جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بانی

علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

اُردو کا اکتالیس سالہ علمی، ادبی اور تہذیبی

ماہنامہ

شاعر

جنوری، فروری ۱۹۷۰

جلد ۴۱، شمارہ ۱ ـ ۲

مدیرِ اعلیٰ

اعجاز صدیقی

ادارۂ تحریر و مشاورت:

☆ مہندر ناتھ

☆ ڈاکٹر محمد حسن

☆ شہاب جعفری

☆ ندا فاضلی

اس شمارے میں

☆ زرِ سالانہ: ۹ روپے

☆ معاونین سے: ۲۵ روپے

☆ تاعمر خریداری: ۱۲۵ روپے

☆ ممالکِ غیر سے: ۲۵ شلنگ

☆ فی پرچہ: ۷۵ پیسے

● ترسیلِ زر کا پتہ:

● ماہنامہ شاعر قصر الادب۔ بمبئی ۸ بی سی

خط و کتابت کا پتہ:

اس شمارے کی قیمت

ایک روپیہ پچیس پیسے

فون: ۳۵۹۹۰۴

ماہنامہ شاعر

مکتبہ قصر الادب، پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶، بمبئی ۸ بی سی

شاعر بمبئی
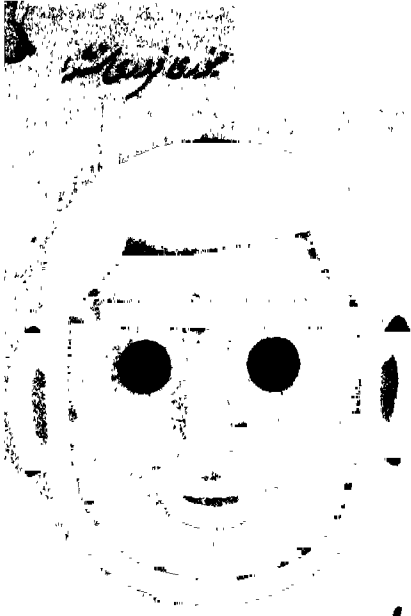
اگلا بچہ ابھی نہیں

تین کے بعد کبھی نہیں

تہذیب کا
شاعر

جنوری، فروری ۱۹۷۰ء

جُوعات

بمبئی اُردو کنونشن ــــ ایک لمحۂ فکریہ !

دو سال کی جدّوجہد کے نتیجے میں اُردو کمیٹی بمبئی نے اُردو زبان کے حقوق کے سلسلے میں ملک کی دوسری چودہ زبانوں کے دانشوروں، ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کو اپنا ہم نوا بنا لیا اور "اُردو مطالبہ" پر بڑی تعداد میں غیر زبانوں کی اہم شخصیتوں کے دستخط حاصل کرنے کے لئے کئی زبانوں میں اُردو کا مطالبہ چھپوایا گیا۔ اراکین نے سفر کئے۔ شخصی ملاقاتوں کے علاوہ بمبئی میں مراٹھی، گجراتی، پنجابی اور سندھی زبان کے ذمّہ دار ادیبوں کو مختلف اوقات میں مدعو کر کے اُن کے سامنے اُردو کا مقدمہ رکھا اور انہیں صحیح صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

کئی سال پہلے کی بات ہے پروفیسر آلِ احمد سرور سکریٹری انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) نے بمبئی میں ایک پریس کانفرنس بلائی تھی۔ اُس میں بعض دُوسری زبانوں کے پریس نمائندوں نے کہا تھا کہ ہم نہیں جانتے کہ اُردو کے مسائل کیا ہیں؟ آپ نے ان باتوں سے کبھی دُوسری زبان والوں کو آگاہ کیا؟ سرور صاحب نے اُس وقت کہا تھا کہ ہاں ہم دُوسری زبانوں میں کچھ پمفلٹ چھپوا رہے ہیں اور پھر وہ بات رفت و گذشت ہو گئی تھی۔

گذشتہ دو سال ملک کی فضا بیحد مکدّر رہی۔ اُردو کنونشن کے انعقاد کے لئے کسی مُناسب وقت کا انتظار تھا اور بالآخر ہندوستان کی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے اُردو کنونشن کے افتتاح کی دعوت قبول فرماتے ہوئے وہی تاریخیں دیں جن تاریخوں میں بمبئی میں کانگریس سیشن ہو رہا تھا۔ چنانچہ ۲۸، ۲۹، ۳۰ دسمبر ۱۹۶۹ء کو خصوصی انتظام و اہتمام کے ساتھ اُردو کنونشن کے سہ روزہ اجلاس ہوئے۔ اُردو کمیٹی نے تقریباً پانچ سو دعوت نامے اُردو کی ممتاز شخصیتوں کو بھیجے تھے اور اُن غیر زبانوں کے تمام دانشوروں کو بھی دعوتِ شرکت دی تھی جنہوں نے اُردو کے مطالبے پر اپنے دستخط کئے تھے۔ اُردو کے لگ بھگ ڈیڑھ سو نمائندے پورے ہندوستان سے آئے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ غیر زبانوں کی بڑی شخصیتیں بھی خاصی تعداد میں جمع ہوگئی تھیں۔ یہ کہنا دُرست نہیں ہے کہ ــــ

"بمبئی اُردو کنونشن کے بارے میں ہندوستان بھر کے اخباروں میں کافی لکھا گیا ہے اور لوگوں کو اُس سے بہت مایوسی ہوئی ہے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اِس کنونشن سے اُردو کا مقصد ذرا سا آگے بڑھ گیا ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ کنونشن والوں نے وُسعتِ نظر سے کام نہیں لیا۔ اُنہوں نے کمیونسٹ اور ترقی پسند مصنفوں کو خاص طور سے بُلایا اور دُوسروں کے معاملے میں ڈھیل سے کام لیا" ــــ (حیات اللہ انصاری۔ قومی زبان)

حقیقت تو یہ ہے کہ اُردو کمیٹی نے کمیونسٹ اور غیر کمیونسٹ، ترقی پسند اور غیر ترقی پسند کسی کی کوئی تخصیص نہیں برتی۔ ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، پنڈت آنند نرائن مُلّا، حبیب الرحمان، عابد علیخاں، پروفیسر احتشام حسین، سجاد ظہیر، جوگیندر پال، حمیدہ سلطان اور خود حیات اللہ انصاری کے علاوہ کشمیر، بہار، اُتر پردیش، مدھیہ پردیش، گجرات، راجستھان، پنجاب، آندھرا اور میسور وغیرہ کی ریاستوں سے پروفیسر، ادیب، شاعر، صحافی اور اُردو تحریک سے وابستہ حضرات کافی تعداد میں تشریف لائے کیا یہ سب کمیونسٹ اور ترقی پسند تھے؟ کاش حیات اللہ انصاری صاحب اِس افسوسناک پہلو پر غور کرتے کہ مرکزی انجمن ترقیٔ اُردو کی طرف سے اُردو کنونشن کو کوئی تعاون نہیں ملا۔ دا اُن کے صدر کُشریف لائے تھے

دسکریٹری۔ جبکہ اُردو کمیٹی نے آغازِ کار ہی میں انجمن کا تعاون حاصل کرنے کے لئے اپنے دو نمائندے بطور خاص علیگڑھ بھیجے تھے اور اِن نمائندوں نے انجمن کے سالانہ جلسے میں اُس کے تمام اراکین کے سامنے اُردو کنونشن کے مقاصد پیش کئے
رہا مایوسی کا سوال تو اِس کے کئی پہلو ہیں۔ ایک ہی عینک سے دُور اور پاس نہیں دیکھا جاسکتا۔ پہلے ہی سے مایوس بے حل اُردو قوم میں اتنی تاب کہاں رہی ہے کہ وہ حالات سے پیدا شدہ کسی جھٹکے کو برداشت کرسکے اور جبکہ حالات خود اُسکے پیدا کردہ ہوں۔ اُردو کی اتنی بڑی بڑی شخصیتیں ایک جگہ جمع ہوئیں اور غیر زبانوں کے دانشوروں نے اپنے مشوروں اور اپنی تقریروں سے اُردو کی زیادہ سے زیادہ تائید اور حوصلہ افزائی کی تو پھر ناکامی کیوں ؟ مگر اِس کا کیا علاج کہ ہم خود ہی اپنی اغراض اور مصلحت پسندیوں کا شکار ہوجاتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے کاسۂ گدائی میں کوئی خود ہی کچھ ڈالدے

۲۸ر دسمبر کا پورا ایک دن، صبح سے دوپہر تک اُردو والوں کے ساتھ اور شام سے رات تک غیر زبانوں کے دانشوروں کے ساتھ صرف پنڈت آنند نرائن مُلا کے لکھے ہوئے نئے "میمورنڈم" پر بحث و تمحیص میں گذر گیا۔ نہ بیرونجات کے نمائندوں کے ساتھ آئندہ کے کسی لائحۂ عمل پر کوئی گفتگو ہوسکی اور نہ اُنکے اپنے صوبوں کے مسائل پر کوئی بات ہوئی۔ مُلا صاحب کو کس نے نیا میمورنڈم لکھنے کی زحمت دی، (مجلس عاملہ کے کسی جلسے میں یہ بات طے نہیں ہوئی تھی) اور کیوں وہ وقت تک اُس نہایت حقیقت پسندانہ، جُراٴت مندانہ مگر بیحد گرم اور طویل میمورنڈم میں ترمیم و تنسیخ کرنے کے لئے تیار ہوئے ؟ اُردو کی بڑی شخصیتوں نے مجلسِ عاملہ کے ساتھ بیٹھ کر کیوں یہ طے نہیں کیا کہ ۲۹ر دسمبر کے جلسۂ عام میں وزیرِ اعظم کے سامنے کس کو کیا کہنا ہے۔ ایک ایک لفظ اور ایک ایک بات کو پہلے سے کیوں نہ جانچ اور تول لیا گیا۔ علاوہ ازیں اپنی اپنی شخصیتوں کی بڑائیوں اور اکائیوں کا افسوسناک مظاہرہ اِس سب سے اہم کنونشن میں بھی دیکھنے میں آیا۔

"جس طرح اُردو کا سوال وزیرِ اعظم محترمہ اندرا گاندھی کے سامنے پیش کیا گیا تھا، اُس سے ایسا لگتا تھا کہ کچھ خاص لوگ اُردو کا مسئلہ حل کرنے کے بجائے، اُسے حکومت کی خوشنودی کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔"
راماین سنگھ۔ میمبر بہار ریاستی انجمن ترقی اُردو (بہاری نیا)

"اُردو کا مقدمہ صحیح ڈھنگ سے وزیرِ اعظم کے سامنے پیش نہیں کیا گیا اور پنڈت آنند نرائن مُلا نے میمورنڈم پیش کرتے ہوئے جو تقریر کی اُس میں اُردو والوں کی وکالت کی بجائے حکومتِ ہند کی ترجمانی کی گئی۔"
شاہ فاروق عطا (انقلاب بمبئی)

آج کل لوگ بھی بلا کے ذہین اور فطین ہیں ـــ "خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر"۔!!
کنونشن کے دوسرے دن ۲۹ر دسمبر ۱۹۷۳ء کو صبح ساڑھے دس بجے تک خوبصورت "برلا ماتوشری سبھا گھر" کی بارہ سو نشستیں پُر ہوچکی تھیں۔ بے شمار لوگ گیلریوں میں کھڑے تھے۔ پڑھی لکھی خواتین بھی بڑی تعداد میں آئی تھیں۔ سب کے چہرے دمک رہے تھے اور دل اُچھل رہے تھے جیسے آج اُردو کے مقدمے کی فتح کا پہلا دن ہو اور سب فیصلہ سننے کیلئے بے چین ہوں۔ وزیرِ اعظم کچھ دیر سے تشریف لائیں اور جب اسٹیج کا پردہ اُٹھا تو ملک کی پسندیدہ قومی زبانوں کے ادیبوں اور دانشوروں کے ساتھ وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی کئی مرکزی و ریاستی وزراء کے ساتھ فروکش تھیں۔ لگ رہا تھا جیسے سب کو کرسیوں پر سجا کر بٹھا دیا گیا ہے۔ پُشت پر مختلف زبانوں میں لکھا ہوا لفظ "اُردو" رہا تھا۔ کیمرے بار بار آگے بڑھ رہے تھے۔ ڈاکٹر ملک راج آنند نے اُردو دوستی سے پُر اپنی تقریر سے جلسے کو ... کیا۔ بعدہٗ اُردو کمیٹی کے صدر کرشن چندر نے اپنی لکھی ہوئی تقریر پڑھی اور اُس میں اپنا دل نکال کر رکھدیا۔ اُ...

یک مجلہ دلوں کو چھید رہا تھا۔ خوب خوب تالیاں بجیں۔ پھر ڈاکٹر ہری کرشن مہتاب نے اردو کی حمایت میں پُرزور تقریر
ی۔ بمبئی میں ہونے والے ہنگامی کانگریس سیشن کی تھکی ماندی اور بھاری نہایت ذہین وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی بغور
ب کچھ سُن رہی تھیں۔ بار بار اُن کی کھلتی اور جھپکتی ہوئی آنکھوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ایک طرح کی کشمکش میں مبتلا
یں اور اب کنونشن کا وہ لمحۂ عروج بھی آ گیا جب اردو کمیٹی کے سکریٹری سید محمد زیدی نے اعلان کیا کہ محترم پنڈت آنند
رائن مُلّا وزیرِ اعظم کی خدمت میں اردو کا مطالبہ پیش کریں گے۔ مُلّا صاحب مائک پر تشریف لائے اور کہا کہ وہ اپنا
لکھا ہوا میمورنڈم اس وقت پیش کرنے سے معذور ہیں۔ اُنہوں نے چند منٹ ایک گول مول مشروط سی تقریر فرمائی
ن میں اردو والوں کے لئے نصیحتیں تھیں اور حکومت کے ہاتھ مضبوط کرنے کی ہدایتیں۔ نہ اردو کا وہ اصل مطالبہ
زیرِ اعظم اور سامعین کو پڑھ کر سُنایا جس پر سب زبان والوں نے دستخط کئے تھے۔ تقریر کے بعد خاموشی کے ساتھ وہ
مطالبہ اور دستخطوں کا مجلد پلندہ وزیرِ اعظم کے اُن ہاتھوں میں دے دیا، جن ہاتھوں نے بینکوں کو قومیایا۔ جو ہاتھ
کانگریس میں ترقی پسند عناصر کو لائے، جنہوں نے چندی گڑھ کی قسمت کا فیصلہ کیا اور ملک میں سوشلزم کی ایک
نئی لہر پیدا کی۔ "اردو مطالبہ" کی یہ خاموش پیش کش اور مُلّا صاحب کی تقریر وزیرِ اعظم کی کش مکش کو دُور کر چکی تھی۔
آنمحترمہ نے مُلّا صاحب کی تقریر کے حوالے ہی سے جواباً جو کچھ فرمایا، اُس کا لُبِّ لُباب بقول احمد جمیل یہ ہے:

"مخالف ہوائیں زیادہ طاقت ور ہیں۔ تمہارے چیمپئن کمزور ہیں۔ تمہارے پاس عوامی طاقت نہیں ہے۔
تم نے تمام زبانوں کے دانشوروں کا دستخط شدہ مطالبہ تو ضرور میرے ہاتھ میں تھما دیا، لیکن اس
سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ تمہارے ساتھ مزدور اور کسان ہیں۔ ملک کی عام جنتا ہے۔ اگر ہم
تمہاری مانگ قبول کر لیں تو فتنہ پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔" (دعوت۔ دہلی)

وزیرِ اعظم کی تقریر میں اردو کی عظمت، اہمیت، ضرورت، اُس کے تہذیبی اور قومی ورثے کے ذکر کے باوجود یوں لگ
رہا تھا کہ پشت پر مختلف زبانوں میں لکھا لفظِ اردو دھندلا ہوتا جا رہا ہے۔ سامعین کے چہرے اُتر گئے۔ دل ڈوبتے
ہوئے محسوس ہوئے۔ لوگ سوچ رہے تھے کہ کل ہی تو وزیرِ اعظم نے کانگریس سیشن میں اردو کی پُرزور حمایت
کی تھی اور آج وہ ۲۲ سال کی مسلسل اردو تحریک کی جدوجہد کو لایعنی سمجھتے ہوئے پھر سے الف۔ بے۔ ت پڑھنے
کی تلقین کر رہی تھیں۔

یہ ایک عام دستور ہے کہ جو ذمے دار شخصیت کرسی نشیں ہوتی ہے وہ جلسے میں کہی گئی باتوں کی روشنی ہی
میں کوئی جواب دیتی ہے۔ وزیرِ اعظم نے بتا دیا تھا کہ وہ تھوڑی سی دیر ہی کنونشن میں رہ سکیں گی۔ ایسی صورت میں
کرشن چندر اپنی طویل تحریری تقریر کے بجائے چند چبھتے ہوئے جملے اور اہم نکتے پیش کر دیتے۔ وہ وزیرِ اعظم کو
بتا دیتے کہ اگر اب بھی اردو کا مسئلہ حل نہ کیا گیا تو کسی دن وزیرِ اعظم کی کوٹھی کے سامنے کرشن چندر اور دوسرے
بہت سے محبانِ اردو کے سینوں میں خنجر پیوست ہوں گے۔ ایسی صورت میں جبکہ ریاستی حکومتیں اردو کے جائز
حقوق دینے کے لئے تیار نہیں ہیں تو آئینِ ہند کے آرٹیکل نمبر ۳۴۷ کی رو سے صدرِ جمہوریہ اور وزیرِ اعظم،
مداخلت کیوں نہیں کرتے؟ مرکزی حکومت کی یہ بے دست و پائی، لاچاری اور مجبوری کیوں؟ صوبوں کے دوسرے
مسائل کو مرکز اپنے اختیارات سے حل کر سکتا ہے، لیکن اردو کے مسئلے کو وہ ۲۲ سال سے نظر انداز کر رہا ہے۔
چونکہ وزیرِ اعظم نے جب اردو کا مطالبہ سُنا ہی نہیں، جب اُن کو یہ تک نہ بتایا گیا کہ مطالبہ پر اُس کی تائید میں کن

کن زبانوں کے کتنے دانشوروں نے دستخط کئے ہیں، جب انہیں یہ بھی یاد نہیں دلایا گیا کہ اردو کمیٹی نے چند ماہ پہلے بھی دہلی میں ڈائرکٹر
ایک محضر پیش کیا تھا تو ظاہر ہے وہ آئینی طور پر کوئی بات کیسے کہہ سکتی تھیں، کوئی وعدہ کیونکر کر سکتی تھیں؟ ۔ اردو کا وہ مطالبہ
اور دستخطوں کا پلندہ جو اُن کے ہاتھوں میں دے دیا گیا تھا، اُن کی سکریٹریٹ کی الماری میں جاکر بند ہو گیا ہوگا۔
یوں لگ رہا تھا جیسے اُردو کنونشن میں سیکڑوں جامد اور ساکت پتھر کرسیوں پر بیٹھے ہوں۔ کسی نے "اُردو زندہ باد" کا
ایک نعرہ تک بلند نہیں کیا، کسی دیوانے نے آگے آکر اپنا گریبان چاک نہیں کیا۔ وزیر اعظم کی مدح سرائی، ہاروں اور پھولوں
میں جتنا وقت ضائع ہوا تھا، اُتنے وقت میں اُردو کا مطالبہ سُنایا جا سکتا تھا۔ پنڈت آنند نرائن مُلّا اپنی اُس حقیقت پسندانہ
تقریر کا کچھ حصہ سُنا سکتے تھے، جس پر پورے ایک دن بحث ہوئی تھی۔ کسی کی زبان سے ایک جملہ بھی تو جراٗت مندانہ نہیں نکلا۔
حالانکہ ایک دن پہلے ہی غیر زبانوں کے دانشوروں کے ساتھ شام کی نشست میں ہندی زبان کی شریمتی شودان چوہان،
اُردو مطالبے کو نرم بنانے کی بات پر اُردو والوں کو شرم دلا چکی تھیں کہ اگر آپ لوگ اتنے ڈریں اور دبیں گے تو قیامت
تک اُردو کا حق نہیں لے سکتے۔ سندھی زبان کے ایک دانش ور نے کھڑے ہو کر پُرجوش لہجے میں کہا تھا کہ اُردو تو پورے
ہندوستان کی زبان ہے۔ ہم سندھی زبان والوں نے صرف ایک مقدمہ عدالت میں دائر کر کے سندھی کو پندرہویں
قومی زبان بنوا لیا۔ کسی نے سچ کہا ہے:

"جیسی تیری ڈفلی، ویسا میرا راگ"

وزیر اعظم کے چلے جانے کے بعد گیانی گُرمکھ سنگھ مُسافر، فخر الدین علی احمد، جی ایم صادق، ڈاکٹر رفیق زکریا،
ڈاکٹر سہارنجن رے وغیرہ نے بھی اُردو کے حق میں بہت اچھی تقریریں فرمائیں۔ مگر یہ سب کچھ بعد از وقت تھا۔ تیر
تو پہلے ہی خطا ہو چکا تھا۔ ۳۰ دسمبر کی شب میں وزیرِ داخلہ شری وائی۔ بی۔ چوہان نے کنونشن کے بہت بڑے
جلسۂ عام میں اُردو سے اپنی بہترین ہمدردیوں کا اظہار کیا اور بھی بہت سی نرم و گرم تقریریں ہوئیں۔ کنونشن میں آئے
ہوئے اُردو اور غیر زبانوں کی بعض شخصیتوں نے اپنے بیانات اخباری نمائندوں کو دئیے۔ مگر اب صرف ایک
ہی سوال ہے:

آگے کیا ہوگا ــــــ ؟

اُردو کمیٹی نے ایک نیا راستہ دکھایا ہے۔ اُس کی سرگرمیاں ختم نہیں ہوئی ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اُردو والے
اب بھی کوئی متحدہ محاذ بناتے اور کوئی جراٗت مندانہ اقدام کرتے ہیں یا نہیں؟ زندہ قومیں اور زبانیں شکر کی
گولیاں نہیں ہوا کرتی ہیں، جنہیں گھول کر پی جانے کا اندیشہ ہو ــ اور اندیشوں سے آنکھیں ملانا ہی زندگی ہے۔
معاصر ماہنامہ "تحریک" دہلی نے اُردو کنونشن اور "نوبھارت ٹائمز" میں شائع شدہ مضامین کے تجزیے میں جو غیر حقیقت پسندانہ
رویّہ اختیار کیا ہے، چاہے وہ معاصر موصوف کے کسی خاص مسلک و مصلحت ہی کے تحت کیوں نہ ہو، مگر ہے بعید افسوسناک۔ بمبئی کے اُردو ادیبوں
نے مل کر ایک بہت بڑا کام انجام دیا ہے۔ بات کو صرف ترقی پسندوں (جنھوں نے سچے دل اور پوری لگن سے کام کیا) تک محدود رکھنا اور
مخالفینِ اُردو کا ہمنوا بنکر اُن کے ہاتھ مضبوط کرنا اور "تحریک" کی تحریروں کو "دھرم یُگ" میں چھپوانا بڑی نامناسب بات ہے۔ بمبئی
اُردو کنونشن نے مخالفینِ اُردو کو بوکھلا دیا ہے۔ یہ وقت ہے کہ تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر اُردو کے مسائل و حالیہ کنونشن
سے پیدا شدہ فضا کو آگے بڑھائیں۔ انجمن ترقی اُردو ہند، اُردو کمیٹی کے ساتھ بھرپور تعاون کرے۔

اعجاز صدیقی

ضیا فتح آبادی

بس ایک بار

خوشی مناؤ کہ چھبیس جنوری کا یہ دن
بس ایک بار ہی آتا ہے سال بھر کے بعد

بس ایک بار ہی خوشیاں منائی جاتی ہیں
بس ایک بار ہی نغموں سے گونجتی ہے فضا
بس ایک بار ہی خوشبوئیں رقص کرتی ہیں
بس ایک بار ہی رنگِ چمن نکھرتا ہے
بس ایک بار ہی گُل کی ہنسی بکھرتی ہے
بس ایک بار ہی کانٹوں کی شمعیں جلتی ہیں
عوامِ ہند کا سر ایک بار اُٹھتا ہے
بس ایک بار دِلوں کا غبار ڈھلتا ہے

پھر اُس کے بعد وہی زندگی کا رونا ہے
تمام سال وہی ایڑیاں رگڑنا ہے
وہی گلے، وہی آنسو، وہی کمی، وہی درد
وہی ستم، وہی نفرت، وہی اُمید کی لاش
وہی اندھیرے دبوچے ہوئے اُجالوں کو

تمام عمر یہی غم ہماری قسمت ہے
کہ ہم کو دِن سے نہیں رات ہی سے نسبت ہے
اِسی لیے تو یہ اِک دِن بہت غنیمت ہے

خوشی مناؤ کہ چھبیس جنوری کا یہ دن
بس ایک بار ہی آتا ہے سال بھر کے بعد

▲

ڈاکٹر دھرم ویر بھارتی (ایڈیٹر، دھرم یُگ)
مترجم: یعقوب راہی

جھُوٹ اور مکر و فریب کے ہتھکنڈوں کے طلبگار

یہ اُردو کے حمایتی ــــــــ

قدیم ایران کی بات ہے۔ دو زبردست مقرر تھے۔ ایک مقرر کی تقریر کے بعد جب دوسرے گروہ کا مقرر جوابی تقریر کرنے لگا تو اُس نے کہا۔ آج میں ایسی زبردست تقریر کرنے جارہا ہوں کہ لوگ تمہارے خلاف غصے سے پاگل ہو اٹھیں گے اور تمہاری بے عزتی کریں گے۔ پہلے مقرر نے پرسکون لہجے میں کہا۔ میں جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ جب ان کا غصہ اتر جائے گا، پاگل پن دور ہو جائے گا تب وہ غور و فکر کریں گے۔ اصلی مجرم کو پہچانیں گے اور تب وہ تمہیں نہیں چھوڑیں گے
ابھی کچھ دنوں پہلے جب "اردو کنونشن" میں اُس کے صدر اور دیگر اردو والوں کی تقریروں کی بات سُنی اور ان کے ذریعہ تیار کیا ہوا اور دور دور تک پھیلا ہوا "مانگ پتر" پڑھا تو پتہ نہیں کیوں برسوں پہلے پڑھی کہانی یاد آگئی۔ ایک قوم جو مختلف تاریخی وجوہ سے بڑی نازک حالت میں آپڑی ہے، جو پہلے سے متفکر اور مشتعل ہے اسے اور بھی متفکر اور مشتعل بنا کر اس کے جذبات سے کھیل کر چند تالیوں اور واہ واہ ہی لوٹ کر اپنا چودھری پن قائم کروالینا آسان ہے۔ لیکن تاریخ اس قسم کی مصنوعی رہنمائی کا پردہ بہت جلد فاش کر دیتی ہے۔ وہ دن دور ہوں، لیکن شائد بہت دور نہیں۔ جب اردو کو پیار کرنے والے اشتعال اور فکر سے نجات پائیں گے، عقل سے سوچیں گے اور اس دن یہ سمجھ پائیں گے کہ ان لوگوں نے بڑے کٹھن وقت میں اردو کے آندولن کو کتنی غلط سمت میں موڑا۔

ایک سیاسی سازش

میں یہ بات بڑے دکھ سے لکھ رہا ہوں۔ اس لئے کہ ان کنونشن والوں میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جنھیں میں بہت پیار کرتا ہوں، بہت زیادہ۔! لیکن میں یہ دو ٹوک بات لکھنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ کیوں کہ میری مجبوری یہ ہے کہ میں صرف ان ہی کو پیار نہیں کرتا، اُردو میں جو کچھ اچھا اور پائیدار ہے، اس کو بھی پیار کرتا ہوں۔ ایک سیاسی سازش اور ایک فرقہ وارانہ تنگ نظری کی تسکین کیلئے اردو کو نئے تناؤ اور جھگڑے کا شکار بنا دینا ایک ناقابل معافی جرم سمجھتا ہوں۔ پچھلے بیس سال میں اس سیاست اور فرقہ وارانہ جنون سے کوئی فائدہ نہیں ہوا ہے۔ اگلے بیس سو سالوں میں بھی اس سے اردو کا کوئی فائدہ نہیں ہونے جارہا ہے تعجب ہے کہ اتنی نمایاں بات کو اردو کمیٹی کے اتنے سمجھدار لوگ نہیں سمجھ پا رہے ہیں۔ اور ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ادب اور ادبی وراثتیں ایک قوم کی عظیم تاریخی روایت سے جڑی ہوتی ہیں۔ انہیں تاریخی روایت سے الگ کرکے صرف ایک فوری سیاست کا مہرہ بنا دینا کتنا غلط کام ہے!

یہ تاریخی روایت کیا ہے؟ اُردو کی اس بہت پیاری ادبی وراثت کا تاریخی روایت میں کیا مقام ہے۔؟ کیا رسم الخط

کا سوال ادب کے مسائل سے زیادہ اہم ہے! سچ بات تو یہ ہے کہ رسم الخط کا اختلاف صرف ایک مصنوعی فرق ہے ورنہ غالب اپنے دیوان کو دیوان ہندوی نہ کہتے۔ ہندوستان کا راجدھانی دلّی کے آس پاس بولی جانے والی زبان کو ناگری لپی میں لکھئے یا فارسی رسم الخط میں، اس سے زبان تو نہیں بدل جائے گی۔ جائسی کی "پدماوت" کے سارے قلمی نسخے اگر فارسی رسم الخط میں ملتے ہیں تو اس سے کیا؟ کیا جائسی اودھی زبان کے مستند و ممتاز کوی نہیں ہیں؟ اور کیا "پدماوت" اودھی زبان کے دیگر بزمیہ ادب (EPICS) میں مناسب عزت و مقام نہیں پاتا؟ صحیح بات تو یہی تھی کہ رسم الخط کے بیجا جھگڑے کو طول کر اردو کی بہترین تخلیقات کو بھی اس بولی میں لکھے جانے والے ناگری رسم الخط کے عظیم ادب کی عظیم روایت مانا جاتا۔ اور اسکولوں میں بھارتیندو، ہریش چندر، اور میتھلی شرن گپت، کے ساتھ میر، نظیر اور غالب بھی پڑھائے جاتے۔ اگر ناگری رسم الخط میں چھپ کر پدماوت کا مقام سو گنا بڑھ جاتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ میر اور غالب کو بھی ایسا ہی ممتاز مقام نہ ملتا۔

بائیس سال پرانی تجویز

یہ بات کہ اردو لکھنے، پڑھنے، اور پڑھانے کے لئے ناگری رسم الخط اپنا لیا جائے اور ہندی۔ اردو کی ملی جلی شاندار وراثت ہماری قومی ملکیت بن جائے۔ شاید اردو کمیٹی والوں کو یہ تجویز ہندی والوں کی کوئی خطرناک سازش معلوم دے، لیکن یہ تجویز نئی نہیں ہے۔ یہ بائیس سال پرانی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں الہ آباد کی ہندی ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں بمبئی سے یہ تجویز لے کر شری علی سردار جعفری گئے تھے۔ اس کانفرنس کے کھلے اجلاس میں ہندی اردو کے مسئلے پر تقریر کرتے ہوئے سردار جعفری نے کہا تھا کہ وہ بمبئی سے اپنے ساتھ اردو کے ادیبوں اور علمی شخصیتوں کا ایک خط لے کر آئے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ اگر ہندی سنسار اردو کا نیا پرانا اعلیٰ ادب ناگری میں لے آئے تو اردو کے لوگ اردو رسم الخط کا اپنا یہ مطالبہ چھوڑنے کو تیار ہیں۔ (شری امرت لال ناگر نے نئی کہانی کے نئے شمارے میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔) یہ ایک بڑا ترقی پسند اور دانش مندانہ سمجھوتا تھا۔ ہندی والے اپنے ڈھنگ سے الگ الگ لوگ اس سمت میں کوشاں رہے۔ اردو کے دائرے میں بھی یہ احساس پیدا ہوا۔ اس کا ثبوت مجھے بمبئی آنے پر ملا۔

۱۹۶۰ء میں بمبئی آنے پر سب سے پہلے اردو کے ایک چوٹی کے ادیب سے میری ملاقات ہوئی۔ اسی وقت انھوں نے مجھے اس تجویز کی بات تفصیل سے بتائی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ چاہتے ہیں کہ ہندی اور اردو کے فراخدل ادیبوں، منصفوں اور ماہرین تعلیم کی ایک ملی جلی کانفرنس بمبئی میں بلائی جائے اور ناگری لپی کے ذریعے ہندی کے نصاب میں ہندی۔ اردو کی ملی جلی ادبی وراثت کی نمائندگی اور درس و تدریس کی روپ ریکھا تیار کی جائے۔ میں نے انہیں بھی یقین دلایا کہ میرا اور مجھ جیسے سوچنے والے بہت سے ہندی ادیبوں اور ماہرین تعلیم کا تعاون انہیں حاصل ہوگا۔ وہ تیاریاں شروع کریں اور اردو کی طرف سے کون کون شامل ہوگا ان کی فہرست بنائیں۔ کرشن چندر، خواجہ احمد عباس اور بہت سے دیگر اردو ادیبوں نے زور و شور سے "دھرم یگ" میں اپنی تخلیقات ناگری دستخطوں کے ساتھ چھپوانی شروع کیں۔ لیکن کنونشن ٹلتا گیا۔ پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ اردو والوں کا بہت بڑا طبقہ بہت کٹر ڈھنگ سے سوچ رہا ہے۔ وہ اس تجویز کا سخت مخالف ہے۔ تھوڑا وقت چاہیئے تاکہ اُسے اپنی بات سمجھائی جا سکے۔

حد درجہ کی ناروا داری

اُردو کا یہ طبقہ کتنا کٹر اور کس قدر ناروادار تھا اس کی ایک زندہ مثال اُسی وقت ملی جب بھائی مجروح سلطانپوری نے کسی مشاعرہ کے دوران کہیں یہ کہہ دیا کہ اردو کا مستقبل ناگری لپی میں ہے۔ بس فوراً بمبئی کے کٹر اخباروں میں

مجروح صاحب کے خلاف گالی گلوچ شروع ہو گئی۔ ناگری لپی کی بات کرنے کی وجہ سے انھیں مہاتمے گھاؤں سلطانپوری کہہ کے پکارا گیا۔ یہ وہی کٹر تنگ نظری تھی جو فارسی رسم الخط کو اپنی میراث مانتی تھی۔ اس کی رُو سے ناگری لپی کو اپنانے والے مہاتمے قرار دیئے جانے چاہئیں۔ یہی وہ کٹر طبقہ تھا جس کی مخالفت کا اندیشہ کرشن چندر اور ان کے ہم خیال ترقی پسند اُردو مصنفین کو تھا۔

کیا انھوں نے اس طبقہ کو پچھلے بائیس برسوں میں سمجھانے کی کوشش کی؟ کیا اُنھوں نے مخالفت کا خطرہ چھوڑ کر انہیں یہ بتانے کی کوشش کی کہ اردو کو فرقہ وارانہ تنگ دلی اور رسم الخط کی حد بندی سے آزاد کرنا ضروری ہے۔ تاکہ اردو ٹھیک طرح سے پھل پھول سکے۔ آئیے دیکھیں کہ اردو کا یہ میمورنڈم جو اس کنونشن کے وقت بھیجا گیا اُس میں کیا ہے۔ یہ اُمید کرنا فطری ہے کہ کرشن چندر اور راز کی کمیٹی نے یہ ترقی پسند نظریہ قائم رکھا ہوگا۔ لیکن میمورنڈم کچھ اور ہی بتاتا ہے۔ دوسری مقامات کو چھوڑ بھی دیں تو جلی حروف میں جو مطالبہ چھپا ہے وہ کیا ہے۔

"ہم مانگ کرتے ہیں کہ دلی، یوپی، ہریانہ، ہماچل پردیش، راجستھان اور مدھیہ پردیش میں ہندی کے بعد اُردو کو سرکاری طور پر ان صوبوں کی علاقائی زبان تسلیم کیا جائے اور اس کی حفاظت قانونی طور پر کی جائے۔"

اس مانگ کا خلاصہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ مندرجہ بالا صوبوں میں سرکاری کام کاج میں ہندی کے ساتھ اردو کو بھی استعمال کرنے کا حق دیا جائے۔"

اس مانگ کا مطلب کیا ہے؟ اس کا دائرہ کن خطرناک حدوں کو چھوتا ہے! اس سے کیا نتیجے یا تناؤ پیدا ہوں گے؟ کون سے جذبے اُبھر پڑیں گے! یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ بائیس سال کے ذہنی سفر کے بعد کرشن چندر اور ان کے ترقی پسند ساتھی کہاں پہونچے۔ کیا یہ لوگ کبھی اکیلے میں یہ سوچیں گے کہ ایک قوم پرستانہ، ترقی پسندانہ اور دانشمندانہ زمین سے ہٹ کر یہ ترقی پسند کس فرقہ پرست تنگ نظری کی زمین پر جا کھڑے ہوئے ہیں۔

کیسی عجیب بدنصیبی ہے اُردو کی لیڈر شپ کی۔ کن ہاتھوں میں پڑ کر کہاں لے جائی جا رہی ہے۔!؟

بائیس سال سے ہندی میں امرت لال ناگر ہوں یا یش پال، بھگوتی بابو ہوں یا امرت رائے سب اردو کے ادب کو غیر فرقہ وارانہ آسان اور قابل فہم بنا کر اس کا سواگت کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن اردو والے؟! فرق صرف اتنا ہے کہ اس مسئلہ پر ہندی میں ایک سچے ترقی پسند خیال کی جیت ہوئی ہے۔ اور اردو میں ترقی پسندوں نے فرقہ وارانہ اور REACTIONIST جذبات کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں۔ مخالفت سے ڈر کر یا پھر فوری واہ واہی لوٹنے کے لئے! ورنہ کیا علاقائی زبان اور دوسری زبان کی مانگ کی منطق پر خود ان کا یقین ہے؟ لکھنؤ میں ان ادیبوں نے جو تقریریں کی ہیں ان سے تو کچھ اور ہی ثابت ہوتا ہے۔

پچھلے دنوں جب بہار کے قحط کی وبا نے سارے دیش کو پریشان کر رکھا تھا۔ تب یہ معلوم ہوا کہ خواجہ احمد عباس، ساحر لدھیانوی اور کرشن چندر شمالی ہند کے دورے پر جا رہے ہیں۔ قیاس یہی تھا کہ اس سفر کا تعلق شائد قحط زدوں کی امداد سے ہوگا۔ لیکن جو خبریں سامنے آئیں انھوں نے چونکا دیا۔ معلوم ہوا یہ سفر اردو کی مہم پر ہے۔ کسی شہر میں عباس نے کوئی کہانی پڑھی جس میں اُردو کے متعلق سیاست کا پروپیگنڈہ تھا۔ اس پر کچھ واویلا بھی مچی۔ لکھنؤ میں ناگرم دیر

نے صورتِ حال کچھ سنبھالی اور وہاں ایک مشترکہ اعلانیہ پر دستخط ہوئے۔ امرت لال جی نے "نئی کہانیاں" میں اس مشترکہ اعلانیہ کی اصل مکمل انگریزی عبارت دی ہے جو اس طرح ہے۔

"Hindi along with Urdu in hindi script- is the one + only the reginal + state language of U.P. — right to use Urdu languag for literary + cultural purposes."

(اور آخر میں بھی یہ ظاہر تھا۔)

"But the state language is only one – Hindi-Urdu in hindi script"

یہ اعلانیہ اتنا واضح ہے کہ کسی طرح کے شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ اتنا ہی نہیں اس وقت کونسل ہاؤس کے سامنے اردو محافظ دستہ کے کچھ لوگ اس بات کے لئے بھوک ہڑتال کر رہے تھے۔ کہ اردو کو دوسری علاقائی یا سرکاری زبان مان لیا جائے۔ ساحر لدھیانوی اور کرشن چندر، یش پال جی کے ساتھ اُن سے باتیں کرنے لگے۔ ساحر اور کرشن چندر نے ان سے صاف صاف کہا کہ اردو کے مناسب حق کے لئے لڑنے میں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ لیکن دوسری صوبائی زبان کے تقاضے کو ہم خود منظور نہیں کر سکتے۔ یہ بھی سنا گیا کہ بعد میں اسی وجہ سے اردو محافظ دستہ کے کچھ لوگوں نے ان لوگوں کو کالے جھنڈے بھی دکھائے اور ایک آدھ جگہ بہت پریشان بھی کیا۔

یہ ایک جانا بوجھا راز ہے کہ جب یہ لوگ خود ہی تسلیم کر چکے ہیں کہ تہذیبی اور ادبی کام میں اردو رسم الخط کے درس و تدریس کی پوری ہمت افزائی ہو۔ لیکن سرکاری کاموں میں ہندی رسم الخط کا ہی استعمال ہو اور ہندی رسم الخط میں لکھی جانے والی ہندی اردو ہی ایک اور صرف ایک سرکاری زبان اتر پردیش کی ہو۔ تو پھر حالیہ اردو کنونشن میں پیش آنے والے مطالبات میں یہ مانگ کیسے ہو سکتی ہے کہ دلی، اتر پردیش، ہریانہ، ہماچل پردیش، راجستھان اور مدھیہ پردیش میں ہندی کے بعد اردو کو ان علاقوں کی علاقائی زبان سرکاری طور پر تسلیم کیا جائے۔ اور اس کی حفاظت قانونی طور پر کی جائے۔ اور مندرجہ بالا ریاستوں میں سرکاری کام کاج میں ہندی کے ساتھ اردو کو بھی استعمال کرنے کا حق دیا جائے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہتھکنڈے کے طور پر خود تو یہ لوگ مانتے ہیں کہ یہ مانگ نہایت بے جا ہے اور اتر پردیش وغیرہ میں اس کا اٹھایا جانا ٹھیک نہیں۔ لیکن بمبئی میں اپنے ایک خاص قسم کے سامعین سے تالیاں بجوانے اور واہ واہی کروانے کیلئے وہاں کچھ اور یہاں کچھ اور چہرہ دکھایا جا رہا ہو۔!! یا پھر ایسا ہے کہ وہاں ہندی ادیبوں کے سامنے ایک مشکل صورتحال سے بچنے کیلئے یہ بیان دیدیا گیا لیکن یہاں آکر پھر وہی حال کہ ——— پنچوں کا کہا سر آنکھوں پر لیکن یہ نالہ وہیں گرے گا۔

ایک اور پیچیدگی

لیکن ایک اور پیچیدگی یہ ہے کہ جب اردو کو علاقائی زبان اور سرکاری زبان بنائے جانے کا یہ مطالبہ کرشن چندر کے دستخطوں کے ساتھ دوسرے ادیبوں کے سامنے پہنچا ہوا تھا اسی وقت خود کرشن چندر یہ کہتے گھوم رہے تھے کہ وہ خود اردو کو دوسری زبان یا سرکاری زبان بنانے کی مانگ سے اختلاف رکھتے ہیں۔ ایک جگہ تو انھوں نے صاف صاف کہا تھا اور بمبئی کے تین ممتاز مدیران جرائد اس کے گواہ ہیں۔ شری گنیش سکسینہ، اروند کمار اور کملیشور۔ ان تینوں کی موجودگی میں انھوں نے کہا کہ اس مانگ کو وہ خود معقول نہیں سمجھتے۔ تو پھر جس مطالبہ سے صدر ہی اختلاف رکھتا ہو، وہ کنونشن کے میمورنڈم میں سب سے اہم مطالبہ کی شکل میں اتنے موٹے حروف میں کیسے چھپا ہے۔ اور اس پر دستخط کرنے کے لئے

کرشن چندر کے دستخطوں سے یہ عرض گزاشت کیسے آئی۔ اور کیسے وہ میمورنڈم اُس وقت بھی تقسیم ہوا جب شریمتی اندرا گاندھی کنونشن میں بھاشن دینے آئیں۔

اس سلسلے میں ایک بہت ہی دلچسپ بات اور ہے۔ لگتا ہے منتظمین نے اس معاملے میں وزیر اعظم کو بھی اس اندھیرے میں رکھا کہ وہ کیا شگوفہ چھوڑنے جا رہے ہیں۔ اس کا تحریری ثبوت ہے۔ جب اُردو کنونشن کا پہلا کارڈ آیا تو اسی وقت شری کملیشور نے وزیر اعظم کو خط لکھا کہ صوبوں میں اگر اسی طرح دوسری سرکاری زبانیں تسلیم کی جانے لگیں تو ان مانگوں کا خاتمہ کہاں ہوگا۔ اتنی مشغولیت کے باوجود وزیر اعظم نے اس سوال کی اہمیت پر دھیان دیا اور ان کی طرف سے مندرجۂ ذیل خط کملیشور کو ملا۔

ڈیر کملیشور۔

مجھے آپ کا ۲۶ر اکتوبر کا خط ملا۔ بلا وجہ تاسف کرنے پر معلوم ہوا کہ بمبئی میں ہونے والے اُردو کنونشن میں اُردو کو کسی صوبے کی دوسری زبان بنائے جانے کا سوال اٹھانے کی کوئی تجویز نہیں ہے۔ اردو کے متعلق سرکار کا نظریہ ۱۴ر جولائی ۱۹۵۸ء کے ایک اعلانیہ میں ظاہر کیا گیا تھا۔ جیسا کہ آپ نے خود کہا ہے۔ اردو کو پڑھنے پڑھانے کا حق ملنا چاہئے۔ سرکاری پالیسی ایک بنیادی بات پر مبنی ہے۔ موقع بہ موقع یہ دیکھتے رہنا کہ پالیسی ٹھیک سے عمل میں لائی جا رہی ہے، غلط نہیں ہوگا۔

فقط۔ اندرا گاندھی

(۲۱ر نومبر ۱۹۶۹ء)

تو کیا یہ چال کھیلی گئی تھی کہ وزیر اعظم کو یہ کہہ کر بلا لیا جائے کہ دوسری سرکاری زبان کا سوال نہیں اٹھایا جائے گا اور پھر اس وقت چپکے سے جذباتی لہجے میں یہ مانگ پیش کر دی جائے۔ یا یہ ممکنہ درمیانی مدت کے انتخابات کے وقت اقلیتوں کے ووٹوں کیلئے شرطیں پیش کرنے کا عیارانہ ڈھنگ تھا۔ کچھ ہو لیکن جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ وزیر اعظم اس چال میں آ جائیں گی اور اس سے اردو کا فائدہ ہوگا، ان کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ نہ تو وزیر اعظم کے خیر خواہ ہیں اور نہ اردو کے۔ اگر ہیں بھی تو ایسے نادان دوستوں سے بھگوان نے ہماری وزیر اعظم کو بچا لیا۔ التجا ہے کہ اردو کو بھی بچا لے جائے۔

فریب در فریب

مگر قصہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ جیسے روسی گڑیا کے اندر گڑیا اور اس کے اندر ایک اور گڑیا ہوتی ہے، ویسے ہی اس میمورنڈم میں بھی فریب در فریب ہیں۔ تیرہویں مد میں یہ کہا گیا ہے کہ پچھلے اگست میں اتر پردیش اور بہار کے اردو اور ہندی کے کچھ بڑے ادیبوں نے جن میں سمترا نندن پنت، یشپال، امرت لال ناگر اور بھگوتی چرن ورما بھی شامل ہیں، یہ اعلان کیا تھا کہ اردو کو بھی ہندی کے ساتھ ان صوبوں کی علاقائی زبان سمجھتے ہیں۔ اور اپنے مشترکہ بیان میں یہ سفارش کی تھی کہ ہندی کے ساتھ اردو کو بھی ان علاقوں میں اردو رسم الخط کے ساتھ حسب ضرورت استعمال کرنے کا حق دیا جائے۔ یہ ایک بہت چالاک قسم کی آدھی سچائی ہے۔ اور اس میں اصلیت کو خوب جان بوجھ کر، توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ تقریباً سال بھر پہلے یہ بات ساحر لدھیانوی نے 'دھرم یگ' میں شائع شدہ ایک اعلانیہ میں کہی تھی۔ اور فوراً امرت لال نے دھرم یگ میں ہی اس کو رد کیا تھا۔ اس پر یہ لوگ چپ سادھ گئے۔ لیکن وہ جھوٹ پھر دہرانے سے باز نہیں آئے۔ اصلیت کیا ہے؟ امرت لال کو لکھے گئے ناگر جی اور یشپال کے خطوط کے اقتباسات پیش ہیں۔ ناگر جی لکھتے ہیں: اردو

کمیٹی بیٹی کا وہ مہ ہیڈآؤٹ دمطالبہ) جو بھارت کی وزیر اعظم سے لے کر تم تک پہنچا، وہ نہ بھگوتی بابو کو ملا ہے۔ نہ لیش پال کو اور نہ مجھے۔ میرا خیال ہے کہ پنت جی کو بھی اس سے محروم ہی رکھا گیا ہوگا۔ اپنی طرف سے صفائی پیش کرتے ہوئے میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ اگر اردو علاقائی زبان کے روپ میں اردو کا وجود نہ لیش پال ہی نے تسلیم کیا تھا اور نہ ہی بھگوتی چرن ورما نے۔ میرے بارے میں جانتے ہو۔ اردو سے پوری ہمدردی ہوتے ہوئے بھی اس کا یہ ناجائز حق میں کبھی تسلیم نہیں کر پایا۔ ہمارے ساتھ متفق ہو کر فراق صاحب سینے تیجائی، کرشن چندر، عباس، مخدوم محی الدین ساحر وغیرہ نے مذکورہ بالا سمجھوتے میں یہ اقرار کیا تھا کہ ہماری صوبائی زبان اور لپی صرف ہندی دیوناگری ہی ہوگی۔ اردو دوسری سرکاری زبان کا درجہ نہیں پائے گی۔ بات اتنی واضح ہے کہ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں۔ پھر بھی بھائی لوگ جہاں سوئی نہ سمائے وہاں پھاوڑے چلا رہے ہیں۔ کیا کہوں!

یش پال جی نے لکھا۔ "اگست ۱۹۷۰ء میں یہاں شام ادب کے سلسلے میں جو پروگرام ہوا تھا اس کی استقبالیہ کمیٹی کا صدر میں ہی تھا۔ اس وقت فکر، اطلاعات میں تبادلۂ خیال کے لئے بہت بڑی میٹنگ ہوئی تھی۔ میں نے اس میں اپنے خیالات تحریری روپ میں پڑھے تھے۔ میرے مقالہ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ: ہندی اردو ایک زبان ہے۔ یہ دونوں شیلیاں ایک دوسرے کے بغیر ادھوری ہیں۔ تقریر و تحریر میں دونوں شیلیوں کے الفاظ اور محاوروں کا موزوں اور مناسب جگہوں پر استعمال ہونا چاہیے تعلیم اور انتظامیہ کی زبان میں بھی ان زبانوں کو الگ سمجھنا خطرناک نظریہ ہے۔ تہذیبی اور ادبی نقطۂ نظر سے اردو فارسی رسم الخط پر بھی کوئی پابندی ٹھیک نہیں۔ اس کے استعمال کے پورے مواقع ہونے چاہئیں۔ لیکن تعلیم اور انتظامیہ (حکومت) کی سطح پر ان صوبوں کی ایک ہی زبان ہوگی اور وہ دیوناگری لپی میں لکھی جانے والی ہندی اردو۔ شری عباس نے میٹنگ میں موجود اردو ادیبوں کی طرف سے کہا تھا۔ میں یش پال جی کے مسودے کے لفظ لفظ کا استقبال کرتا ہوں اور ہم سب اسے منظور کرتے ہیں۔

پنت جی نے لکھا۔ اردو کمیٹی کی طرف سے جو مراسلہ تمہارے پاس آیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس سے ہمارے اندر ایک نفرت کا جذبہ ہی پیدا ہوگا۔ یوپی اور بہار میں اردو کو دوسری زبان تسلیم کیا جائے اس قسم کی کوئی بات، جہاں تک مجھے یاد ہے اس اعلانیہ میں شامل نہیں تھی، جس پر ہم لوگوں کے دستخط لئے گئے تھے۔ نہ کبھی میرا یہ خیال ہی رہا ہے کہ اردو کو الگ سے دوسری زبان کی شکل میں منظوری ملنی چاہیے۔

ایک طرف ہندی کے ادیبوں کے یہ کھلے بیانات ہیں اور دوسری طرف اردو کمیٹی کی وہ قرارداد جس میں انہیں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنائے جانے کی مانگ کا حامی اور سرکاری کام کاج میں اردو رسم الخط کے استعمال کا مؤید کہا گیا ہے۔

آخر یہ اتنا فریب، اتنا جھوٹ، یہ ہتھکنڈے کیوں! کیا یہ کمیٹی والے اردو کی عظیم ادبی وراثت کو اتنا کمزور، اتنا بے جان سمجھتے ہیں کہ وہ ان جھوٹ اور فریب کی بیساکھیوں کے بغیر آگے نہیں چل پائے گی۔ میں اردو کے بارے میں اتنا توہین آمیز نقطۂ نظر نہیں رکھتا۔ میں نہیں مانتا کہ میر، نظیر، غالب، جگر اور فراق جس ادب کے عالیشان ستون ہیں۔ وہ ان کے جھوٹ، فریب اور ان کے گھٹیا ہتھکنڈوں کا طلب گار ہے۔ ہاں! جھوٹ، فریب اور دو رُخی چالوں کی شاید ضرورت ہے ان کی اپنی لیڈر شپ کو بچانے کیلئے۔ کیوں کہ وہ لیڈر شپ ذہنی اعتبار سے بالکل کھوکھلی اور اصلیت سے کٹی ہوئی ہے۔ تاریخ بدل گئی ہے۔ اس سچائی کو دیکھ رہے ہیں۔ لیکن اسے قبول کرنے کی ہمت ان میں نہیں رہ گئی ہے۔ اس لئے کبھی ایک بات کرتے ہیں کبھی دوسری۔ کسی کے سامنے ایک بیان دیتے ہیں، کسی کے سامنے دوسرا۔ ان کی لیڈر شپ اور ان کی خود غرضی کو خطرہ ہے۔ اردو ادب کو نہیں۔ کیوں کہ وہ ادب انہیں کا نہیں ہمارا بھی ہے۔ وہ مٹنے کے ساتھ

(بقیہ صفحہ ۲۲ پر دیکھئے)

کرشن چندر
ترجمہ: یعقوب راہی

ایک زخم اور سہی!

بہار تی جی کی غلط بیانیوں اور غلط فہمیوں، کا پلندہ پڑھا۔ افسوس ہوا۔ اپنی اردو دشمنی میں وہ بڑی بڑی سچائیوں کو بھی نظر انداز کر گئے ہیں۔ ہم ترقی پسند مصنفین نے سچ مچ بہار کے قحط کے سلسلے میں شمالی بھارت کا دورہ کیا تھا، اردو کیلئے نہیں کیا تھا۔ ورنہ ہم یہ سوال سب سے پہلے دہلی میں اٹھاتے، پنجاب میں اٹھاتے، راجستھان میں اٹھاتے، ہم نے تو بہار کے قحط کے سلسلے ہی میں مدد کرنے کے مقصد سے بہار، دہلی، اتر پردیش، بہار، راجستھان کا دورہ کیا، اپنے خرچ پر کیا اور ایک لاکھ سے زیادہ روپیہ جمع کرکے وہیں قحط کمیٹیوں میں بانٹ دیا۔ اس دورے میں ہم نے کہیں بھی اردو۔ ہندی کا جھگڑا شروع نہیں کیا۔ بلکہ یہ جھگڑا सहराना لکھنؤ میں ہونے والی ایک میٹنگ میں یش پال نے شروع کیا تھا۔ یہ میٹنگ بہار کے قحط زدوں کی مدد کے لئے لکھنؤ کے رفیع احمد قدوائی ہال میں ہوئی تھی، جہاں ہم لوگ اپنا پروگرام رکھنے والے تھے۔ اس میٹنگ کے صدر یش پال جی تھے۔ ہم دیر میں پہنچے۔ مگر سنا ہے انھوں نے اپنی تقریر میں اردو، ہندی کے بارے میں بحث طلب باتیں کہیں جس پر مخالفت اور تنقید بھی ہوئی۔ کیونکہ بہار کے قحط کے سلسلے میں ہونے والی میٹنگ میں ان باتوں کی کیا تک تھی۔ بہرحال یش پال جی واک آوٹ کر گئے۔

دوسرے دن اسی مسئلہ پر بحث کرنے کیلئے ہندی اور اردو کے مصنفین کی ایک نشست ہوئی۔ یہ نشست بھی مقامی لوگوں نے طے کی تھی۔ اس میں ترقی پسند اور غیر ترقی پسند، ہر خیال و نظریہ کے لوگ شامل تھے۔ یہ میٹنگ بھی ہم نے نہیں بلائی تھی۔ ہمیں وہاں آنے کی دعوت دی گئی تھی۔ بہت سی باتیں ہوئیں۔ آخر میں میٹنگ وہاں سے ختم ہو کر شری ستیش بترا کے گھر پر پھر جاری رہی۔ جہاں ہم لوگوں کا کھانا تھا۔ لوگوں کی ضد تھی کہ زبان کے الجھے ہوئے مسئلے کو اگر اردو۔ اور ہندی، دونوں زبانوں کے ادیب مل کر سلجھا لیں تو دیش کے لئے بہت اچھا ہوگا۔ بہت بحث و مباحثہ کے بعد ایک سمجھوتہ عمل میں آیا، جسے وہیں پر انگریزی میں تحریری روپ دیا گیا اور وہیں سب لوگوں نے اس پر دستخط کر دیئے۔ وہ سمجھوتہ اس طرح ہے۔

۱ــــ ہم درج ذیل مصنفین جو لکھنؤ میں ۸ اگست ۱۹۶۹ء کو جمع ہوئے متفقہ اعلان کرتے ہیں کہ ہندی ہماری راشٹر بھاشا ہے اور ہماری رائے ہے کہ سبھی راشٹر بھاشاؤں کو اپنی ترقی کے لئے زیادہ سے زیادہ مواقع اور سہولتیں دی جانی چاہئیں۔

۲ــــ اتر پردیش ریاست کیلئے ہم سمجھتے ہیں کہ ہندی کے ساتھ ساتھ اردو بھی اس ریاست کی علاقائی زبان ہے۔ اس لئے ہم

ہندی اور اردو دونوں کے پھیلاؤ اور ترقی کیلئے کوشش کریں گے۔

۳۔۔۔ ہم اردو کی ترقی اور اردو کے رسم الخط کے استعمال میں رکاوٹ ڈالے جانے کے خلاف ہیں۔ ہم زور دار سفارش کرتے ہیں کہ ہندی۔ اردو کی مناسب ترقی کیلئے ہر سطح پر تعلیمی اداروں کی نصابی کتابوں میں ادب کی ہندی اور اردو دونوں زبانوں کے اسالیب کا استعمال ہونا چاہیئے۔

۴۔۔۔ ہم ہندی کو اتر پردیش کی صرف ایک سرکاری زبان تسلیم کرتے ہیں لیکن ہم اتنا ہی زور دے کر کہتے ہیں کہ سبھی مفید اور روزمرہ کی زندگی کے کاموں کے لئے اردو کے استعمال اور اس کی ترقی کیلئے سبھی سہولتیں دی جائیں۔

۵۔۔۔ کسی بھی علاقے میں زبان کے مسئلہ پر تاناشاہی پیدا کرنے کی کوشش کی ہم مذمت کرتے ہیں۔

اس سمجھوتہ میں صاف طور پر اردو کو اتر پردیش کی ایک علاقائی زبان تسلیم کیا گیا ہے اور اس کا استعمال اور زیادہ سے زیادہ ترقی کا حق اس کے رسم الخط کے ساتھ دیا گیا ہے۔

اس سمجھوتہ پر فراق گورکھپوری، یش پال، سجاد ظہیر، بھگوتی چرن ورما، کرشن چندر، امرت لال ناگر، خواجہ احمد عباس، ساحر لدھیانوی، مخدوم محی الدین، آنند نرائن ملا، رام لال، اندلیور، حمید، حبیب اللہ، نذیر بنارسی، گوپال اپادھیائے۔ ستیش بترا، وشولیشور پرد یپ، نرمیندر کلسترِی اور ڈاکٹر داؤجی گپتا کے دستخط موجود ہیں۔ اور ان دستخطوں کے فوٹو اسٹیٹ مختلف اخباروں میں شائع ہو چکے ہیں اور خود یہ سمجھوتہ جو ۱۱ اگست ۱۹۶۰ء کو لکھا گیا۔ ۱۲ اگست یعنی دوسرے دن لکھنؤ کے اخباروں میں چھپ گیا۔ قومی آواز میں (جو لکھنؤ میں چھپتا ہے) اس کا اردو ترجمہ چھپا جو میرے پاس موجود ہے۔ (میں نے اسے شری ادھیکاری کو دکھا دیا ہے)۔ پھر یہ مسودہ پٹنہ کے ہفتہ وار اخبار "مورچہ" میں ۱۵ اگست کو اپنی اصلی (ORIGINAL) حالت میں انگریزی میں شائع کیا گیا۔ (میرے پاس موجود ہے اور میں شری ادھیکاری کو دکھا چکا ہوں) بعد میں یہی مسودہ انگریزی طرز اور دوسرے اخباروں میں بھی چھپا۔ اس سمجھوتہ پر یش پال، بھگوتی چرن ورما اور امرت لال ناگر نے اردو رسم الخط میں دستخط کئے۔ یہ بتانے کیلئے کہ وہ اردو زبان کی حفاظت اس کے رسم الخط کے ساتھ چاہتے ہیں اور ہم نے ہندی میں دستخط کئے۔ یہ ظاہر کرنے کیلئے کہ ہم دیش کی قومی زبان ہندی کو مانتے ہیں اور اتر پردیش کی سرکاری زبان (State Language) بھی صرف ہندی کو مانتے ہیں۔ اب اگر ہندی کے ان مصنفوں کو اس مسودہ سے انکار کرنا تھا تو اس کا صحیح وقت وہ تھا جب وہ مسودہ اخباروں میں چھپا تھا۔ اگر وہ غلط تھا تو اسی وقت تردید کر دینا ان کیلئے ضروری تھا۔ آج اتنے وقت کے بعد ان پچاس سال کے اوپر کے شیر خوار بھولے بھالے بچوں کو خیال آیا ہے کہ ہم نے دھوکے دھڑی سے ان سے دستخط لئے تھے، دستخط کسی اور سمجھوتے پر لئے اور شائع دوسرا کیا۔ یہ صاف کھلی ہوئی دھاندلے بازی نہیں تو اور کیا ہے۔

ہندی مصنفین کی فیاضی

بہرحال اس وقت ہندی میں ان قابلِ فخر ہندی مصنفین کی فیاضی اور انصاف پسندی پر اردو والے بہت خوش ہوئے تھے۔ تبھی ہماری ہمت پڑی کہ ہم الہ آباد اور پٹنہ میں بھی اس کی چرچا کریں۔ جگہ جگہ اخباروں میں اس کا ذکر ہوا۔ اور اس پر اداریے لکھے گئے۔ جن میں ہندی مصنفین کو ہندی۔ اردو جھگڑے کے سیاسی اکھاڑے بازی کے چنگل سے نکال کر اسے ادبی سطح پر حل کرنے کیلئے مبارکباد دی گئی تھی۔ اس تعریف کے موقع پر بھی ہندی کے یہ مصنف چپ سادھے رہے اور میٹھے دودھ کی طرح اس تعریف کو پی گئے۔ حالانکہ وہ وقت بھی تھا جب سمجھوتہ کی تردید کی جا سکتی تھی۔

یہ بھی سچ ہے کہ بھارتی جی کے شہر الہ آباد میں ہمارا استقبال کالی جھنڈیوں سے ہوا تھا۔ لیکن یہ کالی جھنڈیاں ادیبوں نے نہیں

دکھائی گئی تھیں کہ ہم نے اردو کو تسلیم کیوں کیا اور ہندی اردو کے اس جھگڑے کو نبٹانے کی کوشش کیوں کی۔ کالی جھنڈیاں دکھانے والے بائیں بازو کے کمیونسٹ تھے اور ان میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے اور ان لوگوں کا نعرہ تھا کہ لکھنؤ میں ہم نے ہندی مصنفین سے یہ سمجھوتہ کر کے اردو کے ساتھ غداری کی ہے۔ یعنی جتنے پر ہم راضی ہوگئے اس سے کہیں زیادہ ہمیں اردو کے لئے مانگنا چاہئے تھا۔ بھارتی جی بار بار اپنے اس مضمون میں ذکر کرتے ہیں کہ ہم ترقی پسند صرف کچھ تالیوں اور واہ واہ کے لئے اردو کی حمایت کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ آج کل اردو کی لیڈری بڑے گھاٹے کا سودا ہے۔ اس میں تالی کم ملتی ہے گالی زیادہ۔ اس میں کالی جھنڈیاں دکھائی جاتی ہیں اور مردہ باد کے نعرے لگائے جاتے ہیں۔ اس میں جان کا خطرہ اور پیسے کا بھی نقصان۔ اگر یقین نہ آئے تو بھارتی جی دو دن اردو کی لیڈری کر کے دیکھ لیں۔ آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔

غلط الزام

تیسرا الزام بھی غلط ہے۔ ہم نے اردو کنونشن میں وزیر اعظم کے سامنے اردو کو اتر پردیش، بہار، مدھیہ پردیش، ہریانہ، ہماچل پردیش، راجستھان وغیرہ میں دوسری راج بھاشا بنانے کی مانگ ہی نہیں رکھی ہے جس کا ذکر بار بار بھارتی جی نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔ صرف ایک علاقائی زبان بنانے کی مانگ کی ہے۔ وزیر اعظم کو دیئے جانے والے میمورنڈم میں اسے انگریزی میں یوں لکھا گیا ہے۔

"we therfore demand that article 347 of the constitution be implimeted that in DELHI, U.P., BIHAR, HARYANA, HIMACHAL, RAJASTHAN & MADHYA PARDESH, 'Urdu' be officially accepted as a reginal language & these states be legally enforced."

(اس لئے ہم مانگ کرتے ہیں کہ دستور کے فقرہ ۳۴۷ کو پورا کیا جائے اور یہ کہ دہلی، اتر پردیش، بہار، ہریانہ، ہماچل پردیش راجستھان اور مدھیہ پردیش میں اردو کو سرکاری طور پر ایک علاقائی زبان کی حیثیت سے قبول کیا جائے۔ اور اس کی یہ حیثیت قانونی طور پر نافذ کی جائے۔)

یہ مانگ بھی کوئی غیر فطری یا غیر قانونی مانگ نہیں ہے۔ ایسی مانگ نہیں ہے جس کا پہلے کر دستور میں تذکرہ نہ ہو۔ خود ہمارے دیش کے دستور نے ہمیں اس کا حق دیا ہے اور صرف اردو کو نہیں ہر زبان کو یہ حق دیا ہے۔ دستور کی دفعہ ۳۴۷ کے مطابق۔

"On a demand made in that behalf, the President may, if he is satisfied that a substantial proportion of the population of a state desire the use of any language spoken by them to be recognised through out the state or any part there of for such purposes as the may specify."

(اگر اس بات کی مانگ کی جائے تو صدر، اگر انہیں یہ اطمینان ہو کہ کسی ریاست کی آبادی کا بڑا حصہ چاہتا ہے کہ جو زبان وہ بولتا ہے، اسے وہ ریاستی زبان کے طور پر تسلیم کرے، یہ حکم دے سکتا ہے کہ اس زبان کو بھی اس پوری ریاست یا اس کے کسی حصہ میں ایسے کاموں کیلئے جن کا صدر واضح تذکرہ کرے سرکاری طور پر تسلیم کیا جائے گا)

دستور میں حق دیا گیا ہے۔ بیس سال سے اردو اپنا حق مانگ رہی ہے۔ مرحوم صدر ڈاکٹر ذاکر حسین بھی جب وہ صدر نہیں تھے، نمائندوں کا ایک وفد لے کر (جس کا میں بھی ایک ممبر تھا) اس وقت کے صدر راجندر پرشاد کے پاس پہنچے تھے۔ آج تک اس کے

جواب کا انتظار ہے۔ اُردو کنونشن نے البتہ چودہ زبانوں کے دانشوروں کو جو اُردو کا مطالبہ بھیجا تھا اور جس پر چودہ زبانوں کے بڑے بڑے ادیبوں نے دستخط بھی کئے ہیں، اس مانگ پتر (مطالبہ) میں اردو کو دوسری علاقائی زبان بنانے کی مانگ ہے۔ مگر دوسری علاقائی زبان — دوسری سرکاری زبان (STATE LANGUAGE) بنانے کی مانگ — وہاں بھی نہیں ہے لیکن بعد میں جب سب زبانوں کی سبجکٹ کمیٹی کی میٹنگ ہوئی تو یہ مناسب سمجھا گیا کہ لفظ "دوسری" کو بھی نکال دیا جائے تاکہ کچھ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں کہ اُردو کیلئے دوسری سرکاری زبان بنانے کی مانگ کی جارہی ہے۔ میں نے اس کی یاددہانی کی تھی۔ اور جب بھارتی اپنا مضمون لکھ رہے تھے تو اس وقت میں نے شری کملیشور کے سامنے اس مضمون کے چھپنے سے پہلے اس بات کی صاف طور پر وضاحت کردی تھی۔ اُردو کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے۔ مگر انھوں نے میری بات پر یقین کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ شائد غلط فہمی پھیلانا ہی مقصد تھا۔؟

رسم الخط زبان کی کنجی۔

بھارتی جی نے میرؔ اور غالبؔ کا بہت رونا رویا ہے۔ لیکن یہ مگرمچھ کے آنسو ہیں۔ کوئی زبان بھی اپنے ادیبوں کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتی۔ انگریزی آج اس لئے زندہ نہیں ہے کہ اس میں شیکسپیئر اور ورڈز ورتھ موجود ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ وہ کروڑوں گھروں میں بولی جانے والی زبان ہے۔ اسے اسکولوں، کالجوں، عدالتوں اور اسمبلیوں میں برتا جاتا ہے۔ اور اس کے استعمال پر کوئی ایسی پابندی نہیں ہے، جیسی کہ اردو پر ہے۔ کسی بھی دیس میں انگریزی پر وہ پابندیاں لگا دیجئے جو اُردو پر لگادی گئی ہیں، پھر میں دیکھتا ہوں وہ زبان کتنے دن ٹکتی ہے اور شیکسپیئر اور ورڈز ورتھ کتنے دن زندہ رہتے ہیں۔ اُ۔۔۔ کیا؟ کسی بھی زبان کے رسم الخط کو چھین کر اس کے کچھ درجن یا کچھ ادیبوں کو دوسری زبان میں شامل کر لینے سے پہلی زبان کی حفاظت نہیں ہوجاتی۔ اگر میں یہ کہوں کہ ہم میرا، تلسی، بھارتیندو، نرالا اور پنت کے ساتھ سیکڑوں دوسرے ہندی ادیبوں کو اردو میں شامل کئے لیتے ہیں آپ اپنا دیوناگری رسم الخط چھوڑ دیجئے تو کیا آپ تیار ہوجائیں گے۔ آپ اگر تیار بھی ہوجائیں گے تو میں اسے ہندی کے ساتھ غداری سمجھوں گا۔ ہر زبان کو اپنے رسم الخط کے ساتھ زندہ رہنے کا حق ہے۔ ہندی کو دیوناگری رسم الخط کے ساتھ تمل کو اپنے رسم الخط کے ساتھ، اردو کو اس کے رسم الخط کے ساتھ، بنگلہ کو اس کے رسم الخط کے ساتھ، انگریزی کو اس کے رسم الخط کے ساتھ........ رسم الخط زبان کی کنجی ہوتا ہے۔ اُردو سے اگر اس کا رسم الخط چھین لیا جائے تو میرؔ اور غالبؔ ہندی لائبریریوں کی الماریوں میں رکھ دیئے جائیں گے یا موہن جوداڑو کی اینٹوں کی طرح عجائب گھروں میں ان کی کتابیں سجادی جائیں گی۔ شائد بھارتی جی چاہتے بھی یہی ہیں۔

سب سے مزے کا الزام بھارتی جی نے یہ لگایا ہے کہ اردو کا حق مانگنے والے فرقہ پرست ہیں اور یہ شک بھی ظاہر کیا ہے کہ اُردو کی مانگ کرنے سے کہیں ایک "قوم" پر ظلم نہ ٹوٹے جو پہلے ہی سے پریشان اور دکھی ہے۔ دراصل اردو کی مانگ فرقہ پرستوں کی نہیں ہے، بلکہ اس مانگ کی مخالفت کرنے والے فرقہ پرست ہیں، جو اردو کا نام لے کر مسلمانوں کا گلا کاٹتے ہیں اور اقلیتوں کا حق چھینتے ہیں اور اس طرح دیش میں پھوٹ اور جدائی پھیلاتے ہیں اور قومی اتحاد کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ بھارتی جی نے دو تین بار اپنے مضمون میں ترقی پذیروں کو تاریخ کا حوالہ دیا ہے کچھ تاریخ ہم لوگوں نے بھی پڑھی ہے۔ کچھ سچائی کی کھوج ہم لوگوں نے بھی کی ہے۔ وہ اکیلے بھارتی جی کی امانت نہیں ہے۔ اور ہمارا اندازہ یہ تنظر ہمیں بتاتا ہے کہ اس دیش نے اُس وقت ترقی کی ہے، طاقت پائی ہے، جب یہ دیش اشوک اور اکبر کے راستے پر چلا ہے۔ اکثریت اور اقلیت دونوں ہی کو ساتھ لے کر دونوں کے حقوق کو تسلیم کرکے ہمدردی۔ فیاضی اور محبت سے یہ ملک آگے بڑھا ہے، لیکن جب اس دیش پر تنگ نظری اور

فرقہ پرستی کے بادل چھائے ہیں، خواہ وہ ہندوؤں کی طرف سے چھائے ہوں یا مسلمانوں کی وجہ سے، یہ دیش اپنی منزل سے بچھڑ کر کئی سو برس تک غلام رہا ہے۔

میں نہیں چاہتا کہ میرا دیش پھر سے دوسروں کا غلام ہو۔ اس لئے میں اپنے دیش کو مضبوط دیکھنا چاہتا ہوں اور ایک مضبوط دیش بنانے کیلئے یہ بہت ضروری ہے کہ اس کے اقلیتی فرقے بھی خوشحال رہیں اور ترقی کریں۔ انھیں روزی کی سہولتیں نصیب ہوں۔ اور اُن کے مذہب اور تہذیب کی حفاظت کی جائے۔ مجھے امید ہے کہ میرا دیش اس طرف جائیگا۔ ایک دن میرے دیش کے لوگ رانچی جمشید پور، احمد آباد کے فسادوں پر شرمندہ ہوں گے۔ وہی لوگ شرمندہ ہو سکتے ہیں جن کا دل بڑا ہوتا ہے ایک دن میرے دیش کے لوگ اپنے اقلیتی فرقوں کے ساتھ انصاف کریں گے۔ وہ اُن کے مذہب، رسم و رواج اور تہذیب کی حفاظت کریں گے۔ ایک دن وہ اردو زبان کو زمین سے اُٹھا کر اپنی ایک قیمتی قومی دولت سمجھ کر اپنے سینہ سے لگائیں گے

یہ میرا یقین ہے۔

لیکن یہ کام فیاضی سے ہوگا۔ تنگ دلی سے نہیں ہوگا۔ اُردو زبان سے اُس کا رسم الخط چھین کر اُسے علاقائی زبان کی حیثیت سے بھی محروم کر کے، اُس پر تعلیم کے اور عدالتی و سرکاری دروازے بند کر کے آپ کس طرح اس زبان کی حفاظت کر سکیں گے سوچنے کی بات یہی ہے بجاج جی!

یوں تو آپنے اپنے مضمون میں اردو کو ہماری زبان کہا ہے۔ اور اس سے بہت زبانی ہمدردی اور دوستی جتائی ہے۔ لیکن شاید ایسی موقع کیلئے غالب کہہ گئے ہیں۔ ؎

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح　　کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

(نو بھارت ٹائمز دہلی،
۴ر فروری ۱۹۷۰ء

بقیہ صفحہ ۱۱: جھوٹ اور مکر و فریب کے ہتھکنڈوں کے طلب گار ——

بڑھے گا، پھلے گا، پھولے گا، پنپے گا۔ کیوں کہ اس میں زندگی کا عنصر ہے۔ ہماری دونوں ہتھیلیاں ایک دوسرے کا سہارا لیں گی۔ صرف یہ لوگ اپنے فریب اور جھوٹ کے تاش محلوں میں بیٹھے رہیں گے۔ جب تک ان کا جھوٹ ظاہر نہیں ہوتا۔ یہ لوگ وقتی عزت پائیں گے۔ لیکن اس کے بعد تاریخ ان کی رہنمائی کو کوڑے کے ڈھیر پر پھینک کر اپنی عام رفتار سے آگے بڑھتی جائیگی۔ وہ تاریخ میر اور گھنانند، غالب اور رجا ترینید رکی ملی جلی تاریخ ہوگی۔ اس تاریخ میں یہ بھی ہوں گے۔ بشرطیکہ وقت پر ان میں سچائی کو سمجھنے اور تسلیم کرنے کا حوصلہ جاگ جائے۔ اور سارو کو اپنی خود غرضیوں کے لئے گمراہی کی طرف لے جانے کے بجائے یہ کچھ اچھا اور قابلِ قدر لکھنے پڑھنے میں اپنے وقت کا صحیح استعمال کریں۔

(نو بھارت ٹائمز - ۱۱ر جنوری ۱۹۷۰ء)

اعجاز صدیقی

دَوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا!!

ڈاکٹر دھرم ویر بھارتی اور کرشن چندر سے آگے ـــ

متعدد بہت سے ہندی بھاشا والے لوگ مجھے نہ جانتے ہوں صرف اُن کے علم و اطلاع کے لئے یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں اُردو کا ایک جانا پہچانا ادیب و شاعر ہوں۔ میں نے بیشمار قومی و وطنی نظمیں لکھی ہیں۔ کئی نظموں پر ایوارڈ مل چکے ہیں صحافت اور ادب دونوں سے گہرا اور پُرانا تعلق ہے۔ چالیس سال سے اُردو کا ایک ادبی رسالہ "شاعر" کے نام سے نکالتا ہوں۔ پچھلے دنوں جب "شاعر" کا "غالب نمبر" نکالا تھا تو اُس میں میرے دوست ڈاکٹر دھرم ویر بھارتی کا بھی ایک قابلِ قدر مضمون چھپا تھا، جو اُنہوں نے ہندی میں لکھ کر بھیجا تھا اور اُس کو اُردو رسم الخط میں چھاپا گیا تھا۔ تین چار سال پہلے کی بات ہے۔ پونہ ریڈیو پر ہندی اُردو کے شاعروں کا بلا مشاعرہ ہوا تھا اور جب میں اپنی نظم "نغمۂ وطن" پڑھ کر مائک سے واپس آیا تو وہاں موجود ہندی زبان کے کئی کویوں نے فرطِ جوش و مسرت سے مجھے گلے لگا لیا۔ دیر تک اُس نظم کا ذکر رہا۔ بعض ہندی کویوں نے کہا کہ ہمیں معلوم نہ تھا کہ اُردو میں ایسی زبردست ہندی کی گھلاوٹ اور تاثر رکھنے والی نظمیں ہیں۔ اس واقعے کے شاہد میرے عزیز دوست اور ہندی کے کوی شری اندیور ہیں۔ اس طرح کے بے شمار واقعات علمی و ادبی محفلوں میں ہوتے رہتے ہیں۔ جب حقیقتیں سامنے آتی ہیں اور لاعلمی کے پردے آنکھوں سے اُٹھتے ہیں تو لکھی زبانوں کے الگ الگ ہونے کے باوجود پیار، محبت اور ایکتا کے سوتے بہنے لگتے ہیں۔ جب آزادی کی جنگ لڑی جا رہی تھی، جب گاندھی جی کی شہادت ہوئی تھی، جب پنڈت نہرو دنیا سے اُٹھے تھے، جب لال بہادر شاستری کی جان "تاشقند معاہدے" کی نذر ہوئی تھی، جب چین نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا، جب ہند و پاک جنگ کا ہنگامہ برپا ہوا تھا اور حال ہی میں سوشلزم کی طرف ملک کی رہنمائی کے لئے کیسے تیجے اور اَٹوٹ جذبات کے ساتھ اُردو شاعروں نے اعلیٰ درجہ کی نظمیں لکھیں۔ پُراثر گیت ڈھالے۔ جنگ کے محاذ والے اور ہندوستان کے گلی کوچوں میں ان نظموں اور گیتوں نے عوام و خواص کے قومی و وطنی جذبات کو جس طرح جگایا۔ اس حقیقت کو سب جانتے ہیں۔ اُردو زبان کی ان عظیم خدمات کا کس کو اعتراف نہیں ہے۔

اُردو تحریک سے میرا اپنا تعلق بہت پُرانا اور گہرا ہے۔ ۱۹۶۷ء میں جب یوپی میں تیتھ جی کی وزارت تھی تو پہلی بار اُردو تعلیم کو کمزور بنانے کے لئے ایک نیا CARRICULUM اسکولوں کے لئے بنایا گیا، جس میں نہایت چالاکی سے اُردو اور انگریزی زبانوں کو مضامینِ اختیاری میں رکھ دیا گیا تھا۔ اُسی وقت سب سے پہلے میں نے ہی اس ناانصافی کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ اُس دن سے آج تک اُردو زبان کے مسائل پر برابر پابندی کے ساتھ ایک اچھے اداریے لکھتا رہا ہوں۔ اُتر پردیش، بہار، راجستھان، مدھیہ پردیش اور دِلّی کیجئے کہ پورے

ملک میں اُردو کے ساتھ جو جو ناانصافیاں، اور ظلم و ستم ہوئے ہیں، اُن کی پوری تاریخ میں نے اپنے اداریوں میں جمع کر دی ہے۔ آئندہ نسلیں جب اس تاریخ کو پڑھیں گی تو اُن کی گردنیں شرم و ندامت سے جھک جائیں گی۔ کہ ان کے بزرگوں (یعنی اس بار ۲۲ سال کے اردو مخالف لوگوں) نے اُردو زبان کے ساتھ کتنے ناروا سلوک کئے تھے۔

نو بھارت ٹائمز کی ۱۷ جنوری ۷۰ء کی اشاعت میں ڈاکٹر دھرم ویر بھارتی کا مضمون پڑھ کر میری حیرت اور میرے دُکھ کی انتہا نہ رہی۔ یہ اچھا ہوا کہ کرشن چندر نے خود ۱۴ فروری ۷۰ء کے نو بھارت ٹائمز میں بھارتی جی کے مضمون کا جواب دے دیا۔ مجھے یقین ہے کہ کرشن چندر کی تحریر سے بہت سی غلط فہمیاں دُور ہو گئی ہوں گی۔

بھارتی جی کافی پڑھے لکھے اور شائستہ انسان ہیں۔ یو۔ پی کی اُس تہذیب میں ڈھلے ڈھلائے جو گذشتہ ۲۲ سال میں شعوری تبدیلیوں کی کوشش کے باوجود بدل نہیں سکی ہے۔ اُردو ہندی کے سخت تناؤ اور لہجے میں بناوٹ اپنانے کے باوجود وہ تہذیب مٹی نہیں ہے، جو اُن کے پُرکھوں کی ہے اور جسے ہم اپنی مشترک تہذیب کہتے ہیں۔ زبانوں کی تفریق کی بنا پر اگر ہم یہ اعتراض کریں کہ چوں کہ چوڑی دار پائجامہ اور شیروانی مغلوں کا لباس تھا۔ اس لئے اُسے آزاد ہندوستان کا قومی لباس بنانا ٹھیک نہیں ہوا' یا یہ کہ سر تیج بہادر اور پنڈت موتی لال نہرو اور یوپی کے لاکھوں شرفا نے اس لباس کو اپنا کر غلطی کی تھی، تو سوچئے کہ ہمارا یہ ڈھنگ کسی طرح درست قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کسی ایسے ملک میں جس کی تہذیب بہت پُرانی اور رنگا رنگ ہو، جس کی روایتیں شاندار ہوں۔ جس میں مختلف قومیں اور نسلیں بستی ہوں۔ اُس کی کسی چیز پر کسی خاص فرقے کا "ٹھپّہ" لگا ہوا نہیں ہوتا ہے۔ تہذیب و تمدّن کی جو مشترک اقدار جڑ پکڑ جاتی ہیں وہ اُس ملک کا اپنا حصّہ بن جایا کرتی ہیں۔ اور انہیں مٹانے کا خیال ملک، قوم اور تہذیب سے غدّاری کے مترادف ہوتا ہے۔

ہندوستان کی تاریخ میں اُس کی زبانوں کی تاریخ بڑی اہم ہے۔ لسانی تاریخ کا کوئی طالب علم اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ اس ملک میں لہجوں اور شبدوں کے اختلاف سے بولی جانے والی ملکی اور غیر ملکی بہت سی بانوں کے تال میل سے جو زبان شمال اور جنوب میں بنی وہ اُردو ہی تھی۔ شروع میں اس کا نام کچھ بھی رہا ہو۔ لیکن یہ طے شدہ بات ہے کہ مغلوں کی زبان فارسی سے چھٹکارا حاصل کرنے کیلئے ہندو اور مسلمان دونوں نے اسے گلے لگایا۔ سنسکرت مُردہ اور محدود زبان بن کر رہ گئی تھی جو مٹھی بھر پنڈتوں یا اُونچی ذات کے براہمنوں کی میراث سمجھی جاتی تھی۔ عوام کے لئے اُس کا سیکھنا اور بولنا تک پاپ سمجھا جاتا تھا۔ ہندو اور مسلمان صُوفیا نے اس بات کو سختی سے محسوس کیا اور ایک ایسی زبان کو مذہبی اور رُوحانی تعلیم اور اپنے پیغام کے لئے چُنا جس کا مزاج خالص ہندوستانی تھا' جس کی طرف عوام کھنچ رہے تھے۔ جس میں فارسی، تُرکی، عربی، سنسکرت اور ہندوستان کی بہت سی علاقائی زبانوں کے الفاظ خود بخود آتے گئے۔ یہ نئی زبان [illegible] R ہوتی گئی۔ اس کی قواعد بھی بن گئی۔ الفاظ شُستہ ہونے لگے۔ اپنی سادگی کی وجہ سے یہ زبان دیہاتوں، قصبوں اور شہروں کے بازاروں اور گلی کوچوں میں لہجہ اور تلفّظ کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ بولی اور سمجھی جانے لگی' اس میں فارسی اور سنسکرت زبانوں کی کتابوں کے ترجمے ہونے لگے۔ اس کا اپنا ادبی اسٹائل بھی بنتا گیا۔ قواعد GRAMMAR بھی بن گئی۔ ملک کے کسی گوشے سے نہ اس کے خلاف کوئی آواز اٹھی، نہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے اس میں کوئی تفریق کی بات محسوس کی۔ اس سلسلے میں تاریخی حوالے دینے سے یہ مضمون بہت طویل ہو جائے گا۔ میں نے اُردو زبان کے صرف ایک پس منظر پیش کر دیا ہے۔ برطانوی دَورِ حکومت میں انگریزی کو پھیلانے کے ساتھ ساتھ تمام سرکاری اور غیر سرکاری کاموں کیلئے اُردو ہی کو منتخب کیا گیا۔ انگریزوں کو اُردو سکھانے کیلئے رومن رسم الخط میں کتابیں لکھوائی گئیں۔ اُس دَور کی تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ "ہندی نام" کی کوئی زبان سکھانے یا اس میں کام کرنے کے انگریزوں کو احکامات ملے

ہوں۔ مگر ایک وقت وہ آیا جب خود انگریزوں نے سیاسی مصلحتوں کے تحت ہندو اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوانے کیلئے دیوناگری رسم الخط میں تھوڑی بہت سنسکرت آمیز زبان لکھنے پڑھنے کی طرف لوگوں کو دھیان دلایا۔ اردو کے ساتھ ساتھ ہندی کے چھوٹے چھوٹے قاعدے پاٹھ شالاؤں میں بچوں کو پڑھائے جانے لگے۔ میں نے بھی ۱۹۱۶ء میں ٹونڈلہ ضلع آگرہ کی ایک پاٹھ شالہ میں جہاں ہندو اور مسلمان دونوں کے بچے ایک ساتھ تعلیم پاتے تھے، وہ ہندی قاعدہ پڑھا تھا۔ ۱۹۲۲ء میں جب میں آگرہ کے ایک ہائی اسکول میں تھا تو بلا تفریق مذہب و ملت سب بچے اردو پڑھتے تھے۔ اگر کوئی بچہ ہندی بھی سیکھنا چاہتا تھا تو اُس کے لئے ہفتہ میں دو بار ہندی کلاس ہوتی تھی۔ عام طور پر طلبا، اردو ہی میں تمام پرچوں کے جوابات دیا کرتے تھے۔ صرف جامیٹری اور الجبرا یا حساب کے پرچے انگریزی میں آیا کرتے تھے۔ سائنس کی انگریزی اصطلاحوں کا مطلب سب بچوں کو اُردو میں بتایا جاتا تھا۔ ہندی کا ثانوی زبان (SECOND LANGUAGE) کا پرچہ اُن طالب علموں کیلئے آیا کرتا تھا جو فارسی یا عربی کی جگہ ہندی زبان لے لیا کرتے تھے۔ میں سو دو سو سال کی تاریخ کی طرف "نو بھارت ٹائمز" کے پڑھنے والوں کو نہیں لیجانا چاہتا۔ اپنی ۵۹ سالہ عمر میں تھوڑا بہت جو کچھ دیکھا، جو کچھ سُنا، اگر وہ واقعات آج پوری سچائی کے ساتھ ملک کے ہندوؤں اور مسلمانوں، خصوصاً نئی نسل کے کانوں تک پہونچ جائیں تو وہ جھوم اُٹھیں، ملک سے تعصبات کے سارے بادل چھٹ جائیں: "رام لیلا" ہم دیکھنے جایا کرتے تھے۔ ہولی کا رنگ ہم پر ڈالا جاتا تھا۔ دیوالی پر کھیلیں، بتاشے، ٹیسو اور جھانجیں مسلمانوں کے یہاں آیا کرتی تھیں۔ ہندو محرم اِس طرح مناتے تھے جیسے امام حسینؓ اُن ہی کے ہوں۔ غرض کیا کیا بتاؤں۔!

افسوس کہ انگریزوں نے جو پھوٹ ڈالی تھی، آج ہم انگریزی دور سے بھی زیادہ اُس پھوٹ کا شکار ہیں اور اپنے کرتوتوں پر فخر کرتے ہیں۔ آج کے بڑھے ہوئے علم اور عقل کے زمانے میں ہمارے ملک میں جیسی غیر منطقی، غیر نفسیاتی، غیر حقیقی اور کم عقلی کی باتیں ہو رہی ہیں اُن پر رونا آتا ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ ہندی پریمیوں کو نہ بدیسی زبان انگریزی سے کوئی نفرت ہے نہ ملک کی دوسری تیرہ زبانوں سے۔ اگر ہے تو صرف اُردو زبان سے اور اِس سلسلے میں جب "کیوں؟" کا ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہمارے سامنے آتا ہے تو اِس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ تقسیم کے بعد اُردو "پاکستان" چلی گئی۔ کتنی بچکانہ اور غیر حقیقت پسندانہ بات ہے یہ!۔ اگر اردو صرف مسلمانوں ہی کی زبان ہوتی اور چند کروڑ مسلمانوں کے پاکستان چلے جانے کے بعد، ہندوستان کو اپنا ملک سمجھ کر یہاں رہ جانے والے کروڑوں مسلمان اُردو کو اپنی زبان بناتے، تو بھی انصاف کا تقاضہ تھا کہ اُردو کی طرح حفاظت کی جاتی۔ لیکن یہاں تو معاملہ یہ ہے کہ ہندوستان میں اُردو، ہندوؤں، سکھوں، پارسیوں اور عیسائیوں وغیرہ کی بھی زبان ہے۔ (مسلمانوں کی مذہبی زبان عربی اور ہندوؤں کی سنسکرت ہے) کیسی عجیب بات ہے کہ ملک تقسیم ہوتا ہے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں وغیرہ کے لیڈروں کے متفقہ فیصلے سے۔ اِس میں ہندی، بنگالی، گجراتی، مراٹھی، تلگو، ٹمل، پنجابی، غرض سب ہی زبانوں اور صوبوں کے لیڈر، سب کانگریسی اور مسلم لیگی، کمیونسٹ اور سوشلسٹ، انگریزوں کے بٹوارے کے ایوارڈ (AWARD) کو قبول کر لیتے ہیں اور جب سب کے باہمی سمجھوتے سے ملک تقسیم ہو جاتا ہے تو چھری اُردو کے گلے پر چلتی ہے۔!

اگر ہندی والوں کو تقسیم کا بدلا لینا ہے تو وہ سب زبانوں سے کیوں نہیں لیتے! تقسیم کے بعد "لسانی صوبے" بنانے کا بہت سوچا سمجھا منصوبہ اِسی لئے عمل میں لایا گیا کہ اُردو کو بکھیر دیا جائے اور اُسے کوئی صوبہ نہ مل سکے۔ اُردو پورے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی اور اب بھی پھیلی ہوئی ہے۔ اُردو تو چھ سات کروڑ لوگوں کی زبان ہے۔ لیکن دوسری صوبائی زبانیں چند لاکھ لوگوں تک محدود ہیں۔ اُن زبانوں کو ہندی زبان میں ضم کرنے کی بات کیوں نہیں ہوتی؟۔ انہیں وہاں لسانی صوبے حکومت کیلئے دردِ سر بنے ہوئے ہیں۔

بھارتی جی کا مضمون واقعی بہت سخت ہے۔ الفاظ کے لاکھ پردے ڈالنے کے باوجود اُن کی "نیت" کا اُس سے صاف پتہ

چل رہا ہے۔ اگر گفتگو علمی اور تاریخی سطح پر ہو، حقائق کی روشنی میں ہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔ چند مفروضوں کو سامنے رکھ کر تو کوئی سچائی کی بات نہیں ہو سکتی۔ بھارتی جی کے مضمون سے ایک طرف تو "نو بھارت ٹائمز" کے پڑھنے والوں میں اُردو زبان، اُردو کنونشن اور اُردو کے چند ادیبوں کے سلسلے میں بدظنی پیدا ہوئی۔ دوسری طرف اُردو والوں کو اس سے سخت صدمہ پہنچا۔ نہ اُن کے مضمون سے مفاہمت کا کوئی پہلو نکلا، نہ ملک کی مکدّر فضا کو درست کرنے کی کوئی بات پیدا ہوتی۔ ملک میں پیدا شدہ بے شمار تناؤں میں بھارتی جی نے ایک اور شدید تناؤ پیدا کر دیا۔ بھارتی جی کے پورے مضمون کی اہم باتوں کا خلاصہ یہ ہے۔

"ایک قوم جو مختلف تاریخی وجوہ کی بنا پر بڑی نازک حالت میں آ پڑی ہے، جو پہلے سے متفکر اور مشتعل ہے۔ اُسے اُردو کنونشن نے اور بھی مشتعل اور متفکر کر دیا گیا ہے۔ وہ اُردو کنونشن کو سیاسی سازش، فرقہ وارانہ تنگ نظری، تناؤ اور جھگڑے والی بات بتاتے ہیں۔ اُن کے خیال میں پچھلے بیس سال اور اگلے بیس سو سالوں میں بھی اس سے اُردو کا کوئی فائدہ ہونے نہیں جا رہا ہے۔ اُنہوں نے پوچھا ہے کہ کیا رسم الخط کا سوال ادب کے مسائل سے زیادہ اہم ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ دلّی کے آس پاس بولی جانے والی زبان چاہے دیوناگری لپی میں لکھی جائے یا فارسی رسم الخط میں، اس سے زبان نہیں بدل جاتی۔ اُنہوں نے "پدماوت" کا حوالہ دیکر یہ لالچ بھی دلایا ہے کہ جس طرح دیوناگری میں چھپ کر اُسے شہرت ملی۔ میر اور غالب کو بھی ایسا ہی مقام اُردو کا رسم الخط بدل دینے سے مل سکتا ہے۔ اُن کے نزدیک اُردو کو فرقہ وارانہ تنگ دلی اور رسم الخط کی حدبندی سے آزاد کرانا ضروری ہے تاکہ اُردو ٹھیک طور سے پھل پھول سکے۔ اردو کے لئے علاقائی زبان کی مانگ کا دائرہ بھارتی جی کے خیال میں خطرناک حدوں کو چھوتا ہے، اس سے نئے تناؤ پیدا ہوں گے۔ چند ہندی ادیبوں اور شاعروں کے نام لے کر اُنہوں نے لکھا ہے کہ یہ سب اُردو کو غیر فرقہ وارانہ، آسان اور قابلِ فہم بنا کر اس کا سواگت کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن اُردو والے اس سواگت کا جواب فرقہ پرستی اور REACTIO NIST جذبات سے دیتے ہیں" وغیرہ وغیرہ۔

بھارتی جی نے اپنے مضمون میں اس طرح کی جتنی باتیں کہی ہیں وہ سب یکطرفہ اور حقیقتوں سے بالکل کٹی ہوئی ہیں۔ نہ ان باتوں میں سچائی ہے، نہ کوئی منطقی استدلال ہے اور نہ کسی قسم کا کوئی قانونی یا اخلاقی جواز۔ بھارتی جی کی تحریر سے بالکل واضح ہے کہ وہ قوم سے مراد مسلمان لیتے ہیں اور اُن کے خیال میں یہ بڑی نازک حالت میں ہیں، مشتعل اور متفکر ہیں۔ اُن سے گذارش ہے کہ اگر آپ کو بات کرنا ہے تو صرف اُردو کی بات کیجئے، جس میں تمام مذاہب کے لوگ شامل ہیں۔ درپردہ مسلمانوں کو نہ گھسیٹئے۔ مجھے یہاں مسلمانوں کی وکالت نہیں کرنی ہے، لیکن جو عام خیال ہے اُسے دہرا دینا چاہتا ہوں کہ ہندوستانی مسلمان پیہم حق تلفیوں اور فرقہ پرستوں کی دہشت پسندیوں سے متفکر ضرور ہے، لیکن وہ مشتعل ہرگز نہیں ہے اور نہ اپنے مستقبل سے مایوس۔ وہ قومی دھارے سے بھی کٹا ہوا نہیں ہے۔ اُسے اسی ملک میں جینا اور مرنا ہے، وہ ہندوستان کو اپنا ملک سمجھتا ہے اور اسکے سرد و گرم میں برابر کا شریک ہے۔

بات اُردو اور اُردو کنونشن کی ہو رہی تھی۔ بھارتی جی بتائیں کہ گذشتہ بائیس سال میں اُردو والوں نے کب کب اشتعال پسندی سے کام لیا ہے! اگر اشتعال پسندی سے کام لیا جاتا تو اب تک اردو کا مسئلہ کبھی کا حل ہو چکا ہوتا۔ لیکن اُردو والوں نے اپنے تاریخی صبر و ضبط کا ثبوت دیا ہے۔ یہ آئینی اور پر امن طریقے ہی سے اُردو کے حقوق حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ ہاں اگر اس طرح کے چند مضامین اور لکھے گئے جیسا مضمون بھارتی جی نے لکھا ہے، تو ہو سکتا ہے کہ اُردو والوں میں اشتعال پیدا ہو جائے اور ایک ایسی "لسانی مہابھارت" چھڑ جائے جو ماضی کے تمام واقعات کو گرد کر دے۔ لیکن مجھے پورا

پورا یقین ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ اب اردو کے جائز مطالبات کے ساتھ ہندوستان کی سب ہی زبانوں کے لاکھوں عوام دانشوروں اور ادیبوں کی ہمدردیاں شامل ہو گئی ہیں اور غالباً بھارتی جی نے ابھی نئے موڑ سے گھبرا کر یہ مضمون لکھا ہے۔ کاش بھارتی جی بمبئی اردو کنونشن کی نشستوں میں خود شریک ہوتے اور اردو کی مانگ میں اردو والوں کا ساتھ دیتے۔ ملک کی دوسری بڑی زبانوں کے ادیبوں اور دانشوروں نے اردو کے خلاف کی جانے والی حق تلفیوں پر اردو کنونشن میں سخت رنج و غم کا اظہار کیا۔ اردو کو اس کے رسم الخط کے ساتھ اس ملک کی نہایت قیمتی اور بڑی زبان بتایا۔ یہ انکشاف بھی کر دوں کہ جب دوسری زبانوں کے ادیبوں کے سامنے اردو کے مطالبے کو چند الفاظ کے الٹ پھیر سے کچھ نرم کرنے کی بات ہو رہی تھی تو خود ہندی زبان کے نمائندوں نے اردو والوں کو شرم دلائی اور کہا کہ وہ اگر اتنے ڈریں اور دبیں گے تو کبھی اپنا حق نہیں لے سکتے۔ سندھی زبان کے ایک سرگرم نمائندے نے کہا کہ اردو تو پورے ملک میں پھیلی ہوئی کروڑوں لوگوں کی زبان ہے، مگر آپ لوگ اب تک اس کا حق نہیں لے سکے، ہم سندھی والوں نے "عدالت" میں سندھی زبان کا مقدمہ دائر کر کے اسے پندرھویں قومی زبان بنوالیا۔ حیرت کی بات ہے کہ جس کنونشن میں ہر زبان کا ایک سے ایک بڑا دانشور شریک ہوا ہو۔ جہاں علم، عقل، رواداری، پیار، محبت اور یک جہتی کی فضا میں اردو کے مسئلے پر غور کیا گیا ہو، اُسے بھارتی جی سیاسی سازش، فرقہ وارانہ تنگ نظری، تناؤ اور جھگڑے والی بات بتاتے ہیں۔!۔ دوسری طرف کنونشن میں شریک ہونے والے بڑی زبانوں کے چند صاف ذہن اور غیر متعصب دانشوروں کی رایوں کے اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔

ڈاکٹر ہری کرشن مہتاب

"ملک کے دستور کی تیاری کے وقت اردو کو بھی اس کا جائز مقام دیا گیا۔ بعد میں اسے نظر انداز کر دیا گیا۔ اردو اس ملک کے کروڑوں باشندوں کے بولنے، سمجھنے اور لکھنے پڑھنے کی زبان ہے۔ حکومت کو اس کی حیثیت منظور کرنا چاہیئے۔ صرف زبانی ہمدردی اور یقین دہانی سے کام نہیں چلے گا۔"

ڈاکٹر نہار رنجن رے

"اردو نہ صرف اظہار و تبادلۂ خیال کا بہترین ذریعہ ہے بلکہ ملک کے کروڑوں باشندوں کے دلی جذبات اور خیالات کی ترجمانی بھی کرتی ہے۔ اس زبان میں ادب اور شاعری کا بہت بڑا اور بیش قیمت ذخیرہ ہے۔
یہ زبان جس طرح شمالی ہند میں بولی اور سمجھی جاتی ہے، اسی طرح جنوبی اور مغربی ہند میں بھی اس کا یہی حال ہے۔ اردو کا رسم الخط نہایت خوبصورت ہے۔ ہمارے ملک کی یک جہتی اور اتحاد کے لئے ضروری ہے کہ اس عوامی زبان کو اور ترقی دی جائے۔"

گیانی گرمکھ سنگھ مسافر

"اردو قومی یک جہتی کا ایک بہت بڑا ذریعہ اور علامت ہے۔ جذباتی یک جہتی، فرقہ وارانہ دوستی اور یکجائی کے لئے اردو شاعروں نے جتنا کام کیا ہے، اتنا کسی دوسری زبان کے شاعروں نے نہیں کیا۔ اردو والے اگر پر جوش طریقہ پر اپنے مطالبے کو آگے بڑھائیں تو یہ پورے ملک کی خدمت ہوگی۔ ہندی کے حامیوں نے دوسری زبانوں کے ساتھ بدسلوکی کی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہندی الگ تھلگ ہو کر رہ گئی ہے۔ حامیانِ اردو اپنے مطالبات پیش کرنے میں شرم و حجاب سے کام نہ لیں۔"

ڈاکٹر ملک راج آنند

ملک سماجی انقلاب سے دو چار ہو رہا ہے۔ اس میں ناانصافیوں کی تلافی کی جائے گی اور اُردو زبان کو اُس کا جائز مقام دیا جائے گا۔

شیودان سنگھ چوہان (دہلی)

ہندی کے بہت بڑے نقاد، مصنف اور منتی پریم چند کے رسالہ کے ایڈیٹر نے کہا: اُردو کے مطالبات کو منظور ہونا چاہیئے۔ کیوں کہ یہ ایک ملک گیر زبان ہے۔ ہندی کے ساتھ ساتھ اِسے بھی رابطہ کی زبان قرار دیا جانا چاہیئے۔ یو پی کے سہ لسانی فارمولے میں اُردو، ہندی اور انگریزی کو شامل کرنا چاہیئے۔ سنسکرت کو سہ لسانی فارمولے میں شامل کرکے بے ایمانی کی گئی ہے۔ کیوں کہ یہ ایک مُردہ زبان ہے۔ اُردو والوں کی یہ مانگیں کم سے کم ہیں۔ اُردو کو بہار دہلی، پنجاب اور یوپی کے علاوہ اُن ریاستوں میں بھی فروغ ملنا چاہیئے، جہاں اس کے سمجھنے اور بولنے والے لوگ موجود ہیں۔ اُردو اور ہندی کے مسئلے کو فرقہ پرست لوگوں نے ہوا دی ہے۔

ٹی وینکٹ رامیّہ

تیلگو زبان کے مشہور ادیب و شاعر اور نقاد۔ ایڈیٹر ماہنامہ "ابھی دَیا" نے اس طرح اظہارِ خیال کیا: میں اُردو کنونشن میں محض اس لئے شریک ہوا ہوں کہ اُردو آندھرا پردیش میں بولی جاتی ہے اور ہمارے صوبہ کی نہایت مقبول زبان ہے۔ ہمارے بہت سے ادیب و شاعر تیلگو زبان کے ساتھ ساتھ اُردو میں بھی لکھا کرتے ہیں۔ مرزا غالب کا دیوان تیلگو میں ترجمہ کیا گیا جو نہایت مقبول ہوا۔ یہاں تک کہ اُس کے کئی ایڈیشن بار بار چھپے۔ اُردو ہمارے صوبے میں دوسرا مقام رکھتی ہے۔ اسے قانونی طور پر دوسری زبان کا درجہ حاصل ہے۔

پروفیسر ستیّہ رمیّہ

کنڑ زبان کے کہنہ مشق نقاد اور شاعر، میسور یونیورسٹی کے ریٹائرڈ پروفیسر نے کہا: اُردو ایک حسین زبان ہے، جس سے ہر صحیح الدماغ انسان محبت کرے گا۔ اُردو ہر لحاظ سے ایک مکمل زبان ہے، جس نے کسی بھی تمدنی اور تہذیبی گوشے کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود تمام مشکلات کے وہ اب بھی زندہ ہے اور اسے زندہ رکھنے کیلئے ہمیں اُن تمام ذرائع کا استعمال کرنا ہوگا جو ہمارے اختیار میں ہیں۔ میں اُردو کے مطالبے کو منصفانہ اور حق بجانب سمجھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ اُس کو تمام آئینی حقوق ملیں۔

رامائن سنگھ (بہار)

جنگِ آزادی کے پُرانے سپاہی۔ گاندھی جی کے ساتھ کام کئے ہوئے اور فارورڈ بلاک پارٹی کے جنرل سکریٹری نے کہا: مجھے حیرت ہے کہ اُردو والے اب تک سوتے رہے ہیں؟ اُنہوں نے پہلے ہی اس قسم کا کنونشن کیوں نہیں بلایا۔ اگر سارے اُردو والے اُردو کے حق میں ہار کر بیٹھ جائیں۔ تب بھی میں خود اُردو کے لئے لڑتا رہوں گا کیوں کہ میں اسے جائز اور حق بجانب سمجھتا ہوں۔ ہندی والے اُردو کی مخالفت کرتے ہیں لیکن اُردو والوں نے ہندی کی مخالفت کبھی نہیں کی۔ جیسے کہ آندھرا، بنگال، مدراس، کیرالا اور دوسرے غیر ہندی علاقوں کے

شاعر ممبئی

ہندوؤں نے خود ہندی زبان کی مخالفت کی اور اب بھی کر رہے ہیں:

پروفیسر عطر سنگھ

دہلی یونیورسٹی میں جدید ہندوستانی زبانوں کے شعبے میں کام کرنے والے پنجابی زبان کے نقاد۔ اُردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں لکھنے والے مصنف نے یوں کہا: "یہ سب برہمنی سیاست کا کھیل ہے، جس نے اُردو، پنجابی اور ہندی کے مسئلے کو ہوا دی ہے۔ دہلی سے آج بھی سب سے زیادہ اُردو اخبارات و جرائد نکلتے ہیں۔ ملک میں برہمن ازم کا غلبہ آج بھی ہے، جو ہندی کو سارے ملک کی زبان بنا کر باقی تمام زبانوں کو یک لخت ختم کر دینے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو گا۔ اگر آج اُردو کے لئے جنگ نہ کی گئی تو پھر پنجابی زبان کیونکر برقرار رہ سکتی ہے۔ اسی نکتہ کے پیشِ نظر ہم کنونشن میں شریک ہو کر اسے کامیاب بنانا چاہتے ہیں۔"

مہاراشٹر اور گجرات کی دونوں بڑی زبانوں مراٹھی اور گجراتی، ان کے علاوہ سندھی زبان کے چوٹی کے ادیبوں، دانشوروں، نقادوں اور شاعروں نے بھی بڑی تعداد میں اُردو کے مطالبے کی حمایت میں اظہارِ خیال کیا اور اپنے دستخط کئے۔ طوالت کے خوف سے زیادہ رائیں نہیں دی جا رہی ہیں۔ بمبئی اُردو کنونشن میں نہ صرف ملک کی دوسری بڑی زبانوں کے دانشور اور ادیب آئے تھے بلکہ تمام صوبوں سے بڑی تعداد میں اُردو دوست آئے تھے۔ ان میں فخر الدین علی احمد، یونس سلیم، غلام محمد صادق، جسٹس آنند نرائن مُلّا، حیات اللہ انصاری، سجاد ظہیر، پروفیسر محمد مجیب وائس چانسلر جامعہ ملیہ، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر احتشام حسین، حبیب الرحمٰن، عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست حیدر آباد، ڈاکٹر سید محمد حسنین وغیرہ کے نام سر فہرست ہیں۔

اُردو رسم الخط کے متعلق کرشن چندر اپنے مضمون میں کئی بنیادی باتیں کہہ چکے ہیں۔ مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اگر کوئی اُردو ادیب یا شاعر، اُردو کے لئے "دیوناگری رسم الخط" اختیار کر لینے کی رائے دیتا ہے تو یہ اُس کی اپنی ذاتی رائے ہو گی اور وہ خود اُردو کو دیوناگری میں لکھ سکتا ہے۔ اس کے لئے کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ لیکن اسے اُردو والوں کی اجتماعی رائے نہیں سمجھا جائے۔ رسم الخط کے سلسلے میں پورے ہندوستان کے کئی سو ذمہ دارانِ اُردو، کروڑوں اُردو والوں کی طرف سے بار ہا اس کا اعلان کر چکے ہیں کہ اُردو فارسی رسم الخط ہی کے ساتھ اس ملک کی قومی زبان رہے گی۔ یہی اندراج ملک کے دستور میں بھی ہے۔ اُردو زبان کا حُسن، اُس کی صحت اور زندگی اُس کے اپنے مخصوص رسم الخط ہی کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہ رسم الخط کسی حالت میں نہیں بدلا جائے گا۔ البتہ اس پر کوئی پابندی نہیں کہ اُردو شعر و ادب کو ہندی جاننے والوں کے لئے دیوناگری رسم الخط میں بھی لکھا جائے۔ مجھے بھارتی جی اور ہندی زبان کے دوسرے مقتدر ادیبوں کی اس رائے سے سو فیصدی اتفاق ہے کہ ہندی کورس کی کتابوں میں اُردو کے ادیبوں اور شاعروں کو شامل کیا جائے۔ اور اُردو کورس کی کتابوں میں ہندی ادیبوں اور شاعروں کو۔ اُردو رسالوں میں تو اب عام طور پر ہندی اور ملک کی دوسری زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات ترجمہ کرا کے شائع کی جاتی ہیں۔

یہ ایک قطعاً غیر نفسیاتی بات ہے کہ ایک مکمل زبان جو کئی سو سال سے ایک رسم الخط میں لکھی جا رہی ہے، اُسے کسی ہیر پھیر یا سیاست کے تحت بدل دیا جائے۔ کوئی چھوٹی موٹی زبان بھی اس مشورے کو قبول نہیں کر سکتی۔ اُردو تو ایک بہت بڑی زبان ہے، جو پوری دنیا میں پھیل چکی ہے اور دنیا کی بڑی زبانوں میں اعداد و شمار کے اعتبار سے اس کا نمبر چھٹا ہے۔ اُردو کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ بیرونی ممالک کی کئی یونیورسٹیوں میں بڑی تعداد میں طلباً

اُردو پڑھ رہے ہیں۔ لندن سے کئی اُردو کے اخبارات اور رسالے جاری ہو چکے ہیں۔ اُردو رسم الخط مکمل، خوبصورت اور نہایت آسان ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ بیحد مختصر ہے۔ اُلٹے ہاتھ کی طرف سے لکھی جانے والی زبانوں کی دو تین سطریں اگر اُردو رسم الخط میں لکھی جائیں تو وہ صرف ایک سطر میں آجائیں گی۔ لفظوں اور لکھاوٹ کے اختصار، عظمت اور اضافتوں کی وجہ سے اُردو میں زبردست معنویت بڑھ جاتی ہے۔ اس کے ادب اور شاعری میں معنی کی ایک دُنیا چھپی ہوتی ہے۔ ہندی زبان کے دانشور میری اس بات پر غور فرمائیں اور خود اس کا تجزیہ کریں تو انہیں ہرگز اس سے اختلاف نہ ہوگا۔ اُردو کو کسی دوسرے رسم الخط میں لکھنے کے معنی اُردو کی خصوصیات کو ختم کر دینا ہے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ہندوستان میں اُردو زبان دیوناگری رسم الخط میں لکھی جائے اور دنیا کے دوسرے ممالک میں فارسی رسم الخط میں۔ اگر اُردو اور ہندی کا رسم الخط ایک کر دیا جائے تو اُس کی پہچان کیا ہوگی ؟ ۔ شائد جواب میں یہ کہا جائے کہ جس میں فارسی عربی کے الفاظ ہوں گے، وہ اُردو ہوگی اور جس میں سنسکرت وغیرہ کے الفاظ ہوں گے وہ ہندی ہوگی۔ تو میں اس سلسلے میں عرض کروں گا کہ اُردو کے ساتھ ہی سب سے بڑی دشواری ہے کہ یہ ایک "کھچڑی" زبان ہے۔ اس میں فارسی، عربی کے علاوہ سنسکرت، ہندی، انگریزی اور نہ جانے کن کن زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔ اس میں ہر زبان کے الفاظ کو قبول کر لینے اور اپنے یہاں موقع محل کے اعتبار سے بامعنی بنا لینے کی صلاحیت ہے۔ اس کی اسی خوبی نے اسے شمال سے جنوب تک، فلم سے ادب اور آرٹ تک، سبھاؤں اور کلبوں، کوچوں اور بازاروں میں مقبول بنا رکھا ہے۔ بھارتی ہی خود جانتے ہیں کہ بمبئی میں مہاراشٹر کا دارالسلطنت ہونے کے باوجود جو عام زبان بولی جاتی ہے وہ کیا ہے؟ یہاں ہر جگہ اور ہر موقع پر ہر صوبہ کا آدمی اس اُردو کو آسانی کے ساتھ سمجھ لیتا ہے۔ ایک اور بھی دشواری ہے کہ دیوناگری رسم الخط میں اُردو زبان کے بے شمار الفاظ کا صحیح تلفظ مشکل ہوگا۔ اس میں بے اندازہ مرکب الفاظ ہیں۔ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کی جتنی زبانیں اُلٹے ہاتھ کی طرف سے لکھی جاتی ہیں ان کی لکھاوٹ میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہے۔ انگریزی زبان کو دیوناگری میں لکھ کر دیکھئے۔ کنڑ، ملیالم، تلگو اور تمل کو ہندی رسم الخط میں لکھئے، آپ کو دشواری کا اندازہ ہو جائے گا۔

اگر اُردو والے یہ مطالبہ کریں کہ ہندی والے دیوناگری رسم الخط کو چھوڑ کر فارسی رسم الخط اپنا لیں تو کیا وہ اس مطالبہ کو قبول کر لیں گے؟ حالانکہ ہندی الفاظ کو اُردو میں لکھنا بیحد آسان ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ اس بات کو ہندی والے قبول نہیں کریں گے اور یہ مطالبہ اسے غلط بھی ہوگا۔ یہ جو اُردو کا رسم الخط بدلنے کی کبھی کبھی آوازیں اُٹھتی ہیں تو ان کے پیچھے اُردو زبان کو ختم کر دینے کا جذبہ ہوتا ہے، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

"نہ رہے گا بانس، نہ بجے گی بانسری"

جب ہندوستان کے دستور میں ذکر شدہ قومی زبانوں کے بولنے والوں کی تعداد شماری ہوتی ہے۔ تو ہندی بولنے والے لوگوں کی تعداد کتنی کم رہ جاتی ہے۔ اس کے متعلق ہندی کے پریمی اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہندی کو مقبول بنانے کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے، نہ کہ دوسری زبانوں کے حقوق کو چھین لینے کی۔ ہندی زبان سے وہ ہندوستانیت ختم ہو کر رہ گئی ہے، جسے مہاتما گاندھی چاہتے تھے۔ ہندی زبان کو خوبصورت اور آسان بنانے کی طرف توجہ دینی چاہیئے۔ اس میں جو مصنوعی پن پیدا ہو گیا ہے، اُسے دُور کرنا چاہیئے۔ لمبے، مشکل اور نامانوس بے جوڑ شبدوں کی جگہ آسان اور مختصر الفاظ اپنانے چاہئیں۔ بڑی حیرت ہوئی جب اُردو کنونشن میں شریمتی اندرا گاندھی نے یہ کہا کہ

"گجرال صاحب یہاں موجود ہیں۔ میں ان کے ریڈیو کی زبان نہیں سمجھ پاتی"

اندرا جی کی تقریر سے صاف جھلک رہا تھا کہ وہ "ہندی فرقہ پرستی" سے بیحد خائف ہیں اور بے بس ہیں۔ میں نہایت نیک نیتی سے یہ بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جب تک ہندی والے اس فضا کو نہیں بدلیں گے، اُنہیں سوائے نقصان کے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ یہ تو اُردو اور اُردو والوں کا بڑا ظرف تھا کہ اُنہوں نے سب کچھ برداشت کر لیا، لیکن چونکہ اُردو ایک فطری اور خالص ہندوستانی زبان ہے۔ اس لئے وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔ مگر دو دُکھ موہے تو "ہندی سامراج" کو برداشت نہیں کر سکتے۔ پنڈت نہرو کو زندگی بھر یہی شکایت رہی کہ وہ ہندی زبان نہیں سمجھ پاتے۔ حالانکہ اُن کی زندگی میں ہندی اتنی سخت نہ تھی۔ جتنی اُن کے آنکھیں موندتے ہی کر دی گئی۔ یہ ایک دوستانہ مشورہ ہے، لیکن مجھے اس پر کوئی اصرار نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ ہندی زبان کے وہ تمام ادیب اور شاعر جن کے نام اس بحث میں آئے ہیں، اُردو کے ساتھ دوستی اور یگانگت کا ہاتھ بڑھائیں۔ ہندی کے صوبوں میں ایسی فضا پیدا کریں کہ ہندی پڑھنے والے اُردو بھی پڑھیں۔ "نو بھارت ٹائمز" کے پڑھنے والوں کی اطلاع کے لئے یہ بات بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے تمام ان گھروں کے بچے جن کی مادری زبان اُردو ہے، چاہے وہ اتر پردیش میں ہوں یا بہار میں، مدھیہ پردیش میں یا راجستھان میں، مہاراشٹر میں ہوں یا پنجاب میں۔ ایک مضمون کی حیثیت سے ہندی زبان پڑھ چکے ہیں، پڑھ رہے ہیں اور آئندہ بھی پڑھیں گے۔ اُردو کے کسی ایک فرد کو بھی ہندی زبان سے چڑ نہیں ہے۔ زبانوں کا رشتہ مذہب سے جوڑنا انتہائی حماقت ہے اگر ایسا ہوتا تو انگریزی، فرانسیسی، جرمن، روسی، عربی، فارسی اور دنیا کی بہت سی دوسری زبانیں غیر ملکی اور غیر مذہب والے نہ سیکھتے۔ علم جہاں بھی ملے اور زبان جس کی بھی ہو، اُسے سیکھنا چاہیئے۔

جہاں تک اُردو کو بولنے، لکھنے اور پڑھنے والوں کی تعداد کے اعتبار سے کئی صوبوں میں اُسے علاقائی زبان بنانے کا سوال ہے، تو اس پر اعتراض یا اس سے بھڑکنے اور اسے خطرناک بتانے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ دستور میں ہندوستان کی قومی زبانوں کو علاقائی حیثیت سے سرکاری یا ثانوی زبان بنانے کی جو دفعہ رکھی گئی ہے اُردو والے اُسی کی مانگ کرتے آئے ہیں۔ یا تو دستور کو جھٹلا دیجئے یا پھر اُردو کے مطالبے کو مان لیجئے۔ بھارت کے دستور کی رُو سے آبادی کی مناسبت سے دوسرے نمبر کی سب سے زیادہ رائج زبان، کسی بھی ریاست کی دوسری علاقائی زبان قرار دی جا سکتی ہے۔ جیسے تعلیم اور انتظامیہ کے تمام کاموں کی سہولتیں ملنی چاہئیں۔ دہلی۔ اتر پردیش، بہار، راجستھان مدھیہ پردیش اور کئی دوسری ریاستوں میں اُردو کا دوسرا نمبر ہے۔ اس لئے اسے دوسری علاقائی زبان کا درجہ حاصل کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔

اتر پردیش میں اُردو کا جو سرکاری بورڈ بنا ہے۔ اُس کے جلسے میں ریاست کے سابق وزیر اعلیٰ شری سی۔ بی گپتا نے اس بات کا انکشاف کیا کہ سہ لسانی فارمولے کے تحت اب طلبا، انگریزی اور ہندی کے علاوہ اُردو یا کوئی دوسری زبان جو بھی وہ پسند کریں لے سکتے ہیں۔ اب تک سنسکرت لینا لازمی تھا (یہاں ہندی والوں کے لئے یہ نکتہ قابل غور ہے کہ آج کے زمانے میں کوئی طالب علم سنسکرت جیسی مشکل زبان پڑھ کر زندگی کے کسی شعبے میں اُس سے کام نہیں لے سکتا)

وزیر اعلیٰ نے ایک اور نہایت کام کی اور بڑی بے حد دانشمندانہ بات کہی۔ انھوں نے کہا "میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ آٹھویں درجے تک دونوں زبانیں اُردو اور ہندی طلبا کے لئے لازمی رہیں جیسا کہ پہلے تھیں۔ انھوں نے کہا حکومت ہدایات جاری کر چکی ہے کہ عدالتوں میں اُردو درخواستیں قبول کی جائیں۔ رجسٹریشن آفسوں میں بھی اُردو

(بقیہ صفحہ ۱۰۵ پر دیکھئے)

غلام ربانی تاباں

چاند اور ہم

دلِ شاعر کی طرح چاند بھی ویران سہی
چاندنی اب بھی شبِ غم کو نکھارے گی ضرور
رات بھیگے گی تو مہکی ہوئی پُر نور فضا
ایک بے نام سا رومانہ سنوارے گی ضرور
چودھویں رات میں یادوں کی سجے گی محفل
آرزو عہدِ گذشتہ کو سنوارے گی ضرور

چاند کی چھاؤں میں دل اب بھی خوشی پائے گا
چاندنی رات میں ارمان کھلیں گے اب بھی
جلوۂ ماہ سے بڑھ جائے گی دل کی دھڑکن
لب پہ اک شوخ کے پیمان کھلیں گے اب بھی
رُوح کے زخم کسی باغ کے پھولوں کی طرح
نور برسے گا تو ہر آن کھلیں گے اب بھی

چاند سے اب بھی مرے دل کو وہی ہے نسبت
چاندنی رات میں کچھ درد سوا ہوتا ہے
جگمگاتے ہوئے لمحات میں پاتا ہے فروغ
جذبۂ شوق کہ پابندِ وفا ہوتا ہے
چاند کی سطح پہ ہوتا ہے نگاہوں کا وصال
اُن کی دُوری میں بھی قُربت کا مزا ہوتا ہے

چاند سے اب نہ حکایت نہ فسوں کا رشتہ
چاند صحرا ہے تو ظاہر ہے جنوں کا رشتہ

▲

اخلاق حسین عارف

مومنؔ میں جنگِ آزادی کی تڑپ

جس طرح شیکسپیر کو عام لوگ ڈرامہ نگار جانتے ہیں بہت کم اس امر سے واقف ہیں کہ وہ شاعر بھی تھا، یا جس طرح لارڈ بائرن بہ حیثیت شعلہ نوا شاعر مشہور و معروف ہے اُسے ڈرامہ نویس بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ اسی طرح اُردو کے ممتاز شاعر مومنؔ کو بالعموم لوگ شاعرِ شیریں بیاں کہتے ہیں، کم حضرات اس سے واقف ہیں کہ مومنؔ میں جنگِ آزادی کی تڑپ ایک سچے وطن پرست کی طرح کتنی تھی اور اس میں انہوں نے کس نوع سے حصّہ لیا۔

مومنؔ ۱۲۱۵ھ ہجری میں کوچۂ چیلان دلی میں پیدا ہوئے۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی نے محمد مومن نام رکھا۔ اُن کے والد حکیم غلام نبی خاں ولد حکیم نامدار خاں نجبائے کشمیر میں سے تھے۔ حکیم نامدار خاں اور حکیم کامدار خاں دونوں بھائی سلطنتِ مغلیہ کے آخر دور میں کشمیر سے دلی آئے اور شاہی اطبا میں شمار کیے گئے۔ شاہ عالم بادشاہ دلی کی طرف سے انہیں پرگنہ نارنول بطور جاگیر عطا ہوا۔ یہ جاگیرداری بعد میں ضبط کر لی گئی۔ اس کے بجائے باقاعدہ پنشن مقرر ہو گئی۔ مومنؔ نے شاہ عبدالقادر سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ علم طب اپنے والد سے اور علمِ نجوم اپنے چچا سے حاصل کیا۔ اس کے علاوہ انہیں علمِ رمل اور ریاضی سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ شطرنج بہت عمدہ کھیلتے تھے۔ موسیقی اور عملیات میں خاصا دخل تھا۔ شاعری سے بہ سبب عاشق مزاجی لگاؤ پیدا ہو گیا اور شاہ نصیر کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ پنشن ملنے کی وجہ سے معاش کے باب میں فارغ البالی میسّر تھی اس لئے شاعری اور طبابت کو ذریعۂ معاش نہیں بنایا۔ تصانیف میں کلیاتِ ریختہ، دیوانِ فارسی اور انشائے فارسی موجود ہیں بچپن ہی سے ذہین اور طبّاع واقع ہوئے تھے۔ حافظہ بہت زبردست پایا تھا۔ جو بات سنتے تھے یاد ہو جاتی تھی۔ خوش رو، خوش وضع اور عاشق مزاج واقع ہوئے تھے۔ عنفوانِ شباب کا کلام عاشقانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ آخر عمر کے کلام میں پختگی اور متانت نے جگہ لے لی ہے۔ غالبؔ، آزردہؔ اور صہبائیؔ وغیرہ اُن کے ہم عصر تھے۔ ان کے انتقال پر غالبؔ نے غزل کی رُباعی کہی ؎

حسرت کر روی دل خراشم ہمہ عمر خونابہ بہ جوئے زدیدہ پاشم ہمہ عمر

لہ آب حیات ۔ ۲ہ رسالہ اُردو بابت اکتوبر ۱۹۲۶ء حکیم سکھانند شاگردِ مومنؔ کا قصہ

کافر باشم، اگر بہ مرگ — مومن چوں کعبہ سیہ پوش بناشم ہمہ عمر

مومن کی شخصیت، شاعری اور اسلوب میں اک خاص آن بان اور اک خاص انداز و دلبری ہے۔ ان کی شاعری میں دو طرز نمایاں ہیں۔ ایک پیچیدہ گوئی، دوسری سہلِ ممتنع۔ دونوں میں اصلی اور حقیقی رنگ نمایاں ہیں۔ دونوں میں ان کی انفرادیت کی آن بان اور طرح داری کی شان ہے۔ پیچیدگیٔ کلام کا سبب ان کی بڑھی ہوئی علمیت بتایا جاتا ہے مگر اس کی اصل وجہ ان کی جدت طرازی اور منفرد شان ہے کیونکہ غالب کی طرح انہوں نے بھی روشِ عام سے ہٹ کر اپنی راہ متعین کی تھی اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے تھے۔[1]

مومن کے کلام سے ان کی استادی اور انفرادیت ہر مقام پر نمایاں ہے۔ تغزل میں مومن اپنے ہم عصروں میں نمایاں ہیں۔ ان کے یہاں غزل نظیری کی طرح بہت نکھر کر آئی ہے اور اس درجے پر پہنچی ہے کہ اسے غزلیہ شاعری میں ممتاز مقام حاصل ہے۔ مومن، فغانی، شفائی، عرفی، نظیری اور بیدل کا خوشہ چیں ہے اور حقیقت میں اس کی استادی کی بنیاد دستگاہِ فارسی پر قائم ہے۔ فارسی ہی کے اثر سے اس کے یہاں ایسی لطیف ترکیبیں پائی جاتی ہیں جو شعر کی جان ہوتی ہیں مثلاً آرزوہائے دلِ رشک آشنا، چشمِ ستارہ بار، آہوئے نیم خواب، شکوۂ زخم ریز، عشقِ ستیزہ کار، ستم آموزِ روزگار، التفاتِ ستم نما، بیگانۂ آشنا، خموشی اثر، اجل پارہ اور اسی قسم کی بیسیوں استوار اور خوشنما ترکیبیں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کی طبیعت فارسی مذاق سے بخوبی آشنا تھی اور یہ مرصع کاری اسی کا پرتو ہے۔

مومن کی حیات اور شاعری میں مختلف اور متضاد عناصر کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان عناصر میں آویزشِ پیکار بھی ہے اور موج و کنار کی جھلک بھی۔ کہیں آشتی ہے کہیں جنگ۔ ان کے یہاں صنعت گری بھی ہے اور قوم کی غفلت اور سماجی زندگی کے حقائق کا دردمند احساس بھی ہے جسے انہوں نے اس طرح بیان کیا ہے ؎

پامال ہم نہ ہوتے فقط جورِ چرخ سے آئی ہماری جان پہ آفت کئی طرح

---

[1] ملاحظہ ہو ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی کی کتاب "دلی کا دبستانِ شاعری صفحہ ۱۴۴/۱۴۶" پانچواں دور زبان کے لحاظ سے مکمل پختگی کا دور ہے۔ شاعری کی ایک الگ زبان بن گئی ہے اور اسکی صحت کے ساتھ پابندی قادر الکلامی کی دلیل ہے۔ دلی میں ذوق اور لکھنؤ میں ناسخ اس کے استاد مانے جاتے ہیں۔ جب شاعری جیسا فنِ لطیف مشاعروں میں پڑ کر علمِ مجلس بن جائے تو اس کا ایک ظاہری چمک و معیار بن جانا قدرتی امر تھا۔ پھر بھی دلی میں ایسی ہستیاں تھیں جو اس خارجی معیار کی مقبولیت اور نمائش کے باوجود اتنی جرأت رکھتی تھیں کہ اپنا ذاتی رنگ اپنے ڈھنگ پر پیش کرے۔ غالب اور مومن اسی طریقے کے پیش رو ہیں۔ دہلی میں داخلی رنگ کی گویا ایک نشاۃ ثانیہ تھی لیکن پہلے رنگ سے مختلف میر و درد کے زمانے میں جو شیر دگی اور بے اختیاری تھی وہ اس عہد میں با اختیاری کے رنگ میں مبدل ہو جاتی ہے۔ شاعر معاملاتِ قلبیہ سے واقف ہے لیکن وہ میر و درد کی طرح سوزِ دل سے انہیں بیان نہیں کرتا بلکہ انکی طرف اشارہ کرتا ہے۔ درد و اضطراب کو بیان کر کے تسکین حاصل کرنا نہیں چاہتا بلکہ ان کے ذکر سے محض لطف اٹھانا چاہتا ہے۔ غالب و مومن اپنی دیوانگی میں بھی ہوشیار رہتے ہیں۔ انکی خودی شکستِ خوردۂ عشق نہیں ہے بلکہ کبھی کبھی تو حسن و عشق دونوں سے خفا ہو کر اپنی بلندی ثابت کرنا چاہتی ہے اور اسلئے وہ سوز اور بیچارگی اور وہ شیوۂ تسلیم جو میر و درد کے عہد میں تھا اس عہد میں نہ ملیگا۔" (ایک مقام پر آگے چل کر یوں لکھتے ہیں) "مومن بھی غالب کی طرح اپنی انفرادیت لئے ہوئے تھے سنجیدہ معاملہ بندی اور تغزل انکی غزلوں کا مخصوص جوہر ہے۔ انکی نازک خیالی انکے شطرنج کے نقشوں کی طرح دقتِ نظر اور پیچیدگی کی حامل (باقی اگلے صفحہ پر)

اِس شعر میں دلّی کی تباہ حالی اور تیموری جاہ و جلال کو جس کے سامنے شوکت قیصر و کسریٰ کم مایہ معلوم ہوتے تھے، اُس کی بربادی پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس کا بھی مشاہدہ کیا کہ مغلوں کی حکومت سمٹ کر صرف قلعۂ معلّٰی کی چہار دیواریوں کے اندر محدود ہو گئی ہے[1]۔ ان سیاسی حالات پر منطبق کیا جا سکتا ہے۔ مندرجہ بالا شعر کے علاوہ اسی تاثر پر مبنی چند اور اشعار ملاحظہ ہوں ؎

شبنم خراب، مہر کتاں، سینہ چاک ماہ   لو اور بھی ستم زدۂ روزگار ہیں

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۴) ہوتی ہے۔ تغزّل کے محدود دائرے ہی کے اندر یہ مینا کاری کے نقش بٹھاتے ہیں جس کا مقصد محض پیچ کھولنا ہوتا ہے نہ کہ پیچ کھول لینے کے بعد حصول انبساط۔ مومن بھی غالب کی طرح ہمیشہ روش عام سے علیحدہ رہتے تھے۔ ان کی مشکل پسندی اور جدّت طراز طبیعت کسی شعبے میں تقلید کرنا عار سمجھتی تھی۔"

[1] ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک کی فوجیں فاتحانہ پرچم لہراتی ہوئی دلّی تک پہنچ چکی تھیں اور اپنی مصلحت بینی کے پیش نظر ضعیف العمر نابینا شاہ عالم کو جو مرہٹوں کے زیر اثر تھا اپنی امان میں لے لیا تھا جس کے بعد سے انگریزی تسلط کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی۔ اس وقت ہندوستان پر زوال اور انحطاط کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ سلطنت مغلیہ کمزور ہو چکی تھی اس کی حیثیت ایک عظیم الشان درخت کی سی تھی جس کی جڑیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ بہادر شاہ اوّل کے زمانہ سے لیکر نادر شاہ کے حملے تک اسکے ٹہنے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے رہے لیکن اسکی جڑوں کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا لیکن اس بیرونی حملے نے مغلوں کی کمر توڑ دی اور بقول حضرت شاہ ولی اللہ "از سلطنت بجز نامے باقی نماند"۔ اس وقت سبھی لوٹ کھسوٹ پر آمادہ تھے اور جب انکی دوڑیں دلی میں آتی تھیں تو خدا کی مخلوق رات کو سونے نہیں پاتی تھی۔ ان طوفانوں میں عوام خس و خاشاک سے زیادہ مجبور و بے دست و پا تھے۔ ہر زبردست کے گھوڑے اُنکے کھیتوں کو پامال اور ہر جابر امیر کے سپاہی انکے گھروں کو بے چراغ کر رہے تھے۔ روزی کا کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ صبح ملی تو شام کی خبر نہیں۔ دست کار، صناع، کسان، مزدور، وضیع و شریف سب ہی پریشان اور مضمحل تھے۔ خالصہ کی زمین کم ہو جانے سے خود شاہی خاندان پر تین تین وقت کے فاقے گذرتے تھے اور سلاطین کی حالت فقیروں سے بھی بدتر تھی۔ جاگیرداری اور اجارہ داری کی لعنتوں نے آسائش اور اطمینان ختم کر دیا تھا۔ سیاسی انتشار اور اقتصادی بدحالی کے اس اندھیرے میں انگریز جنکے پیچھے انگلستان کا صنعتی انقلاب اور تاریخ کی بڑھتی ہوئی قوتیں تھیں اپنے قدم مضبوطی سے جما رہے تھے۔" (ملاحظہ ہو فوائد الناظرین نمبر ۱ جلد ۴ مورخہ ۹ جنوری ۱۸۴۹ء واقتباس از ذوق و جستجو ص: ۲۴۲/۲۴۳ از ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی)

اسی قسم کا نقشہ ذکر میر ص: ۱۲۲ تا ۱۲۴ پر ہے مگر طوالت کے پیش نظر صرف ان کے شہر آشوب کے دو بند اور چند متفرق اشعار پر اکتفا کی جاتی ہے ؎

مشکل اپنی ہوئی جو بود و باش   آئے لشکر میں ہم برائے تلاش
آن کے دیکھی یاں کی طرفہ معاش   ہے لب ناں پہ سو جگہ پرخاش
نے دمِ آب ہے نہ چمچۂ آش

زندگانی ہوئی ہے سب پہ وبال   کنجڑے جھینکیں ہیں روتے ہیں بقال
پوچھ مت کچھ سپاہیوں کا حال   ایک تلوار بیچے ہے اک ڈھال
بادشاہ و وزیر سب قلاش

پھر قفس میں اِن دِنوں لگتا ہے جی — آشیاں اپنا ہوا برباد کیا

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے — صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

اے گردشِ زمانہ کبھی تو تغیر آئے — عسرت مجھے قبول اگر ابن قدر شہ ہو

اے حشر جلد کر تہ و بالا جہان کو — یوں کچھ نہ ہو، امید تو ہے انقلاب میں

مومن کے کلام میں مندرجہ بالا اور اسی قسم کے دیگر شعلہ بداماں اشعار اس "ولی اللّٰہی" تحریک کا عطیہ ہیں جس کے سرگرم کارکن مولانا سید احمد بریلوی تھے۔ مومن نوجوانی ہی میں مولانائے موصوف کے مُرید ہو گئے تھے۔ اُن سے دلی عقیدت کا اظہار مومن نے اپنے اشعار میں جا بجا کیا ہے۔ مولانا کے فیضِ صحبت کے باعث مومن میں یہ بلند کرداری فرنگی نظم و نسق کے خلاف جذبۂ نفرت و بیزاری اُبھارنے کا ذریعہ بنی جس میں اُن کے جذبۂ حریتِ قومی اور غیرتِ طبعی کی وہ شان کارفرما نظر آتی ہے جس کو دیکھ کر منکر کے لئے بھی ایمان لانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ برطانوی اثر کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو دیکھ کر وہ کس طرح مضطرب ہو گئے، یہ ذیل کے اشعار میں ملاحظہ ہو ؎

این عیسویاں بہ لب رسانند — جانِ من و جانِ آفرینش
نکشود گرہ زکار فرسود — ناخن کر بتانِ آفرینش
تا چند بہ خوابِ ناز باشی — فارغ ز فغانِ آفرینش
برخیز کہ شورِ کفر برخاست — اے فتنہ نشانِ آفرینش

مومن شدہ ہم زبانِ عرفی
از بہر امانِ آفرینش

مومن کا قصیدہ جو اُنہوں نے عرفی کی طرز میں لکھا ہے اس کے مندرجۂ بالا چند اشعار سے ان کی وارستگیٔ مزاج اور سید احمد بریلوی کی روحانی صحبتوں کے مقتضا کی طرف اشارہ ہے۔ ذیل میں اُن کے دو قصائد کی تشبیبوں کا انتخاب درج ہے جس سے اُن کے دلی کرب و اضطراب کا پتہ چلتا ہے ؎

بقیہ نوٹ صفحہ

صنّاع ہیں سب خوار ازاں جملہ ہوں میں بھی — ہے عیب بڑا اس میں جسے کچھ ہنر آوے
تو ہے بیچارہ گدا اگر میر تیرا کیا مذکور — مل گئے خاک میں یاں صاحب افسر کتنے
شہاں کہ کحل جواہر تھی خاکِ پا جن کی — اُنہیں کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں
دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں اُنہیں — تھا کل تلک دماغ جنہیں تخت و تاج کا

("جدید اردو تنقید" صفحہ 113/114، از ڈاکٹر شارب ردولوی)

یادِ ایّامِ عشرتِ فانی
وہ ہم اور وہ تن آسانی
جا لگے وحشت میں سوئے صحرا کیوں
کم نہیں اپنے گھر کی ویرانی
خاک میں رشکِ آسماں سے ملی
ہائے کیسی بلند ایوانی
کر دیا گردشِ سپہر نے چھت
تیغۂ حسرت کی شمشیر کیوانی
ایسی وحشت سرا میں کے کوئی
بے دلی کر رہی ہے مہمانی
شکستہ حجروں سے جی میں ہے تو چلوں
کہ میں شہری ہوں یا بیابانی
کیا ہوا وہ بلند منظر دیوار
کیا ہوئے وہ عمادِ طولانی
جلے گل ہیں صحن میں میرے رشک
کاہ کرتی ہے نازِ ریحانی
اٹھ گئے سوزِ دہر غبار از چشم
ایک قطرہ نہیں کہیں پانی

صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری
کثرتِ دود سے سیاہ شعلۂ شمع خاوری
چشمِ ستارۂ سحر یاں ہے زحل سے سرمہ سا
دشنۂ ترکِ چرخ سے تیز نگاہِ مشتری
خطِ بیاضِ صبح وہ شعلۂ دم اژدرِ سپید
عکس سے جس کے آب ہو آئینۂ سکندری
یاد ہوا ہے کوئی یار خانہ خراب و جاں گداز
خفیہ شمال میں سموم بادِ صبا میں صرصری
سامعہ سوز دل خراش گریہ فزا و زہر ریز
نغمۂ کوکِ عندلیب شاہد تہہ گلِ تری
مجھ کو فغاں سے کام اور ذکر میں اہلِ خانقاہ
دیر میں شور بیدخواں ہے کعبے میں نوگری
چار طرف ہے غلغلہ حی علی الفلاح کا
بدعملیوں سے عذرِ لنگ شدتِ ضعف لاغری
شعلۂ شمع سے فزوں چہرہ مرا اندیز گوں
رنگِ شفق سے بیشتر گریہ مرا معصفری

مومن کی شادی دلی کے نامور رشد و ہدایت خواجہ میر درد کے یہاں ہوئی تھی۔ وہ طبعاً بھی اور ماحول کے اعتبار سے خوشامد اور تملق سے پرہیز کرتے تھے اسی لئے ان کے مجموعۂ کلام میں مدحیہ قصائد گنتی کے دو چار ملیں گے۔ کیونکہ وہ قصائد کو "کارِ ہوس پیشگاں" سے تعبیر کرتے تھے۔ فارسی دیوان میں ایک مقام پر لکھتے ہیں ؎

پادشاہا بہ ایں متاعِ قلیل
مدح چوں از منے چرا خواہی
دیگراں دیگرند و من دیگر
ہر چہ از بوم از ہما خواہی

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے مومن کا تعلق مولانا سید احمد بریلوی سے پیرو مرشد کی بنا پر بہت گہرا تھا موصوف "ولی اللّہی" تحریک کے سرگرم رکن تھے جسے اٹھارویں صدی میں حضرت شاہ ولی اللہ نے شروع کیا تھا۔ اس تحریک کی ابتداء بیرونِ ہند ہوئی تھی۔ اس وقت یہ خالص مذہبی رنگ لئے ہوئے تھی مگر ہندوستان میں آکر شاہ صاحب کی سرکردگی میں اس کی نوعیت ہی بدل گئی اور اس میں سیاسی، معاشی اور ادبی عوامل بھی شامل ہو گئے کیونکہ موصوف کا خیال تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں وہ سچا مذہبی جذبہ مفقود ہو گیا ہے جو انسان کو انسان برقرار رکھتا ہے اور جو معاشرہ اور اپنے وطن کے اغراض کو اپنے ذاتی اغراض پر ترجیح دیتا ہے۔ اس جذبے کو وہ روحانیت اور

تربیتِ نفس کے ذریعے اُبھارنا چاہتے تھے۔ چنانچہ عوام تو عوام انہوں نے امرا اور معززین تک سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ وہ عیش و آرام میں مبتلا نہ ہو کر راہِ عمل نیک اختیار کریں۔ اس تحریک کا سیاسی مقصد یہ تھا کہ وطن کو فرنگیوں کے تسلط اور اقتدار سے پاک کرکے ایسی حکومت کی بنیاد ڈالی جائے جس میں کسی کے ساتھ ظلم نہ ہو اور سب کے ساتھ انصاف و عدل برتا جائے۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ اقتصادی نظام میں بھی تبدیلی لانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اُنکی تحریریں اس امر کی شاہد ہیں کہ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ محنت کشوں اور صنعت گروں کو اُن کے جائز حقوق دیئے جائیں۔ اُن کے نظریات کے بارے میں رتن لال بنسل کے تاثرات قلمبند کئے جاتے ہیں۔ اس سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اس تحریک کا مقصد بدیسی حکمرانوں کے خلاف متحد ہوکر ایک محاذ بنانا مقصود تھا۔

"بدیسی قوموں کے بڑھتے ہوئے خوفناک پنجوں سے ہندوستان کو بچانے کے لئے شاہ ولی اللہ زندگی بھر لڑتے رہے اور اپنے وارثوں، بیٹوں، ناتیوں اور ہزاروں شاگردوں کے دلوں میں ایک ایسی آگ چھوڑ گئے کہ انہوں نے مرجانا پسند کیا، پر ہندوستان کی غلامی کو چپ چاپ برداشت نہ کیا۔"

یہ تھی جنگِ آزادی کی وہ پہلی عملی جدوجہد۔ اسی تحریک کے ممتاز رکن مولانا سیّد احمد بریلوی تھے۔ ان کے خط سے جو انہوں نے راجہ ہندو راؤ کو تحریر کیا تھا، اِس امر کی شہادت ملتی ہے:

"جناب کو خوب معلوم ہے کہ پردیسی سمندر پار کے رہنے والے دنیا جہان کے تاجدار اور یہ سودا بیچنے والے سلطنت کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ بڑے بڑے امیروں کی امارت اور بڑے بڑے اہلِ حکومت کی حکومت اور اُن کی عزت و حُرمت کو انہوں نے خاک میں ملا دیا ہے۔ اِس لئے چند غریب اور بے سروسامان کمرِ ہمت باندھ کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ یہ اللہ کے بندے ہرگز دنیادار اور جاہ طلب نہیں ہیں۔ جس وقت ہندوستان ان غیر ملکیوں سے خالی ہو جائے گا اور ہماری کوششیں بار آور ہوں گی، حکومت کے عہدے اور منصب اُن لوگوں کو ملیں گے جن کو ان کی طلب ہوگی۔"

اِس تحریک نے وہ آزادی، جرأت اور بے باکی پیدا کردی تھی جو اس سے پہلے تاریخِ ہند میں نہیں ملتی۔ جس آزادی اور بے باکی سے شاہ صاحب نے فرنگیوں کے خلاف صفِ جہاد مرتب کی تھی اُسی آزادی کے جوش اور ولولے سے مولانا سید احمد بریلوی نے آزادی کی جنگ لڑی اور ان کے مرید و ہم خیال حکیم مومن خاں مومنؔ دہلوی نے غیر ملکی حکومت کے خلاف اِس طرح جہادِ قلم کیا کہ اُسے اصل ایمان اور اپنی جانِ عزیز کو اِس راہ میں صرف کر دینے کو سب سے بڑی عبادت قرار دیا۔ اوپر جو اشعار دئے گئے ہیں وہ استعارات و رمز میں مستور ہیں، مگر ذیل کے اشعار میں جو اُن کی مشہور مثنوی "جہادیہ" میں سے درج کئے جاتے ہیں اِن میں اُنہوں نے کھل کر بڑی جرأت اور بے باکی سے اس جذبے کا اظہار کیا ہے

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب　　یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
الٰہی اگرچہ ہوں میں تیرہ کار　　پہ تیرے کرم کا ہوں اُمیدوار
یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں
مری جاں فدا ہو تری راہ میں

اِسی قبیل کے چند اور اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جو داخل سپاہِ خدا میں ہوا　　فدا جی سے راہِ خدا میں ہوا

حبیبِ حبیبِ خداوند ہے　　خداوند اس سے رضامند ہے
امامِ زمانہ کی یاری کرو
خدا کے لئے جاں نثاری کرو

میں گنجِ شہیداں میں مشہور ہوں　　اسی فوج کے ساتھ محشور ہوں

مٹکاف[1] نے لکھا ہے کہ دلی میں ولی اللّٰہی تحریک سے متاثر ہو کر عوام میں شوقِ جہاد اس درجہ بڑھ گیا تھا کہ لوگوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجی اور سول ملازمتوں سے استعفے دیدیئے تھے اور اپنے اپنے گھروں سے سربکف ہو کر آمادہ بہ پیکار نکل کھڑے ہوئے تھے۔ اسی ولولۂ جہاد پر مبنی مومن کی ایک رباعی پیش ہے ؎

مومن تمہیں جو کچھ بھی ہے پاسِ ایماں
ہے معرکۂ جہاد چل دیکھے وہاں
انصاف کرو خدا سے رکھتے ہو عزیز
وہ جاں، جسے کرتے تھے بتوں پر قرباں

مومن کی شخصیت میں متضاد دھارے برابر برابر رواں دواں ہیں۔ ایک طرف وہ رند غزل خواں ہیں تو دوسری طرف جہاد کے علم بردار بھی۔ وہ محبوب کی نگاہِ بے حجاب بھی چاہتے ہیں اور عروجِ شہید و صدیق بھی۔ وہ مثنوی قولِ غمیں بھی رقم کرتے ہیں اور مثنوی جہادیہ بھی۔ یہ تضاد اول الذکر فطرت کی دین تھا اور موخر الذکر ماحول کا عطیہ۔ بہت ممکن تھا کہ وہ فطرت کی دین میں جس طرح نامور ہوتے اسی طرح دوسرے پہلو میں بھی انہیں ممتاز مقام ملتا مگر ان کی زندگی ایک حادثے سے دوچار ہوئی۔ وہ چھت سے گر کر کئی ماہ صاحبِ فراش رہے اور ترپن برس کی زندگی پاکر ۱۲۶۸ ہجری میں اس دارِ ناپائدار سے سدھار گئے۔

---

[1] Narratives of the Mutiny in Delhi by sir Malcalfe, Baronet, President of the Local committee public Insteructions, Delhi.

بیان بابت ملکیت وجملہ تفصیلات "شاعر" بمبئی
فارم نمبر ۴ رول ۸

۱۔ مقامِ اشاعت : بمبئی
۲۔ نوعیتِ اشاعت : ماہانہ
۳۔ پرنٹر : اعجاز صدیقی
۴۔ پبلشر : اعجاز صدیقی
۵۔ قومیت : ہندوستانی
۶۔ ایڈیٹر : اعجاز صدیقی
۷۔ قومیت : ہندوستانی
۸۔ پتہ : ۱۲۔ دیناتھ بلڈنگ تیسرا منزلہ۔ فاکلینڈ روڈ بمبئی ۴
۹۔ ملکیت : اعجاز صدیقی
میں اعجاز صدیقی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔
۱۹۷۰ء (دستخط) اعجاز صدیقی

ڈاکٹر ست پرکاش سنگر

پگڑی اچھال

میٹرک پاس کرنے کے بعد میں نے جو زندگی کے میدان میں قدم رکھا تو ماحول کو دلچسپ پایا۔ ہندوستان کو آزاد کرنے کے بعد انگریز یہاں سے چلے گئے تھے۔ صوبوں میں کانگریسی حکومتیں کام کر رہی تھیں۔ ہمارے صوبے کے چیف منسٹر نے جشنِ آزادی کے بعد پریس کو دعوت دی۔ دورانِ گفتگو میں انہوں نے جمہوریت میں پریس کی عظمت کو قبول کیا۔ اس کی قوت کا اعتراف کیا۔ اعلیٰ تعلیم سے آراستہ صاحب اقتدار شخص، اخبارات پر اس قدر دارومدار کر سکتا ہے، ایڈیٹروں کا اس درجہ دست نگر ہو سکتا ہے اور اپنی پالیسی کی تعمیل کے لئے اُن کا اس حد تک مرہونِ منت ہو سکتا ہے یہ سب میرے لئے ایک زبردست راز کا انکشاف تھا۔ انہوں نے ہم پر اس حقیقت کو بخوبی واضح کیا کہ جمہوریت میں وزارت کی کامیابی پریس کے تعاون کے بغیر ناممکن ہے۔ آل انڈیا شہرت کے مالک، بڑے اخباروں کے متعلق وہ وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے، لیکن مقامی پریس کی امداد کے بغیر وزارت کی کشتی کا کنارے تک پہنچنا ایک دم محال تھا۔ مقامی ایڈیٹروں کا اعتماد حاصل کرنے، انہیں اپنا ہمراز بنانے کے لئے انہوں نے ہمیں گھر پر ایک شاندار خصوصی ڈنر پر مدعو کیا۔ اور باتوں باتوں میں ہمارے تعاون کی قیمت چکانے کی طرف اشارہ کیا۔

اس دن مجھے اپنی قوت کا احساس ہوا اور یہ معمولی احساس نہ تھا۔ گھر کے اندر میں کبھی قابلِ عزت نہیں گردانا جاتا تھا۔ صرف ایک ناکارہ اور آوارہ لڑکا تصور کیا جاتا تھا۔ میٹرک ہی بمشکل تمام پاس کر پایا تھا۔ کالج میں جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ مجھ جیسے کم تعلیم یافتہ شخص کے لئے ترقی کی تمام راہیں مسدود تھیں، اس امر کا والدین کو شدید احساس تھا۔ گھر سے دوبار بھاگنا، دوبار میٹرک میں فیل ہونے کے بعد پاس ہونا، غلط قسم کے اوباش لڑکوں کی صحبت، بدمیں گھومنا، انہیں ناگوار گذرتا تھا اور ایسے آوارہ شخص کو صوبے کے ہکیہ منتری کے ذریعے خراجِ تحسین ادا کرنا، اسے اپنا محرم بنانا کس قدر حوصلہ افزا امر تھا۔

کچھ دنوں کے بعد ہکیہ منتری نے مجھے اپنے بنگلے پر بلایا اور ایک عمدہ دعوت سے نوازا۔ دراصل مدعا دوسرا تھا۔ انہیں شہرت عطا کرنے کے لئے ہم نے ایک خاص نمبر نکالنے کی اسکیم تیار کی۔ میں نے اپنے مطالبات پیش کئے جو فوراً منظور ہو گئے۔ خاص نمبر نکالنے کے لئے مجھے کافی محنت کرنا پڑی۔ ضروری مواد فراہم کیا گیا۔ اُن کی زندگی سے متعلق واقعات کو اکٹھا کیا گیا۔ اصل معاملہ اُن واقعات کو ایک خاص انداز میں پیش کرنے کا تھا۔ ہندوستان میں عوام کی زندگی بے کیف اور بے

ملتف ہوتی ہے۔ مگر اس میں رومان کا فقدان ہوتا ہے۔ ایسے بہت کم لوگ ہیں جن کی زندگی میں دلچسپی بھری ہو۔ جنہیں حسین لمحات میسر ہوئے ہوں، جن کے دل کو خوبصورت یادیں گدگداتی ہوں۔ ان حسین لمحات کو پالینے اور ان خوبصورت یادوں کو دل میں محفوظ رکھنے اور باقی ماندہ زندگی میں ان سے مسرت حاصل کرنے اور ان بیتے لمحات سے کیف وسرور حاصل کرنے کی بجائے لوگ انہیں دوسروں سے مخفی رکھتے ہیں بلکہ خود بھی ان سے دوچار ہونا پسند نہیں کرتے۔ ان یادوں کو اپنے دل کے کسی گہرے تہہ خانے میں دبا کر انہیں بھلا دیتے انہیں ایکدم فراموش کرنے ہی میں بہتری سمجھتے ہیں۔ ایسا کرنے میں وہ حق بجانب ہیں۔ وہ نکتہ چینی سے خائف ہیں۔ لوگوں کے کردار میں خوف وہراس اس درجے تک سرایت کر چکا ہے کہ وہ خود کا سامنا کرنے سے بچتے ہیں۔ لوطرواد کے پرستار ہونے کے سبب زندگی میں دورخی پالیسی برتتے ہیں۔ گفتار اور کردار میں یکسانیت پیدا کرنے کے سخت مخالف ہیں۔ سچائی سے ہمیشہ انحراف کرتے ہیں۔

لیکن اس صورت حال کے لئے وہ بھی قصوروار نہیں۔ وہ بھی سماج کے اجزاء ہیں اور سماج خود فریبی کا شکار ہے ہر کوئی خود سے بچتا ہے۔ خود کو دھوکے میں مبتلا رکھتا ہے اور دوسروں کو دھوکے میں رکھنا اپنا فرض گردانتا ہے۔ دراصل ہر کوئی ڈرتا ہے۔ سچائی سے منحرف رہنا اپنا حق سمجھتا ہے۔ یوں تو دوسرے ممالک میں بھی انسان کی زندگی کے مختلف پہلو ہوں گے لیکن وہاں شاید فراڈ کی زیادہ گنجائش نہ ہو۔ جیسے وہاں عشق کرنا ایک خطرناک حرکت نہیں سمجھا جاتا اور لوگ اپنے معاشقوں کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہاں معاملہ برعکس ہے۔ اول تو عوام کی زندگی ایسے خوبصورت تجربات سے عاری ہوتی ہے لیکن اگر کبھی کبھار کسی خوش نصیب کو ان تجربات سے دوچار ہونا پڑے تو وہ انہیں اپنے تئیں محدود رکھتا ہے اور دوسروں سے اپنے خصوصی راز کو مخفی رکھتا ہے۔ ہمارے چیف منسٹر کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ وہ جوانی میں عاشقانہ طبیعت کے مالک تھے۔ عشق کے میدان کے کھلاڑی تھے۔ کالج اور یونیورسٹی میں خوبصورت لڑکیوں کو عشق پیچاں کا کھیل کھیلتے تھے اور اپنے کارناموں کی ڈینگ مارتے، اپنی شیخی بگھارتے۔ اس کی وجہ سے خود کو دوسروں سے برتر سمجھتے اور اکڑ کر چلتے۔ کئی لڑکیوں سے انہوں نے جھوٹے وعدے کئے لیکن موج بہار ہی کو اپنا نصب العین سمجھتے۔ وہ کہتے کہ آدمی ہر خوبصورت لڑکی یا معشوق کے ساتھ شادی کیسے کر سکتا ہے؟ انہوں نے کسی سے بھی شادی نہ کی اور جب شادی کی تو ایک کالی کلوٹی، ناٹی اور موٹی عورت سے۔ یہ قدرت کی طرف سے ان کے معاشقوں کی سزا تھی یا گھروالوں کی طرف سے۔ لیکن ہوا یہی۔

شہر کے سبھی لوگ ان کی ایسی حرکات سے بخوبی واقف تھے لیکن خاص نمبر میں ان کے اس پہلو کو لوگوں کی نظر سے اوجھل رکھنا اور ان واقعات کی پردہ پوشی کرنا ضروری تھا۔ اسپیشل نمبر میں تو ہم نے ان کے کردار کو ایک خاص ڈھنگ میں پیش کیا۔ ہندوستانی سماج کی دورنگی چال اور متضاد کردار کو دھیان میں رکھتے ہوئے ہم نے چیف منسٹر کے عہد جوانی کو بڑے [illegible] کا زمانہ بتایا۔ ہم نے ایک ایسی تصویر کھینچی جس سے یہ عیاں تھا کہ ان کا پہلا زمانہ جدوجہد سے پر تھا۔ جس کا نمایاں پہلو حسینوں کے حملوں کا کامیاب دفاع تھا۔ ایسا انسان جو سازگار ماحول کی موجودگی میں ہر طرح کی ترغیب وتحریص کو ٹھکرا کر حسین لڑکیوں کے جال سے بچ کر ترقی کے میدان میں قدم بڑھائے وہ بڑا اور خضر سے کم نہیں تھا۔ کیا یہ معمولی بات تھی کہ بھرپور جوانی میں امیر خاندان کا ایک بشر برہمچریہ دھرم کا اس خوبی اور کامیابی سے پالن کرے؟ (دراصل نہ وہ امیر خاندان سے متعلق تھے نہ ہی عہد جوانی سے روشناس ہوئے تھے) لیکن ہم نے بھی تو ان کے عہد جوانی کی کچھ فرضی تصاویر چھاپ دیں)۔

ہندوستانی ماحول کے مطابق ہم نے اُن کے کردار میں برہمچریہ دھرم کی فوقیت کا اِس عمدہ انداز سے نقشہ پیش کیا کہ وہ عام انسان کی بجائے ایک اچھے خاصے سنت مہاتما معلوم دینے لگے۔ ایسے شخص کو دنیا کے کسی دوسرے ملک میں چیف منسٹر کی آسامی تو ایک طرف، چیف منشی کی پوسٹ کے لئے بھی نااہل قرار دیا جاتا۔ عورتوں سے بچنا کوئی بہادری کی علامت نہیں۔ پھر وہ تو بچے بھی نہ تھے۔

اِس خاص نمبر کو مفت بانٹنے کے باوجود اس سودے میں مجھے دس ہزار کا منافع ہُوا۔

اس کے بعد میرے حوصلے کھل گئے۔ اپنی طاقت کا مجھے پہلی بار احساس اور زعم ہوا۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی کہ جمہوریت کے اِس دَور میں ایک میٹرک پاس بلا تردّد اور کوشش، ایک کامیاب ایڈیٹر بن جائے۔ اب میدان صاف تھا اور میں نے ہمت اور وشواس کے ساتھ ترقی کی راہ پر چلنا شروع کر دیا۔

میرے لئے جرنلزم محض ایک ذریعۂ معاش تھا۔ اس سے پَرے کچھ نہیں۔ اِن بڑے پرچوں کے بڑے ایڈیٹروں کی بڑی کوالیفیکشنز دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی۔ آخر پیسہ کمانا ہی تو زندگی کا نصب العین ہے اور اگر کوالیفیکشنز کے بغیر ایک پرچہ نکال کر اچھا پیسہ کمایا جا سکتا ہے تو پھر ان خواہ مخواہ کے تردّدات میں کیوں پڑتے؟

میں نے طاقت کے نشے میں ہر کسی کو للکارنا شروع کر دیا۔ میری نگاہ شہر کے بیوپاریوں اور تاجروں، کالج کے پروفیسروں، لوکل سکول کے اُستادوں، حلوائیوں اور ڈاکٹروں پر پڑی۔ میں نے باری باری ایک ایک سے طاقت آزمائی شروع کر دی۔ شہر کے بارسوخ تاجر ملک تاج محمد اخراج محمد بیڑی مرچنٹ کو میں نے ہدف بنایا۔ اُن کی پرائیویٹ زندگی سے متعلق کسی جعلی واقعے کو گھڑنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ اصلی واقعات ہی کچھ کم نہ تھے اور وہ اُن سے منکر نہیں ہو سکتے تھے۔ پہلے پرچے کو پڑھ کر ہی اُن کے حوصلے پست ہو گئے۔ اپنے منیم کے ذریعے انہوں نے مجھے گھر پر مدعو کیا۔ میں نے بھی کچی گولیاں نہ کھیلی تھیں۔ نہیں گیا۔ کیوں جاتا؟ اجی ایسے لوگوں کا کیا ٹھکانہ؟ کوئی گڑبڑ کر بیٹھیں۔ کسی غنڈے سے پٹوا دیں۔ مجھے کیا پڑی، ان کے سمن قبول کر کے اُن کے گھر جاؤں؟ اگر انہیں مجھ سے کام ہے تو خود آ سکتے ہیں۔ سیٹھ تاڑ گیا۔ میری سوجھ بوجھ کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے اور سمجھوتے کی پیشکش کرتے ہوئے اس نے اپنے منیم کے ہاتھوں، معقول معاوضہ بھجوا دیا۔ مجھ جیسے صلح جُو شخص کے لئے دوسرا چارہ ہی کیا تھا؟ میں نے اُن کے صلحنامے کو قبول کر لیا۔

اس کے بعد، سیفیہ میڈیکل ہال کے مالک سیّد امجد علی میرے غیظ و غضب کا شکار بنے۔ اُنہوں نے مقدمہ چلانے کی دھمکی دی۔ میں نے مہم پہلے سے تیز کر دی۔ بہت جھلّائے اور بِلبلائے۔ جوش میں آ کر ہر ملنے والے سے میرے خلاف باتیں کرنے اور دھمکیاں دینے لگے۔ میں تو خود یہی چاہتا تھا۔ اگلے شمارے میں اِنہیں دھمکیوں کو اُن کے خلاف استعمال کر کے اُن کی پول کھول دیتا۔ کہاں تک مقابلہ کرتے؟ آخر کار ہتھیار ڈال لئے اور میدان چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔

اس سودے میں بھی مجھے منافع رہا۔

بعد ازاں میں نے شہر کے ایک ایک سیٹھ، ایک ایک تاجر اور اسمگلر کو آڑے ہاتھوں لینا اور اُن کی زندگی سے متعلق ہر واقعے کو پبلک کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیا۔ ایسا کون آدمی ہے جس کی پرائیویٹ زندگی نہ ہو؟ میرے جاسوس اور کارندے ان بڑے لوگوں کی پرائیویٹ زندگی سے دلچسپ واقعات کو میری معلومات میں اضافہ اور میرے خزانے کو معمور کرتے۔ حیرت یہ تھی کہ تعلیم یافتہ، امیر اور مہذب، ظاہراً خوش و خرم نظر آنے والے ان لوگوں کی زندگی نہایت

خستہ ہوتی۔ کوئی بیوی اور بچوں کے ہاتھوں نالاں تھا۔ کوئی بہن اور بھائی سے پریشان خاطر تھا۔ اکثر لوگوں کی زندگی ازدواجی مسرت سے محروم تھی۔ دکھ اور تکلیف، حزن و ملال سے پُر، ان لوگوں کی زندگی مجھے مسالہ مہیا کرتی۔ میں اُن کے حالات کو پوری طرح ایکس پلائیٹ کرتا۔ ایسا کئے بغیر کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ زندہ رہنے کا مجھے بھی حق تھا۔ کون کسے ایکسلائیٹ نہیں کرتا؟ زندگی کا یہی وطیرہ ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی میں حیرت انگیز ترقی، سماجی نظام میں زبردست تبدیلی اور سیاسی اور سماجی ریفارمرز کی جملہ کوششوں کے باوجود زندگی اُسی انداز سے بسر کی جا رہی ہے۔ کارل مارکس اور اینگلز، شاہ اور ویلز، ہکسلے اور برگسن کی تھیوریز کے باوجود انسانی اقدار جوں کی توں برقرار رہیں۔ پیسہ کمانے کا، دوسروں کو بے وقوف بنانے کا، اُن کی کمزوری سے فائدہ اُٹھانے کا وہی طور ہے اور کیوں نہ ہو؟ ہر شخص کو زندہ رہنے اور اُس کے لئے روزی کمانے کا حق ہے۔ ایک شخص کے پاس پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری اور دوسرے کے پاس پرائمری کی سند ہے۔ اس تضاد کے لئے وہ نہیں، سماج ذمہ دار ہے اور اس کمی کے پورا کرنے کا اُسے پورا مجاز ہے۔ زندہ رہنے کا اُسے پورا حق ہے اور ہر ممکن طریق سے روزی کمانے کا اُسے اختیار ہے۔ چاہے اسے لوگوں کی فطری کمزوری کو ایکسپلائیٹ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ چاہے دوسروں کی پگڑی ہی کیوں نہ اُچھالنی پڑے اور خصوصاً ایسے آدمی کی جو اپنی پوزیشن سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر بے ایمانی سے پیسہ بٹورتا رہا۔

میرا اشارہ جمنا داس اظہر کی طرف ہے۔ 'نئی صبح' کا یہ ایڈیٹر سیاسی رد و بدل کی وجہ سے ایک چیف منسٹر کا چمچہ بن کر ایک صوبے میں ایک عمدہ اور 'کی' پوسٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میرا پرانا واقف کار تھا۔ میں نے سوچا، دوستی نبھانے کی خاطر اس لوٹ مار میں مجھے بھی شریکِ کار کرے گا۔ لیکن وہ تو ایکدم طوطا چشم ثابت ہوا۔ مجھ سے آنکھ ملانے تک سے انکار کر دیا۔ بازار میں چھاتی پھلا کر چلتا۔ سرکاری کار میں شان سے جاتا۔ آخر میں کب تک اس صورت حال کو برداشت کر سکتا تھا؟ میں اس کے حالاتِ زندگی سے واقف تھا۔ ایک دن میں نے پردۂ راز فاش کر دیا۔ ایک پرانے واقعے کی یاد تازہ کر کے جنتا کی معلومات میں اضافہ کر دیا۔ اپنے پرچے میں اُس کی نوجوان بیوی اور پڑوس کے ادھیڑ عمر کے سالے کے معاشقے کی تفصیلات کو شائع کر دیا۔ جمنا داس اظہر کی پول کھل گئی۔ گردن جھک گئی۔ چھاتی کی اینٹھن نکل گئی۔ میرا کچھ بھی بگاڑ نہ سکا۔ مقدمہ چلانے کا سوال ہی نہ اُٹھتا تھا۔ میں تو یہ چاہتا تھا لیکن اس سے اس کی زیادہ بدنامی کا خدشہ تھا۔ اُلٹا گھر پر آ کر معافی کا خواستگار بنا۔ پیسے دے کر ہی پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہوا۔ اپنی حرکت پر نادم بھی تھا۔

مقامی کالج کا پروفیسر بھی میرے حملے سے محفوظ نہ رہا۔ دراصل وہ میرے بچپن کا لنگوٹیا دوست تھا۔ میرے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلتا تھا۔ ہم دونوں ڈاک خانے میں اکٹھے بھرتی ہوئے۔ میں ہرکارے کا کام کرتا، وہ چٹھیوں پر مہریں لگاتا۔ نہ جانے اُسے کیا سوجھی، ساتھ ساتھ پڑھتا بھی رہا۔ مل ملا کر پاس ہوتا رہا۔ ایم اے پاس کرنے کے بعد اسکول ماسٹر، پھر ہیڈ ماسٹر اور بعد ازاں مقامی انٹر کالج کا پرنسپل بن گیا۔ چونکہ پوسٹ مین سے پرنسپل بنا تھا اور ناٹے قد اور کالے رنگ کی وجہ سے کسی خاص شخصیت کا مالک نہ تھا۔ احساسِ کمتری کو چھپانے کے لئے ہر وقت مُنہ میں پائپ رکھتا۔ چال چلن میں کمزور تھا۔ دو بیویوں کا خاوند اور آٹھ بچوں کا باپ۔ باپ ہونے کے باوجود جنسی بھوک سے پریشان رہتا۔ اس لئے اپنے دفتر کے کمرے میں لڑکیوں کو بٹھائے رکھتا۔ دن کو طالبات کی صحبت سے لطف اندوز ہوتا اور رات کو دُخترِ رز کا مزہ لیتا۔ لیکن پہلی قسم کا نشہ نہایت مسرت آگیں تھا۔

اس کے مقابلے میں جملہ نشے بے لطف اور بے کیف ہوتے حسیناؤں کے درمیان آرام کرسی پہ بیٹھ کر ایک خاص لطف کا احساس کرتا۔ ان کی صحبت میں اس کے خون کا دورہ تیز ہوجاتا اور اُسے ایک عجیب نشے کی کیفیت عطا کرتا۔ اس نشے کے زیر اثر وہ خود فراموش ہوجاتا اور اس امر کو بھول جاتا کہ اُس کا چپراسی اس کی جملہ حرکات کا بغور مطالعہ کر رہا ہے اور اس کی ہر بات کو بغور سُن رہا ہے۔ دفتر اور کالجوں کے یہ چپراسی بڑے کام کی شے ہوتے ہیں۔ سمجھ دار لوگ انہیں ہر ماہ باقاعدگی سے نقد انعام دیتے ہیں۔ ناسمجھ نقصان اٹھاتے اور مُنہ کی کھاتے ہیں۔ پرنسپل کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ چپراسی نے مجھے تفصیلات سے آگاہ کر دیا اور میں نے پبلک کے سامنے اپنے اخبار میں اس کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ اسے معطل کر دیا گیا اور بعد ازاں کسی دور دراز مقام پہ اس کا تبادلہ ہوگیا۔

اس کے بعد میرا نزلہ ایک ایم۔ ایل۔ اے پر گرا۔ میں نے انہیں بُری طرح کانٹوں پر گھسیٹا۔ لیکن میرا حملہ ایسے ہی لوگوں تک محدود نہ تھا۔ روزی کمانے اور بیوی بچّوں کا پیٹ بھرنے کے لئے مجھے شریف زادوں پہ حملہ کرنا پڑتا۔ میں مجبور تھا۔ روٹی کے مسئلے سے پریشان خاطر رہتا۔ اس کا میرے پاس ایک ہی مداوا تھا۔ ان کے کردار پر حملہ کرکے بلیک میل سے پیسہ حاصل کرنے کے سوا میرے پاس دوسرا چارہ ہی نہ تھا۔ کالج کے کئی بے قصور پروفیسر اسکول کے شریف ماسٹروں، نیک کردار دکانداروں اور بے ضرر تاجروں پہ اپنے اخبار کے ذریعے شدید ترین حملے کرکے انہیں ذلیل و رسوا کیا۔ پبلک کے سامنے انہیں بُری طرح خوار کیا۔ ان میں سے کسی کے ساتھ مجھے ذاتی عناد نہ تھا۔ شخصی دشمنی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کینہ پروری سے حتی الوسع بچنے کی کوشش کرتا۔ شکم پروری ہی میرا مطمح نظر تھا۔ میں تو محض ایک مشین تھا، ایک آلۂ کار تھا۔

لیکن میں نے محسوس کیا کہ جنتا کے اندر میرے خلاف ایک گھٹا گھٹا جذبہ، ایک خفیہ پروپیگنڈا پھیل رہا ہے لوگ میری حرکات و سکنات سے ناخوش و بیزار ہیں۔ کبھی کبھی میرے دوست اشارتاً اور کنایتاً میرا دھیان اس امر کی طرف مبذول کراتے۔ میرے پروپیگنڈے کے مطابق کے طور پہ جب ایک اسکول ماسٹر کی دل کی دھڑکن رُکنے سے موت واقع ہوگئی۔ تب لوگوں کا خفیہ جذبہ عود کر آیا۔ اس دن شہر میں میرے خلاف ہڑتال ہوگئی، جلوس نکالا گیا اور لوگوں کی ایک میٹنگ میں مجھے کنڈم کیا گیا۔

ماسٹر کی موت کا مجھے بھی افسوس ہوا۔ لیکن کیا کر سکتا تھا؟ بھیڑیئے کے مُنہ کو خون لگ چکا تھا۔ جس ہتھیار کے استعمال سے میری روزی چل رہی تھی، اسے ایکدم کیسے ترک کر سکتا تھا؟ اپنے ذریعۂ معاش کو یوں یکلخت بند کرکے اپنے پیٹ پر کیسے لات مار سکتا تھا؟ اپنے بچّوں کو کہاں سے کھلاتا؟ لیکن ماسٹر کی موت کا غم مجھے ستاتا۔

کفّارے کے طور پر میں نے شہر کے ناتھ باڑے میں جانا شروع کر دیا۔ شہر سے باہر یہ سنتوں کا اکھاڑہ تھا۔ انواع اقسام کے سادھو لوگ یہاں رہتے، جو گاؤں سے آٹا، دال، چاول، دودھ اور گھی سب کچھ مانگ کر لاتے ویسے بھی چڑھاوا آتا رہتا۔ چوبیس گھنٹے بھنڈارا چلتا۔ ان سب لوگوں کی کمال کی صحت تھی۔ اس کی وجہ عمدہ غذا اور ہر قسم کی بے فکری تھی۔ بھرے ہوئے جسم، گول نکلے پیٹ، سرخ چہروں، باوقار مونچھ اور داڑھی والے، گیروے کپڑے پہنے تعلیم سے بے بہرہ، روحانی جذبات سے عاری یہ لوگ مزہ کی زندگی بسر کرتے۔ مہینے میں پورنماشی کے روز سہبھوج ہوتا، جس کے لئے گاؤں کی عورتیں کھانا تیار کرنے آتیں۔ یہ سنت مہاتما جب نوجوان عورتوں سے گھل مل کر ایک خاص انداز میں باتیں کرتے، تو مجھے ان پہ رشک آتا۔ ان کے چیلوں کو تو میں ہمیشہ مشکوک نظروں سے دیکھتا۔

بلا کسی عام سماج کو ہاتھ لگائے، کسی قسم کی دماغی اور روحانی تعلیم سے بے بہرہ یہ لوگ کس طرح ضبطِ نفس کا دعویٰ کر سکتے تھے؟ وہ کیسے حقیقی سنت رہ سکتے تھے؟ یہ ایکدم محال تھا، نا قابلِ یقین تھا۔ عمدہ خوراک اور اطمینان کی زندگی اُن کی جنسی بھوک کو ختم نہیں، تیز کرنے میں معاون ہوتی۔ ان کے طرزِ زندگی کو دیکھ کر کوئی بھی انہیں مہاتما نہیں کہہ سکتا تھا۔ پھر تاتھ باڑے میں عورتوں کے آنے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ آشیرواد اور ثواب، اولاد اور مراد پانے کی غرض سے ہندوستانی عورتیں سنتوں کے پاس آتیں اور ریشمی کپڑے پہنے، سجے سجائے خوبصورت قالینوں والے کمرے میں ریشمی غلافوں والے تکیوں پر جسم ٹکائے بڑے سنت جی کے اُپدیش سنتیں۔

میں نے بھی باقاعدگی سے وہاں جانا شروع کر دیا۔ سنتوں کے پیر چھوتا اور جی بھر کر پرمزہ کھانا کھاتا۔ سنت جی مجھ پر خاص طور سے مہربان تھے لیکن وہ مجھے ایک عام شہری تصور کرتے۔ وہ اس بات سے بالکل لاپروا تھے کہ میں ایک ہفتہ وار اخبار کا نامی ایڈیٹر تھا جس کا دبدبہ منسٹر تک تسلیم کرتے تھے۔ مجھے ایسا لگا کہ ان لوگوں کو میری طاقت کا رتی بھر احساس نہیں تھا۔ ایسا نہیں کہ یہ لوگ میرا پرچہ نہیں پڑھتے تھے، شہر کا ہر کوئی معمولی پڑھا لکھا شخص بھی اُسے پڑھتا۔ بڑے سنت اسے پڑھتے وقت ڈکارتے اور داڑھی پر ہاتھ پھیرتے۔ جب کوئی چٹپٹی بات آتی، تو مُنہ پر ہاتھ پھیرنے لگتے لیکن خاموش رہتے۔ کسی طرح کی جرح نہ کرتے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ لوگ میری حرکت سے ناخوش ہیں، مجھ سے ناراض ہیں۔ میرے پرچے کی پالیسی کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

میرے لئے اتنا کافی تھا۔ اُن کے متعلق میرے پاس بے شمار مواد جمع تھا۔ میں نے مضامین کا سلسلہ شروع کر دیا۔ سنت جی اور ان کے چیلوں کے پول کھلنے لگے۔ میں نے اِس بات پر زور دیا کہ یہ لوگ دوسروں کی کمائی پر زندہ رہتے ہیں اور یہ بدلے میں سماج سیوا کے طور پر اُن کی بہو بیٹیوں تک کو درگزر نہیں کرتے۔

شہر میں سنسنی پھیل گئی۔ ہل چل مچ گئی۔ بازار اور گلیوں میں چوک اور گھروں میں اسی بات کا تذکرہ ہونے لگا۔ شہر والے دو حصوں میں بٹ گئے۔ میری بات کی تائید کرنے والے اور میری پالیسی کی تنقید کرنے والے۔ میں خود موضوع بن گیا۔

لیکن سنتوں پر کوئی اثر نہ پڑا۔

اُنہوں نے اس کے متعلق کوئی بات نہ کی۔ اُن کی اکڑ جوں کی توں بنی رہی۔ میں نے دوسری قسط چھیڑ دی۔ اب کی بار ان پر بالجبر زِنا کا الزام لگا دیا۔ شہر میں آگ بھڑک اٹھی۔ میرے دشمنوں کو موقع ملا۔ ان کے بہکانے اور مجبور کرنے پر سنت جی نے عدالت میں مجھ پر مقدمہ چلا دیا۔ مہینوں مقدمہ چلا۔ پیشیاں ہوئیں، گواہیاں ہوئیں۔

فیصلے والے دن کمرۂ عدالت حاضرین سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ پولیس کے معقول انتظامات تھے۔ مجسٹریٹ نے فیصلہ سناتے وقت مجھے سخت ڈانٹ ڈپٹ بتلائی۔ مجھے ایک غیر ذمہ دار شہری اور شرارت پسند ایڈیٹر قرار دیا اور ایک سال کی قید بامشقت اور پانچ سو روپیہ جرمانے کی سزا سنائی۔

سنت جی نے اُٹھ کر اس سزا کے خلاف آواز بلند کی۔

مجسٹریٹ نے کہا کہ عدالت کے معاملے میں سنت جی کو دخل نہیں۔

اُنہوں نے جواب دیا کہ وہ مدعی ہیں۔ سزا اُن کے مقدمہ چلانے پر ہوئی ہے۔

اُن کا مقصد ملزم کو سزا دینا نہیں، اُسے راہِ راست پر لانا ہے

میجسٹریٹ کے مطابق اس کے لئے یہی مناسب طریق تھا۔
سنت جی اکڑ گئے۔ ستیہ گرہ کی دھمکی دینے لگے۔ میجسٹریٹ مشکل میں پڑ گئے۔ اپنا فیصلہ کیسے واپس لے سکتے تھے؟
سنت جی نے آتم ہتیہ کی دھمکی دی۔
مجسٹریٹ کو ہار ماننی پڑی۔ اُنہوں نے کہا کہ اگر ملزم اپنے جُرم کا اقرار کرلے گا، اس کی سنت جی سے معافی مانگے گا اور عدالت کے سامنے یہ اعلان کرے گا کہ وہ آئندہ کبھی ایسی حرکت کا ارتکاب نہیں کرے گا تو عدالت اُسے معاف کرنے کے متعلق سوچ بچار کرے گی۔
میں سزا بھگتنے کو تیار تھا لیکن معافی مانگنے کے حق میں نہ تھا۔ میری ہچکچاہٹ کو دیکھ کر میرے والد بزرگوار اچانک گیلری میں سے اُٹھے اور عدالت کو سلام کرکے سنت جی کی طرف بڑھے اور ان کے پاؤں پر گر پڑے۔ سنت جی نے انہیں آشیرواد دی اور اُٹھنے کے لئے کہا۔ لیکن وہ تو پاؤں پسارے اس طرح لیٹے تھے جیسے اُٹھنے کے خلاف ہوں۔
سنت جی نے جھک کر انہیں شانوں سے ہلا کر اٹھانے کی کوشش کی۔
"لال چند جی! لال چند جی! اُٹھئے، ہم نے آپ کے لڑکے کو معاف کر دیا۔"
"معاف کر دیا؟" والد صاحب نے گردن اُوپر اُٹھائی۔ پھر ایکدم ان کی گردن لڑھک گئی۔
اس مسرت آمیز خبر سننے سے اُن کے دل کی دھڑکن اچانک بند ہو گئی۔
اس سانحے کا میرے دل پر بے حد اثر پڑا۔ لوگوں نے مجھ پر لعنت بھیجی۔ سبھی کا خیال تھا کہ سنت جی پر حملہ کرنے کی مجھے ایسی سزا ملی ہے۔
میں نے اس پیشے کو خیر باد کہنے کا فیصلہ کر لیا۔
ایک سال تک میں نے اِدھر دھیان ہی نہیں دیا۔
پارلیمنٹ کے چُناؤ آنے پر دوستوں کے اصرار پر مجھے پھر اپنے پرچے کو جاری کرنا پڑا۔ الیکشن میں کانگریس ٹکٹ پر ہماری ریاست کے سابق حکمران راجہ پرتاب بھانو بھی کھڑے ہوئے۔ اُن سے پیسہ بٹورنے کی غرض سے میں نے اُن پر حملے شروع کر دیئے۔ چار شماروں میں اُن کی خوب گوشمالی کی اور انہیں بے حد بدنام کیا۔ انکی دھمکیوں نے مجھ پر کوئی اثر نہ کیا۔
تنگ آکر راجہ صاحب نے صلح کا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ کافی بحث مباحثہ کے بعد معاملہ دو ہزار پر طے ہوا۔ راجہ صاحب نے اپنے سکریٹری کو بُلا کر مجھے روپیہ دینے کا حکم صادر فرمایا۔ میں نے آئندہ اُن پر کبھی بھی حملہ نہ کرنے کا لکھ کر وعدہ کیا۔
روپیہ ایکدم نہیں ملا۔ اِس کے لئے ایک لمبا پروسیجر تھا۔ راجہ صاحب وعدہ فرماتے رہے۔ اتنی دیر میں چُناؤ ہو گئے۔ راجہ صاحب جیت گئے۔ میں نے یاد دہانی کرائی۔ اُنہوں نے سکریٹری کو ڈانٹ پلائی۔
اور جب چند ماہ بعد وعدہ ایفائی ہوئی تو دو ہزار میں سے محض پچاس روپے میرے ہاتھ لگے۔ اِتنے ہاتھوں میں سے ہو کر مجھ تک پہنچتے پہنچتے، پچاس روپے ہی بچے۔
میں یہ تصفیہ نہ کر سکا کہ یہ راجہ صاحب کی جیت تھی یا میری ہار۔

عبدالحی ۔ سرینگر

صرصرِ مغرب، بادِ خزاں!

[شیلے کی مشہور نظم "بادِ مغرب" کا ترجمہ]

اے صرصرِ مغرب، بادِ خزاں!
تیری اَن دیکھی ہیبت سے
بُوٹے، پتّے، سب ہی لرزاں
پتّے یُوں تجھ سے بھاگتے ہیں
جیسے جادوگر کے ڈر سے
بھوتوں کے غول، اُفتاں خیزاں
کچھ زردی مائل، کچھ کالے
کچھ لال بھبھوکا سے پتّے
ہیں تیری تال پہ یُوں رقصاں
کٹھ پتلی جیسے ہوتی ہے
مالک کے حکم پہ رقص کُناں
یا پھر اُن انسانوں کی طرح
تقدیر سے ہوں جو سرگرداں
اے صرصرِ مغرب، بادِ خزاں
جب سُنتے ہیں تیرا فرماں
تخم اپنے مَدفن میں
ہو جاتے ہیں محوِ خوابِ گراں
جب دَورِ خزاں کا گُذرنے پر
دیتی ہے نسیمِ بہار اذاں
یہ بیج بھی ہوتے ہیں بیدار
اور کھِلنے لگتی ہیں کلیاں
رنگین چمکتے پھُولوں سے
بھر جاتے ہیں کہسار اور میداں
اے صرصرِ مغرب، بادِ خزاں
اے وحشی قوت کی مالک
بسکہ ہے ترا ہر سمت رواں
تُو موت بھی ہے، تُو جیون بھی!
مجھ بیکس کی بھی سُن لے فغاں

(۲)

اے صرصرِ مغرب، بادِ خزاں!
دھرتی کی طرح آکاش بھی ہے
تیری ہیبت سے لرزہ بجاں
تیرے ابرو کے اشارے پر
سُوکھے بے جاں پتّوں کی طرح
کالے بادل بھی ہیں رقصاں!
آکاش پہ مارے پھرتے ہیں
ایسے، جیسے کوئی پگلی!
گلیوں میں مارے پھرتی ہے
زُلفیں بکھری، چہرہ ویراں
آوارہ بچّوں سے ترساں
پھر تیرا اشارہ پاتے ہی
برپا ہوتا ہے اِک طوفاں
ہر سُو گھرسے کالے بادل
ہر سُو اِک تاریکی کا سماں
بادل اِس طرح گرجتے ہیں
جیسے کہ فضا ہو نوحہ کناں
یہ سال ابھی جو گزرا ہے
اِس کی میّت کو روتے ہیں
شاید یہ اولے اور باراں
اے صرصرِ مغرب، بادِ خزاں
مجھ بیکس کی بھی سُن لے فغاں

(۳)

اے صَرصَرِ مغرب، بادِ خزاں
پاتال بھی ہے تجھ سے لرزاں
اُس جگہ، جہاں اب ساگر ہے
تھے محل دو محلے عالیشاں
جو تیری چیرہ دستی سے
اب ہیں پانی کے تلے پنہاں
گہرے کالے پانی کے تلے
ہیں کتنی تہذیبوں کے نشاں
ان کھنڈروں اور شہروں کے سوا
ہیں اور خزانے دفن یہاں
جنگل بھی ہیں زیرِ آب بہت
اور ویرانے بھی کئی یہاں
لیکن سب تیری ہیبت سے
ہر دم ترساں ہر دم لرزاں
اے صَرصَر تیرے تھپیڑوں سے
جب ہوتا ہے طوفاں برپا
ہو جاتا ہے ساگر بھی ویراں
مجھ بیکس کی بھی سُن لے فغاں

(۴)

اے صَرصَرِ مغرب، بادِ خزاں
اے کاش مَیں اِک پتّہ ہوتا
یا اَبر کا اِک ٹکڑا ہوتا
یا دریا کی اِک موجِ رواں
کاش اِن میں سے مَیں کچھ ہوتا
اور تیرے جلو میں چل سکتا
گرتا پڑتا، اُفتاں خیزاں
یا پھر مَیں اِک بچّہ ہوتا
ہر غم سے بے پروا ہوتا
اور دُکھ میں بھی ہوتا خنداں
اب مَن میں اُداسی چھائی ہے
اور تن زخموں سے چھلنی ہے
اور جیون کے تپتے پتھر پر
مَیں پڑا ہوں مثلِ برگِ خزاں
تو مجھ کو اُڑا پتّوں کی طرح
کاندھے پہ اُٹھا بادل کی طرح
یا مجھ کو بنا اِک موجِ رواں
اے آزادی کی متوالی!
تجھ کو اپنی تُندی کی قسم
مجھ بیکس کی بھی سُن لے فغاں
مَیں بھی تھا کبھی تیری ہی طرح
آزاد مثالِ سیلِ رواں
اب پَیروں میں زنجیریں ہیں
اور غم سے ہوں بے تاب و تواں
میرے دُکھ کا بھی کچھ درماں
اے صَرصَرِ مغرب، بادِ خزاں

(۵)

اے صَرصَرِ مغرب، بادِ خزاں
جنگل کی طرح مجھ کو بھی بنا
اپنا بربط، اپنا نغمہ
جنگل ہے پت جھڑ کا مارا
اور مجھ پر بھی چھائی ہے خزاں
میرے نغمے ہیں درد بھرے
میرے سپنے ہیں دُھواں دُھواں
تخئیل کا شہپر ٹوٹا ہے
زخمی ہیں خیالوں کی پریاں
لیکن تیری اِک آہٹ پر
اِن سب میں پڑ جائے گی جاں
اِن سے سوکھے بیجوں کی طرح
پھوٹیں گی اُمیدوں کی کلیاں
گونجیں گے گیت بہاروں کے
پربت پربت، میداں میداں
دُکھ درد کے مارے انساں بھی
جی اُٹھیں گے، گا کر یہ نغمہ
"آیا ہے بہاروں کا موسم
دم توڑ رہی ہے فصلِ خزاں"

خورشید احمد جامی

خزاں کی دھوپ میں گلشن کے خواب بھی رکھ دو
کسی بدن کے مہکتے گلاب بھی رکھ دو

تمہارے شہر سے گزروں تو ہر در ِ دریچے میں
کوئی خیال، کوئی ماہتاب بھی رکھ دو

اب اِس میں کیا ہے پُرانی کہانیوں کے سوا
اُٹھا کے طاق میں دِل کی کتاب بھی رکھ دو

سجی ہے محفلِ یاراں تو اپنے چہروں سے
ذرا اُتار کے سارے نقاب بھی رکھ دو

سکوتِ مرگ ہے کیوں دَرد کے جزیروں میں
سمندروں کا یہاں اضطراب بھی رکھ دو

گذر رہی ہیں ہزاروں قیامتیں ہم پر
یہیں کہیں کوئی روزِ حساب بھی رکھ دو

جو ساتھ ساتھ رہا وقت کے اندھیروں میں
کسی مزار پہ وہ آفتاب بھی رکھ دو

جو ہو سکے تو حدیں توڑ کر خلاؤں کی
فلک کے دِل میں زمیں کا عذاب بھی رکھ دو

حیات پیاس کا صحرا بنے تو پھر اُس میں
کچھ آرزو کے چمکتے سراب بھی رکھ دو

چُننے ہیں زخم، تو زخموں کے پاس ہی جامی
کسی کی اِک نگہِ انتخاب بھی رکھ دو

ارشد صدیقی

پتھر سی رات اور کوئی غمخوار بھی نہیں
سر پھوڑیئے سو تیشۂ افکار بھی نہیں

اِس تیرگی میں پوچھیئے کس سے سُراغِ وقت
زندانِ شب میں روزنِ دیوار بھی نہیں

آیا ہے دِل کو شہرِ نگاراں سے کب پیام
جب عشق کا صِلہ رَسَن و دار بھی نہیں

سر پر گزار دی ہے غمِ زندگی کی دھوپ
قسمت میں اپنی سایۂ دیوار بھی نہیں

پھیلے ہوئے ہیں چاروں طرف غم کے دائرے
حدِ نگاہ تک کوئی غمخوار بھی نہیں

محفل میں آپ اُن کی زباں کاٹتے ہیں جو
اِک حرفِ زیرِ لب کے گنہگار بھی نہیں

دامن پہ جب کھلے نہ گُلِ زخم تو کھلا
غم کا جواب دیدۂ خونبار بھی نہیں

آوارگانِ شہر تُنک سر سہی، مگر
پہلے سے اب وہ کوچہ و بازار بھی نہیں

لہجہ بدل کے بولیئے ورنہ کہیں گے لوگ
آپ آشنائے خوبیِ گفتار بھی نہیں

ارشد کا ذکر چھوڑیئے وہ بد دماغ ہے
پھر یہ کہ اپنے وقت کا فنکار بھی نہیں

آیئے عہد کریں
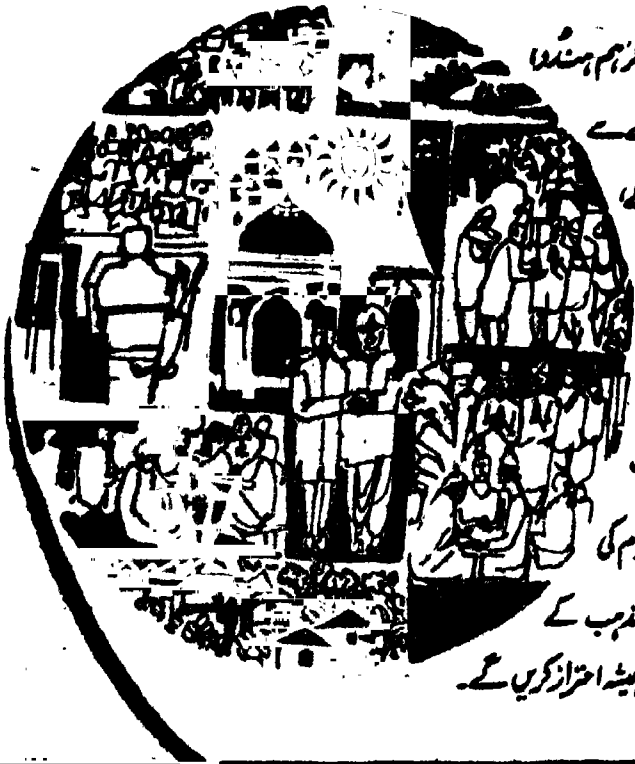
اللہ ایشور کو حاضر ناظر جان کر ہم ہندو، مسلمان اعلان کرتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے سے ایک ہی ماں باپ کے بچوں جیسا برتاؤ کریں گے، کہ ہم تفرقات روا نہیں رکھیں گے کہ ہمارے ایک کا دکھ دوسرے کا دکھ ہوگا اور کہ ہر ایک اسے دور کرنے میں دوسرے کی مدد کرے گا۔ ہم ایک دوسرے کے مذہب اور مذہبی جذبات کا احترام کریں گے، اور دوسروں کے مذہبی رسوم کی ادائیگی میں رکاوٹ نہیں ڈالیں گے۔ ہم مذہب کے نام پر تشدد برتنے سے ہمیشہ احتراز کریں گے۔

مہاتما گاندھی

ہندو مسلم اتحاد کا یہ حلف مہاتما گاندھی نے [illegible] کے لئے ۱۹۲۱ء میں تجویز کیا تھا [illegible] سیاست کی پالیسی کا جزو بنا ہوا ہے۔

مقالہ

ڈاکٹر سیدہ جعفر

پھول بن ــــ ایک مطالعہ

ابنِ نشاطی کی مثنوی "پھول بن" کئی حیثیتوں سے دکنی ادب کا ایک ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے۔ جذبات نگاری، منظر کشی، رزمیہ عناصر کی پیشکشی، طرزِ ادا کی سادگی و پُرکاری، مقامی رنگ اور ہندوستانی تہذیب کی عکاسی نے اس مثنوی کی ادبی اہمیت میں اضافہ کر دیا ہے۔

ابن نشاطی کی زندگی اور نجی حالات، گمنامی اور تاریکی میں پوشیدہ رہے۔ اُس کا ذکر سب سے پہلے اسٹوارٹ نے کیا تھا کیونکہ اُس کی فہرست میں مثنوی "پھول بن" بھی شامل تھی، لیکن شاعر کے حالاتِ زندگی پر وہ کوئی روشنی نہیں ڈال سکا تھا۔ گارساں دتاسی نے ابن نشاطی اور اس کے کارنامے کا ذکر نسبتاً تفصیل سے کیا لیکن شاعر کے نام کا تعیّن کرتے ہوئے وہ تسامح کا شکار ہو گیا۔ گارساں دتاسی نے ابن نشاطی کا نام "آدری" بتایا ہے اور لکھتا ہے:۔

"آداری (یعنی ابن نشاطی) ایک مسلمان مصنّف ہے جو شیعہ مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔" وہ حسبِ ذیل کتابوں کا مصنّف ہے

(۱) پھول بن اور (۲) طوطی نامہ۔

اسٹوارٹ اور دتاسی کے بیانات نے بعض ابتدائی ادبی مؤرخین کو بھی متاثر کیا چنانچہ شمس اللہ قادری نے بھی "طوطی نامہ" کو ابن نشاطی کی تصنیف بتایا ہے۔ ڈاکٹر زور وہ پہلے محقق ہیں جنہوں نے "اردو شہ پارے" میں گارساں دتاسی اور اسٹوارٹ کی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا اور ابنِ نشاطی اور اس کی شعری تخلیق کو زیادہ جامع اور بھرپور انداز میں پہلی دفعہ اردو داں طبقے سے روشناس کروایا۔

ابن نشاطی نے اپنے بعض ہم عصر شعراء مثلاً وجہی اور غواصی وغیرہ کے برخلاف صرف ایک ہی ادبی تخلیق کے سہارے دکن کے بہترین شعراء کی صفِ اوّل میں جگہ پائی ہے۔ ابن نشاطی کا شعری سرمایہ دوسرے شعراء کے مقابلے میں محدود سہی لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسی ایک مثنوی نے اس کو سدا بہار شہرت اور لازوال عظمت عطا کی ہے۔

ابن نشاطی کے حالاتِ زندگی سے ہم زیادہ واقف نہیں ہیں۔ البتہ مثنوی میں بعض ایسی شہادتیں موجود ہیں جن سے اس کی زندگی کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ابن نشاطی کا نام شیخ محمد مظہر اور اس کے والد کا نام شیخ فخر الدین بتایا ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے ۱۹۳۸ء میں اس مثنوی کو مرتب کر کے شائع کیا۔ وہ شاعر کا سنہ ولادت ۱۰۴۰ھ تا ۱۰۴۵ھ اور مثنوی کا سنہ تصنیف ۱۰۶۶ھ قرار دیتے ہیں۔ "پھول بن" کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن نشاطی کی تعلیم و تربیت اعلیٰ پیمانے پر ہوئی تھی۔ وہ علوم متداولہ کا ماہر تھا۔ مثنوی میں بعض ایسے اشارے موجود ہیں جن کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کو فنِ بلاغت اور علمِ معانی و بدیع سے خاص شغف تھا۔ فارسی زبان سے بخوبی واقف ہونے کا یہ ایک اچھا ثبوت ہے کہ اس نے فارسی قصّے "بساتین"

کا دکنی میں بڑا عمدہ ترجمہ کیا۔ اپنی فارسی دانی پر وہ ناز بھی کرتا ہے :۔

تجے ہے فارسی میں دستگاہ آج　　نہ کر سے ترجمہ بھی کوئی کاج باج

مثنوی میں ایک جگہ ابن نشاطی کہتا ہے کہ مجھے ہمیشہ سے انشاء سے دلچسپی رہی ہے اور "طبیعت" کو اس سے ایک طرح کا "حظ" حاصل ہوتا ہے۔ ع

اہے انشاء پو میرا میل دائم　　طبیعت کو مری ہے حظ لائم

ادب سے اس کو غیر معمولی شغف اور فارسی دانی نے اسے "بساتین" کی طرف متوجہ کیا اور دکنی ادب میں ایک خوبصورت مثنوی کا اضافہ ہوا۔ پھول بن اپنی انفرادیت، ماحول کی بھرپور عکاسی، محاکات، جذبات نگاری، منظر کشی اور ادبی و فنی خوبیوں کی وجہ سے دکن کی بلند پایہ مثنویوں میں شمار کی جاتی ہے۔ شاعر سبب تالیف بتاتے ہوئے کہتا ہے کہ میں کسریٰ نہیں کہ انصاف کی وجہ سے میرا نام زندہ رہے نہ میں ابراہیم ادھم ہوں کہ لوگ میرے زہد و تقویٰ کے قصے سنائیں، نہ رستم ہوں کہ جس کی رزمیہ کہانیاں لوگوں کو یاد ہوں۔ اس لئے میں نے اپنی یادگار قائم کرنے کیلئے یہ مثنوی پیش کی ہے۔

توں کسریٰ نہیں جو رہے تیری عدالت　　توں حاتم نئیں جو رہے تیری سخاوت

نہیں ہے توں وو ابراہیم ادھم　　کہیں سگے زہد میں تج کوں مقدم

توں رستم نئیں جو تیری داستاناں　　پڑیں ہر بزم میں شہہ نامہ خواناں

بھلا وہ ہے توں اپنا یادگار آج　　دنیاں میں ہر سند کر آشکار آج

پھول بن کئی اعتبارات سے منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ قدیم طرز کی یہ بیانیہ (Narative) مثنوی مشرقی فن قصہ گوئی کا ایک اچھا نمونہ ہے جس میں قصہ در قصہ کی تکنیک کے ذریعہ سے قاری کی دلچسپی کو بہت دیر تک برقرار رکھا گیا ہے۔ اس قسم کے قصے عموماً دو طرح کے ہوتے ہیں ایک تو وہ جن میں بنیادی قصہ تمام دوسرے قصوں کیلئے چوکھٹے کا کام انجام دیتا ہے اور دوسرے قصے اپنے طور پر مکمل ہونے کے باوجود اسی محور کے گرد گھومتے ہیں۔ دوسرا طریقہ قدیم قصہ گوئی کا ایک یہ ہے کہ ایک قصے کے اختتام پر دوسرا شروع ہوتا ہے اور پہلے قصے سے اس کا تعلق خارجی قسم کا ہوتا ہے۔ پھول بن میں اسی تکنیک سے کام لیا گیا ہے۔

سلسلہ قصص کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ "مشرق" میں ایک شہر کنچن پٹن تھا۔ یہ دلفریب شہر ایک ندی کے کنارے آباد تھا اور اس کی خوبصورتی کا یہ عالم تھا کہ مٹی کے ذرات بھی سونے سے بنے ہوئے معلوم ہوتے تھے اسی لئے اس شہر کو کنچن پٹن یعنی سونے کے شہر کا نام دیا گیا تھا۔

کتے یک شہر مشرق کے کدھیں تھا　　کہ اس کا ناؤں سوں کنچن پٹن تھا

کنچن کے تھے محل کنچن کے دیوار　　کنچن پر بھر کنچن لیپے تھے ہر ٹھار

کنچن کی تھی زمیں کنچن کے جھاڑاں　　گھراں کنچن کے کنچن کے کواڑاں

جدھر دیکھے تو کنچن تھا کنچن تھا　　اسی تے ناؤں اس کنچن پٹن تھا

اس شہر کی تمام رعایا خوش حال اور "عیش و عشرت" سے "نہال" تھی۔ اس کے "خوش بخت" بادشاہ کو دنیا کے بادشاہوں میں "سروری" حاصل تھی۔ شہر گویا باغ اور "بادشاہ باغباں تھا"۔ "تو ابرو کی خبر دینے والا" چاند سورج کی بات اس طرح کہتا ہے کہ جب سورج بلندی سے پستی کی طرف آیا اور "مغرب کے معبد میں جا کے ٹھہرا تو عالم کو سیاہی نے گھیرا۔ بادشاہ نے خواب کے عالم میں

ایک درویش کو دیکھا جس کی پیشانی پر سجدے کا نشان چمک رہا تھا۔ جب صبح ہوئی تو بادشاہ نے ہر طرف خدمتگار دوڑائے اور اس درویش کو بہ وقت تمام دربار میں بلوایا۔ جب وہ آیا تو بادشاہ نے اُس کی بڑی آؤ بھگت کی اور اس سے مل کر بہت خوش ہوا۔ درویش ہر رات بادشاہ کو ایک قصہ سنایا کرتا تاکہ وہ اس سے فیض روحانی حاصل کر سکے۔ درویش نے سوچا معرفت کی باتیں کھول کر بیان کروں تو شاید بادشاہ سمجھ نہ سکے۔ اس نے تمثیل کے ذریعے سے اور کہانی کے پیرائے میں رموزِ حقیقت بیان کرنے چاہیں، تاکہ بادشاہ کا دل حقیقت آگاہ اور محرمِ اسرار و رموز ہو سکے۔

کہا درویش ایسں میں آپ سُن لیں — حقیقت معرفت کا کھول کیوں کہوں
کہ سب کوں کس نہیں اس بات کا علم — ہے مشکل خدا کی ذات کا عِلم
سکر بولیا حکایت یک مجازی — مجازی میں سینا سو بات تازی

درویش نے اپنا قصہ یوں بیان کرنا شروع کیا کہ میرا باپ ملک خراسان کا بادشاہ تھا۔ موسم بہار کا واقعہ ہے کہ ایک دن دربار سجا ہوا تھا، امرا اور وزرا حاضر تھے کہ باغبان ایک پھول لے کر حاضر ہوا۔ حاضرین دربار اور خود جہاں پناہ نے ایسا خوبصورت اور خوشبودار پھول کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس کی مہک دُور دُور تک پھیل رہی تھی۔ سب لوگ دنگ تھے کہ یہ پھول ہے یا طلسم۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ ابھی وقت اس کا پودا تلاش کر کے ہمارے باغ کی زینت بناؤ، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ ہر روز باغباں ایک تازہ پھول بادشاہ کی نذر کرتا جس سے دماغ کو فرحت اور روح کو تازگی نصیب ہوتی۔ ایک دن بادشاہ نے باغباں سے شکایت کی کہ چند روز سے پھول کی تازگی میں فرق آگیا ہے، کیا یہ تمہاری لاپروائی کا سبب نہیں ہے؟ باغباں نے کہا بادشاہ سلامت جاں کی اماں پاؤں تو ایک چشم دید واقعہ بیان کروں۔ بادشاہ ہمہ تن گوش ہو کر قصہ سننے لگا۔ باغبان نے کہا:۔

جہاں پناہ! چند روز سے میں دیکھ رہا ہوں کہ ایک بُلبل اس گُل پر نچھاور ہوتا اور منقار سے اُس کی پنکھڑیوں کو منتشر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور دھوپ سے بچانے کے لئے اُس پر پروں کا سایہ کئے گھنٹوں ہوا میں اڑتا رہتا ہے۔ بادشاہ نے حکم دیا ابھی وقت بُلبل گرفتار کر کے پنجرے میں بند کر دو۔ چنانچہ باغباں نے بُلبل کو گرفتار کر لیا اور ایک جڑاؤ پنجرہ میں قید کر دیا۔ یہ قفس محلِ خاص کی زینت بنا۔ بُلبل ہر وقت گریہ و زاری میں مصروف رہا کرتا نہ دانہ پانی کی سُدھ تھی نہ آشیانے کا خیال۔ یہ حال دیکھ کر بادشاہ نے بُلبل سے پُوچھا۔ "اے نامُراد پرندے! تو کس شمع کا پروانہ ہے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیرے دل میں محبت کی آگ سُلگ رہی ہے۔" بُلبل نے جواب دیا۔ اے مہربان بادشاہ! کیا عرض کروں، میرا باپ خُتن کا سوداگر تھا، مال و دولت کی کمی نہ تھی۔ ہمارے جہاز بندرگاہوں کو گھیرے رہتے۔ ایک مرتبہ میں اپنے والد کے ساتھ بغرض تجارت گجرات پہنچا۔ یہاں ایک فتنۂ روزگار پری جمال پر نظر پڑی اور عشق کا تیر دل کے پار ہو گیا۔ وہ نازنین بھی میری محبت میں مُبتلا ہو گئی۔ اب میں تنہا اس آگ میں نہیں جل رہا تھا وہ بھی میرے ساتھ تھی۔ ابھی چند مہینے بھی نہ گذرنے پائے تھے کہ اس کے والد کو ہمارے عشق کا حال معلوم ہو گیا۔ نازنین کا باپ بڑا متقی اور پرہیزگار آدمی تھا اور اس کے تصرفات روحانی کا ایک زمانہ قائل تھا۔ جب اس کو یہ حال معلوم ہو گیا تو اس نے شرم کے مارے لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ ایک کمرے میں معتکف ہو کے بیٹھ گیا۔ چند روز بعد خدا سے ہم دونوں کے حق میں بددعا کی اور اس طرح اس نازنین کا جسد پھول میں اور میرا وجود بُلبل میں تبدیل ہو گیا۔ جب بادشاہ نے یہ درد بھری کہانی سُنی تو اُس کو بہت افسوس ہوا۔ اتفاقاً اُسے خیال آیا کہ اُس کے خزانے میں ایک ایسی انگوٹھی موجود ہے جس کو اگر ممسوخ پر پھرائیں تو وہ اپنی اصلی حالت میں دوبارہ منتقل ہو جاتا ہے۔ بادشاہ نے فوراً وہ انگوٹھی طلب کی اور اُس کی مدد سے دونوں اپنی اصلی شکلوں میں آ گئے۔

"پھول بن" میں اس طرح کے تین بسیط قصوں کے علاوہ تین تعارفی خاکے بھی موجود ہیں جو اصل قصے کیلئے پیش خیمے کا کام دیتے ہیں۔ یہ تمام قصے زاہد کی ذات سے منسوب کردئے گئے ہیں لیکن زاہد یا کنچن پٹن کا بادشاہ "پھول بن" کے اہم کردار نہیں بلکہ ختن کے سوداگر کا بیٹا، گجرات کے عابد کی بیٹی، جوگیوں کا معتقد بادشاہ، فریبی وزیر، رانی سنتوشی، سمن بر، ہمایوں فال، ملک سندھ کا ناعاقبت اندیش بادشاہ اور اس کا دغاباز وزیر، قصے کے تانے بانے کو استواری اور انفرادیت عطا کرتے ہیں۔

ابن نشاطی نے "پھول بن" کی ابتدا میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس مثنوی میں اس نے بادہ و ساغر کے پردے میں مشاہدۂ حق کی گفتگو کی ہے۔ جب ہم "پھول بن" کے پہلے قصے کے کردار زاہد کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو وہ ہمیں "انوارِ سہیلی" کے حکیم بیدپائے کا قائم مقام معلوم ہوتا ہے۔ "پھول بن" میں مجازی محبت کو "قنطرۃ الحقیقت" بتایا گیا ہے اس میں عاشق طالب اور محبوب مطلوب ہے جس کو حاصل کرنے کیلئے وہ بڑی بڑی دشواریوں کا مقابلہ کرتے ہوئے منزلِ مقصود کی طرف بڑھتا ہے۔ محبت دراصل صوفیاء کی اصطلاح میں سلوک اور اس کی مختلف منزلیں ہیں۔ دیدار یار شہود دیا دیدِ حق۔ یار پیار، طلبِ حق اور محبوب کو پالینا یافتِ حق کی منزل ہے۔ "پھول بن" میں ختن کے سوداگر کا بیٹا، جوگیوں کا معتقد بادشاہ، ہمایوں فال اور ملک سندھ کا ناعاقبت اندیش بادشاہ کو منزلِ مرگ سے گذرنا پڑتا ہے۔ صوفیاء کے خیال میں شہادت کی چار قسمیں ہیں۔ شہادتِ مبدا، شہادتِ عہدا، شہادتِ وجدا اور شہادتِ شہدا۔ ابنِ نشاطی نے "پھول بن" میں تین طویل قصے پیش کئے ہیں اور ہر ایک قصہ ایک ایک عالم یعنی ناسوت، لاہوت اور جبروت کی نمائندگی کرتا ہے۔

فنی اور ادبی اعتبار سے "پھول بن" دکنی مثنویوں میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ایسے زمانے میں جب لفظوں کا خزانہ زیادہ وسیع نہ تھا، ابنِ نشاطی نے محاکات، منظر کشی اور جذبات نگاری کے لئے اظہار کے ایسے بلیغ پیکر کیونکر ڈھونڈ نکالے۔ مفہوم کو وسعت دینے اور لفظوں کو برتنے کا جیسا سلیقہ ابنِ نشاطی میں نظر آتا ہے اس دور کے بہت کم شاعروں کے پاس اس کی مثال ملتی ہے۔ مثنوی صنف ادب کے اعتبار سے اپنا ایک خاص مزاج اور چند مخصوص فنی مطالبات رکھتی ہے۔ بیانیہ مثنویوں میں تسلسل بیان اور ربطِ اظہار کی اس لئے اہمیت ہوتی ہے کہ ان کی عدم موجودگی کے باعث قصہ کی فضا اور اس کی جزئیات اور واقعات کے بیان میں کھانچے پڑجاتے ہیں۔ "پھول بن" کا شاعر قصہ اس طرح بیان کرتا ہے کہ واقعات کی تصویریں نظروں کے سامنے متحرک ہوجاتی ہیں۔ ابنِ نشاطی کے مرقعے بڑے زندہ اور گویا ہیں۔ شاعر کے احساسِ تناسب اور احساسِ رنگ نے ان نقوش کو ایسا تابناک بنادیا ہے کہ صدیاں گذر جانے کے باوجود یہ نقش مٹنے والے نہیں۔

ابنِ نشاطی کی مثنوی اس لئے بھی دکنی ادب کا ایک یادگار کارنامہ ہے کہ اس میں دکنی معاشرت، قطب شاہی عہد کی تہذیب اور مجلسی زندگی کے بڑے دلکش مرقعے موجود ہیں۔ دراصل ابن نشاطی نے جس تہذیبی فضا کو پیش کیا ہے وہ نہ خالص ہندوستانی ہے اور نہ تمام تر ایرانی۔ ابنِ نشاطی، قطب شاہوں کے پایۂ تخت گولکنڈے کا رہنے والا تھا۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دورِ حکومت میں ابنِ نشاطی نے اس تہذیب کو پروان چڑھتے دیکھا تھا، جو ایک علیحدہ اکائی ہوتے ہوئے بھی بنیادی طور پر ہندی سبھیتا اور ایرانی تہذیب کا حسین امتزاج تھی۔ عمارتوں کی تعمیر، رہن سہن کے طریقے، لباس، زیورات، عورتوں کے سنگھار کے طریقے اور سامان، باغات اور درباروں کے نقشے اس بات کے غماز ہیں کہ قطب شاہوں نے جس تہذیب کو معراجِ کمال پر پہنچایا تھا وہ ہندوستانی بنیادوں پر استوار ہوئی تھی۔ قطب شاہی عہد میں لباس کیلئے جس قسم کے کپڑے استعمال کئے جاتے تھے ان کی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔

حریر بافتہ، سالو، سری صاف — مشجر نافتہ دارائے ازباف
سمور د سندس و سیہ کغ طاق — سلیمی، صاحبی ہور کربلائی
مطبق نیلک و سقلاو مخمل — قلم کاریاں و چھیٹاں ہور ململ
پتمبر دار چھیٹاں ہور سوسیاں — تھے شالاں خوب کشمیری دلوسیاں

ابن نشاطی نے کبھی ختن اور کبھی خراساں اور مصر جیسے دور دراز مقامات کا ذکر کیا ہے لیکن وہ سندھ، کشمیر اور گجرات کو نہیں بھولتا۔ کرداروں کے معاشرتی آثار و کوائف سے ثابت ہوتا ہے کہ ختن اور خراساں تو محض نام ہیں لیکن قصے کی جائے وقوع ہندوستان ہی ہے۔ پلاٹ کے اعتبار سے یہ قصے مخلوط ہیں۔ ان میں سنسکرت اور فارسی قصہ گوئی کے عناصر کا میل نظر آتا ہے۔ ہندی اور ایرانی قصوں کی روایتوں کو کچھ اس طرح سمویا گیا ہے کہ اس سے کہانی ایک نیا انداز اختیار کرلیتی ہے۔ اس طرح کی قصہ گوئی میں ایرانی قصے اور ہندی لوک کتھا کا دلچسپ امتزاج دکھائی دیتا ہے۔ منظر کشی اور مرقع نگاری کے رنگ اکثر جگہ ہندوستانی ماحول سے ماخوذ ہیں۔ اس سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ "پھول بن" "بساتین" کا محض خلاصہ نہیں ہے بلکہ ابن نشاطی نے اس میں اپنی اُپج اور انفرادیت کا بھی اظہار کیا ہے اور اس میں بہت سے اضافے بھی کئے ہیں، اور اس طرح "پھول بن" کا یہ قصہ "ہندایرانی" تہذیب کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ سمن بر کے قصے میں سنسکرت قصوں کا عکس نظر آتا ہے اور یہ اسلامی اصل پر ہندی پیوندکاری کا ایک اچھا نمونہ ہے۔

"پھول بن" کے مطالعے سے ابن نشاطی کی وطن پرستی اور ہندوستانی تہذیب اور ماحول سے اس کی والہانہ وابستگی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ پہلی کہانی میں ختن کے سوداگر کا قصہ بیان کرتے ہوئے ابن نشاطی کی حب الوطنی نے کشمیر کا انتخاب کیا اور ہیروئن کو گجراتی بتاکر اس نے نہ صرف یہ بتادیا کہ ہندوستان اور اس کی تہذیب سے اسے موانست ہے بلکہ یہ بھی کہ جس تہذیب کا تصور اس کے ذہن میں ہے وہ ختن اور گجرات اور کشمیر سے تعلق رکھتی ہے۔ یعنی ایک گنگا جمنی تہذیب ہے۔

ابن نشاطی نے مقامی رنگ LOCALCOLOUR اور ہندوستانی عناصر کی پیش کشی کے ذریعے سے اپنی مثنوی کو زیادہ حقیقت پسندانہ اور پراثر بنا دیا ہے۔ اس مثنوی کا دوسرا قصہ خالص ہندوستانی ہے۔ راجا کی جوگیوں سے عقیدت ہندوستانی عنصر کی آئینہ دار ہے روح کی نقل مکانی اور پرندوں اور انسانوں کا باہم ہم کلام ہونا، شک سپ تتی، یا طوطا کہانی، اور بیتال پچیسی کے قصوں کی روایت کی یاد دلاتا ہے۔ ابن نشاطی نے یہ قصے محض حظ یا لطف حاصل کرنے کی خاطر نہیں بیان کئے ہیں بلکہ ان کے پیچھے پند و موعظت اور اخلاق آموزی کا رجحان بھی موجود ہے جیسا کہ پنچ تنتر کے تمام قصے اسی نقطۂ نظر کی عکاسی کرتے ہیں۔

تیسرے قصے میں ایرانی شہزادہ اور شہزادی "مصر و عجم" کو چھوڑ کر ہندوستان میں پناہ لیتے ہیں۔ اور شہر سندھ میں قیام کرتے ہیں۔ یہاں ابن نشاطی نے غلطی سے گنگا کو سندھ میں بہتا ہوا دکھایا ہے جو جغرافی اعتبار سے بالکل غلط ہے لیکن اس سے یہ ایک بات ضرور ظاہر ہوتی ہے کہ ابن نشاطی گنگا کے ذکر سے نہیں چوکتا۔ جب شہزادے سے شہزادی جدا ہو جاتی ہے تو بجز النسا، بزم افروز اور عمل پذیری کی طرح شہزادے کا سراغ لگانے جوگن بن کر نکل جاتی ہے۔ ابن نشاطی نے ایک ایرانی شہزادی کو چابکدستی کے ساتھ ہندوستانی لباس میں اس طرح پیش کیا ہے ؎

برت کے دو دین سفر کی ہوا تالی — کرا پاچیر کنشا گل میں گھالی

...... سبھوتی اپنے موں کوں پھیر لگائی ‏ ‏ ‏ یشُم کا چاند بادل میں چھپائی
سفر کوں مستعد ہوا اس روش سوں ‏ ‏ ‏ چلی ڈھونڈ لیتی اس سجن کوں
...... پڑی دکھ غم کی آ سینے اپر سل ‏ ‏ ‏ چلی پھرتی جنگل کی ہو کو کو یل
جتنے تھے آشنایاں ہور لگانے ‏ ‏ ‏ لگے اس دیکھ کر افسوس کھانے
کہ یو نازک سندر نازک بیگاں کی ‏ ‏ ‏ یو نازک پھول کے نازک ٹھن کی
...... کدھیں پھولاں اپر چلتی جو جاوے ‏ ‏ ‏ پچھلے پاواں کوں آ کر تلملاوے
لو پاپی عشق کاں تے سر چڑیا اس ‏ ‏ ‏ بلاں کاتے ناگ برہے کا لڑیا اس

دکنی ادب میں یوں تو بعض اور مثنویوں کے قصے ہندوستانی ماحول سے ماخوذ ہیں اور ان میں عوامی روایات کو پیش کیا گیا ہے لیکن ابن نشاطی کی "پھول بن" اس لئے امتیازی شان رکھتی ہے کہ اس میں شاعر نے ایک ایسا قصہ پیش کیا ہے جو ہند ایرانی معاشرے کے ذوق و احساس کو آسودہ کر سکے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اشتراک سے جو مخلوط معاشرت ظہور پذیر ہوئی تھی، اس کو ابن نشاطی نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ "پھول بن" میں پیش کیا ہے۔ ابن نشاطی کی وطن پرستی اور ابنائے وطن سے وابستگی جگہ جگہ جھلک گئی ہے۔ وہ ہندوستانیوں کی بہادری، ان کی حق پرستی اور جانبازی کی دل کھول کر داد دیتا ہے وہ اپنے ہم وطنوں کی اس طرح ستائش کرتا ہے۔ ؎

ہمیں ہندی اگر جھگڑے پر آویں ‏ ‏ ‏ گھڑی میں مار مصریاں کوں بھگادیں
ہمارا فن ہے کرنا ترک تازی ‏ ‏ ‏ ہمارا کام ہے شمشیر بازی
ہمارے ماوتاں کرتے ہتیاراں ‏ ‏ ‏ ہمارے راوتاں دشمن شکاراں
دلیری میں ہوا ایسے ہیں دلیراں ‏ ‏ ‏ انن کوں دیکھیا جنگل بچھڑے شیراں
دلیری دیک ہر یک لشکری کی ‏ ‏ ‏ کمر ٹیٹی ہے دھماکاں سوں ہر یک کی
ہمارے لشکراں ایسے ہیں جنگی ‏ ‏ ‏ پلنگاں ان کنے سکتے پلنگی
نہیں چلک سوں کس کوں کام اس ٹھار ‏ ‏ ‏ انن کی بات سوں جھڑتی ہے انگار
...... شجاعت میں انن کوں دیکھئے تو ‏ ‏ ‏ ہر یک بجلی رہے دشمن لکھے دو
سروہی کوں صراحی بوجھتے ہیں ‏ ‏ ‏ سمجھتے ہے عدو کے لہو کوں کر مئے

اُردو ادب میں رزمیہ عناصر کی جو کمی تھی اس کو عظیم مرثیہ نگاروں مثلاً ضمیرؔ، دبیرؔ اور انیسؔ نے پورا کیا۔ اور شاعری میں جنگ کے مناظر اور رزمیہ منظر کشی یا تو مرثیہ نگاروں کے یہاں ملتی ہے یا پھر دکنی شاعروں کی تخلیقات میں جلوہ گر ہے۔ اس سلسلے میں نصرتی کا "علی نامہ" اور رستمی کا "خاور نامہ" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اول الذکر میں ایک بادشاہ اور موخر الذکر میں حضرت علی کے محاربے پیش کئے گئے ہیں۔ اور بنیادی طور پر ان دونوں مثنویوں کا مقصد رزم کی پیش کش ہے۔ اس کے برخلاف پھول بن رزمیہ مثنوی نہیں ہے اور قصے کے درمیان جنگ کے یہ مناظر ثانوی حیثیت کے حامل ہیں۔ اس کے باوجود ابن نشاطی نے جس سلیقے، صداقت پسندی اور دیدہ وری کے ساتھ واقعات نبرد کو پیش کیا ہے۔ اس سے اس کے فن کی پختگی، زبان پر قدرت اور زور بیان کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابن نشاطی آلات حرب و ضرب اور جنگ کی معرکہ آرائی سے واقف تھا اس لئے اس کے اشعار کو پڑھ کر اس کا احساس نہیں ہوتا کہ یہ محض سنی سنائی یا کتابی باتیں ہیں بلکہ ان

میں مشاہدے سے پیدا ہونے والی صحت، ایقان و اعتماد کا اثر نمایاں ہے۔ قدیم جنگوں میں چونکہ تلوار کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی تھی اس لئے مرثیہ نگاروں کی طرح دکنی مثنوی نگاروں کے مناظر رزم میں بھی اس کی تعریف و توصیف ملتی ہے۔ ابن نشاطی کے یہاں تلوار کی یہ تعریف ملاحظہ ہو:

لہوے کا جل جھلا نا دیکھ جھلکار ۔۔۔ دیا ہیں بوسے سمجھ کر دمن کے رخسار
ہماری تیغ کوں سے ناؤں او نا ۔۔۔ کہ اونا کسے رو کا م دونا
اہی تے اسکوں ہے سب ٹھار قیمت ۔۔۔ سنے کا پھول سو ہے اس کو جھت

جنگی باجوں کا یہ بیان بھی قابل ملاحظہ ہے۔

لگی یک دھرلے بھیں بھیں بھیر بجنے ۔۔۔ لگے دم دم دمامے سب گرجنے
اٹھیا چو پھیر پڑیا بوشس کا شور ۔۔۔ نقاریاں کا ہوا باجا ہوت زور
گیا بادل تلک یو شور ہور غل ۔۔۔ پڑیا غوغے سوں تس جگ میں تزلزل

ابن نشاطی دکن کے بلند پایہ شاعروں میں سے ایک ہے۔ "پھول بن" میں ابن نشاطی کی محاکات نگاری اور منظر کشی نے اس کی تصویروں کو پر اثر اور سدا بہار بنا دیا ہے۔ ابن نشاطی میں رزمیہ شاعری کی بڑی اچھی صلاحیتیں موجود تھیں اگر وہ رزم کو اپنا موضوع بناتا تو دکنی ادب کو اپنی بے مثل رزمیہ شاعری سے مالا مال کر دیتا۔ پھول بن جیسی عشقیہ مثنوی میں بھی جہاں رزم کا منظر دکھایا ہے وہاں ابن نشاطی اس کے آداب کو نہیں بھولتا۔ وہ جنگی باجوں، ہتھیاروں اور لوازمات جنگ سے بخوبی واقف ہے اس لئے جہاں موقع ملتا ہے۔ ان کے نام اور قسمیں گنانے سے نہیں چوکتا۔ اسی جزئیات نگاری کی وجہ سے رزمیہ مناظر زیادہ حقیقی اور سچے معلوم ہونے لگے ہیں۔ نبرد آزماؤں کے ہتھیاروں اور سامان مدافعت کا ذکر کرتے زیادہ حقیقی اور سچے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ نبرد آزماؤں کے ہتھیاروں اور سامان مدافعت کا ذکر کرتے ہوئے وہ جوشن، چار آئینہ، زرہ، تیر، نیزے بھالے، خنجر، تلوار گرز اور کیہ تازوں کے دوسرے ہتھیاروں کا مفصل ذکر کرتا اور اس سلسلے میں ایسی تشبیہات اور استعارے برتتا ہے جو ہندوستانی ماحول کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں مثلاً ابن نشاطی کہتا ہے کہ قد آور اور قوی الجثہ بہادروں کے ہاتھ میں نیزوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہاتھی کے منہ میں گنے کی چھڑیاں؛ ریچ یا دشمن کے سر میں پیوست شدہ تیر الٹا لٹک رہا ہے گویا مرغ کے سر پر لال کلغی ہو سپاہیوں کے جسم میں جا بجا دھنسے ہوئے تیروں نے انہیں سارسل تنے سے مشابہ بنا دیا ہے۔ جنگ کے معرکے میں لشکروں کا یہ تصادم ملاحظہ ہو۔ ابن نشاطی نے اپنے زور بیان سے مناظر کو متحرک اور گویا تصویریں پیش کر دی ہیں۔

یکایک دو طرف فتنہ اٹھیا جاگ ۔۔۔ اٹھی دو دھرتے جگ میں کے سلگ آگ
سلح پوشاں کی یوں دستی تھی فوجاں ۔۔۔ مگر سمندر کی آتی تھی موجاں
دلیراں کے دسے یوں تن پہ جوشن ۔۔۔ غضب کی آگ جوں کیتے ہیں روشن
سواں چار آئینے سوں مل دسے یوں ۔۔۔ اگن پانی میں تے نکلے رہے جیوں
نکل ایکہ تا زاں دو طرف سوں ۔۔۔ ہوئے لگے تیچے کر اپنی صف کوں
دلیری سوں دلیراں ہات میں ہات ۔۔۔ ملائے گرز ہور شمشیر کے ساتھ
کیس کا ٹیک چھاتی میں خنجر مار ۔۔۔ سو کر سوار سنتے تھے دلاں بھار

شاعر بھی

گیا آواز سو اسمان میں اسے — رکھے انگلیاں ملا تک کان میں لے

نہ صرف رزمیہ مناظر بلکہ قدرتی مناظر کی عکاسی میں بھی ابن نشاطی کی محاکاتی صلاحیت جزئیات نگاری اور منظر کشی کے سلیقے نے جان ڈال دی ہے۔ ابن نشاطی جب محلات اور باغات کی مرقع کشی کرتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم اسی ماحول میں سانس لے رہے ہیں۔ سمن بر کے باغ کا یہ سماں ملاحظہ ہو جیسے شاعر کی باریک بینی اور وسیع مشاہدے نے دکن کی توضیحی شاعری (DESCRIPTIVE) کا ایک خوبصورت نمونہ بنا دیا ہے ۔

ملن مد کی مستی آتی کر لالے	کھڑے تھے ہت میں لے شئے کے پیالے
چمن کے نرگساں آتی کر دو نار	لیسار انکھیاں کھڑے تھے نا پلک مار
تھی ہو کر منتظر آدے کو وہ دمن	دعا کرنے کو دس جیباں سوں سوسن
وہ نیں ہلتے تھے بن میں باد سوں سرو	تھے دستے دمن کے قد کے نادسوں سرو
بھنور پھولاں پو بیٹھے سود سے یوں	کہ کہہ پر گل رخاں کے خال ہے جیوں
بھرے پھولاں پو بلبل کھول یوں بال	کہ اڑتے ہیں پتنگ جیوں شمع ایرال

مختصر یہ کہ ابن نشاطی نے جہاں دربار کی پر کیف بزم طرب کا حال بیان کیا ہے یا باغوں، جنگلوں، محلوں، راگ راگنیوں کی محفلوں کی تصویریں پیش کی ہیں۔ وہاں اس کی وسیع معلومات، زبان پر قدرت، قافیے اور ردیف کو بے تکان استعمال کرنے کی صلاحیت اور قادر الکلامی کی داد دینی پڑتی ہے۔ اس کی معلومات اتنی وسیع اور ہمہ گیر ہیں کہ آلات حرب و ضرب اور جنگی باجوں سے لے کر کپڑوں کی مختلف قسموں، گھی کی اقسام، راگنیوں کی مختلف کیفیات، پھولوں کے رنگوں اور مختلف کھیلوں اور آلات موسیقی کا وہ بے تکان ذکر کرتا جاتا ہے اور اس طرح مثنوی میں خاصہ تنوع اور رنگا رنگی پیدا ہو گئی ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابن نشاطی ایک باشعور اور ذہین شخص تھا اس نے زندگی کے تلخ و شیریں تجربات سے بہت کچھ سیکھا تھا اور زندگی کے مزاج کو سمجھنے کی پر خلوص کوشش کی تھی" پھول بن" میں اکثر جگہ ایسے اشارے موجود ہیں جن میں اس کے اخلاقی مطمح نظر کا پتہ تو موجود ہے اور ساتھ ہی ساتھ زندگی کے قیمتی تجربات کا نچوڑ اور عطر بھی۔ مثنوی کے آخر میں شاعر کہتا ہے کہ میں نے یہ مثنوی تین مہینوں میں ختم کی امید کرتا ہوں کہ سخن فہم میری اس محنت کی داد دیں گے۔ ؎

ملا پھل بن تیں مہینے لگ لگایا — ہنر کا چاند ہو یہ پورا تو آیا

"پھول بن" کی زبان سیدھی سادھی اور پر اثر ہے۔ طرز ادا میں ندرت اور بے ساختگی پائی جاتی ہے، خوبصورت تشبیہوں اور برجستہ استعاروں نے ابن نشاطی کے طرز ادا کو شگفتہ، جاذب نظر اور پر کیف بنا دیا ہے۔

ابن نشاطی نے اپنی مثنوی میں اس بات کا افسوس ظاہر کیا ہے کہ اس کا شمار بادشاہ (عبداللہ قطب شاہ) کے منظور نظر شعراء میں نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اگر زمانے نے میرے جوہروں کی قدر کی ہوتی۔ مجھے فراغت نصیب ہوتی اور میرے فن کو سراہا جاتا اور مجھے اس کا صلہ ملتا تو پھر میں دنیا کو اپنے دل کے "زخموں کی بہار" دکھا دیتا اور زمانہ میری صلاحیتوں اور کمال فن کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا۔ ؎

حضوریاں میں مرا گر سلک اچھتا	گہر اندر اس کے مرا کلک اچھتا ۔
فراغت اس سنے گر مک منج کوں ہوتا	لے موتیاں خوب میں موتی پردتا
بڑیاں کے ناد گر اچھتا بڑا اپن	میحا کا دکھاتا بات میں فن
زمانہ نا سمج کر قدر ... مرا	بجھایا بے دلی سوں صدر میرا

فصیح اکمل (شاہجہاں پوری)

میرا عہد

یہ میرا عہد ہے یا آنسوؤں کا گہوارہ ؟
نہ صبحِ حسن بداماں نہ شامِ عیش بدوش
ہر ایک سمت ہیں زخموں کے لالہ زار کھلے
تمام آنکھیں پشیماں تمام لب خاموش

نہ روشنی کا یقیں ہے نہ تیرگی کا گماں
کھنچی ہوئی ہے ہر اک سمت ابروؤں کی کماں
نہ دوستی کا پتہ ہے نہ دشمنی کا نشاں
تمام چہروں پہ اک بیکسی کا عالم ہے
بس ایک سانس کا رشتہ ہے جو سلامت ہے
یہ اعتبارِ نفس بھی بہت غنیمت ہے
کہ اس سے ملتا ہے کچھ تو مزاجِ عہدِ رواں
صدائیں مہر بہ لب ہیں، نوائیں پژمردہ
دھواں دھواں سی فضا ہے، اڑی اڑی رنگت
برس رہی ہے رخِ کائنات پر حسرت

کسے پکاریں کہ اس منزلِ اداسی میں
نہ کوئی نقشِ قدم ہے نہ رہروِ مانوس
بجھا بجھا ہے متاعِ حیات کا فانوس
جو زندگی کا پتہ دے وہ رہگذر ہی نہیں
جو روشنی کی پیمبر ہو وہ سحر ہی نہیں
صبا کو صحنِ گلستاں کی کچھ خبر ہی نہیں
نہ کوئے شوق میں رونق نہ قتل گاہوں میں
نہ معبدوں میں اجالا نہ خانقاہوں میں
بس ایک سلسلۂ ناشناسئ مبہم
بکھر رہا ہے نگاہوں سے دل کی راہوں میں
نہ جیبِ وقت کھنگالو کہ عہدِ مایوسی
کرن کرن سے تمازت بھی چھین لیتا ہے
نظر نظر سے مروّت بھی چھین لیتا ہے
نفس نفس سے محبت بھی چھین لیتا ہے

چلو کہ مصلحتِ چارہ گر یہی ہوگی!
مرے نصیب میں شاید سحر یہی ہوگی!

▲

غزلیں

بدیع الزماں خاور

(نذرِ غالب)

طرزِ بیدل میں ہمیں خواہشِ تحریر نہیں
ہم بھی غالب ہیں، مگر معتقدِ میر نہیں
خامشی شرط ہے اظہارِ تمنّا کے لئے
لب رکھو بند کہ یہ موقعِ تقریر نہیں
ہر سحر گذری ہوئی رات کا انجام سہی
ہر اُجالا تو مرے خواب کی تعبیر نہیں
کیا کریں گے وہ گلستاں کی خرابی کے سوا
جن کے سینوں میں کوئی جذبۂ تعمیر نہیں
فتح کر لیں وہ دلوں کو تو کوئی بات بنے
چاند جن کے لئے ناقابلِ تسخیر نہیں
رُوح کو آج بھی احساسِ اسیری ہے بہت
میں نے مانا کہ مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

اُنہیں ذہنوں میں اُبھارو اُنہیں لب تک لاؤ
نام جو وقت کی تاریخ میں تحریر نہیں
ہو جو شہزادۂ فن، شہرِ غزل میں آئے
شاعری کچھ مرے اجداد کی جاگیر نہیں
سرگراں تو نظر آتے ہیں حوادث سے، مگر
ہم بھی کیا لوگ ہیں، آمادۂ تدبیر نہیں
بولتا ہے، نہ ہمیں چھیڑ کے خوش ہوتا ہے
شوخ تجھ سا تو، ترا پیکرِ تصویر نہیں
تیرہ آنکھوں کے لئے خاکِ وطن سے بڑھ کر
میں سمجھتا ہوں، کوئی سُرمۂ اکسیر نہیں
کیوں اِسے خلد ہمارا شرط نہ کہیئے خاور
ارضِ کوکن بھی کم از وادیٔ کشمیر نہیں

غلام مرتضیٰ راہی

زمین چین سے نہ تھی سکوں سے آسماں نہ تھا
مگر نگاہِ وقت میں، مرا قفس گراں نہ تھا

ہر ایک شئے عجیب آگ کی گرفت میں ملی
سُلگ رہی تھی چار سُو مگر کہیں دھواں نہ تھا

جُنوں سرشت، شہر شہر خاک چھاننے لگے
نظر میں وسعتیں نہ تھیں کہ دشت بیکراں نہ تھا

نہ جانے کتنے "آستینِ وقت" میں پلا کیے
ہوئی نہ پرورش مری کہ میں ضرر رساں نہ تھا

قدیم وسوسے دل و دماغ سے نکل گئے
بلندیوں کے راستے میں کوئی آسماں نہ تھا

حدِ تعیّنات سے پرے نگاہ تھی مری
ترے وجود سے الگ مرا کوئی نشاں نہ تھا

نکل گیا ہے دھول جھونک کر ہماری آنکھ میں
بجائے خود غبار تھا، غبارِ کارواں نہ تھا

صدائے بازگشت لے اُڑی مرے تاثرات
جہانِ بے نفس میں، کوئی میرا رازداں نہ تھا

▲

انیس رفیع

کاٹھ کے پتلے

یہ دکان ہے!

اِس دکان میں کاٹھ کی بنی ہوئی چیزیں بکتی ہیں۔

جہاں کاٹھ کی چیزیں بکتی ہیں وہاں ایک عجیب سی خوشبو رچ بس جاتی ہے۔ وہاں ایک ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک گھبیرتا بیچنے اور خریدنے والے کے چہرے سے جھانکتی ہے۔ خریدنے والا دام کے بوجھ سے دبتا نظر نہیں آتا۔ بیچنے والا اپنے ضمیر کے جھٹکے کا خوف نہیں کرتا، کیونکہ ان دونوں کے درمیان منافع کا دیوتا سانس نہیں لیتا۔ یعنی جہاں ایسا ہوتا ہے کہ زندگی کے راگوں کا تار ٹوٹتا نہیں ہے۔ زندگی اپنے اپنے لباس میں فٹ، آگے کی طرف بڑھتی جاتی ہے اور بس!

یہ دُکان ہے۔

اِس دکان میں کاٹھ کی بنی ہوئی چیزیں بکتی ہیں۔

اِس دکان میں کاٹھ کی ایک چوکھٹ ہے۔ چوکھٹ کے کناروں پر پیتل کے بیل بوٹے منڈھے ہوتے ہیں۔ سورج کی تپتی ہوئی روشنی اسے سونا بنا بنا کر آتے جاتے مسافروں کے دلوں پر اچھالتی جاتی ہے لیکن ان کے دلوں میں گٹھیلا پن کی جگہ ایک سکون کو جگا دیتی ہے یہ۔ اس سکون کو مسافر اپنے گھر دل تک لیجانے میں کبھی نہیں تھکتے، کیونکہ اس پیتل کے پیچھے نرم لکڑی کی ٹھنڈک جاگتی ہوتی ہے اور یہ ٹھنڈک ایئر کولر کی ٹھنڈک نہیں ہوتی۔

اور بس!

یہ دکان ہے۔

اِس دکان میں کاٹھ کی بنی ہوئی چیزیں بکتی ہیں۔

اِس دکان میں کاٹھ کا ایک دروازہ ہے۔ دروازہ بند ہے۔ خریدار آ کر اسے کھولتے ہیں اور بند کرتے ہیں۔ چلے جاتے ہیں۔ ہفتوں سے اسے کسی نے خریدا نہیں ہے۔ شاید یہ دروازہ غلط بن گیا ہے جو کسی گھر کے ناپ پر پورا نہیں اترتا اور اس میں فٹ نہیں ہو پاتا۔ یا پھر گھر غلط بن رہے ہیں۔ لکڑی کو تپا کر موڑا نہیں جا سکتا۔ لوہے کو گرما کر موڑا جا سکتا ہے اور اپنے غلط گھر میں بھی فٹ کیا جا سکتا ہے۔ لکڑی کے اس دروازے میں آخری کیل ٹھونک کر ایک طرف کر دیا گیا ہے۔ اب اسے کوئی کھول نہیں سکتا۔ کوئی بند نہیں کر سکتا۔ دیکھو اور چلے جاؤ۔ خریدو، اٹھوا لے جاؤ۔

اور بس!

یہ دکان ہے۔

اس دکان میں کاٹھ کی بنی ہوئی چیزیں بکتی ہیں۔

اس دکان میں کاٹھ کی ایک کھڑکی ہے جو منتظر ہے کہ کوئی اس سے آ کر جھانکے، مگر کوئی آیا نہیں۔ یہ کاٹھ کی ہے اس لئے اسے کوئی جلدی بھی نہیں۔ نہ اسے گرم ہوا کے جھونکے سے پھٹنے کا ڈر، نہ سرد ہوا سے گلنے کا خوف۔ کیا ہوگا کسی کے گھر سے لگ کر بھی۔ جس گھر شانتی چھوڑ چکوں، رومیو اور سمارٹ تان سین کی اُول جلول تانوں کا خوف لیکر جئے گی۔ اس طرح بھی جی لیتی کیونکہ اس کے دل میں شانتی ہے۔ وہ لکڑی کی بنی ہے اور شانتی کا گوارا ہوتا اسے چھو کر بھی نہیں گزرا لیکن ڈر رہا ہے اس بات کا ہے کہ جس گھر میں وہ جائے گی وہ راجن اور

مہاجنوں کا گھر ہوگا۔ ایسا وثوق کے ساتھ وہ اس لئے سوچتی ہے کہ اس کی ساخت ہی کچھ اس قسم کی ہے اور اس لئے بھی وثوق سے کہتی ہے کہ اسے جب کھڑکی کے قالب میں ڈھالا گیا تھا تو اسے صرف چھیل چھال کر ہی دکان میں سجا نہیں دیا گیا تھا بلکہ اسے ہزار طرح کی اذیتیں پہنچائی گئی تھیں اور اس وقت اس کی ایک مرحومہ سہیلی نے، جسے اس لئے جلا دیا گیا تھا کہ لاکھ کوشش کے بعد بھی اس کے بدن پر ابھارے گئے نقش و نگار گاہک کی پسند کو چھو نہ سکے تھے، مسکرا کر کہا تھا۔ تکلیف زیادہ ہو رہی ہے نا۔ ضرور رانی بنوگی" اور رانی بننے کے ڈر سے وہ لرزاں تھی، کیونکہ جیسے ہی وہ رانی بنی اس کے نرم دل میں لوہے کی موٹی موٹی چھڑ چبھو دی جائیگی اور وہ صدیوں اس کرب سے چیختی رہیگی۔ اس کے بیچ سے جھانکنے والے چہرے کبھی اُسے محسوس نہ کر پائیں گے اور بس!

یہ دکان ہے۔

اس دکان میں کاٹھ کی بنی ہوئی چیزیں بکتی ہیں۔

یہاں کاٹھ کی ایک رادھا ہے۔ کاٹھ کا ایک کرشن ہے۔ کاٹھ کی بانسری، کاٹھ کے ہونٹوں میں دبی ہے۔ کرشن پر نظر پڑتے ہی، گاہکوں کے روم روم میں رادھا تک جانیوالے پنگھٹ کے گیت، ٹھنڈ کی طرح اترنے لگتے ہیں۔ کاٹھ کی رادھا ایک ٹک کرشن کو تا لیجاتی ہے اور اس وقت تک تاکتی رہیگی، جب تک وہ بک نہ جائے۔ کون خریدتا ہے رادھا اور کرشن ایک ساتھ۔ لوگ کرشن کو چنتے ہیں، اور رادھا کو دیکھ بھال کے بعد خرید لیتے ہیں۔ اور بس!

یہ دکان ہے۔

اس دکان میں کاٹھ کی بنی ہوئی چیزیں بکتی ہیں

لکڑی کا ایک تاج محل ہے اور اس کے اوپر لکڑی کا ایک سر دچانڈ ٹنگا ہے۔ اسے دیکھنے والے وہ لوگ ہیں جو خیر سگالی کے مشن پر آتے ہیں۔ کاٹھ کی ملکہ الزابتھ، مسز جیکولین کینیڈی، شاہ سعود، خروشچیف، یوری گگارین ہیں سب کے سب کاٹھ کے۔ ماڈل کے دام ہزار سے کچھ اوپر ہیں۔ اور بس!

یہ دکان ہے۔

اس دکان میں کاٹھ کی بنی ہوئی چیزیں بکتی ہیں۔

کاٹھ کا ایک بڑا چرخہ ہے اس دکان میں۔ بہت بڑا۔ چرخے کے چکوں سے ریشمی ڈوری لپٹی ہے۔ ڈور چکوں پر پھسلتی جاتی ہے جھٹکے آتے ہیں۔ چکوں کو گھماتے ہیں۔ ریشمی ڈوریاں ناچتی ہیں۔ بہت خوب ناچتی ہیں۔ پھر پھر۔ پھر پھر۔ گاہک اسے خریدنا چاہتا ہے۔ لالہ بھائی جو اس دکان کا مالک ہے اسے نہیں بیچتا ہے کیونکہ اس نے اسپیشل آرڈر دے کر اُس باباجی کی یاد میں بنوایا تھا جس کے ایک اشارے پر اس کے اپنے بابا نے اسے اور اس کی ماں کو سدا کیلئے تیاگ دیا تھا، وہ گھر سے ماں کی چوڑی اتروا کر گئے تھے۔ اور بس!

یہ دکان ہے۔

یہ دکان ہے اور اس دکان میں کاٹھ کی بنی ہوئی چیزیں بکتی ہیں۔

دکان میں کاٹھ کا ایک گز بھر کا کھڑاؤں ہے۔ ہاتھی دانت کے ٹکڑے کھڑاؤں کے اوپری حصے میں اس طرح دبائے گئے تھے کہ اس پر دھوپ آگ آئی، پہاڑ کھڑے ہوگئے۔ ندیاں بہہ نکلیں، حاشیوں پر لال گلاب کی ٹھنڈک پھیل گئی۔ کھڑاؤں کھونٹی دار ہے۔ کھونٹی کا سر لٹو کا سا ہے، جس پر پاؤ بھر پیتل منڈھ کر بہت زیادہ بھاری اور گول کر دیا گیا ہے، سنہرے پیتل پر چاندی کے رنگوں سے دنیا کا ہر دیش ابھارا گیا ہے۔ جہاں ہندوستان ہے وہاں سے امن کا کبوتر اڑتا دکھایا گیا ہے۔ لوگ کاٹھ کے اس کھڑاؤں کو انسانی ہاتھ کا نادر کرشمہ سمجھ کر دکاندار سے کسی قیمت پر چھین لینا چاہتے ہیں۔ لیکن گاہک یہ نہیں جانتے کہ لالہ بھائی اسے بیچ نہیں سکتا۔ ہاں لالہ بھائی نے اس کھڑاؤں کو چومنے کی اجازت دے دی ہے۔ اس کھڑاؤں میں اس کے باپ کے گورو کی شانتی چھپی ہے۔ اہنسا چھپا ہے اور پھر اس کی خود اپنی امڈتی شردھا بھی اس سے جکڑی ہوئی ہے۔ آؤ اللہ کے بندو! مکڑی اس کھڑاؤں کے روپ میں جو آدرش تمہارے سامنے کھڑا ہے اس کے سامنے اپنے مستک ٹیک دو۔ یہ مہان ہے۔

لوگوں کو تعجب ہے۔ ایک چیز دکان میں سجی ہو اور بک نہیں سکتی! بڑھو یہ ہے۔ اور بس!

۲۔ اکتوبر سے کچھ روز پہلے!

وہی دکان ہے جس میں کاٹھ کی بنی ہوئی چیزیں بکتی ہیں۔

دکان میں آگ لگ چکی ہے۔ چوکھٹ، دروازہ، کھڑکی، رادھا، کرشن، تاج محل، خیر سگالی مشن پر آئے ہوئے لوگ، سب کے سب جل

(بقیہ صفحہ ۰۰ پر دیکھئے)

غزلیں

شہاب سرمدی

خدا کے نام پہ ہوتی ہے جب خداوندی
تو عافیت کا تقاضہ دلوں کی دربندی
نگاہِ شوق کو ترغیب دے گئی کیا کیا
شعاعِ مہر سے ذرّوں کی زود پیوندی
اسے میں کہہ نہ سکا، یا وہی سمجھ نہ سکے
کہ زندگی کا سہارا ہے آرزومندی
نئے لحاظ، نئے واسطوں کی فکریں ہیں
شعورِ رسمِ بزرگی و شانِ فرزندی
عیارِ علم و ہنر تھا یہ روحِ شاعرِ طوس!
زرِ امیر نہیں اعتبارِ ہنرمندی
یہ رات کیا تھا؟ کہ وہ آتے آتے ہی پوچھا
"بہ جانِ عشق بگو سرمدی کہ خورسندی"

مظفر حنفی

بجھنے لگے دیئے جو بگڑنے لگی ہوا
سائے میں روشنی کے کترنے لگی ہوا
اتنا اڑا غبار کہ شکوے ہی دب گئے
شرمندہ ہو کے ریت میں گڑنے لگی ہوا
کانٹوں نے اپنی خشک زبانیں نکال دیں
موتی جو برگ و بار پہ جڑنے لگی ہوا
مرنے کے بعد بھی نہ ملی قید سے نجات
چھوڑا تھا خاک نے کہ جکڑنے لگی ہوا
ذرّوں نے آسمان کو سر پہ اٹھا لیا
صحرا میں ایڑیاں جو رگڑنے لگی ہوا
بیٹھے جو ہم تو کوہِ ندا چیخنے لگے
چلنے لگے تو پاؤں پکڑنے لگی ہوا

کیف احمد صدیقی

یہ رات جیسے کوئی معبدِ شکستہ ہے
یہ چاند جیسے کسی دیوتا کا لاشہ ہے
یہ کائنات مری ذات پر ہے اک تہمت
یہ زندگی مرے دامن پہ ایک دھبہ ہے
ہر ایک سمت سمندر ہے تیری رحمت کا
مرا وجود گناہوں کا اک جزیرہ ہے
میں آفتاب ہوں سائے سمیٹتا ہوں مگر
اسی کو پا نہ سکا جو کہ اپنا سایہ ہے
نہ جانے کتنی ہی صدیاں گزر چکیں لیکن
صلیبِ وقت پہ مصلوب ایک لمحہ ہے
سسک رہی ہے کوئی لاش قبرِ ماضی میں
یہ تیری یاد کہ میری حیاتِ رفتہ ہے
تری غزل سے برستی ہے کیفؔ رحمتِ فن
تری غزل ہے کہ معبودِ شعر و نغمہ ہے

محمد شفیع ساغر

غالب اور ترقی پسندی

ایک غلط فہمی کا ازالہ

جولائی ۱۹۶۹ء کے 'شاعر' میں پروفیسر داؤد کشمیری کا مقالہ نظر سے گذرا جس میں انہوں نے غالب کو اُردو کا پہلا ترقی پسند شاعر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ موصوف کا مقالہ شدید طور پر تناقض PARADOX کا شکار ہو گیا ہے۔ منٹو نے عصمت چغتائی کے ڈراموں کی نسبت سے لکھا تھا کہ وہ ڈرامے کے ابواب کی تقسیم کرتے وقت قینچی سے کتر و بیونت نہیں کرتی بلکہ دانتوں سے اُن کے بے ترتیب ٹکڑے کرتی ہے۔ پروفیسر صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے وقت نہ تو قینچی سے کام لیا ہے اور نہ ہی دانتوں سے بلکہ ناخنوں سے اُن کی دھجیاں اڑائی ہیں۔

پورا مقالہ پڑھ لینے کے بعد بھی یہ واضح نہیں ہوتا کہ مقالہ نگار کیا کہنا چاہتا ہے۔ کبھی وہ غالب پر لکھی گئی تمام کتابوں کو غیر معیاری قرار دیتا ہے۔ کبھی اُردو کے پروفیسروں کو بُرا بھلا کہتا ہے۔ کبھی غالب کے اشعار یاد نہ ہونے پر قاری کو سخن فہموں کے زمرے سے خارج کر دیتا ہے۔ کبھی غالب کے شارحین کو ناقابلِ اعتنا قرار دیتا ہے۔ کبھی ہمارے علمی اور ادبی پس منظر کو کوستا ہے، کبھی شیکسپیئر پر لکھی گئی کتابوں کا موازنہ غالب پر لکھی گئی کتابوں سے کرتا ہے۔ کبھی اُردو تنقید پر نکتہ چینی کرتا ہے اور اس ضمن میں اُس کی کم مائگی پر آنسو بہاتا ہے۔ کبھی غالب کے مطلع کی بے وجہ اور غیر ضروری تضمین کر کے اپنی شعری لیاقت کا بھرم کھولتا ہے۔ کبھی اپنی مسلّم ادبی اور علمی حیثیت قارئین سے منوانے کے لئے سطریں کی سطریں سیاہ کرتا ہے۔ کبھی امیجری اور اصطلاح سے بحث کرتا ہے، کبھی غالب کے اشعار کا موازنہ شکیل اور جعفری کے اشعار سے کرتا ہے اور انہیں باتوں میں ترقی پسند نظریے کے چند اصول منتخب کر کے اُن کا اطلاق غالب کے اشعار پر کر کے غالب کو پہلا ترقی پسند شاعر ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔

اُردو شاعری کے بارے میں کہتے ہیں: "غالب اب اُس محور کی شکل اختیار کر گیا ہے جس پر ہماری شاعری گردش کر رہی ہے۔" ہمارے ذہن میں یہ جملہ پڑھ کر فوراً یہ سوال اٹھتا ہے کیا اُردو نے غالب کے علاوہ کوئی قابلِ تقلید شاعر پیدا ہی نہیں کیا اور کیا ہمارے موجودہ شعراء خرمنِ غالب ہی کی خوشہ چینی میں مصروف ہیں؟ اپنے اس بیان کو وہ ایک نظریہ بتاتے ہوئے دیوانِ غالب کے الہامی مرتبے کو متضاد قرار دیتے ہیں۔ بجنوری کے بیان کو تحسینِ محض نہیں گردانتے اور یہ بھول کر کہ انہوں نے اس سے پہلے کیا لکھا ہے، آگے کہتے ہیں:

"لیکن اس وقت تو گویا قیامت ہی ٹوٹ پڑتی ہے جب تنقید نگار ادیب کی تحسین پر اس طرح آمادہ ہو جاتا

ہے جیسے وہ اپنے کسی رشتے دار کی حمایت کر رہا ہے۔ تنقید نگار ڈھونڈ ڈھونڈ کر ادیب کی شخصیت کے وہ پہلو سامنے لاتا ہے کہ اگر ان آئینوں میں ادیب خود اپنی صورت دیکھے تو پہچاننا دشوار ہو جائے بے ساختہ اُسے ہنسی آ جائے کہ اس کا چہرہ اس قدر مضحکہ خیز ہے ....

جنہوں نے بجنوری کی محاسنِ کلامِ غالب پڑھی ہے وہ بآسانی کہہ سکتے ہیں کہ مندرجہ بالا بیان کی حقیقت کا اطلاق کس طرح پورا پورا اس کتاب پر ہوتا ہے۔ بجنوری کی تنقید کسی طرح بھی غیر جانب دارانہ تنقید کہلائے جانے کی مستحق نہیں کیونکہ اس میں عقیدت اور تخیل نے بیشتر مقامات پر گلکاریاں کی ہیں۔ فاضل مقالہ نگار ایک مقام پر اس طرز تنقید کو مضحکہ خیز بھی بتاتے ہیں اور ساتھ ہی اس کی حمایت بھی کرتے ہیں ... ایں چہ بوالعجبی است!۔

غالب کی عظمت اور اہمیت کے انہیں دو مظاہر نظر آتے ہیں۔ ایک مظہر سیکڑوں کتابیں اور مقالے ہیں جو غالب پر لکھے گئے ہیں۔ دوسرا مظہر صد سالہ جشنِ غالب کی مساعی جمیلہ ہیں .... غالب واقعۃً عظیم ہیں لیکن ان مظاہر کے تحت نہیں۔ آتش پر بمشکل دو تین کتابیں اور دس بارہ مقالے لکھے گئے ہوں گے۔ مومن کی صد سالہ برسی ہم نے اب تک نہیں منائی کیا اس سے ہم یہ مطلب اخذ کریں کہ آتش و مومن اور ان کے جیسے دسیوں شعرا نے اپنی عظمت منانے کے لیے عوام اور شعرا کے دلوں میں ایسی کوئی تحریک پیدا نہیں کی۔

مقالہ نگار اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ اردو ادب میں غالب کی شخصیت ہی ایسی ہے جس پر سب سے زیادہ مقالے اور کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن اس کے باوجود موصوف کا الزام ہے کہ غالب پر کیا گیا کام مایوس کن اور غیر معیاری ہے۔ جب غالب پر کیا گیا اتنا تنقیدی کام قابلِ اعتنا نہیں تو دوسرے شعرا اور ادبا جو ناقدین کی مخصوص نگاہِ التفات سے محروم ہیں، کس سے اپنی محرومیٔ قسمت کی شکایت کریں۔

ایک اچھا نقاد کبھی کوئی قطعی دعویٰ نہیں کرتا۔ ایسا دعویٰ جو کوئی ثبوت پیش کیے بغیر کیا جائے موجبِ تضحیک بن جاتا ہے۔ موصوف کا یہ سوال "کتنے اردو کے پروفیسر ایسے ہیں جنہوں نے سرسری طور پر ہی سہی دیوانِ غالب کو ابتدا سے آخر تک پڑھا ہے؟" ایک ذمہ دار نقاد کے شایانِ شان نہیں۔ حیرت ہے کہ دو چار پروفیسروں کا سرسری مطالعہ کر کے انہوں نے تمام پروفیسروں کے متعلق یہ خیال قائم کر لیا۔

اردو داں طبقوں میں خصوصاً اردو ناقدین میں ایک عام مرض ہے کہ وہ قارئین کو مرعوب کرنے اور اپنی لامحدود قابلیت کے اظہار کے لیے انگریزی ادب اور اس کے ادیبوں اور شاعروں کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اردو تنقید میں یہ بات فیشن کی طرح داخل ہو چکی ہے۔ جس تنقیدی مقالے میں دو چار انگریز مصنفوں کے نام حوالے کے طور پر پیش نہ کیے جائیں وہ اعلیٰ قسم کا نہیں مانا جاتا۔ انہوں نے یہاں غالب پر لکھی گئی کتابوں کا موازنہ شیکسپیر پر لکھی گئی کتابوں سے کیا ہے اس کی روشنی میں انہیں غالب پر کیا گیا تمام تنقیدی کام (جس میں ان کے موکل بجنوری کی کتاب بھی شامل ہے) غیر معیاری اور مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ یہاں موصوف نے تناسب کی غلطی کی ہے۔ انگریزی ایک بین الاقوامی زبان ہے اور شیکسپیر اس زبان کا بہت بڑا فطین مانا جاتا ہے اس لیے اس پر کیے گئے کام کا تناسب یقیناً اردو جیسی زبان سے جسے مشکل سے گنتی کے اہلِ ذوق (یہاں میں مقالہ نگار سے متفق ہوں) میسر آئے ہیں، کم معیاری اور اس سے کم مقدار میں ہوگا۔ اس کے باوجود غالب پر جو کام ہوا ہے اس کی اہمیت اور افادیت سے کوئی بہت بڑا عالم اور فطین ہی انکار کر سکتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سے موجودہ ناقدین کا طرزِ تحریر ایسا ہی ہے جیسا موصوف نے بیان فرمایا۔ اُردو تنقید کی کشتی لفاظی اور اصطلاحات کے گرداب میں پھنس کر رہ گئی ہے۔ اس کمزوری کو دُور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ایسا طرزِ تحریر اختیار کیا جائے جو ان خامیوں سے اپنا دامن بچا کر چلے۔ اصطلاحوں اور لفاظی کے طرز کو بُرا کہنے والے خود اپنے دام میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ لفاظی اور مبہم اصطلاحات کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیے:

"GENTLE MADNESS کے ساتھ ایک فرزانگی بھی صطائی، ایسی فرزانگی جس میں تقدّس اور خلوص تھا اور اس طرح ہماری شاعری پہلی بار جمال کے ساتھ جلال سے بھی رُوشناس ہوئی۔"

سمجھ میں نہیں آتا کہ GENTLE MADNESS میں جمال ہے یا جلال اور اگر دونوں میں سے کوئی ایک ہے تو وہ کس طرح ممکن ہے؟

ایک جگہ اور کہتے ہیں:

"فیض اور جعفری کے علاوہ بھی ترقی پسندوں نے غالب کے پیچھے نماز پڑھنا چاہی لیکن ان کی بغلوں میں اشتراکیت کے بُت تھے اس لئے ان کی نماز قبول نہ ہوئی اور آخر کار انہیں بغلیں جھانکنے پر مجبور ہونا پڑا۔"

"بغلوں کے بُت" اور "بغلیں جھانکنا" سے امانت کی یاد تازہ ہو گئی۔ ایسا لگا جیسے ہم کسی خانقاہ سے نکل کر کسی کی خلوت گاہ میں داخل ہو گئے ہوں۔

یہ اور ایسے کئی جملے اِس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ ترقی پسند ادیبوں (بقول خود) کی طرح ان میں بھی نظریے اور عمل کے درمیان تضاد پایا جاتا ہے۔

عالم بے عمل ہر دَور اور ہر مقام میں خطرناک تسلیم کیا گیا ہے۔ آپ موجودہ ناقدین کے بارے میں کہتے ہیں کہ اُن کی تنقیدوں میں ان کی اپنی شخصیت زیادہ اُبھرتی ہے۔ ان کے مقالے کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اُنہوں نے غالب کے بارے میں صرف ایک بات بتائی ہے کہ وہ اُردو کا سب سے پہلا ترقی پسند شاعر ہے لیکن اپنے بارے میں . . . . وہ مندرجۂ ذیل باتیں بتاتے ہیں۔

(۱) وہ پروفیسر واقع ہوئے ہیں۔

(۲) پروفیسر ہونے کے باوجود وہ اِس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ اُردو کے پروفیسروں نے دیوانِ غالب پورا نہیں پڑھا ہے یعنی در پردہ وہ یہ ثابت کرنے چاہتے ہیں کہ کم از کم اُنہوں نے دیوانِ غالب "سرسری طور ہی پر سہی" ابتدا سے آخر تک پڑھا ہے۔

(۳) عام قاری کی حالت بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ "ان کا ادبی ذوق تربیت یافتہ نہیں، سخن فہمی کا ملکہ بھی نہیں، پھر کوئی کیا غالب کو سمجھے اور اس پر تنقید کرے۔"

اِس سے دو گمان گذرتے ہیں۔ اوّل یہ کہ اُنہوں نے بھی غالب کو نہیں سمجھا اور اوٹ پٹانگ تنقید لکھ دی۔ دوم یہ کہ وہ غالب کو سمجھ چکے ہیں اور اِس لئے تنقید فرما رہے ہیں۔ چنانچہ اُن کا ادبی ذوق تربیت یافتہ ہے اور انہیں سخن فہمی کا ملکہ بھی ہے۔

(۴) ان کی تنقید میں لفاظی اور اصطلاح کا اِبہام نہیں ہے۔

(۵) یہ ایک اچھے قلم کار ہیں جنہیں خداداد لیاقت وصلاحیت ملی ہے اور یہ پروفیسروں سے اُردو تنقید اور غالب کو نجات دلانے کے لئے اپنی مجبوریوں اور محرومیوں کے باوجود آگے آئے ہیں۔
(۶) اُنہوں نے اردو تنقید میں اصطلاحوں کا مسئلہ" نامی ایک مضمون بھی لکھا ہے۔
(۷) انہوں نے بمبئی یونیورسٹی میں ڈی۔لٹ کے لئے "اُردو شاعری میں امیجری" پر بھی کام شروع کر دیا ہے۔

ترقی پسندی کا جو مفہوم اُنہوں نے پیش کیا ہے وہ قطعی درست نہیں ہے۔ کہتے ہیں "ترقی پسندی کے عام طور پر دو مفاہیم اُردو ادب میں مروّج ہیں"۔ اُنہوں نے ترقی پسندی کے جن دو مفاہیم کو پیش کیا ہے کیا واقعی وہ مروّج ہیں؟ کن کن ادیبوں یا نقادوں نے ان دونوں مفاہیم کی نشان دہی کی ہے؟ فرماتے ہیں" ادب کو مقصدیت اور افادیت کا حامل ہونا چاہیئے"۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا غالب کی شاعری مقصدیت اور افادیت کی حامل تھی؟ پھر کہتے ہیں" یہ مقصدیت وافادیت ماحول کی عکاسی سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ دعویٰ بجائے خود محلِ نظر ہے۔ ہر وہ ادب جس میں ماحول کی عکاسی ہو ضروری نہیں کہ وہ مقصدی بھی ہو۔ مثنوی سحرالبیان میں جاگیردارانہ تہذیب کی بھرپور بلکہ جاندار عکاسی ملتی ہے۔ میر کی وہ مثنوی جس میں اُس نے اپنے گھر کا رونا رویا ہے اُس میں بھی زندگی کی عکاسی ملتی ہے۔ نظیر کی پوری شاعری اسی سے بھری پڑی ہے۔ کیا ہم اس قسم کے ادب کو مقصدی یا افادی کہیں گے؟ پھر لطف کی بات تو یہ ہے کہ غالب نے کب ماحول کی عکاسی کی ہے؟ غالب بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور غزل میں ماحول کی عکاسی کی گنجائش ہی کہاں ہے؟ پھر عجیب بات تو یہ بھی ہے کہ ترقی پسندی کا محدود مفہوم بیان کرتے ہوئے داؤد صاحب لکھتے ہیں کہ یہ ادب کو سیاست کے خارزار میں اُلجھا دیتا ہے۔ کیا مقصدی ادب سیاست کے خارزار میں اُلجھنے سے محفوظ رہ سکتا ہے؟ اگر ادب کو سماجی فریضہ سمجھ لیا جائے تو سماج پر سیاست کی پرچھائیاں پڑتی ہی ہیں، اس لئے ادیب کوئی نہ کوئی سیاسی مسلک اختیار کرنے پر مجبور ہوگا۔ غالب نے ادب کو نہ تو سماجی فریضہ سمجھا (شاعری کو معنی آفرینی سمجھنا سماجی فریضہ نہیں ہے) اور نہ یہ تصور ان کے زمانے میں تھا۔ ان کو شاید اس کا احساس ہے اسی لئے سب سے زیادہ زور انہوں نے اس بات پر دیا ہے کہ ترقی پسند ادیب انسانیت کا ترجمان ہوتا ہے اور اسی بنیاد پر اُنہوں نے غالب کو اُردو کا پہلا ترقی پسند شاعر ثابت کرنا چاہا ہے۔ اگر اسی کو ترقی پسندی کہتے ہیں تو مولوی نذیر احمد اُردو ادب کے سب سے پہلے ترقی پسند ہیں کیونکہ توبۃ النصوح، بنات النعش، مراۃ العروس اور ابن الوقت نہ صرف انسانیت کی ترجمانی کرتے ہیں بلکہ وہ زندگی کی اعلیٰ اقدار کے بھی ضامن ہیں اور اس اصول کو اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو غالب کا ترقی پسند ہونا خود بخود زائل ہو جاتا ہے کیونکہ ہمیں غالب کے یہاں انسانیت کی ترجمانی نہیں ملتی بلکہ زندگی کے مختلف پہلو نظر آتے ہیں۔ غالب زندگی من وعن پیش کرتے ہیں اور اپنی جانب سے کسی مسئلے کا حل پیش نہیں کرتے۔
آگے چل کر کہتے ہیں کہ غالب سے پہلے "انسان" ہماری شاعری کا کبھی موضوع نہ رہا۔ (ایسے موقع پر ایک غیر پروفیسر "موضوع نہیں رہا" لکھتا) حالانکہ میر نے اس سے بہت پہلے کہا ہے۔
مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں   تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ساتھ ہی وہ یہ لکھتے ہیں کہ انسان کی انانیت اور عظمت کا جذبہ غالب ہی کی شاعری میں پہلی بار نظر آتا ہے۔ غالباً مندرجۂ بالا شعر موصوف کی نظر سے کبھی نہیں گذرا۔

ہیئت اور موضوع یا مواد ادب میں دو مختلف چیزیں ہیں۔ دونوں اپنی اپنی جگہ انتہائی اہم ہیں۔ ہیئت اور موضوع کو انگریزی میں بالترتیب MATTER اور FORM کہتے ہیں۔ یہ مسلّم امر ہے کہ غالب کی مدوّن شاعری غزل کے میدان تک ہی محدود ہے اور ہم نے اس کی عظمت کا اندازہ صرف اس کی غزلوں سے لگایا ہے۔ جہاں تک MATTER کا تعلق ہے بلاشبہ ہمیں غالب کے یہاں روایتی رجحانات اور تقلید کے خلاف بغاوت واضح طور پر محسوس ہوتی ہے لیکن FORM میں غالب نے کوئی تبدیلی نہیں کی۔ FORM یا ہیئت میں تبدیلی ہمیں حالی کے بعد ملتی ہے جب انگریزی FREE VERSE سے متاثر ہو کر ہمارے شعرا نے بھی معرّیٰ نظمیں کہیں۔ ان میں اسمٰعیل میرٹھی اور عبدالحلیم شرر کے نام سرِفہرست ہیں۔ ان کی روشنی میں موصوف کا مندرجۂ ذیل جملہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

"پھر غالب ہی نے پہلی بار موضوع کے ساتھ ہیئت پر بھی خاطر خواہ توجہ دی اور شاعری میں احساس و جذبہ کے ساتھ فکر و شعور کی آمیزش کی۔"

مقالہ نگار نے غالب کو ترقی پسند ثابت کرنے کے لئے ترقی پسندی کے مختلف پہلو پیش کئے ہیں۔ ایک جگہ کہتے ہیں: "غالب کا ذہن اس اعتبار سے بھی ترقی پسند تھا کہ اس نے فرسودہ روایات اور باطل عقائد سے یکسر قطع تعلق کر لیا۔ خضر کی پیروی ترک کی، تنگ نظری منصور کی تقلید کو معیوب سمجھا۔" اگر ترقی پسند ہونے کی ایک دلیل خضر اور منصور کی پیروی سے منحرف ہونا ہے تو دورِ متقدمین کے شعرا بھی ترقی پسند تھے

بیٹھا تھا خضر آکے مرے پاس ایکدم — گھبرا کے اپنی زیست سے بیزار ہو گیا
آجائے ایسے جینے سے اپنا تو جی ہے تنگ — جیتا رہے گا کب تئیں اے خضر مر کہیں

درد

منصور بھی جو ہوں تو انا الحق کہیں نہ ہم — اپنے طریق میں نہیں یہ ما و من درست

آتش

غالب کو ترقی پسند ثابت کرنے کے لئے ان کا "ڈکشن" (غالباً ڈکشن کے لئے موصوف کو اردو میں کوئی لفظ نہ مل سکا) ثبوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور یہاں بھی ایک ٹھوکر کھائی ہے۔ لکھتے ہیں:

"غالب پہلا شاعر ہے جس نے دار و رسن، جنوں، مقتل، طوق و دار، زنجیر، زنداں، لہو، تیغ و کفن، قید و بند، اہلِ جفا اور کوچۂ دلدار کے الفاظ استعمال کئے ہیں، کثرت سے اور اپنے بھرپور ترقی پسند معنی میں! غالب کا وحشی ہی فیض اور جعفری کے یہاں 'دلِ وحشی' بن گیا ہے۔"

غالباً پروفیسر داؤد نے سرسری طور پر ہی سہی دیوانِ غالب کو ابتدا سے آخر تک نہیں پڑھا ہے ورنہ وہ ایسی مکرر اور بے معنی بات کبھی نہیں کہتے۔ نیز ان کا یہ جملہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ انہوں نے غالب سے پہلے کے اردو شعرا کے کلام کو بھی نہیں پڑھا ہے۔ وہ لوگ جنہیں غالب سے ذرا سی بھی دلچسپی ہے اس بات کو جانتے ہیں کہ غالب نے اپنے پورے دیوان میں "دار و رسن" کی ترکیب صرف ایک بار [illegible] غزل میں استعمال

کی ہے۔ اس کے علاوہ یہ الفاظ دوسرے شعراء کے یہاں بھی کثرت سے ملتے ہیں اور ان سے بھی زندگی کے پہلو نمایاں ہوتے ہیں :

جنوں اور لہو سے

اب کی بہار میں یہ ہوا جوشِ جنوں   سارا لہو ہمارے بدن سے نکل گیا
ناسخ

تمام عمر پیا میں نے غم میں خونِ جگر   جہاں میں نام مگر رندِ بادہ خوار ہوا
ناسخ

جوشِ جنوں میں اس سے گیا ہائے مصحفی   یہ سر رہا ہمیشہ طلب گار سنگِ دشت
مصحفی

کوئی دن اور کر نے دو جنوں مجھ کو بہاراں میں   جبث سیتے ہو اس کو کیا رہا ہے اس گریباں میں
یقین

پی گئی کتنوں کا لہو تیری یاد   غم ترا کتنے کلیجے کھا گیا
درد

نہیں بھولا ہے جنوں میں وہ حواس اڑ جانا   یاد ہے بر ہمیٔ صحبتِ اصحاب مجھے
آتش

زنداں، قید و بند، زنجیر :

صنم کوچہ ترا ہے اور میں ہوں   یہ زنداں دغا ہے اور میں ہوں
بھاگے ہم زاہد تری مسجد کو زنداں جان کر   دیکھ کر تسبیح کو زنجیر کا دھوکہ ہوا
ناسخ

ستم ہے قید کرنا اس طرح کے مرغِ ناداں کو   کہ جو مارے بھلائی کے قفس کو آشیاں سمجھے
یقین

ہم قیدی بھی موسمِ گل کی کب سے توقع رکھتے تھے   دیر بہار آئی اب کی، پہ اسیروں کی نہ رہائی ہوئی
میر

تیغ و کفن، وحشی :

ہوں وہ وحشی عمر بھر بھولا رہا پوشاک کو   جب کفن پہنا تو مجھ کو پیرہن یاد آ گیا
ناسخ

وحشی تھے بوئے گل کی طرح سے جہاں میں ہم   نکلے تو پھر کے آئے نہ اپنے مکاں میں ہم
آتش

دار و رسن :

واقعہ منصور کا سن کر کھلا ہم پر یہ راز   حق کہے سے آدمی ہوتا ہے قابل دار کے
آتش

نہ فقط چاہ مجھے قامتِ دلدار کی تھی ۔۔۔ مثلِ منصور زمانے کو ہوس دار کی تھی
ناسخ

موصوف نے اپنے بیان کے ثبوت میں غالب کے بہت سے اشعار نقل کئے ہیں لیکن انتہائی افسوس ہوتا ہے جب وہ غالب سے متعلق چند مفروضہ و غیر مفروضہ خیالات و حقائق کو ثابت کرنے کے لئے ایسے اشعار پیش کرتے ہیں جو خود اُن کے بیان کی تکذیب کرتے ہیں۔ وہ غالب کو فراخ دل کہتے ہیں۔ اُنہیں زندگی کی حقیقتوں کا ترجمان اور رجائیت کا علمبردار بتاتے ہیں اور ساتھ ہی یہ شعر پیش کرتے ہیں ؎

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں ۔۔۔ گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

گوشہ نشینی اور ترکِ دنیا، غیر ضروری فقر اور تباہ کن قناعت کا جو منفی نظریہ ایک عرصے تک ہمارے ذہنوں کو مسموم کئے ہوئے تھا، اس شعر میں بھی اپنی جولانیاں دکھاتا ہے۔ اِس کے ساتھ ہی مقالہ نگار کا وہ جملہ یاد آجاتا ہے جو انہوں نے غالب کی رجائیت کے سلسلے میں استعمال کیا ہے:

"غالب کی رجائیت ہی فیض اور جعفری کے یہاں نظامِ نو کی بشارت کے رُوپ میں ظاہر ہوئی ہے۔"

جہاں تک غالب کی رجائیت کا سوال ہے وہ اپنے خالص مفہوم میں ہمیں غالب کے یہاں نہیں ملتی۔ ہم اُن کے زندگی سے مردانہ وار مقابلہ کرنے کے عزم کو رجائیت کے نام سے معنون کر سکتے ہیں لیکن اس کے باوجود رجائیت کا مفہوم تشنہ ہی رہ جاتا ہے۔ زندگی سے مقابلہ کرنے کے عزم بھی اُن کے یہاں اس لئے پایا جاتا ہے کہ وہ زندگی کے مقابلے میں خود کو مجبور محسوس کرتے ہیں۔ اُن کا زندگی سے مقابلہ کرنا اس لئے نہیں ہے کہ وہ مقابلہ کرنے اور زندگی کو شکست دینے ہی کو بہادری کا جوہر گردانتے ہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ مقابلہ کرنے پر مجبور ہیں اور "تنگ آمد بجنگ آمد" کے مصداق وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں ؎

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی ۔۔۔ نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

اس کے علاوہ اگر ہم غالب کے مندرجہ ذیل اشعار کا مطالعہ کریں تو غالب کے مطمحِ نظر سے بخوبی واقف ہو سکتے ہیں:

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجے ۔۔۔ ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

ہمہ ناامیدی، ہمہ بدگمانی ۔۔۔ میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام ۔۔۔ دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

مجھے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا ۔۔۔ وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

خزاں کیا، فصلِ گُل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو ۔۔۔ وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

بس ہجومِ ناامیدی خاک میں مل جائے گی ۔۔۔ وہ جو اک لذت ہماری سعیٔ لاحاصل میں ہے

کوئی امید بر نہیں آتی　　　کوئی صورت نظر نہیں آتی

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید　　　ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

یہ اور اس طرح کے بہت سے اشعار جو معمولی سی کاوش کے بعد مل سکتے ہیں، موصوف کے اس نظریے کی تکذیب کرتے ہیں جو انہوں نے غالب کی رجائیت کے بارے میں قائم کیا ہے۔ "رہیے اب ایسی جگہ ..... الخ" اور "اسے تازہ واردان ....." الخ۔ یہ دونوں قطعات غالب کی ناامیدی، قنوطیت اور شدتِ اندوہ کا تاثر پوری طرح اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں اور باوجود کوشش کے ہمیں ـــ

بیا کز نیست دوامے بدیں نشاط و ملال　　　بیا کہ نیست ثباتے بدیں بیاض و سواد

قسم کے اشعار زیادہ تعداد میں نہیں ملتے۔

وہ خصوصیات جو جدید نقادوں نے صرف غالب ہی سے منسوب کر دی ہیں، غالب سے پہلے کے شعراء کے یہاں بھی ملتی ہیں۔ خاص طور سے رشک کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ غالب کا ایک مخصوص جذبہ ہے جو ہمیں صرف غالب ہی کے یہاں ملتا ہے۔ حالانکہ غالب کے اس مشہور شعر کے مقابلے میں ناسخ کا شعر بھی مل جاتا ہے۔

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں　　　ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

ناسخ کہتے ہیں:

رشک سے نام نہیں لیتے کہ سن لے نہ کوئی　　　دل ہی دل میں اسے ہم یاد کیا کرتے ہیں

مقالہ نگار غالب کے اس شعر سے

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں　　　تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

سے غالب کو تحت الشعوری طور پر ترقی پسند ثابت کرتے ہیں۔ اس شعر میں شاعر غمِ جاناں سے زیادہ غمِ دوراں کو تکلیف دہ قرار دیتا ہے۔ یہ کوئی ایسی نئی بات نہیں ہے۔ اردو شعرا کے دواوین ایسے خیالات سے پُر ہیں۔ مندرجۂ ذیل شعر جو یقین اور سودا دونوں سے منسوب ہے، غمِ دوراں کی کتنی سچی منظر کشی کرتا ہے ـــ

فکرِ معاش، عشقِ بتاں، یادِ رفتگاں　　　دو دن کی زندگی میں کوئی کیا کیا کرے

علاوہ بریں صرف میر درد کے یہاں جو خالص تصوف کے شاعر ہیں، اس قسم کے لاتعداد اشعار ملتے ہیں ـــ

آیا نہ اعتدال پہ ہرگز مزاجِ دہر　　　میں گرچہ گرم و سردِ زمانہ سمو گیا

حادثۂ زمانہ کیا، تیری جفا سو کیا بلا　　　ہم کو سپہرِ مت ڈرا، نیش بھی یاں پہ نوش ہے

طریق اپنے پہ اک دورِ جام چلتا ہے　　　وگرنہ جو ہے سو گردش میں ہے زمانے کی

کوئی دن اور بھی ہم کو پھرا اے گردشِ دوراں　　　نہیں اٹھنے کے پھر ہرگز کہیں اب کی اگر بیٹھے

حکایت لذیذ نہ ہونے کے باوجود دراز تر ہوتی جا رہی ہے۔ لہٰذا چاہتا ہوں کہ اسے یہیں ختم کر دوں۔ آخر میں اتنا عرض کروں گا کہ پروفیسر داؤد کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے "میں اپنی مجبوریوں اور محرومیوں کے باوجود آگے آیا ہوں تاکہ پروفیسروں سے (خصوصاً پروفیسر داؤد سے) اردو تنقید اور غالب کو نجات دلا سکوں۔" ـــ

عبدالرب صدا

آزادی کے پہلے اور بعد!

میں نے کل خواب میں زنجیرِ غلامی پہنے
اپنی تقدیر بدلنے کی جسارت کی تھی
گونج نعروں کی فضاؤں میں سمو کر میں نے
ہر غلامانہ روایت سے بغاوت کی تھی

ظلم کی کند چھری کو بھی لگایا دل سے
توپ کے سامنے سینہ بھی اڑایا میں نے
سرخ لوہے پہ تپایا یہی کندن سا بدن
دار کا پھندہ بھی "جے مالا" بنایا میں نے

مجھ کو منظور نہ تھا مشرقی انساں کا نصیب
اہلِ مغرب کے اشاروں کا ہی محتاج رہے
اِس طرف بھوک تڑپتی رہے روٹی کیلئے
اُس طرف عیش رہے تخت رہے تاج رہے

مجھ کو منظور نہ تھا میرے وطن پر کوئی
اپنی عیار سیاست کا فسوں بُنتا رہے
دیش والے تو رہیں مفلس و قلاش مگر
آکے "پردیسی" یہاں لعل و گہر چُنتا رہے

میری ان آنکھوں نے "گاندھی" کا سراپا دیکھا
میرے کانوں نے اہنسا کی صدائیں بھی سنیں
میں نے زنجیرِ غلامی بھی پگھلتے دیکھی!
میرے احساس نے آزاد نوائیں بھی سنیں

صبح ہر ایک کرن ساز بجاتی آئی
زندگی نغمۂ آزادی سناتی آئی

بھائی چارے نے ہر اک دل میں کیا گھر اپنا
رگِ احساس میں گرمئ محبت جاگی
درد نے سیکھ لیا زخم کا مرہم بننا
آدمیت کے ہر اک زخم کی قسمت جاگی

سرحدیں مٹ کے دلوں کی ملیں دل سے آکر
فاصلے اس طرح سمٹے کہ کوئی موڑ نہ تھا
مختلف قوموں کی اِس دیش میں اک قوم بنی
گویا اِس "مالا" کا دنیا میں کوئی جوڑ نہ تھا

یہ تھا باپو کا کرشمہ کہ دلِ بھارت کو
سکھ بھی، عیسائی بھی، ہندو بھی، مسلماں بھی ملا
ارضِ بھارت کے تقدس کو بڑھانے کے لیے
وید بھی، گیتا بھی، انجیل بھی، قرآں بھی ملا

اور پھر باپو کی "وانی" نے بکھیرے موتی
اہلِ بھارت کو محبت کا سبق سکھلایا
ہر کٹھن وقت میں کی صبر کی تلقین بہت
ہر غلط کام کے کرنے کو منع فرمایا

اسطرح "راشٹرپتا" قوم کا معمار بنا
ہند کا پہلا وزیر اعظم، جواہر، گاندھی
فرض واخلاق و محبت کے کھلائے غنچے
ہوش کی بادِ صبا، جوش کی بھر دی آندھی

چپہ چپہ پہ کھلے پھول، فضائیں مہکیں
قمریاں نغمۂ آزادی کی لے پر چہکیں

اہلِ بھارت نے بصد جذبۂ ایثار و خلوص
بڑی پاکیزہ، بڑی شان کی قسمیں کھائیں
جب بہاروں کی حفاظت کے سوالات اٹھے
اپنے "گلشن" کے لیے جان کی قسمیں کھائیں

آج کیا ہو گیا خوابوں کی کڑی ٹوٹ گئی
حیف! ارباب چمن قول و قسم بھول گئے
اسطرح بیٹھے ہیں گویا کہ کوئی بات نہیں
یاد "گاندھی" تو رہا اور "کرم" بھول گئے

"چاند" پر غیر تو قدموں کے نشاں چھوڑ آئیں
اور ہم دل کی حدیں دل سے مٹا بھی نہ سکیں؟
ان کا یہ عزم، کریں چاند ستارے تسخیر
ہم "تعصب" کی دیوار گرا بھی نہ سکیں؟

خون روتا ہے قلم، رنج سے رک جاتا ہے
سینہ تنتا ہے تو سر شرم سے جھک جاتا ہے

فرض و اخلاق کا سب مل کے بنائیں مینار
ساری دنیا میں محبت کا اجالا کر دیں
آج بھی وقت ہے اپنا کے محبت کے اصول
"ہند" کو چاند ستاروں سے بھی اونچا کر دیں

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

مخدوم محی الدین

ایک شعلہ جو کہ کفن پوش ہے،
ایک جگنو جو دمکا و خاموش ہے
اک ستارہ چمک کر کہاں کھو گیا!

وادیاں سو گئیں
رنگ دھندلا گئے
پھول کمھلا گئے
دم بخود ہے فضا
ہائے کیا ہو گیا!
جیسے گل ہی نہیں گلستاں کھو گیا
اک ستارہ چمک کر کہاں کھو گیا

اک دکن ہی نہیں
سارا ہندوستاں
نوحہ گر، نوحہ خواں
اس طرف، اُس طرف
رنجِ مخدوم سے
دل مغموم ہے
تھا مسافر وہاں کا یہاں کھو گیا
اک ستارہ چمک کر کہاں کھو گیا

صاحبِ فکر و فن
نازشِ فخرِ چمن
اک گلِ تر گیا
ایک رہبر گیا
اب ہے "گل تر" کا نشاں
اے غمِ دل! کہاں؟
ہمدم و ہمزباں، مہرباں کھو گیا
اک ستارہ چمک کر کہاں کھو گیا

٭ گلِ تر۔ مخدوم کا مجموعۂ کلام

غزلیں

نصیر پرواز

بڑی رفیق، بڑی معتبر ہے تاریکی
ہر ایک گام مری ہم سفر ہے تاریکی

مرے عزیز مجھے روک کیوں نہیں لیتے
میں جا رہا ہوں وہیں پر، جدھر ہے تاریکی

بھٹک رہا ہے شعورِ ازل خلاؤں میں
سحر اُداس ہے، شوریدہ سر ہے تاریکی

میں اپنے ذہن کی تاریکیوں میں رہتا ہوں
مرا وجود اُجالا، منتظر ہے تاریکی

سیاہیوں میں دمِ انقلاب پلتا ہے
بس ایک جست کہ نزدیک تر ہے تاریکی

تجلیات کے چہرے نظر نہیں آتے
اِس عہد میں تو بڑی پُر اثر ہے تاریکی

بس ایک میرے ہی خلوت کدے میں رہتی ہو
بڑی ہی تنگ، بڑی کم نظر ہے تاریکی

کسی نگاہ کی مانند نکتہ چیں تو نہیں
ہزار عیب چھپا لو، اگر ہے تاریکی

یہ لوگ اپنے ہی دل کو ٹٹول لیں پرواز
بتائیں پھر کہ اُدھر یا اِدھر ہے تاریکی

▲

شاہد ماہلی

ہر مرحلے سے یوں تو گزر جائے گی یہ شام
لیکن بلائے درد کدھر جائے گی یہ شام

پھیلیں گی چار سمت سنہری اُداسیاں
ٹکرا کے کوہِ شب سے بکھر جائے گی یہ شام

رگ رگ میں پھیل جائے گا تنہائیوں کا زہر
چپکے سے میرے دل میں اُتر جائے گی یہ شام

ٹوٹا یقین، زخمی اُمیدیں، سیاہ خواب
کیا لے کے آج سوئے سحر جائے گی یہ شام

ٹھہرے گی ایک لمحے کو یہ گردشِ حیات
تھم جائے گی یہ صبح، ٹھہر جائے گی یہ شام

خونی بہت ہیں مملکتِ شب کی سرحدیں
ہاتھوں میں لے کے کاسۂ سر جائے گی یہ شام

سو جائے گی سسکتی ہوئی شب کی گود میں
خود اپنی خامشی سے جو ڈر جائے گی یہ شام

مہکے گا لفظ و معنی سے شاہد دیارِ صبح
لے کر مری غزل کا اثر جائے گی یہ شام

▲

(ایک پُراسرار انگریزی کہانی)

دیفنی ڈی مورے
مترجمہ: ظہیر نیازی

وہ بھیانک رات

جنگ کے خاتمے کے بعد نیٹ ہاٹن اب پنشن پا رہا تھا۔ ہفتے میں تین دن وہ اُن کھیتوں میں کام کیا کرتا تھا جو سمندر کے کنارے واقع تھے۔ وہ تنہائی پسند واقع ہوا تھا۔ دوپہر کے وقت کسی پہاڑی پر بیٹھ کر روٹیاں کھاتے ہوئے پرندوں کو مائل پرواز دیکھتے رہنا اُس کا محبوب مشغلہ تھا۔ سیاہ و سفید ایگل اور جیکیٹا کے غول کبھی شوخی سے سمندر کی لہروں پر بیٹھ کر انہیں اپنے میں چھپا لیتے تو کبھی آسمان میں اُڑ کر اُسے اپنے پَروں کی لامتناہی چادر سے ڈھک لیتے۔ ایگل اور جیکیٹا پرندوں کی یہ دوستی نیٹ کی بڑی پُراسرار لگتی۔ نیٹ سوچا کرتا۔ موسم سرما کے آتے ہی ان پرندوں کو شاید کوئی غیبی آگاہی ملتی ہے۔ جبھی تو وہ غول در غول گرم علاقوں کی طرف پرواز کر جاتے ہیں۔

دسمبر کو شروع ہوئے تین دن گذر چکے تھے۔ بالکل اچانک موسم برسات نے رُخصت لے لی تھی اور موسم سرما نے اپنے سفید پنجے زمین پر گاڑ دیئے تھے۔ اس سال موسم برشگال میں چلتے پرندے ساحل سمندر پر مچھلیوں کا شکار کرتے آئے تھے اتنے کسی اور سال نہیں آئے تھے۔ ان کا غول کا غول چشم زدن میں ہی آسمان پر چھا جاتا۔ یہ غول گذشتہ تمام برسوں کے مقابلے میں اس برس کہیں زیادہ مہیب اور خطرناک نظر آرہا تھا۔ اب چونکہ موسم سرما آچکا تھا۔ ان پرندوں نے جھنڈ کے جھنڈ گرم علاقوں کی طرف پرواز کی تیاری شروع کر دی تھی۔

رات کو کمرے کی کھڑکی پر کچھ کھڑکھڑاہٹ ہوئی اور نیٹ کی آنکھیں کھل پڑیں۔ کمرے کی ہوا انتہائی سردی کے باعث سکڑ گئی تھی۔ نیٹ پلنگ سے اترا۔ کھڑکی کھولی۔ پلک جھپکتے ہی ایک چڑیا اندر گھس آئی۔ اس نے اپنے پنجوں اور چونچ سے نیٹ کو زخمی کر دیا۔ نیٹ کے بدمزہ مُنہ سے ایک بھدّی سی گالی نکلی اور کھڑکی بند کر لی گئی۔ رات میں سردی سے محفوظ رہنے کے لئے کسی پناہ گاہ کی تلاش میں ہوگی یہ۔" نیٹ خود سے بولا "جھنڈ سے الگ ہو گئی ہے شاید یہ چڑیا!"

نیٹ کی قمیص کی بانہہ خون سے سَن گئی تھی۔ وہ ڈر گیا۔ اُس کی بیوی بھی بیدار ہو گئی۔ اُس نے بیوی کو مختصراً چڑیا کے حملے کی بات بتا دی۔ بیوی نے پوچھا "مگر وہ چڑیا کہاں ہے؟"
"اسی کمرے میں کہیں چھپ گئی ہے کسی گرم گوشے میں۔ مگر تمہیں خوفزدہ نہ ہونا چاہیئے۔ سو جاؤ۔"

کچھ ہی دیر بعد کھڑکی پر کھڑکھڑاہٹ ہوئی اور اس بار نیٹ نے جیسے ہی کھڑکی کھولی چڑیوں کا ایک جم غفیر کمرے میں گھس آیا اور تقریباً سب چڑیاں نیٹ کے چہرے سے بڑی تیزی سے ٹکرائیں جیسے وہ نیٹ پر منصوبہ بند طریقے سے حملہ آور ہوئی ہوں! وہ چیخ پڑا۔ سبھی چڑیاں پہلی چڑیا کی طرح چھت کی کڑیوں اور دوسری آڑوں میں گھس کر چھپ گئیں۔ نیٹ پر بدحواسی اور خوف و ہراس بُری طرح طاری تھا۔ وہ پھسپھسایا "باپ رے! یہ تو میری آنکھیں پھوڑ ڈالنا چاہتی تھیں!"

اسی وقت دوسرے کمرے سے ایک خوفناک چیخ سنائی دی۔ اس چیخ نے نیٹ کی بیوی کو بھی جگا دیا۔ وہ تاریکی میں دیدے پھاڑے بوکھلائے لہجے میں بولی — "یہ چیخ جِل کی ہے، جاکر دیکھو نا، کیا بات ہے؟"

تبھی ایک دوسری بھیانک چیخ نے میاں بیوی کو لرزا دیا۔ یہ چیخ ان کے دونوں بچوں کی ملی جلی چیخ تھی۔ اس پُر ہول اور مہیب رات میں نیٹ کے پسینے چھوٹنے لگے۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اندھیرے میں لاتعداد پرندے اڑانیں بھر رہے ہیں۔ گھبراہٹ کے مارے وہ کھڑکی بند کرنا بھول گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ مزید قیامت خیز پرندے اسی موقع سے فائدہ اٹھا کر اندر گھس آئے ہیں۔ نیٹ نے شمع جلانے کی کوشش کی لیکن ہوا کے تیز و تند جھونکے نے اس کی کوشش کو ناکام کر دیا۔ اس نے بڑی مشکل سے کھڑکی بند کی۔ مگر شمع پھر بھی روشن نہ ہو سکی۔ پرندوں کی پھڑپھڑاہٹ نے ہر بار اُسے گُل کر کر دیا۔ وہ چیخا — "جِل! ڈرو مت، میں آ رہا ہوں!" اس نے پلنگ سے چادر اٹھائی اور اسے بائیں سے دائیں اور دائیں سے بائیں پھٹکارتے ہوئے دروازے کے قریب ہونے کی کوشش کی۔ پرندوں کے چادر میں اُلجھ کر فرش اور دیواروں سے ٹکرانے کی دلخراش آوازیں پیدا ہونے لگیں۔ اب تو پرندوں کو جیسے براہ راست چیلنج مل گیا ہو۔ وہ سیدھی اڑانیں بھر بھر کر نیٹ کے چہرے پر ٹکر مارنے کی کوشش کرنے لگے۔ نیٹ نے چادر کو چہرے سے لپیٹ لیا اور ننگے بازوؤں کو پرندوں پر پھٹکارنا شروع کر دیا۔ کمرے کا دروازہ کھول کر بچوں تک پہنچنا انتہائی خطرناک تھا کیونکہ پرندے اس کا تعاقب کرتے ہوئے بچوں تک پہنچ جاتے۔ لیکن بچے چیخ کیوں رہے تھے؟ کیا ان کے کمرے میں بھی ۔۔۔۔؟ نہیں نہیں، پرندے وہاں نہیں گھس سکتے۔ نیٹ کو یاد آیا، اس نے اپنے ہاتھوں سے بچوں کا کمرہ بند کیا تھا۔

پرندوں سے وہ کب تک جنگ کرتا رہا، اس کا خود اسے پتہ نہ چلا۔ لیکن جب جنگ ختم ہوئی تو وہ بُری طرح تھک چکا تھا۔ مشرق سے آفتاب جہاں تاب کی آمد آمد تھی۔ دونوں بچوں کی دلخراش چیخ نے نیٹ کے ذہن و دماغ کو ماؤف کر دیا تھا۔ کمرے کے سارے پرندے چھت اور فرش وغیرہ سے ٹکرا کر مر چکے تھے۔ اس نے چادر کی لپیٹ سے اپنے چہرے کو آزاد کیا۔ اُسے اُبکائی آنے لگی۔ پرندوں کی اتنی ساری خستہ حال لاشیں بکھری چاروں طرف پرندوں کے نُچے ہوئے پر پھیلے ہوئے تھے — رابن، فنچ، اسپیرو، بلوٹیٹ، لارک، بریمبلنگ وغیرہ انواع و اقسام کے پرندے! نیٹ نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا اور ایک چیخ نکل پڑی — اُف میرے خدا! چڑیوں نے تو میرے ہاتھ کا پورا گوشت ہی ادھیڑ ڈالا ہے!" جب وہ چڑیوں سے برسرِ جنگ تھا، اس کی بیوی اپنے چھوٹے بچوں کے ساتھ گدّوں میں چھپ گئی تھی لہٰذا وہ مع بچے محفوظ تھی۔ اس نے اپنے شوہر کی طرف خوفزدہ نگاہوں سے دیکھا اور شوہر کے زخمی ہاتھ اور مسخ شدہ چہرے کو دیکھ کر اس کا دل رو پڑا۔ نیٹ پھسپھسایا — "ڈارلنگ! یہ چالیس پچاس چڑیاں تو میرا خون پینے پر تُل گئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انتہائی سردی کی

وجہ سے چڑیاں کی طرف سے ادھر آ گئی تھیں۔ ہر سال تو یہ چڑیاں گرم علاقے کی طرف پرواز کر جاتی تھیں اس سال جانے کیا بات ہے کیوں نظر آ رہی ہے؟" اور پھر وہ احتیاط کے ساتھ دروازہ کھول کر بچوں کے کمرے میں گیا جہاں جل انتہائی سو رہے تھے۔ دونوں پر ہیبت طاری تھی۔ رات بھر روتے رہنے کے باعث ان کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ نینٹ کو دیکھتے ہی وہ اس سے لپٹ گئے ۔۔۔ "ڈیڈی! رات کو تم کیوں نہیں آئے؟ رات بھر ہماری کھڑکیاں کوئی کھٹکھٹاتا رہا۔ شاید کوئی چور تھا اور ممی تم بھی کیوں نہیں آئیں؟" نینٹ دل ہی دل میں بولا ۔۔۔ میں کیسے آ سکتا تھا بچو! آ جاتا تو میرے تعاقب میں چڑیاں بھی یہاں آ جاتیں۔"

اس کی بیوی بچوں کو حوائج ضروریہ سے فارغ کرانے لگی اور وہ باہر نکلا۔ آسمان میں چڑیوں کے بڑے بڑے غول منڈلا رہے تھے۔ یہ غول کے غول سمندر کی طرف جاتے نظر آ رہے تھے۔ نینٹ نے اپنے زخموں پر مرہم پٹی کر لی تھی۔ جو بھی ملا، اسے گذشتہ شب کا قیامت خیز واقعہ سنایا۔ لوگوں نے اس سے اظہار ہمدردی کے ساتھ کہا۔ "ہمارے گھروں پر بھی اسی قسم کا منحوس حملہ ہوا تھا۔ لیکن ہم نے کھڑکیاں نہیں کھولیں ۔۔۔۔۔ تم بھی اب کھڑکیاں بند رکھنا!" دراصل یہ لوگ خود اپنا خوف چھپا رہے تھے۔ نینٹ گھر لوٹا تو دیکھا کہ بیوی نے چڑیوں کی لاشیں ایک گوشے میں جمع کر رکھی ہیں اور وہ فرش پر سے خون کے داغ دھبے صاف کر رہی ہے۔ نینٹ ان لاشوں کو ٹھکانے لگانے گھر سے نکلا۔ باہر ہوا نے گویا طوفانی شکل اختیار کر رکھی تھی۔ نینٹ نے لاشوں سے بھرے تھیلے کو جیسے ہی انڈیلا، لاشیں اس طرح اڑنے لگیں جیسے ان میں چڑیوں کی سی قوت پرواز پھر عود کر آئی ہو۔ اس پر پھر ایک دہشت چھا گئی۔

گھر آ کر اس نے ریڈیو کھولا ۔۔۔ آواز آ رہی تھی۔ "لندن اور اس کے مضافات میں چڑیاں ٹڈی دل کی طرح چھا گئی ہیں۔ اتنی ساری چڑیاں یہاں ایک ساتھ کبھی نہیں دیکھی گئیں۔ کل رات وہ کئی گھروں کے اندر گھس گئیں اور انہوں نے اپنی چونچوں اور پنجوں سے بہت سے افراد کو زخمی کر دیا۔ لندن میں تو تین اشخاص کی آنکھیں بھی انہیں چڑیوں کی نذر ہو گئیں۔ سبھی لوگوں کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ شام ہوتے ہی اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آئیں اور رات کو کسی بھی حالت میں دروازے یا کھڑکیاں نہ کھولیں۔ دن میں یہ چڑیاں حملہ نہیں کریں گی، ایسا ماہر حیوانیات کا خیال ہے کیونکہ یہ دن میں مچھلیوں کا شکار کرنے سے فرصت نہ پائیں گی لیکن رات کو یہ بے پناہ سردی سے پناہ لینے کے لئے مکانوں میں گھسنے کو بے چین نظر آئیں گی!"

نینٹ کے دل و دماغ میں ایک عجیب سی سنسنی پھیل گئی۔ رات خواہ جس قدر بھی خوفناک رہی ہو لیکن دن بڑا ہی دلچسپ ثابت ہوا۔ آسمان پر چڑیوں کے جھنڈ چھائے ہوئے تھے اور لوگ انہیں اسی طرح دیکھ رہے تھے جیسے بچے ہوائی جہاز کو ۔۔۔ "آؤ آؤ دیکھو کتنی ساری چڑیاں ۔۔۔" وہ لطف اندوز ہو رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رات کے قیامت خیز واقعے کی یاد ان کے دلوں سے محو ہو چکی ہے! ۔ کوئی ایسا بھی تھا جو گذشتہ شب کی ہلاکت خیزی کو بار بار دہرا رہا تھا۔ "لیکن ان چڑیوں سے نجات کیسے ملے گی؟" دوسرا اس کے جواب میں کہتا ۔۔۔ "فوج پہنچتے ہی ان کا صفایا کر دے گی!" نینٹ نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ "لندن ایک عظیم تر شہر ہے، فوج کس کس علاقے میں ہماری حفاظت کرے گی؟" نینٹ کی دلیل پر سنجیدگی سے غور کرنے والا کوئی نظر نہ آ رہا تھا لوگوں کو بس چڑیوں کے بادل دیکھنے میں مزہ آ رہا تھا اور اس مزے میں ایک عجیب نشہ تھا۔ چڑیوں کی وجہ سے

آفتاب کی زیارت نہ ہو سکی تھی۔ نیٹ سمندر کی طرف سے گھر لوٹ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں چڑیوں سے ڈھکے ہوئے سمندر کا منظر تیزی سے رقص کر رہا تھا۔ کتنا دلفریب منظر! کس قدر سحر آگیں! لیکن یہی چڑیاں رات کو چڑیلیں بن جائیں گی۔ نیٹ چلتے چلتے رک گیا۔ جل کے اسکول سے لوٹنے کا وقت ہو چکا تھا۔ چڑیوں کی وجہ سے اندھیرا بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ نیٹ کے دل میں خوف و خطر نے کروٹیں لینا شروع کر دیں ــــ ہو سکتا ہے کہ رات شروع ہونے کے قبل ہی یہ ہم پر حملہ کر دیں!" اس کا دل دہل اٹھا۔ وہ فوراً ہی بس اسٹاپ کی طرف دوڑ پڑا۔ گھر گھراتی ہوئی بس آئی، جل نیچے اتری۔ اپنے ڈیڈی سے لپٹ گئی۔ آج اسکول میں کچھ بھی پڑھائی نہ ہوئی۔ سارا دن ہم چڑیوں کو دیکھتے رہے کیوں ڈیڈی یہ اتنی ساری چڑیاں کہاں سے آئیں؟"

"پہاڑیوں سے، جہاں ٹھنڈ بہت بڑھ گئی ہے۔" نیٹ نے کہا اور جل کی انگلی پکڑ کر تیزی سے گھر کی طرف لپکا۔ کئی بار اس نے جل کو کندھے پر اٹھا کر دوڑ سی لگائی مگر جل وزنی تھی۔ اسے ہانپتے ہوئے کندھے سے اتار دینا پڑا۔ گھر ابھی کافی دور تھا کہ ایک کار ان کے قریب سے گذری۔ اس میں بیٹھے لوگ چیخے: "جلدی بھاگو!" کار کھچا کھچ بھری تھی لہٰذا جل اور نیٹ کو اس میں جگہ نہ مل سکی۔ نیٹ کے ہوش اڑ گئے۔ اسی وقت اس نے اپنے سر پر پھڑپھڑاہٹ سنی۔ نظریں اٹھائیں۔ سیاہ پشت کی گل چڑیوں کا جھنڈ سر کے ٹھیک اوپر منڈلا رہا تھا ــــ "بھاگو!" وہ چیخا اور جل کو سینے سے دبوچ کر پاگلوں کی طرح دوڑنے لگا۔ ایک بڑی سی گل چڑیا ہوا میں غوطے لگاتی نیٹ کے سر کی طرف جھپٹی۔ نیٹ کمر سے دہرا ہو کر جھک گیا۔ گل چڑیا وار خالی دیکھ کر غالباً جھلا اٹھی۔ پھر سے وار کیا۔ اس بار دوسری چڑیوں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ نیٹ فوراً ہی جل کو لئے زمین پر گر پڑا، وار پھر خالی گیا۔ جل بے تحاشہ چیخنے لگی۔ اس کی کتابیں پتہ نہیں کہاں گر پڑی تھیں۔ اس نے اپنے ڈیڈی کو پھسپھساتے سنا: "میرے سینے سے چمٹ جاؤ۔" جل نے ایسا ہی کیا۔ نیٹ نے اس کے جسم پر سے باہیں ہٹا کر اپنے چہرے کے ارد گرد کر لیں اور بے تحاشہ بھاگنے لگا۔ کئی چڑیاں لوہے کی نوکیلی چادروں کی طرح اس کے بازوؤں سے ٹکرائیں۔ اگر بازوؤں کی آڑ میں چہرہ نہ ہوتا تو یقیناً اس کی آنکھیں جاتی رہتیں۔ ایک زوردار چیخ نیٹ کے منہ سے نکل گئی۔ وہ ٹھوکر کھا کر گرا، اٹھا، پھر گرا۔ بندریا کی طرح اس کے سینے سے چمٹی ہوئی جل بھی جھٹکوں سے نیچے لڑھکتی نظر آئی مگر بال بال بچی۔ پھر نیٹ کو جب ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ اپنے مکان کا دروازہ پیٹ رہا ہے "کھولو، کھولو! ... دروازہ کھولو، میں نیٹ ہوں!" وہ پوری طاقت سے چیخ رہا تھا تاکہ چڑیوں کی پھڑپھڑاہٹ اس کی آواز کو نگل نہ لے۔

رات ــــ! ہاتھ، پیشانی اور چہرے پر پٹیاں باندھے اداس اداس سے نیٹ نے ریڈیو آن کیا ــــ "یہ لندن ہے۔ چڑیوں کا حملہ اس بار بے حد ہلاکت خیز تھا۔ ایسا واقعہ کہیں بھی، شاید ہی کبھی ہوا ہو۔ چڑیوں کے آسمان پر چھا جانے کے باعث ہوائی جہاز کی سروس معطل ہے۔ عوام کو اپنی حفاظت آپ کرنی چاہیئے۔ رات کو باہر نکلنا موت کو دعوت دینا ہے لیکن ہمیں دلجمعی سے کام لینا چاہیئے۔ چڑیوں کے متعلق یہ آخری خبر ہے۔ ٹرانسمیٹر کی خرابی کی وجہ سے ہماری خبریں کل صبح ۷ بجے سے قبل سنی نہ جا سکیں گی، ہم معذرت طلب ہیں!"

کھانا کھاتے ہوئے نیٹ خاندان نے دھماکوں کی آوازیں سنیں۔ "فوجی بندوق داغ رہے ہیں؟" نیٹ نے

کہا۔ بیوی نے اظہارِ خیال کیا "یا یہ بھی ممکن ہے کہ بمباری کی جا رہی ہو"۔ دھماکوں کی آوازیں بند ہوتیں تو
ہوائیں "شائیں شائیں" کرتیں۔ نیٹ نے گھڑی دیکھی، ۹ بج رہے تھے۔ کمرے کا ایک ایک سوراخ تک دن
ہی میں چڑیوں کے خوف سے بند کر دیا گیا تھا۔ بچوں کو بہلا پھسلا کر بیوی نے سلا دیا تھا مگر خود نیٹ اور اس
کی بیوی کی آنکھوں سے نیند اڑ چکی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو دلاسہ دیتے اور کافی کے گھونٹ حلق سے اتار
رہے۔ وہ ایک دوسرے کے مقابلے میں زیادہ خوف زدہ نظر آ رہے تھے ...... کھڑکیوں اور دروازوں پر
چڑیوں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی اور کافی کا پیالہ ہاتھوں کے ساتھ ہی کانپتا نظر آیا ... گھبراہٹ میں گرم گرم
کافی کی زیادہ مقدار لے لی اور زبان دونوں میاں بیوی کی جل گئی! پھر پھڑپھڑاہٹ کے بڑھتے ہوئے شور و شغب،
سے دونوں کے دل لرزنے لگے!

یکایک کمرے میں ایک تیز بدبو پھیل گئی۔ نیٹ بے حد پریشان ہوا۔ یہ بدروحوں کی سی غلیظ بدبو کیسی؟ وہ
سوچ ہی رہا تھا کہ انگیٹھی کی چمنی میں پھڑپھڑاہٹ ہوئی۔ کوئی چڑیا چمنی میں گھس گئی تھی ٹھنڈ سے بچنے کے لئے
اس کے پر جل رہے تھے اور اسی کی بدبو پھیل رہی تھی۔ پھر وہ چڑیا جل کر راکھ کی شکل میں انگیٹھی میں سے نیچے گر
پڑی۔ نیٹ جذبۂ ترحم سے بھر اٹھا مگر یہ کیا، ایک کے بعد ایک کئی چڑیاں چمنی کے راستے انگیٹھی میں گرتی مرتی
گئیں۔ کچھ ادھ مری، نیم جاں چڑیوں کو انگیٹھی سے نکال کر نیٹ نے اپنے پیروں سے کچل کچل کر محض اس لئے
مار ڈالا کہ ادھ جلی چڑیوں کو جاں کنی کے عذاب میں زیادہ دیر تک مبتلا نہ رہنا پڑے لیکن جب چمنی سے آنے
والی چڑیوں کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہونا شروع ہوا تو پھر دونوں میاں بیوی کو ایک دم سے چونک جانا پڑا۔
"ایسا نہ ہو کہ چمنی کے راستے ہی یہ ہم پر حملہ کر دیں"۔ بیوی نے انگیٹھی میں تیل ڈال دیا۔ شعلے لپک اٹھے۔ بدبو
تیز ہو اٹھی۔ سڑاند سے دماغ پھٹتا نظر آیا۔ تھوڑی دیر چمنی میں پھڑپھڑاہٹ نہ ہوئی مگر پھر ہونے لگی، اور
پھدپھد کی سی آواز کے ساتھ چڑیاں چمنی سے گرتی، انگیٹھی سے ہوتی، فرش پر بکھرتی رہیں۔ ڈبے کا سارا تیل خالی
ہو گیا اور کچھ دیر کے بعد پھر انگیٹھی کی آگ بھی سرد ہوتی نظر آئی۔ پھر کیا تھا چڑیاں اور تیزی سے انگیٹھی میں گرنے
لگیں۔ کئی تو زندہ ہی بچ کر کمرے میں پھڑپھڑانے لگیں۔ "تم اپنے آپ کو بچوں سمیت گدوں کے نیچے دبا لو ڈارلنگ!"
نیٹ نے بیوی سے کہا۔ بیوی نے ایسا ہی کیا۔ نیٹ نے ڈنڈا سنبھالا۔ اسی وقت دیوار گیر گھڑی نے صبح صادق
کے ۴ بجنے کا اعلان کیا ـــ "ٹن، ٹن، ٹن، ٹن"۔ گھڑی کی آواز بھی اس وقت منحوس لگ رہی تھی۔ دو خونخوار
آنکھوں والے باز بھی گھس آئے تھے اسی چمنی کے راستے اور بہت پرندے بھی۔ نیٹ نے ڈنڈا چلانا شروع کر دیا۔ بیوی چیخی "نہیں
ڈیئر! تم ان خونخوار پرندوں پر قابو نہ پا سکو گے۔ تم بھی گدے میں چھپ جاؤ"۔ لیکن نیٹ بے تحاشہ ڈنڈے سے چلاتا رہا۔ بیوی نکل کے
آئی اور اسے کھینچ کر گدوں کے اندر لے گئی۔ اس کوشش میں اس کے نازک جسم پر بھی چڑیوں کے پنجوں کی خراشیں آ گئیں۔ بچے
بھی جاگ گئے تھے اور بری طرح چلا رہے تھے خوف سے۔ نیٹ نے کہا۔ "چڑیاں گدوں پر بھی حملہ کر رہی ہیں!۔ انہیں
نوچ نوچ کر ادھیڑ دیں گی، پھر ہمیں بھی!"۔ بیوی نے اس کے ہونٹوں پر ہونٹ جماتے ہوئے کہا ـــ "اوہ، نو ڈیئر نو!" پھر وہ
بچوں کو بھی جیسے بھولتی ہوئی بولی ـــ "مجھے بے حد ڈر لگ رہا ہے تم مجھے اپنے سے چپکا لو!" اور پھر وہ خود ہی چپک گئی!
چڑیوں نے کچھ دیر تو گدوں پر حملہ کیا، پھر رک گئیں یہ دیکھ کر کہ گدے ان پر جوابی حملہ نہیں کر رہے تھے ......
دروازے پر زوروں کا دھکا ہوا تو بیوی نے کہا ـــ "چڑیاں دروازہ توڑ رہی ہیں"۔ "توڑنے دو۔ یہ جب دروازے

سے نکل بھاگیں گی تو ہم اٹھیں گے !"

نیٹ اٹھ کر باہر نکلنا اور دیکھنا چاہتا تھا مگر بیوی مارے خوف کے اسے خود سے چپکائے رہی۔ آخر دروازہ ٹوٹتا نظر آیا۔ اصل میں یہ نیٹ کے پڑوسی تھے جنہوں نے نیٹ ہی کے لئے دروازہ توڑ ڈالا تھا۔ نیٹ نے سر نکال کر دیکھا کہ چڑیاں سب پھر پھر اڑ گئی ہیں اور لوگ کمرے میں داخل ہونے لگے۔ لوگوں کو دیکھ کر نیٹ نے اپنے آپ کو گدھوں کی قید سے آزاد کیا۔ پھر گدھوں کو نوچ کر پھینکنے لگا۔ اس کے اس طرزِ عمل پر اس کی بیوی چیخی، کیونکہ وہ کچھ ایسی ویسی حالت میں تھی !....

بیوی بچوں کو ساتھ لے کر نیٹ ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ سبھی لوگ شہر چھوڑ کر محفوظ علاقے میں جا رہے تھے، چڑیوں نے سارے لندن والوں کو شکست دے دی تھی ! ٹرین کے اندر بچے کھڑکی سے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے لیکن وہاں آسمان کہاں تھا؟ اگر کچھ تھا تو چڑیوں کا بنا ہوا آسمان ! نیٹ اپنی سسرال جا رہا تھا۔ اس نے کہا "حکومت چڑیوں کا خاتمہ کرنے کی ٹریننگ دینے جا رہی ہے !"

بیوی نے کچھ نہ کہا۔ اس کی آنکھوں میں تو اس پڑوسن کی لاش تیر رہی تھی جو دیر سے گھر لوٹتے ہوئے خونخوار چڑیوں کا شکار ہو گئی تھی اور لاش مشکل ہی سے پہچانی جا سکتی تھی۔

ٹرین چھوٹنے کو تھی کہ اچانک نیٹ بولا۔ "ڈارلنگ ! میں تمہارے ساتھ نہ جا کر یہیں چڑیوں کے خاتمے کی ٹریننگ لوں گا !" بیوی نے گڑگڑا کر کہا ــــ "نہیں، نہیں ڈیر اس میں جان کا خطرہ ہے ....." گاڑی چل پڑی تھی اور اس کے ساتھ ہی نیٹ نے اپنی بیوی کو ایک جھٹکے سے خود سے الگ کر دیا۔ وہ برتھ پر جا پڑی اور نیٹ چلتی ٹرین سے نیچے اتر پڑا۔

(ڈیفنی ڈی موریے کی کہانی سے ماخوذ)

ــــــ بقیہ افسانہ "کاٹھ کے پتلے" ۔ صفحہ ۱۲۴ ــــــ

چکر میں۔ لالہ بھائی کی آواز بند ہو گئی ہے۔ وہ تقریباً اگ بجھاتے بجھاتے نڈھال ہو چکا ہے، وہ اس عظیم کھڑاؤں کو بچانے کی زبردست اور آخری کوشش کر رہا ہے اور لگ رہا ہے بچا بھی لیگا ــــ مگر دو آدمی آ جاتے ہیں۔

"کیوں لالہ بھائی لکڑی سے بہت سونا پیدا کر لیا۔ اب کیا کرو گے بچا کر اور بیچ کر۔" پھر ایک آدمی لالہ بھائی کو پٹک کر گلا گھونٹنے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔ لالہ بھائی سخت جان نکلا۔ دوسرے آدمی نے کہا۔

"جلدی کرو بھائی اب زیادہ دم نہیں رہا اپنے پاس۔"

پہلے نے کہا۔

"کیا کروں یہ رشتہ کی بیات ... اور ... مرتا ہی نہیں۔ تم ہی کچھ کرو۔" پھر دوسرا آدمی لپک کر وہ شال کھڑاؤں اٹھا لیتا ہے اور اس کھڑاؤں کی کھونٹی کا لٹو لالہ بھائی کی گدی میں

اترتا چلا گیا۔ !

ریشم کی ڈوری گلے سے لپٹ کر تنگ ہوتی چلی گئی۔ !

یہ دکان ہے۔

یہاں کاٹھ کی بنی ہوئی چیزیں بکتی ہیں۔

یہاں ایک کاٹھ کا الو ہے۔ !

دوسری دنیا سے بلایا گیا ہے۔ کاٹھ کا پتلا ہے۔

کاٹھ کے مگرمچھ ہیں۔ !

کاٹھ کے آنسو ہیں۔ !

کاٹھ کے پہاڑ پر کاٹھ کا شیو بیٹھا ہے۔ شیو کے کاٹھ کی جٹا ہے۔ جٹا سے کاٹھ کی گنگا بہہ رہی ہے۔

کاٹھ کا ایک سڑا سا لمبا اور کالا آدمی گنگا کے سینے پر لوہے کی کیل ٹھونک رہا ہے۔ !

اور بس !۔ اور بس !!!

جمیل الرحمٰن
(مظفرپور)

شاعر اور تاج محل

شاعر:

اے حسین تاج محل، تُو ہی بتا، تُو ہی سُنا
ذہنِ شاعر ہے پریشاں کہ تجھے کیا سمجھے
پیکرِ ناز کا اِک عکسِ حسیں تجھ کو کہے ؟
یا لبِ سنگ سے پھُوٹا ہوا نغمہ سمجھے ؟

چاند کی وادیِ الماس کا اِک قصرِ حسیں؟
کہکشاں کا کوئی بھٹکا ہُوا تارہ تُو ہے ؟
رقصِ زہرہ کا کوئی منجمد انداز ہے تُو ؟
یا شبِ ماہ کا ٹھہرا ہُوا لمحہ تُو ہے ؟

یا کسی پیار کے افسانے کا عُنوان ہے تُو ؟
شیشۂ سنگ میں اِک عکسِ تمنّا تُو ہے ؟
یا کوئی مُہرِ محبت ہے لبِ گیتی پر ؟
یا گریبانِ فضا پر کوئی بُوٹا تُو ہے ؟

یا گہر ہے کسی ناہید کی پیشانی کا ؟
بامِ پروین کی دَمکتی ہوئی قندیل ہے تُو ؟
لوحِ مرمر پہ ہے کندہ کوئی پیمانِ وفا ؟
یا کسی خوابِ دلآویز کی تشکیل ہے تُو ؟

موجِ زن نُور کی لہریں ہیں رگِ مرمر میں ؟
یا جھلکتا ہے غریبوں کی تمنّا کا لہُو ؟
ہے ترے جام میں تہماری و نفرت کی شراب ؟
یا کہ تُو ہے کسی نشہ کی مئے اُلفت کا سبُو ؟

تاج محل:

میرے گنبد تلے سب اپنی صدا سُنتے ہیں
مجھ میں ہر خواب کی تعبیر نظر آتی ہے
دیکھنے والوں کے جذبات کا آئینہ ہوں
مجھ میں ہر ذہن کی تصویر نظر آتی ہے

ایک عبرت کا صحیفہ ہوں مفکر کے لیے
اِک مؤرخ کے لیے زخمِ دلِ شاہجہاں
ایک شیدائے وطن کے لیے توقیرِ وطن
اُس کے سرمایۂ تہذیب کی عظمت کا نشاں

ایک سرشارِ محبت کے لیے کعبۂ شوق !
اِک حسیں کے لیے مضرابِ رگِ دل ہُوں مَیں
مجھ سے وابستہ ہے رُودادِ رہ و رسمِ وفا
دھڑکنوں میں دلِ محبوب کی شامل ہُوں مَیں

رنگ اور نُور کا اِک جلوۂ زیبا بَن کر
اِک مُصوّر کے تصوّر میں اُبھر آتا ہُوں
حُسن و رنگینیِ افکار کی تابانی میں
ذہنِ شاعر پہ دھنک بَن کے بکھر جاتا ہُوں

میری رعنائی سحابِ گہر افشاں کی طرح
ایک فنکار کے احساس پہ چھا جاتی ہے
دِلکشی میری کبھی کیفِ ترنّم بَن کر
پردۂ ذہنِ مغنّی سے اُبھر آتی ہے

دستِ معمار مرے حُسن پہ اِتراتا ہے
رُوحِ تعمیر کے رُخسار کا غازہ ہُوں مَیں
ایک دِل دادۂ تخریب کی نظروں میں مگر
حُرمتِ جذبۂ اُلفت کا جنازہ ہُوں مَیں

میرے گنبد تلے سب اپنی صدا سُنتے ہیں
مجھ میں ہر خواب کی تعبیر نظر آتی ہے
دیکھنے والوں کے جذبات کا آئینہ ہُوں
مجھ میں ہر ذہن کی تصویر اُبھر آتی ہے !

▲

ظفر غوری

دل روز ایک تازہ ستم سے نہال ہے
اے زندگی! تجھے مرا کتنا خیال ہے

جس کا جواب وقت ابھی تک نہ دے سکا
انسان اپنے دور کا ایسا سوال ہے

سو رنگ بھر رہا ہے وہ سورج کی دھوپ میں
ہر عضو اُس بدن کا عجب خوش جمال ہے

ہر لمحہ سو خیال اُلجھتے ہیں ذہن سے
ہر شخص اپنے آپ میں کانٹوں کا جال ہے

کب سے اُٹھائے ہے کوئی سایہ بدن کی لاش
کیا شہرِ دلستاں میں صلیبوں کا کال ہے

کیا کیا روش نہ تیرے ستم کی بدل گئی
میرا جنوں تو اپنی جگہ لازوال ہے

پھر دو جلا کے راکھ خود اپنے وجود کو
اب زخمِ زندگی کا یہی اندمال ہے

زیدی جعفر رضا

ایک کو دوسرے کے خون کا پیاسا دیکھا
شہر میں آج عجب ہم نے تماشا دیکھا

ہر طرف سہمے ہوئے بھاگتے چہرے پائے
دور تک پھیلا ہوا موت کا سایا دیکھا

اسپتالوں میں تڑپتے ہوئے انسان ملے
گھر کی دہلیز پہ ہر شخص کو بھوکا دیکھا

مارنے کے لئے ہر جیب سے خنجر نکلے
راہ میں دوستوں نے جب مجھے تنہا دیکھا

چھپ کے جب تیرہ و تاریک گلی سے نکلا
ایک چوراہے پہ خود اپنا جنازہ دیکھا

دور سے ہم کو بھی ہوتا تھا اُجالوں کا گماں
پاس آئے تو گھٹا ٹوپ اندھیرا دیکھا

جانے کن آنکھوں سے بازار میں جعفر ہم نے
جانے پہچانے ہوئے لوگوں کو ننگا دیکھا

تین غزلیں

تیری گلی سے لے کر آئے قربت کے افسانے لوگ
دل کے گھائل پنچھی پر کچھ طنز کے تیر چلانے لوگ

مدت گزری دشتِ وفا میں اک غنچہ مسکایا تھا
افسردہ ہیں دیکھ کے سوکھے پھولوں کے نذرانے لوگ

ساگر ساگر پیاسے پنچھی ہونٹوں کے کشکول لئے
خالی خالی لوٹ گئے ہیں کیا جانیں انجانے لوگ

اندھی نگری، اندھے باسی، اندھے دل، اندھا قانون
پیار کی قیمت کیا سمجھیں گے دولت کے دیوانے لوگ

پھیکی رنگت، ویراں آنکھیں، دھندلائے چہروں کے چراغ
آخرِ شب آئے ہیں یارو داغ سے داغ جلانے لوگ

اونچے پربت، گہرے ساگر، خوابوں کے شاداب نگر
یاد دلا کر چھلکاتے ہیں آنکھوں کے پیمانے لوگ

عہدِ ماضی کا سرمایہ، یادیں، آنسو اور تڑپ
دل میں جگا جاتے ہیں اکثر سوئے ہوئے افسانے لوگ

دل کا درد سمجھنے والا کون ہے اپنا آج نصر
ہمدردوں کے بھیس میں ہم کو آئے ہیں سمجھانے لوگ

نصر قریشی

مقالہ

انور سدید

راجہ مہدی علیخاں کی تحریف نگاری

راجہ مہدی علی خان کے فن کے کئی زاویے ہیں۔ اس فن کا ایک عمدہ زاویہ اُن نظموں میں ظاہر ہوتا ہے جن میں بعض مشہور اشعار اور بعض مقبول اصناف کی تحریف کی گئی ہے۔ ہر چند ہمارے ہاں تحریف کو ابھی تک قابلِ عزت صنفِ سخن کا مقام حاصل نہیں ہوا اور اُسے ابھی تک سنجیدہ عمل سے تعبیر نہیں کیا جاتا لیکن حقیقت یہ بھی ہے کہ اس اندازِ سخن سرائی نے بعض اکابر شعرا کی توجہ کھینچی ہے اور اکبر الٰہ آبادی سے لے کر نذیر احمد شیخ تک نے زندگی کی بیزار کن یک رنگی کو توڑنے کے لئے اس سے اکثر و بیشتر عمدہ کام لیا ہے۔

ڈاکٹر غلام جیلانی اصغر کا خیال ہے کہ "پیروڈی کا اصل مزاج تضحیکی نہیں بلکہ تفریحی ہے"۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے مطابق "تحریف کا مقصد نہ محض تفریح بہم پہنچانا ہے اور نہ اس کے پیشِ نظر اصلاح کا نظریہ ہی ہوتا ہے"۔ چنانچہ تحریف یا پیروڈی ایک ایسا حربہ ہے جسے مزاح نگار بھی استعمال کرتا ہے اور طنز نگار بھی۔ مزاح نگار اس سے آسودگی کے حصول میں مدد لیتا ہے اور طنز نگار اس کا سہارا لے کر معاشرے کی ناہمواریوں کو ہدفِ طنز بناتا ہے۔ تحریف کا مقصد خواہ تضحیک ہو یا تفریح۔ اسے مزاح نگار استعمال کرے یا طنز نگار، لیکن ایک بات ضرور واضح ہے کہ یہ اصل تصنیف کی کچھ نہ کچھ بگڑی ہوئی صورت ضرور ہوتی ہے اور اسے قبول کرنے کیلئے اصل مصنف کی ذہنی کشادگی کی بے حد ضرورت ہوتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بیشتر تحریف نگاروں نے زندہ شعرا کے مقابلے میں مرحوم شعرا کے کلام کو زیادہ نشانہ بنایا ہے۔ پھر تحریف چونکہ دو متضاد انتہاؤں پر سفر طے کرتی ہے اس لئے اس کے بارے میں صرف ایک ہی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ یعنی تحریف یا تو کامیاب ہوگی یا پھر بالکل ناکام۔ اِسی بُعد کو برقرار رکھنے کیلئے تحریف کیلئے ہمیشہ ان نگارشات یا نظریات کا انتخاب کیا جاتا ہے جو قبولِ عام کی منزل طے کر چکے ہوں۔

تحریف کی کامیابی میں تحریف نگار کا اپنا ظرف اور کشادہ نظری بھی بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے۔ تحریف میں الفاظ کا ذرا سا ردّوبدل، چونکہ مفہوم کا ڈھانچہ ہی بدل دیتا ہے اِس لئے تنگ نظر تحریف نگار کی پیروڈی فوراً پھکڑپن اور ابتذال کا شکار ہو جاتی ہے۔ راجہ مہدی کا مزاح خندۂ دنداں نما کی بجائے ہنسی کی تربیت یافتہ شکل ہے، پھر اس کے ہاں زہرخند اور دلآزاری کی بجائے انکسار اور دردمندی کا عنصر زیادہ ہے۔ چنانچہ اس کے ذہن کی اعلیٰ تربیت اور دل کی بے کدورتی نے اسے تحریف میں بھی طنز و مزاح کا بلند معیار قائم رکھنے پر قادر کیا ہے۔ اس نے تحریف نگاری کا فریضہ قبول کیا تو اس کی نگاہ ایک ایسے شاعر پر پڑی جس کی عظمت کا اعتراف پونے ایک صدی سے کیا جا رہا ہے اور جس کے مختصر سے دیوان کے اکثر اشعار ہر خاص و عام کی نوکِ زبان پر ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ بیسویں صدی کے رُبعِ سوم تک مزاح نگاری میں مرزا غالب کا کوئی حریف پیدا نہیں ہو سکا اور راجہ مہدی نے اس چیلنج کو قبول کیا تو اس نے مرزا غالب کو پچھاڑنے کیلئے سب سے پہلے اسی کے کلام کی تحریف کر ڈالی۔ مثال کے طور پر یہ چند تحریفات ملاحظہ ہوں۔

پھر مری [illegible] یاد آیا ۔۔۔ یعنی پھر ساس کا گھر یاد آیا
دم لیا تھا نہیں [illegible] ہنوز ۔۔۔ کیوں ترا رختِ سفر یاد آیا!

کس نے پھینکا یہاں کوڑا کرکٹ — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

میں نے لیلیٰ پہ لڑکپن میں اسد — سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

قیس ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا — ایک لنگی تھی اسے پھینک کے عریاں نکلا

آئی شامت مری لیلیٰ کو ذرا چھیڑ دیا! — قیس والان سے ہوکر غضب افشاں نکلا

کونسا تھا وہ کنواں ڈوب گیا جس میں اسد — کی جو تحقیق تو وہ چاہِ زنخداں نکلا

حُسن اس پری وش کا اور پھر مکاں اپنا — بن گیا رقیب آخر تھا جو میہماں اپنا

تھا خواب میں پٹھان کو مجھ سے معاملہ — جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سُود تھا

جب کہ گھر میں بس ایک پتھر ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

راجہ مہدی کے مندرجہ بالا اشعار تحریف لفظی کی عمدہ مثالیں ہیں۔ اس عمدگی کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ راجہ مہدی علی نے تحریف کیلئے غالب کے وہ اشعار منتخب کئے ہیں جن سے قاری کی جذباتی وابستگی ایک ایسے سانچے میں ڈھل چکی ہے کہ اس میں کسی ناخوشگوار تبدیلی کا امکان نظر نہیں آتا۔ دوسری طرف اس نے تحریف کا مواد معاشرے کی ایسی ناہمواریوں سے تلاش کیا ہے جو ہمارے روزمرّہ کا حصّہ بن چکی ہیں۔ تصویر کے یہ دونوں رُخ بُعد المشرقین رکھتے ہیں اور جب راجہ مہدی کی ذکاوتِ طبع نے اس دوسرے رُخ کو غالب کے مروجہ سانچے میں پیش کیا تو ایک کامیاب تحریف معرضِ تخلیق میں آ گئی۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ بلند کو پست کے ساتھ مربوط کرنے سے راجہ مہدی علی نے اصل کے خلاف نفرت کا کوئی جذبہ پیدا نہیں کیا بلکہ اِس تحریف سے شاید اصل ماڈل کی اہمیت کچھ اور زیادہ ہوگئی ہے۔ ایک اچھے تحریف نگار کی سب سے بڑی خوبی یہی ہوتی ہے کہ وہ متضاد نہائتوں کو اس طرح قریب لائے کہ اصل کی صورت یکسر بدل جائے۔ قاری اس سے لطف اندوز ہو لیکن کسی جذباتی شکست کا شکار نہ ہو اور راجہ مہدی علی نے یہ کامیابی بدرجۂ اتم حاصل کی ہے۔

تحریف کا دوسرا رُخ وہ ہے جس میں لفظی تبدیلی کی بجائے کسی خاص اندازِ تحریر کی نقل کی جاتی ہے۔ اِس ضمن میں راجہ مہدی علی نے مثنوی کی مقبول صنفِ سخن کو اپنا معمول بنایا ہے۔ اس کا ایک باعث شاید یہ ہے کہ مثنوی طویل نظم کی آسان ترین صورت ہے۔ ہر دو مصرعوں کے بعد قافیے بدل جاتے ہیں اور بحر اتنی رواں دواں اور متحرک ہوتی ہے کہ اس میں ہر قسم کے طویل اور مسلسل موضوعات کو آسانی سے اشعار کے قالب میں ڈھالا جاسکتا ہے۔ دوسری طرف بعض مثنویاں اتنی زبان زدِ خاص و عام ہو چکی ہیں کہ ان کی یکسانیت سے قاری اکتاہٹ محسوس کرنے لگتا ہے۔ مقبولیت کی یہی معراج تحریف نگار کو موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ قاری کی تفنّنِ طبع کے لئے اس پر شب خون مارے اور تصویر کا ایک بدلا ہوا رُخ اس کے سامنے پیش کر دے۔ راجہ مہدی کی اس قسم کی تحریفات میں "تاج دین معراج دین" "مثنوی قہرِ عشق" "جنت میں حسینوں کی بھوک ہڑتال" اور "بیوی کی بغاوت" وغیرہ کو اہمیت حاصل ہے لیکن جو مقبولیت "مثنوی قہرالبیان" کو حاصل ہوئی اُس کی مثال نہیں ملتی۔

"مثنوی قہرالبیان" کا اصل ماڈل میر حسن کی مثنوی "سحرالبیان" ہے۔ راجہ مہدی علی نے قہرالبیان میں سحرالبیان کی کہانی، فضا یا کرداروں کی تحریف نہیں کی بلکہ اس نے مثنوی لکھنے کے عام انداز کو آلۂ کار بنا کر شاعر، عورت اور دولت کو موضوعِ تحریف بنایا ہے۔ کہانی صیغۂ واحد متکلم میں بیان ہوتی ہے اِس لئے نجی تجربہ شخصی المیّے کو ابھارنے میں زیادہ معاونت کرتا ہے۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ راجہ مہدی علی نے اسی شخصی المیّے سے مزاح پیدا کیا ہے اور جہاں کہیں موقع ملا ہے اس نے تحریفِ لفظی اور تحریفِ لفظی سے بھی عمدہ کام لیا ہے۔ قہرالبیان کے مصنّف کے یارِ غار کا منصب وزیر آغا کو سونپا گیا ہے۔ انہیں کو کہانی سنائی جا رہی ہے

شاعر بیتی

وزیر آغا سنو میری کہانی
اگرچہ یہ قلم کی ہے نشانی

کہانی درد سے بھرپور ہے یہ
کہ قصہ بہلی مجبور ہے یہ

تم آغاز سے نفرت ہے ماحول ملی
وہ انجام دونوں ملاحظہ کریں آہ

اور انجام تحریف لفظی کا شاہکار،

دو دن عمر ہوتی ہے باز آئد کہ ناید
بعد عمر ونیاز آئد کہ ناید

زنانہ بے شمار اندر جہاں اند
زن بندہ نواز آئد کہ ناید

کہانی کا مرکزی کردار چونکہ شاعر ہے اس لئے راجہ مہدی علی نے اُس کی مناسبت سے ادیبوں اور شاعروں کے نام اور کہیں کہیں اوصاف کو بھی تحریف کا شکار بنایا ہے اور نہایت کامیابی سے مزاح پیدا کیا ہے۔

زباں پہ ذکرِ منٹو دن میں کس بار
کبھی ذکر ندی اک کالی شلوار

لحاف اک بھی نہیں اور ذکرِ عصمت
بتادے یہ کہاں کی ہے شرافت

کلام میر بھی ہے جوش بھی ہے
نہیں ہے گھر میں آٹا ہوش بھی ہے

ندیم قاسمی سو بار آیا
کبھی اس نے بہن مجھ کو بنایا

میں ہو جاتی تھی شرما کے گلابی
وہ کیوں کہتا تھا آخر مجھ کو بھابی

زباں سے لفظ بیدی گر نکالا
بجادوں گی میں خوش قسمتی سے بارہ

اور اب طلاق کے بعد دعا کا ایک منظر —

دعا یہ ہے اٹھے ہیں مجھ پہ جو ہاتھ
ہتھوڑے سے نہیں ٹوٹے چکن ناتھ

دعا یہ ہے مری اے ذاتِ باری
چبا ڈالے تجھے فارغ بخاری

دعا یہ مانگتی ہے مجھ سے بندی
کہ دے جالندھری تجھے انور گوئندی

اسے یوسف ظفر رستے میں پیٹے
اسے عابد علی عابد گھسیٹے!

بت گلفام را دشنام گفتی
یہ کہہ کر پیٹ دے ممتاز مفتی

اس نوع کی دوسری تحریفات میں "دستکِ نیم شب" جس میں "شکوہ جواب شکوہ" کی بحر اور ہیئت کی تحریف کی گئی ہے اور "سسرال کی جیل" جس میں مرثیہ کی صنف کی تحریف کی گئی ہے، قاری کو خصوصی طور پر متوجہ کرتی ہیں۔

راجہ مہدی کی شاعری پر اگر مجموعی نظر ڈالی جائے تو تحریف نگاری اس کا غالب رجحان نظر آتا ہے اور اس میں راجہ مہدی علی نے جو کامیابی حاصل کی ہے اُس سے یہ تاثر مرتب ہوتا ہے کہ زندگی کی سنگینی، المناکی اور سپاٹ پن کے برعکس اس کی نگاہ تصویر کا وہ رخ زیادہ دلچسپی سے دیکھتی ہے جس سے زندگی کو ایک نئی کروٹ مل سکے۔ سنگینی نرمی میں بدل جائے، سپاٹ پن ختم ہو اور المیہ طربیہ میں بدل جائے اور اس مقصد کے حصول کیلئے راجہ مہدی نے حقیقی دنیا کے سامنے قہقہوں اور مسکراہٹوں کے انبار بکھیر دئیے۔ کہیں اُس نے معاشرے کی ناہمواریوں سے مزاح پیدا کیا۔ کہیں انسان کی ریاکاری کو موضوع طنز بنایا اور کہیں گھریلو زندگی کے چھوٹے چھوٹے پہلوؤں کی اس انداز میں نقاب کشائی کی کہ تفریح کا ایک نیا پہلو پیدا ہو گیا

افسانہ

جمیل احسن شاہجہاں پوری

ٹراھا

جہاز آہستہ آہستہ ساحل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ ریلنگ کے پاس اُفق پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ یکایک سمندر کی سطح پر ایک بھوری سی لکیر اُبھری اور دھیرے دھیرے حجم میں بڑھتی چلی گئی۔ اُس کا دل خوشی سے اُچھلنے لگا اور اُس نے بیقراری سے کہا۔ "میرے دیس کی دھرتی۔ میرے دیس کی دھرتی۔"

اُس نے بارہا خوابوں میں اپنے آپ کو ہندوستان کی سرزمین پر گھومتے ہوئے دیکھا تھا۔ کبھی ہمالیہ کی چوٹیوں سے سورج طلوع ہوتے ہوئے دیکھا، کبھی کشمیر کی گلپوش وادیوں میں شام کو دبے قدموں بڑھتے دیکھا، کبھی چاندنی میں ڈوبا ہوا تاج محل دیکھا اور کبھی صبحدم گنگا کے ساحل پر سینکڑوں چاند نہاتے ہوئے دیکھے۔ تصور کے قدموں سے بارہا وہ اس سرزمین پر آیا تھا۔ کبھی پہاڑوں پر بانسری بجاتے ہوئے چرواہوں کے پیچھے گم سم چلتا رہا، کبھی پنگھٹ پر پانی بھرتی ہوئی شوخ نگاہوں والی کنواریوں کے ہاتھوں اُوک بنا کر پانی پیا، کبھی فصل کٹنے کی خوشی میں بھنگڑا ناچنے والوں کے ساتھ محوِ رقص ہوا اور کبھی میلوں کی بھیڑ بھاڑ، نغموں اور قہقہوں کے شور و غل میں گھومتا رہا۔

اگرچہ اُس نے حقیقت میں آج تک اس دھرتی پر قدم نہ رکھا تھا، مگر اپنے دل کے گوشے گوشے میں اس سے بے پناہ محبت محسوس کی تھی۔ اپنے ٹرانزسٹر پہ دن رات ہندوستانی گانوں، لوک گیتوں اور ڈراموں کو سُنا تھا۔

جہاز ساحل سے لگ گیا اور مسافر اُترنے لگے۔ اُس نے عجب خوشی سے مچلتے ہوئے دل کے ساتھ پہلا قدم اس دھرتی پر رکھا تو بے پناہ مسرت سے جھوم اُٹھا۔ یہ دھرتی جس کی گود میں اس کے ماں باپ کا بچپن گذرا تھا اور جن کی زبانی اُس نے اس ملک کی عظمت، امن پسندی، اور اس دیس میں بسنے والوں کی محبت کی سینکڑوں کہانیاں سُنی تھیں۔ بچپن سے ہی اُس کا دل اس ملک کی سرزمین پہ قدم رکھنے اور اس کی فضا میں سانس لینے کے لئے بے چین تھا۔ آج مسرت، محبت اور عقیدت سے اس کی رُوح کا ذرّہ ذرّہ کہنے لگا۔ "اے میرے پیارے وطن تجھ پہ جان و دل قرباں"

ریل سے تین دن کا طویل سفر طے کر کے جب وہ راج پور کے اسٹیشن پر اُترا تو بڑی ویرانی اور سناٹا سا محسوس کیا۔ عام اسٹیشنوں جیسی چہل پہل اور ہنگامہ بھی نظر نہیں آتی تھی۔ پلیٹ فارم کے باہر کوئی رکشا یا دیگر سواری بھی موجود نہ تھی لہٰذا وہ پیدل ہی چل پڑا۔ راج پور اس کی ماں کی جائے پیدائش تھی اور وہ بڑی امیدوں کے ساتھ اپنی ماں کا گھر اور شہر دیکھنا چاہتا تھا۔ خاندان والوں سے ملنا چاہتا تھا۔

راستوں اور گلیوں میں کوئی فرد و بشر چلتا پھرتا نظر نہیں آتا تھا جس سے وہ راستہ پوچھ سکے۔ اس شہر کی خاموشی اور فضا کی کشیدگی سے وہ متعجب اور پریشان ہونے لگا۔ پھر اس کے ذہن میں ہندوستان کے بارے میں سوچا ہوا ایک انوکھا سا تصور اُبھرا۔ اس نے سوچا شاید آج کوئی بڑا تہوار ہوگا۔ سارے شہر کے لوگ کسی ایک جگہ میلے میں اکٹھا ہوتے ہونگے اور مل جل کر خوشیاں منا رہے ہونگے۔ ہر قوم و مذہب

کھرو بچے اور عورتیں اپنے رنگین لباسوں میں ملبوس مسکراہٹوں اور خوشیوں کے جھولوں میں جھول رہے ہوں گے۔
وہ انہی خیالات میں گم دھان کے کھیتوں سے گزرتا ہوا ندی کے کنارے پہنچا ہی تھا کہ یکایک اُسے دور سے آنے والی آوازیں سنائی دیں۔ بہت سے لوگوں کی ملی جلی آوازیں۔ اُس نے سوچا میلہ قریب آ رہا ہے۔ آوازوں کے سہارے اندازہ لگا کر وہ آگے بڑھتا رہا۔ یکایک اس کی نظر آسمان کی طرف ٹکی کی ٹکی رہ گئی۔ دھوئیں کی طرف گئی اور اُونچے اٹھتے ہوئے شعلے نظر آئے۔ اس نے سمجھا یہ ہولی کا تہوار ہے۔ رنگ اور مستی کا جشن منایا جانے والا دن۔ جس دن ظلم اور نفرت کو آگ لگا دی جاتی ہے اور ہر ایک سے دل کھول کر گلے ملا جاتا ہے۔
خوشی خوشی قدم اٹھاتا ہوا وہ ایک تراہے کے موڑ سے گزر کر آگے بڑھا تو سامنے ایک کشادہ جگہ میں تیس چالیس آدمی جمع نظر آئے۔ لیکن یہ دیکھ کر وہ حیرت سے ٹھٹھک گیا کہ اُس کی اُمید کے خلاف یہ کسی میلے کی بھیڑ نہیں تھی، بلکہ ہر شخص غیض و غضب کا پُتلا تھا۔ اُن کے ہاتھوں میں لاٹھیاں اور چھریاں تھیں۔ اُس نے سوچا یہ ڈاکو اور لٹیرے ہیں۔ اس خیال کے ساتھ گھبرا کر وہ پلٹنے لگا تھا کہ مجمع اس کی طرف دوڑ پڑا اور ایک آدمی نے اُس کا گلا پکڑ کر سُرخ سُرخ آنکھوں سے گھورتے ہوئے پوچھا "کون ہے تو"؟

اس نے خوف سے لرزتے ہوئے اپنا پرس نکال کر کہا "میرے پاس یہی روپے ہیں"۔
"پہلے یہ بتا، تو کون ہے" دوسرے آدمی نے غصّے سے چلّاتے ہوئے کہا۔
"میں .... میں .... میرا نام رام رحیم ہے" اُس نے کہا۔
"جھوٹ بولتا ہے۔ جان بچانا چاہتا ہے۔ سچ سچ بتا، ہندو ہے یا مسلمان؟" پہلے آدمی نے چھرا لہراتے ہوئے کہا۔

...

کاروں اور عمارتوں کے شہر لندن کے ایک ریسٹورینٹ میں یو۔ پی کے ایک سُرخ و سفید پٹھان عبدالرحیم خاں کی ملاقات جب ان کے دوست دلوچکار شرما نے بنگال کی سانولی سلونی سا چکرورتی سے کرائی تو عبدالرحیم کو اپنے دل کے نہاں خانے کے ایک سنسان اور ویران گوشے میں کسی کے نازک قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے روح کی ایک بے برگ و ثمر شاخ پر آہستہ آہستہ کوئی کونپل پھوٹ رہی ہو، کوئی کلی آنکھ کھول رہی ہو۔
اور اسی وقت پہلی بار نگاہیں ملتے ہی سا نے بھی یوں محسوس کیا، جیسے روح میں اب تک جو خلش تھی وہ مٹ رہی ہو، جیسے زندگی میں کچھ نہ کچھ کمی تھی، کسی نہ کسی چیز کی خاموش تلاش تھی سو اب مل گئی اور زندگی اس طرح مطمئن ہو گئی جیسے عمر بھر کے لئے کچھ پا لیا ہو۔
عبدالرحیم ڈاکٹری کا کورس مکمل کرنے کے بعد لندن میں "ہیرٹ اسپیشلسٹ" بننے آئے تھے اور سا لائبریری سائنس کا کورس مکمل کر رہی تھی۔ خود بہت گورے چٹے ہونے کے باوجود عبدالرحیم کو حُسنِ مغرب میں کوئی دلکشی نظر نہیں آئی تھی۔ لندن کی حسیناؤں کے انتہائی گورے رنگ کو دیکھ کر انہیں یوں محسوس ہوتا جیسے وہ دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں کھڑے ہوں۔ اسی لئے سا کے سانولے سلونے حُسن میں انہیں ایسا لگا جیسے شام کا سُرمئی اُجالا چھایا ہو یا دھندلکے کی ہلکی سیاہ چُنری اوڑھے دوشیزۂ صبح قدم قدم بڑھتی چلی آ رہی ہو۔

دونوں نے ایک دوسرے کو سمجھا، چاہا، پیار کیا اور پھر تفریقِ مذہب کے باوجود ایک ہو گئے۔ ان کے گھر والوں کو جب اس شادی کا علم ہوا تو پیتی اپنی جگہ دونوں خاندان غصّے سے بل کھا کر رہ گئے اور ان دونوں پر طعن و تشنیع اور لامذہبیت کے الزامات بھرے خطوط کی بارش ہو گئی۔ اس لئے دونوں نے انگلینڈ ہی کی شہریت اختیار کر لی اور وہیں اپنی چھوٹی سی دنیا آباد کر کے رہنے لگے۔ زندگی باہمی مفاہمت ہم مزاجی اور بڑی محبت کے ساتھ گزرتی رہی۔ تین سال بعد ان کی محبت کا پھول کھلا۔ جس کا نام انہوں نے ایک دوسرے کے مذہب کا احترام کرتے ہوئے رام رحیم رکھا۔

رام رحیم بچپن ہی سے اپنے ماں باپ کو ہندوستان کو یاد کرتے ہوئے اور وہاں کی ہر ایک چیز کے گن گاتے ہوئے سنتا رہا تھا۔ جب ماں اور رحیم باتیں کرتے کرتے اپنے ماضی کی دنیا میں چلے جاتے اور اپنے اپنے شہر کی، کھیتوں کی، اور مخلوص لوگوں کی باتیں کرتے تھے، اجنتا ایلورا کی باتیں کرتے تو رام رحیم کا دل بے اختیار ہند کی دھرتی کی طرف کھنچتا اور وہ والدین سے ہندوستان چلنے کے لئے ضد کرتا، مگر دونوں کچھ اپنی مشغولیت کی وجہ سے اور کچھ گھر والوں کی خفگی کے خیال سے ہندوستان جانے کا ارادہ نہ کر سکے۔ رام رحیم کا ہندوستان دیکھنے کا شوق اور اس ملک سے اس کی محبت اس حد تک بڑھی کہ وہ اکیلے ہی جانے کی ضد کرنے لگا۔ پہلے تو کم عمری کی وجہ سے عبدالرحیم منع کرتے رہے مگر جب وہ بائیس سال کا خوبصورت نوجوان ہو گیا اور اس کا اصرار حد سے آگے بڑھ گیا تو دونوں نے اسے ہندوستان جانے کی اجازت دے دی۔

مجمع خونیں نگاہوں سے اسے گھور رہا تھا۔ رام رحیم نے بڑی حیرت سے اپنے دل میں سوچا، میں کون ہوں؟ ہندو یا مسلمان؟ مسلمان یا ہندو؟ اُس کو یہ معلوم تھا کہ اس کا باپ مسلمان ہے اور ماں ہندو، مگر اس کے نزدیک یہ بڑی معمولی اور غیر اہم بات تھی۔ وہ سوچتا یہ ایسی ہی بات ہے جیسے باپ مرد ہے، ماں عورت ہے، یا باپ لمبا ہے، ماں ناٹی ہے۔ باپ ڈاکٹر ہے، ماں لائبریرین ہے۔ اس میں کوئی اونچ نیچ کی بات نہیں۔ کوئی تعصب کی یا نفرت کی بات نہیں۔ کوئی ایسی بات نہیں جس کو گلا پکڑ کر اور چھرا نکال کر پوچھا جائے۔
سوچنے کے باوجود وہ فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان۔ عید کے دن وہ باپ کے ساتھ نماز کیلئے بھی جاتا تھا اور دُرگا پوجا پر ماں کے ساتھ پوجا کے لئے بھی بیٹھتا تھا۔ دیر و حرم ایک ہی گھر میں جمع تھے اس لئے دونوں کے بیچ کی خلیج یا کشیدگی کا احساس کبھی ذہن میں پیدا نہ ہوا تھا اور نہ کبھی یہ سوال کبھی ذہن میں پیدا ہوا تھا کہ کون صحیح راستے پر ہے اور کون غلط راستے پر ۔۔۔۔۔ اُسے یاد آیا کہ جب عبدالرحیم کسی کام سے مصر گئے ہوئے تھے اور ان ہی دنوں اسرائیل سے جنگ چھڑ گئی تھی تو رما نے دیوی کی مورتی کے سامنے رو رو کر اُن کے خیریت سے واپس آنے کی دعائیں مانگی تھیں اور عبدالرحیم خیریت سے واپس آگئے تھے ۔۔ اسی طرح جب رما بیمار پڑ گئی تھی اور کوئی دوا فائدہ نہیں پہنچا رہی تھی تو عبدالرحیم نے صرف قرآنی آیات پڑھ پڑھ کر پانی پر دم کر کے دینا شروع کر دیا تھا اور نماز کے بعد گڑگڑا کر دعائیں مانگی تھیں اور رما جلدی ہی ٹھیک ہو گئی تھی۔ ان سب باتوں کے زیرِ نظر وہ کیسے فیصلہ کر سکے کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان۔ کیونکہ وہ دیکھ چکا تھا کہ خواہ اللہ کہہ کر پکارو یا بھگوان کہہ کر۔ دعائیں دونوں حالتوں میں سُن لی جاتی ہیں اور بندہ اور معبود کے درمیان لین دین نیز رشتہ کا قیام دعاؤں سے ہی ہوتا ہے۔ دعاؤں کی ڈوری مذہب سے تعلق اور اعتقاد کو مضبوط کرتی ہے۔

"جلدی بتا تو ہندو ہے یا مسلمان؟" ایک آدمی نے دانت پیستے ہوئے کہا۔
"میرا باپ مسلمان ہے اور ماں ہندو۔" رام رحیم نے گھبرا گھبرا کر اٹکتے ہوئے کہا۔
"مارو۔ مارو" کئی آوازیں چلائیں۔
رام رحیم نے پوری قوت لگا کر اپنے آپ کو چھڑایا اور مخالف سمت میں بھاگا۔
اُس کے پیچھے کئی آدمی چھرے لے کر دوڑ پڑے۔ رام رحیم بے تحاشا بھاگ کر سامنے والی گلی میں گھس گیا اور پیچھے آنے والے لوگ اپنی گلی کے سرے پر رُک کر گالیاں بکنے لگے۔
دوسری گلی میں گھس کر اُس نے اپنی سانسیں درست کیں اور جسم سے پسینہ پونچھتا ہوا وہ آگے بڑھ گیا۔ یکایک ایک مکان سے گنڈاسے اور بلم لئے ہوئے آدمیوں کا ایک بڑا غول نکل آیا۔ چند آدمیوں نے بھاگ کر اس کو پکڑ لیا اور قہر آلود لہجہ میں پوچھا "تو کون ہے؟"
"رام رحیم" اُس نے دھڑکتے دل سے کہا۔

"دھوکا دیتا ہے" ایک غنڈے نے چیختے ہوئے کہا۔

"مارو۔ مارو" کئی آوازیں نے چلّا کر کہا۔

ایک غنڈے نے اُس کے پیٹ کی طرف چاقو اُٹھایا۔ رام رحیم نے اُسے روکنے کے لئے گھبرا کر ہاتھ بڑھایا اور چاقو ہتھیلی کو چیرتا ہوا نکل گیا۔ وہ واپس مڑ کر بھاگا۔ کئی غنڈے اُس کے پیچھے دوڑے اور تراہے تک پہنچتے پہنچتے ایک نے بلّم کا وار کیا۔ بلّم رام رحیم کے کاندھے اور گردن کے بیچ میں گھس گیا اور وہ تیسری سڑک پر لڑکھڑاتے قدموں سے کچھ دور بھاگنے کے بعد بیہوش ہو کر گر پڑا۔ آمنے سامنے والی گلیوں کے سِروں پر مخالف گروہوں کی بھیڑ ایک دوسرے کو خونیں نگاہوں سے دیکھ رہی تھی اور رام رحیم کے جسم سے بہتا ہوا خون سوالیہ نشان کی شکل میں جم رہا تھا، جیسے ایک سوال ہو۔ یہ کس کا لہو ہے؟

اور میں، اِس کہانی کا مصنّف، اِس تراہے کے نیچوں بیچ کھڑا ہوں۔ ایک طرف ہندوؤں کے غنڈے ہیں ایک طرف مسلمانوں کے، سامنے رام رحیم زخموں سے چور بیہوش پڑا ہے اور میں سوچ رہا ہوں اِس کہانی کا انجام کیا لکھوں؟

کیا رام رحیم کو مر جانے دوں؟ لیکن اِس انجام سے میرے ملک اور اس کے عوام کی جو مکروہ شکل سامنے آئیگی اُس کا تصوّر بھی میں برداشت نہیں کر سکتا۔

تو پھر رام رحیم کو زندہ رہنے دوں؟ لیکن جب وہ ہوش میں آئیگا تو اس ملک کے بارے میں کیا سوچے گا؟ اُس نے بچپن سے آج تک اِس ملک کو اپنا سمجھا ہے۔ اِس سرزمین کے ذرّہ ذرّہ سے محبّت کی ہے، وہ محبّت کدھر جائیگی۔ اُس نے اپنے والدین سے یہاں کے لوگوں کے خلوص، محبت اور امن پسندی کی کہانیاں سُنی ہیں وہ سب جھوٹ بن جائیں گی۔

کیا یہ ممکن نہیں کہ جب رام رحیم ہوش میں آئے تو اسے گذشتہ واقعات محض ایک بھیانک خواب معلوم ہوں۔ جب وہ آنکھ کھولے تو دونوں گلیوں کے لوگ مل جل کر راہوں میں باہیں اور گلے میں ہاتھ ڈالے ہنستے گاتے نظر آئیں۔ چھُریوں، بلّموں اور بندوقوں کی جگہ اُن کے ہاتھوں میں گلال ہو یا دیوالی کا دیا ہو یا پھول ہوں؟ اور واقعی کسی میلے کی تیاری ہو جس میں سب لوگ مل جل کر مسکراہٹوں اور خوشیوں کے جھولوں میں جھولتے تراہے کے تیسرے راستے پر آگے چل رہے ہوں؟ یہ ایک سوال ہے۔ ▲
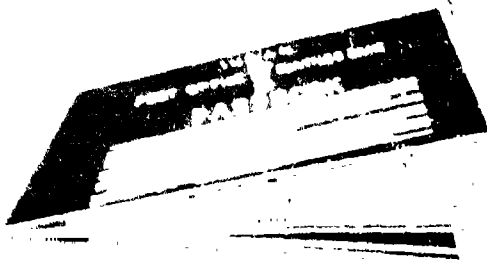
اپنا نظریہ

آپ کا ڈاک گھر
(بڑا یا چھوٹا) آپ کو آپ کے سیونگز
بینک کھاتے کے لئے چیک کی جدید ترین
سہولتیں پیش کرتا ہے۔

سیونگز بینک کھاتے کے لئے چیک استعمال کیجئے

- چیک کھاتے میں کم از کم ۱۰۰ روپے کی رقم باقی رہنی چاہیے۔
- حسب خواہش چیک جاری کر سکتے ہیں۔
- مقامی چیکوں کی وصولی پر کمیشن نہیں لیا جاتا۔
- چیک بک کا حساب میں جمع کرائے جا سکتے ہیں۔
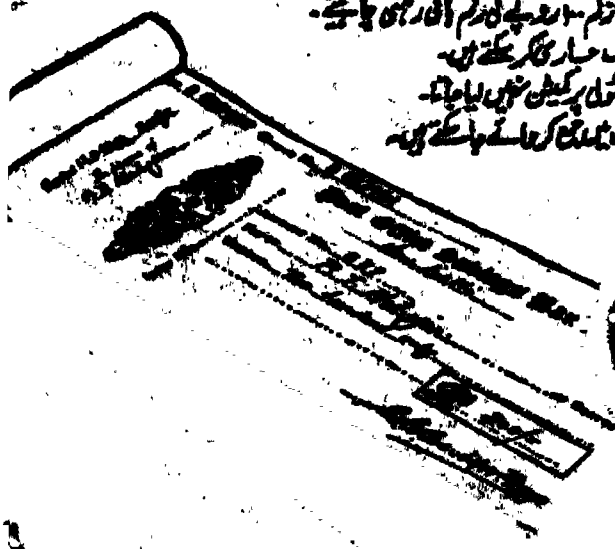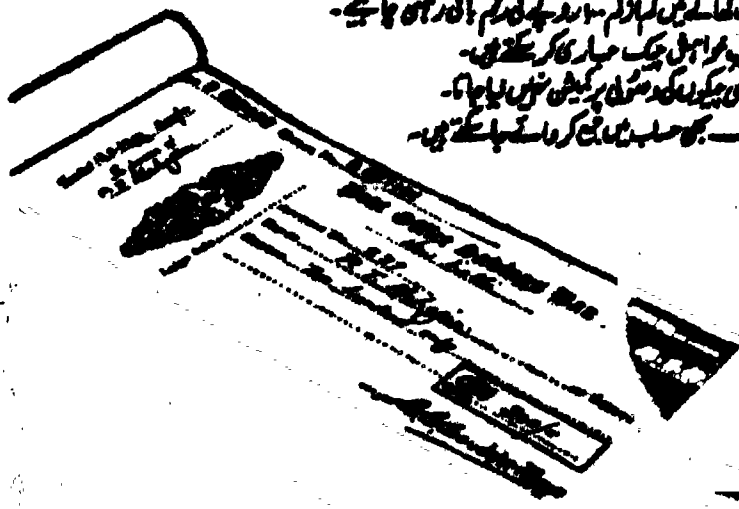
چیکوں سے ادائیگی
آسان اور
محفوظ ہے

ڈاک گھر کے
سیونگز بینک میں
آج ہی کھاتا کھولئے

قومی بچت
آرگنائزیشن

davp 69/236

مشورہ

دَرد تو آگ ہے سمندر ہے
اس کو اشکوں سے کیسے پار گے!
ایک ننھا سا قطرۂ خوں ناب
کرب کی بیکراں اکائی ہے
غرق ہے اِس اتھاہ سیاہی میں
اپنی ہستی کا ایک اِک لمحہ!
جانتے ہو کہ
بہتے پانی میں آگ ہوتی ہے
غم کی دَلدَل کو کیوں بڑھاتے ہو
خشک شعلوں کو اب ہوا مت دو
اِس سے بہتر ہے
مُسکراؤ اور
مُسکراہٹ ہے اِک اَزلی پیاس
دَرد کی آگ پی کے جیتی ہے
اور تم کو بھی،
مجھ کو بھی،
سب کو،
وقت کے ساتھ زندہ رہنا ہے!!

▲

ہمزاد

ہر دِل میں کچھ تاج محل ہیں
ہر شب میں کچھ خواب
کس کس کا دُکھ اپناؤ گے
کس کس کرب سے گزرو گے
کس کس آنکھ میں جھانکو گے
سنگ نُما شہروں میں کب تک
تم اِک شیشۂ دِل لے کر
جاں کا قرض چکاؤ گے
آخر اِک دِن وہ آئے گا
مَیں بھی پتھر ہو جاؤں گا
تم بھی پتھر ہو جاؤ گے!

▲

اُردُو اور غالب

فرازؔ قاضی (دوحہ قطر)

سُرخیِ آفاقِ اُردُو کو کیا ہے سُرخرُو
سینۂ اَوراق میں غالب کے دِل کا ہے لہو
مِٹ گئیں کتنی زبانیں دیکھے اپنا خونِ دل
سرزمینِ غیر نے بھی خود بلایا آب جُو
شاخِ اُردُو اور غزلخوانِ عندلیبِ فارسی
پیکرِ ہستیِ اُردو کو بنایا خوب رُو
آج بھی غالب ہے غالب مسکرانی وتقدیر
ہم عنانِ رَخشِ اُردُو، ہمرکابِ جستجو
شور ہے یاں ہم فرازؔ اُردو کا مسکن لُٹ گیا
پھر رہی ہے یہ غریب اب یوں ہی ہی کو بکو

▲

ساجد اختر

آنکھوں کی سرزمیں پہ آنسو اگائیے
پھر ہو سکے تو گیت مسرت کے گائیے
خواہش کی اپسرائیں اتاریں گی آرتی
مایوسیوں کے غار سے باہر تو آئیے
ہر سمت سُولیوں کی نمائش ہے اندنوں
پیغمبرِ حیات کی عزت بچائیے
تنہائیوں کے کرب کی گردن مروڑ کر
یادوں کی دلنواز ندی میں نہائیے
گاتی ہوئی، حسین امیدوں کے پھول کو
ویران آرزو کا مقدر بنائیے
خاموشیوں کے زرد، المناک تال پر
آواز کی بہار کا نغمہ سنائیے
احساس کے لطیف ترنم کے طاق پر
ساجد! غموں کے گیت کا دیپک جلائیے

ڈاکٹر سحر اعظمی

ننگِ ہمت ہے جو تاراجی پہ شیون کیجیے
بجلیوں کی زد پہ تعمیرِ نشیمن کیجیے
ارتقا کی منزلیں خود بڑھ کے چومیں گی قدم
ختم پہلے قصۂ شیخ و برہمن کیجیے
آدمی کے خون سے ہولی منائے آدمی
اس قدر قانون کا ڈھیلا نہ بندھن کیجیے
مسکرا کر دار پر چڑھ جائیے حق کے لیے
سامنے باطل کے ہرگز خم نہ گردن کیجیے
ہے کہیں جامہ دری بھی جوشِ وحشت کا علاج
کیوں گریباں پھاڑیئے کیوں چاک دامن کیجیے
خود پکار اٹھتی ہے شانِ ارتقا انسان کی
"چاند سے لائی ہوئی مٹی کا درشن کیجیے"
مرگِ انساں ہے سحر کوتاہیٔ عزم و عمل
آندھیوں میں بھی چراغِ زیست روشن کیجیے

محبوب راہی

پہلے پہل تو ہر سچائی کو ٹھکرایا لوگوں نے
لیکن جب خود ٹھوکر کھائی تب پچھتایا لوگوں نے

گزر گئے ڈھلتے سالوں کو روند کے اپنے پیروں سے
سامنے چڑھتے سورج کے سر اپنا جھکایا لوگوں نے

واعظ، لیڈر، سخی، مصور، شاعر اور فنکار بنے
ایک شہرت کی خاطر کیا کیا سوانگ رچایا لوگوں نے

میں نے در در جا کر مانگی بھیک خلوص او چاہت کی
مجھ کو نفرت اور حقارت سے ٹھکرایا لوگوں نے

دل تو دیوانہ ہے یارو، ایسی ہی سی کرتا ہے
کس کس طور سے اس دیوانے کو سمجھایا لوگوں نے

گلی گلی پرچار کیا نفرت کا اور رقابت کا
ہر بستی کو آگ جلتا شمشان بنایا لوگوں نے

نگر نگر ڈھونڈا پیٹا راہی کی گمراہی کا
جب وہ سیدھی راہ چلا اس کو بہکایا لوگوں نے

غزلیں

مقالہ

مختار ٹونکی

راجہ بھوانی سنگھ کی اردو خدمات

راجستھان جو دیروں کی بھومی اور سورماؤں کا مسکن ہے، چتوڑ گڑھ اور رنتھنبور قلعوں کی فصیلیں گواہ ہیں، رانا پرتاپ اور درگاداس کے بہادرانہ کارنامے گواہ ہیں۔ مہاراجہ مان سنگھ اور جسونت سنگھ کی رزم آرائیاں گواہ ہیں، اور پنا دھائے کی وفاداری، رانی پدمنی کی جاں نثاری شہادت پیش کرتی ہے کہ سیاست اور شجاعت میں راجستھان ہمیشہ سربلند رہا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہاں علم و ادب کی شمعیں نہیں جلیں اور شعر و شاعری کو فروغ حاصل نہیں ہوا۔ بالفاظ خان برکت اللہ خاں صاحب امر واقعہ یہ ہے کہ:۔

"راجستھان صرف اپنے جواں مردوں کے، اپنے وطن اور قوم کے لئے مر مٹنے اور راجستھانی خواتین کے اپنے ناموس کیلئے جل کر خاک ہو جانے کے لئے ہی مشہور نہیں ہے۔ اس کے کوہ و بیاباں کے صفحات پر قلم نیزہ نے خون کی روشنائی سے رزمیہ واقعات ہی ثبت نہیں کئے ہیں، اور اس کی شان و شکوہ چتوڑ گڑھ اور رنتھنبور جیسے قلعوں کی فصیل تک ہی محدود نہیں، نیز مذہبی تقدس کے لحاظ سے خواجہ اجمیری کی درگاہ اور پشکر و دلواڑہ وغیرہ کی تیرتھ گاہوں پر ہی اس کی شہرت کا انحصار نہیں ہے۔ بلکہ میدان علم و ادب کے وہ عظیم المرتبت اور نام آور اہل علم بھی اس میں گذرے ہیں۔ جن کے رشحات قلم نے حسین اردو کی بے بہا خدمت انجام دی ہے۔ ان کی بزم آرائیوں اور ادب نوازیوں کے واقعات آج بھی حقیقت بیں نظر کی روشنی بن سکتے ہیں۔"

ادبی لحاظ سے راجستھان کا ماضی نہایت شاندار رہا ہے۔ اس کے جاں بازوں نے دقت کے ساتھ بہت سے زندہ و پائندہ نشاں چھوڑے ہیں۔ ان ادب کے سورماؤں میں اگر ایک طرف عالی وقار علماء و فضلاء کی مجتہدانہ کارگذاریاں سامنے آتی ہیں۔ اور صف اول کے ادبا و شعراء کے مستحسن کارنامے جگمگاتے ہیں۔ تو دوسری طرف ادب کے پاسداروں یا اردو کے خدمت گذاروں میں نوابان وقت اور راجگان عصر بھی اپنی قدر دانیوں کی قندیلیں روشن کئے اور ادب نوازیوں کے علم اٹھائے دکھائی دیتے ہیں۔ جب ۱۸۵۷ء کا خونیں ہنگامہ ظہور پذیر ہوا تو نہ صرف مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا بلکہ دہلی اور لکھنؤ کی ادبی مجلسیں بھی ویران ہو گئیں۔ صاحبان علم و فن کا جب کوئی قدر دان اور پرسان حال نہ رہا تو وہ ترک وطن پر مجبور ہوتے۔ راجستھان کے راجاؤں اور نوابوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور بہتر طریقے سے ان کی سرپرستی و دلجوئی کی۔ کئی اہل زبان اور صاحب علم لوگ یہاں آ کر

شعرائے راجستھان آکر بس گئے جنہوں نے شعر و سخن کی محفلیں گرم کر کے عروسِ ادب کو سنوارنے میں شاعری کے جوہر دکھائے مثلاً راؔقم مرزا الفت، ظہیر حسن ظہیرؔ، احمد مرزا آگاہ دہلوی، تقی بیگ مائلؔ، مہدی حسن مجروحؔ، مرزا سلیمان اسد لکھنوی، بسمل خیرآبادی، مضطر خیرآبادی وغیرہ وغیرہ عرصۂ دراز تک یہاں مقیم رہے۔ اور اپنی ادبی و شعری ہنگامہ آرائیوں سے جے پور، ٹونک، جودھپور، جھالاواڑ، الور اور بھرت پور کو ادبی مرکز بنا دیا۔

راجستھان عظمت نشان کے بابت حکمرانوں میں جس طرح الور کے مہاراجہ جے سنگھ اپنی اردو دوستی کے لئے زمانے بھر میں مشہور ہیں۔ اسی طرح سے اردو کی لائق و فائق خدمات انجام دینے کے صلے میں ہزہائینس جھالاواڑ مہاراج رانا سر بھوانی سنگھ کا نام بھی ایک ضرب المثل کی طرح لیا جا سکتا ہے۔ فرماں روائے ریاست جھالاواڑ موصوف ایک دلکش خیال، بے تعصب اور حوصلہ مند رئیس تھے۔ اردو خصوصاً شعر و سخن کا بڑا پاکیزہ مذاق رکھتے تھے یوں تو آپ کے دربار میں راجہ بھوج اور ہارون الرشید کی علمی مجلسوں کی طرح ممتاز علما و فضلا و عقلانہ صبح سے دس بجے تک موجود رہتے تھے۔ جن میں انگریزی زبان کے فاضل، ہندی سنسکرت کے ودوان، عربی و فارسی کے عالم، اور اردو کے شعرا و ادبا بھی شریک تھے۔ مگر ان میں اردو کے کفش برداروں کو طرۂ امتیاز حاصل تھا۔ شعری مجلسوں اور ادبی تقریبات نے مہاراجہ کی قدر دانی اور ادب نوازی کے چرچے دور دور تک پھیلا دیئے تھے۔ یہ علمی و ادبی محفلیں محض تفریحِ طبع کی خاطر نہ تھیں اور نہ اسے والئی ریاست کا ہنگامی ذوق ہی کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ مہاراجہ نے ملک اور بیرون ملک سے چن چن کر اچھے اچھے لوگوں کو منتخب کر کے اپنے دربار میں بلایا تھا تو یہ ایک خاص نقطۂ نظر سے زبان و ادب کی خدمت کا جذبہ تھا۔ ۱۸۹۰ء میں جب بازار شعر و سخن سرد پڑ گیا تو مولوی عبدالوحید صاحب نیرنگ کاکوروی کو طلب فرمایا گیا اور مہاراجہ کے ایما سے پندرہ روزہ بزم مشاعرہ کی بنیاد پڑی۔ حضرت نیرنگ نے ذوق شعر و سخن کو جلا دینے اور ادبی محفلوں کو دوبالا کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تو مہاراجہ نے بھی ان کی قدر دانی اور عزت افزائی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ حضرت نیرنگ کو افتخار الشعراء کے ارفع و اعلیٰ خطاب سے نوازا گیا۔ دربار میں اعلیٰ منصب عطا فرمایا گیا۔ اور ان کے دیوان کی اشاعت کا بندوبست کرایا گیا۔ مہاراجہ کو اردو زبان سے کتنا لگاؤ اور شغف تھا اس کا اندازہ قاضی سر عزیز الدین صاحب دیوان ریاست کے ایک اقتباس سے ہو سکتا ہے۔ جو دیوان نیرنگ کے دیباچہ سے ماخوذ ہے۔

میں اس کو اردو شاعری کا ایک معجزہ سمجھتا ہوں کہ راجپوتانہ کی ایک دور دراز ریاست جھالاواڑ میں ایک ہندو فرماں روا یعنی مہاراج رانا سر بھوانی سنگھ صاحب بہادر کو منشی عبدالوحید صاحب کے کلام بلاغت نظام کی طرف متوجہ فرمایا۔ اور منشی صاحب نے اپنے نصف صدی کے زمانۂ قیام میں جھالراپاٹن میں رہ کر اور اپنے قدر دان محسن و مربی فرماں روا کے زیر سایہ نہ صرف اردو شاعری کو معراجِ کمال پر پہنچایا بلکہ بکثرت قابل و ہونہار اردو شاعر راجپوتانہ میں پیدا کر دیئے۔

خود حضرت نیرنگ اپنے دیوان میں حق نمک اس طرح ادا کرتے ہیں:

یہ امر میرے لئے باعث مسرت اور سرمایۂ افتخار ہے کہ میرے آقائے نعمت سر بھوانی سنگھ صاحب بہادر آنجہانی نے جو مہاراجہ اپنی زندگی میں دیوان طبع نہ کرا سکے، اس مجموعہ کی ہر غزل کو مطلع سے مقطع تک ملاحظہ و سماعت فرما کر بیش قیمتی مشوروں سے عزت بخشی۔ غالباً دنیا میں یہ پہلا دیوان ہے جسے ایک والئی ملک نے خاص وقت دے کر حرف بحرف سماعت فرمایا اور دربارِ عام منعقد فرما کر اس ہیچ مرز کو سند افتخار الشعراء

مطبوعات عطا کرکے اعزاز وافتخار بخشا۔"

ان کے ایک قطعے سے بھی رئیس موصوف کی قدردانی کا ثبوت بہم پہونچتا ہے۔

قدردانی سے مہاراج کی بے شک نثر رنگ ہے شب و روز ہمیں لطفِ سخن غربت میں

حافظ محمد عالم گیر خاں کیف ٹونکی بھی ترک وطن کر کے جھالراپاٹن گئے تو رئیس موصوف نے اسے اپنی خوش بختی تصور کیا، بڑی قدر و منزلت کی گئی۔ اور کیف کو فوراً درباری شاعر کا اعزاز عطا ہوا۔ امام الشعراء حضرت کیف نواب سلیمان خاں اسد لکھنوی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ اور بڑے قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کے غیر مطبوعہ دیوان کا اکثر و بیشتر حصہ اساتذۂ شعرائے دہلی کی زمینوں میں غزلیں کہنے پر مشتمل ہے۔ داغ کی غزلوں پر انھوں نے بہتر سے بہتر شعر نکالے ہیں۔ نعت گوئی میں بے نظیر و بے عدیل تھے۔ بقیہ کلام "وسیلۂ شفاعت" کے نام سے شائع ہو چکا ہے کیف زندگی بھر جھالاواڑ میں رہے۔ حالانکہ ان کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف میں کئی بار دکن سے بلاوا آیا۔ اور نواب حکمران ریاست جنجیرہ نے بھی ان کی پذیرائی کرنی چاہی مگر انھوں نے یہ کہہ کر ؎

عزت افزائی کی خاطر کیف کیوں جائے دکن قدرداں راجہ بھوانی سنگھ جب پاٹن میں ہے

ان بلاووں کو ٹھکرا دیا۔ کیونکہ بھوانی سنگھ جیسے علم دوست اور ادب نواز راجہ نے معاشی پریشانیوں سے ہر طرح آزاد کر رکھا تھا۔ اس کی تائید میں ذیل کے اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں۔

یا الٰہی اس سے دونا چوگنا ہو اس کا راج اتنی چھوٹی سی ریاست پر یہ شاہانہ مزاج

ہے اسی راجہ کے دم سے قدردانی کا رواج قدرداں راجہ بھوانی سنگھ ہے جتنا کہ آج

کیف قدرِ شعر گوئی اب کہیں اتنی نہیں

تشنگانِ ادب کو سیراب کرنے اور دل دادگانِ شعر و سخن کو عالم سرخوشی عطا کرنے کے سلسلے میں ہی جھالاواڑ دربار نے ماہنامہ "آفتاب" کے طلوعِ مسعود کا حکم صادر فرمایا۔ چنانچہ ۱۹۰۵ء میں یہ ماہنامہ بھی دنیائے ادب پر مہر و ماہ بن کر چمکا۔ اڈیٹر سید محمد حسین رضوی تھے جنھوں نے اپنی صحافتی لیاقتوں سے بہت قلیل مدت میں اسے ممتاز رسائل و جرائد کے مقابل کھڑا کر دیا۔ مگر موصوف کی ناگہانی موت سے یہ بھی افقِ ادب کی پنہائیوں میں ڈوب گیا۔ حتیٰ کہ افسر الشعراء آغا شاعر قزلباش دہلوی کو قدرداں رئیس کا ممنونِ منت بننے کی سعادت نصیب ہوئی اور ان کی زیرِ ادارت جنوری ۱۹۲۰ء میں پھر "آفتاب" نئی شعلہ سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ اور جیسا کہ جھالاواڑ کے ایک لائق باشندے سید مصطفیٰ حسین رضوی "شاعری کی کایا پلٹ" میں تحریر فرماتے ہیں۔

ہمارے آقائے نامدار حضور مہاراج بھوانی سنگھ صاحب بہادر کے سی ایس آئی والئی ریاست جھالاواڑ نے جو علوم و فنون کے مخزن ہیں اور دنیا کی کئی زندہ زبانوں کے ماہر ہیں جہاں دفاتر میں ناگری حرفوں کے رواج کا حکم نافذ فرمایا۔ وہاں ساتھ ہی ساتھ بقائے اردو کے لئے زیر اڈیٹری سید محمد حسین رضوی بی اے ایک رسالہ موسومہ "آفتاب" ریاست ہذا سے نکالے جانے کا حکم بھی نافذ فرمایا۔ یہی "آفتاب" جو سابق اڈیٹر کی ناگہانی موت کے باعث صرف تین چار سال میں اپنی شعاعیں پھیلا کر یک لخت غروب ہو گیا تھا اب شروع جنوری ۱۹۲۰ء سے زیر اڈیٹری افسر الشعراء جناب آغا شاعر قزلباش دہلوی پھر بآب و تاب سے طلوع ہوا ہے اور زبان کی جو خدمت کر چکا اور کر رہا ہے اہلِ ملک سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس علاوہ علوم کے اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ اکتوبر ۱۹۱۸ء سے انجمنِ حسن کی بنیاد ڈالی۔

اور اس طرح زبان اُردو کی بقا کیلئے ہمیشہ ہمیش کو انتظام فرماکر جو احسان شعرائے ہند پر کیا ہے اُس کا شکریہ اگر ہمارے بال بال زبان ہو جائیں جب بھی ادا نہیں کیا جاسکتا۔"

آفتاب اپنے ادبی مسلک کی وجہ سے دورِ اوّل میں ہی ملک گیر شہرت حاصل کر چکا تھا۔ اور اُس کے معیار نے ہندوستان کے مشاہیرِ ادب سے بھی خراجِ تحسین وصول کر کے مقبولیت کی سند پائی تھی شمس العلماء مولانا خواجہ الطاف حسین حالی نے ان لفظوں میں ایڈیٹر آفتاب کو لکھا تھا۔

مکرمی، رسالہ آفتاب کے دو نمبر پہونچے، ان کو دیکھ کر طبیعت بہت خوش ہوئی، اس کو پڑھ کر بے انتہا مسرت حاصل ہوئی۔ کیونکہ ہمارے رئیسوں کا اس طرف متوجہ ہونا اور ایسی لیاقت سے علمی مضامین لکھنا ہندوستان کے بھلے دن آنے کی دلیل ہے۔ بالو امبالال کا مضمون تعلیم پر اور آپ کا مضمون تعصب پر بہت عمدہ مضمون ہیں۔ خدا سے امید ہے کہ آفتاب ملک میں چمکے گا۔ دل سے دعا کرتا ہوں کہ آپ کامیاب ہوں اور آفتاب کی روشنی تمام راجپوتانہ میں پھیلے۔"

۱۸ اپریل ۱۹۰۶ء حیدرآباد دکن

شمس العلماء خان بہادر مولوی ذکاءاللہ دہلوی نے اس طرح حوصلہ افزائی کی۔

میں آپ کے محبت نامے اور دو رسالوں کے عنایت کرنے کا شکریہ ادا کرتا ہوں، مجھے یقین ہے کہ اگر "آفتاب" پر والئی ریاست جھالاواڑ کی نظرِ التفات رہی تو وہ اقلیم سخن میں ویسا ہی درخشاں ہوگا جیسا کہ ہندوستان میں سورج بنسیوں کا خاندان تاباں ہوا تھا۔" ۲۶ اپریل ۱۹۰۶ء

اور چودھری خوشی محمد خاں ناظر نے یوں تعریف کی۔

آفتاب کا مسلک مجھے پسند ہے۔ اس میں بہت سے بیش قیمت اور مفید عام مضامین شائع ہوئے ہیں۔ جو صرف لٹریری طرازی نہیں بلکہ معلومات مفید کے اعتبار سے بہت قابلِ قدر ہیں۔ غزلیات کی نسبت جو سادہ نیچرل نظموں کا سلسلہ آپ نے ایجاد کیا ہے بہایت مفید ہے۔"

رئیس موصوف کو فرسودہ رسمی اور روایتی شاعری میں کوئی افادی پہلو نظر نہیں آتا تھا اس لئے انھوں نے بذات خود ایسی کوششیں کیں اور شعراء کو ترغیب دی کہ وہ شاعری کو نیچرل رنگ کی ڈگر پر لائیں اور زندگی کے حقائق سے قریب تر بنائیں۔ اس لئے ان کے ایماء سے ایک سہ ماہی رسالہ "شاعری کی کایا پلٹ" کا اجراء عمل میں آیا۔ ایڈیٹر سید مصطفےٰ احسن تھے۔ اس میں نیچرل رنگ کے شعراء کا کلام سہ ماہی وقفہ سے شائع کیا جاتا تھا۔ ملک میں نیچرل شاعری کو مقبول بنانے میں اس رسالے کو نہایت اہمیت حاصل ہے۔ اس طرح حالی کی راہ ہموار کرنے اور اُردو شاعری کو متنوع بنانے میں راجہ بھوانی سنگھ کی خدمات کو بھلایا نہیں جاسکتا۔ اس کے ساتھ ہی اس ضمن میں وہ لکچروں کا سلسلہ بھی قابلِ قدر ہے جو دورانِ جنگِ عظیم رہا ۱۹۱۴ - ۱۹۱۹ء جاری رہا۔ یہ سلسلہ مہاراج کے حکم سے عمل میں لایا گیا تھا۔ ہر افسر موضوعات جنگ میں سے کوئی ایک موضوع منتخب کر کے لکچر دیا کرتا تھا۔ یہ لکچر ابتداء میں ہفتہ وار ہوتے رہے بعد میں ماہانہ طور پر جاری ہوتے۔ ان کی ایک خصوصیت یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ ہر لکچر کے ساتھ ایک نظم مزید ہوتی تھی۔ بعض لکچروں کی زبان اور رسم الخط اردو ہے اور یہ سب ریاست کے سرکاری مطبع میں چھپ چکے ہیں۔ ان میں بعض کا تذکرہ غیر ضروری نہ ہوگا۔

لکچر نمبر ۳ بلجیم پر جرمن مظالم مہاراج رانا سر بھوانی سنگھ

تاجر ہمی

لیکچر نمبر ۹	جنگ یورپ	سید مصطفیٰ حسین رضوی
لیکچر نمبر ۱۰	جرمن جاسوسی	پنڈت شیو کمار چتر ویدی
لیکچر نمبر ۱۱	برطانیہ کی بحری طاقت	ماسٹر شیام بہاری لال
لیکچر نمبر ۱۳	جنگ میں شفاخانہ کا قیام	بابو منمن لال صاحب
لیکچر نمبر ۱۶	درہ دانیال	سجاشیا شادی لال صاحب

آخر وہ زمانہ بھی آتا ہے جب اُردو کے خاتمے کا نعرہ اور ہندی کے پروپیگنڈے کی حمایت عام ہو گئی دیو ناگری رسم الخط کی تحریک نے کافی زور پکڑ لیا۔ اور اس اردو دوست راجہ کو جب کوئی سبیل نظر نہ آئی تو لاچار ہو کر دیوناگری رسم الخط کے اجرار کا اعلان کر دیا اس وجہ سے نہیں کہ انھیں اردو سے کوئی دشمنی پیدا ہو گئی تھی بلکہ اس حالت میں اردو کو باقی رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ واقعات بتاتے ہیں کہ اس وقت ہی سے ان کی اردو سے دلچسپی اور شعراء کی قدردانی میں مزید اضافہ ہو گیا اور جیسا کہ "جائزہ زبان اردو" میں تحریر کیا گیا ہے۔

اردو کا طرز عبارت و انشاء اور اسی قسم کی دیگر خوبیوں کو بطور خاص دیکھا جانے لگا۔ اردو رسائل کو سرکاری مطبع میں چھاپ کر جاری کیا گیا۔ اردو میں مختلف موضوعات پر لیکچروں کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ شاعری پر لوگوں کو نگاہ رکھنے کا حکم دیا گیا۔ اردو لائبریری کا قیام عمل میں آیا اور اسی قسم کے متعدد کام کئے جس سے اردو زبان کو فروغ حاصل ہو۔ (جائزہ زبان اردو صفحہ ۹۲)

غرض جھالاواڑ میں راجہ بھوانی سنگھ کے طفیل ایک زمانے تک اُردو ادب کی کافی نشر و اشاعت ہوئی۔ اہل تصنیف و تالیف اور شعراء میں سید محمد حسین رضوی، نیرنگ کاکوروی، شجھو دیال دانش، حافظ لیسین خاں شرر، سید حامد حسین رضوی، محمد عثمان خاں فائق، منشی عبد العزیز عزیز، سکندر خاں اثر، مولوی وجیہہ الدین خاں حنیف، رفیق بیگ تسلیم اور حافظ عالم گیر خاں کیف قابل ذکر ہیں۔ مہاراجہ کے دور حکومت ہی میں جھالاواڑ سے بہت سی اہم بالشان تصانیف زیور طبع سے آراستہ ہوئیں۔ بیکس اقبال نے سب سے پہلے ۱۸۸۳ء میں اردو نثر میں "چہار حسینہ" کے نام سے ریاست جھالاواڑ کی مبسوط تاریخ لکھی۔ ڈرامہ پر ایک دقیق نظر سید محمد حسین رضوی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اور اردو میں ڈرامے کے آغاز و تدریجی ارتقار کا اچھا جائزہ ہے۔

انتخاب کلام شعرائے ہند، اور تذکرۃ الشعرائے جھالاواڑ، کے تذکرے بھی آزاد کی "آب حیات" کے سلسلے کی ایک کڑی کہے جا سکتے ہیں۔ "دیوان نیرنگ" اور کلیات دانش" کی اشاعت بھی اسی دوران ہوئی۔ "اسلامی لغت" تین جلدوں میں سید حامد حسین رضوی نے مرتب کی اور یہ تمام ادبی کارنامے مہاراجہ کی قدردانی اور ادب نوازی کا ثبوت ہم پہنچاتے ہیں۔

طراز غ۔ ک۔ ساز (کشمیر)

چاندنی کا دھواں

آسمان پہ چاند مسکرا رہا تھا۔

ساری جھیل پہ چاندنی کھیل رہی تھی۔

ہلکی ہلکی ہوا کے ترنم ریز جھونکے ذہن پر خوشگوار اثر چھوڑے جا رہے تھے۔

ہر طرف خاموشی ہی خاموشی تھی۔

میرا شکارا سست رفتار سے بڑھا جا رہا تھا۔ سناٹے میں صرف چپوؤں کے پانی میں ہلکی آواز پھیل کر رہ جاتی۔

شکارے کے چلنے سے آس پاس کے پانی میں ہلچل پیدا ہوتی اور بے شمار آڑے ترچھے دائرے دور تک پھیلتے چلے جاتے۔

کیا یہ دائرے کنارے تک پہنچتے ہونگے؟ میں نے سوچا اور اپنے اس بے تکے سوال پر مسکرا پڑا۔ پھر اچانک میں نے چونک کر سر اوپر اٹھایا کہ کہیں کسی نے مجھے یوں مسکراتے ہوئے دیکھ تو نہیں لیا۔

دور دور تک کوئی نہیں تھا۔

میں پھر پانی کی سطح کی طرف دیکھنے لگا۔

دائرے ــــــــ! میں انھیں پلکیں جھپکائے بغیر دیکھتا رہا۔

مگر یہ تھوڑی دور جا کر ختم کیوں ہو جاتے ہیں۔ کنارے تک کیوں نہیں بڑھتے چلے جاتے۔ پہلے ہی کنارے سے ٹکرا کر چور چور ہو جائیں

شش! یہ کیا الجبرے کی کسی پرابلم میں الجھ گیا۔ میں جھنجھلا گیا۔ کیا اس وقت کچھ اور نہیں سوچ سکتا۔ کتنا دلفریب لگ رہا ہے شیشہ جیسا۔

میں نے پھر پانی کی طرف دیکھا چند لمحے دیکھتا رہا۔

پھر اچانک میرے ذہن پر چھایا ہوا کہرا بتدریج چھٹتا گیا۔ مجھے لگا کہ میں شکارے پر نہیں بلکہ بادلوں کے گالوں پہ آسمان میں اڑا جا رہا ہوں۔ کتنی طمانیت ہے میں نے سوچا۔ شاید اسی لئے کشمیر کو جنت کہتے ہیں۔ میری خواہش ہوئی کہ کاش! میں بھی پانی ہی کا ایک حصہ ہوتا۔ اور مجھے محسوس ہوا جیسے میں سراپا سیال ہوں پانی ہی کی ایک لہر ہوں۔

میں بھی اک لہر ہوں۔

میں بھی اک لہر ہوں۔

میرا ذہن اسی مصرع کی گردان کرنے لگا۔

خدا کرے یہ جھیل کبھی نہ ہو اور میں یونہی شکارے پر بیٹھا پانی کی جانب دیکھتا رہوں۔

اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے بھونچال آ رہا ہو۔

میں نے ہڑبڑا کر سر اوپر اٹھایا۔

میرا شکارا کنارے کے ایک ہاؤس بوٹ سے ٹکرا گیا تھا۔

منیندر آ رہی تھی صاب۔ شکارے والے نے شکارے کا رخ درست کرتے ہوئے جلدی جلدی کہا۔

منیند ــــ! میں نے حیرت سے سوچا۔ کیا انھیں اس ماحول میں بھی کسی کو نیند آ سکتی ہے۔ بے خودی اور بات ہے۔ مگر نیند؟ کیا یہ کشمیری مانجھی اس چاندنی رات میں کچھ بھی محسوس نہیں کر رہا ہے کچھ بھی۔ جو دل کے نازک اور لطیف احساسات کے گوشوں کو چھو

سکے۔ فطرت کی اِس شاہکار وادی کے باشندے کیا ذرا سا بھی آرٹسٹک سینس نہیں رکھتے۔

میں نے حیرت سے مانجھی کی جانب دیکھا۔

اُس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ یقینی طور پر وہ اپنی آنکھیں چھپا رہا ہوگا۔ سر کے بال گنجان بڑھے ہوئے اور دھصول میں اَٹے ہوئے تھے۔ کھوپڑی کے پچھلے حصے پر کشمیری وضع کی بھدی سی گول ٹوپی منڈھی ہوئی تھی۔

بھلا اسے آرٹ سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ میں نے مایوسی سے اُس کی قمیص میں لگے ہوئے پیوند دیکھتے ہوئے سوچا۔

پیسہ ۔۔! میں نے سوچا اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر آسمان کی طرف دیکھا۔

آسمان میں چاند بھی کنگ جارج کی تصویر والے بڑے پیسے کی مانند لگ رہا تھا۔

بھلا اِسے آرٹ سے کیا ۔۔ میں نے پھر مانجھی کی طرف دیکھا۔ ہو سکتا ہے۔ اس وقت اس کا ذہن اُن پیسوں میں اُلجھا ہو جو اُسے رات بھر کے اِس جاگنے کے عوض مجھ سے ملنے والے تھے۔

شاید وہ اِن پیسوں سے اپنے اگلے چند دنوں کو خوشگوار بنا دے اپنی بیوی کی کوئی دیرینہ خواہش۔ چاندی کے موٹے گجرے۔ یا ہو سکتا ہے وہ اپنی بیمار بوڑھی ماں کی دوائیوں کا بِل چکانے کی سوچ رہا ہو۔

شکارے والے کی عمر کوئی بیس کے قریب ہوگی۔ کیا یہ زندگی بھر چاندنی راتوں میں یونہی آنکھیں چھپاتا رہیگا۔ اکیلا۔ تنہا۔ میں سوچتا رہا۔ کاش اس وقت میرے پہلو میں کوئی حسین پیکر ہوتا تو یہ کیف آگیں چاندنی مجھ پر اپنی رحمتوں کی بارش کر دیتی۔ کیا اُسے بھی اِس وقت کوئی سلمیٰ، جمیلہ یا نجمہ یاد آ رہی ہوگی۔ یا میں نے رِسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے سوچا۔ ساڑھے بارہ بج رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کوئی اب تک اس کا انتظار کر رہا ہو اور اس کے انتظار میں ابھی رات کا کھانا رکھا ہو۔ مکئی کی روٹیاں اور کرم کا ساگ۔ یہی بات ہوگی۔ میں نے سوچا اور طے کیا کہ اب اسے رات بھر کا معاوضہ دے کر واپس چلونگا۔

"اے ادھر آؤ" میں نے شکارے والے کو پکارا۔

وہ چونک کر میری طرف مڑا اور پھر چپّو چھوڑ کر میرے پاس آگیا۔

"بیٹھو" میں نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا اور کہا۔ "مجھے تمہارا نام نہیں یاد رہا۔"

"علی" اس نے جواب دیا "علی محمد ساب"۔

"شادی ہو چکی تمہاری؟"

"نئیں ساب"

"کیوں؟"

وہ چند لمحے چُپ سا پڑا رہا۔

"پانچ بہنوں کا اکیلا بھائی ہوں ساب اور زمین جائداد کچھ نہیں ہے ساب۔ دو کا شادی بنایا۔ ایک کا اس سال کا آخر میں ہوگا اور پھر دو سال...."

ہاں۔! میں نے سوچا۔ دو سال بعد چوتھی اور پھر دو سال بعد پانچویں اور اس کے بعد....!

میں مغموم ہو گیا۔

"ماں باپ ہیں؟" میں نے پوچھا اور سوچا کہ کاش وہ فیملی پلاننگ پر عمل کرتے۔

"اماں نئیں ہے۔ پچھلے سال مر گیا تھا۔ باوا ہے۔ بوڑھا بیمار۔"

"پیار کیا ہے کبھی؟" میں نے رازدارانہ انداز میں اُس کے اور قریب سرک کر پوچھا۔

"ہاں" بے اختیاری میں اُس کے منہ سے نکلا اور اس کی آواز کپکپا گئی۔

"پھر؟"

"کچھ نئیں ساب۔ کچھ نئیں۔ ایسا کوئی بات نہیں ہوا۔" اُس کا لہجہ سپاٹ تھا اور ہر قسم کے جذبات سے عاری۔

"ہوں ۔! میں نے گردن ہلائی اور ایک ٹھنڈی سانس لیکر سیٹ کی پُشتگاہ سے ٹِک گیا۔

وہ چند لمحے وہیں بیٹھا رہا۔ پھر اٹھا اور اپنی جگہ جا کر چپّو چلانے لگا۔ میں نے جیب سے چار مینار کا ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا، اور دیا سلائی سے سُلگا کر فضا میں دھواں بکھیرنے لگا۔ سنہری چاندنی میں سگریٹ کا نیلگوں دھواں مدغم ہوتا جا رہا تھا۔

شاید چاندنی جل رہی ہے۔ میں نے سوچا۔ ہر دا میں کا نتا ہے

ہر دل میں ایک دیا روشن ہے۔ ہر کوئی محوِ سفر ہے۔ مگر کیوں؟ کس لئے؟ آخر یہ نام سی خواہش کیا ہے؟ کیا یہ جد و جہد یونہی چلتی رہیگی؟ کیا اسی کا نام زندگی ہے؟ مگر نہیں۔ اگر یہی زندگی ہوتی تو اس کشمیری مانجھی کے بال دھول میں نہ اَٹے ہوتے اور اس کی قمیص میں پیوند نہ لگے ہوتے اور اس کی آنکھیں یوں ویران نہ ہوتیں اور اس رومانٹک شب میں اُسے یوں نیند نہ آتی۔ اور ......!!

"یہ زندگی نہیں ہے۔ یہ زندگی نہیں ہے" میرا ذہن کسی بچے کی طرح چیخ پڑا۔

"ساب"

"ہوں" میں چونک پڑا۔

"ساب۔ آپ کیا کبھی پیار؟" علی محمد مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں" میں نے کہا۔

"اچھا کیا۔" علی محمد کہہ رہا تھا۔ "سب دھوکا ہے ساب۔ اِدھر امارے گھر کے پاس ایک بالو تھی۔ اَم کو بہت پیار کیا۔ بولا امارے بغیر زندہ نئیں رہیگا۔ بہت خوبصورت تھا۔" اس نے چپو چلانا بند کر دئے تھے "ایسے ہی رات کو اَم دونوں شکارے پر سیر کرتا۔ ایک رات اَم اس کو چاندی کا دو گجرا دیا اور وہ اَم کو ایک کنگا دیا۔" اس نے اپنا داہنا ہاتھ قمیص کے گریبان میں ڈال کر بنیان میں لگی ہوئی جیب سے کچھ نکالا تھا اور لرزتے ہاتھوں سے میری طرف بڑھا دیا تھا۔

یہ ایک چھوٹا سا جیبی کنگھا (Pocket comb) تھا۔ میں نے ایک نظر اس کے دھول میں اَٹے ہوئے بالوں کو دیکھا۔

"اور پھر۔ اور پھر۔" اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ "وہ بھاگ گیا۔ کسی پنجابی کلرک کے ساتھ۔ تین سال ہو گیا۔"

پرانی بات۔ میں نے سوچا۔ ایک صدی پہلے کے بربریت کے دور میں بھی یہی کچھ ہوتا تھا جو آج ہو رہا ہے اور ہم آج بھی وہیں کھڑے ہیں۔ آج کے اس دور میں جبکہ چاند پر پہنچنا آدمیت کی معراج قرار پائی ہے کیا ہم ابھی تک زمین کے مسائل سے بھی نہیں نپٹ سکے؟

تو کیا زندگی میں جمود آگیا ہے؟ مگر جمود تو موت کا دوسرا نام ہے اور اگر ایسا ہے تو پھر اس زندگی کا کیا حاصل؟ لونا یڈ و نجر۔ بور۔ میں نے سوچا اور مجھے محسوس ہوا جیسے میں اس زندگی سے خودکشی کی حد تک بیزار ہو گیا ہوں۔

چاندنی جل رہی ہے۔ میں نے آنکھیں موند لیں۔ بہت جلد اس کا گہرا کثیف دھواں ساری فضا کو ڈھک لیگا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں بحالتِ بیداری کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ میں نے دیکھا زمین گردش کرنے کی بجائے خلاء میں ایک جگہ معلق ہے۔ جابجا انسانوں کی لاشیں بکھری پڑی ہیں۔ ایک متنفس بھی زندہ نہیں۔ اور میں ایک گدھ کی شکل میں لاشوں کو بھنبھوڑ رہا ہوں۔!

"یہی ہے میری جنّت" میں نے اپنے خون آلودہ پنجے ہوا میں لہراتے ہوئے ایک قہقہہ لگا کر کہا۔

اور میں چونک پڑا۔ موسیقی کی ترنّم خیز لہریں میرے ذہن میں گونج رہی تھیں۔ میں نے بوکھلا کر آنکھیں کھول دیں۔ چند لمحے چاندنی میں آنکھیں پھاڑتا رہا اور پھر میں نے جانا کہ میں کسی جنّت میں نہیں بلکہ شکارے پر بیٹھا ہوں اور کشمیری مانجھی گھٹنوں میں سر دیئے ماحول سے قطعی بےنیاز چپو چلا رہا ہے اور میرا شکارا کنارے سے کچھ دور ایک ہوٹل کے سامنے سے گذر رہا ہے اور موسیقی کی لہریں، ہوٹل کا آرکسٹرا بکھیر رہا ہے اور ہوٹل کے باہر پانچ چھ نو عمر، مفلوک الحال کشمیری لڑکوں کی ایک ٹولی الکٹرک پول کے پاس کوڑے کرکٹ کے ایک بڑے سے ڈسٹ بن میں کشمیر کا مستقبل تلاش کر رہی ہے اور مجھے پنڈت نہرو کے الفاظ یاد آ رہے ہیں۔ "کشمیر جنّت ہے۔ کشمیر میرا دل ہے۔"

اور اچانک میرے دل نے چاہا کہ میں منہ پر ہاتھ رکھ کر زور زور سے "ہپ ہپ ہرّا" کی آوازیں نکالنے لگوں!!!

توجّہ طلب۔!

۱۔ زرِ سالانہ ختم ہو جانے کی اطلاع ملتے ہی "شاعر" کا سالانہ چندہ منی آرڈر سے بھیج دیجئے۔ اگر زرِ سالانہ وقت پر موصول نہ ہوا تو "شاعر" بند کر دیا جائے گا۔

۲۔ نمبر خریداری لکھنا نہ بھولئے۔ ورنہ کسی بات کی تعمیل نہ ہو سکے گی۔

۳۔ جواب طلب اُمور کیلئے جوابی خط یا لفافہ ضرور بھیجئے۔

(مینیجر)

اَسرار اکبر آبادی

تصادم

شام کا سورج ڈوب رہا ہے
کرنوں کے رنگوں کو پی کر سارے منظر لال ہوئے ہیں
لال ہے امبر
لال ہے دھرتی
لال دِشائیں ، لال فضائیں
لال ہے کھیتوں کی ہریالی
رنگوں کا خاموش سمندر چاروں جانب جھوم رہا ہے
گونج رہا ہے
شہروں کی سڑکوں کے اوپر
بجلی کے تاروں کے نیچے
کرداروں کی بِھیڑ کے اندر
بھٹکے سائے ڈھونڈ رہے ہیں اپنے سائے
سایوں کے گر سائے ہیں تو ان کو آ کر کون بتائے ؟
سَر کے اوپر برقی لہریں
اور نیچے ہے پگھلا لاوا
پیچھے پیچھے تاریکی ہے آگے آگے کچھ انگارے
دُور کہیں پہ جنگ چھِڑی ہے
گلزاروں میں آگ لگی ہے
ہوش کو اپنا ہوش نہیں ہے
شعلے ہر سُو پھیل رہے ہیں
پھیل رہے ہیں
گھوم رہے ہیں
وقت کا دامن ڈھونڈ رہے ہیں ۔

▲

محمود خاور

"زندگی"

ایک خالی مکان ، تنہائی
کوئی آہٹ ، کوئی صدا بھی نہیں
ہر طرف ایک مہیب سناٹا
خواب
نور آفریں
حسیں پیکر
دورِ ماضی کے تیرہ مدفن میں
سَر بہ سَر خاک ہو چکے ہوں گے
حُسن سب اپنا کھو چکے ہوں گے
______ ؟
رات ایسی اُداس رات جیسے
روشنی کا کہیں پتہ نہ مِلا
تیز رفتار
وقت نے جس کو بیکراں ظلمتیں عطا کی ہیں
"ایک خالی مکان ، تنہائی
یہ مِرے دَور کا مقدر ہے"!

▲

ڈراما

مجتبیٰ حسین

بیمار کا حال اچھا ہے!

(ریڈیائی مزاحیہ ڈراما)

کردار

مرزا	ایک مریض
بیگم مرزا	مرزا کی بیوی
خالد	مرزا کا خود غرض دوست
بشیر میاں	مرزا کا خود غرض دوست

پہلا ایکٹ:

(پس منظر سے کھانسی کی مسلسل آواز آتی ہے)

مرزا: (کھوں کھوں کھوں) بیگم! (کھوں کھوں کھوں) او بیگم! سنتی ہو!

بیگم مرزا: ہاں ہاں! سن تو رہی ہوں۔ کچھ بولو گے بھی یا صرف مجھے کھانسی کی آوازیں ہی سناتے رہو گے۔ میرے تو کان پک گئے ہیں کھانسی کی اس آواز کو سنتے سنتے۔

مرزا: غصے میں کیوں آتی ہو؟ میں جان بوجھ کر تو نہیں کھانس رہا ہوں (کھوں کھوں کھوں)

بیگم مرزا: بھلا یہ بھی کوئی وقت ہے کھانسنے کا۔ رات کے دو بجے ہیں اور آپ ہیں کہ ردیف و قافیہ کی پوری پابندی کے ساتھ کھانس رہے ہیں۔ اڑوس پڑوس کا بھی کچھ لحاظ کیا کرو۔ یہ کیا کہ جب جی میں آیا، کھانسنے لگ گئے۔

مرزا: (کراہتے ہوئے) بیگم! یوں نہ کہو۔ میرے حال پر ترس کھاؤ۔

بیگم مرزا: تمہارے حال پر ترس نہ کھاتی تو تم سے شادی ہی کیوں کرتی؟

مرزا: اچھا بابا! اب بس بھی کرو۔ اب نہیں کھانسوں گا (کھوں کھوں کھوں) (کھانسی کو دباتے کی کوشش کرتے ہوئے) کمبخت اس بیماری کو بھی ابھی آنا تھا۔

(پس منظر میں چڑیوں کے چہچہانے کی آوازیں آتی ہیں۔ صبح ہو چکی ہے اور گھر میں برتنوں کے اٹھانے اور رکھنے کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ اچانک دروازے پر دستک ہوتی ہے۔)

مرزا: بیگم! ذرا دیکھنا باہر کوئی دستک دے رہا ہے۔

بیگم مرزا: کوئی کیا دستک دے رہا ہے۔ ہوگا کوئی موا تمہارا دوست۔ آیا ہوگا تمہاری مزاج پرسی کرنے کے لئے۔ ان کمبختوں کو تو جیسے کوئی کام ہی نہیں ہے۔ ادھر سورج کی پہلی کرن بھی نہیں نکلتی کہ مزاج پرسی کرنے چلے آتے ہیں میرا بس چلے تو ان لوگوں کے ساتھ بھی وہی سلوک کروں جو تمہارے ساتھ کرتی ہوں۔

مرزا: اب خدا کے لئے بحث نہ کرو۔ دیکھو تو سہی باہر

کون آیا ہے (کھوں کھوں کھوں)

(اچانک باہر سے خالد کی آواز آتی ہے)

خالد: کہو بھابی! خیریت تو ہے، مرزا صاحب کیسے ہیں؟ بس یونہی پوچھنے آیا ہوں۔ رات بھر مرزا صاحب ہی کا خیال رہا۔ کہیں ان پر رات بھاری تو نہیں گذری؟ اسی لئے صبح صبح چلا آیا ہوں۔

بیگم مرزا: (بہ آواز بلند) کون خالد بھائی آپ ہیں! ابھی دروازہ کھولتی ہوں (پھر دبی زبان میں) یہ موا تو جیسے مزاج پرسی کرنے نہیں بلکہ پرسہ دینے آیا ہے۔

(دروازہ کھولنے کی آواز)

بیگم مرزا: آئیے آئیے! خالد بھائی۔ اندر آئیے۔

خالد: بھابی! پہلے یہ بتائیے کہ مرزا صاحب کیسے ہیں کہیں ان پر رات بھاری تو نہیں گذری؟

بیگم مرزا: ان پر تو رات بھاری نہیں گذری، البتہ مجھ پر ساری رات بھاری گذر گئی۔ ساری رات کھوں کھوں کی آواز نے میری نیند کا ستیاناس کر دیا۔

خالد: بھابی! یوں نہ کہیئے، مرزا بیمار ہیں۔ اب بیمار آدمی کھانسے گا نہیں تو اور کیا کرے گا؟

بیگم مرزا: بس، بس۔ اب رہنے بھی دیجئے۔ اپنے دوست کی زیادہ وکالت نہ کیجئے۔ آپ اندر چلئے، میں ابھی آتی ہوں۔

(اندر سے مرزا کی آواز آتی ہے)

مرزا: (کراہتے ہوئے) آؤ بھائی خالد۔ اِدھر آؤ۔ صبح صبح کیسے چلے آئے؟

خالد: بھئی! نہ آتا تو کیا کرتا۔ رات تمہاری حالت دیکھ کر گیا تھا۔ ساری رات تمہارا ہی چہرہ آنکھوں میں گھومتا رہا۔ اب بھی سارے راستے یہی سوچتا آیا ہوں کہ کہیں تمہیں کچھ ہو نہ گیا ہو۔

مرزا: ارے بھئی! اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ کھانسی اور بخار سے اتنا پریشان ہونا بھی کیسا؟

خالد: واہ بھئی واہ! تم صرف کھانسی اور بخار کہتے ہو مجھے تو یہ ساری علامتیں ٹائیفائڈ کی نظر آ رہی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ تم جلدی صحت یاب نہ ہو سکو گے۔ دیکھو نا! کل رات تم اچھے خاصے صحت مند نظر آ رہے تھے مگر اب تو سوکھ کر کانٹا بن گئے ہو۔ تمہاری آنکھوں کے اطراف حلقے تک پڑ گئے ہیں۔

مرزا: (حیرت سے) کیا کہا!؟ حلقے پڑ گئے ہیں!

خالد: اور نہیں تو کیا! مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے تم کچھ ہی دم کے مہمان ہو۔

مرزا: (بڑبڑاتے ہوئے) کیا کہا! بھئی ذرا سنبھل کے کہنا۔ (کھوں کھوں کھوں)

خالد: سنبھل کے کیا کہوں۔ تمہاری حالت بتا رہی ہے کہ تم اب سنبھلنے والے نہیں ہو۔

مرزا: بھئی! ایسا نہ کہو۔ ابھی میں نے دنیا ہی کیا دیکھی ہے؟

خالد: ہاں ہاں! ابھی تم نے دنیا ہی کیا دیکھی ہے ابھی تو تمہاری دوسری شادی کے دن ہیں۔

بیگم مرزا: (کمرے میں داخل ہوتی ہیں) کیا ہو رہا ہے۔ کس کی شادی کی بات ہو رہی ہے۔

مرزا: کچھ نہیں بیگم! تمہیں شادی کی فکر پڑی ہے اور یہاں ہماری جان کے لالے پڑے ہیں۔

خالد: (بات کاٹتے ہوئے) اور ہاں بھابی! اس وقت تو میری جان کے بھی لالے پڑے ہوئے ہیں، اس لئے کہ آپ تو جانتی ہیں کہ میں مرزا کی مزاج پرسی کے لئے ہمیشہ نہار منہ ہی چلا آتا ہوں۔ مرزا کی صحت کا خیال مجھے اتنا ستاتا ہے کہ میں ناشتہ کئے بغیر ہی گھر سے نکل پڑتا ہوں۔ لہذا میرے ناشتے کا فوراً بندوبست کیجئے ورنہ کہیں

میری جان چلی جائے تو اس کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔

بیگم مرزا: خالد بھائی! ابھی آپ کے ناشتے کا بندوبست کرتی ہوں۔ ذرا بشیر میاں کا انتظار کر رہی ہوں۔ آخر وہ بھی تو نہار منہ ہی آپ کے مرزا صاحب کی مزاج پرسی کے لئے آتے ہیں۔

خالد: آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ میں انتظار کر لوں گا مگر ذرا انتظار کی شدت کو کم کرنے کے لئے اس اثنا میں کچھ پھل وغیرہ بھیج دیجئے۔

بیگم مرزا: خالد بھائی! اتنی صبح گھر میں پھل کہاں جب کہ آپ ہی نے تو کل رات گھر جاتے جاتے مرزا صاحب کے لئے لائے ہوئے سیبوں میں سے آخری سیب کھا لیا تھا اور جو اکیلا انار آیا تھا تو اسے بھی آپ اپنے بچوں کے لئے لے گئے تھے۔

خالد: (شرماتے ہوئے) اوہ بھابی! ان دنوں نہ جانے حافظے کو کیا ہو گیا ہے۔ کوئی بات ٹھیک سے یاد نہیں رہتی۔ دراصل بات یہ ہے کہ مرزا کی بیماری نے میرے ہوش و حواس گم کر دیئے ہیں مگر مجھے یاد پڑتا ہے کہ سیبوں کے ساتھ کچھ موسمبیاں بھی آئی تھیں، آخر وہ کیا ہوئیں؟

بیگم مرزا: اُن موسمبیوں کی خیریت کا حال تو بشیر میاں سے پوچھ لینا۔ وہ ابھی آتے ہوں گے۔

خالد: اچھا اب رہنے بھی دیجئے۔ مجھے ناشتے وغیرہ سے کیا سروکار، میں تو اپنے عزیز دوست مرزا کی مزاج پرسی کے لئے آیا ہوں۔ مرزا میرے بچپن کے دوست ہیں۔ مجھ سے اُن کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔ دیکھئے نا کس قدر کمزور ہو گئے ہیں۔ یوں لگ رہا ہے جیسے مرزا اب کچھ ہی دم میں ہمیں چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ بھابی! مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ خدا آپ کو صبرِ جمیل عطا کرے۔

بیگم مرزا: (غصے سے) خالد بھائی! ذرا اپنے منہ کو لگام دیجئے۔ خدا کے لئے ایسی منحوس باتیں میرے سامنے نہ کیجئے۔

خالد: منحوس باتیں نہ کروں تو کیا کروں بھابی! مجھ سے مرزا کی یہ حالت نہیں دیکھی جاتی۔ آپ کو تو اپنے گھر کے کاموں سے فرصت ہی کہاں ملتی ہے۔ نہ مرزا کے کھانے کا خیال ہے نہ اُن کی صحت کا۔ اتنا دن نکل آیا مگر آپ نے ابھی تک نہ انہیں دودھ دیا اور نہ ہی موسمبی کا رس۔ ایسے میں وہ کیا خاک صحت یاب ہوں گے

(اچانک مرزا پر کھانسی کا بڑی شدت سے دورہ پڑتا ہے اور یہ سلسلہ پس منظر میں بڑی دیر تک جاری رہتا ہے۔ خالد اور بیگم مرزا فوراً مرزا کے بازو پہنچ جاتے ہیں)

خالد: (مصنوعی پریشانی اور حیرانی کے ساتھ) بھابی! آپ مرزا کو ادھر سے تھامئے، میں اُدھر سے تھامتا ہوں۔ مرزا! ہمت کرو، ضبط کرو۔ قسمت میں جو لکھا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ (قدرے توقف کے بعد) مرزا! یہ کیا! تمہاری سانسیں تو اکھڑ رہی ہیں۔

بیگم مرزا: ہائے میں کیا کروں۔ میں لُٹ گئی۔

خالد: بھابی! اب آپ چپ بھی رہیئے۔ ذرا بھی شور نہ ہونے پائے۔ مرزا کی نبض ڈوب رہی ہے۔

مرزا: (کراہتے اور کھانستے ہوئے) میرے سینے میں بے حد درد ہو رہا ہے۔

بیگم مرزا: اب کیا ہوگا؟ اب میں کیا کروں؟

خالد: کرنا کیا ہے؟ جلدی جائیے اور مرزا کے لئے دودھ، موسمبی اور سیب لے آیئے۔ شاید پیٹ میں کچھ چلا جائے تو انہیں سکون مل جائے۔

بیگم مرزا: (تیزی سے کمرے سے باہر جاتے ہوئے) ابھی لاتی ہوں۔

(پس منظر میں تھوڑی سی دیر تک مرزا کی سانسوں کی آواز آتی ہے اور کھانسی کی شدت کم ہو جاتی ہے)

خالد: مرزا اب پریشان نہ ہو۔ کھانسی ہی تو ہے، کم ہو جائیگی کچھ پھل وغیرہ کھالو تو سکون مل جائے گا۔

بیگم مرزا: (کمرے میں واپس داخل ہوتے ہوئے) یہ لیجئے خالد بھائی! یہ سیب، یہ موسمبیاں، یہ دودھ اور یہ انار۔ کچھ مرزا صاحب کو کھلائیے اور کچھ آپ بھی کھائیے۔

مرزا: (کراہتے ہوئے) میں سیب نہیں کھاؤں گا۔

خالد: بھئی! اب تم زیادہ باتیں نہ کرو۔ تمہاری کھانسی بڑھ جائے گی۔

مرزا: مگر میں سیب نہیں کھاؤں گا۔

خالد: بھئی تمہیں کھانے کے لئے اصرار کون کر رہا ہے صرف دودھ پی لو۔ لبقیہ پھل کھانے کے معاملے میں میں تمہارا ہاتھ بٹاؤں گا۔

بیگم مرزا: (شرماتے ہوئے) خالد بھائی مجھے معاف کر دیجئے۔ میں نے آپ سے جھوٹ ہی کہا تھا کہ گھر میں پھل موجود نہیں ہیں۔

خالد: (دانتوں سے سیب کترتے ہوئے قہقہہ لگاتا ہے) وہ تو میں جانتا تھا۔ خدا بھلا کرے مرزا کی کھانسی کا۔ ایسی برجستہ اور برموقع کھانسی آئی ہے کہ بس مزا آگیا۔

(پس منظر میں سیب کے کترنے اور دودھ پینے کی آوازوں کے ساتھ ساتھ مرزا کے کراہنے کی آواز بھی آتی ہے۔)

خالد: بھابی! اب آپ جائیے اور ناشتے کی تیاری کیجئے۔

بیگم مرزا: (کوسنے کے انداز میں) تاکہ آپ اس وقت تک سیبوں اور موسمبیوں کا خاتمہ کر ڈالیں۔

خالد: مرزا! تم ہی بھابی کو سمجھاؤ نا۔ وہ تو یہی سمجھتی ہیں کہ میں تمہارے پاس مزاج پرسی کے لئے نہیں بلکہ صرف پھل پھلواری کھانے آتا ہوں۔

بیگم مرزا: اور نہیں تو کیا؟

مرزا: (غصے کے انداز میں) اوہ! بیگم اب تم جاؤ بھی خالد میرے بچپن کا دوست ہے۔ میں اس کے لئے ایسی باتیں برداشت نہیں کر سکتا۔

بیگم مرزا: تمہارے دوست تم ہی کو مبارک۔ تمہاری جان ایک دن انہیں دوستوں کے ہاتھوں جائے گی یاد رکھ لینا۔

خالد: بھابی! آپ ایسا نہ کہئے۔ آپ دیکھ لیں گی کہ ہم مرزا کا آخری سانس تک ساتھ دیں گے۔

بیگم مرزا: اے ہے! کچھ تو شرم کیجئے ایسی منحوس باتیں کرتے ہوئے۔

مرزا: بیگم! خدا کے لئے میرے دوستوں کو کچھ نہ کہو۔ وہ تم سے پہلے میری زندگی میں آئے تھے۔

بیگم مرزا: (کمرے سے واپس جاتے ہوئے) یہی تو میری بھول ہوئی، ورنہ یوں میرا گھر سرائے نہ بن جاتا۔

دوسرا ایکٹ

دروازے پر پہلے دستک ہوتی ہے اور ایک زوردار آواز آتی ہے۔

بشیر میاں: کوئی ہے! کیا مرزا صاحب زندہ ہیں؟

بیگم مرزا: (اندر سے آواز دیتی ہیں) ہاں ہاں! بشیر میاں۔ مرزا صاحب زندہ ہیں اور مرنے کے لئے بس آپ ہی کا انتظار کر رہے ہیں۔

بشیر میاں: ارے بھابی! یہ کیا خوش خبری آپ سنا رہی ہیں۔ دروازہ تو کھولئے۔

(دروازہ کھولنے کی آواز)

بشیر میاں: کہاں ہیں مرزا؟

مرزا: (کمرے میں سے آواز آتی ہے) آؤ بھئی! بشیر میاں ادھر آؤ۔ بڑی دیر لگا دی تم نے آج دکھوں

کھوں کھوں)

بشیر میاں: دیر نہ ہوتی تو کیا ہوتا۔!

مرزا: کیوں؟ کیا ہوا آخر؟

بشیر میاں: تمہارے ہی کام کے سلسلے میں تو مصروف تھا۔

مرزا: کیسا کام؟

بشیر میاں: اب تمہیں اس کام کے بارے میں کیا بتاؤں۔ ابھی تو تم زندہ ہو۔ تمہارے جیتے جی تمہارے سامنے اس کام کی تفصیل پیش کرنا کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ خالد! تم ہی بتاؤ نا۔

خالد: اچھا اچھا۔ اب سمجھا۔ تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم مرزا کی آخری رسومات کی تیاری میں مصروف تھے۔

بشیر میاں: اور نہیں تو کیا؟ کل رات میں ان کی حالت دیکھ کر گیا تھا۔ میں تو سمجھا تھا کہ مرزا صاحب پر آج کی صبح کا سورج طلوع نہ ہوگا، اسی لئے صبح ہی صبح مرزا سے ملنے نہیں آیا۔

مرزا: بشیر میاں! خدا کا شکر ادا کرو، تمہاری دعاؤں کی برکت سے مجھے کچھ نہ ہوا۔

بشیر میاں: یوں خالی خولی ہماری دعاؤں کی برکت کا ذکر کچھ اچھا نہیں معلوم ہو رہا ہے۔ بھابی کو بلاؤ اور کچھ کیک چائے وغیرہ کا بندوبست کرو۔

مرزا: (نقاہت سے پکارتے ہوئے) او بیگم! ذرا ادھر آنا۔ بشیر میاں کے لئے کچھ چلئے وائے کا انتظام کرو۔

بیگم مرزا: (دوسرے کمرے سے آواز دیتی ہیں) وہی تو کر رہی ہوں۔ جب سے تم بیمار پڑے ہو، میرا کام تو یہی رہ گیا ہے کہ تمہارے دوستوں کی خاطر تواضع کرتی رہوں۔

بشیر میاں: آپ زیادہ تکلف نہ کیجئے۔ مرزا کے لئے جو پرہیزی کھانا پک رہا ہے وہی لا دیجئے۔ دوپہر کے کھانے کا وقت بھی تو آگیا ہے۔

بیگم مرزا: اور اس کے بعد تو رات کے کھانے کا وقت بھی آجائے گا۔

خالد: (دبی زبان میں) مرزا کی زندگی باقی رہی تو وہ وقت بھی آ ہی جائے گا۔

بشیر میاں: مرزا! مجھے آج تم سے چند ضروری باتیں کرنی ہیں۔ تمہاری بیماری جوں جوں طول پکڑتی جا رہی ہے مجھے پریشانی لاحق ہو رہی ہے۔

مرزا: کیسی پریشانی؟

بشیر میاں: بھائی! تم سے کیا چھپانا۔ ہمارے محلے کے شیخ سدو تھے نا، انہیں بھی بس ایسا ہی مرض ہوگیا تھا۔ بیچارے چار دنوں ہی میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔

مرزا: کیا کہا! چار دن میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔

بشیر میاں: ہاں ہاں! چار دن میں۔ یقین نہ آئے تو خالد سے پوچھ لو، کیوں خالد؟

خالد: ہاں بشیر میاں تم سچ کہتے ہو اور تم نے اپنے ماسٹر صاحب کی مثال تو دی ہی نہیں۔ انہیں بھی اچانک کھانسی شروع ہوگئی تھی۔ ابھی دوا بھی نہ آئی تھی کہ اس سے پہلے ان کی قضا آگئی اور ان کے دوست ان کی تیمارداری کرنے کی آرزو ہی لے کر رہ گئے۔

مرزا: (ضرورت سے زیادہ کھانستے اور کراہتے ہوئے) بھئی! ایسی بھیانک باتیں نہ کیا کرو۔ مجھے وحشت ہونے لگتی ہے۔

بشیر میاں: (درد بھری آواز میں) اس میں وحشت کی کیا بات ہے

؎ موت سے کس کو رستگاری ہے
آج تم، کل ہماری باری ہے

خالد: اور

؎ بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

(مرزا پر کھانسی کا دورہ پڑتا ہے)

بشیر میاں: مرزا! اٹھ کر بیٹھ جاؤ، ہمت کرو، ضبط سے کام لو۔ آخر ہر انسان کو ایک نہ ایک دن اس دنیا سے جانا ہی ہے۔

مرزا: (مسلسل کھانستے ہوئے) بھئی! میری طبیعت بگڑ رہی ہے۔ کسی ڈاکٹر کو بلاؤ۔ فوراً۔ جلدی۔

خالد: اب ڈاکٹر کہاں ملے گا۔ اب تو تمہیں ضبط ہی کرنا ہوگا۔

مرزا: بھئی! ذرا بیگم ہی کو بلالو۔

بشیر میاں: نہیں مرزا۔ بھابی کو اب بلا کر کیا فائدہ۔ وہ تو دوپہر کے پکوان میں مصروف ہیں۔ انہیں پریشان کرنے سے کیا حاصل؟

خالد: تم ذرا ضبط کرو بھئی۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

(مرزا لمبی سانسیں یوں لیتا ہے جیسے ضبط کے باعث اس کے درد میں کمی ہو رہی ہو۔)

بشیر میاں: میں تو کہتا ہوں مرزا کہ تم ذرا سنجیدگی سے اپنی زندگی کا جائزہ لے لو۔ انسان کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تمہاری جائداد کتنی ہے۔ دولت کہاں ہے۔ تم نے اس کی تقسیم کی ہے یا نہیں۔

خالد: ہاں بشیر میاں! تم ٹھیک کہتے ہو۔ انسان اپنی آنکھوں کے سامنے سب کچھ کر ڈالے تو اس کی روح کو بڑا سکون نصیب ہوتا ہے۔

مرزا: بھئی! تم لوگ کیا چاہتے ہو؟

بشیر میاں: لو خالد میاں! یہ بھی کوئی پوچھنے کا سوال ہوا۔ ہم کیا چاہیں گے۔ ہم تو یہی چاہتے ہیں کہ مرزا احتیاط کے طور پر ابھی سے اپنی وصیت لکھ ڈالیں۔ ہم تو ان کی بھلائی ہی چاہتے ہیں۔

خالد: اور ہاں بھئی مرزا۔ تم نے کسی کو قرض تو نہیں دیا تھا۔

بشیر میاں: (بات کاٹ کر) بھئی! کیسی باتیں کرتے ہو۔ اپنے مرزا نے ایک شریف آدمی کی طرح زندگی گذاری۔ زندگی میں کبھی کسی کو قرض دینے کی نوبت ہی نہ آئی۔ جو بھی پیسہ آیا وہ ہم ہی دوستوں پر خرچ کر دیا۔

مرزا: نہیں بھئی! تم ایسی باتیں کر کے مجھے شرمندہ نہ کرو۔

خالد: اور ہاں مرزا۔ ہو سکے تو بھابی سے اپنا مہر بھی معاف کروا لو۔

بشیر میاں: یہ بات تو تم نے پتے کی کہی۔ مر گئے تو روح پہ بوجھ نہ رہے گا اور زندہ رہ گئے تو سمجھو کہ مہر کی ادائیگی سے بری الذمہ ہو گئے۔

بیگم مرزا: (کمرے میں داخل ہوتے ہوئے) کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ کس کے مہر کا ذکر ہو رہا ہے۔؟

بشیر میاں: کچھ نہیں بھابی! آپ ہی کی بھلائی کی باتیں ہو رہی تھیں۔

بیگم مرزا: اب میری بھلائی کی باتیں ختم بھی کیجیے۔ میں خوب جانتی ہوں کہ آپ لوگ اپنی بھلائی کے سوائے کسی اور کی بھلائی کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتے۔ چلیے! اب باتیں بند کیجیے اور کھانا کھا لیجیے۔

خالد: ارے ہاں! دوپہر کے کھانے کا وقت بھی تو ہو گیا ہے۔

(برتن رکھنے اور کھانا کھانے کی آوازیں آتی ہیں)

بشیر میاں: واہ بھابی! کیا لذیذ کھانا پکایا ہے۔ خدا بھلا کرے مرزا کی بیماری کا کہ اس کے طفیل میں ایک ہفتے سے بڑی اچھی غذائیں کھانے کو مل رہی ہیں۔

خالد: (لقمہ منھ میں رکھتے ہوئے) ایسے موقعے بار بار تھوڑی ہی آتے ہیں۔

بیگم مرزا: آپ ہی لوگ کھائیں گے یا مرزا صاحب کو بھی کچھ کھانے دیں گے۔

بشیر میاں: بھابی! مرزا صاحب بیمار آدمی ٹھہرے۔ انہیں تو کم سے کم غذا استعمال کرنی چاہیے۔ کہیں کھانسی کے ساتھ ساتھ بدہضمی کی شکایت نہ ہو جائے۔ کیوں مرزا تمہارا کیا خیال ہے؟

مرزا: (کھانستے ہوئے) ہاں تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔

بیگم مرزا: آپ کو تو اپنے دوستوں کی ہر بات ٹھیک ہی نظر آتی ہے۔

خالد: دیکھیے بھابی! ہماری دوستی کو نظر نہ لگائیے۔

بیگم مرزا: بس! بس! اب رہنے بھی دیجیے اپنی دوستی کی باتیں۔

مرزا: بیگم! ذرا بشیر میاں کو سیب اور انگور تو کھلانا۔ آخر یہ بیچارے اپنے سارے کام چھوڑ کر میری تیمارداری میں مصروف ہیں۔

خالد: ہاں مرزا! خوب یاد دلایا۔ سیب اور انگور! بھابی کو جب تک کوئی بات یاد نہ دلائی جائے وہ اُس طرف توجہ ہی نہیں کرتیں۔

بیگم مرزا: اب میری زیادہ شکایت نہ کیجیے۔ ورنہ آپ لوگوں کا شام کا کھانا خطرے میں پڑ جائے گا۔

بشیر میاں: شام کا کھانا! خوب یاد دلایا۔ بھابی! آج ہم لوگ شام کا کھانا آپ کے ہاں نہیں کھائیں گے۔ آج میں اور خالد ایک دوست کے ہاں کھانے پر مدعو ہیں۔

بیگم مرزا: کیا آپ کے کوئی اور دوست بھی علیل ہیں جن کی آج شام مزاج پرسی کا ارادہ ہے؟

خالد: مرزا! تم ذرا بھابی کو سمجھاؤ۔ یہ ہمیشہ ہم پر طنز کرتی ہیں۔ وہ کیا جانیں کہ تم میں اور ہم میں کتنا خلوص ہے۔

بیگم مرزا: ہاں ہاں، بڑا خلوص ہے۔ اور میں تو جیسے آپ لوگوں کے خلوص کے درمیان حائل ہو گئی ہوں۔

مرزا: بھئی خالد! میں تھوڑی دیر سو جانا چاہتا ہوں۔ سستی بہت زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔

بشیر میاں: ہاں! ہاں! شوق سے سو جاؤ۔ تمہاری صحت بھی کچھ ٹھیک نظر آ رہی ہے۔ اب تو ہم لوگ بھی چلتے ہیں، کل صبح ہی آئیں گے۔

خالد: بھابی! ہم لوگ جا رہے ہیں۔ مرزا کا خیال رکھنا اور اِن کو ہماری امانت سمجھنا۔ انہیں کوئی تکلیف نہ پہنچنے پائے۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو ہمیں فوراً اطلاع کر دیں۔

بیگم مرزا: بس، بس! اب زیادہ تاکیدیں نہ کیجیے۔

بشیر میاں: اچھا مرزا! اب اجازت دو۔ خدا تمہیں صحت عطا کرے۔ تم بھلے چنگے ہو جاؤ۔ تمہاری زندگی باقی رہے گی تو ہم کل پھر آئیں گے۔

مرزا: بہت بہت شکریہ۔ تم لوگ میری خاطر جو زحمتیں برداشت کر رہے ہو اُس کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں۔

خالد: بھئی واہ! اِس میں شکریے کی کیا بات ہے۔ مصیبت کے وقت ایک دوست دوسرے دوست کے کام نہ آئے تو پھر ایسی دوستی کس کام کی؟

مرزا: (کھانستے ہوئے) مگر بھئی! تم لوگ بہت زحمت اٹھا رہے ہو۔

بشیر میاں: (ڈکار لیتے ہوئے) اب رہنے بھی دیجیے یہ تکلفات کی باتیں۔ خدا حافظ مرزا!

مرزا: خدا حافظ!

خالد: خدا حافظ! پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔

(دروازہ بند کرنے کی آواز آتی ہے)

بیگم مرزا: (بہ آواز بلند) دیکھو جی! اب بہت ہو چکیں تمہارے دوستوں کی ناز برداریاں۔ یا تو اب سیدھے سیدھے صحت مند ہو جاؤ یا پھر مجھے اپنے میکے چلے جانے کی اجازت دے دو۔

مرزا: (کھانستے ہوئے) کتنی بار کہا ہے کہ میرے دوستوں پر غصے میں نہ آیا کرو۔ مگر تمہیں تو جیسے عادت سی ہو گئی ہے۔

بیگم مرزا: خبردار جو آج سے اپنے دوستوں کی طرف داری کی۔ کان کھول کر سن لو کہ اگر کل صبح تک تم صحت مند نہیں ہو گئے تو میں اِس گھر سے ہمیشہ کے لئے چلی جاؤں گی

مرزا: بیگم! کیسی باتیں کرتی ہو۔ کیا انسان کی صحت اُس کے قابو میں ہوتی ہے کہ جب چاہا ٹھیک کر لی اور جب چاہا بگاڑ لی۔ (کھوں کھوں کھوں)

بیگم مرزا: (غصے سے) بند کرو یہ کھانسی۔ میں اب تمہاری

کھانسی نہیں سننا چاہتی۔
مرزا :۔ (کھانسی کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے) آخر یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے بیگم!
بیگم مرزا۔ ذرا اپنے دوستوں ہی سے پوچھ کر دیکھ لو۔ آٹھ دن ہو گئے کہ مجھے سکون کا ایک لمحہ نصیب نہ ہوا۔ دن بھر تمہارے دوستوں کی خاطر تواضع کرتی ہوں اور راتوں میں تمہاری کھانسی میری نیند حرام کر دیتی ہے۔
مرزا :۔ اچھا! تو بتاؤ، میں کیا کروں؟
بیگم مرزا۔ کرنا کیا ہے؟ سب سے پہلے صحت مند ہو جاؤ۔
مرزا :۔ اچھا بابا! صحت مند ہو جاؤں گا۔ (پھر کھانسی کو دبانے کی کوشش کرتا ہے)
بیگم مرزا :۔ دیکھو جی! کل صبح جب تمہارے دوست پھر تمہاری مزاج پرسی کے لئے آئیں گے تو میں یہ کہہ دوں گی کہ تم صحت مند ہو گئے ہو اور دفتر چلے گئے ہو۔
مرزا :۔ اچھا اچھا، کہہ دینا۔ تمہاری خاطر یہ بھی برداشت کر لیں گے۔
بیگم مرزا :۔ خیال رہے کہ جب میں تمہارے دوستوں سے تمہاری صحت مندی کی خبر سناؤں گی تو تم اندر والے کمرے میں چھپ جانا۔ خبردار! جو تم نے اس وقت کھانسنے کی کوشش کی۔
مرزا :۔ ہاں ہاں، بیگم! مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔ میں تو تمہارے لئے سب کچھ کر سکتا ہوں۔
بیگم مرزا :۔ اب زیادہ باتیں نہ بگھارو اور چپ چاپ لیٹ جاؤ۔
[صبح میں چڑیوں کے چہچہانے کی آواز آتی ہے، برتن وغیرہ رکھنے کی آواز آتی ہے]۔
دروازے پر دستک ہوتی ہے!
بشیر میاں :۔ مرزا صاحب! او مرزا صاحب!
خالد :۔ بھابی! او بھابی! دروازہ کھولئے۔
بیگم مرزا :۔ (بہ آوازِ بلند) ابھی آتی ہوں۔ ذرا ٹھہریئے۔
(دبی زبان میں) لو! تمہارے چہیتے دوست آ گئے۔ اب تم فوراً اندر والے کمرے میں چلے جاؤ۔
مرزا :۔ (کھانسی کو روکتے ہوئے) ابھی جاتا ہوں ــ ابھی جاتا ہوں۔
خالد : (باہر سے آواز آتی ہے) بھابی! دروازہ کھولئے نا خیریت تو ہے۔ مرزا صاحب کیسے ہیں؟
بشیر میاں :۔ ہاں ہاں بھابی! جلدی کھولئے دروازہ ــ میں مرزا صاحب کو دیکھنے کے لئے بے چین ہوں۔
بیگم مرزا۔ (دروازہ کھولتے ہوئے) ایسی بھی کیا بے چینی ہے
خالد :۔ واہ بھابی! آپ بھی حد کرتی ہیں۔ ہم مرزا کے لئے بے چین نہ ہوں گے تو پھر کون ہوگا؟
بیگم مرزا :۔ مگر اب بے چین ہونے سے کیا فائدہ؟
بشیر میاں :۔ (عجلت سے) یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ کیا ہوا مرزا صاحب کو؟ جلدی بتائیے نا!
بیگم مرزا :۔ ہونا کیا؟ وہ تو اچھے ہو گئے اور صبح ہی صبح دفتر چلے گئے ہیں۔
خالد :۔ نہیں بھابی! ایسا کیونکر ہو سکتا ہے۔
بیگم مرزا :۔ یقین نہ آتا ہو تو کمرے میں جا کر دیکھ لو۔
(قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے)
بشیر میاں :۔ (حیرانی سے) ارے یہ کیا! مرزا تو سچ مچ غائب ہیں۔
خالد : بھابی! مجھے فوراً ذرا پانی پلا دیجیئے۔ مجھے چکر سا آ رہا ہے۔
بشیر میاں :۔ اور ہاں بھابی! مجھے بھی پانی پلائیے فوراً۔
بیگم مرزا :۔ ابھی پانی لاتی ہوں۔ (چلی جاتی ہے)
خالد : (رونے کے انداز میں) او بشیر میاں! یہ کیا غضب ہو گیا۔
بشیر میاں :۔ (بڑی نقاہت کے ساتھ) یار! ہم تو تباہ ہو گئے برباد ہو گئے۔
خالد : اب کیا ہوگا؟۔
بشیر میاں :۔ کیسے گمان تھا کہ مرزا یوں آن کی آن میں ہمیں دغا

دے جائیں گے اور ہمیں یوں روتا دھوتا چھوڑ کر
صحت مند ہو جائیں گے۔

خالد: اب صبح کے کھانے کا کیا بنے گا؟

بشیر میاں:۔ اور آج ہمیں دوپہر کا کھانا کہاں ملے گا؟

خالد: اور وہ سیب، وہ موسمبیاں، وہ پھل کہاں سے
کھانے کو ملیں گے۔

بشیر میاں:۔ خالد! مجھے سنبھالو۔ میری طبیعت بگڑ رہی ہے
ہائے اب کیا ہوگا؟

خالد: تمہیں کیا سنبھالوں، جب کہ خود میرے قدموں کے
نیچے سے زمین نکلی جا رہی ہے۔

بشیر میاں:۔ مجھ سے صبر نہیں ہو رہا ہے۔ مجھ سے اب اپنی
ہی حالت دیکھی نہیں جا رہی ہے۔

خالد: مجھے اپنی فکر پڑی ہے اور تم اپنا دکھڑا رو رہے ہو۔

بشیر میاں:۔ (دبی زبان میں) اب بھاگو یہاں سے۔ اگر بھابی
نے ہماری یہ حالت دیکھ لی تو سارا معاملہ سمجھ جائینگی۔

خالد: ہاں، ہاں، چلو۔

(دونوں گھر سے باہر نکل جاتے ہیں)

بیگم مرزا:۔ (پیچھے سے آواز آتی ہے) بشیر میاں! خالد
بھائی! پانی تو پیتے جائیے۔

خالد:۔ (جاتے ہوئے، دور سے) اب پانی نہیں چاہیئے
بھابی۔ اب مرزا اگلی بار بیمار ہوں تو تب ہی آکر
ہم پانی پی لیں گے۔ اس وقت تک اس گھر کا پانی
ہمیں نہیں چاہیئے۔

[پس منظر میں بڑی دیر تک بیگم مرزا کے قہقہوں
اور مرزا کی کھانسی کی آوازیں آتی ہیں۔]

حاشیے

ڈاکٹر محمد حسن

تھوڑی سی دیوانگی چاہیئے!

اُردو زبان اور اس کے بولنے والوں میں ایک عجیب دلچسپ کشمکش جاری ہے۔ زبان میں وہ توانائی اور زندگی ہے کہ جب اس کے قاتل اس کے گلے پر چھری پھیرتے پھیرتے دم لینے کیلئے رکتے ہیں تو وہ کروٹیں بدلنے لگتی ہے۔ کسی ایک گروہ یا انجمن کی کوشش کے بغیر، وہ اِکا بہار اور اتر پردیش کی مخلوط وزارتوں کے بنیادی پروگرام میں جگہ پالیتی ہے، اتر پردیش کے گزٹ میں آجاتی ہے اور مسلم مجلس کے سیاسی فیصلوں میں بنیادی مسئلہ بن جاتی ہے۔ بمبئی کے کنونشن میں ہندوستان بھر کے ادیبوں کی حمایت حاصل کر لیتی ہے۔ مشاعرے لوٹ لیتی ہے۔ فلموں کے ذریعے پورے ملک کے دل کھینچ لیتی ہے، غالب کی صد سالہ یادگار کے بہانے قصرِ شاہی اور دار السلطنت کے مرکزی ایوانوں میں گھس جاتی ہے۔ وزارتِ تعلیمات سے ایک کروڑ وصول کر لیتی ہے۔ اتر پردیش میں ترقی اُردو بورڈ کے ذریعے متعارف ہوتی ہے۔

دوسری طرف اردو والوں کا یہ حال ہے کہ اسے مرنے سے پہلے، مار دینے پر تیار ہیں، بلکہ فاتحہ خوانی کی رسم ادا کی جا چکی ہے، تابوت قبر میں اتارا جا چکا ہے اور ماتم گسار آہ و زاری میں مبتلا ہیں۔ کوئی بدبخت کہتا ہے کہ خدارا یہ تو دیکھ لو کہ مُردے میں کہیں جان باقی نہ ہو۔ تو ماتم گسار اس کا مضحکہ اڑاتے ہیں، پھبتیاں کستے ہیں۔ اور فاتر العقل قرار دیتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ اردو رسم خط ختم کر دو۔ اردو کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ کچھ لوگ سرے سے اس مسئلے کے قائل ہی نہیں۔ ان میں کیسے کیسے نورانی چہرے ہیں، علم و فضل کی کیسی کیسی مورتیں ہیں، کیسے کیسے پیارے نام ہیں، قتل کے محضر پر جن کے دستخط دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔

ایسا کیوں ہے! اس کی ایک توجیہہ تو میرے ایک محترم دوست نے اس طرح کی ہے کہ جو لوگ رسم خط کے بدلنے کی بات کرتے ہیں اور اردو کو ہندی کی شیلی یا اسلوب بنا لینے پر بھی آمادہ ہیں، ان میں سے اکثر وہ لوگ ہیں جن میں اردو کا مصنف نہیں ہندی کا پبلشر بول رہا ہے۔ ان کی کتابیں ہندی میں چھپنے لگی ہیں، ان کی کہانیاں اور مضامین جن کے لئے ہندی اخبارات اچھے معقول معاوضے دے کر پچھلے بیس سال سے چھاپ رہے ہیں۔ اس لئے اب ہندی سے ان کا اپنا مفاد اس قدر زیادہ وابستہ ہو گیا ہے کہ وہ اپنی مادری زبان کو بھی اس قربان گاہ پر نذر کرنے کو تیار ہیں۔

دوسری توجیہہ یہ بھی ممکن ہے کہ مصلحت ہاتھ پکڑے ہوئے ہے اور پاؤں میں زنجیر بن کر پڑی ہے۔ جو وہ دکھاتی ہے ہم دیکھتے ہیں۔ جدھر لے جاتی ہے جاتے ہیں۔ خیال یہ ہے کہ کہیں اکثریت ناراض نہ ہو اور ہمارے "بھارتیاتے" کی ضرورت نہ سمجھنے لگے اور بھائی، جب زبان کے نام پر رائج کا قتل عام ممکن ہو تو عافیت یہی کہتی ہے کہ جان کی اماں مانگو اور زبان اور کلچر سب سے دست بردار ہو جاؤ۔ مگر ایک فرزانہ یہ بھی کہتا تھا کہ اگر زندگی میں ایسی کوئی قدر نہ ہو جس کے لئے مرا جا سکتا ہو تو گویا زندگی موت سے بدتر ہے۔ اس فرزانے کی آواز مصلحت کے نقار خانے میں کہیں ڈوب گئی ہے۔

رندی، قلندری اور مقدس دیوانگی، ہماری شاعری کی محبوب اصطلاحیں ہیں آج ان کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ تھوڑی سی دیوانگی مل جائے تو مصلحت کا اندھیرا چھٹے، روشنی کی ننھی سی کرن دکھائی دے۔ اس کرن کو ضد ہے کہ جب تک خونِ جگر سے چراغ نہ جلے گا، نظر نہ آئے گی۔

یہ محض جذباتی باتیں نہیں ہیں حقیقت ہے۔ اُردو والوں میں وہ پست ہمتی آگئی ہے کہ انھوں نے حالات کو مقدر سمجھ لیا ہے۔ حالات تبدیل کئے جا سکتے ہیں اور تبدیل ہوتے آئے ہیں، البتہ ان کے تبدیل کرنے کیلئے قوموں کو قوت

ارادی کی سحر نمائی سے کام لیتا ہوتا ہے۔ مسز اندرا گاندھی تک نے اُردو کنونشن میں یہی بات کہی کہ اُردو کو پہلے ایک جمہوری تحریک بنائیے، پھر اس کے مطالبات پورے ہوں گے اور پچھلے تیس سال سے اردو والے اردو کو جمہوری تحریک سے الگ کرنے کی سعی بلیغ کرتے آئے ہیں۔ اس کے لئے تین سطحوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

پہلا کام ہے اُردو کے مقدمے کو ملک کی جمہوری عدالت میں پیش کرنے کا کام۔ یہ انگریزی اور ہندی میں ہونا چاہیے ابھی تک اتنا بھی نہیں ہوا ہے کہ اردو کا معاملہ صاف اور سیدھے طریقے پر ملک کی موجودہ زبانوں میں پیش کیا جاتا اور ملک میں جمہوری رائے عامہ کے رہنما اور پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں ہمارے نمائندوں تک ہماری بات پہونچتی یہ کام اردو والوں کی فوری توجہ کا مستحق ہے۔

دوسرا کام ہے اردو والوں کی ایک تحریک کی تنظیم، اس میں سر دست بنیادی فریضہ یہ اعتماد پیدا کرنے کا ہے کہ حالات ہمت شکن اور صبر آزما سہی، مگر بدلے جاسکتے ہیں اور بدلے جانے چاہئیں ملک میں تبدیلی کی ہوائیں چل رہی ہیں اور ایسی تمام طاقتوں سے اردو والوں کو اپنا رابطہ مضبوط رکھنا چاہیے جو تبدیلی کی مرکزی محرک ثابت ہوسکتی ہیں۔ اگر ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے موت کا انتظار کر رہے ہیں، تو یہ نہ مصلحت بینی ہے نہ ہوشمندی، اگر ہم دشواریوں کے صحیح شعور کے ساتھ تبدیلی کیلئے کوشاں ہوتے ہیں تو اندھیرے میں ایک ننھا سا دیا تو روشن ہو سکتا ہے۔ اور عین ممکن ہے کہ ایسے چھوٹے چھوٹے دیئے ایک وقت اندھیرے پر فتح پا سکیں۔

دھرم ویر بھارتی کے فرمودات کے باوجود اردو کنونشن نے ملک کے دانشوروں اور ادیبوں کی توجہ اُردو کے مسئلے کی طرف مبذول کرائی ہے۔ یہ ضروری تھا مگر کافی نہیں ہے۔ اس کنونشن سے جو فضا پیدا ہوئی ہے اُسے لے کر آگے بڑھنا چاہیئے اور اُردو کے جمہوری حق کیلئے تمام ہندوستانی ادیبوں کی آواز بلند ہونی چاہیے۔ اردو کا مستقبل محض ایک زبان کا نہیں" ہمارے ملک میں جمہوریت، انصاف اور انسانیت کا مستقبل ہے۔ ▲

آئندہ شمارہ مارچ ۷۰ کی ایک جھلک

گاندھی نمبر

شاعر نظامی، ڈپٹی چیف پروڈیوسر اردو۔ آل انڈیا ریڈیو دھلی

آج کی تازہ ڈاک سے شاعر کا "گاندھی نمبر" ملا۔ میری دلی مبارک باد قبول کرو۔ میں نے ابھی پڑھا نہیں ہے کیونکہ دفتر کا وقت ہے۔ پڑھوں گا اور تفصیل سے لکھوں گا، اختصاً سے یہی کہہ سکتا ہوں کہ اردو ادب تمھارے احسانات اور خدمات سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ اس اندھی اور بے حس اردو سوسائٹی میں تم جس جنون خیزی کے ساتھ خدمت کر رہے ہیں۔ وہ تمھارا ہی دل و جگر ہے۔

آغا رشید مرزا۔ ۱۸/۱ کانگریس ایگزیبیشن روڈ کلکتہ ۱۷

برادر مکرم

گاندھی نمبر ملا۔ گٹ اپ اتنا خوبصورت اور جاذب نظر ہے کہ یک نظر دیکھتے ہی کسی غیر ملکی جریدہ کے معیار کا معلوم ہوتا ہے۔ معنوی اعتبار سے بھی آپ نے ایک انفرادیت پیدا کی ہے اور ایک نیا معیار قائم کیا ہے۔ کسی علمی و ادبی ماہنامہ کیلئے کسی سیاسی شخصیت پر خاص نمبر نکالنا اور اسکو ہر لحاظ سے دل چسپ اور کامیاب بنانا بڑی جان جوکھم کا کام ہے۔ وہ بھی گاندھی ایسی شخصیت پر، تعصب اور نفرت کے ایسے دور میں موقف اور حالات سے جنگ آزمائی کرنا ہے۔ لیکن یہ آپ ہی کی ہمت ہے کہ اتنی مخالفت اور علالت کے باوجود آپ نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور اسے پورا کر دکھایا۔

سیاست، کافی زمانہ ہمارے ادب اور زندگی پر کتنی ہی حاوی کیوں نہ ہو، لیکن بجائے خود ایک ایسی خشک چیز ہے کہ ہر ایک مزاج اسے گوارا نہیں کر سکتا۔ یہ آپ کی تجربہ کاری ہے کہ آپ نے سیاست کو ادب میں سمو کر اس امتزاج سے ایک نیا رنگ پیدا کیا ہے اور اس خشک مضمون کو بھی حد درجہ دل چسپ بنا دیا ہے، تمام مضامین نظم و نثر پر زور، پر اثر، پر از معلومات، پر از حقیقت اور پر از دل چسپی ہیں۔ ہر مضمون توجہ سے پڑھنے کے لائق ہے اور ہر قلم کار اور شاعر داد کا مستحق ہے۔
سب سے زیادہ یہ بات قابل تعریف ہے کہ بعض مضامین میں بڑی سچائی اور صاف گوئی سے کام لیا گیا ہے گاندھی جی کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اُن کی سیاسی کوتاہیوں اور کمزوریوں کا محاسبہ بھی ایمانداری سے کیا گیا ہے۔ تصویر کے ہر رُخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ آپ کی بے لاگ صحافیانہ ایمانداری کی دلیل ہے اور قابل صد ستائش۔

بلاشبہ گاندھی نمبر ایک خوبصورت ادبی اور سیاسی آئینہ ہے جس میں آزادی کی مختصر تاریخ اور گاندھی جی کی زندگی کے مختلف پہلو روشن نظر آتے ہیں۔

گاندھی صدی کے اس شور و غل میں، جہاں بہت سے زبانی جمع خرچ ہوتے رہے، آپ نے خاموشی سے ایک ٹھوس خدمت انجام دی ہے۔

ڈاکٹر گیان چند۔ صدر شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی جموں

محترم۔ تسلیم

"شاعر" کا گاندھی نمبر آج دن میں ملا۔ اتنے عرصے میں میں نے اسے کافی دیکھ لیا ہے۔ امید ہے دو تین دن میں پورا دیکھ لوں گا۔

پاکستان کے برعکس، ہندوستان میں رسالوں کے پیہم خاص نمبر نکالنے کی روایت نہیں، لیکن آپ اس دیار میں اس روایت کو قائم کر کے رہیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خاص نمبروں کے باب میں "شاعر" نے جو فتوحات کی ہیں وہ ہندوستان میں اردو کے کسی دوسرے رسالے نے کب کی ہیں۔ اور یہ تو ہر شخص مانے گا کہ ہندوستان و پاکستان میں ملا کر کسی اردو رسالے نے اتنا اچھا گاندھی نمبر پیش نہیں کیا جتنا آپ نے۔ اور کمال یہ ہے کہ جو آپ نے

اپنی شدید علالت کے دوران اور آپریشن کے باوجود کیا ہے۔ امید کرتا ہوں کہ آپ اپنی روایت کو زندہ ہی نہیں بالیدہ رکھیں گے۔

خادم گیان چند

خواجہ عبدالغفور۔ ایڈیشنل سیلز ٹیکس کمشنر — بمبئی

محبی اعجاز صاحب۔ تسلیم

ماہنامہ شاعر کا "گاندھی نمبر" اپنی تمام خصوصیات اور شانِ امتیازی سے بھرپور ملا۔ اس بار اس کا بانکپن نرالا ہے حسنِ ظاہر اور حسنِ باطن۔ یعنی اس کا دکھاوا اور اس کا مواد دونوں ہی لاجواب ہیں، ویسے تو گاندھی جی کی صد سالہ تقریبات میں بہت سارے جشن منعقد ہوئے، تقاریر ہوئیں، نمائشیں ترتیب دی گئیں، بڑے بڑے رہبر اور رہنما ان کے حوالے سے بڑی بڑی باتیں کرتے رہے۔ لیکن یہ سارے نقوش ساتھ ہی ساتھ مٹتے گئے اور مٹتے جا رہے ہیں۔ اس گاندھی صدی کا عظیم ترین کارنامہ صرف "شاعر" کا گاندھی نمبر ہے۔ ہر مضمون، ہر عنوان، ہر زاویہ سے آپ نے اس کو دلچسپ معلومات سے بھر دیا ہے۔ یہ اردو ادب اور گاندھی لٹریچر میں ایک مستند دستاویز کی طرح موجود اور آنے والی نسلوں کیلئے کارآمد رہے گا۔

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ آپ کی صحت نے ساتھ نہ دیا اور مسلسل جسمانی تکلیف میں مبتلا رہے۔ ایسی صورت میں یقیناً وہ تعاون بھی آپ کو نہ مل سکا ہوگا جو معمولاً اردو ادب میں آپ کے ذاتی مقام اور درجۂ امتیازی کی وجہ سے ملتا رہا ہے۔ ناسازگار حالات کے باوجود یہ شاہکار ہمیشہ شاہکار رہیگا۔

دعا ہے کہ بالصحت و سلامتی آپ ادب کی خاموش خدمت میں ہمیشہ شادمانی و کامرانی کے ساتھ مصروف رہیں اور ہمیں ایسے ہی نادر تحفے پیش کرتے رہیں۔

آپ کا۔ خواجہ عبدالغفور

ضیا فتح آبادی ایم اے ریزرو بینک — دھلی

برادرِ گرامی، تسلیم

شاعر نے دو تین سال کی قلیل مدت میں "کرشن چندر نمبر" اور "غالب نمبر" ایسے ضخیم اور "ڈرامہ نمبر" اور "گاندھی نمبر" ایسے یادگار ایشوع پیش کرکے اپنی چالیس سال کی روایات کو برقرار ہی نہیں رکھا بلکہ ہندوستانی ادب اور صحافت کے صحیح راستے کی نشاندہی بھی کی ہے اور ادبی سرمائے میں گرانقدر اضافہ بھی۔ جب گاندھی نمبر کو جو چند روز پیشتر مجھے ملا، دیکھتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ آپ نے بسترِ علالت سے اتنا اہم اور کامیاب نمبر کس طرح مرتب کر لیا۔ مضامین نظم و نثر کی فراہمی ایک بات ہے اور ان کی ترتیب اور پیشکش دوسری بات اس نمبر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مہاتما گاندھی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور ان کے عقائد کو واضح طور سے سمجھنے میں قاری کو مدد ملتی ہے۔ گاندھی صدی میں گاندھی کا نام کم لیا گیا ہے، مگر اُسے اچھالا زیادہ گیا ہے۔ چنانچہ آپ نے اداریے میں جو کچھ لکھا ہے اُس کی صحت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کسی نے کہا تھا کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے، میں اس میں صرف اتنی ترمیم چاہوں گا کہ محبت اور جنگ کے ساتھ سیاست کا اضافہ کر لیا جائے۔ ہندوستانی سیاست کا جو کھیل اس وقت کھیلا جا رہا ہے وہ آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ہم آپ ایسے دانشور بھی سیاست کے اقتدار کے سامنے سرخمیدہ ہونے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ جس ملک کے ادیب و شعراء بھی سیاسی کھیل میں شریک ہو جائیں اس ملک کا مستقبل کیا ہوگا، یہ کون کہہ سکتا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود آپ نے گاندھی نمبر نکال کر جو کارِ نیک کیا ہے۔ یقین جانئے آپ کے اس احسانِ عظیم کو ملک ایک نہ ایک دن ضرور تسلیم کرے گا۔

خاکسار

ضیا فتح آبادی

عبداللطیف اعظمی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر دہلی

محترمی السلام علیکم

"شاعر" کا گاندھی نمبر بمبئی سے واپسی میں بڑی دلچسپی اور شوق سے پڑھا اور آپ کے اس قیمتی تحفے کی وجہ سے بہت اچھا لگا۔ واقعی آپ نے بہت کامیاب نمبر نکالا ہے۔ مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

آپ نے ظ انصاری صاحب کے مضمون کی صحیح تعریف کی تھی۔ آپ سے ملنے کے بعد ان سے ملا اور ان کی میز پر گاندھی سے متعلق کتابوں کا ڈھیر اور بہت سے نوٹ دیکھ کر اندازہ ہوا کہ انھوں نے کتنی محنت سے یہ مضمون لکھا ہے۔

آپ نے مضمون نگاروں کے تعارف میں ظ صاحب کے مضمون کے بارے میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ "ہو سکتا ہے کہ ان کا مضمون بحث و نظر کا مرکز بنے" میرا خیال ہے کہ انھوں نے جن اختلافی بحثوں کو چھیڑا، اگر نہ چھیڑتے تو اچھا تھا، جب گاندھی جی کی زندگی میں ان کے بارے میں یا گاندھی جی کے خلوص کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا تو اب کیا ہوگا اور اگر ان کو چھیڑنا ضروری ہی تھا، تو ان پر سیر حاصل بحث کرنی چاہیے تھی۔

اسی طرح ڈاکٹر گیان چند جین صاحب کے مضمون میں بلاوجہ مولوی عبدالحق صاحب سے ۳۶ء کی ناگوار بحث کا ذکر آگیا ہے۔ اس سے اردو کے موجودہ مسئلے کو کوئی مدد نہیں ملے گی۔

کیمبل جانسن کی ڈائری کا اگرچہ گاندھی جی سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ مگر اردو حلقے اس سے بہت کم واقف تھے اس لئے آپ نے بہت اچھا کیا کہ اس کے کچھ حصے کا ترجمہ شائع کر دیا۔ لیکن اس کے ساتھ شروع میں جو نوٹ دیا گیا ہے، وہ نہ دیا جاتا تو اچھا تھا۔ میرے خیال میں یہ صحیح نہیں ہے کہ "اس میں صحیت اور واقعات کی بعض تلخ حقیقت پسندانہ جھلکیاں ملتی ہیں۔" اس کتاب کا نام "مشن ود ماؤنٹ بیٹن" دیا گیا ہے جو صحیح نہیں ہے، اس کا نام ہے

(بقیہ صفحہ ۱۲۰ پر دیکھئے)

بقیہ صفحہ ۱۱۳ اردو دور زمانہ چال قیامت کی چل گیا

کے کاغذات قبول کئے جائیں۔ انہیں بتایا گیا کہ ان ہدایات پر عمل نہیں ہو رہا ہے کیونکہ افسران یہ کہتے ہیں کہ ہم اردو نہیں جانتے۔ کاغذات کو کیونکر سمجھیں۔ وزیر اعلیٰ نے کہا کہ ایسے مواقع فراہم کئے جائیں کہ جو افسر اردو نہیں جانتے ہیں وہ اردو سیکھ سکیں۔ جیسا کہ پہلے ہوتا تھا۔ انہوں نے تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اردو طلبہ کی تعداد ۱۲،۱۵۰۰ (بارہ لاکھ ایک ہزار پانچ سو) سے بڑھ کر ۱۵،۰۵،۲۰۲ (۱۵ لاکھ پانچ ہزار دو سو بہتر) ہو گئی۔

دوسری علاقائی زبان کا مفہوم اسی طرح کے کاموں سے ملتا جلتا ہے۔ سوال قانونی طور پر اس کی منظوری — RECOGNIZATION کا ہے۔

میں بھارتی جی اور ہندی زبان کے دوسرے دانشوروں سے بھی یہی درخواست کروں گا کہ وہ رسم الخط اور علاقائی وغیرہ کے اندیشوں میں مبتلا نہ ہوں۔ اردو زبان یا اردو والے ہندی زبان سے کچھ چھین نہیں رہے ہیں، بلکہ اسے کچھ دینا چاہتے ہیں۔ پہلے بھی بہت کچھ دے چکے ہیں۔ اس مسئلہ پر جب ہم ادبی نقطۂ نظر سے غور کریں گے تو کبھی اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ ہندی زبان کے ادب و شعر کو اردو نے بہت فائدہ پہنچایا ہے۔

"جیو اور جینے دو"

کی فکر آج پوری دنیا کا رجحان ہے۔ زبانوں کے معاملے میں بھی یہی ہونا چاہیئے۔ بقول شری پی۔ ایس۔ مینن۔

"آج ہندوستان حالات کے سمندر میں بے پتوار کشتی بنا ہوا ہے۔ تحفظ کے لئے اس کشتی کو ڈوبنے سے بچائیے۔ ہمارا ملک بھائی چارہ، امن، خوشحالی اور ترقی چاہتا ہے۔ آزادی کے بعد سے اب تک رجعت پرستی، فرقہ واریت، خود غرضی اور مصلحت پسندی نے ملک کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ ان باتوں سے پوری دنیا میں ہندوستان بدنام ہو چکا ہے۔ اب اس کو مزید بدنامی سے بچانا ہم سب کا فرض ہے۔ ذاتی اور فرقہ کے جھگڑے ختم کر سب کو ایک دوسرے سے گلے لگ جانا چاہیئے۔"

(ہندی میں نو بھارت ٹائمز بمبئی کی اشاعت کیلئے بھیجا گیا)

مکتوبات

بمبئی اُردو کنونشن

بیدل المنزل۔ بیکانیر
۸ر جنوری سنہ ۱۹۷۰ء

مکرمی و محترمی۔ السلام علیکم

بمبئی کانگریس کے اجلاس میں شرکت کرنے کی غرض سے حاضر ہوا تھا۔ اُردو کمیٹی کی طرف سے اُردو کنونشن میں شرکت کے لئے یقیناً آپ ہی کے ایما سے مدعو کیا گیا تھا۔

میں نے جناب سید محمد زیدی صاحب سکریٹری اُردو کمیٹی سے بذریعۂ فون رابطہ قائم کیا تھا۔ انہوں نے پروگرام بھیج دیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ راجستھان کے منسٹر خان برکت اللہ خاں صاحب اور دوسرے ایم ایل اے صاحبان کو بھی کنونشن میں شریک کروں جس روز وزیر اعظم تشریف لائیں، تمام ساتھیوں سے چھٹکارا پاکر شریکِ اجلاس ہوا۔ آپ کو اور ندا فاضلی صاحب کو باوجود تلاش نہیں پا سکا۔ اندرا جی کے آنے سے پیشتر سب صاحبان کو ہال میں بٹھا دیا گیا تھا اور تھوڑی دیر بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ تشریف لے آئیں اور جلسے کی کارروائی شروع ہوگئی۔ کرشن چندر نے جس خلوص، نیک نیتی اور قابلیت سے اردو کا مقدمہ پیش کیا تھا اُس کی تعریف نہیں کی جاسکتی۔ مگر افسوس مُلّا صاحب نے تمام جوش و خروش اور فضا پر اپنی سیاست آمیز تقریر سے پانی پھیر دیا۔ جس میمورنڈم کو پیش کرنے کے لئے اتنا بڑا کنونشن بلایا گیا تھا اُسے وقت پر ضابطۂ تحریر میں پیش نہیں ہو سکا۔ مُلّا صاحب نے معاملہ گول کر دیا۔ میرے خیال سے اُن ہی کی تقریر کا یہ اثر ہوا کہ وزیر اعظم نے محض اُردو کی ترقی و ترویج کی کوشش کرنے کا وعدہ فرمایا اور تمام کنونشن ناکامیاب ہو کر رہ گیا۔ یہ میری ہی رائے نہیں، بلکہ میرے آس پاس بیٹھے ہوئے سب ہی ادیبوں شاعروں اور سامعین کی رائے تھی جس کا آپس میں برابر اظہار ہوا۔

جلسہ ختم ہونے کے بعد بھی آپ کو اور ندا صاحب کو تلاش کیا، مگر آپ صاحبان نہیں ملے، جس کا بےحد افسوس ہے۔ اُسی روز شام کو تمام ڈیلیگیٹس نے پروگرام بنا لیا کہ روانہ ہو جائیں۔ مُلاقات نہ ہونے کا بہت قلق ہے۔ اُمید کہ آپ کے مزاج بخیر ہوں گے۔ ندا صاحب کو سلام کہئے۔

خاکسار: محمد عثمان عارف نقشبندی ایڈووکیٹ

ببیں تفاوتِ رہ ...!

۲۹½ مدراس ۵

کرم گستر بھائی اعجاز صاحب قبلہ مدظلہٗ
تسلیماتِ فراواں! مزاج

گذشتہ ماہ کیفی اعظمی کے گہرے دوست منصور فریدی صاحب سے ایک ادبی نشست میں ملاقات ہوئی اور اثنائے گفتگو میں آپ کا ذکر چھڑ گیا۔ موصوف سے یہ جان کر تسلی ہوئی کہ آپ رُوبصحت ہیں اور غالباً اسی ہفتے ہسپتال سے ڈسچارج بھی ہو چکے ہیں[1]۔ ناسازیٔ طبع کے باوجود آپ کے ذہنِ رسا کی آواز اتنی واضح اور توانا نظر آئی کہ مختلف رسائل میں آپ کی غزلوں کی فضا میں آپ کی شخصیت کے خد و خال اور نکھر گئے تھے۔ غالباً ضیا فتح آبادی نے آپ سے متعلق "تحریک" یا "بیسویں صدی" میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے اُس سے خوشی کی انتہا نہ رہی۔ آپ مریض سہی مگر آپ اپنی ادبی قدروں کو مریض ہونے نہیں دیتے۔ غزلوں کی تخلیق بھی برابر جاری ہے لہ جریدہ بھی بدستور نکل رہا ہے۔ میری دُعا ہے کہ آپ کو اللہ تبارک تعالیٰ تادیر سلامت رکھے۔ آپ سے ملنے کی تمنا سر اُٹھا رہی ہے۔ کبھی بمبئی کی سیر کسی مشاعرے کے بہانے

---

[1] میں تقریباً چار ماہ پہلے ۱۶ اکتوبر ۶۹ء کو ہسپتال سے ڈسچارج ہوا تھا۔ (اعجاز)

ہی کرا دیجئے گا۔ عین نوازش ہوگی۔ سُنا ہے اِن دِنوں نیاز حیدر صاحب بمبئی پہنچ گئے ہیں۔ خواجہ احمد عباس صاحب نے گذشتہ سال مجھ سے مدراس میں بتایا تھا کہ نیاز حیدر دلی میں خود کش ہیں۔ از راہِ خلوص اُن کے پتے سے مطلع فرمائیے اور سردار جعفری کے "گفتگو" کا پتہ بھی۔ اِن دِنوں آپ کی دُعا سے روز ایک غزل جنوری ۶۸ء سے ہو جاتی ہے۔ شاید آپ کے دماغِ رسیدہ کا پرتو مجھ پر پڑا ہے۔ چند چیدہ چیدہ شعر بھی ملاحظہ فرمائیے جو مختلف زمینوں میں ہیں۔ اور ہاں ایک تازہ غزل "شاعر" کے زیرِ ترتیب نمبر کے لئے ارسالِ خدمت ہے۔ گر قبول زہے ... "شاعر" از راہِ خلوص ہر ماہ بھجوا دیجئے گا۔ دو ماہ پہلے میری غزل کی اشاعت کے لئے مشکور ہوں۔ اب آپ کا مزاجِ گرامی کیسا ہے، مطلع فرمائیے۔ بہت دِنوں سے کوئی خط نہیں لکھا۔ حالانکہ انتہائی مصروفیتوں کے باوصف آپ نے جواب سے نوازا تھا

والسلام۔

فقط آپکا خیر اندیش: کاوش بدری

چند شعر سُنیئے گا (NOT FOR PUBLICATION)

۹/۷ مدراس

کرم گستر بھائی اعجاز صدیقی صاحب قبلہ

تسلیمات! مزاج؟

گرامی نامہ موصول ہوا۔ دیکھ کر انتہائی مسرت کے عالم میں جھوم اُٹھا۔ آپ نے میری ایک غزل کو جس انداز میں ناپسند فرمایا ہے اُس سے مجھے بالکل رنج نہیں ہوا اور اُن کے آپ کے خیال کے مطابق میں نے نہ کوئی گہرا اثر لیا۔ واقعی وہ غزل مزید غور و فکر کی حامل تھی۔ میں وہ غزل تو کیا، اگر آپ جیسے باشعور اور پُر خلوص معمارانِ ادب فرمائیں تو اپنی تمام شاعری کو نذرِ آتش بھی کر سکتا ہوں۔ البتہ ایک شعر پہ

سر اُٹھانے کی توقع ہی کہاں تھی ہم کو
بزمِ خوباں میں بُری طرح نہ رُسوا ہوتے

پر آپ کے COMENTS طنزیہ حدوں تک پہنچ گئے تھے۔ ویسے اِس شعر کی تلمیحی فضا میں وہی پُرانی بات دوہرائی گئی ہے جسے اساتذہ نے بارہا شعری جامہ پہنایا ہے۔ آفرینشِ آدم کے بعد والی (ROMENTIC ACCIDENT کے حوالہ کے سوا اِس شعر میں اور کیا ہے۔ اِس غزل پر اتفاقاً یہاں کے چند باشعور ادبی دوستوں نے ایک سمپوزیم بھی کر ڈالی۔ اور متفقہ طور پر اُن لوگوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہ میری ناکامیاب ترین غزل ہے۔ واللہ سچ کہتا ہوں، میں نے آپ کے خط اور اِس غزل پر آپ کے اعتراضات کی اُنہیں اطلاع تک نہیں دی تھی۔ اب ضرور کہوں گا۔ "شاعر" نہ پڑھنے اور خریدنے کا سوال مدراس میں کوئی عجوبہ نہیں۔ ہر شہر میں اعلیٰ ادب کے پرستار کم ہی ہیں گے۔ ویسے "شاعر" سے مدراس کے ادیبوں کو کافی رغبت ہے۔ انشاء اللہ یہاں اُس کی نکاسی کی کوشش کروں گا۔ اب آپ کی صحت کیسی ہے، مطلع فرمائیے گا۔ ایک تازہ غزل ارسال کر رہا ہوں، گر قبول اُفتد زہے ... جواب سے سرفراز فرمائیے گا۔ زیرِ ترتیب شمارہ میں شامل فرما کر اِس غزل کو اشاعت کا اعزاز عطا فرمائیے۔

آپ کا خیر اندیش، کاوش بدری

۱۴/۷

کرم فرما اعجاز صدیقی صاحب! تسلیم! مزاج۔

آپ کا کارڈ ملا۔ تازہ غزل ارسال کرتے ہوئے مجھ سے بہت بڑی غلطی واقع ہوئی ہے۔ یہ غزل "اوراق" پاکستان اور "آجکل" دہلی کے لئے چُن لی گئی تھی۔ از راہِ کرم اِسے آپ "شاعر" میں شائع نہ فرمائیں۔ آپ کی ترمیمات کو دیکھ کر دیر تک ہنسی آئی۔ ایسی ترمیمات میں آپ کے کلام سے لے کر چچا غالبؔ کے کلام میں کر سکتا ہوں۔ آپ نے دورانِ علالت میں جو غزلیں کہی ہیں اُن میں سے کسی ایک غزل میں ساکن کو متحرک باندھا گیا تھا۔ خلائے بزمگاں

مگر اِن خطا ست سمجھ کر میں نے اُس کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ اب انشاء اللہ "بیسویں صدی" یا "شاعر" وغیرہ میں اُس غزل کو تلاش کر کے مطالعہ کروں گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو مدراس ہی سے ایک طرح کی دُشمنی ہے۔ مولانا شاکر نائطی، تلمیذ حضرت ناطق گلاؤٹھوی ہمیشہ آپکے بارے میں یہ کہا کرتے تھے کہ آپ کا دل صاف نہیں ہے اور پھر مولانا ابوبکر نظمی نے اپنا مجموعہ تین ہزار رُوپے خرچ کر کے مدراس سے شائع فرمایا ہے جس کے آخری صفحات میں آپ کے چند اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے آپ کی شاعری کی جو بُری طرح OPERATION کی گئی ہے، وہ آپ خود ملاحظہ فرمائیں۔ انشاء اللہ اُس کا ایک نسخہ ارسال کروں گا۔ مولانا نظمی کا انتقال بھی ہو چکا ہے۔ موصوف نے فری طور پر بغیر دام اپنے مجموعے کو تقسیم کیا اور مرتے وقت ایک داغ آپ کا لے کر گئے۔ والسلام۔

آپ کا خیر اندیش: کاوش بدری

جواب جو دیا گیا،

۱۷ر فروری [illegible]ء

(شب)

عزیزی و محبی۔ تسلیم۔

آپ کا کارڈ ملا۔ میں نے اپنے پچھلے خط میں کوئی ایسی تلخ بات تو نہیں لکھی تھی کہ آپ اتنے برہم ہو گئے۔ آپ کو اِس کا اختیار ہے کہ میری بات مانیں یا نہ مانیں، لیکن جارحانہ انداز میں خط لکھنا بے حد قابلِ افسوس ہے۔ میں آپ کے اِس ناروا سُلوک کا بھی ممنون ہوں۔ یہ ذہن تنہا آپ کا نہیں ہے، اُردو کی نئی نسل کے بہت سے ناپختہ ذہن اکثر اِسی طرح مشتعل ہو جایا کرتے ہیں۔ اِس دَور نے علمی قدروں کو آگے بڑھانے کے بجائے ہمیں یہی ایک تحفہ دیا ہے۔ میرے پاس ایسے بھی خطوط آتے ہیں جن میں اِس سے بھی زیادہ اشتعال ہوتا ہے۔

اُردو کے تقریباً سب ہی مُدیرانِ رسائل اِس کے شکار ہیں۔ میری بدقسمتی یہ ہے کہ میں کبھی کبھی ازراہِ خلوص اگر کسی کو اِس قابل سمجھتا ہوں کہ اُس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت ہے اور وہ کوئی علمی پس منظر بھی رکھتا ہے تو چند اشارے کر دیا کرتا ہوں۔ جن میں بلند ظرفی اور سنجیدگی ہوتی ہے وہ فائدہ اُٹھا لیتے ہیں۔ عام طور پر ناپسندیدہ تخلیقات ایک مطبوعہ خط کے ساتھ واپس کر دی جاتی ہیں۔ میں نے اپنی علالت اور مصروفیات کے باوجود آپ کو خود خط لکھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے آپ کے اشعار میں کسی قسم کی کوئی ترمیم نہیں کی تھی، صرف اِس مطلع کے متعلق:

مریضِ غم پہ عجیب بے خودی سی طاری ہے
ضرور آج کی شب زندگی پہ بھاری ہے

یہ لکھا تھا کہ "مریضِ غم" وغیرہ بڑی فرسُودہ باتیں ہیں۔ اِس مفہوم کو بے شمار شاعروں نے مختلف پیرایے میں نظم کیا ہے، آج کا مزاجِ شعری ایسی باتوں کو قبول نہیں کرتا۔ اگر آپ یوں کہتے:

مریضِ وقت پہ اک بیخودی سی طاری ہے

تو بھی کچھ بات بن جاتی۔ شاعری میں ہوائی اور خلائی باتوں کے لئے اب کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اِسی غزل کے مندرجہ ذیل اشعار میرے نزدیک فرسُودہ خیالی اور نہایت معمولی فکر و اسلوب کے حامل تھے:

کسی کی یاد جو رہتی ہے میکدہ بر دوش
بغیر بادہ شب و روز مے گُساری ہے

بچا کے لے نہ چلو حادثات سے ہم کو
ہمیں تو صرف غمِ زندگی سے یاری ہے

چراغ بن گئے اختر شماریوں کے طفیل
تمام عمر میں یہ ایک شب ہماری ہے

دیارِ شعر و سخن میں ہیں ہم بہت بدنام
مگر حضور! برابر یہ شغل جاری ہے

اور اب کہتا ہوں کہ غزل کا مقطع بھی پُھسپُھسا ہے:

قدیم طرز سے کاوشیں ہی انحراف کرد
غزل جدید عناصر کی اب شکاری ہے

بارہ اشعار کی اس غزل میں مجھے تو کہیں جدید عناصر نہیں ملے۔ پھر بھی چار شعر جو تقریباً درج کئے ہیں انہیں نکال دینے کے بعد بقیہ اشعار "شاعر" میں شائع کر دینے کے متعلق میں نے آپ کو لکھ دیا تھا۔ پہلے خط کے ساتھ آپ نے جو غزل بھیجی تھی اس میں بھی کئی شعر بھرتی کے تھے مثلاً:

کون سنتا ہے یہاں ذہنِ رسا کی آواز
یہی بہتر تھا کہ ہم لوگ غزل گا ہوتے

مفتیِ شرعِ متیں، شارحِ غالب کیا ہوں؟
صاف یہ مردِ مقطع بھی مقفیٰ ہوتے

آپ نے جو منتخب اشعار سب سے پہلے مجھے متاثر کرنے کے لئے لکھے تھے ان میں کمزور اشعار کے علاوہ یہ شعر بھی تھا:

خار ہیں جادۂ تہذیب و تمدن میں ہزار
فکر قدموں کی طرح آبلہ پا رہتا ہے

مگر میں نے آپ کو اس کی فکری و فنی خامی کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ آپ کو میری ترمیمات پر ہنسی آئی، یہ تو خیر بہت اچھا ہوا (مگر میں نے ترمیمات کی ہی نہیں۔) آپ مجھ پر ہنس سکتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ میرا مذاق اڑا سکتے ہیں۔ اس لئے کہ آپ اپنے ہر شعر کو بہت اعلیٰ پایے کا سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ لیکن انجام کار رونے کا بھی امکان ہے۔ ابھی آپ میں تنقیدی شعور نہیں ابھرا ہے "کاتا اور لے بھاگے" والی بات ہے۔ ایک اچھی نظم یا غزل ہفتوں میں ہوتی ہے، ہر روز نہیں! علمی و فنی امور میں اختلاف اور اتفاق دونوں کی گنجائش ہے۔ ضرورت فکر و شعور اور بلند ظرفی کی ہے۔ جن میں علمی ظرف ہوتا ہے وہ بگڑ سکتے نہیں ہیں، دلائل سے کام لیتے ہیں، اہلِ علم کی رایوں سے استفادہ کرتے ہیں۔

میرے کسی شعر میں آپ کو کوئی سقم نظر آیا ہے تو مجھے بلا تکلف لکھ دیجئے۔ اگر مجھ سے سہو ہوا ہوگا تو میں ترمیم کر لوں گا۔ چھوٹے اور بڑے کے امتیاز کے بغیر اگر کوئی مجھے میری کسی غلطی کی طرف متوجہ کرتا ہے اور وہ واقعی میری اپنی غلطی ہوتی ہے تو مجھے تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا۔ میرا اپنا مزاج تو یہ ہے۔ شعر و سخن کے سلسلے میں دوسروں کی طرح میں نے کبھی کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ یوں بھی شعر بہت ہی کم کہتا ہوں اور اب تو اردو شاعری سے ایک نفرت سی ہوتی جا رہی ہے۔ جن حالات سے اردو زبان دوچار ہے اور اردو کی نئی نسل جس معاشی بحران میں مبتلا ہے اس میں شعرا کی بہتات کو انتہائی مضر سمجھتا ہوں۔ اردو زبان انتہائی سخت دور سے گذر رہی ہے اور ہزاروں لوگ ہیں کہ اپنا وقت صرف شعر گوئی میں ضائع کر رہے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ سب چھپنا بھی چاہتے ہیں۔ ایک دور وہ بھی تھا کہ جب اردو کے بے شمار پرچے تھے اور ان کے لئے مقتدر شعرا سے مسلسل درخواستیں کرنا پڑتی تھیں۔ سالہا سال کی ریاضت کے بعد شعرا کو چھپوانے کا حوصلہ ہوتا تھا۔ آج بغیر طلب ہر رسالے کے دفتر میں ہر روز دس بیس غزلیں بغرض اشاعت آجاتی ہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ سالہا سال شعر کہتے رہنے کے باوجود کوئی قابلِ ذکر شاعر بن جائے۔ شعر کہتے کہتے لوگوں کی زندگیاں ختم ہو گئیں لیکن ادب میں وہ اپنے لئے کوئی جگہ پیدا نہ کر سکے۔

شاکر نائطی صاحب کو یقیناً وہی کہنا چاہیئے تھا، جو ان کے استاد مولانا ناطق مرحوم دوسروں کے متعلق کہا کرتے تھے۔ آپ سے کبھی ملاقات ہوئی تو بہت سی پُر لطف باتیں بتاؤں گا۔ تمام عمر مولانا ناطق مرحوم نے اس کے سوا اور کیا بھی کیا؟۔ حالانکہ ان کا ایک علمی و فنی مرتبہ تھا۔ میرا ذکر چھوڑیئے، مرحوم نے حالی سے لے کر اس دور تک کی کس بڑی شخصیت کا مذاق نہیں اڑایا؟ ان کا ایک مخصوص مزاج تھا۔ چونکہ وہ خاندانِ داغ سے تعلق رکھتے تھے اس لئے احتراماً میں نے ان کی کہی ہوئی

باتوں کا کبھی کوئی نوٹس نہیں لیا۔

نظمی صاحب سے میں واقف نہیں ہوں۔ نہ یہ یاد ہے کہ میں نے اُن کے کلام پر کبھی اعتراضات کئے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ اُن کے مجموعۂ کلام پر "شاعر" میں تبصرہ ہوا ہو۔ اگر انہوں نے جواباً کچھ لکھا ہے تو صحیح اور غلط کا اندازہ اہلِ علم خود کرلیں گے۔ رہی کسی صوبے کے شعرا سے دشمنی کی بات تو آپ کا یہ "غلط احساس" میرے لئے سب سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ کیا "شاعر" میں آپ کا کلام شائع نہیں ہوا؟۔ میں کسی فرد، جماعت یا صوبے کے ساتھ کوئی امتیاز نہیں برتتا۔ سب کے ساتھ خلوص اور رواداری سے کام لیتا ہوں۔ کوئی صوبہ ایسا نہیں ہے جس کے اچھے قلم کاروں کے ساتھ میں نے تعاون نہ کیا ہو۔ نئے ہوں یا پرانے میں سب کو عزیز رکھتا ہوں۔ مجھے لوگوں سے اکثر تکلیفیں پہنچتی رہتی ہیں، لیکن میں نے کبھی کسی سے انتقام لینے کی بات تک نہیں سوچی۔ ہاں بس خاموشی کے ساتھ تعلقات ختم کرلئے ہیں۔ میرا اصول و کردار یہی ہے۔ ایکبار مجھے پھر سمجھنے کی کوشش کیجئے۔

آپ کے پچھلے دونوں خطوں کی روشنی میں جب اِس تیسرے خط کو دیکھتا ہوں تو حیرتوں میں ڈوب جاتا ہوں! آج کا انسان اپنی اغراض کے تحت کتنی جلدی بدل جاتا ہے! ایک ہی غزل اوراق۔ آجکل اور شاعر کو بھیجدینا بھی قابلِ داد بات ہے!۔ میں آپ کے لئے "شاعر" کے دروازے اب بھی بند نہیں کررہا ہوں۔ مگر شائع وہی ہوگا جو معیاری ہوگا۔ اِس میں چھوٹے، بڑے، نئے اور پرانے، اپنے اور بیگانے کسی کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔

دُعاگو: اعجاز صدیقی

★ بقیہ: گاندھی نمبر صفحہ ۱۱۵

MISSION WITH MOUNT BATTEN

ہے اور یہی لکھنا چاہئے تھا، اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ یہ کتاب ابھی حال میں شائع ہوئی ہے، اس کو شائع ہوئے تقریباً انیس سال ہوگئے۔ یعنی سنہ ۱۹۵۱ء میں چھپی ہے۔

آپکا، عبداللطیف اعظمی

نقد و نظر

تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں ضروری ہیں

برگِ آوارہ

از ——— خورشید احمد جامی

"برگِ آوارہ" حیدر آباد کے مشہور شاعر خورشید احمد جامی کا نیا مجموعۂ کلام ہے۔ ایک سو ساٹھ صفحات کے اس خوبصورت (طباعت و کتابت سے آراستہ) مجموعہ میں صفحہ اِکسٹھ تک نظمیں ہیں اور باسٹھ سے ایک سو پچاس تک غزلوں کا باب شامل ہے۔ جامی بہت پہلے سے لکھ رہے ہیں۔ ان کے شعری ذہن کے بنیادی عناصر آزادی سے پہلے کی نیم رومانی فضاؤں کی دین ہیں جنہیں وہ آج بھی نہایت خوش اسلوبی سے اپنے اندر سجائے ہوئے ہیں۔ ان کا لہجہ خوبصورت اور خوش آہنگ ہے۔ اس میں ایسی دھیمی دھیمی چنگاریاں محسوس ہوتی ہیں جو بعد میں اختر شیرانی اور فیض کے اثرات سے پنجاب سے باہر بھی عام ہوئی ہیں۔ لیکن جامی کے یہاں یہ بنا سنورا لہجہ قاری کو کسی نئی فضا کی سیر کی دعوت نہیں دیتا۔ اس میں مناظر تو کم و بیش وہی ہیں جنہیں ہم کئی بار دیکھ چکے ہیں، لیکن اس میں ہلکی سی نوک پلک نے ایک شگفتگی ضرور اُبھار دی ہے جو "برگِ آوارہ" کے قاری کو ہر صفحہ پر محسوس ہوتی ہے۔

تیرے جلووں سے مرے گھر کی فضائیں جھکیں
تیرے آتے ہی درو بام پہ رونق آئی
بجھ گئے سینۂ ہجراں میں دیئے ظلمتوں کے
مٹ گیا شکوۂ احساسِ غمِ تنہائی

جامی غزلوں میں خارجی بناؤ سنگار پر زیادہ توجہ دیتے ہیں، جس میں نئے نئے شعری پیکر اور دھیمے دھیمے سڈول لفظوں کا حسن سجلا لگتے ہوئے بھی انفرادی تجربے کی کمی کا احساس دلاتا ہے۔ اُن کا عشق بچپنا اور کچے پن کی اس خصوصیت سے عاری ہے۔ "برگِ آوارہ" میں عشق کی گرمی اور جذبہ کی نفاست تو ملتی ہے مگر یہ In-dividual کم اور Type زیادہ لگتے ہیں۔

چاند نکلا تو کسی یاد نے دستک دی ہے
رنگ بکھرے ہیں تو عکسِ لب و رخسار بنے
رقصاں ہیں خیالات کی جھیلوں پہ ابھی تک
دلدار و دلآویز نگاہوں کے اُجالے

جامی اپنے شعری مزاج کے اعتبار سے فیض سے زیادہ قریب ہیں۔ فیض کی پرچھائیں یوں تو پورے ترقی پسند عہد پر پڑتی دکھائی دیتی ہے، لیکن تقلید اور متاثر ہونے میں فرق ہے اور یہ بھی احتیاط اور توازن جامی کی غزلوں کی ساکھ ہے۔ جامی بنیادی طور سے غزلوں کے شاعر ہیں۔ اُنہوں نے نظمیں بھی کہی ہیں، لیکن ان میں لفظوں کا آکاش اتنا ابر آلود ہے کہ کوئی منظر نمایاں طور سے نہیں اُبھر پاتا۔

قیمت چار روپے

پتہ: شالیمار ۲۸۷ بی۔ ملک پیٹ جدید حیدرآباد ۳۶۔

(ندا فاضلی)

جوئے کہکشاں

از ـــــــــ امجد نجمی

امجد نجمی کا یہ دوسرا مجموعۂ کلام ہے جسے کرامت علی کرامت نے مرتب کیا ہے۔ امجد نجمی اپنی عمر اور مشقِ سخن کے اعتبار سے پچھلے دور کے شاعر ہیں اور اُنکی شاعری نے ایک غیر اردو علاقے اڑلیسہ میں مشق و مزاولت اور فکر و فن کی منزلیں طے کی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اُنہوں نے اپنے فن کے چراغ سے اڑلیسہ میں شعر و سخن کے اور بھی کتنے ہی چراغ روشن کر دیئے ہیں۔ اِس اعتبار سے اُنکی قدر و منزلت بڑھ جاتی ہے۔ امجد صاحب نظمیں اور غزلیں دونوں کہتے ہیں۔ اُنکے سخن کا ذوق متین اور سنبھلا ہوا ہے۔ وہ بے نمک شعر نہیں کہتے۔ اُنکے اشعار میں کوئی نہ کوئی بات ہوتی ہے خواہ وہ مضمون اور تاثر خود اُنکا ہو یا قدما یا دورِ حاضر کے رہ روانِ سخن کا۔ لیکن وہ بات ڈھنگ سے کہتے ہیں شاعرانہ رکھ رکھاؤ کے ساتھ کہتے ہیں حتی الوسع فنی اسقام سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نہ اُن کے یہاں بہت زیادہ ندرتِ فکر ہے اور نہ اسلوبی انفرادیت،

اِس کے باوجود اچھے اشعار مل جاتے ہیں۔ سید حرمت الاکرام نے اپنے دیباچے میں جو منتخب اشعار پیش کئے ہیں اُنہیں امجد صاحب کا منتہائے سخن کہا جا سکتا ہے۔ اِن ہی منتخب اشعار میں سے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں:

نمودِ صبح کا کیوں منتظر ہے دیوانے
دُعا یہ مانگ شبِ ہجر کی ہو عمر دراز

اِن آنسوؤں کی تم کو حقیقت بتائیں کیا
آنکھیں ہیں میری، شوکتِ طوفاں لئے ہوئے

"شوکتِ طوفاں" سے امجد صاحب کے مزاجِ شعری کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ ذیل کے دو شعروں میں وفا اور جفا، دشمنی اور دوستی، صحرا نوردی اور مذاقِ جستجو، غبارِ راہ اور پردۂ محمل سے جن خیالات کی نمود ہوئی ہے وہ اُن کے قدیم اندازِ فکر کی اچھی مثال ہیں:

وفا کی آڑ میں کیا کیا ہوئی جفا ہم پر
جو دوستی یہی ٹھہری تو دشمنی کیا ہے

ترے صحرا نوردوں کا مذاقِ جستجو توبہ
غبارِ راہ کو یہ پردۂ محمل سمجھتے ہیں

نظموں کے پہلے باب میں سنہ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۹ء تک کی جو نظمیں دی گئی ہیں اُن میں پابند نظمیں غیر پابند نظموں سے بہتر ہیں۔ مرتب نے امجد صاحب کی غیر پابند اور اُنکے خیال میں جدید نظموں پر بہت زور دیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ نظمیں کسی طرح امجد صاحب کے شعری پس منظر کے شایانِ شان نہیں ہیں۔ اُنہیں اِس طرح کی شاعری سے گریز ہی کرنا چاہیئے تھا۔ وہ اپنی عمر اور شاعری کے جس دور میں پہنچ چکے ہیں اور اُنکا جو مزاج بن چکا ہے اُسی کے تحفظ کی ضرورت تھی۔ جدید شاعری بالکل ایک الگ مزاج، مطالعہ، ڈھنگ، غور و فکر اور تکنیک چاہتی ہے۔ اِسے کوئی اوپر سے نہیں اوڑھ سکتا خواہ یہ بھدی ہو یا خوبصورت مگر اندر سے پھوٹتی ہے۔ ہیئت سے اِس کا کچھ زیادہ تعلق نہیں ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جدید نظم معرّیٰ اور آزاد ہی ہو۔ ۱۷۶ صفحات۔ قیمت تین روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ اڑلیسہ اردو پبلشرز۔ دیوان بازار کٹک ۱

مالک، پرنٹر، پبلشر اعجاز صدیقی نے یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس، ٹھاکر دوار، بمبئی ۲ میں چھپوا کر وہیں سے شائع کیا۔

ضلع کو بنیاد مان کر مہاراشٹر کی ترقی کی

منصوبہ بندی

ہر ایک ضلع کی ضروریات کا خیال کر کے تیار کیا جانے والا منصوبہ صرف ضروریات ہی پر مبنی نہ ہوگا بلکہ اس میں ہر ضلع کی امکانی قوت کا بھی خیال رکھا جائے گا۔ یہ لوگوں کی ضروریات اور ان کی آرزوؤں کا مظہر ہوگا۔ جب لوگ منصوبہ سے اس طرح عملاً وابستہ ہو جائیں گے تو مختلف اضلاع کے درمیان نیز ایک ہی ضلع کے مختلف حصّوں کے درمیان نابرابری ماضی کی یاد بن کر رہ جائے گی۔ اس کے لئے سب ہی کو تعاون دینا ہوگا۔ جس سے سوشلسٹ سماج کے قیام میں یقیناً تیزی آئے گی۔

آئندہ پندرہ سال کے پروگرام کو نظر کے سامنے رکھ کر لوگ خود ہی ترقیاتی منصوبہ تیار کریں۔ اسی مقصد سے یہ جرأت مندانہ قدم اٹھایا گیا ہے۔

زیادہ سے زیادہ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ بھلائی کی خاطر

ڈائرکٹر آف پبلسٹی، حکومت مہاراشٹر، بمبئی

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بانی

علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

اُردو کا اکتالیس سالہ علمی ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

شاعر بمبئی

مارچ ۱۹۷۰ء

جلد ۴۱، شمارہ ۳

مُدیرِ اعلیٰ :-

اعجاز صدیقی

اِدارۂ تحریر

☆ مہندسنانہ

☆ ڈاکٹر مُحمّد حسن

☆ شہاب جعفری

☆ ندا فاضلی

اِس شمارے میں

زرِسالانہ : ۹ روپے، معاونین سے : ۲۵ روپے

تاعمر خریداری : ۱۲۵ روپے

ممالکِ غیر سے : ۲۵ شِلنگ

فی پرچہ : ۷۵ پیسے

* ترسیلِ زر کا پتہ :-

ماہنامہ شاعر، قصرالادب، بمبئی ۳ بی سی

فون نمبر

۳۵۹۹۰۳

خط و کتابت کا پتہ :-

ماہنامہ شاعر مکتبۂ قصرُالادب، پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶

بمبئی ۳ بی سی

مکتوبات: عبداللطیف اعظمی، اختر بستوی، بدیع الزماں خاور، شہاب سرمدی، ظہیر نیازی، رام لعل، منجو قمر، ڈاکٹر محمد حسن، ہارون الرشید، سہیل عظیم آبادی، نثار اٹاوی، شفیق رحمانی، منظر کاظمی، وقار عسکری، مظفر شبلی، اخلاق حسین طلعت

شاعر
بمبئی

شاعر کے چار گراں قدر خاص نمبر

کرشن چندر نمبر

اُردو کے شہرۂ آفاق افسانہ نگار کرشن چندر کی شخصیت اور اُن کے ہمہ گیر فن پر ایک عظیم و حسین خصوصی اشاعت! جسمیں ہند و پاک کے مُمتاز اہلِ قلم کے علاوہ دوسرے ممالک کے بھی کئی مُصنّفین اور مفکّرین نے کرشن چندر کے شاہکار افسانوں ناولوں اور ڈراموں پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ یہ نمبر کرشن چندر کی ادبی زندگی کی لافانی تاریخ ہے۔ اِس نمبر میں کئی تازہ کہانیاں اور ایک مکمل نیا ناول شامل ہے۔

۲۴۷ صفحات: پانچ رنگ کا سرِورق، اٹھارہ صفحات پر یادگار تصاویر: قیمت:۔ پندرہ روپے

غالب نمبر

غالب صدی کا بیش بہا تحفہ

غالب کی شخصیت، فن اور زندگی پر ہند و پاک کے مُمتاز قلمکاروں کے تازہ و فکرانگیز تنقیدی و تحقیقی مضامین۔ غالب نمبروں کی بھیڑ میں ایک نہایت سنجیدہ، متنوّع اور مُنفرد خصوصی اشاعت، جسے ہندوستان اور پاکستان کے تمام غالب نمبروں میں سب سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔

گیارہ ابواب، چار رنگ کی غالب کی سُنہری تصویر، غالب کی مختلف اَدوار کی تمام یادگار تصاویر، تین رنگ کا سرِورق، غالب کے اُردو و فارسی کلام کا انتخاب، ۶۳۰ صفحات، قیمت ۸ روپے

گاندھی نمبر

ہندوستان کے عظیم رہنما، تحریکِ آزادی کے سب سے بڑے قائد مہاتما گاندھی کی شخصیت، اُن کی زندگی اور سیاسی و سماجی کارناموں کا بھرپور جائزہ۔ اُردو اور دیگر زبانوں کے ممتاز قلمکاروں کے تازہ و خصوصی مضامین۔ مُلک کی آزادی اور تقسیم کے متعلق معتبر یادداشتیں۔ گاندھی جی کے مضامین کا انتخاب، اُن کے بصیرت اَفروز مَقولے۔ مُلک کے مشاہیر شعرا کا باپو کو منظوم خراجِ عقیدت۔

* کئی ابواب، ابواب کے خوبصورت سرورق۔ گاندھی جی کی چار رنگ کی نایاب تصویر۔ گاندھی صدی پر کسی زبان نے ایسا یادگار نمبر پیش نہیں کیا۔ لاجواب سرورق۔

۲۸۲ صفحات۔ قیمت چار روپے

افسانہ و ڈرامہ نمبر

اِس نمبر میں شاہکار افسانے اور ڈرامے پیش کیے گئے ہیں۔ اِس نمبر کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اُردو کے ۱۷، افسانہ نگاروں اور ۵ ڈرامہ نگاروں کے علاوہ ہندوستان کی کئی دوسری بڑی زبانوں کے گیارہ مشہور افسانہ نگاروں کے درجۂ اوّل کے افسانے اُردو میں ترجمہ کرا کے شائع کیے گئے ہیں اور ان افسانہ نگاروں کا مختصر تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔ غیر مُلکی زبانوں کی دو شاہکار کہانیاں بھی اِس میں شامل ہیں۔ ★ اُردو، ہندی، بنگلہ، مراٹھی، گجراتی، کنڑ، پنجابی وغیرہ زبانوں کے ۲۳، افسانہ اور ڈرامہ نگاروں کی تصاویر بھی شائع کی گئی ہیں۔ یہ نمبر افسانوی اَدب میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲۳۴ صفحات
قیمت: تین روپے

مینیجر: شاعر، پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶۔ بمبئی ۵ بی سی

مجوعات

اُردو کیلئے اتحاد اور تنظیم کی سخت ضرورت ہے

یوں تو تقسیم ملک کے بعد سے اُردو تحریک مختلف مراحل سے گزرتی رہی ہے۔ تحریک کبھی کمزور ہوئی ہے اور کبھی اس نے زور پکڑا ہے۔ کبھی یوں لگا ہے کہ جیسے مختلف صوبوں میں اُس کی راہ سے رکاوٹیں دُور ہو جائیں گی۔ اُسے سرکاری کاموں کے لئے استعمال کیا جائیگا اور اس کی تعلیم پر سے پابندیاں اٹھالی جائینگی۔ لیکن یہ سب کچھ ایک وقتی سیاسی مصلحت اور خواب و سراب سے زیادہ کچھ نہ نکلا۔

بمبئی اُردو کنونشن کے بعد، اُردو تحریک نے ایک نیا موڑ لیا ہے، ہم نے سچائی اور حقیقت پسندی، کمزوریوں اور خامیوں پر توجہ دینی شروع کر دی ہے۔ بمبئی اُردو کنونشن پر شاعر کے گزشتہ شمارہ کے اداریہ میں پوری پوری حقیقت پسندی اور سچائی سے کام لیا گیا تھا۔ کنونشن کی سرگرمیوں میں ایک کارکن کی حیثیت سے حصّہ گیر رہنے کے باوجود بعض کوتاہیوں پر شاعر کے اداریہ میں پردے بھی ڈالے جا سکتے تھے لیکن یہ اُردو تحریک اور ہماری اپنی کاوشوں کا صحیح جائزہ نہ ہوتا اور آئندہ کیلئے ہمیں محتاط اور چوکنا رہنے کا اشارہ نہ ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس اداریہ کو اُردو حلقوں میں زبردست اہمیت دی گئی ہے۔

اُردو والوں کو عام طور پر اس کا علم ہو چکا ہے کہ اُردو کے بہت سے مخالفین بمبئی اُردو کنونشن کے بعد کھُل کر سامنے آگئے ہیں اور اُن کی انتہائی کوشش یہی ہے کہ ہندی والوں میں اُردو کے سلسلے میں اور زیادہ غلط فہمیاں پیدا کی جائیں تاکہ مختلف ریاستوں میں اُردو کی حقوق طلبی کا مسئلہ پھر کھٹائی میں پڑ جائے۔ اُردو کے سوال پر جھگڑے اور فسادات کرائے جائیں۔ مرکز اور ریاستوں کو خوفزدہ کیا جائے۔ اُردو زبان کی ہمہ گیری اور اُس کی اہمیت کا سرے سے انکار کیا جائے۔ اُردو کا رسم الخط بدل کر اُسے ہندی میں ضم کرنے کے لئے کچھ اُردو والوں کو بھی اپنی طرف بلا لیا جائے۔ چنانچہ "نو بھارت ٹائمز" اور "دھرم یگ" میں اِس نوع کے مضامین مسلسل شائع ہو رہے ہیں۔

"شاعر" کے گزشتہ شمارے میں ڈاکٹر دھرم ویر بھارتی، کرشن چندر، اور مدیر شاعر کے مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ "مدیر شاعر" کا مضمون "دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا" "نو بھارت ٹائمز" ہی کیلئے لکھا گیا تھا۔ اور اُسے کافی محنت سے ہندی زبان میں منتقل کرا کے خود مدیر شاعر "نو بھارت ٹائمز" کے ایڈیٹر شری ادھیکاری کے پاس لے کر گئے تھے انہیں "شاعر" کا غالب نمبر اور گاندھی نمبر بھی دیا گیا تھا۔ افسوس کہ ڈیڑھ ماہ گزر جانے کے باوجود "نو بھارت ٹائمز" میں وہ مضمون شائع نہیں ہوا۔ فون پر ادھیکاری صاحب کو دو بار یاد دہانی بھی کی گئی۔ اُردو میں یہ مضمون "شاعر" کے علاوہ کئی دوسرے اخبارات میں شائع ہو چکا ہے۔ اور اُسے نہایت حقیقت پسندانہ اور منصفانہ مضمون قرار دیا گیا ہے۔ اُردو کی ذمّہ دار شخصیتوں کو چاہئے کہ وہ شری ادھیکاری کو اُن کی صحافیانہ ذمّہ داری کی طرف متوجہ کریں اور اُس مضمون کی اشاعت پر زور دیں۔

اُردو کمیٹی بمبئی کی طرف سے پنڈت آنند نرائن ملاّ کی قیادت میں ایک وفد نے گزشتہ ماہ دہلی میں پھر وزیر اعظم سے ۴۵ منٹ بات چیت کی ہے اور انہیں وہ میمورنڈم پیش کیا ہے۔ جو بمبئی اُردو کنونشن میں منظور کیا گیا تھا۔ اُردو کے مقدمہ کے سلسلے میں نہایت تفصیل کے ساتھ وزیر اعظم کو سب کچھ بتا دیا گیا ہے۔ اُردو کمیٹی کی مساعی جاری ہیں اور جاری رہیں گی۔

ذمہ داران اُردو کا فرض ہے کہ وہ اپنی اپنی ریاستوں میں زبردست اتحاد و تنظیم سے کام لیں، متحد ہو کر نئے اقدامات کریں۔ ہمیں آپس میں تلخیاں پیدا نہیں کرنی ہیں اور نہ مخالفینِ اُردو کو اپنے کسی بھی اقدام سے مشتعل کرنا ہے۔ انجمن ترقی اُردو کو اس وقت سب سے زیادہ متحرک ہونے کی ضرورت ہے۔ خصوصاً اُتر پردیش میں قائم کئے گئے اُردو بورڈ کے انتظامیہ پر عملی نگرانی کرنی ہے۔

۱۳ مارچ ۱۹[illegible]ء

[illegible]

نخیر بہمدوی

غالب کا دیوان

مرزا غالب کے علاوہ اُردو کے دُوسرے شعراء کے بارے میں تو وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اُن کی زندگی میں یا اُن کے مرنے کے بعد اُن کے دَوَاوین کی طباعت و اشاعت کتنی بار ہوئی یا اُس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ مگر غالب کے بارے میں تو وثوق اور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اُن کا دیوان اُن کی زندگی میں بھی چھپا اور اُن کے مرنے کے بعد بھی۔ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر مختلف سائز، مختلف ترتیب اور مختلف تزئین و آرائش کے ساتھ لیتھو اور ٹائپ میں طبع ہوا۔ اور میرا یہ خیال ہے کہ غالب شناسی کا جذبہ جب تک سلامت رہے گا 'دیوانِ غالب' کی طباعت و اشاعت کا سلسلہ منقطع نہیں ہوگا اور اب تو انگریزی، ہندی، گجراتی، بنگلہ، تلگو، ملیالم اور ٹامل زبان میں بھی دیوانِ غالب کی طباعت و اشاعت شروع ہو گئی ہے اور اربابِ ذوق دیوانِ غالب اپنے سینوں سے لگائے پھر رہے ہیں۔

اِس وقت دیوانِ غالبؔ کے چند ایسے نسخوں کا ذکر مقصود ہے جو مرزا غالبؔ کی زندگی میں شائع ہوئے اور مجھے "غالب اِن سائی کلو پی ڈیا" کے سلسلے میں اُن کے مطالعے کا موقع ملا۔ "غالب اِن سائی کلو پی ڈیا" کا ایک باب مرزا غالبؔ کے دیوانوں سے متعلق ہے اور میں نے اِس باب کو مکمل کرنے کے لئے دیوانِ غالب کے سَو سے اُوپر مطبوعہ اور دس بارہ غیر مطبوعہ نسخوں تک رسائی حاصل کی ہے۔ غالبؔ کی زندگی میں ان کے دیوان کے کُل پانچ اِڈیشن شائع ہوئے۔

پہلا دیوان ماہ شعبان ۱۲۵۷ ہجری، اکتوبر ۱۸۴۱ء میں مطبع سیّد الاخبار میں چھپا جو سرسیّد کے بھائی سیّد محمد خاں بہادر نے دہلی میں قائم کیا تھا۔ وہ سیّد المطابع کے نام سے بھی مشہور تھا۔ اِس دیوان کا ایک نسخہ پبلک لائبریری رام پور میں موجود ہے۔ ایک کرم خوردہ نسخہ بنارس ہندو یونیورسٹی کے مولوی مہیش پرشاد مرحوم کے پاس تھا۔ ایک اور نسخہ جس کا سرورق ضائع ہو گیا تھا، الٰہ آباد میں خان بہادر ابوؔ بیر مرحوم کے بیٹے کی ملکیت تھا۔[1]

دیوان کے شروع میں غالبؔ کا لکھا ہوا فارسی دیباچہ اور آخر میں نواب ضیاء الدین احمد خاں

---

[1] اِسکے ایک ورق کا فوٹو میرے ذخیرۂ غالبیات میں موجود ہے سُنا ہے کہ دیوان علیگڑھ آزاد لائبریری میں پہنچ گیا ہے۔

کی لکھی ہوئی تقریظ ہے۔

اس دیوان کی اشاعت کے چھ سال بعد دوسرا دیوان جمادی الاول ۱۲۶۳ ہجری۔ مئی ۱۸۴۷ء میں مطبع دارالسلام دہلی محلہ حوض قاضی سے شائع ہوا۔ اس کا ایک نسخہ دہلی یونیورسٹی کے کتاب خانے میں محفوظ ہے۔ ایک اول و آخر ناقص نسخہ میرے پاس تھا۔ اُس کو میں نے اپنے کرم فرما مالک رام صاحب کی نذر کر دیا۔ پہلے ایڈیشن اور اس ایڈیشن میں ایک غزل کی کمی بیشی ہے ورنہ ترتیبِ مضامین یکساں ہے۔ البتہ غزلوں کے عنوانات حذف کر دیئے گئے ہیں اور قصائد کے عنوان کی عبارتوں میں بھی ردوبدل ہے۔

تیسرا دیوان ۲۰ محرم الحرام ۱۲۷۸ ہجری۔ جولائی ۱۸۶۱ء میں مطبع احمدی دہلی میں چھپا۔ اس دیوان کے شروع میں بھی غالب کا لکھا ہوا دیباچہ ہے اور نواب ضیاء الدین احمد خان اور یوسف علی خان عزیز بنارسی کے لکھے ہوئے قطعاتِ تاریخِ طباعت ہیں۔ اس دیوان کا ایک نسخہ ۱۸۶۱ء میں غالب نے نواب افتخار الدولہ بہادر نائب والئ حیدرآباد سر سالار جنگ اول کی خدمت میں تحفتاً بھیجا تھا۔ اسی ایڈیشن کا ایک نسخہ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کے پاس تھا جس سے میں نے استفادہ کیا تھا۔ دیوان کے آخر میں غالب کی تحریر ہے جس کے ابتدائی فقرے یہ ہیں:

"داد کا طالب غالب گذارش کرتا ہے کہ یہ دیوان تیسری بار چھاپا گیا ہے ——"

یہ دیوان بہت غلط چھپا۔ اس لئے غالب کی ترمیم اور اصلاح کے بعد مطبع احمدی کے مالک محمد حسین خان نے دوبارہ نظامی پریس کانپور میں چھپوایا۔ غالب کا وہ رقعہ، جو انہوں نے محمد حسین خان کو لکھا تھا، دیوان کی پشت پر موجود ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

"دو رات دن کی محنت میں میں نے اس نسخے کو صحیح کیا ہے۔"

غالب کا صحیح کیا ہوا وہ نسخہ آصفیہ لائبریری حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ یہ دیوان ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ جون ۱۸۶۲ء میں طبع ہوا۔ دیوان کے خاتمے پر مالکِ مطبع محمد عبدالرحمٰن بن حاجی محمد روشن خاں کی جو تحریر ہے اُس کا اقتباس یہ ہے:

"اس سے پہلے دیوانِ غالب کا دہلی میں چھپا۔ محمد حسین خاں دہلوی نے بعد نظرِ ثانی و تصحیح مصنف کے ایک نسخہ میرے پاس بھیجا۔ میں نے اس نسخے کو شہر ذی الحجہ ۱۲۷۸ ہجری۔ جون ۱۸۶۲ء میں مطبع نظامی واقع شہر کانپور میں صحتِ تمام اور درستئ کمال سے چھاپا۔"

مگر صحتِ تمام اور درستئ کمال سے چھاپنے کے دعوے کے باوجود بھی یہ دیوان صحیح نہیں چھپا۔ دیوانِ غالب کا یہ چوتھا ایڈیشن ہے۔ اس کا ایک ناقص نسخہ میرے کتاب خانے میں محفوظ ہے۔ اس میں دو غزلوں کا اضافہ ہے۔[1]

---

[1] ان غزلوں کے مطلعے یہ ہیں:

کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز — کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

بہت سہی غمِ گیتی، شراب کم کیا ہے — غلامِ ساقئ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

دیوانِ غالب کا پانچواں اڈیشن ۱۲۷۹ ہجری۔ ستمبر ۱۸۶۳ء کے بعد منشی شیونرائن کے مطبع مفید خلائق آگرہ سے چھپ کر شائع ہوا۔ اس کی ترتیب نسخۂ رام پور کے مطابق ہے۔ نسخۂ رام پور سے مراد وہ دیوان ہے جس کو غدر سے پہلے مئی ۱۸۵۷ء میں مرزا غالب نے خوش خط لکھوا کر نواب صاحب رام پور یوسف علی خاں ناظم کے لئے بھیجا تھا۔ اسی دیوان کی ایک نقل ۱۸۶۰ء میں جب غالب رام پور میں نواب صاحب کے مہمان تھے تو بہ سبیل ڈاک نواب ضیاء الدین احمد خاں کو دہلی بھیجی تھی اور رام پور سے دہلی واپس آکر ۲۵ رجون ۱۸۶۰ء کو بہ ذریعہ پارسل شیونرائن کے لئے آگرہ ارسال کی تھی۔

غالب کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے فارسی اور اردو کلام کے دو انتخاب کئے تھے پہلا انتخاب اپنے زمانۂ قیامِ کلکتہ میں اپنے دوست مولوی سراج الدین احمد کی درخواست پر کیا تھا جس کا نام "گلِ رعنا" رکھا تھا۔ "گلِ رعنا" کا ایک خطی نسخہ مالک رام صاحب کو حیدرآباد کے کسی قدیم علمی خاندان سے دستیاب ہوا ہے جو بقول مالک رام" دنیا بھر میں وحید نسخہ ہے"۔

دوسرا انتخاب ۱۸۶۶ء میں خلد آشیاں نواب کلب علی خاں والیٔ رام پور کی فرمائش پر کیا تھا جو کتب خانۂ رام پور کی طرف سے "انتخابِ غالب" کے نام سے چھپ گیا ہے۔

غالب کے انتخابِ کلام و ترتیبِ دیوان کے بارے میں جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مولوی فضلِ حق خیرآبادی اور کوتوال شہر مرزا خانی نے کیا تھا، صحیح نہیں ہے۔ اس موضوع پر غالب نے جو خط مولوی عبدالرزاق شاکر مچھلی شہری کو لکھا ہے اُس سے بھی اس خیال کی تردید ہوتی ہے۔ معتبر شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے اپنے انتخابِ کلام "گلِ رعنا" سے پہلے اپنا اُردو دیوان مرتب کر لیا تھا۔ جب اُن کی عمر ۲۴، ۲۵ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کی تصدیق اُس خطی نسخے سے بھی ہوتی ہے جو ۵ رصفر ۱۲۳۷ ہجری یکم نومبر ۱۸۲۱ء میں لکھا گیا تھا اور ۱۹۲۱ء میں مفتی انوار الحق مرحوم کی تصحیح اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے غیر فانی مقدمے کے ساتھ پہلی بار نواب حمید اللہ خاں فرماں روائے بھوپال کی توجہات عالیہ سے شائع ہوا۔ یہی دیوان اب "نسخۂ حمیدیہ" کے نام سے مشہور ہے۔ اس دیوان کا قلمی نسخہ نواب غوث محمد خاں رئیس بھوپال کے فرزند نواب فوج دار محمد خاں کے کتاب خانے میں محفوظ تھا۔ اس دیوان کے بعد تاریخی ترتیب کے لحاظ سے اُس دیوان پر نظر پڑتی ہے جو حافظ محمود خاں شیرانی مرحوم کی ملکیت تھا، اب پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانے کی زینت ہے۔

ایک خطی نسخہ جو اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر لائقِ ذکر ہے۔ میرے ذخیرۂ غالبیات میں محفوظ ہے۔ اس نسخے کو سر راس مسعود، عبدالرحمٰن بجنوری، شعیب قریشی اور بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کی مرضی اور منشا کے مطابق ہاشمی فرید آبادی نے ترتیب دیا تھا اور نواب احمد سعید خاں طالب رئیس دہلی کے قلمی دیوانِ غالب اور نسخۂ حمیدیہ اور شرحِ دیوانِ غالب حسرت موہانی سے استفادہ کیا تھا۔ ہندوستان کے کئی علمی خاندانوں میں اور کئی قدیم خانقاہوں کی لائبریریوں میں بھی دیوانِ غالب کے بعض قیمتی نسخے موجود ہیں جن کا مجھے علم ہے۔

ولیٔ بادہ خوار غالب کی کرامت دیکھئے کہ ۵ راپریل ۱۹۶۹ء کو امروہہ کے ایک تاجر کتب نے بھوپال کے کسی صاحب سے دیوان کا ایک ایسا نسخہ حاصل کیا ہے، جو تقریباً ڈیڑھ سو سال پرانا ہے اور غالب

(باقی صفحہ ۴۳ پر دیکھئے)

شمیم کرمانی

بچاؤ دامنِ دل، ایسے ہم نشینوں سے
بلا کے ہاتھ جو ڈستے ہیں آستینوں سے

چمک لطیف سہی، دل کو چوٹ لگتی ہے
یہ پتھروں کو شکایت ہے آبگینوں سے

تجھے ہوائے مخالف جگا دیا کس نے
بہت قریب تھا ساحل کئی سفینوں سے

ہماری فکر، امانت ہے صبحِ فردا کی
سماں ہے دور کا، دیکھو نہ خورد بینوں سے

اب اپنے زخمِ جبیں کو چھپا بھی لے اے دل
ٹپک رہا ہے پسینہ کئی جبینوں سے

نہ جانے مجرمِ ذوقِ نظر پہ کیا گذری
بھری تھی راہ تماشا، تماش بینوں سے

نگارِ زیست کو اتنا تو پیرہن دیدو
چھپا لے دیدۂ پُرنم کو آستینوں سے

سکوتِ وقت، مورخ نے لکھ لیا اس نے
جو پتھروں نے کہا بے خطا جبینوں سے

شمیم انجمنِ اہلِ زر میں کیا جائیں
لہو کا رنگ جھلکتا ہے آبگینوں سے

سلام مچھلی شہری

رقصِ نگاہ کا وہی لمحہ حسین ہے
جب دل پکار اٹھے کہ یہ دنیا حسین ہے

اے شمعِ ... کوش، کوئی دلنواز لو
اے عمر! ساتھ دے کہ زمانہ حسین ہے

جب زندگی اداس ہو اک خواب دیکھ لو
اور یہ یقین کر لو کہ دنیا حسین ہے

زنجیر ہو کے اور نکھر میرے دل کے چاند
بے رنگ بادلوں کا یہ ہالہ حسین ہے

اس اک گناہگار کی عظمت بھی دیکھیے
جو کہہ رہا ہو غم کا اندھیرا حسین ہے

جس دور سے تھا میرا تعلق، وہ تو دُور تھا
جس دور سے ہے اب مرا رشتہ حسین ہے

ساقی ہو سرو، جام ہو گل، میکدہ ہو باغ
ان مست انکھڑیوں کا تقاضہ حسین ہے

آئیں گے شیخ جی! سرِ میخانہ بہرِ وعظ
خوش آمدید، ان کا ارادہ حسین ہے

دلی سے دور گاؤں کا یہ میکدہ سلام!
محلوں سے کہہ دو پھر مرا ڈیرا حسین ہے

موسیٰ کلیم

تلاشِ سکوں

تلاشِ سکوں ایک طفلانہ خواہش ہے، مانا
مگر ہے تعاقب میں اِس کے بنی نوعِ انساں
ہر اِک فرد، ہر اک جماعت، ہر اک قوم، ہر مملکت،
امن کا نام لے کر
اسی اِک سکوں کے تعاقب میں صحرا بہ صحرا، ممالک ممالک
اُلجھتے رہے اور جھگڑتے رہے ہیں

پہاڑوں کے دامن، درختوں کے سائے، عماراتِ کہنہ
مقاماتِ ویراں، شکستہ مقابر
انھیں میں نے گہوارہ سمجھا
قرار و شکیب اور امن و سکوں کا
وہاں اپنا مسکن بنایا
سکوں کے نشانات ڈھونڈے
کئی دن، کئی ماہ اور سال گذرے
مگر پھر بھی محسوس یوں ہو رہا تھا، کہ جیسے
جہاں سے چلا تھا، وہیں ہوں
مرے ہاتھ کچھ بھی نہ آیا
بجز ایک حسرت کے جو دل میں ناکام سی رہ گئی تھی
سمجھ میں نہیں آسکا حل کہ کیسے میسر سکوں ہو سکے گا
بس اِک حل یہی ہے "سفینہ کو طوفاں کی نذر کر دوں"
تو مایوس ہو کر
پشیماں ہو کر
حوادث کے عالم میں پھر لوٹ آیا

وہی زندگی کے مسائل کی پیچیدگی میں
پھر اس طرح کھویا ہوا ہوں کہ جیسے سفینہ ہے نذرِ تلاطم
خیالات میں ایک محشر بپا ہے
ہجوم اِک تمناؤں کا، لشکر اِک حسرتوں کا
جو تا عرصۂ حشر پوری ہوئی ہیں نہ ہوں گی
مگر اِن اک لذّتِ بے خودی ہے
یہی لذّتِ بے خودی
زندگی ہے!

قطب سرشار

حال

دُور تک تیرگی کے محبس ہیں،
دُور تک چھا گئے ہیں سنّاٹے
سرسراتے ہیں آہٹوں کے سانپ
(رینگتی جا رہی ہیں اُمیدیں)
آرزوؤں کے مرمریں پیکر
فکر کی دُھوپ میں پگھلتے ہیں
سر پہ آہن ہے،
پیٹ میں پتھر،
خون رگ رگ میں جلنے لگتا ہے
رات کے پتھروں کو سہہ سہہ کر
صُبح کا جسم ہے لہو میں تر
کرب کی، غم کی، بے نوائی کی
ہر طرف پھانسیاں ہیں لٹکی ہوئی
آہنی دَور کے شکنجے میں
زیست کی گھڑیاں ہیں پھنسی ہوئی!

گوپال اُپادھیایا
سید قادر محی الدین

بھارت کا نقشہ

"کل تم لوگ جا رہے ہو۔ ہو سکے تو آج کسی وقت مندر تک ہو آنا۔ کُل دیوتا کا استھان ہے۔ ہاتھ جوڑ آنا۔" پتاجی نے کہا تھا۔ اُن کے کہنے میں بڑا ٹھنڈا پن سا تھا۔

میں جب بھی گھر آتا ہوں، پتاجی اپنے لئے صرف اتنا ہی مانگتے ہیں۔ مندر تک ہو آنے کی اُن کی اِس فرمائش سے میرے دل میں اُن کے تئیں عقیدت اور بڑھ جاتی ہے۔ اگر پتاجی یاد نہ دلاتے، تو شاید میں مندر نہ بھی جاتا۔ مندر سے لوٹتے ہی بارش شروع ہو جاتی ہے۔ پرساد اُن کے ہاتھ پر رکھتا ہوں۔ تو وہ ہڑبڑا کر میرے بھیگے کپڑوں پر ہاتھ پھیر کر کہتے ہیں۔ "ارے، تم تو بھیگ گئے۔"

اُن کے اِس اَدھورے سے جملہ میں درد کا ویسا ہی احساس ہوتا ہے جیسے کہہ رہے ہوں۔ "ارے تمہیں تو بخار ہے۔" پرساد، وہ لے لیتے ہیں اور اُس میں سے پھول پتی اُٹھا کر میرے ہی سر پر رکھتے ہوئے کہتے ہیں۔ "پرماتما تمہاری حفاظت کرے۔"

یہ جان کر بھی کہ میں خود مندر سے اپنے لئے کچھ نہ کچھ مانگ کر ہی لوٹا ہونگا، اپنے لئے وہ کچھ نہیں مانگتے۔ اُن کی مایوس و نم آلود آنکھوں میں مجھے ایک مدھم سی چمک دکھائی دیتی ہے۔ ہزاروں آشائیں۔ ڈھیر ساری تمنائیں اُن کی آنکھوں سے اُتر کر میری آنکھوں میں بیٹھ جاتی ہیں۔ میں چُپ چاپ دوسرے کمرے میں آ جاتا ہوں، جہاں میری بیوی چارپائی پر لیٹی، کوئی اخبار پڑھ رہی ہے۔

شام کو دنیش کے ساتھ کھیتوں کی طرف چلا گیا تھا۔ کئی سالوں سے جب بھی گھر آیا ہوں، ایک دو دن کے لئے کھیتوں پر، جہاں بچپن اور جوانی کے شروعات کے دن بیتے ہیں۔ جا سکنے کا نہ موقع ملتا ہے اور نہ ایسی کوئی خواہش ہی ہوتی ہے۔ اپنے پہلے کھیت میں پہونچتے ہی کچھ عجیب سا لگتا تھا۔ دنیش کچھ کہہ رہا تھا۔ مگر سنائی کچھ نہیں پڑ رہا تھا۔ پچاسوں بار اپنے ہاتھوں ابھی یا اِن سارے کھیتوں میں ہل جوتا ہے۔ اِدھر کنارے جہاں ہل نہیں پہنچتا، اپنے ہاتھوں سے کدال لے کر کھودا ہے۔ فصلیں کاٹی ہیں۔ اس وقت میری خوشحال زندگی کے سوکھے بہاؤ کی یاد ایک عجیب سی شکایت بن کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی ہے۔ جھک کر گیہوں کے ایک، ہرے پودے پر ہاتھ پھیرتا ہوں۔ دنیش کہتا ہے کہ یہ میکسیکن ذات کا ہے۔ میں گیہوں کے پودوں پر ہاتھ اس لئے نہیں پھیر رہا ہوں کہ اُن کی ذات اور نسل پہچان لوں۔ میں اُس دوری کو ناپ رہا ہوں۔ جو اِن پودوں اور میرے بیچ آ گئی ہے۔ اب میں اِن پودوں سے اتنی دور پہونچ

گیا ہوں کہ مجھے صرف دانے نظر آتے ہیں۔ بکاؤ دانے۔ جن سے صرف پیٹ بھرنے کا بازاری رشتہ باقی رہ گیا ہے کوئی اپناپن نہیں۔ اپنے ہاتھوں بوئی اور سانی فصل کی پہلی روٹی میں کتنا اپناپن ہوتا ہے! ایک ایک کھیت میں جاکر میں نے تاریخ کے اوراق کو پلٹ پلٹ کر پڑھنا چاہا۔ مستقبل سے اُن سے ان کا کوئی تعلق نظر نہیں آتا تھا اس ساری دنیا کیلئے میں اجنبی ہو چلا تھا۔ اس مٹی میں دن رات پڑے رہنے سے جو خوشی پیدا ہوتی تھی۔ آج وہ میرے سامنے ایک دھندلکے کے روپ میں کھڑی تھی۔ تایاجی نے اس مٹی میں اپنا اور اپنی اولاد کا مستقبل دیکھا تھا۔ ایک کے بعد ایک نئے کھیت وہ خریدتے چلے گئے تھے۔ اولاد کی پیاس نے تایاجی کی کلپنا کے مستقبل کو کوئلے سے کھینچی گئی لکیر کی طرح پونچھ ڈالا تھا۔ تایاجی نے تو کچھ نہیں کہا تھا، پر دھنے نے بتایا کہ ان پانچ دس کھیتوں کو چھوڑ کر باقی ساری زمین آدھی آدھی قیمت پر لوگوں کو دے دی گئی ہے۔ ان کھیتوں کے بیچ، میں کٹہرے میں کھڑے مدعی کی طرح کھڑا ہو جاتا ہوں جو جانتا ہے کہ وہ اپنا مقدمہ ہار چکا ہے۔ کیوں کہ اس کے پاس اپنے بچاؤ کا کوئی جواب نہیں ہے۔ ایسی حالت میں قسمت کا لکھا ہی سب کچھ ہوتا ہے۔

کھیت کے کنارے بیٹھ کر سگریٹ پینے لگتا ہوں۔ پیچھے جھیر کا وہ لمبا جنگل ہے۔ کھیتوں سے لوٹ کر گھر آتے ہوئے گئوشالہ کے پاس ہاتھ منہ دھونے کے لئے رُک گیا۔ دھنے کہنے لگا "نئی بھینس لی ہے۔ آئیے دیکھ لیجئے"

جاکر دیکھتا ہوں، بھینس پورے گئوشالہ میں اکیلی ہے۔ اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا ہوں۔ وہ سر ہلاکر کہتی ہے۔ "ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے"۔ اُس کے گلے کو انگلیوں سے سہلاتا ہوں۔ وہ سر اُٹھاکر گردن ترچھی کر دیتی ہے۔ اکیلی بھینس کو اتنے بڑے گئوشالہ میں دیکھ کر عجیب سا لگتا ہے۔ نہ بیل ہے نہ بکری۔ نہ گائے ہے نہ بچھڑا۔ ہاتھ پاؤں میں وہ تھکن محسوس ہونے لگتی ہے۔ جو کبھی ڈھیر سارے جانوروں کو پانی اور سانی دینے میں ہو جاتی تھی۔ پیٹھ اور کمر کا وہ درد جاگنے لگتا ہے جو اسی گئوشالہ میں دیر تک جانوروں کو سانی پانی کے وقت جھکے رہنے سے ہو جایا کرتا تھا۔ گئوشالہ کی دیواروں پر مستقبل کی ٹوٹن نظر آ رہی تھی...... بوسیدہ دیواروں پر مکڑیوں کے جالے بنے ہوئے تھے۔ گئوشالہ کی دہلیز کو پھلانگتے ہوئے مجھے ایسا لگا تھا۔ جیسے دو الگ دنیاؤں کا فاصلہ پھلانگ رہا ہوں

گھر آکر چارپائی پر لیٹ گیا اور اپنی اُداسی کے سبب بیوی کے چہرے پر آئی بے رخی کو پڑھ رہا تھا کہ تایاجی نے دروازے کی چوکھٹ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے بہت ہی نرم آواز میں کہا تھا۔ "ہو سکے تو آج کسی وقت مندر تک ہو آنا" چونکہ تایاجی نے، جب سے گھر آیا ہوں، صرف یہی ایک بات ایسی کہی تھی جسے اصرار نہیں، آدیش کہنا چاہیئے، کوئی خواہش مندر تک ہو آنے کی نہ ہونے پر بھی جانا پڑتا ہے۔ تایاجی کی بے انتہا خوشی کیلئے دونوں بچوں کو بھی ساتھ لے جانا چاہتا تھا، مگر بارش ہو سکنے کے ڈر سے بیوی نے انہیں گھر سے باہر نہ بھیجنا ہی مناسب سمجھا۔ گھر سے مندر پہونچنے تک اور مندر سے گھر آنے تک جتنی آنکھیں دیکھیں۔ اُن سب میں ویسی ہی مدھم، بجھی بجھی سی روشنیاں نظر آئیں جو مندر سے لوٹ کر تایاجی کی آنکھوں میں دیکھی تھیں۔ ان روشنیوں کی تمازت بھی بجھی بجھی سی لگ رہی تھی۔ گھر آکر کپڑے اُتار کر چارپائی پر لیٹ گیا تھا تو تایاجی کی وہ بات یاد آگئی تھی۔ "میرے زمانے میں میٹرک پاس ڈپٹی کلکٹر ہوتے تھے۔ گھی، دودھ، پیسے لئے سے گھر بھر جاتا تھا۔" نئے زمانے کی یکایک بدلی ہوئی تصویر کا اندازہ تایاجی کو پہلے شاید نہیں ہو سکا تھا۔ شاید وہ سوچ بھی نہیں سکے ہوں گے کہ اُن کے رہتے وہ زمانہ آجائے گا کہ ایم۔ اے کرنے کے بعد بھی اُن کا لڑکا اُن کے زمانے کے میٹرک کی حیثیت نہیں پا سکے گا۔ تایاجی کا دل، درد کے احساس سے جیسے کسی طرح گھٹ رہا ہو

جاتا ہے۔ پتا جی کی آنکھوں کی چمک مدّھم پڑ گئی ہے...... اپنے ذہن کم پڑھے جاگیردار کا تشدّد، گاؤں کے بنیوں سے بھری گئو شالا سے بہتی دودھ دہی کی نہریں اور اُس کے بعد پڑھے لکھے لڑکے کی اُونچی نوکری سے جھیل رہے سو اکرام کا سپنا اُن کی چمکدار آنکھوں میں ٹوٹ کر کہیں چھپ گیا تھا۔
پتا جی نے کبھی کسی سے کہا تھا۔ بیٹا، انگریز گئے، اب تو اپنا راج ہے۔ انگریزوں کی جگہ ہمارے بیٹوں ہی سے تو بھری جاویں گی نا۔
آج اُن کی آنکھوں کی بجھی بجھی سی روشنی میں اُن نیک تمناؤں کے کھنڈر بہت صاف دکھائی دے رہے ہیں۔ پتا جی غلام دیس میں پیدا ہوئے تھے۔ اور وہ ایک لمبی زندگی تک آزاد دیس کے سپنے گڑھتے رہتے تھے۔ وہ سوچتے تھے اُن کے اُس آزاد دیس میں بھی دودھ کی ندیاں بہیں گی۔ غلّے کی بہتات ہوگی۔ اخلاق، ایمانداری اس دیس کا سرمایہ ہوگی ——— حکومت اُن کے جیسے نچلے طبقہ کے لوگوں یا اُن کے پڑھے لکھے بیٹوں کے ہاتھ ہوگی ——— طوائف الملوکی، لوٹ کھسوٹ نہیں ہوگی........ انصاف اور مساوات کی قدر ہوگی۔ اُن کا اپنا دیس ہوگا۔ اُن کی اپنی حکومت ہوگی۔ اُن کے اپنے تلاش شدہ راستے ہوں گے۔ اور اُن کی اپنی طبیعت کے موافق نئے دیس کا "نرمان" ہوگا۔ دنیا کا سب سے زیادہ سُکھی، امن پسند و خوشحال دیس۔
اور اب ——— !! ہر چیز اپنی توقع کے خلاف پا کر، اُنہیں رنج ضرور ہوا ہوگا۔ چونکہ میں خود اُن کپناؤں سے دُور رہا ہوں اور ابھی زمانہ کا پروردہ ہوں، اُن کے درد کی گہرائی کو آنا نہیں پہنچان سکتا۔ مگر پہلے درجہ میں کامیاب ہونے والے طالب علم کو اخبار میں جب اپنا رول نمبر نہیں دکھائی دیتا، تو اُس کی حالت نہ رو سکنے کی ہوتی ہے اور نہ ہنس سکنے کی۔ پتا جی کی بھی یہی حالت ہوگی۔ مجھے بخوبی اندازہ ہے۔

بیوی رسوئی میں چلی گئی ہے۔ دونوں بچّے پتا جی کے پاس کمرے میں بیٹھے ہیں۔ پتا جی انہیں رٹا رہے ہیں۔ - جے گنیش، جے گنیش، جے گنیش دیوتا۔ ماتا تمھاری پاروتی۔ پتا۔ مہادیوا۔ پتا مہادیوا۔ پتا مہادیوا۔ یہ الفاظ من میں گھومنے لگتے ہیں۔ مٹّی کے مہادیو کی دھیان میں ڈوبی ہوئی مورتی میرے ذہن میں آجاتی ہے۔ وہ اپنی آنکھیں بند کر کے اپنے من کی گہرائی کو ٹٹول رہے ہیں۔ مہادیو جیسی کے چہرے پر فکر کی تیز و ضیا پاش لکیریں نظر آتی ہیں۔ اُنہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ اِس کا دھرم ہے چُپ رہنا۔ ہر مصیبت چُپ چاپ سہنا، مُنہ سے کچھ بھی نہ کہنا — مجھے یہ لفظ "پتا" مہادیو کا مترادف لگنے لگتا ہے۔ یا مہادیو "پتا" کا نمائندہ ہوگا۔ شائد شو چالیسہ کی ان سطور کے ذریعہ پتا جی مجھے اپنی حالت بتا رہے ہیں۔ میرا یہ سوچنا یہیں رک جاتا ہے۔ ماں میرے کمرے میں آکر چارپائی کے پاس بیٹھ جاتی ہے۔
"ادھر چارپائی پر بیٹھ جاؤ ماں" میں کہتا ہوں۔
"نہیں۔ یہاں ٹھیک ہوں بیٹا۔ کرسی پر بیٹھنا میری عادت تھوڑی ہی ہے" ماں سپاٹ سے لہجے میں کہہ دیتی ہے۔ میری بیوی سے ماں کچھ کہتی ہے۔ بیوی کے رسوئی میں چلے جانے کے بعد وہ میرے کمرے میں آتی ہے۔ مجھے لگا، کرسی پر بیٹھنے والا طنز اُس نے میری بیوی کو ہی نشانہ بنا کر کیا ہے۔ مجھے یاد ہے۔ ماں پہلے اکثر میری بیوی کو ستایا کرتی تھی۔ "ہمارے زمانے میں بہوئیں ساس کی طرف مُنہ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں کرتی تھیں" ماں [illegible]

کو بھی زمانہ بدل جانے کا احساس تھا اور بدلے ہوئے زمانے کے بدلتے چلن سے اُسے چڑھ تھی۔ مگر پچھلے کئی سالوں سے۔ جب سے بیوی میرے ہی ساتھ رہتی ہے۔ اُس کا سکون ایک دم بکھر گیا تھا۔ اب وہ محض اپنے کو بہو کی طرح اُس سے میرے چھن کر دور ہو جانے کی کسک سے دو چار پاتی۔ شائد اُسے ایسا لگتا ہو، اب وہ جب بھی مجھ سے کوئی خاص بات کرتی، ہمیشہ بہو کی نظر بچا کر ہی کرتی۔

"کل جا رہے ہو پھر۔" ماں ایسے پوچھتی ہے جیسے معاملہ کسی جج کے پاس ابھی فیصلہ کیلئے پیش ہوا ہو فیصلہ بدل سکنے کی بھی امید ہو۔"

"چھٹی ختم ہو گئی ہے ماں۔ پرسوں دفتر پہنچنا ہے۔"

"تب تو جانا ہی ٹھہرا۔ نوکری کا معاملہ ہوا۔ مگر بیٹا ہم لوگ تو تمہارے ہی دم سے جی رہے ہیں۔ نوکری میں کوئی حیلہ حوالہ نہیں ہونا چاہیئے۔ دس ہمسائے ہنسی کرنے کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں۔" ماں کہتی ہے مگر اُس کی آواز میں پہلے کی طرح تیکھا پن نہیں ہے۔ سیدھا، سپاٹ بولنے کی اس کی عادت نہیں تھی۔ اب بولنے لگی ہے، دوسرے کمرے سے پتا جی کے دیر تک سانس روک کر کھانسنے کی آواز آتی ہے۔ کھانسنے میں دیر تک سانس نہ رُک پانے سے اُن کی تکلیف کا اندازہ بہ آسانی لگ جاتا ہے

"انہیں اس دمہ کے مرض نے تو جیسے چبا لیا ہے۔ کھانسنے کی بھی طاقت اُن کے بدن میں نہیں رہ گئی ہے۔ ڈاکٹر، وید یا حکیم، جس کسی سے بھی پوچھا، جواباً یہی کہتے ہیں کہ دمہ کا کوئی علاج نہیں ہے۔ بس طاقت کی دوا کھاؤ۔ یہاں چائے کیلئے چینی تک نصیب نہیں ہو پائی، دوائیں اپنے سر سے لیں۔" ماں کے جملے نشتر بن کر دل میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ دل کے زخموں سے ذرد رسنے لگتا ہے۔ پتا جی دس پانچ روپیوں کی چائے، چینی اور دس پانچ روپیوں کی دوا کیلئے محتاج رہتے ہیں۔ اپنی مجبوری پر مجھے خود شرم آتی ہے۔

"جب ضرورت ہو۔" میں کہتا ہوں۔ "مجھے کچھ پیسے بھیج دو، کر کے لکھ دیا کرنا۔"

"ان سے کہتی ہوں تو بگڑ جاتے ہیں، کہتے ہیں جتنی تنخواہ اُسے ملتی ہے، اُس میں وہ اپنا گزارا تو کر نہ پاتا ہوگا، اور اوپر سے ہم مانگنا شروع کر دیں۔"

ماں کی کھری کھری باتوں میں کہیں کوئی گھماؤ پھراؤ نہیں ہے۔

"نہیں۔ ایسی کیا بات ہے ماں۔ تم اُنھے بتائے بغیر خود ہی مجھے لکھ دیا کرو۔"

"کبھی کبھی ایسا بھی جی چاہتا ہے۔ اپنے لڑکے سے دکھ سکھ کیوں چھپائیں۔ یہی تو لڑکے کی کمائی کھانے، پہننے اور موج کرنے کے دن ہیں۔ پھر سوچتی ہوں، تم شائد خود ہی کچھ بھجوا دو گے۔ لکھوں تو کہیں بہو ناراض نہ ہو جائے۔"

"نہیں ماں۔ بہو کو بُرا کیوں لگے گا۔ وہ خود ہی جو کہتی ہے۔" میں اپنی بے بسی کو چھپانے کی کوشش کرتا ہوں۔

"خیر۔ ہماری فکر چھوڑو۔ بہو کی بات تو میں نے یوں ہی کہہ دی۔ تم اپنے بچوں کا خیال رکھنا۔ تم لوگ اچھے رہو گے تو ہمیں بھی خوشی ہوگی۔ تم لوگ ہو تو ہم بھی ہیں۔ اس عمر میں بیماری تو لگی ہی رہتی ہے۔" ماں کی اس ممتا کو دیکھ کر دل کی کڑواہٹ اندر ہی اندر بڑھ جاتی ہے۔ کئی بار جی چاہا کہ ماں اور پتا جی کو بھی اپنے ہی ساتھ رکھوں۔ گھر دیکھے دیکھے سے گا۔ مگر تبھی اپنی مجبوری کا خیال آ گیا تھا۔ ماں کچھ خاص بات کہنے کیلئے موقع ڈھونڈ کر آئی ہے کہاں بیاہی ہے۔ اس بات کو میں واضح طور پر محسوس کر رہا ہوں۔ اس بات کو لیکر تو میں سنگھ نوح سے چھٹی پر ایک بار آیا تھا تو ایک بڑا سا سوئیٹر تھا لے

پتاجی کو دے گیا تھا۔ پانچ سال سے کسی طرح پیوند لگا کر اُسے گھسیٹتے رہے ہیں۔ مگر اب اُس کی بکھیاں اُڑ گئی ہیں۔ پیوند بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ سوچا تھا تمہارا کوئی پُرانا سویٹر اُن کے لئے مانگ لوں گی۔ مگر تم بھی پُرانے کپڑے ساتھ لائے ہو۔"

ماں کے اِن الفاظ سے دِل ہی دِل میں بُری طرح کراہ اُٹھتا ہوں۔

لگتا ہے، چارپائی، چرخی کی طرح کمرے میں گھومنے لگی ہے۔ کمرے کی چھت آسمان کی طرف اُڑتی نظر آتی ہے، میرا گلا خشک ہو جاتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے جیسے برف کی سِلوں پر لِٹا دیا گیا ہوں۔

"نہیں لائے ہو تو کوئی بات نہیں۔ ایک انگوٹھی اُن کے ہاتھ میں سونے کی پڑی ہے۔ کئی دِن سے کہہ رہے تھے، اُنگلی میں گڑتی ہے۔ اب شان شوکت کے دِن بھی نہیں رہے۔ اُسے بیچ باچ کر کچھ کر لیں گے۔" ماں اُسی لہجہ میں کہتی رہی۔ کہیں کچھ مرچ مسالہ نہیں۔ کہیں کوئی گھماؤ پھراؤ نہیں۔ اگر ماں کے سلوک کو میں نہ جانتا، تو یہی لگتا کہ وہ مجھے چڑانے کے ڈھونگ کر رہی ہے۔ مگر وہ تو ماں کی صاف گوئی تھی۔ معصومیت تھی۔

پتاجی ماں کی یہ باتیں سن لیتے تو اُسے کھا جاتے۔ پتاجی وہاں نہیں تھے۔ دوسرے کمرے میں تھے۔ مجھے لگا بھادریوں کی مورتی کی طرح وہ آ کر میرے سامنے کھڑے ہو گئے ہیں۔ جگہ جگہ سے پھٹا کُرتا اٹھا کر وہ الگ الگ سانس کے ساتھ اُٹھتی بیٹھتی اپنی پسلیاں مجھے دکھا رہے ہیں۔ ایسا محسوس ہونے لگا کہ بھارت کا نقشہ آ کر میری آنکھوں کے آگے ٹنگ گیا ہے۔ .... جی چاہا، ماں سے کہہ دوں کہ ماں جاؤ۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، ابھی تم جاؤ۔ .... مگر نہیں کہہ پاتا ہوں۔

"حالانکہ" ماں پھر کہتی ہے "سونا گھر میں کہنے کو اِتنا ہی بچ گیا ہے۔ ایسے مرتے وقت منہ میں گنگا جل ڈالنے کیلئے رکھ دینے کو جی چاہتا ہے۔ باقی سب سارا زیور، پچھلے تین چار سال کے مسلسل قحط میں بِک گیا ہے۔ مگر دیکھا جائے گا۔ تم صحیح سلامت رہو گے تو سونا ہی سونا ہو گا۔"

"سونا نہیں ہو سکتا۔ اب کبھی نہیں ہو سکتا۔" میں کہنے ہی کو تھا، پھر سوچا میری اِس ذرا سی بات سے ماں کی بہت بڑی اُمید (جس کے جھوٹے سہارے وہ جی رہی ہے) ٹوٹ جائے گی۔ میں چُپ رہ جاتا ہوں۔

"میں نیا پُرانا کوئی سویٹر نہیں لایا ہوں ماں۔ صرف کوٹ ایک لیتا آیا ہوں۔ اِسی کو پتاجی کو دے دینا ہے" کھونٹی پر ٹنگے کوٹ کی طرف میں اشارہ کرتا ہوں۔

"کل، ایک کوٹ لے کر آئے ہو۔ وہ بھی یوں دے دو گے تو راستہ بھر ٹھنڈ کھاتے جاؤ گے کیا۔؟ ———— وہ بوڑھا جاڑا ابھی بغیر سویٹر کے برداشت کر لیں گے۔ مگر تم اگر راستے میں ٹھنڈ کھا جاؤ تو...... پردیس کی بات ٹھہری۔"

اِس بار ماں کی آواز میں ہلکی سی ڈانٹ چھپی ہے۔

میں چُپ رہ جاتا ہوں۔ چُپ اِس لئے نہیں رہتا کہ مجھے اپنے ٹھنڈ لگ جانے کا ڈر ہے۔ چُپ اِسلئے رہ جاتا ہوں کہ پُرانا کوٹ جس کا استر جگہ جگہ سے پھٹ گیا ہے۔ پتاجی کو دینے کی ہمت نہیں ہو پاتی۔ پھر وہاں پہنچتے ہی نئے کوٹ کا مسئلہ اُٹھ کھڑا ہو گا...... پورے ایک سو روپے کا مسئلہ۔ بات بدلنے کیلئے کہتا ہوں "پتاجی کے پاس جوتا نہیں دکھائی دیتا، جوتا ہے کہ نہیں ماں"

"جوتا۔" ماں اپنی دونوں ہتھیلیوں کو دونوں بغلوں میں دبا کر مسکرا دیتی ہے۔ اب شاید اُنہیں خود بھی یاد نہیں ہوگا کہ اُنہوں نے کبھی جوتے نہیں پہنے ہیں۔ "تایر سول کی چپل جانے اور وہ جانیں۔"

ایک ہلکی سی سرسراہٹ سارے بدن میں کوند جاتی ہے۔ تین تین چار چار جوڑے جوتے مونسے پتاجی کے پڑے رہتے تھے۔ آج اُنہیں ایک جوڑا جوتا بھی نصیب نہیں ہو پا رہا ہے۔ ہر سال گھر آتا رہا ہوں۔ کبھی اُنہوں نے نہیں کہا۔ اور نہ ماں ہی نے کہا۔

"اتنی کڑی سردی اور چپل! اُن کی چپل مجھے لا دینا۔ میں اُنہیں پہن کر چلا جاؤں گا۔ میرا جوتا ابھی نیا ہی ہے اسے اُنہیں میرے چلے جانے کے بعد دیدینا۔ یہ سب کچھ مجھے پہلے ہی کیوں نہیں بنا دیا ماں؟" میں ماں کو جھڑک کر کہتا ہوں۔

"تمہیں کیا کیا بتاؤں بیٹا۔ سب ٹھیک ہے۔ دو دن کیلئے اپنے گھر آتے ہو۔" ہنس بول کر لوٹ جاؤ تو اچھا ہے۔ یہ تو زندگی کے ساتھ ایسا ہی رہتا ہے۔ تم سکھی رہو۔ ہم سارے دُکھ بھوگتے رہیں گے۔" اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔

"ٹھنڈ بہت ہو رہی ہے۔" کہنا ہی پڑا۔ "تم جا کر اپنے بستر میں لیٹو۔"

"کل تو تم لوگ جا ہی رہے ہو۔ اور یہ ٹھنڈ تو کل سے ہمارے ساتھ ساتھ ہی رہے گی۔"

ماں کے اس عجیب سے جواب سے میرے گلے کی خشکی اور بڑھ جاتی ہے۔ پتاجی کی آواز سنائی پڑ رہی ہے وہ بچوں کو کوئی من گھڑت کہانی سنا رہے ہیں۔ بچے خوب ہنس رہے ہیں۔ اور ماں مجھے ..... "تم نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ کپڑے لتے کیا کیا ہیں؟"

میں سمجھ رہا تھا کہ ماں شاید ابھی وہ بات نہیں کہہ پائی ہے جس کیلئے اُس نے موقع تلاش کیا ہے۔ وہ بات کیا ہوگی۔ اپنی کوئی ضرورت بتانے آئی ہوگی۔ بیوی نے پہلے ہی مجھے بتا رکھا تھا کہ وہ اپنے ایک دو کپڑے جاتے وقت ماں کو دیتی جائے گی۔ سوچا، ماں کپڑوں کے لئے کچھ کہے گی تو بتا دوں گا۔ "تمہارے لئے کپڑے رکھے ہیں۔"

"کپڑے لتے۔" کہتے ہوئے ماں نے اپنے کپڑوں کو دیکھا۔ حالانکہ اُس کے کپڑوں کی حالت میں خود بھی روز دیکھتا ہی تھا۔ شاید اُس کے کپڑوں کو اس طرح دیکھنا ہی اُس کا منہ توڑ جواب تھا۔

"تم نے وہ قصہ نہیں سنا ہے۔" ماں مسکرا دیتی ہے۔

"کون سا ماں؟" میں پوچھتا ہوں۔

"تمہاری ہی طرح ایک لڑکے نے اپنی ماں سے پردیس جاتے ہوئے پوچھا تھا۔ ماں تمہارے لئے وہاں سے کیا لاؤں؟" دوسروں نے اپنی اپنی پسند کی چیزیں بتا دی تھیں۔ پھر تو جانتے ہو اُس کی ماں نے کیا مانگا تھا؟" ماں کی نگاہیں میرے چہرے پر گڑ جاتی ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ اُن کی آنکھیں دھیرے دھیرے گیلی ہو گئی ہیں۔

"کیا مانگا تھا؟" میں سراپا سوال بن جاتا ہوں۔

"اُس نے کہا تھا۔ بیٹا، میرے لئے ایک تھیلے میں جھوٹی تو کھائے گا، اُس کی جلی ہوئی پپڑیاں جمع

(بقیہ صفحہ ۳۴ پر دیکھئے)

ڈاکٹر عباس علی خاں لمعہ

اسرارِ زماں اور ہیں، اسرارِ مکاں اور
عقبیٰ کی بصیرت میں ہے پندارِ جہاں اور

یا کنجِ عدم جب مرا مقصود تھا موجود
مشہود کے پردے میں تھا شاہد کا نشاں اور

ساغر کا چھلکنا تھا کہ پندار کا آغاز
کہتا تھا وہی دل جو نہ کہتی تھی زباں اور

صورت گرِ انساں کا تیقن جو ہوا میں
سیرت کی تجلی میں تھا صورت کا گماں اور

نے زیر ہے نے بم ہے نہ آغاز نہ انجام
کہتا ہے ضمیر ایک تو سنتی ہے زباں اور

اک ذوقِ مسلسل ہے کہ یہ مرگِ گراں ہے
مر کر بھی تیری یاد میں جیتا ہے وہاں اور

محبوسِ خلائق ہوں وہ انکار سے میرے
وہ سوزِ دروں دے کہ فغاں کی ہو زباں اور

مقصود پرستش تھی، خدا کی پسِ پردہ
کافر کو سمجھ آیا نہ جز سنگِ گراں اور

اک سحر ہے، اک جوششِ عبادت کا تقاضا
"کافر کی اذاں اور ہے مومن کی اذاں اور"

پابندِ نظر کر کے میں حسنِ ازلی کو
رکھتا ہوں رخِ حسن کو آنکھوں میں نہاں اور

اقبال ہو، رومی ہو کہ غالب ہو کہ لمعہ
ہے سب کی فغاں ایک تو اندازِ بیاں اور

اعجاز صدیقی

بھاگو کے کدھر محشرِ آفات سے ڈر کر؟
جاؤ گے کہاں سختیٔ حالات سے ڈر کر!

رُخ اپنا بدل لیں گے یہ جذبات کے دھارے
حاصل نہیں کچھ شورشِ جذبات سے ڈر کر

نعروں سے وہ اظہارِ خیالات کرے کیا؟
رہ جائے جو خود اپنے خیالات سے ڈر کر!

ذہنوں کو بدلنا ہے تو اک ضرب لگاؤ!
ہو کیوں لیے چپ کہنہ روایات سے ڈر کر!

موسم کی ہیں سوغات، وہ اولے ہوں کہ بوندیں
کیوں گھر میں چھپے بیٹھے ہو برسات سے ڈر کر!

چمکے گا بہر طور نئی صبح کا سورج!
نومیدِ سحر کوئی نہ ہو رات سے ڈر کر

کچھ لوگ بھری بزم میں دانستہ ہیں خاموش،
تنقیدِ سوالات و جوابات سے ڈر کر!

سنتے ہیں کہ ہو کر رہی وہ بات بالآخر!
ہم بزم سے اٹھ آئے تھے جس بات سے ڈر کر!

ہر غم سے لیا ایک نیا حوصلۂ زیست
اعجاز رہے ہم نہ غمِ ذات سے ڈر کر

ایم۔ اے۔ نصر

میر کے بہتّر نشتر

"میر کے بہتر نشتر" کے بارے میں متضاد رائیں ہیں۔ اِس باب میں اصحاب رائے نے مکمل خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔ اگر کبھی کسی طرف سے ہلکی سی آواز سنائی بھی دیتی ہے تو اُس کا اظہارِ بیان اُلجھا ہوا ہوتا ہے جس کا مقصد اُلجھی ہوئی گتھی کو سلجھانا نہیں، بلکہ گول مول بات کہہ کر محض اپنی جان چھڑانا مقصود ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میر کے نشتروں نے ایک مسئلے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ وہ بھی ایک ایسا مسئلہ، جس میں کوئی اُلجھنا نہیں چاہتا۔ اگر کوئی اِس اُلجھی ہوئی ڈور کو سلجھانے کی سعی کرتا بھی ہے تو پرانے تذکرہ نویسوں کے متضاد بیانات کا شکار ہو جاتا ہے اور نتیجے کے طور پر وہ جن تذکرہ نویسوں سے متاثر ہوتا ہے، اُن کے خیال کی مناسبت سے خود بھی اظہارِ خیال کر دیتا ہے اور اپنی ذاتی رائے کو پیش کرنے سے گھبراتا ہے اور اپنی اِس خامی کو چھپانے کے لئے اپنے سحر طراز قلم سے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیتا ہے کہ لوگ اُس کی بھول بھلیّوں میں کھو جاتے ہیں اور مصنّف کی ذاتی رائے جاننے کا خیال اُن کے ذہن سے محو ہو جاتا ہے۔

اِس میں شک نہیں کہ میر تقی میر کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور مختلف انداز سے اُن کی زندگی کے لطیف گوشوں اور اُن کی حیات و شاعری پر موثر انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ مگر چند باتوں میں قدیم تذکروں کی تحریر کو سچ مان لیا گیا ہے اور مختلف پیرایوں میں اُن ہی کے الفاظ کی تائید کی گئی ہے۔ "بہتر نشتر" بھی اُن بہت سی غلط لیکن مشہور روایتوں میں سے ایک ہے۔

میر جیسا شاعر، جس نے اپنی تمام زندگی کو شاعری کے لئے وقف کر دیا تھا اور شاعری اُس کی زندگی کا اہم جزو بن گئی تھی، جس پر یہ مقولہ حرف بہ حرف صادق آتا ہے کہ "تصنیف مصنّف کی زندگی ہوتی ہے۔" اور بقول مولوی عبدالحق "جو شخص میر کے حالات اور اُن کے اخلاق و سیرت سے واقف نہ ہو، وہ اُن کے تمام کلام کو پڑھ کر بغیر کسی تذکرے کی مدد کے خود بخود اُن کی طبیعت کی اُفتاد اور مزاج کو تاڑ جائے گا۔" اور رام بابو سکسینہ کے بقول "میر کی زندگی درد و الم کی زندگی ہے۔" اور سکسینہ نے انگریزی شاعر شیلی کی یہ سطور بھی نقل کی ہیں کہ "حرماں نصیب لوگ غلطی سے گہوارہ ... میں ڈال دیئے جاتے ہیں، جو مصیبت تو خود جھیلتے ہیں، مگر وہی مصیبت نظم میں دوسروں کو سناتے ہیں۔"

ایسا شاعر جو اُردو غزل کا سرتاج ہو اور جس کی مدح و ستائش میں بقول نثار احمد فاروقی (مترجم ذکرِ میر) "اُن کی خدائی کے حضور ایسے ایسے سرکشوں نے اپنی بندگی کا اظہار کیا ہے جن کا مسلک مختلف ہی نہیں، بلکہ متضاد ہے۔" ایسے

بہ عظمت شاعر کے کلام کی عظمت کو صرف "بہتر اشعار" میں مقید کر دینا کیا صحیح ہو سکتا ہے؟ ممکن ہے میر کے کلام کے بارے میں آزردہ کی یہ رائے درست ہو کہ "پستش بغایت پست و بلندش بغایت بلند است" لیکن اس بات سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ میر کے پست کلام تک بھی دوسروں کی رسائی ممکن نہیں ہے۔

اگر میر نے اپنے زمانے کے ماحول سے متاثر ہو کر فارسی کی تقلید کی ہے اور نتیجتہً کچھ پست اشعار کہے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اُن کی شاعری میں تصنع زیادہ ہے اور صرف آورد ہی آورد ہے "آمد" کا پتہ ہی نہیں ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یہ کہنا کہ آورد کا غلبہ ہے، صحیح نہیں ہے۔

اِس نظریے کے زیرِ اثر کوئی رائے قائم کر کے اُن کے اچھے اشعار کی تعداد کو محدود کر دینا، ایک بے معنی سی بات ہے اور میر کے ساتھ صریحاً ظلم ہے۔ زندگی ہمیشہ ہوائے سرد و گرم سے متاثر ہوا کرتی ہے۔ ہر آنے والا لمحہ انسانی زندگی میں انقلاب کا باعث بنتا ہے۔ ٹھیک اِسی طرح ادبی زندگی کا بھی حال ہے۔ یہ بھی ہر دور کے اثرات کو قبول کرتی ہے اور اُس پر زمانے کی بدلتی ہوئی روِش کا خاطر خواہ اثر پڑتا ہے اور یہ اپنے ذہن پر اُن کے اثرات کو مرتب کرتی ہے اور اِس طرح ہر آنے والا زمانہ ایک نئے اضافے کا سبب بنتا ہے اور اپنے ماضی و حال کے اِن اثرات کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے جو اُس کے مزاج کے موافق ہوتے ہیں۔

شاعر بھی انسان ہوتا ہے اور انسانی زندگی کا یہ خاصہ ہے کہ وہ ہوائے سرد و گرم سے متاثر ہوا کرتی ہے اور میر بھی ایک انسان تھے۔ اگر اُنہوں نے اپنی ڈگر سے ہٹ کر ماحول کا کہیں ساتھ دیا تو یہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو یہ بے حسی ہوتی اور کوئی بھی شاعر بے حس نہیں ہوتا ــــ کیونکہ جذبات ہی اُس کا قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں جس کی بدولت وہ بلندی پر پہنچتا ہے اور "جزو لیست از پیغمبری" کا لقب پاتا ہے۔

اُردو تذکروں میں 'آبِ حیات' کی اہمیت مسلّم ہے۔ اِس تذکرے میں میر کے نشتروں کے بارے میں آزاد نے اِن لفظوں میں اظہارِ خیال کیا ہے: "اُردو زبان کے جوہری قدیم سے کہتے آئے ہیں کہ ستّر اور دو "بہتر نشتر" باقی میر صاحب کا تبرک ہے"۔ لفظ جوہری اِس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ آزاد کے پاس اپنے الفاظ کی تائید میں کوئی مستند ثبوت نہ تھا، بلکہ انہوں نے سنی سنائی باتوں پر نشتروں کی بنیاد رکھی ہے۔ اگر اُن کے ذہن میں کوئی ایسی مستند تحریر ہوتی جو اُن کے قول (بیان) کی تائید کرتی تو وہ ضرور اُس کو نقل کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انشا پردازی کی دُھن میں آزاد نے اِس باب میں بھی مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے اور ایک غلط بات میر سے متعلق بیان کر دی ہے۔

دراصل یہ ایک محمد حسین آزاد کی رنگین بیانی کی دین ہے۔ آزاد کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ اُنہوں نے انشا پردازی کو حقیقت پر مقدم رکھا ہے۔ گویا اُن کے یہاں تحریر کے تابع خیال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے ایسے فرضی واقعات کو بھی دہرا لیا ہے جو سراسر غلط باتوں ہی پر مشتمل کیوں نہ ہوں۔ بقول شخصے "آزاد کا بیان سو فیصد حقیقت پر مبنی نہیں ہے"۔ نشتروں کے بارے میں بھی آزاد نے سنی سنائی باتوں کو مدِ نظر رکھا ہے اور اُس کی بنیاد بھی اِن ہی غلط مگر مشہور مروجہ باتوں پر رکھی!

اور آزاد کا یہ کہنا کہ "..... لیکن یہ بہتر کی رقم فرضی ہے، کیونکہ جب کوئی تڑپتا ہوا شعر پڑھا جاتا ہے تو ہر سخن شناس بے مبالغے میں یہی سنا جاتا ہے کہ دیکھیے یہ انہیں بہتر نشتروں میں سے ہے"۔ آزاد کا اِس طرح کھلے لفظوں میں بہتر نشتروں میں سے منسوب روایت کو فرضی گردانا اِس بات کا شاہد ہے کہ آزاد خود بھی اپنی اِس بات سے

مطمئن نہیں تھے اور اسی بے اطمینانی کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے بوکھلا کر ڈھکے چھپے لفظوں میں اپنی غلط بیانی کو تسلیم کر لیا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آزاد نے ایسا کیوں کیا؟ بظاہر تو اس میں کوئی خاص وجہ نظر نہیں آتی ہے، مگر ذہن پر زور ڈالنے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ آزاد کی اس غلط بیانی کا محرک کون ہے؟ یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ 'آبِ حیات' میں آزاد نے ذوق کو کس قدر بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے، اس کی وجہ ذوق سے اُن کا دلی لگاؤ ہے اور ذوق، سودا سے بہت متاثر تھے، لہٰذا یہ قدرتی بات ہے کہ آزاد بھی اُن سے متاثر ہوئے۔

میر کے سامنے سودا کی شمعِ شاعری مدھم تھی۔ سودا خود کو میدانِ غزل کا لاکھ بڑا شاعر سمجھیں اور اُن کے معتقدین کے خیال کی تائید میں لاکھ سر پٹکیں مگر یہ حقیقت ہے کہ میدانِ غزل میں میر نے سودا کو مات دے دی تھی اور اُن کا رُتبہ بلند ہے۔ ممکن ہے میر کی گرفت کو کمزور کرنے اور اُن کے زور کو گھٹانے اور سودا کو اُن کا ہم پلّہ بنانے کی جستجو میں آزاد سے ایسی حرکت سرزد ہوئی ہو تو کوئی تعجب نہیں ہے۔

تاریخ ادبِ اُردو کے مصنف کے بقول "اُن (میر کے)، وہ اشعار جو بہتّر نشتر کے فرضی نام سے مشہور ہیں، سب کے سب انہیں کے سچے اور دلی جذبات کا پرتو ہیں.... مگر سچ پوچھئے تو اُن کے صدہا ایسے اشعار نکلیں گے، جن میں حقیقی شاعروں کے اوصاف بدرجۂ احسن موجود ہیں۔"

اِن کے علاوہ بھی بہت سے تذکرہ نویسوں نے ڈھکے چھپے اور صاف لفظوں میں اِس کو 'فرضی' گردانا ہے اور اِن حضرات نے اِس بات پر بھی افسوس ظاہر کیا ہے کہ میر کے اچھے اشعار کو اِس قدر محدود سمجھنا میر کے ساتھ ناانصافی اور ظلم کے مترادف ہے۔

پُرانے اہلِ قلم حضرات کے علاوہ اُبھرتی ہوئی نئی پود نے بھی اِس کی مذمت کی ہے جن میں دو صاحبان کی رائے مجھے بہت پسند آئی ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ "دریا کو کوزے میں بند کیا جا سکتا ہے، سمندر کو نہیں اور میر ایک بیکراں سمندر ہیں۔" اور اِس باب میں دوسری رائے یہ ہے: "میر کی شاعری ایک ایسے سمندر کی مانند ہے جو اپنے دامن میں خس و خاشاک کو سمیٹے ہوئے بہتا ہے۔"

واقعی میر کی شاعری 'ایک بیکراں سمندر ہے' جو اپنے دامن میں ایک اتھاہ گہرائی رکھتی ہے۔ محض اُس سے اُبھرتے ہوئے چند بلبلوں کو دیکھ کر کوئی رائے قائم کرنا دانشمندی سے بعید ہے۔ اگر سمندر کی سی وسعت رکھنے والی شاعری میں کچھ خس و خاشاک آگئے ہیں تو اِس کے لئے شاعر کو کم توقیر نہیں گردانا جا سکتا اور نہ ہی اُس کے فن کو محدود کیا جا سکتا ہے۔ نہ ہی کچھ خامیوں کے پیشِ نظر اُس کے کلام کی خوبیوں کے بارے میں غلط رائے قائم کی جا سکتی ہے، بلکہ کوئی بھی رائے قائم کرتے ہوئے ایک ترازو کے دو پلڑوں پر اُس کی خوبیوں اور خامیوں کو رکھ کر یہ دیکھنا ہوگا کہ کس کا پلّہ بھاری ہے۔

ہمارے ادب کے کرم فرماؤں کو چاہیئے کہ وہ اپنی تنقیدی و تحقیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے، حقیقت اور مجاز کو اِس طرح الگ کر دیں جیسے دودھ اور پانی ـــــ کیا ہمارے دانشور حضرات میر کے بہتّر نشتر پر روشنی ڈالنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے؟

پروفیسر عابد عالمی ایم۔اے

بہت اُداس، بہت سوگوار ہو، یعنی
تمہیں خیال کی وادی بھی راس آ نہ سکی!

تمہاری آنکھوں میں لرزاں ہیں یاس کے سائے،
تمہارے چہرہ پہ بیٹھی ہے زندگی کی تھکن
تمہارا جسم فغاں کا مزار لگتا ہے
شکست اتنی تو مہلک نہیں ہوا کرتی!
یہ مات کھائی ہوئی کاوشوں کا سونا دیار!
تمہاری آنکھیں کہاں سے لیے اُٹھا لائیں؟

خرد کے اپنے دُھندلکے، جنوں کا اپنا غبار،
تمہاری چشم دُھندلکوں کو پار کر نہ سکی!
شکست خوردہ ارادوں کے کم خیال اسیر!
تمہاری راہ میں کیا کم تھے وحشتوں کے مقام!
کسی بگولہ کو اِک لمحہ رہنما کر کے
کہیں بھی اپنا مقدر بدل لیا ہوتا

نفس نفس ہے نئی آزمائشوں کا عمل
قدم قدم ہے تقاضائے آفرینشِ نو

یہ کارواں جو فلک پہ ہے گردشات میں گم
اِک اجنبی سی زباں میں پکارا کرتے ہیں
وہ کم نصیب ہیں جو اِن کو سُن نہیں سکتے
ہر ایک ذرہ کے قدموں میں رینگتی ہے تھکن
مگر تمہاری طرح کوئی ہارتا ہے کبھی؟

دیارِ یاس میں چھپ کر سکوں نہیں ملتا
تمہیں خبر ہے سکوں حصۂ حیات نہیں

مَیں سوچتا ہوں، مگر میرے سوچنے سے کبھی
تمہارا وقت سے رشتہ سنور نہیں سکتا
یہ حادثے بھی ہیں کیوں اتنے بے اثر؟ آخر
تمہارے ذہن سے وحشت کا کب گزر ہوگا؟

تمہارے ذہن کا ماحول تھک چکا ہوگا!
تھکن تمہاری معاون نہ ہو سکے گی، مگر
تھکن تمہارے سفر سے جدا نہیں ہوگی
تم آج رات کے خوابوں پہ اِک نظر کرنا
تمہاری راہ میں صرف ایک کائنات نہیں!

پرل بک (انگریزی)

(ترجمہ: سُرجیت)

چاندی کی تتلی

آج میں آپ کو اپنی ماں کے متعلق بتاؤں گا۔ چین کے قدیم تہذیب و تمدن نے ماں کو بڑی اہمیت دی ہے۔ جب فوجیں چین کے دیہات میں سے جوان لڑکوں کو زبردستی پکڑ کے لے جاتی ہیں۔ اُس وقت وہ دُوسرے کسی کو نہیں ، اپنی ماں کو پکارتے ہوئے رو پڑتے تھے۔ یانگ تسی دریا کے کنارے ہمارا ایک میلا کچیلا گاؤں تھا۔ گھر ایسے تھے جیسے وہ بنائے نہ گئے ہوں۔ صرف اُن کا ایک انبار سا لگا دیا گیا ہو۔ ہمارا گھر جیسا بھی تھا، گاؤں کا سب سے اچھا گھر تھا، کیونکہ ہم کچھ خوش حال لوگ تھے۔ ہمارے پاس کم از کم بیس ایکڑ زمین تھی اور میرے باپ کا رُعب صرف اس زمین کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ اُس کی ایک بہت خوبصورت داشتہ کی وجہ سے تھا۔ وہی میری ماں تھی۔

میرا ایک بھائی بھی تھا۔ لیکن وہ پانچ برس کی عمر ہی میں مر گیا تھا۔ میری پیدائش اُس کے بعد ہوئی۔ مجھے ہمیشہ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے میری ماں مجھ سے کہیں زیادہ میرے اُس مرحوم بھائی کو پیار کرتی تھی۔ شاید اِس لئے کہ وہ بیٹا اُس کی جوانی کا خواب تھا اور میری پیدائش کے وقت میری ماں کی عمر ڈھل چکی تھی۔ لیکن اِس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ میری جانب سے کچھ لاپروا تھی، بلکہ وہ ہمیشہ میرے زمیندار باپ کو تاکید کرتی تھی کہ وہ میرا اتنا ہی خیال رکھے جتنا وہ اپنے قانونی بچوں کا رکھتا ہے۔ اِس لئے میں اپنی ماں کا ممنون ہوں۔

پھر زمانہ بدلا اور نئی نسل کے لوگوں نے میرے باپ کو حراست میں لے لیا، صرف اس لئے کہ وہ زمیندار تھا۔ سبھی زمینداروں پر کسانوں نے اِلزام دھرے تھے اور میرے باپ پر بھی۔ وہ بھول گئے تھے کہ میرا باپ اُن کے مشکل وقت میں اُن کی کیسے امداد کرتا تھا۔ فصل کی کٹائی کے موقع پر کیسے اپنا حِصّہ چھوڑ دیتا تھا۔ اُن کے لڑائی جھگڑے کا فیصلہ کرتا تھا اور اپنی جیب سے بھی مدد کرتا تھا۔ لیکن یہ شاید اُن کا زیادہ قصور نہ تھا، کیونکہ وہ اگر کوئی الزام نہ لگاتے تو نئی نسل کے ہاتھوں سے وہ خود سزا بھگتتے۔

سبھی زمینداروں کو مر جانا چاہیئے تھا تاکہ نئے سماج کی بُنیاد مضبوط ہو سکے۔ ہمارے اپنے باغیچے ہی میں ایک اُونچے درخت کے ساتھ میرے باپ کو اُلٹا باندھ دیا گیا تھا اور اُس کی جیتے جی کھال اُتاری گئی تھی اور ہم سب کُنبے کے لوگوں کو زبردستی سامنے کھڑا کر کے سب کچھ دِکھایا گیا تھا۔۔۔۔

پھر میرے باپ کی بیوی کو اور اُس کے بچوں کو کہاں بھیج دیا گیا، مجھے پتہ نہ چلا۔ میں، میری بیوی اور میری ماں کو ایک کوٹھری میں بند کر دیا گیا تھا۔ اِس کوٹھری میں پہلے ہمارا چوکیدار رہتا تھا۔ مجھے ایک کو آپریٹیو دکان

میں بہی کھاتہ سنبھالنے کا کام دیا گیا۔ کیونکہ میں کچھ پڑھا لکھا تھا۔ اِس کے علاوہ دریا کے کنارے بنیادوں کی کھدائی کے لئے بھی مجھے کئی گھنٹے لگنا پڑتا تھا۔ بتایا گیا کہ وہاں ایک پُل کی تعمیر ہوگی۔ کنارے کی مٹی ایسی تھی کہ موسم گرما میں سُوکھ کر پتھر کی سی ہوگئی تھی۔ میری بیوی کو بھی میرے ساتھ اِس کام پر لگا دیا گیا تھا۔ ہم جب رات کو گھر لوٹتے تھے تو ایک دُوسرے کے ساتھ بات چیت کرنے کی طاقت بھی ہمارے جسموں میں سے نچوڑ چکی ہوتی تھی۔

سب سے زیادہ ہمارے لئے روٹی کا مسئلہ تھا۔ میری بوڑھی ماں سارا دن گھر رہتی تھی۔ میرے باپ کی بھیانک موت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اُس کا دماغی توازن جاتا رہا تھا' اِس لئے وہ کوئی کام کرنے کے قابل نہیں رہی تھی اور اسی لئے اُسے روٹی کا راشن نہیں ملتا تھا۔ میں اور میری بیوی اپنا راشن اُس کے ساتھ بانٹ لیتے تھے' اِس لئے تینوں ہر روز بھوکے رہتے تھے۔ یہ راشن کا راز صرف ہم کو معلوم تھا۔ لیکن ماں ہر روز حیران ہوتی تھی کہ گھر میں پیٹ بھر کے کھانے کو کیوں نہیں پکتا۔ مچھلی اور سُور کا گوشت اِس سے قبل ہر روز اُس کے کھانے میں شامل ہوتا تھا۔ لیکن اب اُس کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ ہم گوشت کیوں نہیں پکاتے۔ راشن کے مطابق ہم کو مہینے میں ایکبار گوشت ملتا تھا۔ وہ بھی اتنا تھوڑا کہ ہم وہ سارا ماں کے سامنے رکھ دیتے تھے۔ لیکن ماں پھر بھی حیران ہوتی کہ ہم دیگچی بھر کے گوشت کیوں نہیں پکاتے۔

ہمیں پوری مزدوری کبھی نہیں ملتی تھی۔ بتایا جاتا تھا کہ اُس کا کچھ حصّہ ہمارے نام جمع ہو رہا ہے مگر وہ حصّہ کیوں جمع ہوتا تھا اور کہاں جمع ہوتا تھا' ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا۔ ہم سب صرف اتنا جانتے تھے کہ ہمیں ایک شخص کے طور پر نہیں بلکہ ایک وسیع گروہ کی صورت میں زندہ رہنا ہے۔ میں بہت ہوشیار ہو کر رہتا تھا لیکن میری ماں کئی بار ہمیں مصیبت میں ڈال دیتی تھی۔ ایک بار تو بہت ہی بڑی آفت آ پڑی تھی۔ بات یہ ہوئی کہ میں اور میری بیوی کام پر گئے ہوئے تھے۔ ہماری غیر موجودگی میں ہمارے گھر کسی کو جاسوسی کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ بے چاری ماں کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ بہت دنوں کے بعد گھر میں کوئی آیا تھا۔ ماں نے پُرانی عادت کے بموجب اُس کی خاطر تواضع کی۔ اُس کے لئے چائے بنائی تو پورے چار اونس چائے کی پتی صَرف کر ڈالی۔ میری بیوی نے کچھ چاول بچا کر رکھے تھے۔ ہماری پوری ایک دن کی خوراک۔ ماں نے اُس کا پلاؤ بنا کر مہمان کو کھلا دیا۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم پر ذخیرہ اندوزی کا الزام لگایا گیا ۔ ۔ ۔ ۔ کمیون کے ملازم آئے اور ہمارے برتن اُٹھا کے لے گئے کہ ہم گھر میں روٹی بنا کر کھانے کے بجائے مشترکہ باورچی خانہ میں کھانا کھائیں۔ میری بیوی کو مشترکہ باورچی خانے میں روٹی پکانے کی ملازمت مل گئی۔ میں صبح دکان پر چلا جاتا۔ دوپہر کو بنیادیں کھودتا اور شام کو کمیون کی سبھا میں بھی ضرور پہنچنا پڑتا تھا۔ اُس کے بعد مشترکہ باورچی خانے میں کھانا کھانے کے لئے جاتا۔ مجھے اور میری بیوی کو کھانے کا ایک ایک ٹکٹ مل گیا تھا۔ لیکن میری ماں کیونکہ کوئی کام نہیں کرتی تھی اِس لئے اُس کے کھانے کے لئے کوئی ٹکٹ نہیں ملا تھا۔ یہ بہت بڑا مسئلہ تھا۔ میں کمانڈر سے ملا۔ لیکن اُس نے کہا کہ میری ماں کو اِس حالت میں کھانے کا ٹکٹ نہیں مل سکتا۔ میں نے اُس کو بتایا کہ میری ماں کا دماغی توازن ٹھیک نہیں ہے' اِس لئے وہ کوئی کام نہیں کر سکتی۔ لیکن کمانڈر نے اُس کو بچوں کی ایک نرسری میں کچھ دیکھ بھال کا کام کرنے کا مشورہ دیا۔

میں نے ماں کو اس کام پر بھیجدیا۔ اس کے بغیر کھانے کا مسئلہ کسی طرح بھی حل نہیں ہو سکتا تھا۔

کھانے کا ٹکٹ مل گیا لیکن عجیب مصیبتیں شروع ہو گئیں۔ یہ شاید نہ ہوتیں اگر وہ نرسری ہمارے ہی پرانے مکان میں نہ بنی ہوتی۔ ماں کے حواس ٹھیک نہیں تھے۔ وہ مکان کو پہچان نہیں سکتی تھی۔ پھر بھی بیٹھے بیٹھے اُس کو یوں معلوم ہوتا جیسے اُس نے یہ مکان کبھی کہیں دیکھا ہو۔۔۔۔

مکان کی شکل بالکل بدل چکی تھی۔ باغیچہ تباہ ہو چکا تھا۔ پہلے اُس میں پارٹی کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ پھر یہاں ٹوکریاں بنانے کا کارخانہ کھولا گیا تھا۔ فوجیوں کی بارکوں کی صورت میں اس کا استعمال کیا گیا تھا اور اب یہاں نرسری کھولی گئی تھی۔ ماں کی دماغی حالت نے اس کی نئی ہی شکل اپنے تصوّر میں بنا لی تھی کہ وہ زمیندار کی بیوی ہونے کے بجائے چونکہ صرف داشتہ تھی، لہٰذا اُس کو پورا احترام جگہ نہیں دی گئی تھی اور نرسری کے تمام بچے زمیندار کے بچے تھے۔ ایک دن اُس نے نرسری کی نگران خاتون سے صاف صاف کہہ دیا کہ اُس کے ساتھ نوکروں کا سا سلوک نہ کیا جائے۔ وہ مالکن تھی اور وہ باہر باغیچے میں دھوپ میں کرسی بچھا کر بیٹھے گی اور اُس کے لئے ٹرے میں چائے رکھ کے باغیچے میں لائی جائے۔

حاکم خاتون کے مزاج میں صبر و استقلال نہ تھا لہٰذا بات بہت آگے بڑھ گئی لیکن میں نے کسی طرح اُس کی منت سماجت کر کے اُس کو کچھ ٹھنڈا کر دیا اور بات رُک گئی۔ لیکن کچھ ہی دن گذرے تھے کہ نرسری میں پانچ برس کا ایک پیارا سا بچہ لایا گیا۔ میری ماں نے جُوں ہی اُس کو دیکھا، اُس کو لگا جیسے وہ اُسی کا بچہ ہو جو پانچ برس کی عمر کا اُس کے پاس سے کبھی چھن گیا تھا۔۔ میری ماں کو اُس بچے سے پیار ہو گیا۔ یہ ایک بہت بڑا جرم تھا کیونکہ ہمیں تربیت دی گئی تھی کہ ہم بچوں سے پیار نہ کریں۔ پیار کرنے سے بچے کمزور ہو جاتے ہیں اور پیار کے احساس میں سے ایک شخص کا تصور کرتے ہیں جو اُن سے پیار کرتا ہے۔ اُن کو کسی بھی شخص کے بارے میں نہیں بلکہ صرف ایک جماعت کے متعلق سوچنے کی عادت ڈالنی چاہیئے۔۔۔ چھوٹے بچے جب اپنی ماؤں کو بہت یاد کرتے تھے تو اُن کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا، ایک ہی علاج تھا کہ اُن سے بہت کام کروایا جائے۔ جھاڑو دینے کا، کوڑا ڈھونے کا، گھاس کھودنے کا۔۔۔۔ لیکن وہ بچہ جس کے ساتھ میری ماں کو پیار ہو گیا تھا وہ بہت ہی کمزور تھا اور ہر وقت رونے والا بچہ تھا۔ ایسے بچوں کے لئے کام کے بوجھ کا مزید اضافہ کر دیا جاتا تھا۔ لیکن جب وہ بوجھل کام پر لگایا جاتا تو ماں سے نہ دیکھا جاتا۔ ماں اُس کے بجائے خود کام کر دیتی تھی۔ لہٰذا ماں کو دھمکیاں دی جانے لگیں کہ اس کو نرسری کے کام سے ہٹا کر کہیں دوسری جگہ بھیجدیا جائے گا۔ لیکن ماں وہاں سے کہیں بھی جانے کے لئے تیار نہیں تھی۔ وہ بچے کو آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دے سکتی تھی۔۔۔ بہت سمجھانے پر وہ دن کے وقت بچے سے دور رہتی، لیکن رات ہوتے ہی وہ بچے کو چھاتی سے لگا لیتی۔ ماں نے اپنے آپ کو پھر زمیندار کی داشتہ سمجھ لیا تھا اور بچے کو اپنا اصلی بیٹا۔۔۔

ماں ایک دن فرش دھو رہی تھی کہ اُس کی کچھ یادداشت لوٹ آئی۔ زمینداری کے دنوں میں کچھ ہیرے اُس کے پاس تھے جو اُس نے افراتفری کے دنوں میں ایک کمرے میں دبا دیئے تھے۔ اب اُسی کمرے کا فرش دھوتے ہوئے جیسے نیند میں چلتی ہوئی وہ اُس کونے کو کھودنے لگی جہاں ہیرے

دبار کھے تھے۔ ہیروں کا کیا بنا۔ اُس نے کہاں پھینکے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں لیکن اُن میں ایک چاندی کی تتلی بھی تھی جس پر مینا کاری کا کام بنا ہوا تھا اور چھوٹے چھوٹے ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ یہ میں نے اپنی آنکھوں سے وہی دیکھی تھی جس دن میری ماں کو عدالت میں پیش کیا گیا۔

شروع میں ماں نے اس تتلی کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتایا۔ اس کو اپنی اندرونی چولی میں کہیں چھپا لیا۔ اُس سے اگلے دن جب اُس بچے کے ہاتھ کو چوٹ لگ گئی۔ بچے کو گھاس کھودنے کے لئے ایک تیز کھرپی دی گئی تھی اور وہی بچے کے ہاتھ میں لگ گئی تھی اور وہ لہولہان ہو گیا۔ جب اسپتال لایا گیا تو ماں کسی طرح اُس کے تعاقب میں اسپتال پہنچ گئی۔ بچہ کسی طرح خاموش نہیں ہو رہا تھا۔ ماں نے اُس کو اُٹھایا اور ایک ویران گوشے میں لے گئی اور اُس کو بہلانے کے لئے اُس نے چولی میں چھپائی ہوئی تتلی نکال کر اُس کے ہاتھ میں تھما دی۔ بچہ اُس دن بھی بہل گیا اور بعد میں بھی ماں سے تتلی مانگ کر اُس کے ساتھ کھیلتا رہا۔

ایک دن بچے نے وہ تتلی اپنے ایک ہم عمر لڑکے کو دکھا دی تھی اور ہم عمر لڑکے نے نرسری کی افسر خاتون کو اس کی خبر دے دی۔ ایسی کوئی خبر دینے والے بچوں کو شکر کی ایک ٹکی انعام میں دی جاتی تھی۔

بات آگے پہنچ گئی۔ بچے کی بہت پٹائی کی گئی اور اُس کو بتایا گیا کہ کسی بچے کے پاس بھی کسی ایسی چیز کا ہونا جرم ہے جو سب کے پاس نہ ہو۔

ماں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ایسے جرم کی سزا موت ہونی چاہیئے تھی، مگر کمیون نے ترس کھا کے صرف یہ سزا سنائی کہ اگلے اجلاس میں ماں کی سر عام بے عزتی کی جائے ....

اجلاس کے دن بھیڑ میں مَیں بھی تھا۔ مجھے ضرور ہونا چاہیئے تھا۔ ماں کو اجلاس میں لایا گیا۔ اُس کے ہاتھ اُس کی کمر کے پیچھے باندھے ہوئے تھے اور ہماری بھیڑ کو حکم دیا گیا کہ وہ جس وقت ہمارے سامنے سے گذاری جائے ہر ایک آدمی اُس کو تھپڑ مارے اور ایک نعرہ لگائے کہ وہ دُنیا میں سب سے ذلیل عورت ہے....

مُکے اور تھپڑ ایک ہی بار برس پڑے۔ ماں زمین پر گر پڑی۔ اس کا مطلب تھا کہ اُس کو لاتوں سے مارنے کا وقت آ گیا تھا...

میری باری بھی آئی اور میری لات کو کاٹنے کا جرم کرنے کا حق حاصل نہ تھا...

میری بیوی اس "سزا" کو بھگتنے سے بچ گئی، یہ کہہ کر کہ روٹی پکانے کے لئے اُس کا مشترکہ روٹی گھر میں رہنا ضروری تھا۔ سب کو رات کا کھانا کھلا کے وہ چھپتی ہوئی نرسری میں گئی۔ تب تک ماں کو نیم مُردہ حالت میں واپس وہاں پہنچا دیا گیا تھا۔ اُس دن اُس بچے کو بھی مار مار کے اُنہوں نے بے ہوش سا کر دیا تھا اور ماں نے وہاں پہنچتے ہی بچے کو اپنی چھاتی سے لگا لیا تھا اور پھر ایک چٹائی پر لیٹی ہوئی اُس بچے کے ساتھ باتیں کرتی کراہتی رہی تھی۔

میری بیوی کے کانوں میں ٹوٹے پھوٹے جملے پڑتے رہے۔ وہ بچے سے کہہ رہی تھی "آج میں اپنے بیٹے کے لئے بوجھل بن گئی... اُس نے مجھے لات ماری... تو چھوٹا ہے۔ تو کچھ نہیں سمجھتا... چل ہم یہاں سے کہیں دُور چلیں......

بچہ کبھی کبھی ہوش میں آتا تھا تو چاندی کی تتلی کے بارے میں پوچھتا تھا۔ اُس کے ہونٹ سوجے ہوئے تھے۔ وہ کبھی رو پڑتا اور کبھی چاندی کی تتلی کے بارے میں پوچھتا۔ ماں اُس سے کہہ رہی تھی "چل ہم دریا

(بقیہ صفحہ ۵۸ پر دیکھئے)

غزل

شہاب جعفری

میں ہی میں بکھرا ہُوا ہوں راہ تا منزل تمام
خاکداں تا آسماں چھایا ہے مُستقبل تمام

پاسئے ہمّت کے تلے موجود و نا موجود، سب
اندِ دستِ شوق کو حاصل بھی لاحاصل تمام

کوئی حد بھی ہے مِرے آفاق کی ذوقِ سفر
ہمسفر ہوکر چلا سنگِ سرِ منزل تمام

مجکو جب دیکھا گرا پڑتا ہوں اِک اِک گام پر
مجھ میں شامل ہو گئے پھر میرے آب و گِل تمام

سب کے ذہنوں کا سفر کر آئے ہیں ہم سادہ دِل
سب کے سب پامال تھے جیسے ہمارا دِل تمام

گھر کو دِن بھر کی متاعِ رہ نوردی سونپ دی
سعئ پیہم کا غبارِ شہر تھا حاصل تمام

اِس خرابے میں ہے تو موجود کی خاطر ہمیں ؟
میں ہوں اِس دُنیا میں نا موجود کا حامِل تمام

کوہ و صحراسے صدائے کُن کا بوجھ اُٹھتا کہاں
جو کتاب اُتری مِرے دِل پر ہوئی نازِل تمام

خاک اے خاک اب ترا جوہر ہوں مَیں، پیکر نہیں
سر سے پا تک نُور ہی نُور آیتِ غم، دِل تمام

فرد تا فرد آدمی ہے موجِ صد پیدا کنار
ساحِل آسا بحر اور بحر آشنا ساحِل تمام

آدمی خونخوار ہو جاتا ہے، جب صدیوں تلک
درد کی تنظیم ہو چکتی ہے دِل در دِل تمام

دیکھنا سب نے اُٹھا رکھی ہے کاندھوں پر صلیب !
بھیس میں مقتول کے رُوپوش ہیں قاتل تمام

پی چکی کتنی ہی موجوں کا لہو ساحِل کی ریت،
جوں کی توں پیاسی رہی ریگِ سرِ ساحِل تمام

مُلک و قوم و رنگ و نسل و دیں کی قربان گاہ سے
سُرخرُو لوٹے ہیں خاکِ زندہ کے قاتِل تمام

کِس خرابے سے ہُوا تعمیر تُو اے شہرِ نَو
بے مکانی ہے در و دیوار کا حاصِل تمام

ماہتاب اُبھرا بھی تو جانے کہاں ڈوبا کہ رات
کر دیا موجوں نے چھلنی سینۂ ساحِل تمام

منزلِ آسودہ بھی پائے جہت پیما ہے شہاب
پھر بھی اشک آلودہ خوابِ دیدۂ منزل تمام!

آمنہ ابوالحسن

حیدرآباد کی سیرگاہیں

دنیا کے ہر گوشے میں جہاں انسان کا وجود ہے، انسان اپنے لئے سیرگاہیں ضرور تلاش کر لیتا یا بنا لیتا ہے کیونکہ انسانی نشوونما کے لئے ہوا، پانی اور غذا کی طرح تفریح بھی ایک لازمی ضرورت ٹھہری اور سیر و تفریح صحت کے لئے بھی فائدہ مند ہوتی ہے اور ادراک و عقل کے لئے بھی۔

ہر شہر کی اپنی ایک خصوصیت ہوتی ہے جو وہاں کے مکینوں کی طرزِ رہائش، اُن کے مزاج اور اُن کے کردار کی عکاس ہوتی ہے مگر حیدرآباد واحد وہ شہر ہے جہاں پہنچ کر ہر نوعیت اور مزاج کا آدمی سکون اور انبساط محسوس کئے بغیر نہیں رہتا اور حیدرآباد کے مکینوں کی طرح حیدرآباد کی سیرگاہیں بھی ہمہ وقت آغوش پھیلائے نظریں بچھائے مہمانوں کے خیر مقدم کے منتظر رہا کرتی ہیں۔

حیدرآباد کی سیرگاہیں دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ جو صرف باہر سے آنے والوں کی توجہ اور دلچسپی کا مرکز ہیں اور دوسری وہ جو خود حیدرآبادیوں کی زندگی کا اہم اور ناقابلِ فراموش حصہ ہیں۔

نامپلی اسٹیشن شہرِ حیدرآباد کا دروازہ ہے۔ یہ اگرچہ کہ سیرگاہ نہیں ہے مگر وہ پہلا مقام ضرور ہے جہاں کی گہما گہمی اور رونق میں بھی آنے والے کو شہرِ حیدرآباد کا پُرسکون چہرہ اور جمیل خد و خال یکایک نظر آجاتے ہیں۔ پھر وہ راستے جو شہر کے اندر ہر سُو دُور دُور تک جاتے ہیں، کہنے کو صرف سنگلاخ سڑکیں ہی ہیں مگر اُن پر بھی ہوتی خاک کا ذرہ ذرہ بھی مسکراتا، دمکتا، خوش آمدید کہنے کو بے تاب دکھائی دیتا ہے۔

عابد روڈ شہرِ حیدرآباد کی سب سے بارونق اور چکاچوند جگہ ہے۔ شہر کا فیشن ایبل بازار ہونے کے ناطے یہاں صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی ہنگامے جاگ پڑتے ہیں اور پھر یہ ہنگامے پچھلے پہر تک برابر جاگتے اور آنے جانے والوں کی توجہ اور نگاہیں اسیر کرتے رہتے ہیں۔ صحیح معنوں میں عابد روڈ کو سیرگاہ نہیں کہا جا سکتا مگر درحقیقت یہ سب سے زندہ اور متحرک سیرگاہ ہے۔ یہاں ہر ضرورت کی چیز فوراً دستیاب ہو سکتی ہے اور ہر قسم کی دکانیں اپنی اپنی نوعیت کے سامان سے لدی پھندی اس طرح جگمگاتی جاگتی رہتی ہیں جیسے بڑے افتخار سے کہہ رہی ہوں، آئیے، تشریف لائیے، ہم آپ کے منتظر ہیں۔

یہاں کے پُرتکلف اور سجے ہوئے ریستوران بڑی تمکنت سے ایستادہ سر اُبھار اُبھار کر قدموں کی متواتر چاپ

سُنا کرتے اور آنے والوں کے چہرے پڑھا کرتے ہیں جیسے مسرت سے مُسکرانے والوں کو جواب میں کہنا چاہتے ہوں، ہمیں دیکھیے، ہم سے استفادہ کیجیے، پھر آپ ہمیں کبھی نہیں بھول سکیں گے۔ جہاں اسکول کی عمارتیں نوخیز ہونہار نسل پر ہمیشہ فاخر و مغرور سر بلند نظر آئیں گی، جہاں کے ٹک اسٹالس اور سینما ہالز ہر آن انسانی سیلاب کا جوار بھاٹا پیش کرتے نظر آئیں گے۔

عابد روڈ کی خصوصیت یہ ہے کہ خرید و فروخت سے قطعِ نظر ہر آدمی بلا ضرورت بھی عابد روڈ پر شام گذارنا ضروری اور باعثِ مسرت سمجھتا ہے۔ یہاں ہر مزاج کے لوگ اپنے ملاقاتیوں کو اِس اطمینان و فراغت سے مدعو کرتے ہیں جیسے یہ محض بازار نہیں، اُن کا اپنا گھر ہو۔

ہر شام سیکڑوں لوگ اپنی اپنی مصروفیات سے فارغ ہو کر عابد روڈ پر ایک دُوسرے سے ملتے اور پھر تے ہیں، اکٹھے ہو کر کہیں جاتے یا کہیں سے آتے ہیں۔ گویا یہاں کے ریستوران بھی ایک قسم کے مصروف اور اہم اسٹیشن ہیں۔ شاعروں، پلیڈروں، ادیبوں سے لے کر ڈاکٹروں، انجنیئروں، پروفیسروں، دانشوروں اور کاروباری قسم کے آدمیوں تک کے قافلے شام گذارنا اپنے وقت کی معراج سمجھتے ہیں۔ جہاں بچپن، جوانی اور بڑھاپا یکساں مسرور و مصروف اور شوخ نظر آیا کرتا ہے۔

ہر شہر میں صرف کافی ہاؤز ہی فن کاروں کا پسندیدہ مقام سمجھا گیا ہے جب کہ حیدر آباد میں صرف عابد روڈ ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہر گمشدہ اور بچھڑا ہوا آدمی وقتِ ضرورت دوبارہ آسانی سے فوراً مل جاتا ہے۔ لیکن جو لوگ ہجوم اور شور و غُل کے شائق نہیں، جو تنہائی اور سکون چاہتے ہیں وہ عابد روڈ سے گذر کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ پھر بشیر باغ پہنچنے کے بعد کئی راستے مختلف سمتوں سے اُن دو چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کی سمت جاتے ہیں جو کبھی غیر آباد اور سنسان ضرور تھیں، مگر اب شہر کی بہترین سیرگاہ بن چکی ہیں، جو نوبت پہاڑ کے نام سے موسوم ہیں۔ سطحِ زمین سے کافی اُونچی ہونے کی بدولت یہ بے حد خوبصورت اور فضائی اعتبار سے بڑی فرحت بخش جگہ ہے۔

بہت پہلے کبھی یہاں شہر فتح کرنے والے جیالے سُورما کے لئے مُبارکباد کے نوبت نقارے بجے تھے مگر اب یہاں کی عمدہ چمن بندیاں، سبزے اور پھولوں سے لدے ہوئے اُونچے نیچے مخملیں قطعے اور عین وسط میں پہاڑ کی اُونچائی پر بنا ہوا سفید بے داغ گنبد شان و شکوہ کے ساتھ ساتھ حُسن اور رعنائی کا منظر بھی پیش کرتا ہے سارے بلند مقامات کی طرح اِس جگہ نے بھی پُورے شہر کو اپنی ہتھیلی میں لے رکھا ہے، گویا وہ مثال کہ "ہتھیلی میں جنت دکھائی جائے" نوبت پہاڑ پر پُوری طرح صادق آتی ہے، کیونکہ اِس پہاڑ کی بلندی سے شہر کا نظارہ واقعی جنت ہے۔ یہاں پہنچنے والی اور یہاں سے شہر حیدر آباد کو دیکھنے والی ہر نظر گویا نعرۂ تحسین ہے جو واہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی اور شہر کے سجیلے بانکپن، تنظیم اور سکون کی داد دینے پر خود بخود مجبور ہے اور یہی خصوصیات شہر کا طرّۂ امتیاز ہیں اور یہاں کے مکینوں کا مُطمئن اور مسرور کردار بھی۔

یہ سیرگاہ شام کے دُھندلے ملگجے پن میں اپنی رونق کا اُجالا پھر اِس اعتماد اور شوکت سے بکھیرتی ہے کہ ہر تھکا ہوا، پژمُردہ اور فکر مند چہرہ بھی یہاں پہنچ کر ہوا کی طرح ہلکا پھلکا، لطیف، صحت مند اور پُر مسرت بن جاتا ہے۔ یہاں گہری سے گہری اُداسی یکلخت بھول بسر جاتی ہے اور انبساط و فرحت خود بخود گلے آ لگتی ہے۔ تازہ ہوا کا لطیف لمس، پھُولوں کی خوش گوار مہک اور سارے شہر پر بکھری ہوئی روشنیوں کی جھلملاتی ہوئی سُنہری افشاں

اندھیرے اُجالے کی ہم آہنگی کا قابلِ دید سماں پیش کرتی ہے۔ یہاں پہنچ کر آدمی خود کو بھولنے لگتا ہے صرف ایک ہی احساس دوسرے سارے احساسات پر غالب آجاتا ہے اور وہ ہے پیار کا، اُمید کا، راحت کا احساس۔

آنے والوں کی سہولت کے لئے ایک گوشے میں خوردنی کا بندوبست بھی کردیا گیا ہے جو قہقہوں اور چہلوں سے گونجتا کھنکتا رہتا ہے اور جہاں برتنوں کی جھنکار پر انسانی آوازیں ہمیشہ حاوی رہتی ہیں۔

یہاں ہر شام انسانوں کا سیلاب تو نہیں اُمڈتا مگر ہر شام رنگ ضرور کھلتے ہیں، محبت ضرور انگڑائیاں لیتی ہے خوابیدہ وجود جاگتے اور جاگتے ہوئے وجود خوابیدہ ہوتے ضرور آتے ہیں۔ یہاں کی چاندنی راتیں اچھے سے اچھے مقامات کا جواب، اپنے حسن میں یکتا اور پُرخیال ہوتی ہیں۔

نوبت پہاڑ کو تین طرف سے خشکی اور ایک طرف سے پانی کے کنارے نے گھیر رکھا ہے۔ بلندی سے پانی کا کنارا بظاہر نوبت پہاڑ کے دامن میں نظر آتا ہے مگر حقیقتاً پانی اور نوبت پہاڑ کے درمیان اُس رُخ بھی خشکی اور راستے ہیں۔ وہ جھیل، جو اس پہاڑ کی بالکل گود میں نظر آتی ہے، حسین ساگر ٹینک ہے۔

جی ہاں۔ سکندر آباد اور حیدر آباد کو ملانے والا وہ باندھ جو اپنے دلچسپ تعلقِ خاطر کے لئے سڑک بھی کہلایا جانے کا مستحق ہے اور سیر گاہ بھی۔ یہ ایک میل لمبا باندھ حیدر آباد اور سکندر آباد کا گویا اتصالی مقام ہے۔ اس باندھ کے ایک طرف شہر حیدر آباد ہے اور دوسری طرف علاقہ سکندر آباد۔ باندھ پر سے سواری گاڑیاں تیزی یا سُبک خرامی سے دوڑتی ہوئی ملیں گی اور خواہ دن میں یہ مقام ایک کاروباری سڑک ہی نظر آئے، مگر سورج ڈوبتے ہی خود بخود حسین اور پُر فضا سیرگاہ میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ اس باندھ کے داہنی طرف بوجبل ٹریفک کے لئے نشیبی راستہ ہے جب کہ باندھ کے متصل دوسرے رُخ پولیس بنا ہوا اور سیمنٹ کی صاف ستھری روشوں پر فاصلے فاصلے سے سنگی بنچیں لگی ہوئی ہیں۔ سامنے جھیل کا خوبصورت "تلاطم" اور جھیل کے ایک رُخ پر بنا ہوا بوٹ کلب (Boat club)، جس کے شیشوں سے منعکس ہوتی ہوئی مدھم زرد روشنی بوٹ کلب کی عمارت کو کچھ پُراسرار سا بنا دیتی ہے۔ یہاں بھی ہمیشہ سیر و تفریح کے شائقین کی کثرت ہوتی ہے۔ ہر قماش اور نوعیت کے لوگ جوق در جوق آتے اور گذرتے رہتے ہیں۔ ہر تھوڑے وقفے کے بعد نئے چہرے پہلے چہروں کی جگہ لے لیتے ہیں مگر چہل قدمی کی صفیں کبھی نہیں ٹوٹتیں۔ مونگ پھلی، چنا جور گرم، مصالحے دار بٹانے، کیک پیسٹری، آئسکریم کی آوازیں ہمیشہ بلند رہتی ہیں۔

یہاں کا ٹی اسٹال چائے، کافی اور کولڈ ڈرنکس کے پیالوں کے لئے صحرا میں چشمے کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ چھوٹا سا خاص اسٹال بھی جہاں ورقی، پراٹھے اور گرما گرم سیخ کباب اور لیموں والا گوشت بالکل فرمائشی پروگرام کا سماں پیش کیا کرتا ہے۔

پانی کی خنکی اور طراوت سے آمیز فضا یہاں کا محبوب تاثر ہے۔ موسم گرما میں اس جھیل میں کشتی رانی بھی ہوتی ہے اور بوٹ کلب کے قریب ایک خوبصورت پارک بھی ہے جہاں یا تو کنوارے جوڑوں کے راز و نیاز کی سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں یا پھر پُر سکون فضا کی اسٹڈی کرنے والے طالب علموں کی سنجیدہ نظریں، جو متلاشی اور متجسس تو ضرور ہوتی ہیں مگر بے چین اور بے قرار ہرگز نہیں۔

اندرونِ شہر کی ان سیرگاہوں کے علاوہ دو اور قابلِ ذکر سیرگاہیں ایسی بھی ہیں جو سنسان اور ویران تو نہیں

کہلائی جاسکتیں، مگر جہاں لوگ صرف پکنک کے موڈ یا بھرپور چاندنی راتوں کی حشر سامانی کو آزمانے کے لئے ہی جانا پسند کرتے ہیں۔

ان دو مقامات میں سے ایک تو "عثمان ساگر" ہے، جو عرفِ عام میں "گنڈی پیٹ" کہلاتا ہے۔ ۱۹۱۸ء میں وسطِ شہر سے گذرنے والی موسیٰ ندی میں طغیانی نے جو تباہ کاریاں مچائیں، اُن کی روک تھام کے سلسلے میں یہ تالاب وقوع پذیر ہوا۔ موسیٰ ندی کو شہر سے بارہ میل پرے روک کر باندھ کے ذریعے گھیر کر دو تالابوں میں منقسم کردیا گیا، جو عثمان ساگر اور حمایت ساگر کہلائے اور حیدرآباد کے مرحوم نظام عثمان علی خاں اور اُن کے بڑے صاحب زادے، حمایت علی خاں اعظم جاہ کے نام سے منسوب ہوئے۔ اگرچہ کہ یہ سارے شہر حیدرآباد کو سربراہ ہونے والے صاف ستھرے پانی کے دو بڑے ذخائر ہی ہیں، تاہم اپنے اردگرد کی شادابی اور منظر جنگلاتی اور کوہساری کیفیت کی وجہ سے خودبخود ایک سیرگاہ کی کشش حاصل کرچکے ہیں۔ یہاں گھنے درختوں کی چھاؤں سے چھنتی ہوئی سہمی سہمی دھوپ۔ بل کھاتے ہوئے سائے، پانی کا مستقل اُتار چڑھاؤ، بپھری ہوئی تندخو موجوں کی اٹھا پٹک اور کشاکش نے ماحول کی بے ترتیب قدرتی ترتیب کو حزن و ملال کی کیفیت کے باوجود بارعب جلال اور گمبھیر وقار بھی عطا کردیا ہے یہاں خوش فعلیوں کے بعد ہر انسان خودبخود گمبھیر ہو جاتا ہے۔ ٹھٹک جاتا ہے، جیسے قہقہے کسی ماورا رشتے کے احساس سے چُپ اور گم سم ہو جائیں۔ کسی سمجھ میں نہ آنے والی بات سے سہم کر اُداس ہوکر رہ جائیں۔ اگرچہ کہ یہاں کے ایک مخصوص حصّے میں جھولے بھی پڑے ہوئے ہیں۔ خوش رنگ پرندوں کے بڑے بڑے پنجرے اور پالتو خرگوشوں کے بھٹ بھی بنے ہوئے ہیں۔ اصلی گلاب کا ایک خوش رنگ تختہ بھی ہے۔ بالترتیب حسین چمن بندیاں بھی۔ شاندار ریسٹ ہاؤز بھی۔ مگر ان میں سے کوئی بھی چیز ماحول کے گمبھیر وقار اور اُداس یکسانیت پر بھاری یا حاوی نہیں۔ جس کا تنے پن اور تنوع سے کوئی رشتہ نہیں۔ جو فضا پر چھائی رہنے والی سوگوار کیفیت کا احساس کم نہیں کرتی۔ بھلانے نہیں دیتی۔

اسی نوعیت کا دوسرا قابلِ ذکر مقام "قلعۂ گولکنڈہ" ہے۔

قلعے کے نام پر اب یہ ایک کھنڈر ہی ہے، جو "قطب شاہی ٹومبس" کے نام سے مشہور ہے اور مقبروں کی افسردگی کے باوجود یہ تاریخی اور یادگار مقامات کے شائقین کی ایک پسندیدہ سیرگاہ ہے۔

دور دور تک اپنے غیر آباد ماحول اور اتھاہ سناٹے کے باوجود، پتہ نہیں یہاں وہ کونسی ایسی کشش ہے جو بہرحال انسانوں کو وہاں کھینچ لے جاتی ہے اور مسرت و شادمانی کا جویا، رونق کا خواہش مند انسان گھنٹوں، دلچسپی اور انہماک سے اِس مقام کے گُن گاتا اور اپنا سر دُھنتا نہیں بھولتا۔ وہاں اردگرد کے سناٹے کو بالکل محسوس نہیں کیا جاتا، نہ کبھی وہاں کے آزردہ ماحول میں پہنچ کر کوئی اپنے جذباتی اضمحلال کی شکایت کرتا ہے۔

قلعے کے اردگرد سیر و تفریح کا کوئی تصور بھی اب باقی نہیں مگر پھر بھی یہ مقام حیدرآباد کی سیرگاہوں میں شامل ضرور ہے۔

عام طور پر تفریح گاہیں تفریح کے اصولوں اور ضرورتوں کو پیشِ نظر رکھ کر بنائی جاتی ہیں مگر کچھ ایسی بھی ہوتی ہیں جو کسی نہ کسی وجہ سے خودبخود بن جاتی ہیں اور ہر لحاظ سے صرف لوکل ہوتی ہیں۔ حیدرآبادیوں کی ایک ایسی ہی اہم تفریح گاہ معظم جاہی مارکٹ کے ایک رُخ کا فٹ پاتھ کا وہ حصّہ ہے، جو "بیچلرس کوارٹرز" کی بلند و بالا عمارت

سے چند قدم پرے پان کی ایک دوکان کا صحن سامنے والا حصہ ہے۔ جس طرح بعض یادگار عمارات اپنے مکینوں کے قابلِ ذکر رہن سہن یا اپنے مخصوص واقعات کے باعث ذاتی طور پر کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی قابلِ دید جگہیں بن جاتی ہیں اُسی طرح یہ گوشہ بھی یادگاری طور پر اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہے۔

عرصہ پہلے موجودہ پان کی اِسی دوکان سے ایک اُردو رسالہ نکلا کرتا تھا، جو مُدت ہوئی ختم ہو چکا مگر اُس وقت رسالے کے دفتر پر جو ادیبوں، شاعروں کا اجتماع ہوا کرتا تھا، وہ آج تک قائم و دائم ہے اور عادتاً اُسی خاص جگہ سے وابستہ۔

یہاں دن اور رات کے ہر حصے میں اب بھی فن کار قسم کے لوگوں یا اُن کے دوست احباب اور متعلقین کے گروہ ہمیشہ مصروفِ کلام نظر آتے ہیں۔ نئی نظم، نیا مضمون، نیا مسئلہ یہیں ایک دُوسرے کے گوش گُذار کیا جاتا ہے اور اگر کسی کے پاس کہنے سُننے کے لئے کچھ نہ بھی ہو تب بھی صرف جھگڑنے اور بحث مباحثے کی رونق جانے کے لئے لوگ یہاں جمع ہوتے ہیں اور یوں یہ جگہ حیدرآبادیوں کی ایک خاص نسل کے لئے ایسی دانش ورانہ تفریح کی جگہ بن چکی ہے جس کی اہمیت کو بڑے سے بڑا، پابند سے پابند نظم و نسق کا ماہر بھی ادبی ہنگامہ آرائیوں سے محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ تاہم یہ ساری وابستہ اور غیر وابستہ سیرگاہیں سال میں ایک مرتبہ ضرور سُنسان، بے رونق اور غیر آباد ہو جاتی ہیں، جب شہر حیدرآباد میں کل ہند صنعتی نمائش کا انعقاد عمل میں آتا ہے۔ ہر سال یکم جنوری سے ۱۰ فروری تک کے لئے اور اُس وقت یقیناً ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسے دریا کو کوزے میں بند کیا جا چکا ہو، کیونکہ شہر کی تمام تر رونقیں اور بزم آرائیاں کشاں کشاں صنعتی نمائش میں منتقل ہو جاتی ہیں اور بقیہ ساری محبوب سے محبوب جگہیں انسانوں سے یکسر خالی، افسردہ اور بے نام رہ جاتی ہیں۔

یہ چالیس روزہ کل ہند صنعتی نمائش ، جو اب میل ڈیڑھ میل لمبے چوڑے میدان پر ہزار ڈیڑھ ہزار ہر نوعیت کے بقعۂ نور بنے ہوئے اسٹالس کا شاندار مجموعہ ہے کبھی عثمانیہ یونیورسٹی کے چند منچلے نوجوانوں کی محض ایک اُپج تھی اور جس کا آغاز اُس وقت صرف ڈھائی رُوپے کے حقیر خرچ سے ہوا تھا مگر اب جو حیدرآبادیوں کی ایک مستقل شاندار اور سالانہ تقریب بن چکی ہے اور نمائش کے انعقاد کے دوران جہاں انسانوں کا ٹھٹ اور میلہ لگا رہتا ہے اور ہر روز صرف سَو پچاس نہیں بلکہ بیس پچیس ہزار نفوس ضرور اُسمیں شریک ہوتے ہیں۔ جی ہاں۔ جو اپنی گہما گہمی کے بعد صرف نمائش گراؤنڈ کہلاتی ہے مگر دورانِ نمائش جو بلا شبہ حیدرآبادیوں کی سب سے متحرک اور جاندار سیرگاہ ہے۔ پھر نئی نسل کے نمائندہ مقامات کی طرح پُرانے شہر کی "پتھر گٹی" بھی یقیناً ایک ناقابلِ فراموش جگہ ہے، جہاں پُرانے وقتوں کے لوگ آج تک پُرانے مسائل پر بھی ایسے جوش اور ولولے سے سرگرمِ گفتگو نظر آتے ہیں کہ اِن حوصلہ مند اور اُمید افزا گفتگو کے آگے ہر نئی اور اہم بات۔ بھی محض بے کار اور ناقابلِ اعتراض محسوس ہونے لگتی ہے اور جری سے جری لوگ بھی وہاں سے یہ کہہ کر کھسکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ :

"اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، اِنہیں کچھ نہ کہو"

▲

اطلاع : اپریل کے آخر تک قارئین "شاعر" کی خدمت میں اپریل ۱۹۹۰ء کا شمارہ بھی پیش کر دیا جائیگا۔

یعقوب راہیؔ

کہانی لہو کی...!

سُنا ہے ٹوٹی زبانوں میں کچھ بزرگوں سے
پڑھا ہے طاق پہ رکھی ہوئی کتابوں میں
مسیح آئے تھے پیغمبرِ جہاں بن کر
لبوں پہ اپنے پیامِ وصالِ یار لیئے
خزاں رسیدہ چمن میں نئی بہار لیئے
سکونِ دل لیئے، مہر و وفا کی بات لیئے
اور اپنی ذات میں اِک دردِ کائنات لیئے
مگر زباں جو کھُلی دار پر چڑھائے گئے!

مَیں اپنے شہر میں اکثر بھٹکتا پھرتا ہُوں
اور اس میں شام و سحر دیکھتا ہوں رہ رہ کر
مسیح دار پہ اب بھی چڑھائے جاتے ہیں
اور ان کا جُرم کہ یہ زندگی کے طالب ہیں
کہیں نہ گریۂ و ماتم، نہ کوئی آہ و فغاں
ٹپک رہا ہے مسلسل لہو صلیبوں سے
کروڑوں ہاتھوں میں ٹھنکتی ہیں روز ہی کیلیں
خدا تو جھانکتے رہتے ہیں بس فصیلوں سے!

وہاب نازشؔ

تجزیہ

خواب میں
مَیں نے دیکھا کہ میرے قریب
سب ہیں آنسو بہاتے ہوئے
کوئی کہتا ہے کچھ
کوئی کہتا ہے کچھ
پر مِری لاش اِن سب سے بیزار ہے
اور پھر چند لمحوں میں
دھرتی کی آغوش میں
مجھ کو ایسے سمویا گیا
جیسے دُنیا سے میرا کوئی واسطہ ہی نہ تھا

اور بیدار جب میں ہُوا نیند سے
کچھ سُجھائی نہ مجھ کو دیا
کرنیں خورشید کی خیر مقدم کو تیار تھیں
ہر طرف روشنی
روشنی کے بھنور رقص کرنے لگے
اور دِل میں مِرے درد اُٹھنے لگا

وادیوں میں تخیّل کی برکھا ہوئی
قطرے قطرے نے برکھا کے مجھ سے کہا
حوصلوں کے دیئے لیکے آگے بڑھو!!

شفیق کوٹی (لاہور)

تیرے رُخساروں سے گُل، رنگ فشانی مانگے
تیری زُلفوں سے مہک رات کی رانی مانگے

شعر میں ایک نیا زور و روانی مانگے
اور کیا مجھ سے مری ہیچ مدانی مانگے

ہائے کیا چیز ہے تقدیر کا ہیٹا پن بھی
جس کو ڈس جائے یہ مُوذی، وہ نہ پانی مانگے

کیا پلٹ سکتا ہے سورج بھی کہیں مغرب سے
کیوں ضعیفی مری انداز جوانی مانگے

مُلتفت آپ جو ہو جائیں بقصد ناز کہیں
پھر تو عنوان نیا میری کہانی مانگے

آپ تو بات بھی کرتے ہوئے ہکلاتے ہیں
شاعری سحرِ بیاں، حُسنِ معانی مانگے

نذر کرنے کو مَیں کیا چیز وہاں لے جاؤں
جانے کیا مجھ سے وہ معصوم جوانی مانگے

خوشہ چیں گلشنِ سیماب کے جب تم ہو شفیق
اپنا حق تم سے نہ کیوں سحر بیانی مانگے

رؤف خیر

سکوں مجھے بھی نہیں اور اُسے بھی کیا ہوگا
مری طرح کہیں وہ بھی نہ جاگتا ہوگا

وہ اِس خیال سے شاید نہیں مِلا ہوگا
مرے لبوں پہ بھی جیسے کوئی گِلہ ہوگا

مَیں اپنا قتل چھپالوں تو اِس سے کیا ہوگا
وہ پھر کسی کو یہاں قتل کر رہا ہوگا

اب اپنا شہر بھی اپنے لیئے نیا ہوگا
کہ اتنے عرصے میں کیا کیا نہ ہوگیا ہوگا!

تری تلاش میں نکلا تھا پھر نہیں لوٹا
وہ بھیڑ ہے کہ وہ خود سے بچھڑ گیا ہوگا

جو اُس کی چاپ بھی آئی تو یہ کہا دِل نے
کسی ہَوا کے بگولے کا سامنا ہوگا

دیارِ حُسن میں بے چہرہ آہٹوں کے سوا
برائے دیدۂ بے خواب کیا بچا ہوگا

جھجک رہا ہے وہ آنکھوں کو ڈھانپ لو اپنی
نظر بچا کے گزر جانا چاہتا ہوگا

لگی ہے آگ ابھی اندرونِ خانہ ہی
ہَوا چلے گی تو اللہ جانے کیا ہوگا

اِسی دیارِ دکن کا رؤف خیر بھی ہے
یہ نام آپ نے شاید کہیں سُنا ہوگا

وحشی سعید ساحل

جمود کا جنازہ

جمود کا پیرہن چاک کرنے کی جدوجہد بڑی ہی دلفریب ہوتی ہے۔ یوں کہیئے کہ ایک بے حس آدمی میں آپ حس واپس لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جمال کی زندگی پر بھی جمود چھا گیا ہے۔ اُس کی زندگی بھی اب بے حس ہو کے رہ گئی ہے۔ وقت کی تند اور تیز ہواؤں نے اُس کا حلیہ بگاڑ کے رکھدیا ہے۔ اگر اُس کو آپ دیکھیں گے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ ایک مُردہ ابھی ابھی قبر سے نکل کر آپ کے پاس چلا آیا ہے۔ بلوریے چہرے میں اب صرف ہڈیاں باقی رہ گئی ہیں جو شاید اِس لئے باقی ہیں کہ یہ جمال کی نشاندہی کریں۔ سوکھے ہونٹوں اور سوکھے بدن نے اُس کو ایک اچھا خاصا کارٹون بنادیا ہے۔ شاید اِس لئے کہ اُس کے بدن میں جمود نے زہر کا کام کیا تھا۔ جمود موت کی علامت ہے۔ ایک ایسی علامت جو انسان کو اپنے آپ سے چھین لیتی ہے۔ جمود ایک ایسی بیماری ہے جو انسان کی نس نس سے خون کھینچ لیتی ہے۔

پُرانے تقاضے دم توڑ رہے ہیں اور نئی قدریں جگہ لے رہی ہیں۔ وقت بدلتا جارہا ہے۔ ہر لمحہ ایک نئی تبدیلی رونما ہوجاتی ہے۔ ایسے میں پچیس سال کے نوجوان کا جمود میں گرفتار ہونا ٹھیک نہیں ہے۔

جمال نے جذبے کو قتل کیا تھا اور قتل کرکے اُسے ہمیشہ کے لئے نیست ونابود کیا تھا۔ زندگی کے ساتھ یہ بے رُخی جان لیوا ہوتی ہے۔ وہ میرا دوست تھا اور دوست کی زندگی کو میں اِس طرح پامال ہوتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ جمود کے ملبوسات اُس سے الگ کرکے جذبے اور جدوجہد کا پیرہن پہن لینے کے لئے ہر وقت میں اُس کو سمجھاتا رہا۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوتا تھا۔ جیسے ایک گوشت و پوست کا آدمی پتھر کے مجسمے میں تبدیل ہو کے رہ گیا ہو۔ میں اُس سے کہتا۔

"تمہیں سب کچھ بھولنا ہوگا۔ نئے سرے سے نئی زندگی شروع کرنا ہوگی۔ ٹھنڈے جذبات کو گرمی کا احساس دلانا ہوگا۔ زندگی کو ایک مُشتِ غبار تصور نہیں کرنا ہوگا۔ تم جب تک اِس دنیا میں ہو تب تک زندگی کا بوجھ زندگی کے اُصولوں پر اُٹھانا ہوگا۔ اِس لئے اپنے آپ کو بے حسی کے جال سے نکال دو۔ نئی اُمنگوں کو اپنا رہبر بنا کر ایک نئی زندگی کا آغاز کر دو"

وہ میری طرف ایسے دیکھتا کہ جیسے میں نے اُسے خودکشی کرنے کا مشورہ دیا ہو۔ اُس کی آنکھیں مجھ سے صاف یہ کہتی ہوئی نظر آتیں۔ "تم حالات سے بے بہرہ تو نہیں ہو۔ پھر بے بہرہ بننے کی کیوں کوشش کر

کر رہے ہو۔"
ہاں! جمال سے ماضی کے حالات بھیانک تھے جس کو یاد کر کے میرے بدن میں بھی خوف اور ڈر کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ کتنا کرب اور درد اُس کے دل میں چھپا ہوا ہے۔
رشتے کتنے کچے ہوتے ہیں یہ اندازہ تب ہی ہوتا ہے جب انسان دھوکہ کھا لیتا ہے۔ ایک یتیم انسان جو در بدر کی خاک چھانتا پھرتا ہے اور خود میں ا حساس لئے پھرتا ہے کہ کوئی اُس کا دامن تھامنے والا نہیں ہے۔ کس کو بھائی، بہن، دوست، ماں باپ کہہ کے پکارے۔ ایسے پیاسے آدمی کی پیاس بڑی دردناک ہوتی ہے۔ کسی زمانے میں جمال اسی پیاس میں مبتلا رہا۔ جمال کی زندگی بچپن سے لے کر اٹھارہ انیس سال کی عمر تک رشتوں کے بندھن سے آزاد تھی لیکن اچانک رشتوں کی پیاس نے اُس کے دماغ کو آ گھیرا۔ میں اُس کا دوست تھا جس نے ہر وقت اُس کے چہرے پر بے فکری، لاابالی پن اور بے نیازی پائی، اچانک اس سنجیدہ چہرے کو دیکھ کر اُس دن میں نے جمال سے کہا۔
" تم آج کل پریشان نظر آتے ہو۔"
" ہاں ہوں۔" اُس نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔
" نہ جانے دماغ میں ہر بار یہ خیال رہ رہ کے کیوں آتا ہے کہ میری بھی کوئی بہن ہو لیکن کون بنے میری بہن!"
سوال تھا رشتہ قائم کرنے کا۔ لیکن آجکل کی اِس دنیا میں رشتوں کی کیا کمی ہے۔ رشتے، رشتوں پر قائم ہوتے ہیں، نفع اور نقصان پر، تجارت کے صرف و نحو پر۔ پیار کی اِس دنیا میں ہر چیز بک جاتی ہے۔ اِس طرح ایک دن جمال کے گھر میں بھی ایک رشتے والی آ گئی۔ اُس دن جمال نے مجھ سے مسرت آمیز لہجے میں کہا۔
" آج میں بہت خوش ہوں۔"
" کیوں؟ پھر ایک بار تمہارے چہرے پر رونق کیسے آگئی؟" میں نے معلوم کرتے ہوئے پوچھا۔
اُس نے رازدارانہ لہجے میں جواب دیا۔
" میرے پیارے دوست، مجھے میری بہن مل گئی۔"
" بہن مل گئی!" مجھے حیرانی ہوئی۔
" ہاں فٹ پاتھ پر مل گئی۔ وہ بھی میری طرح یتیم ہے، بے کس ہے، لاچار ہے۔ میں اُسے اپنے گھر لے آیا ہوں۔ گھر کا نظام اُس کے حوالے کر دیا ہے۔ مجھے ایک بہن مل گئی۔"
میں واقعی خوش تھا کہ اُس کی رونق واپس آ گئی۔ ایک بار وہ پھر پہلا سا جمال نظر آنے لگا جس کے چہرے پر بے فکری، بے نیازی اور لاابالی پن تھا۔ دنیا نے نہ جانے کیا کیا الف لیلے کے قصے اُس کے اور اُس کی بہن کے رشتے کے ساتھ وابستہ کئے۔ لیکن جمال نے دنیا کی پرواہ نہ کی اور دنیا کب تعلقات کو مدنظر رکھتی ہے۔ کوئی اگر کہتا
" بہن کے پاک نام پر ایک گناہ ہو رہا ہے۔"

کوئی قہقہہ لگاتا: "بہن!"
کوئی کہتا
"جمال کے بھولے پن میں بھی ایک بہت بڑا شیطان چھپا ہوا ہے۔"
دنیا حقیقت جاننے کی تڑپ کب رکھتی ہے۔ باتیں بنانے والے خود ہی تبصرے کرتے ہیں اور خود ہی تجزیہ کر کے فیصلے دے دیتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جمال نئی بہن کو پا کر ہر وقت مسرور نظر آتا تھا۔ اُس کی چھوٹی سے چھوٹی بات پوری کرنے کے لئے تیار رہتا تھا۔
وقت بدلنے میں کب دیر لگتی ہے۔ رشتے کچے دھاگوں کی طرح کٹ جاتے ہیں۔ لیکن شبنم نے کب رشتے سے انکار کیا تھا۔ جمال کو وہ چاہتی تھی لیکن چاہت کا رنگ جدا تھا۔ شبنم ایک ایسے رشتے کی قائل نہیں تھی جو وقتی ہو اور وقت کی تیز ہوا نے ایک خلیج اُن رشتوں کے درمیان پیدا کر دی۔ جب جمال نے ایک دن اُس سے کہا۔
"میری بہن اب بہت جلد ہم ایک دوسرے سے دُور ہو رہے ہیں۔ پھر میں ایک بار تنہا رہ جاؤں گا لیکن لڑکیاں تو ہوتی ہی ہیں پرائی۔ میں تمہاری شادی ایک اچھے گھرانے میں بہت جلد کرنے والا ہوں۔"
شبنم نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔
"ایسی بھی کیا جلدی ہے۔"
"تمہیں پہلے جلدی نہ ہوتی۔ لیکن اب تمہارا بھائی آ گیا ہے اُسے تو جلدی ہے۔ اُس کو اپنا فرض تو نبھانا ہے۔"
"جمال آج تک تم ایک بات نہیں جان پائے۔" شبنم نے آگے کہا۔ "میں تمہیں پیار کرتی ہوں، تم سے دُور نہیں رہ سکتی۔ سچ تو یہ ہے کہ رشتے ہم خود ہی بنا لیتے ہیں اور رشتوں کو ہم خود ہی ترتیب دیتے ہیں۔ میرے پاس ایک احساس ہے، ایک جذبہ ہے کہ تم ہی میرے جسم و روح کے مالک ہو، میرے خوابوں کے شہزادے ہو ـــــ پھر کیوں نہ ہم دونوں شادی کر لیں۔"
جمال یہ سُن کر پتھر کے مجسمے کی طرح کھڑا رہ گیا۔ جیسے کسی نے اُس کے جسم سے رُوح کھینچ لی ہو۔ یا کسی نے بُری طرح سے اُس کے ضمیر کو جھنجھوڑ دیا ہو۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے نیک و بد خیالات میں ڈوبا رہا۔ دوسرے لمحے شبنم کا ہاتھ پکڑ کے اُس نے شبنم کو اُسی (فٹ پاتھ) پر چھوڑ دیا، جہاں کبھی اُس نے اُس کا ہاتھ بھائی بن کر تھاما تھا۔
تب سے بار بار جمال کے دماغ میں یہ خیال آتا رہا۔
"رشتے کتنے کچے ہوتے ہیں۔ رشتوں کے دھاگوں میں نفع و نقصان کی باتیں سوچی جاتی ہیں۔"
شبنم نے اُس کو بہت دُکھ دیا تھا اور دُکھوں نے اُس کو بے حس کر دیا تھا۔ کام سے اُس کا جی اُچاٹ ہو گیا۔ وہ دنیا کے کاروبار سے بیزار ہو گیا اور تمام دنیا اُس کو بے حسی کی تصویر نظر آتی۔ جہاں نہ رشتوں کی کوئی قیمت ہے، نہ ہی انسانیت کا چراغ جلتا ہوا نظر آتا ہے۔
جمود نے دن بدن اُس کی زندگی میں زہر کا کام کیا۔ میں اپنے دوست کی یہ حالت دیکھ کر کچھ تھا۔
(بقیہ صفحہ ۵۰ پر دیکھئے)

مقالہ

سعادت علی صدیقی

یادگارِ غالب اور مقدمۂ شعروشاعری میں غالب کے بعض اشعار

مولانا حالی، غالب کے عزیز شاگرد بھی تھے اور اُن کے پہلے سوانح نگار بھی۔ اُن کی کتاب 'یادگارِ غالب' غالب شناسی کے سلسلے کی پہلی کڑی ہے اور بعض اعتبارات سے آج بھی اُس کی بے مثالی پر حرف نہیں آیا ہے۔ تشریحِ شعری کے فن میں اِس کتاب کا وہ حصہ آج بھی پڑھنے کے قابل ہے جس میں غالب کے اشعار کے لفظی و معنوی محاسن پر مولانا حالی نے روشنی ڈالی ہے لیکن ایک عجیب بات یہ ہے اور جس کی طرف ابھی تک توجہ نہیں کی گئی ہے کہ 'یادگارِ غالب' اور 'مقدمۂ شعروشاعری' میں حالی نے غالب کے جو اشعار درج کئے ہیں اُن میں سے اکثر اشعار کا متن آج تک مصدقہ نسخوں میں موجود متن سے قطعاً مختلف نظر آتا ہے۔ اگر اِس پر نظر رہے کہ حالی کو کلامِ غالب کے قریبی مطالعے کا اتفاق ہوا ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ شعر اُنہوں نے خود غالب کی زبان سے سنے ہوں اور کلامِ غالب کے اُن خطی اور مطبوعہ نسخوں پر بھی اُن کی نظر ہو جو اِس کتاب کی تصنیف کے وقت تک منظرِ عام پر آچکے تھے، تو اِس اختلاف کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

متن کی ترتیب و تنقید کے جو مسائل ہیں اُن میں ایک نہایت اہم مسئلہ اختلافِ متن اور اُس کے وجوہ کا تعین بھی ہے۔ اِس لحاظ سے دیکھئے تو 'یادگارِ غالب' اور 'مقدمۂ شعروشاعری' میں درج ایسے مختلف المتن اشعار کی اہمیت نمایاں ہوتی ہے۔ آزاد کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اُنہوں نے اپنے اُستاد ذوق کے کلام کو جب مرتب کیا تو اُس میں جگہ جگہ لفظی تصرفات کرتے گئے۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیوانِ ذوق مرتبۂ آزاد میں اِس طرح درج ہے:

گُل بھلا کچھ تو بہار اپنی صبا دکھلا گئے حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بِن کھِلے مُرجھا گئے[1]

لیکن دیوانِ ذوق مرتبۂ ویران و ظہیر میں اُس کی یہ صورت ہے:

کِھل کے گُل کچھ تو بہار اپنی صبا دکھلا گئے حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بِن کھِلے مُرجھا گئے[2]

ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اپنے مرتبہ کلیاتِ ذوق میں دیوانِ ذوق مرتبۂ حافظ ویران کے متن کو ترجیح دی ہے اور

---

[1] دیوانِ ذوق مرتبۂ محمد حسین آزاد، طبعِ اوّل، ص: ۲۸۳۔

[2] دیوانِ ذوق مرتبۂ ویران، صفحہ ۱۳۹؛ کلیاتِ ذوق مرتبۂ ڈاکٹر تنویر احمد علوی، صفحہ ۳۹۹ (اِس اطلاع کے لئے میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی صاحب کا منت پذیر ہوں۔ (س۔ ص۔)

اُس کی تہہ میں غالباً یہی خیال کارفرما ہے کہ دُوسری صورت، آزادؔ کی تراشیدہ ہے۔ اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آزادؔ نے خود لفظی تبدیلی کی ہے یا اُنھوں نے کبھی ذوقؔ کی زبان سے یہ شعر اسی طرح سُنا تھا، یا اُن کے پیشِ نظر ایسی کوئی تحریر تھی جس میں ذوقؔ کی یہ اصلاح شدہ صورت ہو اور وہ تحریر دُوسرے کے سامنے نہ ہو... بہرصورت ایسے عصری اختلافات ہمیشہ اہم اور قابلِ ذکر سمجھے جاتے ہیں۔

کبھی کبھی سماعت یا جس چیز کو مذاقِ سلیم یا خوش مذاقی کہا جاتا ہے اور جو دراصل انسان کی ذاتی پسند یا ناپسند کا دُوسرا نام ہے، اُس کی کرشمہ کاریاں بھی ایسے اختلافات کی ذمے دار ہوتی ہیں۔ مولانا حالیؔ کو مرزا غالبؔ سے جو ربطِ خاص تھا، وہ جس قدر اُن سے قریب تھے اور کلامِ غالبؔ سے اُن کو جو تعلقِ خاطر تھا، اِن سب کی بنا پر اُن کے درج کردہ اشعار کے متن کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اِن اختلافات کو ترجیح نہ دی جا سکے اور اصل متن کا درجہ انہیں حاصل نہ ہو سکے، لیکن تنقید و ترتیبِ متن کے اصولوں کے تحت اِن اختلافات کا تذکرہ ضروری ہوگا۔

اسی نقطۂ نظر سے ذیل میں اِن اختلافات کو پیش کیا جاتا ہے۔ یادگارِ غالبؔ پہلی بار ۱۸۹۷ء میں نامی پریس کانپور سے شائع ہوئی اور مقدمۂ شعر و شاعری ۱۸۹۳ء میں مطبع انصاری دہلی سے۔ میں نے اُنھیں اوّلیں ایڈیشنوں کو بنیاد بنایا ہے اور دیوانِ غالبؔ کے نسخۂ عرشی (طبعِ اوّل ۱۹۵۸ء) کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ مالک رام صاحب نے حال ہی میں دیوانِ غالبؔ نسخۂ نظامی پریس کانپور کو شائع کیا ہے جو جون ۱۸۶۲ء میں غالبؔ کی تصحیح کے بعد چھپا تھا اور جس کے متعلق مالک رام نے لکھا ہے:

"مطبع نظامی کے نسخے میں غالبؔ کا سب سے آخری صحیح کردہ متن ہے۔ اِس میں کلام بھی سب سے زیادہ ہے۔ اِسی لئے یہی نسخہ غالبؔ کی صد سالہ یادگار کے موقع پر شائع کیا جا رہا ہے۔"[1]

اِس لئے دیوانِ غالبؔ صدی ایڈیشن کے نسخے کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے اور اختلافات کی صورت میں نشاندہی بھی کر دی گئی ہے۔

مولانا حالیؔ نے مقدمۂ شعر و شاعری میں بھی غالبؔ کے اشعار نقل کئے ہیں۔ مضمون کے آخر میں ان اشعار کو بھی شامل کر دیا گیا ہے اور اس طرح یہ مضمون مولانا حالیؔ کی دو تصانیف میں غالبؔ کے اشعار کے متن اور دیوانِ غالبؔ کے مصدقہ نسخوں کے اختلافات پر مبنی ہے:

یادگارِ غالبؔ طبعِ اوّل	ص	دیوانِ غالبؔ نسخۂ عرشی طبعِ اوّل	ص
مانا کہ نہیں آج سے اچھا کوئی دن اور	ص ۴۷	مانا کہ ہمیشہ نہیں، اچھا کوئی دن اور	ص: ۱۷۰
تم ایسے کہاں کے تھے کھرے داد وستد کے	" "	تم کون سے تھے ایسے کھرے داد وستد کے؟	" ۱۷۱
ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالبؔ	" "	ناداں ہو جو کہتے ہو کہ "کیوں جیتے ہیں غالبؔ؟"	" "
وحشت و شیفتہ اب مرثیہ لکھیں شاید	" ۱۴	وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید	" ۱۸۷
شب خمارِ چشمِ ساقی رستخیز اندازہ تھا	" ۱۱۱	شب، خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا	" ۱۴۶
گویا صحرا غبارِ دامنِ دیوانہ تھا[2]	" ۱۱۰	تو کہے صحرا غبارِ دامنِ دیوانہ تھا	" ۲۵

---

[1] دیوانِ غالبؔ مرتبہ مالک رام (صدی ایڈیشن) ۱۹۶۹ء، صفحہ ۳، ۴-۴ مصرع میں کوئی لفظ چھوٹ گیا ہے (اوقش)

یادگارِ غالب طبعِ اوّل	ص	دیوانِ غالب نسخۂ عرشی طبعِ اوّل	ص
بس کہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا	ص: ۱۴۰	بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا	ص: ۱۵۰
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں	۱۴۲	مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں	۱۹۲
جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے	۱۴۵	ساغرِ جم سے، مرا جامِ سفال اچھا ہے	۲۳۹
ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم	۱۴۲	ترے سروِ قامت سے یک قدِ آدم	۱۷۹ [۱]
کرنے لگا ہے باغ میں تو بے حجابیاں	۱۴۷	کرتا ہے، بس کہ باغ میں تو بے حجابیاں	۳۰۶
نہ مارا جان کر بے جرم قاتل تیری گردن پر	۱۴۰	نہ مارا جان کر بے جرم، غافل تیری گردن پر	۱۳۶
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا	۱۴۰	حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا	۱۶۲
غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ گل مت دو	۱۴۰	غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو	۱۴۷
شایانِ دست و بازوے قاتل نہیں رہا	۱۴۲	شایانِ دست و خنجرِ قاتل نہیں رہا	۱۵۳ [۲]
جہاں ساقی ہو تو دعویٰ ہے باطل ہوشیاری کا	۱۴۲	جہاں ساقی ہو تو، باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا	۱۴۸
یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات	۱۴۴	یارب وہ نہ سمجھے ہیں، نہ سمجھیں گے مری بات	۱۷۰
قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں	۱۴۸	قاصد کے آتے آتے خط ایک اور لکھ رکھوں	۱۸۸ [۳]
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں	۱۵۰	ہر ایک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں	۱۹۰ [۴]
چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ	۱۵۰	چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ	۱۹۰ [۵]
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے	۱۵۱	وہ آئے گھر میں ہمارے، خدا کی قدرت ہے	۱۸۷
جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں	۱۵۲	تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں	۱۹۱
ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ صواب سے	۱۵۳	ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے	۱۹۷
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو	۱۵۴	لیکن، خدا کرے وہ ترا (؟) جلوہ گاہ ہو	۱۹۷
زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالب	۱۵۶	زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب	۲۴۲
تم کیا گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی	۱۵۶	کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی	۲۴۳
اپنی گلی میں دفن نہ کر مجھ کو بعدِ قتل	۱۵۷	اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن، بعدِ قتل	۲۳۹
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے	۱۵۹	دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے	۲۴۷
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے	۱۵۹	جب آنکھ سے ہی نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے	۲۴۲

۱۔ ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم (دیوانِ غالب مرتبہ مالک رام، ص: ۷۸)
۲۔ شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا — دیوانِ غالب نسخۂ مالک رام ص: ۳۹
۳۔ قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں — دیوانِ غالب نسخۂ مالک رام ص: ۷۸
۴۔ ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں — 〃 ۸۱
۵۔ چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ — 〃 ۸۲

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے	ص: ١٦١	پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے	ص: ٢٢٣
ہائے واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا	ص: ١٦٢	ہائے! واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا	٢٣٢
وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اتر جائے	١٦٢	وہ نیشتر سہی پہ دل میں جب اتر جائے	٢٢٨
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے	١٦٣	دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے [1]	٢٣٩
روک دو گر غلط چلے کوئی / ڈھانک لو گر خطا کرے کوئی	١٦٤	روک لو، گر غلط چلے کوئی / بخش دو، گر خطا کرے کوئی	٢٤٢
بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا	١٦٤	بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا	٢٤٩
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے مجھ کو	١٦٦	کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ	٢٢٥
دیا ہے اور کو بھی تا اسے نظر نہ لگے	١٦٧	دیا ہے خلق کو بھی، تا اسے نظر نہ لگے	٢٣٦
زمانہ عہد میں ہے اس کے محوِ آرائش	١٦٧	زمانہ، عہد میں اس کے ہے محوِ آرائش	١٣٦
کانوں پہ ہاتھ رکھتے ہیں کرتے ہوئے سلام / ہے اس سے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں	١٧٠	کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام / اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں	١٢٩
روزہ اگر نہ کھاوے تو ناچار کیا کرے	١٧١	روزہ اگر نہ کھائے، تو ناچار کیا کرے؟	١٢٨
بھیجی ہے مجھے جو شاہِ جم جاہ نے دال	١٧٢	بھیجی ہے جو، مجھ کو شاہِ جم جاہ نے دال	١٥٣
کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر / جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار	١٦٨	کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر / تا نہ دے بادِ زمہریر، آزار / کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش؟ / جسم رکھتا ہوں، ہے اگرچہ نزار	ص: ١٢٦
میری تنخواہ میں تہائی کا	١٦٩	میری تنخواہ میں چہارم کا	١٢٦

مقدمۂ شعر و شاعری [2]		دیوانِ غالب نسخۂ عرشی [3]	
جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے	ص: ٣٩	ساغرِ جم سے، مرا جامِ سفال اچھا ہے	ص: ٢٣٩
اُن کے آنے سے جو آ جاتی ہے رونق مونہ پر	٤٠	اُن کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے رونق منہ پر [4]	٢٣٩
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں	٩٣	مشکلیں مجھ پر پڑی اتنی کہ آساں ہو گئیں	١٩٢
زمانہ عہد میں ہے اس کی محوِ آرائش		زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرائش	٢٣٦

---

[1] دھوئے گئے ہم ایسے کہ، بس پاک ہو گئے : دیوانِ غالب نسخۂ مالک رام، ص: ١٦٤

[2] مقدمۂ شعر و شاعری: الطاف حسین حالی، مطبع انصاری دہلی، مطبوعہ ١٨٩٣ء

[3] دیوانِ غالب: امتیاز علی عرشی، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، مطبوعہ ١٩٥٨ء

[4] دیوانِ غالب: مرتبہ مالک رام، ص: ١٣٨ میں "آن کے دیکھے سے، جو آ جاتی ہے منہ پہ رونق" لکھا ہے۔

جلاد سے لڑتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس رنگ میں جو آئے	ص: ۱۵۷	جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں جو آئے	ص: ۲۲۹
کوئی ویرانی سے ویرانی ہے	۱۶۰ "	کوئی ویرانی سی ویرانی ہے	۱۵۲ "
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے	۱۶۸ "	دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے	۲۲۹ "

یہ طے کرنا ماہرینِ غالبیات کا کام ہے کہ حالی کی تحریروں میں ملنے والے غالب کے اشعار اور دیوانِ غالب کے جدید مستند نسخوں کے اشعار کے متن میں جو اختلاف ملتا ہے متنی نقطۂ نظر سے اُس کی اہمیت کیا ہے اور ان مختلف المتن اشعار میں کس کو ترجیح دی جائے۔ ▲

بقیہ صفحہ ۱۰ "غالب کا دیوان"

اپنے قلم کا لکھا ہوا ہے۔ اِس نسخے میں فارسی کی بارہ اور اُردو کی دو رُباعیاں ایسی درج ہیں جو مروجہ دیوانوں میں نہیں پائی جاتیں۔ اِس کے علاوہ متعدد غزلیں بھی ایسی موجود ہیں جو اس وقت تک کے مطبوعہ اور قلمی دیوان غالب کے دریافت شدہ نسخوں میں نہیں ملتیں۔ ان غزلوں میں تخلص اسد استعمال ہوا ہے ایک غزل سناتا ہوں۔

دلِ بیتاب کہ سینے میں دمِ چند رہا | یدمِ چند گرفتارِ غمِ چند رہا
زندگی کے ہوئے تا گرنفسِ چند تمام | کوچۂ یار جو مجھ سے قدمِ چند رہا
لکھ سکا میں نہ اسے شکوۂ پیاں شکنی | لاجرم توڑ کے عاجز قلمِ چند رہا
اُلفتِ زر ہمہ نقصان ہے کہ آخر قارون | زیرِ بارِ غمِ دام و درمِ چند رہا

عمر بھر ہوش نہ یک جا ہوئے میرے کہ اسد
میں پرستندۂ رُوئے صنمِ چند رہا

یہ دیوان آجکل موضوعِ بحث بنا ہوا ہے اور اس کا بڑا چرچا ہے۔ ▲

(۲۱ دسمبر ۱۹۶۹ء کو لکھنؤ ریڈیو سے نشر)

بقیہ افسانہ صفحہ ۱۸ "بھارت کا نقشہ"

کیونکہ جب گھر لوٹے گا تو لیتا آئے گا۔ لڑکے نے سوچا ماں بھی کیا چیز مانگ رہی ہے۔ وہ روز روز روٹی سینکتے ہوئے بیڑی کو خوب جلا لیتا تھا اور زیادہ سے زیادہ جلی ہوئی بیڑی جمع کرتا رہتا تھا۔ جب وہ گھر آیا تو اُس نے ماں کی وہ فرمائشی چیز اُس کے ہاتھ میں تھما دی ... "اب کی بار وہ پہلے سے تگڑا تھا اور کبھی بیمار نہیں پڑا تھا۔

"کیا مطلب۔؟" میں ماں سے پوچھتا ہوں۔

"مطلب یہ کہ ماں کا بیٹا ہٹا کٹا تندرست رہے اُسے اور زیادہ کچھ نہیں چاہیے۔" ماں کہتی ہے۔ یہ سنکر میرا جی چاہا کہ پوچھوں "ماں! اِس بات پر تم بار بار زور کیوں دے رہی ہو۔؟" لیکن تبھی پتاجی نے آواز دی۔ وہ اُٹھ کر چلی گئی۔ میں وہ بات سمجھ نہیں پایا۔ اُس کمرے میں جا کر پتاجی کے ساتھ اُس کی ہلکی ہنسی کی آواز سنائی دی۔
— وہ لوگ شاید بچوں کی کسی حرکت پر ہنس رہے تھے۔ ▲ (ہندی سے)

عطا محمد شعلہ

★

حُسن ہی زیست کی محفل کا دِیا ہے کہ نہیں
جو بھی دَر پیش ہے آج اَپنا کیا ہے کہ نہیں؟

تُو مصائب سے نہ گھبرا مِری جاں صرف یہ دیکھ
آدمی دَہر میں مَر مَر کے جِیا ہے کہ نہیں؟

جب بھی آیا ہے کبھی حرف تِرے نام پہ دوست
ہم نے سَر دیکے تِرا نام کِیا ہے کہ نہیں؟

مَوجِ خوں سَر سے گُذرتی بھی رہی ہے لیکن
پھر بھی ہنس ہنس کے تِرا نام لِیا ہے کہ نہیں؟

تُو گلی کُوچوں میں سَرمائے کی رَونق پہ نہ جا
خُونِ انساں کا بہت اِس نے پِیا ہے کہ نہیں؟

شعلہؔ کِس مُنہ سے شکایت کی کروگے ہمّت؟
جو بھی کچھ تم پہ ہے سب اُن کا دِیا ہے کہ نہیں؟

تسنیم فاروقی

★

اَور کچھ دیر یہ خوابوں کی گھٹا رہنے دو
عِطرِ گیسو مِری راتوں میں بَسا رہنے دو

پی کے مَیں بھُول نہ جاؤں کہیں پیاسوں کی خلش
ساغروں کو مِرے ہونٹوں سے جُدا رہنے دو

تم نے اِس حرف کو افسانوں میں دیکھا ہوگا
کوئی اور بات کرو، ذکرِ وَفا رہنے دو

رسمِ پُرسِش کی روایت نہ نِبا ہو یارو
تم مجھے زہر پلا دو، یہ دَوا رہنے دو

کیوں اسے ماہ پہ لیجا کے اُگاؤ گے فساد
اَمن کا نام زمینوں پہ لِکھا رہنے دو

ہم سے راہوں میں بہاروں کا بھرم قائم ہے
ہم سُلگتے ہوئے پتّوں کو پڑا رہنے دو

یادِ ایّامِ گُذشتہ کے لیئے اے تسنیمؔ!
طاقِ ماضی پہ دِیا کوئی جَلا رہنے دو

قیصر شمیم

★

نہیں رنگِ خاص سے کچھ غرض، کوئی رنگِ عام تو دو کبھی
کبھی اپنی صُبح نہ دو مگر، مجھے میری شام تو دو کبھی

یُونہی اپنے آپ کو ڈھونڈتا پھروں شہر شہر میں کب تلک
مجھے میری شکل تو دو کبھی، مجھے میرا نام تو دو کبھی

جو نشست ہے کسی اور کی، اُسے رکھو شوق سے تم، مگر
مِرا اپنا جو بھی مقام ہے مجھے وہ مقام تو دو کبھی

مِری آہ پر نہ دو دھیان تم، نہیں اِس کا کوئی گِلہ، مگر
مِرا دَرد جس کا ہے مُستحق، وہی احترام تو دو کبھی

دیئے جاؤ سب کو سُبو مگر، اِسی میکدے کے ہجُوم میں
کوئی عُمر بھر کا ہے تشنہ لب، اُسے ایک جام تو دو کبھی

۳ غزلیں

امیر چند بہار

اُردو

(رُباعیات)

اِک جہل کے سیلاب میں جو بہتے ہیں
اِک عالمِ موہوم میں جو رہتے ہیں
کم ظرف و کم اندیش ہیں، کج فہم ہیں جو
دن رات وہ اُردو کو بُرا کہتے ہیں!

۲

نادان ہیں اُردو کو مٹانے والے
لوگوں کو زبانوں پہ لڑانے والے
جو ورثۂ اجداد کو ٹھکراتے ھیں
لعنت اُنھیں بھیجیں گے زمانے والے!

۳

ہندی سے مجھے پیار ہے، ہاں اپنی ہے
یہ ماتری بھاشا ہے، یہ ماں اپنی ہے
اُردو سے تجھے بَیر یہ ناحق کیسا؟
اے تنگ نظر یہ بھی زبان اپنی ہے!

۴

بھارت میں نہیں ہے تو کہاں ہے اُردو
کیا مصر کی، ترکی کی زباں ہے اُردو!
بھارت میں یہ پیدا ہوئی، پروان چڑھی
آپس کے ملاپ کا نشاں ہے اُردو!

۵

کس درجہ ہے شیریں و دلآویز و رَواں
وہ حُسن ہے کہیے جسے عظمت کا نشاں
گنجینۂ معنی ہے ادب اُردو کا
یہ غالب و چکبست کی ہے زباں!

تنہا تماپوری

سانس کے سُر پہ کھانستے ہیں تال
زندگی تالیاں بجاتی ہے
وقت کے پاؤں لگتے ہیں نڈھال

شہر کی شاہراہ پر بیٹھے
ٹوٹتی ہڈیوں کا بوڑھا گیت
گا رہے ہیں عمر رسیدہ گدھ

اور کچھ نوجوان کُتّے — جو
خون آلودہ اپنے پنجوں کو
چاٹ کر، واہ واہ کرتے ہیں

اُبلتی صبح، سلگتی راتیں
جلتی گلیوں میں تپتے لمحوں کو
چھوڑ کر چل دیئے نہ جانے کہاں؟

کرشن کی بنسری بھی ٹوٹ گئی
مُنجمد ہو گئی اذاں کی پکار
پھر سے گوتم نے شہر چھوڑ دیا!

افسانہ

ایس، ایم، وسیم

ایک سایہ، دو موڑ

"میں قسم کھاتا ہوں کہ میں نے آج تک کبھی کسی سے نفرت نہیں کی۔"
"کیا مطلب؟"
"مطلب... میرا مطلب ہے کہ...."
"کہ...."
"کہ... کمینے... ذلیل... ل ل..."
"جی... ی ی۔"

اور راجکمار وہاں سے آہستہ آہستہ جذبات کے بوجھ تلے دبا ہوا چلا آیا۔ البتہ آنسو کے چند قطرے اُس کی آنکھ سے ٹپک کر پیروں کے نیچے دھول میں جذب ہو گئے ـــ آنسو چھپ گئے ـــ دھول تر ہو گئی ـــ دھول کے چہرے پر آنسوؤں کی کہانی چند لمحے کے لئے ہی سہی، نقش ہو گئی۔

بات کوئی خاص نہ تھی لیکن بات عام بھی نہ تھی۔ انسانی جذبات اور دل کی گہرائیاں ایک مشاق غمّاز کے لئے تو کچھ بھی نہیں، لیکن اکثر ناسمجھ اُس کی وسعت کو سمجھنے سے مجبور ہوتے ہیں۔ اِس میں عمر کی کوئی قید نہیں۔

راجکمار کو نینا سے بے انتہا محبت تھی ـــ اور ہے۔ یہ بھی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ دنیا میں روحوں کے رشتے کبھی کبھی اِتنے مضبوط ہوتے ہیں کہ اُن کا ٹوٹنا آپسی تعلقات کے ٹوٹ جانے پر بھی ناممکن ہوتا ہے۔ لیکن راجکمار کے لئے نینا کا وجود دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ اہم تھا۔

وہ ایک سنجیدہ انسان تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ سنجیدگی اسے اُس وقت نے عطا کی تھی جو اُس نے اکیلے گزارا تھا۔ اس کے خاندان کا ایک ایک فرد کسی وبائی مرض کا شکار ہو گیا تھا۔ وہ اکیلا تھا ـــ تنِ تنہا۔ اور اتنی بڑی دنیا، زمانے کی ٹھوکریں ـــ جو اکیلے پن کے احساس سے اور زیادہ شدید ہو جاتی ہیں اُس کا حصہ بنیں۔ لیکن وقت کے پتوار اُسے طوفانی دریاؤں کے ساحل تک لے آئے۔ ایک اُمید بندھ چلی تھی۔ مستقبل اب صاف نظر آنے لگا تھا۔ اُس کا اچھا خاصہ کاروبار تھا، دولت تھی اور اُس کے

ساتھ ہی ملنے والی جرأت۔ اُسے غم تھا تو یہ کہ باوجود اپنی تمام تر ذہانت کے وہ دنیا کی نظروں میں جاہل تھا۔
اُس کے پاس کوئی سند نہ تھی۔ حالانکہ اُسے تعلیم زمانے کی تنگ و تار گلیوں میں ملی تھی۔ کھلی فضا میں ——
پُر ہجوم چوڑی چکلی سڑکوں پر قدرت نے اُس کا امتحان لیا تھا۔ دروازوں پر دستک دیتی ہوئی آوازوں
نے اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر راہِ راست کی طرف اشارہ کیا تھا —— معصوم بچوں کی چیخ پکار —— درد
سے تڑپتے انسانوں کی آواز —— بے جان قہقہے —— شاطر چالیں —— رُوحانی نور کی کرن —— رات کی سنسان
اور پُر ہول تنکن —— دن کی تابناکی —— سب ہی اُس کا حصّہ بنے تھے۔ اُسے قدرت نے اپنے آنگن میں
تعلیم دی تھی اور اُس کے شوق نے اُسے اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ کسی بھی مہذب سوسائٹی میں بیٹھ سکتا تھا!
وقت کی چھاپ اُس کے خیالوں پر اتنی گہری پڑی تھی کہ اگر وہ مسکراتا تھا تو تلخی صاف جھلکتی تھی۔
ہنستا تھا تو آواز میں ایک چھپا ہوا درد صاف سمجھ میں آتا تھا۔ یہاں تک کہ اگر وہ نینا کو دیکھ کر خوش
ہوتا تھا تو چہرے پر کوئی خاص تاثرات نظر نہ آتے تھے، البتہ آنکھوں کی چمک بڑھ جاتی تھی۔ اُن کا
پیغام پڑھنا اور سمجھنا تو نینا کا کام تھا!۔
مگر نینا باوجود اپنی بے پناہ خوبصورتی کے ایک سادہ لوح لڑکی تھی۔ اُسے ہمیشہ اس کی شکایت تھی
کہ راجکمار اُس سے کھل کر باتیں کیوں نہیں کرتا؟ اُسے عام محبت کرنے والوں کی طرح چاند کے قصے
اور تاروں کی باتیں کیوں نہیں بتاتا؟ رفتہ رفتہ انہیں خیالوں کی رسی پکڑے وہ بے اعتباری کے پُرہول
صحرا میں آ گئی۔
اور اُسے راجکمار سے نفرت ہو گئی۔ اُس کے وجود کو اپنے اطراف میں اُس نے بوجھل جانا۔ ایسے تمام تر
خوبیوں والا راجکمار کمینہ اور ذلیل نظر آنے لگا اور ایک دن جب راجکمار اُسے اپنے خوابوں کی تعبیر سمجھ کر
دیکھنے لگا اور حسین گلستانوں کا پُر رونق گلاب —— تو نینا نے اُسے ڈانٹ دیا۔ چوٹ جذبات کی گہرائیوں
کو چھوتی ہوئی دل و دماغ پر اثر انداز ہوئی اور راجکمار وہاں سے چلا آیا۔

راجکمار کو آج بھی یاد ہے کہ جب وہ اُس دن نینا کی چوکھٹ سے آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا باہر
نکل رہا تھا تو اُس کا سر گھوم رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب یہ قدم آگے نہ بڑھ سکیں گے
بالکل نہیں۔ لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ اب اِس ہوا میں ایک سانس بھی لے سکے، جو نینا کی
رہائش گاہ کے آس پاس سے ہو کر گذری ہو۔ وہ چلا گیا اور وقت یہ سب دیکھتا ہوا ایک زیرِ لب
ہنسی کے ساتھ گذر گیا۔
پھر اِس کے بعد راجکمار نے کبھی بھی اس راہ گذر کا رُخ نہیں کیا۔ اُس راستے کو اُس نے کبھی نہیں
دیکھا البتہ وہ تصور کے تیز رفتار پَروں سے مجبور تھا، جو اُسے —— رات کے سنّاٹے میں —— دن کے
بھرے اُجالے میں —— نینا کے دروازے پر دستک دینے پر مجبور کرتے رہتے تھے۔ کبھی اس نے
نینا کو اپنے مُنہ پر خنداں پایا اور کبھی جذبات کے دروازوں پر دستک دیتے دیتے وہ تھک ہار
کر واپس آیا۔ ماضی کا تصور آدمی کی بوجھل زندگی کا ایک حسین سہارا ہے۔ بے شک تابناک ہو

یا حال ایک ماضی مستقبل کی چمک سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے ـــ مشعل راہ بھی۔

وقت کی رفتار تیز تر ہو گئی۔ راجکمار جوانی کی نو بہاری سے قدم بڑھاتا ہوا ایک ٹھہری ہوئی وقت کی سطح تک پہنچ گیا۔ لیکن وقت کی رفتار تیز ہو تو زندگی کی رفتار بھی اس کے ساتھ ہی منسلک ہونے کے ناطے تیز ہو جاتی ہے۔
وقت نے پھر ایک کروٹ لی۔ اب کے راجکمار وقت کے بوجھل قدموں کے نیچے دب گیا۔ ۱۹۳۰ء کی مندی نے اس کے کاروبار کو بھی ختم کر دیا۔ سارا سرمایہ ڈوب گیا۔ طوفانوں سے لڑ کر حاصل کی ہوئی توانائی کے سہارے راجکمار نے سوچا:
"وقت اب بھی برا نہیں ہے اور پھر میں ـــ میں نے تو زندگی کے نشیب و فراز دیکھے ہیں!"
لیکن وقت کے ترکش میں راجکمار کی تقدیر کا ایک اور تیر باقی تھا۔ رفتہ رفتہ راجکمار کا کاروبار بالکل ختم ہو گیا اور اس کا ماضی لوٹ آیا۔ کبھی سڑکوں پر فاقوں میں گذر بسر کرنے والے راجکمار کو وقت نے آئینہ دکھایا اور منہ چڑانے لگا!

کئی دنوں سے گلے لگی الجھن اور خیالوں کے ادھیڑ بن کے بعد راجکمار ایک بوجھل صبح کو جمال کے گھر پہنچ گیا۔ جمال اس کا بچپن کا دوست تھا۔ ایک چھوٹا سا گیرج تھا جو اس کا اپنا۔ دونوں نے وقت کی دھڑکن ایک ساتھ سنی تھی۔ ایک ساتھ ہنسے تھے ـــ روئے تھے اور ابتدائی تعلیم پائی تھی۔
"آہا ـــ تم"۔
"ہوں ـ کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟"
"راجکمار ...."
"میرے دوست ... مجھ سے پوچھو کچھ مت ... اگر مناسب سمجھو تو مجھے ساتھ رہنے کی اجازت دے دو۔ سوچتا ہوں، باقی زندگی تمہارے ساتھ گذار لوں ـــ تھوڑا سرمایہ پس ماندہ ہے ..." راجکمار نے بے وقت کہا اور کھانسنے لگا۔
"تکلف برطرف ... میں خوب سمجھا ..." اور جمال نے راجکمار کو گلے سے لگا لیا۔

صبح نے شام اور شام نے صبح سے بغلگیر ہو کر راجکمار کی کہانی کہی۔ جمال نے راجکمار کے ابھرے ماتھے پر پڑی ہوئی وقت کی شکن پڑھ لی۔ اسے راجکمار پر ترس آنے لگا۔

آج صبح ہی سے وہ اداس تھا۔ تینا اسے آج پھر تیس برس گذر جانے کے بعد بھی بری طرح یاد آ رہی تھی۔

اس نے بے خیالی میں کمرے کی چھت کی طرف دیکھنا شروع کیا اور خیالوں میں ڈوب گیا۔ یہ اس کی عادت سی تھی۔ افسردگی کے لمحات میں خلاء میں گھورنا اس کی فطرت بن چکا تھا۔ تخیل کی دھندلی زنجیر تو اس وقت ٹوٹی، جب دیوار پر آویزاں اسے جمال کی ایک تصویر نظر آئی۔ بھرپور جوان ـــ مستقبل کی

نینا کی نگاہوں سے جھلکتی ہوئی۔ وہ خوش ہو گیا اور اُس نے فریم بچوں کی جیسی پھرتی سے دیوار سے اُتار لیا۔ دیکھتے دیکھتے اُسے جمال کے فوٹو پر خود اپنے خدوخال نظر آنے لگے اور وہ کھو گیا ـــ خیالوں کی تیز رو تھی فضا میں ـــ چاند کے بھی اُس پار۔ اور پھر تصوّر کی نگاہ اُسے ماضی کے راجکمار کے دُھندلکے لے آئی اور تندرست جواں سال خوبصورت راجکمار نے کمزور اور بوڑھے راجکمار کو بے حد تحقیر آمیز نگاہ سے دیکھا اور دیکھ کر ایک لمبی شاہراہ پر کترا کر نکل گیا اور بوڑھے راجکمار نے جواں سال خوبصورت راجکمار کو ناصحانہ انداز سے قدم اُٹھا کر آگے بڑھتے ہوئے دیکھا اور دیر تک یوں ہی دیکھتا رہا اور وہ دُور ـــ بہت دُور چلا گیا اور رفتہ رفتہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور پھر بوڑھے راجکمار کا شانہ تنہائی نے خود آکر ہلا دیا۔

... اور اُس نے فریم پلٹ کر دیکھا تو ایک لمحے کے لئے مبہوت سا ہو گیا۔ پھر اچانک نہ جانے کس جذبے کے تحت اُس کے ہاتھ سے فریم چھوٹ گیا۔

"ارے ... یہ نینا ... نینا تم ... یہاں بھی ... بے چارہ جمال! میری طرح وہ بھی ماضی کا دامن مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہے۔"

اُسے یاد نہیں ہے کہ کس جذبے سے مجبور ہو کر اُس نے فریم ہاتھ سے چھوڑ دیا تھا لیکن اُسے یہ آج بھی یاد ہے کہ اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ کیونکہ جب اُس نے نینا کی تصویر دیکھنے کی کوشش کی تھی تو اُسے ایسا لگا تھا جیسے اُس کے چہرے پر نقاب سی پڑ گئی ہو لیکن پھر دھیرے دھیرے اُسے نینا کا دُھندلا چہرہ نظر آنے لگا تھا اور رفتہ رفتہ اُس پر سے نقاب ہٹ سی گئی تھی۔

شام کو جمال جب واپس آیا تو اُس نے راجکمار کو حد سے زیادہ اُداس پایا:

"راجکمار .... میرے دوست ـــ اِتنے اُداس کیوں ہو؟ کاروبار بگڑ گیا تو کیا بات ہے؟ کاروباری حالات اعتدال پر آنے ہی والے ہیں۔ جلد ہی ہم تم ایک نیا کاروبار شروع کریں گے۔"

"نہیں جمال ـــ اِدھر دیکھو۔" اور راجکمار نے نینا کی اُس تصویر کی طرف اشارہ کر دیا جس کے دوسری طرف جمال کا فوٹو تھا۔

"ارے ... بھئی ..." اور جمال بچوں کی طرح شرما کر خاموش ہو گیا۔

"نہیں ـــ کوئی بات نہیں ـــ اگر اجازت دو تو اب یہ تصویر ایسے ہی لگی رہے۔" راجکمار نے بڑی آواز میں سنجیدگی سے کہا اور افسردہ خیالی سے سر جھکا لیا۔ آنسو کے دو قطرے بے اختیار اُس کی بے نور سی آنکھوں سے بے تابی سے نکل کر نیچے فرش پر بکھر گئے اور وقت نے گھوم کر اُس شام کی طرف دیکھا جب نینا نے راجکمار کی نظروں کو اپنے اعتماد کا پیغام دیا تھا۔

مگر جمال نے تو یہ سب اُس وقت دیکھا جب اُس نے اپنی آنکھ کے بہتے پانی کو رومال سے پونچھ کر سر اُٹھایا۔

ایک سایہ تھا اور زندگی کے دو موڑ۔

نذیر اختر

غزل

چندا کا جسم رات کی باہوں میں جل گیا
فولاد جیسے موم کی صورت پگھل گیا
دستِ جنوں میں جب کوئی پتھر مچل گیا
ہر کانچ کے مکاں کا کلیجہ دہل گیا
تیرا خیال ڈوبتے سورج کے رنگ میں
غازہ غمِ حیات کے گالوں پہ مل گیا
بوتل کا کاگ اڑتے ہی ماحول جاگ اٹھا
سویا ہوا خیال بھی اوپر اچھل گیا
حسرت زدہ کھڑا کوئی تکتا ہے یوں مجھے
کچے رنگوں کی طرح میں جیسے بدل گیا

صہبا وحید

غزل

کس نے دریوزہ گری میں ہمیں کیا دینا تھا
اس بہانے سے مگر اس کو صدا دینا تھا!
یوں بھی تعبیرِ تمنا کے مراحل ہیں کٹھن
آگ مدھم تھی تو دامن سے ہوا دینا تھا
میں تجھے پا نہ سکوں پاس ترے آ نہ سکوں
راستے میں کوئی دیوار اٹھا دینا تھا
مجھ کو دینا تھا گزرتے ہوئے آنے کا فریب
یعنی دروازے کی زنجیر ہلا دینا تھا
دل کا مصرف بھی ہے کیا اس کے سوا اے صہبا
روتے روتے اسے راتوں میں جگا دینا تھا

علیم جہانگیر

غزل

چمن چمن ترے دستِ حنا کے چرچے ہیں
گلی گلی ترے رنگِ قبا کے چرچے ہیں
زمانہ ہو گیا پھولوں کو مسکرائے ہوئے
روش روش وہی موجِ صبا کے چرچے ہیں
نظر نظر پہ ہے جادو تری نگاہوں کا
زباں زباں ترے ناز و ادا کے چرچے ہیں
کہاں کہاں یہ تری جستجو کروں اے دوست
کہ چار سو تری آوازِ پا کے چرچے ہیں
زمینِ دل کہ جہانگیر اب بھی پیاسی ہے
قریب و دور برستی گھٹا کے چرچے ہیں

شفق تنویر

غزل

بعد انتہا کے بھی، ابتدا نہیں کرتے
ہو گئی سحر پھر بھی، چشم وا نہیں کرتے
حد سے جب گزرتی ہے میکشوں کی محرومی
جام چھین لیتے ہیں، التجا نہیں کرتے
خوف سے گناہوں کے جو تجھے سے رہتے ہیں
زیست ایسی نعمت کا، حق ادا نہیں کرتے
اپنے ہی اجالے ہیں، خود کو دیکھنے والے
مہر و ماہ و انجم پر اکتفا نہیں کرتے
فاعلات مفعولن، جانتے تو ہیں تنویر
پھر بھی شعر کی تقطیع، ہم کیا نہیں کرتے

ڈراما

ابراهیم یوسف

پردے اٹھتے ہیں

افرادِ تمثیل

غازی:۔ .... ایک پیشہ ور شکاری
فرقان:۔ .... ایک نوجوان
سعادت:۔ .... ایک شہری
عبدل:۔ .... غازی کا نوکر

منظر

ایک ایسا کمرہ جس کی سجاوٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی شکاری کا کمرہ ہے۔ فرقان ایک آرام کرسی پر بیٹھا ایک کتاب اس طرح دیکھ رہا ہے جیسے صرف وقت گذاری کر رہا ہو۔ پاس ہی ایک گول میز پر سگریٹ کا پیکٹ، ماچس اور ایش ٹرے رکھی ہے۔ پورا ایش ٹرے سگریٹوں کے ٹکڑوں سے بھرا ہوا ہے اور اس میں سے دھواں نکل رہا ہے جیسے فرقان نے ابھی ابھی سگریٹ اسمیں ڈالی ہو۔ وہیں زمین پر ایک اخبار بے ترتیب پڑا ہے۔ فرقان کچھ دیر یوں ہی کتاب کی ورق گردانی کرتا رہتا ہے اور پھر کتاب میز پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت تھکا ہوا ہے۔ کچھ دیر بعد غازی کمرے میں آتا ہے۔ غازی کی شخصیت بہت پُر وقار ہے۔ عمر پینتالیس سال کے قریب ہے۔ کنپٹیوں کے پاس بال سفید ہو گئے ہیں۔ فرقان آنکھیں کھول کر اسے دیکھتا ہے۔ غازی کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انتہائی سنجیدہ ہے اور کسی اہم مسئلے پر غور کر رہا ہے۔ فرقان خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتا رہتا ہے۔ غازی میز پر سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کر ایک سگریٹ نکال کر جلاتا ہے پھر الماری کے پاس جا کر ایک نقشہ نکالتا ہے اور اسے میز پر پھیلا کر غور سے دیکھنے لگتا ہے۔ فرقان اس کا چہرہ دیکھ کر)

فرقان: کیا بات ہے، غازی چچا۔ آپ بہت پریشان نظر آ رہے ہیں؟۔

غازی: (برابر نقشے کو غور سے دیکھتے ہوئے) ہاں فرقان وہ زخمی ہو کر بھاگ نکلا ہے۔

فرقان: (حیرت سے) زخمی ہو کر بھاگ نکلا۔

غازی: (نقشے پر انگلی رکھ کر) اس جگہ آج میں نے گولی چلائی تھی۔ خلافِ توقع وہ اس کے [illegible]

کے میدان میں داخل ہو کر غائب ہو گیا۔

فرقان: پھر تو وہیں کہیں بیٹھا اپنے زخم چاٹ رہا ہوگا۔

غازی: مگر اس نے یہ سارا میدان پار کر لیا ہے (پھر ایک جگہ نقشے پر انگلی رکھ کر) یہاں سے ایک مرتبہ اس کی آواز سنائی دی تھی۔

فرقان: یہاں تو کوئی سے کے درخت ہیں اور پھر نالا ہے وہ ضرور نالے میں اتر گیا ہوگا۔

غازی: ہاں وہ ضرور نالے میں اتر گیا ہے لیکن اگر وہ نالے میں بائیں جانب مڑ گیا ہے تو پھر بہت خطرناک ہے۔ (فرقان خاموش رہتا ہے غازی پھر نقشے پر انگلی رکھ کر) نالے میں اس جگہ پانی ہے اور دیہات کے مویشی یہیں پانی پینے آتے ہیں۔ کہیں وہ مویشی اور انسان پر حملے نہ شروع کر دے۔

فرقان: ممکن ہے اس نے نالا بھی پار کر لیا ہو۔

غازی: یہاں کنارے بالکل عمودی ہیں۔ اس نے زخمی حالت میں شاید ہی نالا پار کیا ہو۔ (سوچتے ہوئے) ہمیں ہر حالت میں اسے ختم کرنا ہوگا۔

فرقان: مگر .....

غازی: (بات کاٹ کر) لیکن اور مگر کا سوال نہیں ہے، ہماری پریسٹیج کا سوال ہے۔ میں بیس سال سے یہاں کام کر رہا ہوں اور آج تک کوئی شیر زخمی حالت میں نہیں چھوڑا۔ جاؤ تیار ہو لو۔ ہم ابھی اس کی تلاش میں چلیں گے۔

فرقان: کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ .....

غازی: کچھ نہیں ہو سکتا۔ (پھر غور سے فرقان کا چہرہ دیکھ کر) بات کیا ہے، یہ تم آج اگر مگر کیوں کر رہے ہو؟

فرقان: جی نہیں، کوئی بات نہیں ہے بلکہ بات یہ ہے کہ۔ (چند سیکنڈ خاموش رہتا ہے پھر ایکدم جیسے کچھ یاد آ جاتے پر) ابھی ابھی یہ تار آیا ہے۔ (تار میز پر سے اٹھا کر غازی کو دیتا ہے غازی تار لیتے ہوئے)

غازی: کیسا تار ہے۔

فرقان: محکمہ جنگلات کی طرف سے ہے۔ ایک غیر ملکی شکار پارٹی آ رہی ہے جو ہماری خدمات حاصل کرنا چاہتی ہے۔

غازی: (تار پر نظریں ڈالتے ہوئے) کب آ رہی ہے؟

فرقان: آج ہی یہاں پہنچنے والی ہے۔ شاید گورنمنٹ کی مہمان خصوصی ہے اس لئے سوچ رہا تھا کہ۔

غازی: لیکن زخمی شیر کا ختم کیا جانا بہت ضروری ہے۔ اگر اس نے ایک آدھ واردات کر دی تو میری ساری عزت خاک میں مل جائے گی۔ (نقشہ لپیٹ کر الماری میں رکھتے ہوئے) جب تک میں نہاتا ہوں تم بھی تیار ہو لو۔

فرقان: مگر .....

غازی: (پلٹ کر فرقان کو دیکھتے ہوئے) پھر وہی مگر، آخر بات کیا ہے، صاف صاف کیوں نہیں کہتے؟

فرقان: جی۔ کوئی بات نہیں ہے۔ میں ابھی تیار ہوتا ہوں۔

غازی: (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) میں نہا کر ابھی آتا ہوں۔ تم عبدل سے جائے کے لئے کہہ دو اور تیار ہو جاؤ (پھر پلٹ کر) ریسٹ ہاؤس کسی شخص کو پہنچا دو اور وہاں جو شکار پارٹی ٹھہری ہوئی ہے اس سے کہلوا دو کہ کل تک تمام پروگرام منسوخ رہیں گے۔

فرقان: بہت اچھا۔ (غازی دروازے کی طرف بڑھتا ہے) کیا ہم اس کی تلاش کل نہیں کر سکتے؟

غازی: (پلٹ کر پھر فرقان کو دیکھ کر) اگر کل تک

اُس نے ایک دو مویشیوں کو زخمی کر دیا، یا
کسی انسان پر حملہ کر دیا تو پھر کیا ہوگا۔؟
(دروازے کی طرف مُڑ جاتا ہے مگر پھر کچھ
سوچ کر، جیسے کچھ یاد آجانے پر) آخر بات
کیا ہے؟ تم صاف صاف کیوں نہیں کہتے۔

فرقان: (نظریں جھکا کر آہستہ سے) آج مس سعادت
جارہی ہے۔

غازی: مس سعادت جارہی ہے! کہاں جارہی ہے؟

فرقان: شہر۔

غازی: شہر! اب شہر کیوں جارہی ہے؟

فرقان: مسٹر سعادت اسے واپس شہر بھیج رہے
ہیں۔

غازی: اس بُڈھے کھونسٹ کا دماغ خراب ہوگیا
ہے۔ (چند سیکنڈ فرقان کو غور سے دیکھتا
رہتا ہے۔ پھر مُسکرا کر) تم چاہتے ہو کہ وہ
شہر نہ جائے؟

فرقان: میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے
بہر حال مسٹر سعادت اُس کے باپ ہیں۔

غازی: (طنزیہ ہنسکر) باپ! وہ بُڈھا خود کو بہت
عقلمند سمجھتا ہے۔ بیوقوف۔۔۔ مگر تم ایسی
فضول باتوں میں پڑ کر اپنے پیشے سے انصاف
نہیں کر رہے ہو۔

فرقان: آج تک کسی بزرگ نے یہ نہیں کہا کہ اُس
کا چھوٹا اپنے پیشے سے انصاف نہ کر رہا ہے۔
(غازی پھر فرقان کو غور سے دیکھتا ہے فرقان
نظریں جھکا لیتا ہے۔ غازی کے چہرے پر
محبت بھری مسکراہٹ آتی ہے۔ آہستہ
آہستہ فرقان کے پاس آکر اُس کے کاندھے
پر ہاتھ رکھ کر)۔

غازی: فرقان! میں نے یہ نہیں کہا کہ نوجوانوں کو
محبت نہیں کرنا چاہیئے۔ (ہنستا ہے) نوجوان
محبت کرتے ہوئے ہی اچھے معلوم ہوتے
ہیں۔ (پھر کاندھا تھپتھپا کر مسکراتے ہوئے)
آج میں تنہا ہی اُس زخمی شیر کی تلاش میں
چلا جاؤں گا مگر وہ بُڈھا کھونسٹ کس قدر
خبیث ہے ابھی تم نے سمجھا نہیں ہے۔
(پھر محبت سے اُس کا کاندھا تھپتھپاتا ہے
اور آہستہ آہستہ کمرے سے چلا جاتا ہے۔
فرقان چند سیکنڈ خاموش رہتا ہے پھر بلند
آواز سے)

فرقان: عبدل دادا۔ عبدل دادا۔ (کچھ دیر بعد عبدل
کمرے میں آتا ہے۔ فرقان اُسے دیکھ کر۔)
غازی چچا کے لئے چائے تیار کر دو۔

عبدل، صاحب واپس آگئے؟

فرقان: ہاں اور ابھی زخمی شیر کی تلاش میں جارہے ہیں۔

عبدل: زخمی شیر کی تلاش میں! آپ اُن کے ساتھ
نہیں جائیں گے؟

فرقان: ہاں۔ میں نہیں جا رہا ہوں۔

عبدل: (حیرت سے) کیوں! آج تک تو ایسا نہیں ہوا۔

فرقان: مجھے ایک ضروری کام ہے۔

عبدل: ایسا بھی کیا ضروری ہے فرقان میاں۔ انہیں
جنگل میں تنہا نہیں جانا چاہیئے۔ (چند سیکنڈ
خاموش رہ کر) اگر آپ نہیں جارہے ہیں تو
میں چلا جاؤں گا۔

فرقان، عبدل دادا تم!۔

عبدل، میں بوڑھا ضرور ہوگیا ہوں مگر اب بھی سونگھ کر
بتا سکتا ہوں کہ جنگل میں کیسی ہوائیں چل رہی
ہیں۔ آپ نہیں جانتے کہ سعادت میاں اُنکے
کس قدر دُشمن ہیں۔

فرقان، دُشمن! اور غازی چچا کے۔۔۔ وہ تو اُن کے۔

عبدل، (بات کاٹ کر) شاید کوئی راز ایسا ہے جس کا علم صاحب کو ہے اور سعادت میاں دل ہی دل میں اُن کے دُشمن ہیں۔ آپ کو کیا پتہ کہ... جب آپ چھوٹے تھے... مگر خیر چھوڑو اِن باتوں کو۔ آج میں ہی اُن کے ساتھ چلا جاؤں گا۔

فرقان، اگر ایسی کوئی بات ہے تو ـــ اچھا تم جائے تو تیار کر دو۔ (عبدل مُڑ کر دروازے کی طرف جاتا ہے) اور لچھمن کو رلیسٹ ہاؤس بھیج دو۔

عبدل، رلیسٹ ہاؤس! کیوں ؟

فرقان، وہاں جو پارٹی ٹھہری ہوئی ہے اُس سے کہلوا دو کہ آج کے سارے پروگرام ملتوی رہیں گے۔ (عبدل کمرے سے چلا جاتا ہے۔ فرقان کچھ دیر خاموش کھڑا رہتا ہے۔ پھر کچھ سوچ کر رائفل اُٹھا کر اُسے ایک دو مرتبہ چیک کرتا ہے اور کُرسی سے ٹِکا کر رکھ دیتا ہے۔ دُوسری رائفل اُٹھا کر اُسے چیک کرتا ہے۔ کھونٹی سے اپنا شکاری کوٹ اُتار کر پہنتا ہے۔ الماری سے کارتوس نکال کر جیب میں ڈالتا ہے۔ اُسی وقت غازی پھر کمرے میں آتا ہے۔ وہ نہانے کے لئے تیار ہے۔ فرقان کو یوں تیار ہوتا دیکھ کر مُسکراتے ہوئے)

غازی، یہ سب کیا ہو رہا ہے ؟

فرقان: (پلٹ کر غازی کو دیکھ کر) میں نے اپنا اِرادہ بدل دیا ہے۔

غازی، (مُسکراتے ہوئے) اِرادہ بدل دیا ہے !۔ کیوں ؟ مس سعادت کو سی آف نہیں کرو گے ؟۔

فرقان: جی نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ شاید یہاں آئے ـ مگر اب وہ شاید نہیں آئے گی۔

غازی، تم نوجوان بڑے جذباتی ہوتے ہو۔ پہلے تمہیں مس سعادت کو ایک بہادر کی طرح سی آف کرنا چاہیئے۔ (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) لچھمن سے کہہ دینا کہ وہ میرے ساتھ جانے کو تیار رہے۔

(جواب کا انتظار کیئے بغیر کمرے سے چلا جاتا ہے۔ فرقان کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے کہ سعادت کمرے میں آتا ہے۔ فرقان اُسے دیکھ کر، حیرت سے)

فرقان، ارے آپ! (سعادت خاموشی سے اُسے گھورتا رہتا ہے) آخر بات کیا ہے۔

سعادت، اُس نے شہر جانے سے انکار کر دیا ہے۔

فرقان: شہر جانے سے انکار کر دیا ہے! یعنی کہ آپ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

سعادت: تم خوب مطلب سمجھتے ہو مگر یاد رکھو تم اِس طرح اُسے بغاوت پر آمادہ کر کے اپنا مطلب حل نہیں کر سکتے۔

فرقان، کیا مطلب ؟ میں نے کسی کو بغاوت پر، آمادہ نہیں کیا ہے۔

سعادت: تم سمجھتے ہو کہ اِس طرح تم اپنا اُلّو سیدھا کر لو گے (غصّے اور نفرت سے) یاد رکھو، مجھے تم سے نفرت ہے۔

فرقان: مگر اِس کا یہ مطلب نہیں کہ میں کسی سے محبت نہ کروں۔ (بندوق اُٹھا کر غصّے سے ایک دو مرتبہ پھر اُسے چیک کرتا ہے۔ سعادت خاموشی سے اُسے دیکھتا رہتا ہے۔ پھر نفرت اور حقارت سے)

سعادت: تم سمجھتے ہو کہ اپنی بندوق کی اِس کھٹ پٹ سے مجھے ڈرا لو گے۔ میں ایک مرتبہ پھر کہتا ہوں کہ مجھے تم سے نفرت ہے سخت نفرت۔

فرقان: میں اتنا بُزدل نہیں ہوں کہ انسان پر اپنی

گولی ضائع کروں۔

سعادت: تم اپنی اوقات پر غور کرو کہ تم کیا ہو۔

فرقان: میری اوقات کچھ بھی ہو مگر اُن سے ضرور بہتر ہے جو محبت نہیں نفرت کرنا جانتے ہیں۔

سعادت: تم گندی نالی میں سڑنے والے کیڑے تھے۔ اگر غازی تم کو سہارا نہ دیتا تو تم چور ہوتے ڈاکو ہوتے مجرم ہوتے اور تمہاری جگہ کسی جیل خانے کی کوٹھری ہوتی۔

فرقان: مسٹر سعادت مجھے مجبور نہ کیجیے کہ میں اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھوں۔

(غصے سے بندوق اُٹھاتا ہے۔ سعادت پر ایک نفرت آمیز نظر ڈالتا ہے اور تیز تیز قدموں سے کمرے سے چلا جاتا ہے۔ سعادت کچھ دیر حیرت زدہ خاموش کھڑا رہتا ہے۔ چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی انجانے خوف سے گھبرا گیا ہو۔ چند منٹ پریشان سا کمرے میں ٹہلتا رہتا ہے۔ پھر ایکدم دوسری بندوق اُٹھا کر دروازے کی طرف بڑھتا ہے کہ غازی نہا کر کمرے میں آتا ہے۔ غازی چند سیکنڈ میں ماحول کا جائزہ لے کر)

غازی: یہ بندوق کہاں لے جا رہے ہو۔

سعادت: (غصے اور نفرت سے) اگر وہ میرے گھر پہنچا تو میں اُسی کی بندوق سے اُسکا خون کر دونگا۔

غازی: کِس کا؟

سعادت: فرقان کا۔ اُس کمینے نے میری زندگی کی ساری خوشیاں لُوٹ لی ہیں۔ مجھے ذہنی بیمار، ایک تھکا ہوا انسان اور ایک ہارا ہوا جواری بنا دیا ہے۔

غازی: (پُرسکون لہجے میں) بندوق رکھدو۔ وہ تمہارے گھر نہیں جائے گا۔

سعادت: وہ ضرور میرے گھر جائے گا۔ اُس نے میری لڑکی کو محبت کا لالچ دے کر اِس قدر نافرمان بنا دیا ہے کہ وہ مجھ سے بغاوت پر اُتر آئی ہے۔

(دروازے کی طرف بڑھتا ہے غازی غصے سے)

غازی: میں کہتا ہوں دروازے کے باہر نہ جانا ورنہ ....

سعادت: (پلٹ کر غازی کو دیکھ کر) ورنہ کیا۔

غازی: ورنہ اِس کا انجام اچھا نہ ہوگا۔

سعادت: مجھے اِس کی پروا نہیں۔ میں نے ایسی گیدڑ بھبکیاں بہت سنی ہیں۔

غازی: (غصے سے) میں کہتا ہوں بندوق رکھدو تم ناعاقبت اندیش بُڈھے کھوسٹ۔

سعادت: (غصے سے چیخ کر) غازی! کہیں ایسا نہ ہو کہ اِس بندوق کا رُخ تمہاری طرف ہو جائے۔

غازی: (سعادت کی طرف بڑھتے ہوئے) سعادت! مجھے طاقت کے استعمال پر مجبور نہ کرو۔ میں آخری بار کہتا ہوں کہ بندوق رکھدو۔

(سعادت چند سیکنڈ غازی کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھتا رہتا ہے اور پھر ایک مایوس انسان کی طرح بندوق میز پر پھینک دیتا ہے اور ایک کرسی پر بالکل شکست خوردہ انسان کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔ غازی خاموشی سے اُسے دیکھتا رہتا ہے۔ کچھ دیر بعد سعادت نظریں اُٹھا کر بہت مایوسانہ لہجے میں)

سعادت: غازی! میں نے ہمیشہ تمہیں اپنا دوست سمجھا ہے۔ مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ ایک روز تم اِس طرح میری عزت نیلام پر چڑھا

دو گے۔

غازی: اور میں تمہیں اُس وقت اپنا دوست سمجھتا تھا جب تم نے مجھے زخمی شیر کے سامنے دھکیل دیا تھا۔ اگر فرقان کے باپ نے میرے سامنے آکر اپنی جان نہ دیدی ہوتی تو آج میں اِس لئے زندہ نہ ہوتا کہ تم مجھے اپنا دوست کہو۔

سعادت: لیکن بخدا میرا ضمیر پاک ہے۔

غازی: مجھے تمہارے ضمیر سے مطلب نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ تم نے اپنی خود غرضی کی خاطر مجھے زخمی شیر کے سامنے جان بوجھ کر دھکیلا تھا اور تمہیں فرقان سے اِس لئے نفرت ہے کہ اُس کے باپ نے اپنی جان دے کر میری جان کیوں بچائی اور میں ابھی تک کیوں زندہ ہوں۔ تم ہمیشہ غصے میں فیصلہ کرنے کے عادی ہو اور اپنا ذہنی توازن کھو دیتے ہو۔

سعادت: اگر تمہاری لڑکی اس طرح تم سے بغاوت کرتی اور تم پُرسکون رہتے تو مجھے تم پر تعجب ہوتا۔

غازی: اگر میری پڑھی لکھی اور سمجھدار لڑکی اپنے مستقبل کے لئے مجھ سے بغاوت کرتی تو مجھے خوشی ہوتی۔

سعادت: تم ایک باپ کے جذبات کو کیا سمجھو گے۔ تم نے کبھی شادی نہیں کی، تمہارے کبھی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

غازی: (طنزیہ مسکرا کر) یقیناً میں تمہاری طرح کبھی باپ نہیں بنا۔ لیکن میں نے بھی ایک نوجوان کو باپ بن کر پالا ہے (عبدل چائے لے کر کمرے میں آتا ہے۔ غازی اُسے دیکھ کر) چھمن کہاں ہے؟

عبدل: ریسٹ ہاؤس گیا ہے۔

غازی: تم جا کر دیکھو فرقان کہاں گیا ہے؟

عبدل: بہت اچھا۔

(عبدل چائے میز پر رکھ کر کمرے سے چلا جاتا ہے۔ سعادت چند سیکنڈ خاموش رہ کر)

سعادت: تم نے ایک لڑکے کو پالا ضرور ہے، مگر کسی لڑکی کو نہیں۔ اگر تم ایک لڑکی کے باپ ہوتے تو کیا تم اِس کو پسند کرتے کہ اُس کا ہاتھ کسی ایسے کے ہاتھ میں دیدیا جائے جس کا کوئی ماضی نہیں ہے۔

غازی: وہ ایک بہادر باپ کا بیٹا ہے۔ میں نے اسے اعلیٰ تعلیم دلوائی ہے۔ وہ خود بھی بہادر ہے پھر اور کیا چاہیئے۔ رہا ماضی کا سوال، تو ماضی کتنے لوگوں کے اچھے ہوئے ہیں، یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ کبھی تم نے اپنے ماضی پر بھی غور کیا ہے؟

سعادت: میرا ماضی!

غازی: ہاں۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) تم اُس لڑکی کے متعلق بھی تو سوچو جس کا خود کوئی ماضی نہیں ہے۔

سعادت: وہ ایک شریف ماں باپ کی لڑکی ہے۔

غازی: (طنزیہ مسکرا کر) ہاں اِس قدر شریف ماں کی جو اُسے یتیم خانے میں پھینک آئی تھی اور جہاں سے تم اُسے اُٹھا لائے ہو۔ (طنزیہ) تم اس کی ماں کے قاتل کو تو جانتے ہو گے!

سعادت: میں نہیں جانتا۔

غازی: (نفرت اور طنز کے لہجے میں) عدالت میں تم نے اپنی بے گناہی ثابت کر دی، مگر حقیقت کیا ہے یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ کیا تمہارے اُس کی ماں سے ناجائز

تعلقات نہیں تھے۔ کیا تم نے اُس کو اسلئے
قتل نہیں کیا تھا کہ تمہارے علاوہ بھی اس
کے کسی اور سے تعلقات تھے؟

سعادت: مگر غازی ....

غازی: (بات کاٹ کر) کہو تمہارے ہاتھ انفعانی خون سے رنگے ہوئے نہیں ہیں۔ میرے پاس آج بھی ثبوت موجود ہے اور میری زبان کی ذرا سی جنبش آج بھی تمہارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈلوا سکتی ہے۔

سعادت: (غصّے میں کھڑے ہو کر) میں ہتھکڑیاں پہننا پسند کروں گا مگر اپنی لڑکی کا ہاتھ فرقان کے ہاتھ میں نہیں دے سکتا۔

غازی: (طنز اور نفرت سے) تمہاری لڑکی!

سعادت: ہاں میری لڑکی۔ فرقان کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ دینے سے تو میں یہ بہتر سمجھوں گا کہ اس کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دیدوں۔

غازی: (چیخ کر) سعادت!

سعادت: ہاں تمہارے ہاتھ میں۔ مجھے فرقان سے نفرت ہے۔ اُس نے میری نصیحتوں کا مذاق اُڑایا ہے۔ اُس نے میری بزرگی کی تضحیک کی ہے۔ اُس نے میری لڑکی کو بغاوت پر آمادہ کیا ہے۔ بولو تم اس سے شادی کرنے کو تیار ہو؟

غازی: شاید تمہارا نفرت کا جذبہ اس قدر شدید ہو گیا ہے کہ تم اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے ہو۔

سعادت: نہیں۔ میں قطعی اپنے ہوش و حواس میں ہوں۔ میں تمہارے اندر ایک اچھا شوہر بننے کی صلاحیت پاتا ہوں۔ تمہارے اندر شرافت کی نیکیاں ہیں۔ تمہارے اندر مردانہ وجاہت ہے۔ تمہاری شخصیت پُر وقار ہے۔

غازی: میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ تم پاگل ہو گئے ہو (طنزیہ مسکراکر) ممکن ہے میرا ماضی بھی گھناؤنا رہا ہو۔

سعادت: ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں تمہیں بیس سال سے جانتا ہوں۔

غازی: (اسی طرح طنزیہ انداز میں) اور میری عمر پینتالیس سال کی ہے۔

(عبدل گھبرایا ہوا کمرے میں آتا ہے اس کی سانس پھولی ہوئی ہے۔ پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان)

عبدل: صاحب۔ صاحب۔ (غازی عبدل کو دیکھتا ہے) صاحب۔ فرقان میاں ــــ

غازی: فرقان میاں ــــ فرقان کو کیا ہوا؟

عبدل: جی وہ ــــ جی وہ ــــ صاحب وہ ــــ

غازی: (عبدل کے دونوں بازو پکڑ کر ہلاتے ہوئے) اپنے ہوش میں آؤ۔ فرقان کو کیا ہوا۔

عبدل: کچھ نہیں صاحب ــــ مگر وہ ــــ

غازی: (اس کے بازو چھوڑ کر) پھر تم اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟

عبدل: وہ بہت تیزی سے جیپ لے کر جنگل کی طرف گئے ہیں۔ بہت غصّے میں تھے۔

غازی: تم بھی اُس کے ساتھ کیوں نہیں گئے؟

عبدل: میں نے جیپ میں چڑھنے کی کوشش کی مگر اُنہوں نے دھکا دے کر مجھے گرا دیا اور چلے گئے۔ صاحب وہ ضرور زخمی شیر کی تلاش میں گئے ہیں۔

غازی: زخمی شیر کی تلاش میں!

عبدل: جی ہاں۔ جیپ کا رُخ جنگل ہی کی طرف تھا۔ وہ اِس وقت اپنے ہوش میں نہیں

تھے۔ گاڑی غیر معمولی رفتار سے چلا رہے تھے
صاحب انہیں کہیں کچھ ہو نہ جائے۔
(غازی تیزی سے بندوق اٹھا کر اپنے کاندھے
پر رکھتا ہے۔ پھر سعادت کو غصّے سے دیکھتا
ہے پھر ایک دم اُس کا گریبان پکڑ کر)

غازی: اگر اُس کو کچھ ہو گیا تو میں تیرا خون پی لونگا
(دھکا دے کر اُسے کُرسی پر گرا کر) یاد رکھنا
میری گولی عدالت کا انصاف نہیں ہے،
ہمیشہ اپنے نشانے پر لگتی ہے۔

سعادت: مگر غازی . . .

غازی: (بات کاٹ کر) جوشِ انتقام میں تُو اس قدر
نیچے گر گیا ہے کہ انسانیت کے تمام آداب
بھول گیا ہے۔ تُو اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ
کس کی لڑکی ہے۔

سعادت: وہ میری لڑکی ہے۔

غازی: تیری۔ (طنزیہ قہقہہ مار کر ہنستا ہے) اُس
کی شادی تو مجھ سے کرنا چاہتا ہے۔ تجھے
میرا ماضی معلوم ہے (نفرت سے) میں نے
مردم شماری میں کبھی اپنے باپ کا نام نہیں
لکھوایا۔ ہمیشہ اپنی ماں کا نام لکھوایا ہے۔

سعادت: (چیخ کر) غازی!

غازی: وہ اُس کی لڑکی ہے جس سے تُو نے انتقام
لینے کے لئے زخمی شیر کے سامنے ڈھکیل
دیا تھا۔ تو تو اُسے پرورش کر کے اپنے
گناہوں کا کفارہ ادا کر رہا ہے۔

سعادت: یہ جھوٹ ہے وہ تیری نہیں میری لڑکی ہے۔

غازی: جسطرح میں یہ ثابت کر سکتا ہوں کہ تو اُسکی ماں کا
قاتل ہے اُسی طرح میں یہ بھی ثابت کر سکتا ہوں کہ
وہ تیری نہیں میری لڑکی ہے میں جس سے چاہونگا
اُسکی شادی کر دوں گا۔ (تیزی سے کمرے
سے چلا جاتا ہے۔ سعادت خاموش کھڑا رہ جاتا ہے)

بقیہ افسانہ صفحہ ۳۸ "جمود کا جنازہ"

کے رہ جاتا ہوں۔ میں اکثر اُس سے کہتا ہوں۔

"نکال دو اس جمود کا جنازہ۔ تمہیں اپنا رنگ بدلنا ہو گا۔
زندگی سے یوں فرار ہو کر کب تک بھاگتے رہو گے۔"

وہ تھوڑی دیر کیلئے میرا منہ خاموشی سے تکتا رہتا پھر دھیمی آواز
میں جواب دیتا "جمود میری زندگی کا روگ بن گیا ہے۔ اس جمود کا جنازہ
اب تو میری زندگی کے جنازے کے ساتھ ہی اُٹھے گا"۔

بقیہ افسانہ صفحہ ۲۰ "چاندی کی تتلی"

کے دوسرے کنارے کی جانب چلیں۔ دہاں جنگل میں تتلیاں تلاش کرینگے۔"

میری بیوی نے دیکھا کہ ماں بچے کو لیکر گرتی پڑتی کہیں چل دی تھی۔ میری
بیوی اُس کے پیچھے پیچھے چل دی۔ اور اُس نے دیکھا بچہ میری ماں کی گردن
سے چمٹ کر لگا ہوا تھا۔ سامنے دریا آ گیا تھا۔ ماں چلتی جا رہی تھی۔ پانی
اُس کے ٹخنوں تک، گھٹنوں تک ہوتا ہوا اُس کے کندھوں تک آ گیا تھا
اور پھر سر سے بھی اونچا... میری بیوی دوڑ کے اُس کو بچا سکتی تھی۔ لیکن
اس نے ایسا نہیں کیا۔ اُس نے میرے سوا کسی کو بھنک نہیں پڑنے دی کہ
ماں کا کیا بنا۔ اُسی دن مجھے پتہ چلا کہ میری بیوی اُس سے بڑھ کر رحم دل عورت
ہے۔ جتنی میں اُس کو سمجھتا تھا۔

آئندہ شمارہ اپریل ۷۰ء

مقالے: سخن دہلوی۔ غالب کا ایک شاگرد۔ ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ
شاہ معین الدین ندوی۔ محمد ایوب واقف
افسانہ کیا ہے؟ ہارون ایوب
افلاطون کی غلطیاں ظہیر الدین

افسانے: مرد مرد جوگیندر پال
بوتھا فرد شمسی سکینہ
لالی رود ایس ایم حیات بادشاہ
مجھے معراج احمد
یم کا پیٹر ضیا حسنی

نظمیں: نازش پرتاب گڈھی۔ منموہن تلخ۔ اسرار اکبر آبادی۔
کیف احمد صدیقی۔ مریم غزالہ۔ اختر بستوی۔ جیلدر پرکاش شاد

رباعیات: ابو الفاضل راز چاندپوری مرحوم۔ شہاب سرمدی

غزلیں: نثار اٹاوی۔ کرشن موہن۔ رونق دکنی۔ ناکی انصاری
ہمدم کچھوری۔ رفیق پیالوی۔ منشاء الرحمٰن خاں منشا۔
صبا جائسی۔ سلیمان اطہر جاوید۔ ناز قادری۔
فرحت کیفی۔ عادل ادیب۔ ایرج کاشمیری۔

افسانہ: گاندھی نمبر وائیس۔ نقد و نظر (تبصرہ) مکتوبات۔ قلم کار

شمیم ہاشمی

سازش خوشبو نے کی ہے گل تک پہنچے صبا کے ہات
بلبل چپ چپ منہ دیکھ رہی ہے کس سے کہے بیکھر کی بات
اور بھی چیزیں گننے کی ہیں اور بھی غم ہیں سہنے کے
لوگوں کے دکھ گن لیتے کیوں تارے گن کر کاٹی رات
اب اندھیارے اور بڑھیں گے اور بڑھے گی بیتابی
ناگن بن کر ڈسنے آئی سورج کو یہ کالی رات
جنگ کا الو چیخ رہا ہے مغرب کی تاریکی سے
چھین لو روٹی کپڑا پہلے، تب دو گے مشرق کو مات
راکٹ دیکھ کے تارے سہمے چاند کا چہرہ زرد ہوا
ان کو بھی برباد نہ کر دیں خونی انسانوں کے ہات
تن کے اجلے، من کے کالے دنیا کے ہیں لوگ سبھی
دیکھ شمیمؔ ان عیاروں پر کھول نہ دینا دل کی بات

حباب ہاشمی

کچھ اس ادا سے وہ محفل میں دیکھتا ہے مجھے
کہ جانتے ہوئے انجان لگ رہا ہے مجھے
فریب مجھ کو خدارا نہ دے بنام وفا
ترے خلوص کا اندازہ ہو چکا ہے مجھے
بہت قریب سے دیکھا تو اپنا سایہ ہے
وہ ایک شخص جو آوارہ لگ رہا ہے مجھے
خدا گواہ کہ میں اپنے آپ میں گم ہوں
مرا وجود بھی ہر لحظہ ڈھونڈتا ہے مجھے
فسردہ چہرے پہ ہے کتنے ماہ و سال کی گرد
اب آئینہ بھی تو حیرت سے دیکھتا ہے مجھے
فقیر بن کے چلا ہوں حبابؔ شہر کی سمت
سگِ ضعیف بھی رہ رہ کے گھورتا ہے مجھے

غ ۳ زلیں

عزیز اندوری

جادوگروں کے بیچ کھڑا سوچتا ہوں میں
اپنے عصا بغیر کہاں آ گیا ہوں میں
جو بیج میں نے بوئے نہیں اس زمین پر
ان کی بھی فصل کاٹنے اٹھ کر چلا ہوں میں
زنجیرِ حادثات کی آواز سن سکوں
اس واسطے اسیرِ غمِ دل ہوا ہوں میں
تیرے تصورات کی خوشبو نہیں ملی
یوں تو ہر ایک پھول کو سونگھا کیا ہوں میں
گم ہو چکے ہیں پائے جہت آشنا مگر
منزل کی جستجو میں چلا جا رہا ہوں میں
کیا بات ہے کہ دورِ شعر زندگی عزیزؔ
دامن کی آن سے، اب بھی ہوا مانگتا ہوں میں

گاندھی نمبر

حامد اللہ ندوی ایم اے۔ مہاتما گاندھی ریسرچ میموریل، بمبئی

محترمی اعجاز صاحب!

شاعر کا گاندھی نمبر ملا۔ انتظار تو تھا ہی، شوق سے پڑھا۔ شاعر ایک ادبی پرچہ ہے اور گاندھی جی کی شخصیت سیاسی تھی، ادب اور سیاست میں ہم آہنگی پیدا کرنا کوئی آسان کام نہیں لیکن آپ کا نمبر دیکھ کر یقین ہو گیا کہ ایک ماہر فن کار مٹی کی بے جان مورتی کو بھی حسین، دل کش اور قابل پرستش بنا سکتا ہے، جس حسن، خوبی اور سلیقے سے آپ نے اس نمبر میں گاندھی جی پر تاثرات، مقالات، نظمیں، فیچرز اور اقتباسات جمع کئے ہیں۔ وہ آپ اپنی مثال ہیں۔ اس میں ہر ادیب اور شاعر نے شعوری طور پر اس بات کی کوشش کی ہے کہ سیاسی اصطلاحات کا سہارا لئے بغیر گاندھی جی کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اس طرح اجاگر کرے کہ ان کی عظمت کا احساس ہر دل میں جاگ اٹھے، اس نمبر میں جو تنوع، دلکشی اور جاذبیت ہے وہ گاندھی جی کی عظمت کے ساتھ ساتھ آپ کے جذبۂ خلوص، حسن اعتقاد اور مہارت فن کی بھی یاد دلاتی ہے۔ بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے یہ شاندار نمبر نکال کر اردو دنیا کی طرف سے گاندھی جی کو جو حسین خراج عقیدت پیش کیا ہے اس کیلئے اردو دنیا ہمیشہ آپ کی احسانمند رہے گی۔ میرا شکریہ قبول فرمائیے۔ حامد اللہ ندوی

ڈاکٹر سلام سندیلوی، گورکھپور یونیورسٹی۔ گورکھپور

برادر گرامی جناب اعجاز صدیقی صاحب۔ سلام مسنون

شاعر کا "مہاتما گاندھی نمبر" موصول ہوا۔ آپ نے گاندھی جی پر نہایت مفید اور وقیع نمبر پیش کیا ہے۔ گاندھی جی پر اس قدر ٹھوس معلومات کا کسی ایک جگہ ملنا بہت دشوار ہے۔ یہ نمبر شائع کر کے آپ نے قوم کے باپو کے سلسلہ میں ایک تاریخی دستاویز پیش کر دی ہے جس کی روشنی میں ملک و قوم کے افراد حیات مستقبل کی منزلیں طے کریں گے۔

خدا کرے اب آپ کی صحت ٹھیک ہو۔

خلوص کیش، سلام سندیلوی

پرنسپل جوگندر پال — اورنگ آباد

برادرم اعجاز صاحب۔ آداب،

شاعر کا گاندھی نمبر مل گیا ہے شکریہ۔ اسے دیکھ کر آپ کے حسن ترتیب کی داد دیئے بغیر نہیں بنتی۔ مجھے یقین ہے کہ اس سے نہ صرف گاندھی کا طالبعلم مستفید ہوگا بلکہ عام دلچسپی رکھنے والا بھی اس نمبر کو بڑی خاص دلچسپی سے پڑھے گا۔ خدا آپ کے بڑے بڑے حوصلے بنائے رکھے!

آپ کا۔ جوگندر پال

اختر بستوی ایم، اے نیشنل کالج — بستی

محترم اعجاز صاحب آداب و نیاز!

"شاعر کا مہاتما گاندھی نمبر" بذریعہ رجسٹری موصول ہوا بہت بہت شکریہ! اس نمبر کو دیکھ کر مجھ پر ایک سرور کُن حیرت سی طاری ہو گئی۔ یہ بات چاہے کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو لیکن حقیقت یہی ہے کہ اردو کے ادبی رسالے جو خاص نمبر شائع کرنے کے بہت شوقین ہوتے ہیں، ہندستان کے اس عظیم رہنما کی طرف کبھی متوجہ نہ ہوئے جسے گاندھی کہتے ہیں۔ اب تک کسی بھی ادبی رسالے کا کوئی وقیع نمبر گاندھی جی کے بارے میں اب تک نہیں نکلا۔ جو دو ایک گاندھی نمبر شائع بھی ہوئے وہ یا تو گورنمنٹ کے رسالوں کے تھے یا نیم ادبی و نیم سیاسی ہفتہ وار اخبارات کے۔ کسی خالص ادبی رسالے کو گاندھی صدی کے موقع پر بھی یہ توفیق نہ ہوئی کہ باپائے قوم کو خصوصی اشاعت کے ذریعے خراج عقیدت پیش کرتا۔ شاعر نے اس سلسلے میں ہماری لاج رکھ لی اور ایک ایسا ضخیم گاندھی نمبر شائع کیا جسے مضامین کے اعتبار سے سیاسی قسم کی اشاعت ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اس میں شامل کی جانے والی

تمام شعری و نثری تخلیقات کا APPROACH علمی و ادبی ہے۔ ڈاکٹر ظ انصاری کا مضمون "گاندھی جی اور ہندوستانی مسلمان"، ڈاکٹر گیان چند کا مقالہ "مہاتما گاندھی اور بھاشا کا سوال"، مناظر عاشق ہرگانوی کا مضمون "گاندھی جی کا نظریۂ ایشور پرستی"، اور محمد ایوب واقف کا مقالہ "گاندھی جی اسلامیات کی روشنی میں" بہت ہی فکر انگیز ہیں۔ یوسف ناظم صاحب کا انشائیہ اور اظہر افسر صاحب کا ڈرامہ بھی عمدہ ہے۔ منظومات کے حصے میں ساغر نظامی صاحب کی نظم بہت ہی بھرپور ہے۔ اس کے علاوہ سید حرمت الاکرام اور کرشن موہن کی نظمیں بھی قابلِ ستائش ہیں۔ آپ کی لاجواب نظم "بوڑھا بابا" پہلے بھی سن چکا تھا لیکن آخر میں آپ نے جن تین شعروں کا اضافہ کیا ہے اُن کی وجہ سے اس نظم کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔ ادھر کچھ لوگوں سے آپ کی علالت کے بارے میں جو اطلاعات مل رہی تھیں اُن سے بہت تشویش ہو گئی تھی لیکن شاعر کا مہاتما گاندھی نمبر دیکھ کر مجھ کو یقین سا ہو گیا کہ ایسے ناقابلِ فراموش ادبی کارنامے انجام دینے کا حوصلہ رکھنے والے انسان کا بیماری کچھ نہیں بگاڑ سکتی (راقم بہ ہمن)

خدا کرے اب آپ مکمل طور پر صحتیاب ہو چکے ہوں اور اُردو زبان و ادب کو نکھارنے سنوارنے کے کام میں پوری طرح لگ چکے ہوں۔

احقر۔ اختر بستوی

مہر چند کوثر — برنالہ (پنجاب)

محترمی اعجاز صاحب۔ آداب

شاعر کا "گاندھی نمبر" ملا۔ ایسا جامع نمبر نکالنے پر میری دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔ شاعر بلاشبہ ہندوستان کے سب جریدوں میں ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے۔

نیاز مند۔ مہر چند کوثر

سید مبارز الدین رفعت۔ ریڈر و صدر شعبۂ اُردو۔ گورنمنٹ کالج نظام آباد

محبِ گرامی قدر۔

ناساعد حالات کے باوجود آپ نے گاندھی نمبر پر کتنا باوقار اور سنجیدہ نمبر شائع کیا ہے۔ مجھے ظ۔ انصاری صاحب کا مضمون بہت پسند آیا۔ البتہ یوسف ناظم صاحب کے مضمون کا تو جواب نہیں۔ سب ہی مضامین پڑھنے کے قابل ہیں۔

آپ کا۔ مبارز الدین رفعت

سید منظور الحسن برکاتی۔ دارالعلوم خلیلیہ — ٹونک

محترم اعجاز صاحب۔ سلام مسنون۔

شاعر کا گاندھی صدی نمبر ملا۔ یہ خاص نمبر بھی شاعر کے روایتی اور شاندار نمبروں کی طرح بھرپور ہے۔ گاندھی جی کی اسٹیڈی اس نمبر کو پڑھ کر خوب ہو سکتی ہے۔ قومی سطح پر یہ بہت اونچا کام آپ نے گاندھی صدی میں انجام دیا ہے۔ جو صرف اس صدی کے لئے نہیں بلکہ آئندہ صدیوں کیلئے بھی تاریخ صحافت میں یادگار رہے گا۔ سب کو یہ خاص نمبر پسند آیا۔ آپ کی سرپرستی میں جو اہل قلم کام کر رہے ہیں، ان میں بھی آپ نے اپنی ہی جیسی لگن اور اپنا ہی جیسا جذبۂ خلوص پیدا کر دیا ہے۔ یہ واقعی بڑا اعجاز ہے۔ خدا آپ کو زندہ و سلامت رکھے (آمین)

آپ کا مخلص۔ منظور الحسن برکاتی

نازش پرتاب گڑھی۔ بیگم وارڈ — پرتاب گڑھ

برادر محترم : السلام

غالب نمبر کے فوراً ہی بعد یہ گاندھی نمبر! آپ کی مسلسل اور شدید علالت اور بے پناہ مصروفیتوں اور پریشانیوں کو ذہن میں رکھ کر جب گاندھی نمبر پر نظر ڈالتا ہوں تو ایمان لانا ہی پڑتا ہے کہ خدا اپنے جس بندے سے بھی چاہے کرامت کا صدور کرا سکتا ہے خصوصی نمبروں کے سلسلے میں آپ جس سلیقہ اور شعور کا ثبوت دیتے رہے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے زیرِ نظر گاندھی نمبر ان تمام کوتاہ بینوں کیلئے ایک چیلنج ہے۔ جو اُردو کو بدیسی زبان بتلاتے رہے اور جو کہتے رہیں کہ اُردو ہندوستان کے ماحول اور مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہے ہٹ دھرمی اور جانبداری سے کام نہ لیا جائے تو اس نمبر کو ہم ادبی معجزہ کہہ سکتے ہیں۔ کاش آپ کی جانفشانیوں کی قدر بھی ہو سکتی۔

آپ کا۔ نازش پرتاب گڑھی

محفلِ اپنی..

گاندھی نمبر اور اس کے بعد

"شاعر" کے گاندھی نمبر کو ایک عظیم قومی پیشکش تسلیم کر لیا گیا۔ اس نمبر کو بھی وہی نشانِ امتیاز عطا گیا ہے، جو شاعر کے پچھلے خاص نمبروں کو مل چکا ہے، یہ بات وجہِ مسرت تو ضرور ہے لیکن اس قومی کام کا کوئی صلہ ملنے کے بجائے "شاعر" کی اقتصادیات پر اس سے زبردست بار پڑ گیا ہے۔ کسی ریاست نے بھی گاندھی نمبر کی کاپیاں نہیں خریدیں۔ مرکز نے بھی کوئی توجہ نہ دی اور توجّہ کس طرح دی جاتی، جبکہ اُردو کی اُن شخصیتوں نے جو سرکاری حلقوں سے قریب ہیں"۔ مرکز اور ریاستوں کو احساس ہی نہیں دلایا۔ کسی کو بھی یہ پرواہ نہیں کہ وہ ایسے نمایاں کاموں کو سرکاری حلقوں کے سامنے لائے اور جسطرح دوسری زبانوں کے نمایاں کاموں کو سراہا جاتا ہے اُردو کے نمایاں کاموں کو بھی سراہنے پر اصرار کیا جائے۔ اُردو کی شخصیتیں صرف اپنے حلقوں اور اپنی ذات تک مراعات اور فائدوں کا خیال رکھتی ہیں۔

"گاندھی نمبر" کے بعد ۱۲۲ صفحات کا مشترک شمارہ جنوری، فروری ۱۹۷۰ء پیش کیا جا چکا ہے جسے بیحد پسند کیا گیا۔ "شاعر" نے اپنے چالیس سالہ طویل عرصۂ اشاعت میں توازن کا ہمیشہ خیال رکھا ہے۔ لایعنی بحثوں سے گریز کیا ہے۔ وہی شائع کیا ہے جو اعلیٰ ادبی و علمی معیار کا حامل ہو۔ "شاعر" حلقہ بندیوں سے بھی دُور رہا ہے

مارچ کا یہ تازہ شمارہ

مارچ کا یہ تازہ شمارہ حسبِ معمول ۴۸ صفحات کا ہے۔ اس شمارے کا اہم ترین حصّہ مکتوبات کا ہے۔ تمام خطوط اُردو کنونشن بمبئی سے پیدا شدہ فضا سے متعلق ہیں۔ خطوط بڑی تعداد میں آئے [illegible] خطوط آئندہ شمارہ میں شائع کیے جائیں گے۔ منظومات کے صفحات بڑھ جانے کی وجہ سے بعض اعلان شدہ مضامین نظم و نثر رہ گئے ہیں، ہم قلم کاروں سے معذرت خواہ ہیں۔ تبصرے اور "رشحات" کی مسلسل قسط بھی جگہ نہ پا سکی۔

[illegible] خطوط [illegible] مضامین جو مدراس اور دوسرے [illegible] شائع نہیں کیے گئے ہیں۔ تصورات کو پڑھانا [illegible]

یا اُن کو نقصان پہنچانا نہیں ہے۔ خود کادش صاحب نے ۴۰ صفحات کا طویل خط بھیجا ہے جس میں اُن کی شاعری کے متعلق مشاہیر کی توصیفی رائیں ہیں اور مدیر "شاعر" کی ذات پر بے شمار حملے۔ اُن کا خط شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا گیا ہے۔

یومِ سیماب مرحوم

اُردو کے مشہور شاعر جناب ضیاؔ فتح آبادی نے اطلاع دی ہے کہ ۲۴ اپریل کو دہلی میں "بزمِ سیماب" کی طرف سے بڑے پیمانے پر "یومِ سیماب" منایا جا رہا ہے۔ امید کہ دہلی کے علمی و ادبی حلقے اس اجتماع کو کامیاب بنائیں گے۔ چند معتقد ادیب "سیماب اکیڈیمی" کے قیام کے لئے بھی سوچ رہے ہیں تاکہ اس جلیل القدر شاعر و ادیب پر زیادہ سے زیادہ کام ہو سکے۔

آہ ـــــ خورشید احمد جامی

ابھی مخدوم محی الدین کی موت کا زخم تازہ ہی تھا کہ دکن کے ایک اور قابلِ ذکر شاعر خورشید احمد جامی کا بھی ۹ مارچ ۱۹۷۰ء کو انتقال ہو گیا۔ مرحوم آٹھ ماہ سے کینسر کے مرض میں مبتلا تھے۔ چند دن پہلے ہی انہیں عثمانیہ ہاسپٹل میں داخل کیا گیا تھا۔ افسوس کہ اُردو شاعری دکن کے ایک اور ممتاز شاعر سے محروم ہو گئی۔ جامی ۱۱ مئی ۱۹۱۸ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ اُن کی عمر کا ۵۲ واں سال تھا۔ انہوں نے مجرد زندگی گزاری اور اپنے پیچھے اپنا کوئی وارث نہیں چھوڑا ہے۔ اُن کا سب کچھ اُن کی شاعری ہی تھی۔ یوں تو وہ ۳۳ سال سے مشقِ سخن کر رہے تھے۔ لیکن ادھر چند سال سے اُن کا ذکر غزل کے اہم اور قابلِ توجہ شاعروں میں ہونے لگا تھا۔ اُن کے یہاں انفرادیت پیدا ہو چلی تھی وہ اُردو غزل کو تازہ کار بنانے میں مشغول تھے کہ قدرت نے انہیں ہم سے چھین لیا۔

"رخسارِ سحر" کے بعد حال ہی میں اُن کے کلام کا نیا مجموعہ "برگِ آوارہ" شائع ہوا تھا اور اُن کا جشن منانے کی بھی تیاری ہو رہی تھی۔ اور اس سلسلے میں "قیمتِ عرضِ ہنر" کے نام سے اُن پر ایک کتابچہ چھاپا گیا تھی۔ جس میں اُن کی شخصیت اور فن پر مضامین نظم و نثر ہیں۔ جامی مرحوم سے بہت سے مقامی نوجوان شعراء نے استفادہ بھی کیا۔ جامی کی موت واقعی بے حد افسوسناک ہے! (ادارہ)

نقد و نظر

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

شب گشت

از ______ عمیق حنفی

ہر عہد کی اچھی شاعری نئی شاعری ہوتی ہے اور نئی شاعری کمزور شاعری کی مانند، ماضی، حال اور مستقبل کے خانوں میں نہیں بانٹی جاتی ۔ نئی شاعری کا رشتہ اپنے عہد سے ضرور ہوتا ہے ۔ مگر وہ اس عہد کے حدود تک ہی محدود نہیں ہوتی ۔ وہ لگاتار سفر کرتی رہتی ہے ۔

بنیادی طور سے شاعری دو طرح کی ہوتی ہے، سوال کی شاعری اور جواب کی شاعری ۔ جواب کی شاعری اپنے دور کی مقبول اور پُرسکون ترجمان ہوتی ہے ۔ اس میں خارجی حسن کے ساتھ اشیاء کو اُن کی خارجی اشکال تک محدود کرنے کا انداز ملتا ہے ۔ اس میں تجسس کی جگہ تیقن کی کار فرمائی ہوتی ہے ۔ یہ شاعری اپنے عہد کے تقاضوں کو ضرور پورا کرتی ہے ۔ لیکن اس کی زندگی ان تقاضوں کی تکمیل تک ہی ہوتی ہے ۔ اس قسم کی شاعری کی بھی ایک تاریخی اہمیت ہے ۔ زبان کی تراش خراش اور نوک پلک سنوارنے میں یہ اہم رول ادا کرتی رہی ہے ۔ اس کے برعکس سوال کی شاعری انسانی ذہن کے ازلی تجسس کی کوکھ سے ابھرتی ہے ۔ اس کا نمایاں رجحان یقینی نہیں تشکیکی ہوتا ہے ۔ یہ طے شدہ تعریفوں کے دائروں سے باہر ہو کر انسان اور کائنات کے اُلجھے ہوئے رشتوں میں اُترنے کی کوشش کرتی ہے ۔ موروثی اقدار کو جیوں کا تیوں قبول کرنے کے بجائے یہ اُن کے دائیں بائیں جھانکتی نظر آتی ہے ۔ یہ متضاد رجحانات ذوق و غالب کے کلام میں بہ آسانی دیکھے جا سکتے ہیں لیکن ادب میں سپاٹ قطعیت کا گزر نہیں ۔ جہاں غالب کے کہیں شعر محض لفظی بازیگری ہیں وہاں ذوق کے یہاں بھی کچھ شعر نئے سوچتے نظر آ جاتے ہیں ۔ اِن رجحانات میں وقت کا فاصلہ بھی کوئی لازمی شرط نہیں ۔ ایک ہی وقت میں ہم عصر ادیب نئے اور پُرانے ہو سکتے ہیں ۔

عمیق حنفی کا شعری مجموعہ "شب گشت" بھی اُسی روایت کے قریب ہے ۔ جس کی نمائندگی غالب اور دیگر شاعروں نے کی ہے ۔ اِس مجموعے میں شامل بیشتر نظمیں اور غزلیں ایک ایسے مضطرب ذہن کی پیداوار ہیں ۔ جو بیک وقت مختلف اطراف میں پرواز کرتا رہتا ہے ۔ اِن میں اُس معصوم انسان کے المیہ کی روداد درج ہے ۔ جس کو خود اُس کی آگہی نے اسیر کیا ہے ۔ وہ باہر کی روشنیوں سے خائف ہے اور اندر کی پناہ گاہ میں اُترنے کے لئے جس شمع تیقن کی ضرورت ہے وہ بھی اُس کی دسترس سے دور ہے ۔ خارج اور داخل کی دو اجنبی دنیاؤں کے درمیان وہ حیران و پریشان خود اپنا تماشائی بنا ہوا ہے ۔

ریک پر رکھی کتابیں مجھ کو پڑھنا چاہتی ہیں
سادہ کاغذ مجھ کو لکھنا چاہتا ہے ۔
سگریٹیں اور چائے مجھ کو اور پینا چاہتی ہیں ۔

عمیق حنفی کا شعری مزاج رشتوں اور سمتوں ایسی لاتعلقی لیے ہوئے ہے، لیکن عمیق کے یہاں یہ لاتعلقی کسی بہتر جنت کے ردِ عمل کے طور پر نہیں پیدا ہوئی ہے یہی وجہ ہے کہ اُس میں صبر و شکر کے ٹھہراؤ کی جگہ جھلاہٹ اور غصہ زیادہ نمایاں ہے ۔ عمیق کے یہاں یہ غصیلی جھلاہٹیں اُن کے دیگر معاصرین کے مقابلے میں زیادہ محسوس ہوتی ہیں ۔ عمیق بہت زیادہ لکھتے ہیں ۔ ممکن ہے یہ اُن کی کوئی نفسیاتی مجبوری ہو ۔ مگر مجموعے کی اشاعت کے وقت تو انتخاب کی گنجائش تھی ۔ عمیق حنفی نئے شاعر ہیں ۔ لیکن جب وہ دانستہ نئے پن کو اپنے اُوپر طاری کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو نظم نہ صرف منطقیانہ تفصیل کا شکار ہو جاتی ہے اُس کے کل پُرزے ڈھیلے ہو کر مضحکہ کی شکل اختیار کر لیتی ہے ۔ اس قسم کی نظموں میں وہ بات کو کبھی کبھی ، اور، جو، یعنی، اُف، اور ہائے جیسے زائد الفاظ کے سہارے کھینچ کھینچ کر آگے بڑھاتے ہیں ۔

اور اک نٹ پاتھ پر

سیکڑوں بل والی پگڑی سر پر رکھے۔
اور ماتھے پر بڑا قشقہ لگائے،

(بھنور کے رنگ)

وقت کی کھیتی ہیں ہم
وقت بوتا ہے، اُگاتا، پالتا ہے
اور بڑھنے کے مواقع بھی ہمیں دیتا ہے وقت (کھیتی)

نظم کھیتی میں 'بوتا ہے کے ساتھ اُگاتا، اور پالتا ہے' تک تو جیسے تیسے بات بنتی بھی ہے۔ مگر تیسرے مصرع میں 'بڑھنے کے مواقع' کے استعمال کا کیا جواز ہے۔ اسی نظم کا ایک اور مصرع بھی ملاحظہ فرمایئے "چاندنی پی کر ہمیں بدمست ہوتا پا کے خوش ہوتا ہے وقت"۔ یہاں 'ہوتا پا کے' کے استعمال سے زبان، خیال، یا نظم کے مجموعی تاثر کو کونسی مدد ملتی ہے۔ اِس قسم کی نظمیں بُری نثر کی مثالیں ہیں۔ زبان کا میکانکی استعمال تخلیق کی کمزوری ہے۔ خیال الفاظ کے اندر سے پھوٹنے کے بجائے لفظوں کی کیلوں سے جڑا ہوا محسوس ہوتا ہے اس کی وجہ سے نظم میں بکھراؤ اور نثر زدہ پھیلاؤ اُبھر آتا ہے، تخلیق حنفی کی اکثر نظمیں بحر و وزن کی لغزشوں کا بھی شکار رہیں۔ کہیں کہیں دبتے ہوئے الفاظ یا غلط تلفظ کے ساتھ لفظوں کا استعمال بھی تخلیق جیسے سنجیدہ شاعر کے یہاں کھٹکتا ہے "ایک رات" میں کئی جگہ قافیوں کا اہتمام ہے۔ شروع سے آخر تک یہ نیم پابند نظم ہے۔ مگر اس نظم میں "سانسوں کی موجوں کی زد میں اگر دن ما تھا پال" کے ساتھ ہی ڈِل کے ساتھ دھڑکنا دِل کا ہونا محو کنار و بوس "بھی آتا ہے اور پھر نظم کے زیبا مصرع۔ "رگ پٹھوں پر نشہ کے دریاؤں کا لہرانا" کے بعد کا مصرع ہے۔ "تنہائی کے زہر میں مل کر تنہائی کے زہر کا امرت بن جانا"۔ اسی طرح 'نئے آدمی' کے آخری مصرعوں میں یہی نظم دو بحروں میں بٹ جاتی ہے۔ نظم "رنگ زار" میں "دور کھڑا ہے کانٹے دار ببول" "جس کے کانٹے جیسے کومل پات ہرے اور پیلے پھول"۔ "درمیاں سے اس زمیں کو چیرتا جاتا ہے چاکِ ارتقا۔" کی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ "نیم خالی احساس کی نظم"۔ "ذرّے چمک رہے ہیں" سے شروع ہوتی ہے اور بیشتر مصرعے اُسی وزن و بحر میں ہیں۔ لیکن اسی میں یہ مصرعے بھی ہیں۔

کبھی تھے محل حویلی   محراب، بام و در تھے

مکتوبات

● "شاعر" کا تازہ شمارہ (جنوری و فروری کا مشترک شمارہ) ابھی ابھی ملا ہے۔ مجھے اِس شمارے کا انتظار تھا۔ چنانچہ جب ملا تو سب سے پہلے وہ مضامین پڑھے جو اُردو کنونشن سے متعلق ہیں۔ ان مضامین سے نہ صرف یہ کہ میری معلومات میں مزید اضافہ ہوا بلکہ ڈاکٹر (مرحوم) ویر بھارتی کے مضمون سے جس کی اشاعت اُردو اخبارات میں کافی ہوئی ہے، جو غلط فہمیاں پیدا ہوئی تھیں وہ بڑی حد تک صاف ہو گئیں۔ کرشن چندر کے بارے میں بہت سی ایسی باتیں سُننے اور پڑھنے میں آئی تھیں جن سے اُن کے بارے میں رائے خراب ہو سکتی تھی بلکہ شاید ایک حلقہ میں خراب بھی ہو گئی ہے، مگر اُن کے اِس مضمون سے، جس کا ترجمہ آپ نے پیشِ نظر شمارے میں شائع کیا ہے۔ یقیناً یہ غلط فہمیاں دُور ہو جائیں گی۔ ان کا مضمون مجھے بہت پسند آیا۔ اُنہوں نے اُردو کی اچھی وکالت کی ہے اور بھارتی صاحب کے زہر کا تریاق مہیا کیا ہے۔ اُنہوں نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ

"آج کل اُردو کی لیڈری بڑے گھاٹے کا سودا ہے۔ اِس میں تالی کم ملتی ہے گالی زیادہ، اِس میں کالی جھنڈیاں دکھائی جاتی ہیں اور مُردہ باد کے نعرے لگائے جاتے ہیں۔ اس میں جان کا خطرہ ہے، اور پیسے کا بھی نقصان۔"

آپ کو اُردو کے معاملے سے جو دِلی تعلق ہے اور اس کی موجودہ صورتِ حال سے آپ کو جو فکر اور تکلیف ہے، اُس کا احساس بمبئی کی گفتگو میں ہوا تھا۔ آپ کا مضمون پڑھ کر یہ احساس اور تیز ہو گیا۔ میں چاہتا ہوں کہ بمبئی میں جو قدم اُٹھایا گیا ہے وہ پیچھے نہ ہٹے۔ چاہے رفتار سست ہو، چاہے کبھی رُکنا پڑے، مگر عزم و ارادے میں نہ تو کمزوری آنی چاہیئے نہ ٹھہراؤ پیدا ہونا چاہیئے۔ اور ہندوؤں میں مایوسی کا آنے نہ پائے، پوُرے استقلال کے ساتھ اپنے مطالبوں پر جم کر ڈٹے رہنا چاہیئے۔ پچھلے دنوں اُردو کا ایک وفد وزیرِ اعظم سے ملا تھا۔ ماہنامہ "تحریک" کے مدیرِ محترم نے بمبئی کے اُردو کنونشن کے تنظیم کاروں پر کچھ اعتراضات کئے ہیں یا الزامات لگائے ہیں۔ ان کا جواب الفاظ سے نہیں عمل سے اور اچھے نتائج سے دینا چاہیئے۔ "جرعات" میں آپ نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ:-

"اُردو کمیٹی نے ایک نیا راستہ دکھایا ہے۔ اس کی سرگرمیاں ختم نہیں ہوئی ہیں، یہ وقت ہے کہ تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر اُردو کے رسائل و جرائد کنونشن سے پیدا شدہ فضا کو آگے بڑھائیں۔"

اب تک میں نے صرف اُن ہی مضامین اور مراسلوں کو پڑھا ہے جو اُردو کنونشن سے تعلق رکھتے ہیں، دوسرے مضامین پر صرف ایک سرسری نظر ڈالی ہے۔ سرسری نظر ڈالتے وقت ایک عنوان "خواجہ مہدی علی خان کی تحریف نگاری" پر نگاہ رُک گئی۔ "پیروڈی" (PARODY) کے معنی میں "تحریف" کی اصطلاح پر مجھے اعتراض ہے۔ قطع نظر اس کے کہ یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے چونکہ یہ لفظ "تحریف" اُردو میں ایک خاص معنی میں استعمال ہوتا ہے اور اچھے معنی میں استعمال نہیں ہوتا۔ اس لئے "پیروڈی" کے معنی میں "تحریف" کے استعمال کو روکنا چاہیئے۔ میرے خیال میں خود یہ انگریزی لفظ اُردو میں اس قدر رائج اور مقبول ہے کہ اس کے ترجمے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ اُردو کی حمایت میں آپ کا جو مضمون (دوڑو، زمانہ چال قیامت کی چل گیا) پیشِ نظر شمارے میں شائع ہوا ہے، اُس میں ایک جگہ آپ نے لکھا ہے:

"اس میں ہر زبان کے الفاظ کو قبول کر لینے اور اپنے یہاں موقع و محل کے اعتبار سے بامعنی بنا لینے کی صلاحیت ہے۔"

اُردو زبان کی اس صلاحیت سے ایسے ہی موقعوں پر فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔

اِس وقت ایک اور بات عرض کرنا چاہتا ہوں جو پیشِ نظر شمارے سے متعلق نہیں ہے۔ "شاعر" کے غالب نمبر کو شائع ہوئے ایک عرصہ ہوگیا۔ اُس وقت میں نے اس پر ایک سرسری نظر ڈالی تھی، تفصیلی مطالعے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ابھی حال میں ایک مؤقر مجلّہ[1] کی خواہش پر اُردو رسالوں کے غالب نمبروں کا جائزہ لینے کے لئے "شاعر" کا غالب نمبر غور سے دیکھا تو اِس نتیجے پر پہنچا کہ یہ نمبر ہندوستان کے اُن چند نمبروں میں سے ہے جو امتیازی حیثیت کے حامل ہیں۔ اگرچہ اب بعد از وقت ہے۔ مگر اس کامیابی پر آپ اجازت دیں، تو پُر خلوص مبارکباد پیش کروں۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے بالکل صحیح ارشاد فرمایا ہے کہ :-

" خاص نمبروں کے باب میں "شاعر" نے جو فتوحات کی ہیں وہ ہندوستان میں اُردو کے کسی دوسرے رسالے نے کب کی ہیں۔ "

اِس نمبر کے جو مضامین مجھے پسند آئے اُن میں ظ انصاری صاحب کا مضمون "غالب کی کہانی" سرِ فہرست ہے۔ شاید اِس لئے یہ مضمون سب سے زیادہ پسند آیا کہ غالب کے حالاتِ زندگی پر اِس قدر لکھا جا چکا ہے کہ اب اس موضوع پر کسی مضمون میں کوئی نئی بات پیدا کرنا — مواد اور اُسلوب دونوں لحاظ سے — بہت مشکل ہے۔ مگر انصاری صاحب نے نئے نئے گوشے پیدا کئے ہیں اور ان کا اُسلوبِ نگارش دلچسپ اور دلکش ہے۔ مگر جہاں مجھے یہ مضمون سب سے زیادہ پسند آیا، وہیں اِس میں سب سے زیادہ قابلِ اعتراض باتیں بھی نظر آئیں۔ میری نظر میں جو خامیاں ہیں یا جو بیانات قابلِ وضاحت ہیں اُن پر اپنے جائزے میں اظہارِ خیال کر چکا ہوں، مگر چاہتا ہوں کہ آپ کو بھی لکھ کر بھیجوں اور ظ انصاری صاحب کو بھی۔ تاکہ ان پر تبادلۂ خیال کیا جا سکے۔ فی الحال تو یہ ممکن نہیں ہے۔ انشاءاللہ ہفتہ عشرہ کے بعد اس کیلئے وقت نکالنے کی کوشش کروں گا۔ انشاءاللہ

عبداللطیف اعظمی) جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی)

● "شاعر" کا تازہ شمارہ مل گیا۔ شکریہ! جنوری اور فروری کا یہ مشترکہ شمارہ دو وجوہ سے انتہائی اہم ہے اوّل یہ کہ اِس میں آپ نے اپنے اداریئے میں بمبئی کے اُردو کنونشن کی مکمل تصویر پیش کر دی ہے۔ اور اُس کے مثبت پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اُس کی خامیوں کی طرف بھی ایماندارانہ طور پر اشارہ کر دیا ہے۔ دوئم یہ کہ "دھرم یگ" کے ایڈیٹر ڈاکٹر دھرم ویر بھارتی نے اردو کے خلاف ابھی حال ہی میں جو زہر افشانی فرمائی ہے اس کا پول بھی زیرِ نظر شمارے میں پوری طرح سے کھل گیا ہے۔ آپ نے دھرم ویر کا مضمون بھی شائع کر دیا ہے اور اُردو کمیٹی کے صدر کرشن چندر کا جواب بھی۔ اس کے علاوہ خود اپنا مفصّل مضمون "دَورِ زمانہ چال قیامت کی چل گیا۔" شائع کر کے اِس مسئلے کو اُردو کے حامیوں اور مخالفوں دونوں کے لئے صاف کر دیا ہے۔ ماہ ڈیڑھ ماہ قبل جب میں نے پہلی بار دھرم ویر صاحب کے ہندی مضمون کا ترجمہ اُردو کے ایک اخبار میں پڑھا تھا تو میرے دِل و دماغ سُلگ اٹھے تھے۔ آپ نے بالکل ہی بجا فرمایا ہے کہ "اگر اسی طرح کے چند مضامین اور لکھے گئے جیسا مضمون بھارتی جی نے لکھا ہے تو ہو سکتا ہے اُردو والوں میں اشتعال پیدا ہو جائے۔" بھارتی جی نے تو آگ لگا دی۔ اب کچھ لوگ اِس جلتی آگ پر تیل چھڑک رہے ہیں اور مجھے حیرت ہے کہ اس "نیک کام" میں ماہنامہ "تحریک" کے ایڈیٹر بھی شامل ہیں۔ آپ نے اپنے اداریئے میں اُن کے رویّے پر اظہارِ افسوس کیا ہے۔ "ماہنامہ صبحِ نو" (پٹنہ) کے جنوری و فروری ۱۹[illegible]ء کے مشترکہ شمارے میں بھی "اُردو کا مقدمہ اور حزبِ مخالف کے وکیل — گوپال مِتّل اور دھرم ویر" کے عنوان کے تحت اس سلسلے میں اداریہ لکھا گیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مظلوم اُردو کو آزاد ہندوستان میں کتنے قسم کے زخم سہنے پڑیں گے اور کس کس کے ہاتھ میں اس کے خلاف تلوار نظر آئیگی؟

اختر بستوی (ایم اے)
روشن نگر، گاندھی نگر، بستی

---

[1] میں رسالہ، مجلّہ اور جریدہ میں فرق کرتا ہوں (اعظمی)

● جنوری ۱۹۹۰ء کا مشترکہ شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ شکریہ! یہ اشاعت مضامین کی تعداد اور اُن کے تنوع کے اعتبار سے ادب کے اُن پرستاروں کے لئے نئے سال کے ایک تحفہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ جن کی آنکھیں ستمبر ۱۹۸۹ء کے بعد سے "شاعر" کا عام شمارہ دیکھنے کے لئے ترس گئی تھیں۔ اِس شمارے کے ساتھ "شاعر" کی زندگی کا اکسٹھویں سال کا آغاز ہوتا ہے۔ کسی ادبی رسالے کا اتنے طویل عرصہ تک جاری رہنا ہی اُس کی مقبولیت کا واضح ثبوت ہے اور شاعر صرف مقبول ہی نہیں۔ بلکہ تاریخی لحاظ سے اُردو کا ایک بہت اہم رسالہ ہے۔ کیونکہ یہ ہندستان میں اُردو تحریک کی جان ہے۔ میری طرف سے شاعر کی اکسٹھویں سالگرہ پر مبارکباد قبول فرمایئے۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ شاعر کو اور آپ کو قیامت تک زندہ رکھے۔ (آمین)

بدیع الزماں خاور
نیشنل ہائی اسکول داپولی۔

● "شاعر" کا تازہ شمارہ ملا۔ اُردو آپ کو دعا دیتی رہے گی اور آنے والی نسلیں جو یقیناً ہندی۔ اُردو یا ہندی اور اُردو کے ہاتھوں پر بیعت کر چکی ہوں گی۔ سر جھکا کر سوچیں گی کہ جس وقت کردار ہی نہیں، آچار، وچار کی شکست و ریخت ہو رہی تھی، اُس وقت کچھ صاحبانِ قلم اور اربابِ فہم و فہم و ذکاوت ہی نہیں عدل و دیانت کے دھنی بھی ثابت ہوئے۔

جزاک اللہ خیر الجزاء۔

شہاب سرمدی
آل انڈیا ریڈیو۔ لکھنؤ۔

● دھرم ویر بھارتی اور کرشن چندر والے مضمون کو تو میں نے "نو بھارت ٹائمز" اور "تحریک" میں پڑھ لیا تھا۔ مگر آپ نے اُن سے متعلق جو تاثرات قلم بند کئے ہیں، اُس سے میں بہت متاثر ہوا۔ غالباً دو تین سال بعد "شاعر" کو اچھی طرح سے دیکھنے کا پھر سے موقع ملا ہے۔ سارے مندرجات میں آپ کا اداریہ سب سے زیادہ پسند آیا۔

ظہیر نیازی
بھرکنڈا۔ ضلع ہزاری باغ۔

● شاعر کا تازہ شمارہ آج ملا۔ آپ کا اداریہ اور اُردو سے متعلق سارے مضامین ایک سانس میں پڑھ گیا۔ اتفاق سے آج ہی میں نے ایک مضمون دھرم یگ کو روانہ کیا تھا۔ پتہ نہیں وہ شائع کرتے ہیں یا نہیں[1]، اُس کی ایک نقل آپ کو بھیجنا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ ہندی ہی میں ہے۔ ہو سکے تو کسی سے اس کا ترجمہ اُردو میں کرالیں۔ آپ کو ہو سکتا ہے میری بعض باتوں سے اختلاف ہو، لیکن اختلاف کرنا بُری بات نہیں ہے۔ انہیں دور بھی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن پُرسکون گفتگو میں۔ آپ کا اداریہ اور نو بھارت ٹائمز والے آپ کے مضمون کی اُردو نقل پڑھ کر بعض جگہ مجھے بھی اختلاف ہوا۔ وزیر اعظم کا اقتباس دے کر آپ نے لکھا ہے: "سامعین کے چہرے اُتر گئے۔ لفظ اُردو دھندلا ہو گیا[2]۔" وزیر اعظم نے جو باتیں کہیں وہ حقیقت پر مبنی ہی اس سلسلے میں نہ مایوس ہونے کی ضرورت ہے اور نہ غیظ و غضب میں آنے کی۔ گزشتہ بائیس برس میں آپ نے اُردو کے بارے میں جتنے اداریے لکھے ہیں اُنہیں باندھ کر ایک طرف رکھ دیجئے اور بڑی سنجیدگی سے اُردو پڑھانے کے سلسلے میں کوئی عملی اور ٹھوس کام کرانے میں مدد دیجئے[3]۔ جن اسکولوں کے منتظم اُردو پڑھانے سے انکار کرتے ہیں اُن کے خلاف قانونی چارہ جوئی شروع کرایئے، پہلا عملی قدم یہی ہے اِس سلسلے کا۔ اُردو، ہندی اور دوسری قومی زبانوں کے ابتدائی کورسوں کی کتابیں مرتب کرانے میں مدد دیجئے جو صحیح معنوں میں قومی خطوط پر لکھی جانی چاہئیں۔ اُردو پڑھنے والوں کی تعداد بڑھ جائے گی تو علاقائی اور سرکاری زبانوں کے مرحلے بعد میں طے ہوتے رہیں گے۔ ملک میں ہمیشہ تو

---

[1] آپ کا مضمون دھرم یگ کو شائع کرنا چاہئے اس لئے کہ یہ پوری طرح اُردو مخالفین کے مقاصد کی وکالت کرتا ہے۔

[2] وزیر اعظم کی تقریر کے بعد کا وہ تاثر میرا نہیں بلکہ سب کا تھا۔ اس کا سیاق و سباق میں اس جملے کو دیکھئے۔

[3] میں بارہا اس پر زور دے چکا ہوں مگر اتنی بڑی لڑائی کے ذمہ دار اداروں نے کبھی میری معروضات پر دھیان ہی نہیں دیا۔ [illegible] ہوتا تو آپ سب کے ساتھ فکر و عمل کی دوڑ کرتا [illegible] اس کشتی میں شامل کرا دیجئے۔ (اعجاز صدیقی)

کانگریس کی یا رجعت پسندوں کی حکومت نہیں رہے گی۔ ترقی پسند قوتیں بھی بتدریج بڑھ رہی ہیں۔ یہ حقیقت آپ پر اچھی طرح سے واضح ہے۔

دوسری بات آپ نے کہیں یہ لکھی ہے کہ وزیراعظم کی کوٹھی کے سامنے کرشن چندر اور دوسرے ادیب اپنے سینوں میں خنجر کیوں نہیں مار لیتے! محترم یہاں آپ کو یہ مشورہ دینا چاہئے تھا کہ کرشن چندر، سردار جعفری، خواجہ احمد عباس اور وہ سارے اُردو کے ادیب و شاعر جو پدم شری اور پدم بھوشن بن چکے ہیں یہ اعزازات پروٹسٹ کے طور پر واپس کیوں نہیں کر دیتے۔ [1] کاش وہ اپنے اندر اتنی اخلاقی جرأت پیدا کر سکتے۔ بعض ہندی والوں نے تو یہ کر دکھایا تھا جب سرکار کی پر دا انگلش پالیسی کے اختلاف انہیں پروٹسٹ کرنا تھا۔ انہوں نے ابھی تک وہ اعزازات واپس نہیں لئے۔

آپ نے ایک جگہ سنسکرت کو "مردہ زبان" کہا اور دوسری جگہ عربی و سنسکرت کو مسلمانوں اور ہندوؤں کی مذہبی زبان بھی کہا ہے۔ کسی بھی مذہب کی زبان کے بارے میں لفظ "مُردہ" کہنا اُسی کی توہین کرنے کے مترادف ہو سکتا ہے۔ سنسکرت یا ہندی سے اس طرح کی نفرت کا اظہار اور لوگ بھی کرتے ہیں جس سے دوسروں کے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ [2]

میں نے اپنے مضمون میں یہ بات واضح کر دی ہے کہ میں اُردو کو سیاسی ہتھیار بنانے کے حق میں نہیں ہوں اس کے بجائے میں عملی اور ٹھوس کارروائیوں کے حق میں ہوں۔ اپنے تین بچوں میں سے ایک کو میں نے خود اُردو پڑھائی ہے۔ باقی دو بچے اب بھی موقع پا کر پڑھتے ہیں۔ اسکولوں کے منتظمین کے خلاف جب بھی کوئی قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔ میں اپنے بچوں کے خادم کے طور پر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے والوں کے ساتھ ہوں گا۔ کسی بھی اسکول کے منتظم کے خلاف پانچ سرپرست مل کر ایسا کر سکتے ہیں۔ جب ہم یہ سب کرنے لگیں گے تو بہت سی شکایتیں اس طرح بھی دور ہو جائیں گی۔

چار باغ۔ لکھنؤ — رام لعل

● اٹھارویں مارچ، مغرب سے کچھ پہلے "شاعر" کیا آیا، آپ آ گئے، رسالے، ڈائجسٹ اور اخبار کتنے ہی آتے ہیں۔ لیکن صرف "شاعر" کا میں بے چینی سے انتظار کرتا ہوں۔ اب کے سخت انتظار یوں بھی تھا۔ کہ جرعات میں اُردو کو "نظمیں" ہی پر اظہار خیال فرمایا جائے گا۔ چنانچہ وہی کچھ تھا۔ بعد مغرب خود بخود "شاعر" ہاتھ میں تھا۔ پلنگ پر لیٹا ہوا میں صرف سرورق ہی دیکھتا رہا۔ اداریہ، مقالے جو بہت سی باتوں اور کتابوں کے

---

[1] میں یہ بات بھی اپنے ایک اداریئے میں کھُل کر لکھ چکا ہوں۔ یہی نہیں میں نے تو یہاں تک لکھ دیا تھا کہ اگر ڈاکٹر ذاکر حسین (مرحوم) اُردو کی خاطر صدارت سے مستعفی ہو جائیں تو اُردو کو بہت بڑا فائدہ پہنچے گا۔ مگر میری ایسی حقیقت پسندانہ باتوں کا اُردو کی بڑی شخصیتوں نے ہمیشہ بُرا ہی مانا ہے۔

[2] کسی زبان یا مذہب کی توہین میرے نزدیک سب سے بڑا گناہ ہے۔ میں نے اپنے مضمون کے صفحہ ۴۴ پر ماضی کی ایک تاریخی حقیقت کا حوالہ دیتے ہوئے یہ لکھا ہے۔

"سنسکرت مُردہ اور محدود زبان بن کر رہ گئی تھی جو صرف پنڈتوں یا اونچی ذات کے براہمنوں کی میراث سمجھی جاتی تھی۔"

اس کے برخلاف شودان سنگھ چوہان کے بیان کا اقتباس جو "شاعر" کے صفحہ ۲۸ پر ہے۔ یوں ہے — "سنسکرت کو سہ لسانی فارمولے میں شامل کر کے بے ایمانی کی گئی ہے۔ کیونکہ یہ ایک "مُردہ زبان" ہے۔ مگر اسے بھی آپ توہین نہیں کہہ سکتے۔ سنسکرت کسی صوبہ اور علاقہ کی زبان نہیں ہے اور نہ دنیا میں کہیں بولی جاتی ہے۔ ہندی والے اُردو کے ساتھ جس شدت سے اظہارِ نفرت کرتے چلے آ رہے ہیں اُسے کیا کہیے گا۔؟ — اعجاز صدیقی

بھی ہو، رسالہ بھی ہو، اس کے باپ کا بہت سا کلام اب تک غیر مطبوعہ کیوں پڑا ہے۔ اب تو علامہ کی وفات کو ۱۹ سال ہوگئے اگر اب بھی آپ اُسے نہ چھپوا سکے تو پھر وہ کبھی نہ چھپ سکے گا۔ آپ کی صحت یوں بھی اچھی نہیں رہتی۔ یہ سب کچھ بہت جلد ہونا چاہیئے۔ کوئی ایسا پروگرام بنائیے کہ سال میں ایک کتاب شائع ہوتی رہے۔ اس طرح قصر الادب کی مطبوعات کا سلسلہ از سرِ نو شروع ہو جائے گا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ مرحوم کی برسوں کی محنت ہم لوگوں کی بے توجہی سے ضائع نہ ہو جائے[1]۔

اسلامیہ انٹر کالج اٹاوہ ـــ نثار اٹاوی

● ماہ جنوری و فروری کا مشترکہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ اِس شمارے میں آپ نے دھرم دیر بھارتی اور کرشن چندر کے مضامین کا اُردو ترجمہ شائع کرکے اچھا کیا ہے۔ یہ باتیں جو اُردو سے متعلق ہیں ہندی میں شائع ہو رہی ہیں۔ اُن کا اُردو میں ریکارڈ رہنا بھی ضروری ہے[1]۔

آپ نے تجربات میں دُرست فرمایا ہے کہ "بمبئی اُردو کنونشن نے مخالفینِ اُردو کو بوکھلا دیا ہے۔" کنونشن کے بعد اُردو کی مخالفت اور زیادہ زور پکڑ گئی ہے۔ اور مخالفین کی جانب سے کنونشن کے اثر کو زائل کرنے کی کوششیں شدت اختیار کر گئی ہیں۔ آپ نے تجربات میں فرمایا ہے کہ "اُردو کے لگ بھگ ڈیڑھ سو نمائندے پورے ہندوستان سے آئے۔۔۔۔ کشمیر، بہار، اُتر پردیش، مدھیہ پردیش، گجرات، راجستھان، پنجاب، آندھرا، اور میسور کی ریاستوں سے پروفیسر، ادیب، شاعر، صحافی اور اُردو تحریک سے وابستہ حضرات کافی تعداد میں تشریف لائے۔"

لیکن ہمارے ہاں حقیقتوں سے انکار کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ ۸ر فروری ۱۹۷۰ء کے "دھرم یگ" میں ایس فیروز اشرف لکھتے ہیں۔

> • اُردو کمیٹی، بمبئی کی جانب سے پردھان منتری کو پیش کی جانے والی مانگ دہلی، اُتر پردیش، بہار، ہریانہ، ہماچل پردیش، راجستھان اور مدھیہ پردیش کی اُردو جاننے والی جنتا کی مانگ ہرگز نہیں ہے۔"

فیروز اشرف صاحب کا "فرمان" ہے کہ چند نام نہاد ادیب اور شاعر جیسے کرشن چندر، ملک راج آنند، راجندر سنگھ بیدی۔ خواجہ احمد عباس، علی سردار جعفری، قرۃ العین حیدر وغیرہ اِس کنونشن کی آڑ میں اپنی گرتی ہوئی ادبی ساکھ اور لیڈر شپ کو سنبھالنا چاہتے ہیں۔" گویا اس تمام تحریک کے پیچھے صرف ادبی لیڈر شپ کی "ہوس" کارفرما ہے اور بس اُردو عوام کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

---

[1] جی، اب میں بوڑھا بھی ہو گیا ہوں اور میری صحت اتنی گر چکی ہے کہ معمولاً جو کام کر لیا کرتا تھا وہ بھی نہیں کر سکتا ہوں۔ میرے امراض لا علاج بن چکے ہیں ـــ نتیجہ معلوم! امراض کی شدت سے شب و روز تڑپتے رہنا میرا مقدر بن گیا ہے۔ بدقسمتی سے مقامی بے توجہیاں ہمیشہ میرے ساتھ رہی ہیں، جس شہر کو میں نے اپنا وطنِ ثانی بنایا اور جس میں خانہ بہ خانہ شاد ہو کر کام کیا۔ بہت سے نمایاں کام انجام دیئے اُس شہر کے ادبی و تہذیبی اور سرکاری حلقوں سے مجھے وہ تعاون نہیں ملا جو ملنا چاہیئے تھا۔ والدِ مرحوم علامہ سیماب[ؒ] کی نظم و نثر کی تقریباً پندرہ کتابیں ابھی مرتب ہوئی ہیں۔ کئی سال سے متعدد کتابوں کے ایڈیشن ختم ہو چکے ہیں۔ انہیں دوبارہ چھپنا چاہئے۔ جوں جوں میری صحت گر رہی ہے یہ احساس میری روح کو ڈستا جا رہا ہے۔ میں یہ عرض کروں تو بیجا نہ ہوگا کہ کچھ فرض بڑے ادیبوں، ادب دوستوں اور تلامذۂ سیماب کا بھی تھا اور ہے۔ بہت سا قیمتی سرمایہ ضائع ہو گیا جو کچھ ہے اُسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھے ہوئے ہوں میرے پاس سرمایہ نہیں ہے میری طویل و شدید علالت نے بہت نقصان پہنچایا ہے۔ کتابوں کی اشاعت کیلئے سرمایہ چاہیئے۔! (اعجاز صدیقی)

[1] دھرم یگ اور نو بھارت ٹائمز میں اُردو کے خلاف اور بھی کئی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن وہ آج تک رسائل و اخبارات میں نہیں آئے۔ (اعجاز)

بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی، مخالفت کی انتہا یہ ہے کہ
لوگ اُردو کی ہیئت و حیثیت ہی ختم کرنے پر تُل گئے ہیں۔ راہی معصوم
رضا کا مضمون "کیرا ای گھر پریم کا" (دھرم یگ مورخہ یکم مارچ)
ملاحظہ فرمائیے۔ اِس مضمون میں راہی صاحب نے بڑے معصومانہ
مخلصانہ اور ہمدردانہ لہجے میں اُردو کے وجود سے انکار فرمایا ہے،
آپ (اعجاز صدیقی صاحب) اُردو کی سرکاری حیثیت تسلیم
کرانے کے لئے کوشاں ہیں۔ — آپ اس کے فارسی رسم الخط
کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ مگر راہی معصوم رضا اُردو زبان
کی آزاد حیثیت ہی تسلیم نہیں کرتے فرماتے ہیں۔

"میں اُردو کمونشن سے متفق نہیں تھا۔ میں اُردو کو
کوئی آزاد زبان نہیں مانتا۔ میں ریجنل لنگوئج (صوبائی
زبان) کی مانگ کا مخالف ہوں جو لنگوئج (زبان)
ہی نہیں ہے۔ وہ ریجنل لنگوئج کیسے ہو جائیگی۔"

چلیئے سارا قصہ ہی ختم ہو گیا اب اس ارشاد کو دنیا کی
اُن تمام درس گاہوں تک پہنچا دیا جائے جہاں اُردو پڑھائی جاتی
ہے۔ تاکہ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو سکے کہ وہ اب تک ایک
خواہ مخواہ کی چیز میں وقت برباد کرتے آئے ہیں۔

"گھر کے چراغ اِس طرح گھر کو آگ لگاتے ہیں۔!؟"

آپ نے اپنے مضمون "دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا"
میں انتہائی باریک نظری سے حالات کا جائزہ لیا ہے۔ واقعی رسم الخط
کو بدل دینے کی آواز کے پیچھے اُردو زبان کو ختم کر دینے کا جذبہ ہے
اِس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

لیکن مخالفین اُردو کا یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔
اُردو کے مخالفین یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ اُردو تمام دنیا میں
پھیل چکی ہے ان حالات میں۔

"یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ہندوستان میں اُردو
زبان دیوناگری رسم الخط میں لکھی جائے اور دنیا
کے دوسرے ممالک میں فارسی رسم الخط میں۔۔۔"
(اعجاز صدیقی)

محترم! آپ نے بڑے مناسب وقت میں مخالفین کو للکارا
ہے۔ آج پوری اُردو دنیا آپ کی ہم زبان ہے کہ

"اُردو فارسی رسم الخط ہی کے ساتھ اس ملک
کی قومی زبان رہے گی۔۔۔۔۔ رسم الخط کسی
حالت میں نہیں بدلا جائے گا۔"

خدا زبانِ اُردو کی بقا اور تحفظ کے لئے آپ کو صحتمند
رکھے۔ آمین۔

شفیق رحمانی

گورنمنٹ سنٹرل لائبریری۔ گوالیار ا

● بھارتی اور کرشن دونوں حضرات کے مضامین "تحریک"
میں بھی آچکے ہیں۔ متین نے اپنے پرچے میں اور آپ نے "شاعر" میں
اُن دونوں مضامین کا تجزیہ بھی پیش کر دیا ہے۔ "متین کی اُردو"
تشویش کی حد تک قابلِ توجہ بن گئی ہے۔ نظریاتی اختلاف جو اُن
کو ترقی پسند ادیبوں سے ہے، ادب کا معاملہ ہے۔ اُردو زبان کی
بقا و تحفظ اور ترویج و توسیع کا جہاں تک تعلق ہے اِس طرح کے
اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیئے۔ کرشن یا سردار یا
کوئی اور اگر کسی مصلحت (؟) کی بنا پر اُردو زبان کو اپنے
کسی فعل سے نقصان پہنچا رہے ہیں تو متین صاحب کو اُردو کا
معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہیئے۔ دھرم ویر بھارتی جیسے
لوگوں کی حمایت کیا معنی رکھتی ہے! آپ نے اپنے اظہاریہ
میں گزشتہ دِنوں کی طرح اِس بار بھی بڑی صاف گوئی سے
کام لے کر ہندی والوں کے نزدیک اپنی بات نہایت ڈھنگ سے
پیش کر دی ہے۔ آپ کا مضمون ہندی والے سنجیدگی سے پڑھیں گے۔
ممکن ہے کہ مضمون کے کچھ حصّوں سے بعض حضرات "مشتعل"
بھی ہوں۔ مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

رہا سوال رفیعہ سجاد ظہیر یا اُردو کے ایسے ادیبوں کا
جو رسم خط کی تبدیلی چاہتے ہیں تو اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد حسن
نے بہت ہی واضح طور پر ایسے عناصر کی نشاندہی کر دی ہے
کہ یہ اُن کی آواز نہیں۔ بلکہ اُن کے پبلشرز کی آواز ہے اور میرا خیال
ہے کہ اُردو کو ہندی پبلشرز کے "خیرات نما تعاون" کی
سر دست ضرورت نہیں۔ جمشید پور میں بھائی جوگی انور بھی

ایک ہفتہ وار کے ذریعہ رسم خط کو بدلنے کی تحریک اکثر و بیشتر چلاتے رہتے ہیں لیکن یہ اُن کا ذاتی فعل ہے۔ ملک کے مختلف مشہور اور علمی و ادبی مرکزوں میں رقیہ، عصمت، اور مجروح جیسے بہت سے لوگ ہوں گے۔ ہمیں ایسے عناصر کی موجودگی پر ہوشیار تو رہنا ہے لیکن مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ اُردو کنونشن کے بقیہ کاموں کو آگے بڑھنا چاہیئے۔ یہ سفر بہت کٹھن ہے۔ منزلِ مقصود تک پہنچنا بڑا جانگداز کام ہے، کہ راہ میں اپنے ہی درمیان سے "دوست نما دشمن" کی پہچان ضروری ہے۔ یہ لوگ بھارتی سے زیادہ بزدل ہیں اور اس طور پر زیادہ خطرناک بھی ہیں۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جس انرجی کو اُردو کے تحفظ اور بقا پر صرف ہونا چاہیئے تھا۔ اُسے کچھ لوگ اُردو رسم خط کو بدل دینے کی تحریک پر برباد کر رہے ہیں۔

ایم ہے (دلی) ساکچی۔ جمشید پور۔ — منظر کاظمی

● "شاعر" کا تازہ شمارہ وہم و گمان سے زیادہ بڑھ چڑھ کر نکلا۔ آپ نے جس خلوص اور قابلیت سے جریدے کو ترتیب دیا ہے وہ قابلِ داد ہے۔ مضامین، غزلوں اور افسانوں کے تنوع اور ترتیب کے لحاظ سے جریدہ منفرد ہے "شاعر" کی یہی انفرادیت ایک خاص دلکشی اور جاذبیت کا باعث ہے۔ ضیا فتح آبادی۔ تاباں، اکمل شاہجہانپوری جمیل الرحمٰن۔ اور قمر لذ کی نظمیں فکر و فن دونوں اعتبار سے حد درجہ کامیاب ہیں۔ کیف احمد صدیقی کے مندرجہ ذیل اشعار مجھے بہت پسند آئے۔ ؎

یہ رات جیسے کوئی معبدِ شکستہ ہے
یہ چاند جیسے کسی دیوتا کا لاشہ ہے

ہر ایک سمت سمندر ہے تیری رحمت کا
مرا وجود گناہوں کا اک جزیرہ ہے

جھوٹ اور مکر و فریب کے ہتھکنڈوں کے طلبگار یہ ہندی کے حمایتی چاہتے ہیں کہ دنیا کے بیشتر ممالک میں عربی کی رسم الخط میں لکھی جانے والی خالص ہندوستانی زبان ہندوستان میں دیوناگری رسم الخط میں لکھی جانے، محض

اِس بناء پر کہ اس بھاشا کو ہندوؤں، سکھوں اور عیسائیوں سے زیادہ مسلمانانِ ہند بولتے ہیں۔ بس یہی گناہِ عظیم ہے۔ حالانکہ مسلمانوں کی مذہبی زبان اُردو نہیں عربی ہے۔ صرف اصل زبانوں کا رشتہ مذہب و ملت سے جوڑنے والے لوگ ہی ہندوستانی قوم کے دامن پر بدنما داغ ہیں۔ اور ایسے داغ دھبّے مٹا دینا ہی قوم و ملک کے لئے سود مند ہے۔

ہمارے بزرگوں میں ڈاکٹر عبدالحق، سرسیّد احمد خان، تلوک چند محروم، دتاتریہ کیفی۔ کرشن چندر، اعجاز صدیقی، علی سردار جعفری وغیرہ جنہوں نے اپنے تاریخی صبر و تحمل کا ثبوت دیا ہے وہ تو قابلِ تقلید ہے ہی، لیکن مخالفینِ اُردو کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اُردو زبان و ادب کے کچھ ایسے دیوانے بھی ہیں جو کسی لالچ اور دھمکی میں نہیں آتے۔ وہ نہ تو بھوک ہڑتال کرتے ہیں اور نہ حکمرانوں کی کوٹھیوں کے دروازے پر اُردو کے لیئے بھیک مانگتے ہیں۔ یہ تو وہ محبّانِ اُردو ہیں جو اپنے خونِ جگر سے اپنی تہذیب اپنی زبان کی نئی تاریخ لکھنے کے مشتاق ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ہم سرفروشانِ اُردو اپنا سر دیدیں گے مگر اُردو کو ہندی میں ضم نہ ہونے دینگے

ہم محبّانِ اُردو اس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں گے جب تک ریاستی حکومتوں سے اُردو کے حقوق نہ مل جائیں۔

اُردو لائبریری۔ جھریا۔ — وقار عسکری

● خدا کرے آپ کی صحت تا دیر آپ کا ساتھ دیتی رہے تاکہ آپ اپنے اداریوں اور تحریروں سے اُردو کے کاز کو تقویت پہنچاتے رہیں۔

حالیہ شمارے میں بھی آپ کا مقالہ ڈاکٹر دھرم دیر بھارتی کا بہت ہی مناسب اور سنجیدہ جواب ہے۔ کاش اب بھی یہ لوگ حقیقت پسندانہ رویّہ اختیار کر سکیں۔ ان سے زیادہ افسوسناک رویّہ تو اُن لوگوں کا ہے جو اُردو کا نام لے کر اور اُردو کی روٹی کھا کر اُردو کو کند چھری سے ذبح کر رہے ہیں۔ ان گندم نما جَو فروشوں کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے

۹ مارکیٹ اسٹریٹ۔ کلکتہ ۱۳ — علقمہ شبلی

● جنوری اور فروری کا مشترکہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ مقالے کے شائع کرنے کا شکریہ! مجھے تو ڈاکٹر دھرم ویر بھارتی اور کرشن چندر کے مابین "پیش رو کے مباحث"۔ اور "ایک نظم اور سہی" کے سلسلے سے۔ "مقدمہ زیادہ چال قیامت کی چل گیا۔" زیادہ پسند آیا کیونکہ ڈاکٹر بھارتی کے کڑوے کسیلے الزامات کے جو جوابات کرشن چندر نے دیئے وہ اتنے مدلل نہیں۔ اس کے چند اہم گوشے جو تشنہ رہ گئے تھے، آپ نے پُر کر دیئے۔ اس لئے دونوں مضامین کو ملا کر ڈاکٹر بھارتی کے مضمون کا جواب "ترکی بہ ترکی" کے مصداق ہو گیا۔ دیکھئے جو ہٹ دھرموں کی سمجھ میں کچھ آئے۔

اخلاق حسین عارف
۱۵۔ بارود خانہ۔ لکھنؤ۔

● بقیہ — نقد و نظر — صفحہ ۶۴ سے آگے ●

کبھی تھے بہار ساماں　　برگ و گل و ثمر تھے

ایک نظم کا یہ شعر دیکھئے ؎

حسن کی بزم کا ہے ایسا ہی طور　　کاغذی پھول پلاسٹک کے دل

ایسی بے شمار مثالیں عمیقؔ کی نظموں سے دی جا سکتی ہیں "گدگدا جانا"۔ "جمبل اپ" اور نہ جانے کیسے کیسے الفاظ انہوں نے استعمال کئے ہیں۔ اُن کی شاعری کا اگر تفصیلی طور پر فکری اور فنی جائزہ لیا جائے تو بڑے عجیب نتائج برآمد ہوں۔

عمیقؔ پچھلے بیس سال سے شعر کہہ رہے ہیں۔ مبتدیوں میں ایسی بھول چوک درگزر کی جا سکتی ہے۔ لیکن "بازگشت" کا شاعر جس کے پہلے بھی کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور جو خود اچھا خاصا نقاد بھی ہے، اس میں قارئین اگر خوب سے خوب تر کا مطالعہ کریں تو بے جا نہیں۔

۲۰۶ صفحات۔ قیمت پانچ روپے۔　　ملنے کا پتہ:-
شبستان کتاب گھر۔ الہ آباد۔۳　　(بزاز کاظمی)

مالک، پرنٹر، پبلشر اعجاز صدیقی نے یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس ٹھاکردوار بمبئی ۲ میں چھپوا کر دہلی سے شائع کیا۔

شاعر

جاری شدہ ۱۹۳۰ء
بانی
علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم
اُردو کا چالیس سالہ علمی ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

مئی ۱۹۷۰ء
جلد ۴۱ ـــــــ شمارہ ۵

مدیر اعلیٰ
اعجاز صدیقی

ادارۂ تحریر
مہندر ناتھ
ڈاکٹر محمد حسن
شہاب جعفری
ندا فاضلی

زرِ سالانہ
۹ روپے، معاونین: ۲۵ روپے
تاعمر خریداری: ۱۲۵ روپے
ممالکِ غیر سے: ۲۵ شلنگ
فی پرچہ: ۷۵ پیسے

ترسیلِ زر کا پتہ: ماہنامہ شاعر، قصرالادب، بمبئی ۳ بی سی، فون: ۳۵۹۹۰۴
خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصرالادب، پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶، بمبئی ۳ بی سی

اس شمارے میں

منصوبہ بند کنبہ وہ ہے
جس کے افراد کی دیکھ بھال آپ بخوبی کر سکتے ہیں
بھائی جان، مجھے بتائیے آپ
کیسے اتنی اچھی زندگی
بسر کرتے ہیں۔
آسان طریقہ ہے۔ میرا کنبہ چھوٹا ہے —
— صرف دو بچے
نرودھ استعمال کیجیے
بچے کی پیدائش کو روکنا
آپ کے اختیار میں ہے۔
نرودھ استعمال کیجیے
فیملی پلاننگ کے لئے
اب ملک بھر میں دستیاب
70/2

جرعات

فسادات اور ادیب

مُلک کی دوسری بدقسمتیوں کے ساتھ ساتھ فسادات سب سے بڑی بدقسمتی ہیں۔ یہ اپنے نتائج کے اعتبار سے بیحد مہلک اور المناک ہیں۔ بیس بائیس سال سے اِن کا سلسلہ جاری ہے۔ ہر نیا ہونے والا فساد پچھلے فساد کی شدّت کو گرد بنا دیتا ہے دِل ہلا دینے والے واقعات رُونما ہوتے ہیں اور ایسی درندگی کے مظاہرے کئے جاتے ہیں جنہیں سُن کر اور دیکھ کر انسان اور انسانیت پر سے ایمان اُٹھ جاتا ہے۔ فسادات کے اسباب و علل سے مُلک کا بچّہ بچّہ واقف ہے۔ اِن کا مُسلسل وقوع پذیر ہوتے رہنا اِس بات کی دلیل ہے کہ یہ غیر شعوری اور غیر ارادی ہرگز نہیں ہوتے ـــــــ سالہا سال سے ملک میں قومی یکجہتی کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ لیکن اِن کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے منصوبے اور اقدامات بھی بے اثر ہی ثابت ہوتے رہے ہیں اور اس لئے کہ یہ ایک وقتی اُبال کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ فسادات کیلئے کوئی مستقل آئین نہیں بنایا گیا ہے اگر ایسا ہوتا تو ایک کے بعد دوسرا فساد ہرگز نہ ہوتا۔ ہندستان ایک محشر فرقہ پرستی بنا ہوا ہے اور نفسی نفسی کا عالم ہے، قومی اِصلاح کا اب تک کوئی ایسا لائحۂ عمل تیار نہیں ہو سکا ہے جو عوامی جذبات و خیالات کو ہموار کر سکے اور جس سے تالیفِ قلوب ہو سکے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ قوموں کی اِصلاح یا تو عسکری قوانین سے ہوئی ہے یا نفرت کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں محبت کے دیئے جلانے سے۔ چونکہ ہم بے حد فرقہ پرست اور خود غرض بن چکے ہیں۔ اس لئے محبت کا راستہ کافی دشوار اور وقت طلب ہے حالات کی نزاکت فوری طور پر کوئی ایسا سخت اقدام چاہتی ہے جو ملک میں سب کیلئے یکساں ہو اور پُوری دیانتداری کے ساتھ اُس کا اطلاق کیا جائے۔ اُس میں کسی کی رُو رعایت نہ ہو۔ لیکن اِس کی اُمید کم ہی ہے کہ مرکزی سرکار کوئی ایسا قدم اُٹھائیگی اور فرقہ پرست اُس کا اتباع بھی کرینگے۔ سیاسی مصلحت پسندیاں، ہمیشہ کی طرح موجودہ سنگین حالات میں بھی شاید ہی کوئی مؤثر کام ہونے دیں۔ قطع نظر اِس سے کہ فرقہ وارانہ فسادات کی بیخ کنی کے لئے مرکزی اور ریاستی حکومتیں یا سیاسی جماعتیں کیا اقدامات کرتی ہیں، اگر اِس وقت ادیب اور صحافی فرقہ پرستی کی لعنت کے اِستیصال کیلئے منظّم ہو جائیں تو بہت بڑا کام ہو سکتا ہے۔ ادب اور صحافت عوام اور خواص دونوں کے تالیفِ قلوب کا موثر ذریعہ ہیں۔ حکومتوں کے قوانین اور سیاسی جماعتوں کے فیصلے حالات اور فضا کو اُتنا متاثر نہیں کر سکتے۔ جتنا ادیب اور صحافی کر سکتے ہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ اُردو کے بڑے بڑے ادیب اور صحافی اِس سلسلے میں پہل کریں۔ ہر صوبے سے چار چھ مشہور و با اثر اُردو ادیب و صحافی مِل کر ادیبوں اور صحافیوں کی کونسل برائے اِنسدادِ فسادات" (COUNCIL OF WRITERS AND JOURNALISTS FOR THE PREVENTION OF ROITS ـــــ) بنالیں۔ اور پھر تمام صوبوں سے ہر زبان کے مشہور و ممتاز ادیبوں اور صحافیوں کو اِس کونسل میں شامل کر کے ایک ہمہ لسانی کونسل بنالی جائے۔ ادیبوں اور صحافیوں کی اِس ہندستان گیر کونسل کا کسی بھی شہر میں جلد از جلد ایک ہنگامی اجلاس ہو۔ اُس میں متفقہ طور پر ایک لائحۂ عمل طے کیا جائے۔ فسادات اور فرقہ پرستی کے خلاف کسی بھی زبان کے چند ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کے افسانے، نظمیں اور مضامین لکھ دینے سے قیامت تک رائے عامّہ ہموار اور حالات سازگار نہیں ہو سکتے۔ اِس کیلئے ادیبوں اور صحافیوں کو ایسی صورتیں اختیار کرنا ہونگی، جن سے وہ ملک کے گوشہ گوشہ میں ایک ایک مُتنفِّس تک اپنی آواز پہنچا سکیں۔

ہم بمبئی، احمد آباد، بنگلور، حیدرآباد، مدراس، کلکتہ، پٹنہ، بھوپال، دہلی، علیگڑھ، لکھنؤ، کانپور، الٰہ آباد، جے پور اور چنڈی گڑھ وغیرہ کے اُردو ادیبوں اور صحافیوں کو آواز دیتے ہیں کہ وہ آگے بڑھیں اور کونسل کی بنیاد ڈالیں۔ فی الوقت اِبتدائی رابطے کے لئے مُدیر "شاعر" کو اپنی منظوری اور مشوروں سے آگاہ فرمائیں۔

[signature: ... صدیقی]

احمد راہی

کالا سورج

[بھیونڈی، تھانہ، اور جلگاؤں کے
فساد سے متاثر ہوکر]

کتنے روشن آفتابوں کو نگل کر
"کالا سورج"
"روشنی کے شہر" میں داخل ہوا
ساری کالی طاقتوں نے
کالے سورج کو اٹھایا دوش پہ
خود بخود رستے کے سب روشن منارے گر گئے
خود بخود گل ہوگئے سارے چراغ
خود بخود سارے مکاں اور کارخانے جل اٹھے
بے گناہوں کے لہو نے راستے روشن کیئے
— آدمی کا کیا قصور !
رات بھر — یہ کالا سورج
ہر اجالے کا لہو پیتا رہا
کوچہ کوچہ رقص فرماتا رہا
گیت "جھوٹی فتح" کے یہ صبح تک گاتا رہا
روشنی کے شہر میں

کالے سورج پر کئی "آشفتہ سر" وارے گئے
"آدمی" کا کچھ نہ بگڑا "دیوتا" مارے گئے

▲

زاہد کمال

فرقہ پرستوں کے نام

"مانوتا" کے منہ پر تھوکو
سچائی کو گالی دو
جی میں جو آئے کر گزرو
انسانوں کا خون بہاؤ
نفرت کی تسکین جو بجا ہو
آگ لگا دو چاروں طرف
پوری طرح ننگے ہو جاؤ
پوری طرح پاگل ہو جاؤ
تم پڑھ لکھ کر بھی جاہل ہو
اپنے قاتل آپ ہی تم ہو
"بھارت ماں" کے لاڈلے بچو
مٹی کو تم سونگھ کے دیکھو
ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی
سب کے خون کی خوشبو اس میں مل جائے گی
خوب کرو من مانی بچو
ماں کو رسوا خوب کرو
خون بہانے کی خواہش کو
روز یوں ہی پروان چڑھاؤ
مانوتا کے منہ پر تھوکو
انسانوں کا خون بہاؤ
پوری طرح ننگے ہو جاؤ
بھارت ماں کے لاڈلے بچو
تم کو ماں سے پیار نہیں !

▲

چند یادیں

اعجاز صدیقی

شکیل بدایونی مرحوم — کچھ قربتیں کچھ دوریاں

۱۹۶۹ء اور اس نئے سال کے پچھلے چند ماہ میں جو ادیب و شاعر اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ اُن میں نریش کمار شاد، ابوالفاضل رازؔ چاند پوری۔ مولانا الم مظفر نگری، ڈاکٹر عندلیب شادانی۔ مخدوم محی الدین اور خورشید احمد جامی کی موتیں میرے لئے کچھ کم اندوہناک نہ تھیں کہ میرے دیرینہ دوست شکیلؔ بدایونی اور بزرگ ادیب امتیاز علی تاج بھی چل بسے۔ سوائے نریش کمار شادؔ کے، اب تک میں کسی مرحوم کا قرض نہیں چکا سکا ہوں۔ میں ایک دِل شکستہ اور بیمار، زمانے کی خود غرضیوں ناانصافیوں اور مصلحت پسندیوں کا ستایا ہوا۔ اُن بکھری ہوئی یادوں کو کس طرح جمع کروں جن کا تعلق مرنے والوں سے بہت گہرا ہے۔ ؟۔ کوشش کرتا ہوں تو جذبات کی فراوانی اور واقعات کی لاحدی خیالات کو بکھیر دیتی ہے۔ یادوں کی کرچیں دُور تک پھیل جاتی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ انہیں کس طرح چنوں ؟!۔

شکیلؔ بدایونی مرحوم سے چھبیس ستائیس سالہ قربت و بُعد دونوں کا ایک ایسا پُراسرار سلسلہ رہا، کہ اگر اُسے قلم بند کروں تو ایک کتاب تیار ہو جائے۔ احباب سمجھتے ہیں کہ میری گوشہ نشینی، خاموش مزاجی اور مصروفیت مجھے مقامی اور غیر مقامی ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کے واقعات و حالات سے دور رکھتی ہوگی۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ اپنے ہم عصروں سے جتنا میں واقف ہوں اور انہیں قریب و دُور سے جتنا میں نے دیکھا اور سمجھا ہے اُن کی سیرتوں سے جتنا میں واقف ہوں کم ہی لوگ واقف ہوں گے۔ میرے پاس بڑی تعداد میں اپنے ہمعصروں کے خطوط ہیں۔ چاہتا ہوں بہت سی بکھری ہوئی یادوں کو جمع کر دوں۔ لیکن نہیں کر سکتا۔

اِس کا گمان بھی نہ تھا کہ شکیلؔ اتنی جلد دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔ اُن کی موت کی اطلاع سے میرے اوسان جاتے رہے تھے۔ میری طویل علالت نے مجھے چلنے پھرنے اور سیدھا بیٹھنے سے معذور کر دیا ہے۔ شب میں ریڈیو پر شکیلؔ کی موت کی خبر سنتے ہی اِدھر اُدھر فون کئے اور پھر جس حال میں بیٹھا تھا۔ اُسی حال میں ٹیکسی سے مرحوم کی قیام گاہ "بلاؔ تنگ کا پنچ" باندرہ پہنچ گیا۔ احباب کے منع کرنے کے باوجود جنازے کے ساتھ قبرستان تک بھی گیا۔ اور اُس دوست کو اپنے ہاتھوں سے مٹی دی جس کا ساتھ بمبئی میں بیس سال تک رہا۔ اور قیام بمبئی سے پہلے پانچ چھ سال تک علی گڑھ، آگرہ، دہلی اور دوسرے مقامات پر بار ہا ملنے کا اتفاق ہوتا رہا تھا۔

شکیلؔ مرحوم ۳ اگست ۱۹۱۶ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ مجھ سے چار پانچ سال چھوٹے تھے۔ اُن کے والد مولوی جمیل احمد قادری بدایونی مستند عالم اور واعظ تھے۔ ۲۰ سال تک خوجہ اہل سنت کی مسجد میں خطیب کے فرائض انجام دیئے۔ اور یہیں ۱۹۳۰ء میں ذیابیطس کے مرض میں اُن کا انتقال ہوا۔ اُن کے بیٹے شکیلؔ بدایونی کو بھی ذیابیطس نے گھلا دیا۔

شاعرِ بمبئی

شکیل کو مرضِ دِق بھی تھا، اور آخری دِنوں میں اُن کے گلے میں بھی کچھ خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ مرضِ دِق اور ایک ایسے اِنسان کو جو ہمہ وقت ہنستا ہنساتا رہتا تھا۔!! جو معاش کی طرف سے بے حد مطمئن تھا جس نے شرابیں نہیں لنڈھائیں۔ جو اوّل درجہ کا لطیفہ گو اور بذلہ سنج تھا جس کا علاج اُونچے پیمانے پر ہوا۔ جو کئی سال تک "پنج گنی" جیسے صحت افزا مقام پر رہا۔ جسے بڑے ڈاکٹروں کا تعاون حاصل تھا۔ کون سا غم اُسے کھا گیا؟۔ وہ تو غموں کو اپنے پاس پھٹکنے تک نہ دیتا تھا۔ اُس نے کامیاب ترین مادّی زندگی گزاری۔ اُس کی خانگی زندگی میں کسی خلا کا ہونا اور بات ہے۔ لیکن کس کی زندگی میں چند خلے نہیں ہوتے، مگر شاید ایسا بھی نہ تھا۔ اگر ایسا کچھ ہو بھی تو ایک فنکار کے لئے محرومیاں نعمت بن جایا کرتی ہیں۔ فن میں حرارت اور زندگی پیدا ہوتی ہے۔ کئی شہروں میں مرحوم نے اپنے جشن منوائے۔ اگر میری یادداشت غلط نہیں ہے تو اُس کے وطن بدایون میں ہاتھی پر بٹھا کر اُس کا جلوس نکالا گیا تھا۔ اُس کے نام سے ایک شاہراہ منسوب کی گئی تھی۔ کئی شہروں میں اُس نے اپنے نام سے "بزمیں" قائم کرائیں چند دوسری زبانوں کے رسائل میں اُس نے خود پر مضامین لکھوائے، جن میں اُسے جگر مرادآبادی کے بعد سب سے بڑا غزل گو شاعر لکھا گیا۔ شاید ہی کسی کی شہرت کا آفتاب اِتنا چمکا ہو، جتنا اُس کا چمکا۔ شکیل نے حصولِ شہرت کے لئے بہت اہتمام کیا۔ اُس کی موت ہم زندہ ادیبوں اور شاعروں کے لئے عبرت کی بہت سی نشانیاں چھوڑ گئی ہے۔

شکیل مرحوم نے علی گڑھ سے بی اے کیا تھا۔ طالب علمی ہی کے زمانے میں شعر کہنے لگے تھے۔ یونیورسٹی اور علی گڑھ کی نمائش کے مشاعروں میں اُنہیں خوب خوب داد ملتی تھی۔ غالباً اُن ہی کی دو نظمیں "چور" اور "تصادم" طلبہ کو بہت لطف دیا کرتی تھیں۔ بی اے ہوتے ہی محکمۂ سول سپلائز دہلی میں اُنہیں ملازمت مل گئی تھی۔ یہاں بھی اُن کی شاعری کام آئی۔ اور جلد "پروموشن" مل گیا۔ دوسری جنگِ عظیم چھڑ چکی تھی۔ حفیظ جالندھری نے برطانوی حکومت کی طرف سے "سانگ پبلسٹی" کا شعبہ قائم کیا۔ اس کے ذریعہ قوّالیوں، مشاعروں، ڈراموں اور میوزیکل پروگراموں کا شہروں شہروں اور قصبوں قصبوں انتظام کیا۔ "سانگ پبلسٹی" کے مشاعروں کے ذریعہ جن شعرا کو چمکنے کا موقع ملا۔ اُن میں شکیل بدایونی اور خمار بارہ بنکوی کے نام بطورِ خاص لئے جا سکتے ہیں۔ اُس وقت جگر مرادآبادی کی مقبولیت بھی بڑھ رہی تھی۔ وہ اپنے والہانہ اندازِ غزل سرائی، اپنی ٹوپی اور اُس سے باہر نکلی ہوئی بالوں کی لٹوں، اپنے لباس، نشست و برخاست کے ایک خاص اسٹائل اور بے اندازہ مے نوشی سے نوجوان شعرا پر گہرا اثر ڈال رہے تھے۔ بعض نوجوان شعرا نے جگر کی ثانوی کاپی بننے کی شعوری کوشش کی۔ راز مرادآبادی اور خمار بارہ بنکوی کے نام اِسی ذیل میں لئے جا سکتے ہیں۔ شکیل اور خمار اُن ہی دِنوں جگر صاحب سے قریب ہوئے۔ نخشب جارچوی بھی اُن ہی مشاعروں کی پیداوار تھے۔ اِن سے بڑی عمر کے شعرا میں اُس وقت ساغر نظامی، حفیظ جالندھری اور احسان دانش کی غزل سرائی اور کلام کی دھوم تھی۔ اساتذہ میں حسرت موہانی، سیماب اکبرآبادی، آرزو لکھنوی، صفی لکھنوی، فانی بدایونی، اصغر گونڈوی، ثاقب لکھنوی۔ سائل دہلوی۔ بیخود دہلوی۔ احسن مارہروی۔ یگانہ چنگیزی۔ آغا شاعر قزلباش، قمر بدایونی، بیخود بدایونی، ہادی مچھلی شہری۔ پنڈت امرناتھ ساحر، روان انّاوی، جوش ملیح آبادی اور آسی الدنی وغیرہ سے مشاعرے اور شعر و ادب کا وقار قائم تھا۔ مشاعروں کے مخصوص آداب تھے، شعر و ادب کی پاکیزہ روایتیں تھیں۔ اِنسان اور انسانیت اتنے زوال پذیر نہیں ہوئے تھے جتنے اب ہیں۔ اِیسے ہی ماحول میں شکیل مرحوم کی شاعری نے اپنے بال و پر نکالے۔

سنہ ۱۹۴۶ء میں بمبئی کے ایک مشاعرہ میں اے آر کاردار کی نظرِ انتخاب شکیل پر پڑی۔ اُنہوں نے فلموں میں گیت لکھنے کی پیش کش کی۔ شکیل نے سرکاری ملازمت کا عذر پیش کیا۔ اُس وقت بھی شکیل سے میری خط و کتابت تھی۔ میں کئی بار اُنہیں آگرہ بلا چکا تھا۔ بمبئی سے دہلی واپس آ کر مرحوم نے خط لکھا جس میں کاردار صاحب کی پیش کش کا ذکر اور [illegible] اپنا

تذبذب تھا۔ میں نے زور دیا کہ وہ فلمی دنیا میں چلے جائیں۔ اور آرزو لکھنوی کی روایت کو زندہ کریں۔ کچھ دن بعد وہ چار سو روپیہ ماہانہ پر کاردار پروڈکشنز میں ملازم ہوگئے۔ میرا خیال ہے کہ مجروح سلطان پوری، اس سے بھی پہلے کاردار صاحب کے یہاں ملازم ہو چکے تھے۔ شکیل کو پہلی فلم "درد" کے گانے لکھنے کے لئے میوزک ڈائرکٹر سیّد نوشاد علی کی رفاقت ملی۔ نوشاد صاحب نے شکیل کے جوہر کو پرکھا اور اُن کی غیر معمولی ذہانت کو اُجاگر کرنے میں ایک دوست اور مُربّی کا رول ادا کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کاردار صاحب کے علاوہ ایس۔ یو۔ سنی۔ ایم صادق۔ نذیر اجمیری اور محبوب صاحب چوٹی کے ڈائرکٹروں اور پروڈیوسروں میں سمجھے جاتے تھے، دوسری طرف پونہ میں زیڈ احمد کی شالیمار پکچرز کے حلقے میں جوش ملیح آبادی۔ ساغر نظامی اور کرشن چندر تھے۔ شکیل مرحوم جلد ہی بہت سے ڈائرکٹروں اور پروڈیوسروں کے منظورِ نظر بن گئے۔ نوشاد صاحب کے ساتھ متعدد بڑی فلموں کے گانے لکھے۔ اور جب نوشاد صاحب نے یہ اجازت دے دی کہ شکیل دوسرے میوزک ڈائرکٹروں کے ساتھ بھی کام کر سکتے ہیں۔ تو مرحوم کے لئے راستے اور بھی کشادہ ہوگئے۔ انہوں نے ہر بڑے میوزک ڈائرکٹر اور فلم اسٹار کے ساتھ کامیاب ترین فلمی نغمے لکھے۔ اُن کی ہر فلم کے دو تین گیت غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لیتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجموعی طور پر اُنہوں نے سب سے اچھی فلمی شاعری کی۔ دوسرے فلمی شعراء کی طرح اُنہوں نے شعرائے پیش کے کلام کی صورت مسخ نہیں کی۔ اور نہ بے معنی باتیں لکھیں۔ مرحوم نے کلاسیکی رچاؤ کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھا۔ اُنہوں نے پُوربی زبان میں بھی کئی کامیاب گانے لکھے۔ اُن کی فلمی شاعری بڑی توانا اور لائقِ تحسین ہے۔

شکیل مرحوم کے فلمی دنیا میں آنے کے بعد میں دوبارہ "شاعر" کے "خاص نمبروں" کے سلسلے میں آگرہ سے بمبئی آیا اور دونوں بار اُنہوں نے فلمی اشتہارات کے سلسلے میں تعاون کیا۔ والدِ مرحوم پر کراچی میں ۱۹۴۹ء میں فالج کا شدید حملہ ہوا تھا۔ چونکہ ملک میں سخت خلفشار تھا۔ اِس لئے میں بصد مشکل ایک سال کے بعد دسمبر ۱۹۵۰ء کے اواخر میں اُنہیں دیکھنے کے لئے کراچی جا سکا اُن ہی دِنوں کراچی میں "ڈان" کا مشاعرہ تھا۔ مگر میں لاہور رُک گیا تھا۔ جب کراچی پہنچا ہوں تو ہندستان کے بعض شعراء واپس ہو چکے تھے۔ والد صاحب قبلہ علامہ سیماب نے اپنی فالج زدہ اُلجھی ہوئی زبان میں جگر صاحب اور شکیل کا بطورِ خاص ذکر کیا کہ یہ مزاج پُرسی کے لئے آئے تھے۔ اور کافی دیر تک بیٹھے رہے۔ شکیل مرحوم کو شروع ہی سے ہم سے گہرا لگاؤ تھا۔ اُن کے رشتے کے چچا مولانا ضیاء القادری جو ایک کامیاب نعت گو تھے۔ اور رسالہ مشہور دہلی سے منسلک، والدِ مرحوم کا بہت احترام کرتے تھے۔ مولانا ضیاء القادری ہی نے ابتداء میں شکیل کی شعری تربیت کی تھی۔

میں ایک مہینے ہی میں ۲۳ جنوری ۱۹۵۱ء کو والد صاحب قبلہ کو دیکھ کر کراچی سے بمبئی آگیا تھا۔ یہاں سالنامہ "شاعر" کے لئے کچھ کام کرنا تھا۔ شکیل مرحوم سے بھی مِلا۔ دیر تک وہ والدِ مرحوم سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے رہے۔ میں ابھی بمبئی ہی میں تھا کہ شومیٔ قسمت سے ۳۱ جنوری ۱۹۵۱ء کو دوپہر میں ہندستان اور پاکستان ریڈیو سے اُن کے انتقال فرما جانے کی اطلاع ملی۔ اُسی شب کو میں آگرہ روانہ ہوگیا۔ ایک دو دن بعد میرے اور برادرِ معظم منتظر صاحب کے نام شکیل کا دردناک تعزیت نامہ مِلا، والد صاحب قبلہ کے انتقال کے ٹھیک ۱۹ دن بعد آشوبِ روزگار سے تنگ آکر میں ترکِ وطن پر مجبور ہوگیا۔ اور ۲۱ فروری ۱۹۵۱ء کو ہمیشہ کے لئے بمبئی آگیا۔ شکیل مرحوم فوراً ملنے آئے اور کافی تسلی دی۔ پھر تو اُن سے ربط و ضبط بڑھتا ہی گیا۔ کبھی وہ بہت پاس آجاتے اور کبھی بہت، دُور ہو جاتے، گزشتہ بیس سال میں پچاسوں تلخ و شیریں واقعات پیش آئے۔ مدّتوں ملاقات نہیں ہوتی تھی، مگر جب ملتے تھے "تو ٹوٹ کر ملتے تھے۔ چند ہی لوگ بمبئی کی مجلسی زندگی میں نمایاں رہے ہیں۔ اُن میں سے ایک شکیل مرحوم بھی تھے۔ اور کم و بیش میں بھی ہر ادارے اور ہر محفل میں شریک رہا جہاں تک تلخیوں کا تعلق ہے، اُن میں مزاجوں، نظریوں، اُصولوں اور کردار کے تضادات کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ تلخیوں کی ایک بڑی وجہ میرا ترقی پسند ہونا اور ترقی پسند دوستوں کے

شاعرِ بمبئی

حلقے میں رہنا تھا مرحوم ترقی پسندی اور ترقی پسندوں سے اختلاف رکھتے تھے۔ اپنی تقریروں اور غزلوں کے بعض اشعار میں
اُنہوں نے اِس کا اظہار بھی کیا۔ ترقی پسندوں کے حلقے کے مقابلے میں اُنہوں نے مختلف تنظیمیں بنوائیں۔ وہ اپنا ایک الگ حلقہ
رکھتے تھے، مشاعروں اور جلسوں میں شرکت اُن کے اپنے مصالح کے تحت ہوا کرتی تھی۔

شعر و سخن سے جیسی شیفتگی شکیل مرحوم کو تھی، میں نے کسی میں نہیں دیکھی۔ اُن کے بے پایاں شغف اور شاعرانہ انہماک میں
بڑی تنظیم تھی۔ اُن کے پاس باقاعدہ فائل رہتے تھے۔ جن میں مشاعروں کے خطوط اور تار وغیرہ لگائے جاتے تھے۔ اُن سے جو بھی خط و
کتابت کرتا، اُسے بھی محفوظ رکھا جاتا تھا۔ مشاعروں کی تصویروں اور سپاس ناموں وغیرہ کو بھی وہ حفاظت سے رکھتے تھے۔ اُن
میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ فلمی کاموں، سیر و شکار اور تفریح، سفر اور جلسوں وغیرہ کی مصروفیات کے باوجود بڑے مشاعروں میں
نئی غزل سُنانے کی کوشش کرتے تھے۔ غزل کہنے کے بعد باقاعدہ اُس کا ترنم بٹھاتے تھے۔ مشاعروں میں اِس طرح بن سنور کر آتے
تھے۔ جیسے کوئی دولہا ہو۔ سینٹ کی بھینی بھینی خوشبو میں لباس بسا ہوا، پانوں کی بڑی ڈبیہ، بٹوا، اور غزلوں کی بیاض ساتھ میں،
مائک پر ایک دو لمحے گنگنائے اور مطلع پڑھا تو محفل میں گرمی پیدا ہونے لگی۔ اپنے ترنم میں تان، لَے اور سُر کا بڑا خیال رکھتے تھے۔
بمبئی کی تاریخ میں شکیل سے زیادہ شعر و سخن کے ہنگامے کسی نے برپا نہیں کئے۔ اُن کے ساتھ حکیم مرزا حیدر بیگ، خمار بارہ بنکوی اور
چند دوسرے لوگ بھی تھے۔ حکیم حیدر بیگ کی ذات خود ایک انجمن تھی۔ کتنی ہی انجمنیں اُنہوں نے سجائیں۔ حکیم صاحب بڑے بڑے سرکاری و
غیر سرکاری مشاعروں کا اہتمام کرتے تھے۔ شکیل مرحوم کو مشاعروں کی صدارت، افتتاح اور اناؤنسنگ کا بے حد شوق تھا۔ واقعہ
یہ ہے کہ اِن فرائض کو وہ بڑی خوبی سے انجام دیتے تھے۔ برسوں یہ سلسلہ رہا کہ شکیل صدارت کر رہے ہیں، اور خمار افتتاح۔
خمار صدر ہیں تو شکیل اناؤنسنگ یا افتتاح کر رہے ہیں۔ حکیم مرزا حیدر بیگ مرحوم صدر ہیں تو شکیل اور خمار اُن کے دائیں
بائیں موجود۔ پھر جناب عبدالحمید انصاری، مدیر و مالک روزنامہ "انقلاب" بمبئی کے ساتھ مرحوم نے مقامی اور غیر مقامی مشاعرے
پڑھے۔ خود انصاری نے شکیل کی موت پر اظہارِ رنج و افسوس کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"بیرونِ بمبئی کا تقریباً ہر وہ مشاعرہ جس میں شکیل صاحب صدارت کرنے اور میں افتتاح کرتا یا میں
صدارت کرتا اور شکیل صاحب افتتاح فرماتے، شاندار کامیابی سے ہمکنار ہوتا۔ دُور دُور سے شعر و ادب
کے رسیا اُس میں شرکت کرنے آتے۔ شکیل کے بغیر اب مشاعروں کی دنیا کتنی پھیکی اور بے رس ہوگی۔ اس کا
تصور کر کے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔"

شکیل مرحوم میں ایک بڑا وصف یہ بھی تھا کہ وہ معمولی سے معمولی شاعر کو بڑے بڑے مشاعروں میں مدعو کرا دیا کرتے
تھے۔ اِس طرح اُنہوں نے بہت سے لوگوں کو فائدہ پہنچایا۔ اور اپنے گرد اپنے مدّاحوں کا اچھا خاصہ حلقہ بنا لیا۔ کسی کو گرا دینا
اور کسی کو بڑھا دینا اُن کے لئے بہت آسان تھا۔ بہت سے شاعروں کو اُنہوں نے مشاعروں میں متعارف کرایا۔ صبا افغانی
راز الٰہ آبادی۔ شفا گوالیاری، انور مرزاپوری۔ دِل لکھنوی۔ نذیر بنارسی، فنا نظامی، بیکل اتساہی، قمر بھساولی وغیرہ
اُن کے دائیں بائیں رہتے تھے۔ ہر مشاعرہ میں وہ اِنہیں مدعو کراتے تھے۔ کئی ایسی شاعرات کو بھی اُنہوں نے مشاعروں میں متعارف
کرایا، جو خود شعر نہیں کہہ سکتی تھیں۔ مرحوم نے اُن سب کو اپنا ممنونِ احسان بنایا، زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچایا۔ جو اُن
کے حلقے میں آ گئے۔

شکیل مرحوم کے گریز اور تعاون کی تہوں تک پہنچنا بہت مشکل تھا۔ وہ بڑی خوش اسلوبی اور ڈرامائی انداز میں
مسکراہٹوں کے ساتھ اِس طرح دامن بچا لیتے تھے، کہ سامنے والا مطمئن ہو جاتا تھا۔ اگر وہ کسی مشاعرے کو ناکام بنانا

چاہتے تو ایسے اسباب پیدا کر دیتے تھے کہ وہ ناکام ہو کر رہتا تھا۔ مشاعروں میں شکیلؔ اور مجروحؔ کو ایک دوسرے کا حلیف سمجھا جاتا تھا۔ مگر دونوں پُر وقار انداز میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کرتے تھے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوا کہ جس مشاعرہ میں مجروحؔ ہوتے، شکیلؔ نہ آتے۔ شکیل مرحوم اپنے مخالف یا موافق رویّہ میں سوسائٹی کے آداب و اخلاق کا پورا پورا پاس و لحاظ رکھتے تھے۔ شکیلؔ اور مجروحؔ کی نجی ملاقاتوں میں تپاک اور خلوص ہوتا تھا۔ جگرؔ مرادآبادی مرحوم شکیلؔ اور مجروحؔ کو بہت چاہتے تھے۔ مگر وہ بھی دونوں کے نظریاتی اختلافات دُور نہ کرا سکے۔ بمبئی کے "جشنِ جگرؔ" والا واقعہ اور جگرؔ صاحب کے کئی بار بمبئی کے قیام کے واقعات بڑے اہم اور دلچسپ ہیں۔

ترقی پسندوں سے مرحوم ہمیشہ چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے تھے۔ اس کے باوجود جہاں اور جب بھی سب ملتے تو خندہ پیشانی سے ملتے۔ سردارؔ جعفری، شکیلؔ کو اکثر پیش پیش رکھتے تھے۔ جب "شاعر" کا تیس سالہ جشن منایا گیا تو مجلسِ منتظمہ چاہتی تھی کہ سردارؔ مشاعرہ کمیٹی کے چیئرمین ہوں، مگر سردارؔ جعفری نے بہ اصرار شکیلؔ مرحوم کو چیئرمین بنوایا۔ تفصیلات میں نہ جاتے ہوئے مختصراً عرض کروں گا کہ میرے ذاتی اثر و تعلق کی بنا پر ہندو پاک کے تقریباً بائیس بلند پایہ شعراء "جشنِ شاعر" کے مشاعرہ میں شریک ہوئے تھے۔ لیکن شکیلؔ مرحوم بدایون سے واپس آجانے کے باوجود مشاعرہ میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ شہر میں کسی نے ایک پوسٹر بھی چھپوا کر لگایا تھا اور اس میں لکھا تھا کہ ہندو پاک کے جن بڑے بڑے شعراء کے نام دیئے گئے ہیں وہ جشنِ شاعر میں نہیں آ رہے ہیں، اس پوسٹر میں پرنسپل ڈاکٹر شہاب الدین دسنوی کو کمیونسٹ بتایا گیا تھا۔ بمبئی کی تاریخ میں ایسا کوئی مشاعرہ نہیں ہوا جس میں اتنی بڑی تعداد میں بلند ادبی سطح کے شعراء اور اُدباء شریک ہوئے ہوں۔ یہ دو روزہ پروگرام تھا، مگر اس سے شاعر کو کوئی مالی فائدہ نہیں ہوا۔

شکیلؔ مرحوم میری اور میرے کاموں کی بہت عزّت اور قدر کرتے تھے۔ اُنہوں نے اکثر ذبی زبان میں کہا کہ میں ترقی پسند گروپ سے کٹ کر اُن کے ساتھ ہو جاؤں۔ میرے برادرِ معظم منظرؔ صدیقی صاحب سے بھی اُنہوں نے یہی شکایت کی۔ اور کہا کہ میں "شاعر" اور اعجاز بھائی کے لئے بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں مگر وہ مجھ سے دُور دُور رہتے ہیں۔ جلسوں اور مشاعروں کی ملاقاتوں کے علاوہ مجھے شکیلؔ مرحوم کے یہاں جانے کا بہت ہی کم اتفاق ہوتا تھا۔ سال چھ ماہ میں انجمن ترقی اُردو یا کسی دوسرے ادارے کے سلسلے میں اُنہیں مدعو کرنے یا کسی بیرونی معاملے میں اُن کے یہاں چلا گیا تو چلا گیا۔ گھنٹوں پُر لطف باتیں ہوتیں، وہ خاطر تواضع کرتے، رات ہو جاتی تو کھانا کھلا کے اپنی گاڑی میں باندرہ اسٹیشن چھوڑنے آتے۔ مشاعروں میں اشاروں سے پوچھ لیتے تھے کہ اب پڑھواؤں یا نہیں۔ سلام میں پہل کرنے کی اُن کی ادا سے میں بہت متاثر ہوتا تھا جبکہ میرے دوسرے ہم عصر شعراء اس کے متوقع رہتے ہیں کہ پہلے اُنہیں سلام کیا جائے، اُن سے کوئی انٹرویو لیتا تو وہ ادبی رسائل میں "شاعر" کو اپنا سب سے پسندیدہ رسالہ بتاتے۔ "ہماری زبان" پابندی سے منگاتے تھے۔ انگریزی، اُردو اور ہندی کے فلمی اخبارات و رسائل بھی باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔ بیرونی مشاعروں میں اگر اُن کا ساتھ ہو جاتا اور وہ صدر ہوتے یا افتتاح کرتے۔ تو بڑے احترام اور محبت بھرے الفاظ میں تعارف کراتے۔ میں نے جب بھی کسی مقامی یا بیرونی مشاعرے کی شرکت کے لئے اُن سے اِصرار کیا تو اُنہوں نے میری بات نہ ٹالی۔ مگر آخر میں اُن کے اس رویّے میں کچھ تبدیلی آگئی تھی۔ دسمبر ۱۹۶۶ء میں مالیگاؤں میں "جشنِ شاعر" منایا گیا تھا۔ بمبئی سے کرشن چندر۔ خواجہ احمد عباس۔ مہندر ناتھ۔ ساحرؔ لدھیانوی۔ کیفیؔ اعظمی۔ اخترالایمان، سردارؔ جعفری، وغیرہ نے شرکت کیلئے وعدے کر لئے تھے۔ مہندر ناتھ کے ساتھ میں شکیلؔ کے پاس بھی گیا۔ بہت دیر تک اپنی علالت کا تذکرہ کرتے رہے۔ "جشنِ شاعر" کے سلسلے میں اظہارِ مسرّت کیا۔ صحت کی خرابی کے علاوہ یہ عذر بھی پیش کیا کہ اورنگ آباد یا ناندیڑ میں (ٹھیک سے یاد نہیں) اُنہیں

شاعر۔ بمبئی

ایک مشاعرہ میں شریک ہونا ہے۔ اُس کے قریب تاریخ رکھی جائے اور اس میں تھوڑی سی تبدیلی کرلی جائے۔ ہم نے یہ بات منظور کرلی اور طے پایا کہ کار کے ذریعہ اُنہیں مالیگاؤں سے اورنگ آباد بھجوا دیا جائے گا۔ وہ "جشنِ شاعر" میں ضرور شریک ہوں گے۔ لیکن تیسرے یا چوتھے دِن اُن کا خط ملا۔ جس میں لکھا تھا کہ "ڈاکٹر نے سفر کی اِجازت نہیں دی ہے۔ اِس کے علاوہ "جشنِ شاعر" میں آپ اُن ہی ادیبوں اور شاعروں کو لیجائیں۔ جن کے نمبر نکالنے کا آپ نے اعلان کیا ہے۔"

۱۹۵۶ء میں "قدم ملا کے چلو" کے عنوان سے ایک بڑا اِنعامی مقابلہ ہوا تھا۔ مجھے اِس مقابلے کا کوئی علم نہ تھا۔ اِس عنوان پر میری نظم "شاعر" میں ایک ماہ پہلے شائع ہو چکی تھی۔ کسی طرح وہ نظم میرے علم کے بغیر مقابلہ میں چلی گئی۔ ایک ماہ بعد میرے پاس ایک صحافی اور ادیب کی حیثیت سے انعامی مقابلے کے جلسے میں شرکت کا خط آیا۔ میں کسی پس و پیش کے بغیر چلا گیا۔ ایاز پیر بھائی (موجودہ مارکیٹنگ اینڈ ورٹائزنگ کے ڈائرکٹر) اناؤنسر تھے اور مصطفےٰ فقیہ صاحب چیرمین جج کمیٹی (جو اُس وقت وزیرِ ریاست تھے) صدر تھے۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مجھے کافی دور بیٹھنے کے لئے جگہ ملی۔ ہندی اُردو کی سترہ سو (۱۷۰۰) نظموں میں پہلے سے اکیس نظمیں منتخب کرکے اُسی وقت ججوں کے سامنے رکھی گئی تھیں۔ تاکہ وہ اُن میں سے اوّل، دوم اور سوم نمبر کی نظمیں چُن لیں۔ کافی دیر کے بعد فیصلہ سنانے کا وقت آیا۔ ججوں پر نظر ڈالی تو اُن میں شکیل بدایونی بھی تھے۔ دوم اور سوم نمبر پر انعام پانے والی نظموں کا اِعلان کر دیا گیا اور ایک صاحب نے وہ نظمیں حاضرین کو سنا بھی دیں۔ پہلے نمبر پر آنے والی نظم کا اعلان نہ کرتے ہوئے چائے کا وقفہ کر دیا گیا۔ اور جب میں گیلری میں آیا تو ججوں میں سے چند لوگ میری طرف دیکھ کر سرگوشیاں کر رہے تھے۔ میں پھر بھی کچھ نہ سمجھا۔ اور دوستوں سے باتوں میں مصروف رہا۔ وقفہ کے بعد اناؤنسر نے نہایت ڈرامائی انداز میں اِعلان کیا کہ ایک ہزار روپے کا پہلا انعام جس شاعر کی نظم کو ملا ہے وہ یہاں موجود ہیں اور وہ ہیں اعجاز صدّیقی، ہم اُنہیں مبارکباد دیتے ہوئے درخواست کرتے ہیں کہ وہ خود اپنی نظم سنائیں۔ کافی دیر تک تالیوں سے ہال گونجتا رہا۔ میرے جسم کا تو جیسے لہو خشک ہو گیا۔ میں حیران تھا کہ نظم کس طرح مقابلہ میں پہنچ گئی؟ بہر حال نظم سنائی۔ ہار پھول پیش کئے گئے۔ ججوں کے ساتھ، صدر کے ساتھ، پھر منتظمین کے ساتھ تصاویر کھنچیں۔ اور جب یہ سب تماشا ختم ہو گیا تو شکیل نے باہر نکلنے سے پہلے پکڑ لیا، چمٹ گئے اور نظم کی بہت تعریف کی۔ کہنے لگے کہ میں اپنی کار میں آپ کو گھر پہنچانے چلوں گا۔ اور خود جا کر بھابی صاحبہ کو مبارکباد دوں گا۔ میں نے بہت منع کیا۔ مگر وہ نہ مانے۔ غریب خانہ پر آ کر کافی دیر بیٹھے۔ اپنی بھابی کو مبارکباد دیتے رہے۔ چھیڑ چھاڑ کرتے رہے اور یہ شکایت بھی کی کہ اعجاز بھائی خود کو بہت الگ تھلگ رکھتے ہیں۔

مارچ ۱۹۶۰ء میں، میں سخت بیمار ہو کر سینٹ جارج اسپتال کے خصوصی وارڈ میں زیرِ علاج تھا۔ میرے مخلص دوست سردار جعفری گھر آ کر ایسی حالت میں مجھے اسپتال لے گئے تھے، جب کہ میں اُٹھ بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ (یہاں حکیم مرزا حیدر بیگ کا ذکر ضروری تھا۔ مگر طوالت کے خوف سے آگے بڑھ رہا ہوں) مہندر ناتھ اور سردار جعفری کے علاوہ ترقی پسندوں میں سے مجھے کوئی دیکھنے نہیں آیا (میری حالیہ طویل علالت اور بمبئی اسپتال کے دورانِ قیام میں بھی ترقی پسندوں کا یہی رویّہ رہا۔) مگر اُس وقت شکیل دو بار دیکھنے آئے تھے۔ اُن ہی دِنوں بمبئی میں ایک مشاعرہ تھا۔ مشاعرہ کے دوسرے دِن چند شعرا کے ساتھ شکیل مجھے دیکھنے آئے۔ برادرم ڈاکٹر شفا گوالیاری بھی ساتھ تھے۔ ۱۰۴ ڈگری بخار، پیچش، خونی بواسیر کے آپریشن کی شدید تکلیف اور نیم بیہوشی کا عالم تھا۔ یہ سب میری نازک حالت کی تابِ نظارہ نہ لاتے ہوئے تھوڑی دیر کھڑے رہنے کے بعد واپس جانا چاہتے تھے۔ نہ جانے کیسے اُسی عالم میں ایک شعر وارد ہو گیا۔ اور میں نے نحیف آواز میں سب کو سنا دیا ؎

مجھ وقت کے بیمار کا کچھ رقص بھی دیکھو
گھبرا کے یہ جاتے ہو کہاں، بیٹھ بھی جاؤ۔

شاعرِ بمبئی

اسپتال سے گھر واپس آنے کے دو تین دن بعد میرے برادرِ معظّم منظر صدیقی اور میرے بڑے سالے عبدالرشید خاں صاحب کراچی سے مجھے دیکھنے کے لئے بمبئی آگئے۔ میرے دَوروں کا سلسلہ جاری تھا۔ برادرم شکیلؔ کے خیریت طلبی کے خطوط آتے رہے، ایک خط کا جواب منظر بھائی نے دیا اور اپنی آمد کی اطلاع دی۔ شکیلؔ ملنے آئے۔ پھر منظر صاحب کو اپنے یہاں مدعو کیا۔ وہاں میری اُداسی اور بے کیفی کا ذکر نکلا ہوگا۔ چنانچہ شکیلؔ نے منظر صاحب سے کہا کہ میں فلاں دن گاڑی لے کر آؤں گا۔ میری ایک فلم منروا سینما میں لگی ہے۔ اعجاز بھائی کو وہ دکھاؤں گا۔ اُن کی طبیعت بہل جائے گی۔ (مجھے فلم بینی سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔) شکیلؔ حسبِ وعدہ آئے۔ اُنہوں نے اور منظر بھائی نے آہستہ آہستہ نیچے اُتارا۔ اور سینما لے گئے۔ سینما ختم ہونے کے بعد سمندر کے کنارے سیر کرائی۔

جب میں نے برادرم ڈاکٹر شفاؔ گوالیاری سے قطعِ تعلق کیا تھا۔ اور "دوستی کے زخم" والی غزل اُن سے منسوب کی تھی تو شفاؔ مرحوم کے چند شاگردوں نے بڑے سخت خطوط مجھے لکھے تھے، شفاؔ مرحوم نے اپنے مُربّی شکیلؔ بدایونی کو خطوط لکھے، اِس سلسلے میں برادرم شکیلؔ نے مجھے کئی طویل خطوط بھیجے۔ جن سے اُن کی حقیقت پسندی اور معاملہ فہمی کا مجھے قائل ہونا پڑا۔ یہ خطوط اور گاہ بگاہ آئے ہوئے شکیلؔ مرحوم کے دوسرے خط میرے یہاں موجود ہیں۔

ایک بار بمبئی ریڈیو سے مشاعرہ ہوا۔ اپنی علالت کی وجہ سے میں شریک نہ ہو سکا۔ اُس کے دو چار دن کے بعد کسی سلسلے میں شکیلؔ کا خط آیا۔ میں نے جواب دیتے ہوئے آخر میں ایک جملہ یہ لکھ دیا تھا: کہ خمارؔ صاحب آئیں تو اُن سے کہیئے گا کہ آپ نے بہت اچھی غزل پڑھی۔ یہ دو شعر تو مجھے بہت پسند آئے۔ شکیلؔ مرحوم نے جواباً لکھا۔

" خمارؔ صاحب آئیں گے تو آپ کی مبارکباد اُن تک پہنچا دوں گا۔ جو شعر آپ کو پسند آئے وہ بھی بتا دوں گا۔ اور ہاں آپ میری شاعری کے تو قائل ہی نہیں ہیں۔ مگر ایک دو کے قائل نہ ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ "

اور جب میں نے جواب دیا تو اُن کا تاثر کچھ ہلکا ضرور ہو گیا۔ مگر قطعی طور پر ختم نہ ہوا۔

شکیلؔ مرحوم کی کہنہ مشقی، خوش فکری اور حسنِ ادا میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔ اُن کے مجموعوں میں اچھی اچھی غزلیں ہیں۔ اُن کی شاعری کا بیشتر حصّہ داغؔ۔ حسرتؔ اور جگرؔ کی روایتِ شعری کو زندہ کرتا ہے۔" اُن کا یہ رنگ بہت پختہ ہو چکا تھا۔ لیکن اِس رنگ کے ساتھ ساتھ کسی کسی غزل میں وہ ایسا شعر بھی کہہ جاتے تھے۔ جو زندگی کی حرارت سے بھر پور ہوتا تھا۔ اپنے وقت کا بے حد مقبول شاعر ہونے کے باوجود شکیلؔ کو اپنی غزل کے عصری مزاج تک نہ لے جانے کا احساس تھا مگر فلمی مصروفیتوں کے علاوہ اُن کی تمامتر سرگرمیاں مشاعروں تک محدود رہیں۔ اور اُنہیں خود تنقیدی کا موقع نہ ملا۔ نہ اُنہوں نے ادبی حلقوں تک اپنا کلام پہنچانے کی کوشش کی۔ ادبی پرچوں کو بہت ہی کم اپنا کلام بھیجتے تھے۔ اُنہوں نے اپنی شاعری کے متعلق خود لکھا ہے۔

" میں نے اپنی شاعری میں قدیم و جدید دونوں رنگوں کا امتزاج پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ "

اگر ہم اِسی روشنی میں شکیلؔ مرحوم کے کلام کو پڑھیں اور انتخاب کریں تو ایسے بہت سے اشعار مل سکتے ہیں جنہیں اچھّی اُردو شاعری کے سرمایہ میں [illegible]ل کیا جا سکے۔ اُردو نے اگر شکیلؔ کو بُھلا دیا تو یہ بڑا ظلم ہوگا۔ اپنی غزلیہ شاعری کے علاوہ مرحوم نے اپنے فلمی نغموں سے اُردو زبان کی جو گراں قدر خدمت کی ہے۔ وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ نعتیہ کلام کے مجموعے "نغمۂ فردوس" کے علاوہ اُن کے کلام کے تین مجموعے " رعنائیاں، صنم و حرم اور شبستاں" اُن کی یادگار رہے ہیں۔

واقعات تو اور بھی بہت سے ہیں۔ کہاں تک لکھوں۔ شکیلؔ مرحوم سے آخری سرسری ملاقات میرے محترم دوست سیّد شہاب الدّین دسنوی کی صاحبزادی کی شادی کے موقع پر صابو صدّیق پالی ٹکنیک میں ہوئی تھی۔ مدّتوں بعد وہ کسی تقریب میں آئے

تھے۔ جو لوگ مشاعروں کے اس دولہا کے براتی ہوا کرتے تھے۔ اُنہوں نے بھی بڑے اجنبی انداز سے دیکھا۔ آٹھ دس لوگوں نے "کیسے ہو۔ کیسے ہیں۔" سے آگے کوئی بات نہ کی۔ ایک ایسے اِنسان کو جسے مقامی زندگی میں نمایاں حیثیت حاصل رہی ہو۔ اِس رویّے سے کتنا دُکھ ہوا ہوگا۔؟ اُس دِن شاید پہلی بار شکیلؔ مرحوم نے اِس دنیا اور خصوصاً بمبئی کے خود غرضانہ اور مصلحت پسندانہ ماحول کو اچھی طرح سمجھا ہوگا۔ اُس وقت میرے علاوہ سردار جعفری، سکندر علی وجدؔ۔ اور دوسرے دوچار شعراء وہاں موجود تھے۔ دسنوی صاحب نے نوشہ کے ساتھ ہم چند شعراء کو تصویر کے لئے کھڑا کر دیا۔ اپنے ہم عصروں کے ساتھ شکیلؔ کی وہ آخری تصویر تھی۔ تصویر کھنچوانے کے بعد وہ ڈائس سے نیچے اُترے اور صرف دسنوی صاحب سے مل کر خاموشی کے ساتھ واپس چلے گئے۔

انتقال سے غالباً دو ماہ پہلے ایک نئے اِدارے "اُردو سرکل" کے ذریعہ اُنہوں نے بمبئی کی شعری فضاؤں کو پھر بیدار کرنے کی کوشش کی تھی۔ جو غالباً "اُردو کمیٹی" کا جواب تھا۔ یہ اِدارہ مرحوم کا جشن منانے والا تھا۔ کسے خبر تھی جشن کے بجائے اُن کے دوستوں کو "بزمِ عزا" منعقد کرنی پڑے گی۔! دنیا کتنی ناپائیدار ہے اور انسان کتنا حریص؟۔ زندگی اور موت کے فاصلوں پر اگر انسان کی نظریں رہیں تو یہ دنیا خیر ہی خیر ہو جائے۔!

جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے مجھے شکیلؔ بدایونی کی موت کا سخت صدمہ ہے، وہ بزموں کی رونقیں اپنے ساتھ لے گئے۔ میں قطعاتِ تاریخ نہیں کہا کرتا ہوں۔ لیکن شدید تاثر کے تحت اُن کے اِنتقال کے دوسرے ہی دِن ایک سالم مادۂ تاریخ نکل آیا تھا۔ اور مرحوم کی لوحِ مزار کے لئے قطعۂ تاریخ ہو گیا تھا۔ یہ قطعۂ تاریخ روزنامہ اِنقلاب بمبئی کے ۲۶ اپریل ۱۹۷۰ء کے سنڈے ایڈیشن میں شائع ہو چکا ہے۔ حق تعالیٰ شکیلؔ بدایونی کی مغفرت کرے، وہ مدّتوں یاد آئیں گے۔

هُوَالبَاقِی

قطعۂ تاریخِ وفات، شاعرِ شباب شکیلؔ بدایونی مرحوم

بمبئی، تیری خاک میں آخر — چھپ گیا وہ بدایوں کا شکیلؔ
جس کی آواز گھولتی تھی رَس — شاعری جس کی تھی متین و جمیل
جو ترنم میں اپنے یکتا تھا — جانتا تھا جو شعر کی ترسیل
تھا جو ہم عصر و ہم سخن میرا — آہ، اِک دوست بے عدیل و مثیل
ترجمانِ رموزِ حسن و عشق! — عمر بھر جو رہا غزل کا قتیل
پردۂ فلم ہو کہ بزمِ سخن — اُس کے نغمات تھے دِلوں میں دخیل
تھا ابھی درمیانِ شیب و شباب — ابھی روشن تھی فکر کی قندیل
صرف چوّن برس ہی گذرے تھے — مرضِ "دِق" نے کر دیا تحلیل
بیسؔ اپریل، روزِ دوشنبہ — آگیا ہائے، وقتِ کوسِ رحیل
آرزوئیں جو اُس کے دِل میں تھیں — رہ گئیں سب ہی تشنۂ تکمیل

اب تو ہوگا غزل سرا، اعجازؔ
"خُلد میں، شاعرِ شباب۔ شکیلؔ"

۱۹ ۰ ۷۰

غزلیں

حرمت الاکرام

مسافر اُن کے، بڑی طرفگی کے ساتھ چلے
کسی کے ساتھ نہ تھے اور سبھی کے ساتھ چلے
نہ ہم سفر کوئی پایا نہ راہبر چاہا
وہ راہرو ہیں کہ ہم زندگی کے ساتھ چلے
ہیں مہر و ماہ بھی اپنے ہی دائرے کے اسیر
رہِ حیات میں کون آدمی کے ساتھ چلے
فریب خود کو دیئے اور خود ہی پچھتائے
کسی کا جو نہ ہُوا، ہم اُسی کے ساتھ چلے
کہو کہ ہوتی ہے اِک چیز سر بلندی بھی
کہا یہ کس نے کہ ہم سرکشی کے ساتھ چلے
رہے شریکِ سفر، اعتمادِ ہم قدمی
یہ کیا ضرور ہے، کوئی کسی کے ساتھ چلے
شکستہ پا ہی سہی رہروانِ منزلِ درد
یہ کم نہیں کہ سلامت رَوی کے ساتھ چلے
خود اپنا سوزِ طلب دے سکے نہ جس کا ساتھ
دیارِ غم میں وہ کس روشنی کے ساتھ چلے
یہ کہہ کے ہو گئے خود سے بھی ہم جدا حرمت
سفر میں کون کسی اجنبی کے ساتھ چلے

علیم اختر مظفر نگری

طرحی مشاعرہ "یوم سیماب" زیرِ اہتمام "بزمِ سیماب دہلی" بمقام راجوری گارڈن، نئی دہلی میں مورخہ ۲۶ راپریل ۱۹۷۰ء کو پڑھی گئی

خیر، نگاہِ لُطف کی کیفیتِ خوشی نہ دے
حاصلِ بے رُخی مگر رنج و مَلال بھی نہ دے
عکسِ جمالِ ناز سے آئینہ بندیاں نہ کر!
دیدۂ اشتیاق کو حیرتِ خیرگی نہ دے
دیکھ، کہ سازِ کارگل، ہے بھی ہوائے گلستاں
فصلِ بہار کو ابھی اِذنِ شگفتگی نہ دے
ترکِ تعلقات کی لذتِ سنگ دے مجھے
اپنی نگاہ کو مگر تلخئ خامشی نہ دے
جَور و ستم کا آئینہ، اُف یہ خلوصِ دوستاں
ہائے وہ آفتاب جو دن میں بھی روشنی نہ دے
تیشۂ فکر و شوق سے اور صنم تراش لے
اپنے کمالِ فن کا نام، صنعتِ آذری نہ دے
خلوتِ شوق کے لیئے محشرِ آرزو نہ بن
آئینۂ جمال کو سدِّ سکندری نہ دے
دِل کہ ازل کے روز سے مستِ مئے الست ہے
سوزِ یقیں بھی دے اسے بادۂ ناب ہی نہ دے
رہ گذرِ حیات پر نقشِ وفا تو ہیں بہت
خاتمِ شوق کو علیم اور کوئی نگینہ دے

رام لعل

نجات

شکھ دیو نے پیٹھ پر رکھا ہوا ڈاک کا تھیلا ایک جھٹکے کے ساتھ ذرا اُوپر کو پھینکا۔ تھیلے کا مُہر بند سرا اُس کے ایک ہاتھ میں تھا۔ جو اُس کے دائیں کندھے سے ہو کر ٹھیک چھاتی کے اُوپر اُس کے ہاتھ کی مضبوط گرفت میں آیا ہوا تھا۔ لیکن تھیلے میں زیادہ ڈاک نہیں تھی۔ کوسلی، گرم پانی اور بہاڑ پور کے تین ذیلی ڈاک خانوں سے ڈاک ہی کتنی نکلتی تھی۔ ہر جگہ سے سو پچاس خط، چند ایک پارسل اور کچھ منی آرڈر دور دراز کے گاؤں والے پیدل چل کر اُن ڈاک خانوں تک پہنچتے تھے۔ کسی کسی کو تو کئی روز لگ جاتے۔ شکھ دیو تینوں ڈاک خانوں تک ویسٹرن ریلوے اسٹیشن کھوسا پر آئے ہوئے ڈاک کے تھیلے پہنچاتا اور گاؤں سے تھیلے لا کر اُسی اسٹیشن پر سے پوسٹل وین کے ذریعہ ڈسپیچ کرتا تھا۔

کھوسا اسٹیشن کی عمارت تین چھوٹے چھوٹے کمروں پر مشتمل تھی۔ ایک میں بڑے بابو کا دفتر۔ دوسرے میں اُن کے دو اسسٹنٹ ماسٹروں کا دفتر اور تیسرے میں مٹی کے تیل کے پیپے، ٹوٹے ہوئے لیمپ اور دوسرا کچرا بھرا رہتا تھا۔ شکھ دیو کا لکڑی کا ایک بہت بڑا بکس گیٹ کے پاس رکھا رہتا تھا۔ وہ اُسی میں ڈاک کے تھیلے رکھ کر تالا لگا دیا کرتا تھا۔ کئی سال پہلے وہ اُسی بکس کے اُوپر ہی رات کو سویا بھی کرتا تھا۔ اُسی کے اندر کھانا پکانے کے برتن بھی رکھتا تھا۔ لیکن اب اُس نے اسٹیشن کی عمارت سے ذرا دُور جنگل کی لکڑیاں کاٹ کاٹ کر ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنا لی تھی۔ جھونپڑی کے ساتھ ایک اور چھوٹی سی کھولی تھی جس میں بمشکل کبھی کبھار ہاتھ لگا ہوا جنگلی سُوَر ہی بند کیا جا سکتا تھا۔ اُس نے جھونپڑی کے سامنے ایک پُرانا تختہ بھی رکھ چھوڑا تھا۔ جس کے نیچے دو پُرانے تنے پڑے ہوئے تھے۔ اِس طرح یہ ایک تخت بن گیا تھا۔ جس پر بیٹھ کر اُس کی بیوی ستو نتی چائے، شپاری اور بیڑیاں بیچتی تھی۔ دِن میں گاڑی کے دو چار مسافر وہاں رُک ہی جاتے تھے۔ دِن بھر میں وہاں رُکنے والی ایک ہی تو گاڑی تھی۔ دوسری گاڑیاں تو بغیر رُکے چلی جاتی تھیں۔ پھر بھی پانچ دس روپے ہر مہینے بن جاتے۔ جو شکھ دیو کی ماہانہ میں مِل کر پینتالیس پچاس تک پہنچ جاتے تھے۔

شکھ دیو پیٹھ پر پڑے ہوئے سر بمہر تھیلے کو بار بار جھٹکے دے کر اُوپر کی طرف کھینچتا تھا۔ اور بار بار دوسرے ہاتھ میں لی ہوئی لاٹھی کو بغل میں دبا کر ہاتھ کی پشت سے ناک کے بانسے کو ملتا تھا۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا۔ کہ گرمی زیادہ تھی اور وہ بہت زیادہ تھک چکا تھا۔ اور اس کو شدید پیاس بھی ستا رہی تھی۔ یہ سب اگر صحیح بھی ہو تب بھی اُس کی اُلجھن کی وجہ ایک دوسری تھی۔ اُس کی پیٹھ کے ساتھ ایک مضبوط رسّی بھی بندھی ہوئی تھی۔ اُسی رسّی کے دوسرے سرے پر جگو اور ریشمی بندھے ہوئے تھے۔ جگو نو سال کا لڑکا تھا۔ ریشمی سات برس کی لڑکی۔ وہ اُس سے زیادہ سے زیادہ دس گز کے

فاصلے پر پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ سیاہ مُرجھائے ہوئے چہرے، وحشی آنکھوں میں خوف ہی خوف، سر کے بالوں اور پاؤں پر دھول جمی ہوئی تھی۔ دراصل سُکھ دیو اُنہیں گھسیٹتا ہوا سا لا رہا تھا۔ وہ کہیں کہیں گر بھی پڑتے تو سُکھ پلٹ کر کھڑا ہو جاتا۔ اُنہیں ماں بہن کی گالی دیتا۔ اور رسّی کو جھٹکا دے کر سنبھل کر اُٹھنے والے بچے کو پھر گرا دیتا تھا۔ اس استبداد کی وجہ سے دونوں کے چہروں پر آئی ہوئی بے چارگی دیکھنے کے قابل تھی۔ لیکن وہاں دیکھنے والا کون تھا؟ سوائے سُکھ دیو کے۔ جو نہ دیکھتا تھا نہ ہی محسوس کرتا تھا۔ صرف گالی دیتا اور رسّی کو کھینچ کر اُنہیں پھر گرا دیتا۔ ڈاک کے تھیلے جو اُس کی پیٹھ پر لدے تھے۔ اور مجّو اور ریشمی جو اُس کی رسّی کے ساتھ بندھے ہوئے چلے آ رہے تھے اُس کے لئے ایک ایسی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ دونوں کو دلال مانگی کے ہاتھوں میں زندہ و سلامت سونپ دے گا۔ تو اُس کی بیگار میں تیس روپوں کا اضافہ اور ہو جائے گا۔ بیگار اگرچہ اُسے سرکاری دفتر سے ملتی تھی۔ لیکن اُس میں ہونے والے ہر اضافے کو بھی وہ بیگار ہی کا ایک حصّہ گِنتا تھا۔

ایک جگہ رُک کر سُکھ دیو نے آسمان کی طرف دیکھا۔ سورج ڈوبنے میں دو گھنٹے باقی تھے۔ جن پیڑوں کے نیچے نیچے سے ہو کر وہ چل رہا تھا وہ اب ایک مقام پر ختم ہو گئے تھے۔ بیچ میں کھلا میدان پڑا تھا۔ اُس میں اُگی ہوئی گھاس بھی اُونچی نہیں تھی۔ میدان کے پار پیڑوں کا ایک اور سلسلہ تھا۔ لیکن وہاں تک پہنچنے کے لئے وہ کوئی خطرہ نہیں لینا چاہتا تھا۔ اگرچہ اُس کے پاس کوئی نہیں تھا۔ پھر بھی وہ بہت زیادہ محتاط واقع ہوا تھا۔ یہ کام وہ تین سال سے بڑی ہوشیاری سے انجام دے رہا تھا۔ آدی باسیوں کے بچے بڑی مشکل سے ہاتھ لگتے تھے۔ اُن تین برسوں میں وہ بیس بائیس کے قریب پکڑ کر دلال مانگی کے حوالے کر چکا تھا۔ یہ کام اچھا نہیں تھا۔ اُس کے کانوں میں ایسے بچوں کی ماؤں کی چیخیں ہمیشہ گونجتی تھیں۔ وہ اُنہیں وحشی اور گھبرائی ہوئی ہرنیوں کے مانند اپنے بچوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹکتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ وہ ہر آنے والے آدمی کے پاؤں پکڑ کر بیٹھ جاتی تھیں۔ اور اپنی زبان میں بَین کرتی تھیں، چیختی تھیں۔ اپنے بچے کی واپسی کے لئے التجائیں کرتی تھیں۔ وہ ہر راہرو کو بردہ فروش سمجھتی تھیں۔ جیسے اُسی نے اُن کا بچہ اُٹھا لیا ہو۔ لیکن اُس پر کوئی بھی شک نہیں کرتی تھی۔ اُس کی پیٹھ پر لدے رہنے تھیلوں کو بھی ٹٹول کر نہیں دیکھتی تھی۔

کبھی کبھی وہ سوچتا دس پندرہ برس کے بعد جب اُن کے بچے دور دراز کے قصبوں میں مشنری اسکولوں میں تعلیم و تربیت پا کر مہذّب بن جائیں گے۔ تب وہ اُنہیں دیکھ کر خوش نہیں ہوں گی؟ لیکن تب تک وہ ایک دوسرے کو یکسر بھول چکے ہوں گے۔ ایک دوسرے کو پہچان تک نہ پائیں گے۔ کیا پتہ اِن ہی میں سے کوئی بچہ نرس یا اسکول ماسٹر یا مشنری ہی بن کر اُن کے گاؤں میں گھومنے کیلئے آ نکلے۔ لیکن کسی کو کچھ بھی یاد نہیں ہوگا۔ حال اپنے ماضی کو چلے ہوئے کارتوس کی طرح بندوق سے نکال کر پھینک دیتا ہے۔ کچھ رومینٹک رُوحیں ہی ایسی ہوتی ہیں وہ بھی ہزاروں میں ایک ہی دو، جو اپنے ماضی کے لئے بھٹکتی ہیں۔ مستقبل زیادہ کشش رکھتا ہے کیونکہ اُس میں اُمید کی روشنی ہوتی ہے۔

سُکھ دیو نے حسبِ عادت گالی بک کر دونوں بچوں کو زمین پر لیٹ جانے کے لئے کہا۔ پھر اُنہیں پیٹ کے بل گھسٹ گھسٹ کر میدان پار کرنے کا حکم دیا۔ دونوں بچے زمین کے ساتھ سَرک سَرک کر آگے بڑھنے لگے۔ سُکھ دیو بڑی بیتابی سے پیڑوں کے اگلے سلسلے تک پہنچنے کے لئے آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ عام طور پر یہی میدانی حصّے اُس کے کام میں بادھا ڈالتے ہیں۔ لیکن ابھی تک سب ٹھیک ہوتا رہا ہے۔ کبھی کسی نے اُسے پکڑا نہیں ہے۔ پولیس والوں کو بھی اُس پر شک نہیں ہوا وہ میدان کے پار بخیریت پہنچ گیا۔ بچے بھی سَرکتے سَرکتے آ گئے۔ یہ دیکھ کر وہ دل ہی دل میں ہنسا۔ بعض دفعہ شکار بھی شکاری کے خوف بھرے ایڈونچر میں پوری جرأت اور احتیاط سے شریک ہو جاتا ہے۔ اُس نے بچوں کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح

بٹھادی تھی۔ کہ اگر اُنہوں نے ایک بار بھی سر اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا تو خوفناک چیلیں اُن پر جھپٹ پڑیں گی۔ پہلے تو غوطہ لگا کر اُن کی آنکھیں نکال لیں گی۔ اُس کے بعد اُن کی گردنیں اپنی خونخوار چونچوں میں دبا لیں گی۔ بچّے زمین کے ساتھ ماتھا اور ناک رگڑتے ہوئے سے سَرکتے رہے۔ اُنہوں نے ایک بار بھی سر اُٹھا کر آسمان کی طرف نہیں دیکھا۔ اُنہیں یہ تک معلوم نہیں ہو سکا کہ سورج کب ڈوب گیا۔ اُنہیں بتدریج اندھیرا ہونے کا بھی احساس نہیں ہوا۔ لیکن جب وہ میدان پار کر کے پیڑوں کے ایک اور سلسلے کے درمیان جا پہنچے تو اندھیرا چھا چکا تھا۔ گیدڑوں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ وہ بھاگ کر سکھ دیو کے قریب جا پہنچے۔ اب وہ اُس کے قریب ہو کر چلنا چاہتے تھے۔ اُنہیں ڈر لگ رہا تھا گیدڑ اُنہیں اُٹھا نہ لے جائیں۔ گیدڑ یا بھالو۔ سکھ دیو بھی کسی جانور سے کم نہیں تھا۔

اُنہیں یاد تھا۔ جب وقت اُس نے اُنہیں کھیتوں میں سے اچانک جھپٹ کر دبوچ لیا تھا۔ اُن کے گلے پہ چھُری رکھدی تھی اور پھر مُنہ میں کپڑا ٹھونس کر دونوں کو اپنے تھیلے میں ڈال لیا تھا۔ پھر ایک جنگل میں اُنہیں باہر نکال کر اُن کے ہاتھ باندھ دیئے تھے۔ لیکن اُنہیں اِس بات کا پورا یقین ہو چکا تھا کہ یہ گھنی ڈاڑھی والا آدمی جو جسم پر لپٹا ہوا خاکی کوٹ اور پاجامہ چڑھائے ہوئے ہے اور پھٹی ہوئی وزنی چپل پہنے ہوئے ہے۔ بچّوں کو کھا جانے والا جانور ہرگز نہیں ہے۔ وہ اُنہیں کہاں لے جائیگا اُنہیں کچھ معلوم نہیں، لیکن وہ اُنہیں کھائے گا نہیں۔ اِس لئے وہ کھا جانے والے جانوروں کی خوفناک کہانیاں سُن کر اِس آدمی کے قریب ہو گئے۔ پہلے کی طرح رسّی کی پوری لمبائی تک پیچھے پیچھے بے دلی سے چلنا اُنہوں نے چھوڑ دیا۔ کسی جانور کی آواز اچانک اُن کے کانوں میں پڑ جاتی تو اُن کا جی چاہتا یہ آدمی اِنہیں اُٹھا کر کندھوں پر بٹھا لے۔ لیکن وہ اُس کے نزدیک ہو کر بھی اُس سے کہہ نہیں سکتے تھے۔ کہیں وہ غصّے میں اُنہیں جانوروں کے آگے نہ پھینک دے۔!

اُس وقت رات کے گیارہ بجے ہوں گے۔ سکھ دیو بچّوں کے ساتھ اپنی جھونپڑی کے پاس پہنچا۔ دور سے اسٹیشن کی سُرخ اور ہری بتّیاں دِکھائی دیں۔ لیکن ہر طرف مکمّل سنّاٹا تھا۔ جھونپڑی کے اندر ایک مدّھم سا دیا جل رہا تھا۔ سکھ دیو پہلے تو جھونپڑی کے باہر بنی ہوئی کھولی کی طرف گیا۔ دونوں بچّوں کو اُسی کھولی کے اندر ڈھکیل دیا۔ اور دروازہ بند کر دیا۔ کسی چیز سے ٹھوک کر خوب مضبوطی کے ساتھ اُسی وقت جھونپڑی میں سے اُس کی بیوی باہر آ گئی۔ جلتا ہوا دیا اُٹھائے اُس کے اِصرار پر سکھ دیو نے کھولی کا مُنہ پھر کھول دیا۔ عورت نے دِیا اندر کر کے بچّوں کو غور سے دیکھا۔ دونوں بچّے سہمے ہوئے تھے۔ چہروں پر جتنے آنسو بہتے رہے تھے وہاں اب بھی مٹّی جمی ہوئی تھی۔ وہ سارے کے سارے اِس قدر گرد اور دھول سے اَٹے ہوئے تھے کہ مشکل سے اِنسان کے بچّے نظر آتے تھے۔ عورت نے کہا "آج ایک عورت روتی پیٹتی میرے پاس آئی تھی۔ اُدھر دیا پور کے جنگلوں سے کہتی تھی کوئی اُس کا تین سال کا بچّہ اُٹھا کر لے گیا ہے۔ اِسی گاڑی سے لے جانے والا ہے۔ لیکن اُسے اِسٹیشن کے آس پاس کوئی دکھائی نہیں دیا۔ تو لَوٹ گئی۔"

سکھ دیو نے اُسے بتایا۔ "یہ تو دوسری جگہ کے ہیں۔ عمر میں بھی بڑے ہیں۔"

عورت نے کہا۔ "اِنہیں کھانے کے لئے کچھ دوں گی۔ ذرا رُکو۔"

وہ جلدی سے دو بڑے بڑے بیل اُٹھا لائی جو پکے ہوئے کدّو کی طرح پیلے اور بھورے تھے۔ سکھ دیو نے دونوں بیل اُس کے ہاتھ سے لے کر اندر پھینک دیئے۔ دروازہ ٹھونک ٹھانک کر پھر بند کر دیا۔

بچّے بیلوں پر ٹوٹ پڑے۔ پہلے دانتوں سے کاٹنا چاہا۔ نہیں کاٹ پائے تو ایک دوسرے سے ٹکرا کر اُنہیں توڑا یا۔ بیل ٹوٹ کر زمین پر بکھر گئے۔ اُن کے اندر بھرا ہوا لسیّاں مادّہ بہہ نکلا۔ لیکن اُنہوں نے اندھیرے میں بھی مٹّی سے سنے ہوئے

ٹکڑے ڈھونڈھ لئے۔ پھر کچر کچر کھانے لگے۔

اُن کی کھولی جھونپڑی سے ملی ہوئی تھی۔ اُن کے کانوں میں سُکھ دیو اور اُس کی عورت کی باتیں پہنچ رہی تھیں۔ سکھ دیو اپنا دھو کر اب کھانا کھانے میں جُٹا ہوا تھا۔ چاولوں کی خوشبو اُن کی ناکوں میں گھسی آرہی تھی۔ دونوں کھُردری لکڑی کی دیوار کے ساتھ کان لگائے اُن کی باتیں سُن رہے تھے۔

کھانے سے نپٹ کر وہ اِسٹیشن چلا گیا۔ ڈاک کے تھیلے بکس میں بند کرلے، تھوڑی دیر بعد گاتا ہوا لوٹ آیا۔ بہت خوش تھا۔ جھونپڑی میں واپس آکر اُس نے اپنی عورت کو خوب ہنسایا، اُس کی بغلوں میں گُدگُدی کر کر کے۔ کچھ دیر بعد وہ خوب گہری نیند سو گئے۔ مجّو اور ریشمی ابھی تک جاگ رہے تھے۔ آسمان پر چاند نکل آیا تھا۔ چاند کی کرنیں اُن کی بند کھولی میں بھی پہنچ رہی تھیں۔ اُنہوں نے باری باری سے ایک دوسرے کی پیٹھ پر چڑھ کر اُس دراڑ سے باہر جھانکا۔ جس میں سے چاندنی پہنچتی تھی۔ دونوں نے چاندنی میں نہائے ہوئے میدان اور پیڑ دیکھے۔ ہر چیز پر سنّاٹا محسوس کیا۔ پھر اچانک مجّو نے پہلے کی طرح ریشمی کی پیٹھ پر سوار ہو کر درز والی جگہ میں اپنی اُنگلیاں پھنسا لیں اور اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ چھت کی کون سی کڑی کمزور ہے۔ ایک کڑی واقعی ایسی تھی جیسے پہلے تو اُس نے زور لگا کر الگ کرنے کی کوشش کی۔ جب اُس کی اُنگلیاں چھل گئیں تو پھر ریشمی نے اُس کی پیٹھ پر چڑھ کر ایسا ہی کیا۔ دونوں اِس بات پر چپکے چپکے متفق ہو گئے، اُنہیں وہاں سے بھاگ جانا چاہیئے۔ کسی کو کانوں کان بھی خبر نہیں ہوگی۔ کچھ دیر تک دونوں سوراخ میں سے سر نکال کر باہر دیکھتے رہے۔

تھوڑی دیر بعد وہ سچ مچ باہر آگئے۔ اب ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے اُس سمت کی طرف جانے کا فیصلہ کرنے لگے۔ جو اُن کے گھر کی طرف چلی جائے۔ پھر وہاں سے چل پڑے۔ پہلے تو بھاگ پڑے۔ بھاگتے ہی گئے۔ جب دیکھا جھونپڑی بہت پیچھے رہ گئی ہے، دکھائی بھی نہیں دیتی تو پھر چلنے کی رفتار کم کردی۔ وہ تھک بھی گئے تھے۔ لیکن اچانک گھنے پیڑوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اُنہیں درختوں کی طرف دیکھتے ہوئے ڈر سا لگا۔ ایک درخت پر تو کوئی پرندہ اچانک بڑی خوفناک آواز میں چیخا۔ جسے سُن کر وہ رُک گئے۔ اور ایک دوسرے سے چمٹ کر کھڑے ہو گئے۔ کتنے لمحوں تک وہ آگے نہ بڑھ سکے۔ پھر کچھ ہمت پیدا ہوئی تو آگے بڑھے۔ لیکن بہت ہی سہمے سہمے سے۔ اُنہیں اچانک ایک پیڑ پر آگ جلتی ہوئی نظر آئی۔ اُنہوں نے سُن رکھا تھا۔ رات کو پیڑوں پر بھوت بسیرا کرتے ہیں۔ آگ جلا کر آدمیوں کو بھون بھون کر کھاتے ہیں۔

اب اُن سے آگے نہ بڑھا گیا۔ اُنہوں نے ایک دوسرے کو مضبوطی سے تھام لیا اور سِسکنے لگے۔ دُور کہیں گیدڑ بھی کراہنے لگے اچانک ریشمی نے اپنے قدموں کو حرکت دی اور وہ اُسی راستے پر بھاگ پڑی جہاں سے آئی تھی۔ مجّو نے بھی اُس کا تعاقب کیا۔ اُس کے پیچھے تیز تیز بھاگنے لگا۔ وہ ایک گھنٹہ تک مسلسل بھاگتے رہے۔ کہیں بھی دَم لینے کے لئے نہ رُکے۔ اگرچہ اُن کے مُنہ کا لعاب سُوکھ گیا تھا۔ جھاگ بہنے لگے تھے۔ دَم بالکل اُکھڑ رہا تھا۔ لیکن اُنہوں نے جھونپڑی کے پاس پہنچ کر ہی دَم لیا۔ وہاں اُسی طرح سنّاٹا تھا۔ سب آرام سے سو رہے تھے۔ چاند پُورے آسمان کا سفر طے کر کے دوسری طرف پہنچ گیا تھا۔ دُور پورب میں پَو پھٹنے والی تھی۔ وہ جلدی جلدی، مگر بڑی احتیاط سے اُسی جگہ سے پھر کھولی کے اندر چلے گئے۔ جہاں سے نکلے تھے۔ جس لکڑی کو کھسکایا تھا اُسے اپنی جگہ پر رکھ دیا۔ کھولی کے اندر آکر اُنہوں نے اطمینان کا سانس لیا اور زمین پر لیٹ کر گہری نیند سو گئے۔

▲

شہاب سرمدی

شاعر

(رباعیات)

شاعر! تجھے دادِ بے نوائی دی جائے | یا تیرے سماج کو بدھائی دی جائے
اب تو بھی ہے منجملۂ اربابِ نشاط | کیا تیرے لیئے تیری دُہائی دی جائے

△

شاعر کی زباں ہے آگ پانی دونوں | بارانیِ گل، شررفشانی دونوں
اِس سے ہی رہی ہیں اور رہیں گی قائم | تلوار کی آبرو، رَوانی دونوں

△

ہر رنج کو جھیل جائے، شاعر وہ ہے | ہر ٹیس پہ مُسکرائے، شاعر وہ ہے
لیکن بشریت پہ جہاں چوٹ پڑے | تلوار کے مُنہ پہ آئے، شاعر وہ ہے

△

لازم نہیں، الفاظ سے کھیلے شاعر | یا سختیِ اوزان کو جھیلے شاعر
ہاں رازِ حیات، رمزِ جذبات کی بات | کہہ سکتا ہے، کہتا ہے اکیلے شاعر

△

یہ داد نہیں ہے، یوں نہ بیداد کرو | شاعر کی اَنا کو تو نہ برباد کرو!
بیچارہ اِسی غم میں گھلا جاتا ہے | اُس کو غمِ شہرت سے تو آزاد کرو!

△

اسرارِ حیات و حادثات کہہ دیتا ہے | جو کہتی ہے کائنات، کہہ دیتا ہے
شاعر کا یہ احسان ہے اے ہم سخنو | وہ تم سے تمہاری بات کہہ دیتا ہے

△

گو جان پہ شاعر کے بنی رہتی ہے | سُکھ دُکھ سے سدا اس کی ٹھنی رہتی ہے
یہ کم سخنی اور یہ آنکھوں کی نمی! | یوں سمجھو کہ بس تھوڑی چھنی رہتی ہے

△

شاعر ہی اگر نہ گنگنایا ہوتا — ! | حکمت نے بھی فلسفہ سنایا ہوتا!
گونگے کا یہ سپنا جیسے سنسار کہیں | سچ کر کے بھلا کس نے دکھایا ہوتا!

△

جب پاسِ حیا بھی اُسے آسان نہ ہو | کیونکر وہ سر افگندہ، پریشان نہ ہو
اے چین سے اپنی نیند سونے والو | شاعر پہ ہے کیوں شرط کہ انسان نہ ہو

مقالہ

محمد اسحٰق صدیقی

مُرغِ فردوس

دنیا میں سب سے خوبصورت چڑیا "مرغ فردوس" ہوتی ہے۔ جسے انگریزی میں "برڈ آف پیراڈائز" (Bird of Paradise) کہتے ہیں۔ یہ چڑیا صرف نیوگنی، شمالی آسٹریلیا اور آس پاس کے جزیروں میں پائی جاتی ہے۔ نیوگنی کے قریب ایک جزیرے میں اسے منوک دیوتا کہتے ہیں جس کے معنی ہیں "دیوتاؤں کی چڑیا"۔ یہ نام انگریزی زبان میں "منوکوڈ" (MANUCODE) کے نام سے آگیا ہے جو مرغ فردوس کی ایک قسم ہے۔

اِن چڑیوں کی دریافت کی ایک دلچسپ کہانی ہے۔ ۱۵۱۹ء میں پُرتگیز سیاح میگیلان (MEGELLAN) اسپین سے ساری دنیا کا بحری سفر کرنے کے لئے نکلا۔ جب وہ جنوبی امریکہ سے واپس ہو رہا تھا تو ۱۵۲۱ء میں فلپائن میں ایک مقامی جنگ میں مار ڈالا گیا۔ اُس کے مرنے کے بعد اُس کے ساتھی جزائر مولکا پہنچے۔ وہاں کے راجہ نے اُن کے سردار "ایل کینو" (EL CANO) کو مُرغِ فردوس کی چند کھالیں دیں۔ اِن کھالوں کو لئے ہوئے وہ ۱۵۲۲ء میں اپنے ملک لوٹے۔

اِن کھالوں کو نیوگنی کے باشندوں نے پُرانے رواج کے مطابق بنایا تھا۔ یعنی چڑیا کے گوشت اور پیروں کو جُدا کر کے کھال کو آگ پر خشک کر لیا تھا۔ یہ بے پیر کی کھالیں جن میں نہایت خوشنما پر لگے ہوئے تھے۔ لوگوں کو بہت پسند آئیں۔ اور چند لوگوں نے دوسروں کو حیرت میں ڈالنے کے لئے مشہور کر دیا کہ یہ چڑیاں زمین پر نہیں چلتیں۔ اگر زمین پر چلتیں تو اُن کے پَیر ہوتے۔ وہ ہمیشہ آسمان پر اُڑتی رہتی ہیں۔ اتنی بلندی پر کہ کوئی انسان اُنہیں دیکھ نہیں سکتا۔ وہ سورج کو دیکھا کرتی ہیں۔ صرف اُوس پی کر جیتی ہیں۔ نر کی پیٹھ میں ایک گڑھا ہوتا ہے جس میں مادہ انڈے دیتی اور سیتی ہے۔ اور اس بیچ میں نر برابر اُڑتا رہتا ہے۔ یہ جزائر مولکا کے اطراف میں پائی جاتی ہیں۔ جہاں وہ زندہ کبھی نظر نہیں آتیں۔ خشکی پر یا سمندر میں مَری ہوئی ملتی ہیں۔ وہاں انہیں "دیوتاؤں کی چڑیاں" کہتے ہیں۔ یورپ میں یہ "مُرغِ فردوس" کے نام سے مشہور ہوئیں۔ شاید اس خیال کی بناء پر کہ وہ فردوسی مخلوق ہیں۔

غالباً اِس افواہ کو اُڑانے کا مقصد یورپ میں اِن چڑیوں کے پَروں کی مانگ پیدا کرنا اور پھر اُنہیں ملایا سے لاکر بھاری داموں میں بیچ کر نفع کمانا تھا۔ یہ چال کامیاب رہی۔ اور رفتہ رفتہ اِن کے پَروں کی تجارت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

مشرقی ملکوں میں اِن چڑیوں کے پروں کی تجارت پہلے سے ہوتی تھی۔ چین، ہندستان، ایران اور ترکی میں اِن کی کھپت تھی، جہاں اِن کے خوبصورت پر تاج میں لگائے جاتے تھے۔ چنانچہ آج بھی نیپال کے دربار میں بڑے مُرغِ فردوس کے پَروں کی بنی ہوئی کلغیاں مہاراجہ اور اُن کے وزیر کے تاج میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اِنہیں سونے کی طرح قیمتی سمجھا جاتا ہے۔ کیوں کہ اِن کے

ایک ایک پَر کی قیمت آج کل ۱۵۰ یا ۲۰۰ رُوپے سے کم نہیں ہوتی۔

مغرب میں ان پروں کی تجارت کو مشرق سے زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ جیسے جیسے ایسٹ انڈیز میں سفید قومیں آباد ہوتی گئیں اِن پَروں کا کاروبار چمکتا گیا۔ انہیں کافی مقدار میں یُورپ بھیجا جاتا تھا۔ پیرس۔ ایمسٹرڈم اور لندن میں ان کی منڈیاں تھیں جہاں اِن سے فیشن طرازی میں مدد لی جاتی تھی۔ عموماً یہ پَر عورتوں کی ٹوپیوں میں نئے نئے طریقوں سے لگائے جاتے تھے۔

اِن پَروں کو حاصل کرنے کے لئے ہر سال ہزاروں چڑیاں ماری جاتی تھیں لیکن صرف نر۔ کیونکہ جو رنگ رُوپ قدرت نے نر کو دیا ہے مادہ کو نہیں دیا[1]۔ اور نر بھی جب تک بالغ نہیں ہوتا۔ خوبصورت نہیں ہوتا۔

چڑیوں کا شکار دیسی باشندے کرتے تھے۔ جس کا طریقہ یہ تھا۔ کہ شکاری پہلے کسی اُونچے درخت کی مضبوط شاخ پر پتّوں کی ایک ٹٹّی یا جھونپڑی بناتا اور دوسرے دِن سویرے سویرے جاکر اُس میں چھپ جاتا۔ اور دن بھر چڑیوں کا اِنتظار کرتا۔ اگر کوئی چڑیا آتی تو اُسے تیر کمان سے مار گراتا۔ تیر پر لکڑی کی ایک ٹوپی چڑھی ہوتی تاکہ چڑیا تیر کے زور سے مَر تو جائے لیکن زخمی نہ ہو۔ اگر زخم ہو جاتا تو خون سے لت پت ہوکر اُس کے پَر خراب ہو جاتے۔

اِن چڑیوں کا شکار ایک خاص موسم میں کیا جاتا تھا۔ دوسری چڑیوں کی طرح اِن کے پَر بھی سال میں ایک بار جھڑ جاتے ہیں۔ اِس کے بعد جو پَر نکلتے ہیں وہ بہت مُلائم اور چمکدار ہوتے ہیں۔ وقت آنے پر شکاریوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں ساحل کو چھوڑ کر اندر کے گاوُں میں جاکر آباد ہو جاتیں۔ یہ گاؤں شکار کے مرکز بن جاتے۔ جہاں سے وہ قریب کے جنگلوں میں جاتے، اور نر پرندوں کو مار کر لاتے۔ شکار کا یہ سلسلہ مہینوں چلتا رہتا۔ اور جب سارے نر مار لئے جاتے تو شکاریوں کی جماعتیں ساحل پر لَوٹ آتیں۔ یہاں خوب جشن منایا جاتا۔ شراب کا دَور چلتا اور دِل کھول کر جُوا ہوتا۔ بہت سے لوگ اپنی مہینوں کی کمائی ہفتوں میں ہار بیٹھتے۔

۱۸۸۰ء سے پَروں کے اِس کاروبار نے زور پکڑنا شروع کیا۔ اور ۱۹۱۰ء میں عروج کو پہنچ گیا۔ ملایا اور عرب کے تاجر اِن چڑیوں کی تلاش میں نیوگنی کے اندر تک پہنچ گئے۔ پُورے پُورے قصبوں کی گزر اوقات اِنہی پَروں کی تجارت پر تھی۔ پاپوا کے باشندے اور ڈچ تاجر بھی اِس میں شریک تھے۔ جرمن نیوگنی اور آسٹریلیا کے قبضے میں نیوگنی کا جو حصّہ تھا وہاں پَروں کی تجارت سفید اقوام کے ہاتھ میں تھی۔ وہاں اُن کی نوآبادیاں تھیں۔ جب تک اُن کی فصلیں تیار نہ ہوتیں وہ شکار میں مصروف رہتے۔ وہ زیادہ تر ناریل کے درخت اُگاتے تھے۔ جس میں آٹھ دس سال کی عمر سے پہلے اچھے پھل نہیں آتے۔ اِس بیچ میں اُنہیں مزدوری بھی دینا ہوتی۔ اِس خرچ کو پُورا کرنے کے لئے چڑیوں کا شکار ایک اچھا ذریعہ تھا۔ چند ہفتوں میں اُن کے شکار سے جو آمدنی ہوتی وہ سال بھر کے خرچ کیلئے کافی ہوتی۔

روپیہ کمانے کے لئے اِنسان نے کس بے دردی سے قدرت کی اِس حسین مخلوق کا خون بہایا۔ اِس کا اندازہ اِس سے کیجئے کہ ۱۹۱۳ء میں لندن میں ۳۰،۰۰۰ ہزار کھالوں کا نیلام ہوا۔ بعض اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ صرف ڈچ نیوگنی سے ایک سال میں ۸۰،۰۰۰ ہزار کی کھالیں بھیجی گئی تھیں۔ جب اِن پَروں کا کاروبار عروج پر تھا تو یورپ کو اوسطاً ۵۰،۰۰۰ سے لے کر ۱۰۰،۰۰۰ تک کھالیں سالانہ جایا کرتی تھیں۔

اِس اندھا دھند شکار کا نتیجہ یہ ہوا کہ "مرغ فردوس" کی بعض قسمیں تقریباً نیست و نابود ہو گئیں۔ اِس کی ایک وجہ یہ بھی تھی

---

[1] پرندوں کی دنیا میں نر ہمیشہ مادہ سے خوبصورت ہوتا ہے۔ چنانچہ گھر کی مرغی کے مقابلے میں مرغ زیادہ خوبصورت ہوتا ہے۔

ان پرندوں کا حلقہ بڑا محدود ہے۔ ایک جزیرے میں متعدد قسمیں پائی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں انکی پیدائش کی رفتار بھی سُست ہے۔ چونکہ اُن کے قدرتی دشمن کم ہیں۔ اس لئے مادہ دو تین سے زیادہ انڈے نہیں دیتی۔ باوجود اس احتیاط کے کہ مادہ اور کمسن نروں کا شکار نہیں کیا جاتا تھا۔ (اور وہ اس لئے کہ اُن کے پَر اچھے نہیں ہوتے) اُن کی تعداد تیزی سے گھٹنے لگی اور بعض شناسان فطرت یہ محسوس کرنے لگے کہ اگر ان چڑیوں کے شکار پر پابندی نہ عائد کی گئی تو اُن کی نسل ناپید ہو جائے گی۔ لہٰذا سنہ ۱۹۲۲ء میں ان چڑیوں کے شکار کی قانوناً ممانعت کر دی گئی اور اس طرح اِن کے پَروں کی تجارت کا ۵۰ سال پُرانا کاروبار ٹھنڈا پڑ گیا۔ اور ان چڑیوں کی تعداد تیزی سے بڑھنے لگی۔

۲

اُس وقت جبکہ یورپ کی عورتیں مرغِ فردوس کے پَروں کے لئے ترس رہی تھیں اور جدّت طراز مرد اُن پَروں کو زنانی ٹوپیوں میں لگانے کے نئے نئے طریقے سوچ رہے تھے۔ چند لوگ ایسے بھی تھے جو ان چڑیوں کو جیتا جاگتا دیکھنا چاہتے تھے۔ اُن کے رہن سہن کے طریقوں اور عادتوں سے واقف ہونا چاہتے تھے۔

مُردہ چڑیوں کی کھالوں کو دیکھنے سے پتہ چلتا تھا کہ اس چڑیا کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں۔ اِن میں سے بعض کے نام بھی رکھے جا چکے تھے۔ سنہ ۱۶۰۵ء میں ایک شخص نے مرغِ فردوس کی تین قسموں کا مختصر حال لکھا۔ سنہ ۱۷۲۶ء میں ایک دوسرے ماہر حیوانیات نے چھ قسموں کا مفصّل حال لکھا لیکن شاید اُن کے مضامین کی ٹھیک سے اشاعت نہ ہوئی۔ عوام تو عوام خواص بھی اُن سے ناواقف رہے۔ چنانچہ سنہ ۱۷۵۳ء میں سویڈن کے مشہور عالم لِنا ییس (LINNAEUS) نے بڑے مُرغِ فردوس کا علمی نام "پیراڈیزیا اپوڈا" (PARADISEA APODA) رکھا۔ جس کے معنی ہیں "بے پَیر کا مُرغِ فردوس"۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تک یورپ والوں کے دماغ سے یہ خیال نہ نکلا تھا کہ جزائر مولکا میں ایک بے پاؤں کی چڑیا پائی جاتی ہے۔ سنہ ۱۷۸۲ء میں ایک انگریز سائنسداں جان لتھام نے اِس خیال کی تردید کی اور بتایا کہ پاپوا کے باشندے کس طرح اِن چڑیوں کی کھالوں کو محفوظ کرتے ہیں۔

پہلا شخص جس نے اِن چڑیوں کا اُن کے قدرتی ماحول میں جاکر گہرا مطالعہ کیا۔ ڈاروِن کا معاصر اور مؤید الفریڈ رسل ویلس (ALFRED RUSSELL WALLACE) تھا۔ جس نے ان کا مفصّل حال اپنی کتاب "دی میلے آرچی پے لاگو" (THE MALAY ARCHIPELAGO) مطبوعہ سنہ ۱۸۶۹ء میں پیش کیا۔ اُس کے بعد ان چڑیوں کے بارے میں کئی مستقل کتابیں اور درجنوں تحقیقی مضامین شائع ہوئے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

زندہ اور مُردہ عجائب خانوں کے لئے بھی یہ چڑیاں فراہم کی گئیں۔ اِس طرح عوام کو انہیں دیکھنے کا موقع ملا۔ اس سلسلے میں انگلستان کے امیر و کبیر لارڈ روتھشائیلڈ" (LORD ROTHSCHILD) کا ذکر ضروری ہے جنہوں نے اپنے ذاتی عجائب خانے کے لئے ہر قسم اور ہر عمر کے مُرغِ فردوس جمع کئے، تاکہ عمر کے لحاظ سے اُن کی جسمانی تبدیلیوں کا مشاہدہ کیا جا سکے۔ انہوں نے مشہور ماہرین حیوانیات کو نیوگنی نئی قسموں کو دریافت کرنے کے لئے بھیجا۔ وہ چالیس سال تک لگاتار ان چڑیوں کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اور بے دریغ روپیہ صرف کیا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے پاس دنیا میں مُرغِ فردوس کا سب سے اچھا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں انہوں نے اپنے اِس بے نظیر ذخیرے کو فروخت کر دیا جسے امریکن میوزیم آف نیچرل ہسٹری (نیویارک) نے خرید لیا۔

امریکن میوزیم اور نیشنل جیوگرافیکل سوسائٹی (واشنگٹن) نے ماہرین حیوانیات کو وقتاً فوقتاً نیوگنی بھیجا۔ تاکہ وہاں جاکر اِن خوبصورت پرندوں کی زندگی کا مطالعہ کریں۔ انکی نشادہ اور رنگین تصویریں کھینچیں۔ اُن کے بارے میں فلم بنائیں اور اُن کی آوازوں کے ریکارڈ بھریں۔ امریکہ کے علاوہ جرمنی، انگلستان اور بعض دوسرے ملکوں کے لوگ بھی بڑی بڑی دشواریاں سہے

کر کے نیوگنی پہنچے ہیں۔ اور ان میں سے بعض کو وہاں کے نیم وحشی باشندوں کے ہاتھوں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ کیونکہ وہاں کے باشندے اب تک موجودہ تہذیب سے کوسوں دور ہیں۔ وہ پتھر کے ہتھیاروں سے شکار کرتے ہیں۔ اُن کی عورتیں اُوپر کے جسم سے ننگی گھومتی ہیں۔ اُن کے سردار مُرغِ فردوس کے پَروں کو اپنی ناک میں نکیل یا نتھ کی طرح پہنتے ہیں۔ اور اپنے پَروں میں لگاتے ہیں۔ کوڑیوں اور سیپیوں سے سنگار کرتے ہیں۔ چہروں کو لال، پیلے اور کالے رنگوں سے رنگتے ہیں۔ اژدگر کی کھال سے منڈھے ہوئے ڈھول بجا کر اور نیزے ہلا ہلا کر خوفناک رسمیں ادا کرتے ہیں۔

مُرغِ فردوس کے شکار کی صورت بدل چکی ہے۔ اب اُنہیں تیر کمان سے کوئی نہیں مارتا۔ اُن کا شکار کیمرے سے کیا جاتا ہے۔ اُن کی رنگین تصویریں وقتاً فوقتاً رسالوں میں شائع ہوتی ہیں۔ اُنہیں اب بھی پکڑا جاتا ہے لیکن صرف عجائب گھروں کیلئے۔ دنیا کے ہر مشہور عجائب گھر میں یہ چڑیاں پہنچ چکی ہیں۔ اور ہو سکتا ہے کہ اُن میں سے بعض آپ کی نظر سے بھی گزری ہوں۔

۳

مُرغِ فردوس شمالی آسٹریلیا، نیوگنی، اور آس پاس کے جزیروں میں سطحِ سمندر سے لے کر پہاڑ کی بلند چوٹیوں تک پائے جاتے ہیں۔ اُن کی اب تک پچاس قسموں کا پتہ چلا ہے جن کی جسامت کوّے سے لے کر گُدریّا تک ہوتی ہے۔ ان میں سب سے خوبصورت وہ قسمیں ہیں جن کے نَروں کے پَر رنگین ہوتے ہیں۔ اور جو اپنی زندگی کی ذمہ داریوں یعنی گھونسلہ بنانے، انڈے سینے اور بچوں کی پرورش کرنے سے آزاد ہوتے ہیں۔ اور جن کے نَر مادہ کے ساتھ مِل کر گھونسلہ بناتے ہیں۔ اور بچوں کی پرورش کرتے ہیں۔

یہ سب قسمیں گھنے جنگلوں میں رہتی ہیں۔ درختوں کی چوٹیوں پر اپنا وقت بتاتی ہیں جہاں اِن کے چھوٹے چھوٹے غول اِدھر سے اُدھر اُڑا کرتے ہیں۔ اِن چڑیوں کو اِس کا احساس ہے کہ اُن کے خوبصورت پر دشمنوں کو شکار کی ترغیب دے سکتے ہیں۔ اِس لئے ذرا سا کھٹکا پا کر گھنے پتّوں میں چھپ جاتی ہیں۔ اِن میں سے کوئی گاتا نہیں۔ بیشتر کی آواز کرخت ہوتی ہے۔ اِن کی بعض قسموں کو مقامی زبانوں میں "مُرغِ آفتاب" کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ طلوعِ آفتاب کے وقت بڑا شور مچاتی ہیں۔

ان کی خاص خوراک وہ پھل ہیں جن میں چھوٹے چھوٹے بیج ہوتے ہیں گٹھلی نہیں ہوتی۔ بعض قسمیں پھولوں کا رس چوستی ہیں۔ سب ہی قسمیں کیڑے مکوڑے حتیٰ کہ مینڈک اور چھپکلیاں تک کھا جاتی ہیں۔ کیڑوں کی تلاش میں تنوں کو کُریدتی رہتی ہیں۔ اور اُن کی چھال تک اُدھیڑ دیتی ہیں۔

بہتوں کے گھونسلے اور انڈے اب تک دستیاب نہیں ہوئے ہیں۔ عموماً گھونسلہ کسی گھنی جھاڑی یا درخت کی چوٹی پر بنایا جاتا ہے یہ بعد ہٗ مچان کی طرح ہوتا ہے۔ اِسے وہ شاخوں، پتّیوں اور کائی سے ڈھیلا ڈھالا بناتی ہیں۔ انڈے مختلف وضع کے، مختلف رنگوں کے اور دھبّے دار ہوتے ہیں۔ عموماً نارنگی جن پر کتھئی دھاریاں ہوتی ہیں۔

"مُرغِ فردوس" کی بیشتر قسموں کے پَر نہایت خوشنما، رنگین اور چمکدار ہوتے ہیں۔ اُن کی صورتیں بھی عجیب عجیب ہوتی ہیں۔ بعض کی کلغی چھتری نما ہوتی ہے۔ بعض کے سینے پر پَروں کی ڈھال ہوتی ہے۔ بعض کے سر کے پیچھے سے جھنڈی نما پَر لٹکتے ہیں اور بعض کی دُم کے بیچ سے پَروں کے لمبے لمبے تار نکلتے ہیں۔ جو دائیں بائیں، مختلف طریقوں سے مُڑ جاتے ہیں۔ یہ خوشنما پَر صرف نَر کے ہوتے ہیں مادہ کی پوشاک سادہ ہوتی ہے۔ بچے، نَر اور مادہ دونوں معمولی پَر رکھتے ہیں۔ اُن میں کوئی کشش نہیں ہوتی۔ لیکن جب نَر بچہ بالغ ہوتا ہے تو نہایت خوشنما بال و پَر نکالتا ہے۔ نَر کے پَر خوشنما اور مادہ کے معمولی ہونے میں قدرت کی مصلحت ہے۔ اِس سے مادہ کی حفاظت ہوتی ہے۔ جب وہ اپنے گھونسلے میں انڈوں کو سیتی ہے تو آسانی سے نظر نہیں آتی۔ اگر اُس کے پَر بھی نَر کی طرح خوشنما ہوتے تو وہ آسانی سے نظر آجاتی اور اُس کا بھی نَر کی طرح شکار کر لیا جاتا۔ نابالغ اور کمزور بچوں کے پَروں کا معمولی ہونا بھی اِسی وجہ سے ہے۔ جب

مادہ انڈے سیتی ہے تو نر ہمیشہ اُس سے دُور رہتا ہے اور اپنے بچوں کو کبھی دیکھنے نہیں آتا۔ تاکہ انڈوں اور بچوں کا پتہ اُن کے قدرتی دشمنوں (بلاؤں اور سانپوں وغیرہ) کو نہ چلے۔

شروع برسات اُن کے جنسی ملاپ کا زمانہ ہوتا ہے۔ بعض قسموں کے نر مادہ کے سامنے اپنے حُسن کی تنہا نمائش کرتے ہیں۔ اور بعض کے مل کر یعنی نر اور مادہ چڑیاں کسی درخت پر جمع ہو جاتی ہیں۔ ہر نر اپنی خوبصورتی کا مظاہرہ کرتا ہے اور جسے جو مادہ پسند کرلیتی ہے وہ وقتی طور پر اُسی کا ہو جاتا ہے۔ عموماً کسی سوکھے یا کم پتوں والے درخت کو چُنا جاتا ہے۔ تاکہ نر کو پروں کو پھیلانے میں دشواری نہ ہو اور ہر مادہ صاف طور پر اُن کے ایک ایک پر کو دیکھ سکے۔

مُرغِ فردوس کی بعض قسمیں اپنے لئے "ناچ کا میدان" تیار کرتی ہیں۔ جس کے لئے وہ زمین کے جھاڑ جھنکاڑ کو صاف کرتی ہیں اور وہاں کے چھوٹے چھوٹے درختوں کی پتیاں نوچ ڈالتی ہیں۔ انہیں کی ڈالیوں پر وہ طرح طرح کے کرتب دکھا کر مادہ کو رجھانے کی کوشش کرتی ہیں۔

نر اپنے حُسن کی نمائش کے لئے اپنے پروں کو طرح طرح سے حرکت دیتے ہیں۔ اُن کا رُواں رُواں رقص کرتا ہے۔ اور بوٹی بوٹی تھرکتی ہے۔ وہ ہر طرح سے اپنے جسم کو توڑتے مروڑتے ہیں۔ اور وہ سب کچھ کرتے ہیں جو مادہ کی نظر میں اُن کے حُسن کو نمایاں کردے۔ اور اس طرح اُنہیں انتخاب کرنے پر آمادہ کرے۔

مقامی باشندے ان پرندوں کے اجتماعی مظاہرۂ حُسن کو "محفلِ رقص" کہتے ہیں۔ یہ عموماً طلوعِ آفتاب کے وقت کسی مخصوص جگہ ہوتا ہے۔ پُرانے زمانے میں پروں کے تاجر ایسی جگہوں میں چھپے رہتے تھے، اور نروں کو تیروں سے مار گراتے تھے۔

ان میں سے بعض قسموں کے نر صرف اپنے پروں کو دکھانا ہی کافی نہیں سمجھتے بلکہ اپنا مُنہ بھی کھولتے ہیں تاکہ اندر کا سبز یا زرد رنگ بھی مادہ کو نظر آئے اور شاید وہ اسی طرح اُن کی طرف مائل ہو۔

سب سے خوبصورت بڑا مُرغِ فردوس ہوتا ہے جس کی جسامت کوّے کے برابر ہوتی ہے۔ جب یہ پندرہ بیس کی تعداد میں کسی درخت پر اپنے حُسن کی نمائش کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جابجا سُنہرے پانی کے فوّارے چھوٹ رہے ہیں۔ یہ سُنہرا رنگ اُن کے لمبے لمبے بال جیسے پروں کا ہوتا ہے۔ جو اُن کے بازوؤں کے نیچے سے اُگتے ہیں۔ اور اظہارِ حُسن کے وقت پیٹھ پر چنور کی طرح چھا جاتے ہیں۔ اسی طرح جب نیلا مُرغِ فردوس درخت سے اُلٹا لٹک کر اپنے پروں کی نمائش کرتا ہے تو اتنا خوبصورت معلوم ہوتا ہے کہ اگر اُسے زندہ قوسِ قزح کہا جائے تو بجا ہے۔

باوجود اس حسن وجمال کے "مُرغِ فردوس" کوّے کا قریبی رشتہ دار ہے۔ نظریۂ ارتقا کی رُو سے مُرغِ فردوس کا مورثِ اعلیٰ کوّے سے ملتا جلتا ایک پرندہ تھا۔ جس کے پر رفتہ رفتہ مخمل کی طرح نرم اور چمکدار ہوتے گئے۔ چنانچہ آج بھی مُرغِ فردوس کی بعض سیاہ قسمیں پائی جاتی ہیں جن کے پروں میں اُودے اور سبز رنگ کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان سیاہ چڑیوں کو رائفل برڈ (RIFILE BIRD) یا رائفل مین برڈ (RIFLEMAN BIRD) کہتے ہیں۔ شاید یہ نام یوں پڑا کہ اُن کے پروں کی سیاہ پوشاک جس میں سبز رنگ کی جھلک نمایاں ہوتی ہے، برٹش رائفل رجمنٹ کے سپاہیوں کی سیاہ اور سبز وردی سے مشابہ ہوتی ہے۔ اس کی پانچ قسمیں ہیں۔ جن میں سے ایک نیوگنی میں باقی آسٹریلیا میں پائی جاتی ہیں۔

سیاہ پروالے مُرغِ فردوس میں سب سے پُرانی ذات منوکوڈ (MANUCODE) کی ہے جو شمالی کوئنس لینڈ اور نیوگنی میں پائی جاتی ہیں۔ اس کی بھی چار پانچ قسمیں ہوتی ہیں۔ لیکن ان کے سیاہ پروں میں روشنی پڑنے پر سبز اور اُودے رنگ کی جھلک نمایاں ہوتی ہے۔ ان میں نر مادہ یکساں ہوتے ہیں لیکن نر کسی قدر بڑا ہوتا ہے، اُس کی جسامت کوّے سے کم ہوتی ہے۔

(باقی صفحہ ۳۰ پر دیکھئے)

فریبِ آگہی

مہدی پرتاپگڑھی

ہر ایک گام پہ روشن ہیں عہدِ نو کے چراغ
وہ "تیرگی" مگر انسان کا مقدّر ہے
جو ذہن و دِل پہ مُسلّط ہے "آگہی" بَن کر
اُٹھاتی پھرتی ہے ہر سمت قہر کی فصلیں
ہر ایک سینے میں سازش کے بیج بوتی ہے
زباں کو آتش و بارُود کا چلن دے کر
جلاتی رہتی ہے اَمن و اَماں کے گہوارے
بڑھاتی رہتی ہے عالَم کی یاس انگیزی
شعور و فکر کے آنگن میں زخم مِلتے ہیں
عروسِ زیست کے دامن میں زخم مِلتے ہیں
وہ "آگہی" کہ شعورِ بشر پہ خنداں ہے
علاجِ کاہشِ ہستی سے بھی گُریزاں ہے
ہے روز و شب یہ تگ و دو کہ ہاتھ آجائے
زمانہ شام و سحر، گردشِ مہ و خورشید
ہر ایک لمحہ اِسی کشمکش میں گُذرے ہے
نِکل نہ جائیں کہیں محبسِ تفکّر سے
ضمیر، ذہن و نظر، فکر، سوچ، انساں کے
کمند ڈالتے پھرتے ہیں چاند تاروں پر
مگر جو سینۂ گیتی پہ زخم اُبھرے ہیں
یہاں پہونچتی نہیں "آگہی" کی حُسنِ نظر
ہزار فتنے جگاتی ہے اِک اشارے پر
فروغ دیتی ہے نسلی مُنافرت کو کہیں
کہیں پہ فرقہ پرستی کی کرتی ہے تبلیغ
چمن چمن کو بناتی ہے دیت نام کبھی
لہو اُگلتی ہے صیہُونیت کے پردے سے
نگاہ و دِل میں شقاوت کے بیج بوتی ہے
دیارِ گُل میں عفونت کے بیج بوتی ہے

قدم قدم پہ ہیں ذہن و نظر کے سوداگر
جو فکر و فن کا تصوّر خرید لیتے ھیں
ہزار حَیف کہ شیشہ گرانِ عہدِ نو،
سَجائے بیٹھے ہیں زخموں کی اِک دُکاں ہر سمت
بقولِ خود جو مسیحائے وقت بنتے ھیں
وہ زہر بن کے اُترتے ہیں ہر رگِ جاں میں
عجیب موڑ پہ آیا ہے کاروانِ حیات
ضمیر اپنا، نہ ذہن اپنے اور نہ فکر اپنی
شعور مُردہ، فراست کے بام و دَر ہیں بند
بشر کے ذہن میں ہے قید جذبۂ تعمیر
رَوِش پہ گُل کی نسیمِ سحر کا ہر جھونکا
لَپکتے شعلوں کی یلغار کر کے گُذرے ہے
دِل و نظر پہ ہے چھایا فریبِ رنگ و بُو
متاعِ دَرد لُٹائے ہے جنبشِ اَبرُو
رُخِ سحر پہ ہے احساس کی رگوں کا لہُو
لگے ہیں گھات میں انساں کے اَن گنت اَوہام
ہر ایک موڑ پہ تخریب نے بچھائے ہیں دَام
فصیلِ وقت پہ روشن ہیں عہدِ نَو کے چراغ
کسی بھی دل میں مگر روشنی نہیں مِلتی
کسی رَوِش پہ کہیں زندگی نہیں مِلتی
وہ "تیرگی" جو اب انسان کا مقدّر ہے
وہ ذہن و دل پہ مُسلّط ہے "آگہی" بن کر
ہر ایک سمت دکھاتی ہے خُوں چکاں منظر
دِلوں سے چھینتی رہتی ہے عَزمِ گُل بیزی
اُبھارا کرتی ہے اِک جذبۂ سِتم خیزی
قدم قدم پہ فریبِ حیات دیتی ہے
بساطِ فکر پہ انساں کو مات دیتی ہے

شاعر۔ بمبئی

پریم گلین

میرا ہم عمر

کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ اپنے ہم عمر کا گلا گھونٹ دوں۔!

اُس نے آسمان کے نیچے نظر آنے والے اور محسوس کئے جانے والے مختلف عناصر کا تجزیہ کر لیا ہے۔ اور بہت نزاش ہو گیا ہے۔ اب وہ بہت اُداس رہنے لگا ہے۔ کوئی چیز اُسے بھلی نہیں لگتی، نہ ہنستا ہے نہ روتا ہے۔ بس ایک چُپ سادھے ویرانہ میں تنہا بیٹھا رہتا ہے۔ موسم سرما کے اختتام پر درختوں کی جو حالت ہو جاتی ہے، ویسی ہی حالت میرے ہم عمر کی ہو گئی ہے۔!

میں اپنے ہم عمر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُس کے دِل میں اُتر جاتا ہوں۔ اُس کا دِل ایک گونجتی ہوئی اندھیری غار ہے۔ ۔ ۔ ۔ " دولت سے کیا ہوگا؟۔ اِحبابِ کرم کی عنایات سے کیا ہوگا؟۔ کسی چھوٹی چیز کی خواہش سے کیا ہوگا؟۔ "۔ ۔ ۔ ۔ میرے کان پھٹنے لگتے ہیں اُن آوازوں سے۔ میں گھبرا کر اُس غار سے نکل بھاگنا چاہتا ہوں لیکن وہ کم بخت! میرے اُترنے کے بعد غار کا دہانہ بند کر دیتا ہے۔ اور جب میں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے مارتے نڈھال ہو جاتا ہوں تو وہ مجھے غار سے نکال کر زمین پر پٹک دیتا ہے۔!

میں اُس کی مایوسی اور جھلاہٹ کی وجہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ زمین سے اُٹھ کر میں اُس کے ٹھیک سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ اور بڑی محبت سے اُس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیتا ہوں۔ وہ اپنی نظریں میرے چہرے پر گاڑ دیتا ہے۔ اُس کی آنکھوں میں بے چینی کا سمندر اُبل رہا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں یہاں تمہارے ساتھ ہی پیدا ہوا۔ تمہارے ساتھ ہی بڑھا۔ تعلیم حاصل کی اور پھر مختلف عناصر کا تجزیہ کیا۔ خشکی کے کنارے جس جگہ ساگر کے کناروں سے ہم آغوش ہوتے ہیں وہاں تک بھی میں گیا ہوں۔ میں نے ہر جگہ دیکھا ہے کہ جتنے بھی عیش و عشرت کے سامان ہیں وہ تمام مصیبتوں کے باعث ہیں۔ ہرن سراب کو آب سمجھ کر اُس کے پیچھے بھٹکتے رہتے ہیں۔ اُسی طرح ہم لوگ بھی بھٹک رہے ہیں۔ لیکن ہاتھ کیا آئے گا؟۔ اگرچہ کسی نے ہم لوگوں کو خریدا نہیں ہے۔ پھر بھی ہم غلاموں کے مانند دوسروں کا منہ تکتے رہتے ہیں۔ مایا کو جانتے ہوئے بھی اُس کی فکر نہیں کرتے، !"

لیکن اِس سارے جہان کے درد کو تم اپنے ہی جگر میں اکٹھا کیوں کر رہے ہو۔؟۔ اُٹھو، میرے ہمراہ چلو، زندگی کا لُطف اُٹھاؤ۔ یہ زندگی بڑی حسین ہے۔ اس کافر "ساحرہ کو دیکھو تو سہی"۔ میں اُس کی آنکھوں میں اُبلتے ہوئے بے چینی کے سمندر کو شانت کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

" جیسے پُرانا درخت اپنے کھوکھلے پن میں چھپی آگ سے جل جاتا ہے ویسے ہی اِس دیکھ سے میرا چھٹکارا کیسے ہوگا؟۔ دنیا کے آلام کو دیکھ کر میرا دِل چھلنی ہو گیا ہے۔ میں اپنے احبابِ کرم سے ڈر کر آنسو بھری آنکھوں سے رو بھی تو نہیں سکتا۔ کیونکہ

اگر میں رونا شروع کردوں تو وہ بھی رونے لگیں گے۔!" وہ اپنی بے بسی کا اظہار کرتا ہے۔

" تم دوسروں کی اس قدر فکر کرنا چھوڑ دو۔ ایک کام کرو۔ ایک بار جی بھر کر رو لو۔ رو لینے سے جی ہلکا ہو جائے گا۔ اور آنسوؤں کے ساتھ تمہارا سارا درد بہہ جائے گا۔!" میں اُسے پُرخلوص مشورہ دیتا ہوں۔

۔ مجھے بڑی ہمدردی ہو گئی ہے، اپنے ہم عمر سے۔ میں سوچنے لگتا ہوں کہ اگر میں پیلے پربتوں کا مالک ہوتا تو اپنے ہم عمر کی خوشی کے لئے ان پربتوں کو اُس کے قدموں پر جھکا دیتا۔ "

" پیلے پربتوں کا بڑھتا ہوا قد اپنے سائے میں کالے چوروں کو پناہ دیتا ہے۔ ندیوں سے اَن گنت ترنگیں پیدا ہوتی ہیں۔ پھر وہ ہوا کی مدد سے بڑھتی ہیں۔ افکار پیلے پربتوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور کالے چوروں کی مدد سے بڑھتے ہیں۔ جیسے دھول تہہ بن کر موتیوں پر بیٹھ جاتی ہے۔ اور اُن کی چمک کو ماند کر دیتی ہے۔ ٹھیک اُسی طرح بہادر اور دوسروں کے احسان کو یاد رکھنے والے انسانوں کو بھی پیلے پربتوں کا سایہ گمراہ کر دیتا ہے، جیسے "وش لتا" صرف موت ہی لاتی ہے۔ ویسے ہی یہ پربت صرف دُکھوں ہی کو پیدا کرتے ہیں۔ دُکھوں میں اضافہ ہی کرتے ہیں۔ یہ پربت خوبصورت ضرور ہیں۔ بے پناہ کشش بھی ہے ان میں۔ لیکن ان کی خوبصورتی اُن پھولوں کی مانند ہے جن کی بیل کے گرد زہریلے سانپ لپٹے ہوئے ہیں۔!"

" اُف! تم کن سوچوں میں اپنی عمر عزیز گنوا رہے ہو۔!" میں اُس پر ترس کھاتا ہوں۔

" انسان کی عمر گلاب کی پنکھڑی کے سرے پر لٹکتی ہوئی شبنم کی بوند کی مانند ہے۔ ہوا کو قید کیا جا سکتا ہے، آسمان کی دھجیاں اُڑائی جا سکتی ہیں۔ سمندر کی لہروں کو ایک دوسرے میں مالا کی طرح پرویا جا سکتا ہے، لیکن عمر پر بھروسہ کبھی نہیں کیا جا سکتا!"۔ وہ مجھے عمر کی حقیقت سے آگاہ کرتا ہے۔

" لیکن مجھے تو بھروسہ ہے اپنی عمر پر۔ میں زندگی سے پورا لطف اُٹھانا چاہتا ہوں۔ تم بھی اُٹھو اور میرا ہاتھ تھام لو۔ میں تمہیں دکھاؤں گا کہ مجھے خوشی سے جینے کا فن آتا ہے۔ غم مجھے کبھی نہیں گھیر سکتے!" میں فخریہ انداز میں اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھاتا ہوں۔

" گھمنڈ ہی سے مصیبتیں پیدا ہوتی ہیں۔ جسمانی تکلیفیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور پیدا ہوتا ہے ذہنی انتشار۔"

" کہیں یہ گھمنڈ ہی تو تمہارا روگ نہیں؟۔" میں اُس سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ لیکن . . . . ."

" یہ بے چین من، دُرست یا نادرست کے شعور کے بغیر، دُور سے بھی دُور تر۔" گاؤں میں آوارہ کتّے کی طرح بھٹکتا پھرتا ہے۔ جیسے چیل گوشت کے ٹکڑے کو دیکھتے ہی اُس پر جھپٹتی ہے، ویسے ہی دل عیش و عشرت کے سامان پر ٹوٹ پڑتا ہے اور پھر جلد ہی اُس بچّے کی طرح اُکتا بھی جاتا ہے جو نیا کھلونا دیکھتے ہی اُس پر مائل ہو جاتا ہے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد اُسے چھوڑ کر دوسرے کھیل کھیلنے لگ جاتا ہے۔ سمندر کے سارے پانی کو پینے، ہمالہ کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے اور پگھلتے ہوئے لوہے کو نگلنے سے بھی مشکل کام ہے۔ دل کو قابو میں لانا۔!"

. . . . . اُس کی گمبھیر آواز مجھے روک دیتی ہے

سوچ نے اُس کے جسم کو تباہ کر دیا ہے۔ میں اُس سے کہتا ہوں۔

" اپنے جسم کا دھیان تو رکھو۔"

" جسم!۔ بنا پھولوں اور پھلوں کا پیڑ ہے۔ جنگل میں پیدا ہو گیا ہے۔ بندر اس پر ادھر اُدھر کودتا پھاندتا ہے۔ گھُن نے اُس کے چاروں طرف چھید کر دیئے ہیں۔ زہریلے سانپ کا یہ گھر ہے اور کوّے نے اس میں گھونسلہ بنا رکھا ہے۔!"

شاعر لبیٔ

اور پھر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اُس نے پوچھا۔ "خون، ہڈیوں اور گوشت سے بنے ہوئے اِس جسم کے باہر اور اندر اچھی طرح دیکھ کر مجھے بتاؤ، کون سی خوبی ہے اِس میں ؟" "یہ سارا جسم بیماریوں کا گھر ہے۔ بڑھاپے سے پڑنے والی جھرّیوں اور بالوں کی سفیدی کا شہر ہے۔ اِس میں ذہنی کشمکش کی حکومت ہے۔ اِس گھر سے میں اُکتا چکا ہوں کیونکہ میں نہ جسم ہوں نہ جسم کا دوست ہوں۔ نہ جسم میرا ہے اور نہ میں جسم کا ہوں !"

میں اُس کی آنکھوں کی تیزی کی تاب نہ لاکر مُنہ پھیر لیتا ہوں۔ میں سوچنے لگتا ہوں۔ "وقت، دنیا میں پیدا ہونے والی ہر چیز کو کھاتا چلا جاتا ہے۔ اَن گنت لوگ اِس کے پیٹ میں سما چکے ہیں۔ اِس پیٹو کا پیٹ بھرتا ہی نہیں۔ ایک دِن اُس کے پیٹ میں مجھ کو بھی جانا ہے۔ یہ سب دُرست ہے لیکن پھر بھی . . . . . ."

میری کمزوری اُس کے ہاتھ لگ جاتی ہے۔ وہ اِس کو اپنی گرفت میں کَس لیتا ہے۔

"عقل نے سبھی کی رُوح کو بے چین کر رکھا ہے۔ کسی کی رُوح کو سُکون میسّر نہیں۔ ہر طرف محض دُکھ ہی دُکھ چھایا ہوا ہے۔ یہ دُنیا سکون سے یکسر خالی ہے۔ اور ایک دِن ختم ہو جائے گی۔ !"

". . . . . . لیکن پھر بھی ہمیں اُمید کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ دُنیا اُمید پر ہی جیتی ہے۔ !" میں اندر سے کمزور ہوتا جاتا ہوں۔

• اگر کوئی مجھے آرے سے چیرے تو میں آرے کے دانتوں کی رگڑ سہنے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن دنیاوی تعلقات سے پیدا ہونے والی اُمید اور خواہشات کی اُدھیڑ بن میں پھنسنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔"

اُس کی بکواس سے تنگ آکر میں خاموش ہو جاتا ہوں۔ لیکن وہ بکتا ہی رہتا ہے ــــ "اِس طرح سیکڑوں بلاؤں سے بھرے اَندھے کنوئیں کے چھید میں تمام لوگوں کو بے قراری سے جھانکتے ہوئے دیکھ کر میری روح فکر کی دَلدَل میں پھنس جاتی ہے۔ !" "سوچتا رہتا ہوں کہ وہ کون سا طریقہ ہے کہ دَلدَل کا جسم سے تعلق رہنے پر بھی جسم اُس میں دھنسنے سے بچ سکے !"

"مجھے اپنے ہم عمر پر رحم آتا ہے۔ وہ یہ کیوں نہیں سمجھتا کہ سمندر میں پیدا ہونے والی مچھلی پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی !!

"اب میں اپنے ہم عمر سے بھاگنے لگا ہوں۔ لیکن وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ میں اُس سے اِس قدر اُکتا گیا ہوں کہ کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ اپنے ہم عمر کا گلا گھونٹ دوں' !!!۔"

▲

• بقیہ صفحہ ۲۶۔ "مُرغِ فردوس" •

مُرغِ فردوس کی جن قسموں کے پَر سیاہ ہوتے ہیں۔ اُن کے نَر مادہ کے ساتھ مِل کر گھونسلہ بناتے ہیں اور جب اَنڈوں سے بچّے نکلتے ہیں۔ تو اُن کی پرورش کرتے ہیں۔ لیکن مُرغِ فردوس کی جن قسموں کے پَر رنگین ہوتے ہیں وہ گھریلو ذمّہ داریوں سے بَری ہوتے ہیں۔ اِس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خانگی ذمہ داریوں سے بچ نکلنے کی بناء پر مُرغِ فردوس کی بعض قسموں کو اپنے حُسن کی افزائش کا موقع مِلا۔ ڈارون کے نظریۂ انتخاب جنسی (THEORY OF SEXUAL SELECTION) سے اِس کی تشریح یوں ہوتی ہے کہ جو نَر سب سے خوبصورت ہوگا۔ مادہ اُسی کو قبول کرے گی اور پھر اُس کی خوبیاں اولاد میں منتقل ہوں گی۔ اور جب یہ نَر بچّے بالغ ہونے پر بقائے نسل کے لئے مقابلہ حُسن میں حصّہ لیں گے تو اپنے سے بہتر بچّے پیدا کریں گے۔ غرضکہ اِس عمل کی تکرار پیہم سے ہر آنے والی نسل کے نَر سابق سے بہتر ہوں گے۔ یہاں تک کہ شروع میں نَر مادہ میں جو یکسانیت تھی وہ غائب ہو جائے گی۔ اور نَر مادہ کو حُسن میں مات کر دیں گے۔"

▲

غزلیں

حسن کمال

شاید جو زہر شہر میں تھا کام کر گیا
خود سے ملے ہوئے بھی زمانہ گزر گیا
پاگل کوئی اِک اِک سے یہی پوچھتا تھا کل
ہم سب کا ایک گھر تھا، بتاؤ کدھر گیا
سورج کو جنم دے کے جھلسنے کے واسطے
ٹھنڈی سی ریت چھوڑ سمندر اُتر گیا
سوچا تھا اپنے دل میں سنواروں گا میں تمہیں
تم آئے، تم کو دیکھ کے میں خود بکھر گیا
جب تک میں زندگی کو نہ سمجھا تھا جی لیا
جب آگئی سمجھ میں تو بے موت مر گیا
ہر شام کتنے درد سے دیکھا ہے یہ حسنؔ
سورج کا خون پی کے سمندر نکھر گیا

صلاح الدین نیّر

پاک نظروں پہ بھی اندیشۂ رُسوائی ہے
جب سے دیکھا ہے تمہیں تہمتِ بینائی ہے
برگِ آوارہ کی مانند ہے تنہا تنہا
زندگی ساتھ مرا چھوڑ کے پچھتائی ہے
اس سے پہلے کبھی میں نے تمہیں دیکھا تو نہیں
پھر بھی لگتا ہے کہ برسوں سے شناسائی ہے
اتنے لوگوں میں بھی تنہا ہوں ہمیشہ کی طرح
کیسی تنہائی مرے دل میں سمٹ آئی ہے
نظریں ملتی ہیں مگر لب نہیں کھلنے پاتے
اس خموشی میں بھی اندازِ پذیرائی ہے
نرم آغوش ہو یا بسترِ گل ہو نیّرؔ
سونے والوں کو تو کانٹوں پہ بھی نیند آئی ہے

رشتی پٹیالوی

فرصتِ لطفِ زندگی نہ ملی
خوش نصیبوں کو بھی خوشی نہ ملی
اکثر ایسا بھی حادثہ گزرا
چاند رات آئی چاندنی نہ ملی
دوستوں کا خلوص دیکھ لیا
بے غرض رسمِ دوستی نہ ملی
آئینہ خود تو مل گئے لیکن
شکل جو دل میں تھی، وہی نہ ملی
جستجو کا سوال حل نہ ہوا
آگہی کو بھی آگہی نہ ملی
کٹ گئی یوں تو زندگی لیکن
زندگی میں کہیں خوشی نہ ملی
اے رشتیؔ تیرگیٔ دل کے سبب
جلوہ گاہوں میں روشنی نہ ملی

مقالہ

حسن عسکری کاظمی

غالبؔ کی صحتمند محبت کے جلوے

ذہنی عناصر کو جگانے کا محبت کا وہ انداز جس سے شخصیتیں نکھرتی اور سنورتی ہیں وہ غالبؔ کو آگرہ میں نصیب نہیں ہوا۔ اُس کے بچپن کے حالات کو دیکھنے اور سمجھنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ ماں اور نانا کی امیرانہ محبت نے تیرہ سال کی عمر تک عیش کے بھلاووں سے اُس کے ذہن کو رنگا۔ اور عیش کی دی ہوئی آرزوؤں کے پیچھے دَوڑنے کا اُسے عادی بنا دیا۔ مگر اس عمر میں اُس کی شادی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی چھوٹی لڑکی اُمراؤ بیگم کے ساتھ ہوگئی۔ اس بنا پر غالبؔ نے چَودہ سال کی عمر میں آگرے کے ماحول سے نکل کر دہلی میں سکونت اختیار کر لی۔ دہلی میں اُسے نئے ہم عمر دوست ملے۔ اور ادب و شعر کی محفلوں میں شرکت کا موقع ملا۔ اِس طرح اُس کے ذہن میں ایک بڑا شاعر بننے کی آرزو اُبھرنے لگی۔ اپنی اِس آرزو کی تکمیل کی خاطر اُس نے جو مطالعہ شروع کیا اس کی ابتدائی شاعری سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے اُس نے بیدل کو پڑھنا شروع کیا۔ لہٰذا بیدل کے انداز میں شعر کہنے شروع کر دیئے۔ یعنی فارسی ترکیبوں سے اپنے کلام میں حسن پیدا کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ ابتدائی انیسویں صدی کی دہلی میں اُس کے اِس تجربے کو زیادہ اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا لہٰذا اِس کی تنقید اس طرح ہوئی۔ ؎

زبان میرؔ سمجھے اور کلام میرزا سمجھے مگر یہ اپنا لکھا آپ سمجھے یا خدا سمجھے

اُس نے اپنی ابتدائی فنی کاوشوں کے لئے جو اُسلوب بیان اختیار کیا۔ اِس کی کمیوں کو وہ پچیس سال کی عمر میں سمجھنے لگا۔ لہٰذا اُس نے اِس سلسلے میں کہا ہے۔ "پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا۔ اوراق کو یک قلم چاک کیا۔" ان رجحانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غالبؔ میں اپنے گرد و پیش کی زندگی کو دیکھنے اور سمجھنے کی لیاقت پچیس سال کی عمر میں پیدا ہو گئی تھی۔ لہٰذا ذاتی تجربات و مشاہدات کے ذریعہ سے اپنے فن کو نوازنے کے اعتبار سے غالبؔ کا سفر کلکتہ ایک بڑی شہادت ہے یعنی غالبؔ نے کلکتہ کا سفر تیس سال کی عمر میں کیا تھا۔ شیخ اکرام نے غالبؔ نامہ میں لکھا ہے۔ "مرزا کی جاگیر نواب احمد بخش کی جاگیر میں شامل ہو گئی تھی۔ اِن کو جاگیر اپنے چچا مرزا نصر اللہ خان بہادر کے وارث ہونے کی وجہ سے ملی تھی۔ جو پہلے مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کے صوبہ دار تھے۔ اور جب لارڈ لیک کی عمل داری ہوئی تو چار سو سواروں کے رسالدار مقرر ہوئے۔ اِن کی وفات پر ان کے وارثوں اور متعلقین کے لئے سرکار نے فیروز پور جھرکہ کی ریاست سے پنشنیں مقرر کرا دیں۔ جو نواب احمد بخش کی جاگیر میں شامل تھی۔ مرزا کا دعویٰ تھا کہ ان کے اپنے اور شرکائے حقیقی کے لئے دس ہزار روپیہ سال مقرر ہوئے تھے لیکن نواب

فقط تین ہزار دیتے تھے۔ جن میں خاص مرزا کا اپنا حصّہ فقط ساڑھے سات سو روپے کا تھا۔ مرزا کو جب نواب کی طرف سے قطعی مایوسی ہوئی تو اُنہوں نے نواب کی تقسیم کے خلاف کلکتہ میں اپیل کرنے کا ارادہ کیا۔" اِس سلسلے میں یہ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ کہ مرزا نے دہلی سے کس تاریخ کو کلکتہ کے لئے سفر شروع کیا۔ ہاں اِسی سفر میں کئی مہینے لکھنؤ میں رُکنے کے بعد وہاں سے کلکتہ کو روانہ ہونے کی تاریخ ۲۷ جون ۱۸۲۶ء ہے۔ اِس تاریخ کو مدِّنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سفر غالبؔ نے تیس سال کی عمر میں کیا۔ کیونکہ غالبؔ کی پیدائش ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء میں ہوئی تھی۔ اِس عمر میں اُنہوں نے بنارس کی خوبصورتی سے متاثر ہوتے ہوئے مثنوی "چراغِ دیر" لکھی ہے۔ جو مشاہدات و تجربات کے اعتبار سے کافی اہمیت رکھتی ہے۔ اِس مثنوی سے غالبؔ کی صحت مند محبت پر جو روشنی پڑتی ہے۔ اِس سے یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ تیس سال کی عمر میں ہی اِس کی شخصیت میں کس درجہ وسعت پیدا ہو گئی تھی۔ غالبؔ جس وقت بنارس میں تھا اُس وقت اُسے دہلی کو چھوڑے ہوئے کئی مہینے ہو چکے تھے۔ اِس لئے بنارس میں اُس نے اپنے تین دوستوں کو خصوصیت کے ساتھ یاد کیا ہے۔ اور وطن کی محبت کے سلسلے میں کہتا ہے ؎

زِ اَربابِ وطن تو یم سہ تن را   کہ رنگ و رونقے اند این چمن را

اَربابِ وطن میں اپنے تین دوستوں کو تلاش کرتا ہوں جن کے باعث دہلی کے چمن کی رونق ہے۔ اِن دوستوں کو غالبؔ اپنے علمی ذوق کی روشنی میں یاد کر رہا ہے۔ اِن میں سب سے پہلے مولانا فضلِ حق خیر آبادی کے لئے کہتا ہے ؎

چو خود را جلوہ سنج ناز خواہم   ہم از حق، فضلِ حق را باز خواہم

مولانا فضلِ حق خیر آبادی غالبؔ کے ہم عمر تھے۔ اور غالبؔ کے دَور کی دہلی میں غالبؔ کی نکتہ آفرینی کے سب سے بڑے قدرداں تھے۔ لہٰذا وہ بنارس میں فضلِ حق کو پیشِ نظر رکھ کر کہہ رہا ہے کہ میں اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کے ذریعہ سے ناز و فخر کے جلوے دیکھنا چاہتا ہوں، لہٰذا خدا سے چاہتا ہوں کہ فضلِ حق میرے قریب ہو۔ وہ میری نکتہ آفرینی سے محظوظ ہو کر مجھے محظوظ کرے،' یہ محبت غالبؔ کے علمی مقاصد کو کتنے شاندار اُسلوبِ بیان میں لئے ہوئے ہے، فضلِ حق نے غالبؔ کی حسین شخصیت کو حسین ترین بنانے میں جو حصّہ لیا اُس کو دیکھتے ہوئے مولانا فضلِ حق کے تاریخ ساز ذوقِ حسن کا اعتراف کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ شیخ اکرام نے اپنے غالبؔ نامہ میں مولانا کے اِس کارنامے کو اِس طرح سراہا ہے۔ "افسوس ترین انجام مولوی فضلِ حق خیر آبادی کا ہوا۔ جو علاوہ اپنی علمی اور دینی قابلیت کے اِس لئے بھی یاد کے مستحق ہیں۔ کہ اُنہوں نے غالبؔ کو بیدل کی تقلید سے روکا اور اُس کی شاعری کیلئے ایک اُستادِ کامل ثابت ہوئے۔" غالبؔ اور فضلِ حق کی محبت اعلیٰ ادبی مقاصد سے آراستہ ہے، فضلِ حق نے اُنیسویں صدی کی دہلی میں غالبؔ کی تیزیٔ فہم کو سرلو کر اُس کی کمیوں کو دل سوزی اور نرمی کے ساتھ سمجھا کر غالبؔ کے ذہن میں جو جگہ پیدا کی۔ اُس کے متعلق غالبؔ کے اکثر خطوط میں اشارات ملتے ہیں۔ ۱۸۶۱ء کے ایک خط میں فضلِ حق خیر آبادی کے متعلق منشی میاں داد خاں سیّاح کو اُس نے لکھا ہے۔" ہاں خاں صاحب! آپ جو کلکتہ پہنچے اور سب صاحبوں سے ملے ہو تو مولوی فضلِ حق کا حال اچھی طرح دریافت کر کے مجھ کو لکھو کہ اُس نے رہائی کیوں نہ پائی اور وہاں جزیرہ میں اُس کا کیا حال ہے کس طرح گزارہ ہوتا ہے۔" انڈمان میں انگریز کی قید میں رہنے والے فضلِ حق کے حالات کی تلاش اُس سے ذہنی قربت کا پتہ دیتی ہے۔ مولانا فضلِ حق کے بعد حسام الدین حیدر خاں کے متعلق کہتا ہے۔

چو حرزِ بازوئے ایماں نویسم   حسام الدین حیدر خاں نویسم

جب میں ایمان کے بازو کا تعویذ لکھتا ہوں تو حسام الدین حیدر خاں کا نام لکھتا ہوں اِس شعر میں بھی ذہنی اور علمی پاکیزگی کے لگاؤ کو ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ رجحانات بھی علمی مقاصد سے خالی نہیں ہیں۔ اِس کے بعد نواب اَمین الدین خاں کے متعلق کہتا ہے

شاعر بھی

چو پیوند قبائے جاں طرازم　　امین الدین احمد خاں طرازم

امین الدین احمد خاں سے غالب کی بیوی امراؤ بیگم کا بھی رشتہ تھا اور امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں غالب کے شاعرانہ ذوق کے بھی قدرداں تھے۔ لہٰذا ان سے غالب کو بہ لحاظِ ذوق بھی محبت تھی اور بہ لحاظ قرابت بھی۔ مثنوی "چراغ دیر" میں غالب نے اپنے اُن دوستوں کی محبت پر کافی صاف ستھرے انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ مگر کچھ شخصیتیں ایسی بھی تھیں جن کی یاد نے اُسے بنارس میں ستایا تھا۔ مگر اُن کے نام اُس نے نہیں گنائے ہیں۔ صرف اشارات سے سمجھے جانے والے افراد کی یہ محبت غالب کے معیارِ آدمیت کو اِس طرح بلند کرتی ہے۔ ؎

بکاشی لختے از کاشانہ یاد آر　　درین جنت ازاں ویرانہ یاد آر

کاشی میں رہتے ہوئے ذرا اپنے گھر کو بھی یاد کر، اِس جنت میں اُس ویرانے کو نہ بھول جانا۔ گھر کے اُس ویرانے کی جان اُٹھائیس سالہ امراؤ بیگم ہی ہو سکتی ہیں مگر امراؤ بیگم کے حضور میں صاف الفاظ میں وہ اپنی محبت کو پیش نہیں کرتا ہے۔ ؎

دریغا در وطن وامانده چند　　بخوں دیده زوزق رانده چند

افسوس وطن میں کچھ ایسے خستہ حال لوگ ہیں۔ جو میرے لئے بہت غمگین ہیں۔ امراؤ بیگم اور اُس کے ساتھ رہنے والے لوگوں کی محبت کو ذرا اور شاندار اُسلوب بیان سے نوازتے ہوئے کہتا ہے۔ ؎

بہ شہر از بے کسی صحرا نشیناں　　بروئے آتشِ دل جاں گزیناں

وہ لوگ شہر میں ہیں لیکن میری محبت کی وجہ سے وہ ایسا محسوس کر رہے ہیں جیسے صحرا میں بیٹھے ہوئے ہیں اور دل کی آگ پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہاں غالب یہ نہیں کہہ رہا ہے کہ مجھے امراؤ بیگم اور اُس کے قریب رہنے والے افراد سے محبت ہے۔ بلکہ اُن عزیزوں کو جو غالب سے محبت تھی اس کو سراہ رہا ہے۔ اِس سلسلے میں کچھ اور بلند ہو کر کہتا ہے۔

ہمہ در خاک و خوں افگندۂ تو　　بحکم بے کسی ہا بندۂ تو

وہ اُن عزیزوں کا خود کو اِس اعتبار سے مجرم ٹھہرا رہا ہے کہ اُس نے اپنے اِن پیاروں سے الگ ہو کر اُن کو غمگین بنایا ہے۔ امراؤ بیگم اور اُس کے ساتھ رہنے والی شخصیتوں کے درد کو بنارس میں محسوس کرتے ہوئے غالب خود تصویر درد معلوم ہوتا ہے۔ ؎

چو شمع از داغ دل آزر فشاناں　　بہ بزم عرض دعوئ بے زباناں

تیری وجہ سے شمع کی طرح وہ اپنے دل کے داغوں سے آگ برسا رہے ہیں، لیکن پھر بھی وہ تیری کوئی شکایت نہیں کرتے ہیں۔ امراؤ بیگم کی خاموشی کے سامنے یہ اقرارِ جرم ایک غیر معمولی شخصیت کی غیر معمولی محبت کی پیشکش ہے۔

سرو سامانِ غارت کردۂ تو　　ز تو نالاں و لے پروردۂ تو

تو نے اُن کا ساز و سامان لوٹا ہے، تو نے اُن کو غمگین کیا ہے۔ مگر وہ تیرے ہی پالے ہوئے ہیں۔

از آنانت تغافل خوشنما نیست　　بداغِ شاں ہوائے گل روا نیست

اب اُن سے تغافل برتنا اچھا نہیں ہے۔ اُن کے داغوں کو دیکھتے ہوئے خوبصورت مقامات کو دیکھ کر تیرا خوش ہونا تیری کمزوری ہے، اِن اشعار میں غالب کی جدائی کے احساس سے خاموش اور غمگین امراؤ بیگم کی ہی تصویر سامنے نہیں آتی ہے بلکہ غالب نے اُس کے پاس ۱۸۲۶ء میں جن لوگوں کو چھوڑا تھا اِن سب کو وہ بنارس میں بیٹھ کر اپنی محبت سے نواز رہا ہے۔

یہاں اُمراؤ بیگم کی محبت کی نقاب کشائی اُمراؤ بیگم کا نام لے کر نہیں کی گئی ہے، مگر ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو لکھتے وقت اُس کے ذہن میں اُمراؤ بیگم ضرور تھی۔

وہ اُمراؤ بیگم کے عزیزوں سے جو اس کی فنکارانہ صلاحیتوں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ اس انداز سے محبت کرتا تھا۔ اُن کی اَدبی فرمائشوں پر اس کا بگڑنا ملاحظہ ہو۔ "رباعیاں بھیج، قصیدہ بھیج۔ معنی اس کے یہ تو جھوٹا ہے۔ اب کے تو مقرر بھیجے گا، بھائی قرآن کی قسم، انجیل کی قسم، توریت کی قسم، زبور کی قسم، ہنود کے چار بید کی قسم، دساتیر کی قسم، ژند کی قسم، پاژند کی قسم، اُستاد کی قسم، گرُو کے گرنتھ کی قسم، نہ میرے پاس وہ قصیدہ ہے نہ مجھے رُباعیاں یاد، صحت مند محبت کی یہ لہریں ذہن سازی کی کس درجہ صلاحیت رکھتی ہیں۔ یہ خط علاؤالدین خاں کو لکھا گیا ہے۔ علاؤالدین احمد خان کی شخصیت کی تعمیر میں غالب کا کافی حصہ تھا۔ یعنی چھوٹے سے علاؤالدین احمد خاں کو غالب نے پڑھایا بھی تھا۔ اور جوان علاؤالدین احمد خاں کے اَدبی ذوق کو دِل سوزی کے ساتھ سنوارا بھی تھا۔ محبت کے اِنہیں کرشموں کو ذرا دوسرے خط میں ملاحظہ فرمایئے۔

"اے میری جان! مثنویٔ ابرِ گہربار کونسی فکرِ تازہ تھی کہ میں تجھ کو بھیجتا، کلیات میں موجود ہے۔ معہٰذا شہاب الدین خان نے بھیج دی، مکرّر کیا بھیجتا۔ تپ محرِق کے دیکھنے سے اِنکار کیوں کرتے ہو۔ اگر منافیٔ طبع تحریر کو بہ سبب اِنزجار نہ دیکھا کرتے تو فریقین کی کتب مبسوط کہاں سے موجود ہوتیں۔ محبت کا یہ تعمیری رنگ ادبی معاشرہ کو عقلی اعتبار سے صحت مند بنانے کی آرزوؤں سے بھرپور ہے۔"

اُسے اپنے دَور کی دہلی کے تہذیبی معیار کی بڑی فکر تھی۔ ۱۸۵۷ء کے تاریخی حادثے کے باعث دہلی کی شہری زندگی میں بڑی اتھل پتھل ہوئی اور اس کا وہ تہذیبی معیار جو ایک خاص ذہنی صحت کی نمائندگی کرتا تھا۔ اِس کی بربادی کو دیکھ کر غالب اِس پر اس طرح رویا تھا۔

"یہ وہ دِلّی نہیں ہے جس میں تم پیدا ہوئے ہو، وہ دِلّی نہیں ہے جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے۔ وہ دلّی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے۔ وہ دِلّی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے میں آتا جاتا ہوں، وہ دِلّی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ ایک کیمپ ہے مسلمان اہلِ حرفہ یا حکّام کے شاگرد پیشہ ...... معزول بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ، پانچ روپیہ مہینہ پاتے ہیں۔ اناث میں سے جو پیرزن ہیں وہ کٹنیاں اور جوانیں کسبیاں۔"

اُس نے علاؤالدین احمد خان یا اِس قسم کے دوسرے لوگوں کے سامنے ۱۸۵۷ء کے بعد کی دہلی کے اِس تخریبی نقشے کو رکھ کر اپنے حلقۂ اثر میں معیارِ زندگی کے مسئلے کو چھیڑا ہے۔ ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کی تہذیبی حد بندی کو زیادہ سے زیادہ صحت مند دیکھنے کی آرزو پیش کرنا محبت ہی کا کارنامہ ہے۔

۱۸۵۷ء کے حادثے نے غالب کی شاعرانہ صلاحیتوں کو پامال کر ڈالا تھا مگر اس پر بھی وہ نوابین لوہارو کے ادبی ذوق کو سہارا دیتا تھا اور اِس دَور میں بھی اُس نے اُن کی خاطر غزلیں لکھی ہیں۔ جس دَور میں اُس کی غزل اُس کے ذہنی میلانات کو روشنی میں لاتے ہوئے اپنے اِن پیاروں سے پیار کرنے کے انداز کو بھی نمایاں کرتی ہے۔ مثلاً اس غزل کو ملاحظہ فرمایئے۔

غزل

میں ہوں مشتاقِ جفا مجھ پہ جفا اور سہی ۔۔۔ تم ہو بیداد سے خوش اِس سے سوا اور سہی

تم ہو بت پھر تمہیں پندارِ خدائی کیوں ہے ۔۔۔ تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملالیں یارب — سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی
غیر کی مرگ کا غم کس لئے اے غیرتِ ماہ — ہیں ہوس پیشہ بہت وہ نہ ہوا اور سہی
حسن میں حور سے بڑھ کر نہیں ہونے کے کبھی — آپ کا شیوہ و انداز و ادا اور سہی
تیرے کوچے کا ہے مائل دلِ مضطر میرا — کعبہ اک اور سہی، قبلہ نما اور سہی
کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے واعظ — خلد بھی باغ ہے خیر آب و ہوا اور سہی
مجھ کو وہ دو، کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں — زہر کچھ اور سہی، آبِ بقا اور سہی

مجھ سے غالبؔ یہ علائی نے غزل لکھوائی
ایک بیداد گرِ رنج فزا اور سہی

اِس غزل کا مطلع اور مقطع غالبؔ کی اِس محبت کو ظاہر کرتا ہے جو اُس کو علاؤالدّین احمد خاں سے تھی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد غالبؔ غزل کہنا پسند نہیں کرتا تھا۔ مگر اس کے پیاروں کی اس سے یہ فرمائش ہوتی تھی کہ وہ غزل کہے اِس حالت میں جب کہ اُس کے دماغی اعصاب اِس کو غزل کی فکر کے لئے اِجازت نہیں دیتے تھے۔ اِس طرح کی فرمائشوں کو وہ ساٹھ سال کی عمر کے بعد ایک بیداد سمجھتا تھا۔ اِس بیداد کے سلسلے میں کہتا ہے۔ " تم ہو بیداد سے خوش اِس سے سوا اور سہی " چونکہ تم پیارے ہو۔ تمہاری اِس بیداد کو بھی پیار کی نظر سے ہی دیکھنا پڑے گا۔ مقطع میں علاؤالدّین احمد خاں کی محبت کی نقاب کشائی اِس طرح کی ہے۔ کہ اپنے ضعیف دماغی اعصاب پر ظلم کرنے والا کہکر اس کی فرمائش کو پورا کیا ہے۔ غالبؔ کی صحت مند محبت کے اعتبار سے اِس غزل کا مطلع اور مقطع ہی حاصلِ غزل ہیں۔ وہ اپنے دَور کی دہلی کے زندگی کے مظاہروں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہتا ہے۔

" بھائی کیا پوچھتے ہو، کیا لکھوں، دِلّی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع بازار مسجد جامع کا ہر ہفتہ سیر جمنا کے پُل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا، یہ پانچوں باتیں اب نہیں، پھر کہو دِلّی کہاں۔ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اِس نام کا تھا۔ "

زندگی کے مختلف مظاہروں کی وقتی ترتیب سے تہذیبی نقشے مرتّب ہوتے ہیں۔ لہٰذا دہلی کی وہ ملی جلی تہذیب جو صدیوں کی یادگار تھی، اُس پر ۱۸۵۷ء کے تاریخی حادثے کے جو اثرات پڑے اُن کو گنانے کا یہ انداز اُنیسویں صدی کی دہلی کی ملی جلی تہذیب کی پوری وسعتوں کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ یعنی قلعہ جمنا کا پُل۔ چاندنی چوک، جامع مسجد نہیں جامع مسجد کا بازار اور میلہ پھول والوں کا۔ یہ ذکر ایک خاص دَور کی تہذیبی رنگا رنگی پر جبر و استبداد کے بوجھ کو دکھانے کے لئے کیا گیا ہے۔ اِس بیان کا ہر لفظ غالبؔ کی محبت کی وسعتوں کا گواہ ہے۔

" آ ہا، ہا، ہا، میرا پیارا میر مہدی آیا۔ آؤ بھائی مزاج تو اچھا ہے۔ بیٹھو یہ رامپور ہے دارالسّرور ہے۔ آؤ میاں سیّد زادہ، آزادہ، دِلّی کے عاشق دلدادہ، ڈھئے ہوئے اُردو بازار کے رہنے والے، حسد سے لکھنؤ کو بُرا کہنے والے، نہ دِل میں مہر و آزرم نہ آنکھ میں حیا و شرم، نظام الدّین ممنون کہاں، ذوق کہاں، مومن خاں کہاں، ایک آزردہ سو خاموش، دوسرا غالبؔ وہ بے خود و مدہوش، نہ سخنوری رہی نہ سخندانی، کس برتے پر تتا پانی، ہائے دِلّی وائے دِلّی، بھاڑ میں جائے دِلّی۔ "

نواب یوسف علی خاں کی وفات کے بعد کلب علی خاں ۱۸۶۵ء میں جب رامپور کے نواب ہوئے تو انہوں نے

اپنی مسند نشینی کا جشن کیا۔ اِس میں غالبؔ کو بھی بُلایا گیا تھا۔ میر مہدی سے ایک شاگرد ہونے کی وجہ سے غالبؔ کو جو محبت تھی اُس کی توانائی کا نقشہ غالبؔ نے اپنے اکثر خطوط میں کھینچا ہے۔ اِس خط میں بھی محبت کی توانائی اِس طرح دکھائی گئی ہے ــــ "اہا ہاہا، میرا پیارا میر مہدی آیا۔" میر مہدی پانی پت میں، غالبؔ رامپور میں، میر مہدی کا خط غالبؔ کے پاس رامپور میں آیا ہے۔ اِس خط نے میر مہدی کو غالبؔ کے پاس پہنچا دیا ہے۔ اب غالبؔ اپنے پیارے سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔ یہ باتیں میر مہدی کے ذوقِ ادب و شعر پر اثر انداز ہونے والا ایک افسانہ ہیں۔ غالبؔ کو دہلی کے ادب و شعر کے اُس معیار سے محبت تھی جو ۱۸۰۳ء سے لیکر ۱۸۵۷ء تک کی پُر امن شہری زندگی میں قائم ہوا تھا۔ لیکن ۱۸۵۲ء میں مومنؔ خاں کا اِنتقال ہو گیا۔ ۱۸۵۴ء میں ذوقؔ کی وفات ہو گئی۔ ۱۸۵۷ء کے تاریخی ہنگامے نے دہلی کو برباد کر دیا۔ اور غالبؔ کو ذہنی اعتبار سے مار ڈالا۔ اِن تمام حالات کا غالبؔ نے بڑی باریکی کے ساتھ مطالعہ کیا تھا۔ مگر میر مہدی اُس دَور میں ادب و شعر کا دِلدادہ نوجوان تھا۔ اور دہلی کے نواح کا رہنے والا تھا۔ دہلی کی بربادی کا پورا نقشہ اُس کے ذہن میں نہیں تھا۔ لہٰذا اُس کو غالبؔ نے سمجھایا ہے، کِس بنیاد پر دہلی کو لکھنؤ پر ترجیح دیتے ہو۔ اِس سلسلے میں وہ دہلی کے اُن فنکاروں کا ذِکر کرتا ہے جن کی وجہ سے دہلی کے ادب و شعر کا معیار بلند ہوا تھا۔ یہاں وہ ذوقؔ کو بھلا نہیں سکا۔ بلکہ وہ یہ اعتراف کر رہا ہے کہ اُردو زبان کو صاف کرنے اور مانجھنے میں ذوقؔ کا بھی ایک بڑا حصّہ ہے۔ غالبؔ ایک کھلا ہوا دماغ رکھتا تھا اور فن کا قدرداں تھا اُس نے اپنے خطوط میں بھی ذوقؔ کے اِس قسم کے اشعار کے ذریعہ سے اپنے مفہوم کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ــ

؎	اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے	مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے
؎	لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے	اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے

مومنؔ کے تغزّل میں بھی غالبؔ نے کافی کشِش محسوس کی تھی، ایجازِ کلام کے اِعتبار سے مومنؔ کا اُسلوبِ بیان بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مومن کو غالبؔ ایک خوش مذاق اِنسان کی نظر سے دیکھتا تھا۔

؎	پوچھنا حالِ یار ہے منظور	میں نے ناصح کا مدّعا جانا
؎	اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا	رنجِ راحت فزا نہیں ہوتا
	تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے	ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
	تم مرے پاس ہوتے ہو گویا	جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

غالبؔ کو ادب و شعر کا یہ معیار عزیز تھا۔ اِس معیار پر ۱۸۵۷ء کے تاریخی حادثے کے بُرے اثرات پڑے تھے۔ یعنی وہ انجمن جس میں فنکاروں کی نشو و نما ہوتی تھی، درہم برہم ہو گئی تھی، غالبؔ کو دہلی کے ذرّے ذرّے سے محبت تھی۔ مگر وہ متضادات محبت و نفرت سے آشنا تھا۔ میر مہدی دہلی کے معیارِ ادب و شعر کی تعریف کر رہا تھا۔ مگر وہ میر مہدی کی رائے سے مطمئن نہیں ہوا۔ کیونکہ ۱۸۵۷ء سے بعد کے لکھنؤ اور ۱۸۵۷ء سے پہلے کے لکھنؤ میں زیادہ فرق نہیں ہوا تھا۔ اِسی لئے اُس نے میر مہدی سے زور دار الفاظ میں کہا تھا۔ "خدا سے لکھنؤ کو بُرا کہنے والے" یعنی وہ دہلی میں رہتے ہوئے دہلی کی محبت کو اپنے فنکارانہ ذوق کے بیچ میں نہیں آنے دیتا ہے اور ۱۸۵۷ء سے بعد کے لکھنؤ کو وہ انیسؔ و دبیرؔ کی شاعرانہ شخصیتوں کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ یہ خط ۱۸۶۵ء میں لکھا گیا ہے، اِس دَور میں انیسؔ و دبیرؔ لکھنؤ پر ہی نہیں چھائے ہوئے تھے، وہ شمالی ہندوستان کی شہری اور قصباتی زندگی پر بھی چھائے ہوئے تھے۔ اِس کا اندازہ میر مہدی مجروحؔ کو نہیں تھا دیا تو ملا ہما

فصیح اکمل قادری

متاعِ نارسی

اندھیرے کا سفر منزل بہ منزل طے کیا لیکن
کسی صحرائے اندیشہ میں گم ہونا تو کیا ہم نے
ہر اک منزل پہ اِک سنگِ نشانِ نقشِ یقیں چھوڑا

وہ سناٹے، وہ تنہائی، وہ خاموشی کہ صحرا میں
اُداسی، نامرادی، ناشناسی حوصلہ کُش تھی
مگر حسنِ یقیں کی رہنمائی کام آتی تھی
تھکی سانسوں کی آوازِ جرس ہمت بڑھاتی تھی
صدائے دل رجز خواں ہو تو پیچھے کون ہٹتا ہے
سفر ہی عینِ ایماں ہو تو پیچھے کون ہٹتا ہے
نظر کا حوصلہ میزان میں آنکھوں کی تُلتا تھا
اور آنکھیں وہ کہ جن سے پرچمِ اُمید کھُلتا تھا

"سفر کا نقش" "تاریکی کا صحرا" "آنکھ کی پتلی"
یہ "میراثِ سفر" محفوظ ہے ہر آنکھ میں اب تک
یہی نقشِ سفر جلوؤں کی اِک دُنیا بساتا ہے
اندھیرے کا سفر آنکھوں کی تاریخِ تمنا سے
مذاقِ جستجو کو آئینہ ساماں بناتا ہے
تھکن سے چُور لمحے ٹوٹتے ہیں جب بھی آنکھوں میں
تو خوابِ کامیابی نغمۂ راحت سُناتا ہے

جھپک جاتی ہیں آنکھیں نیند کے ہلکے دباؤ سے
گزشتہ حادثے پلکوں کے سائے میں سمٹتے ہیں
"متاعِ نارسی" ہر نوکِ مژگاں سے لہو ہو کر
اُجالے کی حدوں میں قطرہ قطرہ پھیل جاتی ہے

احتشام اختر

ذوقِ نا آسودگی

چند بوسیدہ کتابوں کے پریشاں ہوں ورق
آئینہ ٹوٹ کے بکھرا تھا زمیں پر ایسے
مَیں نے پھر ٹوٹتے ہوئے کانچ کے اِن ٹکڑوں کو
ایک اِک کر کے اُٹھایا تھا زمیں سے گویا
یہ مری رُوح مرے جسم کے ہی ٹکڑے ہوں
کیونکہ اِس شیشۂ بلّور کے ہر ٹکڑے میں
مَیں جھلکتا تھا کہ ہو فلم کوئی پردہ پر
اور پھر شیشۂ بلّور کے ان ٹکڑوں سے
خوابِ اُمید کا اِک نقش بنایا مَیں نے
رنگ و روغن سے چمکتی تھیں لکیریں اس کی
وہ لکیریں جو حدیں کھینچتی ہیں توڑتی ہیں
مَیں نے اِس نقش سے کمرے کو سجایا گویا
مرے کمرے مری ہستی کا یہی حاصل ہو
اور اک روز پھر اس نقشِ حسیں کو مَیں نے
توڑ ڈالا کہ کشش اب نہ رہی تھی اِس میں
مجھ کو اس کا نہ تو غم تھا نہ پشیمانی تھی
اِک نیا نقش بنانے کی تمنا دل میں
شعلۂ آتش کی مانند جواں تھی اب بھی!

(ہندی)

رابن شا پُشپ
رضوان احمد

حق

سرد پلکوں کی صلیب سے اتارے گئے سپنے جیسے کانچ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بن جاتے ہیں۔ مارٹن کو بھی لگا کہ ایسے ہی چبھنے والے ڈھیر سارے احساسوں سے گھرا ہوا ہے۔ گھرنا جسم کی نہیں دل کی مجبوری ہوتی ہے۔ اور مجبوری زندگی ہے۔ جہاں زندگی نہیں وہاں صرف مجبوری جیتی ہے۔

مارٹن نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ چار مینار کا ایک پیکٹ اب اس کی ہتھیلی پر تھا۔ وہ اسے دیکھتا رہا اونچا مینار۔ اسے خیال آیا ہے، نورا جب پہلی بار اس کے گھر آئی تھی اس کی پلکوں میں بہت سے اونچے مینار تھے، مگر اب وہ سوچتا ہے۔ مینار کی اونچائی تک پہنچ پانا کتنا مشکل ہے۔ اب وہ مینار کے بارے میں نہیں صرف سگریٹ کے متعلق سوچتا ہے جب بھی وہ سگریٹ پیتا نورا سختی سے اس کی مخالفت کرتی لیکن اس کے کہنے کا طریقہ کچھ اور ہوتا۔ مارٹی، شوہر پر بیوی کا کچھ حق ہوتا ہے، میں یہ نہیں کہتی کہ تم میری ہر بات مانو، ہر بات برداشت کرو۔ بات، کہنے کا حق بیوی کو نہیں۔ مگر ایک بات، اگر شوہر کی کسی ایسی عادت کو جس سے اسے تکلیف ہوتی ہو، چھڑا دے تو کہتی ضرور ہے۔ کہنا مخالفت نہیں۔ لیکن مرد کا مزاج ہے کہ بیوی کی زیادہ تر باتوں کو مخالفت سمجھ لیتا ہے۔ اور اس لئے مخالفت کرتا ہے۔

اسے یاد ہے اس نے کہا تھا — نورا! تم ہر وقت نصیحتیں کرتی رہتی ہو۔

— نا مارٹی، اگر تم میری بات مان کر سگریٹ پینا چھوڑ دیتے تو مجھے قطعاً فتح کا احساس نہیں ہوتا۔ ایک طرح سے ایک اندرونی خوشی کا احساس ہوتا۔ ہر عورت کے دل میں کہیں نہ کہیں کوئی ماں چھپی رہتی ہے، جو برابر دو مردوں کو اچھا اور خوش دیکھنا چاہتی ہے یہی ماں کچھ کہنے پر مجبور کر دیتی ہے، جسے تم مخالفت سمجھ لیتے ہو۔

وہ پیکٹ سے سگریٹ نکال لیتا ہے، پہلے وہ پیتا بھی کہاں تھا۔ وہ تو پٹی تھی جس نے کہا تھا۔ ادیب ہو کر تم سگریٹ نہیں پیتے .... فنی (F U N N I) —

آخر اس دھوئیں میں رکھا کیا ہے۔ ؟

بہت کچھ۔ یہ دھواں نہیں پرت ہے، تہ پرتہ رکھی زندگی۔ اور یہ جیون وہی جیتا ہے جو خود دھواں بن کر رہ جلتا ہے، ویسے ٹرڈ رائٹر بھی ایک قسم کا دھواں ہوتا ہے۔

وہ سوچتا ہے اب وہ سچ مچ دھواں ہی تو ہے۔ دھواں کے سوا اور کیا۔ پر وہ اپنی دو انگلیوں کے درمیان سگریٹ دبا لیتا ہے۔ نورا نے کہا تھا۔ ٹھیک ہے پیو، بار بار کہنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ وہ یہی کہکر کچھ لینے کی موافقت میں میں کبھی نہیں رہی۔

وہ سگریٹ میں بھرے تمباکو کو دیکھتا ہے۔ جھاڑیوں کی طرح آپس میں الجھے ہوئے اسے خیال آتا ہے پیڑ ٹھا کا۔ اس کی بہن ایڈتھ۔ چھوٹے سے ڈرائننگ روم کو اس نے کیکٹس سے بھر دیا ہے۔ بادل والی پود بھی اس نے دروازے

کی چوکھٹ میں کیلیں ٹھونک کر لگائی ہے۔ کئی بار اُس کی قمیص اُن کانٹوں میں پھنس کر پھٹ گئی ۔ وہ ایڈتھ پر ناراض بھی ہوا۔ مگر یہ نورا تھی کہ ہر بار اُس کی طرف داری کرتی۔ بس قمیص ہی تو پھٹی ہے۔ میں سی دوں گی۔ آخر اس معمولی بات کے لئے ..... میرا مطلب ہے، ایڈتھ اب سیانی ہو گئی ہے اور سیانی لڑکی پر تو اتنا غصّہ اُس کے ماں باپ بھی نہیں کرتے ۔

— اِس کا مطلب یہ ہوا کہ میں اُس کا کچھ نہیں لگتا۔ دو باتیں بھی کہنے سے رہا۔ اب یہی ڈرائنگ روم ..... یہ اچھا خاصا پارک بن کر رہ گیا ہے۔ ادھر کیکٹس، ادھر منی پلانٹ۔ آلٹر پر بھی کیکٹس کی بیلیں ..... کانٹے ہی کانٹے،

— کیا کروگے، یہ اسے اچھا لگتا ہے۔ ایک دِن اپنے گھر چلی جائے گی۔ اُس دن نوچ کر پھینک دینا سب۔ ابھی تو ایسا کرنے سے اُسے رنج ہوگا۔ رہی آلٹر کی بات تو جیسس کی مورتی اِن کانٹوں میں اور خوبصورت لگتی ہے۔ ویسے ہر آدمی کو کانٹوں میں ایڈجسٹ کرنا چاہئے۔ ٹرو کرسچن لائف تو یہی ہے نا ۔ !

ٹرو کرسچن ..... یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ وہ خواہ مخواہ کانٹے لگاتی جائے اور میں چپ چاپ اُس دِن کا انتظار کروں جب وہ یہاں سے چلی جائے گی۔ میں کہتا ہوں کہ وہ نہیں جائے گی.... کبھی نہیں۔ ڈیڈی اِس کے لئے پیچ ڈھونڈتے ڈھونڈتے خود کھو گئے۔ اب لے دے کے میں رہ گیا ہوں میں لڑکا کہاں سے لاؤں ۔؟

— میری شادی میں بھی یہی دِقّتیں آڑے آئی تھیں۔ ہر کرسچن لڑکی کو آج اِسی وقت کا سامنا ہے ۔ لیکن میرے ڈیڈی نے تمہیں ڈھونڈ نکالا تھا۔

مارٹن کا جی چاہا تھا کہ وہ کہدے یہ تو زبردستی ہوئی تھی ۔ اُسے گھیرا گیا تھا۔

وہ کیکٹس کی بیلوں کو دیکھتا ہے، سوچتا ہے۔ ایڈتھ کو گئے کتنے دِن ہو گئے۔ جانے کس لڑکے کے ساتھ . . . جانے کس ذات کا ہو . . . . . وہ شرم سے کئی دِن تک گھر سے نکلا نہیں تھا۔ نورا نے کہا تھا۔ آخر اِس میں اتنا ماتم کرنے کی کون سی بات ہے ۔ وہ پڑھی لکھی لڑکی ہے کیسی ایسے لڑکے کے ساتھ ہی گئی ہوگی جو اس سے شادی کر لے۔ بیوی بننے کی مسرّت ایک ایسی مسرّت ہے جسے ہر لڑکی حاصل کرنا چاہتی ہے ۔ کنواری مرنے سے بہتر ہے کسی سے بھی شادی کرنا۔ اور شادی کرنے کے بعد ہر لڑکی ایک نیا جنم لیتی ہے۔ ایک نئے مذہب سے آشنا ہوتی ہے۔ یہ مذہب دنیا کے تمام مذاہب سے بلند ہوتا ہے ۔ مارٹن! اسے کوئی مرد شاید ہی محسوس کرتا ہو۔ لیکن اِس مذہب سے آشنا ہونے سے جو خوشی ہوتی ہے اُسے صرف عورت ہی جانتی ہے

— یہ سب بکواس — وہ چیخا تھا۔

— نہیں یہ سچ ہے۔ اگر آج تم کسی کے کہنے پر یا کسی مجبوری سے اپنا مذہب بدل لو تو کیا میں نہیں چھوڑ دوں گی ؟۔ میں تو زیادہ پڑھی لکھی نہیں۔ یہ پتہ نہیں مذہب کا رشتہ واقعی خون سے ہوتا ہے یا ...... مگر اتنا ضرور جانتی ہوں کہ شوہر بیوی کا رِشتہ دِل کا ہے ۔ اور دِل کا رشتہ کبھی نہیں ٹوٹتا.... یہ دِل ہی سب سے بڑا مذہب ہے۔

اُسے جواب دینا اُس نے بہتر نہیں سمجھا۔ لیکن وہ اب بھی غصّے سے کھول رہا تھا۔ اُس کا دِل چاہ رہا تھا کہ کیکٹس کے گملوں کو سڑک پر پھینک دے، بیلوں کو نوچ دے۔ وہ بڑھا بھی تھا۔ مگر نورا نے ہی روک دیا ۔ ایسی جذباتیت کا کیا حاصل ؟ اِنہیں رہنے دو۔ تمہارا اور ایڈتھ کا خون کا رِشتہ سہی لیکن وہ برابر تم سے ڈرتی رہی؟ شوہر کے نہ ہونے اور کسی کا پیار نہ حاصل کر سکنے کی وجہ سے وہ اپنا دِل اِن پودوں سے باندھتی رہی ہے..... وہ ایک دِن تمہارے لئے نہ سہی اِن کیکٹسوں کیلئے ضرور آئے گی۔

وہ کچھ نہیں بولا تھا۔ لیکن اُس کے دِل میں جیسے کوئی سوکھے پتّوں پر چل رہا تھا..... چرچر..... چرچر۔ وہ ذہنی بے چینی کا شکار تھا۔ وہ جانتا تھا یہ نورا ہے۔

صرف نوراؔ جو جانے، انجانے۔ ہر بات میں اُس کی مخالفت کرتی ہے کہ وہ اُس کی بیوی ہے۔

اُس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ماچس نکالی۔ اُسے بجایا۔ لگا، جیسے قریب ہی نوراؔ کھڑی ہے۔ ماچس دو، چولہا جلالوں۔ پر جاتے جاتے بولی تھی ۔ تمہارے سگریٹ پینے سے کم سے کم یہ تو فائدہ ہے کہ وقت بے وقت ماچس ...... اُسے لگا نوراؔ نے طنز کیا ہے۔ طنز کی کھینچی دور تک لمبی لکیر ..... جیسے چاقو پیوست کرکے کوئی یہاں سے وہاں تک کھینچ دے۔ چاقو کا خیال آتے ہی، اُسے کڑواہٹ سی محسوس ہوئی۔ اُس نے چلّا کر کہا تھا۔ صبح سے شام تک گھٹتا ہوں، نو بجے کھاتا ہوں۔ یہ بھی کوئی کھانا ہوتا ہے۔ دو لقمہ کھایا اور پانی پی لیا۔ رات کو سوچتا ہوں، سلیقے کا کھانا ملے گا۔ لیکن وہ بھی نہیں ملتا۔ آخر روٹی سے تمہیں اتنی محبّت کیوں ہے۔ ؟

—— میں جانتی ہوں تمہیں چاول پسند ہے۔ مگر بازار میں چاول ملے تب نہ پکاؤں۔ دن میں تو پکا لیتی ہوں۔ کیا ضروری ہے کہ دونوں وقت ....

—— ہاں ہاں، اِس گھر میں میرے لئے کچھ بھی ضروری نہیں ہے۔

—— بس، پھر وہی ناراضگی۔ جانتے تو ہو کہ ہمارے نیتا یہ کوشش کر رہے ہیں کہ ہم روٹی کھائیں اور چاول بھیجنے میں مدد کریں۔

اُس نے پاس پڑے چاقو کو مٹھّی میں کس لیا تھا۔ تب، وہ نیتا کیوں چاہتے ہیں کہ ہم آدھا پیٹ کھا کر آفس میں زیادہ کام کریں..... اور اُس نے زور سے چاقو کی نوک میز میں پیوست کر دی تھی۔

مٹھّی کی بندش کا احساس ہوتے ہی اُس نے اپنی انگلیوں کو دیکھا۔ سگریٹ دبی تھی۔ جو حصّہ انگلیوں کے درمیان تھا کافی چپک گیا تھا، اُس کا جی چاہا۔ وہ سگریٹ پھینک دے۔

نوراؔ نے ایک بار کہا تھا، کچھ ایسا ہی۔ وہ بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں سگریٹ دبائے کچھ لکھ رہا تھا۔ تبھی راجن نے نہ جانے کدھر سے آکر ہاتھ مار دیا۔ کلائی کے پاس کچھ جل گیا وہ چیخنے لگا۔ نوراؔ دوڑتی ہوئی آئی۔ بچے کو گود میں اٹھا کر جاتے جاتے سُنا گئی۔ بچہ جل کر مر جائے، مگر سگریٹ چھوڑتے نہیں بنے گا۔

وہ بولا تو کچھ نہیں لیکن دِل میں فیصلہ کر لیا کہ اب اور زیادہ پیئے گا۔ اُس کے دِل میں لحاظ آیا۔ جب تک عورت غیر رہتی ہے حق نہیں جتاتی۔ اِس خیال سے تو قدیم زمانہ ہی بہتر تھا۔ کیوں نہ نوراؔ سے یہ حق ہی چھین لیا جائے۔ یہ اُسے اچھا لگا۔ پہلے اُس نے اِس سلسلے میں ایک وکیل سے دریافت کیا۔ پھر ایک رات اُس نے کہا۔ ہماری زندگی میں تلخیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ تم کیوں نہ اپنے گھر چلی جاؤ۔

—— اپنا گھر ؟ میرا گھر تو یہی ہے۔

—— مارٹن کو پھر محسوس ہوا کہ وہ بیوی ہونے کا حق جتا رہی ہے۔

—— اگر ایسے جانا بُرا لگتا ہے تو طلاق لے لو۔

—— نوراؔ سناٹے میں آگئی تھی۔ مارٹن کو کچھ خوشی کا احساس ہوا۔ اس نے جان بوجھ کر یہ بات اندھیرے میں کہی تھی تاکہ وہ اُس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کو نہ دیکھ سکے۔ وہ خاموش رہی۔

—— تھوڑی دیر بعد اُس نے پھر پوچھا۔ تم نے کیا فیصلہ کیا؟

—— میں کیا فیصلہ کروں۔ فیصلہ تو تم نے کیا ہے۔

—— یہی سہی، پر تم کیا کہتی ہو۔ ؟

—— میرا کچھ نہیں کہنا، کافی نہیں ہے کیا ؟ تم تو جانتے ہو مارٹی ! میں کچھ لینے کے حق میں کبھی نہیں رہی۔ اور اندھیرے میں اُس نے صلیب کا نشان بنایا..... اِن دی نیم

آف فادر (سن اینڈ

ہولی گھوسٹ ( )

ایمن ( )

دوسری صبح وہ دیر سے اٹھا تھا۔ نوراؔ شاید چرچ گئی

کی طرح کچن میں تھی۔ وہ پڑا رہا۔ اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ اُٹھ کر نورا کا سامنا کرے۔ جب ساڑھے آٹھ بج گئے تو سیدھے لیٹرن میں گھس گیا۔ وہاں سوچتا رہا۔ کہ اگر نورا پھر وہی ذکر چھیڑ دے تو . . . . . اور جب وہ باہر آیا۔ تو جلدی میں نل بند کرنا ہی بھول گیا۔ وہ پھر اندر گھسا۔ ٹیپ مضبوطی سے بند کرتے ہوئے اُس نے اپنے دِل کو بھی مضبوط کیا۔

ہاتھ، مُنہ دھو کر وہ ناشتے کے لئے میز پر آ گیا۔ حسبِ معمول سلیقے سے ساری چیزیں رکھی تھیں۔ اُس نے طشتری میں سبزی لی۔ روٹی توڑنے ہی جا رہا تھا کہ ایک پُرزے پر نظر پڑی۔ اُس نے لٹ پاٹ کو کھسکا کر پڑھا۔ "تم نے دِل کا رشتہ توڑنا چاہا۔ یہ ایک عورت کے لئے طلاق سے بھی بڑی بات ہے۔ ناشتہ بنا دیا ہے، کھا کر آفس جانا۔ میں اپنے بچے کو لے کر جا رہی ہوں۔

اُسے رنج ہونا چاہئے تھا۔ لیکن اُسے غصہ آیا۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ اِس عورت سے سارے حقوق چھین لے۔ صبح جاتے جاتے بھی حق جتا گئی، وہ سیدھا وکیل کے پاس گیا۔ اور پھر ساری باتیں حسبِ خواہش ہو گئیں۔

اُس نے بیوی کو طلاق دے دی، بچہ اُسے مِل گیا۔ وہ خوش ہوا۔ اُس نے تنہا جاتی ہوئی نورا کو دیکھا۔ اُسے لگا۔ اب وہ ہار گئی ہے اور اُسے شکست خوردگی کا احساس ہے۔ وہ دیکھتا رہا۔ نورا نے ایک رکشہ بُلایا۔ ایک پَیر رکھتے رکھتے رُک گئی۔ پھر لَوٹ آئی۔ وہ بےچینی محسوس کرنے لگا ایک دم قریب آ کر اُس نے راجن کے سر پر ہاتھ رکھا ـــــ اُسے لگا اب وہ رو دے گی، کہے گی، اِس بچے سے مجھے الگ مت کرو۔ وہ خوش ہو رہا تھا۔ کہ نورا نے راجن سے کہا۔ بیٹے، تم ڈیڈی کو تنگ مت کرنا۔ جب وہ آفس جائیں تو پڑوس میں آنٹی کے یہاں چلے جانا۔ اور ہاں مارٹن، سردی کا موسم قریب ہے، اِس کیلئے کچھ گرم کپڑے بنوا دینا۔ وہ چلی گئی۔ مارٹن کو افسوس نہیں ہوا، رحم نہیں آیا۔ اُسے پھر غصہ آیا۔ سارے رِشتے توڑ دینے کے بعد بھی عورت اپنا حق جتانا کیوں نہیں چھوڑتی۔ . . . .

اُس نے ماچس سے تیلی نکالی۔ لکڑی پر مسالہ نہیں تھا۔ وہ جانتا ہے گھر میں دوسری ڈبیہ بھی نہیں۔ وہ ہیٹر کے پاس گیا۔ پلگ اُٹھاتے ہی خیال آیا. . . . . راجن کو ٹائیفائیڈ اور نمونیہ ایک ساتھ ہو گیا۔ کئی لوگوں نے کہا۔ وائف کو تار دیکر بُلا لو۔ مگر وہ سوچتا رہا اب اُس کی بیوی کہاں ہے! وہ اکیلا ہی سب کچھ کرتا رہا۔ ایک دِن جب راجن کی حالت بہت بگڑ گئی تو پاسٹر نے کہا۔ میں نورا کو تار دینے جا رہا ہوں۔ وہ کچھ نہیں بولا۔

اُس نے پلگ لگا دیا۔ گھڑی دیکھی، پاس کے کلینڈر پہ کتنی ہی آڑی ترچھی لکیریں تھیں۔ اِس کلینڈر کو رکھ کر وہ غسل خانے میں گیا تھا۔ راجن پانی سے کھیل رہا تھا۔ اُسے ڈانٹ کر باہر نکالا۔ پر جب کچن سے کچھ بنا کر آیا تو راجن کلینڈر پر فاؤنٹین پن سے کتنی ہی لکیریں کھینچ چکا تھا۔ اتنا خوبصورت کلینڈر اور یہ حالت۔ اُس نے اُسے خوب پیٹا۔

کانپتے ہاتھوں سے اُس نے لکیروں کو چھُوا۔ آج اُسے یہ لکیریں ڈھیر ساری صلیبیں لگیں، صلیبیں جن کے آگے گھٹنے ٹیک کر عبادت کی جاتی ہے۔ تبھی باہر سے گیٹ کے کھلنے کی آواز آئی۔ اُس نے گھڑی دیکھی۔ سمجھ گیا نورا آ گئی ہے۔ اُس نے جلتے ہوئے ہیٹر میں سگریٹ ڈال دی۔ تمباکو جلنے کی عجیب سی بُو۔ اُسے لگا، کوئی لاش جل رہی ہے۔ پھر اُس نے برآمدے میں نورا کی آہٹ محسوس کی۔ اب کچھ ہی لمحوں میں اُس کے نزدیک آ جائے گی۔ اُسی لہجے میں پوچھے گی۔ راجن کو کیا ہوا؟۔ میرا راجن کہاں ہے؟. . . . . . تب وہ۔ . . . تب وہ کیا جواب دے گا . . . . . اور وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے مُنہ چھُپا کر بچّوں کی طرح سِسکنے لگا۔ !!!

▲

غزلیں

میکش غازی پوری

خرد کو آج کچھ اس طرح غرقِ جام کریں
قدم قدم پہ ہمیں مستیاں سلام کریں

ہمیں تو جو بھی ملا ہے وہ "غم فروش" ملا
ہم انتسابِ غمِ زیست کس کے نام کریں

ان آنسوؤں کی رفاقت کا ہے عجیب انداز
جہاں زبان ہو بے بس، وہاں یہ کام کریں

حدیثِ عشق کی تفسیر ہو ہی جاتی ہے
ہزار پردۂ الفاظ میں کلام کریں

حیاتِ عشق میں کیا ایسا "ایک دن بھی نہیں"
وفا کی زلفوں کے سایہ میں جس کی شام کریں

گنوا کے تابِ نظارہ بچا لیا ہے بھرم
تجلیوں سے کہو میرا احترام کریں

حرم کے غم کا اثر دیر بھی قبول کرے
"شعورِ دردِ محبت پھر اتنا عام کریں"

مری جبیں میں کچھ ایسے بھی ہیں سجودِ وفا
ترے نقوشِ قدم جن کا احترام کریں

ہم اپنے دور میں وہ کام کر چلیں میکش
ہمارے بعد کی صدیاں ہمیں سلام کریں

قمر اقبال

کبھی زمیں پہ دھنک کی کمان تو ٹوٹے
کوئی ستاروں بھرا آسمان تو ٹوٹے

لہو لہو ہوئے سارے ورق، قلم سے کہو
کہیں یہ سلسلۂ داستان تو ٹوٹے[1]

کرن کرن کوئی سورج صدائیں دیتا ہے
سیاہ رات کی اونچی چٹان تو ٹوٹے

زمین کو تو بہت دور چھوڑ آئے ہیں
اگر ہے سر پہ کوئی آسمان تو ٹوٹے

ملے گی داد بھی اشعار پہ قمر صاحب
غزل ہو ختم، طلسمِ بیان تو ٹوٹے

☆

دھواں دھواں کوئی منظر سا کیا ہے سینے میں
بھنور بھنور یہ سمندر سا کیا ہے سینے میں

یہ نصف رات یہ دل کی تڑپ چراغ چراغ
رگوں کو کاٹتا خنجر سا کیا ہے سینے میں

کسی کی یاد نے شب خون آج پھر مارا
رواں یہ درد کا لشکر سا کیا ہے سینے میں

چبھن ہے جس کی رگ و پے میں پھانس ہے کیسی
گڑا ہوا کوئی پتھر سا کیا ہے سینے میں

تمام جسم میں کانٹے سے ٹوٹتے ہیں قمر
کہ سانس سانس پہ نشتر سا کیا ہے سینے میں

[1] عطف و اضافت کے ساتھ نون کا اعلان درست نہیں۔ ادارہ

مقالہ

ڈاکٹر نورالسعید اختر

اُردو کا پہلا اِنشائیہ نگار

ہر اَدب مُختلف اصناف کا حَسین مجموعہ ہوتا ہے۔ اِس کُلیّہ سے اُردو اَدب بھی مُبرّا نہیں، یہ عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ ابتداءً ہر اَدب نظم کی صورت میں وجود میں آیا۔ جوں جوں اِس کے اِقدار میں اضافہ ہوتا گیا تو زمانے کی مانگ اور وقت کی رفتار کے مطابق ادیبوں اَور فنکاروں نے اپنی فکری سُوجھ بُوجھ اور دیگر صلاحیتوں کے لحاظ سے ادب میں نت نئے تجربے کئے۔ نظم و نثر کے یہ تجربے ادیب کی نفسیاتی بصیرت (PSYCHOLOGICAAL INSIGHT) جمالیاتی ذوق (ESTHETIC SENSE) اور کثرتِ مطالعہ (EXTENSIVE READING) پر مبنی ہوتے ہیں۔ وقت کے تقاضوں کے ساتھ ادیبوں کے یہ تجربے اَصنافِ اَدب کے جزد بن جاتے ہیں۔ سولھویں صدی عیسوی سے اِنشائیہ (ESSAY) کا بھی اَصنافِ اَدب میں شمار ہونے لگا ہے۔ یورپی اور ہندوستانی ادیبوں اور مفکّروں نے اِنشائیہ کی تعریف مندرجۂ ذیل انداز میں کی ہے۔

(۱) ۔ "یہ ایک خاص قسم کے فکر و تصوّر کا نتیجہ ہے جس میں تجزیۂ جذبات، نفسیاتی مُطالعہ، منطقی اِستدلال، فلسفیانہ تفکر، متصوّفانہ اِستقراء اور اِنشائیۂ عالیہ کا جمالیاتی اُسلوب سب کچھ پایا جاتا ہے۔"

(اعتراف و تعارف از نیاز فتحپوری ـــــ اُردو اسیز از ڈاکٹر ظہیر الدّین مَدنی ص۵)

۲۔ " (اِنشائیہ کو) ایک ایسی فلسفیانہ شگفتگی کا حامل ہونا چاہیے جو پڑھنے والوں کے ذہن پر منطق اور اِستدلال کے ذریعے نہیں بلکہ محض خوشگوار اِستعجاب اور بے ترتیب مفکّرانہ اندازِ بیان کے ذریعے اپنا تاثّر قائم کرے۔"

(تعارف اُردو انشائیہ از احتشام حُسین
مُرتبہ سید صفی مرتضیٰ ص۴)

۳۔ "ادب لطیف کا اصل مفہوم اُس طرزِ انشاء سے ہے جو وُسعتِ علم، احساسِ شعریت و حکیمانہ نزاکت خیال اور باہمی اِمتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔"

(دیباچہ، محشرِ خیال از اَصغر گونڈوی
مُصنّفہ سجّاد انصاری)

۴ :۔ " انشائیہ کی نوعیت ذاتی اور انفرادی ہوتی ہے۔ ایک داخلی آہنگ بھی اس میں پایا جاتا ہے جس کی حدیں غنائیت سے جا ملتی ہیں۔ "
(از ڈاکٹر عبادت بریلوی :۔ ادیب ۔۔ انشائیہ نمبر :۔ علی گڑھ)

۵ :۔ " انشائیہ طویل بھی ہو سکتا ہے۔ اور مختصر بھی۔ اس کا لب و لہجہ سنجیدہ بھی ہو سکتا ہے اور شگفتہ بھی۔ "
آر ڈبلیو اجیمس " ESSAY OF MODERN
WRITERS " ماخوذ از انشائیہ :۔ آدم شیخ صد ۱۹

۶ :۔ " سی ڈی پنٹو نے انشائیہ کو ایک ایسا فن قرار دیا ہے جس میں سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ فنکار کی شخصیت کی عکاسی ہوتی ہے "۔ اور مزید یہ بھی کہا ہے کہ " انشائیہ کا بنیادی مقصد اور مطمح نظر تفریح اور انبساط ہے "
(سی ڈی پنٹو (MODERN ESSAYS
ماخوذ از :۔ انشائیہ آدم شیخ صد ۲۱)

انشائیہ کی مندرجہ بالا تعریفیں مشترک اُمور اور متضاد رجحانات کی حامل ہیں۔ یہاں یہ بحث بے معنی ہوگی کہ ان تعریفوں میں مشترک اور متضاد خیالات کیونکر موجود ہیں۔ اس کے برعکس یہ تعریفیں ہمارے تجزیئے کے لئے مدد معاون ثابت ہوں گی اس سے قبل کہ اصل موضوع چھیڑا جائے، مختصر صنفِ انشائیہ کی خصوصیات اور تاریخی پس منظر پر نظر ڈال لینی ضروری ہے۔

انشائیہ کی خصوصیات :۔

موضوع کی لامحدودیت انشائیہ کی نمایاں خصوصیات میں سے ہے۔ اور اسی بناد پر انشائیہ نگار اپنی " انفرادیت " (INDIVISUALITY) کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ فلسفیانہ تفکر (PHILOSOPHICAL THOUGHT PROCESS) " منصوفانہ استقراء " (SOPHISTIC DEDUCTION) " خوشگوار استعجاب " (PLEASENT SURPRISE) حُسنِ عبارت، احساسِ شعریت اور حکیمانہ نزاکتِ خیال "، داخلی آہنگ اور غنائیت " (MUSING) جامعیت (COMPREHENSIVENESS) ' اختصار ' (BREVITY) اور عدمِ تکمیل (INCOMPLETENESS) انشائیہ کے وہ اجزاء ہیں جو اُسے ادب کے دیگر اصناف سے ممتاز کرتے ہیں۔ انشائیہ طویل بھی ہو سکتا ہے اور مختصر بھی۔ لیکن اس میں سادگی اور بے تکلفی کا ہونا ضروری ہے، تفریح اور انبساط کا عنصر کارفرما ہے تو انشائیہ میں زور (FORCE) آجاتا ہے۔ انشائیہ نگار اپنی فکری استعداد اور جمالیاتی ذوق کے مطابق پراگندہ خیالوں کو جدّت اور ندرت کے ساتھ مرکزیت بخشتا ہے۔ یہی اُس کا فنی کمال ہے۔ اگر فطری طور پر انشائیہ نگار رُومان پسند واقع ہوا ہے تو اُس کے خیالات (IDEAS) کو جذبات، محسوسات اور ذہانت کے ہر ایک نئی آب و تاب بخش دیتے ہیں۔

انشائیہ نگاری کی تاریخ :۔

انشائیہ نگاری کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر آدم شیخ نے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

شاعر یمنی

" اُردو اِنشائیہ کے فکری وِرثے اور روایتوں کی تلاش میں جب ان اِنشائیہ نما تحریروں کا مطالعہ بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔ جن کی بنیادوں پر انشائیوں کا ڈھانچہ تیار ہوا۔ عربی، فارسی، فرانسیسی اور انگریزی زبان کا ادب اِس ضمن میں قابل ذکر ہے۔ (انشائیہ ص ۳۴) "

ڈاکٹر صاحب نے سنسکرت جیسی قدیم اور کلاسیکی زبان کا ذکر نہیں کیا۔ جبکہ اس میں بھی پربندھ (THESIS) اور بندھ (....) جیسی چیزیں موجود ہیں۔ یہ بات اور ہے کہ عربی اَدب میں اِنشائیہ نما تحریروں کی بہتات ہے۔ دراصل یہ صنف اَدب عربوں کی جوشیلی طبیعت اور سیمابی مزاج کے موافق تھی۔ یہ لوگ فطری طور پر انشاء پرداز واقع ہوئے تھے۔ بالخصوص عربی فرمانرواؤں کی تحریریں صنفِ انشائیہ کی بہترین مثالیں ثابت ہوئیں۔ علاوہ ازیں عربی ادب میں "مقامات" بھی کافی لکھے گئے ہیں۔ اِن مُقامات کی بیّن خصوصیت یہ ہے کہ اِن کا اِختتام کسی نصیحت یا لطیفے پر ہوتا ہے۔ یہ مقامات مجلسوں اور محفلوں تک محدود ہوتے تھے۔ خلفائے عباسیہ نے جب بغداد کو دارالخلافے کی حیثیت بخشی تو عربی ادب پر اس تبدیلی کے گوناگوں اثرات پڑے۔ بغداد اور ایران کی قربت نے دونوں زبانوں میں ہم آہنگی پیدا کی جس کی وجہ سے عربی نثر نگاری میں نئی رَوِشیں پیدا ہوئیں۔ جاحظ، عبدالحمید بن یحییٰ، بدیع الزماں ہمدانی، ابن المقفع۔ اور محمد قاسم حریری وغیرہ نے اِن رَوِشوں پر چل کر عربی اَدب میں نت نئے تجربے کیے۔ اور وسیع فکری سرمایہ یادگار چھوڑا۔ اِن عربی اُدباء کی کاوشوں میں صنفِ اِنشائیہ کے نقوش کہیں تو بہت گہرے اور واضح ہیں اور کہیں مبہم مبہم سے۔

قدیم فارسی میں صنفِ اِنشائیہ کا وجود قریب قریب ناپید ہے۔ تاہم چند محققین اِس بات پر متفق ہیں کہ قدیم فارسی اَدب میں پائے جانے والے مقالات، مقامات اور رسائل میں اِنشائیہ کے خط و خال موجود ہیں۔ لیکن ڈاکٹر آدم شیخ نے اس امر کی تردید میں کہا ہے کہ

" صنفِ انشائیہ کے موضوع اور تکنیک کے پیش نظر یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ مقالوں میں علمیت کا اظہار، کی اِستدلالی ترتیب و تنظیم اور تسلسل کا خیال اور اصلاح و تنقید کی کوشش نمایاں عناصر کے طور پر اُبھرتے ہیں جو انشائیہ کے مزاج سے لگا نہیں کھاتے۔ (انشائیہ ص ۳۵)

اِس کے باوجود بھی فارسی ادب میں اِنشائیہ کی جھلکیاں قابوس بن وشمگیر کے پوتے کیکاؤس کے " قابوس نامہ " اور قاضی حمیدالدین کی مشہور تصنیف ' مقاماتِ حمیدی ' میں پائی جاتی ہیں۔ اُردو زبان ہر اعتبار سے عربی و فارسی اُدب کی رہین منت ہے لہٰذا قدیم اُردو ادب میں جہاں تک صنفِ اِنشائیہ کے اِبتدائی نقوش اور غیر واضح تانے بانوں کا تعلق ہے وہاں بھی عربی و فارسی اَدب کا تاثر موجود ہے۔

فرانسیسی اَدب میں مان ٹین (MONTAINGNE) کی تحریریں اِنشائیہ نگاری کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مان ٹین کے اِنشائیوں کا پہلا مجموعہ ۱۵۸۰ء اور تیسرا اور آخری مجموعہ " ESSAIS " کے نام سے ۱۵۸۸ء میں شائع ہوا۔

بیکن (BACON) کو انگریزی اَدب میں انشائیہ نگاری کا موجد مانا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ متعدد انگریز نثر نگاروں نے اِس صنف کو آگے بڑھایا۔ ان میں، چارلس لیمب، ولیم ہزلیٹ، ایڈیسن اور اسٹیل قابلِ ذکر ہیں۔

اب ہم قدیم اُردو کے اَوّلین اِنشائیہ نگار کا مختصر تعارف پیش کرتے ہیں۔

مُلّا وجہی کا تعارف :- دکن میں قطب شاہی سلطنت کے آغاز کے ساتھ ہی سیاسی، سماجی، معاشی اور

شاعر وجہی

ثقافتی سرگرمیوں میں نمایاں تبدیلیاں نظر آنے لگی تھیں۔ خصوصاً محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں (۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ) نہ صرف ادب کے مختلف شعبوں کے رجحانات بدلے بلکہ زندگی کے مختلف گوشے نئی قدروں سے منوّر ہوئے۔ شعر و شاعری سے محمد قلی قطب شاہ کو گہرا لگاؤ تھا۔ اس کے دربار میں علما و حکما کی کثیر تعداد اکٹھا تھی۔ ملّا اسد اللہ وجہی جیسے یکتائے زمانہ، ماہرِ فن اور متنوّع و ممتاز شخصیت کے مالک بھی محمد قلی کے دربار سے وابستہ تھے۔ انہیں ادبی خدمات کے عوض ملک الشعراء کا خطاب دیا گیا۔ تھا۔ وجہی کی ادبی کاوشوں کے پیشِ نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۰۱۸ھ تک وہ نظم گوئی کی طرف متوجہ رہے۔ انقلابات و اتفاقات زمانہ نے وجہی کی قسمت کا دھارا موڑ دیا۔ محمد قطب شاہ کے عہد میں (۱۰۲۰ھ تا ۱۰۳۵ھ) وجہی شاہی عتاب کا شکار رہے۔ اس دوران میں انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ انہی ایام میں وجہی نے دکنی اردو میں تصوّف کے موضوع پر "تاج الحقائق" جیسی کتاب مکمل کی اور فارسی دیوان بھی مرتب کیا۔ ۱۰۳۵ھ میں محمد قطب شاہ انتقال کر گیا۔ عبداللہ قطب شاہ تخت نشین ہوا۔ ۵۹ سال کے طویل عرصے کے بعد یعنی ۱۰۴۴ھ میں وجہی "ہوگئی[1]" شاہی دربار میں بلائے گئے اور زبان پان تھمے سے نواز گئے۔ حاکمِ وقت عبداللہ قطب شاہ نے وجہی سے ایک کتاب لکھنے کی فرمائش کی۔ وجہی کی سوئی ہوئی قسمت جاگ اٹھی۔ اور انہوں نے "سب رس" جیسی مایۂ ناز کتاب تصنیف کی۔ ۱۰۴۵ھ کے بعد وجہی طبعی طور پر مرے نہ ہوں لیکن اُن کی ادبی زندگی اس کے بعد ہی ختم ہو گئی[2]۔

نظم کی طرح نثر میں بھی وجہی کی استادی مسلّم ہے۔ نظم میں اُن کی شاہکار مثنوی "قطب مشتری" ۱۰۱۸ھ اور نثر میں "تاج الحقائق" و "سب رس" ۱۰۴۵ھ ہیں۔ قدیم اردو کی نثر کا آغاز خواجہ بندہ نواز گیسو دراز متوفی ۸۲۵ھ مطابق ۱۴۲۲ء کی تصنیف "معراج العاشقین" سے ہوتا ہے۔ قدیم اردو نثر کی مستند تصانیف گیارھویں صدی ہجری میں لکھی گئیں اور ان میں ملّا اسد اللہ وجہی کی تصانیف کو سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ ملّا وجہی کی تصانیف کے پیشِ نظر یہ نظریہ قائم کیا جا سکتا ہے کہ وہ عربی و فارسی جیسے کلاسیکی ادب کے علاوہ اُس زمانے کی دیگر مروّجہ زبانوں اور ادبی سرمایوں پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ وجہی کی تصانیف پر اُن کے عمیق مطالعہ کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ نثر نگاری اسلوب (STYLE) اُن کا اپنا ایجاد کردہ ہے۔

انشائیہ کی اصطلاح، اس کی تعریف اور خصوصیات کا تعین بہت بعد میں کیا گیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس تعین سے پہلے انشائیہ کا وجود نہ تھا۔ بلکہ صحیح یہ ہوگا کہ اس سے پہلے بھی مختلف زبانوں میں انشائیہ کا رواج تھا۔ لیکن وہ اپنی ان مخصوص تحریروں کے لئے انشائیہ کی اصطلاح استعمال نہیں کرتے تھے۔ وجہی کی تحریروں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجودیکہ وہ اس فن کی تعیین سے پہلے اردو ادب میں نمودار ہوئے ہیں۔ لیکن پھر بھی اُن کی اکثر تحریروں میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جن کو انشائیہ کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ اس لئے ہم اگر یہ کہیں کہ وجہی نے اصطلاحی طور پر انشائیہ کے فن سے واقف نہ ہونے کے باوجود بھی انشائیہ لکھے ہیں تو غلط نہ ہوگا۔

وجہی کے انشائیوں کی فضا۔ وجہی کے انشائیوں کی فضا اُن کی روشن ضمیری اور قلب و نظر کی گہرائی کے باعث کافی نکھری ہوئی ہے۔ عمر کی پختگی نے اُن کے تجربوں اور مشاہدوں میں عمق اور دانش و بینش کے خواص پیدا کر دیئے تھے۔ علاوہ ازیں

---

[1] سب رس، وجہی ص ۱۱

[2] ایضاً

اُن کی طبیعت میں فطری طور پر جمالیاتی ذوق اور فلسفیانہ تفکر کے عناصر کار فرما تھے۔ وہ مشکل سے مشکل باتوں کو رمز و کنایہ کی صورت میں اخلاقی پہلو کے ساتھ پیش کرنے کے عادی تھے۔ ذیل کی سطور اس اَمر کی شہادت پیش کرتی ہیں :۔

(۱) **عقل** :۔ "عقل نور ہے۔ عقل کی دَوڑ بہوت دُور ہے۔ عقل ہے تو آدمی کہواتے، عقل ہے تو خدا کوں پاتے، عقل اچھے تو تمیز کرے، بلا اور بھلا جانے، عقل اچھے تو اپس کوں ہور دوسرے کوں پچھانے، عقل تے میر، عقل تے پیر، عقل تے بادشاہ، عقل تے وزیر، عقل تے دنیا، عقل تے دولت، عقل تے چلتی سلطاناں کی سلطنت، عقل تے رہیا ہے عالم کھڑیا۔ جس میں بہوت عقل و بہوت بڑا، عقل سوں چلتی خدا کی خدائی۔ جتنی عقل اُتنی بڑائی، عقل نہ ہوتی تو کچھ نہ ہوتا، کچھ رچیہ نہ ہوتا، بیت :۔

عقل کے نور تے سب جگ نے نور پایا ہے
جنے جو علم سکھا سو عقل تے آیا ہے

عقل بغیر دل کو نور نیں، عقل کوں خدا کہنا بی کچھ دُور نیں" (ص ۱۶ سب رس)

وجہی کے انشائیوں کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔ ان کے یہاں موضوعات کی وسعت، انداز بیان میں ندرت اور کہیں کہیں معنی و فن کے تجربے بھی پائے جاتے ہیں۔ محسوسات کی ترجمانی، اور جذبات کی عکاسی کے لئے موزوں، الفاظ تراشنے میں انہیں ملکہ حاصل ہے۔ ان کا دھیما لہجہ، زبان کی قدامت کو محسوس نہیں ہونے دیتا۔ ان کے اس اُسلوب میں مفکرانہ شگفتگی نظر آتی ہے۔ اور قاری کو ایک خاص قسم کی لطافت و جاذبیت کا احساس ہوتا ہے۔ وجہی اپنی نثر کو استعارہ اور تشبیہ سے مزین کرنا جانتے ہیں جس کے باعث اُن کی نثر میں روانی پیدا ہو گئی ہے۔ شراب سے متعلق وجہی کا یہ انشائیہ مندرجہ بالا حقائق کی غمازی کرتا ہے ملاحظہ کیجئے۔

(۲) **شراب** :۔ "شراب معشوق کا مشاطا۔ ایک حُسن کو سَو حُسن کر دکھلاتا۔ محبت کوں بڑھاتا۔ جس کوئی عاشق ہے اُسے شراب بہوت بھاتا۔ شراب عاشق ہور معشوق کے دِل کے شک کو دُور کرتا۔ شراب دونوں کوں محبت میں چُور کرتا۔ شراب پئے پچھیں دِل میں کچھ خلاف نیں اچھتا۔ شراب پئے بغیر دل صاف نیں اچھتا۔ دنیا کا لذّت تو یو شراب، شراب نا اچھی تو عاشقاں کے انگے دنیا سب خراب، شراب ہرگز غم کوں آنے نیں دیتا۔ شراب خوشی کو دِل میں تی جانے نیں دیتا۔ شراب عشرت کا سنگاتی۔ جہاں شراب وہاں عشرت آتی ...... اگر خدا کوں پہنچنے منگتا ہے تو شراب پی۔ بعضے ولیاں بی شراب نوش کئے ہیں۔ یو نیر آب نوش کئے ہیں۔ شراب مرکب ہے محبت کی بات کا۔ شراب ہادی ہے اس گھات کا۔ شراب آرائش بزم بادشاہی، شراب اسرار خلوت خانۂ الٰہی ..... شراب کو اتال حرام کتے ہیں سخت، دلے حلال تھا عیسیٰ پیغمبر کے وقت۔ اتنی شراب کی منائی آخر پی فعل پر بات آئی۔ بُرا فعل منا ہے نا کہ شراب" (ص ۲۷-۲۸۔ سب رس۔ وجہی)

تخیل کی بلند پروازی اور کردار نگاری کی بہترین مثال کے طور پر مندرجۂ ذیل انشائیہ قابل غور ہے۔

(۳) **عاشق و معشوق** :۔ عاشق ناداں ہے۔ دلے عاشق میں بی تمام معشوق کی گت ہے۔ عاشق معشوق دو نام، دلے دونوں کا ایک کام، سب کوں ایک دھندا ہوں گھڑے، دلے ناداں جُدا پڑے، عشق ایکچہ ہے۔ جو دو نور، جا گا جلوا دیا ہے۔ کیں ناز کی صورت پکڑیا، کیں اپس کوں نیاز کیا ہے۔ ایک عشق ہے جو دونوں کوں بے آرام کیا ہے۔ ایک عشق ہے جو دونوں کوں بدنام کیا ہے، دونوں بی عشق پر عاشق ہیں۔ یوں کوں خام کیا ہے۔

عاشق روتا معشوق بی روتی عشق کی بات گھر گھر ہوتی۔ معشوق اپنی مشتاقی دل میں چھپاتی، عاشق کی بے تابی ظاہر ہو آتی، عاشق اوتالا، بہوت گرم، معشوق کوں حائل ہوتی شرم، اپس کوں اپیچہ بھاتا۔ اپسکوں اپیچہ لگ جاتا۔" (سب رس۔ ص ۹۳)

خاندانی عورتوں کی اصلیت بیان کرنے میں وجہی نے جس اختصار، جامعیت اور حُسنِ عبارت سے کام لیا ہے۔ اس کی ایک بہترین مثال ملاحظہ کیجیے۔

(۴)

اصیل عورتیں " اصیل عورتاں اپنے مرد بغیر دوسرے مردکوں اپنا حُسن دکھلانا گناہ کر جانتیاں ہیں۔ اپنے مَردکوں ہر دو جہاں میں اپنا دین ایمان کر پچھانتیاں ہیں۔ جوں خدا کوں مانے تیوں اپنے مردکوں مان تیں ہیں۔ جو مرد راضی تو خدا راضی، رسول راضی۔ جو مرد راضی تو دین دنیا میں عورت کی سرافرازی جنے بخریاں میں انگٹی۔ مرد کا دل یات نیں پکڑی۔ اپنی چاترائی کچھ کام نیں کی۔ نکاہی کچھ کام نیں کی۔ وہی عورت بھلی۔ جو کوئی مرد کے بچے میں چلی۔ (ص ۸۲ سب رس)

وجہی غیر معمولی ذہانت کے مالک تھے۔ اس خصوصیت نے اُنھیں رومانیت پسند مفکر بنادیا تھا۔ اُن میں وسعتِ علم کے باعث احساسِ شعریت اور حکیمانہ نزاکتِ خیال پیدا ہو گئی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ اُن کی شگفتہ بیانی، داخلی آہنگ اور لب و لہجے کی سنجیدگی سے بھی مزین ہو گئی تھی۔ ان کے انشائیوں میں زندگی کی مختلف تصویریں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ ان تصویروں میں روح افزا تازگی اور جاندار حقیقتیں پنہاں ہیں اور بقول ڈاکٹر مدنی "اس قسم کے ادب پارے کسی بھی طرح نظم سے کم نہیں ہوتے اور شاعرانہ ذہنیت و صلاحیت رکھنے والا ہی نثر میں شاعرانہ لچک پیدا کرسکتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ صنف اپنی بے ربطیِ بیان اور اچھوتے طرزِ ادا کے پیشِ نظر اُردو غزل سے بہت زیادہ مشابہ ہے۔ آنسو ہماری روزمرّہ زندگی کا ایک اہم جزو ہیں۔ وجہی نے شاعرانہ انداز میں آنسوؤں کی مصوّری ذیل کے الفاظ میں کی ہے۔

(۵)

آنسو انکھیاں میں تے انجواں کا بُند پڑتا۔ پھول تے جانو شبنم جھڑتا۔ دونو ہوئے دو جھرے پانی ہور لہو بھرے، انجھو ڈھلتے ہیں۔ اُچلے ہور لال۔ خدا کوں معلوم۔ اِس بچارے کا حال دل ہوا عشق تی دانادانا۔ آنکھی ہوئی یاقوت ہور الماس کی کھان۔ دیدے دیدار کوں ترستے، بادل ہو کر موتی برستے۔ دل کے عشق میں اپس کوں جلالی، دونوں پانوں پڑی الا بلالی۔ یو خس نارِ محبت کی متوالی، دل کا سر گرد میں اُچھالی، سینے سوں سینا لالی۔ عشق سر چڑیا۔ یکایک دل کے موں پر اُس کی انکھیاں میں تی انجھو کا بُند پڑیا۔ دل نیند میں تی جاگیا۔ حیران ہو کر دیکھنے لاگیا۔ جیوں باغ میں تے کلیاں سب پھول کر پھول ہو کرتیاں رلیاں ٹھاریں ٹھار۔ چاروں طرف جھلکتے ہیں۔ جھلکار، جھاڑیاں تے سب تازہ کئے ہیں۔ سنگار، گلے میں پھولاں کے بھارے ہیں۔ بار، بن رُت آئے ہیں بار، جناوراں ڈالیاں پر مست مرغولتے ہیں۔ مست ہو سرشار۔" (ص ۲۰۹-۲۱۰۔ سب رس۔ وجہی)

انگریزی ادیب بیکن (BACON) نے اُن تحریروں کو انشائیے کہا ہے۔ "جن میں بغیر کسی تجسس اور کھوج کے کسی حقیقت کا اظہار ہو جائے۔" وجہی کے انشائیوں کی فضا اس حقیقت سے معمور ہے۔ اُن کے یہاں حقیقت کی پردہ کشائی جا بجا نظر آتی ہے۔ حتیٰ کہ صوفیانہ مضامین میں بھی وجہی حقیقت پسندی سے کام لیتے ہیں۔ وجہی عشقِ مجازی کو نہ صرف عشقِ حقیقی

شاعر۔ بمبئی

کا زینہ تصوّر کرتے ہیں بلکہ معرفت کی راہ کو راگ، راگنی کی تھاپ پہ طے کرنے کی تلقین بھی کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

(۶)

راگ :- راگ سُننا عاشق لوگاں کا عبادت ہے۔ عاشق نے اُس عبادت تھی کچھ حاصل کرلینا۔ راگ ایک آواز ہے کہ اِس آواز میں عاشق جانباز کوں محرم رازکوں ہزار ہزار نیاز ہے۔ اُس آواز میں خداسوں، ایک ایک باتاں ہوتیاں ہیں کہ او خداچ جانتا ہے۔ نزدیک دکھلایا ہوں دلی لبھوت دُور دراز ہے۔ او وانکا نالوں یاں تلملاتا بلکہ کام تیری جیو پہ آتا تو یوں نیں پایا کریاں کیلے ہے۔ اُس آواز میں تمام عشق بھریا ہے۔ اُسی آواز میں عشق جاگا کریا ہے۔ اُس آواز میں بسر خدا ہے۔ اس آواز میں اُس کے چھب دبے چکونے کی صفت وس آتی ہے

(تاج الحقائق۔ وجہی۔ مرتبہ نورالسعید اختر، جامعہ بمبئی)

اِنشائیوں کا فنّی تجزیہ :-

انشائیہ کی تعریف اور خصوصیات پر جس قدر روشنی ڈالی گئی ہے وہ اپنی جگہ ایک علیٰحدہ چیز ہے۔ لیکن جب ہم ان حقائق کے مدِّ نظر وجہی کے اِنشائیوں کا تجزیہ کریں گے تو ہمیں چند ایسی رعایتوں سے کام لینا ہوگا۔ جس کے مُلا وجہی مستحق ہیں پہلی چیز یہ ہوگی کہ مُلّا وجہی جس عہد میں نثر لکھ رہے تھے وہ زمانہ آج سے تین سو سال قبل کا تھا۔ دکن میں اُردو نثر و نظم کو مستند طور پر فروغ دینے والے وجہیؔ ہی ہیں۔ "تاج الحقائق" اور "سب رس" وجہی کی نثری تصانیف ہیں۔ یہ دونوں کتابیں الگ الگ ماحول میں لکھی گئی ہیں۔ وجہی کی اِن تصانیف میں انشائیے اِقتباس کی صورت میں ملتے ہیں۔ یہ انشائیے ایک سوچے سمجھے اندازِ فکر کے ساتھ ہرگز نہیں لکھے گئے، البتّہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ مُلّا وجہی نے غیر شعوری طور پر یہ اِنشائیے لکھے اس رعایت کے پس منظر میں وجہیؔ کی تحریروں کا مطالعہ کیا جائے تو اُن کے یہاں اِنشائیہ کی بہترین مثالیں مل جاتی ہیں۔

"سب رس" میں وجہی کے یہ اقتباسات غور طلب ہیں۔

" یو (یہ) رنگ رنگ کے پھول، سُرنگ مقبول، سب کسے بھاتے، یو (یہ) پھول دائم تازے، ہرگز نیں کملاتے۔ ایسے خوش باس کے پھولاں ابھوں (ابھی تک) کسی باغ میں نیں کھلے، ایسے پھولاں کسی باغ میں نیں ملے۔ سُنگے (سونگھے) دل میں بھرے اُساس، کہاں ہے وہ پھول جس پھول میں ایسی باس (سب رس۔ ص۶)

ایک جگہ یوں رقمطراز ہیں :-

" اِسی باغ میں تے لینگے پھول چُن چُن، جس کے دماغ میں پھول کی باس جاوےگی۔ تازی اُرواح تن میں آویگی۔ جکوئی اچا پایا بنیاد، اوّل آخر وہی اُستاد۔ (سب رس :۔ ص ۱۲) "

وجہی اپنے اِقتباسات کو نہ صرف خوش رنگ پھولوں سے تشبیہہ دیتے ہیں ـــ بلکہ وہ نثر کے میدان میں اپنی اُستادی تسلیم کرانا چاہتے ہیں۔ اُردو اَدب میں اِنشائیہ نگاری مولانا محمد حسین آزاد کی "نیرنگِ خیال" سے شروع ہوتی ہے۔ "نیرنگِ خیال" کے دیباچے میں آزاد بھی اپنی برتری کی طرف اِن الفاظ میں اشارہ کرتے ہیں۔

" بے شک یہ کہنا اُن کا اَصلیت سے خالی نہیں۔ کیونکہ خیالی تصویریں حکمت و اخلاق کی ہیں۔ فکر کے قلم نے خاکہ ڈالا ہے۔ اور استعارہ و تشبیہہ نے رنگ دیا ہے۔ طبیعتیں رستے سے آشنا نہیں سبب یہ ہے کہ ملک میں ابھی اِس طرز کا رواج نہیں " ۔

آزاد نے اِنشائیہ سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے اور جن نکتوں پر زور دیا ہے اُن کے مکمل خط و خال

وجہی کے اِنشائیوں میں بھی موجود ہیں۔ اِس طرح سے آزاد کا یہ کہنا کہ "ملک میں ابھی اس طرز کا رواج نہیں۔ بے معنی ہو جاتا ہے اور انشائیہ کے میدان میں آزاد کی اوّلیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔

انشائیہ نگار کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اِبتذال، سوقیانہ پن اور ہیجان انگیزی سے احتراز کرے۔ وجہی کی آزاد خیال مگر صوفیانہ طبیعت کہیں کہیں بے قابو ہو گئی ہے۔ اُن کی یہ بے باکی آداب سے تجاوز کر جاتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بے تکلفی جمالیات پرستی اور زندہ دِلی انشائیہ کے ضروری عناصر ہیں۔ لیکن اُن کی حدیں بھی مقرر ہیں۔ وجہی اکثر ان حدود کو پار کر جاتے ہیں۔ اِس ضمن میں بھی وجہی خصوصی رعایت کے مستحق ہیں۔ صحیح معنوں میں وجہی کی روایت شکن طبیعت اُردو ادب میں ایک لافانی شاہکار پیش کرنا چاہتی تھی۔ اَدبی میدان میں اُن کا مقابلہ کئی لوگوں سے تھا۔ اور وہ ان سب پر سبقت لے جانا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وجہی اپنے مفہوم اور مقصد کو کُھلے انداز میں پیش کرنے کے عادی ہیں۔

وجہی کے نثری اِقتباسات جنہیں ہم اِنشائیے گردانتے ہیں۔ انشائیہ کے چند عناصر، مربوط فکر، فکر انگیز تشنگی اور منطقی اِستدلال سے عاری ہیں۔ اِن کوتاہیوں کی بنا پر وجہی کے اقتباسات کو انشائیہ قرار نہ دینا غلطی کے مترادف ہوگا۔ ڈاکٹر ظہیر الدّین مدنی نے انشائیہ نگاری کی بابت جو رائے پیش کی ہے اس کا لُبِّ لباب یہ ہے کہ "اسے (ESSAY) نگار اپنے ذاتی تجربوں اور مشاہدوں کی روشنی میں حیات و ممات اور حوادثاتِ کائنات سے متعلق شوخیٔ بیان کے ساتھ بعض اوقات، صاف صاف اور بعض اَوقات رمز و کنایہ میں کسی اخلاقی پہلو کو پیش کرتا ہے اگر چہ فلسفیانہ انداز میں حیات کی کشمکش، زمانے کی ستم ظریفی، اخلاقی اِقدار وغیرہ جیسے مسائل کی گتھیاں سلجھاتا ہے۔ مگر اس کام کے لئے ایسا اچھوتا اندازِ بیان اختیار کرتا ہے کہ ان کو سمجھنے میں نہ کسی قسم کی سعی و کاوش کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ فلسفے کی خشکی ذہن پر بوجھ بنتی ہے۔ (اُردو اسینز ص ۱۱)۔" ڈاکٹر مدنی کی تمام باتیں وجہی کے اِنشائیوں پر صادق آتی ہیں۔ لہٰذا انشائیہ نگاری کی تاریخ میں وجہی کو اُن کا جائز مقام عطا کرنے میں ہمیں پس و پیش نہیں کرنا چاہئے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری بھی ہماری رائے سے متفق ہیں۔ اُن کا بیان ہے کہ :-

"سب رس" میں بہت سے (DIGRESSIONS) بھی ہیں۔ مولوی عبدالحق نے انہیں محض بیان سمجھا تھا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ "سب رس" کے بیانیہ میں اُن سے (وجہی سے) ایسے گنج پیدا ہو گئے ہیں۔ جو بجائے خود حسین اور تسکین دہ ہیں۔ وہ ایک وسیع گلستاں کی منفرد روشیں ہیں جن میں سے ہر ایک اپنی نزہت اور رنگ برنگی کی وجہ سے نظر کش ہیں۔ اِنہی میں ہم کو اُردو انشائیہ نگاری کے اوّلین نقوش بھی ملتے ہیں۔ (مجلّہ عثمانیہ :- دکنی ادب نمبر ص ۴۲،) "

▲

بقیہ صفحہ ۴۳ "غالب کی صحت مند محبت کے جلوے"

اُس کی فنی محبت میں مقامی رنگ تھا۔ غالب کو یہ مقامی رنگ پسند نہیں آیا اگر چہ اس مقام پر غالب نے دہلی کے فنی معیار کو ظاہر کرنے کیلئے ذوق اور مومن وغیرہ کا ذکر کیا ہے، اِسی طرح لکھنؤ کے معیارِ فن پر روشنی ڈالنے کے لئے انیس و دبیر کا ذکر نہیں کیا ہے، مگر اِس خط میں اُس کے تیوروں اور اُس دَور کے لکھنؤ کی ادبی تاریخ کو ملا کر دیکھنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انیس و دبیر کی فنکارانہ شخصیتوں کا افسانہ اِس خط میں اِسی طرح چھپا ہوا ہے جس طرح "مثنوی چراغِ دیر" میں اُمراؤ بیگم کی محبت کا افسانہ چھپا ہوا ہے۔

▲

گمشدہ چہرہ

عبداللہ کمال

بارہا یہ سوچا ہے، اب بھی سوچتا ہوں یہ
پُرفریب چہروں کے، اِس مہیب جنگل میں
کیا ہے اصلیّت میری؟ میری حیثیت کیا ہے؟

دِل ہیں آئینہ، لیکن آئینوں پہ پردے ہیں
رسم کے، تکلّف کے، جھوٹ کے، تصنّع کے
آئینہ مُجلّا سا، کاش کوئی مِل جاتا!
خاک چھانتا ہوں میں، اُس کو ڈھونڈتا ہوں میں
کیسی جستجو ہے یہ؟ کیسی آرزو ہے یہ؟
کچھ سمجھ نہیں پاتا، کتنا ناسمجھ ہوں میں
اِس مہیب صحرا میں، سب ہی اجنبی سے ہیں

یہ حسین سے چہرے، مہ جبین سے چہرے
اپنی بے زبانی سے کہہ رہے ہیں کچھ شاید
ہر حسین چہرے میں، کچھ کمی سی ہے شاید
خود تلاش میں اپنی، ہر حسین چہرہ ہے
کِس کی، کِس کو حاجت ہے، جانتا نہیں کوئی!؟

اپنی اپنی پرچھائیں، اپنا اپنا سُورج ہے
بے بسی مگر یہ ہے، جرأتِ نظر کم ہے
اپنے اپنے سُورج سے، سب ہی خوف کھاتے ہیں
اپنی اپنی پرچھائیں، اجنبی سی لگتی ہے

اِنتہائے وحشت میں، جستجوئے خود بینی
خود فریب چہروں کو، آئینہ دکھاتی ہے

اجنبی سی پرچھائیں، گُل عجب کھِلاتی ہے
پردے سرسراتے ہیں، نقشِ دِل اُبھرتا ہے
اپنے دِل کے دَرپن میں جھانکنا ہی پڑتا ہے
جھُوٹ کی سیاہی میں، ہر لپا پُتا چہرہ
بے نقاب ہوتا ہے، رازِ دِل اُگلتا ہے
دِل کی صاف گوئی سے، سب ہی خوف کھاتے ہیں
روشنی سے ڈرتے ہیں، آگہی سے ڈرتے ہیں
اور پھر یہ گھبرا کر، اپنے ناخنوں سے خود
اپنے اپنے چہروں کا گوشت نوچ لیتے ہیں

یہ لہو لہو ناخن، کِس کے دِل میں اُترے ہیں؟
یہ لہو لہو چہرے، سُرخیٔ شفق کیوں ہیں؟
اُنگلیوں سے رِستا خُوں، سُرخیٔ حِنا کیوں ہے؟
سُرخیٔ شفق کیا ہے؟ سُرخیٔ حِنا کیا ہے؟
کوئی مجھ کو بتلا دے، اِس فریب کا مقصد!

بارہا یہ سوچا ہے، اب بھی سوچتا ہوں یہ!
اِس مہیب جنگل میں، میری جستجو کیا ہے؟

کاش، کوئی شرما دے، میری اجنبیّت کو
کاش، کوئی لوٹا دے، میرا گمشدہ چہرہ
کتنا اجنبی ہوں میں
کتنا ناسمجھ ہوں میں
خود کو ڈھونڈتا ہوں میں
پُرفریب چہروں کے، اِس مہیب جنگل میں!

(بنگالی)

ظہیر نیازی

اُلجھن

ایک خرافاتی مادھوی جٹا میرے ہاتھ لگی اور
من پر سوچنے لگا کہ اس کا استعمال کیسے کروں؟ اچانک
ایک خرافات سوجھی۔ بیوی کو ڈراؤں تو کیسا رہے!

میری بیوی پرمیلا کو اس بات کا فخر ہے کہ وہ ایک
جدید عورت ہے۔ اگرچہ وہ جدیدیت کا مظاہرہ نہیں کرتی۔
گذشتہ تین برسوں کی ازدواجی زندگی میں کبھی اُسے یہ
بتانے کا موقع نہ ملا کہ اُس کے دل میں فرسودگی یا رجعت
پسندی کا بھی کوئی نرم گوشہ محفوظ ہے: وہ اپنے کو مردوں
کے بالکل برابر سمجھتی ہے! نہایت اعتماد کے ساتھ!!

میں نے سوچا، کیوں نہ آج اس کو آزما کے دیکھ ہی
لوں!

جٹا چھپا کر گھر کے اندر ایک بار گھوم آیا۔ پرمیلا گھر کے
پیچھے کی طرف کے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ
میں ایک خط تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے پوچھا۔

"کچھ چاہیئے کیا؟" اُس کا لہجہ بےحد سنجیدہ تھا!

"نہیں!" میں بولا: "خط کس کا ہے؟"

"پتا جی کا!"

"گھر میں خیریت ہے نا؟"

جواب میں اُس نے سرد لہجے میں گردن ہلا دی!

"آج شام کو مجھے جنکشن جانا پڑے گا! رات کو گیارہ
بجے کی ٹرین سے لوٹوں گا!"

"ٹھیک ہے!"

"رات گھر پر اکیلی رہوگی، ڈر تو نہیں لگے گا؟"

"ڈر؟" اس کی بھنویں تن گئیں: "مجھے ڈر نہیں لگتا!"

"اچھی بات ہے!" کہہ کر میں کمرے سے چلا آیا۔ لیکن
میرے دماغ میں کوئی انجانا سا شک کُلبلاتا رہا کہ پرمیلا
کی اس بےپناہ سنجیدگی کے پس منظر میں کون سا راز
مضمر ہے؟ ..... جو ہو، آج رات ہی اس راز
سے پردہ اُٹھ جائیگا!

رات کو ساڑھے گیارہ بجے ایک دوست کے
گھر جا کر مُنھ پر بھسم مل لی۔ اس کے بعد میں نے لمبا
ڈھیلا ڈھالا کرتہ اور جٹا زیب تن کر کے آئینے میں
شکل دیکھی۔

دوست نے ہنس کر کہا: "خوب بھیس بدلا ہے!
کس کافر کو شک ہوگا کہ تم ایک سنیاسی نہیں ہو! ایک
چلم گانجے کا کش لے لیتے تو....."

"نہیں! اس کی کبھی عادت نہیں!" میں نے کہا
اور وہاں سے نکل پڑا!

اپنے گھر کے سامنے پہنچا۔ دروازہ بند تھا۔ پیچھے کی
دیوار پھاند کر میں اندر داخل ہو گیا!

خوابگاہ میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ دروازے کے
باہر سے جھانک کر دیکھا۔ پرمیلا بتی کے سامنے آرام
کرسی پہ بیٹھ کر بڑے انہماک سے اُونی بنیائن بن

رہی تھی!

اچانک کمرے میں داخل ہو کر میں نے بناوٹی آواز لگائی: "ہر ہر مہادیو!"

پرمیلا کے ہاتھ سے پنائی کا سامان گر کر بکھر گیا۔ وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئی! اور چونک کر بولی: "کون؟"

میں ہو ہو کر کے ہنس پڑا! — "ہم شنکر! ہے چانڈی!"

پرمیلا آنکھیں پھاڑ کر، ٹھہری ہوئی نظروں سے مجھے گھورتی رہی! خائف ہو کر بھاگنے کی اس نے کوشش نہیں کی! اس کے بعد اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور بولی: "سُریش دا، تم اس بھیس میں کیوں؟" میں دم بخود! "سُریش دا! میں ایک سنیاسی ہوں، مجھے سُریش دا کیوں کہتی ہو؟"

پرمیلا لوٹتے لہجے میں بولی: "سُریش دا! میں نے تمہیں پہچان لیا ہے، لیکن تم آئے کیوں؟ میں نے تو تم سے کہا تھا، تم اور نہ آنا، پھر بھی......"

پورے جسم میں بجلی دوڑ گئی! سُریش کے ساتھ پرمیلا کی دوستی اس کے بچپن ہی سے تھی۔ شاید کچھ ایسے ویسے تعلقات بھی تھے! اس شخص کو میں پہلے سے ہی پسند نہیں کرتا تھا۔ پرمیلا سے اس کی کافی گہری قربت تھی۔ لیکن یہ قربت یہاں تک.... ؟

میں کچھ ٹوٹی ہوئی آواز میں بولا: "پرمیلا میں..."

پرمیلا نے اپنی دونوں مٹھیاں خوب باندھ کر آہستگی، لیکن بیدلی سے کہا: "نہیں، نہیں سُریش دا! تم جاؤ۔ اس جنم میں ہمارا رشتہ ختم ہو گیا۔ پہلے کی بات بھول جاؤ! اب میں تمہارے پاس نہیں آ سکوں گی!"

دانت پیستے ہوئے میں نے کہا۔

"پرمیلا! ایک دن کیلئے بھی کیا تم مجھ سے پیار..."

"پیار کرتی تھی! آج بھی کرتی ہوں۔ لیکن سُریش دا، تم اس وقت بھگوان کیلئے چلے جاؤ! وہ آ جائیں گے اور قیامت مچ جائے گی۔"

میں اس کے بالکل قریب چلا گیا، لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹی۔ مشتعل ہو کر وہ بولی: "نہیں جاؤ گے! میرے منہ پر کالکھ لگائے بغیر تم نہیں جاؤ گے؟.... میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں.... وہ ابھی آ جائیں گے! پھر بھی کھڑے ہو! اچھا اس بار جاؤ!...."

یک لخت اس نے میرے جسم سے چپٹے ہوئے ہونٹوں کو بوسہ دیا۔ "جاؤ پلیز!" میرا ہاتھ پکڑ کر وہ مجھ کو کمرے کے باہر لے گئی! میں ہکا بکا سا چل پڑا!

پیچھے کا دروازہ کھول کر پرمیلا نے کہا: "پھر کبھی ایسا پاگل پن نہ کرنا! اگر زیادہ بیقراری ہو تو خط لکھ دینا، وہ میرا خط نہیں پڑھتے! لیکن اس حال میں کبھی میرے پاس نہ آنا! یاد رکھنا میں جتنی بھی دور رہوں، تمہاری ہی ہوں، اور کسی کی نہیں!"

اندھیرے میں میں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا! لیکن ایسا محسوس ہوا کہ وہ رو پڑنے والی ہی تھی!

اپنے ہی گھر کے پیچھے کے دروازے سے چپ چاپ نکل پڑا — ! ہم کرتے ہاتھ چلے!

پرمیلا کے بوسے کو میں اپنے ہونٹوں پر زخم کی طرح محسوس کر رہا تھا جیسے اس نے بوسہ نہ لیا ہو، ڈنک مار دیا ہو کسی بچھو نے! اس کی باتیں اب بھی میرے سینے میں تیر کی طرح چبھ رہی تھیں! — "اس جنم میں ہمارا رشتہ ختم ہو گیا!" یہ اشارہ کس قسم کے رشتے کی طرف ہے؟ "پیار تھا، اب بھی ہے!" تو میرے ساتھ کیا ان تین برسوں میں صرف ناٹک رچایا جا رہا تھا؟ "میں تمہاری ہوں اور کسی کی نہیں!...."

دوست کے گھر لوٹنے پر اس نے پوچھا: "کہیے سنیاسی جی! کیسا استقبال ہوا؟"

میں نے جسم سے آزاد ہوتے ہوئے کہا: "اچھا!"

"خوف سے دانت بھینچ گئے تھے کیا؟"

"ہاں بھینچ گئے تھے! لیکن میرے!" میں نے اپنے

آپ سے کہا۔

میں نے جو کیا اچھا کیا۔ اس بہانے مجھے اُس کی تین سالہ اداکاری کا پتہ تو چل گیا! لیکن اب پرمیلا کو بھی پتہ چلے گا کہ ناٹک رچا کر دھوکے میں رکھنے کا انجام کیا ہوتا ہے۔ میں گھر چھوڑ کر کہیں اور چلا جاؤں گا! اس کے سوا ایک شریف آدمی اور کر بھی کیا سکتا ہے! .... اور پرمیلا۔ اپنے جدید کلچر کی آڑ لے کر اب بھی اسی فخر سے زندہ رہ سکتی ہے، تو رہے!

گھر پہونچ کر دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ پرمیلا نے آکر دروازہ کھولا۔ میں نے دیکھا اس کا چہرہ کسی بھی دغا و فریب سے پاک ہے! آنکھیں بھی پاک!!

"اتنی جلدی اسٹیشن سے کیسے لوٹ آئے؟ ٹرین آئے پانچ منٹ ہی تو ہوئے ہیں! میں نے ٹرین کی آواز سنی تھی!"

جوتے وغیرہ اتارتے ہوئے میں بولا "جلدی جلدی چلا آیا! تم اکیلی جو ہو!"

"کچھ کھاؤ گے؟ دودھ مٹھائی ڈھانک کے رکھی ہے میں نے!"

"نہیں، کھا کر آیا ہوں!" میں ٹیبل لیمپ کو تیز کرتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"سوئے نہیں کیا؟ بتی تیز کر دی؟"

میں تو اس کے اندر کچھ اور تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کی آنکھوں میں کسی بھی جرم و گناہ کی چھاپ نظر نہیں آ رہی تھی! میں نے کہا:۔

"تمھارا چہرہ اچھی طرح دیکھنے کیلئے روشنی تیز کر دی ہے!"

"کیوں میرا چہرہ پہلی بار دیکھ رہے ہو کیا؟"

"نہیں!" میں بولا "لیکن چہرہ کیا خواہش ہونے ہی پر دیکھا جاتا ہے؟ میرا چہرہ کیا تم دیکھ سکی ہو!"

"دیکھ سکی ہوں! اتنی رات گئے اوجھ پہیلی نہ بجھاؤ!

سو جاؤ، میں آتی ہوں!!"

پاس کے کمرے میں جا کر، کپڑے تبدیل کر کے وہ جلد ہی لوٹ آئی: "ابھی تک سوئے نہیں! شاید ٹھنڈ بھی نہیں لگتی! میں بیچ ٹھہری، اور کھڑی نہ رہ سکوں گی...." وہ مسکرائی:

"پرمیلا!"

مشتبہ نظروں سے دیکھتی ہوئی وہ بولی "کیا جی؟"

"نہیں کچھ نہیں...." میں بولا "رات زیادہ گذر چکی ہے، سو جانا ہی اچھا ہے!"

یک لخت پرمیلا نے کہا "آج شام کے بعد سانن گھومنے، ملنے کی غرض سے آئی تھی!"

"سانن؟"

"ہاں جی، ہاں! سانن، جسے تم مجھ سے شادی کے قبل چاہتے تھے! آج یاد بھی نہ رہی...."

"اُسے چاہتا نہیں تھا۔ وہ میرے بچپن کی دوست تھی بس!" میں بولا۔

"ایک ہی بات ہے! وہ دو تین دنوں سے اپنے میکے آئی ہوئی ہے آج یہاں آئی تو کئی باتیں ہوئیں!"

"کیا باتیں ہوئیں؟"

"تم ایک بار منہ پر کالکھ لگا کر، بھوت بن کر اس کے سونے کے کمرے میں گھس گئے تھے.... وہی کہانی سُنا رہی تھی!"

کچھ دیر کے بعد میں نے پوچھا "اور کیا کہا اس نے؟"

"اور بہت سی باتیں! اچھا آدھی رات گئے بے وقت، میں تم ایک جوان لڑکی کے کمرے میں کیوں گھس گئے تھے، بولو؟"

"ڈرانے کے لئے!"

"اور کوئی مطلب نہ تھا؟"

میں اب اٹھ بیٹھا۔ اسے پکارا۔ "پرمیلا!"

"کیا!"

(بقیہ صفحہ ۱۰۰ پر دیکھئے)

نازؔ قادری

آگہی، یوں ہے، کوئی زخمِ نہاں ہو جیسے
ایک کانٹا سا قریبِ رگِ جاں ہو جیسے

ابر! افلاک پہ آہوں کا دھواں ہو جیسے
برق! سوزِ غمِ دل شعلہ فشاں ہو جیسے

دامنِ گل پہ دمکتے ہوئے نایاب گہر
پھر کوئی میرے لیئے گریہ کناں ہو جیسے

قیدِ ہستی میں یہ محسوس ہوا ہے مجھ کو!
زندگی سلسلۂ آہ و فغاں ہو جیسے

یوں شہادت گہِ ہستی میں بچے ڈر ڈر کر
یہ جہاں کارگہِ شیشہ گراں ہو جیسے

میری تخئیل کی آغوش میں وہ پیکرِ ناز
دل کشی چاندنی کے ہالے سے عیاں ہو جیسے

اُن سے مل کر بھی مرے دل کو قرار آ نہ سکا
التفاتِ نگہِ ناز گراں ہو جیسے

فرحتؔ کیفی (مدراس)

جب وقت کی سانوں سے نکلتے ہیں شب و روز
سانچے میں غم و درد کے ڈھلتے ہیں شب و روز

منزل کی تمنا میں نکلتے ہیں شب و روز
گرتے ہیں شب و روز سنبھلتے ہیں شب و روز

بخشا انھیں سورج کی شعاعوں نے سلیقہ
حالات کے انگاروں پہ چلتے ہیں شب و روز

کیا بات ہے کیوں سانس تری پھول رہی ہے
لے ہم بھی ترے ساتھ ہی چلتے ہیں شب و روز

یہ مرثیۂ عہدِ گذشتہ تو نہیں ہے!
جو بات کھٹکتی ہے اُگلتے ہیں شب و روز

ہم ٹھہرے نئی منزلِ مقصود کے راہی
اس بات پہ کیوں رنگ بدلتے ہیں شب و روز؟

کس کس کو نئے خواب کی تعبیر بتائیں
کہنے پہ جو آتے ہیں تو جلتے ہیں شب و روز

عادلؔ ادیب

آہوں میں جگر سا داغ کیا ہے
طوفان کے رُخ پہ اِک دیا ہے

کلیوں کو مسل رہے ہیں گلچیں
اللہ! ستم کی انتہا ہے

اُمیدِ کرم! ستم گروں سے!!
کیوں ذہن ترا بھٹک رہا ہے؟

مُنہ پہ جو کھری کھری سنائے
اِس دَور میں کس کا حوصلا ہے؟

اِس دَور میں کیا بتائیں، انساں
سائے سے بھی اپنے ڈر رہا ہے

دُکھ درد کے باوجود عادل!
ہنستے ہوئے دن گذارتا ہے

ایرجؔ کاشمیری

اس عالمِ نفسا نفسی میں ہم چاک گریباں کیا ڈھونڈیں
آدابِ سخن معلوم نہیں، اندازِ سخنداں کیا ڈھونڈیں

احساس کے سانچے میں برسوں پستے آئے جذبے اپنے
دنیائے سکوں کی بزم کوئی اے گردشِ دوراں کیا ڈھونڈیں

ہر پھول ہے انگارہ جیسا، ہر شاخِ چمن سوکھی سوکھی
آغازِ گلستاں ٹھیک نہیں، انجامِ گلستاں کیا ڈھونڈیں

چاہت کی بہت تھی چاہ مگر، نفرت کے ہمیں کچھ جام ملے
بے دردوں کی اس دنیا میں ہم بے سرو ساماں کیا ڈھونڈیں

ہر زخمِ جگر مہکا مہکا: ہر داغِ وفا اُجلا اُجلا
اس برق و شرر کے طوفاں میں اک شمعِ فروزاں کیا ڈھونڈیں

ہر گوشہ سُونا سُونا ہے، ہر سمت برستی ہے وحشت
ویرانی گھر کی کم تو نہیں ہم دشت و بیاباں کیا ڈھونڈیں

اک دورِ طلاطم ہے برپا، جذبات کے گوشے گوشے میں
کیوں ہنگاموں کی فکر کریں اور شورشِ زنداں کیا ڈھونڈیں

ایرج سب شیخ و برہمن کے جھگڑے ہیں، دکھاوے کی باتیں
ہندو بن کر بھی کچھ نہ ملا، اب ہو کے مسلماں کیا ڈھونڈیں

ڈراما

اظہر افسر

غالب کے گھر ایک شام

مرزا غالب
منشی نبی بخش حقیر
حافظ نذیر علی
نیاز علی
ملازم اور ایک ۲۲ سالہ حسینہ

منظر

مرزا غالب کے مکان کا مردانہ حصّہ، قدیم طرز کا ایک خوبصورت دالان ہے، جس میں داہنی جانب تخت بچھا ہے۔ بائیں جانب نیچے اُجلی چاندنی کا فرش ہے۔ وسط میں زرد زمین والا بڑے بڑے کاسنی پھولوں کا عمدہ قالین ہے۔ قالین پر گاؤ تکیے رکھے ہیں اور ایک طرف سیاہ شیشم کا قلمدان ہے۔

پردہ اُٹھتا ہے تو مرزا غالب قلمدان کے اندر کچھ دیکھ رہے ہیں۔ غالب (عمر ۵۵ سال، کشیدہ قامت، چوڑا چکلا جسم۔ بھری بھری تل چاولی داڑھی، گورا رنگ، بڑی بڑی غلافی آنکھیں، سبزی مائل نقش، ململ کا انگرکھا سفید برکا پائجامہ زیب تن کئے ہوئے ہیں) بائیں جانب سے نیاز علی داخل ہوتا ہے۔ جس کی عمر ۳۵ سال ہے۔ دُبلا پتلا لمبا قد۔ معمولی کپڑے کا تنگ مہری کا پائجامہ، تکموں والا کرتہ، کرتے پر موٹے کپڑے کی سیاہ صدری پہنے ہے، داڑھی کالی ہے مونچھیں نہیں ہیں۔

نیاز علی:۔ حضور سررشتہ دار صاحب آئے ہیں۔

غالب:۔ کون؟ (قلمدان بند کرتے ہیں)

نیاز علی:۔ علاقہ کول کے منشی نبی بخش آئے ہیں

غالب:۔ اچھا بھئی، بلاؤ۔

(نیاز علی بلانے کے لئے بائیں جانب چلا جاتا ہے۔ پھر جب لوٹتا ہے تو ساتھ منشی نبی بخش حقیر، حافظ نذیر علی کا ہاتھ پکڑے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔ ایک ملازم بھی ہے جس کے سر پہ ایک ٹوکرا ہے، ٹوکرے میں ہری ہری گھاس بچھی ہے ملازم کے بدن پر معمولی کپڑے کا کرتہ، پائجامہ ہے۔ جس پر وہ کھاروے کی صدری پہنے ہے۔ گلے میں سیاہ تعویذ بندھا ہے۔ منشی نبی بخش جن کی عمر چالیس سال ہے، سیاہ داڑھی مونچھیں ہیں۔ تنگ مہری کا سفید پائجامہ اور آسمانی رنگ کا انگرکھا پہنے ہیں۔ لمبا قد ہے۔ پیروں میں سلیم شاہی جوتی ہے۔

حافظ نذیر علی کی عمر ۳۵ سال ہے، نابینا ہیں، سفید ململ کا کرتہ، سفید پائجامہ، ہلکی نیلی صدری۔ سر پر سفید دو پلڑی ٹوپی۔ پیروں میں پرانی گھیتلی جوتی پہنے ہیں۔ سیاہ فام ہیں۔ ہلکی ہلکی داڑھی ہے آواز بہت عمدہ ہے۔

(غالبؔ سب کو آتا دیکھ کر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں)

غالبؔ ۔۔ بھئی یہ کیا ؟

نبی بخش حقیر ۔۔ تسلیمات بجالاتا ہوں۔ آم ہیں۔

غالبؔ ۔۔ تسلیمات ! ، میں سمجھا کچھ اور ہے۔ توفیقِ خاص نہیں لطفِ عام ہے یعنی مُہر بند جام نہیں آم ہیں۔

(سب ہنستے ہیں۔ مگر ادب ملحوظ ہے)

(مُلازم ٹوکرا نیچے رکھتا ہے، مرزا غالبؔ جھک کر ٹوکرے میں سے گھاس ہٹا کر ایک بڑا سا آم نکالتے ہیں)

غالبؔ ۔۔ واہ واہ، سبحان اللہ۔ ایک ایک آم کو سربمُہر گلاس سمجھیئے۔ لیکور سے بھرا ہوا اور پھر کس حکمت سے بھرا ہوا ہے کہ سَو گلاسوں میں سے ایک قطرہ اِدھر سے اُدھر نہیں ہوا۔

نبی بخش ۔۔ جی، یہ لیکور کیا ہے ۔ ؟

غالبؔ ۔۔ تم نہیں جانوگے۔ لیکور ایک انگریزی شراب ہے" قوام کی بہت لطیف اور رنگت کی بہت خوب، اور طعم کی ایسی میٹھی جیسے قند کا پتلا قوام،

نبی بخش ۔۔۔ خوب

غالبؔ ۔۔ دیکھو، یہ لغت کسی فرہنگ میں نہ پاؤ گے۔ ہاں فرہنگ سروری میں ہو تو ہو، مگر بھائی میں تمہاری اس تکلیف اور تکلّف سے خوش نہیں ہوا۔ (ملازم چلا جاتا ہے۔)

حافظ ۔۔ تسلیمات بجالاتا ہوں،

غالبؔ ۔۔ تسلیمات، حافظ صاحب !

نبی بخش ۔۔ یہ حافظ نذیر علی ہیں آپ سے ملنے اور آپ کو آپ ہی کا کلام سُنانے کے مشتاق ہیں۔

غالبؔ ۔۔ " کس مُنہ سے شکر کیجیئے اِس لطفِ خاص کا "
لیکن یہ آم . . . . .

نبی بخش ۔۔ وہ تو اکبر میں اسب جانتے ہیں آم آپ کو نہایت مرغوب ہیں۔ اِس لئے . . . . .،

غالبؔ ۔۔ (لمبا سانس لیتے ہیں) سچ کہتے ہو، دوست دُور دُور سے عمدہ عمدہ آم بھیجتے ہیں۔ میں خود تقاضہ کر کے منگواتا ہوں، بازار سے خریدتا ہوں، مگر آموں سے طبیعت سیر نہیں ہوتی (مسکراتے ہیں) آم ٹوکرے میں رکھ دیتے ہیں۔ نیاز علی ٹوکرا اُٹھا کر دائیں جانب اندر لے جاتا ہے۔)

غالبؔ ۔۔ آپ حضرات تشریف تو رکھیں۔

(غالبؔ تلوان سے قریب اور منشی نبی بخش دائیں جانب اور نبی بخش سے قریب حافظ نذیر علی بیٹھ جاتے ہیں)

غالبؔ ۔۔ سررشتہ دار صاحب، آم میں دو باتیں ہونی چاہئیں

نبی بخش ۔۔ جی حضرت، کون کون سی ؟

غالبؔ ۔۔ میٹھا ہو اور بہت ہو۔

(سب ہنستے ہیں)

نبی بخش ۔۔ حافظ نذیر علی میرے آگرے کے دوست ہیں، تاج گنج میں رہتے تھے۔ اب میرے ساتھ کول میں ہیں، جہاں میں ملازم ہوں، آپ کی بیسیوں غزلیں وردِ زبان ہیں۔ اور آواز بھی خوب پائی ہے۔

غالبؔ ۔۔ بھئی حقیر، تمہارا ہی تو شعر ہے ؎

دَیر میں ہے ذکر اپنا، کعبہ میں بیاں اپنا
ایک ہم ہیں اور چرچا ہے کہاں کہاں اپنا

نبی بخش ۔۔ جی بے شک، حافظ صاحب کچھ سُنایئے۔

(نذیر علی نہایت عمدہ آواز میں غالبؔ کی یہ غزل سُناتا ہے)

مدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے
پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

پھر وضعِ احتیاط سے رُکنے لگا ہے دَم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے
پھر چاہتا ہوں نامۂ دِل دار کھولنا
جاں، نذرِ دِل فریبیٔ عنواں کئے ہوئے

ایک حسین آواز :۔ مرزا صاحب

نذیر علی :۔ چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سُرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے
جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے
غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیّۂ طوفاں کئے ہوئے

(نبی بخش حقیر سر دُھن رہے ہیں۔ مرزا غالب خاموش سر جھکائے سُن رہے ہیں)

(جب غزل ختم ہوتی ہے تو ....)

غالب :۔ سبحان اللہ حافظ جی، خوب،

(حافظ نذیر علی تسلیمات بجا لاتے ہیں)

غالب :۔ پچھلی عید پر جب میں قصیدہ لکھ کر لے گیا تھا، حضور بادشاہ سلامت نے بڑی قدر افزائی فرمائی۔

نذیر علی :۔ جی۔!

غالب :۔ جب میں قصیدہ پڑھ چکا تو ارشاد ہوا کہ مرزا، تم پڑھتے خوب ہو۔

نذیر علی :۔ سبحان اللہ۔

غالب :۔ خدا نے میری بیکسی اور تنہائی پر رحم کیا۔ اور ایک ایسے شخص کو میرے پاس بھیج دیا۔ جو میرے زخموں کا مرہم اور میرے درد کا درماں اپنے ساتھ لایا ہے اور جس نے میری اندھیری رات کو روشن کر دیا۔ اُس نے اپنی باتوں سے ایک ایسی شمع روشن کی، جس کی روشنی میں میں نے اپنے کلام کی خوبی کو جو تیرہ بختی کے اندھیرے میں خود میری نگاہ سے مخفی تھی۔ دیکھی۔ میں حیران ہوں کہ اِس فرزانۂ یگانہ . . .

نذیر علی :۔ یعنی۔ ؟

غالب :۔ یعنی منشی نبی بخش کو کس درجہ کی سخن فہمی اور سخن سنجی عنایت ہوئی ہے۔ حالانکہ میں شعر کہتا ہوں اور شعر کہنا جانتا ہوں، مگر جب تک میں نے اِس بزرگوار کو نہیں دیکھا، یہ نہیں سمجھا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے۔ اور سخن فہم کس کو کہتے ہیں۔ مشہور ہے کہ خدا نے حُسن کے دو حصّے کئے۔ آدھا یوسفؑ کو دیا اور آدھا تمام بنی نوعِ اِنسان کو، کچھ تعجب نہیں کہ فہمِ سخن اور ذوقِ معنیٰ کے بھی دو حصّے کئے گئے ہوں۔

نذیر علی :۔ جی۔!

غالب :۔ آدھا نبی بخش کے اور آدھا تمام دُنیا کے حِصّہ میں آیا ہو۔

(منشی نبی بخش سر جھکائے بیٹھے ہیں)

نذیر علی :۔ سبحان اللہ -!

غالب :۔ حافظ صاحب، زمانہ اور آسمان میرا کیسا ہی مخالف ہو، میں اِس شخص کی دوستی کی بدولت سارے زمانے کی دشمنی سے بے فکر ہوں، اور اِس نعمت پر دنیا سے قانع،

نذیر علی :۔ سبحان اللہ، سبحان اللہ۔!

نبی بخش :۔ حضور جو نہیں سمجھتے، نہیں سمجھتے میرے حقیر خیال میں آپ کے سارے اشعار ایسے تہہ دار ہیں کہ لہجے کی تبدیلی یا طبیعت پر زور دینے سے ایک ایک شعر کے کئی کئی مطالب برآمد ہوتے ہیں۔ اور جو سمجھتا ہے وہ سمجھتا ہے۔

غالب :۔ گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا تھا۔ اُن ہی دِنوں فارسی میں کچھ شعر موزوں کئے تھے۔ جب میں نے وہ شعر اپنے اُستاد شیخ معظم کو سُنائے تو اُنہوں نے کہا یہ کیا مہمل ردیف اختیار کی ہے، ایسے بے معنی شعر کہنے سے کچھ فائدہ نہیں۔

نبی بخش :۔ جی۔!

غالب ۔ میں اُس وقت تو پشیمان ہو کر چپ ہو رہا۔ ایک دِن مُلّا ظہوری کے کلام میں ایک شعر نظر پڑ گیا، جس کے آخر میں وہی ردیف تھی۔ جو میں نے غزل میں استعمال کی تھی۔ وہ کتاب لے کر دوڑا دوڑا میں اپنے اُستاد کے پاس پہنچا۔ اور وہ شعر دکھایا۔

نبی بخش ۔ جی ۔!

غالب ۔ اُستاد شیخ معظم شعر دیکھ کر حیران رہ گئے اور بولے، تم کو شعر و ادب سے خداداد مناسبت ہے تم ضرور فکرِ شعر کیا کرو۔ اور کسی کے اعتراض کی کچھ پروا نہ کرو۔

نبی بخش ۔ اسی لئے ؎

آج مجھ سا نہیں زمانے میں
شاعرِ نغمہ گو و خوش رفتار

(شام کا اندھیرا بڑھنے لگا ہے۔ دائیں جانب سے نیاز علی قدیم وضع کا شمعدان لئے داخل ہوتا ہے۔ اور محراب میں رکھ دیتا ہے)
(اسٹیج پھر سے روشن ہو جاتا ہے)

ایک حسین آواز ۔ (پھر سنائی دیتی ہے) مرزا صاحب ۔!
(بائیں جانب سے نیاز علی نہایت چمکدار چاندی کا حُقہ مع پیچوان لاتا ہے اور مرزا صاحب کے قریب رکھ دیتا ہے۔ اور چلا جاتا ہے)

غالب ۔ (چہرے پر فکر کے آثار ہیں) ؎

رکھیو غالبؔ مجھے اِس تلخ نوائی سے معاف
آج کچھ درد مرے دِل میں سوا ہوتا ہے

نبی بخش ۔ اب اجازت دیجئے۔

غالب ۔ اچھا بھئی۔
(منشی نبی بخش حقیر اور حافظ نذیر علی بائیں جانب بڑھتے ہیں۔ مرزا غالب بھی اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور محراب سے شمعدان لے کر بائیں جانب چلتے ہیں)

نبی بخش ۔ قبلہ آپ کیوں تکلیف فرماتے ہیں، ہم اپنا جُوتہ آپ پہن لیں گے۔

غالب ۔ (مسکراتے ہیں) میں آپ کا جُوتہ دکھانے کو شمعدان نہیں لایا بلکہ اِس لئے لایا ہوں کہ کہیں آپ میرا جُوتہ نہ پہن جائیں۔
(فضا پھر قہقہہ بدوش ہو جاتی ہے)
(منشی نبی بخش اور حافظ نذیر علی، تسلیمات بجالاتے ہوئے رخصت ہو جاتے ہیں)
(مرزا غالب شمعدان لئے واپس لوٹتے ہیں اور محراب میں رکھ دیتے ہیں۔ پھر گاؤ تکیے سے لگ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور حُقے کی نَے سنبھال لیتے ہیں۔ دو کش لیتے ہیں کہ سامنے بائیں جانب بیس بائیس سال کی ایک حسینہ زرد رنگ کا لمبی آستینوں والا کرتہ، سُرخ گلبدن کا پائجامہ کالے مخمل کی صدری اور دھانی دوپٹہ اوڑھے کھڑی نظر آتی ہے ۔ پھر غائب ہو جاتی ہے)

غالب ۔ (حُقہ کا کش لیتے ہیں) ؎

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سُرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

(پسِ منظر آواز اُبھرتی ہے)

آواز ۔ جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

(پردہ گرتا ہے)

حاشیے

ڈاکٹر محمد حسن

انگریزی میں اُردو ادب کی پیشکش کے مسائل

انگریزی زبان میں اُردو اَدب کے نمونے اور اُن کے بارے میں معلومات کا ذخیرہ ابھی تک وافر نہیں ہے۔ پچھلے بائیس سال میں اُردو ادب میں انگریزی داں طبقے کی دلچسپی بڑھی ہے۔ اِس طبقے میں دو قسم کے گروہ شامل ہیں۔ ایک وہ غیر اُردو داں ہندوستانی جو دوسری ہندوستانی زبانوں کے اَدب تک محض انگریزی ہی کے ذریعے رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اِن کے لئے وہ مُلک اور تہذیب تو مکمل طور پر اجنبی نہیں ہے۔ جو اُردو ادب میں ظاہر ہوتی ہے اُردو کی ادبی روایت سے البتّہ وہ بے خبر ہیں۔ دوسرا گروہ اُن غیر ملکیوں کا خصوصاً انگلستان، امریکہ کے انگریزی دانوں کا ہے۔ جو اُردو زبان ہی سے ناواقف نہیں، بلکہ اس تہذیب اور طرزِ فکر سے بھی اجنبی ہیں۔ اُن کے لئے اُردو ایک نئے تہذیبی سیاق و سباق کی حیثیت رکھتی ہے۔ جیسے وہ اپنے طور پر اور شاید صرف اپنے زاویئے ہی سے سمجھ سکتے ہیں۔ اِس لئے یہ تعجّب کی بات نہیں ہے کہ انگریزی ترجموں میں اکثر ایسے غیر ملکی شاعر اور ادیب مقبول ہوئے ہیں۔ جو خود اپنی زبان اور ادب میں صفِ اوّل میں شمار نہیں کئے جاتے تھے۔ دراصل اس صورتِ حال میں اصل مسئلہ نئے تہذیبی سیاق میں کسی زبان کے ادب کو پیش کرنے کا نہیں رہ جاتا۔ بلکہ اِس کی ہمہ جہتی اور عصری معنویت کا بھی ہے۔ اپنے دَور کا عظیم سے عظیم ادب اور ادیب اگر آج عصری معنویت نہیں رکھتا تو اُس کی حیثیت آثارِ قدیمہ کے گرد آلود یادگار کی تو ہو سکتی ہے۔ زندہ اَدب پارے کی نہیں ہو سکتی۔ یہ ایسا لہو ہے جس کا رگوں میں دوڑتا پھرنا ہی کافی نہیں ہے، آنکھ سے ٹپکنا بھی ضروری ہے۔

لہٰذا انگریزی میں اُردو ادب کے ترجمے یا اِس کے بارے میں معلومات فراہم کرنے والوں کے لئے بنیادی مسئلہ محض اردو ادب کو جوں کا توں انگریزی میں پیش کرنے کا نہیں۔ اِسے مختلف تہذیبی چوکھٹے میں رکھ کر مختلف تہذیبی اقدار اور مختلف تاثراتی ردِّ عمل رکھنے والے قارئین کے لئے پیش کرنے کا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر تہذیب کی اپنی انفرادیت ہوتی ہے اور ادب اور تہذیب کا رشتہ جسم اور لباس کا نہیں جسم و جاں کا ہے۔ قالب کا بدلنا لباس کا بدلنا نہیں۔ اِس تبدیلی کے عمل میں روح کو گزند پہنچنے کا خطرہ بھی ہے اور جان سے گزر جانے کا بھی، جو پورے ادب پارے کو بے جان اور بے روح کر سکتا ہے۔ ابھی اللہ مترجمین کو تاراج کنندہ کہا گیا ہے، اِس غدّاری اور تاراجی کے داغ دھبّوں سے کون سی زبان اور کون سا ادب مبرّا ہے۔ مگر پھر بھی آج کی سکڑتی ہوئی دنیا میں ترجمے کے بغیر چارہ ہی کیا ہے؟۔ رفتار نے زمین کی طنابیں کھینچ دی ہیں۔ اور دنیا میں بکھری ہوئی تہذیبی اکائیاں ایک دوسرے کے خواب و خیال، جذبے اور احساس کی زبان کو سمجھنے کے لئے بیقرار ہیں۔ ایشیا کا سویا ہوا برِّاعظم جاگ رہا ہے، اور اگر کبھی دنیا عالمگیر وفاقی اور وحدانی نظام کی طرف بڑھی تو ایشیا اور افریقہ کے نام نہاد پس ماندہ علاقے، اُن کی تہذیبیں اور اُن کے ادب کو بھی عالمگیر سطح پر اپنا تاریخی فریضہ ادا کرنے کا موقع ملے گا۔!

اِس پس منظر میں اگر اُردو والے اپنے ادب کی جامع مسجد کی سیڑھیوں اور اہلِ لکھنؤ، حیدرآباد، اور عظیم آباد کے مقامی دائروں سے نکال کر اسے بین الاقوامی سطح اور عالمی پس منظر میں نہ رکھ سکے تو یہ ہمارے دَور کے تہذیبی اَلمیے سے کم نہ ہوگا۔ ہر ادب آج عالمی اَدب کا حصّہ بھی ہے اور بین الاقوامی تہذیب کی اَمانت بھی۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے جس طرح ہماری شاعری کو عالمی ادبیات کے پس منظر میں اور غالبؔ کو شیکسپیئر اور گوئٹے کے کائناتی شعور کے پہلو بہ پہلو رکھ کر دیکھنے کی جو روایت قائم

کی تھی اُس کا مذاق اُڑانا آسان ہے، مگر اُسے سمجھنا اور جذباتیت ہٹا کر اُسے آگے بڑھانا دشوار بھی ہے اور ضروری بھی۔ اُردو دنیا ابھی عصرِ حاضر کے اس تقاضے کو پورا کرنے میں بڑی حد تک ناکام رہی ہے اور اس کام کو پورا کرنے کے لئے بجنوری کے اندازِ نظر کی ایک نئے زاویئے سے تطہیر اور توسیع درکار ہے۔

یہاں بنیادی سوال یہ اُٹھتا ہے کہ انگریزی میں اُردو اَدب کے بارے میں خصوصاً مغربی قارئین کے لئے لکھتے ہوئے ہمیں کون سا رویّہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اگر ہم محض مغربی قارئین کی نظر سے اپنے ادب کو پرکھتے ہیں تو عین ممکن ہے کہ ہم اپنے ادب کی تصویر ہی مسخ کر دیں۔ یا تو اس میں ایسی خصوصیات اور اقدار تلاش کریں جو اِس میں موجود ہی نہیں ہیں۔ یا ایسے معائب ڈھونڈھ نکالیں جو صرف ہمارے نقطۂ نظر ہی کی دین ہیں۔ دونوں صورتوں میں ہم اُردو ادب کی صحیح تصویر پیش کرنے سے قاصر رہیں گے۔ یا پھر یہ صورت اختیار کی جائے کہ اپنے ادب سے بنیادی وفاداری قائم رکھیں۔ اور اسے جوں کا توں ترجمے اور تبصرے کے ذریعہ پیش کیا جائے۔ اِس صورت میں قباحت یہ ہے کہ ہماری ترجیحات کا معیار اور انداز ممکن ہے۔ ہمارے مغربی قاری کے لئے قابلِ قبول نہ ہو اور ہم اپنے ادب میں اس کی دلچسپی میں اضافہ کرنے کے لئے اُس دلچسپی کو فنا کر دیں کیونکہ ادب معلومات کی تلاش میں نہیں بلکہ کیفیت کی تلاش کے لئے پڑھا جاتا ہے۔

ظاہر ہے انگریزی میں اُردو اَدب کے بارے میں لکھتے ہوئے اُردو ادب کے ہر طالبِ علم کے لئے دو باتیں لازمی ہونگی۔ پہلی یہ کہ اپنے ادب کی اقدار، فضا اور کیفیت کو پوری دیانت داری اور سچائی کے ساتھ انگریزی میں پیش کیا جائے اور ظاہر ہے کہ اس کے معیار اپنی ادبی روایت ہی کے راستے سے آئیں گے۔ ہمیں بار بار یہ سوچنا ہوگا کہ ہمارے ادب میں ایسی کون سی منفرد خصوصیات ہیں۔ جو اُسے دوسری اَدبیات سے ممتاز کرتی ہیں۔ جن کے ذریعہ ہم عالمی اَدب کو کچھ دے سکتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ ہمارے پورے ذخیرے میں ایسی کوئی خوبی یا خصوصیت نہ ہو، جو عالمی ادب کے لئے تحفہ نہ بن سکتی ہو۔ مگر ابھی تک ہم ادبی یکسانیت اور مرعوبیت کا شکار رہے ہیں۔

عالمی ادب میں اپنی انفرادیت کا پورا عرفان ہنوز ہمیں حاصل نہیں ہو سکا ہے اگر یہ حاصل ہو جائے تو پھر شاید کلیم الدین احمد صاحب بھی غزل پر شرمندہ ہونے کے بجائے غزل کو ہماری تہذیبی انفرادیت کے نشان کے طور پر پیش کر سکیں گے۔ مختلف ہونا عیب نہیں ہے، کیونکہ اختلاف سے تنوّع اور رنگا رنگی پیدا ہوتی ہے۔ اور تھکا دینے والی یکسانیت تہذیب کی رنگ برنگی قوسِ قزح میں بدل جاتی ہے، اپنے ادب کا محض ہمدردانہ نہیں عارفانہ مطالعہ بھی ضروری ہے۔ اور اس پر مانگے کے معیاروں کا اطلاق کرنے سے پہلے اِس کے اپنے پیمانوں کو سمجھنا اور اُس کے من میں ڈوب کر سراغِ زندگی پانا اس کی اپنی اقدار کو پہچاننا اور اس کے اپنے تہذیبی فکری اور ادبی مزاج کی نشاندہی بھی ضروری ہے۔

دوسرے اِسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی لازم ہے کہ بین الاقوامی ادب کے اعلیٰ معیاروں پر ہم اپنے ادب کو برابر پرکھتے رہیں اِس نظر سے اپنے ادب کو دیکھیں، کہ منفرد اور مختلف ہونے کے باوجود اس کے کون سے جواہر پارے ایسے ہیں جو عالمی سطح کے ہیں۔ مغربی قاری کو بنیادی طور پر انہیں مختلف اور منفرد جواہر پاروں سے دلچسپی ہے اور انہیں منتخب کرکے تازگی اور ندرت کے ساتھ مغرب کے سامنے پیش کیا جانا چاہیئے۔ اُردو والوں کے سامنے پڑھنے والوں کا ایک بین الاقوامی حلقہ پھیلتا جا رہا ہے۔ اور اِس حلقہ تک اپنی بات کو تصنیف اور ترجمے کے ذریعے پہنچانا ایک بڑا اہم تہذیبی کام ہے۔ جو اُردو دنیا کے لئے نئے اِمکانات اور نئی ذمہ داریوں کا پیش خیمہ بھی ہے۔

▲

مکتوبات

"غالب ـــ اُردو کا پہلا ترقی پسند شاعر" کے عنوان سے جولائی ۱۹۶۹ء کے "شاعر" میں میرا ایک تنقیدی مضمون شائع ہوا تھا۔ اُس کے جواب میں ایک مضمون جنوری، فروری ۱۹۷۰ء کے مشترکہ "شاعر" میں نظر سے گزرا جس کا عنوان تھا "غالب اور ترقی پسندی: ایک غلط فہمی کا ازالہ"۔ میں اس ضمن میں چند اُمور کو اجمالاً بیان کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

۱۔ جوابی مضمون کی نوعیت میرے مضمون پر تبصرہ کی ہے۔ نہ کہ غالب کی ترقی پسندی پر تنقید کی!، اس لئے ہم اُسے مضمون تو کہہ سکتے ہیں مقالہ نہیں۔ کیونکہ مضمون طنزیہ بھی ہو سکتا ہے، مزاحیہ بھی۔ علمی اور تنقیدی بھی۔ تبصرہ کی صورت بھی اختیار کر سکتا ہے، جبکہ مقالہ میں موضوع کی معقولیت، بیان کی سنجیدگی اور ایک ٹھوس اور منطقی استدلال ہوتا ہے۔ اگر تبصرہ کو بھی مقالہ کہا جائے تو مضمون اور مقالے کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں شفیق الرحمٰن اور کنہیا لال کپور کو بھی مقالہ نگار تسلیم کرنا ہوگا۔ جبکہ یہ حقیقت پر مبنی نہیں ہوگا۔

۲۔ جوابی مضمون کو پڑھنے کے بعد یوں گمان ہوا کہ مضمون نگار نے میرے مضمون کو بغور پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ نتیجۃً خود بعض غلط فہمیوں میں مبتلا ہو گئے۔ اِن غلط فہمیوں نے جہاں اُن کے لہجہ کو جارحانہ بنا دیا ہے۔ وہاں وہ بہت سی غیر متعلق باتیں بھی کہہ گئے ہیں اور اُن کے طریقِ استدلال پر بھی اس کا اثر پڑا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ "پروفیسر صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے وقت نہ تو قینچی سے کام لیا ہے اور نہ ہی دانتوں سے بلکہ ناخنوں سے اُن کی دھجیاں اُڑائی ہیں۔" یہ انداز نہ صرف جارحانہ ہے بلکہ اِسے تنقید کا لہجہ اور طرزِ استدلال بھی نہیں کہہ سکتے۔ اِسی طرح مضمون نگار نے اپنے مضمون کے دوسرے پیراگراف کے جملوں میں نامناسب افعال استعمال کئے ہیں۔ یعنی کوستا ہے، آنسو بہاتا ہے۔ بھرم کھولتا ہے، سطریں کی سطریں سیاہ کرتا ہے۔ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ اِس کو ہم تنقیدی زبان نہیں کہہ سکتے۔ اب غیر متعلق باتوں کی چند مثالیں بھی دیکھئے۔ لکھتے ہیں۔ "جب غالب پر کیا گیا اتنا تنقیدی کام قابلِ اعتنا نہیں تو دوسرے شعراء اور اُدباء جو ناقدین کی مخصوص نگاہِ التفات سے محروم ہیں۔ کس سے اپنی محرومیٔ قسمت کی شکایت کریں۔" بات ہو رہی تھی غالب کی، مگر مضمون نگار دوسروں کی محرومیٔ قسمت کی شکایت لے بیٹھے۔ پھر یہ انداز قناعت پسندانہ ہے، کہ چلو غالب پر لکھا تو گیا، کوئی مضائقہ نہیں اگر وہ غیر معیاری ہے! ـــ اِسی طرح جب وہ کہتے ہیں کہ امانت کی یاد تازہ ہو گئی تو یہ یاد بے موقع اور غیر ضروری طور پر تازہ ہوتی ہے، جس کی وضاحت میں نے آگے کی ہے، لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اگر کسی کی یاد تازہ ہو جائے تو اس میں حرج یا نقصان کیا ہے؟ دوسرے مضمون نگار کا منشا کیا ہے۔ میری تحسین یا امانت کی تحقیر؟۔ اگر امانت کی تحقیر مقصود ہے تو مناسب نہیں، کیونکہ شبلی جیسے عالم نے تملیح کہنے کو فنونِ اَدبیہ میں شمار کیا ہے۔ پھر "ایسا لگا جیسے ہم کسی خانقاہ سے نکل کر کسی خلوت گاہ میں داخل ہو گئے ہوں۔" یہ جملہ غیر متعلق اور الہامی ہے!۔

۳۔ مضمون نگار نے جگہ جگہ لکھا ہے کہ میں نے غالب کو ترقی پسند شاعر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، جبکہ اس طرح کی وکالت سے گریز کر کے میں نے غالب کو اپنے طور پر ترقی پسند شاعر سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ میرے مضمون کا ایک جملہ ہے۔ "القصّہ یہ بات اب واضح ہو گئی کہ غالب کن معنوں میں ترقی پسند تھا۔"

۴۔ مضمون نگار نے دوسرے پیراگراف میں جو کچھ لکھا ہے اُس کے جواب میں عرض کروں کہ میں نے اپنا مضمون غالب صدی کی تقریبات کے موقع پر لکھا تھا جبکہ ہر طرف یہی کوشش

ہو رہی تھی کہ غالب کی شاعری کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ اُس کا حق ادا کیا جائے۔ تقریبات منا کر بھی اور غالب پر تنقیدی اَدَب مہیا کر کے بھی، ایسے موقع پر بعض تلخ اور باہم مربوط حقائق کا اظہار اس نیک نیتی کے ساتھ کہ وہ غالب پر آئندہ کئے جانے والے کام کے سلسلے میں ممد ثابت ہو سکے، وقت، اُردو ادب، اور غالب کی شاعری کا ایک اہم تقاضا تھا جس سے عہدہ برآ ہونے کی میں نے اپنی سی کوشش کی۔ مگر مضمون نگار ان باتوں میں ربط تلاش نہیں کر سکے۔ نتیجتہً یہ کہنے پر مجبور ہو گئے۔ "پورا مقالہ پڑھ لینے کے بعد بھی یہ واضح نہیں ہوتا کہ مقالہ نگار کیا کہنا چاہتا ہے" اگر واقعی وہ نہیں سمجھ سکے تو اپنے مضمون میں آگے چل کر جو اعتراضات اُنہوں نے مزے لے لے کر کئے ہیں، اُن کی بُنیاد کیا ہے۔؟

۵۔ مضمون نگار نے اِبتداء میں کہا ہے کہ میرا مقالہ شدید طور پر تناقص کا شکار ہو گیا ہے۔ اُس کے بعد یہ مثال دی ہے کہ میں ایک طرف تو جانبدارانہ تنقید کو مضحکہ خیز بتاتا ہوں اور ساتھ ہی بجنوری کی حمایت بھی کرتا ہوں۔ یہ دو باتیں اُنہیں متناقض اِس لئے معلوم ہوتی ہیں کہ بجنوری کی تنقید اُن کے نزدیک جانبدارانہ ہے۔ مگر میں نے اپنے مضمون میں وضاحت کر دی ہے کہ میں بجنوری کی تنقید کو جانبدارانہ نہیں سمجھتا۔ اور جہاں میں نے جانبدارانہ تنقید کا مضحکہ اُڑایا ہے تو کہیں بھی بجنوری کا نام نہیں لیا۔ میرا رُوئے سخن دوسرے نقادوں کی طرف ہے۔ اِس لئے تناقض کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اِسی طرح مضمون نگار کو میرے ان دو بیانات میں بھی تناقض نظر آتا ہے کہ میں اِس کا اعتراف کرتا ہوں کہ غالب پر سب سے زیادہ لکھا گیا ہے اور یہ بھی کہتا ہوں کہ غالب پر لکھی گئی تنقیدیں مایوس کُن اور غیر معیاری ہیں۔ دراصل یہاں مضمون نگار نے کیفیت اور کمیت کو خلط ملط کر دیا ہے۔ غالب پر کثرت سے لکھے جانے کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں غالب کی عظمت کا احساس ہے۔ لیکن یہ ایک جُداگانہ بات ہے کہ اُن تنقیدوں کا معیار کیا ہے۔ اور ہم نے اِس احساس کا حق کہاں تک ادا کیا ہے؟ — اور اب میرے یہاں تناقض ڈھونڈھنے والے کے یہاں بھی تناقض کی دو ایک مثالیں مُلاحظہ ہوں — مضمون نگار میری دو باتوں کو تسلیم کرتے ہیں کہ اُردو کو گنتی کے اہلِ ذوق ملے ہیں۔ دوسرے اُردو ناقدین لفّاظی کا شکار ہیں۔ اِس کے باوجود وہ میرے اِس خیال سے متفق نہیں ہیں کہ غالب پر کیا گیا تنقیدی کام غیر معیاری اور مایوس کُن ہے یا — ایک طرف مضمون نگار کہتے ہیں۔ "جہاں تک MATTER کا تعلق ہے بلاشبہ ہمیں غالب کے یہاں روایتی رُجحانات اور تقلید کے خلاف بغاوت واضح طور پر محسوس ہوتی ہے۔" اور پھر (واضح طور پر کہنے کے بعد) اپنے اِس خیال کی تردید بھی کرتے ہیں یہ کہہ کر "وہ خصوصیات جو جدید نقادوں نے صرف غالب ہی سے مختص کر دی ہیں۔ غالب کے پہلے کے شعراء کے یہاں بھی ملتی ہیں۔"

۶۔ میں نے غالب کی عظمت کے دو مظاہر بتائے تھے۔ یعنی وہ سیکڑوں کتابیں اور مقالے جو غالب پر لکھے گئے۔ اور جشنِ غالب کی مساعیِ جمیلہ، مضمون نگار کو اِس سے اتفاق نہیں ہے، بہتر ہوتا اگر وہ خود اُن مظاہر کی نشان دہی کر دیتے جن کے تحت غالب عظیم ہیں۔ رہ گیا اُن کا یہ کہنا کہ آتش و مومن پر اگر غالب سے کم لکھا گیا ہے۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُنہوں نے اپنی عظمت منوانے کے لئے عوام اور شعراء کے دِلوں میں ایسی کوئی تحریک پیدا نہیں کی تو بندہ پرور، عوام اور شعراء کے دِلوں کی تحریک اِنہی دو مظاہر کے تحت سامنے آتی ہے جن کا میں نے غالب کے ضمن میں ذکر کیا۔ ورنہ "شاعر" راجندر سنگھ بیدی یا کسی اور افسانہ نگار کو چھوڑ کر کرشن چندر نمبر کیوں شائع کرتا — ؟ اس مثال سے بھی واضح ہوتا ہے کہ آتش و مومن اور اُن جیسے دسیوں شعراء نے ایسی کوئی تحریک عوام اور اُدباء میں پیدا نہیں کی۔ علاوہ بریں عظیم شعراء کی فہرست طویل نہیں ہوا کرتی ورنہ عظمت کا تصوّر ہی مسخ ہو جائے۔

۷۔ مضمون نگار کا کہنا ہے کہ میں نے اپنے مقالے میں بعض قطعی دعوے کئے ہیں، یہ دُرست نہیں۔ اگر میں نے یہ سوال اُٹھایا کہ کتنے پروفیسروں نے سرسری طور پر ہی سہی، دیوانِ غالب کو اِبتداء سے آخر تک پڑھا ہے تو اِس کا مطلب صرف اِس قدر تھا کہ ایسے پروفیسروں کی تعداد کم ہے۔

ظاہر ہے یہ کوئی قطعی دعویٰ نہیں۔ اِس کے برخلاف خود مضمون نگار نے بعض قطعی دعوے کئے ہیں۔ مثلاً اُن کا یہ کہنا کہ میں نے دو چار پروفیسروں کا سرسری مطالعہ کرکے تمام پروفیسروں کے متعلق ایک رائے قائم کرلی۔" دو چار" کی قطعیت ملاحظہ ہو۔ "تمام" کی وضاحت ابھی میں نے کی ہے۔ اِسی طرح بعض اور جملے بھی ہیں۔ جیسے "اردو داں طبقوں خصوصاً اُردو ناقدین میں ایک عام مرض ہے کہ وہ قارئین کو مرعوب کرنے اور اپنی لامحدود قابلیت کے اظہار کے لئے انگریزی اُدب اور اس کے ادیبوں اور شاعروں کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اُردو تنقید میں یہ بات فیشن کی طرح داخل ہو چکی ہے جس تنقیدی مقالے میں دو چار انگریزی مصنّفوں کے نام حوالے کے طور پر پیش نہ کئے جائیں وہ اعلیٰ قسم کا نہیں مانا جاتا۔ اوّل تو ناقدین کی تخصیص نہیں۔ پھر اِس خیال کو مزید تقویت پہنچتی ہے، عام، مرض، فیشن، جس — وغیرہ عمومیت بتانے والے الفاظ کے استعمال سے۔ اِسی طرح "ترقی پسندی کا جو مفہوم اُنہوں نے پیش کیا ہے وہ قطعی دُرست نہیں ہے" کا لہجہ بھی قطعی ہے۔!

۸ — مضمون نگار میرے شیکسپیئر کا حوالہ دینے پر ناراض ہیں۔ وہ اُسے مرض اور فیشن تصور کرتے ہیں اور میں کہتا ہوں کہ اِس پر ناک بھوں چڑھانا بھی مرض اور فیشن بن گیا ہے۔ یہ ہمارا اِحساسِ کمتری ہے جو ہمارے لاشعور کو کھلاہٹ میں مبتلا کرتا ہے۔

۹ — مضمون نگار نے ایک سوال یہ اُٹھایا ہے کہ "اُنہوں نے ترقی پسندی کے جن دو مفاہیم کو پیش کیا ہے کیا واقعی وہ مروّج ہیں۔؟ کن کن ادیبوں یا نقّادوں نے اِن دونوں مفاہیم کی نشاندہی کی ہے؟" تفصیل کا موقع نہیں، اِس لئے ترقی پسند نقّادوں کی تحریروں سے بعض اقتباسات کی نشاندہی پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔ صفحہ نمبر درج کر رہا ہوں۔ کتاب اور مصنّف یا مضمون نگار کے نام کے ساتھ اقتباس مضمون نگار خود مُلاحظہ فرمالیں۔ سردار جعفری۔ ترقی پسند اَدب (ص ۱۹، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰) تنقیدی نظریات

۱۔

احتشام حسین (ص ۳۹، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸) احتشام حسین، تنقید اور عملی تنقید (ص ۱۴۷، ۱۷۹، ۱۸۰) — تنقیدی نظریات۔ مجنوں گورکھپوری (ص ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۵۶، ۱۵۷) تنقیدی نظریات۔ عبدالعلیم (ص ۲۲۶) سجّاد ظہیر۔ روشنائی (ص ۳۰۸) نگار "انتقاد نمبر ۱۹۳۶ء"۔ مجنوں گورکھپوری (ص ۱۱، ۱۲، ۱۵) ممتاز حسین (ص ۷۰، ۷۲، ۷۳، ۷۵، ۷۹) ان صفحات میں ترقی پسندوں نے نہ صرف ترقی پسندی کے دو مفاہیم کی وضاحت کی ہے۔ بلکہ صاف صاف یہ حکم لگا دیا ہے کہ اِقتصادیات کُل زندگی نہیں۔ اُس کا ایک عُنصر ہے جسے کسی دوسرے عُنصر پر فوقیت نہیں دی جاسکتی اور شاعر کا تعلق پُوری زندگی سے ہوتا ہے۔ طبقاتی کشمکش زندگی کی جدّوجہد کا ایک حصّہ ہے، اِنفرادی جذبات اور تجربات کی اپنی اہمیّت ہوتی ہے اور یہ بھی شاعری کے اہم موضوع ہیں۔

۱۰ — مضمون نگار کو میرا یہ دعویٰ بھی محلِ نظر معلوم ہوتا ہے کہ مقصدیت اور اِفادیت ماحول کی عکّاسی سے پیدا ہوتی ہے، یہ غیر ترقی پسندانہ طرزِ فکر ہے جیسا کہ اُن اقتباسات کو پڑھنے سے بھی اندازہ ہوگا۔ جن کی اُوپر میں نے نشاندہی کی ہے۔ اِسی طرح اُن کا یہ کہنا بھی ترقی پسندی سے اِنحراف ہے کہ غزل میں ماحول کی عکّاسی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ صنفِ غزل پر بھی زبردست اِعتراض ہے۔

مضمون نگار کے اِس اعتراض کا جواب بھی، کہ غالب کے زمانے میں سماجی شعور نہیں تھا۔ اُن اقتباسات میں مل جائے گا جن کی میں نے نشاندہی کی ہے۔ اِن اِقتباسات میں واضح طور پر سمجھایا گیا ہے کہ ادیب کی انفرادیت اور اُس کا ذوقِ جمال بھی معاشرتی قدروں کے رہینِ منت ہوتے ہیں۔ شعور کی کسی نہ کسی سطح پر دیسے میں نے وضاحت کردی تھی، کہ غالب تحت الشعوری سطح پر ترقی پسند تھے۔ اپنے مضمون میں اُنہوں نے شعوری طور پر اور قصداً ترقی پسندی کو بطور اَدبی مَسلک کے اختیار نہیں کیا۔ لیکن اعتراض کرتے وقت

مضمون نگار غالباً اِس غلط فہمی میں مُبتلا ہوئے ہیں۔ !

۱۱ــ مضمون نگار کو غالب کی ترقی پسندی سے اِس لئے بھی انکار ہے۔ کہ اُن کے یہاں اِنسانیت کی ترجمانی نہیں، زندگی کی عکاسی ہے۔ پھر غالب کسی مسئلے کا حل پیش نہیں کرتے۔ جواب، اوّل تو انسانیت اور زندگی کی عکاسی کو دو جداگانہ حقائق نہیں سمجھنا چاہئیے۔ جیسا کہ ممتاز حسین کے اُس اِقتباس (ص ۷۹، نگار) سے بھی معلوم ہوگا۔ جس کی آگے میں نے نشاندہی کی ہے۔ دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ میں نے اپنے مقالے میں اِسی پر زور دیا تھا۔ کہ غالب نے کئی سوالات اُٹھائے اور اِس لئے وہ ترقی پسند تھے۔ ترقی پسندوں کا بھی یہی خیال ہے۔ ملاحظہ ہو۔ احتشام حسین تنقید اور عملی تنقید (ص ۱۴۰)

۱۲ــ مضمون نگار نے عُجلت کے سبب اِستنباط میں بھی بعض غلطیاں کی ہیں۔ مثلاً اُن کا یہ کہنا "اگر ادب کو سماجی فریضہ سمجھ لیا جائے تو سماج پر سیاست کی پرچھائیاں پڑتی ہی ہیں۔ اِس لئے ادیب کوئی نہ کوئی سیاسی مَسلک اختیار کرنے پر مجبور ہوگا۔" سیاسی مَسلک کے اختیار کرنے کی تیسری بات، پہلی دو باتوں، سماجی فریضہ، سیاست کی پرچھائیں سے نتیجہ کے طور پر سامنے نہیں آتی۔

۱۳ــ مضمون نگار کا ذہن بعض ادبی مسائل کے متعلق صاف نہیں معلوم ہوتا۔ مثلاً جب وہ یہ کہتے ہیں کہ FORM میں غالب نے کوئی تبدیلی نہیں کی تو FORM سے وہ صنفِ شعر مُراد لیتے ہیں۔ جیسا کہ اُنہوں نے حالی کے حوالے سے خود اِسے واضح کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ FORM کا ایک اہم ترین جزو ڈکشن ہے۔ اور غالب کا ڈکشن یقیناً پہلے کے شعراء سے جداگانہ ہے کیونکہ اُن کا مَواد جُداگانہ ہے اور جس کا مضمون نگار کو بھی اعتراف ہے۔

۱۴ــ مضمون نگار نے مُتقدمین کے کلام میں بعض ایسے الفاظ کی نشاندہی کی ہے جن کو غالب نے بھی اِستعمال کیا ہے اور جن کے اِستعمال کو میں نے ترقی پسندانہ قرار دیا ہے۔ لیکن مضمون نگار نے اِس پر غور نہیں کیا۔ کہ متقدمین کے یہاں وہ الفاظ روایتی طور پر روایتی مضامین کے لئے اِستعمال ہوئے ہیں۔ جبکہ غالب کے یہاں وہ نئی معنویت کے ساتھ بلند ہو کر اِستعارہ اور علامت بن جاتے ہیں۔ فیض کا بھی یہی خیال ہے اور غالب کی اِس فنکاری سے متاثر اور مستفید ہونے کا اعتراف بھی اُنہوں نے بمبئی کی ایک اَدبی نشست میں کیا تھا۔ جو ہندوستانی پرچار سبھا ریسرچ سینٹر میں منعقد ہوئی تھی۔ اور جس کا ذکر میرے مقالے میں ہے۔

۱۵ــ مضمون نگار کو میرے اِس خیال سے بھی اختلاف ہے۔ کہ غالب کے کلام میں رجائیت ہے اور اِس بنیاد پر وہ غالب کو ترقی پسند شاعر تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ بات صرف اِتنی ہے کہ مضمون نگار، رجائیت سے مُراد زندگی سے مقابلہ نہیں لیتے۔ بلکہ زندگی کو کسی مردِ مومن کی طرح آگے بڑھ کر للکارنے کا نام اُن کے نزدیک رجائیت ہے۔ حالانکہ یہ مثالیت پرستی ہے۔ اور غالب حقیقت پسند تھے۔ وہ مصلح نہیں تھے، شاعر تھے۔ اُن کے یہاں پلٹنے جھپٹنے کا انداز نہیں ملے گا۔ پھر۔ رجائیت کا تصوّر، غم کے تصوّر سے علیحدہ کوئی شئے نہیں۔ کیونکہ زندگی اور اُس کی جدّوجہد ان دونوں رنگوں سے عبارت ہے۔ غالب کے یہاں بھی یہ دونوں رنگ پائے جاتے ہیں۔ اور غم ایک ماتمی کیفیت نہیں بنتا بلکہ عرفانِ حیات بن جاتا ہے۔ جیسا کہ عزیز احمد بھی "ترقی پسند ادب" میں لکھتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ (ص ۳۵/۳۶)

علاوہ بریں اِس سلسلے میں وہ اِقتباسات بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ جن کی اُوپر میں نے نشان دہی کی ہے۔ یعنی احتشام حسین کا اِقتباس (ص ۱۷۹، ۱۸۰) اور ممتاز حسین کا (ص ۷۷، نگار) اِن لوگوں نے بتایا ہے کہ ترقی پسندی کا مطلب کسی ایک جذبے کا بیان نہیں ہے بلکہ مِن و عَن پوری کائنات کو پیش کرنا ہے۔ جس میں سکراہٹ کی شبنم بھی شامل ہے اور زخموں کے پھول بھی۔ اور شاعر کا صحیح مطالعہ اِسی تضاد کے تجزیئے سے کیا جاتا ہے۔

۱۶ــ مضمون نگار نے غالب سے پہلے کے شعراء کے یہاں بعض ایسے اشعار کی نشان دہی کی ہے جن میں غمِ جاناں کے ساتھ غمِ دوراں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اوّل تو ایسے اشعار اُنہوں نے کم نقل کئے ہیں۔

دوسرے مجھے اس سے انکار کب ہے۔؟ میں نے اپنے مقالے میں کہا ہے کہ غالب سے پہلے میرؔ اور سوداؔ کے یہاں بھی ترقی پسندی کی لاشعوری جھلکیاں ملتی ہیں۔ لیکن ترقی پسندی کے رجحان کا ایک نمائندہ شاعر بن کر غالب ہی ہمارے سامنے آتا ہے۔

۱۷۔ مضمون نگار نے اپنے بیانات کی وضاحت سے اکثر گریز کیا ہے۔ مثلاً غالب کی عظمت کے جو مظاہر میں نے بیان کئے، اُن سے انکار کرنے کے بعد وہ خود کسی مظہر کو پیش نہیں کرتے۔ اسی طرح کہتے ہیں کہ غزل میں ماحول کی عکاسی کی گنجائش نہیں، مگر اس دعوے کی کوئی بنیاد بیان نہیں کرتے یا — کہتے ہیں میرے نقادوں نے بہت سی ایسی خصوصیات غالب سے مختص کردی ہیں، جو غالب سے پہلے کے شعراء کے یہاں بھی ملتی ہیں، مگر اُن خصوصیات کی وضاحت نہیں کرتے۔

۱۸۔ مضمون نگار نے میرے خیالات کو بھی بسا اوقات غلط روپ میں پیش کیا ہے، مثلاً اُن کا یہ کہنا کہ میں غالب کو رجائیت کا علمبردار بتاتا ہوں اور ساتھ ہی ایک ایسا شعر غالب کا نقل کرتا ہوں جس میں قنوطیت ہے، اوّل تو اس شعر میں قنوطیت نہیں۔ غم ہستی کا عرفان ہے، قیدِ حیات و بندِ غم کو ایک سمجھنا قنوطیت نہیں، عرفانِ حیات ہے۔ اسی طرح زندگی کو قفس سمجھنا بھی قنوطیت نہیں، عرفانِ حیات ہے۔ علاوہ بریں میں نے وہ شعر اپنے مقالے میں رجائیت کے ضمن میں نہیں بلکہ غالب کی ترقی پسندانہ نہج کو سمجھانے کے لئے نقل کیا تھا، جس کا زندگی کی جدّوجہد، اُس کی مسرّت اور غم دونوں سے گہرا تعلق ہے۔

۱۹۔ مضمون نگار کا ذہن بعض اَدبی اور تنقیدی اصلاحوں سے متعلق صاف نہیں ہے۔ وہ تضمین اور تصرّف میں فرق نہیں کرتے، لکھتے ہیں کہ میں نے ترقی پسند نظریے کے چند اصول مسخ کرکے اُن کا اطلاق غالب کے اشعار پر کیا ہے اور اُسے ترقی پسند ثابت کرنا چاہا ہے۔ جبکہ میں نے ترقی پسندی کے متعلق بعض بنیادی حقائق کو بیان کیا ہے، جن کے پیش نظر میں غالب کو ترقی پسند سمجھتا ہوں۔ مگر بنیادی حقائق اور اصول میں امتیاز نہ کرنے کے سبب وہ سمجھنے اور ثابت کرنے میں بھی فرق نہیں کرسکے۔ اسی طرح غالب پر لکھی گئی کتابوں کا ذکر کرتے وقت میں نے شیکسپیئر پر لکھی کتابوں کا بھی ایک جملے میں حوالہ دیا تھا۔ جسے مضمون نگار "موازنہ" کہتے ہیں۔ نیز میں نے بغلوں کے بُت اور بغلیں جھانکنا کو ایک مخصوص سیاق میں استعمال کیا تھا۔ اِن میں سے پہلا تو تلمیحی استعارہ ہے اور دوسرا محاورہ۔ یہ ضلع کے الفاظ نہیں ہیں۔ اس لئے امانت کی یاد تازہ نہیں ہونا چاہیئے۔ علاوہ بریں مضمون نگار جذبے اور احساس کے نفسیاتی امتیاز سے بھی باخبر معلوم نہیں ہوتے ورنہ میرؔ کا ایک شعر نقل کرتے ہوئے یہ کبھی نہیں لکھتے کہ اگر مجھے انسان کی انانیت اور عظمت کا جذبہ غالب کی شاعری میں پہلی بار نظر آتا ہے تو یہ غلط ہے۔ اور میرؔ کا شعر میری نظروں سے کبھی نہیں گزرا — بات دراصل یہ ہے کہ میرؔ کے شعر میں انانیت اور عظمت کا جذبہ نہیں بلکہ احساس ہے جو اعلان کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے نہ کہ نفسیاتی حقیقت بن کر۔

۲۰۔ مضمون نگار میرے "نہیں" کی جگہ "نہ" لکھنے پر اس قدر نالاں نظر آتے ہیں کہ وہ اپنے اس خیال کو ایک قطعی دعوے کی شکل دیتے ہیں۔ یعنی تمام پروفیسر "نہیں" کی جگہ "نہ" لکھتے ہیں۔ "نہ" کا استعمال درست ہے یا نہیں، اس سے صَرفِ نظر کرتے ہوئے فی الحال اتنا ہی عرض کروں گا۔ کہ "نہ" کو پروفیسر کے علاوہ بھی لوگ استعمال کرتے ہیں۔ ادیب، افسانہ نگار، مضمون نگار شاعر، نقّاد، مورّخ، مبصّر، مترجّم، صحافی، ٹیچر، فلم میں لکھنے والے الغرض تمام لوگوں کی نثر میں یہ استعمال ہوتا ہے۔ پھر پروفیسر ہی کی تخصیص اور در پردہ تحقیر کیوں؟۔

مضمون نگار جہاں تک مجھے اطلاع ملی ہے، ایک مدرسے میں معلّم ہیں۔ مگر اپنے مضمون میں "نہ" کا استعمال ایک جگہ اُنہوں نے بھی کیا ہے!۔ یہی نہیں مضمون نگار نے زبان و بیان کی اور غلطیاں بھی کی ہیں۔ مثلاً وہ "کتر بیونت" کو "کتر و بیونت" اور "بھرم کھلنا" کو "بھرم کھولنا" لکھتے ہیں۔ ایک اور جگہ کہتے ہیں۔ "غالب کے متعلق چند مفروضہ

وغیر مفروضہ خیالات وحقائق" یہ غیر مفروضہ کیا ہے؟۔ پھر جیسے وہ لکھتے ہیں۔" بجنوری کے بیان کو تحسینِ محض نہیں گردانتے اور یہ بھول کر کہ اُنہوں نے اِس سے پہلے کیا لکھا ہے، آگے کہتے ہیں۔ تو "اُنہوں" کی ضمیر مبہم ہوجاتی ہے۔ اِس کا مرجع اُسی وقت معلوم ہوتا ہے جب وہ آگے میرے مضمون کا ایک اقتباس نقل کرنے کے بعد اپنی بات واضح طور پر دُہراتے ہیں۔ ورنہ پہلے یہ گمان گزرتا ہے کہ "اُنہوں" کا مرجع مَیں نہیں ہوں بلکہ بجنوری ہیں۔ یہ ابہام پیدا نہیں ہوتا اگر وہ صحیح زبان لکھتے یعنی "بجنوری کے بیان کو تحسین محض نہیں گردانتے۔ اور جلد ہی اپنے اِس بیان کو بھول کر آگے لکھتے ہیں"۔ ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔ "پروفیسروں کا سرسری مطالعہ کرکے"۔ یہ اُردو کا محاورہ نہیں مطالعہ کتاب کا کیا جاتا ہے۔ یا زندگی کا، یا کردار کا، اِنسان کا نہیں۔ اِسے وہ یوں لکھ سکتے تھے۔ "پروفیسروں کی لیاقت کا حال معلوم کرکے۔"

بمبئی۔ **داؤد کاشمیری**

● "شاعر" جنوری، فروری ۱۹۷۰ء کے اداریہ کی تعریف جتنی بھی کی جائے کم ہے۔ مقالات متنوّع ہیں۔ غلام ربانی تاباں۔ عبدالرّب قمرؔا اور فصیح اکمل کی نظمیں بہت اچھی لگیں۔ موجودہ شمارہ کی غزلیں بھی معیاری اور وقت کے تقاضے کے مطابق ہیں۔ مقالات میں مجھے خاص کر ــــــ محمد شفیع ساؔغر کا مقالہ "غالب اور ترقی پسندی" بہت پسند آیا۔ افسانے بھی اچھے ہیں۔ کرشن چندر کا مقالہ تو ایسی تصویر پیش کرتا ہے۔ جو ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ اور اُس سے بھارتی جی کی غلط فہمیوں کا بھانڈا پھوٹ جاتا ہے۔

لنگٹ ہاسٹل ایل ایس کالج۔ مظفر پور۔ **غیاث الدّین نیازؔ**

کچھ شمارہ مارچ ۱۹۷۰ء کے متعلق

شاعر کا شمارہ ملا۔ شکریہ۔ میں نے شب گشت پر شائع شدہ تبصرہ بہت دلچسپی سے پڑھا۔ عام طور پر تبصروں [illegible] کا اظہار کرنا مجھے پسند نہیں۔ لیکن اِس تبصرے پر کچھ عرض کرنا ضروری معلوم ہورہا ہے۔ مبصر نے زبان و بیان کی جن خامیوں اور کمیوں کی طرف توجہ دلائی ہے اُن پر میں نے غور کیا۔ بہت غور کے بعد میں اِس نتیجے پر پہنچا کہ اگر ایسی غلطیوں خامیوں اور کمزوریوں پر میں نے قابو پالیا۔ (اور قابو پالینا کوئی مشکل نہیں) تو ہماری شاعری کے قارئین لئے ویلے رہنے والی چھوٹی موٹی زبان کے روحانی ذوق سے کیسے پیچھا چھڑا سکیں گے۔؟ اِس لئے مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامّل یا تکلیف نہیں کہ لفظیات، زبان و بیان کے بارے میں اپنے رویّے میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اِس سلسلے میں "خوب سے خوب تر کا مطالبہ" پورا نہ کرسکوں گا۔

دہلی میں ایک صاحب ہیں، ترازو میں تول تول کر فیتے سے ناپ ناپ کر لُغات کی لانڈری میں صاف کرکے شعر کہتے ہیں۔ سُنا ہے لوگوں سے کہتے پھر رہے ہیں کہ "شب گشت" میں ۲۷ مصرعے خارج از بحر ہیں۔ میں نے کہلا بھیجا ہے کہ خدا توفیق دے تو "شب گشت" کے ہر مصرعے کو ترازو پر تولتے جائیں۔ اور دیکھیں کہ خارج از بحر مصرعوں کی تعداد ۲۷ سے کم از کم ۴۵ کیسے ہوگئی۔ اور بے وزن مصرعوں کے بٹورنے کا لطف کیسے دونا ہوگیا۔

مجھے اعتراف ہے کہ میری تخلیقی رَو کا جوش اکثر وزن و آہنگ کے ظاہری دائروں کو کاٹتا ہوا گزر جاتا ہے۔ لیکن داخلی یا معنوی وزن و آہنگ میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ میری خواہش تو یہ ہے۔ کہ میری شاعری کی زبان، میری گفتگو کی زبان کے اور شاعری کا آہنگ، گفتگو کے آہنگ کے قریب تر آتا جائے تاکہ میری بات شاعری اور شاعری بات بن جائے۔ زبان کی روایتی اور رومانی شعریت کو توڑ کر ایک نئی صورت اُبھارنے کا شغل بعض اوقات بڑا دلچسپ اور پُر لطف ثابت ہوتا ہے۔ تخریب سے تعمیر کی صورت پیدا کرنے کا ایک ڈھنگ یہ بھی تو ہے۔

ندا فاضلی بہت اچھے دوست اور بڑے پیارے شاعر ہیں۔ اُن کی شاعری کی پیاری پیاری زبان، اور گیتاتمک آہنگ مزیدار ہے۔ اور اُن کے جذبہ و احساس کا بہت دور تک ساتھ

دیتا ہے۔ آپ کی دوستی اور شاعری کو عزیز رکھنے کے باوجود اُن کے اِس تبصرے کے ناصحانہ حصّوں کا قائل ہونا اور اُن کے پند و نصائح پر عمل کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں۔

۲۷، اے آئی، آر ہوسٹل، کرزن روڈ، نئی دہلی۔ عمیق حنفی

● "شاعر" کا تازہ شمارہ آیا تو دھرم دیر بھارتی، کرشن چندر اور آپ کے مضامین ذہن کے پردے پر رقص کرنے لگے۔ دھرم دیر بھارتی اور گوپال مِتّل کے سلسلے میں میں بھی بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن پھر سوچتا ہوں کہ اِسے شائع کون کرے گا؟ کوئی ہندی رسالہ شائع نہیں کرسکتا۔ اور اب تو یہ یقین پختہ ہوگیا ہے کیونکہ "نو بھارت ٹائمز" کے سلسلے میں آپ کا تجربہ میرے لئے مشعلِ راہ ہے۔

مجھے رام لعل صاحب سے بھی کچھ کہنا ہے۔ ارے صاحب: آپ، ہم اور سبھی لوگ صرف مشورہ ہی دیتے رہیں گے۔ تو عمل کرنے اور کرانے والا کہاں سے آئے گا؟۔ اعجاز صدیقی صاحب نے معقول مشورہ دیا تھا، اِس کا اعتراف آپ کو بھی ہے تو پھر آپ اِس پر عمل شروع کیوں نہیں کرتے۔؟۔ آپ کے ذرائع وسیع ہیں، آپ باصلاحیت ہیں اور آپ چشمِ بینا بھی رکھتے ہیں۔ پھر راہبری کیوں اختیار نہیں کرتے؟ پہل کرکے دوسروں کو آگے بڑھانے یا اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیوں نہیں کرتے؟ آپ جیسے لوگوں کو دوسروں کے آگے بڑھنے کا انتظار کرتے رہنا زیب نہیں دیتا۔ آپ بھی اُردو کے شہرت یافتہ خادم ہیں۔ اِس لئے آپ اسکول کے منتظمین کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنے اور بچوں کے فارم لے کر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے میں پہل کیجئے۔ پھر دیکھئے کہ پانچ کیا، پندرہ سرپرست آپ کے پیچھے نظر آئیں گے۔ اِس کا مجھے یقین ہے۔!

نثار اٹاوی صاحب نے علامہ سیماب مرحوم کی تصانیف کے سلسلے میں میرے دل کی بات کہی ہے۔ علامہ سیماب کی تصانیف کی اِشاعت سے متعلق میں ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔ جہاں تک میرا خیال ہے اُردو کے عظیم المرتبت اور محقق شعراء و اُدباء سے ہمدردی رکھنے والوں کی تعداد کم از کم دس ہزار تو ضرور ہوگی۔ اِن دس ہزار میں دو سو یا ڈیڑھ سو ایسے حضرات لقیناً ہوں گے جنہیں سیماب سے ہمدردی ہوگی جنہیں سیماب پسند ہوں گے۔ اور جنہیں سیماب سے لگاؤ ہوگا اگر یہ ڈیڑھ دو سو حضرات سال میں صرف پانچ روپیہ اَدب کی خدمت کے نام پر بجٹ سے نکالیں، تو سیماب کی تصانیف کی اِشاعت شروع ہوسکتی ہے۔ اِسی طرح دوسرے شاعروں اور ادیبوں سے متعلق بھی کام ہوسکتا ہے۔ میں اُردو کے ہمدردوں، سیماب سے لگاؤ رکھنے والوں اور ماہنامہ "شاعر" کے قارئین سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا سال میں، جی ہاں سال بھر میں صرف ایک بار پانچ روپیہ آپ اپنے بجٹ سے نہیں نکال سکتے۔؟ اگر نکال سکتے ہیں اور میرا مشورہ قابلِ قبول ہے تو میں چاہوں گا کہ ایسے حضرات اپنے ناموں اور پتوں سے مطلع کریں۔ تاکہ سیماب کی تصانیف کی اِشاعت کا کام شروع کر دیا جائے۔ اِس سلسلے میں پہلا نام میں اپنا پیش کرتا ہوں۔ اور سال ۱۹۷۰ء کے لئے ہر وقت رقم دینے کو تیار ہوں۔

قصبہ ہرگانوہ۔ ڈاکخانہ بریگھہ (مونگیر) مناظر عاشق ہرگانوی

● تازہ "شاعر" اپنے جلو میں بہت سی بحث طلب باتیں لے کر آیا ہے۔ خصوصاً اِس کا حصّۂ مکتوبات بے حد قابلِ غور ہے۔ اِس سلسلے میں شفیق رحمانی اور منتظر کاظمی کے خطوط بے حد چونکا دینے والے اور قابلِ عبرت ہیں۔ رام لال صاحب کا مضمون (جو اُنہوں نے "دھرم یگ" کو بھیجا ہے۔ اور جس کی ایک نقل آپ کو بھی ارسال کی ہے) آپ "شاعر" میں بھی شائع کریں، تاکہ ہمیں بھی معلوم ہو کہ یہ بقول آپ کے ــــــ "پوری طرح اُردو مخالفین کے مقاصد کی کفالت کرتا ہے۔" ادھیکاری صاحب (ایڈیٹر روزنامہ "نو بھارت ٹائمز" بمبئی) نے آپ کا مضمون شائع نہ کرکے صحافیانہ بددیانتی کی ہے۔ اِس کا صاف مطلب یہ ہے کہ دیگر ہندی داں افراد کی طرح اُردو کے تعلق سے اِن کا دِل بھی صاف نہیں ـــ

یہ آپ نے اچھا ہی کیا۔ کہ کاوش بدّری کی بحث کو ختم کر دیا۔ زیرِ نظر شمارہ میں حسبِ معمول آپ کی غزل خوب ہے۔ خصوصاً جس مایوس کُن ماحول میں آپ اُردو کے لیے حوصلہ افزا جد و جہد کر رہے ہیں، اُس پس منظر میں اس کے بعض اشعار بہت پسند آئے۔ اِدھر چند مہینوں میں آپ نے بہت ساری چیزیں لکھی ہیں اور بیماری میں اس طرح "زحمت میں رحمت" کا پہلو نکل آیا ہے۔ نثار اٹاوی صاحب نے اپنے خط میں اِس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ علّامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کو شائع کرنا چاہیئے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ علّامہ مرحوم کا تو بہت کچھ کلام زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکا ہے اور ان کی کئی کتابیں مطبوعہ حالت میں موجود ہیں۔ مگر ضرورت اِس بات کی ہے کہ آپ کا مجموعۂ کلام جلد سے جلد شائع ہو۔ کچھ سال پہلے "شاعر" میں آپ کے مجموعۂ کلام کی اشاعت کا اعلان بھی پڑھا تھا۔ مگر پھر نہ جانے کیوں وہ شائع نہ ہوا؟

یہ جان کر افسوس ہوا کہ حکومتی حلقوں میں "شاعر" کے "گاندھی نمبر" کی پذیرائی نہ ہو سکی۔ اور اس کی وجہ سے رسالۂ مذکور کے مالیہ پر زبردست بار پڑ گیا۔ جس قوم کے نوجوان برسرِ عام اپنے رہنماؤں کی تصاویر جلا رہے ہوں اور قومی پرچم کی توہین کر رہے ہوں ایسی قوم سے اور کیا توقع ہو سکتی ہے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ "شاعر" کے دفتر پر اس پاداش میں نکسلائیوں نے حملہ کر کے دو چار دستی بم نہیں پھینکے۔ کہ اس نے کیوں "گاندھی نمبر" شائع کیا۔ اِس لحاظ سے آپ سستے ہی چھوٹے۔ اب رہا سوال "شاعر" کے مالیہ کے مستحکم ہونے کا تو وہ تو کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ آپ اِس کے لئے کبھی راضی نہ ہونگے۔ کہ "شاعر" کا دلیپ کمار و سائرہ بانو نمبر" نکالا جائے۔

اِس حقیقت سے آگہی باعثِ تکلیف رہی کہ آپ ہنوز اچھے نہیں ہوئے ہیں۔ نثار اٹاوی کے خط کے سلسلے میں آپ نے حاشیہ میں یہ عبارت درج کی ہے کہ "اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں"۔ لیکن میرے خیال میں آپ جیسا ایک بوڑھا اور بیمار ہم جیسے بیسیوں نوجوانوں اور صحت مندوں پر بھاری ہے۔ جو ہر روز لکھنے پڑھنے کا کچھ نہ کچھ کام ضرور انجام دے لیتا ہے۔

آپ کے خطوط بے حد مایوسی اور دل گرفتگی لئے ہوتے ہیں۔ اُنہیں پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کہ کس طرح ایک شخص اپنے قلم سے بڑے اطمینان سے یہ لکھ سکتا ہے کہ "میں تقریباً مایوس ہو چکا ہوں۔" شکیل صاحب کی موت سے آپ کا دِل گرفتہ ہونا قدرتی امر ہے۔ لیکن اِس کا یہ مطلب تو نہیں آپ اپنی صحّت کے تعلق سے بالکل بے پروا ہو کر مرنے کی تمنّا کرتے بیٹھیں۔ بقول سکندر علی وجد

مَوت گو لاکھ شان دار سہی
زندگی کا مگر جواب نہیں

خاں صاحب ٹینک۔ حیدرآباد ۲۴ ۔ **رشید الدّین بی اے**

● مارچ کا شمارہ مِلا۔ ابھی ورق گردانی شروع ہی کی تھی۔ کہ سب سے پہلے نظر آپ کی غزل ہی پر جم کر رہ گئی سچ پوچھیئے تو یہ خط لکھنے کی تحریک بھی اِسی غزل سے ہوئی۔ بے اختیار دل چاہا کہ داد دوں، آپ نے غزل کی قدیم روایتوں کی پابندی کے ساتھ ساتھ جدید خیالات اور وقت کے نئے تقاضوں کو بھی اِس میں سمو دیا ہے۔ غزل کا ہر شعر ضرب کلیم ہے۔ پوری غزل جوان، اور جوان طبیعتوں کے لئے پیغامِ عمل ہے۔ خصوصاً اِس ہمّت شکن دَور میں مقطع آپ کی اُفتادِ طبع اور جواں ہمتی کا آئینہ دار ہے۔ اور بہت خوب ہے۔

اِس شمارے میں دوسری نظمیں اور غزلیں بھی قابلِ تعریف ہیں۔ خصوصاً دو نظمیں "تلاشِ سکون" اور "کہانی لہو کی" مجھے پسند آئیں۔ آپ کا نظموں اور غزلوں کا انتخاب تو ہمیشہ ہی لاجواب ہوتا ہے۔

۱۲ کانگریس ایگزیبیشن روڈ۔ کلکتہ ۱۷ ۔ **آغا رشید مرزا**

● مارچ کا "شاعر" ملا۔ اُردو کے لئے اتحاد و تنظیم کی سخت ضرورت ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ہم متحد اور منظم ہوتے تو ابتک کچھ کام ہو چکا ہوتا۔ ہم ذاتی اغراض

مقاصد کے لئے تنظیم اور اشتراک کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔ اور اپنا الّو سیدھا کر لینے کے بعد چپکے سے منتشر ہو جاتے ہیں۔ میں اُردو تحریک کی کوئی قدآور شخصیت تو نہیں ہوں۔ البتہ اُردو سے والہانہ محبّت کے باعث اپنے علاقے کی حد تک کچھ نہ کچھ ضرور کرتا رہتا ہوں۔ سہیل عظیم آبادی کی اِس رائے سے اپنے آپ کو متفق پا رہا ہوں کہ جو کچھ ممکن ہو خود کرتے جائیے کسی سے کچھ اُمید نہ رکھیئے۔

میرا تعلق بھی نئی نسل سے ہے۔ مگر مجھے اپنے نوجوان ساتھیوں سے سب سے بڑی شکایت یہی ہے کہ وہ اپنی زبان کی بقا کے لئے ٹھوس کام اور عمل کرنے کے بجائے، صرف اپنے بزرگوں کو گالیاں دینے اور قدیم و جدید کے نام پر جھگڑے پیدا کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

آپ نے رام لعل کے خط پر بہت دو ٹوک حاشیہ لکھ دیا ہے۔ نثار اٹاوی کے مکتوب پر آپ نے جو فٹ نوٹس لکھے ہیں۔ اُنہیں پڑھ کر بے اختیار آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ آپ مسلسل کام کئے جا رہے ہیں۔ نوجوانوں سے بھی بڑھ کر۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں یہ صرف اُردو والوں کی بے حسی کا ردِّ عمل ہے۔ ورنہ آپ کے اندر کام کرنے کی جو لگن اور تڑپ ہے وہ اِس دَور کے جوانوں میں بھی نہیں مِل سکتی۔ کاش ! ہم اُردو والے شاعر اور قصر الادب کے اسٹیو کام کے لئے کچھ کرتے۔ !!

۴، فیلی مال۔ داپولی (رتناگری) بدیع الزّماں خاور

● مارچ کا شمارہ مِلا۔ شاید ۲؍اپریل کے اخبار میں سیّد امتیاز علی تاج کے قتل کر دینے کی اندوہناک خبر تھی اور ۲۱؍اپریل کو حضرتِ شکیل بدایونی کی موت کی۔ مجھے بیحد دکھ ہوا۔ اِتوار کے اِنقلاب میں حضرتِ شکیل مرحوم کے متعلق آپ کا پُردرد نوٹ اور قطعۂ تاریخِ وفات پڑھا

تازہ شمارہ میں رام لعل صاحب نے اپنے خط میں دھرم یگ کو بھیجے ہوئے جس مضمون کا حوالہ دیا ہے اور جس کے متعلق آپ نے لکھا ہے کہ اِس مضمون کو "دھرم یگ" کو شائع کرنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ مضمون پوری طرح اُردو کے مخالفین کے مقاصد کی تکمیل کرتا ہے۔" لہٰذا وہی ہوا۔ ۴؍مئی کے دھرم یگ میں بعنوان "اُردو اپنے ادبی اور سیاسی لیڈروں کے جنگل میں" شائع ہوا ہے۔ دھرم یگ نے اُسے شائع کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "رام لعل کا یہ مضمون شائع کر کے ہم اُردو کنونشن سے متعلق بحث کا خاتمہ کر رہے ہیں۔" آپ نے بھی یہ مضمون پڑھا ہے، اِس لئے میں اِس کے متعلق زیادہ کچھ نہ کہوں گا۔ رام لعل جی نے لکھا ہے۔ "۱۹۶۴ء میں لکھنؤ میں جو سمجھوتہ ہوا تھا۔ بقول دھرم ویر بھارتی، کسی گہری سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ تھا۔ میں بھارتی صاحب کے اس قول سے متفق نہیں ہوں۔" چلئے رام لال جی نے حقیقت کا اِقرار تو کیا۔ آگے چل کر لکھتے ہیں۔ " لکھنؤ میں جو سمجھوتہ ہوا تھا۔ اس میں اُردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کی کوئی بات نہیں کہی گئی تھی۔" اور یہی بات کرشن جی نے اپنے ایک مضمون (حیات ویکلی) میں صاف لفظوں میں کہی ہے۔ ثبوت کے طور پر انہوں نے کرشن جی کے مضمون کی نقل کا حوالہ دیا ہے۔ آگے لکھتے ہیں کہ "لیکن بمبئی کے ادیبوں کو چاہیئے تھا کہ وہ وزیر اعظم کے سامنے کوئی میمورنڈم پیش کرنے سے پہلے اُن لوگوں سے مشورہ ضرور کر لیتے۔ جو سمجھوتے کے وقت موجود تھے۔"

بھائی جان ! میرا تو خیال ہے، وزیر اعظم کو جو میمورنڈم پیش کیا گیا تھا۔ اُس میں اُردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا کہیں ذکر تک نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور لکھا ہے کہ جہاں اُردو بولنے والوں کی اکثریت ہو، اُردو کو وہاں کی علاقائی زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے۔ اور اُسے وہ تمام حقوق دیئے جائیں جو ایک علاقائی زبان کو قانونی طور پر حاصل ہیں۔

آگے چل کر رام لعل جی رقم طراز ہیں۔ " اتّر پردیش کی حکومت نے اُردو کے لئے جو دس لاکھ روپیہ دینے کا اعلان کیا ہے۔ اِسے اِستعمال کرنے کے لئے اُردو بورڈ کے پاس کیا منصوبے ہیں۔؟ کہیں یہ رقم اُن کے حواریوں

ادھ چلوں کی جیب میں غرضی کتابوں کی اِشاعت کے بہانے تو نہیں چلی جائے گی۔؟ ۔ رام لال جی اِسی بورڈ سے نامتفق نظر آتے ہیں۔ آگے لکھتے ہیں: اِس بورڈ کے ایک آدھ ممبر تو ایسے ہیں کہ ہندو، اُردو ادیبوں کے نام سے بھڑکتے ہیں۔ اور اپنے اِدارے سے نہ تو کسی ہندو، اُردو ادیب کی کتاب شائع کرنے کیلئے تیار ہیں نہ بیچنے کے لئے۔" رام لال کا یہ کہنا اُردو کیلئے کتنا مفید ہے؟۔ ایک دو جگہ رام لال جی نے اُردو کی ترقی کیلئے مفید مشورے بھی دیئے ہیں۔

نئے شمارہ میں موسیٰ کلیم کی جدید نظم "تلاشِ سکوں" پسند آئی۔ غزلیات میں شمیم کرہانی، عباس علی خان لمعہ اور آپ کی غزل بہت پسند آئی۔ واقعی آپ نے جو کچھ لکھا ہے، وہی نقشہ دورِ حاضرہ میں ہمارے سامنے ہے۔

'پرل بک' کی 'چاندی کی تتلی' چین میں جو کچھ ہو رہا ہے اُس کی حقیقی تصویر ہے۔ اِس سے پہلے بھی میں ایک کتاب "دُور بھاگیہ کا سپاہی" پڑھ چکا ہوں۔ جو ایک چینی سپاہی کی آپ بیتی ہے۔ اِس میں وہی سب لکھا ہے جو ماؤ کے پیرو عوام کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور پرل بک نے چاندی کی تتلی میں جس کا ایک ہلکا سا نقشہ پیش کیا ہے۔

اسلام پورہ۔ بھیمڑی۔ (۳۰ اپریل ۱۹۷۰ء) ہارون الرشید

مُنوّر لکھنوی کی وَفات

دہلی ۲۵ رمئی ۷۰ء (چھپتے چھپتے) یہ اطلاع بڑے ہی رنج و افسوس کے ساتھ سُنی گئی کہ اُردو کے ممتاز ادیب شاعر منشی بشیشور پرشاد منوّر لکھنوی کا ۷۳ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔

گزشتہ پچاس سال میں حضرت منوّر لکھنوی نے اُردو کی بڑی خدمت کی۔ متعدد لوگوں کی شعری تربیت کے علاوہ اُن کی تصانیف میں کائناتِ دل، نوائے کفر، ادائے کفر، انوارِ لمعات اُفق قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے کالیداس کی شکنتلا، کمارسمبھو۔ ٹیگور کی گیتانجلی، گوئٹے کی فاؤسٹ اور بھگوت گیتا کے اُردو تراجم بھی کیئے تھے۔ اُن کی موت شعر و اَدب کا عظیم نقصان ہے۔ (اِدارہ)

شاعر
جون ۷۰ء کی جھلکیاں

مقالات

کہانیاں

ڈراما

نظمیں

غزلیں

رفتار

علمی، ادبی اور تہذیبی خبریں

دہلی میں یوم سیماب مرحوم

۲۶ اپریل ۱۹۹۷ء کو "بزم سیماب" کے تحت راجوری گارڈن نئی دہلی میں شاندار طریقے سے "یوم سیماب" منایا گیا۔ سرشار ہوشیارپوری، سکریٹری بزم سیماب نے معزز مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے بزم کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور کہا کہ مولانا سیماب اکبرآبادی کسی ملک یا قوم کے نہیں بلکہ انسانیت اور کائنات کے شاعر تھے۔ انہوں نے ادبی و شعری تخلیقات کا اتنا بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے کہ آنے والی نسلیں دیر تک اُن سے استفادہ کرتی رہیں گی۔

بعد میں بزم کے صدر جناب ضیا فتح آبادی کی درخواست پر مہمانِ خصوصی جناب گوپی ناتھ امن لکھنوی نے مولانا سیماب کی بڑی تصویر کی نقاب کشائی کی۔

صدر کی افتتاحی تقریر کے بعد جناب ساغر نظامی، جناب کوثر چاندپوری، جناب علی جوّاد زیدی اور جناب ابر احسنی گنوری نے مولانا سیماب کی شخصیت اور اُن کی ادبی و شعری خدمات و عظمت پر تقریریں کیں۔ تقاریر کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد ساز و نغمہ کا پروگرام ہوا۔ جسے سُریندر سونی نے ترتیب دیا تھا۔ اس میں چار موسیقاروں نے بڑے اچھے انداز سے سیماب کی غزلیں پیش کیں۔

اس کے بعد "بزم سیماب" کے صدر نے ادیبوں، شاعروں اور حاضرین کو اُس نمائش کی طرف متوجہ کیا جس میں مولانا سیماب کی چند مطبوعہ تصانیف، اُن کی نظمیہ شاعری سے متعلق ڈاکٹر زرینہ ثانی کا تھیسس اور رسالوں کے خصوصی نمبر رکھے گئے تھے۔ امن صاحب تمام اُدبا و شعرا اور شرکا نے نمائش کی اہمیت کو سراہا اور یہ خواہش ظاہر کی کہ مولانا سیماب کی جو کتابیں اس وقت دستیاب نہیں ہیں، یا اُن کا جو نثری اور شعری سرمایہ ہنوز منظرِ عام پر نہیں آیا ہے۔ اُس کی اشاعت پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

آخر میں مولانا سیماب مرحوم کے مصرع
"ذہنِ فریب خوردہ کو فرصتِ آگہی نہ دے"
پر ایک کامیاب طرحی مشاعرہ ہوا جس کا اِفتتاح مشہور محقق جناب مالک رام نے فرمایا۔ مشاعرہ میں تیس شعرا نے حصّہ لیا۔ حضرات امن لکھنوی۔ ساغر نظامی، علی جوّاد زیدی۔ علم اختر۔ ابر احسنی، ضیا فتح آبادی۔ رفعت سروش۔ کرشن موہن۔ طالب دہلوی، افسر آذری، شہریار پرواز۔ جانباز۔ کیلاش چندر ناز۔ ہرکشن بجاج۔ اِندر سروپ دت [illegible] کا طرحی کلام بہت پسند کیا گیا۔

یوم سیماب کے پروگراموں کے اختتام پر بزم کے صدر ضیا فتح آبادی نے تمام مہمانوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر ایک سوونیر تقسیم کیا گیا۔ جس میں سیماب مرحوم کے مختصر سوانح حیات، اُن کی چند تصانیف کی فہرست اور دو سَو اشعار کا انتخاب دیا گیا ہے۔

بقیہ افسانہ صفحہ ۵۵ —— "اُلجھن"

"تمہارا سریش دا، ابھی کہاں ہے؟"

"سریش دا؟"

"ہاں سریش دا، جسے تم شادی سے قبل چاہتی تھیں۔ یاد نہیں۔۔؟"

"کچھ توقّف کے بعد وہ نہایت آہستگی سے بولی۔ "یاد ہے! شادی سے پہلے بھی اُنہیں چاہتی تھی اور آج بھی۔!"

میرے کاٹو تو جیسے بدن میں لہو نہیں! میرے ہی مُنہ پر ایسی بات؟ دانت پیس کر میں بولا:۔

"تمہارا سریش دا ابھی کہاں ہے، بتا سکتی ہو؟"

"بتا سکتی ہوں۔ سُننا چاہتے ہو؟"

"بولو تمہارے مُنہ سے ہی سُنوں!"

پرمیلا نے آسمان کی طرف اِشارہ کیا —— سوَرگ میں!"

"سوَرگ میں؟ مطلب؟؟"

اس کا لہجہ غمناک ہو گیا۔ "آج صبح پتاجی کا خط مِلا کہ سریش دا سورگباش ہو گئے۔ تمہیں ان کا ذکر تک پسند نہ تھا۔ اِسی لئے تمہیں نہیں بتایا! اور آپ سے شانت ہونے میں کچھ دیر لگی۔!"

پرمیلا نے میرے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مدھر مسکان کے ساتھ کہا، "اب سجاد" اس کے بعد اُس نے اپنی بات دہراتے ہوئے کہا۔ اب اور ایسا پاگل پن نہ کرنا، یاد رکھو میں صرف تمہاری ہی ہوں اور کسی کی نہیں!!" ●●

مالک، ایڈیٹر، پبلشر اعجاز صدیقی نے یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس ۲۷ فوروزجی اسٹریٹ [illegible] سے چھپوا کر دفتر [illegible] سے شائع کیا

Regd. No. MH 244 (Telephone No. 359904) MAY, 197[illegible]

The 'SHAIR' Bombay 8.

THE MOST POPULAR OLDEST LITERARY & CULTURAL URDU JOURNAL

(41 Years of Publication)

Publishing Dates, 15-16

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 14482/57

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

اُردو کا اکتالیس سالہ علمی ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

۱۰۷

جون ۱۹۷۰ء

جلد (۴۱) ــــــ شمارہ (۶)

مدیرِ اعلیٰ

اعجاز صدیقی

ادارۂ تحریر:
حسن دسنوی
ڈاکٹر محمد حسن
شہاب جعفری
سید افتاضلی

فون
۳۵۹۹۰۴

ندرِ سالانہ
۹ ــــــ روپے
معاونین سے: ۱۵ روپے
تاعمر خریداری: ۱۲۵ روپے
ممالکِ غیر: ۱۵ شلنگ

فی پرچہ: ۷۵ پیسے

ترسیلِ زر کا پتہ: ماہنامہ شاعر، قصر الادب، بمبئی ۳ . بی . سی

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شاعر، مکتبۂ قصر الادب، پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ بمبئی ۳ بی سی

اِس شمارے میں

شاعر بمبئی

گویم مُشکل وگرنہ گویم مُشکل

شاعر نصف صدی کی آخری دہائی سے گذر رہا ہے۔ حالات کی اتھل پتھل اور اُن کے سخت دباؤ کے باوجود کسی علمی ادبی رسالہ کا اتنا طویل سفر طے کرلینا اُردو زبان وادب کیلئے یقیناً باعثِ فخر و مسرت ہونا چاہیئے۔ شاعر کے پس پُشت کبھی اور کسی وقت بھی ایسے ہاتھ نہیں رہے جو اُسکے مالی استحکام میں مُعاون ہوتے۔ نہ شاعر کیلئے DONATIONS مانگی گئیں اور نہ ایسی ملکی وغیر ملکی تنظیموں سے سازباز کی گئی جو قلم، ضمیر اور ذہن کو خرید لیتی ہیں۔ صرف شائقینِ علم وادب کے ایک محدود حلقے کی پذیرائی نے شاعر کو اب تک زندہ رکھا ہے اور عام شماروں کے علاوہ ایسے خاص نمبروں کی اشاعت کی توفیق بخشی جو ہندوستان کے ادبی رسائل کی تاریخ میں کسی نے شائع نہیں کیئے۔ شاعر نے اپنے تمام قارئین (بشمول مستقل خریدار) کو اب تک نہایت معمولی قیمت اور قلیل زرِ سالانہ میں ہزاروں صفحات پر مشتمل بہترین ادب پیش کیا ہے۔

حالات بالکل بدل گئے ھیں

علم وادب کا اعلیٰ ذوق رکھنے والا حلقہ روز بروز سُکڑتا جارہا ہے۔ دوسری طرف اُردو زبان کے لیئے مزید نازک حالات پیدا ہوگئے ہیں اور تیسری طرف طباعتی و اشاعتی سلسلے کی ہر معمولی سے معمولی چیز کا نرخ چند سال میں بڑھتے بڑھتے آسمان پر پہنچ گیا ہے۔ بک پوسٹ، رجسٹری، وی پی اور منی آرڈر کی بڑھی ہوئی شرح میں اِس سال سے حکومت نے مزید اضافہ کرکے کُتب و رسائل کی اشاعت اور انھیں قارئین تک پہنچانے کا کام بیحد مشکل بنادیا ہے۔

شاعر کے زرِ سالانہ میں خفیف سا اِضافہ

مستقل خریداروں کی توجہ کے لیئے

کوئی بھی اِدارہ ۷۵ پیسے میں ۶۶ صفحات سے زیادہ کا پرچہ پیش نہیں کرسکتا۔ بیحد نقصان برداشت کرتے ہوئے اب تک کبھی ۷۲ اور کبھی ۸۰ صفحات پر شاعر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن اب یہ ممکن نہیں ہے۔ قارئینِ شاعر کی اکثریت چاہتی ہے کہ ہر شمارہ زیادہ ضخیم نکلے تاکہ مضامینِ نظم ونثر کی تعداد اور بھی زیادہ ہوسکے۔ یُوں بھی شاعر معاصر ماہناموں کے مقابلے میں سب سے زیادہ اور متنوع مواد پیش کرتا رہا ہے۔

منتظمینِ شاعر نے فیصلہ کیا ہے کہ شاعر کا حجم مستقلاً ۸۰ صفحات کردیا جائے۔ اسّی صفحات کے رسالہ کا زرِ سالانہ کم از کم ۱۲ روپے ہونا چاہیئے۔ مگر ہم نہیں چاہتے کہ شاعر کے مستقل خریداروں پر بہت زیادہ بار پڑے۔ اِس لیئے زرِ سالانہ میں صرف ایک روپیہ کا خفیف سا اضافہ کیا جارہا ہے۔ جولائی ۱۹۷۰ء سے شاعر کا زرِ سالانہ دس روپیہ ہوگا اور قیمت فی کاپی ایک روپیہ۔

شاعر کے ایجنٹوں سے

شاعر کے ایجنٹوں کی خواہش کے مطابق شاعر اب مستقلاً ۸۰ صفحات پر نِکلا کرے گا اور ایک روپیہ فی کاپی قیمت ہوگی۔ اُمید کہ یہ قیمت اُن حضرات کو کسی طرح بار نہ گزرے گی جو ایجنٹوں سے شاعر خریدا کرتے ہیں۔ صفحات کے اضافے کے ساتھ ایک کاپی کی قیمت میں یہ اضافہ ایجنٹوں کی کمیشن، محصول ڈاک، رجسٹری اور وی پی کی بڑھتی ہوئی شرح کو کسی حد تک برداشت کے قابل بناسکے گا۔

—— اِدارہ ——

تجربات

اُردو ادیب، شعرا، اور صحافی کہاں ہیں؟

شاعر کے پچھلے شمارہ کے "تجربات" میں فسادات کے اِنسداد کے لئے اُردو ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں پر مشتمل اُن کے اپنے اپنے علاقوں میں ایک "کونسل" کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ اُردو کے تقریباً ڈیڑھ سو ذمّہ دار ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کو "اداریہ" پر سُرخ نشان لگا کر "شاعر" بھجوایا گیا تھا، مگر افسوس کہ کسی ایک بھی ذمّہ دار ادیب، شاعر یا صحافی نے اِس سلسلے میں توجّہ نہیں دی۔

ملک میں پے در پے ہونے والے بھیانک فسادات اہم ترین قومی مسئلہ ہیں۔ یہ مُلک کو اِنتہائی تیزی کے ساتھ تباہی کی منزل کی طرف لے جا رہے ہیں۔ اگر یہ سِلسلہ جاری رہا تو ہندوستان کی تاریخ اِنتہائی داغدار ہو جائیگی اور صدیوں یہ داغ دُور نہ ہوگا۔ اگر شرپسند سیاہ طاقتوں پر قابو نہ پایا گیا تو پُورا مُلک آگ اور خون کی لپیٹ میں آجائیگا۔ اگر نسل و رنگ، قوموں اور فرقوں سے اِمتیاز برتنے، اُن سے وفاداریاں طلب کرنے اور "بھارتیانے" کی وَبا اِسی طرح پھیلتی رہی تو مُلک خانوں میں بٹ جائے گا اور یہ ہماری سب سے بڑی بدبختی ہوگی۔ شرپسند سیاہ طاقتوں کے منصوبے بڑے ہی تباہ کُن ہیں۔ یہ مُلکی اور غیر مُلکی سَرمایہ کے بَل بُوتے اور اِشاروں پر "فاشزم" کا ننگا ناچ ناچ رہی ہیں ——— بقول وزیرِاعظم اِندرا گاندھی ——— "مختلف فرقوں اور اقلیتوں کے جان و مال کے تحفّظ کی بُنیادی یقین دہانی کے بغیر مُلک کے سماجی اور معاشی ترقیاتی پروگرام کوئی معنی نہیں رکھتے"۔ سوال یہ ہے کہ یہ یقین دِہانی کِس کی طرف سے ہو؟ حکومت تو برسوں سے یقین دِہانی کرتی چلی آرہی ہے، لیکن فرقہ پرست طاقتیں اِسے بے یقینی میں بدلتی رہی ہیں اور جب تک کروڑوں غیر فرقہ پرست عوام اِن سیاہ طاقتوں کو کچلنے کے لئے صف آرا نہ ہوں گے، یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔

اُردو زبان کی بات ہو یا ہندوستان کی سب سے بڑی اِقلیت "مُسلمانوں" کی۔ حکومت کے ترقی پسند رُجحانات اور منصوبے ہوں یا دوسری اِقلیتوں کے مَسائل۔ سیاہ طاقتیں اپنی تقریروں اور تحریروں سے مُلک کے سادہ لوح عوام کو گُمراہ کرتی رہتی ہیں۔ ایک زبردست تنظیم کے تحت یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ بہت سے کثیرالاشاعت اخباروں پر اِن طاقتوں کا قبضہ ہے۔ اِن میں مددرجہ گمراہ کُن خبروں اور مضامین کی اِشاعت سے عوام کے دِلوں میں نفرت اور حقارت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ مختلف سیاسی اور مذہبی عقیدہ رکھنے والی اِقلیتوں کو ڈرایا اور دھمکایا جاتا ہے۔ اُنہیں ہر چیز سے محروم کر دینے کی دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اُنہیں معاشی اِعتبار سے بے حال بنا دینے کی شعوری کوششیں کی جا رہی ہیں۔

اِسی انتہائی نازک اور تشویشناک صورتِ حال کے پیشِ نظر اُردو اَدیبوں، شاعروں اور صحافیوں کو آواز دی گئی تھی۔ ۱۴ جُون ۱۹۷۰ء کو کانگریس کے اِجلاس میں وزیرِاعظم شریمتی اِندرا گاندھی نے بھی ادیبوں اور آرٹسٹوں سے بطورِ خاص اپیل کی تھی کہ "وہ فرقہ وارانہ اور رجعت پسندی کی مُہم باز سیاہ طاقتوں کے خلاف جنگ میں اپنی تخلیقات کے ذریعہ عوام کی رہنمائی کریں"۔ اُنہوں نے اُس کردار کا تذکرہ کیا جو ماضی میں دانشور طبقہ نے سیاہ طاقتوں کے خِلاف جنگ میں اَدا کیا تھا۔ اُنہوں نے اَدیبوں اور شاعروں سے کہا کہ "اُن میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک شمع رَوشن کرے تاکہ اُن شمعوں کی رَوشنی سے اَندھیرے دُور ہو جائیں"۔

یقیناً اُردو اور ہندوستان کی دُوسری زبانوں کے اَدیب، صحافی اور شاعر مل کر کروڑوں ہندوستانی عوام کے دِلوں اور دماغوں سے اُس زہر کو نکال سکتے ہیں جو فرقہ پرست جماعتوں نے بھر دیا ہے۔ مگر اِس کے لئے زبردست تنظیم اور مُہم کی ضرورت ہے۔ تنہا تخلیقات ذہنوں کو نہیں بدل سکتیں۔ آگے آیئے اور مُلک و قوم کو تباہی سے بچایئے۔

مدیر

ضیا فتح آبادی

طرب سے بھر گیا جب دل، طرب خانے کا کیا ہو گا
نہ ہو گی تشنگی باقی تو پیمانے کا کیا ہو گا
کسی کی کم نگاہی کا صلہ معلوم ہے لیکن
دلِ دردآشنا، انجام غم کھانے کا کیا ہو گا
یونہی جلتی رہیں صحراؤں میں جو بستیاں پیہم
تو پھر مجبور خانماں برباد دیوانے کا کیا ہو گا
نہ پائی ابتدا اہلِ جنوں نے آج تک جس کی
خدا معلوم انجام ایسے افسانے کا کیا ہو گا
لہو دے کر ہی رکھ لی آبروئے گل، نہ یہ سوچا
بہار آئی گلستاں میں تو کاشانے کا کیا ہو گا
یہ آنا کوئی آنا ہے، یہ جانا کوئی جانا ہے
خوشی آنے کی کیا ہو گی، الم جانے کا کیا ہو گا
دلہن بن کر سجی بیٹھی ہے بزمِ شب ضیا دیکھیں
فریبِ شمعِ سوزاں کھا کے پروانے کا کیا ہو گا

غزلیں

احمد عظیم آبادی

ہر جنبشِ لب حرفِ رفاقت تو نہیں ہے
احساس کی پرچھائیں کی صورت تو نہیں ہے
میزان شکنی شانِ عدالت تو نہیں ہے
یہ بات مگر آپ پہ تہمت تو نہیں ہے
کیوں غیر کو یہ غیر کے انداز میں دیکھے
آئینہ کوئی چشمِ کدورت تو نہیں ہے
ہر گام ستارہ کہ بہر گام شرارہ
رفتارِ زمانہ ہے قیامت تو نہیں ہے
خاموشیٔ تجسس کوئی عنوان بتائے
فہرست میں ہونٹوں کی عبارت تو نہیں ہے
ویرانے سے گذرا تو گماں گذرا ہے احمد
کاشانۂ مرحوم کی تربت تو نہیں ہے

عصمت جاوید

غالب کے چند غیر متداول اشعار کی شرح

یہ عجیب اتفاق ہے کہ نسخۂ حمیدیہ، کو جو مفتی انوار الحق کی حسنِ توجہ سے ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا تھا منظرِ عام پر آئے ہوئے تقریباً نصف صدی کا عرصہ ہو رہا ہے۔ اور اس طویل عرصے میں غالب برابر شہرت کی منزلیں طے کرتے رہے۔ لیکن دل دادگانِ غالب کی نظریں اس دیوان کی طرف نہیں اٹھیں جس میں خزف ریزوں کا ایک ڈھیر سہی۔ لیکن اسی ڈھیر میں ایک نہیں بلکہ متعدد لعلِ بے بہا بھی چھپے ہوئے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ نسخۂ حمیدیہ کے شائع ہوتے ہی شارحینِ غالب کی توجہ اس پر مرکوز ہو جاتی اور وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے کہ آخر وہ کون سے اشعار ہیں جنہیں مرزا نے قلمزد کر دیا۔ کیا واقعی یہ سب اشعار دفترِ بے معنی کا حکم رکھتے ہیں۔ یا گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس گیا ہے۔ اب سے چند برس قبل کچھ نقادوں نے غالب کے فنی ارتقاء کو سمجھنے کے سلسلے میں اس کلام مطرود سے ضرور استفادہ کیا۔ لیکن کسی کو اس کلام کے نسبتاً آسان حصے کی شرح لکھنے کا خیال بھی پیدا نہیں ہوا اور یہ بڑی تعجب خیز بات ہے کہ بقول عبدالباری آسی۔ جناب شہا، حضرت بیخود موہانی و بیخود دہلوی کی شرحیں اس وقت تیار کی گئی ہیں۔ جب نسخۂ حمیدیہ چھپ چکا تھا۔ اسی طرح نظم طبا طبائی نے بھی اس طرف توجہ نہیں فرمائی۔ اور نہ اثر لکھنوی۔ حسرت موہانی اور نیاز فتحپوری نے اس کلام کو قابلِ اعتنا سمجھا[1] سب سے پہلے جناب عبدالباری آسی نے اس بارِ گراں کو اپنے کندھوں پہ اٹھایا۔ اور غالباً پہلی بار اردو داں طبقے پر عموماً اور شائقینِ غالب پر خصوصاً اس حقیقت کا انکشاف کیا کہ اگرچہ اس دیوان میں الجھی ہوئی ترکیبوں، ژولیدہ بیانی۔ دور از کار تشبیہوں اور خیالی مضامین کی بھرمار ہے۔ لیکن اس کے باوصف اس میں ایسے کئی اشعار بھی ہیں جن پر اردو شاعری بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ اور جن کی شرح کی سخت ضرورت ہے۔ یہ کام بڑا دشوار، محنت طلب بلکہ جانگداز تھا۔ لیکن مولانا عبدالباری آسی لائقِ صد ستائش ہیں کہ انہوں نے یہ دشوار گزار راستہ طے کیا۔ انہوں نے نسخۂ حمیدیہ کے تمام اشعار کی شرح تو نہیں لکھی" کیونکہ بقولِ خود "بعض اشعار کی پیچیدگیٔ ترکیب اور ژولیدگیٔ بیان نے ان کے حل کرنے کی ہمت ہی نہ بندھنے دی۔

---

[1] "شاعر" کے غالب نمبر میں ڈاکٹر گیان چند کا ایک مضمون "دقائقِ غالب" کے نام سے چھپا ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے یہ اطلاع دی ہے۔ کہ انہوں نے غالب کے ابتدائی دور کے کلام کی مکمل شرح لکھی ہے۔ اور مذکورہ مضمون میں چند قلمزد اشعار کی شرح بھی پیش کی ہے۔ عصمت جاوید

لہٰذا اُن کو نظر انداز کر دیا۔" لیکن اِس سے اُن کی شرح کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ اپنی شرح کے متعلق دیباچے میں فرماتے ہیں
"میں اپنی سمجھ کے موافق اور اپنے اِدراک کے مطابق معانی بیان کئے ہیں۔ مگر میں جانتا ہوں کہ میرے کسی فیصلے سے نقادوں کی مطالب آفریں ذہنیت پر مُہرِ خاموشی نہیں لگ سکتی اور دوسرے معانی بیان کرنے کی گنجائش رہ جاتی ہے۔۔۔۔۔ کسی جدید تصنیف کا اِنعام اِس زمانے میں یہی ہے کہ لوگ اِس پر جی کھول کر اعتراض کریں۔ اور غریب مصنّف دم نہ مارے۔ پھر خلافِ قانونِ قدرت میری شرح اور میں کیوں کر ایسے اعتراضات سے بچ سکتے ہیں۔"

معلوم ہوتا ہے کہ دیگر شارحینِ غالبؔ نے مولانا کی متداول دیوانِ غالبؔ کی شرح سے جس طرح اختلاف کیا ہے، اُس سے وہ دِل برداشتہ اور بدظن ہوگئے تھے۔ اسی لئے یہ فقرے اُن کے قلم سے نکل گئے ہیں۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ غالبؔ کے کسی بھی شعر کی بیان کردہ شرح سے اختلاف کرنے کا حق ہر اُس شخص کو پہنچتا ہے، جو غالبؔ کو سمجھنا چاہتا ہے۔ اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ غالبؔ کے پہلو دار کلام کے سمجھنے میں اختلاف کی کافی گنجائش ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ بیجا موشگافیوں سے کام نہ لیا جائے۔ اور ایسے معانی بیان کرنے کی کوشش نہ کی جائے اور نہ ان پر اصرار کیا جائے جن کے غالبؔ کے اشعار متحمل ہی نہیں ہو سکتے۔ اِس سلسلے میں کلامِ غالبؔ جس طرح تحسینِ ناشناس کا شکار رہا ہے۔ اس کی وضاحت کے لئے ایک علیٰحدہ مضمون درکار ہے۔ بہرحال اِس حقیقت کے اِعتراف کے باوجود کہ حضرت آسیؔ الدنی نے نسخۂ حمیدیہ کے اکثر اشعار کی گتھیاں حل کی ہیں۔ اور اُن کی محنت قابلیت اور خلامت کا اعتراف کرنے کے باوصف اُن کی بعض شرحوں سے دیانتدارانہ طور پر اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ اِس سے شارحِ اوّل کی تنقیص کا پہلو نہیں نکلتا۔ جو بہرحال فضلِ تقدم کا حقدار ہے۔ بلکہ اس طرح کلامِ غالبؔ کے پوشیدہ گوشوں کو منظرِ عام پر لایا جا سکتا ہے۔ اِسی مقصد کے پیشِ نظر مضمون ہٰذا میں اِن کی بعض شرحوں سے اختلاف کیا گیا ہے۔

حضرت آسیؔ کی مذکورہ شرح ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی تھی جسے آج تقریباً انتالیس ۳۹ سال ہو رہے ہیں۔ لیکن جہاں تک مجھے علم ہے۔ نسخۂ حمیدیہ پر اُن کے علاوہ سوائے جناب وجاہت سندیلوی کے کسی نے خاص توجہ نہیں دی۔ اِس موضوع پر اُن کی کتاب 'باقیاتِ غالبؔ' جو ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی ہے' میرے سامنے ہے، اِس کتاب کے آخر میں انہوں نے نسخۂ حمیدیہ اور دیگر ذرائع سے حاصل شدہ کلامِ غالبؔ کا بڑا عمدہ انتخاب پیش کیا ہے، اور غیر متداول کلام خصوصاً نسخۂ حمیدیہ کے اکثر اشعار کی شرح بھی کی ہے جو نہایت عمدہ ہے۔ اُن کی شرح پڑھنے سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت آسیؔ کی شرح اُن کی نظر سے گزر چکی ہے۔ اِن کی بھی بعض شرحوں سے ایماندارانہ اختلاف ممکن ہے۔ طوالت کے خوف سے اِس مضمون میں صرف اُن چند اشعار پر ذاتی رائے پیش کرنے پر اکتفا کی گئی ہے جن کی شرح کے بارے میں راقم کو دونوں شارحین سے اِختلاف ہے، اِس مضمون میں یہ التزام کیا گیا ہے کہ راقم نے ذاتی رائے یا وجہ اختلاف پیش کرنے سے قبل اوّلاً حضرت آسیؔ اور اُس کے بعد جناب وجاہتؔ کی شرح نقل کی ہے۔ تاکہ قارئین کے سامنے تینوں رائیں ہوں اور وہ خود فیصلہ کر سکیں کہ شاعر کے اصل مفہوم سے کون قریب تر ہے۔

(۱) شب نظارہ پرور تھا خواب میں خیال اُس کا — صبح موجۂ گل کو نقشِ بوریا پایا

آسیؔ:- "رات میں نے اُس کو خواب میں دیکھا اور اُس نے میری نظارہ پروری کی۔ صبح اُس کا یہ اثر تھا کہ میرا بوریا موجِ گل بن گیا تھا۔"

وجاہت ۔ " رات کو معشوق کے خیال نے خواب میں بڑے حسین منظر دکھائے ۔ چنانچہ اس کا اثر یہ ہوا کہ صبح کو اپنے بوریے کے نقش کو موجۂ گل پایا۔

" اس سے لطیف تر معنی یہ بھی کہ رات کو معشوق کے خیال نے خواب میں بڑے حسین منظر دکھائے ۔ لیکن صبح جب آنکھ کھلی تو جہاں رات کو ہم موجۂ گل کو دیکھ رہے تھے وہاں اپنے نقش بوریا کو بدستور پایا۔ وہی مثل کہ رہیں جھونپڑی میں اور خواب دیکھیں محلوں کے ۔ "

حضرت آسی نے جو معنی بتائے ہیں اور جس کی تائید جناب وجاہت نے کی ہے شعر اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ مصرع ثانی واضح ہے۔ مثلاً۔ " صبح موجۂ گل کو نقش بوریا پایا" موجۂ گل کے ساتھ حرف 'کو' کے استعمال سے مطلب واضح ہو جاتا ہے۔ پھر بوریا "کو" موجۂ گل کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے۔ وجاہت صاحب نے جو دوسرے معنی بتائے ہیں وہی صحیح ہو سکتے ہیں۔ یعنی صبح جب آنکھ کھلی تو وہی چیز جسے ہم خواب میں موجۂ گل سمجھ رہے تھے وہ نقش بوریا تھا۔ نقش بوریا یا نقش حصیر اُن لہریا نشانات کو کہتے ہیں جو بوریا یا چٹائی بچھانے سے زمین پر پڑ جاتے ہیں۔ ان نشانات سے موجۂ گل کی مشابہت واضح ہے۔ [1]

(۲) اگر آسودگی ہے مدّعائے رنجِ بیتابی — نثارِ گردشِ پیمانۂ مے روزگار اپنا

آسی ۔ " اگر رنج بے تابی کا مدعا آسودگی ہے تو ہم باز آئے۔ ہم گردش پیمانۂ مے پر اپنی زندگی نثار کرتے ہیں۔ دوسرے معنی یہ بھی ہیں اور میرے نزدیک یہ پہلے معنی سے زیادہ اچھے ہیں کہ پیمانے کی گردش اور رنج بیتابی کا نتیجہ آسودگی ہے تو ہم اس کے قربان ۔ "

وجاہت ۔ " اگر رنج بیتابی کا مدّعا آسودگی ہے تو ہم یہ آسودگی نہیں چاہتے ۔ ہم اپنی زندگی گردش پیمانۂ مے پر قربان کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ عبدالباری آسی نے اپنی شرح میں دوسرے بھی معنی لکھے ہیں ۔ (اگر پیمانے کی گردش ۔ ۔ ۔ ہم اس کے قربان)"

میرے خیال میں شعر کے صرف دوسرے معنی جن کی طرف حضرت آسی نے اشارہ کیا ہے صحیح ہیں۔ غالب نے یہی بات اس مشہور شعر میں کہی ہے۔ " مے سے غرض نشاط ہے ۔ ۔ ۔ الخ " شاعر گردش روزگار سے تنگ ہے کیونکہ اس کی بدولت اُس کے حصے میں رنج بیتابی آیا ہے۔ وہ پیمانۂ مے کی گردش کو بھی دیکھتا ہے جس میں گردش تو ہے لیکن جس کا مدّعا آسودگی ہے۔ اسلئے شاعر کا خیال ہے کہ اگر اس گردش سے پیمانے کا مدّعا آسودگی دینا ہے تو ہم بھی اپنی زندگی اُس کی گردش پر قربان کر دیتے ہیں۔ یعنی شغل مے نوشی میں ہم اپنی زندگی صرف کر دیں گے۔

(۳) جاں دادگاں کا حوصلہ فرصت گداز ہے — یاں عرصۂ تپیدنِ بسمل نہیں رہا

آسی ۔ " جو لوگ کہ جان دے رہے ہیں اُن کا حوصلہ یہی ہے کہ اُن کے زمانۂ فرصت کو فنا کر رہا ہے اسی لئے اس میدان میں تپیدن بسمل کا عرصہ نہیں رہا۔ یعنی جو جاں دادہ ہیں اُن کے حوصلے نے اُنہیں تڑپنے کی مہلت بھی نہ دی اور دم بھر میں ختم کر دیا۔ "

---

[1] ڈاکٹر گیان چند نے بھی تقریباً یہی معنی لکھے ہیں۔ اصل شعر میں مصرعِ اولیٰ میں خیال کی جگہ "خرام" ہی ہے مولانا عرشی کے بیان کے مطابق مرتب نسخۂ حمیدیہ نے سہواً خرام کی جگہ خیال نقل کیا ہے۔ چونکہ مولانا آسی اور وجاہت سندیلوی کے پیش نظر یہی نسخہ تھا۔ اس لئے اُنہوں نے خیال ہی نقل کیا۔ عصمت جاوید

وجاہت :۔ اِس شعر کی شرح نہیں لکھی۔

حضرت آسی کی شرح صحیح ہے۔ لیکن اِس میں جان دینے والوں کے حوصلے کی وضاحت نہیں کی گئی کہ وہ کس طرح "فرصت گداز" ہے۔ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ جان دینے والے اپنے محبوب پر جان دینے کے لئے اتنے بیقرار تھے اور اُن کا حوصلہ اِتنا بلند تھا کہ وہ اِس کام میں ایک لمحہ بھی ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اور زندگی سے اپنا رشتہ فوراً منقطع کرنا چاہتے تھے۔ شاعر نے اِس مفہوم کو "فرصت گدازِ" کی جامع ترکیب سے ظاہر کیا ہے۔ چونکہ بسمل بڑی دیر تک تڑپ تڑپ کر جان دیتا ہے، یعنی وہ زندگی اور موت کے درمیان معلق رہتا ہے۔ اِس لئے جان دینے والوں کو یہ تڑپنا جس میں زندگی کا رشتہ قائم رکھنا پڑتا ہے پسند نہ تھا۔ اِس لئے اُنہوں نے اِس میدان کو جس میں بسمل تڑپتا ہے۔ پسند نہیں کیا اور آناً فاناً جان دیدی جو اُن کے حوصلے پر دال ہے۔ اِس شعر میں فرصت اور عرصہ میں ایہام تناسب ہے۔

(۴) ذوقِ سرشار سے بے پردہ ہے طوفاں میرا موجِ خمیازہ ہے ہر زخم نمایاں میرا

آسی :۔ " اپنے ذوقِ سرشار یعنی تماشا جوش نے میرے دِل کا طوفان بالکل بے حجاب ہو گیا ہے اور میرا ہر زخم نمایاں اُس طوفان کی ایک موجِ خمیازہ ہے، گویا طوفانِ دِل موج سی انگڑائیاں لے رہا ہے اور اپنے ذوقِ سرشار کی وجہ سے بالکل عریاں نظر آتا ہے۔ "

وجاہت :۔ " کم و بیش یہی مفہوم ہے وہ بھی خمیازہ کو انگڑائی کے معنوں میں اِستعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ " موجِ خمیازہ سے مُراد وہ موج ہے جو ساحل سے ٹکرا کر واپس لَوٹ رہی ہو۔ "

میرے خیال میں آسی نے صحیح مفہوم لکھا ہے۔ لیکن اُنہوں نے خمیازہ کو انگڑائی کے معنوں میں اِستعمال کر کے شعر کو اُس کے حقیقی مفہوم سے دُور کر دیا ہے۔ خمیازہ کے معنی انگڑائی بھی ہیں اور جماہی بھی۔ غالب نے ہمیشہ اِس لفظ کو جماہی کے معنوں میں اِستعمال کیا ہے۔ موجِ خمیازہ سے جماہی آنے کی صورت میں دہن کے عضلات میں جو پھیلاؤ پیدا ہوتا ہے، اُس کی طرف اِشارہ ہے۔ دہانِ زخم اور جماہی میں مناسبت ظاہری ہے۔ طوفان کی رعایت سے موج کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ سرشار کے لفظی معنی "لبریز" کے ہیں۔ غالب ایک خط میں لکھتے ہیں۔ " لسانِ فارسی میں سرشار صفت ہے پیالے کی۔ معنی لفظی اِس کے لبریز "[۱]

(۵) عروجِ نا اُمیدی چشمِ زخمِ چرخ کیا جانے بہارِ بے خزاں از آہِ بے تاثیر ہے پیدا

آسی :۔ " چشمِ زخمِ چرخ کو نا اُمیدی کے عروج کا حال کیا معلوم۔ وہ کیا جانے کہ نا اُمیدی کا عروج کیونکر ہوتا ہے۔ اگر بہارِ بے خزاں دیکھنا ہے تو ہماری آہِ بے تاثیر کو دیکھے۔ "

وجاہت :۔ " فلک کی آنکھ جو ہر کسی کی بد اندیش ہے وہ نا اُمیدی کے عروج کو کیا سمجھ سکتی ہے۔ میری آہِ بے تاثیر سے ایک ایسی بہار پیدا ہے جو بے خزاں ہے ..... "

میرے خیال میں دونوں شارحین کو تسامح ہوا ہے، اُنہوں نے فاعل کو مفعول اور مفعول کو فاعل قرار دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاعر نے اِس شعر میں عروجِ نا اُمیدی یعنی انتہائے مایوسی کی کیفیت کا اظہار بڑی کامیابی سے کیا ہے۔ اُس کا کہنا یہ ہے کہ انتہائے مایوسی زخمِ چرخ کی کیا اُمید رکھے۔ (چشم داشتن = اُمید رکھنا) یا پھر زخم لگانے والی چشم چرخ کو یعنی مظالمِ چرخ کو کیا جانے۔ وہ ان سے بے نیاز ہے۔ وہ تو اپنی آہِ بے تاثیر میں مگن ہے۔ جو اُس کے لئے بہارِ بے خزاں کا حکم رکھتی ہے۔ بہارِ بے خزاں اِس لئے کہا کہ یہاں اُمید و بیم کی بہار و خزاں کی گنجائش نہیں ہے۔

---

[۱] ادبی خطوطِ غالب صفحہ ۱۱۴۔ ۱۱۵۔ مرتبہ مرزا محمد عسکری۔ طبع ہفتم

(۶) بہ امیدِ نگاہِ خاص ہوں محمل کشِ حسرت — مبادا ہو عناں گیرِ تغافل لطفِ عام اُس کا

آسی :- "میں ایک نگاہِ خاص کی اُمید پہ محملِ حسرت کھینچ رہا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُس کا لطفِ عام اُس کو تغافل پر آمادہ کرے یعنی وہ یہ سمجھے کہ سب میں یہ بھی شریک ہے۔ پھر نگاہِ خاص کی کیا احتیاج ہے۔ عناں گیر اور محمل کشِ حسرت دونوں الفاظ مناسب ہیں۔"

وجاہت :- "یہی شرح نقل کر دی ہے۔ اپنی طرف سے کچھ اضافہ نہیں کیا۔

"حضرت آسی نے مفہوم تو خوب نکالا ہے۔ لیکن عناں گیرِ تغافل کے معنی اُنہوں نے آمادگیٔ تغافل کے لئے ہیں۔ بظاہر عناں گیر سے روکنے کا مفہوم نکلتا ہے۔ "آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا۔" اس لئے میرے خیال میں یہ شرح مناسب ہوگی۔ محبوب کی نگاہِ خاص کی اُمید شاعر کے حق میں حسرت بن گئی ہے۔ اور عالم یہ ہے کہ محبوب کا لطفِ عام ہے۔ عاشق کو یہ خوف ہے کہ کہیں محبوب کا یہ لطفِ عام عناں گیرِ تغافل نہ ہو جائے۔ یعنی وہ شیوۂ تغافل نہ چھوڑ دے۔ ایسی صورت میں جبکہ محبوب کا لطف و کرم ہر کس و ناکس پر ہے۔ شاعر تغافل ہی کو نگاہِ خاص سمجھنے پر مجبور ہے، بقولِ مومن ؎

"اُس کا نہ دیکھنا نگہِ التفات ہے"

(۷) لڑا دے گر وہ بزمِ مے کشی میں قہر و شفقت کو — بھرے پیمانۂ صد زندگانی ایک جام اُس کا

آسی :- "اگر شراب نوشی کی محفل میں وہ مہربانی و قہر دونوں کو لڑا دے یعنی دونوں سے کام لے تو بلا شک اُس کا ایک جامِ زندگی کے سو پیمانے بھر دے۔ یعنی اُس کی ایک مہربانی سو قہر پیدا کرے۔"

وجاہت :- شرح نہیں کی۔

"پیمانۂ زندگی پر شدن" فارسی محاورہ ہے۔ جس کے معنی مر جانے کے ہیں۔ خود غالب نے کہا ہے۔

شاید کہ مر گیا ترے رُخسار دیکھ کر — پیمانہ رات ماہ کا لبریزِ نور تھا

خیام کے اس مصرع۔ "زاں پیش کہ پر کنند پیمانۂ ما" میں بھی موت سے کنایہ ہے۔ شعرِ مذکور میں پیمانۂ صد زندگی بھرنے سے مراد یہ ہے کہ "سیکڑوں آدمیوں کی جان لے لے" ظاہر ہے کہ جب ساقی کسی پر مہربان ہوگا اور کسی پر عتاب نازل کرے گا تو میخوار آپس میں لڑ کر جان دے دیں گے۔ یا شفقت سے ایک جام کسی ایک میخوار کو دے گا۔ تو وہ دوسروں کے حق میں قہر ہوگا۔ ایک شفقت سے مریگا۔ باقی قہر سے۔

(۸) اسدؔ سودائے سر سبزی سے ہے تسلیم رنگیں تر — کہ کشتِ خشک اُس کا، ابرِ بے پروا خرام اُس کا

آسی :- "اے اسدؔ سر سبزی کے خیال سے تسلیم کا شیوہ بہت بہتر ہے اور حصولِ مقصد کی تمنا سے نا اُمیدی اور ناکامی کا طریقہ اچھا ہے۔ کیونکہ اس حالت میں دونوں کا تقابل ہو جائیگا۔ اِدھر اُس کا کھیت خشک ہوگا اور اُدھر اُس کا ابرِ بے پروا خرام ہوگا۔ نہ اُس کو اس کی خواہش ہوگی اور نہ اُس کو اُس کی تمنا ہوگی۔"

وجاہت :- شرح نہیں کی۔

میرے خیال میں حضرت آسی اصل مطلب سے ہٹ گئے ہیں۔ خاص طور پر مصرعِ ثانی کا مطلب واضح نہیں ہو سکا۔ اس شعر کا مطلب صاف ہے۔ شاعر شیوۂ تسلیم و رضا سودائے سر سبزی (پھلنے پھولنے یا سر سبز و شاداب ہونے کی دھن) پر ترجیح دے رہا ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ اگر تمہارا کھیت سوکھا ہو تو اُس کی سر سبزی کے لئے بادل کی تمنا نہ رکھو، بلکہ تسلیم و رضا کا طریقہ اولیٰ ہے پر عمل کرو۔ کیونکہ سوکھا کھیت بھی اُسی کا ہے۔ اور اگرچہ ابر بھی اُسی کا ہے۔ ابرِ بے پروا خرام کہہ کر شاعر

بڑی لطافت سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کبھی کبھی بادل کھیت پر سے بغیر برسے ہوئے یعنی بے پروائی سے گزر جاتے ہیں۔ رنگیں تر، سرسبزی کی رعایت سے استعمال ہوا ہے اور خوب ہے۔

(۹) مژگاں تلک رسائیِ لختِ جگر کہاں — اے وائے گر نگاہ نہ ہو آشنائے گل

آسی:۔ "بڑا افسوس ہے اگر ہماری نگاہ گل پر نہ پڑ سکے۔ اس لئے کہ اگر ایسا نہ ہو تو اس کا بدل صرف یہ ہے کہ پھر ہم لختِ جگر کو دیکھ کر یادِ گل تازہ کریں۔ سو لختِ جگر کی رسائی مژگاں تک ہو کہاں سکتی ہے....!"

وجاہت:۔ "جگر کے ٹکڑے پلکوں تک کہاں پہنچ سکتے ہیں۔ یعنی ہم جی بھر کر کہاں رو سکتے ہیں۔ اگر نگاہ پھولوں کی قدرداں نہ ہو تو بڑے افسوس کا مقام ہے۔ کیونکہ لختِ جگر کا نعم البدل پھول ہی ہو سکتے ہیں — پھول ہی دیکھ کر ہم اپنے لختِ جگر کو بھول سکتے ہیں۔"

میرے خیال میں یہاں شاعر نے گل کو بطور استعارہ استعمال کیا ہے۔ یعنی بمعنی محبوب۔ عام حالات میں جگر کے ٹکڑے مژگاں تک پہنچ نہیں سکتے۔ لیکن ایسا صرف محبت میں ممکن ہے۔ محبت میں جب عاشق اپنے محبوب کے لئے روتا ہے تو اس کی پلکوں سے جگر کے ٹکڑے برسنے لگتے ہیں۔ چونکہ محبت میں یہ کرشمہ ممکن ہے۔ اس لئے شاعر اس نگاہ پر افسوس کرتا ہے۔ جو آشنائے گل یعنی آشنائے محبوب نہیں۔ لختِ جگر اور پھول میں رعایت ہے۔

(۱۰) تماشائے گلشن تمنائے چیدن — بہار آفرینا، گنہگار ہیں ہم

آسی:۔ "اے بہار پیرائے عالم بے شک ہم تیرے گنہگار ہیں اور یقینی تیرے عاصی ہیں کہ تیرے ماسوا ہم کو پھول چننے کی یا گلشن کے تماشے کی تمنا ہے۔ ہم کو چاہیے تھا۔ کہ تیرے سوا اور کسی کی تمنا نہ رکھتے۔"

وجاہت:۔ "گلشن کا تماشا دیکھا اور کچھ پھولوں کے چننے کی تمنا کی اے (کذا) بہار آفرینا! کیا اتنی ہی خطا پر ہم گنہگار ہو گئے!"

اس شعر سے یہ لطیف تر پہلو بھی نکلتا ہے اور کیا عجب کہ شاعر کا اصل مقصود بھی یہی ہو۔ اے بہار آفریں، تو نے باغ میں بہار پیدا کی جس کی وجہ سے ہمارے دل میں تماشائے گل کی خواہش تو پیدا ہوئی۔ لیکن تماشائے گلشن ہمارے دل میں پھول توڑنے کی تمنا بھی پیدا کی۔ تماشائے گلشن، تمنائے چیدن کا باعث بنا اور ہم تیرے باغ سے پھول چننے لگے۔ اس طرح تیری بہار کو برباد کرنا چاہا۔ ہم تیرے گنہگار ہو گئے۔ کیونکہ ہم نے تیری قائم کی ہوئی رونق کو برباد کرنا چاہا۔

(۱۱) بہ وحشت گاہِ امکاں اتفاقِ چشم مشکل ہے — مہ و خورشید باہم سازِ یک خوابِ پریشاں ہیں

آسی:۔ شرح نہیں کی۔

وجاہت:۔ "وحشت کدۂ امکاں میں کسی دو چیزوں میں اتفاقِ چشم پایا جانا بہت مشکل ہے رہا یہ کہ مہتاب اور آفتاب میں اتفاقِ چشم دیکھا جاتا ہے تو محض ایک خوابِ پریشاں کا فریب ہے۔ در اصل اس کی کوئی حقیقت نہیں۔"

میں سمجھتا ہوں کہ اتفاقِ چشم سے یہاں شاعر کی مراد دونوں آنکھوں کے بیک وقت یکجا ہونے سے ہے۔ یعنی اس وحشت کدۂ عالم میں دونوں آنکھیں ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں جو وحشت کا لازمی نتیجہ ہے اور مہ و خورشید دونوں مل کر ایک خوابِ پریشاں کی تخلیق کرتے ہیں۔ شاعر نے مہ و خورشید کا ذکر اس لئے کیا کہ دونوں آنکھ سے مشابہ ہیں۔ اور اتفاقِ چشم کے نہ ہونے کا جواز اس طرح پیدا کیا کہ دونوں آسمان میں بیک وقت ایک ساتھ نہیں ہوتے یا پھر ممکن ہے کہ شاعر کی مراد اتفاقِ چشم سے اتفاقِ رائے ہو۔ یعنی دونوں آنکھوں کا بیک وقت ایک چیز کو دیکھنا اور آپس میں متفق ہو جانا کہ فلاں

چیز دیکھی ہے۔ اور یہ اس وحشت گاہ میں ممکن نہیں جہاں چاند سورج شبانہ روز خواب پریشاں کی تخلیق کرتے ہیں۔

(۱۲) بے دماغی حیلہ جوئے ترکِ تنہائی نہیں ورنہ کیا موجِ نفس زنجیرِ رسوائی نہیں

آسی :- " اصل یہ ہے کہ ہم اپنی بددماغی کی وجہ سے ترکِ تنہائی کا حیلہ نہیں ڈھونڈتے اور تنہائی کو بُرا سمجھنے کی کچھ دلیلیں قائم نہیں کرتے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ تنہائی بھی کوئی بڑی عمدہ چیز نہیں ہے۔ اور اگر ہے بھی تو تنہائی میسر کہاں ہے۔ کیونکہ کہیں بھی جائیں اور کیسی ہی تنہائی اختیار کریں پھر بھی آمد و رفتِ نفس سے چھٹکارا نہیں ہے۔ اور جب یہ رسوائی ہے تو تنہائی کہاں۔

وجاہت :- " ہم نے جو تنہائی ترک کر دی تو اپنے اس فعل کے لئے ہماری بے دماغی کوئی تاویل نہیں پیش کرنا چاہتی۔ ورنہ واقعی (واقعہ) تو یہ ہے کہ نفس کی آمد و شد خود ایک زنجیرِ رسوائی ہے۔ تنہائی میسر ہی کہاں ہے جو اُسے ترک کیا جائے؟"

میری رائے میں آسی شعر کے مفہوم کے زیادہ قریب ہیں۔ آسی کہتے ہیں کہ شاعر نے تنہائی ترک نہیں کی ہے، وجاہت کا کہنا ہے کہ اُس نے تنہائی ترک کر دی، لیکن دونوں اس پر متفق ہیں کہ تنہائی میسر کہاں ہے۔ میرے خیال میں شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ یہ غلط ہے کہ ہم خوفِ رسوائی سے عزلت گزیں ہو گئے ہیں۔ کیونکہ زندگی خود رسوائی ہے۔ (کیا موجِ نفس زنجیرِ رسوائی نہیں ہے) خواہ ہم تنہا رہیں یا محفل کریں۔ رسوائی سے چھٹکارا نہیں ہے۔ اس کے باوجود اگر ہم تنہائی ترک نہیں کرتے تو یہ ہماری بے دماغی کی بدولت ہے۔ مراد یہ کہ ہم خوفِ رسوائی سے نہیں بلکہ بے دماغی کے باعث تنہا رہتے ہیں۔!

(۱۳) فریبِ صنعتِ ایجاد کا تماشا دیکھ نگاہ عکس فروش و خیال آئینہ ساز

آسی :- " صنعتِ ایجاد کے اس فریب کو ذرا غور سے دیکھئے۔ نگاہ عکس فروش ہے اور خیال آئینہ ساز ظاہر ہے کہ آنکھ میں جو عکس پڑتا ہے وہی ظاہر کرتی ہے یا یہ کہ نگاہ برابر عکسِ معشوق دکھا رہی ہے اور خیال آئینے تیار کرتا جاتا ہے۔ یعنی میرے فریب دینے کے لئے دونوں آمادہ ہیں۔"

وجاہت :- " صنعتِ ایجاد کے فریب کا تماشا دیکھ۔ نگاہ عکس بیچ رہی ہے اور خیال آئینے تیار کر رہا ہے۔ مطلب یہ کہ نگاہ حسین منظر دیکھ رہی ہے اور انہیں کی بنیاد پر خیال تصورات کے ہوائی قلعے بنا رہا ہے۔"

وجاہت صاحب نے عکس فروشی کو عکس بیچنا لکھا ہے جو فاش غلطی ہے۔ عکس فروش یعنی عکس کا اظہار کرنے والا۔ جیسے حیرت فروش۔ خود فروش۔ ع :- ("علم موسیٰ بھی ہے جس کے سامنے حیرت فروش" خضرِ راہ۔ (اقبال) ..... آسی صاحب نے پتہ نہیں کیوں اس شعر کو معشوق یا عکسِ معشوق تک محدود کیا ہے۔ اسی طرح وجاہت صاحب کا یہ کہنا بھی محلِ نظر ہے کہ پہلے نگاہ مناظر دیکھتی ہے اور انہیں کی بنیاد پر خیال تصورات کے ہوائی قلعے بناتا ہے۔ کیونکہ شاعر اس کے بالکل برعکس بات کہہ رہا ہے۔ صنعتِ ایجاد سے واضح طور پر شاعر کا اشارہ اس کائنات کی طرف ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ یہ صنعتِ ایجاد فریب ہے۔ اسی بات کو اس طرح بھی ادا کیا ہے۔ ؎

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

جز وہم نہیں صورتِ عالم مجھے منظور جز نام نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

دراصل خیال آئینہ بناتا ہے اور نگاہ اُس میں پڑے ہوئے عکس کا اظہار کرتی ہے۔ ورنہ حقیقت میں اشیاء

کا وجود خارجی نہیں۔ یہ صنعت ایہام فریب ہے۔

(۱۴) بے دماغی شکوہ سنج رشکِ ہم دیگر نہیں   یار تیرا جامِ مے خمیازہ میرا آشنا

اِس شعر کی تشریح میں آسی اور وجاہت دونوں نے خمیازہ کو بھرا نگڑائی کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ حالاں کہ اِستعمالِ شراب میں جماہی لینے سے کھلے ہوئے منہ کے ساتھ جامِ مے کو مناسبتِ صوری ہے۔ مع :۔ "تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا"
اِس مصرع میں بھی خمیازہ صرف جماہی کے معنوں میں اِستعمال ہوا ہے۔

(۱۵) ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار   سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گُل نا آشنا

آسی :۔ "بہار اجزائے وحشت کے شیرازے کا ربط ہے۔ یعنی بہار کی وجہ سے اجزائے وحشت جمع ہو گئے ہیں۔ کیونکہ سبزہ بیگانہ ہے۔ صبا آوارہ ہے۔ اور گُل نا آشنا ہے۔"

وجاہت :۔ "بہار کے یہ اجزاء ایک شیرازۂ وحشت کے پابند ہیں اور ان میں کوئی ہم آہنگی نظر نہیں آتی۔ اس سے زیادہ لطیف معنی یہ ہیں کہ ..... ان مختلف الصفات اجزاء کے درمیان ایک ناقابلِ فہم ضبط و نظم قائم ہے۔ اور یہ سب مل کر بہار کی تخلیق کرتے ہیں۔"

حالانکہ شاعر صرف یہ کہنا چاہتا ہے کہ مختلف اجزائے بہار یعنی سبزہ، صبا اور گُل وغیرہ میں ایک قدرِ مشترک جو انہیں متحد کئے ہوئے ہے، وہاں کی وحشت ہے۔ دیکھئے نا۔ سبزہ بیگانہ ہے۔ صبا آوارہ ہے اور گُل نا آشنا۔ اور یہ سب وحشت کی علامتیں ہیں۔

(۱۶) نہ ذوقِ گریباں نہ پروائے دامن   نگہ آشنائے گُل و خار ہیں ہم

آسی :۔ "اب نہ گریباں کا ذوق ہے، نہ دامن کی پروا ہے۔ ہم گُل و خار کے دیکھنے والے ہیں۔ دامن کانٹوں میں جذب ہو کر رہ گیا اور گریبان کو پھولوں نے بھلا دیا۔"

وجاہت :۔ "ہم کو نہ ذوقِ گریباں ہے اور نہ پروائے دامن۔ ہم تو چمن کے گُل و خار کے نگاہ آشنا یا ہمراز ہیں۔ ہمیں اپنی ظاہری آرائش سے کیا سروکار۔"

میری ناقص رائے میں دونوں شارحین شعر کی روح تک نہیں پہنچ پائے۔ "گُل و خار" سے مراد ہے زندگی کا عیش اور اُس کا غم۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم نے پھول کو دیکھا اور اُسے بھی زیبِ گریباں کر کے خوش بھی ہوتے تھے۔ اس طرح ہم نے کانٹوں کو بھی دیکھا ہے۔ جو ہمارے دامن میں اُلجھ کر اُسے پھاڑ ڈالتے تو ہمیں اِس کا رنج بھی ہوتا تھا۔ لیکن چونکہ ہم نے سرد و گرمِ زمانہ کو چکھ لیا ہے۔ اِس لئے اب نہ تو ہمیں خوشی کی خوشی ہے اور نہ غم کا غم۔ نہ تو ہمیں اپنے گریبان کو پھول سے سجانے کا ذوق ہے اور نہ اپنے دامن کی پروا ہے کہ وہ کانٹوں میں اُلجھ کر پھٹ جائے گا۔ غالب نے اِس شعر میں دانستہ رواقیت کو پیش کیا ہے۔ بڑا بے پناہ شعر ہے۔

▲

اعجاز صدیقی

ظلمتوں کے نرغے میں روشنی کا ہالا ہے
صبح جس کو کہتے ہیں، رات کا سنبھالا ہے!

کس میں کور چشمی ہے، کون آنکھ والا ہے؟
اِک طرف اندھیرا ہے، اِک طرف اُجالا ہے!

درد جب سِوا ہو جائے، خود ہی ہاتھ رکھ لیجے
کون دِل کے زخموں پر ہاتھ رکھنے والا ہے؟!

جیسے روک دی جائے کوئی منہدم دیوار!
گِرتے گِرتے یُوں خود کو بارہا سنبھالا ہے

ڈر گئے شناور بھی اور ناشناور بھی
کشتیوں کو موجوں نے جب کبھی اُچھالا ہے

خود صدائیں لَوٹ آئیں اپنی، یہ تو ممکن ہے
چیختے رہو، لیکن کون سُننے والا ہے؟

تھی نہ اِتنی کل تک تو رُوح و دِل میں بیچینی
آج یہ خُدا جانے، کون آنے والا ہے؟

عقل و ہوش و دانش کی سرحدوں کو جو چھو لے
تُو نے ساقیا! ایسا کوئی جام ڈھالا ہے؟

تُو ہی خود اُٹھا دے تو کوئی شاید اُٹھ جائے
وَرنہ تیری محفل سے کون اُٹھنے والا ہے؟!

جو دکھا چکی اب تک، اور کیا دِکھائے گی؟!
تیرا حال اے دُنیا! اپنا دیکھا بھالا ہے!

جیسے ایک چُٹکی سی کوئی یک بیک لے لے!
دوستوں کی پرسِش کا رنگ ہی نرالا ہے!!

صُورتوں کو کر لیجے بے نیازِ آئینہ
آئینہ تو جو بھی ہے، ٹوٹ جانے والا ہے

آئے ہیں نظر ایسے، کچھ سُفید چہرے بھی
رُوح ہے سیہ جن کی اور دِل بھی کالا ہے!

کیس تو کرنے والوں نے زندگی کی راہیں بند!
ہم نے خود ہی جینے کا راستہ نکالا ہے!!

مُبتلائے پیچ و خم ہے سیاستِ امواج
سخت تر کوئی طوفاں شاید آنے والا ہے؟!

گھٹ چکی ہے اِک حد تک جسم کی توانائی
اِس کے باوجود اعجاز آج بھی جیالا ہے!

ساکی (ایچ۔ ایچ منرو)
ترجمہ: شائستہ رومی

کھلا دریچہ

(ہیکٹر ہیو منرو (۱۸۷۰ء – ۱۹۱۶ء) برما میں پیدا ہوا، اور پہلی جنگ عظیم میں فرانس میں سپاہی کی حیثیت سے رحلت پائی۔ اُس کا بچپن زیادہ خوش گوار نہ تھا۔ اور اُن تلخ ایام کی یاد نے اُس کے ذہن پر گہرا اثر چھوڑا، اُس نے ساکی کے نام سے کہانیاں لکھیں۔ اِس کی تقریباً سبھی قابلِ ذکر کہانیاں بچپن اور اُس دور کے تجربات سے متعلق ہیں۔ اُس کے فن پر آسکر وائلڈ کا نمایاں اثر ہے۔ اُس کی تخلیقات ۱۹۱۴ء سے قبل کے پُرامن انگلستان کی عکاسی کرتی ہیں۔")

"میری خالہ ابھی نیچے آئیں گی! مسٹر نٹل" ایک پندرہ سالہ لڑکی نے پُراعتماد لہجہ میں کہا۔ "اُس وقت تک آپ میرے ساتھ یہیں ٹھہرے رہیئے!"

فریمٹن نٹل نے سوچا، گفتگو کچھ یوں شروع کرے کہ بھتیجی کی خوشنودی بھی حاصل ہو اور خالہ بھی نظر انداز نہ ہونے پائے جو آنے ہی والی تھی۔ ویسے اُسے شبہ ہی تھا کہ اِس قسم کی اجنبی اور رسمی ملاقاتیں اِس کی اعصابی بیماری کے علاج میں سود مند ثابت ہوں گی یا نہیں ——؟

"میں جانتی ہوں وہاں کیا ہوگا۔!۔ تم اپنے آپ میں گم ہو جاؤ گے، کسی سے بات چیت نہ کرو گے، پژمردگی کی وجہ سے تمہارے اعصاب اور بھی متاثر ہوں گے" یہ الفاظ اُسکی بہن نے اُسے اِس سنسان گاؤں کو روانگی کے وقت کہے تھے۔ "میں تمہیں اُن لوگوں کے نام تعارفی خطوط دیتی ہوں جن سے میں واقف ہوں اور جہاں تک مجھے یاد ہے اِن میں بعض واقعی بہت اچھے ہیں۔"

فریمٹن اپنی بہن کے الفاظ یاد کر کے سوچنے لگا، آیا مسز سیپلٹن، جس کے لئے وہ تعارفی خط لایا تھا۔ اُن اچھے لوگوں کی تعریف میں آتی ہے یا نہیں۔

طویل خاموشی کو بوجھل محسوس کرتے ہوئے لڑکی نے پوچھا۔ "کیا آپ یہاں کے اور لوگوں سے بھی واقف ہیں۔؟"

"میں کسی کو نہیں جانتا۔" فریمٹن نے کہا۔ "میری بہن یہاں ریکٹری میں چار سال رہتی تھیں۔ کیا آپ اُن سے واقف ہیں۔؟" اُس نے مجھے اپنے جاننے والوں کے نام کچھ تعارفی خطوط دیئے ہیں۔" اُس کے آخری الفاظ میں غم صاف طور پر جھلک رہا تھا۔

"تب تو آپ میری خالہ سے بھی قطعی ناواقف ہیں۔" لڑکی نے پُراعتماد لہجہ میں گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے صرف اُن کا نام اور پتہ معلوم ہے۔" فریمٹن نے یہ کہکر گویا اپنی ناواقفیت کا اعتراف کر لیا۔ وہ سوچ رہا تھا۔

آیا مسز سیپلٹن کے شوہر بقید حیات ہیں یا نہیں، کمرے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں صرف مرد بستے ہیں۔ لیکن یہ اندازہ کیونکر ہوتا تھا۔ اس کی وضاحت مشکل تھی۔

"آج سے ٹھیک تین سال قبل ان کے ساتھ ایک المناک حادثہ پیش آیا۔" لڑکی نے کہا۔ "یہ حادثہ شاید آپ کی بہن کے دورانِ قیام میں پیش آیا تھا۔"

"حادثہ !!!" فریمٹن نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ ایسے دل فریب مقام پر کسی حادثے کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔

"اکتوبر کی دوپہر میں اتنا بڑا دریچہ کھلا رکھنا آپ کے لئے ضرور باعثِ حیرت ہوگا۔" لڑکی نے لان کی طرف کھلتے ہوئے دریچہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا،

"ہاں، اسی کھڑکی کی راہ سے! آج سے ٹھیک تین سال قبل میری خالہ کے شوہر اور دو بھائی شکار کے لئے گئے اور پھر کبھی لوٹ کر نہ آئے، وہ اپنی پسندیدہ شکارگاہ جاتے ہوئے سبزہ زار کو پار کرتے کرتے دَل دَل میں گم ہو گئے۔ اُن کی لاشیں تک نہ ملیں۔" یہ کہتے کہتے لڑکی کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ اب اُس کے لہجے میں پہلی سی خود اعتمادی نہ رہی۔ اُس میں جھجک اور ہچکچاہٹ نمایاں تھی ـــ "بیچاری خالہ کو یقین ہے کہ وہ کسی دن ضرور لوٹ آئیں گے۔ اپنے شکاری کتے سمیت اور ہمیشہ کی طرح دریچہ سے گھر میں داخل ہوں گے ـــ یہ ہے کھڑکی کھلا رکھنے کا سبب ـــ یہ ہر شام مکمل اندھیرا ہونے تک کھلی رکھی جاتی ہے ـــ آہ، بیچاری، غریب پیاری خالہ ـــ اُس نے مجھے بارہا بتایا ہے۔ کہ وہ لوگ کس طرح باہر گئے تھے۔ اس کا شوہر اپنا سفید برساتی کوٹ کندھے پر ڈالے ہوئے تھا۔ اُس کا سب سے چھوٹا بھائی رونی گنگنا رہا تھا۔ "برٹی! تم اُچھلتے کیوں ہو۔؟" رونی بخوبی جانتا تھا کہ اُسے اس طرح گنگنانا بالکل پسند نہ تھا۔ وہ محض چھیڑنے کی خاطر گنگناتا رہتا ـــ تمہیں کیا معلوم، کبھی کبھی اسی قسم کی پُرسکون خاموش شاموں کو مجھے احساس ہوتا ہے، جیسے وہ لوگ اسی دریچہ کی راہ سے داخل ہو رہے ہیں۔" فرطِ جذبات سے مغلوب ہو کر وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ عین اُسی وقت لڑکی کی خالہ کی آمد فریمٹن کے لئے باعثِ سکون ہوئی۔ اُنہوں نے آتے ہی تاخیر کی معذرت چاہی:

"مجھے یقین ہے ویرا نے آپ کا دل بہلایا ہوگا۔؟" خالہ نے پوچھا،

"ہاں! یہ بہت دل چسپ باتیں کرتی ہیں۔" فریمٹن نے جواب دیا،

"مجھے اُمید ہے کہ آپ کو کھڑکی کھلی رہنے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا؟" خالہ نے نو وارد سے پوچھا: "میرے شوہر اور بھائی شکار سے سیدھے گھر آئیں گے، وہ ہمیشہ اسی دریچے کی راہ سے گھر میں آتے ہیں، وہ دلدل سے ہو کر آئیں گے اور اپنے کیچڑ بھرے جوتوں کے نشانات سے قالین کو خراب کر دیں گے جیسی کہ مردوں کی عادت ہوتی ہے، ٹھیک ہے نا!"

وہ نہایت سرعت سے بات چیت کرتی رہی۔ اُس کی گفتگو سے خوش دلی ٹپک رہی تھی۔ اُس نے شکار کا تذکرہ کیا۔ پرندوں کی کمیابی کا ذکر کرتے ہوئے اُس نے موسمِ سرما میں بطخوں کے شکار کے لئے موزوں جگہوں کی نشاندہی کی؛ فریمٹن کے لئے شکار کی تفصیلات قطعی غیر دل چسپ تھیں، اُسے اس بات کا پورا احساس تھا کہ اس کی میزبان اُس کی طرف پورے طور پر متوجہ نہیں؛ اس کی نگاہیں بار بار کھڑکی سے باہر لان کی طرف اُٹھ جاتی تھیں۔ فریمٹن نے سوچا، یہ واقعی کتنا افسوسناک اتفاق ہے کہ اُن سے حادثے کے یادگار دن ملاقات ہوئی ہے۔

"ڈاکٹروں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ میں مکمل آرام کروں، ہر قسم کی دماغی اُلجھن سے دُور رہوں، جسمانی محنت سے حتی الامکان بچوں، غذا کے معاملہ میں البتہ سب ڈاکٹر ہم خیال نہیں ہیں۔" فریمٹن نے تفصیلی طور پر خاتون کو اپنی اعصابی بیماری کے بارے میں

بتاتے ہوئے کہا، وہ بھی اُن عام لوگوں میں سے تھا جو اِس خوش فہمی میں مُبتلا رہتے ہیں کہ اُن کے اَمراض، اسباب و علاج سے اجنبی لوگ بھی دِل چسپی لیتے ہیں،

" ہم خیال نہیں ہیں ؟" مسز سپیلٹن نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ اِس کی "نہیں" کی آواز جمائی میں گم ہو کر رہ گئی۔ پھر وہ اِچانک چونکی ہو گئی اور اِس کا چہرہ مسرّت سے دَمک اُٹھا، اِس کا تعلق فرمیٹن کی گفتگو سے بالکل نہ تھا۔

" لو ! آخر وہ آ ہی گئے ! ٹھیک چائے کے وقت پر ! ایسے لگ رہے ہیں گویا دیر تک کیچڑ میں لوٹ کر آ رہے ہیں" اُس نے چِلّا کر کہا۔

فرمیٹن اِنہیں آتا دیکھ کر فرطِ خوف سے کانپ اُٹھا اور لڑکی کی طرف ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھنے لگا؛ لڑکی خوف زدہ نگاہوں سے کھڑکی کے باہر تک رہی تھی گویا اُس کے سوچنے کی صلاحیت سلب ہو گئی ہو۔ فرمیٹن ایک اَن جانے خوف کے شل کر دینے والے جھٹکے سے اپنی کُرسی پر کانپ اُٹھا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

گہرے ہوتے ہوئے جھٹ پٹے میں تین صورتیں لان سے ہو کر دریچے کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ تینوں کے کندھوں پر بندوقیں تھیں۔ اِن میں سے ایک کے کندھے پر کچھ زائد سامان تھا۔ ایک سفید برساتی کوٹ — ایک تھکا ماندہ شکاری کتّا، اُن کے پیچھے پیچھے قدموں سے لگا چلا آ رہا تھا، خاموشی سے فاصلہ طے کرتے ہوئے وہ گھر کے قریب پہنچ گئے۔

اور پھر — عین اُسی وقت ایک نوجوان کی کرخت آواز میں گنگنانے کی آواز شام کے دھندلکے سے اُبھری "میں نے کہا، برٹی تم ! اُچھلتے کیوں ہو ؟"

فرمیٹن نے انتہائی وحشیانہ انداز میں چھڑی اور ہیٹ اُٹھائی، اور اَندھا دُھند باہر کی طرف دَوڑا۔ ہال کے دروازے سے بجری دار راستہ اور بیرونی دروازے کا اِس نے کوئی خیال نہیں کیا۔ ایک سائیکل سوار نے ٹکر سے بچنے کی خاطر اپنی سائیکل گڑھے میں اُتار دی۔

" ہم آ گئے پیاری ! سفید برساتی والے شخص نے دریچے سے داخل ہوتے ہوئے کہا۔ " ہم کیچڑ میں ضرور لت پت ہیں لیکن پُورے طور پر نہیں — کون تھا وہ جو ہمارے آتے ہی بھاگ کھڑا ہوا ؟"

" ایک بہت ہی غیر معمولی آدمی " مسز سپیلٹن نے جواب دیا، جو صرف اپنی بیماری ہی کا ذکر کرتا رہا۔ آپ لوگوں کو آتا دیکھ کر وہ یک لخت بھاگ کھڑا ہوا۔ نہ اُس نے رخصت کی اِجازت چاہی، نہ معذرت کی، نہ خدا حافظ کہا — اِس طرح بھاگا گویا اُس نے بھوت دیکھ لیا ہو۔"

" میری دانست میں نو وارد کے بھاگنے کا سبب شکاری کُتّا ہے " آہستہ سے لڑکی نے کہا۔ " اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ اُسے شکاری کتّوں سے بے حد ڈر لگتا ہے۔ ایک بار گنگا کے کنارے شکاری کتّوں نے اِس کا بُری طرح تعاقب کیا تھا۔ اور اُسے بھاگ کر قبرستان میں پناہ لینی پڑی تھی۔ اُس نے وہ رات ایک تازہ نئی کھُدی ہوئی قبر میں گزاری۔ رات بھر اُسے جنگلی جانوروں کے غرّانے اور مُنہ سے جھاگ اڑانے کی آوازیں سر پر سُنائی دیتی رہیں۔ یہ واقعہ کسی بھی شخص کے حواس کھو دینے کو کافی ہے "

منٹوں میں فرضی کہانی گڑھ لینا اُس لڑکی کی خصوصیت تھی۔!!

▲

مقالہ

عطیہ نشاط خان

ڈرامے میں بُنیادی خیال

جب کسی ادبی تخلیق کے لئے مقصد کا ذکر کیا جائے تو بہت سے لوگ مُشتبہ ہو جاتے ہیں۔ اور سوچنے لگتے ہیں کہ یہ تو نعرہ بازی یا پروپگنڈے کو ادب کی جان قرار دیا جا رہا ہے۔ جو ادبی اور شعری محاسن سے انکار کا دوسرا نام ہے۔ یہاں ادب اور پروپگنڈے کی بحث میں نہ پڑتے ہوئے یہ کہہ دینا مناسب ہے کہ ایک ادبی تخلیق کے پس پشت مقصد کا ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ مقصد ہی فنکار کے شعور کی سطح اور اظہار خیال کی ضرورت اور اہمیت کا تعین کرتا ہے۔ شاعر یا افسانہ نگار، ایک اعلیٰ مقصد پیش نظر رکھ کر فن کی تخلیق کرتا ہے۔ یہ اُس کی قوتِ متخیلہ، اُس کے تجربات، علم اور احساس کا نچوڑ ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ کہنا کہاں تک دُرست ہوگا۔ کہ وہ یہ کام بغیر کسی مقصد کے کرتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ مقصد کتنی خوبصورتی سے دوسروں کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ ڈرامے کے لئے بھی ڈرامہ نگار سب سے پہلے ایک مقصد اور موضوع منتخب کرتا ہے۔ اور اسی کے ماتحت پورا ڈرامہ ترتیب دیتا ہے۔

پُرانے زمانے میں ڈرامہ نگار کے لئے اخلاق، روایت، سماجی طرزِ فکر کی وجہ سے موضوع کے انتخاب پر مختلف قسم کی پابندیاں تھیں اور اُس کی حدیں مقرر تھیں۔ اب وہ بات نہیں۔ ڈرامہ نگار کسی بھی تاریخی یا طبع زاد کہانی کو اپنا موضوع بنا سکتا ہے۔ موضوع کا انتخاب ڈرامے کے لئے بہت اہم ہے۔ اِس لئے اس کے انتخاب میں کافی غور و فکر سے کام لینا چاہئے۔ اِس سلسلے میں اِس کی عمومیت کو سب سے پہلے مدِ نظر رکھنا چاہئے۔ اُس کے واقعات اگر ایسا موضوع پیش کریں گے جو عام سمجھ رکھنے والے کو اپنی طرف کھینچ سکے تو اُن سے اس کی کامیابی کا راستہ ہموار ہو جائے گا۔ ڈرامہ میں جذبات کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اگری (E G R I) نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ "جذبہ ڈرامے کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کتے کے لئے بھونکنا۔ عملی زندگی میں ایسے جذبات بھی نمودار ہوتے ہیں جن کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ لیکن ڈرامے میں اُن کا کوئی نہ کوئی مقصد ہونا لازمی ہے"۔[1]

ڈرامہ اپنی تسکین یا عوام کی تفریح کے لئے ہی لکھنا بہت اعلیٰ مقصد نہیں ہے۔ اگرچہ اُس کے یہ دونوں مقاصد بھی ہو سکتے ہیں۔ ڈرامہ کے ذریعہ ڈرامہ نگار کوئی بات کہنا چاہتا ہے۔ حیات و کائنات کے بارے میں انسانی تعلقات کے بارے میں اپنے تجربے اور مشاہدے سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ تاکہ اِس سے انسان کو اپنے

---

[1] EGRI, L. The art of Dramatic writing - Page-7

اردگرد کی دنیا کے سمجھنے میں مدد مِل سکے۔ یہی بات کہنے کے لئے وہ کرداروں کو منتخب کرتا ہے۔ اور اُن کو واقعات کی لڑی میں اِس طرح پروتا ہے کہ اِس سے اُن کے افعال اور خصوصیات واضح ہوں۔ کہانی اِسی پر مبنی ہوتی ہے۔ ڈلانڈوں نے اسے سبق (MORAL) کے نام سے یاد کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ پہلے شاعر کو اپنا سبق (MORAL) سوچنا چاہئے۔ یعنی وہ یہ طے کرلے کہ لوگوں کے سامنے وہ کون سا اخلاقی نظریہ پیش کرنا چاہتا ہے۔ اگری (EGRI) نے اس کے لئے (PREMISE) کا لفظ استعمال کیا۔ جسے ہم بنیادی خیال یا مرکزی خیال کہہ سکتے ہیں۔

بنیادی خیال ڈرامہ نگار کے ذہن میں واضح شکل میں آنا چاہئے۔ یہ بہتر ہوگا کہ وہ اِسے پہلے مختصراً ایسے الفاظ میں لکھ لے کہ عام اِنسان اِسے پڑھ کر ذہن نشین کرسکے۔ غیر واضح بنیادی خیال کا ہونا نہ ہونے کے برابر ہے، یہ بنیادی خیال کسی طرح بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ بعض اوقات ڈرامہ نگار کے دِل میں ایک خیال آتا ہے۔ جسے وہ بنیادی خیال بناکر اسے دوسروں پر واضح کرنے کے لئے ایک کہانی کا روپ دیتا ہے۔ کبھی کسی واقعہ یا کہانی سے اثر لیکر وہ ذہن سے ایک بنیادی خیال اخذ کرتا ہے۔ اور اُسے بغیر مناسب ترمیم و اضافے کے بعد متحرک کرداروں کی صورت میں کہانی کی شکل دیتا ہے۔ بہرصورت ڈرامے کا ڈھانچہ تیار کرنے کے لئے ایک واضح بنیادی خیال کی ضرورت ہے۔ ورنہ چاہے کوئی اچھی کہانی سامنے ہو، تب بھی جب تک اپنا نقطۂ نظر اُس کے ذہن میں صاف نہ ہوجائے۔ ڈرامہ نگار کو ڈرامہ لکھنا شروع نہ کرنا چاہئے، ورنہ یہ ڈرامہ ایسے سفر کی طرح ہوگا جس کی کوئی منزل ہی نہ ہو۔

بنیادی خیال کے لئے یہ بالکل ضروری نہیں کہ وہ عالمگیر صداقت ہو یا ایک مسلّم حقیقت۔ ہاں ڈرامہ نگار کو اس کی درستی اور سچائی کا یقین ہونا چاہئے۔ کیونکہ جب تک خود اُسے اپنے موضوع سے خلوص نہ ہوگا وہ خود واقعات و تعلقات کی جھاڑیوں میں اپنے تجویز کئے ہوئے راستے کی درستی اور حقیقت پر یقین نہ رکھتا ہوگا۔ دوسروں کی کامیاب رہنمائی نہ کرسکیگا۔ یہ یقین چاہے اُسے اپنے تجربوں سے ملا ہو، چاہے دوسروں کے حالات کا مشاہدہ کرنے سے حاصل ہوا ہو، یا سُن کر وہ اُس نتیجے پر پہنچا ہو۔

بنیادی خیال کے لئے ضروری نہیں کہ اُسے کسی کردار کی زبان سے ادا کرایا جائے یہ ڈرامہ نگار کا فن اور اس کی انفرادیت ہے کہ وہ کس طرح بنیادی خیال کو دیکھنے والوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ خواہ واقعات سے خواہ مکالمے سے۔ مجموعی طور سے ایسا ہونا چاہئے کہ ڈرامہ ختم ہوتے ہوتے مرکزی خیال پوری طرح ناظرین کے ذہن نشین ہوجائے۔

اکثر نقادوں کا خیال ہے کہ ڈرامے میں ایک ہی مرکزی خیال ہو تو اس کا اثر بھرپور ہوتا ہے اور وہ ڈرامے کو کامیابی کی طرف لے جاسکتا ہے۔ متعدد مرکزی خیالوں میں ڈرامہ لکھا تو جاسکتا ہے لیکن سب میں مطابقت اور ربط قائم رکھنا مشکل ہے۔ ایک ہی بنیادی خیال کو پایۂ ثبوت تک پہنچانا بڑی توجہ اور مہارت چاہتا ہے، نہ کہ ایک سے زیادہ بنیادی خیال ہوں تو اُن کے ساتھ انصاف کرنا دشوار تر ہے۔ ہاں، ایک مرکزی خیال کے کئی پہلو ہوسکتے ہیں۔

اِنسانی جذبات و احساسات پر غور کرنے سے بہت سے بنیادی خیال حاصل ہوسکتے ہیں۔ جیسے احساسِ کمتری، لوگوں میں حسد اور کینہ پیدا کرکے غلط اقدامات پر مجبور کرتا ہے۔ اُمنگ، حوصلہ یا ترقی کی خواہش اچھی چیز ہے لیکن بعض اِنسانوں میں یہ ضرورت سے زیادہ ہوکر انہیں غلط راہوں پر لگا دیتی ہے، لالچ لوگوں کی تباہی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ محبت کو بڑی سے بڑی طاقت بھی مغلوب نہیں کرسکتی۔ سچی دوستی اور محبت ہر چیز کی قربانی پیش کرسکتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ مگر ڈرامہ نگار کو یہ بات پیشِ نظر رکھنا چاہئے کہ کرداروں کے جذبات اور ردِّ عمل کے ہمیشہ مختلف اسباب ہوتے ہیں۔ ڈرامے

لیکن بعض لوگ کسی فوری جذبے کے تحت ہوش و حواس کھو بیٹھتے ہیں۔ اور قتل کر ڈالتے ہیں، ایسے مجرموں کا قانون بھی خیال کرتا ہے۔ اور ایک عام قاتل کے مقابلے میں اس سے دوسرا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ ڈرامہ نگار کو عدالت کے جج کی طرح قتل کے اسباب کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ ناظرین پر اس کردار کی مجبوری یا اختیار آئینہ ہو جائے۔ اور وہ سمجھ لیں۔ کہ قتل ایسا بُرا کام اُس نے کیا۔ اور اس وجہ سے کیا کہ وہ دراصل بہت بُرا آدمی ہے یا نیک خصلت آدمی ہے۔ بعض حالات میں ایسے جُرم کا اِرتکاب کیا ہے۔

بُنیادی خیال کی اہمیت ایک دیواریں نیو کی سی ہے۔ لیکن یہ بھی مدِّنظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ دیواریں نیو ہی سب کچھ نہیں۔ جس طرح اُوپر کی عمارت کے لئے چونا، سیمنٹ۔ اینٹ، لوہا۔ وغیرہ درکار ہوتا ہے۔ اِسی طرح ڈرامہ مختلف عناصر سے مِل کر تکمیل کی منزل کو پہنچتا ہے۔ اِن عناصر میں کسی ایک پر خاص کر توجہ کرنا دوسرے عناصر کو کمزور بناتا ہے۔ جس کا نتیجہ پورے ڈرامے کی کمزوری ہوگا۔ اِس کی مثال انگریزی کے ایک مشہور نقّاد نے مشہور مجسّمہ ساز رودن (RODIN) کے بالزاک کے مجسّمے سے دی ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ رودن نے جب بالزاک کا مجسّمہ مکمّل کیا تو اپنے شاگردوں سے اس کے بارے میں رائے لی۔ سب نے مجسّمہ کے ہاتھوں کی بڑی تعریف کی۔ اِس پر رودن نے غصّہ میں تیشہ اُٹھا کر مجسّمہ کے ہاتھ اُڑا دیئے۔ اور شاگردوں سے کہا۔ کہ یہ ہاتھ کُل مجسّمے پر چھائے جا رہے تھے۔ جُزو کو کُل پر کبھی غالب نہیں آنا چاہیئے۔ یہ ہاتھ کٹا ہوا مجسّمہ آج بھی پیرس میں موجود ہے۔ ڈرامہ نگاروں کو اِس سے سبق لینا چاہیئے۔ ! ▲

منیب احمد صوفی

مرا وجود

یہ کیسے لوگ ہیں پہچانتے نہیں مجھ کو
پکارتا ہوں تو سنتے نہیں مری آواز
یہ دیکھتے ہیں مجھے اجنبی نگاہوں سے
کہ جیسے میں کوئی بھٹکا ہوا مسافر ہوں

طلوعِ صبح سے پہلے شریکِ بزم تھا میں
مرا لہو تھا کہ جس سے چراغ روشن تھے
مرے وجود کا پیمانہ رقص کرتا تھا
مگر یہ صبح کو پہچانتے نہیں مجھ کو
مرے وجود پہ کیوں نفرتوں کی یورش ہے
شریکِ بزم تھا، آیا تھا سرخرو ہو کر
میں جل رہا ہوں مگر اب لہو لہو ہو کر

انا، غرور، تحکم، تغافلِ بے جا
نماز بیٹھیں ہیں کسی بزمِ خاص کی مجھ پر
مرا وجود، حقارت، شکست و پسپائی
ملامتوں کی خلش، لازوال رسوائی
میں جی رہا ہوں زمانے میں نقش پا بن کر
یہ مبتلائے اذیت ہیں کیوں خدا بن کر

▲

تنہا تماپوری

تلاش

پہلے پہل جب آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا
اس دھرتی پر پھول کھلے ہیں
ندی، نالے جھوم جھوم کر
شانت سمندر کے آنگن میں آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں
بادِ صبا کے ٹھنڈے جھونکے، سبزے کا منہ چوم رہے ہیں
ڈال ڈال پر رنگ برنگے البیلے البیلے پنچھی
امرت وانی بول رہے ہیں
گیتوں میں رس گھول رہے ہیں -----
وہ دھرتی کتنی سندر تھی
پھر ــ میں نے اس سندرتا کے بیچ
اپنے من میں بوئے :
ہمدردی، اخلاص، وفا ... کے پھول
مرے من کی دھرتی پر مہک اٹھے
سچائی اور امن کی شیتل نہریں جھر جھر بہنے لگیں
اور تخیل کے سندر پنچھی، لفظوں کی شاخوں پر بیٹھے
گیت انوکھے گانے لگے ...
تب، میں نے دیکھا
ساری دھرتی، جس سے میں نے درس لیا تھا۔
اب کچھ بنجر سی لگتی ہے
سوچ رہا ہوں
پھر میں کس دھرتی پر جاؤں؟!

▲

افسانہ

انور خاں

نہ قربتیں نہ فاصلے

کار ڈرائیو کرتے ہوئے وہ رفیق کے متعلق سوچنے لگا۔ کیا رفیق گھر پر ہوگا، ہونا تو چاہیئے۔ وہ آفس سے ہمیشہ سیدھا گھر ہی آتا ہے۔ اور میرے بغیر تو وہ کبھی گھر سے نکلتا ہی نہیں۔ جہاں بھی گئے ہم دونوں ہمیشہ ساتھ گئے جو کام بھی کیا ساتھ ہی کیا۔ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ہم ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے اور اب ملتے ہوئے بھی ایک انجانے خوف سے دل بیٹھا جا رہا ہے۔ کیا اب بھی وہ شام کو گھومنے نکلتا ہوگا۔ اب وہ نہ جانے کس کے ساتھ جاتا ہوگا۔ کیا بے فکری کے دن تھے پیدل بھی۔ میلوں نکل جاتے تھے۔ کیا اب بھی میں میلوں چل سکتا ہوں۔ لیکن کار کے ہوتے ہوئے مجھے چلنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بس کی لمبی آہستہ آہستہ سرکتی قطاروں میں کھڑے ہوئے ہم کتنی حسرت سے کاروں کو تکا کرتے تھے۔ ہماری کتنی خواہش تھی کہ کاش ہمارے پاس بھی کار ہوتی۔ اُس نے اطمینان سے کار کے ہینڈل کو دیکھا۔ ایک نظر کار کے اندر دوڑائی۔ آئینہ کا رُخ اپنی طرف کر کے سیٹی بجاتے ہوئے اپنے دل میں سوچا NOW I AM ON THE TOPE OF THE WORLD پھر سوچنے لگا، دس سال بھی کیا پلک جھپکتے گزر گئے تھے۔ اسکالرشپ لیکر تعلیم حاصل کرنے گئے اور انگلستان پہنچ کر پھل پھیلنے لگے۔ واہ ری قسمت۔ مسکراتے ہوئے اُس نے کار کو موڑا، اور پھر خیالوں میں کھو گیا۔ رفیق مجھے دیکھ کر کتنا حیران ہوگا۔ دس سال ہو گئے۔ میں نے تو کوئی سال سے اُسے ایک خط بھی نہیں بھیجا۔ لندن کی مصروف زندگی میں اس قسم کی عیاشی کا بھلا کیا کام۔ جب میں اچانک پہنچوں گا تو وہ تعجب اور خوشی سے دیکھتا رہ جائے گا۔ لیکن اُس بیچارے کا پتہ نہیں کیا حال ہوگا۔ ملازمت میں گنجائش ہی کتنی ہوتی ہے۔ بچے بڑے ہو رہے ہوں گے۔ اخراجات سے تو وہ پریشان ہو گیا ہوگا۔ وہ اطراف کی جانی پہچانی چیزوں کو دیکھنے لگا۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا ہے۔ اُس نے سوچا۔ آج دس سال بعد بھی ویسی ہی دکانیں، ویسے ہی راستے ایک دوسرے سے ملے جُلے، اونچے نیچے رنگ و روغن سے بے نیاز مکانات۔ وہ اپنی یادوں کے پس منظر کو حقیقت میں بدلتا دیکھ رہا تھا۔ یہ ہوٹل! اس میں زندگی کے کتنے دل چسپ لمحے گزرے، لیکن وہ گندی پیالیاں اور وہ گھُٹا گھُٹا سا ماحول۔ اب تو اس میں بیٹھنے سے رہا۔ لیکن شاندار ہوٹلوں نے بھی مجھے کون سا سکون پہنچایا۔ کون سے دن یہ گلی کوچے یاد نہیں آئے۔ اوہ، چ، اُس نے بریک مارا۔ ایک بچہ تب تک سڑک کے پرے ہو چکا تھا۔ کیا داہیات بچے ہیں۔ ان کے ماں باپ انہیں گھر سے باہر کیسے چھوڑ دیتے ہیں۔ اُس کا سارا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ اب اُسے ایک منٹ بھی یہاں رہنا دوبھر ہو جائے گا۔ کار کو گلی میں موڑتے ہوئے اُس نے دیکھا نکڑ پر کچھ بچے گلّی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔ وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔ میں بھی گلّی ڈنڈا کتنا اچھا کھیلا کرتا تھا۔ محلے بھر میں دھاک تھی میری۔ گلّی، زن سے اُس کی

کار کے قریب سے گزر گئی۔ ایک لمحے کے لئے اُس کی سانس رُک سی گئی۔ ایسا بھی کیا کھیلنا۔ یہ بچے میدان میں جاکر کیوں نہیں کھیلتے۔ لیکن میں بھی تو انہی گلیوں میں کھیلا کرتا تھا۔ شاید میں ہی کچھ بدل گیا ہوں۔ رفیق کا مکان آ گیا تھا۔ اُس نے گاڑی روک دی۔

شکستہ، اندھیری سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ کچھ جذباتی اور نروس ہو گیا۔ ایک پیار تھا جس نے دل کو گرفت میں لے لیا تھا۔ کچھ ہی سیڑھیاں چڑھا ہو گا کہ اس کا سانس پھول گیا۔ وہ رُک گیا۔ پھر بھی آہستہ آہستہ زینے طے کرنے لگا۔ رفیق کے کمرے کے سامنے کھڑا وہ کچھ دیر اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن پردہ پڑا تھا۔

"رفیق!" ایک بھرائی سی آواز اُس کے گلے سے نکلی۔

"کون؟" کہتا ہوا رفیق تہبند اور بنیان پہنے ہوئے باہر آیا اور اُسے دیکھ کر ساکت سا کھڑا رہ گیا۔ پھر اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے اُس نے کہا۔ "آؤ یار آؤ!" "اندر آؤ"۔ رخشی دیکھو تو محمود آیا ہے۔"

محمود نے محسوس کیا کہ رفیق کچھ گھبرا گیا ہے۔ وہ اندر آ گیا۔ گھر میں کچھ زیادہ تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ شاید ایک آدھ چیز زیادہ ہو گئی تھی، بس، اُس کے جذبات اُمڈ رہے تھے۔ لیکن اُسے کچھ گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ کرسی بہت پرانی تھی۔ برسوں اُس پر وہ بنا کچھ خیال کئے بیٹھتا رہا ہو گا۔ لیکن اِس وقت اُسے کرسی کے بدہیئت اور گندے ہونے کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ پھر بھی وہ جی کڑا کر کے بیٹھا رہا۔

"انگلستان سے کب آئے؟"۔ رفیق نے پوچھا۔

"دو روز ہوئے"۔ محمود نے جواب دیتے ہوئے سوچا، کس قدر رسمی سا سوال ہے۔

"اور بزنس کا کیا حال ہے؟"۔ رفیق نے پوچھا۔

"بس ٹھیک ہی چل رہا ہے، تم اپنی سناؤ"۔ محمود نے کہا۔

"ہم تو وہی ہیں۔ تنخواہ میں کچھ اضافہ ہو گیا ہے، بچوں میں بھی اضافہ ہو گیا ہے، اور کوئی نئی بات نہیں ہے۔" رفیق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

بات چیت رُک گئی۔ محمود سوچنے لگا۔ یہ مصنوعی تکلف اُن کے درمیان کیسے آ گیا۔ وہ خواہ مخواہ دیواروں کو تکنے لگا۔ رفیق کی لڑکی چائے لے کر آئی۔ محمود نے بچی کو دیکھا۔ بچی نے آداب کیا۔ محمود نے پیار سے جواب دیا۔ بچی اُس کے سامنے چائے رکھ کر شرماتی ہوئی چلی گئی۔

"کافی بڑی ہو گئی ہے یہ"۔ محمود نے رفیق سے کہا۔

رفیق مسکرا دیا۔ لیکن خاموش رہا۔ محمود کو بچی بڑی پیاری لگی، اُس نے سوچا کہ اگر اِس بچی کو اچھے سے کپڑے پہنا دیئے جائیں تو کتنی خوبصورت لگے گی۔ گھٹن کا احساس کچھ کم ہونے لگا۔

محمود نے چائے کی پیالی اُٹھائی۔ پیالی کنارے سے ذرا سی ٹوٹی ہوئی تھی۔ اُسے کچھ کراہیت سی محسوس ہوئی۔ رفیق بھی کچھ شرمندہ سا تھا۔

"معاف کرنا یار!" اُس نے کہا۔ "گھر میں ایک بھی چیز ٹھیک نہیں رہتی۔ صبح لاؤ شام تک برابر۔ کسی چیز کو ٹھیک سے رہنے ہی نہیں دیتے۔"

"نہیں یار! بال بچوں کے گھر میں ایسا ہوتا ہی ہے۔" محمود نے یہ کہتے ہوئے سوچا، نہ جانے کتنی بار اُس نے

ٹوٹی ہوئی پیالیوں میں چائے پی ہوگی۔ یہ آج اُسے کیا ہوگیا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ چسکی لیتے ہوئے چائے پینے لگا۔

رفیق کی بیوی رخسانہ نے محمود کے سامنے آتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا اور رفیق کے قریب بیٹھ گئی۔ محمود نے بھی ہاتھ اُٹھاکر اشارے سے سلام کا جواب دیا۔ اُس نے نوٹ کیا کہ بھابی نے ابھی خاص طور سے کپڑے بدلے ہیں۔ ساڑی بہت جلدی میں پہنی گئی تھی شاید۔

"میں تو سمجھا تھا کہ آج آپ کے درشن نہیں ہوں گے۔" محمود نے کہا۔

"جی! وہ ذرا گھر کے کام کاج میں اُلجھی ہوئی تھی۔ کیسے ہیں آپ۔ بال بچے کیسے ہیں۔ اُنہیں لائے آپ؟"

رخسانہ نے بالکل رسمی طور سے پوچھا۔ لیکن محمود کو اچھا معلوم ہوا۔

"ابھی تو آپ لوگوں کی یاد آئی تو چلا آیا۔ دوسری مرتبہ آؤں گا تو اُنہیں ساتھ لیتا آؤں گا۔" اُس نے یہ کہتے ہوئے سوچا۔ بھابی کے چہرے پر کتنی سختی آگئی ہے۔ اور یہ رفیق بھی معلوم ہوتا ہے پینتس چھتیس سال کا نہیں پینتالیس سال کا ہو۔ لیکن میں بھی کیا سوچ رہا ہوں۔ دس سال میں کیا میں نہیں بدلا ہوں گا۔

"کچھ بیمار تھے کیا؟" اُس نے رفیق سے پوچھا۔

"نہیں بھائی، اپنی یہی حالت ہے۔ تم تو پہلے سے بھی زیادہ تندرست ہو خدا کے فضل سے۔" رفیق نے کہا۔

"ہاں یار! سب پیسے کی کرامت ہے۔ تم میری لائن میں نہیں آئے ورنہ آج مزے کر رہے ہوتے۔ اب بھی آجاؤ تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔" یہ کہتے ہی اُسے احساس ہوا کہ اُس نے غلطی کی، کہیں رفیق راضی نہ ہو جائے۔ اُسے اپنے آپ پر غصّہ آنے لگا، نہ معلوم کیا بات ہے۔ وہ رفیق کے قریب بھی آنا چاہتا ہے اور دُور بھی رہنا چاہتا ہے۔ رفیق کچھ جواب دینے والا ہی تھا کہ اُس کے بچّے کمرے میں داخل ہوئے اور اُس سے لپٹ گئے۔ اُس نے بچّوں کو پیار کیا۔ محمود پھر ماحول سے بیزار ہونے لگا۔ ننگ دھڑنگ بچّے، عجیب غلیظ سی حالت تھی اُن کی۔ رفیق نے بچّوں کو اُس سے ملایا ــــ اُس نے بادلِ ناخواستہ اُن سے کچھ باتیں کیں۔ رفیق نے اُنہیں باہر بھیج دیا تب کہیں اُسے اطمینان ہوا۔

"اچھا یار! چلوں۔" وہ یہ کہہ کر اُٹھا ـــ "اچھا بھابی! پھر آؤں گا۔" دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے اُس نے رفیق کی بیوی سے کہا۔

"ضرور آیئے گا! اور بیوی بچّوں کو بھی لایئے گا۔" رخسانہ بھی زبردستی اپنے آپ سے کہلوا رہی تھی۔

رفیق کار تک اُسے چھوڑنے آیا۔ محمود سوچ رہا تھا، رفیق اُس کے ساتھ بزنس میں آجائے تو شاید پھر وہ ایک دوسرے سے قریب ہو جائیں۔

"یار تم نے کوئی جواب نہیں دیا۔" وہ کہہ اُٹھا، "تم میری لائن میں کیوں نہیں آجاتے۔"

رفیق سوچ میں پڑ گیا۔ محمود کہہ کر پھر پچھتانے لگا۔ وہ کیوں جنجال مول لے رہا ہے۔ کاش رفیق انکار کردے۔

"چھوڑو یار!" رفیق نے جواب دیا۔ "اب مجھ سے کچھ نہیں ہوتا، سروس ہی کرلوں یہی بہت ہے۔"

"اچھا! پھر ملیں گے۔" محمود نے کار چالو کرتے ہوئے کہا۔ اُسے اپنی کم ظرفی پر غصّہ آرہا تھا۔ اُس نے سوچا، وہ تکلف کی دیوار نہیں گرا سکا۔

اندھیری ٹیڑھی میڑھی گلیوں سے کار نکالتے ہوئے، مکانوں پر ایک حسرت بھری نظر ڈالتے ہوئے، اُسے احساس ہوا کہ وہ اپنے ماضی سے کٹ گیا ہے۔ ▲

بدیعُ الزّماں خاور

محفل میں نہیں، آ کے سرِ دار کیا ہے
دیوانوں نے جس بات کا اظہار کیا ہے

ہر غم میں رچائی ہے کسی زُلف کی خوشبُو
ہر دَرد کو اِک شعلۂ رُخسار کیا ہے

کچھ تجھ کو پتہ بھی ہے کہ کس ناز سے ہم نے
اے گردشِ ایّام تجھے پیار کیا ہے

مہتاب نئے، ہم نے اندھیروں سے اُگا کر
راتوں کو اُجالوں کا پرستار کیا ہے

اِس بات سے ناراض ہیں کچھ لوگ کہ ہم نے
تقلیدِ روایات سے اِنکار کیا ہے

پرکھول کے صیّاد نے مُرغانِ چمن کے
پرواز کی طاقت کو گرفتار کیا ہے

شیشوں کا ہوا اعجاز کہ نظروں کا کرشمہ
رِندوں کو کسی شے نے تو سرشار کیا ہے

جب وقت پڑا ہے تو صفیرانِ چمن نے
پھولوں سے لدی شاخ کو تلوار کیا ہے

ہے دُھوپ اگر تیز تو ہو، ہم نے بدن کو
خود اپنے لیے سایۂ دیوار کیا ہے

جینے کی تمنّا نے ترے شہر میں ہم کو
دیوانہ بنایا ہے، گنہگار کیا ہے

غلام مرتضیٰ راہی

رُخ بدلتی ہوئی ہَوا پہ نہ جاؤ
دِل جو دریا تو سَلو اُتار چڑھاؤ

اپنی محنت کا پھل ابھی بھی چکھاؤ
پیڑ کی نرم ٹہنیوں کو جھُکاؤ

چاند تاروں کو لگ گیا ہے بُرا
اور اپنی نظر سے ہم کو گراؤ

ہو اندھیروں سے روشنی پیدا
یُوں بھی اِک دوسرے سے ٹکراجاؤ

آسماں سے بہت بلند ہے وہ
تاکہ تم لوگ اپنے سَر نہ اُٹھاؤ

کچھ تمہارا پتہ نشاں تو ملے
اپنی اپنی جگہ سے دُھول اُڑاؤ

آ رہے ہو جہت جہت ہو کر
کوئی راہِ فرار ہو تو بتاؤ

کچھ ٹھکانہ نہیں ہے چہروں کا
اپنی خاطر میں اب کسی کو نہ لاؤ

ابنِ آدم کو چھوڑ کر راہیؔ
چڑھ رہا ہے ہر ایک جنس کا بھاؤ

مقالہ

دیوی سنگھ وینکٹ سنگھ چوہان

دکھنی ہندی میں حُبّ الوطنی

گزشتہ ایک صدی سے زائد عرصہ ہوتا ہے کہ بھارت میں جذبۂ حب الوطنی نئے روپ سے اور نئے ڈھنگ سے موجزن ہے۔ حصولِ آزادی کے بعد اس جذبے کو کماحقہٗ ہانی دِلانا اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔ جذبۂ حب الوطنی سماج کی دائمی و عالمی ضرورت ہے۔ اور اِسی خصوصیت کی بناء پر پیغمبرِ رسول اللہ نے سماج کی ہر نوعیت کی رہنمائی کرتے ہوئے حکمِ آخر لگایا ہے کہ "حُبّ الوطن من الایمان" قرآن کا یہ حکم ایرانی شاعری میں ہمیشہ کے لئے مشعلِ راہ بنا ہوا نظر آتا ہے۔ حبیب یغمائی شاعرِ نو ایران نے اِسی جذبے کو فارسی جامہ پہنایا ہے [1]

حُبِّ وطن شیوۂ نیکاں بُود　　　حُبِّ وطن دیں بُود، ایماں بُود

ایک اور شاعرِ ایران نے حبّ الوطنی کی اصلی بُنیاد کو پیش کیا ہے، وہ ہے ادیب پیشاوری (پیشاوری کا اِنتقال ۳۰ر جون ۱۹۳۰ء میں ہوا) کہتا ہے [2]

برآں قوم و کشور ببایدگریست　　　کہ برکامِ بدخواہ بایست زیست
ہمیں خاک کت ناف اینجا زدند　　　تن و جانت را توشہ زینجا چدند
ترا مہرِ وی بہرۂ دیں بود　　　پیمبر چنیں گفت و چو نیں بود
سزد چوں تو ایں بہرہ کم داریا　　　کہ خود را مسلماں نہ پندار یا

دکھنی ہندی یا اُردو کی پرورش و پرداخت مسلمان شعراء اور اُدباء کے ہاتھوں ہی ہوئی۔ اِس کی زندگی کی اوّلین چار صدیاں مسلمانوں ہی کے ہاتھوں سے پروان چڑھی ہیں۔ اِس واقعہ میں کوئی واجبی و موزوں اعتراض ہو ہی نہیں سکتا۔ دکھنی اُردو یا ہندی کی پرداخت میں ہندوؤں کا حصّہ زوالِ سلطنتِ مغلیہ کے مابعد کا ہے۔ اُس زمانے میں ہندی یا اُردو نے قومی زبان کا روپ اختیار کر لیا تھا۔ گویا ہندی یا اُردو کو قومی زبان کے اعلیٰ ترین رُتبہ کو پہنچانے کا سہرا مسلمان ادیبوں ہی کے سر ہے۔ پس اِسی واقعیت کے پس منظر میں دکھنی ہندی کے چند مشہور و معروف ادیبوں کے جذبۂ حُبّ الوطنی کو اِن چند سطور میں پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مثلاً نصرتی دکنی ہندی یا اُسی کی زبان میں، ہندی کا واقعتہً ملک الشعراء ہے۔ مرحوم ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے کئی جگہ

---

[1] ڈی جے ایرانی میموریل یادنامہ (۱۹۴۳ء) بمبئی، ص ۲۲
[2] وہی، ص ۲۱۹

نصرتی کو ولی سے بہتر و برتر بتلایا ہے، وہ رقم طراز ہیں کہ :-

" اور حقیقت یہ ہے کہ بحیثیت شاعر کے نصرتی کا درجہ ولی سے کہیں بلند ہے۔ جسے اس کی تفصیل درکار ہو وہ میری تالیف " نصرتی " کا مطالعہ کریں[1]۔ دکھنی ہندی اور بھارت کی تمام انڈو آرین بھاشاؤں کا صرف نصرتی ہی شاعرِ اوّلین ہے جس نے ہندیا بھارت کو ایک قوم کی نظر سے دیکھا ہے۔ اس خصوص میں اس کی تعریف بندرگاہِ سورت قابلِ توجہ ہے۔ یہ سطور علی نامہ سے ماخوذ ہیں[2]۔ (تصنیف ۱۰۷۶ھ)

کہ سورت لکر ملک گجرات میں | بندر یک اتھا خوب سب بات میں
رہیں بحر و خشکی کے تجار جاں | ملے بست عالم میں جو نیں سواں
یک یک کوچہ و شہر معمور اچھے | ہر یک گھر میں گئی گنج بھر پور اچھے
لیوے صندت فیض اس تے نول | کہ جیوں ابر کوں آب دریا تے بل

شہر سورت کے عروج اور سرمایگی پر بھارت کے ناز و غرور کا شاعر نے بڑی خوبی سے ذکر کیا ہے
دکھن یا بیجاپوری حکومت کا ملا نصرتی نے بڑے جذبے کے ساتھ کئی بار اپنی اس مشہور مثنوی میں ذکر کیا ہے
اس کا ذکر تفصیل سے کرنے سے ہم قاصر ہیں لیکن دکن میں شہر بیجاپور یا بیجاپوری حکومت کے رتبہ کا اشارہ
قابلِ ملاحظہ ہے۔ وہ کہتا ہے[3]

دکھن شخص ہے جس بے جا پور تن | جیوں انساں ہیں ہور علی شہ جیون

خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کا ذکر کرتے ہوئے اس نے کہا ہے[4]

جتے عاشقاں ہیں اچھے سرفراز | جتے جگ کا مخدوم بندہ نواز
دکھن کی عجب بخت ور خاک ہے | کہ جس بیچ تجھ خواب گہہ پاک ہے
یو بھو میں کس خطر تے نہ ہوئے ہولناک | کہ ہیکل ہے تس گل تیرا قبر پاک

بیجاپور کی ہوا کا بھی نصرتی نے کیا خوب ذکر کیا ہے[5]

ٹھنڈا باد بیمار دل کا دوا | کرے روح کا روح تازہ ہوا
نہ اس شہر سا شہر کیں دلپذیر | نہ ایسی ہوا کیں اچھے بے نظیر

وجہی دکھنی کا مسلم الثبوت استاد ہے۔ اس کی نثری تصنیف " سب رس " دکنی اردو کی اوّلین نثر کا بہترین نمونہ ہے۔ وجہی نے اپنی مثنوی قطب مشتری (۱۰۱۸ھ) میں اپنی حب الوطنی کا اظہار اس طرح کیا ہے

---

[1] گلشنِ عشق اور نصرتی ۔ ڈاکٹر عبدالحق، کراچی (۱۹۵۳ء) مقدمہ ص ۱۲
[2] علی نامہ از نصرتی ۔ ع ۔ م ۔ معدلقی حیدرآباد (۱۹۵۷ء) ص ۱۸۳
[3] علی نامہ ، ص ۳۶۳
[4] گلشنِ عشق ، ص ۲۱
[5] علی نامہ ، ص ۲۲۷ اور ۲۲۹
[6] قطب مشتری از وجہی ۔ عبدالحق طبع ثانی، کراچی (۱۹۵۳ء) ص ۸۸

دکھن کا سا نہیں ٹھار سنسار میں — پنچ فاضلاں کا ہے اِس ٹھار میں
دکھن ہے نگینہ انگوٹھی ہے جگ — انگوٹھی کو حرمت نگینا ہے لگ
دکھن ملک کوں دھن عجب ساج ہے — کہ سب ملک سر ہور دکھن تاج ہے
دکھن کوں جو دیکھے اسے نار تو — نہ کرسی گردھیں یاد بنگالے کوں
دکھن ملک بیوتی پچ خاصا اہے — تلنگانہ اس کا خلاصہ اہے

حسن شوقی بھی دکھنی ہندی اُردو کا مُسلّم الثبوت اُستاد ہے۔ اُس نے اپنی دو مشہور مثنویاں "ظفر نامۂ نظام شاہ" اور میزبانی نامہ" اور کچھ غزلیں ہمارے لئے یادگار چھوڑی ہیں۔ اِس کی اول الذکر مثنوی قبل ۹۳۵ھ بہ زمانہ ملک عنبر، احمد نگر کی نظام شاہی حکومت کے عروج کے زمانہ میں لکھی جانا پایا جاتا ہے۔ اِس تاریخی مثنوی میں حسن شوقی نے اپنی حبّ الوطنی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ —— یہ مثنوی کراچی میں ہے اور ابھی تک روشنی میں نہیں آئی۔ اِس مثنوی میں دوسرے ممالک پر ہندوستان کی برتری بتاتے ہوئے اُس نے لکھا ہے۔ [1]

حکومت کرا ملک ہے روم و شام — طرف کربلا کے شہیداں تمام
ایران و توران ہور ملکِ سند — رہیں پُر عقل بادشاہانِ ہند

ہندوستان میں حسن شوقی کو ملکِ دکن زیادہ پیارا اور محبوب ہے۔ وہ کہتا ہے۔

سوا فضل میانا ہے "ملکِ دکن — ہوئے یاں کے شاہاں جیتے نوش لکھن

ایک غزل میں حسن شوقی نے ہندستان کی برتری اور مشکینیت اِس طرح جتلائی ہے [2]

اے مشک بو ہندوی صنم عالم معطر ہو رہیا — تج طرۂ طرار میں نافہ اہے تا تار کا

اگر ہم دکنی کے ادیبوں کا گہرائی سے مطالعہ کریں تو ہم کو کئی بیش بہا گوہر ہاتھ لگ جاتے ہیں۔ بھارت کی ندیاں گنگا، جمنا، گوداوری، کاویری، ساوتری وغیرہ بھارت کے باشندوں پر ہزارہا سال سے تبرک و پاکیزگی کا جادو چلائے ہوئے ہیں۔ حسن شوقی ایک اور غزل میں کہتا ہے [3]

تج نین کے انجن کوں ہو زاہداں دیوانے — کوئی گوڑ، کوئی بنگالہ، کوئی سامری کہتے ہیں
من از فراق رویت رُو رُو سمند بھر آیا — کوئی گنگ، کوئی جمنا، کوئی ساوتوری کہتے ہیں
جب عارفاں کی صف میں شوقی شعر پڑیا ہے — کوئی خسرو علائی، کوئی انوری کہتے ہیں

ہاشمی عادل شاہی حکومت کے آخری دَور کا عظیم شاعر ہے۔ اُس نے اپنی پوری زندگی بیجاپور اور مہاراشٹر میں گزاری ہے۔ باوجود کہ بصیر مادر زاد اندھا تھا اُس دَور کے معاشرتی اور عسکری زندگی کا ایسا خاکہ پیش کیا ہے گویا چشم دید واقعات پیش کئے ہیں۔ اُس زمانے کے سپاہیوں کی زندگی اور اُن کا عشق اور معشوقیت بدرجۂ اتم پیش کی ہے۔ ہاشمی نے اپنی محبّ وطن کا ثبوت بھی دیا ہے۔ مہاراشٹر کی ندیاں بھیما اور کرشنا کے لئے اس کے دِل میں وہی جذبۂ تبرک

(بقیہ صفحہ ۴۰ پر دیکھئے)

---

[1] قدیم اُردو، ڈاکٹر عبدالحق۔ کراچی (۱۹۶۱ء) ص ۷۷

[2] قدیم اُردو، ڈاکٹر مسعود حسین خان، حیدر آباد (۱۹۶۵ء) ص ۵۱۷

[3] وہی، ص ۵۲۱

قطب سرشار

نئی آواز

روشنی ـــــ ! ہاں ہر طرف ہے
جل رہے ہیں تشنگی کی آگ میں
ہر سُو ـــــ بدن
شور و غل ـــــ ! ہاں ہر طرف ہے
اپنی ہی آواز سے دہشت زدہ
کرب میں ڈوبی ہوئی
چیخ اور پکار
شہر میں، کوچہ بہ کوچہ، دربدر
ہر شخص اک پاگل نظر آتا ہے گویا
زندگی نے کاٹ کھایا ہو ـــــ
ہزاروں جسم ایسے ہیں کہ
جن کا کوئی بھی چہرہ نہیں ہے
اب یہاں جس وقت چاہیں
برچھیاں
خنجر
فضا میں یوں ہی لہراتے ہیں
آنتیں ـــــ
پیٹ کے باہر نکل جاتی ہیں یوں ہی
خون بہہ جاتا ہے کتنا
"پیاس کی دھرتی" مگر سیراب ہو پاتی نہیں ـــــ
اپنے اس ماحول میں
ہر شخص کو اک بھوک لاحق ہو گئی ہے
" بھوک نے "
اک صرف معدے ہی نہیں
اذہان بھی خالی کیے ہیں ـــــ
ہم یہاں لاکھوں کروڑوں ہیں مگر
ہر فرد
تنہائی کے اک تابوت میں بے حس پڑا ہے
خیر ـــــ جو کچھ بھی ہوا
ماضی کی قبروں پر
کریں ماتم تو کچھ حاصل نہ ہوگا
چلو ـــــ اب "عہدِ نو" کے میکدے سے
ارتقا کا جام پی لیں
زندگی کے نام پر کچھ اور جی لیں ـــــ !!!

رحمٰن جامی

فکرِ رائگاں

خیالوں کا سورج
تمازت سے اپنی ہی جل بجھ گیا ہے
مرے ذہن و دل پر کوئی بوجھ سا ہے
حقیقت کو پا کر
اچانک مری سوچ کی کہکشاں ٹوٹتی ہے
مری سادہ لوحی حقیقت سے کیوں آشنا ہے
میں کیوں سوچتا ہوں
یہ اچھا ہے اور یہ بُرا ہے
ہزاروں برس سے یہی ہو رہا ہے
تماشہ !
تماشہ تو ہم آپ سب دیکھتے ہیں
مگر کس کو فرصت ہے یہ سوچنے کی
کہ کیا ہو رہا ہے
مگر کس میں جرأت ہے یہ بولنے کی
جو کچھ ہو رہا ہے غلط ہو رہا ہے
مگر مجھ کو عادت سی ہے سوچنے کی
مرے سوچنے کی بھی عادت بُری ہے !

جمیل احسن شاہجہاں پوری

بڑی بی بی

ذہن کی اندھیری گلی سے کبھی کبھی ایک بوڑھی عورت گزرتی ہے جو اپنے دبلے پتلے اور لٹکی ہوئی کھال والے ہاتھ سے میرا دامن پکڑ کر پوچھتی ہے۔ "تو میرا بیٹا ہے نا؟" میں کہتا ہوں۔ "نہیں۔ تیرا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ جن کو تُو نے اپنا بیٹا سمجھا وہ بھی دراصل تیری دولت کے بیٹے تھے۔"

بڑی بی بی کو پہلی بار میں نے تب دیکھا تھا۔ جب میں اپنی والدہ کے ساتھ اُن کے گھر گیا تھا۔ اُن کا دو منزلہ گھر بہت بڑا اور شاندار تھا۔ اُن کے گھر کے پاس ایک پیپل تھا۔ اسی لئے پیپلوالا گھر کے نام سے مشہور تھا۔ اتنے بڑے گھر میں بڑی بی بی، دو بچوں، ایک نوکر اور ایک نوکرانی کے ساتھ رہتی تھیں۔ اُن کے شوہر کا عرصہ ہوا انتقال ہو چکا تھا۔ جب ہم اُن کے گھر پہنچے تو وہ ایک شاندار چھپر کھٹ پر سفید بُراق کپڑے پہنے بیٹھی تھیں۔ اُس وقت تو میری عمر بہت کم تھی اس لئے مجھے بڑی بی بی کے بجائے اُن کی گود میں بیٹھی ہوئی چھوٹی سی لڑکی میں زیادہ دلچسپی محسوس ہوئی۔ بچوں اور نوجوانوں کو بوڑھوں میں تب تک دلچسپی محسوس نہیں ہوتی جب تک وہ خود بوڑھے نہ ہو جائیں۔ اُس وقت تک تو نہیں مگر بڑا ہونے کے بعد جیسے جیسے میں بڑی بی بی کی زندگی کے حالات سے واقف ہوتا گیا، میرے دل پر اُن کی زندگی کا درد و غم اثر انداز ہوتا گیا۔ مجھے اُن سے ہمدردی، محبت اور دلچسپی محسوس ہونے لگی۔

مجھے پہلی ہی نظر میں اُن کی آنکھیں بڑی عجیب محسوس ہوئیں۔ میں نے جب بھی اُن کو دیکھا۔ اُن کی آنکھیں دیکھ کر یوں محسوس ہوا جیسے وہ ابھی ابھی رو کر خاموش ہوئی ہوں۔ کچھ غم آلود، سوجی ہوئی سی، گلابی گلابی آنکھیں تھیں اُنکی۔ وہ بہت آہستہ آہستہ دھیمی آواز میں بولتی تھیں جیسے زندگی سے تھک گئی ہوں۔ اُس وقت اُن کے قریب ریشمی کپڑے پہنے ہوئے ایک خوبصورت لڑکی کھڑی تھی۔ وہ لڑکی مجھے اُس دن سے جو اچھی لگی تو آج تک اُس کی شبیہہ دل کے ٹوٹے ہوئے آئینے کے ٹکڑوں میں جھلکتی ہے۔ اُس کا نام تارا تھا۔ وہ ایسا تارا تھی جو سرِ شام ہی ٹوٹ گیا، ایسی کلی تھی جو بہار میں کھلنے سے پہلے مرجھا گئی۔ ایسا جام تھی جو لب تک آنے سے پہلے پھوٹ گئی۔

بڑی بی بی کے بارے میں مجھے آہستہ آہستہ معلوم ہوا۔ اُن کی زندگی ایسا تلخ جام تھی جس کا ایک گھونٹ بھی پینا دشوار تھا۔ تارا میں دلچسپی کی وجہ سے مجھے بڑی بی بی سے بھی تعلق ہو گیا تھا۔ اِس لئے مجھے اُن کی زندگی کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو سکا۔

بڑی بی بی اپنے والدین کی صرف دو لڑکیوں میں سے ایک تھیں۔ بچپن سے ہی اُن کو بڑی بی بی اور چھوٹی بہن کو چھوٹی

شاعر بھی

بی بی کہا جاتا تھا۔ اُن کے والد ایک سخت مزاج، ضدی، مغرور اور اکھڑ قسم کے پٹھان زمیندار تھے، وہ زیادہ تر مردانے میں محفلیں جمائے رہتے تھے۔ زنانے مکان میں رات گئے آتے تھے اور صبح تڑکے چلے جاتے تھے۔ اِس لئے باپ کے ہوتے ہوئے بھی بڑی بی بی بیچاری باپ کی محبت سے محروم رہی تھیں۔ کوئی بھائی نہیں تھا۔ اِس لئے بھائی کی محبت نہیں ملی۔ وہ بیچاری مرد کے سائے تک سے انجان تھیں۔ اِس لئے شادی کے بعد اُن کو پہلی بار یہ اُمید ہوئی وہ کسی مرد کی محبت سے آشنا ہو سکیں گی۔ مگر یہ اُمید پوری نہ ہوئی۔ کیونکہ اُن کے شوہر کو اپنی خالہ زاد بہن سے محبت تھی۔ جو مفلس تھیں۔ اِس لئے اُن کے والد نے زبردستی بڑی بی بی سے شادی کرائی تھی تاکہ بڑی بی بی کے والد کی دولت اُن کی امارت کو دوچند کر دے، بڑی بی بی شوہر کی محبت سے بھی محروم رہیں۔ جب اُن کو شوہر سے بھی مایوسی ہوئی تو اُن کا دل ایک بیٹے کے لئے مچلنے لگا۔ وہ ایک ایسے بچّے کا تصوّر کرتیں جس کو بیٹا کہہ سکیں۔ جو دھیرے دھیرے بڑا ہوتا جائے۔ وہ جوان، تنومند اور طاقت ور ہوتا جائے اور وہ خود بوڑھی اور کمزور ہوتی جائیں، مگر اپنے بیٹے کے لمبے قد، تندرست جسم اور توانا سراپا کو دیکھ دیکھ کر جی لیں۔ وہ ایک تناور درخت کی طرح اُن کی محروم، مایوس اور تشنہ زندگی پر سایہ فگن ہو جائے۔ ایک ہی سہی، مگر بیٹا ہو، جو اماں کہے، جس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دیں۔ جس کے بازوؤں کے سہارے ہانپتی کانپتی چل سکیں۔ جس سے اُن تمام محبتوں کی پیاس مِٹ جائے جو باپ سے نہ ملی، بھائی سے نہ ملی، شوہر سے نہ ملی۔ اُس کے بیٹے کے تنے جسم کو اپنے سینے سے لگا لیں اور جو اپنی مضبوط باہیں اُن کے گلے میں ڈال دے اور اماں کہہ کر لپٹ جائے، لیکن کاتبِ تقدیر نے یہ مسرّت بھی اُن کے نصیب میں نہ لکھی تھی۔ اُن کی کوکھ کبھی ہری نہ ہوئی۔ اِس وجہ سے بھی شوہر کی بے تعلقی اور نفرت گہری ہوتی چلی گئی۔ شوہر کی مرضی نہ ہونے کی وجہ سے وہ کسی کو گود بھی نہیں لے سکتی تھیں۔ جب شوہر کا انتقال ہو گیا تو انہوں نے چھوٹی بی بی کے لڑکے کو گود لے لیا۔ چھوٹی بی بی کے شوہر اپنی اور بیوی کی جائداد کلبوں میں فلیش کی نذر کر چکے تھے، اِس لئے اِس لائق بھی نہ تھے کہ اپنے لڑکے کی تعلیم مکمل کرا سکیں۔ پڑھائی کے لالچ میں چھوٹی بی بی نے انیس خاں کو بڑی بی بی کو سونپ دیا۔ بڑی بی بی کو گویا ایک نعمت مل گئی، اُن کی کوکھ ہری ہو گئی، اُن کو دنیا میں جنّت مل گئی۔ اُنہوں نے بڑی محبت، لاڈ اور ناز و نعم سے انیس خاں کو پالا۔ وہ انیس خاں کو دیکھ دیکھ کر جیتی تھیں اور اپنے ناآسودہ ارمانوں کی تکمیل سمجھتی تھیں اُن کو انیس خاں کی ذرا سی دیر کی بھی جدائی گوارا نہ تھی۔ جب کالج کی تعلیم مکمل ہو گئی تو انیس خاں نے یونیورسٹی جانا چاہا۔ بڑی بی بی جدائی کے خیال سے راضی نہ ہوتی تھیں۔ مگر انیس خاں کی ضد اور اُن کا دل رکھنے کے خیال سے اُنہوں نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر اُن کو علی گڑھ ایل ایل بی کرنے بھیج دیا۔ جب اُن کی تعلیم مکمل ہو گئی تو چھوٹی بی بی نے بڑی بی بی سے لڑائی کر لی۔ اور انیس خاں نے بڑی بی بی کے پاس آنا جانا بند کر دیا۔

یہ صدمہ بڑی بی بی کی جان لے لینے کے لئے کافی تھا۔ مہینوں وہ گُم سُم خاموش پڑی رہیں۔ کسی سے نہ بات کرتی تھیں، نہ روتی تھیں۔ ایک سکتہ کے عالم میں ہو گئی تھیں۔ اِس غم نے اُن کی زندگی کے شجر کو خشک ٹھونٹھ میں تبدیل کر دیا۔ جس طرح کبھی کبھی سوکھے ہوئے پیڑوں پر ایک چھوٹی سی نرم و نازک کونپل اُبھر آتی ہے، اسی طرح ایک مدّت بعد بڑی بی بی کے خزاں رسیدہ دل کی شاخ پر آس کی کونپل پھوٹی۔ جب محلّے کی ایک بیوہ عورت کا انتقال ہو گیا۔ اور اُس کا ایک یتیم بچّہ بے سہارا ہو گیا۔ بڑی بی بی نے اُس کو پال لیا۔ اور اُمید کی کچی دیوار پر آرزوؤں کی بیل چڑھائی، رفیق کو اپنے بیٹے کی طرح پالا۔ اُس کو پڑھانے لکھانے کی بے حد کوشش کی مگر وہ پڑھائی کی طرف قطعی ملتفت نہ ہوا۔ بڑا ہوتے ہوتے وہ آوارگیوں میں پڑ گیا۔ آئے دن بڑی بی بی سے روپیہ کی مانگ ہوتی رہتی۔ جس کو وہ خندہ پیشانی سے پورا کرتی رہتیں۔ جب رفیق جوان ہو گیا تو اُنہوں نے اُس کی شادی کر دی۔

رفیق کی بیوی بڑی بدمزاج اور تنگ دل عورت تھی۔ اُسے بڑی بی بی کے ساتھ رہنا پسند نہ تھا۔ اُس نے رفیق کو مجبور کیا کہ وہ الگ گھر لے کر رہے۔ بڑی بی بی پھر اتنے بڑے گھر میں اکیلی بے سہارا رہ گئیں۔ اُمید کی جس شاخ پر اُنہوں نے ارمانوں کا نشیمن بنایا تھا وہ ٹوٹ گئی۔ زندگی منہ پھاڑے سامنے کھڑی تھی، مگر اتنی بڑی دنیا میں کوئی ایسا نہ تھا جس کو وہ اپنا کہہ سکیں۔ کوئی محبت ایسی نہ تھی جو تپتے ہوئے دل پر بادل بن کر برسے۔ وہ اکثر لوگوں سے بڑے درد انگیز لہجے میں کہتی تھیں "ہائے میں مرجاؤں گی تو کوئی مجھے گاڑنے تک کو نہیں ہوگا۔ کوئی کندھا دینے تک کو نہ ملے گا۔" جن کو اُنہوں نے اپنا سمجھا تھا۔ وہ مطلب پورا ہونے پر کنارا کر گئے تھے۔

کچھ دنوں بعد رفیق کی بیوی ایک لڑکا اور ایک لڑکی چھوڑ کر مر گئی تو رفیق پھر بڑی بی بی کے پاس لوٹ آئے۔ اور اپنے دونوں بچوں کو چھوڑ کر نہ جانے کہاں نکل گئے۔ کوئی خبر نہ ملی۔ بڑی بی بی نے اب اِن بچوں کو سینے سے لگا لیا۔ حفیظ بڑا تھا اور تارا چھوٹی حفیظ اپنے باپ سے بھی زیادہ شریر اور آوارہ مزاج تھا۔ مگر تارا بھولی بھالی اور معصوم تھی۔ حفیظ دِن بھر گلیوں میں کھیلتا اور لڑکوں کو پیٹتا رہتا۔ آئے دِن اُس کی شکایتیں آتی رہتیں۔ مگر بڑی بی بی اُس کی حمایت کرتیں۔ اُس کے مقابلے میں تارا بڑی بی بی سے ماں جیسی محبت کرتی تھی اور اُن کی بہت خدمت کرتی تھی۔ میرا اور اُس کا بچپن کا ساتھ دوستی کے موڑ سے گزر کر محبت کی شاہ راہ پر آگیا۔

پھر جب تارا جوان ہوئی اور ہم دونوں کی محبت اور مضبوط ہوئی اور بڑی بی بی نے تارا کی شادی کی تیاریاں کیں تو تارا مر گئی۔ یکایک اور اچانک۔ اگر تارا نہ مرتی تو بڑی بی بی ہر ایک سے نہ پوچھتی پھرتیں، میرا بیٹا کون ہے ؟۔ اگر تارا نہ مرتی تو میں اپنی رُوح کے ویرانوں میں بھٹکتا نہ رہتا۔

جب تارا مر گئی تو میری ساری دِل چسپیاں ختم ہو گئیں۔ بڑی بی بی سے بھی اور زندگی سے بھی۔ میں اپنے شہر سے بہت دُور چلا گیا۔ حکومت کے محکمۂ معدنیات کے لئے MINERALS کھوجتا رہا اور زندگی کی سخت چٹانوں سے بہتے ہوئے غم کے آبشار میں ڈوبتا اُبھرتا رہا۔

کئی سال بعد میں واپس آیا تو معلوم ہوا کہ حفیظ نے پڑوس کی ایک قصائی کی لڑکی سے ناجائز تعلقات قائم کر لئے تھے۔ جس کے نتیجے میں ایک بچہ ہوا۔ قصائیوں کی برادری والوں کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ طیش میں آکر حفیظ کی جان کے پیچھے پڑ گئے۔ ایک دِن ایک نوجوان نے دِن دہاڑے سرِ راہ حفیظ کو چھرا مار دیا اور وہ چند گھنٹے کے اندر مر گیا۔

بڑی بی بی کے نصیب میں جو صدمات کی طویل زنجیر تھی، یہ واقعہ آسکی ایک کڑی بن گیا۔ تارا کی موت کو اُنہوں نے بڑی مشکل سے جھیلا تھا کہ یہ نیا کوہِ غم آگرا۔ حفیظ بُرا ہی سہی۔ مگر اُن کے لئے تو بیٹا ہی تھا۔ آنسو بہاتے بہاتے اُن کی آنکھیں خراب ہو گئیں۔ جب غم کچھ ہلکا ہوا تو اُنہوں نے لڑکی والوں کی خوشامد کی کہ وہ ناجائز بچہ، جو اُن کے لئے بوجھ ہے اُنہیں دے دیں۔ مگر لڑکی بچے کو چھوڑنے کو تیار نہ تھی۔ ممتا کی ماری، محبت کی پیاسی بڑی بی بی اپنا عالی شان گھر اور عزت چھوڑ کر اُس لڑکی کے گھر جا کر رہنے لگیں اور ناجائز بچے کو اپنے بچے کی طرح پالنے لگیں۔ وہ لوگ اُن کی محبت کا ناجائز فائدہ اُٹھاتے رہے۔ روز نئی نئی فرمائشیں اور روپے کی طلب ہوتی۔ بڑی بی بی اپنی محبت کی بھاری قیمت چکاتی رہیں اور اُن لوگوں کی ہر بات پوری کرتی رہتیں، یہاں تک کہ اُن لوگوں نے بہلا پھسلا کر بڑی بی بی سے اُن کا مکان بچے کے نام لکھا لیا۔ اور جب بڑی بی بی کی دولت ختم ہونے لگی اور وہ اُن کی مانگیں پوری کرنے کے لائق نہ رہیں۔ تو اُنہوں نے مجبور کر دیا کہ وہ کہیں اور ٹھکانہ تلاش کر لیں۔ بڑی بی بی حفیظ کے بچے کے لئے جان دیئے دیتی تھیں اور کہتی تھیں میں تمہارا گھر چھوڑ دوں گی کہیں چلی جاؤں گی مگر مجھے میرا بیٹا دے دو۔ یہ بچہ مجھے دیدو۔ اُن لوگوں نے ایک نہ سُنی۔

اور بڑی بی بی کو گھر سے نکال دیا۔
اب اُن کا کوئی گھر نہ تھا، کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ بڑی بی بی کے دُور کے رشتے کی ایک بھانجی ہوتی تھیں۔ اُنہوں نے رحم کھا کر اپنے گھر میں پلنگ بھر کی جگہ دے دی۔ اِس گھر میں اُن کی حیثیت ایک نوکرانی سے زیادہ نہ تھی۔ اُن کی بھانجی اُن کو محض اِس لئے برداشت کر رہی تھیں کیونکہ اُن کی نظر بڑی بی بی کے زیورات پر تھی۔ جو اُنہوں نے بقول اُن کے اپنے کفن دفن کے لئے بچا رکھے تھے۔ بڑی بی بی کا محبت کا پیاسا دل ہر لحظہ کسی نہ کسی کو اپنا بیٹا بنانے کی آرزو کرنے سے اب بھی باز نہ آیا تھا۔ اپنی بھانجی کے بیٹوں پر جان چھڑکتی تھیں۔ لیکن وہ لڑکے انتہائی حقارت کا سلوک کرتے تھے۔ بڑی بی بی پھر بھی نہ مانتی تھیں اور دونوں لڑکوں کو بیٹا بیٹا ہی کہا کرتی تھیں۔
میں جب اُن کے پاس گیا تو دیر تک رو رو کر اپنا حال سُناتی رہیں۔ اور میں اُن کو سمجھاتا رہا۔ اُنہوں نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔ "ہائے میرا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ میں یوں ہی مر جاؤں گی۔ کوئی میری فاتحہ نہیں کرائے گا۔ کوئی مجھے یاد نہیں کرے گا۔ نسیمہ کے دو لڑکے ہیں۔ میں کہتی ہوں ایک مجھے دے دو، میں بیٹا بنالوں گی، مگر وہ نہیں مانتی ہے"۔ میں نے اُن سے کہا۔ بڑی بی بی اب اللہ اللہ کیجئے۔ اِس بیٹا بنانے کے چکر کو چھوڑ دیجئے۔ آخر آج تک کوئی آپ کا ہوا؟"
بڑی بی بی نے ایک گہری ٹھنڈی سانس بھری اور مغموم لہجہ میں کہا۔ "بیٹا کہتے تو تم ٹھیک ہو، مگر کیا کروں، دل نہیں مانتا۔"

کبھی کبھی ذہن کی اندھیری گلی سے ایک بوڑھی عورت گزرتی ہے جس کے جسم پر اچھے کپڑے ہیں۔ زیور ہیں۔ شکم سیر ہے۔ مگر ہاتھ میں ایک کاسہ ہے۔ یا دل میں ایک کاسہ ہے اور وہ زبانِ حال سے در در صدا دیتی جاتی ہے۔ "بیٹا بیٹا۔ میرا بیٹا کہاں ہے۔ میرا بیٹا کون ہے؟۔ مجھے ایک بیٹا دے دو۔ جس سے میری باپ کی شفقت، بھائی کی رفاقت، شوہر کی محبت کی محرومی اور تشنگی مٹ جائے۔" وہ ہر دروازے سے لوٹائی جاتی ہے۔ میں اُس سے کہتا ہوں۔ "تیرے پاس مال و دولت۔ عزت سب کچھ ہے۔ تو کیوں بھکاری بن کر گھومتی ہے۔ کس لئے بیٹا مانگتی ہے؟" بوڑھی عورت شرمندہ ہو کر کہتی ہے۔ "دل نہیں مانتا۔"

▲

(بقیہ صفحہ ۴۲ — "دکھنی ہندی میں حبّ الوطنی")

موجزن ہے جو حسن شوقی میں پایا جاتا ہے۔ ایک غزل میں کہتا ہے۔ ؎

ہوا دل گل لہو میرا انجھو ٹپکے سوں یوں رستا   سفید لشواز پہ ہر یک بوٹا جیوں لال ریشم کا
انکھیاں بھینوٹرا سو کشتا ہو سدا بھر پور بہتیاں ہیں   انجھوں بھر گود میں میرے تیرت پکڑیا ہے سنگم کا

مہاراشٹر کے شاید ہی کسی شاعر نے اپنی مادر صفات ندیوں کے بیان میں اتنے متبرک اور پاکیزہ خیالات کا اظہار کیا ہو۔ جس طرح دکنی کے ادیبوں نے اپنے شاہکاروں میں اظہار کے ایسے سانچوں، ایسی تشبیہوں، استعاروں اور تمثیلوں کو برتا ہے جو ہندستانی ذہن اور قدیم دکنی کے مزاج سے مطابقت رکھتی ہیں۔ اور جس طرح اُنہوں نے سرمایۂ زبان کو سنسکرت، اپبھرنش وغیرہ سے اخذ کیا ہے۔ اِسی طرح اُنہوں نے مادرِ وطن کے دیوتا کو حبّ الوطنی کے پھول بھی چڑھائے ہیں۔

عابد عالمی

اجنبی

وقت کی جادوگری، اِک سال میں
ہر گلی، ہر موڑ میرے شہر کا
پُوچھتا ہے مجھ سے "صاحب کون ہو"؟

جس کو اپنا گھر کہا کرتا تھا مَیں
جس کی ویرانی سے دِل مانُوس تھا،
آج اُس کی ایک اِک دیوار سے
یہ صدا آتی ہے "صاحب کون ہو"؟

کیا یہی گوشہ ہے وہ جس میں مری
سَر بہ زانُو اَن گِنت راتیں کٹیں،
جس سے اپنا غم کہا کرتا تھا میں،
جس میں میرے دِل کو مِلتا تھا سکوں؟
آج کیوں اِس کی مُروّت مرگئی؟

دوستو! ایسا بھی کیا، اِک سال میں
اِس قدر خود کو بُھلا بیٹھے ہو تم،
مَیں وہی ہُوں، غور سے دیکھو ذرا
مَیں، جسے تم نے ہزاروں غم دِیئے،
جس کے ہونٹوں کا تبسّم آج بھی
تم سے کہتا ہے، مجھے پہچان لو!

وقار خلیل

دوروزہ زندگی میں
طلب، جُستجو، ہوس
حرماں، اَلم، نشاطِ تمنّا کا بانکپن
یعنی فریبِ آرزُو، کاہِش، سُرورِ غم
اِنساں کی سعئ پیہم و جہد و طلب کی بات
اور پھر نوشتۂ خطِ تقدیر کا طِلسم
اَرزاں متاعِ قیمتِ عرضِ ہُنر کا ذکر

سب وَسوسے ظہُور میں اِک لفظِ کُن سے ہیں
اور لفظِ کُن ہے نقطۂ آغازِ زندگی
وہ زندگی جو کشمکشِ نقدِ ذات ہے
اِک ایسی روشنی جو شعُورِ حیات ہے!

مقالہ

شکیل احمد عاصم بریلوی

پنڈت آنند نرائن مُلّا — ایک شعری جائزہ

آج دنیا ایک حسرت زدہ عاشق کی طرح انتشار کے عالم میں سانسیں لے رہی ہے۔ زندگی کے جس شعبے پر نظر ڈالیے کوئی نہ کوئی مسئلہ اژدہے کی طرح منہ پھاڑے ملتا ہے۔ اگر اقتصادی میدان کا جائزہ لیا جائے تو لوگوں کی کثیر تعداد بھوک اور افلاس کی آہنی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ملتی ہے۔ اگر اخلاقیات کا مطالعہ کیا جائے تو اخلاق مفلوج اور کردار مدقوق نظر آتا ہے۔ اگر امن و امان کی جانب نظر اٹھا کر دیکھئے تو جنگ و جدل کے بھیانک سائے انسانیت کو تباہ کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ مختصر یہ کہ تنظیم عالم درہم و برہم ہے۔ انسانی سکون کا شیرازہ منتشر ہے۔ خوش حال سے خوش حال انسان بھی ذہنی اور قلبی سکون کے لئے ترس رہا ہے۔ بقول شخصے، "آج ہم اس دور سے گزر رہے ہیں جو ایک ایسے ہنڈولے کی طرح ہے جو سونے کا بنا ہوا ہو مگر جس میں کانٹوں کا بستر بچھا دیا گیا ہو۔ آج دن کے اجالے میں بھی رات کی سیاہی نظر آتی ہے۔"

آج دنیا اور خصوصاً ہندوستان کی آنکھیں اپنے شعراء اور ادباء کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ وقت کی یہ پکار ہے کہ ادباء موجودہ سیاسی اور سماجی مسائل کو گہری نگاہوں سے دیکھیں۔ اور ان کے مناسب حل تلاش کریں۔ ہر دور کا ادب ہی دعوتِ فکر و عمل اور پیامِ زندگی دے کر قوم و ملت کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرتا ہے۔ اس ضمن میں مجھے نثار اٹاوی کا ایک شعر یاد آرہا ہے ؎

جو اپنے ہی غم میں مرتا ہے انسان کے غمخواروں میں نہیں
اس دور میں ایسا اہل قلم کچھ اور ہے فن کاروں میں نہیں

آج جبکہ ایسے ادیبوں کی وقت کو سخت ضرورت ہے جو نئی اقدار اور بدلتے ہوئے تقاضوں کو اپنی شاعری میں سمونے کی پُرخلوص کوشش کریں۔ بیشتر شعراء یا تو اسیرِ کاکلِ جاناں ہیں یا کسی 'ازم' کے شکار ہیں۔ ایسے شعراء اپنے عصری فرائض کو فراموش کئے بیٹھے ہیں۔ وہ ادب کے اس عظیم فرض کو بھولے ہوئے ہیں۔ شاعری کے ذریعہ لوگوں میں اخلاقی بلندی پیدا کرنا ایک عام مقصد رہا ہے۔ اور دنیا کے بڑے بڑے شعراء اس مقصد کے حامل رہے ہیں۔ جن سے اگر ہم یہ مقصدیت جدا کر دیں تو ان کی شاعری بے معنی ہو جائے گی۔ میرا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ شاعری میں "جمالیاتی ادب" کا کوئی مقام نہیں ہے بلکہ مجھے یہ کہنا ہے کہ آج کے مشینی دور میں ہمیں اپنی شاعری میں جمالیات کے ساتھ ساتھ تعمیری خیال کو بھی سمونے کی ضرورت ہے۔ ادب وہی ہے جس میں افادیت اور انبساط دونوں پہلو بہ پہلو ہوں۔ میں انگریزی کے مشہور شاعر گوئٹے کے اس خیال کا حامی ہوں کہ ادب زندگی کی قوتوں میں اضافہ کرتا ہے۔ وہ ہمارے جذبات و احساسات کو پاکیزہ بناتا ہے۔ انسان کی قوتِ ارادی کو

تقویت عطا کرتا ہے اور آدمی کو انسانیت کے زیور سے آراستہ کرتا ہے۔ بقول شفیق جونپوری ؎

شاعری وہ ہے جو دیتی ہو، پیامِ زندگی   جس کے آگے ماند ہو خورشید کی رخشندگی
شاعری وہ ہے جو ہو مجموعۂ فکر و عمل   جس سے کِھل اُٹھتا ہو قلبِ آدمیت کا کنول

مُلّا صاحب اس نقطۂ نگاہ سے بے حد قابلِ قدر ہیں کہ اُنہوں نے اپنی شاعری کا موضوع محبوب کے لب و رخسار کو نہیں بنایا بلکہ اُس میں نئی قدروں اور وقتی تقاضوں کو سمونے کی قابلِ ستائش کوشش کی ہے۔ اُن کی پیدائش ہندوستان کے ادبی گہوارہ شہر لکھنؤ میں ہوئی۔ اُن کے والد پنڈت جگت نرائن مُلّا کا شمار لکھنؤ کی ممتاز شخصیتوں میں ہوتا تھا۔ مُلّا نے لکھنؤ ہی میں تعلیم حاصل کی اور ایم، اے، ایل، ایل، بی کرنے کے بعد لکھنؤ ہی میں وکالت شروع کر دی۔ درترقی کرتے کرتے ہائی کورٹ کی جج تک پہنچے۔ پارلیمنٹ کے ممبر چنے گئے۔ وہ اُردو کے نہایت پُرجوش اور بے باک خدمت گزار ہیں۔ اُن کے حالاتِ زندگی تفصیل کے ساتھ بیان دینے کا موقع نہیں ہے۔ جہاں تک شعر و شاعری کا تعلق ہے یہ اُنہیں ورثہ میں ملی ہے اس لئے کہ مُلّا صاحب چکبست خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ ابتدائی دور میں انگریزی میں شعر گوئی کی مگر چند احباب کے اصرار پر ۱۹۲۶ء سے اُردو میں بھی شعر کہنا شروع کیا۔

"مُلّا صاحب کے کلام کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اُس میں آپ بیتی اور جگ بیتی دونوں کی آمیزش ملتی ہے، وہ زندگی میں رُونما ہونے والے واقعات و مشاہدات کو نہایت فلسفیانہ نظر سے دیکھتے ہیں اور پھر اُس کو بڑے غور و فکر کے بعد شعر کا رُوپ دیتے ہیں۔ وہ اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کو شعر کا جامہ پہناتے ہیں۔ اُن کے اشعار پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے جیسے یہ اُسی کے دِل کی پکار ہے۔ وہ ابہام سے زیادہ "ابلاغِ فکر" میں عقیدہ رکھتے ہیں۔ وہ محض لفظوں کے سہانے تک ہی شعر کو محدود نہیں رکھتے بلکہ اُن سے نہایت گہرے مفاہیم پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں سیّد عبدالباری کی یہ رائے (مطبوعہ "دوام") قابلِ توجّہ ہے۔

"مُلّا ادب اور ادیب کے منصب کو انتہائی بلند مقام عطا کرتے ہیں۔ وہ ادب کو فقط ادیب کی زخمی رُوح کی چیخیں، یا اُس کی دبی کچلی رُوح کی فریاد یا اُس کے بے چین جذبات کا سیلان نہیں سمجھتے۔ اُسے وہ ذہن کی تطہیر اور ذوق کی تربیت کا ایک آلۂ کار قرار دیتے ہیں۔ اُن کے اِن بلند خیالات کا نکھرا ہوا عکس اُن کی شاعری میں نظر آتا ہے جو پڑھنے والے کے اندر بلند اور شریفانہ جذبات اُبھارنے کی صلاحیت رکھتا ہے"

مُلّا صاحب کے یہ دو شعر ملاحظہ کیجئے ؎

اِس مَے کو نہ پی قطرہ قطرہ، گِن گِن کے نہ لے سانسیں اپنی   جینا ہے تو جی جینے کی طرح، جینے کا فقط الزام نہ لے
یہ کہہ کے آخرِ شب شمع ہو گئی رخصت   کسی کی زندگی لینے سے زندگی نہ ملی۔

مُلّا صاحب اپنے اشعار میں پیامِ زندگی اور دعوتِ فکر و عمل بڑے پُرجوش اور مؤثر انداز میں دیتے ہیں۔ وہ ایک طرف کج اخلاقی پر ناقدانہ نظر ڈالتے ہیں اور دوسری طرف اُس کے اصلاحی طریقوں پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ اُن کی یہ خصوصیت کلام اُن کے تعمیری اور تخلیقی جذبے کی غماز ہے۔ اُن کے کلام کو اگر "مجموعۂ فکر و عمل" یا "خزانۂ اقدارِ نو" کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ کیونکہ وطنیت اور قومیت، انسان دوستی اور محبّت کا جذبہ شدّت کے ساتھ اُن کی شاعری سے نمایاں ہے۔ سیّد عبدالباری نے ٹھیک ہی کہا ہے:

"مُلّا ادب کی پائیداری اور محکم بنیادوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ اعلیٰ ادب کی تخلیق کے لئے فقط جذبات

احساسات کو کافی نہیں سمجھتے ہیں بلکہ پختہ سماجی شعور اور اخلاقی بصیرت کو بھی لازمی گردانتے ہیں۔ اظہارِ حُسن، اظہارِ ذات اور اظہارِ نفس سے زیادہ اظہارِ مقصد کو اہمیّت دیتے ہیں۔ وہ ادب برائے ادب کے فرسودہ نظریہ اور اُس کی آڑ میں لذّت پرستی اور وقتی جذبات کی تسکین کو ادب کے لئے اِنتہائی مہلک قرار دیتے ہیں۔"

مُلاحظہ فرمایئے اِظہارِ مقصد ؎

سینے کی حرارت سے خالی، گرمیٔ چراغِ شام نہ لے   یہ دِل ہے اَمانت دنیا کی، اپنا ہی بس اس سے کام نہ لے
مے سب کو نہ ہو تقسیم اگر، اپنا بھی اُلٹ دے پیمانہ   یہ کُفر ہے کیشِ رندی میں، ساقی سے اکیلے جام نہ لے
یہ خزاں بدوشِ سموم تو، ہے گُلوں کے ظرف کا امتحاں   وہی گُل ہے گُل، جو فسُردہ ہو، تو فسُردگی بھی بہار دے

مُلّا صاحب کے کلام کی بُنیاد فکرِ بلیغ ہے۔ اُن کے تخیّل کی پرواز اتنی بلند ہے کہ فلسفی نہ ہوتے ہوئے بھی وہ کبھی کبھی فلسفی معلوم ہونے لگتے ہیں۔ دراصل یہ اُن کے زندہ محسوسات کی بات ہے۔ لیکن وہ جو کچھ کہتے ہیں اُسے اپنے عصر سے دُور نہیں لے جاتے۔ علّامہ اِقبال کا ایک مشہور شعر ہے۔ ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نُوری پہ روتی ہے   بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اِس مفہوم کا مُلّا بڑی خوبصورتی سے اپنے مخصوص انداز میں یوں اِظہار کرتے ہیں ؎

نہ جانے کتنی شمعیں گُل ہوئیں کتنے بُجھے تارے   تب اِک خورشید اتراتا ہوا بالائے بام آیا

وہ حیات و کائنات کو بہت قریب سے دیکھتے ہیں اور حقائق کی عُقدہ کشائی اِس کامیاب انداز میں کرتے ہیں کہ قاری اُسے اپنے ہی دِل کی آواز سمجھنے لگتا ہے۔ اُن کے بعض اَشعار اَسرارِ حیات اور رموزِ کائنات کی تفسیر معلوم ہوتے ہیں۔ وہ خود بھی ایک شعر میں اِس طرف اِشارہ کرتے ہیں ؎

شعرِ مُلّا ہیں اندھیروں میں اُجالے کی تلاش   فکرِ مُلّا ہے ستارے توڑ کر لانے کا نام

حیات و کائنات کی عقدہ کشائی مُلاحظہ ہو ؎

بشر کو مشعلِ اِیماں سے آگہی نہ مِلی   دُھواں وہ تھا کہ نگاہوں کو روشنی نہ مِلی
ترا لطف آتشِ شوق کو، حدِ زندگی سے بڑھا نہ دے   کہیں بُجھ نہ جائے چراغ ہی، اِسے دیکھ اِتنی ہوا نہ دے
سمجھ کر جس کو غم کی اِک اَمانت رکھ لیا دِل میں   وہی خاموش نالہ حاصِلِ فریاد ہوتا ہے

وہ گناہ و ثواب کے فلسفے پر ایک نئے انداز سے نظر ڈالتے ہیں۔ اُنہیں تعجّب ہے کہ اِس حیاتِ چند روزہ میں لوگ توبہ کے لئے فرصت کیسے نکال لیتے ہیں جبکہ گناہ کے لئے بھی مُہلت کم مِلتی ہے۔ اُن کا ذیل کا شعر احساسِ گناہ اور توبہ نہ کر سکنے کی ایک طرح کی ندامت کو اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے ؎

وہ کون ہیں جنہیں توبہ کی مِل گئی فرصت؛   یہاں گناہ بھی کرنے کو زندگی کم ہے

وہ غمِ جاناں اور غمِ زمانہ سے گھبراتے نہیں ہیں۔ بلکہ غمِ جاناں کو غمِ ہستی کے بُھلانے کا ذریعہ تصوّر کرتے ہیں۔ وہ غمہائے زمانہ سے گھبرا کر فراریت بھی اِختیار نہیں کرتے۔ بلکہ ایسے حالات میں عزائم کو بلند اور ہمّت کو جوان رکھتے ہیں۔ وہ غم کو تربیتِ دِل کا گردانتے ہیں۔ ع ____ "غم سے ہوتی ہے تربیت دِل کی"

مُلّا ایسے کلام کے قائل ہیں جو اِنسان میں بلندی و جراُت کے جذبات پیدا کرے۔ اِس لئے وہ ایک بڑے شاعر کے لئے صالح ذہن کا ہونا ضروری سمجھتے ہیں۔ اُن کی نظر میں ذہنِ صالح وہ ذہن ہے جو اِنسانیت کو ایک اِکائی بن کر سوچتا

ہے۔ اور وہ اس بات میں راسخ عقیدہ رکھتا ہے کہ انسانی فطرت میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ تعلیم و تربیت سے نفسِ امّارہ پر قابو سکتی ہے۔ وہ انسانی مستقبل سے مایوس نہیں ہیں۔ بلکہ وہ ایسا سوچنے والے کے ذہن کو بیمار تصوّر کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک بیمار ذہن صالح اور صحت مند ادب پیش نہیں کر سکتا۔ وہ حقیقت نگاری کے بارے میں بھی بڑی متوازن رائے رکھتے ہیں اپنے اِس خیال کا اظہار اُنہوں نے اپنے مجموعۂ کلام "میری حدیثِ عمرِ گریزاں" کے پیش لفظ میں اِس طرح کیا ہے:

" ادب میں حقیقت نگاری زندگی کا عکس پیش کرنا نہیں، بلکہ زندگی کے راز کو بے نقاب کرنا ہے، اِس میں منظر سے زیادہ پسِ منظر اہم ہے ——— فنکار محض منظر نہیں دکھاتا بلکہ منظر کو آڑ بنا کر اپنا پیغام سُناتا ہے ..... پچھلی دو عالمی جنگوں اور انسان کو تباہ و برباد کرنے کی واقفیت و طاقت نے اُس کے عقائد کی بُنیادیں ہلا ڈالی ہیں اور وہ تہذیب کے اِس ضبط سے، جو اُس نے صدیوں میں اپنی جبلّت پر کسی حد تک قابو پا کر حاصل کیا تھا، آج پھر باز گشت کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور ہر نظامِ اخلاق کو ٹھکرا کر اپنی انفرادی تشنگی کی سیرابی کا جویا نظر آتا ہے۔ لیکن یہ تصویر کا ایک رُخ ہے، مجھے نام نہاد حقیقت نگاروں سے یہی شکایت ہے کہ یہ تصویر کا صرف ایک رُخ دیکھتے ہیں۔ اِنسان کے دِل میں فرشتہ بھی ہے اور شیطان بھی۔ لیکن یہ کس قسم کی حقیقت نگاری ہے جو جب دِل میں جھانکتی ہے تو شیطان ہی نظر آتا ہے اور فرشتہ ہمیشہ کسی تاریک گوشہ میں چھپا رہ جاتا ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ حقیقت نگاری دانستہ یا نا دانستہ طور پر بادلیر کے اِس قول پر کہ حُسن کی بہترین تصویر شیطان کی ذات ہے، ایمان رکھتے ہیں۔ اِسی قسم کا ادب ایک مریض ذہن کی علامت ہے۔"

اُن کے اِن خیالات کی روشنی میں اُن کے ذیل کے اَشعار اپنے اندر خاصا سامانِ فکر و انبساط رکھتے ہیں ؎

جہاں کے غُل میں دبنے دے نہ آوازِ ضمیر اپنی
جہاں تک ہو سکے کانوں میں یہ آواز رہنے دے

تھے گرفتارِ قفس اب ہیں اسیرِ آشیاں
شاید آزادی ہے بس زنداں بدل جانے کا نام

کارواں ہے خود اپنی گرد میں گُم
پَیر کی خاک مُنہ کو آتی ہے

بَدی کے سامنے نیکی ابھی تک
سپر انداز ہوتی جا رہی ہے

اِس سے اِنکار نہیں کیا جا سکتا کہ مُلّا صاحب دَورِ نَو کے ایک صحیح الفکر شاعر ہیں۔ اُن کا تخیّل تعمیری اور فکر صحت مند ہے، زبان میں فصاحت، سَلاست اور سادگی کا عنصر کارفرما ہے۔ وہ صرف ایک بلند پایہ شاعر ہی نہیں ہیں بلکہ ایک ممتاز سیاست داں بھی ہیں۔ حق گوئی و بے باکی اُن کی فطرت ہے، اُن کا شمار اُردو زبان کے محسنین میں ہوتا ہے، اِس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک باکمال شاعر ہیں۔ اُن کا شمار اَساتذۂ اُردو میں ہوتا ہے اور جہاں تک میں نے نظر دوڑائی ہے اُن کی عمر کا کوئی دوسرا شاعر اُن کی فکری پہنچ تک نہیں پہنچا۔ فراقؔ کو اُن کا ہم عمر کہا سکتا ہے۔ لیکن فراقؔ بالکل دوسرے رنگ کے شاعر ہیں۔ ناقدینِ فراقؔ کا یہ کہنا کہ۔ فراقؔ کے یہاں اُن کی اپنی زبان اور اپنے اُسلوب میں متقدّمین بولتے ہیں، کچھ غلط نہیں ہے۔ آنند نرائن مُلّا اپنے دَور کے جیتے جاگتے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کا عصر اُن کی شاعری میں بولتا ہے۔ اُن کے یہاں طنز کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ تہذیب و تمدّن، سماج اور سیاست، وقت اور حالات، اِنسان اور انسانیت پر وہ بڑے حقیقت پسندانہ خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ لکھنوی شاعری کی چھاپ اُن کے رنگِ سخن پر نہ ہونے کے برابر ہے مگر جہاں اُن کی غزل میں انتہائی بلند اشعار ملتے ہیں وہیں بہت معمولی اشعار اور ٹوٹے پھوٹے مصرعے بھی مِل جاتے ہیں۔ اُنہیں اِحساس تک نہیں ہوتا کہ وہ فکر کی بلندی سے یکایک پستی کی طرف آ گئے۔ اُنہیں پڑھنے اور سُننے والے حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔

یعقوب راہی

فساد کے بعد

وہ ندیاں جو بہتی رہیں کوہ و دشت میں
وہ آرزوئے دِل کی طرح خشک ہوگئیں
وہ پیڑ جن کی چھاؤں میں بیٹھا کیئے ہو تم
وہ بوڑھے سایہ دار شجر سوکھ بھی گئے
کچھ اور تیز ہوں جو ہوائیں تو ٹوٹ جائیں!

وہ گاؤں جس کی گلیوں میں بھٹکا کیئے ہو تم
وہ اِس طرح جلا ہے کہ اب راکھ بھی نہیں
وہ لوگ جن کی نظروں میں "پاگل" رہے ہو تم
پچھلے فساد میں وہ سبھی قتل ہوگئے!
ساکت سی ہوگئی ہے ہوا، اور دُور دُور
بے حس کھڑے ہیں زرد پہاڑوں کے سلسلے
جیسے یہ قتلِ عام میں شامل کبھی نہ تھے!!

"پاگل"! پھر آج آئے ہو اِس ریگ زار میں
اب کس درخت کے تلے سستانے جاؤگے
تم اپنی پیاس، کیسے، کہاں، کب بجھاؤگے!؟
بستی کے راکھ ہونے پہ، جسموں کے قتل پر!
کب چیخ بن کے گونجو گے، کب کھُل کے روؤگے؟

شعبان بن رابرٹ
(سواحلی)
مترجمہ
ساحر شیوی

"میرے کوچے سے تیرے کوچے تک"

پیچ و خم میں کہیں نہ کھو جاؤں
ہاں ابھی تک اِسی تصوّر میں
رُک رہے تھے، لرز رہے تھے قدم
میرے کوچے سے تیرے کوچے تک
راہ میں پیچ و خم ہزاروں ہیں
ایک انجانا راستہ میرا
کس طرح پیچ و خم نظر آتے

دُور منزل تھی اور یہ مشکل،
اِتنی پُر ہول، اِتنی وحشت ناک
غرق تھی رات بحرِ ظلمت میں
نہ فلک پر ظہور تاروں کا
حشر کی رات کا سا سناٹا
بارہا جس کو دیکھا سپنوں میں
خوف سے جس کے
روم روم مِرا
کانپ جاتا تھا
ہوش اُڑتے تھے
جس کی ہیبت سے ڈگمگاتے تھے
وہ قدم
جو نہ ڈگمگائے کبھی

مجھ کو تسلیم! یہ گِلہ تیرا
جن کے دِل پیار کی ضیاؤں سے
روزِ روشن کی طرح ہوتے ہیں
ظلمتوں سے کبھی نہیں ڈرتے
جان دے کر بھی وہ نہیں مرتے!

شبنم قیوم

آنکھیں

"نہیں نہیں ۔ ۔!! ایسا نہ کہیئے ڈاکٹر! میں آپ کے پیر پڑتی ہوں۔ آپ مجھ پر یہ احسان کیجئے ڈاکٹر!"

"تمہارا دماغ ٹھیک ہے کیا ۔ ۔ ؟"

"ہاں ڈاکٹر! میرا دماغ ٹھیک ہے۔ صرف میری آنکھیں ۔ ۔ ۔ خدا کے لئے آپ میری یہ آنکھیں نکال دیجئے ۔"

"میں نے ایک بار کہدیا ہے، مجھ سے ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا، آپ تو ڈاکٹر ہیں۔ میں آپ کو مجبور کر رہی ہوں۔ پھر آپ کو اس میں اعتراض کیا ہے ۔ ؟"

"تم اپنی یہ آنکھیں نکالنا کیوں چاہتی ہو۔ آنکھوں کے بغیر تم جیو گی کیسے ؟"

"اس کی آپ فکر نہ کیجئے، اِن آنکھوں کے بغیر میں جیوں گی اور اچھی طرح جیوں گی۔ مجھے اِن آنکھوں کی کوئی ضرورت نہیں جنہوں نے مجھے قدم قدم پریشان کر دیا ہے، جنہوں نے مجھے بڑی اُلجھنوں میں ڈال دیا ہے۔"

"عجیب عورت ہو تم، مجھے یقین ہے تمہارا دماغ ٹھیک نہیں۔"

"غلط ۔ ڈاکٹر! آپ غلط سمجھ رہے ہیں میرے دماغ کو کچھ نہیں ہوا ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"اگر تمہارا دماغ ٹھیک ہے تو پھر تم اپنی آنکھیں نکلوانا کیوں چاہتی ہو۔؟"

"ڈاکٹر! جن آنکھوں کے نکالنے کے لئے میں آج آپ کے سامنے منت سماجت کر رہی ہوں یہی آنکھیں نہ نکالنے کے لئے میں کبھی روئی ہوں، گریہ وزاری کی ہے مگر...... یہ سب بے سود۔"

"۔ تو کیا . . . کیا تمہاری آنکھیں کبھی نکالی بھی گئی ہیں؟"

"۔ ہاں اُن دِنوں میں بہت چھوٹی تھی۔ مجھے یاد ہے میں اپنے والدین کے ساتھ میلہ دیکھنے گئی تھی۔"

"کونسا میلہ ۔ ؟"

"مجھے یاد نہیں۔"

"کیوں ۔ ؟"

"کیا آپ بتا سکتے ہیں اِس وقت میری عمر کیا ہوگی۔ ؟"

"لگتی تو تم پچاس برس کی ہو، لیکن ... تمہاری عمر تیس پینتیس سال کے درمیان ہوگی۔"

"اگر تیس سال مان لیا جائے تو آج سے پچیس سال قبل جب میری عمر صرف پانچ سال کے لگ بھگ تھی، میں نہ جانے اپنے ماں باپ کے ساتھ کہاں کونسا میلہ دیکھنے آئی۔ البتہ یہ بات یاد پڑتی ہے کہ اُس میلے میں ہم ایک جگہ بیٹھے کچھ کھا پی رہے تھے کہ میری نظر ایک غبارے والے پر پڑی اور میرا دل ایک رنگین غبارہ لینے کے لئے مچل گیا۔ میں نے ماں سے غبارہ لینے کیلئے پیسے

لئے اور غبارے والے کے پیچھے دوڑی بھاگی ـــــ کچھ دور جاکر میں نے اُسے جالیا۔"

"پھر کیا ہوا ـــ؟"

"غبارہ لیکر میں خوشی سے اُچھلتی کودتی واپس آ رہی تھی کہ ایک شخص نے جھٹ گود میں لے کر مجھے بیٹی کہہ کر چوما اور میرے ہاتھ میں مٹھائی کا لفافہ تھما دیا ـــــ یہ کون شخص تھا؟ میں اُسے تب جانتی تھی نہ اب جانتی ہوں۔ اُس نے مجھ سے اور باتوں کے علاوہ میرے ماں باپ کے بارے میں بھی پوچھا کہ وہ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ جب میں نے اُس کی باتوں کا صحیح صحیح جواب دیا تو اُس نے مجھے اپنے بیٹے سے مِلانے کیلئے کہا، کافی دُور پہنچ کر اُس نے مجھے ایک کار میں بٹھا دیا جس میں دو آدمی ایک چھوٹے بچے کو مٹھائی کھلا رہے تھے، جونہی میں اس کار میں بیٹھ گئی کار فرّاٹے سے چل دی ..... میں چلائی تو میرا مُنہ بند کر کے مجھے اُس چھوٹے لڑکے کے ساتھ سیٹ پر لٹا دیا گیا اور نہ جانے کہاں لے جا کر ہم دونوں کو ایک کمرے میں بند کر دیا۔"

"پھر کیا ہوا ـــــ؟"

"دوسرے تیسرے روز اُنہوں نے ہمیں ٹرین میں بٹھا کر نہ جانے کہاں اور کدھر بھیج دیا ـــ اپنے قبضہ میں کرنے کے چند روز بعد اُنہوں نے لڑکے کے بازو اور ٹانگیں توڑ دیئے اور میری آنکھیں نکال دیں!"

"اُف ..... فوا، پھر کیا ہوا۔؟!"

"اِس درد سے جب میں سنبھل گئی تو پھٹے پُرانے کپڑے پہنا کر مجھے بھیک مانگنے کا سبق سکھا دیا۔"

"تم نے کیا کیا ـــ؟"

"میں دو تین بھکاریوں کے قبضے میں گلی گلی سڑک سڑک (اندھی بیٹی کا ایک پیسے کا سوال ہے بابا) پکارتی رہی اور زندگی کے یہی راستے طے کرتے ہوئے بڑی ہو گئی۔"

"تم نے کسی کے سامنے اِس بات کا اظہار نہیں کیا؟!"

"میرے ساتھی جو سائے کی طرح اپاہج بن کر میرے ساتھ ساتھ رہتے تھے، مجھے کسی کے سامنے بھی اپنی رُوداد سُنانے نہیں دیتے تھے۔ پھر بھی کئی بار میں نے اس کی کوشش کی مگر ..... مگر مجھے اس کی کڑی سزا بھگتنی پڑی، اُس کڑی سزا کا آج بھی تصوّر کرتی ہوں تو کانپ اُٹھتی ہوں!"

"کیا کیا اُنہوں نے تمہارے ساتھ ؟"

"ایک بار ایک عورت نے مجھے پیسے دیتے ہوئے میرے ماں باپ کے بارے میں پوچھا، میرا دِل بھر آیا۔ میں اُس سے اپنی رُوداد کہنے لگی تھی کہ مجھے فوراً وہاں سے کھسکا دیا گیا اور ٹھکانے پر لے جا کر مجھ پر کوڑے برسائے گئے اور کئی دِنوں تک میرا دانہ پانی بند کیا گیا۔ ایسے ہی واقعے جب چند ایک بار پیش آئے تو میں نے اپنے آپ کو حالات کے سُپرد کر دیا۔ اُنہوں نے مجھے جس طرح چاہا اِستعمال کیا۔ میں دن کو اندازے کے مُطابق پانچ آٹھ روپے کماتی تھی۔ لیکن کھانے کو مجھے رُوکھی سُوکھی کے سوا کچھ نہیں ملتا تھا ـــــ میری جیسی دوسری لڑکیوں اور لڑکوں کی کمائی پر یہ لوگ بڑے بڑے کاروبار کرتے تھے۔ عیش کرتے تھے اور ہم ..... مشرق، مغرب جنوب و شمال گھومتے گامتے اپنا دھندا کرتے کرتے اپنی زندگی گزارتے رہے۔"

"اُس گروہ سے پھر تم کیسے چھوٹ گئیں۔؟"

"اِسے آپ ایک اتّفاق سمجھ لیجئے ڈاکٹر! ہماری ایک جماعت کو دھندا کرنے کے لئے کشمیر بھیجا گیا۔

"اچھا ـــ تم نے کشمیر بھی دیکھا ہے۔"

"کاش! اُن دِنوں میری آنکھیں ہوتیں، جن دِنوں میں کشمیر میں تھی ـــــ ویسے میں اُس کشمیر کو کبھی نہیں بھولوں گی جس نے مجھے اُس گروہ سے آزادی دِلائی" ـــــ کشمیر میں دھندا کرتے ابھی ہمیں کچھ ہی دِن ہوئے تھے کہ وہاں کی پولیس نے تمام بھکاریوں پر چھاپہ مار کر اُنہیں گرفتار کر کے بیگر ہوم بھیج دیا ـــــ اِس طرح کوئی پچیس سال کے بعد مجھے اپنے ساتھیوں سے علیٰحدہ کر کے زنانہ وارڈ میں رکھا گیا۔"

"وہاں تم نے کیا کیا ــــ؟"

" ہر کوئی بھکاری اور بھکارن وہاں اپنا اپنا کام کرتا اور اس کے عوض میں مفت کھانا اور پہننا ملتا تھا ایک روز میں بیمار ہو گئی۔ مجھے بیگرہوم کی ڈسپنسری میں لے جایا گیا۔ جہاں لیڈی ڈاکٹر نے مجھ سے میری بیماری کے ساتھ اِن آنکھوں کے بارے میں بھی پوچھا ــــ میں نے اُسے اوّل سے آخر تک اپنی ساری رُوداد بتائی۔ میری زندگی کا المیہ سُن کر اُس کا دِل بھر آیا۔ دوسرے روز پولیس نے میرے ساتھیوں کو گرفتار کر کے عدالت میں اُن کا چالان کر دیا۔ بدقسمتی سے اصلی سرغنے ہمارے ساتھ وہاں نہیں تھے، اِس لئے وہ صاف بچ گئے۔ لیکن اُن کی تلاش اب بھی جاری ہے۔"

"پھر کیا ہوا ــــ ؟"

" میں بیگرہوم میں اپنی بقیہ زندگی گزار رہی تھی کہ مجھے نئی آنکھیں لگوانے کے لئے یہاں بھیجا گیا۔

" اچھا! یہاں آکر تمہاری نئی آنکھیں لگ گئیں۔ لیکن تم انہیں نکلوانا کیوں چاہتی ہو۔؟"

" ڈاکٹر! اِن آنکھوں نے مجھے بہت پریشان کر دیا ہے، بڑی اُلجھنوں میں ڈال دیا ہے۔ میں حیران ہوں۔ جو بات میں سوچ نہیں سکتی وہ میں آنکھوں سے کیسے دیکھتی ہوں۔ میری سوچ اور نظر میں اتنا تضاد ہے کہ میں قدم قدم پر چونک اٹھتی ہوں ــــ پچیس تیس سال کی تاریک اور گھناؤنی زندگی میں میں ایک محدود دائرے میں پلی بڑھی ہوں۔ مجھے اپنے سماج، قوم اور ملک کا بالکل پتہ نہیں۔ میں کسی کو بھی نہیں جانتی، نہ جاننے کی ضرورت ہے۔"

" ہوتا کیا ہے تمہیں ؟"

" مجھے کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے لیکن میں اس کا اظہار نہیں کر سکتی، اظہار کروں گی تو تشریح نہیں کر سکتی۔ آپ یہ جان لیجئے۔ اگر میرا دل اپنے آپ کی فکر کرتا ہے کہ میں کیسے جیوں؟ تو میری یہ آنکھیں مجھ کو چھوڑ کر ملک کی فکر میں پریشان ہو جاتی ہیں۔ دِل اور نظر کے اِس تضاد کو دیکھ کر میرا دماغ ماؤف سا ہو جاتا ہے۔ میں سب کچھ بھول کر ایک چھوٹے خستہ حال کمرے میں بیٹھ کر اپنے بارے میں سوچتی ہوں تو میری نظر پرواز کرتے کرتے بیک وقت ماسکو، نیویارک، لندن، پیکنگ، پیرس، ٹوکیو وغیرہ جیسے ممالک پہنچ جاتی ہیں۔

" ایسا کیوں ہوتا ہے ؟"

" اتنا ہی ہوتا تو کوئی بات تھی ڈاکٹر! ــ خیالوں ہی خیالوں میں دنیا میں گھوم پھر آ کر جب میں سب کچھ بھول کر سو جانا چاہتی ہوں تو فوراً ذہن سے بغاوت کر کے میری یہ آنکھیں آپ ہی آپ بنگال، راجستھان، پنجاب، آسام، کشمیر، بہار، کیرالا اور دوسری ریاستوں میں پہنچ جاتی ہیں اور وہاں کے بدلتے حالات دیکھ کر مجھے رات بھر پریشان کرتی رہتی ہیں۔"

" کیوں ــــ ؟ آخر کیوں ؟!"

" یہی تو میں بھی پوچھ رہی ہوں ــــ، میں اپنی حیثیت کے چند لوگوں سے اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں ملنا چاہتی ہوں تو میری نظر یک دم ملک کے بڑے بڑے لیڈروں اور سیاست دانوں پر جا کر ٹھہرتی ہیں۔ میں اپنا مسئلہ حل کرنا چاہتی ہوں تو میری آنکھوں کے سامنے فوراً ملکی و غیر ملکی مسائل آجاتے ہیں۔ اِس طرح اُلجھنوں اور پریشانیوں میں گھر کر میں راہِ فرار اختیار کر کے بچ نکلنا چاہتی ہوں تو میری نظر پھر دل اور دماغ کو دھوکہ دے کر چلی جاتی ہے اور وہاں سے کیا کچھ دیکھ کر آتی ہے۔ اگر میں اِس کا اظہار کروں گی تو ایک انقلاب آجائے گا۔ جس سے سارا ملک درہم برہم ہو سکتا ہے۔"

" پھر تم کیا کرتی ہو ــــ ؟"

" میں کر بھی کیا سکتی ہوں ــــ میں تو سب کچھ بھول کر اپنے لئے ایک چھوٹا سا گھر بنانا چاہتی ہوں، یکایک میری نظروں میں بڑی بڑی عمارتیں، بڑے بڑے ڈیم، کارخانے اور فیکٹریاں آجاتی ہیں ــــ میں اپنے چھوٹے سے گھر میں اپنے جیون ساتھی اور اپنے بچوں کا تصور کرتی ہوں، تو میری

نظروں میں ملک کے لاکھوں اور کروڑوں لوگ آجاتے ہیں۔ اس طرح میری سوچ میرے خیالات اور میرے ارادوں کے ساتھ میری نظر کوئی اتفاق نہیں کرتی۔ میرا جو دل چاہتا ہے نظر وہ مانتی نہیں۔ یہاں تک کہ میں پاگل ہو گئی ہوں ـــــ اگر آپ جلد میری یہ آنکھیں نہیں نکال دیں گے تو میں ضرور پاگل ہو جاؤں گی؟

"تم گھبراؤ نہیں میں سب سمجھ گیا۔ تمہاری یہ آنکھیں نہیں نکالی جائیں گی۔ بلکہ تمہارے دل اور دماغ کو اس قابل بنا دیا جائے گا کہ وہ اِن نظروں کا بار سہہ سکیں۔ اگر تمہارے دل اور ذہن نے تمہاری نظروں کا بار واقعی سہہ لیا تو سارے ملک کے لئے یہ نیک فال ہے کیونکہ اس ملک کو ایک ایسی ہی عورت کی ضرورت ہے جس کی آنکھیں تمہارے پاس ہیں۔"

"کس کی ہیں یہ آنکھیں ڈاکٹر ـــــ ؟!"

"بتاؤں گا لیکن تم مچلنا نہیں ـــــ وہ دیوار پر تم کیلنڈر دیکھ رہی ہو ؟"

"ہاں! اس پر ایک عورت کی تصویر ہے جس کے سر پر گھنیرے سیاہ بال ہیں۔ لیکن دائیں جانب ماتھے سے ذرا اوپر سفید بالوں کا ایک چھوٹا سا گچھا ہے۔"

"بہت دن ہوئے اِس ملک کی باگ ڈور اسی عورت کے کاندھوں پر تھی۔ اُس نے اپنی زندگی میں یہ وصیت کی تھی کہ میرے مرنے کے بعد میری آنکھیں Eyes Bank کو دے دی جائیں تاکہ یہ کسی اندھے کے کام آسکیں۔

...... اِس کے مرنے کے بعد ملک کی جو حالت ہوگی تم اُسے اِنہی آنکھوں سے دیکھو اور اپنے آپ کو انہی حالات کے سانچے میں ڈھال کر اپنے آپ کو تیار کرو۔ کیونکہ تمہیں ایک بہت بڑا کام انجام دینا ہے۔ اُٹھو، اپنے دل کو مضبوط کرو اور اپنے آپ کو ....

..... میں نے کہا، تم یہ نیند میں کیا بڑبڑا رہے ہو؟

"اُوں .... ہونہہ! ہم ..... میں کہاں ہوں؟

"تم کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہے تھے۔؟"

"ہاں! میں ایک خواب دیکھ رہا تھا ـــــ ہندوستان کے مستقبل کا ـــــ؟"

"جب سے تم آئیز بینک کے ڈائرکٹر بن گئے ہو۔ تم ایسے ہی خواب دیکھا کرتے ہو۔"

"دیکھو، میری بات سنو ـــــ جو اندھی بھکارن یہاں اکثر بھیک مانگنے آتی ہے اگر وہ آج بھی آگئی تو اُسے تم میرے پاس ہسپتال بھیج دینا، اُس کے لئے آنکھیں میرے پاس آگئی ہیں۔"

"اچھا ـــــ کس کی ہیں وہ آنکھیں ؟!"

"اوہ! مجھے معاف کرنا، ابھی آنکھیں نہیں آئی ہیں صرف اُن آنکھوں کے بارے میں وصیت آگئی ہے۔"

راہی قریشی

خاموش رہتے رہتے صدا کو ترس گئے
اِک التجا کو، ایک دُعا کو ترس گئے
مُحسنِ ستم کو، لُطفِ جفا کو ترس گئے
کیا ذکرِ التفات، سزا کو ترس گئے
بیمار جب نہ تھے تو مسیحا تھے مہرباں
اب زخم بڑھ گئے تو دوا کو ترس گئے
فردوسِ قُرب میں تو بہت دِن رہے، مگر
خوشبُوئے زُلف و رنگِ حنا کو ترس گئے
جن کے نفس سے پھُول مہکتے رہے سدا
اب وہ بھی سانس لینے ہوا کو ترس گئے
عرضِ وفا کی آرزو، لب تک نہ آسکی
تجھ سے ملے تو حرف و صدا کو ترس گئے
وہ وقت ہے کہ چھُوٹ گیا سائے کا بھی ساتھ
وہ شور ہے کہ اپنی صدا کو ترس گئے
راہیؔ وطن میں کوئی شناسا نہیں رہا
ہم گلستاں میں رہ کے صبا کو ترس گئے

حبیب الرحمٰن راہی

وہ اِک درخت جو سُوکھا دکھائی دیتا ہے
لُٹی بہار کا ڈھانچا دکھائی دیتا ہے
سُنے گا کون یہاں دستکیں اُجالوں کی
ہر ایک گھر میں اندھیرا دکھائی دیتا ہے
بڑا حسین ہے منظر کہیں یہ خواب نہ ہو
چمن کے سائے میں صحرا دکھائی دیتا ہے
شراب، حُسن، جوانی، چراغ، راکھ، دھواں
اکیلے، رات میں کیا کیا دکھائی دیتا ہے
زمانہ کچھ بھی کہے، لیکن اِس زمیں سے مجھے
وہ چاند تیرے ہی جیسا دکھائی دیتا ہے
چلو قیام کریں ہم بھی اب وہیں راہیؔ
وہ دُور ایک دِیا سا دکھائی دیتا ہے

وقار واثقی

شکوہ کیا ہو کہ کسی نے مجھے دیکھا بھی نہیں
کھُل کے جب سامنے مَیں آج تک آیا بھی نہیں
رشک کرنے لگی جس بات پہ دُنیا، اے دوست
اُس نظر سے کبھی مَیں نے تجھے دیکھا بھی نہیں
میری تصویر، جو دُنیا نے دکھائی ہے مجھے
مَیں نے اُس شکل میں خود کو کبھی دیکھا بھی نہیں
آج مطعُون زمانے میں ہُوا ہوں میں وقارؔ
اُس تمنّا پہ، کہ جو میری تمنّا بھی نہیں

ڈراما

جمیل شیدائی

شکار

افراد

سعیدہ :۔۔۔ ۳۰، ۳۵ سال کی عورت
شفیق :۔۔۔ سعیدہ کا شوہر
فیروز :۔۔۔ سعیدہ کا چچازاد بھائی
فوزیہ :۔۔۔ ایم اے کی طالبہ سعیدہ کی بہن
ملازمین :۔۔۔

پہلی کڑی

مکان کا اندرونی حصّہ۔ وسیع دالان سے ملحقہ بڑے بڑے ہال ہیں۔ پیش دالان سے باغ کا حصّہ شروع ہوتا ہے۔ باغ اور پیش دالان کو ملانے والی سیڑھیوں کے دونوں جانب موتیا اور گلاب کے درخت لگائے گئے ہیں۔ آرام کرسی پر سعیدہ دراز ہے۔ اس کا رُخ دالان سے سیدھے جانب والے کمرے کی طرف ہے۔ یہ شو نے کا کمرہ دکھائی دیتا ہے۔ مسہری پر آرام دہ بستر ہے اور اس کمرے کی دیواروں پر خوبصورت قدرتی مناظر کی تختیاں آویزاں کی گئی ہیں۔ دو عورتیں اور دو کمسن بچیاں مختلف قسم کے کاموں میں مصروف ہیں۔

سعیدہ :۔ (ملازمہ سے) دیکھو چھت پر ایک جالا نہ رہے اور گھڑی کے اطراف کی گرد اچھی طرح سے جھٹک دو۔

ملازمہ :۔ جی اچھا! (دوسری ملازمہ سعیدہ کی طرف آتی ہے)

ملازمہ ۲ :۔ بی بی، اُدھر والے کمرے میں جو ٹیوب لائٹ ہے نا، وہ اگر یہاں لگا دی گئی تو؟

سعیدہ :۔ ٹھیک ہے۔ یہاں کا بلب وہاں لگایا جا سکتا ہے۔

ملازمہ :۔ بی بی، صاحب کب تک آرہے ہیں۔؟

سعیدہ :۔ کچھ ہی دیر میں آجائیں گے۔

ملازمہ :۔ آپ کے یہ کون ہوتے ہیں۔؟

سعیدہ :۔ میرا چچازاد بھائی ہے۔ ایم، اے ہے۔ اُسے ملازمت اِس اِسٹیٹ میں ملی ہے۔ طبیعت کا بڑا اچھا ہے۔

ملازمہ :۔ کیا اپنی چھوٹی بی بی کے لئے بات چیت نہیں کی جا سکتی؟

سعیدہ :۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ (موٹر کے ہارن کی آواز آتی ہے) میں سمجھتی ہوں وہ آگئے۔ (شفیق اور فیروز داخل ہوتے ہیں۔)

شفیق :۔ لو بھئی سعیدہ، تمہارے بھائی صاحب آگئے۔

فیروز :۔ (سلام کرتا ہے اور سعیدہ سر کے اشارے سے جواب دیتی ہے) باجی! کوئی چھ سال بعد

آیا ہوں۔

سعیدہ ۔ ہاں میں سمجھتی ہوں، کچھ اس سے بھی زیادہ عرصہ ہو گیا۔ اُس بار تو تم صرف ایک دن ٹھہرے تھے ۔

فیروز ۔ مگر باجی، اب تو مہینوں قیام رہے گا۔

(اندرونی حصّے سے فوزیہ داخل ہوتی ہے، وہ سلام کرتی ہے۔ فیروز سلام کا جواب دیتا ہے۔ فیروز اُسے یوں دیکھتا ہے جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔) باجی! آپ کی تعریف ۔

سعیدہ ۔ ارے یہ فوزیہ ہے۔ تم نے پہچانا نہیں۔ ؟

فیروز ۔ جی نہیں۔ پچھلی دفعہ جب میں یہاں آیا تھا تو یہ اپنے ماموں کے یہاں گئی ہوئی تھیں، اس لحاظ سے میں انہیں کوئی.... جی ہاں۔ بارہ سال بعد دیکھ رہا ہوں۔

شفیق ۔ تم لوگ باتیں کرو۔ میں کچھ دیر آرام کر لوں ۔

فیروز ۔ ٹھیک ہے بھائی جان (شفیق اور فوزیہ چلے جاتے ہیں۔ سعیدہ اور فیروز بیٹھ جاتے ہیں۔)

سعیدہ ۔ (ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے) تمہارے لئے یہ کمرہ منتخب کیا ہے ___ اس کا ایک دروازہ باہر کی جانب کھلتا ہے۔ تمہارے دوست احباب اُسی سے آ جا سکتے ہیں۔

فیروز ۔ باجی، میں تنہائی پسند ہوں۔

سعیدہ ۔ پھر بھی انسان کا ایک آدھ دوست تو ہوتا ہی ہے،

فیروز ۔ وہ تو ہے۔ اچھا باجی۔ یہ فوزیہ کیا کرتی ہے ؟

سعیدہ ۔ وہ ایم اے کر رہی ہے۔

فیروز ۔ خوب ___ !

سعیدہ ۔ (غمگین ہوتے ہوئے) فیروز! میں فوزیہ کے لئے بہت پریشان ہوں ۔

فیروز ۔ کیوں باجی، اُسے کیا ہوا ؟

سعیدہ ۔ بات یوں ہے اُس میں عام لڑکیوں کی سی بات نہیں۔

فیروز ۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا، باجی ؟

سعیدہ ۔ ماشاءاللہ، تم بازو کے برابر ہو گئے ہو، اب تم سے کیا چھپایا جائے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ لڑکیاں فطرتاً لڑکوں کی طرف مائل ہوتی ہیں، لیکن فوزیہ میں ایسی کوئی بات میں نہیں دیکھتی۔

فیروز ۔ (ہنستا ہے) آپ بھی عجیب باتیں کرتی ہیں۔ وہ ایم، اے کر رہی ہے۔ اُسے فرصت کہاں ہوتی ہوگی جو اِس قسم کی لغو باتوں میں دل چسپی لے ۔

سعیدہ ۔ ایم اے کرنا ایک اور چیز ہے۔ فطرت کا تقاضا دوسری چیز ۔

فیروز ۔ ہو سکتا ہے ابھی اُس کا شادی کا خیال نہ ہو۔

سعیدہ ۔ میں شادی کی بات نہیں کرتی۔ اُسے مَردوں کے تذکرے سے نفرت ہے۔ وہ کہتی ہے مَردوں کی بات گھر میں نہ ہو۔

فیروز ۔ تو یوں کہیئے وہ "مرد بیزار" ہو گئی ہے۔

سعیدہ ۔ خدا جانے کیا ہے ؟

فیروز ۔ باجی، ایم اے میں میرا مضمون "نفسیات" تھا۔ عموماً ایسا ہوتا ہے۔ بعض بعض مرد بھی عورتوں کے تذکرے سے گھبراتے ہیں۔ لیکن اُن کا طرزِ عمل کسی معقول وجہ سے ہوتا ہے ___، جو اُن کو ایسا کرنے پر شعوری یا غیر شعوری طور پر مجبور کرتی ہے۔

سعیدہ ۔ پھر بھی یہ قانونِ فطرت کے خلاف نہیں ۔

فیروز ۔ ہو سکتا ہے، فوزیہ کے کیس میں صرف انانیت کارفرما ہو۔

سعیدہ ۔ مگر اس کا اظہار مَردوں کی ذات ہی تک محدود کیوں ؟ اس کا شکار ہم بھی تو ہو سکتے تھے ۔

فیروز ۔ آپ لوگوں کے ساتھ اُس کا کیسا سلوک ہے ؟

سعیدہ ۔ بالکل نارمل۔ وہ فرماں بردار ہے، ہمدرد ہے اور محنتی بھی۔

فیروز ۔ شاید وہ مَردوں کے تعلق سے احساسِ برتری کا شکار ہو، ہو سکتا ہے اب تک اُس کا

ایسے مَردوں سے سابقہ پڑا ہو جو اُس سے تعلیم میں کم ہوں
یا اُن کے خیالات اُس کے اپنے خیالات سے ہم آہنگ
نہ ہوتے ہوں۔

سعیدہ :۔ پتہ نہیں کیا بات ہے۔ اِس اثناء میں کتنے ہی
اچھے اچھے پیامات آتے رہے اور اُس نے ہمیشہ انکار
کر دیا ۔ !

فیروز :۔ ہو سکتا ہے وہ اپنے آپ کو بہت خوبصورت
سمجھتی ہو۔

سعیدہ :۔ اگر وہ سمجھتی ہے تو اُسے اِس کا حق بھی
پہنچتا ہے۔ کیا وہ خوبصورت نہیں ہے ۔ ؟

فیروز :۔ وہ تو ہے باجی، بات یہ ہے کہ یہ احساس بعض
اوقات بڑی پیچیدگیاں پیدا کر دیتا ہے۔

سعیدہ :۔ بھئی مجھے اِن ساری چیزوں کا علم نہیں۔

فیروز :۔ باجی میں ایک بار بات چیت کر لوں تو آپ کو بتا
سکتا ہوں کہ بات کیا ہے۔

سعیدہ :۔ اب جبکہ تمہیں یہیں رہنا ہے تو بات چیت ہونی
ہی ہے۔

فیروز :۔ وہ تو ہے۔

سعیدہ :۔ اچھا، اب آرام کرو۔

فیروز :۔ جی اچھا۔

سعیدہ :۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو ملازمہ سے کہہ دینا۔
یا مجھے بتا دینا۔

فیروز :۔ ٹھیک ہے باجی۔

دوسرا منظر

دوسرا دن :۔ شام کے پانچ بجے ہیں۔ فیروز باغ میں
بیٹھا ہے۔ وہ ملازمہ کو آواز دیتا ہے

فیروز :۔ دیکھو۔

ملازمہ :۔ جی۔

فیروز :۔ ذرا فوزیہ بی بی کو یہاں بھیجدو۔

ملازمہ :۔ جی اچھا، (کچھ دیر بعد فوزیہ آتی ہے۔ اس نے
بالوں کو خاص انداز سے بنا رکھا ہے اور یوں لگتا ہے
جیسے وہ باہر جانے والی ہو۔)

فوزیہ :۔ (قریب آکر) فرمایئے۔

فیروز :۔ میں ابھی ابھی آفس سے لوٹا تو سوچا تم سے
کچھ باتیں کروں۔

فوزیہ :۔ میں جانتی ہوں آپ کیا باتیں کرنا چاہتے ہیں۔

فیروز :۔ یہ میرے لئے نیا انکشاف ہے۔ اچھا بتاؤ تو میں
تم سے کیا کہنے والا ہوں۔

فوزیہ :۔ وہی جو عام طور پر مرد کسی لڑکی سے کہتے ہیں۔

فیروز :۔ مجھے نہیں معلوم کہ مرد کیا کہتے ہیں ؟

فوزیہ :۔ یہی کہ تم بہت اچھی ہو۔ بہت خوبصورت ہو۔
اور نہ جانے کیا کیا ۔!

فیروز :۔ بالکل غلط، میرے ذہن کے کسی گوشے میں بھی
اِس قسم کا کوئی خیال نہیں تھا۔ بلکہ میں تو خوفزدہ تھا کہ
کہیں تم بھی دیگر عورتوں کی طرح وہی جملے نہ دوہراؤ،
جن کو سن سن کر میرے کان پک گئے ہیں۔

فوزیہ :۔ (اُسی کے لہجے کی نقل کرتے ہوئے) اب میں کیا
جانوں کہ عورتیں کیا کہتی ہیں۔

فیروز :۔ یہی کہ میں خوبصورت ہوں۔ ویل بلٹ
(WELL BUILT) ہوں۔ مسکیولر (MU
SCULAR) ہوں۔ مردانگی کا شاہکار ہوں

فوزیہ :۔ (ہنستی ہے) مردانگی کا شاہکار تو میں نہیں کہتی
غلط فہمی کا شکار ضرور ہیں۔

فیروز :۔ جن باتوں کا تذکرہ میں نے کیا۔ کیا وہ مجھ میں نہیں
ہیں ۔ ؟

فوزیہ :۔ بالکل نہیں۔ بلکہ آپ میں اور ایک سطحی انسان
میں مجھے ذرہ برابر بھی فرق محسوس نہیں ہوتا۔

فیروز :۔ وہ کیسے ؟

فوزیہ :۔ ہر مرد یہی سمجھتا ہے کہ وہ کوئی بڑا آدمی ہے۔

کوئی شکسپیر (SHAKSPEAR) ہے۔ تو
کوئی مارلن براندو، تو کوئی چرچل تو کوئی دلیپ کمار،
اور ان بیچارے جانوروں کو اکثر اسی قسم کے دورے
پڑتے رہتے ہیں۔

فیروز :۔ تو عورتیں کب اس جذبے سے خالی نظر آتی ہیں۔
کوئی لیڈی چرچل ہے، تو کوئی کرسچین کلر، کوئی مارگریٹ
ہے تو کوئی مینا کماری۔

فوزیہ :۔ آپ میری ہی باتوں کو لوٹا رہے ہیں۔

فیروز :۔ تم یہ مانتی ہونا ؟

فوزیہ :۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک سوال پوچھوں ؟

فیروز :۔ ضرور پوچھیے۔

فوزیہ :۔ ابھی ابھی آپ نے جو باتیں عورتوں کی ذات
سے منسوب کیں، کیا ان کا اطلاق آپ کی بہن پر بھی ہوتا ہے۔

فیروز :۔ میری بہن اس سے مستثنیٰ ہے۔

فوزیہ :۔ وہ کس لئے ؟

فیروز :۔ وہ اس لئے کہ میری مراد آج کل کی ماڈرن عورتوں
سے ہے۔

فوزیہ :۔ پھر بھی آپ صحت مند خیالات کے حامل نہیں۔

فیروز :۔ بس یہ سمجھو کہ میں تمہارا جواب ہوں۔

فوزیہ :۔ تو گویا میری حیثیت ایک سوال کی سی ہے۔

فیروز :۔ (طنز سے) بالکل ایک ایسا سوال جو دیکھنے
میں بڑا مشکل لگے اور حل کرنے میں بڑا آسان ہو۔

فوزیہ :۔ یہ بھی ایک ہی بات ہے، کم سے کم میری تو سمجھ
میں نہیں آتی۔

فیروز :۔ تمہاری سمجھ ہی کتنی ۔؟

فوزیہ :۔ یہ مت کہئے۔ میں کسی لحاظ سے آپ سے کم نہیں ہوں!

فیروز :۔ تم چاہتی ہو کہ میں تمہارے مقابلے پر اتر آؤں۔

فوزیہ :۔ میرا یہ مطلب نہیں اور اگر آپ اتر آئیں تو شاید
منہ کی کھائیں۔

فیروز :۔ پہلے تو میں عورتوں سے مقابلے میں آنا کسرِ شان
سمجھتا ہوں۔

فوزیہ :۔ وہ کس لئے ؟

فیروز :۔ وہ اس لئے کہ ان کے بارے میں یہ کہا جاتا
ہے کہ یہ ناقص العقل ہوتی ہیں۔

فوزیہ :۔ صرف کہا جاتا ہے، یہی نا ؟

فیروز :۔ کہا بھی جاتا ہے اور یہ حقیقت پر بھی مبنی ہے۔

فوزیہ :۔ یہ بات کسی کوتاہ نظر مرد نے کہی ہوگی اور آپ
جیسے لوگ اسے صحیح سمجھ بیٹھے۔

فیروز :۔ (مسکراتا ہے) کھمبا نوچنے کا محاورہ کبھی سنا ہے ؟

فوزیہ :۔ جی ہاں! بیشتر سنا ہے۔ مگر اس موقع پر اس کا
اطلاق نہیں ہوتا۔

فیروز :۔ "اُلحق مرد" کے بارے میں کیا خیال ہے۔

فوزیہ :۔ (جھنجھلاتی ہے) بڑا نیک خیال ہے۔

فیروز :۔ (ہنستا ہے) خوب ۔ !

فوزیہ :۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ یہ ہنسنے کا
کون سا محل ہے۔

فیروز :۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ تمہارا آپشنل
(OPTIONAL) کیا ہے۔

فوزیہ :۔ فلسفہ۔

فیروز :۔ بڑا دلچسپ مضمون ہے۔

فوزیہ :۔ آپ کیا جانیں

فیروز :۔ (ستانے والے انداز میں) کیوں اس میں کیا
مشکل ہے۔ میں تمہیں پڑھا سکتا ہوں۔

فوزیہ :۔ (ہنستی ہے) میں ایم اے کی طالبہ ہوں۔

فیروز :۔ (اسی انداز سے) میں ایم اے سے کم کے طلبہ
کو پڑھانا تضیع اوقات سمجھتا ہوں۔

فوزیہ :۔ اچھا ۔ !

فیروز :۔ جی ہاں ۔ !

فوزیہ :۔ آپ کا سبجیکٹ (SUBJECT) کیا تھا۔

فیروز :۔ نفسیات۔

فوزیہ ۔۔ (اُسی کے لہجے میں) بڑا دلچسپ مضمون ہے۔
فیروز ۔۔ (فوزیہ کے لہجے کی نقل کرتا ہے) آپ کیا جانیں؟
فوزیہ ۔۔ کیوں اِس میں کیا مشکل ہے۔ میں آپ کو پڑھا سکتی ہوں۔
فیروز ۔۔ (ہنستے ہوئے) میں ایم لے کامیاب ہوں۔
فوزیہ ۔۔ تو کیا ہوا۔ پی ایچ ڈی کیلئے مدد کی ضرورت پڑے گی۔
فیروز ۔۔ جب تمہیں ہمہ دانی کا اتنا ہی دعویٰ ہے، تو میں تم سے نفسیات کا ایک سوال پوچھتا ہوں۔
فوزیہ ۔۔ ضرور پوچھیئے۔
فیروز ۔۔ بعض عورتیں مردوں سے کیوں خار کھاتی ہیں؟ وہ چاہتی ہیں کہ مردوں کا تذکرہ اُن سے نہ کیا جائے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔؟
فوزیہ ۔۔ میری سمجھ میں ایسی عورتیں بڑی عقلمند ہوتی ہیں۔ کیونکہ اِس مخلوق کے تذکرے میں رکھا ہی کیا ہے۔؟
فیروز ۔۔ میں نفسیات کی روشنی میں یہ جاننا چاہتا ہوں ورنہ عورتوں کا عام رَویّہ یہی رہا ہے کہ وہ مردوں میں دِل چسپی لیتی ہیں یا چاہتی ہیں کہ مرد اُن میں دِل چسپی لیں۔
فوزیہ ۔۔ یہ بات بیکار عورتوں تک محدود ہے۔
فیروز ۔۔ عورت بے کار ہو یا با کار۔ فطرت سے گریز اُس کے اپنے بس کی بات نہیں۔
فوزیہ ۔۔ کیا اِس سے ہٹ کر آپ کے پاس کوئی اَور موضوع نہیں ہے۔
فیروز ۔۔ اَب میں تمہیں بتاؤں گا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔
فوزیہ ۔۔ جی شکریہ!! اِس تذکرے سے مجھے نفرت ہے اَور دوسری سنجیدہ باتیں بھی تو ہیں۔
فیروز ۔۔ اچھا! تم ہی کہو، کیا باتیں کی جائیں؟
فوزیہ ۔۔ میں باہر جارہی ہوں۔ اب میں اجازت چاہوں گی۔
فیروز ۔۔ ضرور، ضرور (فوزیہ چلی جاتی ہے۔ کچھ دیر بعد سعیدہ آتی ہے)
فیروز ۔۔ باجی! ابھی ابھی فوزیہ سے بات چیت ہوئی تھی۔
سعیدہ ۔۔ اچھا! کچھ پتہ چلا۔ بات کیا ہے؟
فیروز ۔۔ کیس (CASE) بڑا سیریس (SERIOUS) ہے۔
سعیدہ ۔۔ وہ کیسے۔؟
فیروز ۔۔ باجی! کچھ ہی دن میں آپ بہت پریشانی کا شکار ہوں گی۔ کئی پیچیدہ نفسیاتی عناصر فوزیہ میں ملتے ہیں اور جب یہ شدّت اختیار کر جائیں گے تو شعور و تحت الشعور سے تمام باتیں محو ہو جائیں گی۔
سعیدہ ۔۔ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔
فیروز ۔۔ سیدھا سا مطلب ہے۔ پاگل پن۔
سعیدہ ۔۔ میرے اللہ! کیا کیا جائے۔
فیروز ۔۔ شادی۔ باجی شادی۔
سعیدہ ۔۔ شادی کے لئے وہ تیار نہیں ہے۔
فیروز ۔۔ زبردستی کر دیجئے۔
سعیدہ ۔۔ زبردستی کی شادی کے لئے کون تیار ہوگا؟
فیروز ۔۔ آپ اگر مناسب سمجھتی ہوں تو میں اپنا نام پیش کرنے کے لئے تیار ہوں۔ میری اِسٹڈی (STUDY) کے لئے بڑا دلچسپ کیس ہاتھ آئے گا۔ کیوں باجی۔؟
سعیدہ ۔۔ وہ تو ہے اور مجھے اِس شادی سے بیحد مسرت بھی ہوگی۔ مگر اُسے کس طرح ہموار کروں؟

تیسری کڑی

تیسرا دن ۔۔ سعیدہ اور فوزیہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی بات کر رہی ہیں۔
سعیدہ ۔۔ وہ تو بڑا بے وقوف نکلا۔
فوزیہ ۔۔ ہاں باجی! میں ڈر رہی تھی کہ نہ جانے کتنے

دن تک مجھے "مرد بیزار عورت" کا پارٹ ادا کرنا پڑیگا۔

سعیدہ :۔ تم خوش قسمت ہو فوزیہ، وہ پڑھا لکھا ہے۔ ملازم ہے۔ تنخواہ خاصی اچھی ہے۔

فوزیہ :۔ اِن چیزوں کے علاوہ ایک اور چیز بھی تو قابلِ تعریف ہے جس کا تذکرہ آپ نے نہیں کیا۔

سعیدہ :۔ وہ کیا ہے ؟

فوزیہ :۔ وہ یہ کہ حضرت بے وقوف بھی ہیں۔

سعیدہ :۔ ہاں! عورت کے نقطۂ نظر سے تو یہ بہت اچھا ہے۔ ہر بات کی وہ نفسیاتی تاویل دیتا بیٹھا رہے گا اور تم اپنی من مانی کر سکوگی۔

فوزیہ :۔ وہ تو ہے باجی، مگر مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ کسی سادہ لوح اِنسان کو اِس طرح "اُلّو" بنایا جائے۔

سعیدہ :۔ مجبوری ہے نا فوزیہ۔ اگر ہم پراپر چینل (PROPER CHANNEL) سے آتے تو یہ قریب قریب ناممکن تھا۔

فوزیہ :۔ وہ کیوں ؟

سعیدہ :۔ کئی باتیں اُٹھ کھڑی ہوتیں اور پھر ہمارا اپنا اِرادہ اور اشتیاق پسِ پردہ نہ رہ سکتا۔ ہمارے نقطۂ نظر سے یہ کچھ ٹھیک نہ ہوتا۔ ہمارا پلان بڑا کارگر رہا۔ تم نے پڑھا ہوگا (CURIOSITY KILLS A CAT) بس اِسی کے مصداق کام ہو گیا۔

فوزیہ :۔ مگر پھر بھی۔

سعیدہ :۔ تو پاگل ہے۔ ارے اچھے لڑکوں کا کال ہے کال۔ (وہ جاتی ہے)

(پردہ گرتا ہے)

چوتھی کڑی

(ایک ماہ بعد۔ شادی کے دوسرے دن)

فیروز اور فوزیہ ڈرائینگ روم میں خاموش بیٹھے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے فیروز کسی گہری سوچ میں غرق ہے،

فوزیہ کچھ دیر فیروز کی طرف دیکھتی ہے۔

فوزیہ :۔ یہ آپ گم صُم سے کیوں ہیں ؟۔ کیا میں وجہ جان سکتی ہوں۔ ؟

فیروز :۔ کچھ نہیں۔ تمہارے متعلق سوچ رہا تھا۔

فوزیہ :۔ میرے متعلق ؟

فیروز :۔ ہاں فوزیہ۔ جہاں تمہارے حُصول سے زندگی میں ایک اہم کمی کا اِحساس جاتا رہا، وہیں ذہن پر ایک قسم کا بار بھی محسوس کر رہا ہوں۔ خیر چھوڑو اِن باتوں کو۔

فوزیہ :۔ (فیروز کے اِس جملے سے کچھ چونکتی ہے اور اپنی دانست میں سمجھتی ہے کہ اِس کی بہن کی بنائی ہوئی اِسکیم کا شاید فیروز کو علم ہو گیا ہے) ہو سکتا ہے میری طرف سے آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔

فیروز :۔ نہیں نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے نہ جانے کیوں رہ رہ کر یہی خیال آرہا ہے کہ .....

فوزیہ :۔ ہاں ہاں کہئے۔

فیروز :۔ کہ تم ٹھہریں ایک مرد ....

فوزیہ :۔ "مرد بیزار عورت نا ؟"

فیروز :۔ اور میں نے تمہارے حُصول میں .....

(فی الوقت فیروز کا ضمیر فوزیہ کو حاصل کرنے کے لئے چلی ہوئی چال کے لئے ملامت کر رہا ہے اور اِس کا اقرار فوزیہ کے سامنے کرتے ہوئے وہ جھجک رہا ہے۔ دوسری طرف فوزیہ اُس کی مُبہم سی باتوں سے یہ سمجھ رہی ہے کہ اُس کی بہن کی اِسکیم کا پتہ فیروز کو لگ گیا ہے۔ دونوں یہ نہیں چاہتے کہ اِس کا انکشاف ایکدوسرے پر کریں۔) اچھا فوزیہ، یہ بتاؤ کہ میرے بارے میں تمہارے کیا خیالات ہیں ؟

فوزیہ :۔ یہ بڑا عجیب سا سوال ہے۔ فرض کیجئے۔ میں یہی سوال آپ سے پوچھوں تو آپ کیا جواب دینگے۔

فیروز :۔ یہ کوئی مشکل بات تو نہیں۔ اگر کوئی مجھ سے

(باقی صفحہ ۶۱ پر دیکھیئے)

مجاہد سعیدی

سعیِ مشترک

بھوک اُگے گی پیاس بڑھانے
پیاس بڑھے گی آنکھ ملانے
آنکھ ملا کر، کون یہ جانے
کس دُنیا میں لے جائے گی
اِنسانوں پر کیا گذرے گی؟

چُپ چُپ بیٹھا سوچ رہا ہوں
پھٹی ہوئی اِفلاس کی چادر
گِری ہوئی دیوار کا سایہ
غُربت ہی کا حِصّہ کیوں ہے؟

پیار کی جھیلیں سُوکھ رہی ہیں
بڑھتے بڑھتے آگ دِلوں کی
نفرت کے شعلوں تک آئی
شعلوں کو بھڑکاتے کیوں ہو؟
آؤ مِل کر، آگ بجھائیں!!

جالب دہلوی

کوئی شوخی، کوئی خوشبو، کوئی رنگت مانگے
جس کو دیکھو وہی، کلیوں کی نزاکت مانگے
غمِ محبت کی امانت ہے نہ دیں گے ہرگز
موت بھی آکے اگر ہم سے یہ دولت مانگے
چند زخموں کے اُجالے تھے جنھیں نذر کیا
اور کیا شئے ہے مرے پاس جو ظلمت مانگے
ایک تو وقت نے ڈھادی ہے عمارت دِل کی
اور اُس پہ یہ ستم، ہم سے ہی اُجرت مانگے
عکس آئینے سے دیتا ہے صدائیں جالب
تیری ظلمت نہ کہیں، اپنی یہ صورت مانگے

غزلیں

علی عباس اُمید

رات تحریروں کی اب یکسر خیاباں ہوگئی
لفظ جب جاگے، عبارت بھی نرالی ہوگئی
اَن گِنت چہرے تھے شہرِ دِل میں لیکن کیا کہوں
وقت کا سایہ پڑا، بستی یہ خالی ہوگئی
جن کا اِک اِک لفظ تھا مژدہ نئے موسم کے نام
حیف اُن صفحات کی صورت بھی کالی ہوگئی
دِل کے محبس سے چلے، تھے قافلے یادوں کے پر
اِک کرن پلکوں کی سُولی پہ سوالی ہوگئی
ہمسفر شائستگی تھی رہ گذارِ زیست میں
پھر بھی جس سے بات کی ہر بات گالی ہوگئی
حادثوں کی دُھند سے فنکار نے جس کو گڑھا
شکر ہے اُس بت کی پیشانی اُجالی ہوگیا
کیسے اِس موسم کو دَورِ گُل کہوں میں، اے اُمید
رنگ سے محروم جب اِک ایک ڈالی ہوگئی

اخبار و افکار

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے !!

پروفیسر نریش (کنوینر انجمن اردو پنجاب)
۶ر مئی ۱۹۷۰ء

پنجاب یونیورسٹی۔ ایوننگ کالج
چنڈی گڑھ ۱۴

محترم اعجاز صاحب۔ آداب۔!

اُردو پر بھارتیہ کرن کے نام سے کئی الزامات لگائے جا رہے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا، ۱۹۶۹ء میں میں بمبئی آیا تھا اور انصاری صاحب نے ایک جلسہ کا انعقاد کیا تھا جس میں مولانا مہر محمد خاں شہاب اور آپ نے بھی شرکت فرمائی تھی۔ میں نے تب بھی یہی کہا تھا کہ سوال اُردو کا نہیں سوال مسلمانوں کا ہے۔ جن سنگھ جیسی جماعتیں مسلمانوں کو برداشت نہیں کر سکتی ہیں، اُردو کی آڑ لے کر ان پر حملہ کرتی ہیں۔ آج یہ بحث عام ہو گئی ہے۔ اپنے تاثرات قلمبند کر کے اِرسالِ خدمت کر رہا ہوں۔ آپ کی صحت اب کیسی ہے؟۔ خدا کرے آپ بخیر ہوں۔

نیاز مند:- نریش۔

بھارتیہ کرن کا ڈرامہ اور اُردو

از
پروفیسر نریش۔ چنڈی گڑھ

مسلمانوں کے بھارتیہ کرن سے چل کر بات اُردو کے بھارتیہ کرن تک آ پہنچی ہے۔ ۱۹۶۹ء میں بمبئی میں منعقدہ ایک ادبی جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ مسئلہ ہندی یا اُردو کا نہیں ہے، مسئلہ ہندوستانی یا غیر ہندوستانی کا بھی نہیں ہے۔ مسئلہ ہے ہندو اور مسلمان کا۔ اور اُردو کو چونکہ سیاسی طور پر مسلمانوں کی زبان کہا جاتا ہے اس لئے اُردو کا مطلب ہے مسلمان۔ اور مسلمان چاہے ہندوستان سے کتنا ہی عشق کیوں نہ کرتا ہو کہنے والے اسے غیر ہندوستانی ہی کہتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ نماز پڑھتا ہے تو قبلہ رُو ہو کر۔ حج کے لئے جاتا ہے تو ہندوستان سے باہر۔ دیکھتا ہے تو عرب کی طرف۔ سوتے جاگتے اُسے ہندوستان کا نہیں عرب کا خیال رہتا ہے۔ الزام لگانا بڑا آسان ہے۔ الزام کو ثابت کرنا بڑا مشکل ہے۔ اگر ہمارے مسلمانوں کا ایمان واقعی اس قدر پختہ ہوتا جس قدر بھارتیہ کرن کے دعویدار خیال کرتے ہیں تو یقیناً آج ہندوستان کا مسلمان اس الزام کا وہ جواب دیتا کہ کہنے والے کو سر بچانا مشکل ہو جاتا۔ وہ خاموش ہے۔ چپ چاپ اس زہر کو پی رہا ہے۔ پچار رہا ہے۔ صرف اسلئے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ؎

نہ وہ عشق میں رہی گرمیاں نہ وہ حُسن میں رہی شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

اُردو والوں سے مجھے بھی کچھ شکایتیں ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ اُردو شاعری فارسی کی تقلیدِ محض ہو کر رہے۔ ایسا کرنا اُردو کا گلا گھونٹنا ہوگا۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ہم وقت کے تقاضوں کو سمجھیں اور اپنے شعر و ادب کو عوام سے وابستہ کریں۔ تاکہ مستقبل

اور مدینہ منورہ کی بات بھی کریں۔ مگر رآم کے آدرشوں اور کرشن کے اُپدیشوں کو بھی یاد رکھیں۔ شہیدانِ کربلا کی عظمت کو دل و جان سے تسلیم کریں۔ مگر بھیشم اور دھیچی کو بھی مت بھولیں۔ دجلہ اور فرات کی بات ضرور کریں۔ اُن کے حُسن سے اپنے نغموں کو زیبائی بھی دیں مگر گنگا اور جمنا کو بھلا کر نہیں۔ طُور کا ذکر کریں مگر ہمالہ کو نظر انداز کر کے نہیں۔ قرآن پر بھی ایمان لائیں مگر گیتا کی تقدیس کو بھی بطور فرض اپنائیں۔

لیکن سوال تو یہ ہے کہ کیا یہ سب کچھ اُردو میں سرے سے ہی ناپید ہے؟ بھارتیہ کرن کا نعرہ لگانے والوں نے اُردو کے کس شاعر کو پڑھا ہے؟ اُنہیں کیا معلوم کہ کتنے شعراء نے رآم، کرشن، بدھ اور نانک کے نغمے گائے ہیں۔ انہیں کیا خبر کہ کتنے شعراء نے دیوالی، بسنت، ہولی اور دسہرہ پر سیکڑوں نظمیں کہی ہیں۔ اُنہیں علم کیا کہ اُردو شعراء نے گنگا اور جمنا کی لہروں کی سنگیت سے اپنے نغموں کو سحر انگیز بنایا ہے۔ وہ علامہ اقبال پر الزام تراشی کرتے وقت "بانگِ درا" کی نظموں کو بھلا دیتے ہیں۔ یا یہ کہئے کہ اُنہیں معلوم بھی نہیں کہ اقبال کے کسی مجموعۂ کلام کا نام بانگِ درا بھی ہے جس کے مقابلے کی کوئی ہندی کتاب ایسی نہیں ہے جو ہندوستانیت کے جذبات سے لبریز ہو۔ اب حالت ایسی ہوتی جا رہی ہے کہ ہم فارسی استعارات و تشبیہات کو کم اور ہندوستانی استعارات و تشبیہات کو زیادہ استعمال کریں۔ لیکن کسی کے کہنے سے ہوگا کیا؟ زبان خود بخود بدلتی ہے۔ تغیّر زبان کی فطرت ہے، شعر و ادب کے رجحانات بدلتے رہتے ہیں۔ اگر قارئین کو یہی روش پسند ہوگی تو اُردو والے خود بخود یہی روش اختیار کر لیں گے۔ مگر کوئی ڈنڈے کے زور سے چاہے تو یقیناً اُسے مُنہ کی کھانی پڑے گی۔

میں یہاں صاف لفظوں میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ یہ جو بھارتیہ کرن کا چکر چل رہا ہے یہ اُردو کے تنِ خستہ پر ایک بھرپور وار ہے۔ آزادیٔ وطن کے بعد مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے جس بے رحمی سے اُردو کو مٹانا چاہا ہے اس کے پیشِ نظر یہ سمجھ لینا مشکل نہیں کہ بھارتیہ کرن کا ڈرامہ اُردو کو بدنام کرنے کے لئے، اُسے مجروح کرنے کے لئے رچایا گیا ہے۔ لیکن وار کرنے والے یہ مت بھولیں کہ زبانیں نہ کبھی خنجر کے زور سے مٹی ہیں اور نہ مٹ سکتی ہیں۔

ہاں البتہ اُردو دوستوں کے لئے فکر کا مقام ضرور درپیش ہے۔ بہت سے ادیب یہ سمجھتے ہیں کہ اُردو کو زندہ رکھنے کیلئے اُردو کا بھی سیاست دانوں کے ہاتھ سے لے کر ادیبوں کے ہاتھ میں دینا چاہئے۔ میں اُن سے اختلاف کرتا ہوں۔ اُردو کو زندہ رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اسے قطعی طور پر سیاسی مسئلہ بنا دیا جائے۔ اُردو والے متحد ہوں۔ متحد ہو کر فیصلہ کریں کہ ووٹ اُسے دیں گے جو اُردو کا حمایتی ہے۔ اُردو کے ادیبوں کو میدانِ عمل میں نکلنا ہوگا۔ (مسلمانوں کو کم اور ہندوؤں کو زیادہ) حکومت جہاں بھی اُردو کے حق میں اُبھرتی ہوئی آواز سنے گی، سیاسی مصلحتوں کے پیشِ نظر اُس کا حق تسلیم کرے گی ورنہ اُسے خود وزارت سے ہاتھ دھونا پڑیگا۔ پنجاب کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ پنجابی کے شعراء و اُدباء نے بڑا زور مارا مگر پنجابی کو سرکاری زبان نہ بنوا سکے۔ اکالی دَل نے پنجابی کا کیس اپنے ہاتھ میں لیا تو نہ صرف پنجابی کو سرکاری زبان ہی بنوایا بلکہ پنجابی صوبہ قائم کر کے وہاں اپنی حکومت بھی قائم کی ہے۔ جن لوگوں کو سیکولرازم سے محبت ہے، جو لوگ اُردو کو ہندوستانی زبان مانتے ہیں وہ لوگ اُردو سے پیار کرتے ہیں۔ جن کو یہ دعویٰ ہے کہ اُردو اُن کی مادری زبان ہے، جو اُردو کی تعلیم کو اپنا پیدائشی حق قرار دیتے ہیں، اُنہیں سیاسی طور پر متحد ہونا ہی پڑے گا۔ سیاسی طور پر جہاد کرنا ہوگا۔ تبھی اُردو کو اُس کا حق ملے گا ورنہ نقار خانے میں طوطی کی آواز نہ کبھی سُنی گئی ہے اور نہ سُنی جائے گی۔

خواہ پیالہ ہو، خواہ نوالہ ہو
بن سکے تو جھپٹ لے بھیک نہ مانگ

جاوید اقبال ناطق — ۴ بی آئی ٹی بلاکس۔ ممبئی ۳

محترمی۔ آداب!

لیجئے دہلی کے ہفت روزہ ہندی رسالے 'ہندوستان' دہلی میں چھپے ایک خط کا ترجمہ حاضر ہے۔ اس کی علمی و ادبی حیثیت کیا ہے؟ اللہ جانے، مگر اُردو شاعری اور اُردو ادب پر یہ ایک کاری ضرب یقیناً ہے۔ چاروں طرف سے یارانِ طریقت اُردو کو گھیرے ہوئے ہیں۔ نہ معلوم کب یہ طوفان رُکے گا۔؟

دُکھ تو یہ ہے کہ اُردو کے خلاف باقاعدگی سے محاذ قائم ہے۔ مورچے بندھے ہوئے ہیں، مگر حامیان و پاسبان و سربراہانِ اُردو آج تک متحد و متفق ہی نہیں ہو پائے۔ اِنتشار اور اِفتراق کا ایک عجب عالم ہے۔ اور اُردو پریس تو اِن مخالفینِ اُردو کے خلاف یوں خموش ہے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

آپ نے ایک مضمون "دھرم یگ" کو بھیجا تھا۔ ایک خط میں نے بھی لکھا تھا، مگر جب آپ کا مضمون ہی شائع نہ کیا گیا تو میرا سوال ہی کیا ہے؟۔ مگر مجھے دُکھ اور حیرت ہے تو یہ کہ اُردو کے حامی اور خالص اُردو کے اخبارات "انقلاب" "اُردو ٹائمز" اور "مورچہ - گیا" نے بھی اِس سلسلے میں میرے خط اور تراجم شائع کرنے کی زحمت نہ کی۔ شاید یہ عدمِ اِشاعت بھی "صلحِ حدیبیہ" جیسی کوئی مصلحت اپنے پہلو میں لئے ہوئے ہو۔!

دعاؤں کا طالب:۔
اِقبال ناطق

ردِّ عمل

"چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر"

پروفیسر نریش[۱] ۔ ایوننگ کالج ۔ چندی گڑھ ۱۱

ترجمہ: جاوید اقبال ناطق

پچھلے دِنوں لکھنؤ میں ایک سیمنار ہوا تھا۔ اُردو نظموں میں ہندوستانی اثرات کے موضوع پر، صدارتی خطبے میں تقریر کرتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ سوال ہندی اور اُردو کا نہیں، سوال ہے ہندو اور مسلمان کا اور اِس سے بھی زیادہ ہندوستانیت (بھارتیتا) کا۔ میں نے کہا تھا کہ اُردو کو زندہ رکھنے کے لئے اُسے نہ تو کسی صوبے کی سرکاری زبان بنانا ہی ضروری ہے اور نہ اِس کے لئے دستوری حقوق کی مانگ کرنا۔ ضروری یہ ہے کہ اُردو کا بھارتیہ کرن کیا جائے۔ تب نہ تو ہندی سے اِس کی کوئی مخالفت ہوگی نہ ہی بھارت کے لوگ اِسے بے عزت کریں گے نہ اِس کی راہ میں رُکاوٹ بنیں گے۔

اِدھر اِس مسئلے پر کافی سنجیدگی سے سوچا جانے لگا ہے۔ میرا اُردو سے تعلق بہت پرانا ہے۔ اُردو سے مجھے دلچسپی بھی عشق کی حد تک ہے۔ میں ہر طرح سے اُردو کا فائدہ بھی چاہتا ہوں۔ میں اِس بے حد میٹھی، پیاری اور لوچ بھری بھاشا کی ترقی کی خواہشات ہی نہیں رکھتا۔ بلکہ اِس کے لئے گزشتہ کئی سالوں سے مسلسل جدوجہد کر رہا ہوں۔ لیکن میرے ساتھی اُردو کے مصنفین کیا میرے کچھ سوالوں کا جواب دے سکیں گے۔؟

---

[۱] میں نے اپنا مضمون "نو بھارت ٹائمز" کو شائع کرنے کے لئے دیا تھا۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ کٹر سے کٹر آریہ سماجی ہندو اخبار بھی عید، بقر عید کے موقع پر مکّۂ معظّمہ کی تصاویر چھاپ کر حضرت محمدؐ صاحب کی زندگی اور پیغامات سے متعلق ایک آدھ مضمون ضرور چھاپ دیتا ہے۔ ہندی کے اکثر رسائل و جرائد بھی اسلامی طرزِ زندگی پر مضامین شائع کرتے رہتے ہیں۔ لیکن کیا کبھی دسہرہ، دیوالی، بسنت، ہولی یا کسی دوسرے تہوار پر 'الجمعیۃ' یا 'دعوت' نے بھی کرشن یا رام یا کسی دوسرے مہاپُرش کی تصویر چھاپی ہے۔؟۔ کیوں ؟۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ کیا ان اخبارات کو صرف مسلمان ہی پڑھتے ہیں۔؟۔ اور صرف مسلمان ہی پڑھتے ہیں تو کیا انہیں بھارتیہ ہونے کے ناتے بھارت کی امر شخصیات کے بارے میں علم و واقفیت نہیں ہونی چاہیئے۔؟۔

اردو شاعری کے ساتھ ایک بات یہ بھی ہے۔ کہ اُس نے شروع ہی سے ایران اور عرب کی تہذیب، روایت و تمدّن کو اپنا سہارا بنا لیا ہے (بنیاد) اُردو کے مسلمان ہی نہیں ہندو شاعر بھی جب بات کریں گے تو ایران یا عرب کے پس منظر ہی میں کریں گے۔ اُن کی سبھی مثالیں اور کردار و مقامات غیر ملکی ہوں گے۔ ندیوں میں انہیں دجلہ و فرات تو دکھائی دیتی ہیں۔ جن کا نمبر دنیا کی ندیوں میں شاید پچاسواں ہوگا۔ مگر گنگا دکھائی نہیں دیتی جو دنیا کی تیسری سب سے بڑی ندی ہے۔ دجلہ و فرات کا کنارا قدرتی دل کشی کا خوبصورت اور تفریحی مقام ہوگا۔ لیکن کیا جمنا کے کنارے کوئی خوبصورت مقام ہی نہیں؟ وہی جمنا جس کی خوبصورتی سے ہندی شاعری اَٹی پڑی ہے۔ اُردو کے لیئے غیر متعلق کیوں ؟۔ انہیں قرآنی قصّوں کے موسیٰ اور طُور تو دکھائی دیتے ہیں، کرشن کی لیلا دکھائی نہیں دیتی۔؟۔ چلیئے، مان لیا کہ طُور بڑا ہی اہم تاریخی پہاڑ ہے، لیکن کیا ہمالیہ کے ساتھ تاریخ وابستہ نہیں؟ کیا ہمالیہ خوبصورت نہیں، کیا رام، کرشن، ہریشچندر، ویویکانند۔ رام کرشن پرم ہنس اروِند کی زندگی میں کوئی تاریخی یا قابل ذکر واقعہ یا حادثہ نہیں ہوا۔؟ تو کیا وجہ ہے اُردو شاعری کا انحصار ہندوستانی طرزِ زندگی اور بھارتی روایات پر نہیں ہے۔

اُردو شعرا آنکھ کی تشبیہہ میں نرگس کا پھول پیش کرتے ہیں۔ نرگس کا پھول ان شاعروں میں سے شاید ہی کسی نے دیکھا ہو۔ یہ پھول گول کٹوری جیسا ہوتا ہے۔ ایرانیوں کے پیارے کردار کیونکہ گول آنکھوں والے چینی ہوتے تھے، اس لیئے وہ اُن کی آنکھوں کو نرگسی کہتے تھے۔ بھارت میں خود یہ شاعر بھی چینیوں کی گول آنکھیں پسند نہیں کرتے۔ یہاں آنکھ سے متعلق ہمارا نقطۂ نظر کمل نینی یا مرگ نینی کا ہے۔ (کمل بمعنی کنول، مرگ بمعنی ہرن) کیا نرگسی آنکھ کی رٹ لگانا فارسی والوں کی اندھی تقلید نہیں ہے ؟۔

حضرت محمدؐ صاحب کے نواسوں نے کربلا کے میدان میں مذہب اور انسانیت کے تحفّظ کے لیئے جان کی بازی لگائی تھی۔ ہمارے دل میں اُن کے لیئے عقیدت ہے۔ اِس عقیدت کا اظہار ہندی شاعروں نے بھی کیا ہے۔ شوُرگیہ میتھلی شرن گپت کا مجموعہ "کعبہ اور کربلا" شہادت کی اِسی کہانی پر مبنی ہے اور اُنہوں نے اِس کا ذکر بڑے ہی عقیدت مندانہ انداز و پیرائے میں کیا ہے۔ لیکن اُردو کے کسی شاعر نے ددیچی کا نام شاید ہی سُنا ہو۔ پُورو کے نام سے کتنے اُردو کے شاعر واقف ہیں ...
شیوی کی کہانی اور اُن کے تیاگ کا کتنے اُردو شعراء کو علم ہے۔ اِن لوگوں کی قربانی اُن کے لیئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔؟۔ ہریش چندر کی مذہب کی خاطر اٹھائی گئی تکالیف اور مصیبتوں پر اُن کا من نہیں پسیجتا۔؟۔

اُردو میں تخلّص رکھنے کی روایت بہت پُرانی ہے۔ اُردو شاعر بھی فارسی شاعروں کی مانند نظم (کلام ...) کے آخر میں اپنا نام جوڑتے ہیں۔ اب کئی نام ایسے ہوتے ہیں جو آسانی سے نہیں کھپ پاتے۔ لہٰذا ایسے نام والے شعراء عموماً قلمی نام رکھ لیتے ہیں۔ ہندی میں یہ رواج اُردو کے اثرات کا ہی نتیجہ ہے۔ گو کہ ہندی شاعر اپنے کلام میں نام یا تخلّص کا استعمال نہیں کرتے ہیں۔ اُردو میں تو بھگو رام جیسا غیر شاعرانہ نام ہونے پر جوش قلمی نام (تخلّص) رکھنا ہی پڑتا ہے۔

اب یہاں بھی ایک سوال اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اگر چین کا مسلمان ہنگ چنگ ہونے پر بھی مسلمان رہ سکتا ہے۔ روس کا مسلمان محمدوف ہو کر بھی مسلمان ہے، تو پھر بھارت کا مسلمان رد کیش[1] (غالباً راکیش) ہو کر کیوں مسلمان نہیں رہتا؟۔ امرت لال تو عشرت ہو سکتے ہیں۔ رام پرکاش ساحر بھی ہو سکتے ہیں۔ میلارام وفا بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن کوئی ابراہیم علی دنیش کیوں نہیں ہو سکتا؟۔ کوئی اصغر علی نیرج کیوں نہیں ہو سکتا۔ قلمی نام (تخلص) اختیار کرتے وقت ہندو اور مسلمان اُردو شعراء کیا ہندوستانیت سے مُنہ نہیں موڑ لیتے؟

یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو میں بھی نظیر اکبر آبادی جیسے شاعر ہوئے جن کی شاعری خالص ہندوستانی ہے مجھے بھی اِس کا تذکرہ کرنے میں فخر سا محسوس ہوتا ہے لیکن ایسے شاعر ہیں کتنے؟ اور اُردو ادب کے تاریخ نویسوں نے اُن کو کیا مقام دیا ہے۔؟

میرے اِن سوالوں سے اگر کوئی مجھے اُردو کا مخالف سمجھتا ہے تو میرے پاس اِس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ لیکن میں اُردو کا شیدائی ہوں، اُردو سے مجھے عشق کی حد تک پیار ہے۔ اُردو کے لئے میں جو کچھ کر رہا ہوں، اُتنا شاید نعرہ لگانے والے کبھی نہ کر سکیں گے۔ لیکن حقیقت پسندی کوئی پاپ نہیں ہے، ہم اُردو والوں کو اِس مسئلے پر صبر سے سوچنا ہوگا اور اپنی نظموں کو بھارت کی پاک زمین سے جوڑنا ہوگا۔ وگرنہ آنے والا دور نہ اُردو کو جانے گا اور نہ ہمیں آپ کو پہچانے گا۔ اُردو کو باعزت طریقہ پر زندہ رکھنے کے لئے اِسے ایران، عرب کے ماحول سے نکال کر گنگا کے کنارے پر لاکر کھڑا کرنا ہوگا۔ اِسے بھارتیہ رنگ میں رنگنا ہوگا۔ اِسی لئے کہتا ہوں کہ ؎

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی

---

[1] اصل مضمون میں یہ نام یوں چھپا ہے [illegible]

بقیہ ڈراما "شکار" صفحہ ۵۸ سے آگے

پُوچھے کہ دنیا میں سب سے زیادہ مجھے کون سی چیز عزیز ہے تو میں بلا تامّل کہہ دوں گا — تم۔!

فوزیہ :- آپ نے تو میرے الفاظ چھین لئے۔

فیروز :- کیا۔؟

فوزیہ :- جی ہاں۔!

فیروز :- بعض اُوقات معمولی سی باتیں ذہن پر بوجھ بن جاتی ہیں۔ (اُس کا اِشارہ اپنے اُس خیال کی طرف ہے۔)

فوزیہ :- اور ذہن میں اُن سے ہلچل سی ہونے لگتی ہے۔ درحقیقت جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ قسمت کا لکھا ہی تو ہوتا ہے۔

فیروز :- یہ تم نے ٹھیک کہا۔ چائے کے بارے میں کیا خیال ہے۔؟

فوزیہ :- میں ابھی لائی۔ (وہ جذبات سے چور گنگناتی اور اُچھلتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چلی جاتی ہے)

(پردہ گرتا ہے)

مکتوبات

شمارۂ اپریل سنہ ۱۹ء کے متعلق

● شاعر کا تازہ (اپریل) شمارہ نظر نواز ہوا۔ آپ کی نظم "کھڑکیاں بند کرو" کا صرف عنوان اپنے اندر اتنی کیفیات کا حامل ہے کہ میں دیر تک اُس کے (DIMENSIONS) میں گُم رہا۔ پوری نظم عنوان سے چپکی ہوئی ہے "آوازوں کے جنگل"، "تعاقب میں"، "شیش محل" اور دوسرے PUNS (ذومعنویت) بہت ہی کیف انگیز ہیں۔ گرچہ موضوع کے اعتبار سے آپ کا تجربہ (ذہنی) نیا نہیں ہے۔ لیکن جن خارجی مواد کے توسّل سے آپ نے اپنے محولہ تجربے کا اظہار کیا ہے، وہ نظم کو قابلِ قدر بنانے میں بے حد معاون ہیں۔

من موہن تلخ کی نظم "اپنے میں خالی" بھی کافی EMOTIVE معلوم ہوئی۔

ظہیر الدین[1] صاحب کا مقالہ "افلاطون کی غلطیاں" کئی غلط فہمیوں کا نتیجہ ہے۔ ظہیر الدین صاحب میرے خیال میں لفظ 'MIMIC' یا MIMESSES سے غلط طور پر متاثر ہوئے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اس دور میں، افلاطون وغیرہ کی ادبی تنقیدوں یا تنقیدی اُصولوں پر آج کی عینک کی وساطت سے نظر ڈالنا کوئی مناسب طریقہ نہیں ہے۔ "اگر افلاطون کا "شاعر جو کچھ دیکھتا ہے، شاعری میں اُسی کی نقل کرتا ہے" خیال غلط ہے تو پھر حالیہ مفکرین، شعراء اور ناقدین میں سے بعض کی اس رائے

"THE POET IS ESSENTIALLY A VOYANT, A SER" کی

ظہیر صاحب کیا حیثیت متعین کریں گے۔ !

ظہیر صاحب کے توسّل سے یہ بھی علم ہوا کہ افلاطون نے "شاعر کو مجذوب کہہ کر پکارا ہے" اور یہ کہ اُس نے شاعر کے پاگل پن کو مقدس پاگل پن کا نام دیا ہے۔ اگر افلاطون کا یہ خیال جُرم ہے تو پھر نطشے کی یہ رائے ARTIST TRUELY LIVES BEYOND GOOD + EVIL کیا ایک مجذوب یا پاگل کے مصداق نہیں ہے۔؟

شعر و ادب کے متعلق اسلاف کی رائے میں توڑ مروڑ اکثر قاریوں کے لئے گمراہ کُن ہوتا ہے۔ خیر !

ایم ۲/۱۳۵ پی۔ ایس۔ بی۔ کدما۔ جمشید پور۔ — احمد عظیم آبادی

● شاعر کے دو شمارے سات آٹھ روز کے فرق سے موصول ہوئے، ممنون ہوں۔ اپریل کا شمارہ بہت ہی جاندار ہے۔ نظم "کھڑکیاں بند کرو" گہرے سیاسی اور سماجی شعور کی آئینہ دار ہے۔ لوگ سکون اور اطمینان چاہتے ہیں۔ یہاں انتشار اور تخریبی رُجحانات کی فراوانی ہے۔ لوگ معاشی ترقی کے خواہاں ہیں۔ یہاں فرقہ وارانہ فسادات کی مدد سے تاریخ کا پہیہ اُلٹا گھمانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ لوگ امن اور جمہوریت کا استحکام چاہتے ہیں۔ یہاں خانہ جنگی کی منزل تک پہنچنے کے لئے کارکنوں کو تربیت دی جا رہی ہے۔ بہر حال ہر شب کے بعد سحر ہونی مقدر ہے ؎

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
چمن میں آتشِ گُل کے نکھار کا موسم

اپریل کے شمارے میں محمد ایوب واقف نے شاہ معین الدین احمد ندوی پر مضمون لکھتے ہوئے ایک جگہ یہ مصرع،

"اِک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق"

غالب کے نام سے موسوم کیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ یہ مصرع مولانا حالی کا ہے۔ جس کا دوسرا مصرع یہ ہے۔ ؎

[1] مضمون نگار کا نام ظہور الدین ہے۔ غلطی سے ظہیر الدین چھپ گیا تھا۔

"رکھتی ہے آج لذتِ دردِ جگر کہاں"

اور پورا شعر بہت مشہور ہے۔ غالباً اُن کو سہو ہوا ہے، ویسے مضمون اچھا ہے اور معلومات سے بھر پور ہے۔

۹۷/۹۱ پریڈ۔ کانپور ۱۳ تابش انصاری

● 'شاعر' کا پچھلا شمارہ موصول ہو گیا تھا۔ اُردو اور اُس کے حال و مستقبل کے بارے میں آپ کے بصیرت افروز اداریوں کا تو سارا عالم قائل ہے۔ لیکن نہ معلوم کیوں اُردو پرست آپ کی بتلائی ہوئی لائنوں پر چلنے اور کچھ کر گزرنے کے مراحل پر کچھ قیل و قال کے عالم میں نظر آنے لگتے ہیں۔ یوں تو اپنی سچی لگن کی بنا پر ذاتی طور سے کچھ کریں، وہ بات الگ ہے۔ آج کل بھر تو پرا جتماعی کوشش ہی کچھ رنگ لا سکتی ہے ایک منظم اور صحیح لائحۂ عمل تیار کرکے اگر سب کو پابند کیا جائے تو اُمید بندھ سکتی ہے، ورنہ اِس مسموم اور نفرت انگیز ماحول میں جو زہر ہماری زندگی میں رفتہ رفتہ سرایت کرتا جا رہا ہے اور جس کے اثرات ہر شعبے میں نمایاں نظر آنے لگے ہیں، بہت جلد کچھ ہونا ناممکن سا دکھائی دیتا ہے۔ وجوہ کچھ بھی نہ ہوں، ذاتی مفاد سے لے کر دیگر پابندیاں اور سب سے بڑھ کر ہماری بے حسی اور غیر ذمہ داری ؟!، کس طرح ناؤ کنارے لگ سکتی ہے۔؟۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اِس پُرخوف و خطر ماحول میں جہاں اِنسانی زندگی اور عزت کا کوئی یقینی تحفظ باقی نہیں' وہاں زبان بے چاری کس زُمرے میں آ سکتی ہے۔!

آپ نے شمیم احمد صدیقی اور انیس رفیع کے خیالات کو جذباتیت پر محمول بتایا ہے۔ شاید یہ کسی حد تک صحیح بھی ہو۔ پھر بھی اِس حقیقت سے اِنکار ناممکن ہے کہ جس طرح چند خاص تنگ نظر اور تعصب گیر جماعتوں اور گروہوں نے باقاعدہ ایک منظم سازش کے تحت ملک گیر پیمانے پر جو نفرت اور خوف کی فضا طاری کر رکھی ہے جس نے ہمارے اور ہمارے بعد کی نسلوں کے حال و مستقبل کو ہر ممکن طریقہ پر غیر محفوظ بنا رکھا ہے۔ اُسی طرح انہیں خیالات سے پر چار میں بہت سے پڑھے لکھے اور ذہین دماغوں نے بھی اپنے قلم اور افکار سے ہماری زبان اور ادب کا کیس نہایت گمراہ کن انداز میں پیش کرنے کا تہیہ کیا ہوا ہے اور اپنے خیالات کو زیادہ پُرزور بنانے کے لئے اگر کچھ کرائے کے اُردو قلمکار شامل کر لئے ہوں تو معاملہ کتنا خطرناک اور تباہ کن موڑ پر نظر آتا ہے۔ ایسی حالت میں جذبات مشتعل نہ ہوں تو کیا ہو۔!

اِدھر ایک رسالے میں آپ کے خلاف بھی کچھ پروپیگنڈہ نظر سے گزرا اور تکلیف ہوئی۔ نہ معلوم کیوں کچھ حضرات کسی بھی بات کو غلط دلائل کے ذریعہ اپنے نقطۂ نظر تک توڑ موڑ کر لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنی دانست میں زبان اور ادب کی خدمت اِسی طرح کر رہے ہیں' آپ نہایت پُرزور، مُدلّل اور دل و دماغ کے پردے اُٹھا دینے والے "انداز" میں جواب دیں تو بہتر ہوگا۔ شاید آپ اِس کو میری جذباتیت پر محمول فرمائیں، لیکن غلط بات ہر شخص کو بُری لگتی ہے۔

اب کے "شاعر" میں نازش پرتاب گڑھی کی نظم "کوئی ہنگامہ کرو!" اور آپ کی نظم "کھڑکیاں بند کرو" بطور نے بہت متاثر کیا۔ شاید بہت سے لوگوں کو یہ 'جوابات' کا کام بھی دیں۔ کرشن موہن صاحب کی اوّل غزل پسند آئی۔ اِس شمارے کے ترجمہ شدہ افسانے بہت کامیاب ہیں۔ "افلاطون کی غلطیاں" مقالہ اچھا ہے، مگر مقالہ نگار نے صرف افلاطون کے ادبی نظریات کا ہی سرسری جائزہ پیش کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ محمد ایوب صاحب واقف نے "شاہ معین الدین احمد ندوی" پر اچھا مقالہ تحریر کیا ہے۔ دارالمصنفین کی اگر دیگر اکابر شخصیات کو بھی متعارف اور روشناس کرایا جائے تو بہتر ہوگا۔

۲۴۴۔ اعظم بلڈنگ۔ سرائے کاشتان۔ کوٹہ۔ ظفر غوری

● اپریل ۱۹۹۰ء کا "شاعر" ملا۔ "افلاطون کی غلطیاں" چھاپ کر آپ نے میری جو حوصلہ افزائی کی ہے اُس کے لئے ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کاتب نے شاید سہواً "ظہور الدین" کی جگہ "ظہیر الدین" لکھ دیا ہے۔ آئندہ مہربانی کرکے اِس بات کا خیال رکھیں۔

آپ کا "اُردو کو اپنا دین و ایمان بنا لیجئے" بھی پڑھا۔

اس سے پہلے کے شمارے میں آپ کے اور کرشن چندر جی کے مضامین بھی پڑھے ہیں اور اس بات کا احساس ہونے لگا ہے کہ اُردو کے لئے ہمیں جو کچھ کرنا چاہئے وہ پیچ پچ ہم نہیں کر رہے ہیں۔ جہاں ایک طرف اُردو میں بیش قیمت جدید فن پارے وجود میں لانے کی ضرورت ہے وہیں دوسری طرف حکومت کی خوابیدہ آنکھ کو بھی بیدار کرنا ضروری ہے۔ یہ دونوں باتیں اگر ہو گئیں تو پھر اُردو اپنا مقام حاصل کرلے گی۔

شعبۂ اُردو۔ جموں یونیورسٹی۔ جموں۔ نیر اندیش۔ ظہور الدین

● مارچ کے بعد اپریل کا "شاعر" بھی ملا۔ شکریہ۔!
آپ نے رام لعل صاحب کے خط کے جواب میں اُن کے مضمون کے بارے میں ٹھیک ہی اندازہ لگایا تھا۔ رام لعل کا وہ مضمون محض چند ہفتوں کے اندر ہی "دھرم یگ" میں چھپ گیا۔ اس میں اُنہوں نے بعض ایسے جملے بھی استعمال کئے ہیں جو کسی بھی اچھے اور سنجیدہ قلمکار کو زیب نہیں دیتے۔ بیچارے یونس سلیم (مرکزی نائب وزیر) کو "حضرت سلیم" وغیرہ طنزاً کہا ہے۔
اس سے پہلے راہی معصوم رضا نے "اُردو ساہتیہ کی بھاشا" کے عنوان سے اپنا جو مضمون "دھرم یگ" میں چھپوایا تھا اُس میں بھی اُنہوں نے "ڈاکٹر فریدیوں، آل احمد سروروں وغیرہ" طنزاً بلکہ غصّۃً لکھا تھا۔ جس کی حمایت میں گیا کے ایک پروفیسر صاحب کا خط "دھرم یگ" ۱۰ رمئی ۱۹۷۰ء میں چھپا ہے کہ راہی معصوم رضا کے مضمون کو اُردو رسائل میں بھی چھپنا چاہئے۔ اور زیادہ سے زیادہ۔
اپریل ۱۹۷۰ء کے "شاعر" میں دو مکتوب نگاروں کے خط کے جواب میں آپ نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ یوں جذباتیت سے کام نہ چلے گا۔ آپ جس اعتدال پسندی اور میانہ روی کی باتیں کرتے ہیں، میں خود اُن کا تہِ دل سے قائل ہوں۔ مسئلہ غلط طریقے سے اُلجھنے اور جھگڑنے سے کبھی حل نہ ہوگا۔ ہمیں اُردو کے مخالفین خصوصاً ہندی کے علمبرداروں کو اُردو کیلئے ہموار کرنے کے لئے اُن سے بناؤ کرنا ہوگا، بگاڑ نہیں۔ مناسب اور معقول کوششیں یقیناً بارآور ہوں گی۔ دُور اندیشی اور دانشمندی سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ اشتعال انگیزی کی کوئی بھی صورت ہمارے طرزِ عمل سے ظاہر نہیں ہونی چاہئے۔
شکیل بدایونی کی بے وقت موت اور پھر مہاراشٹر کے ہولناک فسادات نے دل کا سکھ چین چھین لیا ہے۔ کسی کل چین نہیں۔ اب تو ملک کے اندر پھیلی ہوئی فسطائی طاقتوں کے بھیانک رُوپ دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم پھر کسی اَنچاہی طاقت کے غلام ہو جائیں گے۔ خدا اُس منحوس دن سے ہمارے وطنِ عزیز کو بچائے۔!

بھر گنڈا۔ ہزاری باغ۔ ظہیر نیازی

● "شاعر" کا تازہ شمارہ ملا۔ "جرعات" سے خطوط کے کالم تک اُردو زبان کے سلسلے میں جو باتیں شاعر میں آئی ہیں اُن کا خیر مقدم نہ کرنا انتہائی ناانصافی ہوگی۔ خیر مقدم ہی نہیں بلکہ اُن باتوں کو روبہ عمل لانے کی اَشد ضرورت ہے۔ فی زمانہ اس طرح کی تحریک کا باضابطہ مطالبہ کرتا ہے۔ ہم اُردو دوست اگر اس طرح مل جل کر اُردو کے لئے کام کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ اُردو کو دریا بُرد کیا جاسکے۔ شرط ہے جذبۂ عمل کا پیدا ہونا، ورنہ زبانی گھوڑے تو اس میدان میں بہت دَوڑے اور شکستِ فاش کھا کر چلے گئے۔
شری دھرم ویر بھارتی اگر ایسی باتیں کرتے ہیں تو اُن سے میرا کوئی گِلہ نہیں۔ گِلہ تو اس بات کا ہے کہ گوپال متل جیسے لوگ جن کا اُردو اوڑھنا بچھونا ہے ایسی باتیں کرتے ہیں۔
اس مرتبہ "شاعر" کے مجموعی پر نظمیں زیادہ نظر آئیں، اور نظمیں بھی صاف ستھری۔ آپ کی نظم "کھڑکیاں بند کرو" بہت پسند آئی۔ ساتھ ہی نازش پرتاپ گڑھی کی نظم "کوئی ہنگامہ کرو" بھی بہت خُوب ہے۔ غزلوں میں رونق دکنی سیمابی۔ پیام فتحپوری رِشی پٹیالوی کی غزلیں پسند آئیں۔ ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ کا مقالہ ایک اضافہ ہے معلومات میں۔
خترمی ضیا فتح آبادی، صدر بزمِ سیماب کا پتہ ارسال فرمائیں۔ یہاں ہم لوگ بزمِ سیماب کی شاخ قائم کرنا چاہتے ہیں۔!

بنگلور ٹیلرنگ، مین روڈ۔ رانچی۔ ضیاء الانجم پرتاپگڑھی

اپریل ۱۹۷۰ء کا شمارہ ملا شکریہ! اُردو کے سلسلے میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ بے حد اثر انگیز ہے۔ اور اُس خلوص و دیانتداری کا مظہر ہے۔ جو آپ کے وجود میں سرایت کر چکی ہے اور فی زمانہ اُردو کی بقا کے لئے جس کی اشد ضرورت ہے۔

اُردو سے ہمدردی رکھنے والے تمام افراد ہر ممکنہ جدوجہد کے ساتھ گھر کے بچوں کو اپنے طور پر اُردو پڑھانے کے معاملے میں سنجیدہ ہو جائیں جو کہ بہت دشوار نہیں ہے۔ تو یہ بھی ایک اہم اقدام ہوگا۔ عمل کی توفیق ہونا شرط ہے۔

۱۶۶۔ منہاج پور۔ الٰہ آباد ۳، **خان ارمان**

شمارۂ مئی ۱۹۷۰ء کے متعلق

● مئی کا تازہ شمارہ ملا۔ فسادات کے انسداد کے لئے "ادیبوں اور صحافیوں کی کونسل" کے قیام کا خیال بڑا مستحسن ہے مجھے اُمید ہے کہ آپ کو اس سلسلے میں اُردو کے ہر بڑے ادیب اور صحافی کی تائید حاصل ہوگی اور تعاون ملے گا۔ آپ نے بمبئی سے چنڈی گڑھ تک تقریباً پندرہ بڑے شہروں کے اُردو ادیبوں اور شاعروں کو کونسل کے قیام کے لئے خاص طور سے آواز دی ہے اور حقیقت میں یہ ضروری بھی ہے کہ ان بڑے شہر والے ادیبوں اور صحافیوں کو پہل کرنی چاہئے۔ آگے بڑھنا چاہئے اور کونسل کی بنیاد ڈال دینی چاہئے۔ ایک بار بنیاد پڑ جائے، کاموں کا خاکہ بن جائے اور بڑے مقامات پر کام کا آغاز ہو جائے تو چھوٹے چھوٹے مقامات پر بھی ضروری حد تک کچھ کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال کونسل کے قیام کے سلسلے میں میں آپ کی رائے سے متفق ہوں۔

علامہ سیماب کی تصانیف کی اشاعت کے سلسلے میں مناظر عاشق نے جو مشورہ دیا ہے اگر اُسے آپ اور علامہ مرحوم کے تمام عقیدت مند قبول کر لیں تو ایک بڑا کام ہو سکتا ہے۔ اُردو والوں میں ایثار کا تھوڑا سا جذبہ بھی ہے تو بانیٔ "شاعر" کی کتابوں کی اشاعت کے لئے سالانہ پانچ روپے دینے والے دو ڈھائی سو افراد کی فہرست تیار ہونا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ آپ میرا اور بیگم خاور کا نام اس فہرست میں شامل کر لیجئے۔ ہم دونوں اس نیک مقصد کیلئے سالانہ دس روپے دینے کے لئے ہمہ وقت تیار ہیں۔

"کچھ قربتیں کچھ دوریاں" کے عنوان سے آپ نے شکیل بدایونی مرحوم پر جو مضمون لکھا ہے وہ بڑا پیارا اور آپ کی صداقت اور آپ کے فنکارانہ خلوص کا آئینہ دار ہے۔

نورالسعید اختر سے، جب سے انہوں نے چاندپور چھوڑا ہے، ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ سُنا ہے وہ اب ہندوستانی پرچار سبھا میں کسی عہدہ پر کام کر رہے ہیں۔ اِدھر "شاعر" اور دوسرے متعدد رسائل میں اُن کے مضامین دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ اُن کا قلم زندہ ہے۔

تازہ پرچے میں آپ نے اُن کے اور حسن عسکری (لکھنوی) کے تحقیقی مقالوں کے ساتھ "مرغِ فردوس" پر محمد اسحٰق صدیقی کا معلوماتی اور دلچسپ مضمون شامل کیا ہے۔ اِس قسم کے مضامین کی اشاعت کا سلسلہ جاری رکھا جائے اور ان کی تعداد میں اضافہ کیا جائے تو پرچے میں تنوع پیدا ہو سکتا ہے۔

حالیہ فسادات پر اختر راہی کی نظم سب سے پہلے "انقلاب" میں دیکھی تھی۔ "شاعر" میں یہ دوبارہ پڑھنے کو ملی ہے[1] اس کے ساتھ ہی ـــ زاہد کمال کی نظم "فرقہ پرستوں کے نام" بھی اچھی ہے۔ عبداللہ کمال کی نظم "صبحِ اُمید" میں بھی "تلاش" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ مگر مجھے اس کا عنوان "گمشدہ چہرہ" ہی زیادہ اچھا لگتا ہے۔ "شاعر" میں اس نظم کا فارم بھی قدرے بدلا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ فنی لحاظ سے بھی یہ "تلاش" سے بہتر ہو گئی ہے۔ دوسری نظموں میں مجھے "فریبِ آگہی" پسند آئی۔ حرمت الاکرام، حسن کمال اور قمر اقبال کی غزلیں اچھی ہیں۔ مکتوبات کے باب میں پروفیسر داؤد کشمیری نے محمد شفیع ساغر کے مضمون (مطبوعہ جلد ۴۱ - شمارہ ۱، ۲) کا نہایت

---

[1] - ۲ اختر راہی کی نظم دانستہ "انقلاب" سے لی گئی تھی لیکن عبداللہ کمال نے اپنی نظم "شاعر" ہی کے لئے دی تھی۔ اور اس کا گمان بھی نہ تھا کہ وہی نظم "صبحِ اُمید" میں چلی جائیگی۔ ادارہ کو اس کا افسوس ہے۔ (ادارہ)

سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا ہے۔

بدیع الزّماں خاور

بی اے فیملی مال۔ ڈابولی۔

● ماہ مئی ۱۹۷۰ء کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ زیرِ نظر شمارے کا اداریہ "فسادات اور ادیب" خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ملک میں بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی سے ہر درد مند انسان کا فکرمند ہونا لازمی ہے، خاص طور پر ایسی صورت میں جب کہ ملک "محشرِ فرقہ پرستی" بنا ہوا ہو، اور نفسی نفسی کا عالم ہو۔ یوں بھی اِن حالات میں ملک کی ذمّہ دار ہستیوں کا خواہ وہ سیاست داں ہوں، ادیب ہوں، شاعر ہوں، صحافی ہوں غرض زندگی اور فن کے کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتی ہوں۔ یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اِس لعنت کو ختم کرنے کے لئے متّحد ہو جائیں۔ اِس کے اسباب و علل پر غور کریں اور اِس کے اِنسداد کے طریقے کھوج نکالیں۔

اگر فرقہ پرستی کی اِس بڑھتی آگ کو بروقت نہیں روکا جا سکا تو نتائج خطرناک ہی ہوں گے۔ آگ کے درخت سے برف کے پھول نہیں برس سکتے۔ اِنسدادِ فرقہ پرستی کی ذمّہ داری ویسے تو اربابِ حکومت پر عائد ہوتی ہے مگر جب یہ نظر آنے لگے کہ حکومت "سیاسی مصلحت پسندیوں کے باعث اِس میں ناکام ہو رہی ہے؟ تب یہ ذمّہ داری دیگر امن پسند طاقتوں کو اپنے ہاتھوں میں سنبھال لینا چاہیئے۔

آپ نے "نوعات" میں دُرست فرمایا ہے کہ — "قوموں کی اِصلاح یا تو عسکری قوانین سے ہوتی ہے یا نفرت کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں محبّت کے دیئے جلانے سے۔" جہاں تک عسکری قوانین کی بات ہے تو یہ کبھی اِصلاحِ قوم اور تالیفِ قلوب میں کامیاب نہیں رہے، یہ تو صرف محبّت کے ذریعہ ممکن ہے۔ لہٰذا اِس حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد نظر ادیب اور صحافیوں پر ہی جاتی ہے۔ آپ کا اِرشاد قطعی بجا ہے کہ :۔

> "اگر اِس وقت ادیب اور صحافی فرقہ پرستی کی لعنت کے اِستیصال کے لئے منظّم ہو جائیں تو بڑا کام ہو سکتا ہے۔ ادب اور صحافت عوام اور خواص دونوں کے تالیفِ قلوب کا مؤثّر ذریعہ ہیں۔ حکومتوں کے قوانین اور سیاسی جماعتوں کے فیصلے حالات اور فضا کو اِتنا متاثّر نہیں کر سکتے جتنا ادیب اور صحافی کر سکتے ہیں"

آگے جا کر آپ نے جس ہمہ لسانی کونسل کی تشکیل کی اِسکیم پیش فرمائی ہے وہ یقیناً اِس سمت بہت دُور جا سکتی ہے آپ نے ہمیشہ اندھیروں میں چراغ دِکھلائے ہیں۔ اِس بار بھی آپ نے ایک اَچھوتا اور عمدہ خیال پیش فرمایا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کتنے با عمل لوگ سامنے آتے ہیں۔ اب ضرورت اِس بات کی ہے کہ آپ کی اِس آواز کو دُور دُور تک پہنچایا جائے۔

شکیلؔ مرحوم کے سلسلے میں آپ کا مضمون "شکیل بدایونی — کچھ قربتیں کچھ دُوریاں" شکیلؔ کی زندگی اور فن پر ایک بھرپور تبصرہ ہے۔ اِس سے شکیلؔ کی شخصیت اور فن کے بہت سے ڈھکے چھپے پہلو اُجاگر ہو جاتے ہیں۔ آپ نے بڑی ایمانداری اور حق گوئی سے یہ فریضہ انجام دیا ہے۔ قطعۂ تاریخ کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔

مکتوبات میں مناظر عاشق نے بڑی عمدہ اِسکیم پیش کی ہے۔ اگر ایک مستقل فنڈ اِس طرح قائم کر لیا جائے کہ پانچ روپیہ سالانہ یا حسبِ اِستعداد رقم زیادہ سے زیادہ ادب نواز حضرات اِس فنڈ کے لئے دے سکیں تو بہت کچھ کام ہو سکتا ہے، اِس جانب خصوصی توجّہ دینے کی ضرورت ہے۔

شفیق رحمانی

گورنمنٹ سینٹرل لائبریری۔ گوالیار۔

ماہ مئی کا "شاعر" ملا۔ یہ ہمیشہ کی طرح اعلیٰ معیار کی پچھلی روایتوں پر برقرار ہے۔ اِنتخابات خوب تر ہیں۔ خصوصاً آپ کا مضمون شکیلؔ بدایونی مرحوم کے بارے میں "کچھ قربتیں، کچھ دُوریاں" بے حد پسند آیا۔ قربتوں اور دُوریوں کا یہ اِمتزاج شکیلؔ مرحوم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا اَحاطہ بڑے ہی مؤثّر انداز میں کرتا ہے اِن کی مَوت یقیناً آپ کیلئے سوہانِ رُوح رہی ہوگی۔

جناب اظہر افسر صاحب کا ڈرامہ "غالبؔ کے گھر ایک شام" بڑا ہی دِل چسپ ہے۔ غالبؔ کو کردار بنانا اور پھر اِس کردار کے ساتھ پُورا پُورا اِنصاف کرنا کوئی آسان کام نہیں مگر فاضل ادیب نے جس خوبی کے ساتھ یہ کام انجام دیا ہے۔ وہ اِن کی کہنہ مشقی اور اَدب کی اِس صنف پر اِن کی مضبوط گرفت کا پتہ دیتا ہے۔

جناب اسحٰق صدیقی صاحب کا مقالہ "مرغ فردوس" معلومات آفریں ہے۔ اس قسم کے مقالے اُردو میں کم کم ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ چونکہ بات پرندوں کی تھی اس لئے شاید جناب نے یہ کہہ کر "پرندوں کی دُنیا میں نر ہمیشہ مادّہ سے خوب صورت ہوتا ہے۔" پرندوں پر ہی اکتفا کیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جانداروں کی دُنیا میں بھی نر ہمیشہ مادّہ سے خوبصورت ہی ہوتا ہے۔

۱۷، ۳، ۱۱/۴۔ امام باڑہ روڈ۔ حیدرآباد۔ **جمیل شیدائی**

● شکیلؔ بدایونی مرحوم پر آپ کے تاثرات بیحد پسند آئے۔ حق گوئی اور بے خوفی ۔۔ یہی انداز مجھے بھی چاہئے ۔
مگر ؎ " تا نہ بخشد خدائے بخشندہ "

فسادات کے سلسلے میں آپ نے جو تجویز پیش کی ہے، واقعی مداوا بن سکتی ہے۔ جانے ہمارے وطن کا یہ ناسُور اچھا بھی ہوگا یا نہیں ؟!۔

۱۳۶۱۔ شنکر نگر۔ ناگپور۔ (پروفیسر) **ڈاکٹر زرینہ ثانی**

● "شاعر" کا مئی کا شمارہ دستیاب ہوا۔ شکیلؔ بدایونی مرحوم پر آپ کا مضمون دیکھا۔ آپ نے مناقب ومثالب دونوں کے ذکر میں جو درمیانی راہ نکالی ہے، وہ آپ ہی کا حصّہ ہے۔ کاش ہمارا نوجوان طبقہ اس اسلوب کی قدر کرنا سیکھے۔ داؤد کشمیری کا مضمون، پھر اُس کے جواب میں شفیع ساغر کا مضمون اور زیرِ نظر شمارے میں داؤد کشمیری کا جواب الجواب، بھی نظر سے گزرے اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے نقادانہ صلاحیتیں مناظرہ بازی میں ضائع ہو رہی ہیں۔ ایک زمانہ میں دونوں میرے عزیز طالب علم رہ چکے ہیں اور آج بھی مجھے دونوں عزیز ہیں۔ بہتر ہوگا اگر یہ دونوں نوجوان اہلِ قلم ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہونے کے بجائے مل کر کلامِ غالب کے افہام و تفہیم میں اپنا زور صرف کریں۔

بڑوانے نواب کوارٹرز۔ اورنگ آباد۔ (پروفیسر) **عصمت جاوید**

● فرقہ وارانہ فسادات کی قیامت خیزی ہماری روزمرّہ کی زندگی کا معمول بن چکی ہے۔ اس کا انسداد جس قدر لازمی ہے، اُتنا ہی بعید از امکان ہوتا جا رہا ہے۔ صحافیوں اور ادیبوں کی کونسل برائے انسدادِ فسادات" کی تجویز قابل قدر ہے۔ لیکن کیا اس کی تشکیل بآسانی عمل میں آجائیگی۔ یا اس سے واقعی کوئی اچھی توقع رکھی جا سکتی ہے؟ بہرحال میں کارواں سے علیحدہ نہیں۔ آئندہ پروگرام سے مطلع فرمائیں۔

شہابؔ سرمدی کی رُباعیوں کا کیا کہنا۔ مجھے حد درجہ پسند آئیں۔ شکیلؔ بدایونی مرحوم پر آپ کا مضمون بڑا بھرپور ہے۔ شخصیات کا اتنا قریبی اور عمیق مطالعہ جس کی پشت پر حقیقت پسندانہ تجزیاتی عوامل کی بھی کارفرمائی ہو، مشکل کام ہے۔ بلاشبہ یہ مضمون ذہن و قلم کی متبحرانہ ہم آہنگی کی نہایت دلپذیر مثال ہے۔ اداریوں کی طرح یہ صنف بھی آپ کی خصوصیت بنتی جا رہی ہے۔

رام باغ۔ مرزاپور۔ **حرمت الاکرام**

● آپ کے اداریئے روز بروز دل گداز ہوتے جا رہے ہیں۔ خواہ آپ اُردو کے نام پر ہمیں پکاریں، خواہ انسانیت کے نام پر۔ آپ کے لب و لہجہ کا بے پناہ خلوص اور آپ کی آواز [illegible] سوز و گداز ہر جگہ برقرار رہتا ہے۔ آپ کا سخت سے سخت مخالف بھی "شاعر" کے اداریئے پڑھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ماتم صرف اس کا ہے کہ ہماری قوتِ عمل ختم ہو چکی ہے۔ گزشتہ بیس بائیس برسوں سے آپ مسلسل و متواتر اپنے اداریوں کے ذریعے ہم اُردو والوں کو عزم و عمل کی راہ پر بلاتے آئے ہیں۔ مگر نتیجہ معلوم!

اب فرقہ پرستی کے طوفان اور خونیں فسادات کے لامتناہی سلسلے کو ختم کرنے کے لئے ہم ادیبوں اور شاعروں کو آواز دی ہے اور ایک بہترین طریقۂ کار و لائحۂ عمل بھی پیش فرما دیا ہے۔ مگر دیکھئے اب کتنے آپ کی آواز پر کان دھرتے ہیں۔

میری بھی شدید ترین خواہش یہی ہے کہ ہندوستان کی ساری زبانوں کے با اثر اور معتبر اُدبا و شعراء جلد از جلد آپ کی مجوزہ کونسل کا انعقاد عمل میں لائیں اور فرقہ پرستی کو جڑ سے ختم کر دینے کیلئے سینہ سپر ہو کر میدان میں آجائیں۔

مرحوم اُستادِ محترم کے کلام کی اشاعت کے سلسلے میں مجھے جناب ناظر عاشق کا مشورہ بیحد پسند آیا۔ حضرت مولانا سیماب کے تلامذہ اور پرستاروں کا خاصا حلقہ بھی موجود ہے۔ اگر آپ اعلان کر دیں تو مجھے اُمید ہے کہ جلد ہی خاطر خواہ فنڈ جمع ہو سکیگے۔

بیگم وارڈ۔ پرتاب گڈھ ۔ **نازش پرتاب گڈھی**

محفل اپنی

کیا کہیں اور کیا نہ کہیں۔!؟

کئی ماہ سے قارئینِ "شاعر" "محفل اپنی" کی کمی محسوس کر رہے تھے۔ کہنے کیلئے تو بہت کچھ تھا، لیکن گاندھی نمبر" کی اشاعت کے بعد سے سنہ [illegible]ء کی اس ششماہی میں جتنے شمارے نکلے ہیں، وہ بڑے اہم مضامین اور مسائل کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہیں۔ اِن شماروں میں جتنا زیادہ مواد دیا گیا ہے، اتنا اِس سے پہلے کبھی نہیں دیا گیا تھا۔ اسی لئے قارئینِ "شاعر" سے گفتگو کا موقع نہ مل سکا۔

اُردو کنونشن بمبئی کے بعد جو فضا پیدا ہوئی اور اُس وقت سے اب تک فرقہ پرست ذہنیتیں جو لاوا اُگل رہی ہیں، اُردو والے جس سکرد خواب، بے عملی اور نا اُمیدی کے دور سے گزر رہے ہیں، اُس کا سب سے زیادہ ذکر "شاعر" ہی میں رہا ہے۔ (یہ خود ستائی نہیں) پوری اُردو دنیا جانتی ہے کہ ایک اُبال کے بعد ہر طرف سناٹا ہے اور ذمہ دارانِ اُردو نے اپنے لبوں پر مُہریں لگالی ہیں۔ اُردو کی صفوں میں دراڑیں پڑتی جا رہی ہیں۔ ایک "شاعر" اور اُس کا ایڈیٹر ہے جو حقائق کے چہرے سے مسلسل نقاب اُٹھا رہا ہے اور "شاعر" کو کلیتاً اُردو مسائل کے لئے وقف کر دیا ہے۔ قطع نظر اِس کے کہ کچھ اپنوں سے زخم مل رہے ہیں اور کچھ دوسروں سے۔ حالات کتنی تیزی سے بدل رہے ہیں، اِس کا اندازہ اسی اشاعت کی اُن دو تحریروں سے لگایئے جو "بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے" کے عنوان سے شائع کی جا رہی ہیں۔ اُردو والے اگر اب بھی ہوش میں نہ آئیں اور اپنی مصلحتوں کو نہ چھوڑیں تو اِسے سوائے بدقسمتی کے اور کیا کہا جا سکتا ہے!

آپ کے ضمیر سے اپیل

جلدی جلدی کئی شمارے پیش کر کے تاخیرِ اشاعت پر قابو پا لیا گیا ہے۔ جولائی کا شمارہ جولائی ہی میں اپنی مقررہ تاریخ پر شائع ہوگا۔ جولائی کے آئندہ شمارے سے "شاعر" کو اور زیادہ بہتر بنایا جا رہا ہے۔ اِس کا صحیح اندازہ جولائی شمارہ کا شمارہ دیکھنے کے بعد ہو سکے گا۔

قارئینِ شاعر کے پاس اگر دردمند دل ہے اور وہ "شاعر" کی خدمات کو اُردو زبان و ادب کے لئے ضروری سمجھتے ہیں تو سب اپنی اپنی جگہ ایکبار نہایت پُرجوش تعاون سے کام لیتے ہوئے اپنے اپنے حلقۂ اثر سے صرف **دو دو چار چار نئے خریدار** عنایت کریں اور آج کی انتہائی مخالف ہواؤں میں "شاعر" کی شمع کو لرزنے نہ دیں۔ اگر اُن کا ضمیر یہ کہتا ہے کہ "شاعر" اُن کے تعاون کا مستحق نہیں ہے تو پھر ہمیں کچھ نہیں کہنا ہے۔

"شاعر" کو اِس وقت کم از کم پانچ سو نئے خریداروں کی سخت ضرورت ہے۔ صرف ڈیڑھ دو سو دردمندانِ اُردو اِس ضرورت کو پورا کر سکتے ہیں۔ دیکھیں کون کون اِس کارِ اُردو میں حصّہ لیتا ہے۔؟؟؟

اُردو کے مشہور، ممتاز اور منفرد کہانی کار

کشمیری لال ذاکر

کا تازہ ترین، دلچسپ اور بیحد خوبصورت ناول

دھرتی سدا سہاگن

آئندہ ماہ سے شاعر میں بالاقساط شائع ہوگا

دھرتی جو اپنی بیش بہا نعمتیں بغیر کسی امتیاز کے سب کو بانٹتی ہے، دھرتی جو کسی ایک کی ملکیت نہیں، دھرتی جو سب کی ہے اور جسے سب چاہتے ہیں، سب پیار کرتے ہیں۔ دھرتی جو سدا سہاگن ہے۔

آج کے دور میں کوئی بھی مسئلہ اتنا پیچیدہ اور مشکل نہیں۔ جتنا کہ انسانی رشتوں کا۔ چاہے وہ رشتے بین الاقوامی ہوں، چاہے اپنے ملک کے، چاہے ایک گاؤں یا کنبے کے۔ یہ انسانی رشتے ہی دراصل انسانی ارتقاء کی بنیاد ہیں۔ اِس ناول کا مرکزی خیال وہ اکائیاں ہیں جو ایک ہی مقصد کیلئے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر، کندھے سے کندھا ملا کر ملک کو آگے لیجانے کیلئے کام کر رہی ہیں۔ اِن اکائیوں ہی کے جُڑنے سے آزاد ہندوستان کی تعمیر و ترقی کی داستان مکمل ہوتی ہے۔

ناول کی پہلی قسط سے

آخری قسط تک، ہر ماہ "شاعر" کا شمارہ محفوظ رکھیے

نقد و نظر

(ہر کتاب کی دو کاپیاں آنا ضروری ہیں)

عیارِ غالب

از ——— مالک رام

اُردو کے مشہور محقق مالک رام، رسالہ تحریر کا غالب نمبر نکالنا چاہتے تھے۔ اُسی کے لئے موصوف نے غالب صدی کے موقع پر کچھ مضامین منگائے تھے۔ لیکن تحریر کے نمبر کے بجائے اُن مضامین کو کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے۔

غالب صدی پر معیاری اور غیر معیاری سب طرح کے مضامین بڑی تعداد میں لکھے گئے۔ تحقیق مزید کے علاوہ ایسا قابلِ قدر تنقیدی مواد بھی سامنے آیا جو پہلے نہیں آیا تھا۔ غالب کی زندگی کے بعض ایسے گوشوں کی بھی نشان دہی کی گئی جن کی طرف نظریں نہیں گئی تھیں۔ مثلاً اسی کتاب میں ڈاکٹر نریندر ناتھ دک (ماہر نفسیات) کا مضمون "غالب ایک نفسیاتی مطالعہ" اور ڈاکٹر عبدالجلیل کا مضمون "غالب کی بیماریاں اور مرض الموت" موضوع کے اعتبار سے نئے ہیں۔ ڈاکٹر جلیل نے مرزا کی بیماریوں کی اچھی کڑیاں ملائی ہیں۔ اُنہوں نے علم کے علاوہ قیاس سے بھی کام لیا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اُن کے نتائج صحیح ہوں، مگر اُن کی کوشش دلچسپ اور متنوع ضرور ہے۔

تنقیدی مضامین فراق گورکھپوری کا مضمون جو انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کیا گیا ہے خاصے کی چیز ہے۔ فراق نے غالب کے شعری نظریات اور اُس کے فکر و فلسفہ سے اچھی بحث کی ہے۔ دوسرا قابلِ ذکر مضمون ڈاکٹر محمد حسن کا ہے، جس میں کلامِ غالب کی معنویت، اُس کے فنی تحفظات و لوازمات اور اُس کے شعری مزاج کا تجزیہ غالب ہی کی "خود تنقیدی" کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ فاضل مضمون نگار کی کوشش اچھی ہے۔ پھر بھی اپنے فن کے متعلق غالب کے اشارے، اُس کی اپنی فنی موشگافیوں کے لئے کافی نہیں ہو سکتے۔ غالب کے اجتہاد اور اُن روایتی فنی اشاروں میں بڑا فرق ہے۔ غالب کے یہاں جو فنی کج رویاں اور زبان و بیان کی متجاوزانہ صورتیں ہیں، اُن کی طرف اگر ڈاکٹر محمد حسن توجہ دیتے تو اچھا ہوتا۔

مولانا ضیا احمد بدایونی نے غالب کی نعتیہ شاعری پر سیر حاصل مضمون لکھا ہے۔ اُردو میں تو غالب نے نعتیہ شاعری کی ہی نہیں۔ لیکن اُس کی فارسی شاعری میں نعت و منقبت کا قابلِ قدر ذخیرہ موجود ہے۔ غالب کے عقیدے کی شدت اور شاعرانہ کمال اگر دیکھنا ہے تو اُس کی فارسی منقبتیں دیکھنی چاہئیں۔ بیشک قدسی کی غزل پر غالب کی نعتیہ تضمین بے مثال ہے۔

اس کتاب میں قاضی عبدالودود کا "جہانِ غالب" بھی ہے جو قاضی صاحب کا مخصوص تحقیقی انداز لئے ہوئے ہے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کا مضمون بھی تحقیقی ہے جو چند خطوط پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر گیان چند نے غالب کی زبان اور سید صمد حسین رضوی نے غالب کی تاریخ ولادت سے بحث کی ہے۔ دونوں مضامین مزید بحث طلب ہیں، مگر ان کا انداز علمی و فکری ہے۔ محمد عزیز حسن مرادآبادی نے غالب کے تصورِ ویرانی پر لکھا ہے۔ اختر حسن نے غالب کی مثنوی "چراغِ دیر" کا منظوم اُردو ترجمہ پیش کیا ہے۔ آخری مضمون "غالب شناسی" جب ادراب "خود "عیارِ غالب" کے مرتب کا ہے، جس کی حیثیت ایک محاکمہ کی سی ہے۔ ابتداء میں مالک رام نے غالب کے خاندان اور اُس کی زندگی کے اہم واقعات تاریخی ترتیب کے ساتھ پیش کئے ہیں۔ یہ مختصر تجزیہ بہت کام کا ہے۔

۳۰۴ صفحات۔ قیمت ۷ روپے ۷ پیسے۔ ناشر علمی مجلس دہلی

فٹ نوٹ

از ——— یوسف ناظم

یوسف ناظم اُردو کے جدید مزاح نگاروں میں

ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر وہ اتنے جدید بھی نہیں ہیں کہ اُنہیں تجریدی آرٹ کی اُلٹی سیدھی لکیریں سمجھ لیا جائے۔ یہ اُن کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے۔ وہ جدید اِس اعتبار سے ہیں کہ اُنہوں نے عظیم بیگ چغتائی۔ رشید احمد صدیقی۔ پطرس۔ کنہیا لال کپور۔ شوکت تھانوی اور جگر تونسوی وغیرہ سے بالکل الگ اپنی راہ نکالی ہے۔ یہ راہ "تکلف برطرف" سے مختلف ہے۔ جیسے خود ہنسنے اور دوسروں کو ہنسانے میں اُنہیں کچھ شرم سی آتی ہو۔ مگر نتیجہ میں یہ شرم "بالائے طاق" رہ جاتی ہے۔ وہ لاکھ شائستہ اور مہذب بات کریں مگر اُن کا قاری مسکرائے گا ضرور۔ ہنسا جائے گا اور سوچا جائے گا کہ عجیب بات ہے مضمون نیچے اور فٹ نوٹ اُوپر۔ "چہرے اور ترکاریاں"۔ بھلا اِن کا تطابق بھی کوئی بات ہوئی؟ لیکن اِسے کیا کیجئے، کہ یوسف ناظم آپ کو ٹماٹر کی طرح گول اور چقندر کی طرح سُرخ بنا دیں گے۔ اِن دو مزاح پاروں کے علاوہ اِس کتاب میں ہدایت نامۂ سامعین۔ خلعتِ فاخرہ۔ دِن منانا۔ شاعروں کی اِنسائیکلو پیڈیا۔ پھلوں کے بیان میں۔ موازنۂ قیس و فرہاد۔ لقمانیات۔ ایک خط۔ مرد کی پسلی۔ مقابلۂ حسن۔ علم بڑی دولت ہے۔ گداگری۔ اشرف المخلوقات۔ برائے فروخت۔ علم سے فلم تک۔ آورینٹل ہوٹل۔ دیسیاں اور چمچے۔ علامتی اِنشایئے اور آخر میں "شکریہ" نامی طنزیہ و مزاحیہ مضامین ہیں۔ اِس شکریئے میں اپنی کتاب کی رسمِ اجراء سے مایوس ہو کر جہاں اُنہوں نے قارئین کے لئے مسکراہٹوں کا سامان بہم پہنچایا ہے وہیں صبر کی بھاری سِل اپنے سینے پر بھی رکھی ہے۔ اُنہوں نے کتابوں کی رسمِ اجراء کے سلسلے میں ایک مشفق ناصح کا رول بھی ادا کیا ہے۔ یوسف ناظم کی یہ نصیحتیں بڑی اِنتقامی ہیں۔ اگر یہ نصیحتیں دماغوں میں بیٹھ جائیں تو کتابوں کی اِجرائی رسمیں ہی بند ہو جائیں۔ اور غالباً وہ یہی چاہتے بھی ہیں۔ کتاب کی رسمِ اجراء کے سلسلے میں اُنہیں جو بات سب سے زیادہ پسند ہے وہ یہ ہے۔

"کتاب کی رسمِ اِجراء کے جلسے کی جو بات مجھے سب سے زیادہ پسند آئی، وہ خود مصنّف کی خدمت میں پیش کئے جانے والا منظر ہے۔ اِس عمل سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی یا تو خود اپنے بچے کو گود لے رہا ہے یا اپنی ہی بیوی سے دوبارہ عقد پڑھوا رہا ہے۔"

"فٹ نوٹ" طنزیہ و مزاحیہ ادب میں قابلِ قدر کتاب ہے۔ ۱۶۰ صفحات۔ قیمت تین رُوپے پچیس پیسے۔ نصرت پبلشرز، چوک لکھنؤ

۱۹۶۹ء کی منتخب شاعری

مرتبہ ———— کمار پاشی۔ پریم گوپال متل

۱۹۶۷ء سے اِس سالانہ شعری انتخاب کا سلسلہ جاری ہے اور بقول مُرتّبین اِس کی اچھی پذیرائی ہوئی ہے۔ ۱۹۶۹ء کی منتخب شاعری کے اِس مجموعہ میں ۲۵ نظمیں اور ۵۳ غزلیں شامل کی گئی ہیں۔ آخر میں احمد آباد کے فساد سے متعلق پانچ منظومات ہیں۔ بلراج کومل کی نظم اِس حصّہ میں خاص ہے۔

مُرتّبین نے پیش لفظ میں لکھا تو یہ ہے کہ یہ اِنتخاب کسی طے شُدہ نظریئے کے تحت نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن شعراء کے ناموں اور اُن کی تخلیقات سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ہی انداز (TYPE) کی نظمیں غزلیں منتخب کی گئی ہیں۔ اِنتخاب میں جدیدیت کا رُجحان غالب ہے، مگر یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں۔ شعری اِنتخاب کا تعلق پسند اور نظر سے ہے فنّی اور فکری اِعتبار سے جو کمزور نظمیں اور غزلیں اِس میں شامل ہیں ہو سکتا ہے مُرتّبین کی نظر میں وہ اعلیٰ درجے کی ہوں۔ کئی نظمیں غزلیں واقعی اِنتخاب ہیں اور اُن سے اُردو شاعری کے اندھیروں میں روشنی کی کچھ اُمید بندھتی ہے۔ آج کا شاعر بڑا زُود رنج اور زُود اِحساس ہے۔ تبصرہ میں خوبیوں اور خامیوں کا نام بنام اِظہار شعراء کی طبعِ نازک

پرگراں گزرے گا۔ یہی کیا کم ہے کہ شعری انتخاب کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ مرتبین اگر آئندہ وسعتِ نظر سے کام لیں تو ڈیڑھ دو سو صفحات میں وہ ایک نمائندہ انتخاب پیش کر سکتے ہیں۔ اچھی شاعری کے انتخاب کے لئے ایک وسیع بورڈ کی ضرورت ہے۔ موجودہ حالات میں اُردو شعر و ادب کی بقا کے لئے "نظریات" کے اختلاف کو ضد کی حد تک نہیں بڑھانا چاہئے۔ یہ دَور جانبداریوں اور مصلحت پسندیوں کے بجائے گوش و ہوش کا متقاضی ہے۔ مُلک میں صرف اِسی شاعری کو پڑھنے اور پسند کرنے والے نہیں ہیں جو اِس انتخاب میں پیش کی گئی ہے۔ کیوں نہ ایسا انتخاب ہو جسے زیادہ سے زیادہ لوگ پسند کریں۔

ضخامت ۹۶ صفحات۔ قیمت تین روپے (جو زیادہ ہے)
ناشر:۔ پی کے پبلیکیشنز۔ ۱۷/۱۵ آریہ سماج روڈ۔ قرولباغ۔ نئی دہلی۔

دِلّی جو ایک شہر تھا!

از ——— راجندر ناتھ ہانڈا

راجندر ناتھ ہانڈا، مُلک کے ممتاز لوگوں میں سے ہیں۔ وہ مختلف بڑے سرکاری عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ اِن دِنوں وزارتِ اطلاعات و نشریات میں "آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی" کے عہدے پر متعیّن ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد اُنہوں نے اپنی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا اور انگریزی اخبار "ٹریبون" سے ۷ سال تک منسلک رہے۔ ۱۹۴۷ء سے سرکاری ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا۔ مگر بنیادی طور پر چونکہ وہ ادیب اور صحافی تھے اس لئے اُن کا قلم تصنیف و تالیف میں بھی لگا رہا۔ اُن کی چھ کتابیں ہندی میں اور تین انگریزی میں شائع ہو چکی ہیں۔ انگریزی میں اُن کی دو کتابیں اور بھی زیرِ ترتیب و طبع ہیں۔ اپنی ہندی کہانیوں کا انتخاب وہ انگریزی میں ترجمہ کر چکے ہیں۔ ہندی میں اُن کی کہانیوں کے کئی مجموعے چھپے ہیں۔ ہانڈا صاحب ہندی، انگریزی اور اُردو کے علاوہ بنگالی، گجراتی، مراٹھی، فرانسیسی اور فارسی زبانوں سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ وہ مشرقی روایات کا بہترین نمونہ ہیں۔ اور ہندوستان کے قومی مسائل سے بھی اُنہیں حد درجہ دلچسپی ہے۔

۱۹۵۸ء میں "دِلّی کے دس ورش" کے نام سے ہانڈا صاحب کی یہ کتاب ہندی زبان میں شائع ہوئی تھی۔ اِس میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء تک کے دِلّی کے حالات ہیں۔ اُنہوں نے پُرانی دِلّی بھی دیکھی اور تقسیم کے بعد کی نئی دِلّی بھی۔ وہ دِلّی کے تاریخی پس منظر اور اُس کے سیکڑوں سال پُرانے تہذیب و تمدّن سے بھی واقف تھے۔ ہندوستان کے اِس سب سے اہم تاریخی شہر کی یہ کہانی ہانڈا صاحب نے مختلف عنوانات کے تحت بڑے ہی دلچسپ انداز میں لکھی ہے۔ ہندی کا یہ ایڈیشن بہت مقبول ہوا تھا اور نایاب ہو گیا تھا۔ اِس کتاب کا کئی دیگر علاقائی زبانوں میں بھی ترجمہ ہوا اور اب بیس سال بعد اِس کا اُردو ایڈیشن نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔

"دِلّی جو ایک شہر تھا عالم میں لاجواب"

ہمیشہ لاجواب رہا ہے۔ اِس کی مختلف جھلکیاں ہانڈا صاحب کی کتاب میں ملتی ہیں۔ ہر دَور کی دِلّی پر کتب و رسائل میں بہت سا مواد مِل جاتا ہے۔ ہانڈا صاحب نے جس دَور کی تصویر کشی کی ہے وہ دِلّی کا اہم ترین دَور تھا۔ دوسری جنگِ عظیم چھڑ چکی تھی۔ ہندوستان آزاد ہونے کے لئے پوری طرح تیار ہو چکا تھا۔ برطانوی حکومت کا اقتدار لرز رہا تھا۔ اِن ہی دس سال میں کیلنڈر کی سب سے اہم تاریخیں ہیں۔ اِن ہی میں تقسیمِ مُلک کا المیّہ بھی شامل ہے۔ ہانڈا صاحب نے ایک ایک بات کو دِل نشین اور مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔ تبصرہ نگار کو بھی اُس دَور کی دِلّی سے واقفیت ہے اور یہ واقعہ ہے کہ ہانڈا صاحب نے صداقت اور حقیقت پسندی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ جو واقعات بھی اُنہوں نے قلم بند کئے ہیں، وہ حقیقی ہیں۔ اور زیبِ داستاں کے طور پر الحاقی باتیں کم ہی ہیں۔ "جب دودھ روپیہ کا نو سیر تھا۔" کے وقت سے "قومی یک جہتی اور اقلیتیں" تک جتنے عنوانات کے تحت ہانڈا صاحب نے لکھا ہے اُن میں بہت سا تاریخی، سماجی اور سیاسی مواد سمٹ آیا ہے۔ یہ انشائیہ اور رپورتاژ قسم کی

تحریریں ہیں۔ اِن کا تدریجی بہاؤ قاری کو نظر ہٹانے نہیں دیتا۔ اگست ۱۹۴۷ء۔ آزادی کا نزول۔ قیامت کا منظر۔ دو سلسلی غیر ہیجے۔ اُفق پر دو سورج۔ قافلے کا کوچ۔ بڑے دِل گداز مضامین ہیں۔ "دِلّی اور اُردو ادب" کے عنوان سے بھی اُنہوں نے کچھ لکھا ہے۔ مگر اُس دَور کی دِلّی میں اُردو زبان اور اَدب سے وابستہ عام تہذیب کو وہ پُوری طرح تو اُجاگر نہیں کر سکے ہیں۔ پھر بھی کچھ مشہور شخصیتوں اور چند واقعات کا اُنہوں نے ذکر کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ دِلّی کے اُردو حلقوں سے پانڈا صاحب کا کوئی وسیع رابطہ نہیں رہا۔ اُن کے بعض اَذکار سے اجنبی پن سا ٹپکتا ہے۔

آخری دو مضامین "قومی یک جہتی اور اقلیتیں"۔ اور "زبان، ایک دشوار مسئلہ" میں پانڈا صاحب نے جو کچھ لکھا ہے آج سے دس سال پہلے اُن کی طرزِ فکر سے شاید اتفاق کر لیا جاتا۔ لیکن اب حالات بالکل مختلف ہیں۔ "زبان، ایک دشوار مسئلہ" میں اُنہوں نے "ہندی اور انگریزی" کی صورتِ حال اور ان کے ADJUSTMENT ہی سے زیادہ بحث کی ہے۔ چند علاقائی زبانوں کی ترقیوں اور اُن کے علاقائی اعتبار سے ہندی سے آگے بڑھ جانے کا بھی ذِکر ہے۔ لِسانی مسئلے کا حل اُن کے نزدیک رومن رسم الخط اختیار کر لینا ہے یا پھر شمال اور جنوب کی تمام زبانوں کو صرف ہندی رسم الخط میں لکھا جاتا۔ اُن کے تجزیئے اور دلائل میں وزن ضرور ہے اور اِس سے اُن کے لِسانی شعور کا بھی پتہ چلتا ہے۔ لیکن دس سال میں زبانوں کا مسئلہ ایک عقدۂ لاینحل بن گیا ہے۔ غریب اُردو زبان کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ پانڈا صاحب کے مضمون میں بھی اُس کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

کتاب میں پروفیسر محمد مجیب کا مختصر پیش لفظ اور غلام ربانی تاباں کا لکھا ہوا تفصیلی تعارف ہے۔ اچھی کتابت اور آفسیٹ کی نفیس طباعت نے کتاب کو بہت خوبصورت بنا دیا ہے۔ بقول غلام ربانی تاباں:

> ہر مضمون پر اُنہوں نے اپنی دِل فریب و دلنواز شخصیت کی چھاپ لگا دی ہے۔ اِس کے جملوں میں انسانیت کے درد سے تڑپتے ہوئے دِل کا سوز و گداز رُوح کی بے چینی اور فکر کی گہرائی و گیرائی کو سمو دیا ہے۔"

۲۵۸ صفحات۔ قیمت پانچ روپے، ملنے کا پتہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی بمبئی

جامِ جم

از ——— محمد ذوالنورین مرحوم

یہ مجموعۂ کلام ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا تھا۔ ذوالنورین کا اِنتقال بہت کم عمر میں ہوا، وہ کافی پڑھے لکھے، ذہین اور باذوق اِنسان تھے۔ بڑے سرکاری عہدوں پر فائز رہے، چونکہ اِس مجموعہ میں اُن کے حالاتِ زندگی شامل نہیں ہیں۔ اِس لئے مزید کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مرحوم کی غزلوں کا یہ مختصر مجموعہ جس میں تقریباً پونے تین سو اشعار ہیں، اُن کی بیگم نے یادگار کے طور پر شائع کرایا تھا ——— پروفیسر احتشام حسین کے تعارف سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ مرحوم اپنے فطری ذوق سے مجبور ہو کر شعر کہا کرتے تھے۔ شعری محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ شعراء کو داد دیتے تھے۔ لیکن خود اپنی شاعری پر پردے ڈالے رکھتے تھے۔

۱۹۵۳ء میں ایک نجی صحبت میں اُنہوں نے بڑے اِصرار کے بعد اپنا کلام سُنایا اور بقول احتشام صاحب "ذوالنورین کے اشعار بہت دِل کش اور خوبصورت تھے"۔ دراصل مرحوم نے اپنی شاعری کے فطری جوہر کو خاموشی کے ساتھ نکھارا، سنوارا اور اس میں پختگی پیدا کی۔ وہ مشہور نہیں ہونا چاہتے تھے اور نہ مشاعروں کا شاعر بننا چاہتے تھے۔ اُن کے بعض اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن میں وہ چنگاری ضرور تھی جو اگر شعلہ بن جاتی تو اُردو کو ایک اچھا شاعر مل جاتا۔ ذیل کے چند منتخب اشعار سے ذوالنورین مرحوم کی فکر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

بے خودی میں نہ رہا منزلِ دِل کا بھی خیال
ہم نکل آئے تری راہ گزر سے آگے

تھی مہربان عروسِ بہاراں بہت، مگر
جب دِل کو اِمتیازِ بہار و خزاں نہ تھی

گزر ہی جائیگی یہ زندگی مگر اے دوست
ترے مزاج پہ اِس دَور کا گماں کم تھا

زندگی کی اُداس شاموں میں
یاد تیری بہت غنیمت ہے

۱۰۴ صفحات۔ قیمت تین روپے۔ پتہ۔ دانش محل امین الدولہ پارک۔ لکھنؤ۔

رفتار

(علمی، ادبی اور تہذیبی خبریں)

● خورشید احمد جامی مرحوم کی یاد میں حیدرآباد سے ایک پندرہ روزہ رسالہ برگِ آوارہ کے نام سے نکلنے والا ہے۔ اس کے مدیر محمود خاور ہیں۔ اس کا سالانہ چندہ پانچ روپے اور ششماہی تین روپے رکھا گیا ہے۔ نمونے کی کاپی کے لئے ۲۵ پیسے کے ٹکٹ بھیجے جائیں۔

پتہ:- ۴-۱-۵۳۶، ترپ بازار۔ حیدرآباد (اے، پی)

● اردو کی مشہور ادیبہ ڈاکٹر سیدہ جعفر کی دو کتابیں حال ہی میں شائع ہوئی ہیں۔ مکھکہ انجن (قبل ۱۶۳۵) قیمت پانچ روپے۔ ناشر:- لطف الدولہ اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ حیدرآباد (اے، پی)

تنقید اور انداز نظر — قیمت چار روپے

ناشر:- نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ۔

● "ساتولی" کے بعد ملک کے ممتاز ڈرامہ نگار اظہر افسر کی نئی کتاب "بھول ہی بھول" نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے شائع ہو گئی ہے۔ یہ کتاب اظہر افسر کے ایسے بارہ منتخب مزاحیہ ڈراموں کا دل کش مجموعہ ہے جو نہایت آسانی سے اسٹیج کئے جا سکتے ہیں۔ اس کی قیمت تین روپے ہے۔

● غلام مرتضیٰ راہی کا پہلا مجموعۂ کلام "لامکاں" نصرت پبلشرز۔ وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ کی طرف سے شائع ہونے والا ہے۔

● کیف احمد صدیقی کا پہلا شعری مجموعہ "گرد کا درد" جلد ہی منظرِ عام پر آنے والا ہے۔ اس کے ناشر نائشدہ کتاب گھر، شیخ سرائے۔ سیتاپور (یو، پی) ہیں۔

● مناظر عاشق ہرگانوی نے عبدالحلیم شرر کا نایاب ڈراما "میوۂ تلخ" بڑی تلاش و جستجو کے بعد مرتب کیا ہے اور یہ کتابی شکل میں نسیم بک ڈپو، لکھنؤ کی طرف سے شائع ہو گیا ہے، ۱۲۰ صفحات ہیں اور قیمت دو روپے ہے۔

● نئی دہلی ۶ جون۔ اردو کو ملک میں اس کا جائز مقام دلانے کے مطالبے کی حمایت کے لئے پارلیمنٹ کے ممبروں کا ایک کنونشن اس کے موجودہ اجلاس کے دوران ہوگا۔ ایک اردو پارلیمانی کمیٹی جناب آنند نرائن ملا کی صدارت میں بنا دی گئی ہے۔ انہوں نے ممبروں کی ایک ایگزیکیوٹو کمیٹی نامزد کی ہے۔ ممبران کے نام یہ ہیں۔

۱۔ اجیت پرشاد جین (کانگریس) ۲۔ ایس این مصرا (تنظیم کانگریس) ۳۔ اے کے گوپالن (مارکسی پارٹی) ۴۔ سُریندر ناتھ دویدی (پرجا سوشلسٹ) ۵۔ جارج فرنانڈیس (سنیکت سوشلسٹ) ۶۔ گرمکھ سنگھ مسافر (کنوینر) ۷۔ این کے سومانی۔ ۸۔ وی کے کرشنا مورتی۔ ۹۔ گرچرن سنگھ ۱۰۔ اسحاق سنبھلی۔ ۱۱۔ ڈاکٹر مسز تری بوس ۱۲۔ چندرجیت یادو ۱۳۔ آر کے سنہا ۱۴۔ اکبر علی خاں ۱۵۔ ایس اے آغا ۱۶۔ محمد عثمان عارف ۱۷۔ شیشی بھوشن

● لکھنؤ۔ یوپی کونسل میں چھیدی لال ساتھی کا وہ غیر سرکاری ریزولیشن نامنظور ہو گیا جس میں اردو کو اتر پردیش کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

ریزولیشن کو نامنظور کرتے ہوئے وزیرِ تعلیم سری پت مصرا نے کہا کہ اردو کے لئے حکومت گہری ہمدردی کے جذبات رکھتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اردو پھلے پھولے، سرکاری کام کاج میں اس کا عمل دخل قائم ہو اور اس کے ساتھ سوتیلا سلوک نہ برتا جائے۔ لیکن جہاں تک اردو کو صوبہ کی دوسری سرکاری زبان بنا دینے کا تعلق ہے۔ حکومت اس مطالبہ کو تسلیم نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اس مطالبہ کی راہ میں کئی ٹیکنیکل دشواریاں ہیں جن میں سے اولین دشواری یہ ہے کہ صوبہ میں اردو بولنے والوں کی تعداد دس فی صد ہے۔ جبکہ کسی صوبہ کو دو لسانی صوبہ قرار دینے کے لئے لسانی کمیشن کی شرط یہ ہے کہ متعلقہ صوبہ میں دوسری سرکاری زبان کے مطالبہ کنندگان کی تعداد کم از کم تیس فیصد ہو۔

● اردو کے مشہور شاعر موہن لال ساحر کا جشن انجمن عروج ادب دہلی کے زیرِ اہتمام اگست میں منایا جائیگا۔ اس کے چیئرمین شری آئی کے گجرال وزیرِ اطلاعات و نشریات، سرپرست شری وی شنکر اور کنوینر شری کنور مہندر سنگھ بیدی سحر ہیں۔

شاعر

جولائی ۷۰ء کی جھلکیاں

مقالات :

نسخۂ بھوپال
بخطِ غالب پر ایک نظر ——— ڈاکٹر ابو محمد سحر
اردو شاعری اور سیکولرزم ——— ڈاکٹر ظ ۔ انصاری
مخدوم کی شاعری ——— ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید
ادبی قسمت قصّے ——— جے ۔ سی ۔ داس
ترجمہ : نامی انصاری

کہانیاں :

تنہا تنہا ——— تاجدار احتشام صدیقی
آخری جواب ——— ہال ٹیلسن
ترجمہ : عبدالسلام بیگ
معصوم سوال ——— اقبال بلگرامی
جونک (بنگلہ) ——— اچنت کمار سین گپتا
ترجمہ : رونق دکنی

ڈراما :

مرضی ——— اظہر افسر

طنز و مزاح :

سیاسی دروغ گوئی کا فن ——— جوناتھن سوئفٹ
تلخیص و ترجمہ : احمد جمال پاشا

ناول ——— (بالاقساط)
دھرتی سدا سہاگن ——— کشمیری لال ذاکر

مشاہیر اور ممتاز شعرا کی منظومات
خطوط ۔ کتابوں پر تبصرے
ادبی و تہذیبی خبریں

(اپنے مقامی ایجنٹ کے یہاں یہ اہم شمارہ محفوظ کرا لیجئے)

مالک پرنٹر، پبلشر اعجاز صدیقی نے یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس ۲۲ نوروزجی اسٹریٹ ٹھاکردوار بمبئی ۲ میں چھپوا کر دفتر سے شائع کیا

Regd. No. Bm 244

The 'SHAIR' Bombay 8.

THE MOST POPULAR OLDEST LITERARY & CULTURAL URDU JOURNAL

(41 Years of Publication)

Publishing Dates, 15-16

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 14482/57

علامہ سیماب اکبرآبادی

کی چند حیات افروز تصانیف

کلیم عجم	(غزلیات)	چار روپیہ آٹھ آنے
سدرۃ المنتہیٰ	(غزلیات)	چار روپیہ
کارامروز	(نظمیں)	چار روپیہ آٹھ آنے
شعر انقلاب	(نظمیں)	تین روپیہ
عالم آشوب	(رباعیات)	تین روپیہ
نفیر غم	(مراثی نظمیں اور سلام)	ایک روپیہ

جلدوں پر خوبصورت اور رنگین گردپوش

(مکمل سیٹ کی خریداری پر نصف محصول ڈاک معاف)

منیجر اشاعت، مکتبۂ قصرالادب پوسٹ بکس ۳۵۲۶ بمبئی ۸

Cover printed at JAYA ART PRINTERS, Bombay-8.

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

اردو کا اکتالیس سالہ علمی ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

جولائی ۱۹۷۰ء
جلد (۴۱) شمارہ (۷)

مدیر اعلیٰ
اعجاز صدیقی

ادارۂ تحریر:
مہندر ناتھ
ڈاکٹر محمد حسن
شہاب جعفری
ندا فاضلی

ترسیلِ زر کا پتہ:
ماہنامہ شاعر
قصرالادب
بمبئی ۵ بی سی

☆

فون: ۳۵۹۹۰۴

اس شمارے میں

ڈاکٹر ظ۔ انصاری ۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر، کشمیری لال ذاکر ۔ غلام ربانی تاباں ۔ سید حرمت الاکرام ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید ۔ ہال لیتی ۔ جے ہی، داس اجنت کمار سین گپتا ۔ اطہر افسر ۔ ندا فاضلی محسن زیدی ۔ تاجدار احتشام ۔ اقبال بلگرامی اقبال ماہر ۔ خلش بڑودوی ۔ اسرار اکبرآبادی اختر بستوی ۔ یوسف اعظمی ۔ سعادت نظیر

اور دوسرے

ناول (پہلا باب)

اردو شعر و ادب کا بھارتیہ کرن

- تبصرے
- مکتوبات
- محفل اپنی ...

زرِ سالانہ ۱۰ روپے
معاونین سے ۲۵ روپے
تاعمر خریداری: ۱۲۵ روپے
ممالکِ غیر سے: ۲۵ شلنگ

فی پرچہ: ایک روپیہ

خط و کتابت کا پتہ:
ماہنامہ شاعر
مکتبۂ قصرالادب
پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ بمبئی ۵ بی سی

NIRODH

شاعر کے چار گراں قدر خاص نمبر

کرشن چندر نمبر

اُردو کے شہرۂ آفاق افسانہ نگار کرشن چندر کی شخصیت اور اُنکے ہمہ گیر فن پر ایک عظیم و حسین خصوصی اشاعت جسمیں ہند و پاک کے ممتاز اہلِ قلم کے علاوہ دوسرے ممالک کے بھی کئی مصنفین اور مفکرین نے کرشن چندر کے شاہکار افسانے، ناولوں اور ڈراموں پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ یہ نمبر کرشن چندر کی ادبی زندگی کی لافانی تاریخ ہے۔ خود کرشن چندر کے قلم سے اِس نمبر میں کئی تازہ کہانیاں اور ایک مکمل نیا ناول شامل ہے۔

اِس عظیم و ضخیم نمبر نے ہند و پاک میں مقبولیت اور پسندیدگی کی نئی روایت قائم کی ہے۔

۷۲۴ صفحات، پانچ رنگ کا نظر فریب سرورق، ۱۸ صفحات پر یادگار تصاویر، اعلیٰ کتابت و طباعت، قیمت: پندرہ روپے

گاندھی نمبر

ہندوستان کے عظیم رہنما، تحریکِ آزادی کے سب سے بڑے قائد مہاتما گاندھی کی شخصیت اُن کی زندگی اور سیاسی و سماجی کارناموں کا بھرپور جائزہ، اُردو اور دیگر زبانوں کے ممتاز قلمکاروں کے تازہ و خصوصی مضامین، ملک کی آزادی اور تقسیم کے متعلق معتبر یادداشتیں، گاندھی جی کے مضامین کا اِنتخاب، اُن کے بصیرت اَفروز مقولے، ملک کے مشاہیر شعرا کا باپو کو منظوم خراجِ عقیدت۔ کئی ابواب کے خوبصورت سرورق، گاندھی جی کی چار رنگ کی نایاب تصویر۔

گاندھی صدی پر کسی زبان نے ایسا یادگار نمبر پیش نہیں کیا۔

لاجواب سرورق ÷ ۲۸۲ صفحات

قیمت، چار روپے

غالب نمبر

غالب صدی کا بیش بہا تحفہ

غالب کی شخصیت، فن اور زندگی پر ہند و پاک کے ممتاز قلمکاروں کے تازہ و فکر انگیز تنقیدی و تحقیقی مضامین۔ غالب نمبروں کی بھیڑ میں ایک نہایت سنجیدہ، متنوّع اور منفرد خصوصی اشاعت، جسے ہندوستان و پاکستان کے تمام غالب نمبروں میں سب سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔ گیارہ ابواب، ابواب کے سرورق دو رنگ میں، آرٹ کا بہترین نمونہ، چار رنگ کی غالب کی سُنہری تصویر، غالب کی مختلف ادوار کی تمام یادگار تصاویر، غالب کے مشہور شاگردوں کی تصویریں، پُرانی کتابوں، غالب کی تحریروں اور سرورقوں کے عکس۔ ہر صفحہ پر غالب کا اسکیچ، تین رنگ کا نظر فریب سرورق، رنگین بارڈر کے ساتھ غالب کے اُردو فارسی کلام کا انتخاب۔

۶۳۰ صفحات ÷ قیمت آٹھ روپے

افسانہ و ڈرامہ نمبر

اِس نمبر میں شاہکار افسانے اور ڈرامے پیش کیے گئے ہیں۔ اس نمبر کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اسمیں اُردو کے ۱۰ افسانہ نگاروں اور ۵ ڈرامہ نویسوں کے علاوہ ہندوستان کی کئی دوسری بڑی زبانوں کے گیارہ مشہور افسانہ نگاروں کے درجہ اوّل کے افسانے اُردو میں ترجمہ کرا کے شائع کیے گئے ہیں اور ان افسانہ نگاروں کا مختصر تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔ غیر ملکی زبانوں کی دو شاہکار کہانیاں بھی اسمیں شامل ہیں۔ اُردو، ہندی، بنگلہ، مراٹھی، گجراتی، کنڑ، پنجابی وغیرہ زبانوں کے ۲۳، افسانہ اور ڈرامہ نگاروں کی تصاویر بھی شائع کی گئی ہیں۔ یہ نمبر افسانوی اَدب میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ۳۲۴ صفحات ÷ قیمت تین روپے

مکتبۂ قصر الادب، پوسٹ بکس ۴۵۲۶ بمبئی ۸ بی سی

جُرعات

ادیبوں اور صحافیوں کی کونسل برائے قومی یک جہتی و انسدادِ فسادات

شاعر کے پچھلے اداریوں میں اُردو ادیبوں اور صحافیوں کو ایک ایسی کونسل کی تشکیل کی طرف توجہ دِلائی جا چکی ہے جو قومی یکجہتی اور ملک میں بار بار ہونے والے فسادات کے اِنسداد میں معاون ہو سکے۔ فرقہ پرستوں کے منصوبے بڑے بھیانک اور پوری ہندوستانی قوم کے لئے سخت فکر و تردّد کا باعث ہیں۔ بھیونڈی اور جلگاؤں کے حالیہ دل ہلا دینے والے فسادات کے بعد مرکزی اور صوبائی حکومتوں میں بہت سے مذاکرات ہوئے ہیں، تدابیر سوچی گئی ہیں اور بعض تدابیر کو بروئے عمل بھی لایا جا رہا ہے۔ لیکن ملکی سیاست کا رُخ اور پُر تشدّد واقعات کا حال اب بھی وہی ہے جو پہلے تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ "منصوبہ بند فرقہ پرستی" کی لَے اور تیز ہو گئی ہے۔ چاہے ملک برباد ہو جائے، لیکن فرقہ پرست رہنما اپنی ضِد اور ہٹ چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ وہ ٹھنڈے دل سے ایک لمحہ کے لئے بھی اِس پر غور کرنا نہیں چاہتے کہ اِقلیتوں کے جان و مال کے تحفظ، اُن میں اِعتماد کی بحالی اور اکثریت کے پُر سکون طرزِ عمل کے بغیر ملک آگے نہیں بڑھ سکتا، نہ دوسرے ممالک کے ساتھ ساتھ چلنے اور اُن سے آنکھ ملانے کے قابل ہو سکتا ہے۔

عالم یہ ہے کہ ہر فرقہ پرست جماعت خود کو اور زیادہ مضبوط بنا رہی ہے اور عوام میں خوف و دہشت پھیلا کر اپنی برتری اور نازیت کا پرچم لہرانا چاہتی ہے۔ ہفت روزہ "حیات" دہلی کے حوالے سے "صدائے ہند" پٹنہ (۱۴ جون ۱۹۷۰ء) میں ایک نئی فرقہ پرست جماعت "انقلابی ہندو نوجوانوں کی تنظیم" کے اُن پمفلٹوں اور پوسٹروں کے متعلق صراحت دی گئی ہے، جنہیں ملک کے بہت سے علاقوں، خصوصاً اُتر پردیش اور راجستھان کے شہروں اور دیہاتوں میں تقسیم کیا گیا اور لگوایا گیا ہے۔ اِس نئی تنظیم کا ہیڈ کوارٹر شیلا دیوی اجمیر میں ہے اور شاخیں جگن ناتھ مندر احمد آباد، ہندو یونیورسٹی بنارس، دیال باغ آگرہ، پناجی گوآ اور مدراس ہوٹل کناٹ پیلس نئی دہلی میں ہیں۔ "حیات" دہلی نے ایک پوسٹر کی عکسی تصویر بھی شائع کی ہے، جس کا عنوان ہے۔

"مسلمانو! — ہندو ہو جاؤ یا بھارت چھوڑ دو۔"

پمفلٹوں اور پوسٹروں میں کی گئی اِشتعال انگیز باتوں میں سے چند اِختصار کے ساتھ درج ذیل ہیں۔

(۱) "اِنقلابی ہندو، خون سے اِنقلاب لانے کی تیاریاں کر چکے ہیں اور جیسے ہی مہا سمیتی کی ہدایات مل جائینگی تمام ہندو دشمن مسلمانوں اور قوم دشمن کمیونسٹوں کا خاتمہ کر دیا جائیگا..... اِن قوم دشمنوں کو زیادہ سے زیادہ ۱۹۷۲ء تک کا وقت دیا جا رہا ہے۔ اِس وقت تک اگر وہ اِس بات کیلئے (مذہب بدلنے) تیار نہ ہوئے تو ۱۹۷۲ء کی ہولی اُن کے خون سے کھیلی جائے گی..... تمام ہندوؤں، خاص طور پر نوجوانوں کو ہدایت دی جا رہی ہے کہ وہ اس انقلاب کیلئے خون بہانے کو تیار ہو جائیں۔ تنظیم قائم کریں۔ ہتھیار جمع کریں اور ہندو نسل کے دشمنوں کو قتل کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔"

(۲) "یاد رکھو ہندوؤ - ہندو بہادرو، اٹھ کھڑے ہو جاؤ، دنیا سے اِسلام اور پاکستان کا نام مٹا دو اور بھارت کو ایک بار پھر عظیم ملک بنا دو۔"

(۳) "ہم کیوں مذہبی غیر جانبداری کی چکّی میں پیسے جا رہے ہیں۔ اگر بھگت سنگھ اور چندر شیکھر ہماری آزادی کے موقع پر زندہ ہوتے تو کیا وہ بھارت ماتا کے ٹکڑے کرنے کی اجازت دیتے؟ کیا مدن موہن مالویہ نے کبھی یہ سوچا بھی تھا کہ آزادی کے بعد میرے بچوں کو یہ سکھایا جائے گا کہ تم (یعنی آریائی) باہر سے آئے تھے۔ اگر آج چندر شیکھر یا اُن کے کوئی بھی ساتھی زندہ ہوتے تو کیا روسی اور چینی سازش کامیاب ہو سکتی تھی؟ اے ہندوؤ! بودھوں، جینیوں اور سکھوں

اپنے اختلاف بھول جاؤ اور اس مقدس دھرتی کو ملیچھوں اور کمیونسٹوں سے بچاؤ ..... سومناتھ مندر کا بدلہ لو۔ نیند سے بیدار ہو جاؤ اور اپنی حقیقی آزادی اور عظیم بھارت کے لئے جدوجہد شروع کر دو۔"

دہلی میں ایک اور تنظیم "پرادت" کے نام سے کام کر رہی ہے۔ اس نے نازی جرمنی کے نشان "سواستیکا" کو اپنایا ہے۔ یہ تنظیم چنے ہوئے افراد کی "ڈکٹیٹرشپ" کا پرچار کرتی ہے۔ راجدھانی دہلی کی دیواریں "پرادت" کے نعروں اور "سواستیکا" کے نشان سے لپی ہوئی نظر آتی ہیں۔

ہر چند یہ باتیں بیحد انتہا پسندانہ اور جارحانہ ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان خیالات میں مزید شدت پیدا ہو جائے اور یہ رو بہ عمل آ جائیں۔ لیکن ہر حال میں اپنے عظیم ملک کو تباہی اور خلفشار سے بچانے کے لئے قوم پرست ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کو پوری طرح خبردار اور بیدار ہو جانا چاہیئے۔ فرقہ پرستوں کے ان بھیانک ارادوں اور چیلنجوں کو ناکام بنانے کی ایک ہی صورت ہے کہ قومی اور سماجی سطح پر مل جل کر تن دہی سے کام کیا جائے۔ اس وبا کو پھیلنے سے روکا جائے اور ہندوستانی عوام کو حقائق سے آگاہ کیا جائے۔

دنیا میں خیر و شر کی طاقتیں ساتھ ساتھ رہی ہیں۔ لیکن شر پسند طاقتوں پر خیر پسند طاقتوں کو ہمیشہ فتح ہوئی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ ملک میں سنجیدہ، امن پسند، منصف مزاج، روادار اور قومی یک جہتی کو چاہنے والے لوگوں کی تعداد فرقہ پرستوں سے پچاس گنا زیادہ ہے۔ لیکن اب تک انہیں بیدار اور فعال نہیں بنایا گیا ہے۔ یہ مدوجزر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، مگر خاموش ہیں۔ آج فرد بالکل بے بس ہے۔ جب تک اجتماعیت پیدا نہ ہو، کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔

"ادیبوں اور صحافیوں کی کونسل برائے قومی یک جہتی و انسدادِ فسادات" کی تجویز کا جواب اُردو کے بڑے ادیبوں اور صحافیوں کی طرف سے تو نہ ملا۔ لیکن بعض اداروں اور افراد نے اس تجویز کی تفصیلات چاہی ہیں۔ بعض شہروں میں تھوڑا بہت کام شروع بھی ہو گیا ہے۔ لیکن یہ ایک مضبوط تنظیم اور واضح لائحہ عمل کے بغیر ہی ہو رہا ہے۔ جو سخت طوفان آ چکے ہیں یا اب جن کے آنے کا خطرہ ہے وہ زبردست تنظیم اور مسلسل جدوجہد چاہتے ہیں۔ اس کے لئے ایک آسان، ہمہ گیر اور موثر لائحہ عمل کی ضرورت ہے۔

کونسل کے لائحہ عمل کا ابتدائی خاکہ یہ ہے۔

(۱) ہر شہر میں ہر زبان کے ممتاز اور بااثر ادیبوں اور صحافیوں پر مشتمل پہلے شہری مرکزی کونسل بنائی جائے (داعی اُردو کے ادیب اور صحافی ہوں)

(۲) مرکزی شہری کونسل زونل کونسلیں بنوائے۔ اور زونل کونسلیں اپنے علاقوں کے محلّوں میں کونسل کی برانچیں قائم کرائیں۔

(۳) مرکزی شہری کونسل شہر میں کونسلیں بنوانے کے بعد قصبوں اور دیہاتوں میں ان کا جال پھیلائے۔

(۴) زونل کونسلوں اور بستیوں کی برانچ کونسلوں کے لئے مقامی حالات کے مطابق لائحہ عمل بنایا جائے۔

(۵) مرکزی شہری کونسل زونل کونسلوں کی نگراں کار ہو اور زونل کونسلیں برانچ کونسلوں کی۔

(۶) ہر مہینے، ہر محلّے اور ہر بستی میں ایک جلسہ ضرور ہوا کرے، جس میں مرکزی اور زونل کونسلوں کے لوگ شریک ہوں۔ یہ بستی اور محلّے کے عوام و خواص سے خطاب کریں۔ لوگوں کو سماجی فلاح و بہبود، پیار محبت سے مل جل کر رہنے، اچھے شہری اور محبِ وطن بننے کی تلقین کریں۔ ہر محلّے کی کونسل اپنے محلّے میں امن و امان قائم رکھنے کی ذمہ دار ہو۔ قریبی پولیس چوکیوں کے افسروں اور ماتحتوں سے کونسل کے ممبران کو متعارف کرا دیا جائے تاکہ وقتِ ضرورت پولیس سے مدد لی جا سکے۔!

(۷) ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور دیگر فرقے اپنے اپنے علاقوں میں ایک دوسرے کے تہواروں اور تقریبوں میں دل کھول کر حصّہ لیں۔ مختلف مذاہب کے بچّوں کو ایک ساتھ کھیلنے کودنے دیا جائے۔ زبانوں کے تناؤ کم کئے جائیں۔ ایک دوسرے کی زبان کو سیکھا جائے۔

(۸) قومی سطح پر بغیر ٹکٹ کے مختلف علاقوں میں ڈراموں، کوی سمیلنوں، قوالیوں اور دوسرے کلچرل پروگراموں کا اہتمام کیا جائے۔

اعجاز صدیقی

سیدہ حرمت الاکرام

فساد و فتنہ سراپا بنے ہوئے لوگو!
ہمہ شرر، ہمہ شعلہ بنے ہوئے لوگو!
یہ آستیں کہ ہے جس میں چھپا ہوا خنجر
تمہارے دستِ جفا سے نظر چراتی ہے
جواب دو، کبھی تم کو بھی شرم آتی ہے؟
سیاہیوں کے یہ دھبے زمیں کے ماتھے پر
یہ نفرتوں کا دھواں، جس میں گم ہے روحِ بشر
تم اپنے آپ کو ڈھونڈو تو پا نہیں سکتے
منافرت کا یہ صحرا ہے بیکراں کتنا!

تمہاری روح کہ تھی جلوہ گاہِ مہر و خلوص
درندگی کے اندھیروں پہ فخر کرتی ہے
یہ کیوں؟ جواب تم اس کا نہ دو تو بہتر ہے
کہ اس جواب کا ہر لفظ ایک خنجر ہے
کہ اس جواب میں ہے سازشوں کی بو پنہاں
کہ اس جواب میں انساں کا ہے لہو پنہاں
کہ اس جواب سے دل اور کانپ جاتا ہے
تمہاری "شوخ بیانی" سے خوف آتا ہے

خبر بھی ہے کہ یہ طوفاں ہے کس قدر بھاری؟
تمہیں کہو کہ یہ محفل کے جھلملاتے چراغ
لوئیں ہیں جن کی نہیں پختگی کا نور ابھی
تھپیڑے تند ہواؤں کے سہہ بھی پائیں گے؟

مگر جواب تم اس کا نہ دو تو بہتر ہے
کہ اس جواب کا ہر لفظ ایک خنجر ہے
اور اس گھڑی ہمیں خنجر نہ چاہیئے لوگو!
یہ وقت اور ہے، کچھ اور ہی یہ ساعت ہے
جلاؤ پیار کے، اخلاص کے دیئے لوگو!
قدم قدم پہ محبت کے پھول برساؤ
اِک ایک دل کو شمیمِ وفا سے مہکاؤ
اِک ایک دل وطن و قوم کی امانت ہے
عظیم وقت کے تیور ہیں اور کچھ، دیکھو
جو وقت کو نہ سمجھ پائے دکھ اٹھاتا ہے
خود اپنی راہ میں کانٹے کوئی بچھاتا ہے؟
کہ گھاؤ روح کے اندر ہیں اور کچھ، دیکھو
یہ گھاؤ کرتے ہیں تم سے تقاضا مرہم کا
مگر تمہارے لبوں پر ہے ذکرِ تیغ و سناں
تمہارے دستِ جفا سے ہے زندگی لرزاں
ہے رنگ اور تمہارے مزاجِ برہم کا
تم اپنے زخموں پہ نشتر چلا کے نازاں ہو!
خود اپنی راہ میں کانٹے بچھا کے نازاں ہو!
ڈرو کہ گردشِ دوراں نہ ایسا دن لائے
اٹھاؤ ہاتھ میں تم آئینہ تو شرم آئے!
ڈرو کہ فیصلہ تاریخ کا کڑا ہوگا!
عظیم وقت کا ہر لمحہ آئینہ ہوگا!
سوال کرتا ہے انسانیت کا مستقبل
جو تم رہے یونہی خنجر بکف تو کیا ہوگا؟

مقالہ

ڈاکٹر ظ۔ انصاری

اُردو شاعری اور سیکولرزم

جو لوگ اُردو زبان نہیں جانتے، اُن کی زبانی بھی سُننے میں آتا ہے کہ اُردو شاعری ہے بڑی مزے کی چیز۔ زبان کا مزہ تو وہ جانے جو زبان کی اُونچ نیچ اور پیچ و خم سے واقف ہو۔ لیکن وہ جو اِس کے سوا مزہ ہے وہ لفظوں کی آواز، آوازوں کے اُتار چڑھاؤ اور لفظوں اور خیالوں کے ساتھ آزادانہ برتاؤ کا ہے۔ یہ آزادانہ برتاؤ ہی اصل میں سیکولرزم کی جڑ ہے۔ اور اُس کے پنپنے کی شکتی ہے۔

یونان کی شہری ریاستوں کو اب ڈھائی ہزار برس ہوتے ہیں، دیمقراطیس نے مالکوں کی جمہوریت (ڈیماکریسی) سوچی تھی اور افلاطون اور اُس کے بعد ارسطو نے ایسی ری پبلکوں کا خواب دیکھا تھا، جس میں عقیدوں کے اختلافات سے کوئی فرق نہ پڑے۔ ہمارے یہاں تقریباً اُسی زمانے میں سمراٹ اشوک نے اپنے وہ حکم نامے تیار کرائے جو پتھروں پر کھود کر مُلک مُلک پہنچائے اور لگائے گئے۔ اُن کے ذریعے شہریوں کو دین دھرم کی آزادی کے ساتھ برابر کے حق دیئے گئے تھے۔

فریڈرک دوم نے ہیروشیا میں جب پاپائے رُوم سے نافرمانی کی تو یورپ میں قوموں کی جغرافیائی حد بندی کے ساتھ ساتھ رُوم کی براہِ راست فرماں برداری سے آزاد ہو کر قومی چرچ بنانے کا راستہ بھی ہمیشہ کے لیئے کھُل گیا۔ ۱۴ ویں صدی ہی سے کلاسیکی لاطینی اور یونانی زبانوں کی جگہ جرمن، فرانسیسی اور انگریزی زبانوں نے لینی شروع کر دی۔ کاغذ اور چھاپہ خانے کے استعمال سے پندرھویں صدی میں نہ صرف موڈرن قومی زبانوں کو بڑھاوا ملا، بلکہ خود مذہب میں آزادانہ خیالات کا پھیلاؤ ہونے لگا۔ بائبل کا پہلے انگریزی اور پھر جرمن زبانوں میں ترجمہ ہونا اور پچاس برس کے اندر اُس کا گھر گھر پہنچنا تھا کہ پوپ کے مقابلے میں انجیل کو رہنما قرار دینے کی تحریک چل پڑی۔ پھر اِن ترجموں میں اختلاف ہوا اور تفسیروں کے اختلاف سے مذہبی آزاد خیالی کو اور ہوا ملی۔ جرمن سُدھار وادی پادری لُوتھر اور فرانسیسی روشن خیال عالم کالوِن دونوں نے اپنے اپنے طور پر باغیانہ تحریکوں کی رہنمائی کی اور جیتے جاگتے ذہنوں کو روشن خیال اور آزادی طلب شہری کے درمیانی طبقے کی مدد سے یہ حوصلہ ہُوا کہ زندگی اور ذہن دونوں کے پاؤں سے پُرانی بھاری زنجیر کا لوہا گلا ڈالے یعنی ایک طرف تو انتظامِ حکومت یا سرکاری مشنری پر سے دینی عالموں کا قبضہ یا بادشاہت اور عبادت کا گٹھ جوڑ ناکام کر دیا جائے۔ دوسری طرف خدا اور بندے کے درمیان کوئی اور طاقت حائل نہ رہے۔ اِن تحریکوں نے دینی اختیارات کو سماجی اور سیاسی طاقت ماننے سے انکار کر دیا اور دین یا عقیدے کو خُدا اور بندے کا باہمی معاملہ قرار دیا۔

سائنس کی تیز رفتار ترقی سے پہلے پہلے اِن تحریکوں کے پیچھے MYSTRISM کی دینی تبلیغ کام کر رہی تھی، جو ایشیا میں ہزار برس پہلے تصوّف کے نام سے پھیل چکی تھی۔ کہیں ویدانت کے نام سے "مَن و تو" کا فاصلہ کم کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ گیان مارگ کی جگہ بھگتی مارگ نے عام لوگوں میں بے تاج و تخت کی بادشاہت کو عام کیا جو بڑی خاموشی سے، صبر و سکون سے، مانگ رنگ یعنی نشتر سے نہیں، مرہم سے ایک پُرانے ناسُور کو کاٹ کر ذہنوں اور جسموں کی غلامی مٹا رہی تھی۔

اُردو شاعری نے انھیں سنت صوفیوں اور فقیر منش ویدانتیوں کی گود میں آنکھ کھولی ہے اور مزے کی بات یہ کہ جب شاہی دربار میں فارسی اور سنسکرت کی سرپرستی ہوا کرتی تھی، یہ بیچاری اُردو شاعری جنوبی علاقے میں مراٹھی اور تیلگو کے سائے میں دکنی کے نام سے پروان چڑھی۔ میلوں ٹھیلوں میں، مٹھوں اور خانقاہوں میں، ہاٹ بازار میں، رام داس اور نام دیو کے ترجموں کی صورت میں، اشلوکوں اور آیتوں کے دیسی روپ میں فارسی کے بڑے صوفی شاعروں کے عام پسند خیالات کی ترجمانی کی شکل میں اس نے دِلوں میں گھر کیا اور بیجاپور اور گولکنڈہ کے شہزادوں نے اسے نوک پلک سے سنوارا تو باقاعدہ ایک ایسی زبان کی شاعری بن کر نکھری جس میں گرامر شمال کی کھڑی بولی جیسی تھی اور لفظ کچھ دیسی کچھ بدیسی۔ زیادہ سے زیادہ رسیلے اور سمجھ میں آنے والے۔ عقیدہ اس کا کچھ نہ تھا۔ کئی طرح اور کئی زمینوں کے آزادانہ عقیدے اس میں آکر مل گئے تھے۔

ابراہیم عادل شاہ نے ۱۷ راگوں میں ۵۹ گیتوں کا اپنا شاعرانہ مجموعہ "نورس" آج سے ساڑھے چار سو برس پہلے شائع کیا تو فارسی کے شاعر ظہوری نے اس کا دیباچہ لکھا اور کتاب کے نام کی وجہ بیان کرتے ہوئے یہ جتایا کہ ایک تو یہ فارسی لفظ ہے جس کے معنی ہیں نئی کلی یا تازہ پھل، پھر دیسی زبان میں یہی नवरस یا نازہ رس ہے اور پرانے زمانے سے ہندوستانی ودوانوں نے انسانی جذبات کو نورسوں میں بانٹا ہے۔ اور اس کتاب میں کئی رسوں کو راگ راگنی کا روپ دیا گیا ہے۔ ابراہیم عادل شاہ اپنی بادشاہی کے زمانے کی سب سے کامیاب ادبی کوشش کو یوں شروع کرتا ہے۔

नवरस سوا جگ جگ جوتی انڑ سرو گنی
پوست سرستی ماتا ابراہیم پرساد بھئی دُنی

(सरसवती)

(اے سرسوتی ماں تم نے ابراہیم پر اپنا دُگنا فضل کیا ہے) شمال میں یہ زبان بولی تو جاتی تھی اور اس میں فارسی، عربی، ترکی کے بہت سے الفاظ بھی گھل مل گئے تھے، لیکن اُس نے ابھی ادبی رنگ روپ نہ نکالا تھا۔ آج سے ساڑھے چھ سو برس پہلے خسرو سے یہ شعر منسوب کیے جاتے ہیں

"شبانِ ہجراں دراز چوں زُلف و روزِ وصلت چو عمر کوتہ"

ترجمہ (جُدائی کی راتیں اُس کی زُلفوں کی طرح لمبی ہیں۔ ملنے کا دِن عمر کے مثال بہت چھوٹا ہے)

"سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں"

اَودھ کے علاقہ کاکوری کے رہنے والے ایک شاعر سعدی کاکوروی نے جو اکبر کے زمانے میں زندہ تھے، اسی قسم کی کوشش کی لیکن وہ عام چلن یا TRADITION نہ بن سکی۔

سعدی طرح انگیختہ شیر و شکر آمیختہ
دَر ریختہ دُر ریختہ ہم شعر ہے، ہم گیت ہے

شاعر کہتا ہے کہ اُس نے ایک بنیاد ڈالی ہے، دودھ میں شکر گھولی ہے، 'ریختہ' میں موتی بکھیرے ہیں۔ یہی شعر بھی ہیں اور گیت بھی ——— یعنی اب سے چار سو برس پہلے جب اُردو نام کی کوئی زبان نہ تھی۔ شاعری کے اِس طرز کو جو شعر بھی ہے اور گیت بھی، جیسیں مقامی رنگ بھی ہے اور ولایتی رنگ بھی 'ریختہ' کہا جاتا تھا۔ غالب کے وقت یا اب سے سوا سو برس پہلے تک ریختہ کہتے تھے۔ فارسی محاورے میں ریختہ کے معنی ہیں اِدھر اُدھر سے چھیلا ہوا، کترا ہوا، کریدا ہوا یا گرا ہوا۔ یہ کرید کرید کر نکالنا، گرانا اور ملانا کم و بیش چار سو برس چلتا رہا اور مہاراشٹر او تلنگانہ کے اُن علاقوں میں چلتا رہا جو فارسی زبان و ادب کے شمالی مرکز دِلّی، آگرہ اور لاہور سے بہت دُور تھے جہاں سنت صوفیوں کے حلقے

یا اُردو کی محفل میں بیٹھنے والے زیادہ تر ہندوستانی تھے، ایرانی یا تُرک نہیں تھے۔

عبداللہ قطب شاہ "بسنت کی رُت" پر اپنی نظم یُوں تمام کرتا ہے ؎

نبیؐ کے صدقے عبداللہ سلطان　　عجب اوتار برس ہے جگ میں آیا

ویلور کا شاعر وَلی آج سے ۳۰۰ برس پہلے "رتن و پدم" کا قصّہ شروع کرتے وقت اِن سُروں میں الاپتا ہے

خدایا تُو ہے پاک پروردگار　　نرنکار داتار واچھی اتار

مُقیمی، اورنگ زیب کا ہم عصر دکنی شاعر خدا سے خطاب کرتا ہے ؎

رحیما تُو خلّاق و رحمان ہے　　نرنکار بے چوں و سُبحان ہے

اُردو شاعری کی پہلی شکل یہی ریختہ تھی اور ریختہ کے مزے لینے والوں میں کئی کئی مذہبوں اور عقیدوں کے لوگ ہُوا کرتے تھے۔ یہ ہے مزاج جو اُردو شاعری کی گھُٹی میں پڑا ہے۔ کہنا چاہیئے کہ مذہبی اور سماجی آزاد خیالی، علاقے اور ایک محدود زبان کے دائرے سے باہر نکلنے کی اَدبی کوشش نے بڑھتے بڑھتے اُردو شاعری کا رُوپ ریکھا تیار کی ہے۔

جب دِلّی اور پُونا کی بگڑتی اور بنتی سلطنتیں لڑ رہی تھیں، اُس وقت دِلوں کو مِلانے والے اُردو شاعر اِسی لہجے اور اِسی زبان میں اپنے کلام کا مجموعہ لے کر اورنگ آباد سے دِلّی پہونچے اور فارسی لکھے پڑھے شاعروں نے اِس کلام کو سُنتے ہی مان لیا کہ "ریختہ" نام کے اسٹائل یا زبان سے شعر کہا جا سکتا ہے اور کہنا چاہیئے۔

خُسرو نے ساڑھے چار سو برس پہلے جو دعویٰ کیا تھا کہ مَیں، تُرک بچّہ سہی لیکن ہندوستانی شاعر ہوں اور اپنی زبان میں شکر گھول رہا ہوں۔ اِس دعوے کی سچائی پر فارسی اور بھاشاؤں کے عالم خانِ آرزو نے زور دیا اور کہا فارسی چھوڑ دو، اِس اپنی زبان میں شعر کہو۔ آخر اُن کے سوتیلے بھانجے میر تقی میر نے اپنی عظیم الشان شاعری سے ثابت کر دکھایا کہ اوّل تو مَیں سند ہوں، پھر یہ میری زبان ہے ؎

گفتگو ہم سے ریختہ میں نہ کر
یہ ہماری زبان ہے پیارے

سوچنے کا مقام ہے کہ ہندوستان میں غیر مذہبی حکومت، آزادانہ عقیدے کے پھیلاؤ اور اُردو شاعری کی عُمر ایک ہے۔ وَلی دکنی محمد شاہ کے زمانے کا شاعر ہے، جسے اپنی آزاد خیالی، عیش پسندی اور آزادانہ برتاؤ کی بدولت محمد شاہ رنگیلے کہا جاتا ہے۔ اِس کے انتقال کو اب ڈھائی سو سال ہو گئے۔ کیا زبان، کیا لہجہ اور کیا خیالات، سب ہیں دین دھرم کے اختلاف اور دھرم اور حکومت کے میل سے ایک سرکشی پائی جاتی ہے۔ اِس میں فارسی کی رِندانہ اور صوفیانہ شاعری کا بھی اِتنا ہی حصّہ ہے، جتنا دکن کی سرزمین پر بیجاپور، گولکنڈہ اور احمد نگر کے سنتوں، صوفیوں اور فن کار یار باش شہزادوں کی زندگی اور چلن کا ؎

کیا شیخ، کیا برہمن، جب عاشقی میں آوے
تسبی کرے فرامُش، زنّار بھُول جاوے

فارسی کا مشہور عالِم اور شاعر ٹیک چند بہار کہتا ہے ؎

وہی اِک ریسماں ہے جس کو ہم تم تار کہتے ہیں
کہیں تسبیح کا رشتہ کہیں زنّار کہتے ہیں

تسبیح اور جنیؤ کا ایک ہی تاگا ماجا پر جا کے فاصلے اور عقیدے کے اختلاف کو کھینچ کر ایک طرف کر دیتا ہے۔ ولی کے وارث ہیں سراج اورنگ آبادی، جن کی یہ غزل آج تک گائی جاتی ہے ؎

خبرِ تحیرِ عشق سن، نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ وہ تو رہا نہ وہ میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

یہ ایسی بے خبری ہے جو بہت باخبر ہے: یہ ہے میں اور تو کے اختلاف سے بے خبری۔ یہ اُس عشق کی خبر سنائی جا رہی ہے جو آدمی اور اُس کے معبود کے درمیان، خدا اور بندے کے درمیان کسی، درطاقت کو یا دیوار کو نہیں مانتا۔ کینہ سے صاف سینہ ہی خدا کی جلوہ گاہ ہے، اپنا پرایا کوئی نہیں۔ یہ ہے وہ فکری لائن جس کی فلسفیانہ بنیاد افغانستان کی پہاڑیوں سے نیچے محی الدین ابن عربی نے ڈالی تھی۔ جنوب میں شنکر آچاریہ نے، جسے بعد میں رامانج نے عقل واستدلال کے بجائے دھیان اور پریم کی طریقت پر ڈال دیا تھا۔ شروع کے بولوں سے لے کر آج تک کی اُردو شاعری اسی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔

بہرحال اُردو شاعری اُسی صاف کیئے ہوئے ریختے کا نام ہے جو محض زبان کے طرز میں نہیں، خیالات کی پینچ اور ذہن کے جھکاؤ میں بھی ریختہ ہی ہے جس نے ہند ایرانی تہذیب کا بہترین رس پیا ہے اور غالب جیسا فارسی پر جان چھڑکنے والا شاعر آخر اُس پر فخر کرتا ہے

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کر ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

مذہبوں، عقیدوں کے بارے میں یہ آزاد خیالی اور کثرت میں وحدت کی یہ تلاش یورپ کی فکری اور ادبی تحریکوں کی طرح خود ہمارے کلچر میں بھی انسان کو وکیتی ([illegible]) یا فردِ واحد کو آبرو مند دیکھنا چاہتی ہے۔ یہاں عقیدے کی بناوٹ یا حکومت کی بناوٹ کے مقابلے میں انسان کو زیادہ عزیز رکھتی ہے۔ میر نے کہا تھا اور ہر زمانے کے صفِ اوّل کے اُردو شاعروں نے اِس خیال کی تائید کی ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے اِنسان نکلتے ہیں

انسان کی یہ اہمیت، انسان کی آرزومندی کو عزت اور محبت کی نظر سے دیکھنا، اعلیٰ درجہ کی اُردو شاعری کا خاصہ رہا ہے اور یہی خاصہ ہے سیکولرزم کا ——— یہ محض ایک اصطلاح نہیں، روزمرہ کی زندگی میں ایک بیوہار اور برتاؤ کا نام ہے جو صرف مذہبی حکومت کی تفریق سے نہیں بلکہ عقیدے اور قانون کے جبر کا پھندا ڈھیلا کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ سیکولرزم عقیدے اور فرد دونوں کی رہائی اور مجلمنساہت کی طرف ایک ریڈیکل قدم ہے اور ولی سے لیکر میر، انشا اور نظیر اور پھر غالب تک یہی صورت ہے۔ نظیر تو خیر بہت ہی اہم نام ہے، جسے اُردو شاعری میں سیکولرزم کا سمبل (علامت) کہنا چاہیئے۔ پھر غالب کے دور سے آج کی اُردو شاعری تک صرف چند اتفاقات کو چھوڑ کر ایک ہی قدم رواں دواں ہے اور اُردو شاعری ابتدا سے آج تک اُس کی ہمدم اور ہمقدم رہی ہے۔

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو)

غلام ربانی تاباں

ہر موڑ کو چراغِ سرِ رہ گزر کہو
بیتے ہوئے دنوں کو غبارِ سفر کہو

خوں گشتہ آرزو کو کہو شامِ میکدہ
دل کی جراحتوں کو چمن کی سحر کہو

غم ہائے روزگار کا کچھ احترام بھی
چھلکے جو کوئی جام اُسے چشمِ تر کہو

ہر رہ گزر پہ کرتا ہوں زنجیر کا قیاس
چاہو تو تم اِسے بھی جنوں کا اثر کہو

میری متاعِ درد یہی زندگی تو ہے
نا معتبر کہو کہ اِسے معتبر کہو

یہ بھی عروجِ رنگ کا اک معجزہ سہی
پھولوں کی تازگی کو فروغِ شرر کہو

دانشورانِ حال کا تاباں، ہے مشورہ
ہر منظرِ جہاں کو فریبِ نظر کہو

○

یوں تو ہر نقشِ تغافل کو میں باطل کہدوں
راز پھر راز ہے کیسے سرِ محفل کہدوں

منزلِ شوق بجز وہم و گماں کچھ بھی نہیں
ہاں جو تم چاہو تو ہر موڑ کو منزل کہدوں

اک ذرا اور بڑھے خونِ تمنا کا وقار
تم مسیحا ہی سہی، آج تو قاتل کہدوں

کیا میں دو چار تھپیڑوں کے بھی قابل نہ رہا
ایک دن موج کو گھبرا کے نہ ساحل کہدوں

عشقِ معصوم کی توہین گوارا نہ ہوئی
ورنہ سوچا تھا کہ اک روز غمِ دل کہدوں

جس کو اربابِ ہوس دستِ رسا کہتے ہیں
لطف آئے جو اُسے کاسۂ سائل کہدوں

اُن کی بیداد کہ دُنیا کے ستم ہوں تاباں
زہر بن جائیں اگر چارہ گرِ دل کہدوں

تاجدار احتشام

دردِ تنہا

گذری ہوئی راتوں میں ڈستی ہوئی تنہائیوں کی قسم، تم بہت یاد آتی ہو۔ رات قطرہ قطرہ بٹ کر بکھر سی جاتی ہے اور میں اپنے سینے میں چھپے ہوئے اَن گنت دکھوں کو دبائے اپنے اُلجھے اُلجھے سے تصوّرات میں تمہاری ناکام تصویریں بناتا رہتا ہوں۔

تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں۔ تم چنار کی وادیوں میں سفید مرمریں لباس پہنے ایک ادائے بے نیازی کے ساتھ مسکراتی ہوئی چلی جارہی ہو۔ ہوائیں رقصاں ہیں۔ فضاؤں میں تمہارے بدن کی بھینی بھینی خوشبو بکھری ہوئی ہے۔ تمہارے قدموں کی آہٹ پر اپسراؤں کے پاؤں میں بندھے ہوئے گھنگھروؤں کی کھنک محسوس ہوتی ہے۔ چاروں طرف بکھرے ہوئے پھول تم سے مسکرانے کی ادا چراتے ہیں۔ تمہیں شرماتا دیکھ کر چاند بادلوں کی اوٹ میں چھپ چھپ جاتا ہے۔ جھیل کے بہتے ہوئے بے کل پانی کی گنگناہٹ تھم تھم سی جاتی ہے...... فلورینا اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی وہی اداس دھن بجارہی ہے۔ عجیب سا تضاد ہے دل میں اداسی بھی ہے اور تمہارے قرب کا احساس بھی۔ دل چاہتا ہے تم اِسی طرح اپنے بدن کو چرائے ہوئے کھڑی رہو، شرمائی سی، لجائی سی، فلورینا کا وائلن اٹھا کر دور پھینک دوں، اُسے زور سے ڈانٹ دوں۔ تم کوئی گیت چھیڑ دو، رات کی جوانی انگڑائی لے کر مدہوش ہو جائے۔ ذرہ ذرہ گنگنا اُٹھے۔ میں فلورینا کو منع نہیں کر سکتا۔ میں اس کو کس طرح منع کر دوں۔

...... تم کہاں ہو ــــ تم کہاں ہو۔ آؤ کہ یہ رات کٹے۔ اِس گھر کے سُونے سونے آنگن میں تمہارے گیت بجیں، تمہارے پائلوں کی جھنکار اور تمہاری چوڑیوں کی کھنک سے رات جاگے اور ــــ اور یہ رات کبھی ختم نہ ہو۔

"پوسٹ مین ــــ" دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ اُٹھا ــــ "پھر وہی خط ــــ اُسی کی لکھائی۔ اس نے پوسٹ مین سے خط لے لیا۔ اُسے کھولا۔ پھر پریشان ہوا۔ کب لکھا تھا اس نے یہ خط؟ ــــ خود اپنے ہی نام اُس کی سمجھ میں نہیں آیا!

اجنبی شہر، اجنبی لوگ، چھوٹا سا یہ گھر، بکھری ہوئی بے ترتیب چیزیں، الجھی الجھی سی زندگی، ویران ویران تنہا تنہا۔ کوئی کسی کا نہیں ــــ کوئی کسی کا نہیں۔ ماں بہت دور گاؤں میں اپنے بیٹے کی شادی کے سپنے بنتی ہے، باپ نے وقت سے پہلے اپنے چہرے پر بڑھتی جھریوں کو برداشت کر لیا، مگر اُس کو شہر بھیج کر تعلیم دلائی اور جب اس کی کمر نے مزید بوجھ برداشت کرنے سے انکار کر دیا۔ اور جب اِس دھرتی پر وہ بوجھ بن گیا، تو اُس نے بھگوان کے آگے پیار تھا کی کہ اب وہ اپنی لاش کو اٹھائے اٹھائے نہیں پھر سکتا۔ بھگوان نے اُس کی بات مان لی اور اسے دھرتی نے اپنی بانہوں میں چھپا لیا۔

اور اُس دن ــــ اُس دن کو وہ کبھی نہیں بھول سکا۔ اس نے صرف تین دن کی چھٹی مانگی تھی۔ اور صرف سو روپیہ ایڈوانس کی صورت میں اور اس کے مالک نے۔ اُس مالک نے جس کی کئی فیکٹریاں تھیں، کئی ملیں تھیں، اُسے نہ صرف چھٹی

دینے سے انکار کردیا تھا بلکہ ایڈوانس کے لئے بھی بُری بھلی باتیں سُنائی تھیں۔ اُس کا مالک اُصولی آدمی تھا۔ کمپنی کے قانون کو نہیں توڑ سکتا تھا: نئے ملازم کو کس طرح سو روپیہ ایڈوانس دیا جا سکتا ہے، کس طرح چھٹی دی جا سکتی ہے۔ اگر اُسے رعایت دی گئی تو دوسروں کو بھی دینا پڑے گی۔ اور پھر کمپنی میں ڈسپلن باقی نہیں رہے گا۔ قانون باقی نہیں رہے گا اور پھر اُس کمپنی کے مالک کا قانون قائم رہا اور وہ اپنے باپ کے انتم سنسکار میں بھی شریک نہ ہو سکا۔ پیسہ بہت بڑا قانون ہے۔ سب سے بڑا اُصول ــــ !

اور اُس دِن وہ بہت رویا تھا۔ اُس کا دل رویا تھا اُس کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو کسی نے نہیں دیکھا، اُس کی آہوں کی سِسکیوں کی آواز چھوٹے سے کمرے کی دیواروں سے ٹکرا کر رہ گئی اور پھر آہستہ آہستہ اُس کی آواز بھی تھک گئی۔ دیواریں خاموش رہیں۔

اُس نے ایک تصویر بنائی تھی۔ دُور جھیل کے پانیوں میں سُورج ڈوب رہا ہے، بادلوں میں سُرخی گھُل رہی ہے جھیل کے ساحل کے قریب پڑے ہوئے ایک پتھر پر اُس کی گوری بیٹھی ہوئی پانیوں میں پاؤں لٹکائے، آنکھوں میں صدیوں کا اِنتظار، اُداسیوں کے اتھاہ ساگر، اَن گنت خواب ٹوٹے ہوئے بکھرے ہوئے، شام کی اُداسی، اُداسیوں کے رنگ، کتنی اچھی لگ رہی تھی گوری اِس رُوپ میں۔

اُس نے گوری کو نہ جانے کتنے رنگوں میں دیکھا۔ کبھی اُس نے اُسے شُوخ بھڑکدار کپڑے پہنائے، کبھی شہزادی بنایا، کبھی پنگھٹ کی رانی بنا دیا۔ کون سا رنگ کون سا رُوپ ایسا تھا جو اُس نے گوری کو نہ دیا ہو۔ مگر وہ گوری کی آنکھوں سے اُداسی نہ چھین سکا۔ اُس کی پلکوں پہ بکھرے ہوئے مُوتی نہ چُن سکا۔ اُس نے جب بھی کوئی تصویر بنائی گوری اُس کے ساتھ رہی۔ اُس کی اُداس آنکھیں اِنتظار کا درد لئے اُس کا پیچھا کرتی رہیں۔

گوری اُس کے گاؤں میں رہتی تھی۔ وہ اُسے بہت چاہتا تھا۔ اپنی جان سے زیادہ۔ وہ لمحے جو وہ گوری کے ساتھ گزارتا اُس کے لئے اَمر ہو جاتے اور وہ اُن لمحوں کے حِصار میں، اپنے آپ کو قید کئے اپنے لئے ایک حسین مُستقبل کے خواب بُنا کرتا۔ ایک چھوٹا سا گھر ہوتا۔ وہ ہوتا اور گوری ہوتی، اور اُس کے خواب: بکھر جاتے۔ سجتے اور بگڑ جاتے۔ وہ مایوس نہیں ہوتا۔ صرف خواب ہی تو اُس کا سہارا تھے، اُس کا وِرثہ تھے، اُس کے باپ کا ارمان تھے۔ ماں کے سپنے تھے۔

"بیٹا، آج تم اِس گاؤں سے ایک بڑا آدمی بننے جا رہے ہو۔ اُسے یاد آتا۔ گاؤں سے آتے وقت اُس کی ماں نے کتنی حسرت سے کہا تھا۔ جیسے وہ گاؤں کا سب سے بڑا آدمی بن گیا ہے۔ اُس کی ماں کا سر فخر سے اُونچا ہو گیا ہے۔ پُورے گاؤں میں اُس کا چرچا ہے۔ اُس کے باپ کے قدم زمین پر نہیں ٹِکتے۔ گوری اپنی ہی سکھیوں سے بات کرنا اپنی توہین سمجھتی ہے۔ اب وہ گاؤں کے سب سے بڑے آدمی کی بیوی بننے والی ہے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ بڑا آدمی نہ بن سکا۔ اُس کے سپنے پُورے نہ ہو سکے، اُس کا باپ اپنی آنکھوں میں کل کی آس لئے تھک گیا اور تھکی ہوئی آنکھیں ایسی بند ہوئیں کہ پھر نہ کھلیں۔

گوری کی تصویر کے سامنے وہ نہ جانے کتنی دیر تک گُم صُم سا بیٹھا رہا۔ اُس کے آنسو بہتے رہے۔

"گوری، دیکھ، میں بہت بڑا آدمی بن گیا ہوں۔"

"ماں مجھے آشیرواد دے، میری طرف دیکھ۔ دیکھ تیرا بیٹا کتنا بڑا آدمی بن گیا ہے۔"

وہ کبھی نہ کہہ سکا کہ اس دنیا میں بڑا آدمی بننا بہت مشکل ہے۔ اِس دنیا کے لوگ کسی کو بڑا آدمی نہیں بننے دیتے۔

شاعر بمبئی

جھوٹ سچ کی لمبی زنجیر ہے۔ سچائی کے حلقے کمزور ہیں۔ کوئی ساتھ نہیں دیتا، کوئی بھی نہیں!

اُس نے ہمیشہ اپنی ماں کو جھوٹے خط لکھے۔ ایسے خط جن کو لکھتے وقت اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے۔ ہاتھ کانپ کانپ جاتے۔

"ماں! تو تو کہتی تھی کہ جھوٹ سب سے بڑا پاپ ہے۔ نہیں ماں ایسا نہیں ہے، تو جھوٹی تھی۔ سچ سب سے بڑا پاپ ہے۔ اُس نے گوری کو بھی بہت سے خط لکھے، ایسے خط جو کبھی نہ بھیجے گئے۔ ایسے خط جو اُس میں زندہ رہنے کی اُمنگ پیدا کرتے رہے۔ کل کی آرزو، کل کی تلاش، اپنے لئے اپنی گوری کے لئے، اپنے ماں باپ کے لئے۔

گوری کی تصویر بھی خاموش تھی۔ گوری نے بھی آج اُس کو دلاسہ نہیں دیا۔ تسلی نہیں دی۔

روتے روتے وہ بے سُدھ ہو گیا ــــ اور چار دن تک وہ تیز بخار میں تپتا رہا اور اپنے کام پر نہ جا سکا۔ اور جب اُسے کچھ ہوش آیا تو اپنے دفتر گیا اور وہاں وہ ہوا جو نہ ہونا تھا۔ اُسے نوکری سے جواب مل گیا تھا۔ ڈیڑھ سو روپے کی کلرکی ختم ہو گئی تھی۔

"ہے بھگوان کہاں ہے تو، کدھر ہے، کہاں ہے تیرا انصاف، تیرا نیائے، کیوں اتنا کٹھور ہے، اتنا سنگدل ہے ــ"

"نہیں بیٹا، ایسا نہیں کہتے۔ بھگوان کو دوشی نہیں کہتے۔ وہ سب کی سُنتا ہے، وہ بڑا دیالو ہے۔" اُس کی ماں نے ایک بار کہا تھا، جب زمیندار نے اُس کے مکان پر قبضہ کر لیا تھا اور اُس کو اپنے ماں باپ کے ساتھ گھر سے نکلنا پڑا تھا۔

اُس نے اپنی کالج کی ڈگری کی طرف بڑی حسرت سے دیکھا ــ "ماں دیکھ میں کتنا لکھ پڑھ گیا ہوں۔ کتنا بڑا آدمی ہو گیا ہوں ــ کل ......"

اور پھر اُسے کئی مہینوں کی جدوجہد کے باوجود کوئی نوکری نہ مل سکی۔ اُس نے یہ مہینے، یہ دن رو رو کر گزارے۔ پوسٹ آفس کے باہر بیٹھ کر لوگوں کے لئے خطوط لکھے۔ اچھے خط، بُرے خط، پیار بھرے خط، منی آرڈر فارم، رجسٹریاں بیمے ــ پوسٹ آفس کے باہر بیٹھ کر لکھنے کا کام زیادہ دن نہ چل سکا۔ کیونکہ شہر میں ہر جگہ کی قیمت ہوتی ہے۔

اُس سے پہلے والا آدمی اپنے گاؤں گیا ہوا تھا شادی کرنے۔ اور اُس نے سوچا تھا کہ وہ یہاں بیٹھ کر خوب محنت کرے گا اور پیسہ جمع کرے گا اور ایک دن اُس کی گوری دُلہن بنی اُس کے گھر آئے گی، کئی بار تو ایسا ہوتا کہ وہ کسی کا خط لکھتے لکھتے عجیب سے خیالوں میں کھو جاتا۔ کسی خط کی سطروں کے پیچھے اُس کی ماں اُسے پکارتی ــ کسی میں گوری اُسے آواز دیتی اور کسی میں اُس کا باپ اپنے ہاتھ پھیلائے اُسے اپنے سینے سے لگانے کے لئے بیتابانہ آگے بڑھتا۔

گاؤں سے چٹھیاں آئیں۔ پتاجی بہت بیمار ہیں۔ کھانے پینے کے لئے گھر میں کچھ بھی نہیں۔ ماں کے گہنے بک چکے ہیں۔ ساہوکار کا قرضہ بہت بڑھ چکا ہے۔ اُس نے اپنے جمع کئے ہوئے دو سو روپے گاؤں بھیج دیئے ــ اور بعد میں پتہ چلا کہ وہ پیسے اُس کے باپ کے انتم سنسکار میں خرچ ہو گئے۔

ــــ وہ پھر بے کار ہو چکا تھا۔ اُس نے سوچا اب تصویریں بناؤں گا۔ اُس نے بڑی محنت سے تصویریں بنائیں ــ دن رات ایک کر ڈالا اور جب وہ اُن تصویروں کو لے کر بازار میں نکلا تو اُن تصویروں کا کوئی خریدار نہ تھا۔

"کیا بکواس ہے ــ یہ روتی صورتیں، ایسے ہی کوئی اچھی چیز لاؤ۔ بڑھیا سی۔" دوکاندار نے آنکھ مارتے ہوئے اُس سے کہا تھا۔

اور پھر ایک دن آیا کہ اُس نے اپنے آپ سے بغاوت کر ڈالی۔ اپنی تصویروں کو پھاڑ ڈالا۔ اپنے پیٹ کی آگ میں جلنے کی تاب اُس میں نہیں رہی تھی۔ اُس نے دوکاندار کی بات مان لی اور "بڑھیا سی" تصویریں بنا ڈالیں۔ اور وہیں اُس دوکان پر اُس کی ملاقات فلورینا کے باپ سے ہوئی اور اُس نے اپنی لڑکی کو PAINTINGS سکھانے کیلئے

ملازم رکھ لیا۔ اُس نے سوچا عجیب دنیا ہے یہ اور عجیب ہیں یہاں کے لوگ۔ ٭ فلورینا عجیب و غریب لڑکی تھی۔ اتنے بڑے محل میں رہتی تھی۔ نوکر چاکر تھے۔ پیسہ تھا۔ کیا کچھ نہ تھا مگر وہ ہمیشہ اُداس رہتی۔ خاموش سی۔ بہت کم بولتی، وہ خاموش رہتی۔ مگر اُس کی آنکھیں ہمیشہ بولتی رہتیں۔ اُس کے وائلن کے گیت مچلتے رہتے۔ اُس نے ایک مرتبہ فلورینا کی تصویر بنانے کی کوشش کی اور جب تصویر مکمل ہوئی تو اُس کو بہت تعجب ہوا۔ وہ فلورینا کی تصویر نہیں تھی۔ وہ گوری کی تصویر تھی اور ہزار کوششوں کے باوجود بھی وہ فلورینا کی تصویر نہ بنا سکا تھا۔

وہ اب بھی گوری کو خط لکھا کرتا۔ اِدھر کچھ دن سے ایک ایسی بات ہو رہی تھی جو اُس کی سمجھ میں نہ آسکی۔ گوری کے نام لکھے ہوئے اُس کے خطوط کس طرح پوسٹ مین اُسے دے جاتا ہے۔!

فلورینا کی سالگرہ تھی۔ رات گئے تک وہ انتظامات میں لگا رہا اور پھر سجے ہوئے ہال کے ایک کونے میں پڑے ہوئے صوفے پر پڑ کر سو گیا۔ کچھ دیر بعد فلورینا نے دیکھا کہ وہ کسی کے نام خط لکھ رہا ہے۔ خط لکھنے کے بعد اُس نے اپنی جیب میں رکھے ہوئے لفافے کو نکالا۔ خط رکھا۔ لفافہ بند کیا اور اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ فلورینا نے سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ اُس نے وہ لفافہ ــــ ڈاک خانے کے بکس میں ڈال دیا۔ دبے قدموں واپس آیا اور پھر اپنے صوفے پر پڑ کر سو گیا۔ بالکل بے سُدھ ــــ بے جان۔

فلورینا نے اپنا وائلن اُٹھایا۔ فضاؤں میں ایک درد بھرا گیت گونجا ــــ معلوم نہیں یہ گیت کس کے لئے تھا۔

ندا فاضلی

مور ناچ

دیکھتے دیکھتے
اس کے چاروں طرف
سات رنگوں کا ریشم بکھرنے لگا

دھیمے دھیمے،
کئی کھڑکیاں سی کھلیں
پھڑپھڑاتی ہوئی فاختائیں اُڑیں
بدلیاں چھا گئیں،

بجلیوں کی لکیریں چمکنے لگیں
ساری بنجر زمینیں ہری ہو گئیں

ناچتے ناچتے
مور کی آنکھ سے
پہلا آنسو گرا،

خوبصورت سجیلے پروں کی دھنک
ٹوٹ کر ٹکڑا ٹکڑا بکھرنے لگی
پھر فضاؤں سے جنگل برسنے لگا۔

بن باس

آسماں لوہا،
دشائیں پتھر
سرنگوں سارے کھجوروں کے درخت
کوئی حرکت
نہ صدا
بجھ گئی بوڑھی پہاڑی پہ چمکتی ہوئی آگ

اپنے بکھرے ہوئے اُونٹوں کو اکٹھا کر لو۔
پھر سے کندھوں پہ سروں کو رکھ لو
پھر سے جسموں میں لگا لو ٹانگیں
ڈھونڈ لو کھوئی ہوئی آنکھوں کو

اب .....!
کسی پر نہیں اُترے گا صحیفہ کوئی۔

ڈاکٹر ابو محمد سحر

نسخۂ بھوپال بخطِ غالب پر ایک نظر

نسخۂ بھوپال بخطِ غالب سے مُراد دیوانِ غالب کا وہ مخطوطہ ہے جو ۱۹۶۹ء میں بھوپال سے دستیاب ہوا ہے۔ اِس کا جو ایڈیشن جناب اکبر علی خاں نے دیوانِ غالب بخطِ غالب، نسخۂ عرشی زادہ کے نام سے شائع کیا ہے وہ میری نظر سے گزر چکا ہے۔ لیکن اِس مخطوطے کا کسی قدر تفصیلی مطالعہ میں نے بیاضِ غالب (مطبوعہ نقوش، لاہور، غالب نمبر حصّہ دوم کے توسّط سے کیا ہے۔ چونکہ یہ مطبوعہ نسخہ مخطوطے کا عکس ہے اِس لئے چند اُمور سے قطع نظر کرکے اس کے مطالعے کے نتائج اصل مخطوطہ کے مطالعے کے نتائج کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔

مخطوطے کی مجمل یا مفصّل کیفیت کئی محققین نے اپنی تحریروں میں بیان کی ہے۔ اُنہوں نے بعض اہم تحقیقی مسائل سے بھی بحث کی ہے اور نتائج اخذ کئے ہیں۔ چونکہ اِس مضمون کا مقصد ان سب تحریروں کا جائزہ لینا نہیں ہے اور ہر جگہ دوسروں کی رائے کی تائید یا تردید کرنے اور اس کے لئے دوسروں کی رائے دُہرانے میں بھی حد سے زیادہ طوالت ہے، اِس لئے میں دوسری تحریروں کے اقتباسات اور حوالے صرف ایسے ہی موقعوں پر پیش کروں گا جہاں ازبس ضروری ہوگا۔

(۲)

اِس مخطوطے میں کل ۶۳ اَوراق ہیں۔ دیوان ورق ۱ الف سے شروع ہو کر ۶۲ الف پر ختم ہوا ہے۔ ورق ۶۲ ب پر میر درد اور نشاط کے دو مطلعے، کسی کا ایک شعر اور چند ادھورے اِندراجات ہیں جو دیوان سے غیر متعلق ہیں۔ پورے دیوان کی کتابت پختہ شکستہ خط میں ترچھی بیاض کی وضع پر تربیت یافتہ انداز میں کی گئی ہے۔ ورق ۱ الف کے بالائی حصّے میں اُوپر سے نیچے کی طرف تین سطروں میں یہ اِندراجات ہیں :۔

" یا علی المرتضیٰ علیہ و علیٰ اولادہ الصلوٰۃ و السلام
یا حسن بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم یا حسین
ابوالمعالی میرزا عبدالقادر بیدل رضی اللّٰہ عنہ "

اِن کی پہلی اور تیسری سطریں، دوسری سطر اور اس صفحے پر نیچے لکھے ہوئے اشعار کے مقابلے میں کسی قدر جلی قلم سے لکھی ہوئی ہیں جس سے گمان ہوتا ہے کہ پہلے صرف " بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم " لکھا تھا، اُس کے بعد اُسی قلم سے داہنی طرف " یا حسن " اور بائیں طرف " یا حسین " کا اِضافہ کیا گیا اور جلی قلم سے پہلی اور تیسری سطر لکھی گئی۔ اِن اندراجات کے نیچے ترچھے کالموں میں پہلی غزل " نقش فریادی ہے " کے چھ شعر اِس طرح لکھے گئے ہیں کہ پہلے کالم میں داہنی سے بائیں جانب

شاعر۔ بمبئی

تین شعر اور دوسرے کالم میں بائیں سے داہنی جانب تین شعر ہیں۔

بیشتر صفحات پر غزلیں تین کالموں میں اُوپر سے نیچے کی طرف لکھی گئی ہیں۔ جا بجا درمیانی کالم کے اشعار صفحہ اُلٹ کر نیچے سے اُوپر کی طرف بھی لکھے گئے ہیں۔ بہت سے دوسرے صفحات پر رُخ بدل کر چار کالموں میں داہنی سے بائیں طرف کتابت کی گئی ہے۔ اِن میں بھی جگہ جگہ ایک کالم ایک طرف سے اور دوسرا کالم دوسری طرف سے شروع کیا گیا ہے۔ کچھ صفحات پر ایک تیسرا انداز مربع اور مثمن کی شکل میں کتابت کا بھی ملتا ہے۔ اِس ردّوبدل کی وجہ سے فی صفحہ اشعار کی تعداد میں کوئی مطابقت نہیں ہے۔ لیکن ہر جگہ ایک سطر میں ایک مصرع لکھا گیا ہے۔ تین کالموں کے صفحات پر عموماً ہر کالم میں نو سطریں اور چار کالموں کے صفحات پر ہر کالم میں چھ سطریں ہیں لیکن کہیں کہیں ان کے سطور میں بھی اختلافات ہیں۔

ورق ۹۱ الف کے وسط تک ردیف وار غزلیں درج ہیں لیکن اِن میں ٹ، خ، ڈ، ص، ض، ط، ظ اور ق کی ردیف میں کوئی غزل نہیں ہے۔ مقطعوں میں کہیں اسدؔ تخلص لکھا ہے کہیں اُس کی جگہ چھوڑ دی ہے۔ بہت سی غزلوں پر صاد بنایا ہے اور چند غزلیں کاٹ دی ہیں۔ غزلوں کے خاتمے پر لکھا ہے :۔

" تمام شد غزلیات بعونہ تعالا فقط ۔ " !

پھر رُخ بدل کر بائیں طرف " عنوان صحیفہ رباعیات " لکھ کر پہلے فارسی اور پھر اُردو کی رُباعیاں لکھی ہیں جو ورق ۹۳ الف تک چلی گئی ہیں۔ داہنی سے بائیں طرف لکھے ہوئے تیسرے کالم میں رُباعیوں کے اختتام پر " تمت تمام شد " لکھا ہے اور پھر صفحہ سیدھا کر کے چار سطروں میں یہ عبارت لکھی ہے :۔

" بتاریخ چہاردہم رجب المرجب یوم سہ شنبہ سنہ ہجری وقت دوپہر روز
باقیماندہ فقیر بیدل اسد اللہ خاں عرف میرزا نوشہ متخلص بہ اسدؔ عفی اللہ عنہ
از تحریر دیوان حسرت عنوان خود فراغت یافتہ بہ فکر کاوش مضامین دیگر رجوع
بجناب روح میرزا علیہ الرحمۃ آورد، فقط "

ورق ۸۱ الف کے بائیں حاشیے پر یہ اندراج ہے :۔

" لعل خاں اول صفر ۱۲۲۵ھ در ماہہ عہ ۸ "

اِسی طرح ورق ۷۸ الف کی ایک غزل کے اس شعر

تماشا کہ اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنّا سے ہم دیکھتے ہیں

کے دوسرے مصرع کی طرف طرف " تا این جا نوشتہ ام " اور اس کے بعد کے شعر

سُراغِ تفِ نالہ لے داغِ دل سے
کہ شب رَو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

کے پہلے مصرعے کے داہنی طرف " از این جا شروع " لکھا ہوا ہے۔

چند موقعوں پر کتابت کی معمولی غلطیاں ہیں مثلاً کش فتہا کو کسا فتہا، سبکباری کو سکباری، تماشائے چمن کو تماشا چمن اور سرو رعنا سے، کو سرو رعنا سے، لکھا ہے۔ کئی مصرعوں میں یا تو کوئی لفظ چھوٹ گیا ہے یا خارج نہیں کیا گیا۔ کئی جگہ ہو کو اور ایک جگہ مشاطہ کو بضم اول لکھا ہے۔

مخطوطے کے متن میں ترمیم و تنسیخ اور حاشیوں میں اضافے ملتے ہیں۔ متن اور اُس میں ترمیم و تنسیخ کا خط تو ایک ہی ہے۔ لیکن

حاشیوں کے اِضافوں کا خط یا تو بالکل مختلف ہے یا بالیقین ایک نہیں قرار دیا جا سکتا۔ متن میں ۲۴۰ غزلیں ہیں۔ ۱۴ غزلیں حاشیے میں درج ہیں، جن میں سے ورق ۲۰ الف کے متن کی ایک غزل "توش وحشتے کہ عرضِ جنونِ وفاکروں" غالباً متن میں ترمیموں کی وجہ سے ورق ۳۰ب کے حاشیے پر دوبارہ درج کردی گئی ہے، اِس طرح متن وحاشیہ کی غزلوں کی مجموعی تعداد ۲۵۳ اور اشعار کی تعداد ۱۶۶۹ ہے۔ فارسی اور اُردو رُباعیوں کی تعداد جو سب کی سب متن میں ہیں علی الترتیب ۱۳ اور ۱۱ ہے۔

اِس مخطوطے کے متن کی تیئیس[۲۳] اور حاشیے کی ایک غزل اِس اعتبار سے نئی ہیں کہ دیوانِ غالب کے کسی اور معلوم نسخے میں نہیں ہیں۔ یہی کیفیت فارسی کی بارہ اور اُردو کی دو رباعیوں کی ہے، فارسی کی ایک مطبوعہ رُباعی کا پہلا مصرع کلیاتِ غالب (فارسی) میں بہ تغیر درج ہوا ہے۔ اُردو کی نئی غزلوں اور رُباعیوں کے پہلے مصرع مع تعدادِ اشعار حسبِ ذیل ہیں:۔

(۱) رفو بچیدنی ہے فرشِ بزمِ عیش گستر کا۔ ۶
(۲) تنگ ظرفوں کا رتبہ جہد سے برتر نہیں ہوتا۔ ۷
(۳) وہ فلک رُتبہ کہ بر توسنِ چالاک چڑھا۔ ۵
(۴) خط جو رُخ پر جانشینِ ہالۂ مہ ہوگیا۔ ۴
(۵) دلِ بے تاب کے سینے میں دم چند رہا۔ ۵
(۶) جگر سے ٹوٹی ہوئی ہوگئی سناں پیدا۔ ۵
(۷) نہاں کیفیتِ مے میں ہے سامانِ حجاب اُس کا۔ ۵
(۸) زبس ہے نازپردازِ غرورِ نشۂ صہبا۔ ۵
(۹) وندان کا خیال چشمِ تر کر۔ ۶
(۱۰) یاں اشک جدا گرم ہیں اور آہ جدا گرم۔ ۶
(۱۱) ضمانِ جادہ رد یاندن ہے خطِ جامِ مے نوشاں۔ ۵
(۱۲) نہیں ہے بے سبب قطرے کو شکلِ گوہر افسردن۔ ۷
(۱۳) سازشِ صلح بتاں میں ہے نہاں جنگیدن۔ ۵
(۱۴) منقار سے رکھتا ہوں بہم چاک قفس کو۔ ۵
(۱۵) اشک چکیدہ۔ رنگ پریدہ۔ ۷
(۱۶) خوشا طوطی و کنجِ آشیانہ۔ ۶
(۱۷) کرے ہے رہرواں سے خضرِ راہِ عشق جلّادی۔ ۵
(۱۸) اِس قامتِ رعنا کی جہاں جلوہ گری ہے۔ ۵
(۱۹) وہ نہا کر آبِ گل سے سایۂ گل کے تلے۔ ۵
(۲۰) روتا ہوں بس کہ در ہوسِ آرمیدگی۔ ۵
(۲۱) بدست آوردنِ دل گوہرِ دریائے شاہی ہے۔ ۵
(۲۲) نہ چھوڑو محفلِ عشرت میں جا اے میکشاں خالی۔ ۷
(۲۳) تماشائے جہاں مفتِ نظر ہے۔ ۷

شاعرِ معنی

(۲۴) سمجھاؤ اسے یہ وضع چھوڑ دے۔ (غزل حاشیہ)۔ ۹

رباعیات :- (۱) بے گریہ کمالِ ترجبینی سے ہے مجھے
(۲) گلشن شرر اہتمام بستر ہے آج

غزل ۵[۵] "باغِ مہر" نامی قلمی نسخے کے حوالے سے ایک تضمین میں شائع ہو چکی ہے[۱] چھٹی غزل کا مطلع بھی پہلے مصرعے میں لفظی فرق کے ساتھ عمدۂ منتخبہ میں یا اس کے حوالے سے شائع ہو چکا ہے۔ لیکن اس غزل کو غیر مطبوعہ غزلوں میں شمار کرنا بیجا نہ ہوگا۔ اس طرح کل تیئیس غزلیں اور اُن کے ۱۲۱ اشعار غیر مطبوعہ کہے جا سکتے ہیں۔ الف، ج، ر، ن، ہ اور ی کی ردیفوں کی مطبوعہ غزلوں میں بھی اُنیتس[۲۹] اشعار غیر مطبوعہ ہیں۔ یوں غزلوں کے غیر مطبوعہ اشعار کی کل تعداد ۱۴۰، اور دو رباعیوں کو شامل کر کے کل غیر مطبوعہ اُردو اشعار کی تعداد ۱۴۴ تک پہنچتی ہے۔[۲]

(۳)

حتمی شہادتوں کے بغیر کسی کے خط کی شناخت کا معاملہ بڑے دھوکے کا ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ اندازِ خط میں تبدیلی کے علاوہ کتابت کا فن اگر باقاعدہ سیکھا گیا ہو اور اس کی مشق بھی کی گئی ہو تو ایسے ایک سے زیادہ اشخاص کی خوشخط یا شکستہ تحریر میں قریبی مشابہت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک ہی زمانے کے لوگوں کے املا میں بھی اکثر کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ غالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی بے شمار تحریریں محفوظ ہیں اور اُن کے عکس شائع ہو چکے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ مخطوطہ جس زمانے کا لکھا ہوا ہے۔ اس زمانے کی اُن کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کوئی تحریر موجود نہیں ہے۔ چنانچہ محض اندازِ خط یا املا کی مشابہتوں سے اس مخطوطے کے متن کے خط کو غالب سے منسوب کرنے میں کچھ نہ کچھ شک رہ جانا لازمی تھا۔ لیکن خوش قسمتی سے اس کا ترقیمہ تمام داخلی شہادتوں پر ایک ایسی مہرِ توثیق ثبت کر دیتا ہے، جس کے بعد کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

پرستارانِ غالب کے لئے اس مخطوطے کی سب سے اہم خصوصیت یہی ہے کہ اس کا متن تمام و کمال خود غالب کا لکھا ہوا ہے۔ دیوانِ غالب کے کسی اور معلوم مخطوطے کو یہ امتیاز حاصل نہیں ہے[۳]۔ ایک محقق بھی اسے اتنی اہمیت دے گا جتنی بڑے ادیب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی مکمل کتاب کو دی جا سکتی ہے۔ ترقیمے اور دوسری داخلی اور خارجی شہادتوں کی روشنی میں یہ بھی یقینی ہے کہ یہ مخطوطہ دیوانِ غالب کا اوّلین نقش ہے۔ جسے خود اُنہوں نے کسی غیر مردف بیاض یا متفرق اوراق سے ذاتی بیاض ہی کی شکل میں تیار کیا تھا۔ اِس سے کچھ ایسے کلام کا پتہ چلتا ہے جسے اُنہوں نے نسخۂ بھوپال مکتوبہ ۱۲۳۷ھ سے بھی حذف کر دیا تھا اور جو نسخۂ حمیدیہ سے نسخۂ عرشی تک اِن کے غیر مطبوعہ کلام کو جمع کرنے کی تمام کوششوں کے باوجود اب تک غیر مطبوعہ تھا۔ خود اپنے کلام میں غالب کی ترمیم و تنسیخ کے قدیم ترین نمونے بھی اس سے سامنے آتے ہیں۔

اِس مخطوطے کی لوح کے اِندراجات سے نوجوانی میں غالب کے گہرے اثنا عشری عقائد کا ثبوت ملتا ہے، اِسی طرح لوح اور تمت دونوں سے بیدل سے اُن کی غیر معمولی عقیدت کی توثیق ہوتی ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ صحیح معنوں میں یہی دیوان اُن کی شاعری کے اس اِبتدائی دَور کی یادگار ہے جس میں وہ بیدل کی تقلید میں غرق تھے۔ کیونکہ اُنہوں نے نہ صرف لوح میں بیدل کا نام بڑے احترام اور ارادت سے لکھا ہے بلکہ ترقیمے میں اُن کا ذکر اس حیثیت سے کیا ہے کہ دیوان کی کتابت سے فراغت پاتے ہی وہ کاوشِ مضامینِ دیگر کے لئے اُن کی روح کی طرف رجوع ہو گئے تھے۔

---

[۱] تبرکاتِ غالب از قاضی معراج دھولپوری، ہماری زبان، علی گڑھ، یکم اگست ۱۹۶۱ء ص ۱، ۷

[۲] اِس مخطوطے پر دیگر تحریروں میں جو اعداد و شمار پیش کئے گئے ہیں اُن میں جا بجا اختلافات اور غلطیاں ہیں۔

[۳] گلِ رعنا کا ایک نو دریافت نسخہ بھی غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا بتایا جاتا ہے لیکن یہ اُردو فارسی کلام کا انتخاب ہے دیوان نہیں۔

نسخۂ بھوپال بخطِ غالب کی دریافت سے پہلے نسخۂ بھوپال مکتوبہ ۵ صفر ۱۲۳۷ھ (۱۸۲۱ء) جو عرصہ سے گم ہو چکا ہے[1] دیوانِ غالب کا سب سے قدیم مخطوطہ خیال کیا جاتا تھا۔ لیکن اب یہ فضیلت نسخۂ بھوپال بخطِ غالب کو حاصل ہے۔ اس کے متن کی تکمیلِ کتابت کے وقت غالب صرف اسد تخلص کرتے تھے۔ متن میں اُنہوں نے اسد کی جگہ غالب لانے کے لئے بعد میں ترمیمیں کی ہیں۔ نسخۂ بھوپال کے متن کی تکمیلِ کتابت سے پہلے وہ غالب تخلص بھی اختیار کر چکے تھے۔ چنانچہ اس کے ترقیمے میں کاتب نے اسد اور غالب دونوں درج کئے تھے۔ نسخۂ بھوپال بخطِ غالب کی ۱۴ مکمل اُردو غزلیں ۱۴ متفرق اُردو اشعار، دو اُردو اور تیرہ فارسی رُباعیاں نسخۂ بھوپال میں شامل نہیں کی گئی تھیں۔ نسخۂ بھوپال کے متن میں ایک فارسی قصیدہ، تین اُردو قصیدے، ۵۹ اُردو غزلیں اور دو اُردو رُباعیاں نسخۂ بھوپال بخطِ غالب کے متن سے زیادہ تھیں۔ دونوں کے متن کی بعض مشترک غزلوں میں بھی اوّل الذکر میں زائد اشعار تھے۔ نسخۂ بھوپال پر نسخۂ بھوپال بخطِ غالب کے تقدّمِ زمانی کا ایک اور ثبوت یہ ہو سکتا ہے کہ موخر الذکر کے حاشیے کی تین غزلیں اوّل الذکر کے متن میں درج تھیں اور یہ ثبوت تو نہایت قوی ہے کہ اوّل الذکر کے متن میں جا بجا (واضح رہے کہ ہر جگہ نہیں) موخر الذکر کے ترمیم شدہ متن نے جگہ پائی تھی۔ مثلاً :-

از نفس[2] گرمیٔ سحرِ شعلۂ آواز سے — شب تری تاثیرِ سحرِ شعلۂ آواز سے
تارِ شمع آہنگِ مضراب پرِ پروانہ تھا

بت پرستی ہے بہارِ نقشبندیٔ جہاں — از صریرِ خامہ پیدا نالۂ ناقوس تھا
ہر صریرِ خامہ میں یک نالۂ ناقوس تھا

ہے یہ بزمِ گلرخاں از نیم رنگی ہائے شمع
نیم رنگی ہائے شمعِ محفلِ خوباں سے ہے — پیچکِ مہ صرفِ چاکِ پردۂ فانوس ہے

کمالِ بندگی آیا ہے شیوۂ تسلیم
برنگِ سایہ ہمیں بندگی میں ہے تسلیم — کہ داغِ دل بہ جبینِ کشادہ رکھتے ہیں

دماغِ سنگ بر سر کوفتن کو عجزِ تسلیمی
ہوئی ہے ناتوانی بے دماغِ شوخیٔ مطلب — جبیں میں در لباسِ سجدہ ہائے دستِ عالم ہو

نہ حیرت چشمِ ساقی کی نہ صحبت دورِ ساغر کی — اسد محفل میں میری گردشِ افلاک باقی ہے
مری محفل میں غالب گردشِ افلاک باقی ہے

بدگماں رحمے کہ کیا بودِ چراغِ کشتہ ہے
رحم کر ظالم کہ کیا بودِ چراغِ کشتہ ہے — نبضِ بیمارِ وفا دودِ چراغِ کشتہ ہے

نسخۂ بھوپال بخطِ غالب میں اِن ترمیموں کے بعد شعر کی جو شکل ہوئی ہے وہ نسخۂ بھوپال میں بجنسہٖ موجود تھی۔

---

[1] دیوانِ غالب کا ایک نادر مخطوطہ از نثار احمد فاروقی، آج کل، دہلی۔ جون ۱۹۶۹ء ص ۳۳۔ اور بیاضِ غالب از نثار احمد فاروقی، نقوش، لاہور، غالب نمبر حصّہ دوم ص ۱۷

[2] غالب کا خود نقل کردہ نسخۂ دیوانِ اُردو از امتیاز علی عرشی، آج کل، جولائی ۱۹۶۹ء، ص ۸

(۴)

اُوپر نسخۂ بھوپال بخطِ غالب کی چند مسلّمہ حیثیتوں پر روشنی ڈالی گئی لیکن اس مخطوطے کے کچھ پہلو غور طلب اور حل طلب ہیں۔ اِن پر مزید تحقیق اور غور و فکر کی ضرورت تھی۔ لیکن اس کے بارے میں بعض قابلِ قدر مضامین بھی بڑی عجلت میں لکھے گئے۔ اِس کے علاوہ ہمارے محققین خصوصاً ماہرینِ غالبیات قیاس اور حسنِ ظن سے حد سے زیادہ کام لیتے ہیں اور جو باتیں ٹھوس شواہد کی تلاش و جستجو کا تقاضا کرتی ہیں اُن کو صرف اپنے پایۂ اِستناد یا ذہانت سے طے کر دینا چاہتے ہیں۔ اِس اندازِ تحقیق سے اِس مخطوطے کے بعض پیچیدہ مسائل تو بھلا کیا حل ہوتے، البتہ غلط مبحث اور غلط فہمیوں میں اضافہ ضرور ہو گیا۔ جہاں ایک طرف شواہد بہت کم پیش کئے جا سکے۔ وہاں دوسری طرف قیاس بھی زیادہ تر ایسے کئے گئے جو نہ غالب ہیں نہ جامع اور نہ مانع۔

اِس مخطوطے کے ترقیمے میں غالب نے تکمیلِ کتابت کی تاریخ اور دن تو لکھا ہے لیکن سنہ ہجری کے اعداد نہیں درج کئے۔ چونکہ اتنا بالیقین ثابت ہو سکتا تھا کہ یہ مخطوطہ نسخۂ بھوپال سے زیادہ قدیم ہے اور سنہ کتابت کے تعیّن کا مسئلہ بڑا نازک اور دور رس تھا۔ نیز اس کے لئے کوئی حتمی شہادت بھی دستیاب نہ تھی۔ اِس لئے تحقیقی احتیاط اور ذمہ داری کا تقاضا یہ تھا کہ اِس کی ظاہری قدر و قیمت پر اکتفا کی جاتی۔ اور سنہ کتابت کے تعیّن کے لئے اس وقت کا اِنتظار کیا جاتا جب کوئی شہادت مل جاتی۔ لیکن سب سے پہلے تو اِسی پر قیاس کیا جانے لگا کہ غالب نے سنہ کیوں نہیں لکھا۔ جناب نثار احمد فاروقی نے اسے غالب کے سہو پر محمول کیا۔[1] مولانا اِمتیاز علی عرشی کو اس کے سوا کوئی وجہ سمجھ میں نہ آئی کہ "غالب کتاب ختم کرتے وقت سرخوشی کے عالم میں ہوں اور سنہ یاد نہ رہا ہو۔"[2] جناب اکبر علی خاں نے چار قیاسی وجوہ بیان کئے جن میں یہ وجہ قابلِ ذکر ہے کہ سنہ شنگرف سے لکھنے کا خیال تھا جس کی نوبت نہ آئی۔ لیکن خود وہ اِس نتیجے پر پہنچے کہ "غالب سے اعدادِ سنہ سہواً ترک نہیں ہوئے عمداً اُنہوں نے ایسا کیا ہے۔"[3] سہواً اور عمداً کا معاملہ تو خدا ہی بہتر جان سکتا ہے۔ عالمِ سرخوشی کے بارے میں اتنا عرض کرنا ممکن ہے کہ عموماً لوگ عالمِ ہوش میں بھی تاریخ اور دن بھول جاتے ہیں۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ ترقیمہ لکھتے وقت غالب عالمِ سرخوشی میں تھے تو یہ کیسے مان لیا جائے کہ انہیں تاریخ اور دن تو یاد رہا لیکن سَن یاد نہ رہا۔ مولانا عرشی نے اس سے پہلے نسخۂ بھوپال کے حک و اِضافہ کی بعض بے ربطیوں کی بھی یہی توجیہہ کی تھی۔

"حک و اضافہ کا خط جگہ جگہ میرزا صاحب کے اس خط سے ملتا ہوا ہے جس سے ہم آشنا ہیں۔ لیکن بعض مقامات پر وہ بالیقین میرزا صاحب کا نہیں معلوم ہوتا جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اُنہوں نے سرخوشی یا دوسری وجہ سے کسی اور سے بھی یہ کام لیا ہے۔"[4]

سنہ نہ لکھنے کے متعلق عقلی گدّوں سے قطعِ نظر، سنہ کے تعین میں ایک ایسا طریقہ اختیار کیا گیا ہے جو کسی قدر تحقیق کے دائرے میں رکھا جائے گا یعنی تقویموں کی مدد سے ۱۴ رجب اور سہ شنبہ کا مطابق سنہ تلاش کیا گیا۔ چونکہ نسخۂ بھوپال مکتوبہ ۵ صفر ۱۲۳۷ھ (۱۸۲۱ء) سے یہ نسخہ مقدم تھا۔ اِس لئے یہ جستجو ۱۲۳۷ھ سے پہلے کی گئی۔ اِدھر ورق الم الف کے حاشیے پر لعل خاں سے متعلق یکم صفر

---

[1] دیوانِ غالب کا ایک نادر مخطوطہ از نثار احمد فاروقی، آجکل، دہلی، جون ۱۹۶۹ء، ص ۳۳ اور ریاضِ غالب از نثار احمد فاروقی، نقوش، لاہور، غالب نمبر حصہ دوم، ص ۴

[2] غالب کا خود نقل کردہ نسخۂ دیوانِ اُردو از امتیاز علی عرشی، آجکل، جولائی ۱۹۶۹ء، ص ۶

[3] نودریافت دیوانِ غالب سنہ کتابت کا مسئلہ از اکبر علی خاں عرشی زادہ، تحریک، دہلی، مارچ ۱۹۷۰ء، ص ۲۷

[4] دیوانِ غالب نسخۂ عرشی، دیباچہ ص ۷۷، ۷۸

۱۲۳۵ھ کے اندراج سے یہ فرض کر لیا گیا کہ اس تاریخ سے پہلے دیوان مکمل ہو چکا تھا۔ نثار احمد فاروقی صاحب کے پیشِ نظر تقویم ہجری و عیسوی مرتبہ ابوالنصر خالدی کی تھی۔ جس میں ۱۲۳۳ھ نکلا[1] چنانچہ پہلے اُنہوں نے یہ سنہ متعین کر دیا۔ مولانا عرشی اور جناب اکبر علی خاں نے منشی نولکشور کے مطبع کی ۱۲۱۰ھ سے ۱۸۹۵ء کی تقویم کو مشعلِ راہ بنایا۔ غالب کی ۱۲۳۱ھ والی ایک مہر سے چونکہ یہ اشارہ ملتا ہے کہ اس سنہ میں غالب یہ تخلص رکھ چکے تھے۔ اس لئے اسی سنہ پر توجہ مرکوز کی گئی اور ۱۴ رجب المرجب کو سہ شنبہ کا دن نکل آیا۔ اس تقویم کے مطابق ۱۴ رجب کو سہ شنبہ کا دن ۱۲۳۶ھ میں بھی تھا لیکن اسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ مولانا عرشی صاحب نے ۱۲۳۱ھ طے کر دیا۔ البتہ جلال الدین صاحب کی رائے ۱۲۳۶ھ کے حق میں ہوئی۔[2] عرشی صاحب کا متعین کیا ہوا سنہ کتابت یعنی ۱۲۳۱ھ غالباً اب عام طور پر تسلیم کیا جا رہا ہے۔ جناب نثار احمد فاروقی نے بھی اب اپنی رائے اسی کے مطابق کر لی ہے[3] جلال الدین صاحب کی آخری رائے میرے علم میں نہیں۔

کسی مخطوطے کی تاریخ کتابت کے تعین میں اگر معمولی سی غلطی ہو جائے یا ہمارا علم اس کے تقریبی زمانۂ کتابت سے آگے نہ بڑھ سکے تو کوئی خاص بات نہیں۔ لیکن دیوان غالب کے قلمی نسخوں کی تاریخ کتابت کا مسئلہ ان کے کلام کی تاریخی ترتیب سے بُری طرح جُڑ گیا ہے۔ چونکہ تاریخ کتابت کا غلط تعین چند در چند تحقیقی و تنقیدی غلطیوں اور غلط فہمیوں کا باعث ہو سکتا ہے، اس لئے اس مسئلے سے سرسری گزر جانا مناسب نہیں۔ مطبع نول کشور کی سو سالہ تقویم ابوالنصر خالدی کی مرتب کی ہوئی تقویم سے ممکن ہے زیادہ قابلِ اعتبار ہو۔ لیکن اس قسم کی تقویموں کی غرض و غایت یہ ہے کہ مختلف سنین میں تاریخ و ماہ و سال کا اندازہ ہو جائے۔ یہ طریقہ بہت ہی مشکوک ہے کہ قمری مہینوں کی تاریخ اور دن کی مدد سے تقویم سے سنہ اخذ کر لیا جائے۔ اس طرح برآمد کیے ہوئے کئی سنوں میں سے کسی ایک سنہ کا انتخاب اپنے علیحدہ شکوک رکھتا ہے۔

لعل خاں کو ملازم رکھنے یا تنخواہ ادا کرنے کی یادداشت کے بارے میں فیصلہ سرتاسر قیاسی ہے۔ اور یہ ایک اور قیاس کا مانع نہیں جس طرح یہ قیاس کر لیا گیا ہے کہ اس یادداشت کے اندراج یعنی یکم صفر ۱۲۳۵ھ سے پہلے یہ مخطوطہ مکمل ہو چکا تھا۔ اسی طرح یہ قیاس بھی کیا جا سکتا ہے کہ غالب نے ورق ۱۹ الف کے حاشیے پر یہ اندراج کیا اُس وقت مخطوطے کی کتابت اُنہوں نے اس صفحے تک کی تھی اور اُسی سال ۱۴ رجب کو یہ اختتام کو پہنچی۔ چونکہ یہ مبیضہ وہ اپنے لئے تیار کر رہے تھے۔ اس لئے کسی بھی صورت حال میں اُنہیں ایسا کرنے میں تامل نہیں ہوا۔ اس قیاس کی ایک معقول وجہ یہ ہے کہ اس مخطوطے پر اس قسم کی کوئی دوسری یادداشت درج نہیں ہے۔ اگر مبیضے کے مسودہ بن جانے پر یہ یادداشت درج کی جاتی تو اس مخطوطے پر اس قسم کی کچھ اور یادداشتوں کا درج ہونا بھی لازمی تھا۔

یہ مسلّم ہے کہ یہ مخطوطہ نسخۂ بھوپال کی تاریخِ کتابت سے پہلے لکھا جا چکا تھا اور اُس وقت غالب صرف اسد تخلص کرتے تھے۔ اب اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ اُنہوں نے اُردو میں غالب تخلص کب اختیار کیا تو اس کا سنہ کتابت ۱۲۳۷ھ سے پہلے بالیقین مقرر کیا جا سکتا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے کئی دوسرے مسائل کی طرح اس مسئلے میں بھی صحیح معلومات اب تک حاصل نہیں ہو سکیں۔ خود غالب کے بیانات سے کوئی واضح نتیجہ نہیں نکلتا۔ سب سے پہلے آزاد نے سنہ کے ساتھ تخلص کی تبدیلی کا ذکر کیا ہے:

"پہلے اسد تخلص کرتے تھے۔ جب سنا کہ کوئی فرومایہ سا شخص اسد تخلص کرتا تھا۔ ایک دن اُس کا مقطع کسی نے پڑھا۔"

اسد تم نے بنائی یہ غزل خوب   ارے او شیر رحمت ہے خدا کی

---

[1] دیوانِ غالب کا ایک نادر مخطوطہ از نثار احمد فاروقی، آجکل، جون ۱۹۶۹ء ص ۳۴

[2] تفصیل کے لئے دیکھئے نو دریافت دیوان غالب کے سنہ کتابت کا مسئلہ از اکبر علی خاں، تحریک، مارچ ۱۹۸۰ء ص ۲۱

[3] بیاضِ غالب، نقوش غالب نمبر حصہ دوم ص ۱۶ اور نو دریافت دیوانِ غالب کے سنہ کتابت کا مسئلہ از نثار احمد فاروقی، تحریک، مئی ۱۹۷۰ء، ص ۲۰

سُننے ہی اِس تخلّص سے جی بیزار ہو گیا کیونکہ اُن کا ایک یہ بھی قاعدہ تھا کہ عوام النّاس کے ساتھ مشترک حال ہونے کو نہایت مکروہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ ۱۲۴۵ھ و ۱۸۲۸ء میں اسداللہ الغالب کی رعایت سے غالبؔ تخلّص اختیار کیا۔ لیکن جن غزلوں میں اسدؔ تخلّص تھا۔ اُنہیں اُسی طرح رہنے دیا۔"[1]

حالیؔ نے یہ لطیفہ مختلف صورت میں بیان کیا ہے۔ شعر بھی دوسرا لکھا ہے اور تخلّص کی تبدیلی سے اسے کوئی نسبت نہیں دی۔[2] اِس کے علاوہ یہ عرصہ سے معلوم ہے کہ غالبؔ ۱۲۴۵ھ سے بہت پہلے یہ تخلّص اختیار کر چکے تھے۔

شیخ محمد اکرام نے قیاس و یقین کے امتزاج کے ساتھ ۱۹۳۶ء میں یہ رائے ظاہر کی تھی۔

" مرزا نے تمام فارسی غزلیات میں غالبؔ تخلّص استعمال کیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ فارسی شعر گوئی شروع کرنے کے کچھ عرصہ بعد اُنہوں نے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں یہی تخلّص قائم رکھا، اگرچہ شاعرانہ سہولت کی وجہ سے بعد کی چند غزلوں میں اسدؔ بھی استعمال کیا ہے۔"[3]

تقریباً اِسی زمانے میں غلام رسول مہرؔ نے لکھا ہے :۔

" غالبؔ نے ابتداءً اُردو میں شعر کہنے شروع کئے تھے تو اسدؔ تخلّص رکھا تھا۔ جب فارسی میں شعر کہنے شروع کئے تو غالبؔ تخلّص اختیار کیا۔ بعدازاں اُردو میں بھی بالعموم یہی تخلّص رہا اور اِسی نے عالمگیر شہرت پائی لیکن اُردو میں اس تخلّص کی پابندی اُنہوں نے کبھی گوارا نہ کی۔"[4]

۱۹۵۸ء میں مولانا اِمتیاز علی عرشیؔ لکھتے ہیں :۔

" اِبتداءً میرزا صاحب اسدؔ تخلّص کرتے تھے۔ بعدازاں اپنے نام اسداللہ کی مناسبت سے غالبؔ لکھنے لگے۔ چنانچہ منشی شیو نرائن کو اپریل سنہ ۱۸۵۹ء میں تحریر کیا ہے :۔

" میں نے کوئی دو چار برس ابتداء میں اسدؔ تخلّص رکھا ہے ورنہ غالبؔ ہی لکھتا رہا ہوں۔"

لیکن یہ دو چار برس صحیح تخمینہ نہیں کیونکہ وہ اپنی شعر گوئی کی پہلی منزل، بیدلؔ رنگ، کے زمانے میں اسدؔ ہی لکھتے رہے ہیں۔ البتہ فارسی میں سرے سے غالبؔ تخلّص ہی استعمال کیا ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اُنہوں نے فارسی کے لئے یہ تخلّص پسند کیا تھا۔ بعد میں ریختے کے اندر بھی لکھنے لگے۔"[5]

مشہور روایتیں بھی یہی ہیں کہ غالبؔ نے پہلے اُردو شاعری شروع کی اور اسدؔ تخلّص رکھا۔ پھر فارسی کے لئے غالبؔ تخلّص اپنایا اور بعد میں اُردو کے لئے بھی یہی تخلّص اختیار کر لیا۔ حالانکہ مولانا حالیؔ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابتداہی میں فارسی اشعار بھی کہنے لگے تھے[6] اور نسخۂ بھوپال

---

[1] آبِ حیات، ص ۵۰۰ — [2] دیکھئے یادگارِ غالبؔ، مطبوعہ الٰہ آباد، ص ۱۱۲

[3] غالبؔ نامہ، طبع دوم، ۱۹۳۹ء ص ۷

[4] غالبؔ از غلام رسول مہرؔ، طبع دوم۔ ص ۸

[5] دیوانِ غالبؔ نسخۂ عرشی، دیباچہ ص ۱۳، ۱۴

[6] دیکھئے یادگارِ غالبؔ، ص ۱۰۳۔ مالک رام صاحب نے اِس کا لحاظ رکھتے ہوئے لکھا ہے کہ " اگرچہ اس زمانے کی ایک فارسی غزل کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مگر شروع میں اِن کی توجہ زیادہ تر اُردو ہی کی طرف رہی۔" ذکرِ غالبؔ، طبع چہارم۔ مکتبۂ جامعہ۔ دہلی، ص ۴۴

(۱۲۳۷ھ) کی دریافت یا ۱۹۲۱ء میں نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت سے ماہرینِ غالبیات کو معلوم ہو جانا چاہیے تھا کہ وہ فارسی میں بھی عرصے سے غالب تخلص نہیں استعمال کرتے تھے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس امر کی طرف میں پہلی بار توجہ دلا رہا ہوں کہ نسخۂ حمیدیہ میں نسخۂ بھوپال کا ایک فارسی قصیدہ شامل ہے جس میں انہوں نے اسد تخلص استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

راقمِ بیچارۂ پژمردہ دل یعنی اسد
کز فسردن ہائے دل گردیدہ پابندِ جلاب [1]

اب نسخۂ بھوپال بخطِ غالب سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے کہ ابتدا میں وہ فارسی میں بھی اسد تخلص استعمال کرتے تھے۔ اس کی ایک فارسی رباعی جس میں اسد تخلص آیا ہے درج ذیل ہے:-

گفتم کہ اسد گفت دلِ آشفتۂ من — گفتم نفسش گفت بخوں خفتۂ من
گفتم سخنش بایں نزاکت گفتن — گفت ایں ہمہ مدعائے ناگفتۂ من

چنانچہ یہ قیاس نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ غالب ابتدا میں اردو و فارسی دونوں میں اسد تخلص کرتے تھے اور اس کی بنا پر یہ قیاس ایک تحقیقی قیاس قرار پائے گا کہ شروع میں اردو و فارسی دونوں کے لئے صرف اسد تخلص رکھنے کے بعد پہلے انہوں نے فارسی میں غالب تخلص اختیار کیا اور پھر اردو میں بھی حتی الامکان یہی تخلص استعمال کرنے لگے اور جیسا کہ نسخۂ بھوپال بخطِ غالب کی ترمیموں سے ظاہر ہے۔ بعض پرانے مقطعوں میں اسد کو بدل کر غالب کر ڈالا۔ لیکن چونکہ ہر بحر میں غالب نہیں آسکتا تھا۔ اسد تخلص کے پرانے مقطعے بھی برقرار رکھے اور نئی غزلوں کے مقطعوں میں بھی اسد کو یک قلم ترک نہیں کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تخلص کی تبدیلی کا خیال آنے کے کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے اسد کے ساتھ بھی سمجھوتہ کر لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نسخۂ بھوپال کے ترقیمے میں دونوں تخلص درج ہوئے تھے اور نسخۂ بھوپال بخطِ غالب کے بعض مقطعوں میں تبدیلی کے باوجود نسخۂ بھوپال میں پھر اسد والے متن کو ترجیح دی گئی تھی۔

جہاں تک ۱۲۳۱ھ کی مہر "اسد اللہ الغالب" کا تعلق ہے یہ بعید از قیاس نہیں کہ اس انداز کی مہر محض حضرت علیؑ سے عقیدت کی بنا پر بنوالی گئی ہو اور اس میں جو "الغالب" نقش کیا گیا تھا۔ اس کا تخلص سے اس وقت کوئی تعلق نہ ہو۔ بالفرض تخلص کی تبدیلی ۱۲۳۱ھ میں ہو گئی تھی تو اس کے لئے کوئی ثبوت موجود نہیں کہ یہ تبدیلی فارسی کے لئے مقصود تھی یا اردو کے لئے۔ اگر فارسی کے لئے تھی جیسا کہ زیادہ قرینِ قیاس ہے تو اس کا ثبوت نہیں کہ اس کا اطلاق اردو پر کب ہوا۔

لہٰذا نسخۂ بھوپال بخطِ غالب کو ۱۲۳۱ھ کا مکتوبہ قرار دینے کے بجائے بہتر یہ ہے کہ صرف نسخۂ بھوپال پر اس کے تقدمِ زمانی پر قناعت کی جائے۔

(بقیہ آئندہ اشاعت میں)

---

[1] دیوانِ غالب جدید المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ مرتبۂ مفتی محمد انوار الحق، قصائد، فاتحۂ فارسی، ص ۲۹۲۔ ۱۲۳۰ھ یا اس سے پہلے کا یہ قصیدہ ترمیم و تنسیخ کے بعد جب کلیاتِ فارسی میں قطعات میں شائع ہوا تو اس میں یہ شعر نہیں رہا۔ دیکھئے کلیاتِ فارسی مطبع نول کشور، لکھنؤ، جنوری ۱۸۷۲ء، قطعہ نمبر ۶، ص ۷۴۔

غزلیں

محسن زیدی

لاکھ پردے سے کوئی حالات پہ ڈالے پھر بھی
ہم کو معلوم ہیں قاتل کے ارادے پھر بھی

بے وفا دوست سہی، زہر بھرے جام سہی
کچھ نہ کچھ بن گئے، جینے کے سہارے پھر بھی

یاد کرنے کو بہانے نہیں ہوتے درکار
بھول جانے کے تو ہوتے ہیں بہانے پھر بھی

یہ گھنی چھاؤں، یہ سائے، یہ سکونِ منزل
یاد آتے ہیں بہت پاؤں کے چھالے پھر بھی

جانتا ہوں کہ نہ گزرے گا اِدھر سے کوئی
چنتا جاتا ہوں مگر راہ سے کانٹے پھر بھی

ہم سے کہتے ہیں کہ مجبوریِ قاتل سمجھو
رکھے جا سکتے ہیں زخموں پہ تو پھاہے پھر بھی

روح کے دشت میں در آتے سمندر بھی اگر
ہم وہ پیاسے تھے کہ سیراب نہ ہوتے پھر بھی

میری آنکھوں میں نہیں اشک بھی کوئی محسن
دامنِ شب میں تو ہیں چند ستارے پھر بھی

خلش بڑودوی

وقت نے مجھ کو قید کیا ہے اپنے گہرے غاروں میں
کتنے چہرے گھوم رہے ہیں، میرے لئے بازاروں میں

یادوں کی اگنی برکھا میں بھٹکتے رہے لمحہ لمحہ
ہم نے اپنا سارا جیون کاٹ دیا انگاروں میں

غم میں بھی اپنے ہونٹوں پر کچھ ایسی مسکان رہی
جیسے کوئی تازہ تازہ پھول کھلا ہو غاروں میں

ہم سے محبت ترک نہ ہو گی کچلے ہوئے انسانوں کی
چاہے آگ میں ڈالو، چاہے چنوا دو دیواروں میں

ایک دلِ غمناک کو اب تک سینے سے ہیں لگائے ہوئے
اور تو ہم نے اپنا سب کچھ بیچ دیا بازاروں میں

آج ہوں گو آثارِ قدیمہ، لیکن صدیوں پہلے تو
میں انسانی نعرہ بن کر گونجا ہوں درباروں میں

اپنے حصے کا پیمانہ چھین لیں بڑھ کر ساقی سے
اتنی جرأت پیدا ہو گی جانے کب میخواروں میں؟

مسجد مندر کے چکر سے کچھ بھی ہاتھ نہ آئے گا
ڈھونڈنے والے ڈھونڈ خدا کو ہم سے دنیا داروں میں

کل تک اپنے جو شاعر، مزدور کی باتیں کرتے تھے
آج وہ بنگلوں میں رہتے ہیں، اڑتے ہیں طیاروں میں

اچنت کمار سین گپتا
ترجمہ:۔ رونق دکنی سیمابی

جونک

قربان کانچ کی چوڑیاں خریدنے آیا تھا ہاٹ میں، مزاج بگڑا ہوا تھا، بدن تھکاوٹ سے چُور چُور تھا، اس کے باوجود وہ دوکانوں کے چکر کاٹ رہا تھا سنہری مل جائیں کونیجنی، یہ ٹھیک سے طے نہیں کر پاتا تھا پہلے جب بھی وہ ہاٹ آیا کرتا تو تمباکو خرید لیتا، پیاز، مرچ کے ساتھ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں لیتا تھا۔ مگر آج اُسے چوڑیاں خریدنی تھیں اور بالوں کے فیتے خریدنے پڑ رہے تھے اپنی بیوی نور بانو کے لئے۔ چوڑی کا ناپ تین انگل تھا اس لئے چوڑیوں میں ہاتھ ڈال ڈال کر دیکھتا۔ ناپ ٹھیک ہوتا تو رنگ پسند نہ آتا اور رنگ اچھا لگتا تو ناپ کی نہیں ملتی۔ آج وہ نور بانو کے ہاتھوں کی چوڑیاں غصہ میں آکر توڑ آیا تھا اور چٹیا پکڑ کر کھینچنے سے بالوں کا جوڑا کھل گیا تھا، تھوڑی بہت خراشیں بھی آگئی تھیں نور بانو کے بدن پر۔

قربان کے زمین جائداد تو دکھی نہیں دینا پاؤنا بھی نہیں تھا کسی کا۔ کھیت والا کسان تھا وہ۔ اُسے ہی تک دوسرے سے مانگ کر لا یا تھا تھا، بہت غریب کسان تھا وہ، جو تھوڑا بہت دھان پچھلے سال ہوا تھا وہ بھی چڑیوں نے چگ لیا تھا، چونٹیوں نے کھا لیا تھا، اس سال پودے بوئے تھے تو بالیاں نہیں اُگی تھیں۔ زرخیز زمین تھی مگر پانی کا کھار اپنی پوری طرح ختم نہیں ہو پایا تھا۔ تھوڑا بہت دھان ہوتا تھا وہ بھی بٹور بٹا کر مالک کے کھلیان میں دے آنا پڑتا تھا۔ اس کے تین حصے جاتے اور اسے ایک حصہ ملتا تھا، نہ ٹھکانے سے کھانے کو تھا نہ پہننے کو چونکہ اکیلے قربان کی محنت کی کمائی سے گھر کا خرچ چل نہیں پاتا تھا، اس لئے نور بانو کو بھی کام کرنا پڑتا وہ مالک کے گھر دھان کوٹتی، جوٹ لپیٹتی، کپڑے لتے دھوتی، پانی کھینچتی اور مالکن کی خدمت کرتی۔ اس کے بال بناتی، بدن دباتی۔ مالش کرتی اس کے بدلے میں کبھی کبھی بچا کھچا کھانا کو مل جاتا تھا اور ہر مہینے چار پیسے ملتے تھے۔ لیکن بیچاری کے جی کو چین اور اطمینان نہیں ملتا تھا۔ مالک دفعدار نور بانو کو بُری نظر سے دیکھتا تھا۔ اس نے پہلے ہی دن شوہر سے شکایت کی، مالک مجھے گھورتا ہے معلوم نہیں کیوں کھنکار کھنکار کر کھانستا ہے۔ ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے داڑھی پر ہاتھ پھیرتا ہوا ہنستا ہے۔ غریب کا غصہ ہی کیا، قربان نے کہا، تو اُس کے نزدیک جاتی ہی کیوں ہے؟ دُور دُور سے کام کر کے چلی آیا کر۔ جواب میں نور بانو کہتی، میں تو گھونگھٹ نکال کر دور ہی سے نکل جاتی ہوں، میں اس کے نزدیک کیوں جاؤں، ایسا کہتے ہوئے نور بانو کا چہرہ شرم سے گلگوں ہو گیا تھا۔

دفعدار، اُدھر اپنی بیجا حرکتوں سے باز نہیں آ رہا تھا۔ ایک دن موقع دیکھ کر اچانک اس نے نور بانو کا ہاتھ پکڑ لیا مگر وہ کسی طرح اپنا ہاتھ چھڑا کر تیز قدم گھر چلی آئی اور اپنے شوہر سے روتے ہوئے کہا، دفعدار میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ اب میں کیا کروں۔

قربان، کا منہ غصے سے لال ہو گیا۔ بولا۔ تو اس کے سامنے گئی ہی کیوں؟ کس نے کہا میں اس کے سامنے گئی تھی!

" سامنے نہیں گئی تھی تو ہاتھ کیسے پکڑا اُس نے؟

" میں تو ڈھنکی چھپّا گھر میں تھی، وہ اندر آکر بولا، نوکری میں کتنے جوج ہو رہے اور ساتھ ہی مسکرانے لگا۔ میں اس کا مطلب سمجھ گئی اور پیچھے کے دروازہ سے بھاگنے لگی۔ تو اس نے جھپٹ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا! غریب قربان کیا کر سکتا تھا۔ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا، خوبصورتی یا بدصورتی خدا کی دین ہے جس کو چاہے وہ دیدے، یہاں امیر اور غریب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، مگر غریب کی بیوی کی قسمت میں اگر خوبصورتی آجائے تو جان مصیبت میں پڑ جاتی ہے شوہر

کو اپنی حسین بیوی سے پیار کرنے کا حق بھی حاصل نہیں، اُسے بیوی کے سکھ سے بھی محروم رہنا پڑتا ہے۔ کیا قسمت ہے غریبوں کی اور کیسا انصاف ہے؟ پھر وہ اپنے جذبات پر قابو پا کر کہنے لگا: "ہم غریب ہیں اور وہ ہیں پیسے والے اور اس روپیہ کے زور سے تھانہ اور پولیس سب ان لوگوں کے قبضہ میں ہے، ہماری سنتا ہی کون ہے؟ غریب جو ہوئے ہم لوگ، ہمیں ان لوگوں سے جس قدر ہوسکے دور ہی رہنا چاہئے۔ کام کاج سے جلدی نپٹ کر تو گھر آجایا کر۔" نور بانو خوشی سے سنتی رہی۔

دوسرے دن شام کو جب وہ گھر لوٹی تو چوڑیوں سے اس کے ہاتھ بھرے تھے۔ رنگین چمکدار اور فیتا لپیٹ کر جوڑا بنایا ہوا تھا، وہ بہت خوش تھی مگر جب اس نے قربان کی آگ برساتی ہوئی آنکھیں دیکھیں تو سہم گئی۔ "کہاں سے آیا یہ سب؟" اس نے پوچھا۔ "مالک نے دیا ہے۔" جواب بے معصومیت جھلک رہی تھی، وہ نیچی نظریں کئے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کرید نے لگی، ساڑی کا آنچل دانتوں تلے دبا رہا تھا، قربان اندر ہی اندر سلگنے لگا "کانچ کی چوڑیاں ہیں، کل زیور کپڑا ہوگا۔ کھاری زمین کو ایسے ہی دھیرے دھیرے تیار کیا جاتا ہے، پہلے انگلی پکڑی جاتی ہے، پھر پہنچا پکڑے گا!

پھر وہ گرجا! پھینک دے سب نکال کر اور دیکھ" نور بانو عورت ذات تھی، جوان تھی، ایسے میں پہننے اوڑھنے کا شوق فطری ہوتا ہے شوہر کے حکم کی تعمیل میں آنا کانی کرنے لگی وہ آگے بڑھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ دیا، کڑ کڑ کر کے کتنی ہی چوڑیاں ٹوٹ گئیں، جوڑا پکڑ کر جو جھٹکا دیا تو کنڈلی بنا کر بیٹھا ہوا سا نپ کھلا اٹھا۔ دھاڑیں مار کر رو پڑی نور بانو، کانچ کے ٹکڑوں کی خراش سے جگہ جگہ ہاتھوں پر خون چمک رہا تھا ادھر غصے میں جلے ڈگ بھرتا ہوا قربان باہر نکل گیا۔

نور بانو تھوڑی دیر یونہی بیٹھی رہی پھر سوچنے لگی۔ گھر کے آدمی کا غصہ بھی ایسا روپ بھی ہوتا ہے وہ کبھی نہ سمجھی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی پھر آپ ہی آپ کہنے لگی "بھاڑ میں جائے چوڑی کنگن، میں غریب کسان کی بیوی ہوں، یہ مجھے بھون نہیں چاہئے۔ شوق سے لے کیا لینا جیسی رکھیں مجھے ویسا ہی رہنا ہوگا۔" نور بانو حقیقت میں دنیا والوں کے ہیر پھیر سے واقف نہ تھی۔

دوسرے دن شام کو جب قربان ہاٹ سے لوٹ کر آیا تو اس کے تھیلے میں چوڑیاں تھیں اور رنگین فیتے تھے، یہ جان کر کہ یہ سب اس کے لئے ہی ہیں، نور بانو معصومیت سے اپنے شوہر کا منہ تکنے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کل ہی اس کے ہاتھوں سے چوڑیاں نوچ لی گئی تھیں۔ اور جوڑے سے فیتا کھینچ لیا گیا تھا اور آج پھر یہ کیسے... مگر جب قربان نے آگے بڑھ کر نور بانو کا ہاتھ بڑے ہی پیار سے دبایا اور دھیرے دھیرے چوڑیاں پہنانے لگا تو وہ شرم سے پانی پانی ہوگئی۔ حقیقت میں اس دن قربان کو یک بیک غصہ آگیا تھا اس لئے وہ آپے سے باہر ہوگیا تھا، ورنہ جس کا ہاتھ اس قدر نازک اور ملائم ہو اس پر وہ ہاتھ کیسے اٹھا سکتا تھا۔ "تم نے یہ کیوں بیکار خرچ کیا،" آخر نور بانو نظریں نیچی کئے اور مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "تمہارے پاس ایک اچھا کُرتا تک نہیں، لنگی بھی پھٹ گئی ہے، اور بنیان جگہ جگہ سے مسک گئی ہے" اور جب وہ اپنی گول مٹول خوبصورت آنکھوں سے اپنے شوہر کو دیکھنے لگی تو قربان نے اختیار اپنی بیوی کو اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔ "تو ایک بار مجھے دیکھ کر ہنس دے نور، اور بس" اس کھینچا تانی میں نور بانو کا جوڑا کھل گیا اور لانبے لانبے سیاہ اور چمکدار بال بکھر گئے۔ وہ ایک دل آویز مسکراہٹ سے جب اپنے بالوں کو سمیٹنے لگی تو نئی چوڑیوں کی کھنکھناہٹ نے قربان کو بے اختیار کر دیا اور اس نے اپنی بانہوں میں بھر لیا!

نور بانو ملک کے گھر کام کرنے جاتی تھی۔ کیا کرتی بیچاری ماہانہ چار روپے کیا کم تھے۔ ایک وقت کا کھانا بھی تو مل جاتا تھا اور کبھی کبھی تھوڑا دھان بھی۔ مالکن کی اُتری ہوئی ساری بھی اسے کبھی مل جاتی تھی۔ کس طرح ان چیزوں کو لینے سے انکار کیا جاسکتا تھا کچھ دن یونہی بیت گئے مگر ایک دن جب نور بانو دفعدار کے گھر سے آئی تو وہ فالسئی رنگ کی نئی ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ اس کا انگ انگ ساڑی کے اندر سے پھوٹا پڑ رہا تھا۔

"کہاں سے لے آئی پھر یہ ساڑی؟" قربان کی پیشانی شکن آلود ہوگئی تھی۔

شاکرہ بیگم

"لاتی کہاں سے؟ مالکن نے انعام دیا ہے، کیا تمہیں یاد نہیں کہ آج عید ہے" نور بانو مسکرانے لگی؟

"ہو گی عید۔ مگر ہمیں اس سے کیا؟ جب کہ کھیر پوری کی شکل تک دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ ایک نیا جھمکا تک خریدا نہ جا سکا، پھر عید کیسی'
قربان نے جب دوبارہ نور بانو کو دیکھا تو وہ غصہ سے کھول اٹھا۔ ساڑی کے ہر تار میں ابھی اسے دفعدار کی منحوس صورت دکھائی دینے لگی۔
چرچر کر کے اس نے ساری کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ عید غریبوں کے گھر آنے سے کتراتی ہے، تو پھر ایسے موقع پر ہمارے سیٹھانی بننے
کا شوق ہی کیوں ہو! سمٹ اور دھک کر اُسے ایک گوشہ میں پڑا رہنا چاہیئے۔ اتنا بناؤ سنگار اس کے لئے زیبا نہیں، شاید اُسے معلوم
نہیں کہ ساڑی کی ایک ایک چنٹ میں سانپ چھپا بیٹھا ہے۔ جو رینگتے رینگتے اوپر اس کی چھاتی میں ڈس لے گا۔ ساڑی کی
دھجیوں کو دیکھ کر نور بانو کو کوئی افسوس بھی نہ ہوا، وہ چپ ہو رہی۔ اس کا ضمیر پاک تھا۔ ساڑی لیتے وقت کسی کی بد نیتی
سے وہ واقف نہ تھی، اس نے پھر اپنی کالی پرانی اور پیوندوں سے اٹی ہوئی ساڑی خوشی سے پہن لی۔ مفلسی کی تاریکی کی طرح
پھٹی پرانی ساڑی میں اس کا حسن اور بھی نکھر گیا۔

رات کو نیند میں جب نور بانو اپنے شوہر کی باہوں کے گھیرے میں سمٹی جانے لگی تو دیئے کی ٹمٹماتی روشنی میں
قربان کو اپنی بیوی کا معصوم چہرہ بڑا ہی پیارا لگا۔ اسے یقین ہونے لگا کہ اس کی بیوی دنیا اور دنیا والوں کی ریاکاری سے
بالکل ناآشنا ہے۔ دوسرے دن قربان نے اپنی بیوی کو کام سے چھڑوا دیا۔ پردہ میں رہ کر بھوکے پیاسے دن بھلے ہی کاٹنے پڑیں
پر پاپ کی راہوں پر بھٹکنا کون عقلمندی ہے غریبی بھلے ہی تنگ کرے مگر عزت تو محفوظ رہے گی۔ عفت کا نیلام تو نہ
ہوگا۔ برے دنوں سے گھبرا کر خصوصاً غریبوں کو ایمان کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیئے۔

لیکن دفعدار جونک تھا جونک! بوڑھا ہو چلا تھا مگر تھا ہوس کا مارا۔ کبھی پاس دھان کی کٹائی ہو رہی تھی قربان کھیت
پر گیا ہوا تھا۔ موقع کو غنیمت جان کر دفعدار دبے پاؤں قربان کے آنگن میں چلا آیا۔ اسکے ہاتھوں میں کانوں کے جھمکے تھے چاندی
کے، پاؤں کی پازیب تھی اور گلے کی مالا جھلملا رہی تھی، بولا کہاں ہو بی بی جان! دیکھو کیا لایا ہوں میں تمہارے لئے، نور بانو
باہر نکل آئی اور دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی! دفعدار ہنس رہا تھا، ابھی ابھی سفید و سیاہ اور میلی داڑھی میں سے اس کے ٹیڑھے
میڑھے پان سے اٹے ہوئے گندے دانت، جھانک رہے تھے۔ چاندی کے ان گہنوں کو دیکھ کر پہلے تو اس کی طبیعت بہت
للچائی۔ مگر فوراً ہی دفعدار کے دل کا مطلب وہ تاڑ گئی۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا، سارے زیور اسے سانپ جیسے لگ
رہے تھے۔ اُسے یکبیک احساس ہوا کہ وہ اکیلی ہے۔ وہ خوف سے تھرا اٹھی۔ کیا کرے کیا نہ کرے۔ ایک تو وہ مالک تھا دوسرے
زمیندار کا گماشتہ، تیسرے دفعدار جو کچا گوشت چبا جانے والے بھیڑیئے سے کم نہ تھا۔ وہ سنبھلی اور آگ بگولا ہو کر بولی، چلے جائیے یہاں سے۔
ابھی اور اسی وقت۔"

"ارے میں تو مرا جا رہا ہوں تمہارے لئے اور تم کہہ رہی ہو یہاں سے چلا جاؤں۔ اس قدر بھی کٹھور نہ بنو بی بی جان! دیکھو یہ سارے زیور
تمہارے ہی لئے نئے بنوا کر لایا ہوں" دفعدار کے ہونٹوں پر بے حیائی کی ہنسی پھوٹ پڑی اور رال ٹپکنے لگی۔

"مجھے نہیں چاہیئے یہ زیور! چلے جائیے یہاں سے فوراً۔ نہیں تو میں شور مچا دوں گی" مگر شور مچانے سے پہلے ہی قربان اتفاق سے گھر جلد لوٹ آیا،
دھوپ میں جلتا بھنتا وہ آیا تھا اس لئے آنکھوں میں دھندلاپن سا آگیا تھا مگر اسے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اس کے گھر کے چبوترے پر دفعدار
چاندی کے گہنے لئے کھڑا ہے اور نور بانو کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک ہے اس کا خون کھول گیا۔ اس نے یہی سمجھا کہ نور بانو کی آنکھوں میں خوشی کی
چمک ہے۔ اس کا منع کرنے کے باوجود وہ غیر مرد کے سامنے کس طرح ڈھٹائی سے کھڑی ہے اور اس کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ان دونوں میں
کتنا ٹھٹھا مذاق ہوا ہوگا۔ کتنی ہی چھیڑ چھاڑ ہوئی ہوگی، کتنی ہی ملی جلی شرطیں آپس میں باندھی گئی ہونگی، قربان کے سر پر خون سوار تھا۔ بیچارے کی طرح

شاد۔ بیتی

اس نے چاروں طرف دیکھا۔ نور بانو اسی طرح بے پردہ کھڑی ہوئی تھی، وہ دھان کاٹتے کاٹتے ہنسیا بھی کھیت ہی پر چھوڑ آیا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور دھاڑا، "کیوں آئے ہو تم یہاں،" دفعدار بغلیں جھانکنے لگا، پھر ہکلاتے ہوئے بولا، "میں۔ میں۔ یہ دیکھنے آیا تھا کہ تم بھی بااس دھان کاٹنے کھیت پر گئے ہو کہ نہیں!

قربان نے ٹوکا! "تم کھیت پر آکر بھی دیکھ سکتے تھے۔ میری غیر حاضری میں میرے گھر کے آنگن تک آنے کی تمہیں اتنی جرأت کیسے ہوئی؟" دفعدار اب سنبھل گیا تھا۔ زیور کرتے کے جیب میں ٹھونس لئے اور ہنستے ہوئے کہا! "جرأت! اندر باہر یہ سب میری زمین ہے۔ جہاں چاہوں جب چاہوں میں جاؤں گا آؤں گا، مجھے کون روک ٹوک سکتا ہے بھلا،" قربان غصہ سے بے قابو ہو گیا۔ لپک کر اس نے دفعدار کی داڑھی پکڑ لی اور بس گتھم گتھا شروع ہو گئی۔ اور ادھر نور بانو ڈر کے مارے اندر بھاگ گئی۔ دفعدار کے ہاتھ میں لاٹھی تھی)۔ قربان نے یہ نہ دیکھا تھا۔ بیچارہ غریب آدھا پیٹ کھانے والا مریل کسان اور دفعدار مفت کی روٹی توڑنے والا مسٹنڈا۔ ایک دھکے سے ہی قربان زمین پر آ رہا۔ پھر دفعدار کی لاٹھی ہوا میں لہرائی اور قبل اس کے وہ قربان کے سر پر پڑتی نور بانو دوڑتی ہوئی اندر سے چلی آئی اور باز کی طرح اس پر جھپٹ کر لاٹھی چھین لینے کے لئے زور لگانے لگی۔ مگر لاٹھی چھڑا نہیں پا رہی تھی، اس چھینا جھپٹی میں اس کا جوڑا کھل گیا اور ساری سینہ پر سے سرک گئی۔ اس منظر کو نہ جانے کس روپ میں دیکھا قربان نے کہ اس کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی، جھپٹ کر اس نے نور بانو کے بال مٹھی میں سمیٹ لئے اور چلا کر بولا، "پردہ سے باہر تو کیوں آئی، کلنکنی۔ اور غیر مرد کے ساتھ چھینا جھپٹی کرتے شرم نہیں آئی تجھے۔ نور بانو کی گرفت لاٹھی پر سے ڈھیلی پڑ گئی اور دفعدار نے پھر لاٹھی اٹھائی اور قربان کے دے ماری۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا گر پڑا۔ اس نے یہی سمجھا کہ نور بانو کے اشارہ پر ہی لاٹھی ماری گئی ہے۔ وہ اپنی سدھ بدھ سب کھو بیٹھا۔ اور پاگل کی طرح وہ اٹھ کھڑا ہوا اور چلا اٹھا۔ ایک طلاق، دو طلاق، تین طلاق!!! اور ختم، ساری اتھل پتھل آن کی آن میں ختم ہو گئی اور سب خاموش جہاں تھے وہیں رہ گئے کسی کی سمجھ میں بھی نہ آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو گیا ہے، قربان سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ دفعدار کے ہونٹوں پر ایک بھونڈی سی مسکراہٹ کھیل اٹھی اور وہ اپنی لاٹھی سنبھالے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

نور بانو کا چہرہ غصہ سے لال ہو رہا تھا۔ قربان کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ یہ سب پل دو پل میں کیا ہو گیا۔ چاروں طرف اسے اندھیرا ہی اندھیرا نظر آنے لگا! دھیرے دھیرے لوگ جمع ہونے لگے۔ اور دھیرے دھیرے اس کے منتشر خیالات بھی ایک جا ہونے لگے۔ اب اسے اپنی غلط فہمی کا احساس ہونے لگا۔ وہ کھڑا ہو گیا اور نور بانو سے کہا! "تو فکر مت کر نورو۔ میں سب سمجھ لوں گا، تو اندر جا نور بانو کی، قربان کے اس جملہ سے ڈھارس ہوئی اور سچ مچ جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو وہ آنچل سنبھالتی ہوئی اندر چلی گئی، شوہر کی بیوی کی طرح مگر اس سے کیا ہو سکتا تھا۔ تیر کمان سے چھوٹ چکا تھا۔ لوگوں میں کانا پھوسی ہونے لگی۔

دفعدار کے اکسانے پر بالآخر پنچایت بیٹھی۔ بحث چھڑی۔ نیا نئے خیالات ہوئے۔ قربان نے اپنی غلط فہمی قبول کر لی۔ اور غصہ کے عالم میں جو کچھ بھی کہہ دیا تھا اس کے لئے معافی مانگی مگر سرپنچ نے ہاتھ کے اشارہ سے قربان کو چپ کر دیا۔ اور فیصلہ صادر ہوا "طلاق دی ہوئی عورت پرائی عورت ہوتی ہے اس لئے اس پر پہلے شوہر کا کوئی اختیار نہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسے اپنے گھر میں بند نہیں رکھ سکتا۔ شادی کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے ۔" ایک ویران خاموشی چھا گئی۔ دفعدار ہنسنے لگا، قربان رو پڑا۔ غصہ میں منہ سے نکلی ہوئی بات اس قدر اہم ہو سکتی ہے اور ایک شادی شدہ عورت یک بیک پرائی بن جاتی ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ سرپنچ کہے جا رہا تھا، "پتنگ کٹ جانے پر ڈور لپیٹنے سے کیا پتنگ واپس لائی جا سکتی ہے؟ غصہ کے عالم میں ہو یا صحیح حالت میں طلاق، طلاق ہی ہے" دفعدار نے دخل اندازی کی۔ "اس نے تو دن دہاڑے چلا کر طلاق دی ہے، اس لئے اس کا نور بانو پر کوئی اختیار نہیں"

قربان بے بسی کے عالم میں سرپنچ کی جانب دیکھ رہا تھا، آخر اُس نے پوچھا کیا کسی طرح بھی اب وہ نُور بانو کو واپس نہیں لے سکتا ہے"
قربان" سرپنچ نے کہا "ایک راستہ ہے۔ وہ یہ کہ نور بی بی کو اب تین مہینے عدت کے پورے کرنے ہوں گے۔ اس کے بعد اس کی کسی سے
شادی ہونی چاہئے۔ پھر وہ شوہر اُسے طلاق دیگا۔ طلاق کے بعد پھر تین مہینے اور عدت کے گذارنے ہونگے، اس کے بعد ہی تم اس سے
دوبارہ شادی کرسکتے ہو۔ اس سے پہلے تمہارا نور بی بی پر کوئی ادھیکار نہیں۔ سُنّت کے یہی اصول ہیں، مالک، غلام، امام، ملّا
منشی حتیٰ کہ یونین بورڈ کے صدر کے لئے بھی یہی اصول ہیں اور اسے سب مانتے ہیں" قربان کو جیسے بل ملا، اُس نے جلدی سے کہا
عدت کے دن تین مہینے نور بانو اس کے گھر گذار سکتی ہے، البتہ..." سرپنچ نے سر ہلاتے ہوئے ٹوک دیا۔ کیسی بات کرتے ہو قربان!
نور بی بی ایک جوان عورت ہے وہ کیسے کسی غیر مرد کے پاس رہ سکے گی"

قربان کا سر چکرانے لگا، "یا اللہ اب وہ نور بانو کے لئے غیر مرد ہوگیا" تھوڑی دیر سوچتا رہا پھر کہنے لگا کہ اس کے پاس
نہ سہی اُس کے پاس کے گاؤں میں اس کا ایک چچا ہے۔ نور بانو اس کے پاس تین مہینے عدت کے گذار دے گی، سرپنچ
نے کہا، ہاں، یہ ہوسکتا ہے مگر عدت کے تین مہینے کے بعد اب دیکھنا یہ ہے کہ کون اس عورت سے اس شرط پر شادی کریگا
کہ شادی کے بعد اسے پھر طلاق دیدے" سرپنچ نے حاضرین کی طرف دیکھا پھر کہا، کوئی ہے جو یہ وعدہ کرے اور اسے پورا
بھی کرے۔ ایک دو لمحہ خموشی رہی۔ دفعدار نے ایک نظر نور بانو پر ڈالی پھر مسکراتے ہوئے داڑھی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔
پنچایت کا فیصلہ مجھے منظور ہے" میں کروں گا شادی اس عورت سے" نور بانو پھوٹ پڑی اور دونوں ہتھیلیوں سے اپنا
منہ چھپا لیا۔ اُسے ایسے لگا جیسے اُس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے شوہر کو قبر میں سلایا ہے اور وہ بیوہ ہوگئی ہے"

عدت کے دن پورے کرنے کے لئے نور بانو قربان کے چچا کے گھر چلی گئی اور قربان بازی ہارے ہوئے جواری کی طرح ڈگمگاتا ہوا
اپنے گھر آگیا۔ ایک دو دن، پھر گھر کاٹ کھانے لگا۔ اپنے چچا کے محلّے ہی میں اس کا ایک دوست تھا۔ اپنے گھر پہ تالا ڈال کر وہیں رہنے
لگا۔ دھان کی کٹائی ختم ہونے تک وہ وہیں رہا۔ ایک آدھ جھلک اسے نور بانو کی میسّر ہو جاتی تھی۔ پھر وہ اپنے گھر لوٹ آیا۔
تالا کھولا تو گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ مگر اب عدت کے دن پورے ہونے میں کچھ ہی دن باقی رہ گئے تھے۔ اس امید پر کہ عدت
کے دن پورے ہونے پر پنچ کے فیصلے کے موجب دفعدار نور بانو سے شادی کرے گا اور ساتھ ہی طلاق بھی دے دیگا، اس کے بعد
نور بانو باقی کے تین مہینے عدت کے پھر اُس کے چچا کے گھر گذار دیگی پھر اس کے بعد...." اس کا چہرہ مسرت سے دمک اٹھا!
ایک دن رات گئے نور بانو سب کی نظر سے چھپ کر اپنے گھر آئی، مگر اس قدر گھبرائی ہوئی تھی وہ، جیسے اس نے
کوئی بڑا گناہ کیا ہو!

قربان سے ہٹ کر وہ الگ بیٹھی آنچل میں منہ چھپائے وہ سسکنے لگی، وہاں کوئی اور نہ تھا۔ لپک کر قربان نے اُسے اپنی آغوش
میں کھینچ لینا چاہا۔ اس نے چاہا کہ اُسے پاس بٹھا کر اس کے آنسو اپنے ہاتھ سے پونچھ ڈالے، مگر نور بانو نے ہاتھ کے اشارے سے
اُسے ٹوک دیا! "نہیں۔ میں ابھی حلال نہیں ہوئی۔ ابھی عدت کے دن پورے نہیں ہوئے ہیں صرف تمہیں دیکھنے آئی ہوں"
قربان نور بانو کو تکنے لگا! "کسقدر کمزور ہوگئی ہے نورو!" میرے دل کی طرح تیرا دل بھی مر گیا ہوگا۔ گورا چٹا بدن سانولا پڑ گیا
ہے۔ ساری چمک دمک ماند پڑ گئی ہے" نور بانو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی گھر میں بکھرے اور بے ترتیب
پڑی ہوئی ساری چیزوں کو قرینے سے سجانے لگی اور جب وہ جانے لگی تو قربان نے بے بسی سے کہا "کیا میں تجھے پا سکوں گا نورو"
"کیوں نہیں پاؤ گے۔ پنچائت کا فیصلہ جو ہے۔ کوئی ہنسی مذاق تو نہیں ہے۔ پائی پائی وصول کر لی جائے گی۔ آنکھ بند
کرکے کسی طرح دونوں عدت کے دن کاٹ دو اور اس کے بعد......" مگر نورو" قربان نے ٹوکا "کیا وہ بھیڑیا

تجھ پر دانت لگائے بنا چھوڑ دیگا۔ کیا وہ جونک تیرا خون چوسے بنا تجھے جانے دیگا۔ شادی کے بعد اگر وہ منہ پر تالا لگا لے اور کہدے میں نہیں دوں گا طلاق ؟"

زخمی سانپ کی طرح پھنکارتی ہوئی نور بانو بولی "پنچایت کیا اُسے ایسے ہی چھوڑ دیگی، اور پھر وہ میرا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ اس کی نیت ذرہ بھر بھی بدلتی ہوئی نظر آئی تو زہر نہ دے دوں گی۔ اس بدمعاش کی، آنکھیں نہ نکال لونگی اس بدتمیز کی۔ قربان نے دیکھا کس قدر سچائی ہے نور بانو کی آنکھوں میں۔ نور بانو نے جاتے ہوئے کہا کہ اگلے جمعہ کو عدت کے دن پورے ہوں گے اور اسی دن اس کا نکاح دفعدار کے ساتھ ہوگا اور اُسی دن اُسے طلاق بھی مل جائے گی "نور بانو نے کہا "تم گھبراؤ نہیں، ہمارے اچھے دن اب آتے ہی دیر نہیں" اور وہ تیز قدم چلی گئی۔ اور قربان خیالوں میں کھو گیا۔

جمعہ کے دن پنچائت کے فیصلے کے بموجب دفعدار نے نور بانو سے شادی کرلی۔ قربان وہاں موجود نہ تھا۔ وہ اپنے گھر میں بیٹھا نور بانو کا انتظار کرنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جیسے ہی نور بانو طلاق لیکر آجائے گی، وہ سے چچا کے گھر باقی عدت کے پورے کرنے کے لئے بھیج دیگا۔ اور اس کے بعد۔۔۔۔۔؟ مگر نور بانو لوٹ کر نہ آئی، شام سے رات بھی ہوگئی، قربان گھبرا گیا، کہیں اُس بھیڑیئے کی نیت میں فتور تو نہیں آگیا۔ کہیں اُس نے طلاق دینے سے انکار تو نہیں کر دیا، کہیں نور بانو اپنا سب کچھ ہاتھ نہ دے۔ رات بھر وہ سویا نہیں، اور سویرا ہوتے ہی وہ دوڑا ہوا اضطراب کے عالم میں پتہ لگانے کے لئے دفعدار کے گھر گیا۔ دعویدار کی طرح نہیں ایماندار کی طرح۔ دفعدار نے اُسے دروازہ پر ہی ٹوک دیا، "کہاں اندر زنانے میں گھسے جا رہے ہو، ٹھہرو یہیں ٹھہرو، میں اپنی جگہ پنچائت کے فیصلے پر اٹل ہوں۔ میں آج ہی بلکہ ابھی اسی وقت اس عورت کو طلاق دیدوں، مگر نور بانو سے میری شادی تو ہوئی ہے لیکن وہ ابتک میری بیوی بنی نہیں ہے، بیوی بنے بنا کس طرح طلاق دی جا سکتی ہے"۔

قربان بوکھلا گیا، اس نے فوراً پنچائت بٹھائی، دفعدار بلایا گیا۔ اور اس سے پوچھا گیا کہ پنچائت کے فیصلے کے بموجب وہ نور بانو کو کیوں طلاق نہیں دے رہا ہے۔ دفعدار نے اطمینان سے داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور کہا! میں آپ لوگوں کے فیصلے کے خلاف کب ہوں۔ میں ابھی اور اسی وقت اسے طلاق دینے کے لئے تیار ہوں، مگر اس سے شادی کا مطلب ابتک پورا نہیں ہو پایا ہے، نیز ابھی بچی نہیں ہوئی۔ شادی کے باوجود وہ مجھ سے بچ کر نکل جاتی ہے، وہ میری پرچھائیں تک سے دور بھاگتی ہے، دروازہ کی چٹخنی لگا کے میرے پاس سونے نہیں آتی۔ شاید وہ یہ سمجھے ہوئے ہے کہ نکاح کے دو بول کا ہی میں سزاوار ہوں باقی کچھ نہیں، اور میں اسے ایسے ہی طلاق دے دوں گا، اب آپ ہی بتایئے سرپنچ! کہ جب کوئی رشتہ ہی نہ جُڑا ہو تو اسے توڑنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ شادی کے صحیح معنے پورے کہاں ہوئے؟" اس نے اپنے گندے دانت باہر نکال دیئے اور داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک زوردار قہقہہ مارا۔

سرپنچ نے کہا "ٹھیک ہی تو کہتا ہے دفعدار، شادی کے بعد بیوی شوہر کے ساتھ ایک رات ہی نہ گذارے تو شادی کیسے جائز ہوئی، جب شادی جائز نہیں ہوئی تو پھر طلاق کیسی؟ نور بی بی کے حلال ہونے کا کوئی چارہ نہیں، اُسے بھکاری کی طرح بعد میں طلاق طلب کرنی ہوگی" پھر سرپنچ نے دفعدار کی طرف دیکھا۔ ہاں دفعدار، نور بانو جیسے ہی تمہاری بیوی بن جائے گی تمہیں پنچائت کے فیصلے کے بموجب فوراً اسے طلاق دینا ہوگا"

یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے سرپنچ! مجھے نہ پہلے انکار تھا اور نہ آج ہے" اُس نے داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ بھیڑیئے کے چنگل سے بچ نکلنے کیلئے نور بانو کیلئے کوئی راستہ بھی نہ تھا۔ رات اس نے دفعدار کے کمرہ میں جاکر چٹخنی لگالی، دوسرے دن چڑیوں کی چہچہاہٹ کے ساتھ تڑکے ہی دفعدار نے نور بانو کو طلاق دے دی۔

(بقیہ صفحہ ۴۹ پر دیکھئے)

یوسف اعظمی

خون کی لہر

راہزن کی طرح پھرتی ہے یہاں موجِ نسیم
لٹتا جاتا ہے گلستاں میں بہاروں کا سہاگ
خون میں ڈوبے ہوئے بادِ صبا آتی ہے
چپ ہے قاتل کی زباں، چپ ہے زبانِ خنجر
دلِ ناداں ہے کہ خاموش تماشائی ہے

موت کے شعلوں نے جھلسا دیا اِمروز کا جسم
ڈر ہے جل جائے نہ فردا کی حسیں پرچھائیں
موت کے سایہ میں پلتے ہیں، جواں ہوتے ہیں
حسرتیں دفن ہوئیں دِل کے نہاں خانوں میں
ذہن پر خوف ہے، آواز کے سائے ہیں محیط
موت بیٹھی ہے یہاں کتنی کمیں گاہوں میں
چپ ہے قاتل کی زباں، چپ ہے زبانِ خنجر
دلِ ناداں ہے کہ خاموش تماشائی ہے

ہم اندھیرے کو مقدر تو نہیں کہہ سکتے
سینۂ شب سے نئے دِن کو نکلنا ہوگا
ماتمِ تیرہ شبی سے بھی نہیں کچھ حاصل
شمع کی طرح جلیں جسم بھی تو کیا ہوگا؟
اہلِ دِل آؤ کہ ظلمات کا اب خون کریں!

اختر بستوی

ہم فنکار

ہم لوگ ہیں فن کار، صداقت کے پرستار
سچائی کا ہر حال میں کر دیتے ہیں اظہار
ہم وہ ہیں جو شمشیر سے چپ ہو نہیں سکتے
زنجیر سے، تعزیر سے چپ ہو نہیں سکتے
ہر قید کو، ہر ظلم کو سہہ سکتے ہیں ہم لوگ
حق بات کو سولی پہ بھی کہہ سکتے ہیں ہم لوگ
سقراط ہیں، پی جائیں گے ہم زہر کے پیالے
ہونٹوں پہ نہ برداشت کریں گے کبھی تالے

شعلے

دِل میں کم ظرف کے اُٹھتی ہیں حسد کی لپٹیں
آتشِ عشق سے عاشق کا جگر جلتا ہے
قلبِ پاکیزہ میں ہر عابدِ پاکیزہ کے
شعلۂ خواہشِ عرفانِ خدا پلتا ہے
مَیں نہ حاسد ہوں، نہ عاشق ہوں، نہ عابد اے دوست
پھر بھی انگاروں پہ ہر وقت رہا کرتا ہوں
میری قسمت میں ہے احساسِ خودی کی حدّت
اپنی ہی آگ میں دِن رات جلا کرتا ہوں

مقالہ

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

مخدوم کی شاعری

ترقی پسند تحریک نے اُردو کو جو چند ممتاز شاعر دیئے ہیں، اُن میں ایک باوقار نام مخدوم محی الدّین کا ہے۔ مخدوم کی شخصیت کئی پہلوؤں کی حامل تھی۔ ادبی طور پر وہ ترقی پسند رہے اُس وقت جبکہ ترقی پسند تحریک "تحریک" کی حیثیت سے ختم ہوچکی تھی۔ سیاسی طور پر وہ کمیونسٹ رہے اور اُس کی خاطر قید و بند کی صعوبتیں کو بھی گوارا کیا۔ مذہبی طور پر زاہدِ تنگ نظر نے اُن کو کافر جانا۔ اور کافر نے اگر اُن کو "مسلمان" نہ بھی سمجھا ہو، ایک اِنسان ضرور قرار دیا۔ میں سمجھتا ہوں مخدوم کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے۔ اِس طرح مخدوم کی شخصیت مختلف خانوں میں منقسم نظر آتی ہے۔ لیکن جو قدر ان سب میں ہم آہنگی اور ارتباط کا باعث ہے وہ مخدوم کی انسانیت ہے۔ وہ سیاست داں، مزدور لیڈر، شاعر اور جو کچھ بھی ہوں۔ اُنہوں نے زندگی کا مطالعہ بس ایک اِنسان کی حیثیت سے کیا ہے۔ گہرا جائزہ لیں تو مخدوم کی شاعری میں فرانس کی HUMANIST تحریک کے اثرات محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ ممکن ہے یہ اثرات شعوری طور پر قبول کئے گئے ہوں۔ لیکن لاشعوری اور تحت الشعوری طور مخدوم نے "اِنسانیت پرستوں" کی طرح سائنس کی برکتوں سے استفادہ کرتے ہوئے دانشورانہ آزادی سے کام لیا اور جس طرح "اِنسانیت پرستوں" نے یونانی کلاسیکی اقدار سے اِکتساب کیا، مخدوم کے یہاں بھی اُردو اور فارسی کی کلاسیکی شاعری سے اکتساب ملتا ہے، بلکہ ترقی پسند تحریک میں مخدوم اور فیض دو شاعر ہی ایسے ہیں۔ جنہوں نے اپنے ہمعصروں سے زیادہ اُردو اور فارسی کی صحت مند شاعرانہ روایات کی پابندی کرتے ہوئے عصرِ حاضر کے معاشرتی اور سیاسی تقاضوں سے ہم آہنگی پیدا کی ہے۔ اِن دونوں کی شاعری روایتوں اور بغاوتوں کا خوبصورت اور متوازن اِمتزاج ہے، جس نے اپنی شائستگی، تہذیب، سنجیدگی، سلیقہ مندی اور اہتمام کے باعث اُردو شاعری کو نکھارنے اور سنوارنے میں اہم حصّہ ادا کیا ہے۔

کم و بیش ہر شاعر کی طرح مخدوم نے بھی اپنی شاعرانہ زندگی کا آغاز رُومانیت سے کیا ہے لیکن جیسا کہ مخدوم کے پاس شائستگی اور تہذیبی اقدار کا رچاؤ ملتا ہے اُن کی رومانی شاعری میں آوارہ مزاجی، اخلاقی قدروں کا زوال اور لذّت پسندی نہیں ہے اِس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اُن کے محبوب کی جو تصویر اُن کے کلام میں ملتی ہے وہ کوئی شاہدِ بازاری یا صاحبِ بالاخانہ نہیں بلکہ پاکیزہ معاشرہ کا فرد ہے۔ تہذیبی اقدار پر ایقان رکھتا ہے اور وہ محبوب ہی نہیں محب بھی ہے۔ وہ بھی اُسی جذب و شوق سے مخدوم کا انتظار کرتا اور اُس کی پرستش کرتا ہے جیسا کہ اُس کی پرستش مخدوم کے ہاں ملتی ہے (مثلاً "جب رہا کرتا ملاقاتوں کا باہم انتظار" نظم یاد ہے)۔ اِسی چاہنے اور چاہے جانے اور ملاقاتوں کے باہم انتظار کی کیفیت نے ایک دوسرے کے احترام پر مجبور کیا اور جب ایک دوسرے کا احترام ملحوظ ہو تو زندگی ہو یا شاعری، سلیقگی، شرافت اور پاکیزگی سے عبارت ہو جاتی ہے۔ یہ دو شعر کتنے

بصورت اور کس قدر حسین تصور کے حامل ہیں ؎

تھرتھراتے ہوئے آنچل سے دھڑکتے دل سے
تیرے رُخ سے ترے آنچل کو ہٹانا ہی پڑا

ہر طرف پھیلی ہوئی ہے چاندنی ہی چاندنی
جیسے وہ خود ساتھ ہیں اُن کی جوانی ساتھ ہے

مخدوم کی اِس نوع کی رُومانی نظموں میں "طُور"، "سجدہ" — "لمحۂ رخصت"، "یاد رہے"، "انتظار" اور "چارہ گر" خاص کی چیزیں ہیں۔ ان میں سوائے "چارہ گر" کے تمام منظومات اِبتدائی دَور کی ہیں جن میں اخلاص اور گداز تو ضرور ہے لیکن فضا جذباتی ہے۔ شاعر نے محسوسات کے اظہار میں ریاضت سے کام نہیں لیا ہے لیکن "چارہ گر" کی تخلیق کا دَور شاعر کے خیالات و احساسات کی پختگی، فکر کی گہرائی، تجربات کی شدّت اور مشاہدات کی وسعت کا دَور ہے اور پھر ابتدائی دَور کی طرح محاکاتی انداز یا محض واقعات کا بیان نہیں۔ تاثرات کا فنکارانہ اظہار ہے۔ نزاکت اور ندرت کے ساتھ دل میں پزیرائی کرتا ہوا۔ ساری نظم میں یہی کیفیت ہے۔ آخری چند مصرعوں میں تو یوں لگتا ہے کہ یہ کیفیت سارے ماحول پر چھا چکی ہے ؎

یہ بتا چارہ گر
تیری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبّت بھی ہے ؟
کچھ علاج و مداوائے اُلفت بھی ہے ؟

لیکن مخدوم کے یہاں رُومانیت کا صرف یہی محدود و محصور تصور نہیں جس کا دائرہ محبّت اور محبوب تک ہو۔ بلکہ اُن کی اِنقلابی اور مسائلی شاعری میں بھی رومانیت کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ مخدوم کی شاعری میں انقلابی فکر ضرور ہے لیکن اِسی کے ساتھ رومانیت کی شگفتگی بھی جلوہ آرا ہے۔ اِس اِنقلاب اور رومان میں کچھ ایسے حُسن و اہتمام سے فطری طور پر ہم آہنگی ہے کہ یہ کہنا درست ہوگا کہ مخدوم کی شاعری رومانی اِنقلابی یا اِنقلابی رومانی ہے۔ مخدوم کی اِسی رومانی انقلابی یا انقلابی رُومانی نظموں میں "قمر"، "سپاہی"، "انقلاب" اور اِدھر اُن کے آخری دَور کی ایک معروف نظم "چاند تاروں کا بن" ہے۔ لیکن رومان و انقلاب کا جس قدر کامیاب اور پُرتاثیر امتزاج "سپاہی" میں ہے۔ مخدوم کی شاید ہی کسی نظم میں ہو۔ ترقی پسند تحریک نے بھی بحیثیت مجموعی اُردو شاعری کو ایسی نظمیں بہت کم دی ہیں۔ "سپاہی" میں رُومان اور انقلاب کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دینا یا اُن کے مابین حدِ فاصل قائم کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ایک بھیانک پس منظر کے باوجود لب و لہجہ میں کتنی گھلاوٹ، شیرینی، حلاوت اور نغمگی ہے ؎

کتنے سہمے ہوئے ہیں نظارے
کیسا ڈر ڈر کے چلتے ہیں تارے
کیا جوانی کا خون ہو رہا ہے
سُرخ ہیں آنچلوں کے کنارے

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے

رُومانی انقلابی شاعری کی یہ پرچھائیں صرف نظموں کی حد تک ہی نہیں۔ "گُلِ تر" میں جو کوئی غزلیں شامل ہیں اُن میں بھی رُومان و انقلاب ایک دوسرے میں سمو گئے ہیں۔ گویا شاعر کو رومان اور انقلاب میں سے کسی کا ایثار گوارا نہیں۔ اُس کے ہاں ان دونوں نے باوقار طریقہ پر ایک دوسرے سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ یہ فضا کئی غزلوں میں موجود ہے۔ لیکن میرے نزدیک "سیماب وشی، تشنہ لبی، باخبری ہے" والی غزل اس زاویہ سے ایک کامیاب غزل ہے۔ خصوصاً اِن دو اشعار کی جتنی بھی تحسین ہو کم ہے ؎

ہر شام سجائے ہیں تمنا کے نشیمن — ہر صبح مئے تلخیِ ایّام بھی پی ہے
دھڑکا ہے دلِ زار ترے ذکر سے پہلے — جب بھی کسی محفل میں تری بات چلی ہے

"سُرخ سویرا" کی شاعری کا دَور ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کا دَور ہے۔ باغیانہ افکار، تخریبی کردار، احتجاجی لب و لہجہ اور مستقبل کا جذباتی تصوّر، یہ اُس دَور کے ادب کے عمومی میلانات ہیں۔ مخدوم تو خیر ایک شاعر ہی نہیں آزادی کی جدوجہد کے ہراول دستے کا سپاہی اور میدانِ کارزار کا مجاہد رہا ہے۔ اُن کے ہاتھ میں قلم ہی نہیں تلوار بھی تھی۔ وہ ان میلانات کے حامل کیوں نہ ہوتے۔ لیکن "باغی"، "جنگ" اور "موت کا گیت" جیسی منظومات

کسی دَور میں خواہ مقبول رہی ہوں مخدوم کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں۔ مخدوم کے مزاج میں سنجیدگی، متانت، توازن اور تہذیب ہے "باغی" اور اس نوع کی دیگر منظومات میں جو گونج گرج، کڑک اور جھنکار ہے وہ اُپجی اور فطری نہیں، روایتی اور تقلیدی ہے۔ یہ وہ دَور ہے جبکہ بنگال کے آتش نوا شاعر قاضی نذرالاسلام سے متاثر ہوکر ہندوستان کی دیگر زبانوں میں اُسی کے آہنگ کو اختیار کیا جا رہا تھا۔ ہندی میں نرالا، مرہٹی میں ودّا گھول اور اُردو میں جوش نے اِس طرز کو اپنانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ کامیابی کسی کو حاصل نہ ہو سکی جو نذرل کے حصّہ میں آئی۔ نذرل کی کامیابی کا سبب یہ ہے کہ اُس کی زندگی، اسلوب اور شاعری سب کچھ باغیانہ ہے اور کئی ایک کے نزدیک اِس تقلید کی حقیقت کوّے اور ہنس کی چال کا انجام رہی ہے۔ غنیمت ہے کہ مخدوم نے اِس طرز کو مزید روا نہیں رکھا۔ ویسے جن نظموں میں اُس کا باغیانہ لب و لہجہ بھی اعتدال پر ہے اُن میں سیلانی کیفیت نہیں ملتی ــــ اگرچہ ایسی نظموں میں بھی بغاوت کی روح موجود ہے لیکن الفاظ کے انتخاب میں احتیاط و اہتمام کے باعث دلآویزی اور دلنوازی پیدا ہو چکی ہے۔ ایسی دل نواز نظموں میں "سپاہی" کے علاوہ "جنگ آزادی"، "مشرق"، "آزادیٔ وطن" اور آخری دَور کی نظموں میں "چُپ نہ رہو" خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں۔ "باغی" کا پہلا ہی بند ہے۔ ؎

رعد ہوں، برق ہوں، بےچین ہوں پارا ہوں میں
خود پرستار، خود آگاہ، خود آرا ہوں میں۔۔!
گردنِ ظلم کٹے جس سے وہ آرا ہوں میں
خرمنِ جَور جلا دے وہ شرارا ہوں میں
میری فریاد پر اہلِ دُوَل انگشت بدوش
لاتیر خون کے دریا میں بہانے دے مجھے

اور کانگو کے انقلابی قائد لوممبا کے قتل پر لکھی گئی نظم "چُپ نہ رہو" کے آخری مصرعے ہیں ؎

خیر ہو مجلسِ اقوام کی سُلطانی کی
خیر ہو حق کی، صداقت کی، جہاں بانی کی
اور اونچی ہوئی صحرا میں اُمیدوں کی صلیب
اور اک قطرۂ خوں چشمِ ستمگر سے ٹپکا
جب تک دَہر میں قاتل کا نشاں باقی ہے
تم مٹاتے ہی چلے جاؤ نشاں قاتل کے
روز ہو جشنِ شہیدانِ وفا چُپ نہ رہو
بار بار آتی ہے مقتل سے صدا چُپ نہ رہو
چُپ نہ رہو، چُپ نہ رہو۔

ہر دو نظموں میں شاعر استبدادی اور ظلم قوتوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے لیکن "باغی" میں ایک حد تک سطحیت پیدا ہو گئی ہے لیکن "چُپ نہ رہو" میں الفاظ اور آہنگ کا انتخاب یں ایک عمر کا تجربہ پوشیدہ ہے اِس لئے عمق اور گہرائی موجود ہے اور تاثیر کئی گنا افزوں ــــــــــــــ مخدوم کے ہاں عمق اور تاثیر کی ایک اور وجہ بھی ہے جس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بیشتر ترقی پسند شاعر آج تک یا ایک عرصہ تک خطابت کا شکار رہے ہیں۔ خطیبانہ انداز کہیں کہیں اور کبھی کبھی تو رنگ دے جاتا ہے۔ لیکن بسا اوقات یہ رنگ شاعروں کو لے ہی ڈوبتا ہے۔ خطابت کے باعث کلام میں شعریت مجروح ہو جاتی ہے ایسے شاعروں کے برعکس عوام سے بعید قریب ہونے کے باوجود مخدوم نے اپنی شاعری کو خطابت سے آلودہ نہیں کیا۔ اور اسی طرح اُن کے ہاں نعرہ بازی بھی نہیں ملتی یا اگر ملتی بھی ہے تو بے حد کم ــــ اور اس نعرہ بازی کے فوراً بعد وہ مثبت اور تعمیری اندازِ فکر اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً اُن کے ہاں اِس زمینِ موت پرورہ کو ڈھانے کا عزم ہے تو اُسی کے ساتھ اک نئی دنیا اور نیا آدم بنانے کی خوش گوار تمنا بھی۔

مخدوم کے ہاں یہ گونج گرج، ہنگامہ آرائی اور جب جب کہیں کہیں بھی جو نعرہ بازی "سُرخ سویرا" ہی میں پائی جاتی ہے لیکن جیسے جیسے حالات بدلتے گئے سماجی تقاضوں اور اُن کی نوعیت میں تبدیلی آئی۔ عوامی شعور جلا پایا، ذہنی ارتقا ہوا اور خود شاعر کے میلانات میں پختگی آئی اور وہ نکھرنے لگے، کلام میں قرارِ ٹھہراؤ اور وزن و وقار بھی بتدریج افزوں ہوتا گیا۔ "سُرخ سویرا" کے

بعد مخدوم کی سیاسی مصروفیات اگرچہ آئے دن افزوں ہوتی گئیں۔ مستحسن بات یہ ہے کہ شاعر کا خود تنقیدی رجحان بھی ترقی پاتا گیا۔ سبط حسن نے مخدوم کے موسومہ مکتوب مورخہ ۲۵ دسمبر ۱۹۴۳ء میں جس کو اِشاعت گھر حیدر آباد کے ناشرین نے "سُرخ سویرا" کے پہلے ایڈیشن جنوری ۱۹۴۴ء کے دیباچہ کی حیثیت دے دی ہے" کے آخر میں لکھا ہے :۔

"کل ایک صاحب سے تمہاری شاعری پر بحث ہوئی۔ اُنہیں تمہاری فنّی خامیاں بہت کھٹکتی ہیں۔ میں نے کہا آپ کا ارشاد بجا و درست، مخدوم الفاظ کے انتخاب میں احتیاط نہیں برتتے۔ بعض اوقات بندشیں ڈھیلی ہوتی ہیں۔ محاورے بھونڈے ہوتے ہیں۔ اِن خامیوں کے باوجود آپ کو مخدوم کی جدّتِ فکر، ادبی صداقت اور خلوص اور خود اعتمادی سے تو اِنکار نہیں ہو سکتا۔ یہی تو اُس کے سِن و سال کا حاصل ہے۔ فنّی خامیاں تو خشک پتّوں کی طرح تھوڑے دِنوں میں خود ہی جاتی رہیں گی۔" [1]

فنّی ریاضت خود تنقیدی اور آپ اپنے احتساب کے سبب یہ خامیاں تو واقعی خشک پتّوں کی طرح جاتی رہیں۔ "سُرخ سویرا" کی بعد کی بیشتر غزلوں کے علاوہ نظموں "قید" "چارہ گر" "چاند تاروں کا بن" "رقص" "چُپ نہ رہو" "لختِ جگر" "شب کا خواب" اور "وقت ـــــ بے درد مسیحا" میں بہار آئی ہے، پُر بہار، شوخ و شاداب، رعنائیوں و برنائیوں کے ساتھ۔ لہجہ میں بانکپن ہے، فکر میں گرمی ہے، سوز و گداز ہے اور کھنک ہے۔ اِس کی وجہ مخدوم ہی کے الفاظ میں "گُلِ تر" میں "اپنے پڑھنے والوں سے" میں سُنیئے :۔

"یہ فرق میری نظر میں ایک نیا پن ہے جو عمر، تجربہ اور خود عصرِ حاضر کی نوعیت کے اپنے ماسبق سے مختلف ہونے کا نتیجہ ہے جو سماجی اور شعوری ارتقاء کی نشاندہی کرتا ہے۔ پھر بھی اِنسان دوستی اور سمٹا ہوا جمالیاتی اثر قدرِ مشترک ہے۔" [2]

جیسا کہ خود مخدوم کو اس کا اِحساس ہے میں نے اِس مضمون کے آغاز میں مخدوم کی اِنسان دوستی کا تذکرہ کیا ہے۔ شاعری کے مختلف اُدوار میں یہ قدرِ مشترک ہونے کے ساتھ ساتھ ارتقاء پذیر، مستحکم اور گہری ہوتی گئی ہے۔ اُن کی تمام نظموں میں یہ جذبہ والہانہ انداز میں سب سے زیادہ نظم "قید" میں ہے۔ اِس حد تک کہ جیسے "سینۂ شمشیر سے باہر ہو دم شمشیر کا"۔ اِنسان دوستی کی اس سے تابندہ مثال اور کیا ہوگی ؎

سیکڑوں لاکھوں دھڑکتے ہوئے اِنسانوں کے دِل
جَورِ شاہی سے غمیں، جبرِ سیاست سے نڈھال
جانے کس موڑ پہ یہ دھن سے دھماکہ ہو جائیں
سالہا سال کی افسُردہ جوانی کی اُمنگ
طوق و زنجیر سے لپٹی ہوئی سو جاتی ہے
کروٹیں لینے میں زنجیر کی جھنکار کا شور
خواب میں زیست کی شورش کا پتہ دیتا ہے
مجھے غم ہے کہ مرا گنجِ گراں مایۂ عمر
نذرِ زنداں ہوا
نذرِ آزادیٔ زندانِ وطن کیوں نہ ہوا۔

"سُرخ سویرا" میں مخدوم کے ذہنی اور ادبی ارتقاء کا پتہ بھی چلتا ہے۔ یہ ارتقاء "گُلِ تر" میں مکمل ہو تا گیا ہے۔ "سُرخ سویرا" میں رُومانی نظموں کی تعداد کافی ہے لیکن آخری نظموں ـــــ "استالین" "جانبازانِ کیور" اور "بنگال" میں اِنقلابی عزم مستحکم اور محکم ہو تا گیا ہے۔ شاعر ایقان کی دولت سے مالا مال، رجائیت کا حامل، اُمیدوں کی شمعیں جلائے اور آرزوؤں کے پھول کھلائے ہے۔ "بنگال" کا آغاز ہی اِس بند سے ہوتا ہے ؎

ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم
خون کا بحرِ پُر دریا پار کر سکتے ہیں ہم
کانگریس کو لیگ کو بیدار کر سکتے ہیں ہم
زندگی سے ہند کو سرشار کر سکتے ہیں ہم

---

[1] "سُرخ سویرا" صـ [illegible] [2] گُلِ تر صـ [illegible]

شاعرِ منبئی

اپنے آپ پر کس قدر اعتماد ہے۔ بھرپور اور توانا ــــــ

"سرخ سویرا" اور "گلِ تر" میں اُن کے ادوار اور ناموں کا فرق واضح ہے لیکن "گلِ تر" کی کئی نظموں اور غزلوں میں تر و تازگی شگفتگی اور شادابی کے باوصف ایسا محسوس ہوتا ہے کہ "شاعر" حزین و ملول، مایوس و ناامید اور الجھا الجھا سا ہے۔ "گلِ تر" کے بعد کے کلام میں یہ رنگ بہت واضح اور نمایاں ہے۔ یہ مخدوم کی دروں بینی، ہج یا اپنی ذات میں کھو جانے یا "انا" کی سیاحت کے رجحان کے سبب نہیں بلکہ اس کے برعکس یہ زندگی اور زمانہ کے گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ تیسری جنگِ عظیم کے منڈلاتے خطرات، سیاسی قدروں کے بکھرتے جانے، اخلاقی اقدار کے زوال، نظم و نسق کی ابتری اور انسان کے ہاتھوں انسان کی تباہی کا عکس ہے اور ردِ عمل بھی ــــ

مخدوم نے اپنی شاعرانہ زندگی کے آغاز کے چند سال بعد ہی سیاست میں حصہ لیا اور پھر وہ سیاسی نظمیں بھی کہنے لگے۔ "جنگ" مخدوم کی پہلی سیاسی نظم ہے۔ اس کے بعد قومی ہو یا بین الاقوامی، تقریباً ہر اہم سیاسی واقعہ پر جس کا تعلق سیاستدانوں سے نہیں عوام سے رہا ہے۔ انہوں نے اپنے جذبات کا منظوم اظہار کیا ہے۔ مخدوم کی سیاسی نظمیں صرف جذباتیت کی حامل اور نعرہ بازی نہیں اور نہ انہوں نے روایتی طور پر سیاسی شاعری کی ہے۔ سیاسی نظموں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی نظر اقوامِ عالم کی سیاست اور انقلابی تحریکات پر گہری تھی۔ لیکن جب سیاست کے دھارے ہی بگڑ چکے ہوں اور چہرہ مسخ ہی ہو گیا ہو۔ تو شاعر لاکھ رجائیت کے باوجود اس ہول کا حامل ہو جاتا ہے جو اس کے اکناف میں موجود ہے۔ مخدوم کے یہاں یہ فضا پہلی بار "چارہ گر" میں ملتی ہے۔ چونکہ "چارہ گر" ایک رومانی نظم ہے اس لئے یہ فضا دھندلی دھندلی ہے۔ "احساس کی رات" میں بھی دھندلکے برقرار ہیں۔ طوفانِ حوادث کے نرغے اور ہوس کی یلغار، شاعر کو اپنے احساسات کے سرد ہو جانے کا خدشہ ہے۔ کئی سوال شیشۂ ذہن پر ابھر آتے ہیں ؎

جسم کا، جان کا، پیمانِ وفا کیا ہوگا؟
تیرا کیا ہوگا میرے تارِ نفس
تیرا کیا ہوگا اے مضرابِ جنوں
یہ دہکتے ہوئے رخسار
یہ مہکتے ہوئے لب
یہ دھڑکتا ہوا دل
شفقِ زیست کی پیشانی کا رنگیں قشقہ
کیا ہوگا ــ ؟

اس "کا کیا ہوگا ــ ؟" کا جواب شاید کچھ بھی نہیں۔ جو بھی "ہے" وہ یہی ! ؎

یہ زرد زرد اجالے یہ رات رات کا درد
یہی تو رہ گئی اب جانِ بیقرار کی بات

واقعات کی جس پیش رفت نے مخدوم کو کہیں زیادہ متاثر کیا وہ خصوصاً بین الاقوامی سطح پر کمیونسٹ دور کا بحران ہے۔ روس اور کمیونسٹ چین کی نظریاتی کشمکش نے عالمی سیاست پر جو اثرات بھی مرتب کئے ہوں کمیونسٹ تحریک کو اس سے زبردست نقصان پہنچا۔ کاری ضرب ! یہاں تک کہ ہر ملک میں کمیونسٹ دو، دو خانوں میں بٹ گئے۔ مفادات ایک دوسرے سے ٹکرائے اور الزامات و جوابی الزامات کا سلسلہ شروع ہوا ــ نہ چاہتے ہوئے بھی مخدوم کو ان پیچ و خم سے ہم آہنگ ہونا پڑا۔ با دلِ ناخواستہ انہوں نے خود کو بھی ایک خانے میں رکھا۔ لیکن ان پر جو ردِ عمل ہوا وہ ناقابلِ بیان ہے۔ ممکن ہے مخدوم نے سیاسی حیثیت سے اس خصوص میں اپنے تاثرات کا اظہار اتنے واضح الفاظ میں نہ کیا ہو۔ لیکن ایک شاعر کی حیثیت سے یوں لگتا ہے انہوں نے اس تقسیم کو دائیں اور بائیں بازوؤں کو قبول نہیں کیا۔ حسرت و یاس کا عالم ہے۔ متحدہ ماضی یاد آتا ہے جو خوشگوار بھی تھا اور تابناک بھی ــــ اور اسی کے ساتھ دل میں ہزاروں سوال ابھر آتے ہیں۔ یہ کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ اور کب ہوا؟ ــ "سب کا خواب" نہ صرف مخدوم کی کامیاب ترین نظموں میں ہے بلکہ اس کو دنیا بھر کی سیاسی نظموں کے انتخاب میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ شاعر کے جذبات کی روانی کا اندازہ دشوار ہے۔ جیسے والگا، یانگسی، نیل اور گنگا ایک ساتھ بہہ رہے ہوں ؎

لاکھ دِل ہوتے تھے لیکن
جب دھڑکتے تھے تو اک دِل کی طرح
جب مچلتے تھے تو اک دِل کی طرح
جب مہک اُٹھتے تھے تو دنیا کا مہک اُٹھتا تھا دِل
والگا کا، یانگسی کا، نیل کا، گنگا کا دِل
آپ میں اِک گرمئ اِحساس ہوتی تھی
نہیں معلوم وہ کیا ہو گئی
چاندنی سی میرے دِل کے پاس ہوتی تھی۔
نہیں معلوم وہ کیا ہو گئی

اِس گرمئ اِحساس اور چاندنی سے محرومی مخدومؔ کے آخری دَور کی شاعری کا ایک طرح سے عنوان بن جاتی ہے۔ اِس پس منظر میں شاعر کو ہر طرف خموشی، اُداسی، سکوت اور مُردنی چھائی دکھائی دیتی ہے۔ ایک سنّاٹے کی کیفیت۔ چہار جانب بس یہی سنّاٹا۔

سنّاٹا، سنّاٹا، سنّاٹا ——— !!!!

سنّاٹا ——— مخدومؔ کی شاعری میں یہ لفظ (جہاں کہیں بطورِ اِشارہ استعمال ہوا ہے) بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ "سُرخ سویرا" مخدومؔ کی شاعری کے کم از کم نصف سرمایہ پر مشتمل ہے لیکن "سُرخ سویرا" میں یہ لفظ صرف دو مواقع پر آیا ہے۔ اور ہر دو مواقع پر اِس کی اِشارتی حیثیت نہیں۔ "پشیمانی" ایک ٹھیٹ رومانی نظم ہے جس کا آغاز اِس مصرع سے ہوتا ہے۔ ع ؎

"اے خوشا وہ دِن کہ جب تجھ سے مُلاقاتیں نہ تھیں"

اِس کا تیسرا شعر ہے ؎

شب کے سنّاٹے میں چُپکے چُپکے رُو لینا نہ تھا
آنکھ میں آنسو نہ تھے لب پر مُناجاتیں نہ تھیں

یہاں یہ لفظ اپنے لغوی معنوں، ہُو کے عالم، سُنسان اور چُپ چاپ سے منظر کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

"اندھیرا" کا پس منظر سیاسی ہے۔ سامراجی اور رجعت پسند طاقتوں پر اِس نظم کو ایک بھرپور اور مؤثر طنز کی حیثیت حاصل ہے۔ اِس کا آغاز اشارتی طور پر ہوتا ہے لیکن جلد ہی اِس میں اشارتی فضا ختم ہو جاتی ہے۔ اس کا ایک مصرع ہے۔ ع ؎ "شب کے سنّاٹے میں رونے کی صدا" یہاں لفظ لفظ کی صورت میں استعمال نہیں ہوا ہو تو بھی اس میں اشارتی فضا مکمل نہیں ہے۔ "گُلِ تر" کی نظموں کی تحریر کے وقت قومی اور بین قومی سیاست کا منظر ہی اور ہے۔ اِس عرصہ میں کئی ممالک آزاد ہوئے لیکن سامراج کا جال بھی وسیع ہو چکا ہے۔ رجعت پسندوں اور فسطائی طاقتوں کی ریشہ دوانیاں۔ سازشی ذہنیت اور استحصال دِن بدن افزوں ہوتا جا رہا ہے۔ ترقی پسند طاقتیں جو کبھی حدِ واحد کی طرح متحد تھیں بکھر رہی ہیں ——— اِضمحلال اور بے دست و پائی کا اِحساس عام ہو رہا ہے۔ خستگی اِنسان کا مقدّر بنتی جا رہی ہے، یہی سنّاٹا ہے! ——— افریقہ میں آزادی کی تحریکات کا سُورما لومبا سامراجی طاقتوں کے گٹھ جوڑ کے نتیجہ میں قتل کر دیا جاتا ہے۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ یہ ایک اِنسان کا قتل نہیں۔ ایک پاکیزہ ولولہ اور جذبۂ حُبّ الوطنی کا قتل تھا۔ مخدومؔ تلملا اُٹھتا ہے۔ اپنے ماحول کی اُداسی اور خاموشی کو چیرتی ہوئی اُس کی آواز نکلتی ہے ؎

شب کی تاریکی میں ایک اور ستارہ ٹوٹا
طَوق توڑے گئے، ٹوٹی زنجیر
جگمگانے لگا ترشے ہوئے ہیرے کی طرح
آدمیّت کا ضمیر
پھر اندھیرے میں کسی ہاتھ میں خنجر چمکا
شب کے سنّاٹے میں پھر خون کے دریا چمکے

یہاں پس منظر بھی اور ہے اور منظر بھی اور ——— اِس نظم سے مخدومؔ کے ہاں "سنّاٹا" ایک لفظ کی نہیں ایک اِشارہ کی صورت میں استعمال ہوا ہے اور پھر بار بار اُنہوں نے یہ اِشارہ استعمال کیا۔ اپنے ماحول کی بے چارگی، بے بسی اور موت کی سی خاموشی کے اظہار کے لئے "وصال" کے مصرعے "سنّاٹے چونکے" اور گونگے سنّاٹے بول اُٹھے"۔ "وقت ——— بے درد مسیحا" کا مصرعہ "شب کے سنّاٹے کے جادو نے کمندیں پھینکیں۔" نظم "ہم دونوں" میں بھی مصرع "شب کے سنّاٹے میں" ملتا ہے۔ لیکن اِس

مصرعہ کو شاید یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا جائے کہ یہ کماری اندرا دھن راج گیرجی کی نظم of lie Bo... کا آزاد ترجمہ ہے ضروری نہیں کہ مخدوم کے مزاج کی من و عن عکاسی ہو ۔ یہ اشارہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا ۔ مخدوم کی ایک نظم کا عنوان ہی "سناٹا" ہے جس میں ساری فضا یہی ہے ۔ یہ ایک خوبصورت تاثراتی نظم ہے ویسے "سناٹا" اور "وادیِ فردا" کا مرکزی خیال ایک ہی ہے ۔ نظم "سناٹا" "وادیِ فردا" کے اِن مصرعوں میں بند ہے ؎

رات ہی رات ہے ۔ سناٹا ہی سناٹا ہے
کوئی ساحل بھی نہیں
کوئی کنارہ بھی نہیں
کوئی جگنو بھی نہیں
کوئی ستارہ بھی نہیں

اپنے ماحول کی کس قدر کامیاب عکاسی ہے !

مخدوم نے لکھا ہے :-

" شاعر بہ حیثیت ایک فردِ معاشرہ حقیقتوں سے متصادم اور متاثر رہتا ہے ۔ پھر وہ دِل کی جذباتی دنیا کی خلوتوں میں چلا جاتا ہے ۔ روحانی کرب و اضطراب کی بھٹی میں تپتا ہے ۔ شعر کی تخلیق کرتا ہے اور داخلی عالم سے نکل کر خارج میں واپس آتا ہے تاکہ نوعِ انسانی سے قریب تر ہو کر ہمکلام ہو۔"[1]

لیکن جب حقائق ہی ایک دوسرے سے متصادم ہوں تو شاعر کا تخلیقی عمل اور زیادہ دُشوار اور زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے ۔ سماج میں اِثباتی اقدار کی پامالی، بے کیفی اور اجنبیت ہر اِنسان دوست کے نزدیک ایک اَلمیّہ ہے ۔ مخدوم نے جو کبھی زندگی کو بھرپور طریقہ پر چاہا تھا ۔ آج بھی زندگی کے بارے میں اُس کے عقیدہ اور اعتماد میں بنیادی طور پر کوئی کمی نہیں آتی ۔ لیکن زندگی کے رنگوں کا پھیکا پن اُس پر عیاں ہو جاتا ہے اور سطحیت نمایاں ہو جاتی ہے ۔ واہموں کا اِدّعا کہ اُن کو حقائق تسلیم کیا جائے اِس سے بڑھ کر زمانہ کا مذاق اور کیا ہو سکتا ہے "نیا نیا سال" اگرچہ مختصر سی نظم ہے لیکن بڑی اہمیت رکھتی ہے

کروڑوں برس کی پُرانی
کہن سال دنیا
یہ دنیا بھی کیا مسخری ہے
نئے سال کی شال اوڑھے
بہ صد طنز ہم سب سے یہ کہہ رہی ہے
کہ میں تو "نئی" ہوں
ہنسی آ رہی ہے

آخری مصرعہ ہے کہ نشتر !

غالبؔ صدی تقاریب بالغ نظر اصحاب کے نزدیک ایک ہیجانِ محض تھا جس کو اُردو والوں کے سامنے بصورتِ یقین پیش کیا گیا ۔ مخدوم نے بھی اِن تقاریب کو اِسی زاویہ سے دیکھا اُنہوں نے نظم بھی لکھی ۔ لیکن غالبؔ پر لکھی جانے والی بے شمار نظموں کی طرح یہ کوئی روایتی نظم نہیں ، بلکہ اِس کو غالبؔ پر نظم ہی کیوں کہا جائے اِس کا کینوس تو خاصا کشادہ ہے ۔ عصرِ حاضر کی ساری ابتری ۔ معاشی و معاشرتی ہی نہیں ، ذہنی و فکری بُحران جو شاید غالبؔ کے دَور میں بھی اِس قدر بھیانک نہ رہا ہو اِس میں ملتا ہے ۔ سبط حسن نے مخدوم کی شاعری کو عصرِ حاضر کے اِضطراب اور احساس کا آئینہ دار قرار دیا ہے ۔ اِس نظم کا آئینہ میں عصرِ حاضر کی تصویر کس قدر روشن ہے ؎

تم جو آ جاؤ آج دِلّی میں خود کو پاؤ گے اجنبی کی طرح
دِن ہے پیرِ خسیس کی مانند رات ہے دامنِ تہی کی طرح
پنجۂ زرگری و زرگیری عام ہے رسمِ رہزنی کی طرح
آج ہر میکدہ میں ہے کہرام ہر گلی ہے تری گلی کی طرح

ایک اِنسان دوست یہ لیل و نہار دیکھتا ہے لیکن دیکھا نہیں جاتا ۔ شاعر کا ردِّ عمل ــــ وہ اپنا دِل مسوس کر رہ جاتا ہے ۔ اِن اشعار میں ایک حساس دِل اِنسان کے جذبات کی کتنی حقیقت پسندانہ ابھری ہے ؎

خوشنما یادوں کے ڈھانچوں سے ملاقات ہوئی
چہرہ ٹوٹا ہوا آئینہ نظر آنے لگا

---

[1] گل تر صفحہ ۴

دِل کے تہہ خانے میں بارود بچھی ہو جیسے
ایک اک سانس میں دِل ہے کہ بکھر جانے لگا

سماج اور اُس کے دُکھ درد، زندگی اور اُس کے مسائل سے مخدوم کی یہ مطابقت اُن کی شاعری کا بنیادی عنصر ہے۔ اُنہوں نے اپنی شاعری کو سیاسی جدوجہد کے کام میں لایا ہو یا نہیں، لیکن اپنے سیاسی کردار سے شاعری کو آب و رنگ ضرور دیا ہے بایں وجہ مخدوم کی شاعری کو اُن کی سیاسی جدوجہد سے علیحدہ کرکے دیکھنے سے بات نہیں بنے گی۔ بلکہ اُن کے عہد کے پس منظر اور سیاسی و سماجی کشمکش کے آئینہ میں دیکھنا چاہیئے۔

کہا جاتا ہے کہ مخدوم کا اپنا کوئی اسلوب نہیں۔ یہ بات ایک حد تک دُرست بھی ہے۔ اِس کے چند ایک اسباب ہیں۔ مخدوم نے کیا کہنا چاہیئے اُسکی طرف توجہ دی۔ کِس طرح یا کیونکر کہنا چاہیئے اِس کو نظر انداز کر دیا۔ اُن کی سیاسی مصروفیات نے اُن کو یہ موقع ہی نہیں دیا۔ دوسری بات یہ کہ مخدوم نے نظم گوئی سے اپنی شعری زندگی کا آغاز کیا۔ جبکہ اُس وقت تک نظم گوئی اُردو شاعری میں ایک محبوب، مقبول اور موثر صنف بن چکی تھی۔ وہ اسلوب میں اپنے لئے کوئی جگہ پیدا نہ کرسکے۔ اُنہوں نے آزاد شاعری کا آغاز نظم "اندھیرا" سے کیا۔ "استالین" اُن کی دوسری آزاد نظم ہے۔ اگر وہ آزاد شاعری مسلسل کرتے تو ممکن ہے اُردو شاعری ایک نئے اسلوب سے رُوشناس ہوتی لیکن اُنہوں نے آزاد شاعری ہی کیا۔ ۱۹۴۴ء سے ۱۹۵۱ء تک صرف ایک نظم کے سوائے کوئی شعر کہا ہی نہیں۔ اور پھر جب ۱۹۵۱ء کے بعد اُنہوں نے شاعری کی طرف توجہ دی تو نظموں کے مقابلے میں غزلیں زیادہ کہیں، جبکہ اُس وقت تک فیض احمد فیض وغیرہ جدید غزل کو کافی آگے بڑھا چکے تھے، اِس لئے اُن کی غزلوں میں بھی ایک طرحداری اور بانکپن کے با وصف کوئی اسلوب نہیں۔ مزید براں اہم ترین بات یہ ہے کہ وہ کم گو شاعر تھے۔ شعر کو اُنہوں نے نہ تو بیکاری کا مشغلہ بنایا اور نہ سخن کا پردہ۔ جیسا کہ اُنہوں نے "گلِ تر" میں لکھا ہے۔ اُنہوں نے شاعری اُسی وقت کی جبکہ محسوس کیا کہ لکھنے پر مجبور کیا جا رہا ہوں، یا اُن سے سماجی تقاضے پُر اسرار طور پر شعر لکھواتے رہے۔ بیشتر منظومات اُنہوں نے ایک ہی نشست میں لکھیں اور شاید ہی کسی پر نظرِ ثانی کی ہو۔ ظاہر ہے اِن حالات میں اسلوب کا پیدا ہونا ممکن نہ تھا۔

مخدوم کے کلام کا ایک جوہرِ خاص اُس کی غِنائیت ہے۔ اُنہوں نے "گلِ تر" میں لکھا ہے :-

" شعر کہنے کی طرح شعر پڑھنا خود ایک تخلیقی عمل ہے۔ شعر کہتے ہوئے شاعر اپنے آپ کو بھی بدلتا جاتا ہے۔ شعر پڑھنے والا بھی نہ صرف پڑھنے کے عمل میں بدلتا ہے بلکہ وہ اختراع بھی کرتا ہے، اپنے تجربے کی بناء پر۔ "[1]

جہاں تک شعر پڑھنے کا تعلق ہے مخدوم خوش گلو تھے اور شعر گوئی کے آغاز سے قبل وہ خوش لحنی سے مختلف شاعروں کی غزلوں اور نظموں کو اپنے احباب کی محفلوں میں سنایا کرتے تھے۔ یہی چیز اُن کی شعر گوئی کا محرک بھی ثابت ہوئی۔ یہی نہیں کہ وہ خوش لحن رہے ہوں۔ اُن کے کلام کے جائزے سے فنِ موسیقی سے اُن کے لگاؤ کا اِظہار بھی ہوتا ہے۔ اُن کے ابتدائی دَور کی نظم "ساگر کے کنارے" کا ایک شعر ہے :-

وہ چھاؤں میں تاروں کی وہ کھیتوں کے کنارے
دہقاں بھی بھیرویں کی لگا تان اُڑا نے

شاعر یہاں صبح کا منظر پیش کر رہا ہے اور بھیرویں بھی وہ راگ ہے جو صبح کے وقت چھیڑا جاتا ہے۔ غنائی شاعری کیلئے صرف صَوتی تسلسل ہی ضروری نہیں موضوع اور موقع و محل سے ہم آہنگی بھی ضروری ہے۔ نظم "ترسہ" کا مُوضوع المیہ ہے۔ اِس نظم میں کافی غنائیت ہے لیکن موضوع کی مناسبت سے لَے دھیمی اور کیفیت حزنیہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف شاعر پر حُزن و ملال کی کیفیت طاری ہے بلکہ وہ حُزن و ملال اور رنج والم کا ایک ماحول بھی تخلیق کر رہا ہے۔ مخدوم اپنی غنائیت سے ایک سماں باندھ دیتے ہیں، اُن

بقیہ صفحہ ۱۹۱ پر دیکھئے۔

[1] " گلِ تر " ص۳

اسرار اکبر آبادی

★

کیسے کسی سے مل کے کہیں اپنے دل کی بات
اِن بستیوں میں دن سے ہی ٹھہری ہوئی ہے رات

دن رات روشنی سے سجاتی رہی حیات
پھر بھی دُھواں دُھواں سی رہی بزمِ کائنات

رعنائیاں لیئے ہوئے سورج کدھر سے آئے
چاروں طرف تو رات کے پھیلے ہوئے ہیں ہات

آسانیوں کی چاہ میں دشوار ہو گئی،
اب اپنی اُلجھنوں میں ہے اُلجھی ہوئی حیات

اس دَورِ کش مکش میں اندھیروں کے باوجود
لَو دے رہا ہے جذبۂ تسخیرِ کائنات

ویرانیوں میں سیکڑوں گلزار کھِل گئے
خوابوں سے نکل آئے ہیں جب تشنہ خیالات

تاریکیوں کے سرد سمندر کے درمیاں
جلتا ہوا چراغ ہے اسرار میری ذات

اقبال ماھر

★

قحط الرّجال اور زمیں پر خزاں کا راج
شاخِ شجرہ پہ لوگ اُگانے لگے اناج

یہ رسم، یہ قیود، یہ دستور، یہ رواج
یہ احتساب اور کہاں، عشق کا مزاج

اِن دشمنانِ عقل کا پوچھے کوئی مزاج
سُوکھی زمیں سے مانگنے نکلے ہیں جو خراج

موجوں کے دوش پر ہو رواں جیسے راج ہنس
یوں میرے دل میں یاد تری آ رہی ہے آج

ہر گل مسیح وقت ہے ہر شاخ ہے صلیب
سَر پہ شجر کے ہے کانٹوں کا ایک تاج

اس بیکسی میں تابِ مدارات تو نہیں
خوش آمدید! آپ اگر آ گئے ھیں آج

جو سر کہ اب ہے دردِ سری سے وبالِ دوش
رکھا ہوا تھا اِس پہ کبھی سر خوشی کا تاج

زہراب کر دیا ہے اِس آبِ حیات کو
اِتنا نہ تھا خوشی میں کبھی غم کا امتزاج

اب اعتبارِ حسن نہ وہ اعتمادِ عشق
ماھر بدل گیا ہے بہت وقت کا مزاج

افسانہ

اقبال بگرامی

معصوم سوال

نومبر کا مہینہ شروع ہوتے ہی ہوا کا رنگ ایک دم بدل گیا۔ آسمان کا رنگ راکھ کی مانند ہو گیا اور اس کے نیچے کی دنیا بڑی بھیانک دکھائی دینے لگی۔ بازاروں کی بھیڑ بھاڑ بھی کم ہو گئی۔ بڑے درخت کے نیچے، مسجد کے احاطے میں اور کنوئیں پر جہاں گرمیوں میں بچے اکٹھے ہوتے تھے اب کوئی نظر نہ آتا تھا۔ البتہ کبھی کبھی اکا دکا کوئی شخص وہاں پانی بھرتا ہوا ضرور نظر آجاتا تھا۔

ایک لڑکا دوپہر کو کنوئیں پر پانی پینے گیا لیکن وہ بھاگتا ہوا واپس آیا تو اس کی سانس پھول رہی تھی۔ اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ پوچھنے پر بمشکل تمام اس نے یہ کہا کہ "بشارت مر گیا۔"

بشارت کو بازار میں سب ہی جانتے تھے۔ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ بھری بھری سرخ و سیاہ داڑھی اور گٹھا ہوا مضبوط جسم۔ وہ خاندانی بہشتی تو نہ تھا، لیکن وہ محلے کے گھروں میں پانی پہنچاتا، اور دن بھر اسی کام میں مصروف رہتا۔ اس کا خاندان صرف بیوی اور دو بچوں پر مشتمل تھا۔ لیکن پھر بھی اس کی گزر بسر بڑی مشکل سے ہوتی تھی۔ وہ اتنی محنت کرنے کے باوجود اپنے متعلقین کیلئے دو وقت کی روٹی نہیں کما سکتا تھا۔ ٹین کے دو کنستر اور ایک بانس یہی اس کی کل جائیداد تھی۔ بانس کے دونوں کناروں پر باریک لوہے کی سلاخوں سے کنستر لٹکا کر وہ بازار میں نکلتا اور آوازیں لگاتا "پانی لے لو"۔۔۔۔ "پانی" جنہیں ضرورت ہوتی اسے بلا لیتے۔

بشارت دس پندرہ پھیرے لگاتا۔ ایک پھیرے کا مطلب ہوتا دو کنستر پانی۔ وہ پہاڑی کے قریبی کنوئیں پر جاتا اور کنستر بھر کر لے آتا۔ اس طرح اس کا سارا دن کنوئیں اور گھروں کے بیچ پھیرے لگانے میں گزرتا۔ ایک پھیرے کے معاوضہ میں اسے بیس پیسے ملتے یعنی دس پیسے فی کنستر۔ اس طرح روزی کمانے کا مطلب ہوتا جوئے شیر لانا یا سوئی سے کنواں کھودنا۔ اگر اس کی آمدنی کا یہی ایک ذریعہ ہوتا تو اس کمر توڑ گرانی کے دور میں چار افراد کا پیٹ بھرنا مشکل ہو جاتا۔ وہ تو کہیئے کہ اس کی بیوی گلنار دو چار گھروں میں کام کر کے اپنے شوہر کی مدد کرتی تھی تب کہیں جا کر انہیں دو وقت روکھی سوکھی نصیب ہوتی۔

لیکن اب سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ بشارت مر گیا تھا۔ اس کی ناگہانی موت کا سبب بھی فوراً ہی معلوم ہو گیا تھا۔ آج حسب معمول کنستروں کو اٹھانے لگا تو اچانک اس کا پیر پھسل گیا۔ اس کا سر کنوئیں کے قریبی پتھر سے بری طرح ٹکرایا اور وہ مر گیا۔ اسے دیکھ کر کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ وہ اس طرح اتنی جلدی مر جائیگا۔

گلنار نے یہ خبر سنی تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ یہ اس کے گناہوں کی سزا تھی؟ نہیں نہیں ـــ خدا اتنا ظالم نہیں ہو سکتا۔ یہ تو ویسے ہی ہو گیا۔ کوئی بھی اس طرح گر کر مر سکتا تھا۔

ہاں، مر تو سکتا تھا۔ لیکن شاید اپنے خاندان کے گزارے کے لئے کچھ ضرور چھوڑ جاتا۔ بشارت نے جو ترکہ اپنے پیچھے چھوڑا تھا وہ دو کنستر

اور ایک بانس تھا۔ گلنار اب کیا کرے گی۔ اُس نے بہت سوچا لیکن اُسے کوئی بھی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اُس کا ایک لڑکا نو برس کا تھا اور دو سال پہلے پیدا ہوا تھا۔ اِس حالت میں اکیلے رہ جانا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ ہفتہ میں دو یا تین بار لوگوں کے گھر کام ملتا اور اُس قلیل آمدنی سے خود اپنی اور ان معصوموں کی پرورش کیسے کرسکتی تھی۔؟

جب کسی کے گھر میں موت ہو جاتی ہے تو اُسے کھانے پکانے کا ہوش نہیں رہتا۔ پہلی چیز جو گھر والے بھول جاتے ہیں وہ روٹی ہے۔ ایک وقت کسی طرح نکل جاتا ہے۔ لیکن پیٹ کی آگ تیز ہوتی ہے تو کوئی بھی ترس کھا کر اور اپنی عاقبت سدھارنے کی فکر میں کہتا کہ ہمارے پاس چلے آؤ۔ کھانا کھا لو۔ اور اس طرح ایک بار کھانا کھانے کے بعد روزانہ کھانا کھانے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

مسلمانوں میں یہ رواج ہے کہ موت والے گھر میں 'پڑوسی' محلّے کے لوگ یا قریبی عزیز و اقارب ایک دو روز کھانا ضرور بھیج دیتے ہیں۔ پہلے دن کھانا خاص طور سے کونے والی سفید کوٹھی سے آیا تھا۔ سفید کوٹھی والے بڑے امیر آدمی تھے اِس لئے اُن کے یہاں سے آنے والا کھانا، بہت ہی عمدہ اور لذیذ تھا۔ باسمتی چاول، گوشت، روغنی روٹیاں اور ساتھ میں مٹھائی بھی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اُس دن کھانے کا کسی کو ہوش نہیں تھا لیکن جس وقت خوان پر سے رومال ہٹایا گیا تو ریچ میں لگی ہوگئی اور سب کھانا کھانے کے لئے تیار ہو کر خوان کے گرد آ بیٹھے اُنہوں نے اس سے پہلے کبھی اتنا لذیذ کھانا نہیں کھایا تھا۔ اِس لئے کھانے میں بڑا لطف آیا اور دوپہر کا بچا ہوا کھانا بھی رات کو اچھی طرح کھا لیا گیا۔

اگلے دن ایک اور ہمسائے نے کھانا بھیج دیا۔ زندگی کا دوسرا دن بھی بے سہارا ہوتے ہوئے گزر گیا۔ یہ سلسلہ تین چار دن تک چلتا رہا اور پھر خوان بند ہو گئے۔ جب پہلے دن کھانا آنا بند ہوا اُس دن دوپہر تک اُنہیں انتظار رہا۔ گلی میں پیروں کی آہٹ سُن کر نظریں خود بخود دروازے کے سامنے گلی کی سمت اُٹھ جاتیں کہ شاید سفید رومال سے ڈھکا ہوا کوئی خوان آئے گا۔ لیکن گلی میں تو لوگ اپنے کاموں سے آتے جاتے نظر آتے۔ کسی کے بھی ہاتھ میں کچھ نہیں ہوتا۔ اور اُن کی بانہیں ویسے ہی نیچے لٹکی ہی ہوتیں۔

وقت اپنی رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ لوگ بھی اُسی رفتار سے رواں دواں تھے تاکہ کسی سے پیچھے نہ رہ جائیں اور اُسی رفتار سے لوگوں نے اُن کو بھلا دیا۔

شام تک اُنہیں یقین ہو گیا کہ اب کوئی کھانا نہیں لائے گا اور حسبِ معمول اُنہیں گھر ہی میں پکانا پڑے گا۔ جتنا سامان اُن کے پاس تھا وہ تین چار دن میں ختم ہو گیا۔ اور پھر آٹا، گھی، تیل، آلو ختم ہو گئے۔ اِس کے بعد دن جیسے تیسے گزرے اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب گھر میں ایک دانہ بھی نہ تھا۔ اُس دن وہ پہلی بار خالی پیٹ سوئے۔

اگلے دن بھی یہی حال رہا۔ بھوک سے بچّہ رونے لگا۔ "ماں ۔ میرے پیٹ میں کچھ ہو رہا ہے۔" ماں نے کہا صبر کرو بیٹا۔ صبر کوئی تدبیر ہو ہی جائے گی۔ اُنہیں یہ محسوس ہوتا کہ اُن کے پیٹ سکڑ کر رہ گئے ہیں۔ کھڑے ہونے پر اُن کی آنکھوں کے سامنے سرسوں پھولنے لگتی یا تارے ناچتے ہوئے دکھائی دیتے اِس لئے لیٹے رہنا ہی ٹھیک تھا۔ انہیں محسوس ہوا کہ ان کی آوازیں بھی دھیمی پڑ گئی ہیں۔

اگلے دن گلنار نے ایک خواب دیکھا۔ شاید محلّے میں کسی کو گھر کا کام کرنے والی عورت کی ضرورت ہو۔ پتہ نہیں چلتا۔ شاید کام کے لئے کوئی بلاوا آ ہی جائے گا۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ گلنار سے کہنا آج آکر گھر کا کام کر جائے۔ لیکن محلّے والے اُس سے اِس حال میں کام کرانا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔

وہ سوچتے بے چاری دُکھ سے ویسے ہی مری جا رہی ہے کام کیا کرے گی۔"

اگلی صبح کسی میں اُٹھ کر کھڑے ہونے تک کی تاب نہیں تھی۔ سب کی آنکھوں کے آگے "روٹی" رقصاں تھی۔ چھوٹا لڑکا بار بار کہتا۔ "وہ دیکھو ماں مجھے روٹی دکھائی دے رہی ہے۔ روٹی نرم اور گول" اور وہ یہ کہتے ہوئے بے ساختگی کے عالم میں روٹی کو پکڑنے کے لئے ہاتھ بھی بڑھاتا۔ لیکن اُس کی خیالی روٹی اُس کے ہاتھ نہ آتی بلکہ نظروں کو دھوکہ دیتی ہوئی دُور بہت دُور چلی جاتی۔ اور پھر وہ خلاؤں میں چھپے خیالی روٹی کے

تلملا یانے بلکنے لگتا۔

کاش اُسے روٹی کا ایک نوالہ ہی مل جاتا۔ !

بڑے لڑکے کو روٹی کے بجائے مٹھائی نظر آتی۔ اُس سے کیسی حماقت سرزد ہوگئی تھی کہ وہ اپنے حصّے کی ساری مٹھائی ایک دم ہی کھا گیا تھا۔ وہ سوچتا اگر اب مٹھائی آئی تو وہ آہستہ آہستہ کھائے گا۔ ہر ایک چیز کا پورا مزا لے گا۔

گلنار کھاٹ پر پڑی ہوئی اپنے بچّوں کی باتیں سُنتی رہی۔ دانتوں کے نیچے زبان دبا کر اُس نے اپنے آپ کو رونے کی آواز سے روکے رکھا تھا۔ لیکن آنسو تھے کہ ساون بھادوں کی طرح بہے جا رہے تھے۔ وہ اُسے روکنے میں ناکام ہو گئی تھی۔ باہر لوگ حسبِ معمول آجا رہے تھے۔ اندر آنے والی آہٹیں سُن کر ہی وہ بتا سکتی تھی کہ محلّے میں کیا ہو رہا ہے۔

آخر گلنار کے ذہن میں اُدھار لینے کی بات آئی۔ اُس نے سوچا جب وہ لوگوں کے یہاں کام کر کے پیسے کمائے گی تو دے دیگی۔ اِس خیال نے اُسے کچھ تقویت پہنچائی۔ دروازے کی چٹخنی پر ہاتھ رکھ کر وہ اندر ہی کھڑی ہو گئی اور محلّے میں سے آنے والی آوازوں کو بغور سُننے لگی۔ کوئی آواز آ رہی تھی اور جب اُس نے آواز پر دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ٹھیلے پر لدی کئی چیزیں قریب سے گزر رہی تھیں۔ ٹھیلے پر لدے بھی ٹوکرے کھانے کی مختلف چیزوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ڈبل روٹیاں بھی تھیں۔ خالص سفید میدے کی بنی ہوئی۔ تازہ اور نرم۔ اُن کو ہاتھ میں لینے ہی پر بڑا مزا آئے گا۔ اُنگلیاں بیچ میں ہی دھنس جائینگی۔ وہ روٹی والے سے کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ اُس نے ٹھیلہ آگے بڑھا دیا۔

گلنار کی ہمت ختم ہو گئی۔ وہ ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی۔ بس مبہوت سی کھڑی، دیوار سے دگڑتے روٹیوں کے ٹوکروں کو دیکھتی رہی۔ اناج ۔ خدا کی نعمت۔ اُس کے گھر کے پاس سے گزرے اور وہ ہاتھ آگے کر کے اُسے پکڑ نہیں سکتی تھی۔

دروازہ بند کر کے پھر وہ واپس آگئی۔ اُس کے بچّے بڑی اُمیدیں لئے اُس کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے، لیکن گلنار میں اُن سے آنکھ ملانے کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اپنی آنکھیں نیچی کئے ہوئے سوچ رہی تھی کہ وہ اپنے خالی ہاتھ کیسے چھپائے۔ لیکن کوئی بات نہیں ہوئی۔ بڑے لڑکے نے اُسے خالی ہاتھ دیکھ کر خوف سے آنکھیں بند کر لیں اور چھوٹے نے بھی ایسا ہی کیا۔ ماحول میں ایک تناؤ سا پیدا ہو گیا۔ خاموشی بڑھ گئی۔ آدھے گھنٹے تک یہی حالت رہی۔ آخر چھوٹے لڑکے نے نحیف آواز سے سکوت توڑا۔

"ماں ۔"

" ہاں بیٹا !"

" مجھ سے اب برداشت نہیں ہوتا۔ میرے پیٹ میں کچھ ہو رہا ہے۔ "

" سب بھوک کی وجہ سے ہے بیٹا۔ میرے پیٹ میں بھی ایسا ہی ہو رہا ہے۔ کوئی بات نہیں صبر کرو۔ "

" میں مرنے والا ہوں ماں، میں مر جاؤں گا۔ "

بڑے لڑکے نے آنکھیں کھولیں اور اپنے بھائی کی طرف دیکھا۔

گلنار نے دونوں کو پیار بھری مجبور نظروں سے دیکھا۔ جیسے وہ اپنی خاموش نظروں سے کہہ رہی ہو کہ بچّو ! میں دنیا کی ایسی بدنصیب ماں ہوں، جو اپنے بچّوں کے لئے روٹی کا اِنتظام کر نہیں سکتی۔ ہو سکے تو تم دونوں مجھے معاف کر دینا تاکہ تمہارے بعد اگر میں بھی بھوک سے تڑپ تڑپ کر مر جاؤں تو کم سے کم میری روح کو ابدی سکون ملے۔ اُس اللہ کے پاس جس نے روٹی دینے کا وعدہ کیا ہے۔ ہاں روٹی۔

ہاں.... و .... ع .... د ...... !

گلنار نے بڑے لڑکے کو اِشارہ کیا وہ اُٹھا اور دونوں باہر گئے ـــــ باہر آکر گلنار نے لڑکے کے کان میں چپکے سے کچھ کہا۔ جیسے اِس بات کا ڈر ہو کہ کوئی اُس کی بات سُن نہ لے ۔

"پڑوس کی دکان والے لالہ کے پاس جا کر اُس سے کہنا کہ کچھ آٹا اور دالیں اُدھار دے دو۔ پیسے کچھ دنوں کے بعد دے دیں گے۔"
لڑکے کی ٹانگوں میں بالکل جان نہیں تھی۔ لیکن کسی طرح وہ نکڑ والی دکان پر پہنچ گیا۔ وہ خاموش کھڑا رہا اور لوگوں کو سودا لیتے دیکھتا رہا۔ وہ دکان دار سے تنہائی میں کچھ بات کرنا چاہتا تھا۔

لیکن جب وہ دوکان سے خالی ہاتھ نکلا تو گھر تک پہنچنا اُس کے لئے پہلے کی نسبت مشکل ہو گیا۔ پڑوس کی سفید کوٹھی سے دھواں نکل رہا تھا۔ اُس میں رہنے والے لوگ کتنے خوش قسمت ہیں۔ ویسے اُس کے ننھے سے دِل میں کوئی حسد نہیں تھا۔ بلکہ اُن لوگوں کے لئے بڑی عقیدت تھی۔ اُنہوں نے سب سے اچھا کھانا جو کھلایا تھا۔ ایک بار ———

گھر واپس آنے پر اُس نے نہ اپنی ماں سے کچھ کہا اور نہ ہی بھائی سے۔ اُس کے خالی ہاتھ ہی تمام کیفیت زبانِ خاموش سے کہہ رہے تھے۔ وہ آتے ہی بستر میں گھس گیا۔ جیسے وہ سردی سے ٹھٹھرا ہوا آیا ہو۔ اُس نے صرف اتنا کہا۔ "مجھے بہت سردی لگ رہی ہے" اُس کے کانپتے ہوئے جسم پر جو پھٹا کمبل پڑا تھا وہ نیچے اوپر ہوتا جا رہا تھا۔ گلنار کو جو کچھ ملا اُس کے اوپر ڈال دیا۔ پھر اُس کے کانپتے ہوئے جسم پہ کپڑوں کو اوپر نیچے ہوتے دیکھتی رہی۔ دو گھنٹہ تک وہ کانپتا رہا۔ پھر اسے تیز بخار چڑھ گیا۔ گلنار ادھر اُس کے گرد چکر کاٹتی رہی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ کمرے میں جاتی، بے چینی سے ٹہلتی اور خالی خالی آنکھوں سے کبھی دیوار اور کبھی چھت کی سمت دیکھتی۔ بچے کا بخار بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

تھکا ماندہ سورج رات کا سیاہ کمبل اوڑھ کر بے خبر سو چکا تھا۔ لیکن چھوٹے لڑکے کو بھوک کی شدت سے نیند نہیں آ رہی تھی۔ بیمار لڑکا ہائے ہائے کرتا اور کروٹیں بدل رہا تھا۔ اُس کا چہرہ اب بخار کی گرمی سے تمتما رہا تھا اور وہ بے ہوشی میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

چھوٹا لڑکا اُٹھ کر بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ سے اپنی ماں سے پوچھنے لگا۔ "ماں کیا بھیا مر جائے گا۔"
ماں کانپ اُٹھی۔ جیسے اُسے برفانی ہوا کا سرد جھونکا لگ گیا ہو۔ اُس نے خوفزدہ نظروں سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا اور کہا۔ "نہیں بیٹا ایسی زبان نہیں نکالتے۔"

لڑکا ماں سے نظریں نہیں ملا سکا۔ نظریں نیچی کئے ہوئے چپ بیٹھا رہا۔ اور پھر اُس نے ماں کے کان کے پاس سرگوشی کے انداز سے کہا۔ "میں تو اِس لئے پوچھ رہا تھا ماں کہ پھر سفید کوٹھی سے کھانا آئے گا۔"

بقیہ افسانہ "جونک" صفحہ ۳۵ سے آگے

سہ پہر کی بیمار دھوپ قربان کے چبوترے پر رینگ رہی تھی کہ نور بانو چلی آئی۔ قربان سب کچھ ہار کر چبوترے پر حقہ لئے بیٹھا تھا، ہاتھ میں حقہ تھا مگر چلم میں آگ نہ تھی نہ معلوم وہ کب کی بجھ گئی تھی۔ اس کی نگاہیں خلاؤں میں جمی ہوئی تھیں۔ اس کی نس نس ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ زندگی جیسے اتھاہ دلدل میں پھنس گئی تھی، ندی کے ٹوٹتے کنارے پر بنے گرنے کے لئے تیار شکستہ مکان کی طرح اس کا وجود تھا۔ اُس نے نور بانو کو دیکھا مگر اُسے پہچان نہ سکا۔ نور بانو کی سرمگیں آنکھوں میں گذشتہ شب کا اب تک خمار تھا۔ ہونٹوں پر پان کے سوکھے داغ اب بھی تھے۔ سارا جسم عطر سے بسا ہوا تھا، بیگنی رنگ کی ساری کا وہ پہنے ہوئے تھی جس کی ہر شکن عیاشی کی غماز تھی، قربان کو ایسے لگا جیسے پانی بہت گدلا ہو گیا ہے اور کیچڑ سے اٹا ہے، اس سے سڑی بدبو آ رہی ہے۔ ایسے پانی میں غسل نہیں کیا جا سکتا۔

نور بانو نے مسکراتے ہوئے کہا، "میں عدت کے دن یہیں پورے کروں گی، دن پورے ہوتے ہی ملا کو بلا کر نکاح پڑھوا لو۔" یہ کہہ کر ڈگمگاتی ہوئی وہ دہلیز کی طرف بڑھنے لگی مگر قربان نے بجھے ہوئے حقہ کا کش کھینچتے ہوئے کہا: "شادی بیاہ کے لئے اب میری طبیعت نہیں چاہتی، تو لوٹ جا دفعدار کے گھر نور بانو۔"
کووں کا ایک غول کائیں کائیں کرتا ہوا چبوترے پر سے گذر گیا۔

جے۔ سی۔ داس
ترجمہ: ناطق الصادقی

ادبی مناقشے

ادب کی تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جب کہ ناقدوں نے مصنفین پر بیجا اور ناروا حملے کئے ہیں یہ بات قابلِ فہم بھی ہے۔ نقاد بہر حال ادب پارے تخلیق نہیں کرتے اس لئے اکثر وہ مصنفین کے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں ناکام رہتے ہیں۔ ڈزرائیلی اکثر کہا کرتا تھا کہ وہ لوگ جو فنکار بننے کے اہل نہیں ہوتے تنقید نگار بن جاتے ہیں (جیسے اپنے میاں کی مثل ہے کہ بجھوا اٹھا مرشیہ گو) مصنفین پر تنقید نگاروں کے حملے کی ایک عمدہ مثال کیٹس KEATS کی نظموں پر تبصرہ اور تنقید ہے۔ یہ عام طور پر یقین کیا جاتا ہے کہ کیٹس کو وقت سے پہلے لب گور پہونچانے میں ان تنقیدوں کا بڑا دخل رہا ہے۔ لارڈ بائرن نے کیٹس کے تبصرہ نگاروں پر بڑی سخت نکتہ چینی کی ہے۔ اس نے "ڈان جوان" میں لکھا ہے کہ جان کیٹس کو ناقدوں نے اس وقت لب گور پہونچا دیا جب کہ وہ دنیا کو کوئی عظیم تخلیق پیش کرنے والا تھا۔ مندرجۂ ذیل سطور کو کیٹس کی نظموں پر تلخ تنقید کی ایک واضح مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے: "ہم ایک چھوٹی سی پیشین گوئی کرنے کی جرأت کرتے ہیں اور وہ یہ کہ ناشر اب کیٹس کی نظموں کی دوبارہ اشاعت پر پچاس پونڈ بھی خرچ کرنا گوارا نہیں کریں گے۔ ایک فاقہ کش شاعر سے ایک فاقہ کش دواساز ہونا زیادہ دانشمندی کی بات ہے۔ اس لئے نوجوان! بہتر یہی ہے کہ تم اپنی پرانی دواسازی کی دوکان پر واپس چلے جاؤ لیکن خدا کے لئے دواؤں میں نیند لانے والے اور نشہ آور اجزا اس سے کم مقدار میں ملانا جتنا کہ تم نے شاعری میں ملایا ہے۔"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مصنفین خود آپس میں کیوں جھگڑتے ہیں اور ایسی لڑائیاں بسا اوقات اس حد تلخ اور شدید کیوں ہو جاتی ہیں۔ ارسطو نے کہا تھا کہ شاعر تیلیوں کی طرح ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔ شاعروں سے اس کی مراد عام طور سے مصنفین سے ہے۔ لیکن جب تلیاں آپس میں لڑتے ہیں اور ایک دوسرے کو زخمی کر دیتے ہیں تو ان کے زخم وقت گذرنے کے ساتھ بغیر کسی شہرت کے مندمل ہو جاتے ہیں مصنفین کے معاملہ میں ایسا نہیں ہوتا۔ چونکہ فریقین قلم کار ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی لڑائیاں بھی ادب کا حصہ بن جاتی ہیں جنھیں آنے والی نسلیں دلچسپی سے پڑھتی ہیں۔ مصنفین کے درمیان مناقشے کی وجہ عام طور سے رقابت، حسد اور غیر مفاہمت کا جذبہ ہوتا ہے۔ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جبکہ کسی مصنف کے بارے میں کسی دوسرے مصنف کی حقیقی واقفیت کسی ناول یا ڈرامے کا مرکزی خیال بن گئی ہے مصنفین کے درمیان مناقشے زمانۂ قدیم میں بھی اتنے ہی رہے ہیں جتنے کہ آج کل ہیں۔ اس قسم کے مناقشے کی قدیم ترین مثال یونانی ادب میں ملتی ہے۔ ارسٹوفینز ARISTOPRANES نے اپنے کامیڈین ڈرامے "مینڈک" میں کئی ایک ٹریجڈی لکھنے والوں خصوصاً یوری پائڈز URIPIDES اور اس کی تصنیفات کے خوب لتے لئے ہیں

خود ہمارے ملک میں کالی داس اور رویندرناتھ ٹیگور کی لفظی تکرار بہت مشہور ہے (اللہ آباد اکبیت اور شرر کے ادبی تنازعوں کی شدت سے پوری اردو دنیا میں سنسناہٹ پھیل گئی تھی) علاوہ یہ ہے کہ شہرۂ آفاق ڈرامہ نگار - اور شاعر شکسپیر تک کو نہیں بخشا گیا۔ اس کے ہمعصر ڈرامہ نگار رابرٹ گرین نے شکسپیر کو ایسے کوے سے تشبیہ دی ہے جو ناچتے ملنگ کے پروں سے خود کو سجانا اور سنوارنا چاہتا ہے۔ اس فقرے کا مطلب یہ ہے کہ شکسپیر کے ڈراموں کے پلاٹ اس کے اپنے نہیں ہوتے بلکہ دوسرے ذرائع سے حاصل کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس میں اصل نکتہ یہ ہے کہ شکسپیر کے ڈرامے WINTER'S TALE (جاڑے کی کہانی) کا پلاٹ خود رابرٹ گرین کے ڈرامے PANDOSTO پر مبنی ہے۔ والٹیئر کے خیال میں شکسپیر کا شہرۂ آفاق ڈرامہ ہیملٹ ایک نہایت غیر مہذب اور وحشیانہ ڈرامہ ہے اور اسی لئے اٹلی اور فرانس جیسے مہذب اور شائستہ ممالک نے اس ڈرامے کو قبول نہیں کیا ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ہیملٹ کا معیار اتنا گرا ہوا ہے کیونکہ شکسپیر خود نہایت غیر مہذب اور شراب میں غرق رہنے والا شخص ہے۔ ڈرائیڈن شکسپیر کا نہ تھکنے والا نکتہ چیں ہے۔ اس نے شکسپیر کی زبان و بیان اور پلاٹ کی بہت سی خامیوں کی طرف اشارے کئے ہیں۔ بن جانسن کی طرح اس کو بھی یقین تھا کہ شکسپیر کی تخلیقات کا بڑا حصہ اگر انگریزی ادب سے خارج کر دیا جائے تو اس سے انگریزی ادب کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ شاید ڈرائیڈن نے ایک ڈرامہ بھی انٹونی اور کلوپیٹرا کی بنیاد پر ثابت کرنے کیلئے لکھا تھا کہ اسے شکسپیر پر فوقیت حاصل ہے۔ اسکاٹ لینڈ کا فلاسفر ڈیوڈ ہیوم بھی شکسپیر کے ڈراموں کی تعلیمی اور تہذیبی اقدار سے متعلق مشتبہ تھا کیوں کہ اس کے خیال میں مصنف کافی تعلیم یافتہ نہ تھا۔ سیموئیل پے پیز (SAMUEL PEPYS) رومیو اور جولیٹ کو اپنے وقت کا بدترین ڈرامہ سمجھتا تھا۔ ٹالسٹائی کے قول کے مطابق یہ ڈرامہ نیز کنگ لیئر کوئی اعلیٰ درجے کے ڈرامے نہیں ہیں۔ سترہویں صدی کا انگریز شاعر ایڈمنڈ والر کہا کرتا تھا کہ ملٹن کی "فردوس گم شدہ" (PARADISE LOST) میں سوائے اس کی طوالت کے اور کوئی خوبی نہیں ہے۔ ڈاکٹر جانسن کا بھی خیال ہے کہ فردوس گم شدہ کی جتنی تعریف کی گئی ہے اتنی پڑھی نہیں گئی نیز انسانی خوبیوں کا فقدان اس نظم کی زبردست خامی ہے۔ ٹامس کارلائل نے ایک مرتبہ "SWIN BURNE" دیکھنے سے اس لئے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس کے خیال میں وہ (SWINBURNE) سیوریج میں بیٹھا ہوا اس کی گندگی میں اضافہ کر رہا ہے۔ کارلائل نے مشہور فلاسفر ہربرٹ اسپنسر کو بھی نہیں بخشا وہ کہتا تھا کہ اسپنسر عیسائیت کی دنیا کا ایک زبردست گدھا ہے۔ کارلائل کو چارلس لیمب کی تخلیقات بھی ناپسند تھیں کیوں کہ اس میں اُسے گہرائی اور علم کا فقدان محسوس ہوتا ہے۔ اور ایک قسم کی سیال گندگی کا عکس جھلکتا ہے۔ علاوہ یہ ہے کہ اٹھارہویں صدی کے ادبی ڈکٹیٹر ڈاکٹر جانسن پر ایک معمولی شاعر چارلس چرچل نے حملے کئے ہیں۔ اس نے ایک نظم بھوت (THE GHOST) کے عنوان سے لکھی جس میں اس نے جانسن کی شخصیت اور اخلاق کا مضحکہ اڑایا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ والٹیئر نے دنیا کے مسلمہ ادب کو بھی تسلیم نہیں کیا اس نے ہیملٹ کو غیر مہذب کہا۔ اسی طرح اس نے دانتے کی DIVINE COMEDIA کو خام اور مہمل قرار دیا۔ دانتے کی فاؤسٹ پر بھی کولرج نے اعتراضات کئے ہیں۔ کولرج اگرچہ خود شاعر تھا مگر اس کے باوجود وہ فاؤسٹ میں کوئی شاعرانہ خوبی نہ ڈھونڈھ سکا۔ کولرج کو اسکاٹ ناول ایوانہو (IVANHOE) میں بھی کوئی عظمت نظر نہ آئی۔ اس کے خیال میں یہ ناول ایک قطعی ناکام تخلیق ہے۔ ٹالسٹائی ادب کو انسانی فلاح و بہبود کے نقطۂ نظر سے جانچتا تھا۔ اُسے اوڈیسی (ODYSSEY) اور ایلیاڈ (ILLIAD) سے اسلئے شکایت ہے کہ ان میں کوئی نارمل آئیڈیا نہیں تھا۔ ا نے "چچا ٹام کا کیبن" کو ادب کا شاہکار قرار دیا ہے لیکن اسکو باڈلیئر (BAUDLAIRE) کی ایک بھی نظم پسند نہ آئی۔ جو کہ عام طور سے بغیر کسی غیر معمولی کوشش کے سمجھی جا سکتی ہے۔

سیموئل بٹلر کو (THE WAY OF ALL FLESH) لکھنے میں بیس سال لگ گئے اس کے بعد اس نے پبلشر چیپ مین اینڈ ہال کو اشاعت کیلئے مسودہ دیا۔ اُسی وقت اس فرم کا مشہور ناول نگار جارج میریڈتھ تھا مسودہ پڑھ کر

پڑھنے کے بعد جارج میرڈتھ نے فرم کو مشورہ دیا کہ یہ ناول اشاعت کے قابل نہیں ہے اگرچہ یہ ناول مصنف کی موت کے بعد ہی شائع ہو سکا لیکن آج اس کا شمار انگریزی کے کلاسیکل ادب میں کیا جاتا ہے۔

برنارڈ شا کو اپنی ابتدائی مشق کے دوران ڈرامہ نگار ہنری آرتھر جونز سے کافی مدد ملی لیکن اس کے بعد ان دونوں میں اَن بن ہو گئی۔ شا کے غیر روایتی اور باغیانہ افکار جونز کو پسند نہ آئے۔ اس نے شا کے متعلق لکھا "اذیت پسندی سے تمہاری تخلیق ہوئی ہے۔ بر خود غلط خیالات نے تم پر قبضہ جما لیا ہے۔ انتشار تمہاری مڈوائف ہے۔ بد نظمی تمہاری نرس ہے اور نامعقولیت نے تم کو اپنے پیروں پر جھکا دیا۔ تمہارا ماضی ان کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے" اس نے مزید کہا کہ شا ایک ایسا عجلت پسند اور خود پسند معمول ہے جو قانونی علاوہ میں آئے بغیر پیدا ہو گیا ہو۔

کہا جاتا ہے کہ ورڈس ورتھ خوبصورتی کا زبردست شیدائی تھا اور دنیاوی دولت سے اس کو ذرا بھی رغبت نہ تھی۔ لیکن والٹر سیوج لینڈر کو اس نظریے سے اتفاق نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ورڈس ورتھ کی ایک نگاہ "DAFFODIL" پر تھی اور دوسری ہر سو پونڈ سے حاصل ہونے والی شیئرز کی آمدنی پر تھی۔ "ڈان جوان" کے تیسرے "CANTO" میں بائرن نے جھیل کے شاعروں خصوصاً ورڈس ورتھ اور ساؤدی کی خاصی خبر لی ہے۔ اول الذکر کے متعلق وہ لکھتا ہے "THE EXCURISION" ایک ایسی جامعانہ اور دھندلی نظم ہے اور ایسے پیرائے میں لکھی گئی ہے کہ اس کا نہ لکھا جانا ہی اس سے بہتر ہوتا۔

حالیہ برسوں میں سومرسٹ ماہم نے اپنی ناول "CAKES AND ALE" میں اپنے ہم عصر مصنفین کا زبردست خاکہ اڑایا ہے۔ اس کی ناول کے دو کردار الرائے کیر (ALROY KEAR) اور ڈریفیلڈ (DRIFFILED) بالترتیب ہیوغ وال پول اور ٹامس ہارڈی کے خاکے ہیں۔ ہارڈی اس ناول کی اشاعت سے دو سال پہلے انتقال کر چکا تھا۔ مگر تقریباً تیس ناولوں کا مصنف وال پول نہ صرف یہ کہ زندہ تھا بلکہ کیر کے پیچھے اپنے خدوخال بھی پہچان سکتا تھا۔ والپول کو ماہم کی اس حرکت سے دلی صدمہ پہونچا۔ کیونکہ ماہم نہ صرف اس کا بہت عزیز دوست تھا بلکہ اس کی تحریروں کی تعریف میں اکثر رطب اللسان رہا کرتا تھا۔ والپول کے نزدیک یہ ماہم کی دغابازی تھی کہ وہ اپنے دوستوں کے کردار کے تاریک پہلوؤں کا مضحکہ اڑائے۔ ماہم نے اس بات کو تسلیم نہیں کیا کہ اس نے کیر کے پردے میں والپول کا خاکہ اڑایا ہے لیکن اس کی اس یقین دہانی پر مشکل ہی سے چند لوگ یقین کر سکے اور والپول کے شبہات ماہم کی بار بار یقین دہانی کے باوجود آخر وقت تک رفع نہ ہوئے۔ والپول کی موت کے دس سال بعد جا کر کہیں ماہم نے یہ تسلیم کیا کہ ہاں کیر کے کردار کی تشکیل کے وقت والپول اس کے ذہن میں موجود تھا۔

ماہم کو بھی اپنی اس بدبختی کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ ایک سال بعد ہی امریکہ سے ایک نئی ناول "GIN + BITTERS" آئی یہ کتاب اے۔ رپاسٹی (A. RIPOSTE) کے فرضی نام سے شائع ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس ناول کا مصنف خود جزیرہ تاہیتی اور دوسرے قریبی جزائر میں گیا تھا تاکہ وہ ماہم کی نجی زندگی اور کیریکٹر کے بارے میں مواد حاصل کر سکے۔ ماہم اس ناول کے ایک ہیرو ہرلے HURLE کے روپ میں ابھرتا ہے۔ ماہم اور اس کے دوستوں کو جزیرہ تاہیتی میں ان لوگوں کی نجی زندگی کے انکشاف سے قدرتی طور سے بڑی تشویش لاحق ہوئی۔ یہ حملہ اتنا تیکھا تھا کہ انھوں نے انگلینڈ میں اس ناول کی اشاعت کو رد کرنے کیلئے سر توڑ کوششیں شروع کر دیں۔ بہرحال اس ناول کا انگریزی اڈیشن موسومہ "FULL CIRCLE" (پورا حلقہ) مارکیٹ سے بعجلت واپس لے لیا گیا۔ شروع میں ہر شخص کو یہ شبہ تھا کہ والپول ہی اس ناول کا مصنف ہے مگر اس نے سختی سے اس کی تردید کی۔ بعد میں یہ راز کھلا کہ اس ناول کی مصنفہ ایک لیڈی ایلی نور مورڈانٹ (ELINOR MORDAUNT) تھی۔

(بقیہ صفحہ ٥٠ پر دیکھئے)

بدنام نظر

غزل

رہ رہ کر چبھ جاتی ہے اک سبز نکیلی دھار
چاٹ رہی ہے میری گردن رشتوں کی تلوار

ذہن کی جیب ہے خالی خالی معنی کے سکّوں کے بغیر
سُونا سُونا سا لگتا ہے، لفظوں کا بازار

ایسے میں اب دُنیا اندھی ہو جائے تو رونا کیا؟
بستی بستی اِنساں ہیں اور پربت پربت ہیں اوتار

پھولوں کا بستر بھی اب تو کانٹا کانٹا لگتا ہے
رات کی زُلفیں، نیند کی باہیں، پھر بھی ہوں بیدار

یادوں کے طوفاں سے اکثر ذہن کے پٹ کھل جاتے ہیں
اکثر لگ جاتا ہے گھر میں لاشوں کا انبار

کس کو کس کو روئے کوئی، کس کا کس کا ماتم ہو؟
سب کے کاندھے پر رکھا ہے اپنی ہی میّت کا بار

حبس وہ ہے کہ اِک پل جینا مرجانے سے بدتر ہے
میرے چاروں طرف کھڑی ہے خواہش کی دیوار

کھیل رہی ہے فن کے پردے پر دِل کی تصویر
لیکن مُردہ مُردہ سے ہیں، یادوں کے کردار

چارہ گروں کی سب دوکانیں بند پڑی ہیں اے بدنام
کوئی بتلائے جائیں کہاں یہ صدیوں کے بیمار!

مخدوم اشرف اشرف

آہ شکیل بدایونی

(قطعات)

یہ سچ ہے موت نے چھینا شکیلِ گُلِ بداماں کو
کسی صورت مگر نغمہ تو اُس کا مر نہیں سکتا
دیا ہے اُس نے جو زخمِ جُدائی آج ہم سب کو
یہ ایسا زخم ہے جو تا بہ مُدّت بھر نہیں سکتا

محشر سے کم نہیں ہے کسی خوشنوا کی موت
کیوں کر نہ دِل سے کیجیے ماتم شکیل کا
اشرف مٹے گا نالہ و فریاد سے کہاں
پہلو میں ہے جو صورتِ دِل غم شکیل کا

اندر جیت گاندھی

منوّر لکھنوی کی یاد میں

(قطعات)

بزم سے یکتا سخنور اُٹھ گیا
ہائے علم و فن کا رہبر اُٹھ گیا
نازشِ اُردو زباں تھا جو کبھی
آج گاندھی، وہ منوّر اُٹھ گیا

آسمانِ فن کا نیّر اُٹھ گیا
علم کا مہرِ منوّر اُٹھ گیا
جس کا ثانی کوئی اے گاندھی نہ تھا
اِس جہاں سے وہ سخنور اُٹھ گیا

افسانہ

ہال ایلیسن
ترجمہ: عبدالسلام بیگ

آخری جواب

شام ہو چکی تھی۔ باہر [illegible] ہو رہا تھا۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ برآمدے کا بھی یہی حال تھا۔ کہیں کہیں کوئی راہگیر نظر آجاتا تھا۔۔۔

اسٹرک لینڈ (STRICKLAND) چلتے چلتے کیا ریس بار کے قریب رُک گیا۔ دفتر کے کچھ لوگ گپیں ہانکتے ہوئے بیئر پینے میں مصروف تھے۔ شدت کی گرمی پڑ رہی تھی۔ اسٹرک لینڈ نے کولڈ ڈرنک کے لئے آرڈر دیا۔ آج اُسے جلد اپنے دفتر پہنچ کر ایک ضروری رپورٹ تیار کرنی تھی ۔۔۔!!

اسٹرک لینڈ ایک تنگ گلی سے گزر رہا تھا۔ اُس کا سایہ گلی میں بڑی تیزی سے پھیل رہا تھا اور اُس کے پیروں کی آہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ ایک بڑی عمارت میں داخل ہو گیا جہاں وہ ملازم تھا۔ بڑا دروازہ تو بند تھا۔ لیکن لفٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا ۔۔۔!!

وہ اندر داخل ہو گیا۔ لفٹ کا آپریٹر ہمیشہ اُس کا خیر مقدم کرتا۔ لیکن اُس [دن] لفٹ میں کوئی دوسرا اجنبی آپریٹر کھڑا تھا۔

"فلور پلیز ؟" اُس نے پوچھا۔

اسٹرک لینڈ کو اس پر ہنسی آ گئی۔ نیند میں اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔

"تیرھویں فلور" ۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔

دوسرے ہی لمحہ دروازہ بند ہو گیا اور لفٹ تیزی سے اوپر چڑھنے لگی۔

لفٹ تیرھویں منزل پر رُک گئی۔ آپریٹر دروازے کی طرف بڑھا۔ اور پھر دروازہ کو روکتے ہوئے اسٹرک لینڈ کو بغور دیکھنے لگا۔ اُس کی بڑی بڑی کالی آنکھوں میں خوف کی ایک جھلک نمایاں تھی۔

"اچھا۔! تم دروازہ نہیں کھولو گے" اسٹرک لینڈ سراپا تجسس تھا۔

"ایک سوال سر۔"

"پوچھو۔"

"آپ آزادی کے پرستار ہیں یا غلامی کے ۔ ؟"

اس سوال پر اسٹرک لینڈ دل کھول کر ہنسنا چاہتا تھا مگر آپریٹر بھیگی بلی بنا جواب کا منتظر تھا۔

"مجھے آزادی چاہئے۔" اسٹرک لینڈ نے جواب دیا۔

"ٹھیک جواب ہے۔" آپریٹر نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا

اسٹرک لینڈ لفٹ سے باہر آ گیا۔ برآمدے سے گزرتے ہوئے اُس نے اپنے دفتر میں قدم رکھا۔ پھر سوچنے لگا۔ اگر اُس کا جواب غلط ہوتا تو۔۔۔۔!

پھر وہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا ۔۔۔!!

ایک گھنٹہ بعد پھر تیرھویں فلور پر لفٹ کا دروازہ کھلا۔ اسٹرک لینڈ کو کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اُسے یہ کچھ غیر معمولی سا نظر آیا کہ آج رات کا پہرہ دار ابھی سے گشت پر ہے۔ پھر دفتر کا دروازہ کھلا اور پھر جھٹکے سے بند ہو گیا۔ اسٹرک لینڈ اپنی کرسی میں سنبھل کر آنے والے کا انتظار کرنے لگا۔

"کون ہے —؟" اسٹرک لینڈ کی آواز کمرے میں گونجی۔

— اور پھر وہی آپریٹر اسٹرک لینڈ کے رُوبرو تھا — !!

" آج آپ زیادہ مصروف تو نہیں —؟" اُس نے اور بھی قریب آتے ہوئے پُوچھا۔

" مجھے صبح ہونے تک ایک ضروری رپورٹ تیار کرنی ہے۔ لیکن اِس وقت تمہیں میری کیا ضرورت ہے —؟" اسٹرک لینڈ کے تیور چڑھے ہوئے تھے۔

" ایک اور سوال مسٹر —"

اِسٹرک لینڈ چاہتا تھا کہ اُسے کمرے سے باہر نکال دے۔ پھر اُس نے سوچا، یہ شراب کا نشہ ہے۔ اور ایسے لوگوں سے مذاق بھی خوب رہے گا۔

" اچھا! کیا سوال ہے ؟"

" آپ سچ کے حامی ہیں یا جھوٹ کے —؟"

" سو فیصدی سچ کا —" اسٹرک لینڈ نے بے ساختہ طور پر کہا۔

" اگر اجازت ہو تو .... ؟"

" ہاں، تو پھر —؟"

" کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ ہمیشہ سچ پسند کرتے ہیں —؟"

" بالکل —" اب تم یہاں سے جا سکتے ہو۔"

آپریٹر اِس جواب پر خاموش ہو گیا۔ پھر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے اِسٹرک لینڈ کی طرف مڑ کر دیکھا۔

" مجھے آپ پر یقین ہے —"

" شکریہ —!" اسٹرک لینڈ کے لہجہ میں تلخی تھی۔

رپورٹ میز پر تھی۔ اُس کے لئے اب کام کرنا مشکل تھا۔ وہ خاموشی سے قدموں کی آہٹ سُنتا رہا۔ اُس نے فون کی طرف بڑھتے ہوئے سوچا۔ کیوں نہ اِس بے وقوف کو پولیس کے حوالے کر دے۔ پھر اُس نے بلڈنگ کے ناظم کو فون کرنا چاہا۔ اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مُسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا —!!

اگر وہ شکایت کرے بھی تو غریب آپریٹر کو نوکری سے نکال کر دیا جائے گا —!!

شدید گرمی تھی۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ اُس نے ٹہلتے ہوئے کاغذات سے اپنا پسینہ پُونچھا۔ اُسے پیاس لگ رہی تھی۔ واٹر کولر خود دفتر میں رکھا ہوا تھا۔

ابھی وہ گلاس میں پانی بھر ہی رہا تھا کہ اُسے پھر کسی کے قدموں کی چاپ سُنائی دی۔

" اب کی بار —" اُس نے سوچا "یہ رات کا پہرے دار ہی ہوگا۔"

سامنے کا دروازہ کھلا اور بند ہو گیا۔

آپریٹر کے قدم آہستگی سے (RECEPITIONIST) ریسپشنسٹ کی خالی میز کی طرف بڑھے اور رُک گئے۔

وہ تاڑ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ آپریٹر اس کے کمرے میں جائے۔ اور اُسے نہ پا کر لوٹ جائے۔ آپریٹر کو باہر نکالنے کی یہی ایک ترکیب تھی۔ وہ بالکل خاموش رہا۔ اور اُسے دکھائی بھی نہ دیا۔

آپریٹر نے کمرے کا جائزہ لیا۔ اُس کی خوفناک نگاہیں کمرے میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ اُس نے نگاہیں چاروں طرف دوڑائیں۔ خالی کرسیاں —— میز .... اور پھر اسٹرک لینڈ کا سایہ —!!

اسٹرک لینڈ نے دیکھا کہ آپریٹر کے ہاتھوں میں ایک بندوق بھی ہے —!!

"— آہا! تم یہاں ہو —؟" آپریٹر اسٹرک لینڈ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

اسٹرک لینڈ کے سر پر وہ بھوت کی طرح سوار تھا۔ بندوق، وہ بھی ایسے آدمی کے ہاتھوں میں جو بالکل پاگل لگتا ہے — پھر اُس کے احمقانہ سوالات۔ اُس کا خوفزدہ چہرہ۔ اور بڑی بڑی پھیلی ہوئی آنکھیں —!!

اُس کے ہاتھ سے بندوق چھین لینا چاہیئے۔ اسٹرک لینڈ نے سوچا۔

آپریٹر آگے بڑھتے ہوئے اسٹرک لینڈ کو بندوق کی زد میں لانے لگا۔

"— آؤ! اب دیکھیں، تم کتنے عقلمند ہو۔ تمہیں

ایک اور سوال کا جواب دینا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ تم اِس بار ضرور پھنس جاؤ ــــــ !!

اِسٹرک لینڈ کچھ گھبرایا۔ پھر اُس نے معذرت چاہی۔ اور سوچنے لگا کہ کچھ ہی دیر میں رات کا پہرہ دار ضرور اُس کی مدد کو آجائے گا۔

" شٹ اَپ " آپریٹر چیخ اُٹھا۔ تو پھر تیار ہو جاؤ ــــ اب کی بار تمہیں ٹھیک جواب دینا ہوگا۔

"۔ تمہیں محبّت پسند ہے یا نفرت ــ ؟ " تمہیں دس سکنڈ کے اندر اندر اس کا ٹھیک جواب دینا ہوگا۔

اُس کا جواب تو واضح تھا۔ اسٹرک لینڈ کو کوئی دقت پیش نہ آئی۔ اگر وہ اس کا ٹھیک جواب بھی دے تو ہو سکتا ہے پاگل کا فیصلہ اُس کے برعکس ہو۔

" آپریٹر اب وقت کو تیزی سے گننے لگا۔ اور اپنی بندوق کو سنبھالنے لگا۔

" محبّت ــ"۔ بندوق کی گولی کی طرح اسٹرک لینڈ کے منہ سے نکل پڑا۔

" خوب، بہت خوب ــ " آپریٹر نے مسکراتے ہوئے بندوق نیچے کرلی۔

" مجھے یقین تھا کہ تم اِس مرتبہ پھسل جاؤ گے۔ تم بہت چالاک نکلے ــ "

" اور تم بھی ــ " اسٹرک لینڈ نے کہا۔ " تو پھر سُنو۔"

" ہاں ــ ! "

" مجھے وہ بندوق دے دو۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا ــــ ورنہ ــ "

" ورنہ کیا ہوگا ــ ؟ " آپریٹر کا لہجہ سوالیہ تھا۔

" تم تو خواہ مخواہ مصیبت میں پڑ رہے ہو۔ کچھ ہی دیر میں پہرہ دار یہاں ہوگا۔ "

" پہرہ دار ! " آپریٹر نے ایک قہقہہ اچھالتے ہوئے کہا۔

" وہ میرے امتحان میں کامیاب نہ ہو سکا۔ "

" کون سا امتحان ــــ ؟ "

" یہی جس میں تم کامیاب ہوئے ہو۔ " آپریٹر نے کہا۔ وہ مجھے نچلی فلور پر ملا تھا۔ وہ تم جیسا چالاک نہیں ۔ یہ اُسی کی بندوق ہے ــــ "

" کیا تم نے اُسے مار ڈالا ــ ؟ "

یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے ! وہ بڑا ہی بے وقوف نکلا۔ میرے سوالات کے ٹھیک جوابات نہ دے سکا۔ "

اسٹرک لینڈ کی سانس پھولنے لگی۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔

" کیا میں اِس کا جواب دے سکتا ہوں ــ ؟ " اسٹرک لینڈ نے آپریٹر سے پوچھا۔

" نہیں، اِس کا جواب میں خود دوں گا۔ " آپریٹر نے اسٹرک لینڈ کی طرف بندوق کرتے ہوئے کہا۔ پھر کچھ لمحوں تک رسیور اُس کے کانوں سے لگا رہا۔ رسیور رکھتے ہوئے وہ اسٹرک لینڈ کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

" تمہارے لئے ایک اِطلاع ہے ۔!! ۔ تمہارا نام ۔ "

" اسٹرک لینڈ ۔ "

" اچھا سُنو !۔" فون پر تمہیں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ ایک پاگل اِس بلڈنگ میں گھوم رہا ہے ۔ اور یہ کہ مزید ہدایت دینے تک تمہیں اِسی دفتر میں رہنا پڑے گا۔ وہ پاگل بڑا ہی خطرناک ہے..... اور خونی بھی ـــ !! "

اسٹرک لینڈ کی معصوم آنکھیں آپریٹر کی خوفناک آنکھوں سے ٹکرائیں۔ اُس کے وحشت ناک چہرے کو دیکھتے ہی وہ تھرتھرانے لگا۔

" ہاں ـ" اسٹرک لینڈ ـ تم کیا سوچ رہے ہو ـــ ؟ " آپریٹر نے کہا۔ " اُوہ، تم کیوں گھبرانے لگے۔ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ــ تم بڑے ہی ذہین ہو ۔ اب صرف ایک سوال باقی رہ گیا ہے ـــ آخری سوال ۔ "

" تم مجھے پاگل سمجھتے ہو، یا نہیں ۔ ؟ " آپریٹر نے پوچھا۔ " تمہیں دس سیکنڈ کے اندر اندر اس کا ٹھیک جواب دینا ہوگا۔ "

اور بندوق اسٹرک لینڈ کے جواب کا اِنتظار کر رہی تھی ۔!!

(انگریزی سے ترجمہ)

شفیق رحمانی

کسی کی زُلف کے سائے میں سوگئی ہے رات — تجلّیات کی موجوں میں کھو گئی ہے رات
کسی کی بزم ستاروں سے جگمگا اُٹھی، — کسی کے حال پہ چپکے سے رو گئی ہے رات
اُبل رہے ہوں ہر اِک سمت بُلبُلے جیسے — سمندروں میں سفینے ڈبو گئی ہے رات
کسی نے تپتی ہوئی ریت پر گزارا دِن، — کسی کی گود میں سر رکھ کے سو گئی ہے رات

شفیق دِن کی حدیں ختم ہی نہیں ہوتیں
نہ جانے کونسی منزل پہ کھو گئی ہے رات

اعزاز افضل

دِل کے پٹ بند ہیں آگہی کیا کرے
گھر میں روزن نہیں، روشنی کیا کرے

دیجئے شوقِ تنہا روی کو دُعا
رہبری کیا کرے، رہزنی کیا کرے

کٹ گئے ہو کے نیستاں نیستاں
رُندھ گئے ہیں گلے، بانسری کیا کرے

جس کبوتر پہ شاہیں جھپٹتے رہیں
وہ غریب احترامِ خودی کیا کرے

عکس اُبھرے نہ [illegible] خد و خال ہو
آئینہ ذکر [illegible] لی کیا کرے

▲

سعادت نظیر

بس اِنتہا ہے یہ بارِ اَلم اُٹھانے کی
ہنسی کہاں کہ نہیں تاب مُسکرانے کی

یہ برق و باد نے چاہا کہ خاک بھی نہ رہے
غبار بن کے رہی خاک آشیانے کی

کمالِ شوق نے بخشا ہے زندگا کا شعور
حیات تُو ہے محرّک نئے زمانے کی

ملا ہے آج یہ کس کو پیامِ آزادی
کہ بیڑیوں میں بھی جھنکار ہے ترانے کی

فضائے غنچہ و گُل ہو کہ بزمِ انجم ہو
کہاں نہیں ہے جھلک تیرے مُسکرانے کی

جب اپنے حال پہ ہنستے ہیں آپ ہم ہی نظیر
تو کیوں ہے غیر پہ تہمت ہنسی اُڑانے کی

ڈراما

تماعر۔ بمبئی

اظہر افسر

مرضی

مالا
نوجوان
بوڑھا

منظر

سامنے نوکروں کے کوارٹر کا ایک حصّہ ہے۔ داہنی جانب پختہ بنگلے کے کچھ حصّے نظر آرہے ہیں۔ بائیں "ونگ" باہر جانے کے راستے کو اور داہنی "ونگ" بنگلے کے اندر جانے کے راستے کو ظاہر کرتی ہے۔ ایک طرف سبزہ اور گملے بھی ہیں۔ پردہ اٹھتا ہے تو بوڑھا ایک گملے کی مٹی نیچے اوپر کر رہا ہے — بائیں جانب سے سترہ اٹھارہ سال کی ایک الھڑ لڑکی (مالا) جاکٹ لہنگا پہنے اور دوپٹہ اوڑھے اچھلتی گنگناتی ترکاری کی ٹوکری لئے داخل ہوتی ہے۔

بوڑھا، یہ کون تھا تیرے پیچھے پیچھے۔

مالا؛ پیچھے پیچھے — کون ہوتا موا۔

بوڑھا۔ خیر جا جا، جلدی جا، مالکن اندر تجھے بلاتی ہیں۔

(مالا اندر کی طرف جانے لگتی ہے)

بوڑھا، اور سُن، میں ذرا صاحب کے کلب جا رہا ہوں۔ گرمی بہت ہے آج۔ جھاڑو لگا کر کھٹیا باہر ہی ڈال دے۔

مالا؛ میں تو اندر ہی سوؤں گی دادا۔

بوڑھا، ہاں تو اندر ہی سونا۔

(مالا اندر کی طرف اور بوڑھا بائیں جانب چلا جاتا ہے)

ذرا سی دیر اسٹیج خالی رہتا ہے کہ بائیں جانب سے ایک نوجوان سفید پینٹ اور کھلتی شرٹ پہنے فیلٹ ہیٹ لگائے ادھر ادھر دیکھتا ہوا داخل ہوتا ہے اور بیچوں بیچ آکر ٹھہر جاتا ہے۔

(داہنی جانب سے مالا آتی ہے)

مالا؛ (نوجوان کو سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے) آپ؟

نوجوان، (گردن نیچے کرکے)

مالا؛ صاحب گھر پر نہیں ہیں،

نوجوان، جی، میں صاحب سے ملنے نہیں آیا۔

مالا؛ آپ صاحب سے ملنے نہیں آئے؟

نوجوان: جی نہیں۔

مالا؛ رانی ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ کسی سے نہیں ملینگی

نوجوان، میں رانی ماں کے لئے بھی نہیں آیا تھا۔

مالا؛ رانی ماں کیلئے بھی نہیں آئے تھے۔ میرے دادا بھی صاحب کے کلب گئے ہوئے ہیں۔ صاحب نے انہیں وہاں بلایا ہے۔

نوجوان، میں دادا کے لئے بھی نہیں آیا۔

مالا؛ پھر آپ ہیں کون؟

نوجوان: میں......!
مالا: بجلی دیکھنے آئے ہو۔؟
نوجوان: نہیں۔
مالا: ڈر۔ بیچ کے دفتر سے آئے ہو۔؟
نوجوان: جی نہیں۔
مالا: پانی کے بل کے لئے؟
نوجوان: جی نہیں، آپ نے مجھے پہچانا نہیں،؟
مالا: نہیں، (مسکراتی ہے) میں نے نہیں پہچانا۔ کیا آپ ہوشیار پور سے آئے ہیں۔؟
نوجوان: (ایک پتی توڑتے ہوئے) جی نہیں میں تو یہیں سے آیا ہوں، پاس ہی سے۔
مالا: کہیں تم جانکی کے پتی تو نہیں؟
نوجوان: جی نہیں، اتفاق سے میں ابھی تک کسی کا پتی نہیں ہو سکا ہوں
مالا: ؤ، اے بابا تو پھر کون ہو تم؟
نوجوان: کیا آپ نے سچ مچ مجھے نہیں پہچانا،
مالا: میں تمہیں جانتی تک نہیں تو پہچاننے کا کیا سوال ہے۔
نوجوان: مگر میں تو یہاں روز آتا ہوں۔
مالا: یہاں۔؟
نوجوان: جی ہاں، یہاں۔ (ہاتھ لمبا کرکے) اور اکثر وہاں تک۔
مالا: روزانہ۔؟
نوجوان: جی ہاں روزانہ۔ بعض دفعہ تو دن میں دو بار۔ حیرت ہے آپ نے کئی بار مجھے دیکھا ہے اور اس وقت آپ یوں پلکیں جھپکا جھپکا کر دیکھ رہی ہیں جیسے...... جیسے...
مالا: آدمی زدو میں کوئی چیز دیکھتا ہے۔
نوجوان: (ہنستا ہے) جی ہاں، آپ پڑھنا لکھنا جانتی ہیں۔
مالا: ہاں تھوڑا تھوڑا۔ تم جانتے ہو۔
نوجوان: (ہنستا ہے)
مالا: ارے بولو، ہنس کیا رہے ہو۔
نوجوان: میرے پاس روزانہ ملک ملک سے اور ملک کے کئی حصوں سے بڑی بڑی اور چھوٹی چھوٹی کتابیں آتی ہیں۔

مالا: کتابیں۔؟
نوجوان: رنگین بڑی بڑی تصویروں والے چکنے رسالے،
مالا: تصویروں والے رسالے، بھلا کس زبان کے؟
نوجوان: ہر زبان کے، تیلگو کے، انگریزی کے۔ کنڑ کے، ملیالم کے، گجراتی کے، مرہٹی کے، اور کبھی سندھی کے، ہندی کے،
مالا: اور اُردو کے نہیں۔؟
نوجوان: اُردو کے بھی بہت آتے ہیں۔
مالا: کیا کرتے ہو تم یہ سب۔؟
نوجوان: کچھ خود پڑھتا ہوں۔ باقی تقسیم کر دیتا ہوں۔
مالا: مجھے کچھ کتابیں اور پرچے دوگے۔
نوجوان: ہاں ہاں ضرور۔ بولو کون سے پرچے دوں۔
مالا: اُردو کے اور تیلگو کے،
نوجوان: ضرور ضرور، بڑی خوشی سے
مالا: تم بہت بڑے آدمی ہوگے نا؟ میرا مطلب ہے، آپ بہت بڑے آدمی ہیں نا؟
نوجوان: (ہنستا ہے)
مالا: آپ ہنس رہے ہیں۔
نوجوان: مگر تمہارے لئے بالکل بڑا نہیں ہوں۔
مالا: تم نے تو مجھے پریشان کر دیا۔ آخر کون ہو تم۔؟
نوجوان: نہیں پہچانا۔؟
مالا: نہیں، میں جاتی ہوں۔
نوجوان: ارے ارے، ٹھہرو، ٹھہرو،
مالا: تم یہاں روز کیوں آتے ہو۔ میں نے تو تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔
نوجوان: بات یہ ہے۔
مالا: کیا بات ہے؟
نوجوان: کہہ دوں۔؟
مالا: نہیں تو میں جاتی ہوں۔
نوجوان: سنو سنو سنو۔ بات یہ ہے۔ میں روز چونکہ ڈریس میں ہوتا ہوں نا، اس لئے شاید تم مجھے پہچان نہیں سکیں۔

مالا: [illegible]یس میں ــ؟

نوجوان: جی ہاں، اس وقت کیونکہ میں سادہ لباس میں ہوں اس لئے آپ مجھے، آپ مجھ سے اجنبی کا سا سلوک کر رہی ہیں

مالا: کبھی آپ۔ کبھی تم ــ!

نوجوان: جی وہ، میں سادہ لباس میں ہوں نا!

مالا: سادہ لباس؟ یہ قمیص ــ؟

نوجوان: ویسے یہ قمیص نو روپے آٹھ آنے کی ہے۔

مالا: یہ پتلون ــ؟

نوجوان: سولہ روپے۔

مالا: ہیٹ ــ

نوجوان: جی ــ؟

مالا: جی ــ؟

نوجوان: ایک دوست کی ہے۔

مالا: (نیچے دیکھتے ہوئے) یہ شوز بھی ــ؟

نوجوان: جی نہیں یہ میرے اپنے ہیں۔ لیکن بہت دنوں کے ہیں۔

مالا: (انگلی ٹھوڑی کو لگاتی ہے) اب بھی میرے پلّے کچھ نہیں پڑا کہ آپ کون ہیں ــ؟

نوجوان: سچ مچ ــ؟

مالا: کیا میں آپ سے مذاق کروں گی ــ؟

نوجوان: جی، میں۔ اس محکمے کا .....

مالا: پولیس کے جوان ہو ــ؟

نوجوان: جی نہیں پوسٹ مین ہوں، خط دینے والا۔ روز تو آپ مجھ سے چٹھیاں لے جاتی ہیں۔ (مالا ہنس پڑتی ہے دہری ہو ہو کر ہنستی ہے)۔

نوجوان: آپ نے مجھے بہت حیران کیا۔

مالا: ارے، حیران تم نے کیا یا میں نے، (آنکھیں نکالتی ہے۔)

نوجوان: جی جی، شاید میں نے ہی۔

مالا: پہلے ہی کیوں نہ بتا دیا کہ میں پوسٹ مین ہوں۔ لاؤ۔ کہاں ہے چٹھیاں۔ کیا آج کل رات میں بھی چٹھیاں بانٹی جا رہی ہیں ــ؟

نوجوان: جی نہیں، میں اس وقت چٹھیاں بانٹنے نہیں آیا تھا۔

مالا: چٹھیاں دینے نہیں آئے تھے تو پھر ــ؟

نوجوان: میں وہ ــ دراصل یہ کہنے آیا تھا کہ .....

مالا: کہ کل ڈاک خانے کی چھٹی ہے۔

نوجوان: جی نہیں وہ۔

مالا: ارے ــ!

نوجوان: آپ ذرا ایک طرف بیٹھ جائیے نا۔

مالا: کون، میں ــ؟

نوجوان: جی ہاں، نہیں تو میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ کہہ نہ سکوں گا۔

مالا: اچھا! (ایک طرف سبزہ پر بیٹھ جاتی ہے) ہاں اب بولو۔

نوجوان: آپ بُرا تو نہیں مانیں گی ــ؟

مالا: نہیں ــ بولو۔

نوجوان: میں (ہیٹ کے کناروں کو ناخنوں سے گھماتا ہے)

مالا: میں ــ؟

نوجوان: دراصل میں ــ دراصل آپ .....

مالا: اتنی دیر میں دو لفظ آپ نے کہے ہیں۔ دراصل میں ــ دراصل آپ ــ

نوجوان: تم مجھے 'آپ' مت کہو مالا ــ

مالا: ارے تم اپنے کو کیا سمجھتے ہو۔ کیا میں تم کو 'تم' کہوں گی۔

نوجوان: ہاں صرف تم۔

مالا: ٹھیک ہے۔

نوجوان: تم ــ تم مجھے بے حد پسند ہو (جلدی سے) تم خفا تو نہیں ہو ــ؟

مالا: نہیں، بس اتنا ہی کہنا تھا۔ (جانے لگتی ہے)

نوجوان: میں دو خط بھی لایا تھا۔

مالا: ارے، پھر اتنی دیر سے دیئے کیوں نہیں۔ لاؤ۔ میں اندر لے جاؤں ــ

نوجوان: یہ صرف تمہارے لئے ہیں۔

مالا: میرے لئے، لاؤ ــ (نوجوان جیب میں سے ایک

کا غذ نکال کر مالا کو دیتا ہے)

مالا: (پڑھتی ہے) مجھے تم بے حد پسند ہو۔ اور میں ؟ ۔ دھت (پھاڑ کر پھینک دیتی ہے)

نوجوان: یہ دوسرا خط ہے۔ کہیں اس کا بھی وہی حشر نہ ہو۔

مالا: پہلے میں پڑھوں تو (پڑھتی ہے) میں تم سے شادی کر کے گھر بسانا چاہتا ہوں۔ "ارے باپ رے!"

نوجوان: کیا ہوا۔ ؟

مالا: دادا آ رہے ہیں۔

نوجوان: (گھبرا کر) کہاں، کدھر، کس طرف۔ ؟

مالا: وہ سامنے، اب بھاگتے کیوں ہو۔ ؟

نوجوان: بھاگوں نہیں تو کیا کروں۔

مالا: اگر اب بھاگے تو جب کبھی ادھر آؤ گے ڈنڈے سے تمہارے پاؤں توڑ دوں گی۔

نوجوان: ٹھہرتا بھی ہوں تو پیر ٹوٹتے ہیں۔ بھاگتا ہوں تو سر پھوٹتا ہے۔ اوہ۔!

بوڑھا: یہ کون ہے مالا۔

مالا: یہ ۔ یہ ۔ دادا مجھے خود سمجھنے میں دو گھنٹے لگے ہیں۔

بوڑھا: دو گھنٹے۔ ؟

مالا: ہاں ۔ !

بوڑھا: کیا چاہتا ہے یہ۔ ؟

مالا: آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ یہ خط دیکھئے۔

نوجوان: کیا کر رہی ہو ۔

بوڑھا: ہوں، تیرا خیال ہے۔ اری ٹھہر ٹھہر جا مت۔ تیری مرضی جانتے ہی کو تو یہ آیا ہے۔

مالا: (حیرت سے) دادا، !!

بوڑھا: میں اسے جانتا ہوں۔ میں نے ہی اسے بھیجا ہے۔

مالا: (ٹھنکتی ہے) اُو دادا، تم بہت خراب ہو۔

(بوڑھا قہقہہ لگاتا ہے۔ نوجوان اس کے پیروں کی طرف جھکتا ہے)

(مالا بھاگ جاتی ہے) (پردہ گرتا ہے)

بقیہ صفحہ ۴۴۔ "مخدوم کی شاعری"

کی معروف نظم "انتظار" پڑھیئے۔ ایک نہیں کئی بار۔ یونہی نہیں نظم کی فضا میں ڈوب کر دنیا و ما فیہا سے بے خبر ہو کر ۔ جب ہم اس مصرعہ پر پہنچتے ہیں۔ ع۔

"بج رہی تھی مرے غمخانے میں شہنائی سی"

تو یوں محسوس ہوتا ہے۔ واقعی کوئی شہنائی بجا رہا ہو اور ہم کھو سے گئے ہوں۔ یہ غنائیت صرف مقفّیٰ اور مرجز نظموں ہی تک نہیں۔ آزاد اور معرّیٰ شاعری میں بھی مخدوم نے غنائیت سمو دی ہے۔ چنانچہ "چارہ گر" اور "چاند تاروں کا بن" اپنی غنائیت اور ترنم ریزی کے سبب بھی وزن اور وقعت رکھتی ہیں۔ مخدوم کی مقبولیت کا ایک باعث یہ بھی ہے۔ لیکن مخدوم کی شاعری کی ہمہ گیری اور اُن کی عظمت اس میں ہے کہ اُن کی آواز میں اپنے عہد اور معاشرے کی آواز ہے اُن کے دل کی دھڑکنوں میں عوام کے دلوں کی دھڑکنیں شامل ہیں وہ اپنی سیاسی حیثیت ہی میں عوام سے بے حد قریب نہیں رہے اُن کی شاعری بھی عوامی جذبات و احساسات کی آئینہ اور انسان دوستی کی تفسیر اور تصویر ہے۔ اس لئے کمیت کے اعتبار سے کم ہونے کے باوجود اپنی کیفیت کے باعث اُردو شاعری کا وسیع حصہ رہیگی

ناولٹ

کشمیری لال ذاکر

دھرتی سدا سہاگن

کشمیری لال ذاکر ممتاز کہانی نگاروں میں سے ہیں ۔ اپنی کہانیوں کی انفرادیت سے وہ اپنے قاری کو ہمیشہ متاثر کرتے رہے ہیں۔ وہ شعر بھی کہتے ہیں، اور انہیں زبان و بیان پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ کشمیری لال ذاکر ۱۹۴۰ء سے مسلسل لکھ رہے ہیں۔ مگر کبھی افراط و تفریط کے شکار نہیں ہوئے۔ پہلی کہانی "الگ الگ راستے" تھی جو "ہمایوں" لاہور میں شائع ہوئی تھی، انہوں نے چونکا دیا تھا ۔ ابھی تک اردو میں کہانیوں کے تین مجموعے، دو ناول اور دو مکمل ڈرامے ۔ ہندی میں کہانیوں کے چار مجموعے ۔ دو ناول، ایک ڈرامہ اور پنجابی زبان میں ایک ناول اور دو کہانیوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ تیلگو، تامل، گجراتی اور روسی زبان میں کہانیوں کے ترجمے ہوئے۔ سال گزشتہ حکومت ہریانہ نے کشمیری لال ذاکر کی طویل خدمات کو سراہتے ہوئے "اسٹیٹ ایوارڈ" دیا تھا۔ دو کتابوں پر حکومت پنجاب سے اور ایک کتاب پر مرکزی سرکار سے انعامات مل چکے ہیں۔ تعلیمی محکموں میں زندگی گزری ہے۔ آج کل بورڈ آف ایجوکیشن حکومت ہریانہ میں آفیسر ہیں۔

پہلا باب

پسینجر ٹرین کے سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں بیٹھے ہوئے شیتل نے باہر جھانکا۔ گاڑی بہت دھیمی رفتار سے چل رہی تھی۔ پسینجر ٹرینیں سدا ہی آہستہ چلتی ہیں، گاؤں میں رہنے والی جنتا کی سوچ کی طرح۔ وہ بھی تو گاؤں کا رہنے والا تھا۔ شمر پور گاؤں کا۔ شیتل کی آنکھوں کے سامنے اپنے گاؤں کا نقشہ گھوم گیا۔ ایک چھوٹا سا گاؤں، شہر سے میلوں دور، چھوٹی سی تنگ گلیاں جن میں بہت سے موڑ تھے۔

آج سے کچھ برس پہلے وہ اپنے گاؤں کی پیاری دھرتی کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس لئے کہ اس کے کھیتوں میں کم اناج اُگتا تھا۔ سینچائی کے سادھن نہیں تھے۔ بارش بھی کم ہوتی تھی۔ اُس کا کُنبہ اگرچہ بہت بڑا نہیں تھا۔ پھر بھی گزارا اچھی طرح نہ ہوتا تھا۔ اور شیتل اپنے گھر کی حالت سدھارنے کی خاطر گھر ہی چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

آج کئی برس کے بعد اپنی ایک ٹانگ کٹوا کر واپس آرہا تھا وہ اپنے گاؤں۔ اُسے رہ رہ کر یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ اپرادھی ہے۔ دھرتی نے جو امانت اُس کے ہاتھ سونپی تھی اُس کا کچھ حصّہ لُٹ گیا تھا۔ وہ اپنے جسم کے سارے انگ صحیح و سالم لیکر گیا تھا اور اب ایک ٹانگ گنوا کر لنگڑاتا ہوا واپس جارہا تھا۔ اُس کی امانت بے خبری میں نہیں ہوشیاری میں لُٹی تھی۔ شیتل نے سیٹ پر بیٹھے ہوئے اپنی کٹی ہوئی بائیں ٹانگ کے گھٹنے سے اوپر والے حصّہ کو ہلایا۔ اُس کی مصنوعی ٹانگ کی بے جان اور بے حس سطح نے اُس کے تمام جسم میں ایک کپکپی سی بھر دی۔

اُس نے دوبارہ ڈبے سے باہر جھانکا۔ اور اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ شمر پور گاؤں کی سیمائیں شروع ہو گئی تھیں۔ ٹیلے پر اُگے ہوئے وہ پیڑ کتنے بڑے اور گھنے ہو گئے تھے۔ اُس ٹیلے پر کسی فقیر کا مقبرہ تھا۔ اب جانے اُس پر کوئی ڈھنگ سے چراغ بھی جلاتا تھا کہ نہیں۔ کسی زمانے میں تو اس مقبرے کے بڑے چرچے ہوا کرتے تھے۔ سال میں دو بار میلہ بھرتا تھا۔ ڈھلتی رات تک قوالیاں ہوتی تھیں۔ لوگ دور دور سے آتے تھے۔ منتیں مانگتے، لنگر کھلاتے تھے۔ دنیا بھر کے فقیر جمع ہوتے تھے۔ کالے کالے برقعوں میں چھپے چاند سے مکھڑے سہرے میں جھلکتے تھے۔ مرادیں پوری بھی ہوتی تھیں اور ادھوری بھی رہتی تھیں۔ لیکن اس سے فقیر کی عظمت میں کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ شیتل اپنے مسلمان دوستوں کے ساتھ میلے میں جایا کرتا تھا۔

شاعر لدھیانوی

جب بھی کوئی کالا برقعہ سرسراتا ہوا قریب سے گزرتا اُس کے ذہن میں جانے کیا ہونے لگتا۔ ایک غیر واضح سی کیفیت تھی جسے وہ کوئی نام نہ دے سکتا تھا۔ شیتل کے دماغ میں بہت سی چیزیں غیر واضح اور نامکمل تھیں۔ اُس کا ذہن ایک اچھا خاصا کباڑ خانہ تھا جس میں جہان بھر کی چیزیں بغیر کسی ترتیب کے پڑی تھیں۔ جب بھی اُس نے کسی چیز کو ترتیب سے رکھنا چاہا، ڈھیر کا ڈھیر اُس پر آ گرا۔ اور وہ ایک بھاری بوجھ کے نیچے دب کر رہ گیا۔ اُس کی یہ کٹی ہوئی ٹانگ بھی تو ایسی ہی ایک بے کار کوشش کا نتیجہ تھی۔

ٹیلہ گزر گیا تھا۔ گاڑی دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔

شیتل نے دیکھا۔ مہامایا کے مندر کی سفید برجی چمک رہی تھی۔ جیسے کسی سوکھے ہوئے درخت کی آخری ٹہنی پر کوئی راج ہنس بیٹھا ہو۔ موتی چننے کی کوشش میں لاکھوں کنکروں کو ٹٹولا ہو اور اب تھک ہار کر ایک ٹھنڈ پر بیٹھا آرام کر رہا ہو۔ مہامایا کا یہ مندر بہت پرانا ہے۔ اِس گاؤں سے بھی پرانا۔ کہتے ہیں کہ ایک بار بہت سے یاتری دیوی کے درشنوں کو آئے اور پھر واپس ہی نہیں گئے۔ رات کو خواب میں دیوی نے اُن سے کہا کہ اگر وہ اُس کے سچے بھگت ہیں اور اُنہیں اُس پر اٹوٹ اعتقاد ہے تو وہ وہیں بس جائیں، اور اُس سے اگلے روز مندر سے کوئی دو میل دُور خالی پڑی ہوئی زمین پر کہیں کہیں سے آئے ہوئے یاتری واپس جانے کے بجائے یہیں آباد ہو گئے۔ اور اِس طرح سمرپار گاؤں کی بنیاد پڑی۔

مہامایا کے مندر میں نوراتروں کے دنوں میں بڑی بھیڑ رہتی تھی۔ لوگ مُنہ اندھیرے نہا دھو کر دیوی کی آرادھنا کے لئے مندر میں پہنچ جاتے تھے۔ لوبان اور خوشبودار دھوپ کا دھواں مندر سے باہر نکل کر ساری فضا کو ایک عجیب طرح کی کشمکش اور خوبصورتی بخشتا تھا۔ بچپن میں وہ کئی بار اپنی ماں کے ساتھ مہامایا کے مندر میں دیوی کے درشنوں کے لئے گیا تھا۔ ایک بار جب اُس نے دسویں جماعت کا امتحان دیا تھا، اور اِس کا ریاضی کا پرچہ بہت خراب ہو گیا تھا تو اُس نے مندر میں جا کر مَنّت مانگی تھی کہ اگر وہ امتحان میں پاس ہو گیا تو پانچ روپے کا پرشاد چڑھائے گا۔ رزلٹ والے روز شیتل کی حالت بڑی عجیب تھی۔ وہ بڑا بے چین اور مضطرب تھا۔ یہ اُس کی قسمت کے فیصلے کا دن تھا اور اُسے یقین تھا کہ وہ فیل ہو جائیگا۔ لیکن جب رزلٹ نکلا تو وہ پاس تھا۔ اُس کی حیرت اور خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ مہامایا نے اُس کی لاج رکھ لی تھی۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ اُداس ہو گیا۔ اُسے تو مہامایا کو پرشاد بھینٹ کرنا تھا۔ مگر اُس کے پاس، پانچ روپے تو کیا پانچ آنے بھی نہیں تھے۔ کہاں سے لائے گا وہ اتنی بڑی رقم؟ یہ سوچ کر اُس کی تمام خوشی ایک دم غائب ہو گئی۔ وہ پراشچت کی تلخی سے جلنے لگا۔ اُس نے اپنی مَنّت پوری نہ کی تو دیوی ناراض ہو جائے گی۔ اُس کے کوپ کو وہ کیسے برداشت کرے گا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور سیدھا مہامایا کے مندر کی طرف چل پڑا۔

جب اُس کے تمام ساتھی ہنس کھیل رہے تھے، وہ گاؤں سے دو میل دُور دیوی کے مندر میں بیٹھا اپنی بے بسی اور مجبوری پر رو رہا تھا۔ جانے وہ کتنی ہی دیر مندر میں بیٹھا روتا رہا۔ جب گھر واپس پہنچا تو رات ہو چکی تھی اور ماں اُس کے لئے پریشان ہو رہی تھی۔

گاڑی کے ڈبے سے باہر جھانکتے ہوئے شیتل کی آنکھوں کے سامنے آج بھی وہ تمام نظارہ اپنی ساری جزئیات کے ساتھ گھوم رہا تھا۔

گاڑی اپنی مخصوص رفتار سے چل رہی تھی۔

گاؤں کا اسٹیشن قریب آ گیا تھا۔ جن دنوں وہ یہاں تھا، اُن دنوں بس ایک آدھ گاڑی ہی یہاں رُکتی تھی۔ اسٹیشن کا کوئی واضح وجود نہیں تھا۔ ریلوے لائن کے ساتھ تھوڑی سی جگہ پر سُرخ بجری ڈال دی گئی تھی۔ تھوڑی ہی دُور پر ریلوے اسٹاف کے مختصر سے گھر والوں کے لئے نہایت ہی مختصر کوارٹر تھے۔ لگتا تھا جیسے ریلوے اسٹیشن کا گاؤں سے بس ایک واجبی سا ہی تعلق تھا، جسے تعلق کہنا بھی زیادتی تھی۔ اور اب تو اُس کی کایا ہی پلٹ گئی تھی۔ اسٹیشن کی اچھی خاصی عمارت تھی۔ اُونچا اور پکا پلیٹ فارم تھا۔ مسافروں کو پانی پلانے کے لئے جانی وار سبیل بھی تھی۔ شیتل کے جانے کے بعد گاؤں میں کتنی تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ شاید یہ سب اُس کے گاؤں چھوڑنے کے کارن ہی ہوا تھا۔

اگر وہ گاؤں ہی میں پڑا رہتا تو یہاں کچھ بھی نہ ہوتا۔ کوئی تبدیلی رُونما نہ ہوتی۔ کوئی انقلاب نہ آتا۔ کسی پری ورتن نے کروٹ نہ لی ہوتی۔ سب کچھ ویسا ہی بے رس اور بے جان رہتا۔ زندگی چادر تان کر بے سُدھ پڑی رہتی اور اُس میں حرارت کی رمق بھی پیدا نہ ہوتی۔ اچھا ہوا وہ چلا گیا۔

اور اب اتنے برسوں کے بعد وہ واپس آ رہا تھا۔ بہت کچھ گنوا کر۔ اُسے ایک بار پھر اپنی کٹی ہوئی ٹانگ کا خیال آ گیا اور عین اُسی وقت گاڑی سمر پور اسٹیشن کی حدود میں داخل ہوئی اور پھر رُکنے کی کوشش کرتے ہوئے آخر رُک ہی گئی، ایک ہلکے سے دھچکے کے ساتھ۔ اُس نے دیکھا گنتی ہی کے کچھ مسافر گاڑی سے اُترے تھے۔ سروں پر اپنا اپنا سامان اُٹھائے جا رہے تھے، گیٹ کی طرف۔ اُس وقت سُشیتل کو اپنی ایک ٹانگ نہ ہونے کا بڑی تلخی سے احساس ہوا۔ وہ اپنا سامان کیسے اُتارے؟ قلی تو ایک بھی نظر نہ آ رہا تھا پلیٹ فارم پر۔ اُس نے اپنی بیساکھی سنبھالی اور پھر ساتھ کی سیٹ پر بیٹھے مسافروں کی طرف دیکھا، خاموش نظروں سے۔ اُنہوں نے فوراً ہی اُس کا سامان ڈبے سے باہر نکال کر پلیٹ فارم پر رکھنا شروع کر دیا۔ اور وہ دھیرے سے گاڑی سے نیچے اُتر گیا۔ اُس نے ایک بار پھر خاموش لیکن تشکر بھری نظروں سے اُن سب کی طرف دیکھا جیسے اُنہوں نے اُس پر کوئی بہت بڑا احسان کیا ہو، ایک اپاہج پر۔ وہ ایک اپاہج ہی تو تھا۔ یہ خیال آتے ہی اُس نے پلیٹ فارم پر رکھے اپنے ٹرنک، بستر اور فوجی تھیلے کی طرف دیکھا۔ یہی تو تھی ایک اپاہج کی پونجی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اُس کا جی چاہا کہ وہ کالے رنگ کے ٹرنک پر سفید پینٹ سے لکھے ہوئے اپنے نام کے سامنے اپاہج کے لفظ کا اضافہ کر دے۔ اُس نے ایک بار سُونے پلیٹ فارم کا جائزہ لیا۔ گاڑی جا چکی تھی۔ سب مسافر بھی گیٹ سے باہر نکل چکے تھے۔ ایک صرف وہ کھڑا تھا، اکیلا اور بے سہارا۔ اُس کی آنکھیں انجانے ہی میں اپنی بیساکھی پر جم گئیں، جیسے اُس کی زندگی کا آخری سہارا وہی ہو۔ وہ سنسان پلیٹ فارم پر اپنی نئی مصنوعی ٹانگ سنبھالے یوں کھڑا تھا جیسے رات کی سیاہی میں محاذ پر کوئی سپاہی بڑے ہی مخدوش حالات میں پہرہ دے رہا ہو۔ اور کبھی کبھی خود اپنے ہی قدموں کی آواز سے چونک اُٹھتا ہو، رات کے گہرے اور گمبھیر سناٹے میں۔ اس مصنوعی ٹانگ کا احساس، جو اس کے جان دار جسم سے سمجھوتہ نہ کر پائی تھی، کتنا تلخ تھا۔!

سردیوں کا موسم ہونے کے کارن دھوپ اچھی لگ رہی تھی۔ سُشیتل نے ریلوے اسٹیشن کے دونوں طرف آنکھ بھر کر دیکھا۔ کھیتوں میں سرسوں پھول رہی تھی۔ فصلیں جوان ہو رہی تھیں۔ فصلیں بچپن سے لے کر بڑھاپے تک ہر موڑ پر سے گزرتے ہوئے خوبصورت لگتی ہیں۔ بیج جب مٹی کی گیلی گیلی تہوں سے سر نکال کر کونپلوں کو باہر اُچھالتے ہیں تو رات دن کام کرنے والے کسانوں کی آرزوئیں جاگ جاتی ہیں اور جب دن کی دھوپ، رات کی چاندنی اور پچھلے پہر کی شبنم پی کر فصلیں پروان چڑھتی ہیں تو اُن کی سرسراہٹوں سے کنواریوں کے سپنے تشکیل پاتے ہیں۔ اور جب یہ اناج کی بالیوں کے بوجھ سے لد کر جھکتی ہیں اور اُن کی رنگت پک پک کر سونے کا روپ دھار لیتی ہے تو دھرتی کے بیٹوں اور بیٹیوں کے سینے جوان اور مضبوط ارادوں سے اُبلنے لگتے ہیں۔ پہاڑی جھرنوں کی طرح جن میں صاف اور شفاف پانی گنگناتا رہتا ہے۔ حُسن کی رعنائیاں اور رنگینیاں عشق کا ہاتھ تھام کر زندگی کی دشوار راہوں پر اٹوٹ عزم سے گامزن ہو جاتی ہیں اور اس طرح انسانی رشتوں کے قافلے سدا چلتے رہتے ہیں، کبھی سُست اور کبھی تیز رفتار سے۔ لیکن رُکتے کبھی نہیں۔ انسانی رشتے بڑے مضبوط ہیں۔ وہ ٹوٹ جائیں تو انسان سے زندگی کا ساتھ چھوٹ جاتا ہے۔ ان رشتوں کو سنوارنا اور نکھارنا ہم سب کا فرض ہے۔ ہم جب اس فرض کو بھول جاتے ہیں تو انجانے ہی میں زندگی کے ارتقا میں حائل ہو جاتے ہیں اور اُس کا بہاؤ رُک جاتا ہے اور اُس کی خوبصورتی مجروح ہو جاتی ہے اور اُس کی رنگینیاں سسکنے لگتی ہیں۔ جب کبھی ایسا ہوتا ہے تو زندگی ایک دم چیخ اُٹھتی ہے۔

سُشیتل نے بیساکھی ایک طرف رکھ دی اور ٹرنک پر بیٹھ گیا۔ اُس نے جیب میں سے سگرٹ کا پیکٹ نکالا۔ سگرٹ سُلگایا اور اُس کا دھواں نکھری دھوپ میں بکھیرنے لگا۔ فضا میں تحلیل ہوتے ہوئے دھوئیں کے ہلکے ہلکے مرغولے بڑے خوبصورت لگ رہے تھے۔ اُس نے کلائی سے بندھی گھڑی کی طرف دیکھا۔ دو بج رہے تھے۔ گاؤں بہت دُور نہیں تھا۔ وہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ نہیں بیٹھ سکتا تھا اور سگرٹ پی سکتا تھا اور سوچ سکتا تھا۔ اگر اُس نے ماں کو اپنے آنے کی اطلاع دی ہوتی تو وہ خود اسٹیشن پر آ جاتی۔ لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ

شاعر بھی

اُس کی ماں اسٹیشن پر آئے اور اپنے اپاہج بیٹے کو سینے سے لگاتے ہوئے رو اُٹھے۔ اُسے شرم آ رہی تھی ماں کے سامنے جاتے ہوئے۔ وہ اُس سے کیا کہے گا۔ کہ وہ جنگ کے محاذ سے اپنی ماں کے لئے لکڑی کی مصنوعی ٹانگ اور بیساکھی لے کر آیا ہے، وہ چیخ اُٹھے گی اور اُس نے فیصلہ کر لیا کہ آج کے بعد وہ اپنی مصنوعی ٹانگ کو استعمال نہیں کریگا۔ اُسے اُتار کر رکھ دے گا اور ایک دن توڑ کر گھر سے باہر پھینک دے گا۔ اب اُسے گاؤں پہنچنے کی جلدی نہیں تھی۔ جب وہ واپس آ گیا ہے تو گاؤں میں تو جائے گا ہی۔ قیامت تک یہیں تھوڑی بیٹھا رہے گا۔ لیکن جو لمحے اِس سنسان پلیٹ فارم پر سَر سَوں کے بے شمار پھولوں کو دیکھتے ہوئے گزر جائیں وہی اچھے ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد اسسٹینٹ اسٹیشن ماسٹر اپنے کوارٹر کی طرف جاتے ہوئے اُدھر سے گزرا۔ اب تو گاڑی شام کو چھ بجے آئے گی، اِس لئے وہ گھر جا سکتا تھا اور کچھ دیر آرام کر سکتا تھا۔ شیتل کے قریب سے گزرتے ہوئے اُس نے پوچھا۔

"کہاں جانا ہے جوان تمہیں۔؟"

"سمر پور گاؤں میں" شیتل نے جواب دیا۔

"گاڑی گزرے تو دیر ہو گئی۔ تم ابھی تک یہاں بیٹھے ہو۔؟"

"یوں ہی ذرا دھوپ میں بیٹھ گیا تھا۔"

اسسٹینٹ اسٹیشن ماسٹر شیتل کا جواب سُن کر آگے نکل گیا۔ اُسے کیا معلوم کہ شیتل کو دھوپ میں بیٹھنا کیوں اچھا لگتا تھا۔ اُسے کیا خبر کہ نیفا کی سرحد پر اٹھارہ ہزار فٹ کی بلندی پر اپنی چوکی کی حفاظت کرنے کے بعد شیتل کو اپنی ٹکڑی سے الگ ہو کر اڑتالیس گھنٹوں تک منجمد کر دینے والے کمر تک اُونچے پانی میں چلنا پڑا تھا۔ اور جب وہ اسپتال پہنچایا گیا تھا تو اُس کا نچلا دھڑ سُن ہو چکا تھا۔ انجماد انگیز ماحول اُس کی ہڈیوں تک سرایت کر گیا تھا اور اِسی لئے اُس کے جسم کا رُواں رُواں گرمی اور دھوپ کی ہلکی سی رمق تک کو ترستا تھا۔ سمر پور کے چھوٹے سے اسٹیشن پر گاڑیوں کی آمد و رفت کو کنٹرول کرنے والے اِس جونیئر ریلوے کرمچاری کو کیا معلوم کہ زندگی میں کتنے سنگین حادثے پیش آیا کرتے ہیں۔ اُسے کون بتائے کہ اِن چھوٹے چھوٹے پُرسکون گاؤں سے دُور کتنے بڑے بڑے طوفان اُٹھا کرتے ہیں، کتنے بھونچال جاگا کرتے ہیں۔ اور کتنی حسین اور عظیم عمارتیں پَل بھر میں ملبے کا ڈھیر بن جاتی ہیں۔ بندھی ہوئی خاموش زندگی گزارنے والے یہ لوگ کوندتی بجلیوں اور چنگھاڑتی آندھیوں کو بھلا کیا جانیں۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے برفیلی چوٹیاں، گہرے بھیانک کھڈ اور برف اُڑاتی ہوئی تیز ہواؤں کے ریلے گھوم گئے۔ اُسے محسوس ہوا جیسے اُس کے کانوں میں گولیوں کی گونجتی ہوئی آوازیں اور زخمیوں کی کراہیں، پگھلے ہوئے گرم سیسے کی طرح داخل ہو رہی تھیں۔ اُس چوکی کی چٹان کا دردناک منظر اُسے یاد آ گیا جس کی خاطر اُس کے ساتھیوں نے اپنی جانیں قربان کر دی تھیں۔

شیتل نے اپنی ٹانگیں پھیلائیں، اُسے ایکبار پھر اپنی مصنوعی ٹانگ کو ایک طرف کرتے ہوئے تلخی کا احساس ہوا۔ نیا سگرٹ سلگا کر اُس نے دھوئیں کا ایک بڑا سا غبارہ فضا میں اُچھالا اور ٹرنک پر بیٹھے بیٹھے ہی ایک بھرپور انگڑائی لی۔ ایک آوارہ کتا اُس کے تھیلے کو سونگھتے ہوئے ذرا دُوری پر رُک گیا۔ شیتل نے ہاتھ بڑھا کر تھیلے کو اپنی طرف کھینچا۔ اُس میں سے بسکٹ کا ڈبہ نکالا۔ دو تین بسکٹ پاس کھڑے کتے کی طرف پھینکے اور ایک اُس نے اپنے مُنہ میں ڈال لیا۔ کاش اُسے اِسی لمحہ کہیں سے چائے کی ایک تیز سی پیالی مِل جائے۔ اُس نے پلیٹ فارم پر ایک بھرپور نظر ڈالی۔ اسٹیشن سے باہر نکلنے والے گیٹ سے اِدھر کچھ فاصلے پر ٹی اسٹال تھا۔ تھا تو وہ یُونہی سا لیکن شیتل کو وہاں سے چائے کی ایک پیالی مِل سکتی تھی۔ اُس نے اپنی بیساکھی سنبھالی اور ناپ تول کر قدم اُٹھاتا ٹی اسٹال کی طرف چل پڑا۔ آوارہ کتا بڑی وفاداری سے اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

"کیوں بھائی چائے کی ایک پیالی مِل سکتی ہے۔؟"

شیتل نے ٹی اسٹال کے چھپّر کی سی چھت کے نیچے اُونچے اسٹول پر بیٹھے آدمی سے پوچھا جو بیڑی پی رہا تھا۔

"مِل سکتی ہے۔" جواب میں کوئی جذبہ نہ تھا۔ صرف لہجہ تھا۔ قدرے سخت اور کھردرا۔ وہ اسٹول سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"لیکن بیڑی والے، ہاتھ دھو لیتا بھائی۔"

شیتل کی بات سن کر چائے والے نے جن نظروں سے اُس کی طرف دیکھا وہ بڑی حوصلہ شکن تھیں۔

"ایسے گاہک ہمیں وارا نہیں کھاتے۔" اُس نے بیڑی کا ایک لمبا کش لیا اور دوبارہ اسٹول پر بیٹھ گیا۔

سمر پور گاؤں میں نیا ریلوے اسٹیشن بن گیا تھا۔ اچھی عمارتیں تعمیر ہو گئی تھیں۔ پکے پلیٹ فارم بن گئے تھے لیکن لوگ وہی تھے، اُن کے ذہن نہیں بدلے تھے، روایات اور عادات کی گہری گرد ابھی اُن کی شخصیت سے لپٹی تھی۔ جانے یہ گرد کب چھٹے گی؟ کب اُن کے ذہن اُجلے ہوں گے؟ کب اُن کے کردار نکھریں گے، ٹی اسٹالوں پر چائے بنانے والے کب ایسے گاہکوں کو برداشت کریں گے۔ جو اُنہیں بیڑی والے ہاتھ دھونے کو کہتے ہیں، جو اُن سے تمیز سے بات کرنے کی توقع رکھتے ہیں۔ جو اُن لوگوں کو صرف چائے بنانے والے، رکشا چلانے والے، مزدوری کرنے والے نہیں سمجھتے، بلکہ اپنے جیسے اِنسان سمجھتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ وہ زندگی میں مفید اور کار آمد شہری بنیں۔ جن کے سامنے زندگی کا کوئی مقصد ہو، کوئی منزل ہو، کوئی کہکشاں ہو، کوئی اُفق ہو، اور اُس کے حصول کے لئے وہ جدوجہد کریں۔ محنت کے بیج بوئیں اور پودوں کو نکھاریں۔ اور پھولوں سے اپنے گھروں کو سجائیں۔ گھر سجیں گے تو ایک نسل نکھرے گی، ایک دَور نکھرے گا، ایک یُگ پروان چڑھے گا۔ ایک نئے اِنسان کا نرمان ہوگا۔

لیکن شیتل تو جھکی تھا۔ وہ تو ایسی ہی مشکل، اور ناممکن باتیں سوچنے کا عادی تھا۔ محاذ پر تھا تو سوچا کرتا تھا کہ فوجیں آپس میں لڑیں گی نہیں، سپاہی ایک دوسرے کا خون نہیں بہائیں گے۔ آپس میں بات چیت کر کے فیصلہ کر لیں گے۔ لیکن ایسا کب ہوا تھا؟ ایسا کب ہوتا ہے؟۔ اِنسان تو ایک دوسرے کا خون بہا کر اپنے مسئلوں کا حل سوچتے ہیں۔ ایک دوسرے کا گلا گھونٹ کر امن کی بنیاد رکھتے ہیں۔ عورتوں کے سہاگ لوٹ کر اُنہیں بھرے پُرے آنگن دینے کی تمنا کرتے ہیں۔ ایسی باتیں سوچنے والا شیتل بھلا کب تک فوج میں رہ سکتا تھا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ وہ صرف ایک ٹانگ گنوا کر ہی واپس آگیا، ورنہ شاید اُس کا دماغ ہی اُس سے چھن جاتا، اُس کے جذبات و احساسات اُس کا ساتھ چھوڑ دیتے اور جب وہ اپنے گاؤں لوٹتا تو اُس کے پاس کچھ بھی نہ ہوتا۔ اُس کی زندگی ایک دم خالی اور ویران ہوتی۔ اُس میں صرف کھنڈروں کا ڈراؤنا پن ہوتا اور ہیروشیما کے بازاروں اور گلیوں میں سڑتی ہوئی لاشیں ہوتیں اور برف کے نیچے دبے ہوئے جسم ہوتے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ اُس کی زندگی میں یہ لمحہ نہیں آیا۔ اُسے صرف بیساکھی اور مصنوعی ٹانگ دے کر ہی چھوڑ دیا گیا۔ اُس کے دماغ پر جلتی ہوئی مہریں نہیں لگائی گئیں۔ اگر کبھی ایسا لمحہ آجاتا تو پھر — ؟

شیتل نے سوچ سے بوجھل آنکھیں اُوپر اُٹھا کر چائے والے کی طرف دیکھا۔ وہ اِسٹول پر بیٹھا بیڑی پینے میں مست تھا۔ ایسے گاہک کی طرف توجّہ دینے کی اُسے ضرورت نہیں تھی۔

شیتل بیساکھی کا سہارا لئے واپس آگیا۔ اُسی جگہ جہاں اُس کا سامان پڑا تھا۔ اُسے چائے کی بیحد ضرورت تھی۔ لیکن گندے ہاتھوں کی بنی ہوئی چائے نہیں۔ آوارہ کُتّا پھر اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اپنی جگہ پر واپس پہنچ کر شیتل نے تھیلے میں سے بسکٹ کا ڈبّہ نکالا اور سارے بسکٹ کتّے کی طرف پھینک دیئے۔ کتّا بڑی احسان مند نظروں سے شیتل کی طرف دیکھ رہا تھا اور اپنی دُم ہلا رہا تھا اور زمین پر بکھرے ہوئے بسکٹوں کو ایک ایک کر کے چبائے جا رہا تھا۔ شیتل ٹرنک پر بیٹھ گیا۔ اُس نے تازہ سگرٹ سلگایا اور آوارہ کتّے کو غور سے دیکھنے لگا۔

(باقی)

اُردو شعر و ادب کا بھارتیہ کرن

(پروفیسر نریش اور اعجاز صدیقی کی مراسلت)

۱۰ جون ۱۹۷۰ء

مکرمی نریش صاحب ۔ تسلیم ۔ !

مئی کے شروع میں آپ کا ایک نوٹ "بھارتیہ کرن کا ڈرامہ اور اُردو" ملا تھا۔ میں نے اُسے پڑھ لیا تھا اور آپ کو خط بھی لکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اپنی تکالیف کی شدت سے مجبور و معذور ہو گیا۔ آپ کو شاید علم ہو کہ میں ایک سال سے بیمار ہوں اور تمام معالجے ناکام ہو چکے ہیں۔
چند دن ہوئے ایک صاحب نے مجھے ہندوستان (ہندی) دہلی ۳۱ مئی ۱۹۷۰ء کا تراشہ اور اُس کا ترجمہ بھیجا ہے۔ عنوان ہے۔

"چمن میں تلخ نوائی مری گوارہ کر"

اِسے پڑھنے کے بعد سخت تعجب ہوا۔ مجھے جو نوٹ آپ بھیج چکے ہیں، آپ کا "ہندوستان دہلی" والا مضمون اُس سے بالکل مختلف ہے !
یہ تضاد میری سمجھ میں نہیں آیا۔ کیا چند دن ہی میں آپ کی رائے بدل گئی اور آپ اُردو ادب اور شاعری کے "بھارتیہ کرن" کے ہم نوا ہو گئے ؟ آپ کو تو اُردو سے بڑا لگاؤ تھا۔ بمبئی کی ملاقات کو بھولا نہیں ہوں۔ آپ نے مختلف شہروں کا دورہ بھی کیا تھا۔ اُردو کے سلسلے میں کام کرنے کے بہت سے وعدے کئے تھے۔ !

آپ پڑھے لکھے، باشعور اور تاریخی حقائق سے واقف ہیں۔ اُردو شروع ہی سے "سیکولر" رہی ہے۔ اِس کے ہندوستانی مزاج کی ہزاروں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اِس موضوع پر ضخیم کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔

اُردو ادب اور شعر ہندوستانیت سے جتنا قریب رہا ہے، ہندوستان کی دوسری زبانوں میں اس کی مثال کم ملے گی۔ مجھے تو آپ نے اس بات کی حمایت میں نوٹ بھیجا تھا، پھر یہ کیا ہوا ؟ ۔ آپ کی ہندوستان والی تحریر سے ایک طرف تو اُردو والوں کو تکلیف پہنچ رہی ہے۔ دوسری طرف ہندی زبان کے جاننے والوں کے دماغوں میں مزید زہر گھل گیا۔ وہ یقین کر لیں گے کہ اُردو شعر و ادب ایسا ہی ہے اور مسلمانوں کی طرح اس کا بھی "بھارتیہ کرن" ہونا چاہیئے۔ یہ بہت ہی افسوسناک بات ہوئی اور فرقہ پرستوں کو اِس سے مزید تقویت پہنچی۔

میں یہ بات مسلمان کی حیثیت سے نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ ایک ہندوستانی اور قوم پرست کی حیثیت سے لکھ رہا ہوں۔ اِس سے پہلے کہ میں "شاعر" میں آپ کی دونوں تحریریں شائع کروں یا "ہندوستان" کے لئے کوئی مضمون بھجواؤں، خود آپ سے معلوم کر لینا چاہتا ہوں کہ کیا دونوں تحریریں آپ ہی کی ہیں ۔ ؟

اِس خط کا جواب بواپسی دیدیجئے۔

مخلص :۔ اعجاز صدیقی

ڈاکٹر نریش ۔ ایم اے (ہندی اُردو) پی۔ ایچ ڈی ۔
معرفت نوجوت پبلشرز۔ مالیر کوٹلہ۔
۲۲ جون ۷۰ء

برادر محترم ۔ تسلیم ۔ !

یونیورسٹی میں گرمیوں کی چھٹیوں کے باعث آپ کا ۱۰ جون کا تحریر کیا ہوا خط ری ڈائرکٹ ہو کر آج ملا ہے۔ "ہندوستان" میں جو کچھ

شائع ہوا ہے وہ میرا ہی لکھا ہوا ہے۔ 'شاعر' کے لئے جو مضمون ارسال کیا گیا ہے اُسے بھی میں نے ہی لکھا ہے۔ تعجب ہے آپ نے "ہندوستان" والے مضمون کا بُرا منایا ہے۔ اُردو کے لئے گزشتہ ۱۵ برس سے مَیں جو کچھ کر رہا ہوں، آپ اُس سے واقف ہیں۔ اَب بھی اُردو کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے تیار ہوں۔

اللہ جانے ترجمہ کن صاحب نے اور کس روشنی میں کیا ہے۔ اِس مضمون میں اُردو کے خلاف کیا ہے ؟ چند سوالات ہیں جو میں نے اُردو دوستوں سے کئے ہیں۔ کیا میرے اِعتراضات دُرست نہیں ہیں ؟ آپ بصد شوق دونوں مضامین شائع کیجئے۔ میں جن سنگھ کے بھارتیہ کرن والے نعرے کا سخت مخالف ہوں۔ یہ ضرور محسوس کرتا ہوں کہ اُردو ہندوستانی روایات سے الگ ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی اور اِس کے اِرتقاء کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اُردو والے متحد ہو کر اسے ایک سیاسی مسئلہ بنا دیں۔ تاکہ حکومت اِس زبان کو اِس کا حق دینے پر مجبور ہو جائے۔ آپ کی صحت کے لئے دُعا گو ہوں۔

نیازمند :- نریش

۲۵؍ جون ۱۹۷۰ء

محبی نریش صاحب۔ تسلیم !

بڑے اِنتظار کے بعد آپ کا خط مِلا۔

میرا پچھلا خط دوبارہ پڑھنے کی زحمت کیجئے۔ آپ کی "ہندوستان" والی تحریر سے بُرا ماننے یا نہ ماننے کا سوال نہیں ہے۔ سوال ہے اُس میں چھپی ہوئی اُس زہرناکی کا، جسے سمجھنے میں ذرا سی بھی دُشواری نہیں ہوتی۔ ہر اُردو دوست خواہ وہ مسلمان ہو یا ہندو۔ سکھ ہو یا عیسائی۔ آپ کی تحریر سے یقیناً دُکھ محسوس کرے گا۔ آپ نے ہندی والوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ اُردو زبان مذہبی اور غیر سیکولر ہے۔ لیکن مجھے جو تحریر پہلے بھیجی تھی، وہ اِس کے بالکل برعکس تھی۔ اگر آپ نے اپنی اُسی پہلی تحریر کو "ہندوستان" میں شائع کرایا ہوتا تو اُس کا ردِّ عمل کچھ اور ہوتا۔ فرقہ پرست ذہنوں کو مزید گمراہی کا موقع نہ مِلتا۔ وہ اُردو زبان و ادب سے اور زیادہ بدظن نہ ہوتے۔

اگر آپ کو اُردو والوں سے کچھ سوالات کرنے تھے تو کسی اُردو رسالے یا اخبار کے ذریعہ کئے ہوتے۔ سب اُردو ادیب اور شاعر تو "ہندوستان" نہیں پڑھتے۔ اِس اِقدام میں مُضمر مصلحت کو سمجھنا مُشکل نہیں۔ نہایت خطرناک قسم کا تیر آپ کی کمان سے نِکلا ہے۔ اِسے ہرگز اُردو دوستی اور حقیقت پسندی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ سچائیوں پر دانستہ پردے ڈالنے کی کوشش ہے۔ مجھے بھیجے ہوئے مضمون میں تو آپ کہتے ہیں کہ اُردو کے بھارتیہ کرن کا نعرہ غلط ہے۔ اُردو ہندوستان سے جُڑی ہوئی ہے۔ جن سنگھی ذہنیت رکھنے والے لوگ لاعلم ہیں اور "ہندوستان" کے مضمون میں اُردو زبان و ادب کو بھارتیانے کی ضرورت پر زور دے رہے ہیں۔ آپ تو یہاں تک لکھ گئے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنے نام اور اُردو شاعروں کو اپنے تخلص بھی بدل لینے چاہئیں۔! ہندوستان والے مضمون کا ترجمہ ہی نہیں بلکہ اصل تراشہ بھی میرے پاس ہے۔ ہندوستان کے اور چند شمارے بھی ہیں۔ مترجم نے ترجمہ میں اپنی طرف سے کوئی اِضافہ نہیں کیا ہے۔ آپ کا ہندی مضمون کئی دوسرے ہندی جاننے والے دوست بھی پڑھ چکے ہیں۔ سب کی وہی رائے ہے جو میری ہے۔

آپ کے لکھنے کے مُطابق آپ کی دونوں تحریریں تازہ "شاعر" میں دے رہا ہوں۔ ۲۹۔ یا ۳۰ جون کو "شاعر" پوسٹ ہوگا۔ ایک کاپی مالیر کوٹلہ کے پتے سے آپ کو بھجوا دوں گا ــــــ اُردو کیلئے فی الوقت آپ کی بڑی قربانی یہی ہو سکتی ہے کہ آپ "ہندوستان" ہی میں اُس غلط فہمی کے اِزالہ کی کوئی صورت نکالیں جو آپ کی تحریر سے پیدا ہو چکی ہے۔ تازہ "شاعر" ملنے کے بعد آپ مجھے خط ضرور لکھیں اور اطلاع دیں کہ آپ اپنی تحریر کے اِزالہ کے لئے کیا قدم اُٹھا رہے ہیں۔؟

مخلص :- اعجاز صدیقی

پنجاب یونیورسٹی۔ ایوننگ کالج۔ چنڈی گڑھ ۱۴ ۴ر جولائی سنہ ۱۹۷۰ء

محترم اعجاز صاحب۔ تسلیم

کرم نامہ اور شاعر کا تازہ شمارہ — دونوں کے لئے ممنون ہوں۔

مجھے افسوس ہے کہ آپ میرے "ہندوستان" میں شائع ہوئے مضمون کا مطلب بہت غلط لے رہے ہیں۔ میں کٹر پن کا مخالف ہوں۔ وہ ہندی والوں میں ہو یا اُردو والوں میں، ہندوؤں میں ہو یا مسلمانوں میں۔ مجھے خوشی ہوتی اگر آپ نے میرے کسی سوال کا جواب دیا ہوتا۔ یا میرے کسی اعتراض کو کسی دلیل سے کاٹا ہوتا۔ میں ہندوؤں کی حمایت نہیں کر رہا اور نہ ہی ہندی والوں کو خوش کرنے کی کبھی سوچی ہے۔ ہندوؤں کے رویّے سے بھی نالاں ہوں۔ اِن سے بھی (ہندی والوں سے) چند سوالات کئے ہیں۔ یہ مضمون بھی 'ہندوستان' کو ہی ارسال کیا ہے۔ اگر انہوں نے نہ چھاپا تو آپ کو بھیج دوں گا۔

لیکن سوال تو یہ ہے کہ اُردو شاعری کب تک فارسی شاعری کی تقلید بنی رہے گی۔ اِسے کیوں نہ ہندوستان کی مقدّس سرزمین سے جوڑا جائے۔

ایک بات اور بڑی عجیب دیکھ رہا ہوں، وہ یہ کہ ہندوستان میں شائع ہوئے میرے اِس مضمون کو جتنے بھی مسلمان دوستوں نے پڑھا ہے سب نے مجھ سے ناراضگی کا اظہار کیا ہے اور جتنے ہندو دوستوں نے پڑھا سب نے مُبارکباد بھیجی ہے۔ جن میں مشہور افسانہ نگار رام لعل بھی شامل ہیں۔ اگر میرا یہ مضمون اُردو کے خلاف جاتا ہے تو کیا وہ تمام ہندو ادیب جو سالہا سال سے اُردو سے وابستہ ہیں اُردو کے خلاف سوچتے ہیں یا اُن کی ذہنیت غیر سیکولر ہے۔؟

آپ دونوں مضامین شائع کر چکے ہیں۔ عنوان سے قطعِ نظر — بتایئے دونوں میں کیا تضاد ہے۔؟ کیا دونوں مضامین میں بُنیادی سوال یا بُنیادی آواز ایک نہیں ہے۔؟

میں واضح طور پر یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اُردو شاعری کو ANTI INDIAN ہرگز ہرگز نہیں سمجھتا۔ مگر اس کا بیشتر حصّہ NONINDIAN ضرور ہے۔ اسی لئے میں نے اُردو کے بھارتیانے کی بات کی ہے۔ بھارتیہ کرن کا جو نعرہ جن سنگھ والوں نے بلند کیا ہے۔ وہ فرقہ پسندی پر مبنی ہے، وہ لوگ مسلمان اور اُردو کو غیر ہندوستانی قرار دے رہے ہیں۔ میں ایسا سوچنا ہی پاپ سمجھتا ہوں۔ مگر اُردو اور مسلمان دونوں کے لئے یہ چاہتا ہوں کہ وہ اپنے ادب اور معاشرے میں زیادہ سے زیادہ ہندوستانی عناصر کو جگہ دیں۔ جن سنگھ والے مسلمانوں کو ہندو بنانا چاہتے ہیں۔ میں انہیں مضبوطی سے اسلام کا دامن تھامنے کی تجویز پیش کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے، میں نے LINE OF DISTINCTION کو واضح کر دیا ہے — آپ کی صحت یابی کے لئے دُعا گو ہوں۔

نیاز مند، نریش

۹ر جولائی سنہ ۱۹۷۰ء

محبّی نریش صاحب۔ تسلیم۔!

آپ کا ۴ر جولائی کا کرم نامہ ملا۔

میں نے آپ کے مضمون مطبوعہ "ہندوستان" (ہندی) دہلی کا مطلب ہرگز غلط نہیں سمجھا ہے۔ پھر میرے سمجھنے اور نہ سمجھنے سے کیا ہوتا ہے۔ میں نے آپ کی دونوں تحریریں "شاعر" میں شائع کر دیں۔ فیصلہ کرنے والے خود فیصلہ کر لیں گے کہ ان میں تضاد ہے یا نہیں۔ آپ کے کسی سوال کا جواب دینا یا کسی اعتراض کے لئے کوئی دلیل پیش کرنا بھی مشکل نہیں۔ یہ بالکل سامنے کی باتیں ہیں۔ آپ رائی کا پہاڑ

شاعر، بمبئی

بنادیں تو دوسری بات ہے۔ آپ کے تمام اعتراضات کا نہایت تسلی بخش جواب دیا جا سکتا ہے۔ یہ سوالات بظاہر تو چھوٹے چھوٹے ہیں، لیکن ان کے جواب کے لئے ایک بسیط مضمون کی ضرورت ہے۔ اِس موضوع پر مواد کی کمی نہیں۔ ضخیم کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ بات آپ کو مطمئن کرنے کی بھی نہیں ہے۔ آپ اپنی جگہ قطعاً مطمئن اور تاریخی حقائق سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ اِس کے ثبوت میں آپ کی وہ تحریر کافی ہے جو آپ نے مجھے بھیجی تھی۔ مگر برِبنائے مصلحت، اُس کے بالکل برعکس جو تحریر آپ نے "ہندوستان" (دہلی) میں شائع کرائی اور جس سے اکثریتی فرقہ کے ہندی جاننے والے، تاریخی حقائق سے نابلد لوگ گمراہ ہوئے، اُس کا تدارک کس طرح ہو۔؟

مجھے تو اِس میں شک ہے کہ آپ کے تمام ہندو دوستوں نے مضمون پر آپ کو مبارکباد دی ہوگی۔ اِس کے برخلاف اُردو کے ایسے بیشمار ہندو ادیبوں اور شاعروں نے جو فرقہ پرستی کو گناہ کے مترادف سمجھتے ہیں، جن کے ذہن و دِل پاک صاف ہیں، جو وسیع علمی پس منظر رکھتے ہیں اور جنہیں تاریخی حقائق کی بھی آگاہی ہے۔ آپ کے مضمون کی زہرناکی کو شدّت سے محسوس کیا ہے۔ اگر یقین نہ ہو تو چنڈی گڑھ ہی کے اُن مقتدر ہندو ادیبوں سے مِل کر دیکھ لیجئے جو اُردو میں لکھتے ہیں۔ جن کی شخصیتیں مسلّم ہیں۔

حیرت کا مقام ہے کہ آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں ۔۔ !" کیا دونوں مضامین میں بُنیادی سوال یا بُنیادی آواز ایک نہیں ہے؟" بندہ نواز ۔۔ وطنیت الگ چیز ہے اور مذہبیت الگ۔ بدقسمتی سے آپ نے دونوں کو گڈمڈ کر دیا ہے۔ کوئی اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کر یہ کہدے کہ اُردو شعر و ادب میں وطنیت نہیں ہے، تو اِس کا کیا علاج؟ کم از کم آپ کو تو اِس طرح کی باتیں زیب نہیں دیتیں۔ اِس لئے کہ آپ خود کو اُردو کا پرستار اور ہمدرد بتلاتے ہیں۔ ادب کے ایک ادنیٰ طالبِ علم کی حیثیت سے، بلا جھجک عرض کروں گا کہ ۱۹۴۷ء تک اُردو زبان میں جتنی وطنیت پیدا ہو چکی تھی، اُس کی مثال ہندوستان کی دوسری علاقائی زبانوں سے تو کیا، خود ہندی سے بھی نہیں لائی جا سکتی۔ راج سنگھاسن پر ہندی کو بٹھانے کے بعد اب کچھ بھی کہا جائے۔ ہم سب کچھ سُن رہے ہیں اور آئندہ بھی سُنیں گے۔ آزادی کے بعد کا اُردو شعر و ادب تو اتنا قابلِ قدر ہے کہ ہندی کے پرچارک اگر اُسے آنکھوں سے لگائیں تو کم ہے۔

نریش صاحب! ۔۔ کیا اعلیٰ اور آفاقی شعر و ادب کا مذہب سے براہِ راست رشتہ ہوتا ہے؟ شعر و ادب کا واسطہ تو حیات و کائنات کی اُن صداقتوں اور حقیقتوں سے ہے جو رنگ و نسل و مذہب کے امتیاز کے بغیر زندگی سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ مذہبی شاعری، مذہبی اساطیر اور مذہبی تاریخ کا خانہ بالکل الگ ہے۔ شاعر و ادیب تو مذہبی روایات و معتقدات سے بھی بلند ہو کر سوچتا ہے۔ اُردو شاعروں اور ادیبوں کے نزدیک ادب میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی اصطلاحیں ہی نامناسب ہیں۔ ہندی والے یہ اصطلاحیں استعمال کریں تو کریں!۔ وہ مذہبی معتقدات کو ادب میں شامل کر کے وطنیت مُراد لیں تو یہ اور بات ہے۔!

آج یہ کہنے کی ضرورت کیوں پیش آ رہی ہے کہ اُردو شاعری کا بیشتر (اپنے اِس "بیشتر" پر غور کیجئے) حصّہ غیر ہندوستانی (NON INDIAN) ہے؟۔ اب سے ۲۵ سال، پچاس سال، سو سال، دو سو سال اور اِس سے بھی بہت پہلے، امیر خسرو کے وقت کے لوگوں نے یہ سوال کیوں نہیں اُٹھایا؟۔ ہندوستان میں دَر آنے والی زبانیں اپنے ساتھ جو تہذیب، تلمیحات، تشبیہات اور استعارے لائی تھیں، اُنہیں اُسی وقت قتل کیوں نہ کر دیا گیا؟ اُس وقت تو ہندوستان میں قدیم تہذیبوں اور مقامی زبانوں کی جڑیں بہت مضبوط تھیں۔ لوگ اپنے اپنے دھرم اور اُس سے وابستہ قابلِ احترام شخصیتوں سے بہت قریب تھے۔ اُردو کے ہندو اور مُسلمان شاعر، شاعری سیکھنے کے لئے ایران، مصر، شام اور حجاز تو نہیں گئے تھے!۔ ہندوستان میں فارسی زبان اور اِس کی تہذیب جب عام ہوئی تو پُرانی تہذیبوں اور زبانوں کے علاوہ نئی پیدا ہونے والی زبان "اُردو" پر اُس کا عکس پڑنا لازمی اور فطری تھا۔ آپ نے اُردو زبان میں فارسی سے آئی ہوئی جن تلمیحات و تشبیہات کے پیشِ نظر اُردو شاعری کو غیر ہندوستانی (NON, INDIAN) قرار دیا ہے۔ وہ کسی بھی باشعور اہلِ علم کے نزدیک قابلِ اعتراض بات نہیں ہو سکتی۔ مگر اِن تلمیحات و تشبیہات کا حال بھی آٹے میں نمک کا سا ہے۔ اُردو شاعری کے ابتدائی دَور سے اِس وقت تک کی

شاعری کا اگر آپ مکمل جائزہ لیں تو میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس میں آپ کو بے حد مقامیت ملے گی۔ یا تو آپ اُردو کے ہزاروں ادیبوں اور شاعروں کی نظم و نثر سے واقف نہیں ہیں اور محض ہوا اور خلا میں تیر چھوڑ رہے ہیں یا پھر دیدہ و دانستہ حقائق کی پردہ پوشی کرنا چاہتے ہیں۔ اُردو شعر و ادب میں وطنیت اور سیکولرزم کی جتنی بو باس ہے، شاید ہی ہندوستان کی کسی دوسری زبان میں ہو۔

کسی بھی عام پسند زبان کی تہذیب کو روکا نہیں جا سکتا۔ نہ کسی زبان اور تہذیب کو ڈنڈے کے زور سے پھیلایا جا سکتا ہے۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کی (ہم ہندوستانیوں کی) اپنی تہذیب کیا ہے؟ بدیسی حکمرانوں کے دورِ غلامی کو جانے دیجئے۔ آزادی کے بعد ہندوستان کے ساٹھ پینسٹھ کروڑ افراد میں کتنی ہندوستانیت آئی ہے؟ کیا انگریزی زبان کی لائی ہوئی تہذیب کی جھوٹن ہم اب تک نہیں چاٹ رہے ہیں؟ ! لودیوں، پٹھانوں اور مغلوں کی زبان اور اُن کی تہذیب تو پھر بھی مشرقی تھی۔ زمانۂ قدیم میں ہندوستان کا اُن مشرقی ممالک سے گہرا تعلق تھا، جہاں سے یہ آئے تھے۔ اِن سے پہلے آریہ بھی ایک تہذیب اور زبان اپنے ساتھ لائے تھے۔ مگر یورپی حکومت، زبان اور تہذیب تو بہت دور سے آئی تھی۔ بھارت کے لوگ اُس میں کیوں رنگ گئے؟ آپ کو شدّت کے ساتھ یہ احساس اور شکایت ہے کہ اُردو شاعری میں بکثرت گنگا۔ جمنا۔ ہمالیہ اور یہاں کی قابلِ احترام عظیم تاریخی و مذہبی شخصیتوں کا ذکر نہیں ہے۔ اِس لئے یہ شاعری غیر ہندوستانی (NON INDIAN) ہے۔ دوسری طرف ہماری وطنیت کا یہ حال ہے کہ ہمارا اپنا کوئی وطنی لباس تک نہیں ہے۔ اعلیٰ طبقہ بالکل یورپی لوگوں کی طرح کھاتا پیتا ہے اور غریب طبقہ گندی زمینوں پر بیٹھ کر۔ ہندوستان کے لوگ انگریزوں ہی کی طرح بال کٹواتے ہیں۔ انگریزی زبان کے ساتھ آئی ہوئی کون سی تہذیب ہندوستان میں جڑ پکڑے ہوئے نہیں ہے؟ ویدک اور طبِّ یونانی کو دفن کر دیا گیا۔ روحانیت، ایمان اور ایقان کی دولت ہندوستان سے چھن گئی۔ کردار پست سے پست تر ہو گئے۔ لاکھوں غریب ہندوؤں کو ہم نے عیسائی ہو جانے دیا۔ اُس وقت ہماری غیرت، حمیّت اور وطنیت کہاں گئی تھی؟ یہ لاکھوں کروڑوں غریب ہندو جنہیں اچھوت اور نیچ سمجھا گیا، ہندو سوسائٹی سے ہرگز نہ کٹتے، اگر ان سے نفرت کے بجائے محبّت کا برتاؤ کیا جاتا۔ عیسائی مذہب نے انہیں عزّت اور برابری کی زندگی دی، انہیں احساسِ کمتری سے نکالا۔ مگر نقصان ہندوستان ہی کا ہوا۔ مہاتما بودھ اور اُن کی تعلیمات کے ساتھ ہندوستان نے کتنا انصاف کیا ہے؟ خود انہیں اور اُن کی خدا پرستانہ تعلیم کو ہندوستان سے باہر دھکیل دیا۔ (آہ — ہندوستان کا عظیم پیغمبر!) اکثریتی فرقے کے کتنے گھروں میں صبح کے وقت ویدوں، گیتا اور رامائن کا پاٹھ ہوتا ہے، اِن کا گیان کتنے لوگوں کو ہے؟ کیا اکثریتی فرقہ اِن مقدّس کتابوں کی تعلیمات کی پیروی کرتا ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو ملک میں اِتنی مذہبی منافرت نہ ہوتی، جتنی کہ اب ہے۔ مقدّس ویدوں کی تعلیم کو کیوں عام نہیں کیا گیا، اِن میں تحریف کیوں کی گئی اور اُونچی ذات کے لوگوں ہی تک اِنہیں کیوں محدود رکھا گیا، دوسری زبانوں میں ویدوں کے تراجم بکثرت کیوں نہیں کرائے گئے؟ جبکہ دنیا کی تمام مقدّس کتابوں پر دنیا بھر کے علماء نے زیادہ سے زیادہ کام کیا ہے اور دُنیا والوں کے لئے (بلاقیدِ مذہب و ملت) اُنہیں آئینہ کر کے رکھ دیا ہے۔ کاش، آپ اِس کی داد دیتے کہ اُردو والوں نے اپنے طور پر کتنی ہی مقدّس مذہبی کتابوں کے تراجم اُردو میں پیش کئے۔ ہندوستان کے مختلف مذاہب و عقائد کا کون سا ایسا لٹریچر ہے جو کم و بیش اُردو میں شائع نہ ہوا ہو۔ میرے دوست شام کشن نگم دہلوی، اُردو میں گیتا کے کئی ایڈیشن ہزاروں کی تعداد میں چھپوا کر سالہا سال سے مُفت تقسیم کرتے رہے ہیں۔ یہ تو چند سال پہلے ہی کی بات ہے کہ منوّر لکھنوی اور کئی دوسرے قلم کاروں نے ہندوستان کی کئی مقدّس کتابوں کے نظم و نثر تراجم اُردو میں پیش کئے۔ مولانا آلِ مظہر نگری نے فیضی کے فارسی ترجمۂ گیتا سے، گیتا کا اُردو منظوم ترجمہ کیا تھا، جسے پندرہ سال پہلے "مکتبۂ برہان" جیسے ممتاز مُسلم ادارے نے شائع کیا تھا۔ عہدِ قدیم سے عہدِ جدید تک اُردو میں کیا شائع نہیں ہوا؟ اُردو کے نظم و نثر قصّوں اور مثنویوں میں ایک ایک مقامی چیز اور بات مذکور ہے۔ بڑی تعداد میں ایسی نظمیں پیش کی جا سکتی ہیں جو ہندوستانیت سے بھرپور ہیں۔ مسلمانوں کے گھروں میں شادی بیاہ کے موقعوں پر گائے جانے والے گیت خالص ہندوستانی ہوتے ہیں اور شادی کی بعض رسمیں بھی قطعاً ہندوستانی! کالی داس کے کئی ڈرامے نظم و نثر دونوں صورتوں میں

اُردو میں منتقل کئے گئے۔ جائسی، رحیم، خانخاناں۔ کبیر، سُورداس، میرا اور تلسی وغیرہ کی شاعری کو اُردو میں منتقل کیا گیا۔ اب سے ۴۴ سال پہلے ۱۹۲۶ء میں میرے یہاں سے نکلنے والے رسالۂ "پیمانہ" میں سنت تکارام پر والد مرحوم علامہ سیماب اکبرآبادی نے ایک تحقیقی مضمون لکھا تھا جب کہ سنت تکارام سے بہت کم لوگ واقف تھے۔ یہ مضمون سنت کی تصویر کے ساتھ شائع کیا گیا تھا۔ کرشن گیتا کے نام سے سری کرشن جی مہاراج پر سیماب کی نظموں کا الگ سے ایک مجموعہ ہے، جسے انڈین پریس الٰہ آباد نے ۱۹۴۰ء میں اتنا خوبصورت چھاپا تھا کہ مثال نہیں ملتی۔ اُس وقت جب کہ ہندوستان کی عظیم مذہبی شخصیتیں صرف "سوانگوں"، "نوٹنکیوں" اور "رام لیلا" تک محدود تھیں، اُردو ڈرامہ نگاروں نے اُن کی زندگی پر کامیاب ترین ڈرامے لکھے اور اُنہیں نہایت اہتمام سے فنی خوبیوں کے ساتھ اسٹیج پر پیش کیا۔ دوسرے ڈرامہ نگاروں کے علاوہ اِس سلسلے میں آغا حشر کاشمیری کا نام بطورِ خاص لیا جا سکتا ہے۔ سیماب اکبرآبادی کا مکمل ڈرامہ "گوتم بدھ" موجود ہے۔ مجھے بتائیے اب سے تیس چالیس سال پہلے کتنے ہندی کویوں نے بنارس پر نظمیں لکھی تھیں اور اگر لکھیں تو اُن کی تعداد اور اُن کا معیار کیا ہے۔ نظیر اکبرآبادی کی تمام وطنی نظموں کو بھی چھوڑ دیجئے، غالب کی مثنوی "چراغِ دیر" میں بنارس کے ذکر کو اہمیت نہ دیجئے۔ لیکن میں مختلف اُردو شعراء کی بنارس کے تقدس اور "صبحِ بنارس" پر پچاس نظمیں آپ کو دکھا سکتا ہوں۔ ہندوستان کے پرندوں کے ذکر سے اُردو شاعری بھری پڑی ہے۔ کیا ہندوستانی موسموں کی کیفیات اُردو شاعری میں نہیں ہیں؟ کیا دکن کی قدیم اُردو شاعری (دکنی) کو کبھی آپ نے پڑھا ہے؟ کیا آپ اُن سیکڑوں "بولوں" سے واقف ہیں جو ہندوستان کے بڑے مسلمان موسیقاروں نے بنائے، جنہیں آج تمام ہندو موسیقار گاتے ہیں اور جن کی بنیاد بھگتی اور ہندوستانیت ہی پر ہے۔

آپ اُردو شاعری میں فارسی تلمیحات و تشبیہات کو رو رہے ہیں۔ رونے کی بات تو یہ ہے کہ ہندوستانی خواتین کی وہ گھنی اور دراز چوٹیاں جو کبھی سیندور اور افشاں سے دمکتی رہتی تھیں، جن سے حسن اور سہاگ دونوں عبارت تھے، جو ہندوستانی عورت کو امتیاز عطا کرتی تھیں، اب کٹ کر گردن سے اُوپر پہنچ گئی ہیں۔ کسی زمانہ میں مرد کا غصہ میں عورت کی چٹیا کاٹ ڈالنا جرم سمجھا جاتا تھا اور عورت کی سخت توہین! وہ ہاتھ اور پاؤں جو کبھی مہندی سے رچے رہتے تھے "نیل پالش" کے خوگر ہو گئے ہیں۔ وہ لب و رُخسار جو کبھی حیا سے گلابی اور پان سے سُرخ رہا کرتے تھے، "لپ اسٹک" اور "میک اپ" کے رہینِ منت ہیں۔ ہندوستان کی کروڑوں لڑکیاں اور بڑی عمر کی عورتیں تک مغربی لباس زیبِ تن کرتی ہیں۔ کیا اِسی کا نام ہندوستانیت اور وطنیت ہے؟۔ ذرا کبھی ہندوستانی کلبوں اور ہوٹلوں میں جھانک کر دیکھئے، معلوم ہوگا کہ آپ ہندوستان میں نہیں، لندن یا پیرس میں ہیں!۔ کبھی اِس پر بھی ماتم کیجئے کہ گلی گلی اور بازار بازار عصمتیں فروخت ہوتی ہیں۔ ہم لوگ تو چین کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ وہی چینی جنہیں افیونی کہا جاتا تھا، وطن پرستی اور اصلاحات میں آپ سے سو سال آگے نکل گئے ہیں۔ اب سے تیس سال پہلے وہاں عصمت فروشی کا ایک ایک اڈہ ختم کر دیا گیا۔ چین سے تعلقات کشیدہ ہونے سے پہلے ہمارے کئی لیڈروں نے وہاں سے آنے کے بعد بہت سی اصلاحات کے متعلق اپنے بیانات دیئے تھے۔ اِس پر ماتم کیجئے کہ ہندوستانی اور بیرونی فلموں کے عریاں مناظر و مظاہر پر ہندوستانی عوام و خواص، مرد، عورتیں، اور بچے کتنے بے قابو ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان میں کتنی دھارمک فلمیں ہر سال بنتی ہیں اور اُنہیں کتنے لوگ دیکھنے جاتے ہیں، وہ کس حد تک کامیاب ہوتی ہیں؟ انگریزی میں بات کرنا اب بھی افضل سمجھا جاتا ہے، وہ بھی اِس احتیاط کے ساتھ کہ انگریزی قواعد اور لب و لہجہ سے ہم ہٹ نہ جائیں۔ لیکن اپنے ہی ملک کی زبان "اُردو" کو پڑھنے اور بولنے سے اکثریتی فرقہ دانستہ گریز کر رہا ہے۔ اُسے اِس زبان سے نفرت ہے۔ پہلے آل انڈیا ریڈیو سے خبروں میں کچھ اُردو الفاظ پڑھے لکھوں کے تلفظ کے ساتھ بول لئے جاتے تھے۔ لیکن اب "بھارتیانے" کے خبط میں اُن ہی الفاظ کو بگاڑ کر جاہلوں اور دیہاتیوں کے انداز میں۔ زور کو جور۔ مذاق کو مجاک۔ دروازہ کو دروآجہ۔ بازار کو باجار۔ قرض کو کرج۔ منظور کو منجور۔ خراب کو کھراب (وغیرہ وغیرہ) بولا جاتا ہے۔ انگریزی الفاظ کے تلفظ کو کیوں نہیں بگاڑا جاتا، اِس بدیسی زبان کو کیوں نہیں "بھارتیایا"

جاتا ۔؟ اسی لئے نا، کہ انگریزوں کو ہندوستانی اب بھی برتر سمجھتے ہیں ۔!!

اُردو زبان کو بھارتیانے " کی آواز لگانے والے لوگ، سماج سے بکثرت شراب نوشی، بدکرداری، نفع اندوزی، فریب اور جعلسازی کی لعنتوں کو ختم کرنے کی آواز کیوں نہیں بلند کرتے ۔ ؟ ۔

پروفیسر نریش ــــ آپ اُن افراد اور جماعتوں کو پھانسی پر لٹکوائیے جو بدیسیوں سے خفیہ طور پر موٹی موٹی رقمیں لے کر زبان اور مذہب " کی آڑ میں ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے پر تلے ہوئے ہیں ۔ کیا ایسی باتیں اور آوازیں وطن دوستی کے ذیل میں نہیں آتیں ؟ ۔ کیا صرف اُردو کو ختم کر دینے یا مسلمانوں کو ہندوستان سے نکال دینے یا دونوں کا " بھارتیہ کرن " کرنے ہی کا نام وطن پرستی اور اسی میں ملک کی نجات ہے ؟ ۔ آپ اُن کو بھارتیانے " پر زور کیوں نہیں دیتے جو مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو جیسی عظیم شخصیتوں کی مسلسل توہین کر رہے ہیں ۔

بھارت سے اُردو اور مسلمانوں کو ختم کر دینا، بڑھی ہوئی فرقہ پرستی کے لئے کچھ مشکل نہیں ہے ۔ خدا وہ منحوس گھڑی نہ لائے ۔ اگر دنیا کا یہ سب سے بڑا المیہ رُونما ہوا، اور اس سے بھارت کی تاریخ میں جو سیاہ دھبے رہ جائیں گے ' اُنہیں قیامت تک نہیں مٹایا جا سکے گا ۔

دنیا بہت وسیع ہوتے ہوئے بھی اتنی سکڑ گئی ہے کہ ہزاروں میل پر ہونے والا تیلی کا کھٹکا تک سُنا جا سکتا ہے ۔ آج ایک کا دامن دوسرے کے دامن سے اور ایک کی آستین دوسرے کی آستین سے پیوست ہے ۔ یہ تو صرف اپنا بھارت ہی ہے، جو اپنی ہی آستینوں اور اپنے ہی دامنوں کو جُدا کرنے پر تلا ہوا ہے ۔ !

" وطن پرستی و وطن دوستی کارِ دیگر است "

اگر آپ واقعی اُردو کے پرستار و وفادار ہیں، سچے دیش بھگت اور ہندوستانی ہیں تو میں نے جو اشارے کئے ہیں، اُنہیں پھیلا کر ایک مضمون یا کتاب لکھئے اور اُسے ہندی میں شائع کرائیے ۔ آپ دُور نہ جائیں، چنڈی گڑھ ہی میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے صدر ڈاکٹر ست پرکاش سنگر موجود ہیں جو اُردو اور ہندی کے ممتاز ادیب ہیں ۔ اُن سے آپ کو بہت سے تاریخی حوالے مل جائیں گے ۔ میں دوسرے محققین سے بھی آپ کو متعارف کرا سکتا ہوں ۔ ایسی کتابوں کی نشاں دہی کی جا سکتی ہے، جن میں اُردو زبان اور اُس کے شعر و ادب میں ہندوستانیت کے متعلق مواد ملتا ہے ۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کھلے دل سے یہ اعتراف کریں کہ " ہندوستان " (دہلی) والی تحریر میں آپ نے جو کچھ لکھا تھا، وہ آپ کی غلط فہمی پر مبنی تھا ۔ کسی غلطی کا اعتراف کر لینا انسانی کردار کی عظمت کی دلیل ہے ۔ اس وقت ؎

" وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے "

اگر آپ نے میری معروضات پر توجّہ نہ دی تو مجھے اور دوسروں کو یہی کہنا پڑے گا ؎

" لاگ ہو تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ ،
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکہ کھائیں کیا ! "

منتظرِ جواب

مخلص،

اعجاز صدیقی

نقد و نظر

(ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

لکیریں

از ——— نازش پرتاب گڈھی

نازش پرتاب گڈھی گزشتہ تیس سال سے تخلیقی سرگرمیوں میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ غزل سے نظم کی طرف آئے اور اردو کی نظمیہ شاعری میں قابل قدر اضافے کئے۔ نظم کی فضا، اس کے بست و کشاد، موضوعی تعمق اور ایک اچھے نظم نگار کی طرح خوشنما الفاظ و تراکیب کے انتخاب کا انہیں پورا پورا شعور ہے۔ نازش کو بسیار گو کہا جاتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک ہی موضوع پر انہوں نے متعدد نظمیں لکھی ہیں۔ اس کے باوجود سخت سے سخت تر انتخاب کے بعد بھی کافی تعداد میں ان کی ایسی نظمیں مل جائیں گی جنہیں اردو کی نمائندہ نظموں میں شمار کیا جا سکے۔ قومی نظمیہ شاعری میں خصوصیت کے ساتھ نازش پرتاب گڈھی امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی نظموں کا ہیئتی انداز تو پرانا ہی ہے، لیکن موضوعات اور خیالات و اسلوب کے اعتبار سے جوش کے بعد ہونے والی نظمیہ شاعری کا یہ ایک اچھا نمونہ ہیں۔

نازش پرتاب گڈھی کے ساتھ یہ بدقسمتی رہی ہے کہ وہ نظموں اور غزلوں کا اپنا کوئی بھرپور مجموعہ شائع نہ کرا سکے۔ جو کچھ شائع ہوا وہ کتابچوں سے آگے نہ بڑھا۔ اب ان کی منتخب غزلوں کا ۱۱۲ صفحات کا یہ مجموعہ سامنے آیا ہے۔ اسی نام سے وہ پہلے بھی غزلوں کا ایک نہایت مختصر مجموعہ ۱۹۵۰ء میں شائع کر چکے تھے۔ ۱۴ سال کی طویل مدت کے بعد تو کسی دوسرے نام سے ان کا کوئی ایسا مجموعہ آنا چاہیئے تھا جو کافی ضخیم، خوبصورت اور صرف "لکیریں" (مطبوعہ ۵۰ء) کے بعد کی غزلوں پر مشتمل ہوتا۔ زیرِ نظر مجموعہ کے شروع میں ۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۹ء تک کی چند منتخب غزلیں ضرور ہیں۔ لیکن ان ہی کے ساتھ "لکیریں" کے پرانے ایڈیشن کا انتخاب اور اسی کے ساتھ ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور نیاز فتحپوری کی رائے بھی شامل ہے۔

ابتداء میں غلام ربانی تاباں کا تعارف ہے۔ جس میں انہوں نے نازش کی غزلیہ شاعری کے متعلق اظہارِ خیال کیا ہے۔ تاباں خود غزل کے اچھے شاعر ہیں۔ اور غزلیہ شاعری کے آداب سے واقف۔ ان کا یہ کہنا غلط نہیں ہو سکتا کہ نازش نے غزل کے امکانات میں وسعت پیدا کی ہے اور اسے روایتی بننے سے بچا لیا ہے۔ ان کی غزلوں میں ہلکا ہلکا غم گھلا ہوا ہے۔ اور لہجے کا دھیما پن جالی گزیں ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان کے اشعار بوجھل نہیں ہوتے۔ ایسا لگتا ہے کہ دل پر چوٹ سہہ سہہ کر تہذیبِ نفس کر لی گئی ہے۔ ان کے یہاں ضبطِ غم ہے۔ گریۂ غم نہیں۔"

"لکیریں" کے مطالعہ کے بعد ہمیں اندازہ ہوا کہ اس مجموعہ کی نئی غزلوں میں زندگی کے دکھ درد اور کرب و اضطراب کی پرچھائیاں کچھ اور نکھرے ہوئے انداز میں زیادہ وسعت اور گہرائی لئے ہوئے ہیں۔ کہیں کہیں ان کی فکر جدید تر شعراء کی فکر کے قریب پہنچ جاتی ہے مثلاً ؎

چیختا ہوں اپنی ہی ویرانیِ دل دیکھ کر
ورنہ میرے شہر میں اتنا بھی سناٹا نہیں

اس طرح خالی نگاہوں سے تکا کرتا ہوں آپ
جیسے تم تو خیر تم ہو، میں بھی خود اپنا نہیں

———

سامانِ تجارت ہے نہ ارمانِ تجارت
ہستی مری بازار میں حیران کھڑی ہے

———

گزرے ہوئے لمحوں کے گھنے شہر میں نازش
تنہا ہیں مگر رات گئے گھوم رہے ہیں

"لکیریں" کے انتخاب میں سختی سے کام لیا گیا ہے۔ بعض غزلوں کے تو دو دو چار چار شعر ہی مجموعہ میں شامل کئے گئے ہیں۔ زندہ اردو غزل کے شائقین کو "لکیریں" کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے۔

قیمت : ——— ۲ روپے

ملنے کا پتہ : ——— بزمِ ادب، بیگم وارڈ۔ پرتاب گڈھ

منزل کی طرف

از ——— دواکر راہی

دواکر راہی کا پیشہ وکالت ہے۔ لیکن ادب و شعر سے بھی انہیں گہرا لگاؤ ہے۔ وہ ہندی کی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ اس سے پہلے اُن کے کلام کا انتخاب "بڑھتے قدم" شائع ہوا تھا۔ اُس کے بعد سو-۱ منتخب اشعار کا کتابچہ "دلِ صد چاک" منظرِ عام پر آیا اور اب اُن کے مکمل کلام کا مجموعہ "منزل کی طرف" نہایت اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ یہ ۵۶۴ صفحات کا ضخیم مجموعہ ہے۔ کتاب کے تقریباً ۶۴ صفحات میں راہی صاحب کی شخصیت اور شاعری کے متعلق رائیں ہیں۔ ان آراء میں ماہر القادری۔ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد۔ پروفیسر احتشام حسین۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار۔ اختر علی خاں، سابق وزیرِ صحت (یوپی) شوکت علی خاں ایڈوکیٹ رامپور۔ شاہجہاں بانو یاد دہلوی کی تفصیلی آراء کے علاوہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی۔ عروج زیدی بدایونی' محشر عنایتی اور بہت سے دوسرے لوگوں کی مختصر رائیں ہیں۔ سب نے دواکر راہی کی شعری کاوشوں کو سراہا ہے

حیرت کی بات ہے کہ دواکر راہی نے پانچ سال کی قلیل مدت میں نہ صرف شاعری کے تمام مدارج طے کر لئے بلکہ اتنی بڑی تعداد میں غزلیں کہہ لیں کہ یہ ضخیم مجموعہ تیار ہو گیا۔ پروفیسر احتشام حسین نے جو اشعار منتخب کئے ہیں اُن سے راہی صاحب کا مزاجِ شعری بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

خزاں میں رہ کے بھی رہتے ہیں ہم بہاروں میں
کہ ہم نے پھول کھلائے ہیں ریگزاروں میں

جسے سُن کر ہمیں طوفان سے لڑنے کی جرأت ہو
فسانہ ایک بھی ایسا نہیں آغوشِ ساحل میں

غمِ جہاں کے حقائق ہمیں مٹا ڈالیں
تخیلات اگر کچھ سنہرے خواب نہ دیں

جنوں کے ناز اٹھاؤں، خرد کا کام کروں
غمِ حیات بتا، کِس کا احترام کروں

بقول احتشام صاحب دواکر راہی کے کلام میں پختگی، سنجیدگی، رندانہ سرمستی اور دلکشی کا امتزاج ہے' ہماری رائے میں راہی صاحب کی وہ لگن سب سے زیادہ قابلِ تعریف ہے جس کی وجہ سے یہ ضخیم مجموعۂ کلام منظرِ عام پر آیا ہے۔

قیمت پانچ روپے۔ ناشر بزمِ شعراء۔ دو محلہ روڈ۔ رامپور۔

بقیہ "ادبی مناقشے" صفحہ ۵۲

اب تک صرف قلمی حملوں کا ہی ذکر کیا گیا ہے۔ اگرچہ واقعہ یہ ہے کہ بعض اوقات ایک مصنف نے دوسرے مصنف پر جسمانی حملہ کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ ٹالسٹائی اور ترگنیف کے مناقشے سے ادب کا ہر طالبِ علم واقف ہوگا۔ ٹالسٹائی اتنا بے قابو ہو گیا تھا کہ اُس نے ترگنیف کو ڈوئل لڑنے کے لئے چیلنج کر دیا تھا۔ خوش قسمتی سے ترگنیف کی نرم دلی آڑے آئی اور یہ معاملہ ٹل گیا ورنہ ٹالسٹائی حقیقی معنوں میں اس وقت تک ڈوئل لڑنے کیلئے تیار تھا' جب تک کہ ان میں سے ایک کا خاتمہ نہ ہو جاتا۔ بیسویں صدی میں امریکی مصنف ارنسٹ ہمنگوے کی طرح کسی دوسرے ادیب نے اس قدر جنگجویانہ اسپرٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ واقعہ یوں ہے کہ میکس ایسٹ مین (MAX EASTMAN) ہمنگوے کا دوست تھا۔ ہمنگوے کی کچھ اہم ناولوں کی اشاعت کے بعد ایسٹ مین نے ایک ادبی رسالے میں ان ناولوں کے حُسن و قبح پر اپنا تبصرہ شائع کیا۔ اُس نے اشارہ کیا کہ ہمنگوے اپنی ناولوں میں انسانی طاقت کے متعلق غیر فطری شوخی بگھارتا ہے۔ غالباً اس طرح وہ اپنی کچھ کمزوریوں کی پردہ پوشی کرنا چاہتا ہے' اس تبصرے کو پڑھ کر ہمنگوے آگ بگولہ ہو گیا۔ اس کے بعد چار سال تک دونوں ایک دوسرے سے کنارہ کش رہے۔ چار سال بعد ایک روز اتفاقاً ہمنگوے اپنی ناولوں کے پبلشر کے آفس میں جا نکلا۔ شومئ قسمت سے ایسٹ مین وہاں پہلے ہی سے موجود تھا۔ اور اس پبلشر کے ادبی مشیر میکسول پرکن کے بالمقابل ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہمنگوے نے جیسے ہی اُس کو دیکھا وہ چیخ اُٹھا۔ "تم سُوّر کے بچے یہاں موجود ہو" چند شعلہ بار الفاظ کے تبادلے کے بعد ہمنگوے گھونسہ تان کر ایسٹ مین پر پل پڑا۔ کچھ دیر تک مسٹر پرکن کی میز پر دونوں ایک دوسرے کو نوچتے کھسوٹتے رہے۔ ایسٹ مین جسمانی اعتبار سے کچھ تھل تھل قسم کا تھا اور ہمنگوے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے پر تلا ہوا تھا۔ بڑی مشکلوں سے مسٹر پرکن نے دونوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرایا جس سے ایسٹ مین نے نجات کی سانس لی۔ کیونکہ وہ جسمانی طاقت اور قلم کی طاقت دونوں میں ہمنگوے سے کمزور تھا۔

(انگریزی سے ترجمہ)

مکتوبات

● ماہ جون کا "شاعر" موصول ہو گیا ہے۔ "بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے" بغور پڑھا۔ یہ پروفیسر نریش صاحب بھی خوب آدمی ہیں۔ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہیں۔ اُردو میں کچھ، ہندی میں کچھ۔ اُردو کو ایسے "خیر خواہوں" سے یقیناً بچانا ہوگا۔ اُن میں اخلاقی جرأت ہوتی تو وہ ہفت روزہ "ہندوستان" دلی میں کہی گئی باتیں آپ سے کہتے۔ اُردو زبان اپنے "پرستاروں" کے ہاتھوں ہی ذلیل و رُسوا ہو رہی ہے۔ پروفیسر نریش کو دجلہ اور فرات کے ذکر سے متلی آتی ہے۔ اُردو شاعری میں جہاں دجلہ اور فرات کا تذکرہ آتا ہے وہاں گنگ و جمن کی بھی قصیدہ خوانی کی گئی ہے۔ رام اور کرشن پر بے شمار نظمیں لکھی گئی ہیں۔ تنگ نظری مسائل کا حل نہیں۔ یہ تو اتفاق کی بات ہے کہ اُردو زبان کے اکثر عظیم شعراء اسلام سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنے اپنے اعتقاد کی بات ہے۔ دوسرے موضوعات کے علاوہ اسلامی نبی، اولیا، اور دوسرے عظیم انسانوں کی زندگیوں سے متاثر ہو کر اُن کے حالاتِ زندگی پر طبع آزمائی کرنا کوئی کفر نہیں۔ آخر اِس بات سے پروفیسر نریش کو چڑھ کیوں ہے؟۔ وہ یہ کیوں کر بھول لیتے ہیں کہ اسلام نے ہندی کو رحیم دیا ہے۔ اُس کی شاعری میں ہندو دھرم کے ایسے ایسے حوالے ملتے ہیں جو خود ہندوؤں کو معلوم نہیں، اور پھر علامہ اقبال، حفیظ اور جوش کے کلام کو کیسے فراموش کیا جا سکتا ہے۔ آج جب کہ انسان ارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہوا، "ایک دنیا، ایک حکومت" کی طرف بڑھ رہا ہے۔ تو ہندو برانڈ اور مسلمان برانڈ شاعری جیسے فرسودہ خیالات کو ہمیں خیرباد کہنا ہی ہوگا۔ اِسی میں انسان کی اور دُنیا کی تمام زبانوں کی بقا کا راز مضمر ہے۔ تعصب کسی قسم کا ہو مضر ہے۔ ہر قسم کے تعصب سے بالاتر ہو کر ہی ہم انسانیت کے معیار پر پورے اُتر سکتے ہیں، ورنہ ہمارے یہاں ہر روز احمد آباد، بھیونڈی اور جلگاؤں بنتے رہیں گے۔ رہا سوال ہندی اور اُردو کے تخلص کا، تو میرا عقیدہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان ہندی میں شاعری کرے گا تو اُسے تخلص بھی اُسی زبان میں رکھنا ہوگا۔ اُردو میں نیرج اور دنیش نہیں کھپ سکتے، پروفیسر نریش کے خطوط پڑھ کر

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا

مرزا غالب کا شعر یاد آتا ہے۔

مجسٹریٹ درجہ اول۔ دھرمسالہ (کانگڑہ)۔ — منوہر ناتھ ورما

● جون کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ اُردو سے پروفیسر نریش کے والہانہ عشق کے پیشِ نظر اہلِ اُردو کو اُن کے خطوط کی تضاد بیانی کا خیال کئے بغیر اُنہیں معاف کر دینا چاہیئے۔ اُن کے خطوط میں کام کی بات اُن کا وہ مشورہ ہے جس میں اُنہوں نے اُردو والوں کو سیاسی طور پر متحد ہونے اور اُردو کے لئے سیاسی جہاد پر آمادہ ہونے کی تلقین کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اِس سلسلے میں پنجابی صوبے کے حصول اور پنجابی کو صوبے کی سرکاری زبان بنانے کی مثالیں اُردو پر منطبق نہیں ہو سکتیں۔ اُردو کی یہ خوش نصیبی سمجھی جاتی ہے کہ اُس کے بولنے والے سارے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن دراصل اُردو کی سب سے بڑی بدبختی بھی یہی ہے کہ اُس کا کوئی مخصوص جغرافیائی خطہ نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پنجابی صوبے کی طرح سادگی سے یا تشدد کے بعد اُردو کی بھی کوئی نہ کوئی ریاست تا حال ضرور بن جاتی۔

پروفیسر نریش نے یہ زرّیں مشورہ بھی دیا ہے کہ اُردو کے ادیبوں کو میدانِ عمل میں نکلنا ہوگا (مسلمانوں کو کم اور ہندوؤں کو زیادہ) مشکل یہیں پیش آتی ہے۔ اُردو کا مسلمان ادیب میدان میں نکلنے سے گھبراتا ہے۔ رہے اُردو کے ہندو ادیب! تو اُن میں سے بعض کی ذہنیت اُس "پروفیسر نریش کی سی ہوتی جا رہی ہے" جس کے خط کا ترجمہ جاوید اقبال ناطق نے کیا ہے۔ گو نریش صاحب نے اِس کا بھی اعتراف کیا ہے کہ اُردو ادب میں ہندوستانیت سرے سے ناپید نہیں ہے اور بھارتیہ کرن کا نعرہ اُردو کے خستہ تن پر ایک بھرپور وار ہے۔

اُردو ادب میں گنگا جمنا کے مقابلے میں دجلہ و فرات — کنول کے مقابلے میں نرگس اور ہمالیہ کے مقابلے میں کوہِ طور وغیرہ کے استعمال پر اب تک کے بے شمار اعتراضات بہت پرانے ہو چکے تھے۔ مگر اس دفعہ نریش صاحب نے ایک نیا اور دلچسپ اعتراض یہ پیش کیا ہے کہ امرت لال تو عشرت اور میلہ رام تو وفا ہو سکتا ہے، لیکن اصغر علی نیرنج اور ابراہیم علی دنیش (کیوں نہیں ہوتا؟)۔

امرت لال اور میلہ رام اگر ہندی میں شاعری کرتے تو شاید وہ عشرت اور وفا ہونے کے بجائے نیرنج اور دنیش ہی ہوتے۔ اُردو میں چونکہ نیرنج اور دنیش وغیرہ تخلص مقبول نہیں رہے ہیں، اس لئے اس باب میں اس قدر کوتاہ اندیشی اور تنگ نظری نامناسب ہے۔ ادبی اور تہذیبی روایات اتنی جلد نہیں بدلتیں۔ حیدر آباد پر "پولیس ایکشن" ہوئے اور حضور نظام کی حکومت کے خاتمے کو بائیس سال ہو گئے، لیکن وہاں کے بے شمار سقہ ہندو حضرات آج بھی فصیح اُردو بولتے، شیروانی، چوڑی دار پائجامہ اور سلیم شاہی جوتے پہنتے ہیں۔ اور مسلمانوں کی طرح ایک ہاتھ اُٹھا کر آداب عرض کرتے ہیں۔ (دونوں ہاتھ اُٹھا کر نمستے نہیں کرتے) جس ملک میں اقلیتوں کی بے بسی اور مظلومیت کی تائید کرنے پردھان منتری وزیرِ اعظم محترمہ اندرا گاندھی کا بھارتیہ کرن ضروری سمجھا جائے وہاں کسی معقولیت کا سوال ہی نہیں ہے

تاہم خود پروفیسر نریش نے فرما دیا ہے کہ ...... بھارتیہ کرن کا ڈرامہ" اُردو کو بدنام اور اُسے مجروح کرنے کے لئے رچایا گیا ہے!" یہ بھی پروفیسر نریش ہی کا ارشاد ہے کہ زبانیں نہ کبھی خنجر کے زور سے مٹی ہیں اور نہ مٹ سکتی ہیں۔!"

نریش صاحب کے دونوں خطوط پڑھنے کے بعد آپ کی اسی شمارے میں شامل شاندار غزل کا یہ شعر سمجھ میں آگیا کہ ؎

صورتوں کو کر لیجے بے نیازِ آئینہ
آئینہ تو جو بھی ہے ٹوٹ جانے والا ہے

اسی طرح ؎

خود صدائیں لوٹ آئیں اپنی، یہ تو ممکن ہے
چیخئے رہو، لیکن کون سننے والا ہے

پڑھ کر آپ کے بے شمار اداریئے یاد آگئے۔
منزل ۵-۱ ہلز روڈ کالونی۔ گلبرگہ۔ راہی قریشی (ایم اے)

● اتنی کربناک حالات کے باوجود آپ پابندی سے "شاعر" نکال رہے ہیں اور نظم و نثر سے اُردو کو بلند سطح تک پہنچا رہے ہیں۔ آپ کی جانفشانی ایک دن ضرور رنگ لائے گی۔ "جرعات" میں آپ نے جس کونسل کے قیام کے بارے میں تحریر فرمایا ہے میں اُس سے سو فی صد متفق ہوں اور ان ساری ACTIVITIES کے لئے آپ مجھے خود سے قریب پائیں گے

"تازہ شاعر" میں میرے لئے سب سے اہم اور باعثِ کشش آپ کی غزل ہے۔ غزل ایک بار نہیں بار بار پڑھی اور ہر بار دل و دماغ پر گہرے اثرات مرتسم ہوئے۔ ہر شعر آپ کے دل کے سوز و گداز و گداخت کا بھرپور ترجمان اور تجرباتِ زیست کا آئینہ دار ہے ؎

درد جب سوا ہو جائے، خود ہی ہاتھ رکھ لیجے
کون دل کے زخموں پر ہاتھ رکھنے والا ہے
جو دکھا چکی اب تک اور کیا دکھائے گی؟
تیرا حال اے دنیا، اپنا دیکھا بھالا ہے
صورتوں کو کر لیجے بے نیازِ آئینہ
آئینہ تو جو بھی ہے ٹوٹ جانے والا ہے

اور پھر مقطع ؎

گھٹ چکی ہے اِک حد تک جسم کی توانائی
اس کے باوجود اعجاز آج بھی جیالا ہے

مضامین نظم و نثر کے اعتبار سے زیرِ نظر شمارہ مجھے بیحد پسند آیا۔
ڈیوڑھی نواب دولہ خان۔ چنچل گوڑہ۔ حیدر آباد۔ اکرام جاوید (بی کام)

● جون نمبر موصول ہو گیا تھا۔ اب جولائی کا شمارہ اگر اسی ماہ میں نکل جائے تو پھر "شاعر" کی رفتار میں جو لغزش آگئی تھی وہ سنبھل جائے گی۔ مگر اسے بروئے کار لانے میں آپ کن مالی اور جسمانی مصیبتوں کے شکار رہے ہوں گے اس کا اندازہ کیا کوئی لگا سکے گا۔ ایک زبانی ہمدردی ہے اور بس۔! کیا خوب کہا ہے آپ نے بھی ؎

جیسے ایک چٹکی سی کوئی یک بیک لے لے
دوستوں کی پرسشں کا رنگ ہی نرالا ہے۔

درد جب سوا ہو جائے خود ہی ہاتھ رکھ لیجے
کون دل کے زخموں پر ہاتھ رکھنے والا ہے

کراس روڈ نمبر ۶، ایگریکو۔ جمشید پور۔ رونق دکنی سیمابی

● بڑی جلدی جلدی "شاعر" کے دو شمارے ملے۔ ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے میں نے "تجربات" کا صفحہ پڑھا۔ آپ نے وقت کی نہایت اہم ضرورت پر قلم اٹھایا ہے (شاعر مئی ۷۱ء) واقعی مرکزی اور ریاستی حکومتیں اور سیاسی جماعتیں اس سلسلے میں جو اقدامات کریں گی، کریں گی۔ ہر علاقے کے ادیبوں، صحافیوں اور شاعروں کا پہلا فریضہ ہے کہ وہ فرقہ پرستی کی لعنت کو جڑ سے اکھیڑ پھینکنے کے لئے پابہ رکاب ہو جائیں۔

یہاں حیدر آباد میں تو ہم لوگوں نے ایک جلسہ ۱۴ر جون کو شام میں چھ بجے اردو ہال میں منعقد کر بھی لیا۔ جس کی صدارت پرنسپل ایڈمنسٹریٹیو اسٹاف کالج جناب این پی سین نے کی اور اس جلسہ کو مندرجۂ ذیل مقررین نے "فرقہ واریت" اور "دانشوروں کے فرائض" کے موضوع پر حاضرین کو مخاطب کیا۔

(۱) ڈاکٹر سید حسین ظہیر (۲) پروفیسر رشید الدین خاں، (ایم، پی) (۳) پروفیسر منظور عالم (۴) ڈاکٹر پی ایم بھارگو۔ (۵) شری رام بھٹلا کرشنا مورتی (۶) ڈاکٹر اے ایم خسرو، (۷) شری کے ایل مہندرا۔

یہ جلسہ انجمن ترقی پسند مصنفین آندھرا پردیش کی جانب سے منعقد کیا گیا تھا۔ جس میں مقررین نے فرقہ واریت کی پیدائش، اس کی اشاعت اور تشدد پر تفصیل سے تقریریں کیں۔ اس خطرناک اور شرمناک جذبے کو نیست و نابود کرنے پر بھی سوچ بچار کیا گیا۔ ادیبوں اور شاعروں کو قلم ہی کے ذریعہ نہیں عملی طور پر بھی فرقہ پرستی کا خاتمہ کرنا ہے، جاہل طبقہ ہی کو نہیں، پڑھے لکھے سمجھداروں کی بڑی سے بڑی تعداد کو اس لعنت سے چھٹکارا دلانا ہے۔

آپ نے "تجربات" والے صفحہ پر "کونسل برائے انسدادِ فسادات" کی جو تجویز پیش کی ہے اس پر سارے ملک کے ادیبوں اور دانشوروں کو ایک آواز ہو کر اٹھ کھڑا ہونا چاہئے۔ اور سب کو آپ کا ساتھ دینا چاہئے۔ لیکن یہ سب کچھ بہت جلد ہونا چاہئے

۴/۲۴ آر۔ ٹی۔ مہاراجہ چندو لال بارہ دری۔ حیدر آباد ؛ ۔ اظہر افسر

● جون ۷۱ء کا شمارہ ملا۔ سرورق خوب ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی غزل بھی پسند آئی۔ خاص طور پر مقطع۔ "پروفیسر عصمت جاوید" اور "عطیہ نشاط خان" کے مضامین بھی اچھے ہیں۔ "ڈرامے کے بنیادی خیال" میں اور بھی بہت کچھ اضافہ کیا جا سکتا تھا۔ پھر بھی کوشش قابل ستائش ہے۔

خطوط میں اپنے بارے میں جناب احمد عظیم آبادی کے خیالات بھی نظر سے گزرے۔ اُن کے تمام اعتراضات کا جواب اُن ہی کے لکھے اس جملے (اس دور میں افلاطون وغیرہ کی ادبی تنقیدوں یا تنقیدی اصولوں پر آج کی عینک کی وساطت سے نظر ڈالنا کوئی مناسب طریقہ نہیں) میں مضمر ہے۔ اگر ہم آج کی عینک سے اُن اصولوں کو پرکھ نہیں سکتے تو پھر ہمیں یہ بھی ماننا ہوگا کہ آج کے ادب پر اُن اصولوں کا اطلاق نہیں ہو سکتا اور یہی سب کچھ تو میرے اُس مضمون کا مقصد و مدعا ہے۔ روایت کا احترام میں بھی کرتا ہوں، لیکن صرف اُس روایت کا جو حال و مستقبل کی راہوں کو ہموار کرنے میں معاون ہو۔ کسی بات کو صرف اس لئے مان لینا کہ وہ اسلاف کی دین ہے صحت مند رجحان نہیں ہے اور محض یہ بات کہ کسی قول کے سامنے صدیوں تک لوگ سرِ تسلیم خم کرتے رہے ہیں، بھی کسی بات کے حقیقت ہونے کی ضامن نہیں ہو سکتی۔

محترمی احمد صاحب نے نیٹشے کا قول نقل کیا ہے اور میرے لئے یہ ایک نیا انکشاف ہے کہ وہ ایک ایسے انسان کو جو کسی میں جذب ہو چکا ہے GOOD & EVIL سے معرّیٰ قرار دیتے ہیں۔ مجذوب اگر GOOD سے معرّیٰ ہو جائے تو پھر اُس کی حقیقت ہی کیا رہ جائے گی۔ خیر، GOOD ہی تو مجذوب کی آخری منزل ہے۔ نیٹشے کا قول درست ہے لیکن اُس نے یہ قول مجذوب کے لئے نہیں ایک

آرٹسٹ کے لئے لکھا ہے۔ ایک مجذوب اور آرٹسٹ میں فرق یہ ہے کہ مجذوب خارجی دنیا سے قطعی انحراف کرکے داخلی دنیا میں ڈوب جاتا ہے۔ لیکن آرٹسٹ داخلی دنیا کو سامنے رکھ کر خارجی دنیا کی تشکیل عمل میں لاتا ہے اور اس طرح اگر مادہ کے اندرون کی صحت روح کی وساطت سے عمل میں آتی ہے تو مادہ کی خارجی ہئیت کی صحت آرٹسٹ کے ہاتھوں تکمیل پاتی ہے۔ اپنی خامیوں کے باوجود میں نے اُس مضمون سے جو نتائج اَخذ کئے ہیں اُن پر مکمل ایمان رکھتا ہوں۔

جموں یونیورسٹی۔ جموں ظہور الدین

● جون کا شاعر ملا۔ پروفیسر نریش کے دونوں مضمون نظر سے گزرے۔ دونوں مضمون قابلِ غور و فکر ہیں۔ پروفیسر صاحب نے اُردو شعراء کے جتنے قصور گنوائے ہیں اِن میں کتنے بے بنیاد ہیں۔ کیا اُنہیں نہیں معلوم کہ ہر زبان کی شاعری کا اپنا ایک مزاج اور ڈھنگ ہوتا ہے۔ ایک روایت ہوتی ہے؟ پہلے مضمون میں تو اُن کی باتیں سیدھی سادی ہیں۔ مگر دوسرے مضمون میں (جسے جاوید اقبال ناطق نے ہندی سے ترجمہ کیا ہے) اُن کے لہجے میں جھلاہٹ پیدا ہو گئی ہے۔ وہ خود یہ کہتے ہیں کہ سوال اُردو زبان کا نہیں بلکہ اُردو کے پردے میں مسلمانوں کا ہے۔ تو پھر اُن کی کہی ہوئی تمام باتیں کمزور ہو جاتی ہیں اُردو شاعری کے مزاج اور رواج کے مطابق اس میں عربی فارسی کی تلمیحات و تشبیہات استعمال ہوتی رہی ہیں۔ یہ غلط ہے کہ بھارت کے اُردو شعراء کو اپنے دیش کی مہان شخصیتوں اور اپنے دیش کی چیزوں سے پیار نہیں ہے۔ سوال صرف شاعری کے مزاج اور اُس کی روایات کا ہے اور جب اُسکا مزاج بدلے گا (اب بدل رہا ہے) تو آہستہ آہستہ جو رنگ وہ چاہتے ہیں اور گہرا ہو جائیگا۔

یہ بات تو اب ظاہر ہی ہے کہ جن سنگھ مسلمانوں کو برداشت نہیں کر سکتی (اور یہ آپ نے بھی کہا ہے) تو کیا ناموں کی تبدیلی سے اور تخلص کے بدل جانے سے وہ نفرتیں ختم ہو جائیں گی جو دیش کو کھوکھلا کئے دے رہی ہیں؟ ابراہیم کے ساتھ دینیش اور اصغر علی کے ساتھ نیرج لگا دینے سے کیا اُن کے جان و مال محفوظ رہ سکیں گے۔ کیا ثبوت ہے اُن کے پاس اِس بات کا؟

بڑودہ کے حالیہ فساد کے وقت ایک مسلمان وکیل جن کا نام ہندوانی (دامنی) ہے، اُنہیں ایک قتل کے غلط الزام میں دفعہ ۳۰۲ کے تحت گرفتار کروا کے چھ ماہ جیل میں سڑوا دیا گیا تھا۔ اور اُن کا ہندوانی نام بھی اُن کی حفاظت نہ کر سکا تھا کیا یہ سب بند ہو جائے گا؟ سوال صرف نفرتوں کا ہے اور اُن کے ایسے مضامین اِن نفرتوں کو جو دیش کے لئے خطرناک ہیں اور ہوا دیتے رہیں گے۔

آپ کی غزل بہت پیاری اور رواں دواں ہے۔ ارشد صدیقی اور خاور صاحب کی غزلیں بہت اچھی لگیں۔

یعقوت پورہ۔ بڑودہ۔ خلش بڑودوی

● مئی ۸۳ء کا شاعر نظر سے گزرا۔ آپ نے اداریئے میں جو کچھ لکھا ہے COUNCIL OF WRITERS & JOURNALISTS FOR THE PREVETION OF RIOTS اِس سلسلے میں ہماری ریاست میسور کے مشہور جواں سال شاعر اور ادارے کے سکریٹری مشتاق احمد خاں عادل ادیب اور صدر جناب مبارز الدین رفعت اِس سلسلے میں بہت کوشش کر رہے ہیں۔ لہٰذا آپ اپنی گراں قدر رائے سے ہمیں سرفراز فرمائیں۔

ادارۂ اُردو۔ عمر شریف روڈ۔ بنگلور ۲۔ شمیم بنگلوری

● آج کی ڈاک سے جون کا شمارہ ملا۔ "بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے" پڑھ کر ذہن کی حالت کچھ ایسی ہو گئی کہ قلم اٹھائے بغیر نہیں رہا گیا۔ اِس وقت ہندوستان میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو ہندی کے رسالوں میں اُردو مخالف مضامین لکھتے ہیں۔ اور اِس مظلوم زبان میں طرح طرح کے کیڑے نکالتے ہیں اور اُردو رسائل میں مگرمچھ کے آنسو بہاتے ہوئے اِس کے حمایتی بن کر بھولے بھالے اُردو دانوں کو بے وقوف بھی بناتے ہیں۔ آپ نے بہت اچھا کیا جو پروفیسر نریش کا حقیقی روپ اُردو والوں کو دکھا دیا۔ حد ہو گئی!۔ ایک طرف تو اُنہوں نے ہندی اخبار "ہندوستان" میں اُردو کے "بھارتی کرن" کا نعرہ لگایا اور خود کو اِس تحریک کا ہیرو بنا کر پیش کیا اور دوسری طرف آپ کو ایسا مضمون بھیج دیا جس میں اِس نعرے کی شدید مخالفت تھی۔ ہندی والوں سے تو یہ کہا کہ اُردو

والے گنگا اور جمنا سے نگاہیں پھیر کر دجلہ و فرات کی طرف نظریں اُٹھاتے ہیں۔ ہر لشی چند کی داستان بھلا کر حسینؑ کی شہادت کا ذکر کرتے ہیں۔ ہمالیہ کی عظمتیں بھلا کر طور کے گن گاتے ہیں۔ دسہرہ، ہولی، دیوالی سے منہ موڑ کر عید، بقر عید کو شعر و ادب کا موضوع بناتے ہیں۔ اور ماہنامہ "شاعر" کے توسط سے اُردو والوں کو یہ تسلی دی کہ تمہاری زبان پر اس قسم کے الزام عائد کرنا بے انصافی ہے اور یہ کہ ہندی والوں کو کیا معلوم کہ کتنے شعراء نے رام کرشن، بدھ اور نانک کے نغمے گائے ہیں۔ اُنہیں کیا خبر کہ کتنے شعراء نے دیوالی، بسنت، ہولی اور دسہرہ پر سیکڑوں نظمیں کہی ہیں۔ اُنہیں علم کیا کہ اُردو شعراء نے گنگا اور جمنا کی لہروں کی سنگیت سے اپنے نغموں کو سحر انگیز بنایا ہے وغیرہ وغیرہ۔

پروفیسر نریش صاحب کے اس منافقانہ رویّے کو دیکھ کر اُردو والوں کی آنکھیں کھل جانا چاہئیں ــ ہائے بدنصیب اُردو، تیرے بھی کیسے کیسے دشمن نما دوست اور دوست نما دشمن ہیں۔ !

روشن محل۔ گاندھی نگر۔ بستی (یوپی) اختر بستوی ایم اے

● "دعوت" کے شمارے میں "فرقہ واریت اور ادب" کے عنوان سے آپ کی اپیل دیکھنے کا اتفاق ہوا تو دل کو ہلکی سی طمانیت محسوس ہوئی۔ سوچ اور فکر کی یکسانیت بھی تو تعلق خاطر کی نمائندگی کرتی ہے۔ جو چراغ آپ جلانا چاہتے ہیں اسی پر تکیہ کرنے والے اندھیروں کے مکین اور بھی ہیں۔ شاید یہ احساس خود آپ کے لئے بھی موجب تسکین ہی قرار پائیگا۔ ہم رشتہ عرضداشت میں یہ بات وضاحت کے ساتھ آپ کے سامنے آجائے گی کہ قطعی انہیں خطوط پر ادبی سنگم نے بھی اپنی جدو جہد کا آغاز کیا تھا جو آپ کے صالح فکر و نظر نے اپنی اپیل میں متعین فرمائے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ ہو سکتا ہے "سنگم" عجلت جیسے جرم کا مرتکب قرار پائے۔ لیکن یقین جانیئے آپ کی جانب سے کسی تحریک کا کوئی علم ہمیں اس سے پہلے نہیں تھا اور جب "سنگم" کی جانب سے ادبی سیمنار کے انعقاد کا فیصلہ کر لیا گیا اور عملی کام بھی شروع ہو گیا تو آپ کی اپیل سے تعارف ہوا۔ بہرحال اب میں انتہائی خلوص کے ساتھ آپ سے مستدعی ہوں کہ قطعی اپنے انداز فکر کے ساتھ اس سیمنار کے انعقاد کے سلسلے میں رہنمائی فرمایئے۔ آپ کے مشورے اور تجاویز اس جدوجہد کو اور چار چاند لگا سکتے ہیں۔

ادبی سنگم۔ جلی کوٹھی۔ میرٹھ۔ ڈاکٹر انجم جمالی

● "شاعر" جون ۸۹ء میری آنکھوں کے سامنے کھلا پڑا ہے . . . . اور میں پتھرائی ہوئی آنکھوں سے یہ حیرت انگیز سلسلۂ مضامین (بھارتیہ کرن کا ڈرامہ اور اُردو ــ (چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر) دیکھ رہا ہوں۔

جس وقت میں نے ساپتاہیک "ہندوستان" کے اسی مضمون "چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر" کا ترجمہ کیا تھا۔ اُس وقت میرے ذہن میں ایک ہی گروپ کا خیال اُبھرا تھا، جسے اُردو دوستی کا ضرورت سے زیادہ دعوٰی ہے اور جس کے ممبران و عہدیداران میں رضیہ سجاد ظہیر اور راہی معصوم رضا قبیل کے افراد ہیں۔

لیکن "شاعر" دیکھ کر محوِ حیرت ہوں۔ ایک ہی شخص کے دو مختلف کرداروں اور خیالات کا یہ تصادم ایک سبق آموز سنگم ہے۔ ایک حیرت انگیز دوراہا ہے، اب بھی اگر اُردو والے اُردو کے دوستوں اور دشمنوں میں فرق محسوس کر سکیں تو یہ بے چاری اُردو کی بدقسمتی اور موت کے مترادف ہوگا۔ اُردو کے یہ نام نہاد بہی خواہ اور ریفارمر اپنی اصل ذہنیت کے ساتھ سامنے آگئے ہیں۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ دنیائے اُردو کیا سبق لیتی ہے اور کیا اندازِ کار اختیار کرتی ہے۔

میں نے پروفیسر نریش کے اس مضمون کا ہندی ترجمہ کر کے جو انہوں نے آپ کو بھیجا تھا۔ "ہندوستان" دہلی کو بھیج دیا ہے۔ توقع تو نہیں لیکن اگر وہ ہندی ترجمہ شائع کر دیا گیا تو یہ اُن کی صحافتی دیانتداری ہوگی۔ پروفیسر نریش کے متعلق صرف اتنا ہی عرض کروں گا ؎

"قیس تصویر کے پردے میں بھی عُریاں نکلا"

۶/۵ بی آئی ٹی بلاکس۔ بمبئی ۳ جاوید اقبال ناطق

● "شاعر" جون ۸۹ء کے اداریہ میں آپ کی ایک اطلاع سے میں مزید کرب میں مبتلا ہو گیا۔ پہلے ہی کچھ کم دُکھ نہ ہوا تھا ــ اُردو کے "علمبرداروں" کی سرد مہری دیکھ کر ــ . . . میں نے ادیبوں اور صحافیوں کی کونسل برائے انسدادِ فسادات" کے سلسلے میں ایسے اہم قلمکاروں کو توجہ دلائی تھی۔ جن سے میری خط و کتابت رہی ہے اور کچھ ایسے بھی تھے جنہیں میں نے پہلی بار محض اسی مقصد کے تحت خط لکھا تھا۔ لیکن سب نے خاموشی اختیار کر لی۔ میں اُن کا نام نہ بھی لوں تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ حقیقی "علمبردارانِ"

تک پہنچے گی تو خود اُن کا ضمیر انہیں ملامت کرے گا... تعجب ہے کہ خواتین قلمکاروں کو بھی چُپ ہی رہ جانا پڑا۔ !

زیرِ نظر "شاعر" میں بھائی حرمت الاکرام صاحب کا خط اِس سلسلے میں پڑھ کر خوشی ہوئی۔ آپ کو یہ جان کر یقیناً خوشی ہوگی کہ کچھ غیر مسلم ہستیاں ایسی بھی ہیں جو ادیبوں اور صحافیوں کی کونسل برائے انسدادِ فسادات کو زیادہ سے زیادہ سرگرم دیکھنا چاہتی ہیں، ایسا مجھے میرے حلقے کے غیر مسلم قلمکار دوستوں کے خطوط سے معلوم ہوا، اِن میں خواتین کی تعداد معقول ہے۔

بھر کنڈا (ہزاری باغ) ظہیر نیازی۔

● پوسٹ کارڈ ۲۳ موصول ہوا۔ اِس زحمت کے لئے ممنون ہوں، کچھ ایسا خیال گزرا کہ اِس خط کے مضمون کا نشانہ کوئی اور صاحب تھے، میں زد میں آگیا ہوں۔

یہ صحیح ہے کہ کسی بھی جریدے کے مدیر کو اس قدر تخلیقاتِ نظم و نثر وصول ہوتی ہیں کہ انتخاب کا مسئلہ دشوار تر ہو جاتا ہے حالانکہ یہی نازک ترین موقع مدیر کی صلاحیت اور ادبی مذاق کے لئے آزمائش بھی ہوتا ہے۔ میں اپنی غزل کی عدمِ اشاعت سے دل برداشتہ نہیں، رنجیدہ ضرور ہوں کہ کم از کم آپ جیسی وسیع شخصیت کی طرف سے اِس قسم کا جواب آئے کہ "بہت بڑی تعداد میں نظمیں اور غزلیں جمع ہیں!" شاید یہ DICTATE کراتے وقت آپ صاحبِ طرز شاعر کم ——— "شاعر کے ایڈیٹر" زیادہ تھے۔

مجھے یہ کہنے میں کچھ پس و پیش نہیں کہ آپ نے غزل ملاحظہ نہیں فرمائی ورنہ ضرور بالضرور پسند فرماتے ——— اِس سے قطع نظر کہ ہند و پاک، میں مجھ سے بہتر غزل کوئی نہیں کہتا ———"

موضوعِ گفتگو غزل کا حق، اُس کا روایتی اسلوب اور بیان کی تہ داری کے علاوہ جدید حسّیات کی گرفت ہے۔ یہ میرا کارنامہ ہے ——— اور آپ کے اِسکول کا فیض ———!

آئندہ کے لئے کس سنہ تک غزل بھجوا دوں —؟

۹۵/۲۵ حلیم کمپاؤنڈ۔ فراش خانہ۔ کانپور۔ زبیر شفائی
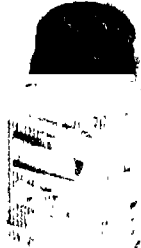
محفلِ اپنی

قلمکاروں سے چند گزارشات

"شاعر" پرانے اور نئے بہت سے قلم کاروں کی خدمت میں اعزازی طور پر بھیجا جاتا ہے، اِن میں سے بعض کا قلمی تعاون حاصل ہے اور بعض توجہ دِلانے کے باوجود "شاعر" کے لئے کچھ نہیں بھیجتے۔ خاصی تعداد میں ایسے ممتاز قلمکار بھی ہیں جو بغیر طلب اپنی بہتر اور تازہ تخلیقات سے "شاعر" کو نوازتے رہتے ہیں۔ ایسے قلم کار زیادہ سے زیادہ شکریہ کے مستحق ہیں۔

جن ادیبوں اور شاعروں کو سالہا سال سے "شاعر" جا رہا ہے اور وہ خاموش ہیں۔ اُن سے گزارش ہے کہ وہ "شاعر" کی قلمی اعانت فرمائیں۔

لکھنے والے بڑے ہوں یا چھوٹے، پرانے ہوں یا نئے، ادارہ "شاعر" سب کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ تخلیقات کے انتخاب میں کسی بھی تخلیق کے موضوع، اُس کے تنوّع اور علمی و فنّی حیثیت کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔ وہی تخلیقات واپس کی جاتی ہیں جو عمومی اور کمزور فکر و فن کی حامل ہوتی ہیں۔ اِس میں کسی امتیاز اور جانبداری سے کام نہیں لیا جاتا۔ یہ صحیح ہے کہ بڑی تعداد میں نظم و نثر تخلیقات آتی ہیں، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اُن میں نوّے فی صد غیر معیاری ہوتی ہیں۔

بعض قلمکار اپنی ایک ہی تخلیق دو دو تین تین جگہ بھیج دیتے ہیں اور اُس وقت بڑی تکلیف ہوتی ہے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ "شاعر" سے پہلے وہ کسی دوسرے رسالے میں شائع ہو گئی۔

(۱) قلم کاروں سے (بہ استثناء) ——— درخواست ہے کہ وہ "شاعر" کیلئے جو بھی تخلیق بھیجیں، پہلے اُس کے معیار کا اچھی طرح جائزہ لے لیں۔ (۲) مرسلہ تخلیق صرف "شاعر" کیلئے ہو اور جب تک دفتر سے جواب نہ مل جائے اُسے کسی دوسری جگہ اشاعت کیلئے نہ بھیجا جائے۔ (۳) کسی دوسرے رسالے یا اخبار سے واپس آئی ہوئی کوئی تخلیق "شاعر" کے لئے ہرگز نہ بھیجی جائے (۴) فرسودہ موضوعات پر مضامین اور افسانے نہ بھیجے جائیں۔ تخلیق کا متنوّع اور آج کے علمی، ادبی، فنّی، تہذیبی، سماجی اور سیاسی تقاضوں کے مطابق ہونا ضروری ہے۔

مالک، پرنٹر، پبلشر اعجاز صدیقی نے یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس ۲۳ نوروزجی اسٹریٹ شاکرواڑ بمبئی ۲ میں چھپوا کر دفتر سے شائع کیا
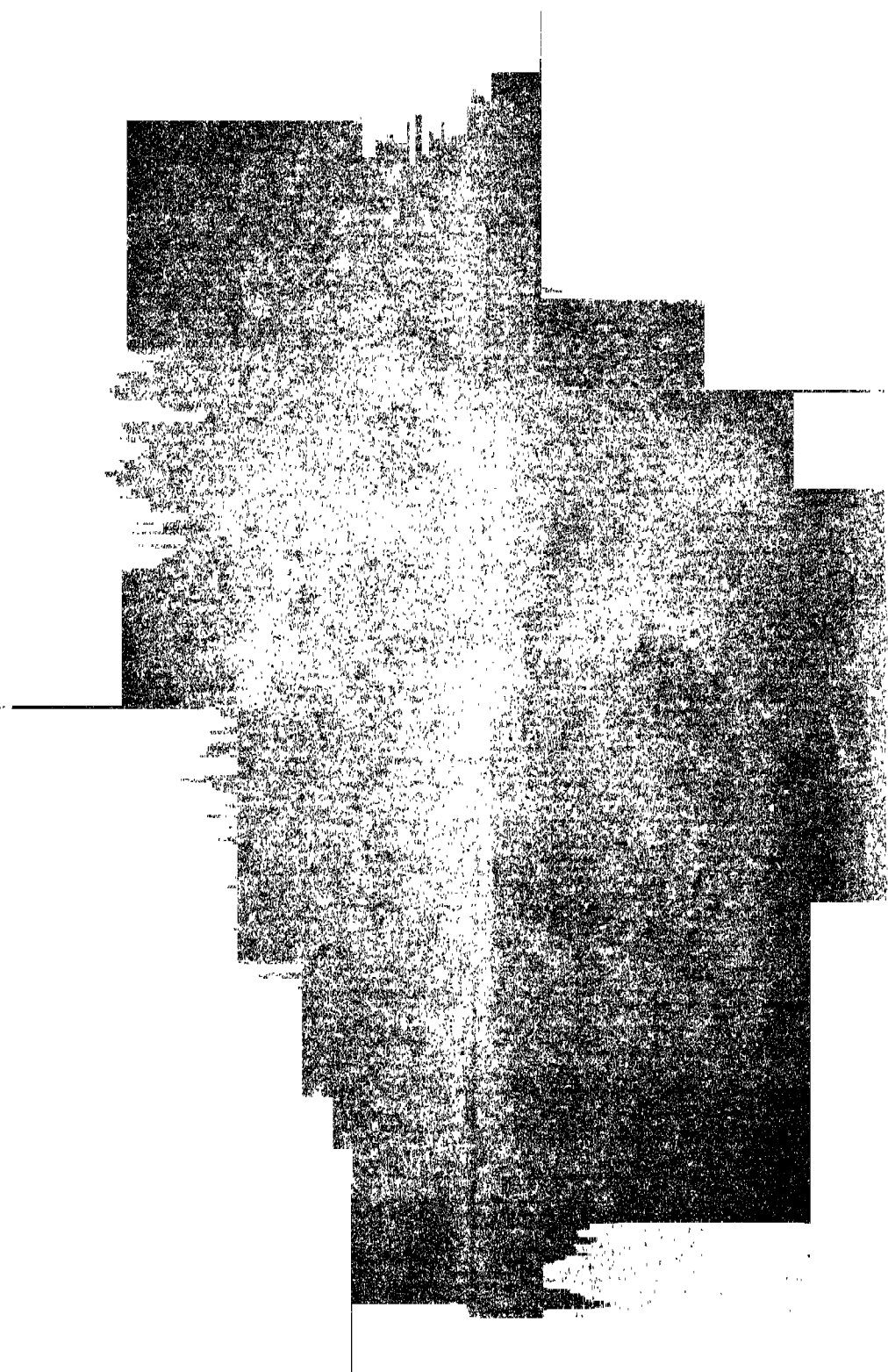
OST POPUL OLDES I AN & LI URDU JO
(41 Years of Publication
Publishing Dates, 15-16
Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 1

علامہ سیماب اکبر آبادی

کی چند حیات افروز تصانیف

کلیم عجم	(غزلیات)	چار روپیہ آٹھ آنے
سدرة المنتہی	(غزلیات)	چار روپیہ
کارامروز	(نظمیں)	چار روپیہ آٹھ آنے
شعر انقلاب	(نظمیں)	تین روپیہ
عالم آشوب	(رباعیات)	تین روپیہ
نفیر غم	(عزائی نظمیں اور سلام)	ایک روپیہ

جلدوں پر خوبصورت اور رنگین گردپوش

(مکمل سیٹ کی خریداری پر صرف محصول ڈاک معاف)

منیجر اشاعت مکتبہ قصرالادب پوسٹ بکس ۲۵۲۶ بمبئی

جاری شدہ ۱۹۳۰ء
بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم
اُردو کا اکتالیس سالہ علمی، ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

اگست ۱۹۷۰ء
جلد (۴۱) شمارہ (۸)

مُدیرِ اعلیٰ
اعجاز صدیقی

اِدارۂ تحریر:
مہندر ناتھ
ڈاکٹر محمد حسن
شہاب جعفری
ندا فاضلی

اِس شمارے میں

ڈاکٹر ابو محمد سحر ۔ بابا جان غفوروف ۔ [illegible]
سید احمد خاں ۔ نازش پرتاپ گڑھی ۔ [illegible]
ابراہیم یوسف ۔ کشمیری لال ذاکر ۔ جاں نثار اختر
حرمت الاکرام ۔ اکرام جاوید ۔ بشر نواز ۔ رشی پٹیالوی
صوفی غلام محمد ۔ ایس ایم حیات بادشاہ ۔ [illegible] شاہ
من موہن تلخ ۔ معراج انور ۔ اے سی [illegible]
مناظر عاشق ہرگانوی ۔ اختر راہی ۔ یعقوب راہی
فرحت کیفی ـــــ اور دوسرے

ناول (دوسرا باب)

* تبصرے
* مکتوبات
* محفل اپنی

زرِ سالانہ ۱۰ روپے
معاونین سے ۲۵ روپے
تاعمر خریداری ۱۲۵ روپے
ممالکِ غیر سے ۲۵ شلنگ

فی پرچہ: ایک روپیہ

ترسیلِ زر کا پتہ:
ماہنامہ شاعر
قصر الادب
بمبئی ۳ بی سی

خط و کتابت کا پتہ:
ماہنامہ شاعر
مکتبۂ قصر الادب
پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ بمبئی ۳ بی سی

فون نمبر: ۳۵۹۹۰۲

NIRODH

شاعر

ستمبر ۷۰ء کی جھلکیاں

★ **مقالات**

سردار جعفری کا اسلوبِ نگارش — ابوالفیض سحر
اکبر اعظم کا مشغلۂ شکار — ڈاکٹر نورالسعید اختر
اردو کی آزاد نظم — محمد ایوب واقف ایم اے
نازش کی غزل — پروفیسر انور صدیقی ایم اے

★ **کہانیاں**

انفرنو — آمنہ ابوالحسن
اجالوں کے پاسباں — رضاء الجبار
اپنا خون (ملیالم) — ٹی ایس پلے
ترجمہ: عالم برہ پوری
چھوٹی بات — نسیم محمد جان

★ **طنز و مزاح**

سندباد جہازی کا سفرنامہ — مجتبیٰ حسین

ڈراما

ہم آواز (مراٹھی) — رتنا کر مٹکری
ترجمہ: نور پرکار ایم اے

★ **ناول**

دھرتی سدا سہاگن (تیسرا باب) — کشمیری لال ذاکر

★ مشاہیر اور ممتاز شعرا کی نظمیں، غزلیں

- قلمکاروں کے خطوط
- کتابوں پر تبصرے
- ادبی و تہذیبی خبریں

★ فسادات پر ایک شاہکار افسانہ اور طنزیہ

(اپنے مقامی ایجنٹ کے یہاں یہ اہم شمارہ محفوظ کرا لیجیے)

شاہد جمیل

اہلِ وطن کو

آزادی کی تیسویں سالگرہ

مبارک

آزادی کی حفاظت
قومی یکجہتی
امن و سکون
خوش حالی
اور ترقی
کے لئے جدوجہد کیجئے

جہالت
فرقہ پرستی
بدامنی
لاقانونی
اور مذہبی منافرت
کو مٹانے کے لئے
میدانِ عمل میں آیئے

ادارہ

رشی پٹیالوی

صورتِ حال

وطن وطن تو پکار رہے ہو خیال بھی ہے، وطن کہاں ہے؟
بہار کے گیت گا رہے ہو، بہار سامان چمن کہاں ہے!
وہ اٹھ گئے، جن کے دم قدم سے چمن چمن تھا، وطن وطن تھا
شعور آدابِ زندگی تھا، وقارِ سامانِ انجمن تھا
وہی ہیں گنگ و جمن کے دھارے، وہی فلک ہے، وہی زمیں ہے
کروڑوں انساں یہاں ہیں لیکن جمالِ انسانیت نہیں ہے!

قدم قدم پر وطن پرستی، لباس اپنا بدل رہی ہے
وفا شعاری کی جعل طرازی غرض کے سانچے میں ڈھل رہی ہے!
زباں پہ شانِ وطن کے نغمے، لبوں پہ حُبِّ وطن کی باتیں
دلوں میں قدرِ پدیدہ کار فرما، وہی وطن دشمنی کی گھاتیں
رہا یہی حال اگر تو اک دن سحر کو روئے گی خوں فشانی
یہ دور بن جائے گا فسانہ، زباں پہ رہ جائیگی کہانی
غرض پرستی کے دائرے سے نکل سکو تو ہے وقت اب بھی
ابھی تو گھر میں ہے گھر کی دولت، سنبھل سکو تو ہے وقت اب بھی

کچھ اور ہے وقت کا تقاضا، ضرورتِ حال اور کچھ ہے
کچھ اور ماحول چاہتا ہے، کہ صورتِ حال اور کچھ ہے

تجزیات

شکوک و شبہات دُور کیجئے

دُنیا میں اکثر ایسے دور آتے رہے ہیں جب قوموں اور زبانوں کے درمیان شکوک و شبہات پیدا ہوئے ہیں، یہی نہیں بلکہ سخت ٹکراؤ بھی ہوئے ہیں۔ تاریخ خود کو دہرایا کرتی ہے اور نئے نئے رُوپ دھار کر سامنے آتی ہے۔ جب بھی کسی ملک میں ایسی صورت حال پیدا ہوئی ہے تو دانشمند طبقے نے علم و فکر کی روشنی میں، اپنے دَور کے تقاضوں کو اچھی طرح سمجھ کر اُن شکوک و شبہات کو دور کرنے کی ایک انتھک مخلصانہ سعی کی ہے۔

آزادی کے بعد ہندوستان کے اقلیتی فرقوں اور زبانوں کو بڑے بڑے مصائب و مسائل سے گزرنا پڑا ہے۔ یہ گذشتہ تیئیس سال میں مختلف انداز میں اُبھرتے رہے۔ پہلے بات وفاداریوں تک آئی اور پھر بڑھتے بڑھتے، مذہب، معتقدات اور زبانوں کو بدل دینے تک پہنچ گئی۔ اس وقت ہم اُردو والوں کے سامنے دو اہم ترین سوالات ہیں۔ ایک ہے اُردو کا اپنا فارسی رسم الخط بدل دینے کا سوال اور دوسرا اُردو شعر و ادب کے "بھارتیہ کرن" کا۔ اُردو زبان کو گذشتہ ۲۳ سال میں بُری طرح پامال کیا گیا ہے۔ مگر اب پُوری قوت سے منظم طور پر اُردو کی چند معروف شخصیتوں کو اپنی طرف ملاکر، دشمنانِ اُردو اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ اردو زبان اُس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتی، جب تک اُس کا اپنا مخصوص فارسی رسم الخط نہ بدل دیا جائے۔ دوسری طرف اکثریتی فرقے کو یہ بھی باور کرایا جا رہا ہے کہ اُردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے اور اُس کے شعر و ادب میں ہندوستانیت نہیں ہے!۔

اس درجہ نازک صورتِ حال پیدا ہو جانے کے باوجود، ذمّہ دارانِ اُردو اپنی مصلحتوں کے خول سے اب بھی باہر آنے کو تیار نہیں ہیں۔ اُن کے تساہل اور اُن کی بے عملی کا وہی انداز ہے جو پہلے تھا۔ چنگاریاں شعلوں میں بدل چکی ہیں، اژدہے اپنا مُنہ پھاڑے ہوئے ہیں، مگر اُردو کا دانشور طبقہ اپنی عظمتوں کے درختوں کی شاخوں سے چپٹا ہوا خود کو محفوظ سمجھ رہا ہے!۔

شکوک و شبہات کو اگر اعلیٰ اور نچلی، دونوں سطحوں پر دُور کرنے کی طرح دُور کیا جائے تو یقیناً خوشگوار نتائج نکل سکتے ہیں۔ اُردو کا رسم الخط بدل دینے کی بحث ہو یا اُس کے "بھارتیہ کرن کی" کی، اُردو والوں کی طرف سے نہایت جذباتی قسم کی تحریریں اُردو ہی میں چھپی رہتی ہیں اور سمجھ لیا جاتا ہے کہ حق ادا ہو گیا!۔

وہ ادارے جو اُردو کی خدمت کے ٹھیکیدار اور دعویدار ہیں، جو موٹی موٹی رقمیں غیر اہم کاموں پر صَرف کر رہے ہیں۔ یا وہ ادیب، جنھیں اُردو نے عظمت کا تاج پہنایا ہے، کیا ہندی اور انگریزی میں ایسے کتابچے شائع نہیں کر سکتے۔ ہندی اور انگریزی کے رسائل و اخبارات میں ایسے مضامین نہیں لکھ سکتے، جو حقائق کو آئینہ کر دیں؟ محض اُردو ہی کی گلیوں میں کب تک گُڈا پھوڑا جاتا رہے گا!!

جس طرح عصمت چغتائی کے، اُردو کے لئے ناگری رسم الخط اختیار کرلینے کے جواب میں اُردو کے ادیب و شاعر، ادارۂ شاعر کے رُکن ندا فاضلی نے اردو بلٹز بمبئی میں ہندی اُردو زبانوں کے الگ الگ مزاجوں، اُن کی لکھاوٹوں کے فرق اور دشواریوں کی طرف علمی اور سائینٹیفک اشارے کئے ہیں، کیا دوسرے ماہرینِ "اُردو لسانیات" ہندی ہی میں ہندی والوں کو مزید تشریح، پھیلاؤ اور استدلال کے ساتھ یہ یاد نہیں کرا سکتے ہیں کہ اُردو کیلئے دیوناگری رسم الخط اختیار کرنا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ کیا اُردو کے بڑے ادارے، اُردو مفکرین سے ایسے کتابچے لکھوا کر، تھوڑے خرچ سے ہندی اور انگریزی میں شائع نہیں کرا سکتے، جن میں اردو شعر و ادب کی ہندوستانیت کی نہایت واضح مثالیں ہوں!۔ اُردو زبان نے اپنی جنم بھومی ہندوستان کی جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ اُن سے ہندی اور دوسری زبانوں کے جاننے والوں کو آگاہ تو کیا جائے۔ ان کی غلط فہمیاں تو دُور کی جائیں!

وقت، اُردو والوں سے جو سوالات کر رہا ہے، اُس کا جواب دینا ہی پڑیگا۔ بے تعلقی، خاموشی اور فراریت آج کی تاریخ کا وہ سب سے بڑا جرم ہے جو کبھی معاف نہیں کیا جائے گا، خواہ یہ اتحاد صداقتی سے سرزد ہو یا کسی اور سے!!

اِعجاز صدیقی

آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کی فرمائش پر تازہ نظم، جو ۱۴ اگست ۷۰ء کو نشر کی گئی۔

یہ ایک نعمتِ لا انتہائے عالم ہے — اِسی کو منزل و مقصودِ زندگی کہیئے
اِسی کو دیجئے انفاسِ خوشِ خرام کا نام — اِسی کو لمحۂ تجدیدِ سرخوشی کہیئے
سرِ نیاز اِسی کے حضور کیجیئے خم — اِسی کے ذکر کو ہونٹوں کی بندگی کہیئے
یہ اِک حسین کرن زیست کے اندھیروں میں — نہ کیوں اِسے نِگہ و دِل کی روشنی کہیئے
یہ آنسوؤں کو ستاروں کا رُوپ دیتی ہے — اِسی کو اصلِ متاعِ غم و خوشی کہیئے
یہ جب بڑھی تو غلامی کی کٹ گئی زنجیر — اِسے نجات دِہِ پائے آدمی کہیئے

شعار کیجئے کیوں رسم و راہِ عامِ کہن؟ — یہ کیا ضرور کہ جو سب کہیں، وہی کہیئے!
بُرا نہیں ہے حدیثِ خزاں کا دُہرانا — فسانۂ غمِ ماضی کبھی کبھی کہیئے
کہاں تو کچھ بھی نہ تھا اور مِل گیا سب کچھ! — اِسے بھی معجزۂ دامنِ تہی کہیئے
اِسی سے گرم ہوئی حرف و صوت کی دُنیا — یہ قصّۂ لبِ جاں بخش بھی کبھی کہیئے
اِسی کے فیض سے اُبھری وہ شکلِ منزلِ نو — جسے نتیجہ و انعامِ خود روی کہیئے
وہ جام، جس نے دیا میکشوں کو کیف و سُرور — وہ مَے، کہ جس کو مُداوائے تشنگی کہیئے
قرار دیجئے اِس کو نوائے آخرِ شوق — تو اوّلین تمنّائے دِل رسی کہیئے
اِک آفتاب، جو دے رُوح کو نئی تب و تاب — اور ایک چاند، جسے نُورِ آگہی کہیئے
رُخِ بہار کا غازہ، جمالِ صبحِ چمن — گُلوں کا رنگ، شگوفوں کی تازگی کہیئے

نِکل تو آئی مگر کوئی صورتِ تعمیر! — اب اِس کو چاہیے مآلِ شکستگی کہیئے
بصد وقار و بصد اہتمام آ کے رہی — اِسے کرشمۂ خودداری و خودی کہیئے
جو اِس کے نام سے جاگا، وہ کچھ نہ کچھ تھا ضرور! — غرور کہیئے کہ احساسِ برتری کہیئے!
کبھی رسن، کبھی زندان و دار سے گزری — جو قیصری سے نہ ہاری وہ سروری کہیئے
سیاہ رات کا آنچل ہٹا کے مسکائی — وہ صبح، جس کے اُجالوں کو دائمی کہیئے

یہ شمعِ محفلِ جاں اور ہم ہیں پروانے
نثار اِس پہ خلوص و وفا کے دُردانے

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ)

نازش پرتاب گڈھی

اردو شاعری میں ہندوستانیت

(یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ نازش پرتاب گڈھی انشا پرداز، نقاد یا محقق نہیں ہیں۔ وہ صرف اردو کے ایک ممتاز شاعر ہیں — ادارہ)

اردو میں ہندوستانیت، نیا موضوع تو نہیں ہے۔ اردو کے نثری ادب میں ایسے مضامین ضرور مل جائیں گے جن میں اس اہم موضوع پر جابجا بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ یہ مضامین کتب و رسائل میں بکھرے ہوئے ہیں اور بڑی ضرورت ہے کہ انہیں یکجا کیا جائے۔ یا ان مضامین کے ایسے حصوں کا انتخاب کر لیا جائے جن میں اردو کے ہندوستانی اور وطنی کردار کی وضاحت کی گئی ہے۔ بدقسمتی سے اردو کو تنہا مسلمانوں کی زبان سمجھ لیا گیا ہے اور جس طرح فرقہ پرست جماعتیں ہندوستانی مسلمانوں سے وفاداریاں طلب کر رہی ہیں۔ انہیں "بھارتیانے" پر زور دے رہی ہیں، اسی طرح اب ایک نئی آواز "اردو شعر و ادب کو بھارتیانے" کی اٹھی ہے۔ ہر چند دونوں آوازیں اور دونوں مطالبے غلط فہمی اور ہٹ دھرمی پر مبنی ہیں۔ پھر بھی اردو کے ہندو اور مسلمان ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ان لوگوں کو مطمئن کریں جو حقائق سے لاعلم ہیں۔ یہ حیلہ بہت اچھا ہے، جہاں ہم اس موضوع کی تجدید کر سکیں گے، وہیں بہت سا چھپا ہوا اہم مواد بھی سامنے آ جائے گا۔ ان اردو شاعروں اور نثر نگاروں کی یاد تازہ ہو سکے گی جنہوں نے اپنی نگارشات سے ملک و قوم و وطن کی خدمت کی۔

جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں، یہ موضوع بہت وسیع ہے۔ اس کا مواد بہت بکھرا ہوا ہے اور یہ بات کسی ایک قلم کار کے بس کی نہیں کہ وہ کئی سو سال کی نظم و نثر کا جائزہ لے۔ میں چکبست، سیماب، ظفر علی خاں، محروم اور جوش وغیرہ کے بعد آنے والے نظم نگار شعراء کی صف میں سے ہوں۔ تقسیم کے بعد میں نے اور میرے دوسرے معاصر نظم نگار شعراء نے اپنی شاعری میں ہندوستانیت اور وطنیت کو جو جو موقع اپنے شعر و ادب میں جگہ دی ہے۔ میں ان حوالوں کی تلاش سے معذور و مجبور رہوں۔ اس وقت صرف اپنی ہی چند نظموں سے مثالیں پیش کروں گا۔

جب ہندوستان اور پاکستان میں فوجی جھڑپ ہوئی تھی، اس وقت امدادی فنڈ جمع کرنے کی غرض سے آنجہانی لال بہادر شاستری کی صدارت میں ایک آل انڈیا مشاعرہ دلی میں منعقد کیا گیا تھا۔ ایک مشہور و معروف شاعر جو حکومت ہند کے محکمۂ اطلاعات کے ذمہ دار رکن اور بڑے افسر بھی ہیں، جب اپنا کلام پیش کرنے کی غرض سے مائیک کے سامنے تشریف لائے تو ایک قطعی غیر متعلق اور غیر ضروری بات یہ فرمائی کہ — "جب چین سے لڑائی ہو رہی تھی تو اردو والے بہت بڑھ بڑھ کر نظمیں لکھ رہے تھے اب "پاکستان" سے جنگ چھڑ گئی ہے تو اردو والے خاموش ہو گئے ہیں۔" معترض خود بھی اردو والے تھے اور موصوف نے خود بھی اس وقت تک ہند و پاک جنگ کے سلسلے میں کچھ ارشاد نہیں فرمایا تھا۔ اس کے باوجود سر مشاعرہ انہوں نے اردو والوں کی خاموشی کا گلہ کیا۔ آپ سمجھے؟ — موصوف نے اردو شاعروں سے گلہ نہیں کیا تھا بلکہ، دراصل انہوں نے اپنی دانست میں مسلمان شاعروں کی "وطن بیزاری" کو بے نقاب کرنا چاہا تھا۔

اور محض الزام تراشی کی دُھن میں حقیقت سے چشم پوشی کی تھی۔ شکر ہے کہ اتنے بڑے جھوٹ اور الزام کی پول اُسی جگہ کھل بھی گئی تھی۔ اور بیکل اُتساہی اور فیاض بھاگلپوری وغیرہ نے یہ کہکر معترض کا منہ بند کردیا تھا کہ محکمۂ اطلاعات کے ذمہ دار افسر ہوتے ہوئے بھی آپ کو خبر نہیں ہے کہ باقاعدہ فوجی جھڑپ شروع ہونے سے بہت پہلے مئی کے شروع ہی میں پاکستان کی جارحیت کے خلاف اُردو کے ہفتہ وار اخبار "بلٹز" میں نازش پرتاپگڑھی کی نظم شائع ہوچکی ہے۔ جس میں نازش نے تمام ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے صدائے احتجاج بلند کی ہے۔

جیساکہ ماہنامہ شاعرؔ کے پچھلے شماروں میں شائع شدہ چند مضامین اور خطوط سے ظاہر ہوتا ہے، سوال ہندی اور اُردو کا نہیں بلکہ موجودہ فرقہ پرست سیاست نے ہندو اور مسلمان کا سوال اُٹھا دیا ہے۔ چنڈی گڑھ کے ایک پروفیسر صاحب نے شاعرؔ میں کچھ سوالات پیش کئے ہیں اور اُردو شاعروں اور شاعری پر اعتراضات صادر فرمائے ہیں۔ انہیں میں سے ایک بات ہندوستان کے مہاپرشوں کی تصاویر کی اشاعت بھی ہے۔ اِس سلسلے میں عرض کروں گا کہ مسلمانوں کے یہاں کسی بھی جاندار کا بُت رکھنا، اُس کی تصویر بنانا، رکھنا اور شائع کرنا یکسر خلافِ شرع اور مذہباً ممنوع ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اُردو کے تمام رسالوں اور اخباروں وغیرہ میں جن کے مدیر مسلمان ہی ہوتے ہیں۔ ہر قسم کی تصویریں شائع ہوتی رہتی ہیں، بے جان چیزوں کی بھی اور جانداروں کی بھی، صاف ستھری اور پاکیزہ بھی اور گندی، فحش اور مخرّبِ اخلاق بھی۔ مگر۔ اِن تمام اخباروں اور رسالوں کے مدیر صاحبان نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اُن کا اخبار یا رسالہ مذہبی ہے۔ پروفیسر صاحب اگر اُردو کے دوسرے اخباروں کے بارے میں فرماتے کہ وہ رام، کرشن یا کسی دوسرے مہاپرش کی تصویر کیوں نہیں چھاپتے تو کوئی اور اُن کا ساتھ دیتا یا نہ دیتا لیکن میں اُن کی ضرور ہم نوائی کرتا اور آواز بلند کرتا کہ اُردو کے اخباروں اور رسالوں میں مذکورہ بالا عظیم ہستیوں کی تصاویر ضرور شائع ہونی چاہئیں۔ مگر معترض یہ تصویریں "الجمعیۃ" اور "دعوت" میں دیکھنا چاہتے ہیں، جو دینی اور مذہبی اخبار ہیں اور جن کے مدیر صاحبان حتی الامکان شرع کی پابندی کرتے ہیں۔ بات وہی نکلی نا، کہ اعتراض اُردو اخباروں پر نہیں بلکہ مسلمان اخباروں سے گلہ ہے۔ ڈھکے چھپے لہجے میں یہ ہدایت ہے کہ بھارت کے جو تھوڑے سے مسلمان اپنے مذہبی قوانین اور شرع کی پابندی کرتے ہیں، اب انہیں بھی اِس قید سے آزاد ہوجانا چاہئے ورنہ وہ بھارتی کہلانے کے مستحق نہ ہوں گے۔

اُردو زبان و ادب کی تعمیر میں چونکہ عربی اور فارسی زبانوں کا بھی حصّہ ہے۔ اِس لئے الفاظ کے ساتھ ہی ساتھ عربی اور فارسی زبانوں کی علامتیں، اِشارے، اِستعارے اور تلمیحیں وغیرہ بھی اُردو شعر و ادب میں شامل ہوئیں۔ پھر اُس زمانے میں ہمارے یہاں عربی و اور فارسی کی تعلیم بھی عام اور بڑی حد تک ضروری تھی۔ اُس وقت کے شعراء عربی اور فارسی زبانوں میں خاصی مہارت رکھتے تھے۔ وہ اِن زبانوں کی علامتوں اور تلمیحوں سے بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ جب وہ عربی اور فارسی کی روایات (TRADITIONS) کے تحت اپنی بات کہتے تھے تو اُنہیں اپنے جذبات کے اظہار میں کوئی رکاوٹ یا دِقت پیش نہیں آتی تھی اور عربی اور فارسی زبانوں سے خاصی واقفیت رکھنے کی بنا پر اُن کا سامع یا قاری بھی کوئی اُلجھن یا دشواری محسوس نہیں کرتا تھا۔ مگر جب عربی اور فارسی زبانوں کا چلن ملک میں کم ہوا تو اُردو شعراء از خود ہندوستانی روایات سے قریب ہوتے گئے۔ اُردو شاعری کا ہندوستانی مزاج بنتا گیا۔ اُس میں زبردست وطنیت آئی۔ سیاسی اور سماجی مسائل نے جگہ لی۔ اُردو شعراء نے خود کو بدلا۔ یہی نہیں بلکہ اِس طرف بڑے بڑے اُردو ادیبوں اور شاعروں نے زور بھی دیا۔ اب سے بہت عرصہ پہلے غالباً ۱۹۴۸ء کے آخر یا ۱۹۴۹ء کے شروع میں "شاعرؔ" ہی کے توسط سے میں نے اپنی طویل نظم "نیا ساز نیا انداز" کے ذریعہ اُردو شعراء سے عرض کیا تھا کہ اُنہیں اپنے وطن کی طرف زیادہ سے زیادہ متوجہ ہونے کی ضرورت ہے۔ قارئین شاعرؔ کی یاد تازہ کردینے کی غرض سے میں اِس نظم کے کچھ اشعار ذیل میں درج کررہا ہوں ؎

سخنورو! کِس طرف ہو آؤ، میں تم کو آواز دے رہا ہوں — تمہارے نغموں کے واسطے آج اِک نیا ساز دے رہا ہوں
تمہاری فکرِ سخن کی خاطر اِک اور انداز دے رہا ہوں — تمہارا ہر شعر تول اُٹھیگا، تمہیں وہ اعجاز دے رہا ہوں

شاعرِ ملّی

بلندیٔ فرشِ خاک پر آسماں کی رفعت نثار کردیں
دیارِ ہندوستان پہ آؤ، بہارِ جنّت نثار کردیں

نقوشِ ایلورا کے پتھروں پر کہ چشمِ گیتی میں خواب جیسے — قطب کی یہ لاٹ عزمِ آدم کی صورتِ کامیاب جیسے
یہ جامع مسجد کا حسنِ سادہ، دُعا کوئی مستجاب جیسے — یہ تاج - انساں کی حسن کاری اُلٹ رہی ہو نقاب جیسے

کمالِ فن کی کرشمہ سازی سے ایک اک رنگ بول اُٹھا ہے
نظر اجنتا کی سمت اُٹھاؤ، جہاں دلِ سنگ بول اُٹھا ہے

اُڑی ہے سنگم سے جب بھی خوشبو تو آبروئے ختن گئی ہے — ہنسی ہے جب رات مالوے کی تو روشنی دِل میں چھن گئی ہے
پٹھار ارضِ دکن کے ہیں یا نگاہِ محبوب تن گئی ہے — کوئی اماوس کی رات لہرا کے زلفِ بنگال بن گئی ہے

نگارِ دِلّی کی یہ سجاوٹ کتھاکلی کا ہو رُوپ جیسے
یہ لکھنؤ کی حسین شامیں گلابی جاڑے کی دُھوپ جیسے

یہ رُودِ سرجو ہے یا تقدّس کی آنچ میں رُوح گل گئی ہے — پوتر جمنا کے رُوپ میں بانسری کی اِک تان بہہ رہی ہے
یہ پاک گنگا کہ جس سے قلب و نظر کو آسودگی ملی ہے — ہماری دھرتی نے ہاتھ پھیلا کے ہم کو آشیرواد دی ہے

یہ لال قلعے کی سُرخ تعمیر، جم گیا ہو گُلال جیسے
ہمالیہ کی بلندیوں میں زمین کا ہو جلال جیسے

یہ دھان کی بالیاں کہ جس طرح کوئی نازک سی آرزو ہو — جھکے ہوئے خوشہ ہائے گندم کہ جیسے چشمِ بہانہ جُو ہو
یہ پھیلی بکھری ہوئی سی بیلیں کہ جیسے عاشق کی گفتگو ہو — یہ پھولی سرسوں کے کھیت، آنگن میں جیسے بیٹھی ہوئی بہو ہو

یہ کیاریاں ہیں کہ اک مصوّر کے شاہکاروں کا سلسلہ ہے
یہ کونپلیں ہیں کہ سینۂ آدمی میں جینے کا حوصلہ ہے

یہاں خیالوں کی جلوہ گاہوں میں امن کے دیپ جل چکے ہیں — یہاں نگاہوں کی بانسری سے خوشی کے نغمے اُبل چکے ہیں
دیارِ گوکل میں حسن و اُلفت کے سرمدی گیت پل چکے ہیں — یہ وہ زمیں ہے جہاں فضا میں غزل کے اشعار ڈھل چکے ہیں

فریب نے جب بھی سر اُٹھایا تو بھیم و ارجن چلے ہیں تن کر
جو ظلم کی کوئی آگ بھڑکی تو لوگ اُٹھے ہیں پرہلاد بن کر

یہاں بھرت کی سعید فطرت نے اِک کھڑاؤں سے لَو لگائی — یہاں جہانگیر کی عدالت میں شمعِ انصاف جگمگائی
یہ ہے زمینِ بلند و برتر، یہاں ہوئے راکھی بند بھائی — یہاں کرشن آ گئے مدد کو دروپدی پر جب آنچ آئی

لُٹے ہوئے گلستاں کے گوشوں میں اب بھی کچھ برگ و بار ہوں گے
دیارِ ہندوستاں میں ڈھونڈیں تو لاکھوں شرون کمار ہوں گے

ملے گا بدھ کے پیامِ حق میں وہی سکونِ حیات اب بھی — گیا کے ذرّے دکھا رہے ہیں جہاں کو راہِ نجات اب بھی
اجودھیا کی فضاؤں میں ہے وفائے سیتا کی بات اب بھی — مصیبتوں کے گھنیرے جنگل میں رام لچھمن ہیں ساتھ اب بھی

کریدو ماضی کی راکھ اس میں شعور کا جامِ جم ملے گا
انھیں روایات کے خزانے سے تم کو زورِ قلم ملے گا

شاعر بمبئی

وہی ادائیں ہیں گوپیوں کی تو کرشن کی بانسری وہی ہے — وفائے شاہجہاں نے کی تھی جو مرمریں شاعری وہی ہے
ہماری دھرتی کے ذرّے ذرّے میں پریت کی راگنی وہی ہے — پھٹا ہے پنجاب کا کلیجہ مگر لبوں پر ہنسی وہی ہے

انہیں میں موضوعِ نظم ڈھونڈو یہیں پہ مینارۂ ادب ہے
زمیں ہی مرکزِ سخن ہے، وطن ہی گہوارۂ ادب ہے

میں نے مسلمان شاعروں کو ہندو بن جانے کا مشورہ تو یقیناً نہیں دیا اور نہ دے ہی سکتا ہوں لیکن ہندوستان کی تہذیب و تمدّن، اس کے حسن و خوبصورتی اور ماضی کی تمام صحت مند روایتوں کی طرف جس سلیقے کے ساتھ اُردو شاعروں کو متوجہ کیا ہے اور ہندوستانی مہاپرشوں کی تقلید کرنے کے لئے جس شعور کے ساتھ اِشارے کئے ہیں وہ ہر مذہب کے ماننے والے کیلئے قابلِ قبول ہو سکتے ہیں۔ کیا اُردو شاعری پر اعتراض کرنے والے ایسی کوئی مثال "اپنے لوگوں" کے یہاں سے بھی پیش کر سکتے ہیں۔ صرف اِسی ایک نظم کی موجودگی میں یہ سوال ختم ہو جاتا ہے کہ اُردو شاعروں کو گنگا کیوں نہیں دِکھائی دیتی۔ کیا جمنا کے کنارے کوئی خوبصورت مقام ہی نہیں۔ ؟ کرشن کی لیلا نہیں دکھائی دیتی؟ وغیرہ وغیرہ۔ کم و بیش ہر نظم گو شاعر کے یہاں اُن تمام چیزوں کا ذکر موجود ہے، جن کی کمیابی کا رونا فرقہ پرست روتے ہیں اور اُردو شعر و ادب کے "بھارتیہ کرن" کا نامعقول نعرہ بلند کرتے ہیں۔

دجلہ اور فرات کے نام سے، طُور اور موسٰی کے ذکر سے برہمی اور بیزاری کا واحد سبب یہ ہے کہ اِن کا تعلق مسلمانوں سے ہے اور ان کا ذکر قرآنی قصّوں میں موجود ہے۔ فرقہ پرستی کے جذبات کو چند لمحوں کے لئے دِل سے نکال کر معترضین اگر غور کریں تو یہ بات اُن پر واضح ہو جائے گی کہ مُسلم ہو یا غیر مُسلم اُردو کے جس شاعر نے بھی دجلہ اور فرات کا ذکر کیا ہے۔ طور اور موسٰی کی بات کی ہے۔ یا حسینؑ اور یزید کا نام لیا ہے تو اُس نے صرف علامت اور اِشارے کے بطورِ استعمال کیا ہے، اِن کی مذہبی اہمیت اور اُن کا تقدّس مرثیوں، سلاموں اور نعتوں تک محدود ہے۔

جیسا کہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں۔ اب سے تیس پینتیس سال پہلے تک عربی اور فارسی زبانوں کی تعلیم عام تھی۔ ادیب و شاعر انہیں زبانوں کے ادب کا مطالعہ کرتے تھے اور اِن ہی علوم کی علامتوں، اِستعاروں اور اشاروں سے اپنی بزمِ سخن بھی آراستہ کرتے تھے، اِس میں ہندو اور مسلمان کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ آزادی سے قبل ہندی زبان کی تعلیم کہاں عام تھی؟ نہ اُردو اور فارسی زبانوں میں ایسی کتابیں موجود تھیں جن میں ہندوستان کے مہاپرشوں کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہو؟۔ پھر اُردو کے شاعر اور ادیب کے لئے ہندوستان کی قدیم تاریخ و تمدّن اور اہم شخصیتوں سے واقفیت کا ذریعہ کیا ہوتا جب آخر وہ کسی ایسی بات اور چیز کا ذکر کیونکر کرتے جس کے بارے میں اُنہیں پُوری آگاہی حاصل نہ تھی اور جس کی تفصیل اور پس منظر سے وہ بے خبر تھے۔ اِس دُشواری اور دقّت کے باوجود اُردو کے شعرا کسی زمانے اور کسی دَور میں بھی اپنے وطن اور وطن کی صحت مند روایات سے یکسر بیگانہ نہیں رہے ہیں۔ بہت سے ایسے مقالے اور مضامین شائع ہوئے ہیں جن میں تفصیل کے ساتھ اُردو شاعری میں ہندوستانی مزاج اور تہذیب و تمدّن کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اور بے شمار مثالوں کے ذریعے اُردو شعراء کے یہاں قدیم ہندوستان اور اس کی اہم شخصیتوں کی واضح جھلکیاں دکھائی گئی ہیں یہاں تک کہ میر انیس کے مرثیوں تک میں ہندوستانی رنگ و آہنگ اور رسم و رواج موجود پائے گئے ہیں۔ "اسلامی شاعر" اقبال تک کے یہاں رام اور رام تیرتھ پر نظمیں ملتی ہیں ؎

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا — وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

قسم کے بہت سے اشعار نظر آتے ہیں۔

میتھلی شرن گپت کا مجموعہ "کعبہ اور کربلا" دیکھنے والی نظریں مولانا حسرت موہانی کے یہاں "کرشن علیہ السلام" لکھا ہوا بھی دیکھ سکتی ہیں اور کرشن جی کے بارے میں مولانا مرحوم کے بے حد عقیدت مندانہ جذبات و خیالات بھی پڑھ سکتی ہیں۔ یہاں میں مولانا سیماب اکبر آبادی کی متعدد نظموں کا ذکر قصداً نہیں کر رہا ہوں کہ مرحوم نے کبھی اپنے "مولانا" اور "اسلامی شاعر" ہونے کی بات نہیں کی۔ اگر اُن کے یہاں بہت سے ہندوستانی مقدس مقامات اور مہاپرشوں پر نظمیں موجود ہیں تو کچھ زیادہ تعجب کی بات نہیں ہے۔ ساغر نظامی، حفیظ جالندھری، رَوِش صدیقی، احسان دانش، سلام مچھلی شہری، اعجاز صدیقی، رفعت سروش، نذیر بنارسی وغیرہ کتنے ہی شعرا کی شاعری میں ہندوستانیت رچی بسی ہوئی ہے۔

اب بات آپڑی ہے تو صرف اظہارِ واقعہ کے طور پر کہنا پڑ رہا ہے کہ چینی جارحیت کے زمانے میں صرف میں نے سترہ نظمیں لکھی تھیں۔ اور ہند و پاکستان کے تنازعہ سے متعلق اور دورانِ جنگ میں لکھی گئی میری نظموں کی تعداد تیس سے زائد ہے۔ اُردو شاعری میں حب الوطنی کے فقدان کا گلہ کرنے والے اور اسی قبیل کے دوسرے تمام معترضین باقاعدہ حساب لگا کر اچھی طرح چھان بین کر کے اور متعدد بار شمار کرنے کے بعد بتائیں کہ کیا ہندوستان کی کسی اور زبان کے دو چار شاعروں نے مل کر بھی اس سے زیادہ یا اتنی ہی نظمیں لکھی ہیں؟

گزشتہ اور موجودہ چھوٹے بڑے تمام دوسرے شعرا اور اُن کی بے شمار نظموں کا ذکر نہ کرتے ہوئے اگر میں صرف اپنی ہی نظموں کا ذکر کروں اور یہ بیان کرنے لگوں کہ ہندوستانی رسم و رواج، تہذیب و تمدن، صحت مندانہ روایات، مہاپرشوں کی زندگیوں کے مثالی واقعات اور اُن کے قابلِ تقلید کردار کو میں نے اپنی نظموں کے ذریعہ کِس کِس انداز اور کن کن زاویوں سے پیش کیا ہے تو "شاعر" کے تقریباً سارے صفحات گھیر سکتا ہوں۔ مگر نتیجہ معلوم ہے۔ اُردو کو بدیسی اور مسلمانوں کو غدار ثابت کرنے والے لوگ ہر واقعے اور ہر حقیقت کو جھٹلا دینے کی کوشش کرتے رہیں گے۔ اُردو کے اساتذہ، شعر و ادب کے ستونوں اور ممتاز ترین شعرا کے یہاں سبھی کچھ ہوتے ہوئے بھی جب "اُردو شاعری کے بھارتیہ کرن" کا نعرہ لگانے والوں کو کچھ بھی نظر نہ آسکا تو پھر بیچارہ ناز کس گنتی میں اور کِس شمار و قطار میں ہے جو انہیں یقین دلا سکے کہ اُس نے گنگا اور جمنا کے گیت بھی گائے ہیں اور ہمالیہ کی عظمتوں کا نغمہ بھی الاپا ہے۔ رام اور کرشن کے مثالی کرداروں کا ذکر بھی کیا ہے اور سیتا اور ساوتری کے قابلِ تقلید کارناموں کو بھی بیان کیا ہے۔ اپنی نظم "نیا ساز نیا انداز" کے چند بند نقل کر چکا ہوں اُن میں بہت کچھ موجود ہے، مزید ثبوت کے لئے میں اپنی ہی ایک نظم کا ذکر اور کر دینا چاہتا ہوں۔

جیسا کہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں اُردو میں تخلیق کئے جانے والے شعری ادب میں وہ تمام چیزیں اور وہ سارے تذکرے موجود ہیں جو محض "مسلم دشمنی" کی بناء پر فرقہ پرستوں کو نظر نہیں آرہے ہیں اور جن کے مفروضہ فقدان پر یہ حضرات بے حد چراغ پا ہیں۔ البتہ میں اِس قدر ضرور جاننے کو تیار ہوں کہ اُردو کے مسلمان شاعروں نے کرشن جی مہاراج، رام، ہنومان، بھرت، سیتا اور ساوتری وغیرہ کو خدا یا اُس کا اوتار سمجھ کر غیر انسانی کردار کی صورت میں کبھی پیش نہیں کیا۔ نہ مذکورہ مہاپرشوں کا ذکر کرتے ہوئے اُن کے تئیں پرستش اور بندگی کا اظہار کیا ہے۔ پرستش اور بندگی صرف خدا کے لئے ہے۔ عقیدت الگ چیز ہے اور بندگی الگ۔ ہر مذہب کے مہاپرش اور مقدس ہستیاں لائقِ عقیدت و احترام ہیں۔ مسلمان شعرا اپنے نبی آخرالزماںؐ کو بھی خدا کا پیغمبر سمجھتے ہیں، خدا نہیں۔ خود حضرت محمدؐ نے صاف اور واضح لفظوں میں فرما دیا تھا کہ "اے لوگو! میں بھی تمہاری ہی طرح ایک انسان ہوں۔" اُردو کے مسلمان شعرا کے برعکس سنسکرت اور ہندی کے (غالباً) تمام شاعروں نے ہندوستان کے مہاپرشوں کو صرف اوتار، بھگوان اور غیر انسانی کردار کی صورت میں پیش کیا ہے۔ سنسکرت اور ہندی کی نظموں میں ان لوگوں کا بیان سُن کر ہمارے دِلوں میں عقیدت اور ارادت کے جذبات تو ضرور پیدا ہو سکتے ہیں، اِن کو پوجنے اور ان کی پرستش کرنے کا خیال نہیں اُبھر سکتا۔ اُردو کے مسلمان شاعروں نے بھارتی مہاپرشوں اور اہم و عظیم ہستیوں کا ذکر تو ضرور کیا ہے لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، ہم نے اپنے شعر و ادب

میں اُنہیں اَوتار اور بھگوان بنا کر پیش نہیں کیا بلکہ ہم نے اُن کی مقدس زندگیوں کے اُنہیں واقعات اور کردار کے اُنہیں گوشوں کو اُجاگر کیا ہے جن سے ہمیں کوئی سبق ملتا ہے۔ اور جن کو عام حیاتِ اِنسانی قابلِ قبول سمجھ سکتی ہے۔

میں شروع میں اپنی نظم "نیا ساز نیا انداز" کے کچھ بند نقل کئے ہیں۔ "اُردو شاعری کے بھارتیہ کرن" پر زور دینے والے لوگ غور کریں۔ میں نے "عشق" کے مقابلے میں "سنگم" کو ترجیح دی ہے۔ ستر جو کو تقدس کی آنچ میں پگھلی ہوئی رُوح بتایا ہے۔ کرشن اور گوپیوں کی راس لیلا کو ذہن میں رکھتے ہوئے جمنا کو "بانسری کی ایک تان" سے تشبیہ دی ہے۔ گنگا کو وہ ہاتھ کہا ہے جو دُعا اور آشیرواد دینے کیلئے اُٹھتے اور پھیلتے ہیں۔ اور۔ میں نے موجودہ فریب، مکر اور جھوٹ کا مقابلہ کرنے کے لئے ہندوستانی عوام کو بھیم، ارجن اور پرہلاد جیسا بن جانے کا لطیف اِشارہ کیا ہے۔ میں نے بڑے بھائی کی عزت اور احترام کرنے کی غرض سے بھرت کے اُس واقعہ کی طرف اِشارہ کیا ہے جب رام چندر جی جنگل جانے کے لئے گھر سے نکل چکے تھے۔ بھرت جی اُنہیں واپس لانے کی ہر کوشش میں ناکام رہنے کے بعد اُن کے پیروں کی کھڑاؤں لے کر اجودھیا آئے اور راج سنگھاسن پر وہی رکھدی۔ (فرقہ پرست اگر سمجھ سکیں تو یہ واقعہ کا ذکر میں نے صرف اِس غرض سے کیا ہے کہ ہم اِس سے سبق سیکھیں۔ مسلمان اقلیت اپنی فطرت میں بھرت کی سعادت پیدا کرے اور ہندو اکثریت بڑے بھائی ہونے کی حیثیت سے اگر ضرورت پڑے تو رام چندر جی کی طرح چھوٹے بھائی کی حق میں تخت و تاج تک سے دستبردار ہو جائے۔) میری صرف اِسی ایک نظم میں پراچین بھارت کے بہت سے اہم اور معروف واقعوں اور کرداروں کا ذکر آگیا ہے۔

میں اپنی ایک اور نظم کے اشعار نقل کر رہا ہوں۔ دیکھئے، میں نے (ایک مسلمان نے) گیتا۔ مہابھارت اور رامائن کے بہت سے واقعات اور کرداروں کو کس طرح مثالی اور ہر لحاظ سے قابلِ تقلید و عمل نمونے بنا کر پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ میں نے بھارتی مہاپرشوں کو ایسے زاویئے سے پیش کیا ہے کہ نظم سننے کے بعد نہ تو کوئی ہندو اُنہیں "بھگوان" اور "اَوتار" کہہ کر آگے گزر سکتا ہے اور نہ کوئی مُسلمان یا عیسائی اُنہیں دوسرے مذہب والا کہہ کر اُن کی تقلید کرنے سے اِنکار کر سکتا ہے۔ اور۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی مذہبی شخصیت کا ذکر اُس کی بزرگی اور تقدس کے اِعتبار سے نہیں بلکہ صرف اُس کے بلند پایہ اِنسانی کردار کے پیش نظر کیا جانا چاہیئے تاکہ اُس کے عقیدے اور مذہب سے اختلاف رکھنے کے بعد بھی دوسرے ہمارے اِنسان اُسے اپنے لئے مشعلِ راہ بنا سکیں۔ میں نے اپنی نظم "ہم بھارت دیش کے باسی" میں یہی انداز اختیار کیا ہے ۔

زیست کو فرض کا احساس دیا کرتے ہیں — باپ کے حکم پہ بن باس لیا کرتے ہیں
سچ کو ہر دَور میں ہم زندہ کیا کرتے ہیں — پرہلاد آگ میں جل جل کے جیا کرتے ہیں

غلبۂ حق ہے یہاں فطرتِ اِنسانی پر
راجہ مجبور ہے مرگھٹ کی نگہبانی پر

("اُردو شاعری کا بھارتیہ کرن" چاہنے والے چنڈی گڑھ کے پروفیسر صاحب نے لکھا ہے۔ "ہرلیش چندر کی مذہب کی خاطر اُٹھائی گئی تکالیف اور مصیبتوں پر اُن کا (اُردو والوں کا) من نہیں پسیجا؟" جہاں تک مجھے علم ہے، راجہ ہرلیش چندر نے مذہب کے لئے نہیں بلکہ صرف اپنی سچائی اور اپنا قول پُورا کرنے کی غرض سے راج پاٹ چھوڑا تھا۔ اور بنارس کے گھاٹ پر مُردے جلانے کا کام اختیار کیا تھا۔ ہم اُردو کے شعراء اِسی ہرلیش چندر کی تقلید کرنے کا درس نہ صرف ہندوستانی عوام بلکہ ساری دُنیا کے اِنسانوں کو دیں گے۔)

بھارت ورش کی بڑائی، برتری، اور بزرگی ظاہر کرنے کے لئے اور ہر طبقے کے اِنسانوں کو سچائی اور فرض کی تبلیغ پر آمادہ کرنے

شاعر نظمی

غرض [illegible] نے اپنی نظم میں سری کرشن جی اور مہابھارت کا ذکر یوں کیا ہے ؎

یہاں "رگھو پان" بھی آئینِ بقا دیتا ہے عرصۂ ہند کا ہر ذرّہ صدا دیتا ہے
مہابھارت کا فسانہ یہ بتا دیتا ہے آن پر آدمی یاں جان لڑا دیتا ہے

تیرگی نور کی عظمت کو نہیں چھو سکتی
نگہہِ بد کسی عورت کو نہیں چھو سکتی

اسلحہ ہم نے لیا حق کو جتانے کے لئے گرم پیکار ہوئے حسن بڑھانے کے لئے
ہم لڑے بھی ہیں تو سیتا کو بچانے کے لئے جنگ اگر کی ہے تو کورو کو مٹانے کے لئے

نکلے میدان میں دل سوزی و رنجوری سے
ہم نے تلوار اٹھائی بڑی مجبوری سے

اُردو شاعری پر اعتراض کرنے والے غور فرمائیں کہ مہابھارت اور رام و راون کی جنگ کا حوالہ دے کر ہماری امن پسندی اور اہنسا وادی پر طنز کرنے والوں کو اردو کے ایک مسلمان شاعر نے کس قدر مسکت جواب دیا ہے۔ کیا ہماری راشٹر بھاشا والے اپنے یہاں سے بھی کوئی ایک ایسی مثال پیش کر سکتے ہیں۔ ؟ ؎

دے دیا کاٹ کے خود اپنا انگوٹھا ہم نے مان اس درجہ کیا اپنے گرو کا ہم نے
بڑے بھائی کے کھڑاؤں کو بھی پوجا ہم نے چھوٹے بھائی کے لئے راج کو چھوڑا ہم نے

ماضیٔ ہند کی تاریخ پہ ڈالیں جو نظر
اپنے قربان ہوں اس دیش کے سوتیلوں پر

اس بند کے ہر مصرعے میں ایک ایک اہم واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن کی تفصیل جاننے کے لئے ہندو میتھالوجی سے خاصی واقفیت ہونی چاہئے۔ مگر میں نے کسی بھی مصرعے پر مذہب کی چھاپ نہیں پڑنے دی ہے اور نہ کسی بھی عنوان سے یہ ظاہر ہونے پایا ہے کہ مذکورہ کارنامے مسلمان اور عیسائی کے نہیں بلکہ صرف ہندوؤں کے بزرگوں اور مہاپرشوں کے ہیں۔ میں نے صرف قدیم ہندوستان کے باشندوں کے ایسے کارنامے پیش کئے ہیں اور کردار کی وہ بلندیاں ظاہر کی ہیں جو ہر زمانے اور ہر دور کے عام انسانوں کے بس کی بات " رہے گی۔ اسی سلسلے میں یہ بند بھی خصوصی توجہ کے لائق ہے۔ اس میں میں نے جن کرداروں کو پیش کیا ہے، اگر ہندوستان کے عوام اپنے آپ کو ان ہی کرداروں کے سانچے میں ڈھال لیں تو ہمارے سارے دکھ، دلدر " دور ہو جائیں، واضح رہے کہ میں سبھوں کو ہندو بن جانے کا مشورہ ہرگز نہیں دے رہا ہوں۔ جیسا کہ بعض فرقہ پرست چاہتے ہیں ؎

کوئی بیٹا جو ہوا رام تو کوئی شروَن ہم میں بھائی ہے بھرت کوئی تو کوئی لچھمن
پیار کی آخری حد ہے دلِ رادھا کی لگن بیوی کے روپ میں سیتا کی وفاؤں کا چلن

عشقِ صادق کا ہم اس طرح پتا دیتے ہیں
چیر کر سینہ ہنومان دکھا دیتے ہیں

حیاتِ انسانی کے سارے قریبی رشتوں، بھائی، بیٹا، بیوی، محبوبہ اور دوست کے مثالی کرداروں کا ذکر مذکورہ بالا بند میں موجود ہے اور لطف یہ کہ ان میں سے کوئی بھی کردار نہ ایران کا ہے اور نہ عرب کا۔ کیا ہمارے "بھارتیائے" جانے کا نعرہ بلند کرنے والے خود اپنے آپ کو ان آئینوں میں کہیں دکھا سکتے ہیں ؟۔ ایک بند اور ؎

پیار ہی پیار ہر اک لَے، ہر اک آواز میں ہے حسن ہی حسن ہر اک پردۂ گہرِ راز میں ہے
رقص ہی رقص یہاں زیست کے انداز میں ہے نغمہ ہی نغمہ ہر اک دل میں ہر اک ساز میں ہے

شاعرِ عظیم

کبھی پربت پہ کبھی نیل گگن پر ناچے
موج میں آئے تو ہم ناگ کے پھن پر ناچے

مضمون طویل ہو چکا ہے اور ابھی کچھ اور باتیں بھی کرنی ہیں مگر۔ کیا کروں کہ ذہن میں میری ایک اور نظم بھی کُلبلانے لگی ہے۔ کسی تمہید، تشریح، یا تفسیر کے بغیر ہی میں اِس نظم کے بھی صرف تین بند نقل کر رہا ہوں۔ ہندوستان کے عظیم عوامی شاعر گوسوامی تلسی داس جی کی جینتی کے موقع پر اب سے دس سال پہلے میں نے یہ نظم لکھی تھی ؎

تسلیم ہے کہ شاعرِ معجز بیاں ہے تو — تسلیم ہے کہ نکتہ ور و نکتہ داں ہے تو
یہ اعتراف رہبرِ منزل نشاں ہے تو — اور یہ بھی اعتراف کہ حق کی زباں ہے تو
اِس درجہ جان کر بھی تجھے جانتے نہیں
یعنی ترے پیام کو ہم مانتے نہیں

ہم میں کوئی نہیں جو محبّت شعار ہو — ہندوستان کے خلوص کا آئینہ دار ہو
میدانِ زندگی میں جو مردانہ وار ہو — ہے کون؟ باپ کا جو اطاعت گزار ہو
سیتا کی پاکبازی کا ہم میں چلن نہیں
بھائی تو بے شمار، کوئی لکشمن نہیں

ہر موڑ پر حیات کا پیغام چاہیئے — علم و شعور آج سرِ عام چاہیئے
جھوٹے مگر میں سچ کا کہیں نام چاہیئے — راون تو ہر طرف ہیں ہمیں رام چاہیئے
تلسی! ابھی حیاتِ بشر ہے اسیرِ غم
پھر کس طرح کہیں کہ تجھے جانتے ہیں ہم!

اُردو نے کم و بیش ہر ہندوستانی مذہب کی اہم شخصیتوں کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اور اپنی مختصر سی عمر میں جس بے پناہ رُوا داری اور وسیع النظری کا ثبوت دیا ہے اُس کا عشرِ عشیر بھی ہندوستان کی کسی دوسری زبان میں نہیں مل سکتا۔ اُردو پر صرف عرب اور ایران کے گیت گانے اور "قرآنی حصّے" بیان کرنے کا الزام لگانے والے کورچشم ہیں۔ سطورِ بالا میں مَیں نے اپنی صرف تین ہی نظموں کے اقتباسات درج کئے ہیں۔ طوالت کا خوف مانع ہے ورنہ میں اپنی ہی پچیسوں نظموں اور سیکڑوں اشعار کی مثالیں پیش کرتا۔ دوسرے بہت سے شعراء کی ڈھیر ساری نظموں کا ذکر کرنا تو ایک ضخیم کتاب کا لکھنا ہے۔

ایک شعر

ہماری طرح کون اپنا لہو دے گا چراغوں کو؟
ہمارے بعد محفل میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے!

اعجاز صدیقی

(ہمیں فریب کہ ہم ہیں چراغِ آخرِ شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے)

جاں نثار اختر

فرصتِ کار فقط چار گھڑی ہے یارو
یہ نہ سوچو کہ ابھی عمر پڑی ہے یارو

اپنے تاریک مکانوں سے تو باہر جھانکو
زندگی شمع لیئے در پہ کھڑی ہے یارو

ہم نے صدیوں انھیں ذرّوں سے محبت کی ہے
چاند تاروں سے تو کل آنکھ لڑی ہے یارو

کس کی دہلیز پہ لے جاکے سجائیں اس کو
بیچ رستے میں کوئی لاش پڑی ہے یارو

فاصلہ چند قدم کا ہے، منا لیں چل کے
صبح آئی ہے، مگر دور کھڑی ہے یارو

اُن کے بن جی کے دکھا دیں گے اُنھیں، یُونہی سہی
بات اتنی ہے کہ ضد آن پڑی ہے یارو

جب بھی چاہیں گے، زمانے کو بدل ڈالیں گے،
صرف کہنے کے لیئے بات بڑی ہے یارو!

اکرام جاوید

مجھے جانے دو!

محبتوں اور نفرتوں کی نیم روشن نیم تاریک فضاؤں میں غبارِ کہکشاں کی طرح بکھرا ہوا زندگی کا راستہ حدِ نظر تک دراز ہے۔ اور میں اس اکیلے اُداس راستے کا ایک تنہا اُداس مسافر ہوں۔ میرے ہوش و حواس کا عالم عجیب اور نا قابلِ بیان ہے۔ میں سوچ بھی رہا ہوں اور کچھ بھی سوچ نہیں رہا ہوں۔ یہ فیصلہ دشوار ہے کہ میرا کوئی حقیقی وجود بھی ہے یا نہیں -!

"اسے دیکھئے کتنے بجے ہوں گے؟

میرے قدم خود بخود رُک جاتے ہیں۔ میں حیران و ششدر سا آواز کی طرف دیکھنے لگتا ہوں۔ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ وہ آواز اندھیروں میں نور کی ایک لکیر بناتی ہوئی کہیں گم ہو گئی ہے۔ ایک طوفان سا میرے دل و دماغ میں ابھر آیا ہے۔ رنگوں کے سیلاب میں ڈوبتے اُبھرتے زاویوں، قوسوں اور دائروں کے پس منظر سے کوئی پری سا چہرہ جھانک رہا ہے۔ یاد کرتا ہوں تو یاد نہیں آتا۔ اپنی حالت پر ہنسی آتی ہے کہ زندگی بھر جسے یاد رکھنے کا دعویٰ تھا، اس کی صورت تک بھول گیا۔ لمحات سے رواں دواں دریا کے کنارے کھڑی ہوئی وہ حیران اور منتظر آواز ایک درد بھری سسکی کی صورت میں اُبھر کر ڈوب جاتی ہے۔ میری روح کے ایوانوں میں سناٹا سا چھا جاتا ہے -!

جوانی کے طوفانی دیوانی دور کی، محبت کے گلشن کی پہلی کلی جو مرجھا کر مسکائی، پھول بنی اور ذہن میں تصورِ گل کے نقوش چھوڑ کر معدوم ہو گئی۔ پہلی محبت، پہلی عورت، درد کے جام کا پہلا گھونٹ، صلیب پر شوق کی جانے والی پہلی کیل۔ شاید تم نے سچ ہی کہا تھا۔ تم سے جدا ہو کر زندہ رہنا بہت آسان تھا۔ بے حد سہل۔ ہاں گھاؤ بہت گہرا تھا۔ کسک اب بھی باقی ہے -!

"سنو۔ تم مجھے ہر وقت کیوں گھورتے رہتے ہو؟"

"کون؟"

اندھیری فضا میں کوئی جگنو چمک اٹھا ہے۔ دل میں نرم نرم سی آنچ سُلگ گئی ہے۔ برف پگھل رہی ہے۔ کالج کے زمانے کی ایک خوبصورت یادِ بے شبانہ۔ زندگی میں تم سے صرف تمنا کہنے کی جرأت نہ ہو سکی وہ دیوانہ تمہارے بعد سارے زمانے کو قصۂ غم سناتا پھرا۔ حکایت تمہارے لب و رخسار کی، تغافل تمہارے حسنِ جہاں سوز کا، بے خبری تمہارے معصوم دل کی -!

"ایک آسمان پر ایک ستارہ ٹوٹ گیا ہے۔ چنگاریاں سی خلا میں اُڑ رہی ہیں۔ دل میں شعلے بھڑک اٹھے ہیں مجھے زندگی بھر تم سے شکایت رہے گی۔ تم نے اپنی شادی میں مجھے کیوں نہیں بلایا؟"

تمہارا شکوہ سر آنکھوں پہ نازنین، تم میری ندامت کا شاید اندازہ کر سکتی ہو۔ خاموش محبت کا مختصر سا افسانہ مجسم چاندنی، ہمدرد اور خلیق نازنین، تم نے بڑا ستم کیا۔ میرے ضبط کا کچھ اس طرح امتحان لیا۔ اور اپنے رازِ دل کو اس طرح نہاں رکھا کہ ہمارے درمیان ناقابلِ عبور فاصلے حائل ہو گئے۔

اے خالقِ جدائی۔ لذتِ درد کے خزانے لٹانے والی فنکارہ تم آج مجھ ہی سے شکوہ سنج ہو کر میں نے تمہیں اپنی شادی میں نہیں بلایا۔ تم کھل نہیں پوچھتیں کہ آخر میں نے شادی ہی کیوں کی؟ تم اگر اپنے آپ کو غلط کار نہیں مان سکتیں تو مجھے کیوں الزام دیتی ہو۔ شادی ایک سماجی ضرورت ہے۔ زندگی کی ایک شرط۔ اس طرح میں نے ایک شرط پوری کی۔ اور تم نے بھی رسم دنیا نبا ہی۔ پھر یہ دل میں درد سا کیوں اُبھرتا ہے۔ یہ خلش سی کیوں ہوتی ہے۔ آنکھوں کی نمی کا مطلب کیا ہے؟ تم کو مجھ سے بہر حال جدا ہونا تھا۔ اور تم مجھ سے جدا ہو گئیں۔ میں نے جام زہر پی لیا۔ چاکِ گریباں سی لیا، لبوں پر مہرِ خموشی ثبت کر دی۔!

"میں تمہاری ہوں۔ تمہاری رہوں گی۔ جانتی ہوں تم میرے نہیں ہو سکتے۔ لیکن میں تمہاری رہوں گی، زندگی بھر اور اس کے بعد بھی۔ چاند میرا نہیں ہو سکتا۔ لیکن چاندنی تو میری ہے؟ آمر بیل کی طرح میرے جذباتی وجود پر پھیل جانے والی بیاور ایک مکمل وجود رکھتے ہوئے خوابوں کی طرح غیر مرئی، خوشبو کی طرح غیر پابند اور ہوا کے جھونکے کی طرح آزاد۔ محبت میرا وجود رکھنے والی نزہت۔ اب تو تمہیں یقین آگیا ہوگا کہ تم مجھے بھول بھی سکتی ہو۔ مجھ سے، میرے خیال سے غافل بہت خوش اور مطمئن بھی رہ سکتی ہو۔ ایک درد کے سوا کیا تھا میرے پاس تمہیں دینے کیلئے، تم سے لینے کیلئے۔ تمہارا محبوب فنکار واقعی تہی دست رہا سرد سا نکلا۔!

ایک سسکی، ایک کراہ، ہوا کا ایک جھونکا، خوشبو کی ایک لہر اور بس۔ پھر اکیلی سنسان راہیں، نیم روشن، نیم تاریک فضا۔

"تم آج پھر اکیلے ہو؟"

چلتے چلتے میں ایک دم لڑکھڑا سا جاتا ہوں۔ ایک نورانی غبار سا ہر طرف پھیل جاتا ہے۔ میرے وجود کے کھلے دروازے سے ایک جانا پہچانا خوبصورت چہرہ جھانکنے لگتا ہے۔

"تم کو سہارے کی ضرورت تھی میں نے سہارا دیدیا۔ دل مگر پرایا ہے تم کو بھلا کیسے سکتی ہوں؟"

"ٹھیک ہے نسرین۔ پھر مجھے مرجانے دو۔ مجھے سہارے کی نہیں تمہارے دل کی ضرورت ہے۔ مجھے پہچانو نسرین۔ جس طرح میں تمہیں پہچان گیا ہوں۔ تم میری صدیوں کی تلاش ہو۔ تم میری محبت کی منزل ہو۔ میری زندگی ہو۔"

ایک کرب افزا خاموشی، جان لیوا سکوت، پھر نسرین کی آواز کا نغمہ اُبھرتا ہے۔

"میں نے اپنا سب کچھ تمہیں دیدیا۔ اپنا جسم، اپنی جان، اپنی عزت و آبرو، اپنا ماضی و حال۔ اپنی خوشیاں اور غم۔ سب کچھ تمہیں دے دیا۔ میں بہت خوش ہوں۔ بہت مطمئن ہوں۔ مجھے اب دنیا میں کچھ نہیں چاہیئے۔!"

اور آج تم مجھ سے سیکڑوں میل دُور ایک متمول و متمدن مغربی ملک میں بہت خوش اور آسودہ ہو۔ تم نے اپنی منزل پالی۔ تم کو تمہاری زندگی مل گئی۔ اور میں جو کبھی تمہارا سب کچھ تھا۔ جسے تم اپنا مجازی خدا مان چکی تھیں، صد ہزار ندامتوں کے داغ لئے رسوا سر بازار ہوا۔ میں نے اپنی دوسری بیوی کی حیثیت میں تمہیں قبول کیا تھا۔ رفاقت کے اس عہد و پیمان کی کوئی سماجی، مذہبی اور قانونی حیثیت ہو یا نہ ہو، میں اس عہد پہ دل کی تمام تر صداقتوں

کے ساتھ آخری وقت تک قائم رہا۔ پھر بھی عہد شکن ٹھہرا، فریبی اور دھوکہ باز ثابت ہوا۔ محبت میں کس نے بیوفائی کی، کس نے کسے ٹھکرایا۔ کون گمراہ ہوا۔ کس کے قدم لڑکھڑائے، اب ان باتوں کے ذکر سے حاصل۔ مجھ پر الزام ہے بے وفائی ہے، تہمت آوارگی و بدچلنی ہے دنیا بھر کی تہمتوں، رسوائیوں اور نفرتوں سے میں سمجھوتہ کر چکا ہوں نسرین۔ آگے پیچھے، دائیں بائیں اوپر نیچے کچھ نہیں رہا ہے، نہ کوئی رشتہ، نہ کوئی ناطہ، نہ کوئی جذبہ، نہ کوئی احساس۔ تمنا اور مطلب سے بے نیاز، رنج و راحت کی فکر سے بے پروا، مطلب و مقصد حیات سے بے نیاز۔ تاریک خلا میں تنہا اکیلا۔ مجھے چھوڑ دو۔ آواز نہ دو۔ مت روکو۔ مجھے جانے دو۔ چلا جانے دو۔!

زندگی کے لمبے اکیلے راستے کا تنہا، مایوس اور دل شکستہ مسافر آوازوں کے بھنور میں ہچکولے کھاتا ہوا ابھر رہا ہے۔ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں! اس شکستہ ویران زندگی کو کہاں لے جاؤں! دنیا میں زندہ ہوں تو آخر کیوں! کس کے لئے؟ کون ہے جو یہاں واقعی میرا ہے؟ بے کار وجود، بے معنی زندگی۔ اب مزید جینے کی حماقت کیوں کروں!

"بابا آگئے۔ میرے بابا آگئے۔!"

میرے قدم خود بخود رک گئے ہیں۔ آوازوں کے طوفان میں ایک ننھی معصوم آواز جانے کہاں خاموش کھڑی تھی۔ میرے منے، میرے لاڈلے، میری روح کے ٹوٹے ہوئے تارے۔ زندگی میں تیری محبت اور رفاقت کا غم بھی ملا۔ تین سال تیرہ دن کی معصوم رفاقت کا ایک ایک لمحہ سلگتا ہوا انگارہ بن کر میری روح سے چمٹ گیا ہے۔ بے مہر، خود غرض کاروباری دنیا میں ٹوٹے ہوئے دل کا تو ایک سہارا تھا۔ تو نے مجھے نئی زندگی دی تھی۔ جینے کی خواہش کو بیدار کیا تھا۔ دل کے ہر سہارے کی طرح تیرا سہارا بھی مگر ٹوٹ گیا۔ یوں اچانک تو مجھ سے جدا ہوا، حقیقت سے خواب بن گیا۔ مجھے اب بھی تیری موت کا یقین نہیں آتا۔ تین سال تیرہ دن بھی کوئی مرنے کی عمر ہوتی ہے۔ تو چلا گیا۔ میرا کھلونا ٹوٹ گیا۔ میرا آخری سرمایۂ حیات بھی لٹ گیا۔ وقت بیکار گیا، عمر رائیگاں گذری۔ میرے ننھے مسافر۔ مجھ سے پہلے ہی تو اپنی منزل پر پہنچ گیا۔ آج اگر تو ہوتا ——— آج اگر تو ہوتا ——— ایک صحت مند جوان اور خوبرو انسان ہوتا۔ میرا درخشاں مستقبل۔ میری زندگی کا حاصل ہوتا ——— اجنبی دنیا میں خونخوار انسانوں کے درمیان میں اس قدر تنہا اور بے بس نہ ہوتا۔

"بابا۔" اندھیرے میں آواز کی روشنی سی پھیل جاتی ہے۔ نور کی ہلکی سی کرن دھیرے دھیرے میرے دل کے سیاہ خانے کو منور کر دیتی ہے۔

"بابا۔ میں آپ سے جدا کہاں ہوا ہوں۔ کیا دنیا کے ان گنت معصوم بچوں میں آپ مجھے نہیں دیکھ سکتے؟ میں آپ کے ساتھ ہوں مجھے پہچانئے۔ میرے لئے دنیا کو خوبصورت بنا دیجئے۔ میرے کھلونوں کو، پھولوں اور مٹھائیوں کو، زندگی کے حسن کو محفوظ رکھئے۔ مجھے میرا مستقبل دیدیجئے۔ بابا۔ میرے لئے آپ کو بہت کچھ کرنا ہے۔ میں جو آپ کی زندگی ہوں۔ آپ کا مستقبل ہوں مجھے بچا لیجئے بابا ——— !"

حیرت، ندامت اور احساس جرم سے میری حالت عجیب ہو رہی ہے۔ اپنے مایوس اور محدود خیالوں پہ بہت شرمندہ ہو رہا ہوں۔ میری راہوں میں صد ہزار سورج اُگ آئے ہیں۔ اب اندھیرا نہیں ہے۔ تاریکی نہیں ہے۔!

خوبصورت آوازو۔ اندھیروں کی اوٹ سے مجھے مت پکارو۔ دل میں احساس ناکامی اور محرومی کا زہر مت گھولو مجھے جانے دو۔ حسن کی تلاش میں، فردوس گمشدہ کی بازیافت کیلئے مجھے آج کے بچے اور کل کے نئے انسان کے لئے ایک نئی دنیا بنانی ہے۔ نئی دنیا، اور سازگار ماحول میرے پیاروں کیلئے، میری روح کے چاند ستاروں کے لئے۔ مجھے مت روکو۔ مجھے جانے دو۔ جانے دو ——— !

بشر نواز

ایک نظم "اُس" کے نام

مگر تم نے اِس درد کے ذائقے کو چکھا ہی نہیں ہے
کہو تم ہی پھر تم کو سمجھاؤں کیسے، کہ اِس تلخ لذّت میں کتنا مزہ ہے۔
ٹھٹھرتی ہوئی برف باری کی راتوں میں جلتے الاؤ کی قیمت سے تم آشنا ہی نہیں ہو۔
تمہیں سوچ آتی ہے کڑوے کسیلے دُھویں! اس کے بخشے ہوئے کھارے پانی کے قطروں سے رنگوں کی دیوار ڈھ جائیگی
اور دیوار کی موت، اُس آگ کو جس پہ تم نے تمنّا کی لاشوں کے پہرے بٹھائے رکھے ہیں
خدا جانے کس طرح آزاد کر دے۔

تمہیں آگ کا، اپنے دامن کا اور تجربے کے نتیجے کا ڈر ہے۔
ابھی تم دہکتے ہوئے سُرخ شعلوں کی میٹھی تمازت، لپکتی ہوئی آنچ کی نرمیوں،
خُوں کی گردش میں آہستہ آہستہ گھلتی ہوئی بجلیوں کے پُر اَسرار جادو سے واقف نہیں ہو۔

مری بات مانو،
اِنھیں سُرخ شعلوں میں میری تمہاری مسرّت چھُپی ہے
اُٹھو،
منتظر ساعتوں کا وطن کب سے سُنسان ہے، غیر آباد ہے!

فرحت کیفی

ایک سوال؟
(ترائیلے)

ترے دِل کا صحرا، تصوّر کا جنگل، ابھی تک ہے ویراں
تمنّا کے سُورج نے آواز دی ہے، تجھے کچھ خبر ہے؟
کبھی تُو نے سوچا کہ تُو اِسقدر کس لیئے ہے پریشاں
ترے دِل کا صحرا، تصوّر کا جنگل، ابھی تک ہے ویراں
نہ بادِ صَبا ہے نہ بُوئے وفا ہے نہ گُھٹائے خنداں
یہ کیا بے نیازی ہے، کیسی اُداسی ہے، کیسی ڈگر ہے
ترے دِل کا صحرا، تصوّر کا جنگل، ابھی تک ہے ویراں
تمنّا کے سُورج نے آواز دی ہے، تجھے کچھ خبر ہے؟

ڈاکٹر ابو محمد سحر

نسخۂ بھوپال بخطِ غالب پر ایک نظر

(گزشتہ سے پیوستہ)

(۵)

اِس مخطوطے کے تقدّمِ زمانی کی بنا پر اُن غلط فہمیوں سے بچنا بھی ضروری ہے کہ نسخۂ بھوپال اِس کا مُبیّضہ یا ترقی یافتہ شکل تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اِس کا اکثر کلام اور بعض ترمیمیں نسخۂ بھوپال میں ملتی ہیں لیکن دونوں نسخوں میں اِس قسم کی مماثلتوں سے زیادہ اختلافات اہم ہیں۔ اِن کی وجہ سے دونوں میں مسوّدے اور مبیّضے کا رِشتہ تو قائم ہی نہیں ہوتا، ترقی یافتہ شکل کہنا بھی کوئی خاص معنی نہیں رکھتا۔ مختلف نسخوں کے اختلافات اور درمیانی کڑیوں کو اگر اسی طرح حذف کر دیا جائے تو غالب کے متداول دیوان کو بھی اِسی مخطوطے کی ترقی یافتہ شکل کہا جا سکتا ہے۔

مخطوطے کی کیفیت سے یہ بالکل واضح ہے کہ اِس پر نظرِ ثانی کا عمل ہوا ہے اور پھر دوسرا نسخہ تیار کیا گیا ہے۔ ورق ۲۸ الف پر غالب کی لکھی ہوئی یادداشتوں "تا ایں جا نوِشتہ ام" اور "از ایں جا شروع" سے یقین ہوتا ہے کہ یہ دوسرا نسخہ بھی خود غالب نے لکھا تھا۔ مخطوطے کی اکثر غزلوں پر صاد بظاہر ان غزلوں کو نقل کرنے کے بعد اس لئے بنایا گیا ہے کہ نقل میں تکرار نہ ہو جائے۔ ممکن ہے یہ دوسرا نسخہ اُسی "دیوانِ دوّمی" کا مسوّدہ ہو، جس کا کلکتہ کے قیام کے دَوران کے دو خطوط میں غالب نے سات سال پہلے مرتّب ہونا بیان کیا ہے۔ اُس کی کوئی نقل اُنہوں نے اپنے مقدّمے کے سلسلے میں اپنی شخصیت کے بارے میں کچھ غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لئے آخر کے ورق پر اپنے نام و عُرف کی ۱۲۳۱ھ کی مُہر چسپاں کر کے اہلِ دفتر کو پیش کی تھی۔[۱] اِس دیوان کی تیاری کا زمانہ وہی قرار پاتا ہے جو نسخۂ بھوپال کی تیاری کا تھا۔ افسوس ہے کہ اب تک اِس کا صحیح علم نہیں ہو سکا۔ کہ نسخۂ بھوپال نواب فوجدار محمد خان کی ملکیت میں کس طرح اور کہاں سے آیا تھا۔ چونکہ ایک دیوان کی ایک سے زائد نقلیں ہو سکتی ہیں۔ اِس لئے ضروری نہیں کہ غالب نے اہلِ دفتر کو نسخۂ بھوپال ہی پیش کیا ہو لیکن گمانِ غالب ہے کہ نسخۂ بھوپال اِسی "دیوانِ دوّمی" کی نقل تھا۔

نسخۂ بھوپال براہِ راست نسخۂ بھوپال بخطِ غالب سے نقل نہیں ہوا بلکہ درمیان میں ایک اور مسوّدہ تیار ہوا۔ یہ بھی

---

[۱] تفصیل کے لئے دیکھئے غالب کا دریافت طلب مخطوطۂ دیوانِ اردو، نسخۂ کلکتہ از اکبر علی خاں، تحریک، ستمبر ۱۹۶۹ء ص ۱۷-۱۸ — مجھے اکبر علی خاں صاحب کے اِس قیاس سے اتفاق نہیں کہ غالب نے دیوان عدالت میں داخل کیا تھا۔ گمان غالب ہے کہ اہلِ دفتر کو دیوان دکھا کر غلط فہمی دُور کر دی ہو گی۔

پہلے دیوان یا دیوان کے پہلے نسخے کی طرح نظرِ ثانی اور ترمیموں اور اضافوں کے مراحل سے گزرا، اور اکثر مندرجات کے اشتراک کے باوجود اس کی آخری شکل اپنی اصل سے کافی مختلف ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ نسخۂ بھوپال بخطِ غالب اور نسخۂ بھوپال میں وصل و فصل دونوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ سب سے پہلا فرق تو کلام کی کمی بیشی ہے جس کا ذکر اس مضمون میں ایک اور موقع پر کیا جا چکا ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ کئی غزلیں اور متفرق اشعار اول الذکر میں قلمزد نہ ہونے کے باوجود موخر الذکر میں شامل نہیں کئے گئے تھے۔ مثلاً یہ غزلیں ؂

(۱) وہ فلک رتبہ کہ بر توسنِ چالاک چڑھا۔

(۲) خط جو رُخ پر جانشینِ ہالۂ مہ ہو گیا۔

(۳) اُس قامتِ رعنا کی جہاں جلوہ گری ہے۔ (اس غزل پر صاد بھی ہے)

تیسرا فرق یہ ہے کہ اول الذکر کی یہ ایک قلمزد غزل موخر الذکر میں شامل تھی: ۔

"اے خیالِ وصل نادر ہے مے آشامی تری"

چوتھا فرق یہ ہے کہ ردیف الف، ن اور ی کی غزلوں کی ترتیب بہت زیادہ مختلف تھی مثلاً ردیف میں نسخۂ بھوپال بخطِ غالب کی غزل ۱۵۱ نسخۂ بھوپال میں ۲۴ پر، ردیف ن کی غزل ۱۱۴، ۱۳۵ پر اور ردیف ی کی غزل ۱۳۱، ۲۴۹ پر درج ہوئی تھی۔ دیگر ردیفوں کی غزل کی ترتیب میں اختلاف اس لئے بہت کم تھا کہ ان کی تعداد میں برائے نام اضافہ ہوا تھا۔

پانچواں فرق یہ ہے کہ حاشئے کی تیرہ غزلوں میں سے صرف تین غزلیں نسخۂ بھوپال کے متن میں اور چھ غزلیں نسخۂ بھوپال کے حاشیوں اور آخر کے اوراق میں موجود تھیں اور باقی چار غزلوں میں سے تین نسخۂ بھوپال کو پھلانگ کر نسخۂ شیرانی میں پہنچ گئی ہیں۔ ایک غزل دیوانِ غالب کے کسی نسخے میں نہیں ہے۔

چھٹا فرق اختلافِ متن سے متعلق ہے جس کی حسبِ ذیل تین نوعیتیں قابلِ ذکر ہیں: ۔

(۱) نسخۂ بھوپال بخطِ غالب میں ترمیم کی گئی لیکن یہ نسخۂ بھوپال میں منتقل نہیں ہوئی بلکہ اولین متن بحال رہا۔ مثلاً: ۔

(الف) نسخۂ بھوپال بخطِ غالب:

نہ دیکھیں روئے یک دل سرد غیر از شمع کافوری
خدایا اس قدر بزمِ اسد گرمِ تماشا ہو
خدایا بزمِ غالب اس قدر گرمِ تماشا ہو

نسخۂ بھوپال:

نہ دیکھیں روئے یک دل سرد غیر از شمع کافوری
خدایا اس قدر بزمِ اسد گرمِ تماشا ہو

(ب) نسخۂ بھوپال بخطِ غالب:

اسد مایوس مت ہو گرچہ رونے میں اثر کم ہے
نہ ہو مایوس غالب گرچہ رونے میں اثر کم ہے
توقع ہے کہ بعد از زاریٔ بسیار ہو پیدا

نسخۂ بھوپال:

لہ نقوش غالب نمبر حصّۂ دوم، تصریحات، ص ۱۰۱ میں لکھا ہے۔ "نہ ہو مایوس اب ہو لکھا تھا اسے نہ ہو مایوس غالب بنایا ہے اور ہو قلمزد کرنے سے رہ گیا ہے۔" لیکن یہ صحیح نہیں۔ دراصل اسد کی جگہ چھوڑ کر پہلے "مایوس مت ہو" لکھا تھا۔ اس میں خالی جگہ میں "نہ ہو" لکھ کر "مت" کو "غالب" بنایا ہے اور "ہو" قلمزد ہونے سے رہ گیا ہے۔

اسدؔ مایوس مت ہو گرچہ رونے میں اثر کم ہے — کہ غالب ہے کہ بعد از زاریِ بسیار ہو پیدا

(۲) نسخۂ بھوپال بخطِ غالب میں ترمیم کی گئی لیکن اس کے بجائے نسخۂ بھوپال میں دوسرا متن لکھا گیا۔ مثلاً :-

(الف) نسخۂ بھوپال بخطِ غالب :

وہ نفس ہوں کہ اسدؔ زمزمۂ فرصت نے — رشتہ بر سازِ پئے نغمۂ بیدل باندھا

وہ نفس ہوں کہ اسدؔ مطربِ دل نے مجھ سے — سازِ پر رشتہ پئے نغمۂ بیدل باندھا

نسخۂ بھوپال :

مطربِ دل نے مرے تارِ نفس سے غالبؔ — ساز پر رشتہ پئے نغمۂ بیدل باندھا

(ب) نسخۂ بھوپال بخطِ غالب :

از بس کہ اشک سوکھ گئے چشم میں اسدؔ

غالبؔ زبس کہ سوکھ گئے اشک چشم میں — آنسو کی بوند گوہرِ نایاب ہو گئی

نسخۂ بھوپال :

غالبؔ زبس کہ سوکھ گئے چشم میں سرشک — آنسو کی بوند گوہرِ نایاب ہو گئی

(۳) نسخۂ بھوپال بخطِ غالب میں ترمیم نہیں کی گئی لیکن نسخۂ بھوپال میں دوسرا متن درج کیا گیا :-

(الف) نسخۂ بھوپال بخطِ غالب :

ترے سروِ رعنا سے یک قدِ آدم — قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

نسخۂ بھوپال :

ترے سرو قامت سے اک قدِ آدم — قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

(ب) نسخۂ بھوپال بخطِ غالب :-

تغافل مشربی سے ناتمامی بسکہ پیدا ہے — نگاہِ مست در چشمِ بتاں زنّار مینا ہے

نسخۂ بھوپال :-

تغافل مشربی سے ناتمامی بسکہ پیدا ہے — نگاہِ ناز چشمِ یار میں زنّار مینا ہے

اِن شواہد سے صاف ظاہر ہے کہ نسخۂ بھوپال بخطِ غالب کے بعد دیوانِ غالب کا جو دوسرا مسودہ تیار ہوا تھا وہ ترمیم و تنسیخ اور نئے کلام کے اضافے کی وجہ سے خود اپنی ایک انفرادیت اختیار کر گیا تھا۔ چونکہ نسخۂ بھوپال اس سے نقل ہوا تھا۔ اس لئے قدرتی طور پر کلام کی مقدار اور نوعیت دونوں کے اعتبار سے وہ نسخۂ بھوپال بخطِ غالب سے کافی مختلف ہوگیا۔ لیکن دیوان کے دوسرے مسودے اور اس کے مبیضے یا مبیضوں کی تیاری کے بعد نسخۂ بھوپال بخطِ غالب بیاض کے طور پر خود غالب یا اُن کے کسی دوست کے پاس محفوظ رہا۔ چنانچہ اسکے حاشیوں پر وقتاً فوقتاً تیرہ نئی غزلیں بھی درج ہوئیں۔ یہ غزلیں اس نسخے سے نسخۂ شیرانی کی تک سارے کلام پر مشتمل نہیں ہیں۔ اِن میں سے تین جو نسخۂ بھوپال کے متن میں شامل ہیں نسبتاً قریبی زمانے کی ہیں۔ تو نسخۂ بھوپال (۱۲۳۷ھ / ۱۸۲۱ء) اور نسخۂ شیرانی (غالباً ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۶ء) کے درمیانی زمانے کی ہیں[1]۔

---

[1] دیکھیے غالبؔ کا خود نوشت دیوان از ڈاکٹر گیان چند، ہماری زبان علی گڑھ، ۸ نومبر ۱۹۶۹ء، ص ۴، ۵

حاشیئے کی ایک غزل "سمجھاؤ اسے یہ وضع چھوڑے" کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کب لکھی گئی کیونکہ کسی اور نسخے میں درج نہیں ہوئی۔

(۶)

نسخۂ بھوپال بخطِ غالب کے ترقیمے سے بالواسطہ یہ پتہ چلتا ہے کہ غالب نے اِس دیوان کی تسوید کے بعد بیدل کے رنگ میں مزید شاعری کی تھی لیکن کلام سے اِس کا ثبوت نہیں ملتا۔ بیدلانہ رنگ کی نئی غزلیں اِس مخطوطے کے حاشیوں پر درج ہو سکتی تھیں لیکن اِس کے حاشیوں کی کسی غزل میں بیدل کا رنگ نہیں ہے۔ تیرہ میں سے بارہ غزلیں غالب کی معروف غزلیں ہیں۔ اور ان کے گہرے انفرادی رنگ میں ہیں۔ ایک غزل جو کسی اور نسخے میں نہیں ہے خود اُن کے رنگ سے مختلف اور گری ہوئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے :-

سمجھاؤ اُسے یہ وضع چھوڑے — جو چاہے کرے پہ دل نہ توڑے
تقریر کا اُس کے حال مت پوچھ — معنی ہیں بہت و لفظ تھوڑے
نذرِ مژہ کر دل و جگر کو — چہرے ہی سے جائیں گے یہ پھوڑے
عاشق کو یہ چاہیئے کہ ہرگز — اندوہ (و[1]) سے منہ نہ موڑے
آ جا لبِ بام کوئی کب تک — دیوار سے اپنے سر کو پھوڑے
جاتے ہیں رقیب کو خط اُس کے — کاغذ کے دوڑتے ہیں گھوڑے
غم خوار کو ہے قسم کہ زنہار (قطعہ) — غالب کو نہ تشنہ کام چھوڑے
حسرت زدۂ طرب ہے یہ شخص — دم جب کہ بہ وقتِ نزع توڑے
پانی نہ چوائے اس کے مُنہ میں — تحُل مے میں بھگو بھگو نچوڑے

نسخۂ بھوپال کے متن میں جو نئی غزلیں شامل ہوئیں وہ بھی بہ حیثیتِ مجموعی بیدلانہ رنگ میں نہیں ہیں۔ اِس کے قصائد میں البتہ بیدلانہ مشکل پسندی موجود ہے۔ گمان غالب ہے کہ نسخۂ بھوپال بخطِ غالب کی کتابت کے کچھ ہی عرصے کے بعد انہیں طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنے کی قیامت کا اندازہ ہو گیا تھا اور انہوں نے غزلیات میں یہ روش ترک کر دی تھی۔ اِن ترمیموں کے مطالعہ سے جو نسخۂ بھوپال کے متن میں کی گئی تھیں، معلوم ہوتا ہے کہ "اکثر انہوں نے ایک طرف فارسی کے ثقیل اور غریب پیرایوں کو صاف اور مانوس پیرایوں میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے تو دوسری طرف اُردو الفاظ و تراکیب کو فارسی الفاظ و تراکیب پر ترجیح دی ہے۔"[2] تقریباً یہی خصوصیات نسخۂ بھوپال بخطِ غالب کی ترمیموں میں بھی نظر آتی ہیں۔ مثلاً :

حیرت از شورِ فغانِ بے اثر غفلت ہوئی
حیرت اپنے نالۂ بے درد سے غفلت بنی — راہِ خوابیدہ کو غوغائے جرس افسانہ تھا
فزوں ہوتا ہے ہر دم جوشِ خونباری تماشا ہے — نفس کرتا ہے بر رگ ہائے مژگاں کام نشتر کا

---

[1] مخطوطے میں یہاں ایک لفظ چھوٹ گیا ہے۔ نقوش نے اپنی طرف سے "جفا" چھاپا ہے میرے نزدیک وفا زیادہ مناسب ہے۔ غالب نے اندوہِ وفا استعمال بھی کیا ہے۔ ع : "میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں"

[2] نسخۂ حمیدیہ اور اس کی اہمیت از راقم الحروف، نگار پاکستان، کراچی، جون ۱۹۶۹ء ص ۳۷

نفس کرتا ہے رگِ ہائے مژہ پہ کام نشتر کا

سخن حیراں تحیر، شرر فشاں، پرواز ہے گانہ — پر طوطی ہے قفلِ زنگ بست آئینہ خانے میں

ہوئی یہ بیخودی چشم و زباں کو تیرے جلوے سے — کہ طوطی قفلِ زنگ آلودہ ہے آئینہ خانے میں

وہم غفلت مگر احرامِ فسردن باندھے — ورنہ یاں در دلِ ہر سنگ شرر پنہاں ہے

ورنہ ہر سنگ کے سینے میں شرر پنہاں ہے

اسدؔ اس فصل میں کوتاہیٔ نشو و نما سمجھو، — اگر گل بر قدِ شمشاد پیراہن نہ ہو جائے

سمجھ اس فصل میں کوتاہیٔ نشو و نما غالبؔ — اگر گل سرو کے قامت پہ پیراہن نہ ہو جائے

اِس مخطوطے اور نسخۂ بھوپال کے اوّلین متن کے اختلافات سے بھی ترمیم و اصلاح کی یہی کیفیت سامنے آتی ہے۔ مثلاً :

(الف) نسخۂ بھوپال بخطِ غالبؔ :

تغافل بدگمانی یا، تظلم سخت جانی ہا — نگاہِ بے حجابِ ناز کو بیم گزند آیا

نسخۂ بھوپال :

تغافل بدگمانی بلکہ میری سخت جانی سے — نگاہِ بے حجابِ ناز کو بیم گزند آیا

(ب) نسخۂ بھوپال بخطِ غالبؔ :

اگر آسودگی ہے مدعائے رنج کوشش ہا — نثارِ گردشِ پیمانۂ مے روزگار اپنا

نسخۂ بھوپال :

اگر آسودگی ہے مدعائے رنج بیتابی — نثارِ گردشِ پیمانۂ مے روزگار اپنا

(ج) نسخۂ بھوپال بخطِ غالبؔ :

ضبطِ گریہ گوہرِ آبلہ ہائے تب خال — پائے صد موج بہ طوفاں کردۂ دل باندھا

نسخۂ بھوپال :

ضبطِ گریہ گوہرِ آبلہ لایا آخر — پائے صد موج بہ طوفاں کردۂ دل باندھا

اِن مثالوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اِبتدائی کلام میں ترمیم و اصلاح کا جو انداز نسخۂ بھوپال سے پہلی بار منظرِ عام پر آیا تھا، اس کی اِبتدا نسخۂ بھوپال بخطِ غالبؔ کی تکمیلِ کتابت کے بعد ہو چکی تھی۔ اگرچہ غالبؔ کے فنی نشو و نما کے بارے میں اِن ترمیموں کے بجائے خود کوئی ایسی بات سامنے نہیں آتی جو بالکل نئی ہو لیکن اِس کا یقین ہو جاتا ہے کہ مغلق فارسی الفاظ و تراکیب اور اسالیبِ بیان سے اپنے کلام کو صاف کرنے کے سلسلے میں غالبؔ کا رجحان نسخۂ بھوپال سے قدیم تر ہے۔ اگر نسخۂ بھوپال بخطِ غالبؔ پر سنہ کتابت درج ہوتا یا کوئی اور معتبر شہادت دستیاب ہوتی تو، ہمیں اِس رجحان کے آغاز کا زمانہ قطعی طور پر معلوم ہو جاتا لیکن بہ صورتِ موجودہ یہ قیاسی بحث تحقیق کی محتاج ہے

(۷)

نسخۂ بھوپال کی دریافت کے بعد سے عبدالرزاق شاکر کے نام غالبؔ کے ایک خط مورخہ یکم اگست ۱۸۶۵ء کی یہ عبارت برابر زیرِ بحث آتی رہی ہے۔ اور اس کے مضمرات کی صداقت پر شبہات وارد کیے گئے ہیں :-

" اِبتدائے فکرِ سخن میں بیدلؔ و اسیرؔ و شوکتؔ کی طرز پر ریختہ لکھتا تھا۔ چنانچہ ایک غزل کا مقطع یہ تھا :-

طرزِ بیدلؔ میں ریختہ لکھنا — اسداللہ خاں قیامت ہے

"پندرہ برس کی عمر سے پچیس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہوگیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس
دیوان کو دُور کیا۔ اوراق یک قلم چاک کیے۔ دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوانِ حال میں رہنے دیے"[1]

قاضی عبدالودود صاحب لکھتے ہیں کہ :

"بیدل کا ذکر پرانے دیوان میں بہت جگہ ہے لیکن اسیر و شوکت کا نام تک نہیں آیا۔ اس میں ایسے اشعار بھی ہیں
جو ان شاعروں کے مخصوص رنگ میں نہیں۔" نیز "میرا خیال ہے کہ کسی زمانے میں بھی اردو دیوان کی ضخامت اتنی نہ رہی
ہوگی کہ اسے بڑا کہہ سکیں"[2] اوراق یک قلم چاک کئے اور دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوانِ حال میں رہنے دیئے۔

اِن دونوں فقروں میں بھی مبالغہ ہے، ایک زیادتی کی طرف دوسرا کمی کی طرف۔ لیکن پرانے کلام میں اسیر و شوکت کا ذکر
نہیں آیا تو اس سے تقلیدی رجحان کی نفی نہیں ہو سکتی کیوں کہ ان کی تقلید دراصل بیدل ہی کے تتبع کی توسیع تھی۔ نسخۂ بھوپال
میں ایسے اشعار کی موجودگی جو ان شعراء کے مخصوص رنگ میں نہیں ہیں۔ اس وجہ سے تھی کہ تقلید کے دائرے میں جا بجا غالب کا
ایک انفرادی رنگ بھی ابھر تا تھا اور اس میں اس زمانے کا کلام بھی آگیا تھا جب وہ ابتدائی تقلیدی رنگ سے منحرف ہو چکے تھے۔

عمدۂ منتخبہ میں غالب کا ذکر صرف اسد تخلص کے ساتھ کیا گیا ہے۔ انتخاب میں غالب تخلص کا ایک مقطع اور بعد کے کچھ
اشعار بھی شامل ہیں جن کے رنگ سے تنقیدی فقروں کی تائید نہیں ہوتی۔ اس سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ اس تذکرے میں
غالب کے متعلق اندراجِ نثر زیادہ قدیم ہے۔ چنانچہ مندرجۂ ذیل اقتباس سے بیدل کی تقلید کی صحیح معنویت اور اس دائرے
میں غالب کی انفرادیت دونوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

"درفنِ سخن سنجی متتبع محاورات میرزا عبدالقادر بیدل علیہ الرحمہ و ریختہ در محاوراتِ فارسی موزوں می کند
بالجملہ موجدِ طرزِ خود است ...... اکثر اشعارش از زمینِ سنگلاخ بہ مضامینِ نازک موزوں گشتہ، رویۂ
خیال بندی بیش از بیش پیش نہاد خاطر دارد"[3]

غالب کے دیوانِ حال یعنی متداول دیوان میں پچیس برس تک کی عمر کے بیدلی رنگ کے دس پندرہ اشعار سے کہیں زیادہ
موجود تھے۔ لیکن انہوں نے اِس زمانے کے دیوان کا کافی حصّہ قلمزد کر دیا تھا، اگرچہ اوراق یک قلم چاک نہ کئے تھے۔ اِن اشعار
میں اگر ان مشترک اشعار کو شمار نہ کیا جائے جو پچیس برس کی عمر کے ہوتے ہوئے بیدلی رنگ میں نہیں ہیں تو اُن کی تعداد بہت
کم رہ جاتی ہے۔ اُن کا متداول دیوان بھی مقابلتاً اتنا مختصر تھا کہ اپنے کسی قدیم دیوان کو بڑا کہنے میں اُن سے کوئی خاص
غلط بیانی نہیں ہو رہی تھی۔

شاعری کی ابتدا کے متعلق ۱۵ برس کے علاوہ غالب کے دس اور بارہ برس کے اقوال بھی موجود ہیں۔ لیکن اس اختلاف
کو بھی موزونیِ طبع کے آثار پیدا ہونے اور انہماک کے ساتھ شاعری کرنے کے فرق کی بناء پر حل کیا جا سکتا ہے۔ غالب کے زیرِ
بحث قول میں سب سے زیادہ غور طلب نکتہ یہ ہے کہ انہوں نے پچیس برس کی عمر میں ایک بڑے دیوان کا جمع ہونا بیان
کیا ہے۔ اِس کا اطلاق اُس دیوان پر کیا جائے گا جس کی نقل نسخۂ بھوپال تھی کیونکہ اِس مخطوطے کی تکمیل کتابت اُن

(بقیہ صفحہ ۶۳ پر دیکھیے)

[1] خطوطِ غالب مرتبۂ غلام رسول مہر، طبع دوم کتاب منزل، لاہور، ص ۴۳۲

[2] دیوانِ غالب کے دو نسخے از قاضی عبدالودود، معاصر پٹنہ، حصّہ ۱۲، ص ۲

[3] عمدۂ منتخبہ از اعظم الدولہ سرور مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ۱۱۶

غزلیں

حرمت الاکرام

کس طرف جائیں کہ سورج سر پہ آیا جائے ہے
سائے کا کیا، سایہ تو قدموں سے لپٹا جائے ہے

دیکھتا ہوں ذہن سے، آنکھوں سے سوچا جائے ہے
آنکھ کھلتی جائے ہے اور ہوش اڑتا جائے ہے

دل کی مٹی کو نہ کوسو، یہ ہے مقسوم حیات
خواب بویا جائے ہے اور درد کاٹا جائے ہے

تجربہ کہتا ہے، پھولوں سے بھی کترا کر چلو،
اور دامن ہے کہ ہر کانٹے سے الجھا جائے ہے

بنتی مٹتی سی لکیریں، جلتے بجھتے سے دیئے
زندگی بھر زندگی کا خواب دیکھا جائے ہے

سربلندی، ارجمندی ہے نگاہ و فکر کی
دل کا قد خوابوں کے پیمانے سے ناپا جائے ہے

نغمہ زارِ فن ہے یا کوئی بساطِ دار و گیر
نطق کو الفاظ کی سولی پہ کھینچا جائے ہے

زندگی کیا چاہتی ہے، کھیل ہے آخر یہ کیا!
شیشہ توڑا جائے ہے، پتھر کو چوما جائے ہے

خود کو اتنا کون موڑے، کون ساتھ اس کے چلے
وقت اک دریا ہے، بہتا جائے، مڑتا جائے ہے

درد کی چنگاریو! کیوں تم نے یہ سمجھا دیا!
دل کا پیکر سنگِ حرماں سے تراشا جائے ہے

شورشِ انفاس کی تاریخ کیا ہوتی رقم
مرحبا حرمت! قلم خود مجھ کو لکھتا جائے ہے

▲

من موہن تلخ

○

جمی جو گرد تو ہر چہرہ اپنا غم نکلا
خود اپنے آپ کو پہچاننا ستم نکلا

صدا میں دکھ کی جگہ دکھ کا جب بھرم نکلا
ہر ایک لفظ کا بس ایک چپ میں دم نکلا

پڑا ہے دل پہ وہی ربط کا سا خالی بوجھ
اکیلا ہونے میں بھی کوئی کتنا کم نکلا

سمجھ میں آ نہ رہے تھے جب ایک دوسرے کو
یہ ربط بھی اسی آواز کا کرم نکلا

عدم سماعتِ آواز کا یہ عالم ہے
کہ دشمن اپنی صدا کا ہر اک قدم نکلا

بہت قریب سے آواز دینی پڑتی ہے
ہر ایک فاصلہ اس فاصلے سے کم نکلا

خود اپنی ذات کے ڈر نے کیا ہے خود سے بھی دور
کوئی بھی قرب نہ اتنا بڑا ستم نکلا

ہر ایک ذہن میں بھٹکی کوئی بڑی آواز
ہر ایک ذہن خود اپنا کوئی بھرم نکلا

دلوں میں تلخ وہ قربت کا ہول بیٹھا ہے
کوئی ہو ساتھ تو محسوس ہو کہ دم نکلا

▲

اور تحمل سے کام لیا۔ اپنی عمر کی ساٹھ منزلیں طے کر لینے کے بعد جب کہ وہ کمزور اور نحیف نظر آنے لگے تھے، اُنہیں کسی بات پر مشتعل نہ ہونا چاہیئے۔ وہ اپنے سیاسی مشاہدات کا سنجیدگی سے اظہار نہیں کر رہے تھے۔ اُن کے خیالات میں تلخ تجربات سے آشنا اُس انسان کے ذاتی خیالات کا عکس نظر آتا تھا۔ جس کی رشتیا پر برطانوی حکومت میں تیس سالہ طویل مدّت کی ملازمت اور یونین جیک سے وابستہ گہری وفاداری کا مخصوص رنگ غالب تھا۔

ترنگا پرچم اُن کی یادداشت کو کچوکے لگا رہا تھا اور اُن کی تلخیوں میں اضافہ کر رہا تھا۔ شاستری جی نے یادوں کے اوراق اُلٹے۔ اُن کے سینے میں دبی ہوئی چنگاریاں بھڑک اُٹھیں اور ان کا دل ان دہکتے شعلوں کی لپیٹ میں آگیا۔

آر۔ کلیانارام برہمن طلباء کے اُس گروہ میں سے تھے جو یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کیلئے ۱۹۰۸ء کے اوائل میں شامل ہو گئے تھے۔ مدراس کے کرسچین کالج سے بی۔ اے کیا۔ صوبۂ مدراس میں ہی وہ ممتاز طالب علم تھے جنھوں نے بی۔ اے کے امتحان میں انگریزی میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کئے اور یونیورسٹی کی طرف سے ہلر گولڈ میڈل حاصل کیا۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ صیغۂ مالیات میں پندرہ روپیہ ماہوار کی تنخواہ پر کلرکی کرنے لگے۔ متوسط طبقہ سے وابستہ تھے۔ آباء و اجداد نیک خصائل اور تمثیلی کردار کے مالک تھے۔ اُن کی شادی سترہ سال کی عمر میں ہو چکی تھی۔ جس سال انھوں نے بی۔ اے کی سند حاصل کی وہ ایک لڑکے کے باپ بھی بن گئے۔ اُن کی بیوی متوسط طبقہ کی ایک سلیقہ شعار لڑکی تھی۔ میاں بیوی ایک دوسرے سے بہت خوش تھے۔ شاستری جی دو دنیاؤں کے مالک تھے۔ ایک دنیا ان کا اپنا گھر اور دوسری دنیا اُن کا دفتر۔ جہاں تک شادی کے مقدس رشتہ میں منسلک دو ساتھیوں کا تعلق ہے، اُن دونوں میں گہری مناسبت تھی اور ان کے پھلتے پھولتے لڑکے کے ساتھ ہی اُن کی خوشیاں بھی پروان چڑھنے لگی تھیں۔ اس انہماک کی بدولت اُن کا حلقۂ احباب محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ عوام سے خود کو الگ رکھنے کا وصف غالباً اُن کی زندگی کے اعلیٰ ترین مقاصد کے مفاد کیلئے اُن میں پیدا ہوا تھا۔

شاستری جی غیر معمولی استعداد رکھتے تھے۔ ملازمت میں داخل ہونے کے چند ہی سال میں اُنھوں نے تمام صیغہ جاتی امتحانات میں شرکت کی اور نمایاں کامیابی حاصل کی۔ بحیثیت افسر مالیات شاستری جی نے نمایاں شہرت حاصل کی۔ کھیتوں اور زمین کی پیمائش کا کام حسن و خوبی انجام دیتے تھے۔ دفتری سال کے اختتام کے پہلے ہی تمام قسطیں وصول کر لیا کرتے تھے اور دوسرے تعلقوں کے برعکس اُن کا تعلقہ بہت صاف ہوا کرتا تھا۔ جاننے خطوں کو جن میں پانچ سال سے مخفی طور پر کاشتکاری جاری تھی کھاتے میں داخل کروانے کا سہرا شاستری جی ہی کے سر تھا۔ صوبہ کے خزانۂ عامرہ کے ساتھ بہت بڑا دھوکہ ہوا تھا۔ برطانوی حکومت کا نمک جسے وہ برسوں کھاتے رہے اُن کے حلق میں دھتورا بن کر چبھنے لگا۔ چوٹ کھائے ہوئے دیانتداری کے جذبہ نے اُنہیں ملامت کی کہ اُنھوں نے اس مخفی کاشتکاری کو بہت پہلے ہی بے نقاب کیوں نہیں کیا۔ اُن کا عتاب پیش رَو عہدہ داروں پر نازل ہوا۔ اُن کے خیال میں وہ دانستہ ہی ان خطوں کا پتہ لگانے سے چشم پوشی کرتے رہے تھے۔ شاستری جی کی اس قابلِ توصیف خدمت کو ہزی مارٹن ونٹرلو تھم آئی۔ سی۔ ایس، ریونیو ڈویژنل آفسر نے بیحد سراہا اور چند ہی دنوں میں شاستری جی کے منصب میں ترقی ہو گئی۔ اور وہ سب مجسٹریٹ بنا دیئے گئے۔ اس مسرّت خیز موقعہ پر مسٹر ونٹر لوتھام کی تصویر شاستری جی کے مکان میں ملکہ میری اور شاہ جارج پنجم کے سُنہرے رنگ کے منقش فریموں میں لگی تصویروں کے ساتھ لگادی گئی۔

شاستری جی کے بخت کا ستارہ عروج پر تھا۔ مجسٹریٹ کے منصبی اختیارات کو اُنھوں نے نہایت ہی راست بازی سے برتا۔ اُن کے دیئے ہوئے فیصلوں پر سب کلکٹر کو نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی تھی۔ اُن کے فیصلوں میں قانونی تبحر اور اظہارِ خیال

افسانہ
(انگریزی)

منجری ایس ایسوارن
ترجمہ: ایس ایم حیات پادشاہ

دو آوازیں

صدیوں کی طویل سیاہ رات گزر چکی تھی اور ہندوستان کے اُفق پر آزادی کی صبح کی سپیدی نظر آنے لگی تھی۔ مادرِ وطن کا پرچم، ترنگا۔ زعفرانی، سفید اور سبز۔ درمیان میں اشوک کا نیلا چکر۔ دستور ساز اسمبلی پر لہرایا گیا۔

"یہ پرچم کسی حکومت کا نشان نہیں ہے"۔ قائد مخاطب تھا۔ عوام کا نمائندہ۔ تقریر فصاحت و بلاغت سے لبریز تھی۔ لہجہ میں جوش اور وقار تھا۔ "یہ پرچم کسی مملکت کا نشان نہیں ہے۔ یہ پرچم کسی شہنشاہی نظام کا نشان نہیں ہے۔ دوسروں پر اقتدار کا پرچم نہیں۔ یہ پرچم آزادی کا نشان ہے۔ آزادی نہ صرف ہماری بلکہ ہر اُس انسان کی آزادی جو اس پرچم کو دیکھ سکتا ہے ...... مہاتما گاندھی زندہ باد!"

"اس پرچم کے نیچے شہزادہ اور کسان کا امتیاز نہیں۔ امیر اور غریب کا فرق نہیں۔ مرد اور عورت کا امتیاز نہیں" ایک شاعرہ نے پرجوش نظم سنائی۔

فضا تحسین و آفرین کے نعروں سے گونجنے لگی۔

"پرچم کا درمیانی سفید رنگ سچائی، سادگی اور اُجالے کا ضامن ہے۔ اشوک کا چکر نیکی اور حسنِ سیرت کا نمائندہ۔ دھرما اور ستیہ۔ یہ قوم میں جمود اور بے حسی کو داخل نہیں ہونے دیتے۔ زعفرانی رنگ انکساری اور ضبطِ نفس کے جوہر کی ترجمانی کرتا ہے اور سبز رنگ دیش کی مٹی سے وابستہ ہمارے رشتہ کی عکاسی کرتا ہے۔ اس پرچم کے نیچے تمام تر انکساری کے ساتھ اور ضبطِ نفس کے جذبے کے زیرِ اثر ہندوستان میں ایک جنت کی تعمیر ہوگی۔" ایک فلسفی نے اپنے خیالات پیش کئے۔

مجمع ہمہ تن گوش تھا۔

شاعرہ کی پرجوش نظم، لیڈر اور فلسفی کی بلیغ تقریروں نے عوام کو بیحد متاثر کیا۔ لیکن رائے بہادر آر کلیان رام شاستری وظیفہ یاب ڈپٹی کلکٹر کے دل و دماغ پر نہ تو ان تقریروں کا کوئی اثر ہوا اور نہ وہ پرجوش قومی نظم اُنہیں متاثر کر سکی۔!..

آزادی؟ آخر کس لئے؟ جمہوریت! خدا کی پناہ! کتنے لیبل چسپاں ہیں اس پر! عوام کی حکومت، عوام کے نمائندوں کی حکومت اور عوام کی فلاح و بہبودی کیلئے حکومت ــــــ رفاقت! جبکہ تمہارا پڑوسی تم پر اعتماد کھو رکھے اور بدظن بھی ہو جائے ــــــ اتحاد! اختلافات کا جڑواں بھائی۔ الفاظ! الفاظ! الفاظ!!! جنھیں تصورات اور خیالات کے دائروں میں مختلف جماعتوں اور گروہوں میں منقسم کر دیا جاتا ہے۔ الفاظ! وزارت کی کرسی حاصل کرنے کی ہوس دل میں لئے عوام کے آگے اپنے آپ کو قوم کا واحد اور سچا راہنما بنا کر پیش کئے گئے الفاظ! کتنا نفرت انگیز عمل ہے۔ رائے بہادر نے ضبط

بالکل صاف اور سادہ ہوتا تھا۔ شاستری جی نے سب مجسٹریٹ کے منصب کی ایک سالہ مدّت زیرِ آزمائش مکمل کرلی۔ اس عرصہ میں متحدہ کمان نے میتی ہیم پر اپنا آخری داؤ آزمایا۔ معاہدہ ورسیلیس پر دستخط ہوئے اور کلیان رام شاستری نے دل و جان سے حکومتِ برطانیہ کی ظفر یابی کا جشن منایا۔ اپنے تعلقہ کے غربا کو کھانا کھلایا، کپڑے تقسیم کئے، مسرّتوں اور خوشیوں کے مناظر میں حقیقت کا پرتو عیاں کرنے کی غرض سے ان میں لوک ناچ اور دوسرے دلچسپ کھیل بھی شامل کرلئے۔ اور شاستری جی جن پر برطانوی سرکار کی خاص عنایت تھی تحصیلدار بنا دیئے گئے۔ شعبدہ باز کا دکھایا ہوا کرتب۔ شاستری جی کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ آم کے بیج کا پلک جھپکنے میں شق ہو کر بیج کل سے لدے میوہ دار درخت کی شکل میں نمودار ہونا۔ بانس کی ایک لکڑی کی کرشمہ سازیاں۔ شعبدہ باز کی چھڑی دوبارہ گھومی اور شاہ جارج پنجم کی سالگرہ کے موقع پر شاستری جی کو رائے صاحب کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔

اس عرصہ میں دنیا میں کئی تبدیلیاں رُونما ہوئیں۔ انڈین نیشنل کانگریس نامی ایک جماعت جس کا مقصد ہندوستان کو سیاسی طور پر برطانوی سامراج سے آزاد کرانا تھا۔ بہت زور پکڑ گئی۔ سارے ملک میں ہنگامے اور قتل و خون کی وارداتیں ہونے لگیں۔ شمالی ہندوستان میں بلوے اور فسادات کی تعداد زیادہ تھی اور گاندھی جی جیسے راہنما عوام کے کانوں اصولوں میں حیات آفریں آبِ حیات بھر رہے تھے۔ اُن میں ایک نئی روح بیدار کر رہے تھے۔

برطانوی سرکار کے خادم کی اُس کے حاکم کی سیاست کے سوا دوسری سیاست نہیں ہو سکتی۔ وہ ذہن جو حاکمِ وقت کی خدمت کے نظام کا پابند ہو چکا ہو، اندھی اطاعت جس کا وصف بن چکی ہو اُن عوام کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا جو اپنی گردنوں پر غیر ملکی اقتدار کا جُوا اٹھائے صدیوں سے کراہ رہے تھے اور اس طوقِ غلامی کو اُتار پھینکنے کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ایسا دماغ خوف اور بُزدلی کا مرکب ہوتا ہے اور اُس کے اندرونی حصّہ میں اپنے تحفّظ کیلئے سختی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اُن چیزوں کو حقیر یا ذلیل سمجھتا ہے جنھیں وہ سمجھتے ہوئے خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اُس کا وجدان ان چیزوں کو مقدّس مانتا ہے اور ہر اُس شئے کو جو اُس دماغ کے جذبۂ تحفّظ کیلئے خطرہ کا باعث بن جاتی ہے بڑی کلبیت کے ساتھ دیکھتا ہے۔

رائے صاحب آر۔ کلیانا رام شاستری تحصیلدار کو گاندھی تحریک کی حکومت دشمنی اور غیر قانونی کارروائیوں سے چڑ تھی۔ وہ اپنی بیوی ناگ لکشمی سے کہتے۔ گاندھی جی دنیا کو اپنے خیالات کے سانچہ میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اُن کی کوشش رائیگاں جائے گی۔ ناگ لکشمی جواب میں اپنا سر ہلا دیتی، جیسے اپنے شوہر کی عقل اور فراست کا اعتراف کر رہی ہو۔ لاعلمی اور گھبراہٹ کے درمیان بصورتِ دیگر بدلتی ہوئی مسکراہٹ اس حقیقت کا اظہار کرتی تھی کہ بیرونی دنیا کئی رنگ بدل چکی ہے پھر بھی اُن کی گھریلو زندگی کے پُرسکون دھارے کے بہاؤ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی ہے۔ وہ پُرسکون دھارا جس کی دلکشی میں اُن کی آٹھ دس سالہ لڑکی کا بھی دخل ہے جسے ناگ لکشمی نے اپنی خوبصورتی اور دلکشی کا زیادہ حصّہ بخش دیا تھا۔ راجا رامن جو پہلا بیٹا تھا اب سولہ سال کا ہو چکا تھا۔ اُس کی تمام تر توجہ تعلیم پر مرکوز تھی۔ وہ درجۂ یازدہم کا طالبعلم تھا اور ہائی اسکول کا سلسلۂ تکمیل کو پہنچا چاہتا تھا۔

شفیق ماں کی نگاہوں میں راجا رامن اب بھی وہی راجا رامن تھا۔ پڑھنے میں منہمک کھیل کود میں زندہ دل۔ لیکن باپ کی دقیقہ رس اور حقیقت شناس نگاہوں کو اپنے بیٹے میں بہت کچھ نظر آیا۔

ہیڈ ماسٹر نے با دلِ ناخواستہ شاستری جی سے کہا تھا "جہاں تک تحصیلِ علم کا تعلق ہے مجھے راجا رامن سے کوئی شکایت نہیں لیکن چند دنوں سے وہ بے پروا سا ہو گیا ہے۔"

"کیا وہ بُری صحبتوں میں پڑ گیا ہے؟" ۔ باپ نے فکر مند لہجہ میں پوچھا۔

"ایسا تو نہیں ہے۔"

"تو پھر ۔ ؟"

"میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اُس کی بے پروائی کا ایک خاص سبب ہے اور وہ یقیناً بُری صحبت تو نہیں ہے۔ میں جرم اور کوتاہیوں پر سزا دینے سے دریغ تو نہیں کرتا لیکن اس کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ راجا رامن غیر معمولی ذہین ہے لیکن اُسے اپنے ذہن میں چند عجیب و غریب اور بالکل الوکھے خیالات کو داخل نہ ہونے دینا چاہیئے۔"

"کیسے خیالات؟"

"سیاسی۔"

ایک ہلکا سا طنز ہیڈ ماسٹر کے لبوں میں خم پیدا کر چکا تھا۔

"سیاسی خیالات!" مسٹر شاستری جی نے نہایت تعجب خیز لہجہ میں پوچھا۔

"ہاں! ہندوستان کیلئے سوراج اور وہ تمام بہکے بہکے خیالات جو گاندھی اور اُس کی کانگریس عوام میں اور بالخصوص نوجوانوں میں پھیلا رہے ہیں۔ بشاید بیرونی رسُوخ ہی کام کر رہا ہے!"

"تم سچ کہہ رہے ہو!"

"میری پچیس سالہ ملازمت میں یہ پہلا انکشاف ہے جناب من!۔ غیر متوقع انکشاف۔ ہر صبح کلاس شروع ہونے سے دس منٹ پہلے تمام طلباء کامن ہال میں دُعا اور حمد کیلئے جمع ہوتے ہیں۔ اس کا انتظام میں خود کرتا ہوں۔ کوئی اُستاد کسی بچہ کو اُس کا نام لے کر بلاتا ہے۔ بچہ آگے بڑھ کر ڈائس پر آ کھڑا ہوتا ہے اور حمد سناتا ہے۔ حمد کے بعد سرکاری پرچم یونین جیک لہرایا جاتا ہے۔ اس کی سلامی کے بعد طلباء اپنی اپنی جماعتوں کا رُخ کرتے ہیں۔ میں کئی بار راجا رامن کو اس کام کے لئے منتخب کر چکا ہوں۔ آپ تو جانتے ہیں، اُس کی آواز میں کتنی موسیقیت ہے، لیکن وہ ہمیشہ دوسرا اور حلق میں درد کے جھوٹے حیلے تراش کر ٹال دیا کرتا تھا۔ میں بھی اُس پر مہربان تھا۔ اس پر کسی نے توجہ نہیں دی۔ انجام کار آج کل تو وہ قطعی طور پر انکار کرنے لگا اُس نے کہا۔ یہ ہماری مادرِ وطن کی توہین ہے، ہمارے جذبۂ خود داری کی توہین ہے کہ ہم یونین جیک کو سلامی دیں۔ اس پرچم کے آگے اپنا سر نگوں کریں جب کہ ہمارے مخلص اور صادق مجاہدِ وطن گوروں کے ہاتھوں بے جا ظلم و ستم کا شکار ہیں قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہے ہوں۔ وہ دُعا کے موقع پر ہر روز ایک نہیں ان گنت دعائیہ نظمیں سُنائے گا۔ اس میں اس کا حلق ہی کیوں نہ پھٹ جائے لیکن وہ کسی قیمت پر یونین جیک کے آگے اپنا سر نہ جھکائے گا!"

ہیڈ ماسٹر چند لمحوں کیلئے خاموش ہو گئے۔ وہ سوچنے لگے۔ ان کا اسکول تو امدادی مدرسہ ہے، سرکاری گرانٹ پر جس کا انحصار ہے، موجودہ روایتوں سے انحراف اُنہیں کے لئے نہیں۔ اُن کے اسکول کیلئے بھی باعثِ عتاب ہوگا۔ کوئی ناراض استاد کسی بھی موقع پر افسرانِ اعلیٰ اور حکام کے کان بھر سکتا ہے۔

"اپنے بیٹے کو تنبیہ کر دیجئے" ہیڈ ماسٹر نے قدرے سنبھل کر کہا "ایک بچے کے دماغ میں اس طرح کے خیالات پروان چڑھیں یہ خطرناک بات ہے۔ میں تحقیق و تفتیش کرتا ہوں کہ اس طرح کے باغیانہ اثرات کا منبع کہاں ہے اور اُسے روک دوں گا۔ راجا رامن، دیکھئے جناب عالی میں پھر دہرا رہا ہوں۔ وہ ایک ہونہار اور ذہین لڑکا ہے ایک تابناک مستقبل کا مالک! مجھے طلباء کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کا خاص طور پر خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ان کی تربیت

میرے ذمّہ ہے۔ میں اپنی اس طویل اور گرم گفتگو کیلئے آپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔ امید کہ آپ مجھے معاف فرمائیں گے۔"
ہیڈ ماسٹر نے تحصیلدار صاحب سے رخصت لی۔

اپنے لختِ جگر کے متعلق اتنا کچھ سن کر رائے صاحب۔ آر۔ کلیانارام شاستری بہت پریشان ہوئے۔ ہیڈ ماسٹر کے الفاظ یوں تو بظاہر سادہ اور معمولی تھے لیکن درحقیقت وہ تیر کے اُن پھلوں کی طرح تھے جن پر خوش خلقی اور نرمی کی تہہ چڑھا دی گئی ہو۔ لیکن جن کا نشانہ کبھی نہیں چوکتا۔ جن کا گھاؤ نہایت گہرا ہوتا ہے۔ وہ سوچنے لگے۔ ہیڈ ماسٹر یہی کہنا چاہتے تھے کہ میں حکومت کا ایک ذمّہ دار افسر ہوں۔ ایک تعلقہ کا نگراں اور میرا بیٹا سرکش اور خبطی ہو گیا ہے۔ ہمیشہ سیاست میں مبتلا رہتا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ میری تباہی کا باعث بنے اُسے میں رام کر لوں۔

لیکن۔ شاستری جی اُن لوگوں میں سے نہ تھے جو اتنی جلدی کسی کی دھمکی میں آجاتے۔ وہ جانتے تھے کہ کس طرح وہ اپنے بیٹے پر قابو پا سکتے ہیں۔ پھر بھی وہ فکر مند اور برہم ہو گئے۔ دفتر بھی جمع بندی کا بہت سارا کام ادھورا پڑا تھا ان کے ذہن میں کئی خیالات چکر کاٹنے لگے اور اُن کے ذہن کے کینوس پر اُن کے چھوٹے بھائی کی جنہیں مرے کافی عرصہ ہو چکا تھا تصویر اُبھر آئی۔ ایک ذہین اور ہوشیار طالب علم جس نے ڈاکٹر اینی بیسنٹ اور اُن کی ہوم رول تحریک سے متاثر ہو کر اپنی اعلیٰ تعلیم کو ادھوری چھوڑ دیا۔ صحافت کی طرف رجوع ہوا اور "انڈین پیٹریٹ" کے اسٹاف میں شامل ہو کر شعلہ ریز مقالات لکھے، شعلہ بار تقریریں کیں، عوام کے دلوں میں جوش و خروش بھر دیا اور وقت سے پہلے موت کی بھٹی میں جھلس گیا۔ کیا راجا رامن بھی اپنے چچا کے نقشِ قدم پر چل پڑا ہے؟ اس لڑکے کی چھوٹی سی بھول میں بھی ناقابلِ تسخیر سرکشی مضمر تھی۔

وہ باپ دانشمند ہوتا ہے جو کوئی اہم واقعہ وقوع پذیر ہونے سے پہلے اپنی اولاد کی ہر حرکت کو بخوبی سمجھے۔ شاستری جی اپنی دانشمندی اور دُور اندیشی کا ثبوت دینا چاہتے تھے۔

اس بات کا کسی کو پہلے سے علم نہیں ہوتا کہ ایک چھوٹی سی بات آگے چل کر بھی ادنیٰ ہی رہے گی۔ یا خطرناک صورت اختیار کرے گی۔ ظاہری حالات ان کے محرکات اور عوام کے کردار کے مطالعہ ہی سے اُن کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

"تو تم نے اپنے ہیڈ ماسٹر سے کشیدگی پیدا کر لی ہے!"
شاستری جی نے اپنے بیٹے سے یہ سیدھا سا سوال کیا۔
راجا رامن یہ بھانپ گیا کہ ہیڈ ماسٹر نے اُس کے باپ کے کان بھرے ہیں۔
"اختلاف کی تو کوئی بات نہیں پتاجی! بس میری سمجھ میں جو بات درست نظر آئی میں نے اُنہیں بتا دی۔"
"راجا! ابھی تم لڑکے ہو۔ اس بات کا فیصلہ کہ تم غلطی پر ہو یا راستی پر بڑوں کو کرنا چاہیے، تمہیں نہیں!"
"بے شک پتاجی لیکن ہیڈ ماسٹر کو یہ کہاں تک حق پہنچتا ہے کہ وہ طلباء کے تعلیمی سلسلے سے ہٹ کر ان کے دوسرے اُمور میں مداخلت کرے!"
"جب تک تم اسکول میں ہو، یہ تمہارا فرض ہے کہ ہیڈ ماسٹر کی ہر بات مانو۔ تعلیم کی بات ہو یا کوئی اور معاملہ ہو! سمجھے!"
"میں مجبور ہوں پتاجی!"
"کیسی مجبوری؟"
"میں ایسے آدمی کی ہر بات نہ مان سکوں گا۔"

"ایسے آدمی کی! یاد رکھو راجا! وہ تمہارے استاد ہیں۔ اُن کے متعلق احترام سے بات کرو"
شاستری جی نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

راجا رامن چپ چاپ کھڑا رہا۔ اُس کے ہونٹوں اور ناک کے نتھنوں پر طاری کپکپی نازد غم سے پلے لڑکے کی زود حسی کی غماز تھی۔ شاستری جی کی نگاہیں راجا رامن پر جم گئیں۔ اُن کے سورگیہ بھائی کا چہرہ اُن کی آنکھوں کے سامنے اُبھر آیا۔ وہی دم خم اور وہی جوش و ولولہ!

"میں ہر صبح پریئر ہال میں سو سے زیادہ دعائیہ نظمیں سنانے کو تیار ہوں پتا جی! اُس وقت تک سناؤں گا جب تک کہ میری آواز بھاری نہ ہو جائے۔ اور میرے حلق کی رگیں تن کر پھٹ نہ جائیں، لیکن میں یونین جیک کے آگے اپنا سر نہ جھکاؤں گا! یہ سراسر بے غیرتی ہے پتا جی!" ۔ جوش اور گھبراہٹ سے ملی جلی کیفیت کے زیر اثر راجا رامن بڑبڑا اٹھا

شاستری جی کی نگاہیں راجا رامن کے چہرہ پر اُسی طرح جمی رہیں۔ اُن کی نگاہیں کسی گہری سوچ کی غمازی کر رہی تھیں۔ وہ سوچنے لگے ہیڈ ماسٹر کا راجا رامن کے انہیں جملوں کے دہرانے کا منشا یقیناً اُن پر بیٹے کے اس گولہ بارود سے بھری بارود کے ذخیرہ کی طرف منسوب کرنا تھا:

"راجا! آخر وہ کیا بات ہے جس سے تمہاری دل شکنی ہوتی ہے؟"

"سب کچھ۔ وہ پرچم۔ اسکول کے اصول۔ طلبا کے دماغوں پر نئے خیالات کا تسلط۔ یونین جیک کا لہرانا۔ اُس کی سلامی۔ پھر پرچم کا اُتارنا۔"

"پرچم! ۔ اُصول!"

"ہاں پتا جی!" راجا رامن نے اپنے ذہن میں ایک تخیلی پرچم کو لہراتے ہوئے کہا "میں اپنے ملک کے پرچم کے آگے بصد احترام و عقیدت اپنا سر نگوں کرتا ہوں اور اُس مملکت کی سالمیت اور بقا کیلئے میری کئی جانیں قربان جس کا وہ نشان ہے۔ وہ مملکت جس میں کئی اقوام اور ملتیں شامل ہیں اور پھر بھی سب ایک ہیں۔ ناقابلِ تقسیم۔ وہ مملکت جہاں کا ہر فرد آزاد ہے اور جہاں ہر ایک کیلئے انصاف ہے"

ایک زناٹے دار تھپڑ راجا رامن کے گال پر پڑا۔ اُس کے ذہن میں لہراتے ہوئے قومی جھنڈے پر کئی بجلیاں گر پڑیں۔ اُسے اپنے گرد و پیش کی دنیا برق رفتاری کے ساتھ گھومتی نظر آئی۔ اُس کے دماغ میں غضب ناک مکھیوں کے چھتے کی بھنبھناہٹ تھی۔ بدحواسی کے عالم میں اُس نے ماں کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے ہاتھ میں کنگھا لئے کھڑی تھی۔ وہ کنگھا راجا رامن کو ایک دیو پیکر چھلا نظر آنے لگا۔ اُس کی خوبصورت بہن کے کچھ بے ترتیب اور کچھ سنورے گھنگھریالے سیاہ بال آگ کے شعلوں میں جھلسی ہوئی سا جھاڑی کی طرح معلوم ہو رہے تھے، وہ فضائے بسیط میں بغیر کسی جسامت کے تیرنے لگا۔ معاً اُس نے اپنے ہواس درست کئے۔ توہین کرنے والے چہروں کے سامنے کھڑے رہنا اُسے گوارا نہ تھا۔ ایک ہی جست میں وہ باہر چلا گیا۔ دوسرے لمحہ! فضا میں ایک چھنا ہوا۔ ایک زبردست چھناکا۔ جیسے فریم کے شیشوں پر شدت کے ساتھ پتھر پھینکے جا رہے ہوں۔ شاستری جی نے فوراً راجا رامن کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے تھام لئے۔ لیکن اس سے پہلے ہی مہاتما کی گرد کی زمین پر ملکہ میری اور شاہ جارج کی تصویر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر پڑی تھیں۔

یہ حادثہ سکیا نارام شاستری کی اُس پُرامن اور چھوٹی سی محدود دنیا میں ہوا جس سے باہر کی دنیا کے متعلق انہیں کچھ نظر آتا تھا۔ یہ حادثہ بجلی کی کڑک کی طرح تھا۔ وہ اچانک اپنے آپ کو ایک درمیانی عمر کے معمولی صورت انسان سے ایک بوڑھا

اور تھکا ہارا ہوا انسان سمجھنے لگے۔ ماتھے پر تلخیوں کی لکیریں اُبھر آئیں۔ اُنھوں نے اپنے بیٹے کو خشمگیں نظروں سے دیکھا، جس نے اُن کے بنائے ہوئے مندر کی بے حُرمتی کی تھی اور اُن کے دیوتاؤں کو پیروں تلے روندڈالا تھا!

چاروں طرف ایک نئے ہندوستان کی پکار تھی، لیکن شاستری اپنے گرد و پیش کی کسی بھی نئی چیز کو دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ مانسونی ہوائیں چلنے لگی ہیں یا اُن کے آغاز میں غیر معمولی تاخیر ہوگئی ہے۔ چاول کی فصل اچھی ہوئی ہے یا بُری۔ چھ ماہ کی قلیل مدت میں دو ماہ کیمپ پر چلے جاتے۔ اچھی تنخواہ اور سفر الاؤنس پاتے۔ بیوی کی رفاقت کا حق ادا کرتے۔ اپنی بیٹی کو لاڈ پیار کرتے دیکھ کر کہا کرتے بھگوان کی بڑی دین ہے جو انھیں بیٹی دی! انھیں اُس دن کا انتظار تھا جب کہ ڈپٹی کلکٹر کی اسامی پر اُن کا تقرر عمل میں آجائے۔ اور جب وہ وظیفہ پائیں تو اُن کے نام کے ساتھ رائے بہادر کا خطاب لگا ہو!۔

لیکن —

شاستری جی کی چھوٹی سی دنیا کی مطلق پروا کئے بغیر جس کے ساتھ وہ جونک کی طرح چپکے ہوئے تھے، ہندوستان آگے بڑھتا گیا۔ شہنشاہ برطانیہ کی پُرشکوہ حکومت پر نہ ڈوبنے والے سورج کی شعاعیں ماند پڑنے لگیں۔ ہندوستان آگے بڑھتا گیا۔ اُس نے راجارامن جیسے کئی نوجوانوں کی ایک نئی نسل کو جنم دیا۔ باہمت، بلند حوصلہ، دلیر، دیانتدار اور بے غرض نوجوان، جو اولوالعزم لیڈروں کی قیادت میں کام کرنے لگے اور جنھوں نے مادرِ وطن کے ماتھے سے غلامی کے دھبّے کو مٹانے کے لئے ہر طرح کی قربانیاں دیں۔ کیا شاستری جی کا راجارامن زندہ ہے؟ ہو سکتا ہے ہو۔ یا وہ بھی اپنی جان کا بلیدان دے چکا ہو، لیکن وہ اُس آزاد رُوح کا زندہ جاوید نشان بن کر رہے گا جس پر اُس نے فتح پائی ہے۔ آزاد ہندوستان کا پرچم لہراتے ہوئے وجد آفریں نغمے گاتے ہوئے!!۔

رائے بہادر آر کلیانا رام شاستری وظیفہ یاب ڈپٹی کلکٹر کے کانوں میں رہ رہ کر ایک آواز گونجتی ہے جسے وہ اپنے سر کو جھکا کر سنتے ہیں۔ وہ آواز جسے سُن کر اُن کے چہرے پر پریشانی اور برہمی کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں۔ وہ آوازیں اُن کی کمزور سماعت کے شیرازہ کو درہم برہم کرتے ہوئے ان پر چھا جانے کی جدوجہد میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔

"سلام اپنے دیش کے پرچم کو اور اُس مملکت کو جس کا وہ نشان ہے!"

"یہ پرچم کسی مملکت کا نشان نہیں ہے۔ یہ پرچم کسی شہنشاہی نظام کا نشان نہیں ہے۔ دوسروں پر اقتدار کا پرچم نہیں۔ یہ پرچم آزادی کا نشان ہے!!"

▲

بقیہ صفحہ ۲۸ نسخۂ بھوپال بخطِ غالب پر ایک نظر

کی عمر کے پچیسویں سال ہی میں ہوئی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ چونکہ اُن کا یہ قول پچیس برس میں دیوان کے مرتّب ہونے پر بھی دال ہے اس لئے دیوان کے پہلی بار مرتّب ہونے کا زمانہ اُسی عمر کے قریب ہونا چاہئے۔ اسی دیوان نے لگ بھگ پچیس[2] برس کی عمر میں وہ صورت اختیار کی ہوگی جس کو انہوں نے "بڑا دیوان" سے تعبیر کیا ہے۔ اس لحاظ سے نسخۂ بھوپال بخطِ غالب نسخۂ بھوپال سے دو ڈھائی سال سے زیادہ پہلے کا نہیں ہو سکتا۔

نسخۂ بھوپال بخطِ غالب کی کتابت کا سنہ معدوم محققین کو نئے شواہد کی تلاش و جستجو کی دعوت دیتا رہے گا۔ لیکن یہ ماننے میں اب شاید ہی کسی کو تامّل ہو کہ غالب کی ابتدائی یا بیدل رنگ کی شاعری کا دَور اسی دیوان کے متن کے کلام پر ختم ہوا تھا۔ تحقیقی اعتبار سے یہی انکشاف اس دیوان کی دریافت کا ماحصل ہے۔ یوں پرستش کے لئے یہ اُن کے دستِ خاص کا لکھا ہوا بھی ہے اور اس میں اُن کا کچھ ایسا کلام بھی ہے جو اب تک پردۂ خفا میں پڑا ہوا تھا۔

▲

غلام مرتضیٰ راہی

غزل

کوہ و دشت و دریا کے خوف کو مٹا کر بھی
لوگ چل نہیں پائے راستے بنا کر بھی

آگہی غنیمت ہے سو فریب کھا کر بھی
دیکھ لے تو اپنے کو رنگِ رُخ اُڑا کر بھی

اُس کی ذات میں مُضمر کچھ عجب عناصر ہیں
وہ نظر نہیں آتا روشنی میں آ کر بھی

لوگ ٹھیس لگنے پر چیخ چیخ اُٹھتے ہیں
پُرسکوں ہُوں مَیں کیسی چوٹ کھا کر بھی

رات دِن مَیں دَم اپنی زندگی کا بھرتا ہُوں
سَر بہ سَر توقع کے برخلاف پا کر بھی

مَیں نے سوچ رکھا تھا اور جانے کیا کیا کچھ
ہو رہا ہُوں شرمندہ تجھ کو راس آ کر بھی

'بحرِ موج زن' کے بعد' 'دشتِ بے صدا' ہستی
بچ کہاں سے پائے گا کوئی پار جا کر بھی

جان کی اَماں پا کر بھی زباں نہیں کھُلتی
چُپ ہُوں اپنے دامن کو ہر طرح بچا کر بھی

اے۔ سی بہار

رباعیات

پہلُوئے بشر میں دلِ دیوانہ ہے
آمادۂ صد جراُتِ رندانہ ہے
افلاک پہ اِک خاک کا پُتلا پہنچا
یارو یہ حقیقت ہے کہ افسانہ ہے

اِنساں کی طِلسم ساز ہستی دیکھو
گردُوں پہ بسا رہا ہے بستی دیکھو
ساتھ اِس کے زمیں پہ ہے یہ کتنا پامال!
اِس اَوج کے ہوتے بھی ہے پستی دیکھو

یہ چاند پہ جانا کوئی سازش تو نہیں
تحقیق کے پاؤں کی یہ لغزش تو نہیں
دھرتی پہ جن اعمال سے رُسوا ہے بشر
کیا اُن کو چھپانے کی یہ کوشش تو نہیں

آباد ہُوا چاند پہ دھرتی کا مکیں
ہر سمت سے اُٹھتی ہے صدائے تحسیں
ڈرتا ہُوں کہ دھرتی کو اُجاڑا جس نے
کر دے اب چاند کو نہ تاراج کہیں

مقالہ

سعید احمد خاں

صابر علی خاں صابرؔ

مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ہندوستان میں متعدد چھوٹی بڑی خود مختار ریاستیں وجود میں آگئی تھیں، جن کے حکمراں شمشیر بکف اور قلم بدست رہا کرتے تھے۔ مختلف علوم و فنون کے جاننے والے، اُدبا و شعرا اُن کے زیرِ سایہ علم و ادب کی خدمت کیا کرتے تھے۔ نواب حافظ الملک حافظ رحمت خاں بہادر نصیر جنگ والیِ سابق مُلکِ روہیلکھنڈ محتاجِ تعارف نہیں۔ نواب شجاع الدولہ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی متحدہ افواج سے دادِ شجاعت لیتے ہوئے سنہ ۱۷۷۴ء میں راہیِ مُلکِ عدم ہوئے [1]۔ ان کی پانچویں پُشت میں، صابر علی خاں صابرؔ اعلیٰ پایہ کے شاعر اور بلند مرتبہ صوفی گذرے ہیں۔ جن کے حالات اختلاطِ زمانہ سے مستور اور ادبی کارنامے پردۂ خفا میں تھے۔

صابر علی خاں صابرؔ سنہ ۱۸۶۲ء میں ریاستِ ٹونک میں پیدا ہوئے۔ سایۂ پدری سے تین سال کی عمر ہی میں محروم ہوگئے تھے، اس لیے اِن کے حقیقی چچا مجتبیٰ علی خاں نے پرورش اپنے ذِمّے لی اور تعلیم و تربیت کے لیے ٹونک سے رامپور لے گئے [2]۔ اس ذہین و فہیم بچے نے جلد ہی مُروّجہ نصاب کی تکمیل کر کے اُردو، فارسی اور عربی زبانوں پر قدرت حاصل کر لی۔ صابرؔ نے جب ہوش کی آنکھیں کھولیں تو رامپور کی سرزمین میں ہر طرف شعر و شاعری کا چرچا دیکھا۔ والد صاحبزادہ مختار علی خاں قادر الکلام شاعر تھے۔ نظام رامپوری [3] کے شاگرد تھے اور مختارؔ تخلص تھا۔ سارا کلام، زمانے کی گردش سے تلف ہوگیا، باقیماندہ 'شارخِ نبات' کے ضمیمہ میں شامل ہے [4]۔ چچا محمد مجتبیٰ خاں بھی شاعر تھے۔ محوؔ تخلص تھا [5]۔ دادا محمد ضیاء الدین خاں یاسؔ تھے [6]۔ اِن کے دو شعر بطورِ نمونہ ہدیۂ ناظرین ہیں ؎

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے: History of British India by P. E. ROBERTS.

[2] ملاحظہ ہو 'شاخِ نبات'

[3] رامپور کے سادات میں سے تھے، سید احمد شاہ کے صاحبزادے تھے۔ نظام شاہ نام، نظامؔ تخلص تھا، اُردو، فارسی اور عربی بخوبی جانتے تھے۔ فردوس مکانی نواب یوسف علی خاں ناظمؔ، شیخ علی بیمار اور اپنے پیر و مرشد احمد علی صاحب سے اصلاح لیتے تھے ۷۰ سال کی عمر میں ۱۲۸۹ میں انتقال کیا۔ فنِ شعر سے فطری مناسبت تھی۔ نمونۂ کلام حسبِ ذیل ہے ؎

عادت ہی ہو گئی ہے اُن کی نظام کچھ اور — آ دس بزم سے عدو بھی اب صبح و شام نکلا

بعد رنجش، وہ مِل کے پوچھتے ہیں — میں نہ مِلتا تو آپ کیا کرتے

مزید دیکھیے: کُلیاتِ نظام۔ مطبوعہ: شمس المطابع

[4] شارخِ نبات۔ کُلیات حضرت صابرؔ

[5] کلام اور امیر مینائی کی رائے کے لیے دیکھیے: 'یادگارِ انتخاب'

[6] ملاحظہ ہو شمیم سخن۔ از: عبد الحی صفا بدایونی

گھر میں آنے سے مرے آپ کو ڈر کس کا ہے شوق سے لائیے تشریف یہ گھر کس کا ہے

(کذا) حالِ دل اُن کو سنانے کو تو بیٹھا ہوں مُنہ سے کیا نکلے دمِ گفتار دیکھا چاہیے

پردادا اکبر محمد خاں بھی بلند پایہ شاعر تھے[1] صابر کے خاندان کے دیگر شعرا کی ایک طویل فہرست محمد سلیمان خاں اسد نے تحریر کی ہے[2] ان میں مشہور نواب محبت علی خاں محبت[3] راسخ ، عزیز ، نیاز احمد ہوش ، معروف اور اسد ہوئے ہیں۔ اسد، صابر کے رشتے میں چچا ہوتے تھے۔ اُن سے ٹونک کے اکثر شعرا اصلاح لیتے تھے۔ مختلف عہدوں پر فائز رہے[4] پُر گو اور بلند پایہ شاعر تھے۔ بطور نمونہ ایک شعر تحریر کیا جاتا ہے ؎

دم لبوں پر ہے، زباں بند ہے، آنکھیں بے نُور پُوچھنے آئے وہ کس وقت طبیعت میری

نواب صفدر علی خاں صفدر، جن کا نسب پانچویں پُشت میں حافظ رحمت خاں سے ملتا ہے اور جو خود صاحبِ طبل و علم تھے۔ اُن کی دُختر سے اُنیس سال کی عمر میں صابر کا نکاح ہوا۔ ۱۳۰۵ھ ہجری میں اپنی ہمشیرہ سے ملنے ٹونک آئے، جو ممتاز الامرا حافظ حاجی محمد صدیق خاں صاحب بہادر دلیر جنگ کو بیاہی تھیں۔ بہنوئی کے توسط سے نواب حافظ محمد ابراہیم علی خاں خلیل[5] کے دربار میں رسائی ہوئی، نواب صاحب نے قدر دانی فرمائی اور ریاست کی ملازمت پر مامور کیا۔ بسلسلۂ ملازمت پرگنہ علی گڑھ میں

---

[1] ریاض الفردوس: مؤلفہ: محمد حسن خاں صاحب شاہجہاں پوری

[2] نقشِ سلیمان فی البیان، حالات نواب حافظ رحمت خاں بہادر

[3] نواب موصوف نے اُس زمانے کے مشہور مصوّر عاقل خاں سے شعرا کا ایک مرقعِ تصاویر تیار کرایا تھا۔ جرأت و جعفر علی حسرت کا تعلق اُن کے دربار سے تھا۔ اُردو، فارسی اور پشتو میں شعر کہتے تھے۔ مثنوی سسی پنّوں آپ کی یادگار ہے۔ تفصیل کیلئے دیکھیے تذکرۂ مصحفی۔

[4] تاریخ ٹونک۔ از: اصغر علی ابرؔ۔

[5] نواب محمد علی خاں صاحب بہادر کے فرزند ششم تھے۔ ۱۲۷۳ھ ہجری میں پیدا ہوئے۔ ٹونک میں متعدد اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ناظم سرونج اور ہوم ممبر کی حیثیت سے مقبول ہوئے۔ ۱۳۲۹ھ ہجری میں وفات پائی۔
"نسب نامہ امیریہ"۔ مرتبہ: صاحبزادہ علی احمد خاں صاحب مرحوم (قلمی)

[6] آپ نے ۶۳ سال حکومت کی۔ ۱۹۳۰ء میں انتقال کیا۔ ایک مؤرخ نے آپ کے دورِ حکومت کو دورِ شاہجہانی سے تعبیر کیا ہے۔ عشقِ رسولؐ آپ کی رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا۔ جشنِ عید میلاد النبیؐ کی ابتدا آپ ہی نے کی تھی۔ نمونۂ کلام حسبِ ذیل ہے ؎

لُطف و کرم کی اُن کو جو عادت نہیں خلیل
جور و ستم کی خُو ہی سہی، کچھ نہ کچھ تو ہو
مُنہ سے تو وہ سب کچھ ہیں، وفا بھی تو کیجیے (کذا)
یُوں تو پیماں بھی ہے، وعدہ بھی ہے، اقرار بھی ہے

مزید حالات اور کلام کے لیے دیکھیے:
'خیابانِ خلیل'۔ مرتبہ: اصغر علی ناظم

رہے تو سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے صوفی بزرگ حضرت مولوی ابراہیم علی[1] صاحب روحی کے دستِ حق پرست پر بیعت کی۔ پیر باصفا نے صوفیانہ رموز و حقائق کی تعلیم دی اور مزید تربیت کے لیئے اپنے پیر و مرشد محمد علی شاہ[2] صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ پیر و مُرید دونوں کی توجہ سے تصوّف و سلوک کے تمام مدارج جلد ہی طے کر کے ممتاز صوفی کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔ نواب ابراہیم علی خاں صاحب اور تمام اُمرا بڑی قدر کرتے تھے۔ پرگنہ سرونج میں ۲۴ سال تک منصفی کے عہدہ پر مامور رہے۔ کچھ عرصہ جے پور اور دیولی میں بھی وکالت کے عہدہ کا کام خوش اسلوبی سے انجام دیا[3] لیکن بعض وجوہ کی بنا پر اربابِ حکومت ناراض ہو گئے۔ اس لیئے ٹونک چھوڑ کر رامپور کی طرف رُخ کرنا پڑا۔ رامپور سے جو خاندانی وظیفہ مِلتا تھا وہ بھی بند ہو گیا تھا۔ وہاں بھی عرصہ دراز تک پریشان رہے۔ مشہور ہے کہ صوفیانہ ریاضت کے دوران ایک لغزش کے سبب سے بارہ سال مُصیبت کے گزارنے پڑے۔ آخر کار اس مُدت کے بعد نواب حامد علی خاں صاحب مرحوم والئ رامپور نے توجہ فرمائی۔ اُن سے آپ کی رشتہ داری بھی ہوتی تھی۔ جب صابر نے صنعتِ توشیح حرفی میں ایک قصیدہ پیش کیا تو نواب صاحب موصوف نے بہت پسند فرمایا اور زرّین چوکھٹے میں منڈھوا کر خوابگاہ میں آویزاں کرنے کا حکم فرمایا[4]۔ رامپور میں کافی عرصہ معاشی پریشانی سے آزاد ہو کر علم و ادب کی خدمت کرتے رہے۔ ساتھ ہی صوفیانہ تعلیم سے لوگوں کو فائدہ پہنچاتے رہے، لیکن ۱۹۳۰ء میں نواب صاحب کی وفات نے صابر کو پھر معاشی پریشانیوں میں مُبتلا کر دیا۔ اِس لیئے مجبور ہو کر رامپور کی سکونت ترک کرنی پڑی۔ آپ مرادآباد تشریف لے گئے۔ وہاں تین سال قیام کرنے کے بعد ۶۹ سال کی عمر میں ۱۹۳۳ء کی پہلی جنوری کو راہئ مُلکِ عَدم ہوئے۔ پس ماندگان میں پانچ صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں یادگار چھوڑیں۔ آپ کی صاحبزادی آفاق زمانی بیگم کے شاعرہ ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ صابر کے دیوان میں اُن کا قطع تاریخ موجود ہے۔ صابر کا مزار مُرادآباد میں گھیر سیّد خاں میں مرجعِ خاص و عام ہے۔

صابر کو شاعری ورثہ میں مِلی تھی۔ لیکن اُنھوں نے اِس میراث پر قناعت نہیں کی۔ اپنے خُونِ جگر سے اِس گلزار میں نئے گُل بُوٹے کھِلائے۔ اپنی مشاطگی سے گیسوئے اُردو کو سنوارا اور اپنی کاوش سے شاعری کو نِکھارا ہے۔ مختلف اصنافِ سُخن میں اگرچہ صابر نے طبع آزمائی کی ہے لیکن بُنیادی طور سے وہ ایک غزل گو شاعر تھے۔ اُن کے زمانے میں غزل ہی اُردو

---

[1] مولانا ابراہیم علی خاں روحی ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۵ء میں وفات پائی۔ عربی فارسی کے جیّد عالم تھے۔ اُردو فارسی عربی میں شعر کہتے تھے۔ پہلے فیض اور بعد میں روحی تخلص اختیار کیا۔ ہزاروں کی تعداد میں چہار بیت کہی ہیں۔ فنِ طِب اور تصوّف پر کئی کتابیں آپ کی یادگار ہیں۔ نمونہ کلام حسبِ ذیل ہے ؎

شوقِ موسیٰ اور تجلّی دونوں یکساں ہو گئے　　کیا تماشہ تھا کہ خود محوِ تماشہ کر دیا

پیچھے سب کچھ کہہ رہا تھا' یہ کہوں اور وہ کہوں　　سامنے اُن کے نہ کچھ میں تو نظر آیا (کذا)

دیکھئے: رُوداد کُل راجستھان اُردو سمپوزیم

[2] سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے مشہور صوفی اور مشہور شاعر حضرت نیاز احمد صاحب بریلوی کے مُرید کے مُرید حضرت سکندر علی صاحب کے مُرید تھے۔ ٹونک کے محلہ بھیر میں آپ کا مزار مرجعِ خاص و عام ہے۔ شجرہ کے لیئے ملاحظہ ہو: 'خورشید روحی'۔ مرتبہ: مولنٰا ابراہیم علی صاحب روحی

[3] تاریخ مالوہ۔ مؤلفہ: منشی سیّد احمد مرتضیٰ۔ ص: ۳۰۱

[4] تقریظ شاخِ نبات۔

شاعری کی آبرو تھی۔ اگر مَیں یہ کہوں تو شاید غلط نہ ہوگا کہ اُس دَور میں اُردو شاعری کا نام غزل ہی تھا۔

عاشقانہ، صوفیانہ اور رِندانہ ہر قسم کے اشعار دیوان میں موجود ہیں۔ کلام پر طائرانہ نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر کی طبیعت میں بَلا کی آمد تھی۔ سلاست، رَوانی، سادگی و پُرکاری کلام کی خصوصیات ہیں۔ دیوان کا نام "شاخِ نبات" ہے۔ اس نام سے ہی شیرینی و حَلاوت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ٹونک اور رامپور دو جگہوں کے شاعرانہ ماحول کے پروردہ ہونے کی وجہ سے اشعار میں غضب کا بانکپن پیدا ہوگیا تھا۔ نازک خیالی اور سوز و گداز نے شعروں میں عجب کیفیت پیدا کردی ہے۔

میر کے بہتّر نشتر مشہور ہیں۔ صابر کے دیوان کا پہلا نشتر ملاحظہ ہو جس سے دیوان کی ابتدا ہوتی ہے ؎

کعبہ میں، کلیسا میں، نہ بُت خانہ میں دیکھا — ہم نے اُنھیں کچھ اپنے ہی مٹ جانے میں دیکھا

اب چھوٹی بحروں میں میر کی سی نشتریت ملاحظہ ہو ؎

(کذا) مَر مِٹے تم پہ اور تمہیں — آج تک ہم سے پردہ داری ہے

دامن سے کسی نے پونچھے آنسو — آنکھوں نے یہ میری آبرو کی

(کذا) جو عرض کروں ہے وہ بیجا — جو آپ کہیں سب بجا ہے

محاورہ اور روزمرّہ کا استعمال بھی صابر بڑی چابک دستی سے کرتے ہیں ؎

دیتے ہیں ہم تو حُسن کی قیمت میں جان تک — آگے ہے اختیار تمہیں اپنے مال کا

گھر غیر کے تم نے قیام کیا، مَیں نے کام اپنا تمام کیا — تم نے اُدھر کام کیا، مَیں نے اِدھر اپنا کام کیا

تُو نے بُتوں کے صدمۂ فُرقت سے اے خُدا — کیوں ڈال دی ہے جان ہماری عذاب میں

داغ کا اثر اُس زمانے کے تمام شعرا پر پڑا تھا۔ صابر نے تو رامپور میں کافی عرصہ قیام کیا تھا، اِس لئے داغ کا اثر قبول کئے بغیر نہ رہ سکے ؎

اِک بوسے پہ کیوں ہیں لاکھوں اغماض — دِل دے کے مَیں تم سے لُوں نہ کچھ بھی!

ہنسی، فریاد پر، یہ اے سِتم ایجاد کیسی ہے — خُدا جانے یہی ہے داد تو بیداد کیسی ہے؟

تمہارا وعدۂ فردا بھی کیا روزِ قیامت ہے — نہیں جس کی کوئی معیاد یہ معیاد کیسی ہے؟

کہتے ہیں، شکوؤں سے کیجے نہ پشیماں شبِ وصل — ورنہ پھر ہم سے سوا آپ پشیماں ہوں گے!

چھوٹی بحر ہو یا بڑی، صابر کو دونوں طرح کی بحروں میں شعر کہنے کی مہارت حاصل تھی اور ان میں بڑے عُمدہ شعر کہے ہیں۔ صاحبِ نقدالشعراء کی رائے میں وہ غزل جس سے غزل کا مقصد پُورا ہوتا ہے وہ ہے جس میں عشق و محبّت کی شیفتگی و فریفتگی کے باکثرت دلائل موجود ہوں، جس میں سوز و گداز کے نَو بہ نَو شواہد پائے جائیں[1] اِس لحاظ سے بھی صابر کا کلام اعلیٰ پایہ کا ہے۔ عشق و محبّت کی شیفتگی و فریفتگی کا لُطف لیجئے ؎

غضب ہو، قہر ہو، فتنہ ہو، آفت ہو، قیامت ہو — مجسّم تم ادا و ناز و شوخی و شرارت ہو

پوری غزل مرصّع ہے، الفاظ نگینے کی طرح جڑے ہوئے ہیں ؎

اُن کو شکوؤں سے پشیماں کر کے — ہم ہوئے آپ پشیماں دِل میں

---

[1] 'نقدالشعراء'۔ ص: ۴۲

ہر دم دلِ پُر شوق پر قبضہ ہے بُتوں کا — اللہ کا گھر ہم نے صنم خانے میں دیکھا
ذکرِ دشمن پر وہ مجھ کو دیکھ کر چیں بر جبیں — ہنس کے فرمانے لگے کہیئے محبت کیا ہوئی

سوز و گداز عشق کا لازمی نتیجہ ہے۔ صابر کے دل میں عشقِ الٰہی نے گھر کر رکھا تھا۔ وہ صاحب قال ہی نہ تھے صاحب حال بھی تھے۔ قرآنی آیات سے شعر میں عجب کیفیت پیدا کر دیتے ہیں ؎

باُمیدِ کشائش جھیل لیتے ہیں مصیبت بھی — اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ کی صورت دیکھنے والے
مجھے نااُمیدی ہو رحمت سے کیونکر — کہ قرآں میں آیا لَا تَقْنَطُوْا ہے
صدمۂ ہجر جس کا دوزخ ہے — وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار [1]
جس سے اِیَّاکَ نَعْبُدُ ہے خطاب — اے دل، اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ پکار
تیری ہی شان کے مصداق ہے قُلْ جَاءَ الْحَقُّ — وَزَهَقَ الْبَاطِلُ حصّہ ہے ترے اعدا کا

صابر کی غزل گوئی کی ایک بڑی خصوصیت سوز و گداز، مایوسی اور خستگی ہے۔ وہ فطرتاً خستہ جگر، گداختہ دل، عزلت نشیں، قناعت پیشہ تھے۔ زرطلبی اور ہوسناکی سے اُن کو تعلق نہ تھا۔ اِس لیئے کچھ شعروں کا لب و لہجہ [illegible] اور آتشیں سا ہو گیا ہے۔ اِس سوز و گداز کی کیفیت نے اشعار میں عجب رنگ و اثر پیدا کر دیا ہے ؎

تجھ سے وہ پوچھیں تو کہنا قاصد — زیست سے تنگ رہا کرتا ہے
اِس اُمید پر شاید طلب کر لے کبھی ساقی — پڑا رہتا ہوں زیرِ سایۂ دیوارِ میخانہ [2]
نہ کوئی بیٹھ ہے چین دم بھر طپاں ہے فرقت میں جانِ مضطر — نہ اپنے قابو میں وہ ستمگر، نہ دل پہ ہے اختیار اپنا
دم نکل جائے گا لیکن یہ نہیں نکلیں گے — خود کب دل سے مرے آپ کے ارماں ہوں گے
بے خودیٔ عشق نے آخر کو بےغم کر دیا — دونوں عالم سے دل اب یکسو نظر آیا مجھے

سادگی اور سلاست جو صابر کے کلام کا زیور ہے اُس کا لطف لیجئے ؎

وہ بت بے سبب کیوں خفا ہو گیا — خداوندِ عالم یہ کیا ہو گیا
مناسب ہے غیروں سے پردہ ضرور — مرے خانۂ دل میں بیٹھے رہو
وہ مجھ سے بات کر کے مسکرائے — شگفتہ یوں مرے دل کی کلی ہے
آنکھ جب کھلتی ہے پاتا ہوں وہی تاریکی — یاالٰہی! شبِ فرقت کی سحر ہے کہ نہیں

مشہور مقولہ ہے "تصوّف برائے شعر گفتن خوب است" شیخ مصحفی کا بھی قول ہے: "وَالحق کہ درویشی و شاعری دوش بدوش راہ می رَود" [3] صابر، سلسلۂ چشتیہ کے بزرگ تھے، صاحبِ حال تھے، اِس لیئے اُن کے قال میں حال کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ کلام میں سرمستی و بےخودی ہے۔ اشعار کیا ہیں، بادۂ عرفان کے چکیدہ قطرات ہیں۔ وحدت الوجود، اسمائے الٰہی، نیاز مندی، توبہ و ورع، فقر و فاقہ، بزرگانِ دین سے محبت وغیرہ کے مضامین جابجا ہیں، چند اشعار صوفیانہ ضیافتِ طبع کے لیئے تحریر ہیں ؎

---

[1] غالب نے اِس آیت کو اِس طرح استعمال کیا ہے ؎ دھوپ کی تابش آگ کی گرمی ؛ وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار
[2] میر کے اِس شعر سے مقابل کیجئے ؎ وہ جو کھ بیٹھے پرسے دیکھیں تو میں اپنا کو پوچھوں ؛ بستر اپنا پاس دیوار کروں یا نہ کروں
[3] تذکرۂ مصحفی۔

وَحدتُ الوجود : ـ جب دونوں جگہ ایک ہی جلوہ نُما ہے ؛ پھر ایک ہیں کعبہ و کلیسا مرے آگے
اِس شعر سے غالب کے شعر کا موازنہ کیجئے ـ

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کُفر   کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

غالب تذبذب اور تشکیک کے دائرے میں سرگرداں ہے جبکہ صابر یقین و ایمان کے بلند مقام پر پہنچکر دوسروں کی رہنمائی کر رہے ہیں ـ ایک شعر اسی سلسلے میں اور ملاحظہ ہو ـ

نہیں لیلیٰ وہ مجنوں ہے نہیں مجنوں وہ لیلیٰ ہے   اَنا لیلیٰ کی حالت نے ہٹادی اوٹ محمل کی

رحمتِ خداوندی سے اُمید : ـ مجھے ناامیدی ہو رحمت سے کیونکر ؛ کہ قرآن میں آیا لَاتَقنَطُوا ہے

جو قول ہے سَبَقَت رحمتی علی غضبی   تو پھر بروز قیامت عذاب کیا ہوگا

عشقِ رسُولؐ : ـ دردِ عشقِ مُصطفےٰ ہے راحتِ قلبِ حزیں ؛ ایسے پیارے درد کا پھر کِس کو درماں چاہیئے

ہے کعبہ و دیں اَبرُوئے خمدارِ محمدؐ   ایماں ہے مرا مُصحفِ رُخسارِ محمدؐ

خدا کا جلوہ عام ہے مگر
ہر شخص نہیں دیکھ سکتا : ـ

جلوۂ جمالِ یار کا، کس جا کِدھر نہیں
سچ پُوچھیئے تو اپنی ہی صابر نظر نہیں

سَرمستیٔ عرفان : ـ جب وہ جامِ مئے توحید پلا دیتے ہیں ؛ اپنے ہشیاروں کو دیوانہ بنا دیتے ہیں

جو بادۂ عشق میں ہے مستی وہ بیخودی کب شراب میں ہے   جلے ہوئے دِل میں جو مزہ ہے کہاں وہ لذّت کباب میں ہے

مُشتے نمونہ از خروارے' کے طور پر چند اشعار صوفیانہ مضامین کے درج کیئے گئے ہیں' ورنہ اہلِ بیت کی محبت' خواجہ اجمیریؒ سے والہانہ عقیدت اور اپنے مرشد حضرت مولانا ابراہیم علی صاحب رُوحی کی اُلفت جابجا اشعار میں نمایاں ہے ـ اپنے پیرِ مرشد کے مُرشد حضرت مولانا محمد علی صاحب طاب ثراہ کی تعریف میں جو اشعار آپ کے قلم سے نکلے ہیں' وہ آپ کی والہانہ عقیدت اور بے انتہا محبت کے آئینہ دار ہیں ـ مندرجہ ذیل شعر پر تو علمائے وقت نے آپ کے خلاف کُفر کا فتویٰ دے دیا تھا ـ

مجھے جان سے افضل ایمان ہے   اور ایماں سے اعلیٰ محمد علیؓ

صابر کے دیوان میں جہاں رِندی و سَرمستی' شیفتگی و محبت کے اشعار ہیں' وہاں اُسکے ساتھ ہی جذب و سُلوک اور وَحدتُ الوجُود کے نادر مضامین بھی ہیں ـ آخر میں صابر کے چند فارسی اشعار تحریر کیئے جاتے ہیں' جس سے فارسی ذوق اور قادرالکلامی کا اندازہ ہوتا ہے ـ

خوشا گہ جامۂ ہستی خویشس پارہ کُنم   ز سرحدِ خرد و ہوش خود کنارہ کُنم
ہر زماں ذوقِ وصالِ تُو بجہاں می یابم   جلوۂ تازہ بچشمِ نگراں می بینم
ہر جا ست گر ہوش و خرد دیوانہ شو' دیوانہ شو   یعنی ز صَہبائے مُغاں مستانہ شو' مستانہ شو
ناقُوسِ دَیر و بانگِ حَرم گوشش می کُنی   زاہد اینکہ ہر دو ندائے کیست   (دکنا)

اِن اشعار سے بھی صوفیانہ رُجحان اور وسیع المشربی کا اندازہ ہوتا ہے ـ صابر کی شاعری کا اجمالی جائزہ لینے کے بعد مَیں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ اُردو ادب میں اُن کو مناسب مقام نہیں دیا گیا ـ اُن کا کلام شترگربگی اور سوقیانہ باتوں سے عاری ہے ـ اس میں پختگی اور ہمواری ہے ـ اگرچہ صابر کا کلام خواجہ سید دردؒ اور اصغر گونڈوی سے اعلیٰ پایہ کا نہیں' لیکن اُردو کی صوفیانہ شاعری میں بلاشبہ وہ بلند مقام کے مستحق ہیں ـ

اختر راہی

جُستجُو

حق شناسی کے ہیں لاکھوں زاویئے
خودشناسی کا کوئی نقطہ نہیں

مَیں ازل سے
ایک اِک سے پوچھتا ہوں اپنے بارے میں مگر
کوئی دیتا ہی نہیں سیدھا جواب
کوئی ملتا ہی نہیں میرا سُراغ
مجھ کو اپنی جُستجو ہے

سلسلے جہد و عمل کے،
ارتقائے علم و فن کے جوڑ ڈالے
عقل سے وہم و گماں کے سارے افسوں توڑ ڈالے
کُرۂ ارضی کو اپنے دوش پر مَیں نے اُٹھایا
نیلے اَمبر کو زمیں کے اور بھی نزدیک لایا
چاند کی دھرتی پہ آیا اِس لیئے
خودشناسی کا کوئی نُقطہ ملے؟

حق شناسی کے ہیں لاکھوں زاویئے
خودشناسی کا کوئی نقطہ نہیں!

یعقوب راہی

جُب بھی رات آتی ھے

دُھوپ اُگلتی ہوئی کرنوں کا فسُوں ختم ہُوا
اپنی چہکار سمیٹے ہوئے خوش رنگ طیُور
آشیانوں میں دُبک کر سوئے
رات کی کوکھ سے بے نُور ستارے اُبھرے
اور ہر سمت اندھیروں کی رِدائیں پھیلیں
تیرہ و تار فضا میں کوئی جگنو بھی نہیں
دُور گلیوں میں کسی طرح کی آہٹ بھی نہیں
رات آئی ہے مِرا دَرد جگانے کے لیئے
میرے رُوٹھے ہوئے خوابوں کو سنانے کے لیئے!!

جب بھی ڈھلتا ہے تھکا ہارا دَہکتا سُورج
رات ہر روز دَبے پاؤں کھِسک آتی ہے
دردِ خُفتہ کو جگاتی ہے، چلی جاتی ہے
مَیں وہ مجبُور ہوں جو رات کی تنہائی میں
دَرد کی گود میں چھُپ جاتا ہوں، رو لیتا ہوں
اور جاگے ہوئے دردِ شبِ تنہائی کو
زندگی کے لیئے ہر صُبح بھُلا دیتا ہوں!

معراج انور

بھگوان

گوداوری میں کینال پر کئی گاؤں بسے ہوئے ہیں، چھوٹے بڑے اور خوبصورت۔ جن کے اطراف کی زمین کو نہر کا پانی سیراب کرتا ہے۔ وہ پانی جو صاف بھی ہے۔ میٹھا بھی ہے اور مقدس بھی ہے۔ اپنے پاپ دھونے کے لئے جس میں ہر صبح لوگ نہاتے ہیں اور سورج کی پوجا کرتے ہیں تاکہ وہ بھی گواہ رہے کہ انہوں نے گوداوری کے پوتر پانی میں اپنے پاپ دھوڈالے ہیں۔ وہ اس وقت تک ہی پوتر رہتے ہیں جب تک نہر انہیں گوداوری کے مقدس پانی میں ڈبوئے رکھتی ہے۔ جیسے ہی وہ باہر آئے ان کے جسم کا پانی سوکھنے سے پہلے ہی ان کا دل گندہ ہو جاتا ہے اور جسم بھی ـــ! ان میں ایک پنڈت رام بھی ہے۔ وہ روز نہر میں نہاتا ہے۔ نہر سے ملا ہوا شیو کا جو مندر ہے، وہاں جاکر پوجا بھی کرتا ہے۔ پھر کئی بار پانی میں غوطے لگا لگا کر سورج دیوتا کو بھی خوش کرتا ہے۔ اس کا رنگ گورا ہے لیکن دل کا کالا ہے۔ بالکل سیاہ! اپنے کو پوتر سمجھتا ہے اور ساری دنیا کو اچھوت ـــ اپنے کو ذات کا بڑا سمجھتا ہے۔ لیکن دل کا چھوٹا ہے۔ اس کا خیال بہت پست ہے۔ اس کا ایک چھوٹا سا لڑکا ہے کرشنا، خوبصورت سا۔ گورا اور بھولا، جیسے سب بچے ہوتے ہیں۔ پنڈت رام اسے روز اپنے ساتھ نہر پہ لے جاتا ہے۔ لیکن اسے نہلاتا نہیں، کنارے پر بٹھا دیتا ہے۔ وہ اسے دور ہی سے سب کچھ سکھاتا ہے تاکہ وہ بھی بڑا ہو کر پنڈت کرشنا بنے۔!

ایک دیویا ہے، کشتیاں چلانے والا۔ غریب لیکن ایماندار۔ کڑی دھوپ نے جس کا رنگ کالا کر دیا ہے۔ جوان، صحت مند اور دل کا اچھا۔ وہ بھی نہر میں روز نہاتا ہے۔ خوب رگڑ رگڑ کر اپنے بدن کو صاف کرتا ہے، اس کی نظر میں وہ صاف ستھرا ہے۔ اسے گوداوری کے پانی نے صاف کر دیا ہے۔ وہ شیو کے مندر میں نہیں جاتا۔ کیونکہ وہاں پنڈت رام کا ٹھیکہ ہے۔ وہ اپنے گھر میں شیو کی تصویر کے سامنے کھڑا ہو کر پوجا کر لیتا ہے۔ کیونکہ وہاں پنڈت رام نہیں ہے۔ وہ اس کا اپنا گھر ہے۔ وہاں اس کے اپنے شیو ہیں۔ وہ سوچتا ہے ـــ کون شیو سچے ہیں پنڈت رام کے یا میرے ـ ؟ پنڈت رام ہی کے شیو سچے ہوں گے۔ کیونکہ لوگ پنڈت رام کو بڑا کہتے ہیں اور بڑوں کی ہر بات سچی ہوتی ہے ـــ نہیں۔!! میرے شیو بڑے ہیں! وہ پھر سوچتا، ان کے پاس جانے کے لئے کوئی روک ٹوک نہیں۔ کوئی بھی میرے شیو کے پاس جا سکتا ہے۔ میرے شیو کا دل بہت بڑا ہے۔ وہ جب بھی شیو کے سامنے کھڑا ہوتا ہے بس ایک ہی دعا مانگتا ہے۔ اے میرے بھگوان! میرے ہاتھوں میں قوت دے۔ میرے بازوؤں کو اور طاقتور بنا، تاکہ میں کشتیاں چلا سکوں اور محنت کر سکوں۔ وہ برسوں سے یہی ایک دعا مانگتا آیا ہے اور بھگوان اس کی بات بھی سنتا ہے۔ وہ دن رات محنت کرتا ہے۔ بھگوان نے اسے قوت دکی ہے۔ اس نے کبھی اچھے گھر، اچھے کھانے اور نہ اچھے کپڑوں کے لئے دعا مانگی۔ مانگتا تو کیا پوری ہوتی ـــ ؟

ایک صبح دیویا کشتی چلاتا آرہا تھا۔ کشتی سامان سے بھری ہوئی تھی۔ کنارے کنارے وہ اور اس کے ساتھی چلے آرہے تھے۔ ایک ہی

ساتھ۔ ایک ہی آواز پر۔ دیویا سب کے آگے تھا۔۔۔۔۔ شیو کے مندر سے پنڈت رام پوجا کر کے نکل رہا تھا اور اُس کا بچہ کنارے پر کھیل رہا تھا۔ دیویا بچے کو ہٹانے کے لئے آگے بڑھا۔ اُس نے اپنے ہاتھ آگے بڑھائے اور بچے نے اپنی باہیں آگے کر دیں۔ وہ سمجھا گود میں لے رہا ہے۔ دیویا کے اندر کا باپ جاگ اُٹھا۔ اُس نے بچے کو گود میں اُٹھا لیا اور وہ اُس پیارے بچے کو پیار سے چوم رہا تھا کہ پنڈت رام برس پڑا۔ کمینے! ذلیل! اچھوت!۔ میرے بچے کو چھو لیا؟ ناپاک کر دیا۔!؟" دیویا کے ہاتھ وہیں رُک گئے۔ اُس کے دل کو دھکا لگا۔ اُس کے اندر کا باپ رو پڑا۔ اُس نے بچے کو گود سے اُتار دیا اور معافی مانگی۔ پنڈت رام نے جب تک اپنی گالیاں پوری نہ کر لیں، خاموش نہ ہوا۔ دیویا نیچی گردن کئے چلا گیا۔ مندر کے شیو، رام اور دیویا دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ اور خاموش تھے۔ بچہ سوچ رہا تھا۔۔ آخر اس آدمی کا کیا قصور ہے۔؟ پنڈت رام نے بچہ کو نہلایا اور اُس پر کچھ منتر پڑھے، تب اُسے لے کر گھر آیا۔

ایسی ہی کئی صبحیں آئیں۔ دیویا اُس جگہ سے گزرتا رہا۔ پنڈت رام اُسے دیکھ کر مُنہ پھیر لیتا۔ دیویا بھی اُسے نہ دیکھتا، اُس کے بھگوان کو بھی نہیں۔ صرف معصوم بچے کو حسرت اور پیار بھری نگاہ سے دیکھتا چلا جاتا تھا۔

پھر ایک صبح جب پنڈت رام شیو کے سامنے آنکھیں میچے کھڑا تھا، اور اس کا بچہ کنارے پر کھیل رہا تھا اور کچھ دُور دیویا کشتی کھیتا چلا آرہا تھا۔ صبح کا وقت تھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا، وہ نہا کر باہر نکلا ہو، اُس کا پورا جسم پسینہ میں نہایا ہوا تھا۔ آج کشتی میں کافی سامان تھا۔ ہوا بھی مخالف تھی۔ اُس کی پوری قوت کشتی کو کھینے میں لگی ہوئی تھی اور نگاہ معصوم کرشنا پر۔ ابھی وہ بچہ سے کچھ دُور ہی تھا کہ نہ جانے کیا ہوا بچہ پانی میں پھسل گیا۔ دیویا دور سے چلّایا۔ دوڑو، دوڑو۔! پنڈت رام جلدی سے باہر آیا، دیکھا تو اُس کا بچہ بہا چلا جا رہا ہے۔ اُسے گھبراہٹ میں کچھ نہ سوجھ رہا تھا۔ بس وہ چلّائے جا رہا تھا۔ "بچاؤ۔ بچاؤ۔ میرے بچے کو بچاؤ۔!!۔ دیویا کشتی اور چپّو چھوڑ ایک دم پانی میں کود گیا۔ پھر۔ چند لمحوں کے بعد بچہ دیویا کے ہاتھوں میں تھا۔ لیکن بے ہوش۔ بچے کے پیٹ میں پانی بھر چکا تھا۔ دیویا نے اُس کا پیٹ دبایا۔ کچھ نیچے اوپر کیا۔ پیٹ کا پانی نکل گیا۔ پھر کوئی ایک گھنٹہ کے بعد وہ ہوش میں آگیا۔ پنڈت رام کا چہرہ جو مُرجھا چکا تھا کھِل اُٹھا۔ اُس نے بچے کو گلے سے لگا لیا اور دیویا کو اپنے گھر لے گیا۔ اُسے کچھ روپے بطور انعام دینے چاہے! لیکن دیویا نے روپے لینے سے انکار کر دیا۔ پنڈت رام اصرار کرنے لگا۔ تب دیویا نے اُس سے صرف ایک انعام مانگا۔ بچہ کا ایک پیار! پنڈت رام نے کچھ تامّل کے بعد بچہ کو دیویا کے ہاتھوں میں دے دیا۔ دیویا نے صرف ایک بار پیار سے بچے کو چوم کر اُسے گود سے اُتار دیا۔ اُس کی حسرت، اُس کی چاہ اور اُس کا انعام اُسے مل گیا تھا!

پنڈت رام نے آج کرشنا کو نہیں نہلایا۔ آج دیویا۔ نیچ دیویا، ذلیل دیویا، گندہ دیویا نہ تھا۔ پنڈت رام کے لئے دیوتا تھا۔ بھگوان کے سمان تھا۔!!

مقالہ

بابا جان غفوروف (روس)

(انتخاب)

امیر خسرو ـــ ہندوستان کے عظیم انسان دوست شاعر

ہندوستان انسانی تہذیب کے قدیم ترین مرکزوں میں سے ہے اور اس نے اپنی ۵ ہزار سال کی تہذیبی تاریخ میں دنیا کو بہت سے عظیم سائنسداں، صاحبانِ ثقافت، ادیب، فلسفی اور مذہبی عالم دیئے ہیں جن کی تخلیقات نے پوری نوع انسانی کی تہذیب و ثقافت کے ارتقاء کو فروغ دیا ہے۔ اس وقت میں ہندوستان کی ادبی تخلیق اور سماجی فکر کے میدان کی صرف ایک ایسی عالی دماغ شخصیت کے متعلق اپنے خیالات قارئین کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں جس کی تخلیقات کو ہمارے وسیع ملک کے بہت سے لوگ بھی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

یہ عالی دماغ شخصیت ہندوستانی عوام کے عظیم فرزند امیر خسرو دہلوی کی ہے جو شاعر اور مفکر تھے۔ امیر خسرو نے اب سے ۔ سو سال پہلے (۱۲۵۳ء تا ۱۳۲۵ء) اپنی گراں قدر تخلیقات پیش کیں اور ان کے امر گیت اب تک کروڑوں انسانوں کو اپنا والہ و شیدا بنائے ہوئے ہیں۔ امیر خسرو کی پیدائش و پرورش ہندوستان کی مقدس سرزمین پر ہوئی لیکن ان کی شاعری کا بیشتر حصہ جس زبان میں ہے اس کی وجہ سے ان کا کلام وسط ایشیا، ایران، افغانستان اور دوسرے بہت سے لوگوں کے لئے تہذیبی دولت بن گیا ہے جہاں ان کی غزلیں گائی جاتی ہیں اور لوگ آج تک ان سے سرمایۂ مسرت و انبساط حاصل کرتے ہیں۔ امیر خسرو ادب عالیہ کے اُن اساتذہ میں سے ہیں جن کی تخلیقات پر امتدادِ زمانہ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ انہوں نے اپنے گیتوں میں محبت، دوستی، مقصد کے لئے بلندی و پاکیزگی، بھائی چارے، عام انصاف جیسے بلند جذبات و خیالات کی عظمت و اہمیت کے گُن گائے جو دائمی ہیں اور جن کی اہمیت اُس وقت تک برقرار رہے گی جب تک انسان کے دم میں دم ہے۔ اُن کی شاعری کے متن و مواد کی گہری انسانی خوبیوں ہی کی وجہ سے انہیں ایسی قبولیت عام حاصل ہوئی ہے جس پر نہ جانے کتنے ادیب و شاعر رشک کر سکتے ہیں۔ ہندوستان کے ایک عظیم سپوت جواہر لال نہرو نے اپنی تصنیف "تلاشِ ہند" میں لکھا ہے کہ ہم کسی اور ایسی مثال سے واقف نہیں ہیں کہ ۶ سو سال پہلے کے لکھے ہوئے گیتوں کی مقبولیت برقرار رہی ہو اور وہ متن میں کوئی تبدیلی کئے بغیر گائے جاتے ہوں۔

خسرو کے گیتوں کو مشرق کی قوموں کی غنائی شاعری میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ادبی مہارت کے ساتھ ساتھ موسیقی کے عناصر، تصوری کی پذیری اور جمالیات کی وہ شبک پُرکاری جو ہندوستان کی مینا تور تصوری کا خاصہ ہے خسرو کی شاعری میں ایک آفاقی جاذبیت پیدا کر دیتی ہے۔ بادی النظر میں ایسا لگتا ہے کہ ان کی غزلیں جو اُن کے ۵ دیوانوں میں موجود ہیں انہیں شاعر کی ... تمام جذبات و احساسات کی دنیا کی آئینہ دار ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا

شاعرِ مبئی

ہے کہ اُن کی غنائی شاعری کے مرکزی کردار خود شاعر اور اُس کا محبوب ہیں اور ان غزلوں کا خاص موضوع شاعر کے محبوب کا حُسن ہے، اُس کے عاشق کی وفاداری اور خلوص ہے اور اس کے عشق کی عظمت و قوّت، گہرائی اور اُستواری ہے۔ لیکن شاعر کی محبت جتنی زیادہ گہری اور پختہ ہے اُس کا محبوب اُتنا ہی خوبصورت، نازک اور اُتو ہی معلوم ہوتا ہے اور اپنے عاشق پر ظلم و ستم کرنے کی اُس کی خواہش اتنی ہی شدید ہے۔ شاعر مبتلائے رنج والم ہے اور خوشی اُس سے کوسوں دُور ہے۔ رنج و غم، درد و کرب، ہجر و اُمید اُس شاعری و جدانی شاعری کا موضوع ہیں جو خود ہی اپنے کلام کا مرکزی کردار معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ شاعری قاری کو متاثر کرتی ہے اور رفتہ رفتہ غنائی مرکزی کردار کی تمثیل پس منظر میں چلی جاتی ہے اور اُس کی جگہ خود قاری آجاتا ہے۔ شاعر کے جذبات و احساسات خود ہمارے جذبات و احساسات ہو جاتے ہیں۔ ہر وہ چیز جو شاعر کے دِل پر اثر کرتی تھی اور جس سے اُسے خوشی ملتی تھی یا رنج ہوتا تھا وہ، شاعر کی پوری رُوحانی زندگی خود قاری کی داخلی دنیا کا جزو بن جاتی ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ شاعر نے خود اپنے داخلی جذبات کی نہیں، بلکہ بالعموم اِنسانی روح کے جذبات و خواہشات کی عکّاسی کی ہے۔

خسرو کی غنائی شاعری کی محبوبہ بھی گوشت پوست کا ایک اِنسان نہیں ہے، بلکہ وہ تجریدی اور تعمیمی تمثیل ہے۔ باوجود اس کے کہ شاعر نے اُس کا سراپا بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ شاعر کی محبوبہ دائمی حُسن کا پیکر معلوم ہوتی ہے۔ ایسا حسن جو کامل ہے لیکن جو واقعی زندگی میں ناقابلِ حصول ہے۔ محبوبہ کا حُسن اور اُس کی دِلکشی صحیح معنوں میں بھرپور زندگی کی علامت ہے۔ اور اس کی سرد مہری صحیح معنوں میں کامل، خوبصورت اور معقول و منظّم زندگی کی نارسائی کی علامت ہے۔ دراصل یہی خوبی ہے جس نے خسرو کی غزلوں کو صدیوں سے قارئین کے اُن وسیع حلقوں کے لئے دبے دبائے جذبات کے اِظہار کا وسیلہ بنا دیا ہے جنہیں اپنے دِل آویز خوابوں کی اور رنج و غم کی عکّاسی مل جاتی ہے جو صرف یک طرفہ محبت ہی کا نہیں بلکہ بے سروسامان زندگی کی محرومیوں اور ذمّہ داریوں کا بھی نتیجہ ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ایسی غزلیں بھی ہیں جنہیں نسلاً بعد نسلاً نہ جانے کتنے لوگوں نے خوشی و انبساط کے جذبات کا اِظہار کرنے کے لئے پڑھا ہے۔ خسرو کی غنائی شاعری پاکیزہ، بلند اور بے لوث دوستی کی آیات بھی ہیں۔

"دوست اور رفیق کہے جانے کا صرف وہی شخص مستحق ہے جو خوشی میں بھی آپ کا دوست ہو اور غم میں بھی۔ اور اگر کوئی صرف خوشی میں دوست ہو اور غم میں آنکھیں پھیر لے تو اُسے دوست نہیں دشمن کہو۔

اپنے اہم معاملات کسی ایسے شخص کے سپرد نہ کرو جسے نِگاہوں میں پرکھا نہ جا چکا ہو۔"

خسرو کی غزلیہ شاعری نے مشرق کی قوموں کے غنائی صنفِ سخن کو بے مثال بلندیوں پر پہنچا دیا اور بڑی حد تک اِس صنفِ سخن کے مزید ارتقاء کا تعین بھی کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ شیرازی (متوفی ۱۳۸۹ء) جامی (۱۴۱۴ء تا ۱۴۹۲ء) اور نوائی (۱۴۴۱ء تا ۱۵۰۱ء) جیسے عظیم صاحبانِ شعر و ادب خسرو کا اِس قدر احترام کرتے تھے اور اُنہیں اپنا اُستاد تسلیم کرتے تھے۔

لیکن غنائی شاعری خسرو کی بے شمار اور رنگارنگ تخلیقات کا صرف ایک حصّہ ہیں۔ ماضی کے کسی اور شاعر نے شاید ایسا گراں قدر ورثہ نہیں چھوڑا۔ اندازہ یہ ہے کہ خسرو کا کلام پانچ لاکھ ابیات پر مشتمل ہے۔ اِن میں سے مثنویاں خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں جو اقوامِ مشرق کے ادب کی ممتاز شاہکار ہیں۔ یہ مثنویاں انتہائی فنّی محاکات سے بھری پڑی ہیں جن میں صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ اُس وقت کے پورے وسط مشرق کے جاگیردارانہ سماج کی مختلف سماجی تہوں کی زندگی کی روشن، بھرپور اور حقیقت پسندانہ تصویر پیش کی گئی ہے۔

شاعر-میٔ

خسرو ایک امیر جاگیر دار گھرانے میں پیدا ہوئے تھے لیکن جیساکہ ولادیمیر لینن نے کہا ہے، سچے فنکار صحیح معنوں میں صاحبِ استعداد شاعر ہمیشہ اپنے محدود طبقاتی مفاد سے بلند تر ہو جاتے ہیں اور خسرو ایسے ہی فنکاروں میں سے تھے، جو سارے داخلی تعصبات سے بلند ہو کر انسانی آرزوؤں اور اُمیدوں کے ترجمان بن جاتے ہیں۔ اُنہوں نے لکھا ہے کہ :-

" بادشاہ کے تاج کا ہر موتی بدنصیب کسان کی آنکھوں سے ٹپکے ہوئے خون کے آنسو کا منجمد قطرہ ہے۔"

خسرو کے کلام میں جن اہم سماجی مسائل کو فنّی چابکدستی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے انہیں سمجھنے کے لئے ہمیں اُن تاریخی حالات کو ذہن نشین رکھنا چاہیے جن میں اس شاعر نے زندگی بسر کی اور اپنی تخلیقات پیش کیں۔ تیرھویں صدی کے نصف آخر اور چودھویں صدی کے ربع اوّل میں ہندوستانی عوام کو بہت سی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ مسلمان جاگیر دار اُمراء کے مختلف گروہوں میں مقبوضہ علاقوں کی تقسیم اور بار بار دیگر تقسیم کے لئے اقتدار کے لئے شدید جدوجہد جاری تھی۔ ان اُمراء نے تیرھویں صدی کے شروع ہی میں شمالی ہندوستان کے بڑے حصّے پر قبضہ کر لیا تھا۔ مقامی ہندو جاگیر دار اور سردار اپنے کھوئے ہوئے علاقوں اور دولت کو حاصل کرنے کی کوشش میں ترک امیروں اور ان کے سرخیل، سلطان سے شدید لڑائیاں لڑا کرتے تھے۔ ملکی و غیر ملکی اُمراء کی اُوپری تہوں نے اپنی عارضی فوجی کامیابی کے نشے میں چور ہو کر ملک کو خوب خوب تاراج کیا۔ آئے دن کی جنگوں اور فوج کشی نے جو صاحبانِ اقتدار کی ہوا و ہوس کی تشفی کے لئے کی جاتی تھیں۔ محنت کش عوام کو زیر بار کر رکھا تھا جن کی محنت پر سماج کی بنیاد قائم تھی۔ منگول فوجوں کے پے در پے حملوں نے صورتِ حال کو اور زیادہ خراب کر رکھا تھا۔ جو پنجاب، اور ملک کے دوسرے علاقوں کو لوٹا کرتی تھیں اور اکثر دار السلطنت دہلی کی فصیلوں تک پہنچ جاتی تھیں (۱۲۸۶ء میں امیر خسرو کے والد جو سلطانِ دہلی کی فوج میں سردار تھے، گرفتار کر لئے گئے اور اسی سال جب منگولوں نے ملتان کے صوبیدار کو شکستِ فاش دی تو امیر خسرو کا بھی وہی حشر ہوا اور وہ صرف ایک حسنِ اتفاق کی وجہ سے قید سے نکل آئے۔)

شعر کے جذب و اثر سے پوری طرح واقف ہونے کی وجہ سے امیر خسرو نے اپنی مشہور مثنوی "مطلع الانوار" لکھی۔ اس مثنوی میں اُنہوں نے صاحبانِ اقتدار و اختیار سے حکمرانوں، صوبیداروں، سالاروں اور بادشاہوں سے پُرزور درخواست کی کہ وہ عقل کے ناخن لیں۔ دانش اور انصاف کو شعار بنائیں اور اپنے پڑوسیوں سے محبّت کریں۔ اُنہوں نے ان لوگوں کو مشورہ دیا کہ ہتھیار الگ رکھ کر اپنے بھائیوں کا خون بہانے سے باز آئیں اور اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے ان فصلوں کو نہ روندیں جو بے گناہ کسانوں کے خون پسینے سے اُگی ہیں۔ شاعر نے ظالموں کو خبردار کیا ہے کہ ایک دن ایسا بھی آئیگا جب اُنہیں اپنے کئے کی سزا ضرور ملے گی اور اُنہیں عذاب الیم سے ڈرایا ہے۔

شاعر نے اپنے زورِ بیان اور اپنی مساعی کی بدولت آپس کی جنگ کو ختم کرانے میں کامیابی حاصل کر لی۔ اُس نے سلطان کیقباد اور بنگال کے صوبیدار بغرا خان کے درمیان (جو کیقباد کا باپ تھا) صلح صفائی کرانے میں سرگرمی سے حصّہ لیا اور جب شاعر کی کوشش کامیاب ثابت ہوئی اور جب ان حکمرانوں نے اپنے جھگڑوں کا تصفیہ کر لیا تو شاعر نے اِس موقع کے لئے ایک خاص مثنوی لکھی، جس کا نام ہے "قرانِ السعدین" جس میں اُس نے دوستی اور امن کے گیت گائے ہیں۔

فرقہ وارانہ اختلافات اور جھگڑے ہمیشہ سے شدید ترین بُرائیوں میں رہے ہیں اور ان کی وجہ سے ہندوستانی سماج میں اختلاف اور انتشار پیدا ہوتا رہا ہے۔ حکمراں طبقے اِس سے فائدہ اُٹھاتے تھے اور ہندو مسلم نااتفاقی کو ہوا دے کر اپنے اقتدار کو مستحکم بناتے تھے۔

اپنے اِنسان دوستانہ نظریات اور اِس بات کا اِظہار کرنے کے لئے کہ فرقہ وارانہ جھگڑوں سے کس قدر نقصان

پہنچا ہے۔ امیر خسرو نے اپنی اہم اور عمدہ مثنوی "خضر خاں دیول رانی" لکھی۔ اِس مثنوی میں انہوں نے بے مثال فنی چابکدستی اور مہارت کے ساتھ ایک مسلمان نوجوان خضر خاں اور ایک ہندو لڑکی دیول رانی کے پاکیزہ و دلنواز عشق کی داستان بیان کی۔ یہ دونوں خسرو کے ہم عصر تھے جنہیں مذہبی تعصبات کی کھڑی ہوئی بلند دیواروں نے ایک دوسرے کے قریب نہ آنے دیا اور مذہبی ناروا داری اور کٹر پن کا شکار ہو کر دونوں مر مٹے۔

ہندوستان کے لئے ایک اور تشویش کن مسئلہ اُس کی لسانیاتی رنگارنگی کا تھا جو ملک کی مرکز بندی اور اتحاد کے راستے میں رکاوٹ بن رہی تھی۔ خسرو نے اپنی مثنوی "نہ سپہر" میں اِس مسئلے سے بحث کی ہے جو دراصل شاعر کے زمانے کے ہندوستان کی ایک انسائیکلو پیڈیا ہے۔

شاعر نے اپنے وطن کے مناظرِ فطرت، اُس کی پہاڑیوں اور وادیوں، ندیوں اور جنگلوں، پودوں اور پھولوں کا ذکر بڑے حُسن دل پذیری کے ساتھ کیا ہے اور اپنے گہرے وطن پرستانہ جذبات کا اظہار کیا ہے۔ خسرو نے مختلف عقائد اور طرزِ عبادات، دیو مالاؤں اور خیالات کے ارتقاء کی تاریخ بتائی ہے اور اِس سلسلے میں زبانوں اور بولیوں کے بارے میں اُن کے خیالات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اِس بات کا ذکر بڑی تندی کے ساتھ کیا ہے کہ زبان ایک دیوار بن کر ہندوستان کے عوام کو غیر متحد بنائے ہوئے ہے۔ قدیم ہندوستان کے تہذیبی ورثے کے لئے انہوں نے بڑی قدر و منزلت کے جذبات ظاہر کئے ہیں اور سنسکرت کی بہت تعریف کی ہے۔ "جو اُتنی ہی بجل، وسیع اور پُر معنی ہے جتنی کہ عربی زبان ہے" جو کہ قرآنِ کریم کی زبان ہے۔

ازمنۂ وسطیٰ میں سرکاری نظریئے کے خلاف نظریاتی مزاحمت کی ایک صورت کی حیثیت سے تصوّف کا فروغ ہوا۔ اِس سے اُس عہد کے ترقی پسند مفکروں کو اِس کا موقع ملا کہ کتابوں کی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں۔ جو جاگیردارانہ نظریئے کے خلاف تھے۔ صوفیوں نے انسانوں کی برابری، نوعِ انسانی سے محبت اور دولت سے بے نیازی کے خیالات کا پرچار کیا جس کی وجہ سے عام لوگ اُن کی طرف مائل ہوئے۔ امیر خسرو کا تعلق صوفیوں کے سلسلۂ چشتیہ سے تھا جس کے اراکین عام لوگ، کسانوں اور دستکاروں میں تبلیغ کرتے تھے۔ تصوّف نے اپنے آپ کو ہندوستان کے اُن غیر اسلامی عقائد میں مدغم کر کے جو عوام میں رائج اور راسخ تھے۔ اُن کے مفاد کے عام اظہار کی صورت اختیار کر لی۔ نظام الدین اولیاؒ اور دوسرے صوفیا کی تعلیمات کی روشنی میں امیر خسرو نے بھی انسانی برابری کا پرچار کیا اور سماجی درجہ بندیوں کو نظر انداز کیا۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ ہر انسان ایک ہی اُلوہی جوہر کا حامل ہے۔ یہ خیالات نہ صرف یہ کہ اُن کی طویل مثنویوں مثلاً "مطلع الانوار" اور "مجنوں لیلیٰ" میں بلکہ دیوانوں کے بڑے حصّے میں اور دوسری تخلیقات میں بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔

خسرو کے خمسہ کا ذکر کرنا خاص طور سے ضروری ہے۔ اِن مثنویوں کا ذکر کرنے سے پہلے میں آپ کی توجہ اُس بر خود غلط نظریئے کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو بعض ادبی مؤرخوں اور زبان دانوں میں رائج ہے کہ خمسۂ خسرو کی مثنویاں بجائے خود کوئی فنی اہمیت نہیں رکھتیں اور صرف نظامی گنجوی کے خمسے کا تتبع ہیں۔ اِس طرح کی رائے سے متفق ہونا ذرا مشکل ہے۔ یہ صحیح ہے کہ پانچوں مثنویوں کا موضوع نظامی سے مستعار لیا گیا ہے۔ لیکن امیر خسرو نے انہیں موضوعات کو مختلف اور ممتاز فنی اُسلوب کے ساتھ پیش کیا ہے۔ خسرو کے خمسے کی ساری مثنویاں اسلوب اور ہیئت سے فنی مسائل کی تشریح و تفسیر کے اعتبار سے، محاکات کی نوعیت کے اعتبار سے، پلاٹ کے ارتقاء کے اعتبار سے نظامی کی مثنویوں سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ خسرو نے "اپنی نظم کے ہندوستانی حُسن کو وہ لباس پہنا دیا ہے" جو گنج میں بنا تھا۔

ہم خمسے کی پہلی مثنوی "مطلع الانوار" کا پہلے ہی ذکر کر چکے ہیں۔ یہ مثنوی تصوّف کے فلسفیانہ مسائل کے بارے میں ہے اور انسانی شخصیت کے انسان دوستانہ تصوّرِ کُلّی کا اظہار ہے جو دراصل شاعر کے اُس فلسفیانہ نظام کا سنگِ بنیاد ہے،

جسے اُس نے اپنی ساری تخلیقات میں برقرار رکھا ہے۔

خمسے کی دو اور مثنویاں "شیریں خسرو" اور "مجنوں لیلیٰ" بلند انسانی جذبات، پاکیزہ محبت اور انسانوں کے درمیان اخلاقی رشتوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ امیر خسرو کے نزدیک محبت صرف ایک اِنسان سے دوسرے اِنسان کے لگاؤ کا نام نہیں ہے بلکہ اپنے جذبات کی اُستواری، وفاداری، احساسِ فرض، پاکیزگی اور مقصد کی بلندی محبت کے خواص ہیں۔ امیر خسرو نے محبت کو ایک سماجی متن و مواد کا حامل بھی بنا دیا ہے۔ مثلاً شیریں کی بے لوث محبت کے زیرِ اثر بادشاہ خسرو کی طبیعت میں پاکیزگی آئی اور اُس نے اپنی بُرائیوں سے چھٹکارا پالیا۔ لیلیٰ مجنوں کی اَلمناک محبت کو قبائلی تعصبات اور احمقانہ خاندانی جھگڑوں نے پروان نہ چڑھنے دیا اور اُس کا انجام دو چاہنے والوں کی موت پر ہوا جس کی وجہ سے ان کے قبیلوں کو اپنے تعصبات کی لغویت کا احساس ہوا۔

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ امیر خسرو کی اِن مثنویوں اور اُن کے عدیم المثال اسلوب نے اُردو، فارسی، پنجابی، سندھی، اور کشمیری میں منظوم عشقیہ کہانیوں کی صنف کے ارتقاء کا سامان کیا۔ اِس اَثر کی واضح مثال مشہور شاعر فیضی کی مثنوی "نل دمن"، پنجابی شاعر وارث شاہ کی مثنوی "ہیر رانجھا" اور "مرزا صاحباں" اور سندھی زبان کی مثنوی "سسی پنوں" وغیرہ میں۔ مشہور مثنوی "آئینۂ اسکندری" خمسے کی چوتھی مثنوی ہے۔ اِس مثنوی میں امیر خسرو نے یونانی سالار مقدونیہ کے اسکندر کو مثال بنا کر اپنا معروف نظریہ پیش کیا کہ ایک روشن ضمیر اور منصف بادشاہ ہو جس کی بہی خواہی کے ذریعے ایک یوٹوپیائی سماج کی تخلیق ہو جہاں عام خوش حالی اور فلاح، سماجی برابری اور انصاف ہو۔ یہ مثنوی ایک پُر جذبات وعظ ہے جس میں شاعر نے اپنے زمانے کے سلاطین کو اور خاص طور سے علاؤ الدین خلجی (۱۲۹۶ء تا ۱۳۱۶ء) کو مخاطب کیا ہے۔

خمسہ کی آخری مثنوی "ہشت بہشت" میں ایک منصف بادشاہ اور عام سماجی خوش حالی کے خیال کو اور زیادہ نکھار سنوارا گیا ہے۔ اس کے لئے شاعر نے "تری پناکا" اور "رامائن" کی کہانیوں کا عام طور سے اِستعمال کیا ہے اور ایسے بلند اشعار رقم کئے ہیں جو آج تک بے پناہ فنی لطف کا سرچشمہ ہیں۔

امیر خسرو کی تخلیقات اتنی وسیع اور اتنی ضخیم ہیں کہ ایک مقالے میں اُن کا سیر حاصل تجزیہ کرنا ناممکن ہے جن مثنویوں اور دیوانوں کا ذکر اوپر آچکا ہے اُن کے علاوہ امیر خسرو نے سائنس، تاریخ وغیرہ پر بہت سی تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں۔ اِن کی فہرست ہی کے لئے ایک دفتر چاہیئے۔ . . . . . فنی اور اَدبی کاوش کا کوئی میدان ایسا نہیں ہے جس میں اِس عظیم شاعر و مفکر نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔

یہ کہتے ہوئے بڑا افسوس ہوتا ہے کہ ابھی تک ہم پر اِس شاعر کا جو قرض ہے وہ ہمارے ملکوں کے ماہرینِ علم زبان اور عالموں نے ادا نہیں کیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ جب خسرو کی وفات ہوئی تو چھاپے خانے نہ تھے اُن کے کلام کی نقلیں ہاتھ سے کی گئیں۔ نقل کرنے والوں نے ظاہر ہے کہ تبدیلیاں کیں۔ اضافے کئے، متن کو کچھ کا کچھ بنا دیا۔ اِس عظیم شاعر کی بیشتر تخلیقات ابھی تک اپنی اصل صورت پہ بحال نہیں کی جا سکی ہیں۔ سوویت یونین اور دوسرے ملکوں کے کتب خانوں میں جو قدیم نسخے ہیں اُن کی بنیاد پر "مجنوں لیلیٰ"، "خضر خاں دیول رانی"، "ہشت بہشت" اور غزلیات کے چند دیوانوں کے تنقیدی متن تیار کئے گئے ہیں۔ چند سال پہلے ہمارے اِدارے نے "مجنوں لیلیٰ" کا متن شائع کیا ہے۔ اور جلد ہی اِس کا منظوم رُوسی ترجمہ شائع ہو جائیگا۔ خسرو کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر بہت سے تحقیقی مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ لیکن یہ سب ناکافی ہے۔ اِس شاعر کی ساری تخلیقات کے تنقیدی متنوں کی اِشاعت کے لئے اور اِس کی شاعری کے سیر حاصل مطالعہ کے لئے ضروری ہے کہ بہت سے ملکوں کے اور خاص طور سے ہندوستان، سوویت یونین، ایران اور افغانستان کے صاحبانِ علم مشترکہ طور پر کوشش کریں۔ شاید بہتر یہ ہو کہ ایک خصوصی بین الاقوامی ادارۂ امیر خسرو دہلوی قائم کر دیا جائے جہاں مندرجۂ بالا ملکوں کے صاحبانِ علم اپنے مساعی کو یکجا کر سکیں۔ (باقی صفحہ ۵۴ پر)

ایم۔اے۔شمیم

عزم دل کا ہوتا ہے اور بھی جواں یارو
زیست جب بھی لیتی ہے اپنا امتحاں یارو

مہر و ماہ ہیں ہم بھی لیکن اس کو کیا کہیئے!
قریہ قریہ پھرتے ہیں خوار و بےمکاں یارو

میں کسی کے قدموں کا ایک نقش مبہم ہوں
میری جستجو میں ہے گرد کارواں یارو

نفرتوں کے شعلوں میں لوگ کیوں جھلستے ہیں؟
کس لیئے ہر اک چہرہ ہے دھواں دھواں یارو؟

کس طرح چھپاؤ گے، شکلِ لالہ و گل میں
جب پکار اٹھے گا خونِ کشتگاں یارو؟

اک نئی سحر لے کر آفتاب نکلا ہے
کھول کر ذرا دیکھو بند کھڑکیاں یارو

آبروئے گلشن ہے "جانِ لالہ و گل" بھی
ہے شمیم کے دم سے رنگِ گلستاں یارو

ظفر غوری

کہتے ہیں شہرِ دل پہ رقیبوں کا راج ہے
اے دوست! اہل شہر کا کیسا مزاج ہے
پھرتے ہیں کتنے لوگ اٹھائے ہوئے صلیب
کتنوں کے سر پہ آج بھی کانٹوں کا تاج ہے
تاریخ آ رہی ہے کسی سمت موڑ پر
ہر رسم و راہِ کرب و بلا عام آج ہے
بیزار ہر نفس ہے خود اپنے وجود سے
اے زندگی بتا تو ترا کیا علاج ہے؟
انسان اپنی ذات سے تنہا کہاں رہا
ہر فرد اپنے آپ میں پورا سماج ہے
اس عہدِ فتنہ کار سے جائیں کہاں ظفر
سانپ آستیں میں پالنا جس کا رواج ہے

خالد رحیم

دھوپ میں تپتے، پیاسے صحراؤ
میں سمندر ہوں، مجھ کو پی جاؤ
کون ہوتا ہے، کس کا دنیا میں
دور رشتوں کا بوجھ پھینک آؤ
دل کا دروازہ سونا سونا ہے
کاش زنجیر آ کے کھٹکاؤ!
خامشی کے جھلستے آنگن میں
دل کی باتوں کو دفن کر آؤ!
جسم کی تازگی ہی مت ڈھونڈو
روح کے درد کو بھی اپناؤ
گرمیاں چاہتے ہو گر خالد
آتشِ دل کو اپنی بھڑکاؤ

(کشمیری)

صوفی غلام محمد
ترجمہ: نور شاہ

دِل اور دیوار

دھرم سنگھ کی زندگی یوں تو ایسے اَن گنت واقعات سے بھرپور تھی۔ لیکن آج جو واقعہ اُس کی نظروں کے سامنے اتھل پتھل مچا رہا تھا وہ اُس کے لئے کافی چونکا دینے والا تھا۔ اُس نے سن رکھا تھا کہ خواب کبھی حقیقت کا رُوپ نہیں دھارتے مگر آج اُس نے دیکھا کہ خوابوں نے سچ مچ ہی حقیقت کا پیرہن پہن لیا تھا۔ پُورے بیس سال بعد آج پھر ایک بار دھرم سنگھ اپنے گاؤں لوٹ آیا تھا۔ وہ گاؤں جہاں اُس نے اپنی ماں کی کوکھ سے جنم لیا تھا جہاں اُس کا بچپن، اُس کا لڑکپن بیتا تھا۔ جہاں اُس کی جوانی نے ایک نیا رُوپ ایک نیا رنگ اپنا لیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا، یہ فسادات، یہ لُوٹ مار اور جنگ کیسے عام لوگوں کو گھر سے بے گھر بنا دیتی ہے۔ یہ فسادات، یہ لُوٹ مار اور جنگ کبھی انسان کے ارمانوں اور آشاؤں کو پنپنے نہیں دیتی۔ یہ جنگ اپنے دامن میں ہمیشہ بربادی، پریشانی اور پشیمانی لاتی ہے۔ مگر یہ عجیب بات تھی۔ دھرم سنگھ سوچ رہا تھا، اگر یہ جنگ نہ ہوئی ہوتی تو اُس کے خوابوں نے کیونکر حقیقت کا پیرہن اوڑھا ہوتا۔ اُس نے بس ایک لمحے میں عمر کی بیس منزلیں طے کر لی تھیں۔ وہ پھر اُسی گاؤں میں لوٹ آیا تھا، جہاں کے درختوں کی ٹھنڈی اور میٹھی چھاؤں میں اُس کا بچپن بیتا تھا۔ جہاں کی چہل پہل کرتی ہوئی ندیوں کی شیریں گہرائیوں میں اُس نے نرم و نازک مچھلیوں کی طرح اپنے ہاتھ پاؤں پھیلائے ڈبکیاں لگائی تھیں جہاں اُس نے سُورج ڈوبتے سمے ہیر رانجھا کے مدھر رسیلے بول گنگنائے تھے اور جہاں اُس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ کبڈی کھیلی تھی — یہ جنگ اُس کے خوابوں کی زندۂ جاوید تصویر تھی۔ صرف ایک دن پہلے اُسے پتہ چلا کہ کل سویرے وہ دشمن پر حملہ کرنے جا رہے ہیں۔ مگر اُسے کیا معلوم تھا کہ یہ وہی جگہ ہوگی۔ اپنا گاؤں، اپنی مٹی، اپنی دھرتی۔ افسر لوگ اپنے فوجیوں کو آخری لمحہ تک نہیں بتاتے کہ حملہ کب، کیوں اور کس جانب ہوگا۔ فوجیوں کو جنگ کا احساس بس اُس لمحے ہوتا ہے جب اُن کی بندوقیں آگ اُگلنا شروع کر دیتی ہیں۔ جب دھرتی دھواں بن کر پگھلتی ہے۔ ہواؤں میں زہر گھل مل جاتا ہے۔ انسانوں کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ سانسیں رُکتی ہیں اور لاشوں کے انبار لگ جاتے ہیں۔ لیکن دھرم سنگھ کی فوجی زندگی آج پہلی بار اس واقعہ سے دوچار ہوئی تھی۔ جب اُسے اپنے افسر نے آگے بڑھنے کا حکم سُنایا تھا اور وہ حکم سُن کر اُسے اُن راہوں کی خوشبو کا احساس ہوا تھا جنہوں نے بیس سال پہلے آخری بار اُس وقت اُس کے پاؤں چھوئے تھے جب پنجاب میں بھگت سنگھ کو ایک اور بار پھانسی دی گئی تھی اور اُس کے جسم کے دو ٹکڑے کر دیئے گئے تھے۔ دھرم سنگھ کو یاد آیا کہ یہی ستمبر کے دن تھے۔ خزاں کی یہی پُراسرار زرد دیاں چھانے لگی تھیں۔ کھیتوں میں فصلیں لہلہا رہی تھیں۔ جب وہ اپنے گھر سے بے گھر ہو کر اپنی جان بچانے کی خاطر چٹانوں اور پھیلے ہوئے درختوں کی آغوش میں پناہ لینے پر مجبور ہوا تھا۔ اُس دن ایک قیامت بپا ہوئی تھی۔ ماں کو اُس کے بیٹے کا علم نہ تھا۔ بھائی بھائی سے بچھڑ گیا تھا۔

جن کھیتوں میں دل لبھانے والے گیت گائے جاتے تھے اُن کھیتوں سے معصوم بچوں کی چیخیں اور زخمی عورتوں کی آہیں اُبھر اُبھر کر دھرتی کا سینہ کو چیر رہی تھیں۔ جہاں دھرم سنگھ، رحیم خان، کرشن، تلک اور محمود کبڈی کھیلا کرتے تھے۔ وہاں اِنسانوں کے کٹے ہوئے سر بکھرے پڑے تھے۔ دھرم سنگھ جب اپنے گھر سے باہر نکلا۔ اُس کی بیوی پہلے گھر چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ دھرم سنگھ کو آج تک بھی یہ پتہ نہ چلا، کہ اُس کے ساتھ کیا بیتی۔ وہ کسی پہاڑی سے لڑھک گئی تھی یا کسی غنڈے سے اپنے آپ سے بچانے کی خاطر دریا میں ڈوب مری تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ آج بھی زندہ ہو، لیکن اگر وہ آج بھی زندہ ہوتی تو وہ اب تک چھپی نہ رہتی۔ دھرم سنگھ سوچ رہا تھا اور اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔ بچپن اور جوانی کے واقعات جن پر بیس برسوں کی طویل مدت کی گرد جم چکی تھی۔ آج اُسے ایک ایک کر کے یاد آ رہے تھے۔ اُس کی نظروں کے سامنے لپک رہے تھے، آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ جنگ کے دوران توپوں اور گولیوں کی گھن گرج میں ایک فوجی کے لئے ایسی باتیں سوچنا بڑا ہی کٹھن ہے۔ لیکن جب ایک خواب اچانک حقیقت کا رُوپ اپنا لیتا ہے تب میدانِ جنگ میں ایک فوجی خندق بھی ایک سپاہی کے لئے اُس کے گھر کا کمرہ بن جاتی ہے۔ خصوصاً اُس سمے جب یہ خندق اُس رات کی آغوش سے لپٹی ہوئی ہو جس کے ساتھ اُس کے بچپن اور پیار کا سمبندھ رہا ہو۔ دھرم سنگھ نے اپنی زندگی میں کئی جنگیں دیکھی تھیں اور کئی لڑائیاں لڑی تھیں۔ آج سے تیس سال پہلے جب دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی تھی تو دھرم سنگھ اُس وقت برما فرنٹ پر جاپانیوں کے خلاف لڑا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب دھرم کی جوانی اپنے شباب پر تھی۔ جب وہ ایک ہی سانس میں کئی ڈنٹر پیلتا تھا۔ جب اُس کی قدآوری اور سینے کی چوڑائی دیکھ کر اُس کے افسروں کو بھی رشک آتا تھا۔ اِس جنگ میں دھرم سنگھ نے کئی میڈل جیتے تھے۔ اُس نے برما کے جنگلوں میں کئی جاپانیوں کو ہمیشہ کی نیند سُلا دیا تھا۔ دھرم سنگھ کو وہ سمے بھی یاد آیا جب اُس کے گاؤں کے ساتھی رحیم خان دشمن کی گولی لگنے سے مُنہ کے بل زمین پر گرا تھا۔ دشمن بھاری تعداد میں آگے بڑھ رہا تھا۔ توپوں اور گولیوں کی آگ چاروں سمت پھیلی ہوئی تھی۔ دشمن کی طوفانی پیشقدمی دیکھ کر فوجی افسروں نے اپنی فوجوں کو پیچھے ہٹ جانے کا حکم دیا تھا۔ مگر جب دھرم سنگھ حکم کی تعمیل میں اپنی خندق سے باہر نکلنے لگا تھا تو رحیم خان نے یاس بھری آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھا تھا۔ اُس کے سینے کے بائیں طرف گولی لگی تھی۔ خون رِس رِس کر اُس کے سارے جسم کو رنگ رہا تھا۔ وہ جینے کی خاطر موت سے لڑ رہا تھا۔ مگر اُس کے جینے کی آس تبھی پوری ہو سکتی تھی جب کوئی اُسے سہارا دیتا۔ اُس کے بے بس جسم کو اپنے کندھوں کا سہارا دیتا۔ دھرم سنگھ اس قدر بے دل نہ تھا کہ اپنے بچپن کے ساتھی کو یوں اکیلا چھوڑ دیتا۔ اپنے اِرد گرد اَن گنت خطرات سے بے نیاز اور لاپروا ہو کر دھرم سنگھ نے زخمی رحیم خان کو اپنے کندھے پر اُٹھا کر خندقوں اور پُرخطر گھاٹیوں کو عبور کر کے ایک محفوظ مقام پر پہنچا کر ہی دم لیا۔ دھرم سنگھ نے رحیم خان کو ایک نئی زندگی بخشی تھی۔ اور اُس کے دل کے ارمانوں اور آشاؤں کو خاک نہ ہونے دیا تھا۔ دھرم سنگھ کو ساتھ ہی وہ واقعہ بھی یاد آیا جب رحیم خان نے اپنی زندگی کا یہ قرضہ اُسے چکا بھی دیا۔ یہ وہی دن تھے جب دھرم سنگھ اپنے گھر سے بھاگ کر سنگلاخ چٹانوں اور گھنے درختوں کی سیاہیوں میں چھپ چھپ کر اپنی زندگی کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کے کئی دِن فاقوں میں گزر رہے تھے۔ جس آزادی کی خاطر اُس کے اور اُس کے دوستوں کے دِلوں میں جو آرزوئیں جنم پا رہی تھیں وہ آزادی اپنے ساتھ اُن کے لئے بربادی اور پشیمانی لائی تھی۔ اِنسان کا خون ارزاں ہو گیا تھا۔ آباد بستیاں ویران ہو گئی تھیں۔ ہزاروں سالوں کی پُرانی اِنسانی روایات بے موت مر گئی تھیں۔ جن گھروں میں زندگیاں ناچ رہی تھیں وہاں اب موت کے کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ زندگی تڑپ رہی تھی۔ موت اپنے پَر پھیلا رہی تھی۔ دھرم سنگھ اور اُس جیسے ہزاروں لاکھوں اِنسان زخمی فاختاؤں کی طرح اپنی زندگیوں کی آخری سانسیں ویرانوں میں گِن رہے تھے۔ مگر دھرم سنگھ کی زندگی میں ایک معجزہ رُونما ہوا تھا۔ رات کے بھیانک کالے اندھیرے میں رحیم خان نے اُسے زندگی کی راہ دکھا کر اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔ اُسی طرح جس طرح دھرم سنگھ نے برما کے جنگلوں میں زخمی رحیم خان کو اپنے شانوں کا سہارا دے کر اُسے ایک نئی زندگی دی تھی۔ ایک نئی زندگی کی تحریک بخشی تھی۔ یہ گزرے ہوئے واقعات ایک ایک کر کے دھرم سنگھ کو یاد آ رہے تھے یوں تو وہ خندق میں بیٹھا ہوا تھا مگر اُس کی تصوّر کی نگاہیں جوانی

کی وادیوں میں گھوم پھر رہی تھیں۔ بیس سال ـــــ کتنا طویل عرصہ ہے۔ وقت کا یہ احساس دھرم سنگھ کو اُس وقت ہوا جب اُس نے اپنا جیبی آئینہ نکال کر اپنی صورت دیکھی۔ بیس سال پہلے جب وہ ایک انجان راہ پر چل کر ایک انجانی منزل کی جانب چل پڑا تھا تب اُس کے سر کا ایک بال بھی سفید نہ تھا۔ مگر آج بیس سال کے بعد عجیب حالات اُسے پھر اپنے گاؤں لے آئے تھے۔ اُس کے بہت سے بال سفید ہو گئے تھے۔ لیکن ایک بات اُسے ضرور محسوس ہوئی کہ انسان پیدا ہوتا ہے، پروان چڑھتا ہے، جوان ہوتا ہے اور بوڑھا ہو جاتا ہے اور پھر مر جاتا ہے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھلا دیا جاتا ہے۔ لیکن یادیں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔ پھلتی پھولتی ہیں۔ آج بیس سال بعد اُس نے اپنے گاؤں کو بالکل ایسے ہی پایا جیسے وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ وہی لہلہاتی کھیتیاں تھیں۔ وہی سرسبز گھاٹیاں تھیں۔ وہی پگڈنڈیاں تھیں، اُن میں وہی پیچ و خم تھے۔ وہی راہیں تھیں اور اُدھر پتھروں کے ٹیلے پر کھڑا وہی لمبا بیر کا درخت تھا۔ اُس پہاڑی کے دامن میں وہی رواں دواں شور مچاتی ندی تھی، جہاں بیٹھ کر گاؤں کی گوریاں مدھر گیت الاپتی تھیں۔ دوسرے گاؤں کے کسی راہ چلنے والے گبرو جوان کا بے مقصد مذاق اُڑایا کرتی تھیں ـــــ دھرم سنگھ سوچ رہا تھا آخر ایسا کیونکر ہوا کہ وہ اور اُس جیسے لاکھوں لوگ اپنے گھروں سے بے گھر ہو گئے۔ کیا ایک ہی ملک میں زمین پر صرف ایک لکیر کھینچنے ہی سے انسان بھی بٹ جاتے ہیں۔ انسانی قدریں بدل جاتی ہیں۔ انسانی سوچیں الگ ہو جاتی ہیں۔ اگر یہ لہلہاتے کھیت اپنی صورتیں نہیں بدلتے تو پھر کیا وجہ ہے کہ زمین پر بٹوارے کی ایک لکیر کھینچنے سے انسان کے خیالات بدل جاتے ہیں۔ اگر زمین کا رنگ ایک ہی ہے۔ ندی نالوں میں بہتے ہوئے پانی کی لَے ایک ہی ہے، درختوں اور پیڑوں کی چھاؤں میں ٹھنڈک ایک جیسی ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ رحیم خان سرحد کے اُس پار اپنی زندگی گزار رہا ہے اور دھرم سنگھ سرحد کے اِس پار دن کاٹ رہا ہے۔ کیوں اور کس لئے ـــ؟ دھرم سنگھ عجیب ڈھنگ سے سوچ رہا تھا۔ باہر مکان جل رہے تھے۔ کھیتوں میں کھڑی فصلیں پاؤں تلے روندی جا چکی تھیں، رات کے عمیق اندھیرے پر زخموں کے نشان ابھی تازہ تھے۔ دھرم سنگھ یہ سب کچھ محسوس نہیں کر رہا تھا، بلکہ اُسے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اپنی ماں کی گود میں دُبکا پڑا ہے۔ ـــــ!!

اِس جنگ نے دھرم سنگھ کے ارمانوں کی آبیاری کی تھی۔ دفعتاً ایک دھماکہ ہوا۔ گولیوں کی بوچھار ہوئی۔ آگ پھیلتی گئی۔ افسر نے آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ دھرم سنگھ کے بہت سارے ساتھی مر کھپ گئے تھے، ہر طرف شور، شرابا تھا۔ ہر سمت دھواں بکھر گیا تھا۔ دھرم سنگھ کے اندر کا سپاہی جاگ پڑا۔ وہ بھی آگے بڑھا اور بڑی پھرتی سے دشمن کی ایک خندق میں گھس گیا۔ وہاں ایک سپاہی پہلے ہی موجود تھا۔ دونوں ایک دوسرے پر سبقت لینے کی کوشش کرنے لگے۔ دونوں ایک دوسرے پر بندوق چلانے کی تگ و دو میں لگ گئے۔ اور پھر ایک گولی چلی۔ خندق کا سینہ شق ہو کر رہ گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دھرم سنگھ نے اپنے دشمن کو بے بس کر دیا تھا ـــــ اور پھر اچانک گولیوں کی بوچھار میں دھرم سنگھ کی آواز گونجی ـــــ "رحیم خان" ـــــ ہاں واقعی اُس کے پاس رحیم خان کی بے حس لاش پڑی تھی۔ اُس کی آنکھیں کھلی تھیں جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہوں ـــــ دھرم سنگھ کو محسوس ہوا کہ وہ زندگی کی بازی جیت کر بھی ہار چکا ہے۔ اُس کے خواب کی تعبیر اُس کے سامنے تھی۔ اُس کی نظروں کے سامنے ایک معجزہ رونما ہوا تھا جو اُس نے کبھی نہ دیکھا تھا اور نہ کبھی سُنا تھا ـــــ!!!

▲

بقیہ صفحہ ۴۲۔ "امیر خسرو ـــــ ہندوستان کے عظیم انسان دوست شاعر"

امیر خسرو کی پیدائش کا ۔ ۔ ۔ وال جشن ہماری قوموں کی تہذیبی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہوگا۔ امیر خسرو نے اپنے فن و ہنر کو عوام کی خدمت کے لئے وقف کر دیا تھا اور ایک عالی دماغ شاعر کی حیثیت سے انہیں خراجِ عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں اُن کی نگارشات کا کماحقہٗ مطالعہ کرنا چاہئے۔ امیر خسرو کی ایک مثنوی اپنے قارئین سے اور آئندہ آنے والی نسلوں سے اِس التجا پر ختم ہوتی ہے کہ

"صاحب نظر قاری سے میں تعریف نہیں انصاف چاہتا ہوں۔ ہمیں اِس عظیم شاعر کی اس ہدایت پر عمل کرنا چاہئے۔"

طنز و مزاح

لکھن پیاری لال مہتہ

ترجمہ: حافظ عاشق ہرگانوی

بلاعنوان

ریلوے بکنگ آفس جاکر میں نے کہا۔ "سون گڑھ کے دو ٹکٹ فرسٹ کلاس کے دیں گے؟"۔ چھوٹی سی کھڑکی سے آنکھیں نکال کر اونچی آواز میں کلرک نے سوال کیا۔ "سون گڑھ؟ ۔ کون سا سون گڑھ؟ تین سون گڑھ ہیں، جن میں دو اسٹیشن ہیں۔"

میں: ٹکٹ تو اسٹیشن کا ہی لینا ہے۔

کلرک: لیکن دو میں سے کس کا؟

میں: پہلا سون گڑھ کہاں ہے، میں نہیں جانتا۔ دوسرے کا ٹکٹ دیدیجئے۔ وہ اسی ملک میں ہے

کلرک: ہمارے نقشے میں ملک جیسا کہیں کچھ ہے ہی نہیں۔

میں: اب وہ گجرات کا حصّہ ہے، مگر پہلے الگ اسٹیٹ تھا۔ اس کے وزیر اعلیٰ.....

کلرک: (مجھے ٹوکتے ہوئے)۔ یہ سب تفصیل یہاں بیکار ہے مجھے یہاں ملک کی تاریخ یا جغرافیہ سیکھنے کیلئے نہیں بٹھایا گیا ہے۔

میں: ایک شہری کے ناتے دوسرے شہری کو ملک کی حوالی حقیقت سے متعارف کرانا اختیار ہی نہیں، فرض بھی ہے۔ جمہوری عوام کہلانے کے لئے یہ ضروری ہے۔

اس درمیان میرے پیچھے ٹکٹ لینے والوں کی لمبی لائن لگ چکی تھی۔ کئی پریشان ہو رہے تھے، کئی بے چین تھے اور کچھ کو مزا آرہا تھا کہ دونوں کے بیچ خوب ٹھنی ہے۔

کلرک: میری معلومات بڑھانے کی تکلیف آپ گوارا نہ کریں۔ آپ کو جانا کہاں ہے یہ صاف صاف بتائیں۔

میں: تیسری بار ــ نہیں، دوسری بار کہہ رہا ہوں کہ جو سون گڑھ ملک میں ہے اس کے فرسٹ کلاس کے دو ٹکٹ چاہئیں۔

کلرک: دوسرا ٹکٹ کس کے لئے۔؟

میں: (ہاتھ پیچھے گھما کر)۔ اس سے آپ کو کیا لینا دینا ہے؟ میری نگرانی کرنے کا آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا۔

کلرک: جناب، میں نے اسی لئے پوچھا کہ اکثر لوگ دو ٹکٹ لے کر ان میں سے ایک بلیک مارکیٹ میں فروخت کر دیتے ہیں۔ مجھے کیا لینا دینا ہے۔ آپ جس کے ساتھ چاہیں، جائیں، ریلوے کسی پر پابندی تھوڑے ہی لگا سکتی ہے۔

میں: تو میں اعلان کر رہا ہوں کہ دوسرا ٹکٹ مجھے اپنی بیوی کے لئے چاہئے۔ عورت نصف حصّۂ جسم ہوتی ہے۔ پھر بھی مغربی طور طریق کی وجہ سے اس کا بھی پورا ٹکٹ لینا پڑتا ہے۔ اس بارے میں میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ پورے پینتالیس پہلے ہماری شادی احمد آباد میں ہوئی تھی۔ بڑی سادگی سے ہوئی تھی.....

کلرک: آپ کی شادی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ٹکٹ کی بات کیجئے۔

میں: اگر آپ کو دو سون گڑھ کا فرق نہیں معلوم ہے تو مجھے نقشہ دیجئے میں ڈھونڈ دیتا ہوں۔

کلرک: ریلوے کا نقشہ مسافروں کے لئے نہیں ہے۔ وہ ایسا مبہم ہوتا ہے کہ ریلوے کا کلرک بھی بیس سال نوکری کرنے کے بعد ہی اسے سمجھ سکتا ہے۔

میں: تو ٹائم ٹیبل دیجئے، میں دیکھ کر لیتا ہوں۔

کلرک: ٹائم ٹیبل یہاں نہیں بیچا جاتا۔ چرچ گیٹ کے آفس میں پتہ لگائیے۔ یا سرکاری پبلشنگ دوکان میں جاکر خریدیئے۔

میں: گورنمنٹ پبلشنگ آفس سے پوچھنے پر پتہ چلا ہے کہ ٹائم

ٹیبل چھپنا اب بند کردیا گیا ہے اور پرانے ٹائم ٹیبل بھی واپس لئے جارہے ہیں۔

کلرک:۔ اس کی وجہ ہے کہ پہلی اپریل سے ٹائم ٹیبل کا طریقہ بند ہو رہا ہے اب ٹائم ٹیبل نہ شائع ہوں گے اور نہ کسی کو ملیں گے۔

یہ سنتے ہی میرے آس پاس اور پیچھے کھڑے لوگوں میں کھلبلی مچ گئی۔ کیوں؟ اس طرح کیسے چلیگا؟ لوگوں کو گاڑیوں کے آنے جانے کے وقت کا پتہ کیسے چلے گا؟" میں جو اب تک دوسروں کے لئے تکلیف دہ ہو رہا تھا اب اس بھیڑ کا لیڈر بن گیا۔ میں نے پوچھنا جاری رکھا۔ لیکن اس کی وجہ؟ عوام کو کتنی پریشانی ہوگی پہلے سے جو پریشانی ہے، وہی کیا کم ہے؟"

پیچھے سے کئی لوگ بول اٹھے۔ "ہیئر، ہیئر۔!"

کلرک: ٹائم ٹیبل کا صرف بیجا ہوتا تھا۔ عام لوگوں کے لئے تو اسے پڑھنا اور سمجھنا دشوار ہے۔ اسے سمجھانے کے لئے "گائڈ" بنوانے کی بات بھی ایک بار سوچی گئی تھی۔ اس دشواری کے سبب لوگ غلط سلط سمجھ بیٹھتے ہیں اور الزام ریلوے کو دیتے ہیں پھر ٹرین ذرا کہیں لیٹ ہو گئی تو غل غپاڑہ کرتے ہیں، الٹی سیدھی باتیں کرتے ہیں اور پٹری پر جمع ہو جاتے ہیں۔ دوسری آتی جاتی گاڑیوں کا آنا جانا روک دیتے ہیں، ڈبوں پر پتھر پھینکتے ہیں۔ انجن کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ ڈرائیور اور گارڈ وغیرہ کو مارتے ہیں۔ سگنل اور سگنل آفس جلا ڈالتے ہیں۔ اسٹیشن کے چلتے کے اسٹالوں سے مفت چائے پی ڈالتے ہیں۔ یہ سب گڑبڑ روکنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ گاڑیوں کے آنے جانے کا مقررہ وقت آخر تک پوشیدہ رکھا جائے۔

میں نے زوردار مخالفت کی۔ "یہ تو سراسر ظلم ہے۔ یہ دوا تو مرض سے بھی بری ہے۔ لاکھوں مسافروں کو پریشانی میں ڈالنا کہاں تک مناسب ہے؟ حکومت کو یہ سسٹم کورٹ جانا پڑیگا۔

بھیڑ سے کئی نے تالی بجائی۔ کئی نے "شرم! شرم!" کے نعرے لگائے۔

کلرک ناراض ہو کر چلّایا۔ "خاموش رہیئے! یہ کوئی چوپاٹی یا شیواجی پارک نہیں ہے" اور مجھے دھمکی دی۔

"ذرا سنبھل کر بولئے۔ ریلوے سرکاری محکمہ ہے۔ کسی بھی سرکاری محکمے کے خلاف بولنا، وطن سے غداری ہے۔ ہو نہ ہو پلیٹ شوں نے ملک کو گرانے کی جو سازش چلا رکھی ہے اس میں آپ شریک ہوں گے تو پچھتائیں گے۔"

میں: حد ہو گئی یہ تو! ملک اور سرکار، ریاست اور اس کے محکمے، مادر وطن اور کیبنٹ یہ الگ الگ چیزیں ہیں۔ کسی محکمہ کی تنقید کرنا یا اس کی غلطی بتانا کوئی گناہ نہیں ہے۔ ابھی ہم نے تاناشاہی نہیں اپنائی ہے۔

یہ سن کر آس پاس کے لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

کلرک: (چڑھ کر)۔ میں سیاسی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا وہ میرا کام بھی نہیں ہے۔ مجھے تو بس اتنا کہنا ہے کہ ٹائم ٹیبل کا سہارا لے کر مسافر تنہا ہی مچاتے ہیں۔ اگر اس کا علاج نہیں کیا گیا تو حالت اور بھی بگڑ جائے گی۔ شاید ٹرینوں کا آنا جانا بھی بند کرنا پڑے۔

میں: لیکن کیا ٹرینوں کو وقت کا پابند بنانا صحیح علاج نہیں ہے؟ میں نے سنا ہے کہ جاپان میں کوئی ٹرین دو تین منٹ بھی لیٹ ہو جاتی ہے تو ڈرائیور کو جواب دہ ہونا پڑتا ہے اور اگر ٹرین پندرہ منٹ سے زیادہ لیٹ ہو جائے تو کرایہ بھی مسافروں کو لوٹا دیا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں بھی اگر ایسا اصول ہو تو بیشتر لوگ مفت ہی میں سفر کرسکیں گے۔ اس سے ریلوے کا بجٹ بھلے ہی گڑبڑا جائے، لوگوں کو کتنا فائدہ ہوگا۔

میرے از خود پیدا مقلدوں میں تو بکھلاہٹ پھیل گئی۔

کلرک: (غصے میں)۔ جاپان اور ہمارے یہاں کی حالت میں بہت فرق ہے۔ جاپان سرمایہ دار ہے۔ امریکہ کا نوآبادیاتی اور فوجی اڈہ ہے۔ ہم اشتراکی ہیں۔ سوویٹ روس کی مدد لے کر ہم خود کفیل بننے والے ہیں۔

میں: یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ حالانکہ جاپان کی معاشی ترقی کا انحصار اپنے وطن سے محبت ہے۔ ہر ایک منسٹر اشتراکیت معاشی نظم چاہتا ہے۔ کاہلی نہیں۔

پیسہ ٹھیک ہے ریلوے کے کارکنوں کی ناقص کارکردگی اور کاہلی پہلے بھی بیحد چاہیئے اور آخر میں یہ فقرہ چھوڑا۔

میں : میں نے تو سنا ہے کہ راجستھان میں بہت سی گاڑیاں اتنی دھیمی چلتی ہیں کہ اکثر مسافر چلتی گاڑی سے اتر کر لائن کے کنارے چرتی ہوئی گائے یا بھینس کا دودھ دوہ لیتے ہیں۔ اور ڈبے میں واپس جا بیٹھتے ہیں۔

لوگوں نے قہقہے لگائے اور تالیاں بجائیں۔

کلرک کہ تھا تو سانولا پھر بھی لال ہو گیا۔ بولا۔ "ایسی گپیں تو اخبار والے سرکار کی ہنسی اُڑانے کیلئے اپنی طرف سے چھاپ دیتے ہیں۔ ریلوے بورڈ کو ان پر ہتک عزت کا کیس کرنا ہی چاہیئے۔ ریلوے کا مذاق سرکار کا مذاق ہے۔"

میں : آپ کو بُرا لگا ہو تو معافی چاہتا ہوں۔ تو کیا اب ٹائم ٹیبل سچ مچ چھپے گا ہی نہیں ؟

کلرک : نہیں اگر ٹائم ٹیبل ہوا اور لوگ اُسے پڑھ کر سمجھ بھی لیں تو سمجھیں گے کہ مقررہ وقت پر گاڑی فلاں اسٹیشن سے چھوٹنی ہی چاہیئے۔ اٹلی میں مسولینی نے ایسی اصلاح کر دی تھی کہ گاڑیاں مقررہ وقت پر آتی جاتی تھیں۔ مگر فاشزم ہمارے لئے قابلِ ترک ہے اس لئے ریلوے وزیر نے فیصلہ کیا ہے کہ لوگوں میں جھوٹی اُمید پیدا کر کے اسے پورا نہ کر سکنے سے بہتر یہ ہے کہ جھوٹی اُمید دلائی ہی نہ جائے۔

میں : تو پھر لوگوں کو کیسے پتہ چلے گا کہ فلاں گاڑی آئے گی یا جائے گی۔ ؟

کلرک : ریلوے پر لوگوں کو بھروسہ رکھنا ہوگا۔ اگر ریلوے پر بھروسہ نہ رکھیں گے تو کس پر رکھیں گے ؟ کسٹم والوں پر ؟ انکم ٹیکس والوں پر ؟ انکم ٹیکس نہ دینے والوں پر ؟ ایر لائنس پر ؟ سٹّہ کیٹ پر ؟ اس ملک کے لوگوں کو ریلوے پر پورا پورا بھروسہ ہے کہ وہ دیر سے ہی سہی۔ ایک شہر سے دوسرے شہر پہنچا ضرور دے گی . . . . . .

میں : (بیچ میں)، حادثہ نہ ہو جائے تو ؟

کلرک : (ناخوش ہو کر) ہاں یہ حادثہ تو زندگی اور دنیا کی علامت ہے۔ ابھی آپ یہاں کھڑے ہیں لیکن کیا آپ کو پورا بھروسہ ہے کہ یہ عمارت ٹوٹ کر آپ کے اوپر نہیں گر پڑے گی ؟ کیا دوسرے ملکوں میں ریل کے حادثے نہیں ہوتے ؟ موٹریں نہیں ٹکراتیں ؟ وزیر کیا ایک برخواست نہیں کر دیئے جاتے ؟ جب تک زندگی ہے، حادثے ناگزیر ہیں، اتنے حادثوں کے باوجود کروڑوں لوگ سفر کرتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ریلوے پر عوام کو بھروسہ ہے۔

میں : (اعتراض کرتے ہوئے) : فرض کیجئے میں نے سون گڑھ کے دو ٹکٹ لے لئے اور گاڑی نہیں چھوٹی تو ؟

کلرک : اب سے مسافر ہی ریلوے کی مدد کر کے اُسے کارآمد بنائیں گے آپ ٹکٹ لیں گے تو اور لوگ بھی لیں گے اور جب خوب لوگ اکٹھے ہو جائیں گے تو پھر ٹرین چل دیگی۔

میں : اگر نہ اکٹھے ہوئے تو ؟

کلرک : تو ٹرین کا وقت بدل جائے گا۔ تھوڑی دیر سے چلے گی۔ مسافر وقت پر آجائیں گے تو پہلے چل دے گی۔

میں : اس کا مطلب ہے کہ اب مسافروں کو چانس لینا ہوگا۔

کلرک : (فلسفیانہ انداز میں) ۔ زندگی بھی تو چانس ہی ہے۔ جب ہوائی جہاز سے اُڑتے ہیں تو صحیح سلامت پہنچ جانے کی کیا گیارنٹی ہوتی ہے ؟ بینک میں آپ کا ڈپازٹ محفوظ ہے۔ اس کا آپ کو سو فیصدی بھروسہ ہے ؟ موت کل آپ کو نہیں اُٹھا لے جائیگی یہ آپ کیسے جانتے ہیں ؟ اس لئے جیسے سماج یقین پر چلتا ہے ویسے ہی ٹرین بھی چلے گی۔

میں : تب ٹائم ٹیبل کی جگہ کیا چیز ہو گی ؟

کلرک : کچھ نہیں ! ریلوے آفس میں اس کا حساب رہے گا۔ مگر عوام پر وہ ظاہر نہیں کیا جائے گا۔

میں نے اوب کر کہا۔ اچھا، آج تو سون گڑھ کے دو ٹکٹ دے دیجئے۔"

اُس نے پھر سوال کیا۔ "یہ سون گڑھ کہاں ہے، پہلے یہ تو بتایئے ؟"

▲

ڈراما

ابراہیم یوسف

موت سے پہلے آدمی

افرادِ تمثیل

زیتون ۔ کالج میں لیکچرار
عباس ۔ زیتون کا شوہر
محسن ۔ عباس کا دوست
امتیاز ۔ ڈاکٹر، زیتون کا پہلا شوہر
ممن ۔ عباس کا نوکر

منظر :-

ایک ریسٹ ہاؤس کا کمرہ جس میں ایک صوفہ سیٹ اور دو چار کرسیاں ہیں، ایک جانب چارپائی بچھی ہے جس پر صاف ستھرا بستر ہے۔ چھت میں پنکھا ہے جو آہستہ آہستہ چل رہا ہے۔ پنکھے کے نیچے زیتون بیٹھی ایک کتاب کا مطالعہ کر رہی ہے۔ آنکھوں پر خوبصورت فریم کا چشمہ ہے۔ سامنے ایک گول میز رکھی ہے جس پر قلم اور کچھ کاغذات رکھے ہیں۔ دائیں جانب دروازہ ہے جو ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں کھلتا ہے۔ کچھ دیر بعد عباس اس دروازے سے آتا ہے۔ زیتون نظر اٹھا کر اسے دیکھتی ہے۔ مگر عباس ایک اچٹتی ہوئی نظر اس پر ڈال کر آگے بڑھ جاتا ہے اور کھڑکی کے پاس کھڑا ہو کر باہر دیکھنے لگتا ہے۔ زیتون کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھتی رہتی ہے، پھر آہستہ سے۔

زیتون: آپ نے چائے پی لی ؟
(عباس پلٹ کر اسے دیکھتا ہے۔ چند سیکنڈ خاموش رہ کر انتہائی طنزیہ لہجے میں)

عباس: آپ کو اس کتاب سے فرصت مل گئی ۔ ؟
(زیتون کچھ دیر خاموش رہتی ہے پھر شکست خوردہ لہجے میں مایوسی سے)

زیتون: میں نے ممن سے چائے کیلئے کہہ دیا تھا جانے کہاں غائب ہو گیا۔

عباس: جب آپ ہی کو میری پروا نہیں تو اُسے کیوں ہونے لگی، نوکر آخر نوکر ہوتا ہے۔

زیتون: (کتاب بند کرتی ہے، عینک اتار کر میز پر رکھتے ہوئے) آپ تشریف رکھیے میں کچن میں جا کر دیکھتی ہوں۔

عباس: (بے حد جارحانہ طنز سے) آپ کیوں تکلیف فرماتی ہیں۔ بلا وجہ وقت ضائع ہو گا۔

زیتون: آپ تو بلا ضرورت اُلجھنے کے مواقع پیدا کرتے ہیں (ہاتھ پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھ کر) آپ نہانے چلے گئے تھے اس لئے میں نے جلدی نہیں کی تھی۔

عباس: میں کوئی آخری غسل نہیں کر رہا تھا آپ جانتی تھیں، کہ مجھے ذرا جلدی ہے۔

زیتون: آپ بیٹھئے تو چائے بھی آئی جاتی ہے۔
(کھڑی ہو کر دروازے کی طرف بڑھتی ہے۔)

عباس: بس بس رہنے دیجئے۔ آپ کا وقت ویسے ہی قیمتی ہے۔

زیتون: میرے وقت کا کیا ہے ـــ میں

عباس: (بات کاٹ کر) ہے کیوں نہیں۔ (بہت ہی طنزیہ لہجے میں) آپ کے وقت کا ایک ایک لمحہ اُس محبت سے زیادہ قیمتی ہے جو آپ کا شوہر آپ کو دیتا ہے۔ وہ اُن خواہشوں سے زیادہ قیمتی ہے جو آپ کا شوہر اپنی دلچسپیوں سے حاصل کرتا ہے۔

زیتون: لیکن آپ کی دلچسپیاں۔
عباس: (لقمہ دیتے ہوئے) ایسی ہیں جن سے آپ کو دلچسپی نہیں۔
(پھر گہرے طنز سے) اور ہونے بھی کیوں لگی، آپ کی دلچسپیاں
تو کالج کے اسٹاف روم میں بیٹھ کر قہقہے لگانے میں ہے۔
زیتون: (کسی قدر ناگواری سے) دیکھئے آپ بلاوجہ۔
عباس: (بات کاٹ کر) مسز زیتون عباس! حقیقت بڑی کڑوی
ہوتی ہے آپ خود فیصلہ کیجئے اور انصاف سے کہئے کہ آپ کو میری
ذات میں زیادہ دلچسپی ہے یا ان خرانٹ موٹے موٹے چشموں
سے مسلح پروفیسروں میں۔
زیتون: اگر آپ ایمانداری اور انصاف سے پوچھتے ہیں تو خدا گواہ
ہے کہ۔
عباس: (بات کاٹتے ہوئے طنزیہ قہقہہ لگاکر) کیوں بیچارے خدا
کی اور مٹی پلید کرتی ہو، وہ پہلے ہی ہم انسانوں کو پیدا کرکے پچھتا
رہا ہے۔
زیتون: (غصہ سے) وہ انسان پیدا کرکے پچھتا رہا ہے یا نہیں یہ
تو مجھے نہیں معلوم، مگر اس نے شکی مرد پیدا کرکے ضرور غلطی کی ہے
(چند سیکنڈ خاموش رہ کر) آپ کی دلچسپیاں۔
عباس: (طنزیہ طور پر لقمہ دیتے ہوئے) غیر دلچسپ، غیر انسانی اور
بور کردینے والی ہیں۔ بیچارہ ڈاکٹر امتیاز تو ان غیر دلچسپ اور
غیر انسانی دلچسپیوں کا شکار نہیں تھا۔ پھر آپ نے اس سے
کیوں طلاق لے لی۔
زیتون: دیکھئے آپ بلاوجہ۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر اکتائے ہوئے
لہجے میں) جانے آپ بار بار اس موضوع کو کیوں چھیڑتے ہیں
جس سے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میرے
ان کے اختلافات کسی اور وجہ سے تھے۔
عباس: کسی اور وجہ سے! وہ کوئی بدچلن انسان بھی نہیں تھا۔
پھر اختلافات کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔
زیتون: یہ میرے لئے کوئی دلچسپ موضوع نہیں ہے۔ میں کئی بار
کہہ چکی ہوں کہ بات صرف اس قدر تھی کہ وہ اپنے پیشے میں
اس قدر مشغول رہتے تھے کہ میں ازدواجی زندگی سے تقریباً

محروم ہو گئی تھی۔ ویسے وہ ایک عظیم انسان ہے۔ خیر۔
عباس: ویسے میری بھی دلچسپیاں آپ کو پسند نہیں ہیں اور آپ کا
یہ دن رات کتابیں پڑھتے رہنا مجھے پسند نہیں، پھر آپ مجھ سے...
زیتون: (دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کسی قدر طنز اور نفرت سے)
آپ بیٹھئے میں چائے لاتی ہوں۔
عباس: رہنے دیجئے ایسی بھی کیا جلدی ہے، چائے بھی آ
جائے گی۔
زیتون: اور اگر میں ہی لے آؤں تو کوئی حرج ہے۔
(زیتون کمرے سے چلی جاتی ہے، عباس سگریٹ جلاکر
دو چار کش لیتا ہے۔ پھر ٹہلنے لگتا ہے کہ محسن آتا ہے۔
عباس اسے دیکھ کر)
عباس: جانے کہاں غائب ہو گئے تھے، میں کب سے تمہارا انتظار
کر رہا ہوں۔
محسن: جنگل ہی سے آرہا ہوں، مگر ایک سخت ہیبت ناک خبر
لے کر۔
عباس: (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) ہیبت ناک خبر!
محسن: (چہرہ کا پسینہ پونچھتے ہوئے) ہاں! (جیب میں سے
سگریٹ کا پیکٹ نکالتا ہے۔ اسے خالی پاکر پھینک دیتا ہے۔
کرسی پر بیٹھ کر عباس سے، سگریٹ دینا۔ عباس سگریٹ
کا پیکٹ دیتا ہے محسن سگریٹ جلاکر) قصبہ میں سخت ہیضہ
پھیل گیا ہے کئی آدمی مر چکے ہیں۔
عباس: خبر تو واقعی ہیبت ناک ہے (کچھ دیر خاموش رہ کر) ہانکا
کرنے والوں کا انتظام ہوا؟
محسن: مچان تو تیار ہو گیا ہے، مگر ہانکے میں آنے کے لئے کوئی تیار نہیں۔
عباس: پھر کیا کیا جائے..؟
محسن: میرا خیال ہے ہمیں بھی پروگرام ختم کر دینا چاہیئے۔
عباس: کمال کرتے ہو۔ مچان تو اسی جگہ تیار ہوا ہے نا جہاں
ہم نے پسند کیا ہے۔
محسن: ہاں!
عباس: پھر ٹھیک ہے ہم چل کر مچان پر بیٹھتے ہیں۔ گرمی میں جانور

وہاں پانی پینے آتا ہوگا۔

محسن، لیکن ہیضے کا حملہ بڑا سخت ہے۔ ہمارا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔

عباس، یار تم بھی غضب کے بزدل ہو جیسے ہیضہ ہماری تمہاری تاک لگائے بیٹھا ہے

محسن، تاک لگائے نہ بھی بیٹھا ہو، مگر احتیاط کہاں کی بری چیز ہے (مسکرا کر) اور پھر شکاری کے لئے احتیاط تو پہلی شرط ہے۔

عباس، (ہنس کر) اور بزدلی آخری شرط بھی نہیں۔ بس چائے پی لیں پھر چلتے ہیں۔

محسن۔ مگر۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) بھابی صاحبہ کہاں ہیں؟

عباس، چائے لانے گئی ہیں (بلند آواز سے) ممتن۔ ارے ممتن۔ چائے تیار ہوئی۔

زیتون، (چائے کی کشتی لئے ہوئے کمرے میں آکر) ممتن بازار گیا ہے۔

عباس، بازار! کیوں؟

زیتون، کچھ سامان منگوایا ہے (چائے کی کشتی میز پر رکھتی ہے، ایک کرسی پر بیٹھ کر چائے بناتے ہوئے محسن سے) آپ کب تشریف لائے۔

محسن، بس ابھی حاضر ہوا ہوں (زیتون چائے کی پیالیاں عباس اور محسن کو دیتی ہے۔ محسن چائے کی پیالی لیتا ہے۔ ہاتھ میں دبا ہوا سگریٹ پھینک کر پلیٹ میں سے بسکٹ اٹھاتے ہوئے مسکرا کر) بھابی! آپ کو شکار سے دلچسپی نہیں ہے۔

زیتون، جی ہاں! کچھ زیادہ نہیں۔

عباس، کچھ سے کیا مطلب۔ یوں کہئے بالکل نہیں ہے۔ بس، انہیں تو کتابیں ہونا چاہئیں۔

زیتون، یوں ہی سمجھ لیجئے۔ ویسے بھی شکار عورتوں کا اسپورٹ نہیں ہے۔

محسن، (قہقہہ مار کر ہنستا ہے، پھر زیتون کی طرف دیکھ کر) مغل شہزادیوں کا تو یہ پسندیدہ اسپورٹ تھا اور یہ تو کوئی دور کی بات بھی نہیں۔ بیگمات بھوپال شیر تک کا شکار کرتی تھیں

زیتون، (ہنس کر) ویسے تو مغل شہزادیاں چوگان بھی کھیلا کرتی تھیں۔ کل آپ کہیں گے، میں پولو کیوں نہیں کھیلتی۔

(محسن قہقہہ مار کر ہنستا ہے زیتون بھی مسکرا کر خاموش ہو جاتی ہے اور خاموشی سے چائے پینے لگتی ہے۔ عباس اپنی پیالی میز پر رکھتے ہوئے)

عباس، جیپ سے چلنا ہے؟

محسن، پیدل بھی چل سکتے ہیں۔ صرف ڈیڑھ دو میل کا فاصلہ ہے مگر

عباس، یہ اگر مگر چھوڑو۔ نہانا ہے تو جلدی نہا لو اور چلو۔

محسن، نہانے کو تو جی چاہ رہا ہے۔

عباس، تو پھر جلدی نہا لو۔

محسن، (سوچتے ہوئے) اب میں واپس آکر ہی نہاؤں گا۔

عباس، تو پھر چلو (کھڑے ہو کر باہر جاتے ہوئے) میں ابھی آیا۔

(عباس کمرے سے باہر چلا جاتا ہے (زیتون کچھ دیر خاموش رہ کر)

زیتون، مسٹر محسن! آخر یہ پروگرام کتنے دن کا اور ہے۔

محسن، ابھی تو چار پانچ دن کا اور ہے۔

زیتون، اب میں بری طرح اکتا گئی ہوں۔ خدا کے لئے اسے کسی طرح مختصر کر دیجئے (ممتن کمرے میں آتا ہے، اس کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت گھبرایا ہوا ہے (زیتون اسے دیکھ کر) کیا بات ہے بہت جلدی آ گیا سامان نہیں لایا

ممتن، (پسینہ پونچھتے ہوئے) کیسے لاتا۔ قصبے کے چاروں طرف تو پولیس کا پہرہ لگا ہے۔

زیتون، (حیرت سے) پولیس کا پہرہ! آخر کیوں؟

ممتن، قصبے میں ہیضہ پھیل گیا ہے، لوگ پٹاپٹ مر رہے ہیں۔

زیتون، ہیضہ پھیل گیا ہے! (محسن کی طرف دیکھ کر) محسن صاحب!

محسن، جی ہاں! بے حد سخت اٹیک ہوا ہے۔

زیتون، تب تو ہمیں یہاں نہیں ٹھہرنا چاہئے۔ قصبہ ہے ہی کتنی دور!

محسن، جی ہاں۔ میں عباس سے کہہ چکا ہوں مگر اس پر بھلا کہیں اثر ہوتا ہے۔

زیتون، انہیں کسی طرح واپس چلنے پر آمادہ کر لیجئے۔ بلا وجہ کا رسک لینا کہاں کی عقلمندی ہے ویسے بھی آٹھ دن ہو گئے

محسن، وہ ایک نمبر کا ضدی ہے آپ بھی کہئے میں بھی کوشش

کروں گا۔

زیتون: ایسی بھی کیا ضد کہ انسان اپنی زندگی ہی خطرے میں ڈال دے۔

(دونوں خاموش ہو جاتے ہیں۔ کچھ دیر بعد عباس دو بندوقیں لئے ہوئے آتا ہے، ایک محسن کی طرف بڑھا کر)

عباس: لو — چلو۔

زیتون: بیکار جینے تو ہی۔

عباس: میں سُن چکا ہوں کہ قصبے میں ہیضہ پھیل گیا ہے۔

زیتون: پھر یہاں ٹھہرنا کون سی عقلمندی ہے۔

محسن: عقلمند لوگ واپس جا سکتے ہیں۔

(بلا جواب کا انتظار کئے کمرے سے چلا جاتا ہے۔ محسن بھی نیم دلی سے اس کے پیچھے پیچھے جاتا ہے۔ زیتون کچھ دیر خاموش رہتی ہے پھر مٹھن کی طرف دیکھ کر برتنوں کی طرف اشارہ کر کے)

زیتون: انہیں لے جاؤ۔

مٹھن: (برتن سمیٹتے ہوئے) جانے صاحب کبھی کبھی اس قدر ضدی کیوں ہو جاتے ہیں۔

زیتون: کل تک تو ہیضے کی کوئی خبر نہیں تھی۔

مٹھن: کل بھی جب میں بازار گیا تھا۔ لوگ پریشان نظر آ رہے تھے۔

زیتون: پھر تو نے کل ہی کیوں نہیں کہا۔

مٹھن: میں نے اس پر دھیان نہیں دیا تھا۔ بس سودا لے کر لوٹ آیا تھا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ ایک ہی رات میں قصبے کا قصبہ چوپٹ ہو جائے گا۔ (برتن اٹھا کر) بیگم صاحب! جیسے بھی ہو اب یہاں سے چل دینا چاہئے۔ مجھے یوں بلا وجہ مرنے سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔

زیتون: (مسکرا کر) بلا وجہ مرنے سے؟

مٹھن: جی ہاں، بلا وجہ مرنا نہیں تو اور کیا ہے۔ بس کھایا پیا اور مر گئے۔ اب صاحب آئیں تو آپ پھر اُن سے کہئے گا۔

(زیتون کوئی جواب نہیں دیتی۔ مٹھن برتن اُٹھا کر چلا جاتا ہے۔ زیتون کچھ دیر بیٹھی سوچتی رہتی ہے پھر چشمہ آنکھوں پر رکھ کر کتاب پڑھنے لگتی ہے۔ ڈاکٹر امتیاز کمرے میں آتا ہے اور زیتون کو دیکھ کر ایک دم ٹھٹک جاتا ہے۔ زیتون بھی نظریں اُٹھا کر اُسے دیکھتی ہے اور گھبرا سی جاتی ہے۔ کچھ دیر دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے ہیں۔ پھر امتیاز واپس جانے کے لئے مُڑتا ہے۔ زیتون اُسے واپس جاتا دیکھ کر)

زیتون: آیئے، (ایک کرسی کی طرف اشارہ کر کے) تشریف رکھئے۔

امتیاز: مگر تم — یعنی آپ — میرا مطلب ہے کہ آپ یہاں....

زیتون: (ایسی مسکراہٹ سے جیسے خود پر طنز کر رہی ہو) جی ہاں، میں یہاں شکار کھیلنے آئی ہوں۔

امتیاز: شکار! یعنی آپ کا مطلب ہے کہ۔

زیتون: جی ہاں، میرا مطلب شکار ہی سے ہے

امتیاز: (جواب اپنی حیرت پر قابو پا چکا ہے، مسکرا کر) یہ مرض کب سے لاحق ہو گیا۔

زیتون: بس ہو گیا اتنا ہی سمجھ لیجئے۔ (چند سیکنڈ خاموش رہ کر نظریں نیچی کر کے) کیا آپ تشریف نہیں رکھیں گے۔

امتیاز: میں صرف نہانے چلا آیا تھا۔ ہم نے پاس ہی اپنا کیمپ لگایا ہے

زیتون: کیمپ! کیسا کیمپ؟

امتیاز: قصبے پر سخت ہیضے کا حملہ ہوا ہے۔ میں ایک امدادی پارٹی لے کر آیا ہوں۔

زیتون: جی ہاں! ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ کافی لوگ ہیضے کا شکار ہو چکے ہیں۔

امتیاز: اگر فوری امداد نہیں دی گئی تو بہت سی اور جانیں خطرے میں پڑ سکتی ہیں۔

زیتون: (چند سیکنڈ رُک کر) چائے پیجئے گا (بلند آواز سے) مٹھن ارے مٹھن۔

امتیاز: دیکھئے اس وقت۔ یعنی میرا مطلب ہے کہ مجھے جلدی قصبے میں پہنچنا ہے۔

(زیتون ایسی نظروں سے دیکھتی ہے جن میں بڑی مایوسی ہے، امتیاز اُسے محسوس کر کے) اگر آپ بضد ہیں تو منگوا لیجئے۔

زیتون: شکریہ! (پھر بلند آواز سے) مٹھن۔ ارے مٹھن۔ (مٹھن آتا ہے) ذرا جلدی سے چائے بنا لا۔ (امتیاز کی طرف دیکھ کر)

نہانے کے لئے پانی رکھوا دوں ؟ (امتیاز خاموش رہتا ہے، زیتون پھر منّن کی طرف دیکھ کر) غسل خانے میں نہانے کے لئے پانی رکھ دے۔

منّن: (جانے کے لئے مڑتے ہوئے) بہت اچھا !

امتیاز: (زیتون سے) آپ بھی احتیاط رکھئے گا کوئی چیز قصبے سے منگوا کر نہ کھائیے گا بلکہ مناسب تو یہی ہے کہ (مسکرا کر) یہ شکار کا شوق کسی اور وقت پورا کر لیجئے گا۔

(منّن کمرے سے چلا جاتا ہے، زیتون اور امتیاز دونوں خاموش رہتے ہیں مگر کبھی کبھی چور نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ کچھ دیر بعد امتیاز اس خاموشی کو توڑتے ہوئے) ۔

امتیاز: اب تو آپ کی صحت ٹھیک رہتی ہے۔

زیتون: جی ہاں، ایسی کوئی بری بھی نہیں رہتی۔

امتیاز: (عجیب مجرمانہ لہجے میں) مسٹر عباس تو ٹھیک ہیں۔

زیتون: جی ہاں وہ بھی ٹھیک ہیں (دونوں اس طرح خاموش ہو جاتے ہیں جیسے اُن کے پاس بات کرنے کو کوئی موضوع نہ ہو۔ زیتون کچھ دیر بعد نیچی نظریں کرکے) آپ نے دوسری .... میرا مطلب ہے کہ — یعنی۔

امتیاز: (زیتون کو دیکھتا ہے پھر پھیکی مسکراہٹ سے) جی نہیں۔ میں نے دوسری شادی نہیں کی۔

زیتون: کیوں — ؟ (امتیاز خاموش رہتا ہے۔ زیتون ٹھنڈی سانس بھر کر) خوش قسمت ہیں آپ — !

امتیاز: (حیرت سے) جی — !

زیتون: (گھبرا کر) جی کچھ نہیں۔ (بات ٹالنے کے انداز میں) پھر تو آپ کو بڑی تکلیف ہوتی ہو گی۔

امتیاز: جی نہیں۔ کوئی خاص تکلیف نہیں ہے۔

زیتون: سسٹر ثمینہ اب بھی تو آپ ہی کے ساتھ کام کرتی ہیں۔

امتیاز: (غور سے زیتون کو دیکھ کر) جی نہیں۔ میں نے امّی کو بلا لیا ہے۔ وہ گھر کی دیکھ بھال کر لیتی ہیں۔

زیتون: اور نُور —

امتیاز: جی ہاں، وہ تو ہے۔ باہر کا سارا کام اُسی کے ذمّہ ہے اور باغیچہ کی دیکھ بھال کرتا ہے، اس گلابوں کی اچھی فصل آئی تھی۔ شہزادے پر بھی اُس نے کچھ نئے تجربات کئے ہیں۔

زیتون: شہزادے پر —

امتیاز: جی ہاں — وہی جو آپ نے فوّارے کے پاس لگایا تھا اور شہزادہ نام رکھا تھا۔ نور کا خیال ہے وہ اِن تجربات سے اس کا رنگ تبدیل کر دے گا۔

زیتون: مگر اُس کا رنگ تو پہلے ہی دلکش تھا۔

امتیاز: اُس کا خیال ہے کہ وہ اگر اس کا رنگ سیاہ نہیں تو سیاہی مائل ضرور کر سکتا ہے۔

(زیتون خاموش رہتی ہے) نواب گاہ کے پاس جہاں آپ چاہتی تھیں میں نے دو کمرے بنوائے ہیں۔

زیتون: اچھا — !

امتیاز: جی ہاں، مہمان آ جاتے تھے تو واقعی تکلیف ہوتی تھی۔ آپ کا خیال ٹھیک تھا۔ (کچھ دیر رک کر) ٹائیگر مر گیا۔

زیتون: بُرا ہوا۔ بڑا خوبصورت کُتّا تھا۔ چیم چیم تو ہو گی۔

امتیاز: جی ہاں وہ تو ہے۔ اِس سال اُس نے بچے بھی دیئے تھے۔

زیتون: (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) سسٹر ثمینہ اب کہاں کام کر رہی ہیں۔

امتیاز: پتہ نہیں۔ شاید کسی مشن ہاسپٹل میں اسے جگہ مل گئی تھی (دونوں خاموش ہو جاتے ہیں۔ زیتون نظریں جھکا کر زمین کو دیکھنے لگتی ہے اِس کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار ہیں۔ امتیاز اُسے غور سے دیکھ کر) آپ کچھ بیمار نظر آ رہی ہیں

زیتون: (نظریں اُٹھا کر) جی نہیں۔

امتیاز: مگر آپ کے چہرے سے تو —

زیتون: صرف تھکاوٹ ہے۔ (طنز اور مایوسی سے) ہر غیر دلچسپ کام میں تھکاوٹ ہو ہی جاتی ہے۔

امتیاز: کیسا غیر دلچسپ کام — ؟

زیتون: جیسے یہی شکار کا مشغلہ —

(امتیاز کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا ہے اور باہر دیکھنے لگتا ہے۔ کچھ دیر مکمل خاموشی رہتی ہے۔ پلٹ کر زیتون کو

دیکھتا ہے جو دوپٹے کے پلّو سے عینک صاف کر رہی ہے)

امتیاز: شاید آپ خوش نہیں ہیں؟

زیتون: (نظریں اٹھا کر) جی۔! (پھر ایسے لہجے میں جس میں شدید تکلیف کا احساس ہے) میں خوش ہوں مجھے کوئی تکلیف نہیں۔

امتیاز: مگر۔ (کچھ سوچ کر خاموش ہو جاتا ہے اور موضوع بدلنے کے انداز میں) آپ کا کالج کیسا چل رہا ہے۔

(منّن کمرے میں آ کر)

منّن: پانی غسل خانے میں رکھ دیا ہے اور چائے بھی تیار ہو گئی ہے

زیتون: پہلے نہائیے گا یا چائے پیجیے گا۔؟

امتیاز: پہلے نہالوں۔ (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) مسٹر عباس کہاں ہیں۔؟

(زیتون خاموش رہتی ہے۔ امتیاز بھی کچھ اس طرح کمرے سے چلا جاتا ہے۔ جیسے اس نے یہ سوال رسمی طور پر کیا ہو۔ زیتون عینک لگا کر چند سیکنڈ سوچتی رہتی ہے، پھر کھڑی ہو کر کھڑکی کے پاس جاتی ہے اور باہر دیکھنے لگتی ہے، کچھ دیر بعد پلٹ کر منّن کو دیکھ کر)

زیتون: تولیہ اور صابن غسل خانے میں رکھ دیا ہے۔؟

منّن: جی ہاں،!

زیتون: جب وہ نہا کر آجائیں تو چائے لے کر آجانا۔

منّن: بہت اچھا۔!

(منّن کمرے سے چلا جاتا ہے۔ زیتون پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتی ہے کچھ دیر بعد عباس اور محسن کمرے میں آتے ہیں۔ محسن عباس کو سہارا دے کر چل رہا ہے، عباس کے چہرے سے کمزوری کا احساس ہوتا ہے اور وہ آہستہ آہستہ چل رہا ہے زیتون پلٹ کر دونوں کو دیکھتی ہے اور گھبرا کر)

زیتون: کیا بات ہے۔ محسن عباس کو ایک کرسی پر بٹھلا دیتا ہے۔ زیتون عباس کے پاس آ کر) آخر بات کیا ہے، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔

(عباس کوئی جواب نہیں دیتا۔ محسن دونوں ہندو قیں

دیوار سے لٹکا کر زیتون سے)

محسن: انہیں راستے میں قے ہو گئی۔

زیتون: (گھبرا کر) قے۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا مگر آپ سنتے ہی کس کی ہیں۔ (دروازے کے پاس جا کر بلند آواز میں) منّن، ارے منّن، ذرا دوڑ کر ادھر آ۔

منّن: (باہر سے آواز) آیا بیگم صاحب۔ چائے تیار ہو گئی ہے۔

زیتون: چائے کو مار گولی۔ پہلے ادھر آ۔ (عباس پاس آ کر) اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں۔ (عباس خاموش رہتا ہے، مگر اس کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود کو بہت کمزور محسوس کر رہا ہے۔ منّن کمرے میں آتا ہے۔ زیتون اسے دیکھ کر) جا دیکھ ڈاکٹر صاحب نہا چکے۔

منّن: (عباس کو دیکھ کر گھبرا کر) صاحب۔ کیا بات ہے۔

زیتون: پہلے جا کر ڈاکٹر صاحب کو تو دیکھ۔

(منّن کمرے سے چلا جاتا ہے۔ عباس زیتون کو دیکھ کر کمزور آواز میں)

عباس: کون، ڈاکٹر صاحب۔؟

زیتون: وہ — میرا مطلب ہے ڈاکٹر امتیاز۔

عباس: ڈاکٹر امتیاز! یہاں کس سلسلے میں تشریف لائے ہیں۔؟

زیتون: سلسلہ بھی معلوم ہو جائے گا۔ فی الحال آپ آرام سے لیٹے رہیے۔

عباس: مگر میں ڈاکٹر امتیاز کا کوئی احسان لینا نہیں چاہتا۔

محسن: (کسی قدر بگڑ کر) عباس! فضول باتیں نہ کرو۔ پہلے ہی کہا تھا کہ یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں ہے، مگر تم کسی کی سنتے ہو۔

(ڈاکٹر امتیاز تولیہ سے سر پونچھتا ہوا آتا ہے۔ عباس پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر محسن سے)

امتیاز: کیا بات ہے۔

محسن: راستے میں انہیں ایک قے ہوئی ہے اور ایک دم سے میرا مطلب ہے انتہائی کمزوری محسوس کرنے لگے ہیں۔

امتیاز: اچھا۔ (عباس کی طرف بڑھتا ہے کہ اسے ایک اور قے ہوتی ہے، امتیاز قے میں نکلے ہوئے مادّے کو غور سے دیکھتا ہے۔

پھر زیتون کی طرف دیکھ کر) آپ کا نوکر کہاں ہے۔؟
زیتون: یہیں ہے (بلند آواز سے) محسن۔ ارے محسن۔
امتیاز: (محسن کی طرف دیکھ کر) مسٹر—
محسن: مجھے محسن کہتے ہیں۔
امتیاز: مسٹر محسن آپ چلے جائیے۔ اسی سڑک پر دائیں جانب ایک آدھ فرلانگ کے فاصلے پر ہمارا کیمپ ہے۔ وہاں سے دواؤں کا بکس اور ایک کمپاؤنڈر کو بلا لیجئے۔
محسن: بہت اچھا۔
(محسن تیزی سے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ امتیاز عباس کی نبض پر ہاتھ رکھ کر)
امتیاز: آپ اب —
عباس: (ہاتھ کھینچ کر) میں ٹھیک ہوں۔
امتیاز: آپ یقینی طور پر ٹھیک ہیں۔ بلا وجہ اپنے جذبات کو
عباس: (غصے سے) میرے جذبات بھی نارمل ہیں۔
امتیاز: آپ آرام کیجئے۔
عباس: (اسی طرح غصے سے) قے ہو جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مجھے ہیضہ ہو گیا ہے۔
امتیاز: میں کہتا ہوں آپ پُر سکون رہئے۔ غصہ سے بلا وجہ اعصاب میں — !
عباس: (بات کاٹ کر) غصے کی بات ہی ہے (کھڑے ہونے کی کوشش کرتے ہوئے) بلا وجہ مجھے بیمار سمجھا جا رہا ہے۔
امتیاز: (عباس کو بٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے) آپ آرام کیجئے۔
(عباس بُری طرح امتیاز کا ہاتھ جھٹکتا ہے۔ امتیاز بڑی مایوسی سے زیتون کی طرف دیکھتا ہے۔ زیتون بڑھ کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر)
زیتون: آپ آرام تو کیجئے۔ ڈاکٹر صاحب نے دوا منگوائی ہے۔ آپ کو جلد آرام ہو جائے گا۔
عباس: میں کہہ رہا ہوں کہ میں علاج کرانا نہیں چاہتا۔ آخر یہ سازش میرے خلاف کیوں کی جا رہی ہے۔
زیتون: سازش ! (نفرت اور غصے سے) گویا قے میں ہیضہ میں نے پھیلایا ہے۔ آپ کو قے میں نے کرائی ہے۔
عباس: کچھ بھی ہو، مگر ڈاکٹر امتیاز کو تم نے بلایا ہے تاکہ وہ اپنا من مانا علاج کر سکیں۔ وہ تو چائے پیتے ہی میری طبیعت پر گرانی شروع ہو گئی تھی۔
زیتون: کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ وہی چائے میں نے بھی پی تھی۔ اور مسٹر محسن نے بھی۔
عباس: (تقریباً چیختے ہوئے) مگر میں ڈاکٹر امتیاز سے علاج کرانا نہیں چاہتا۔
(نڈھال ہو کر کرسی سے ٹک جاتا ہے اور آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ زیتون بڑی مایوسی سے امتیاز کو دیکھتی ہے اور آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔)
امتیاز: چائے کا دودھ قصبے سے آیا تھا؟
زیتون: جی ہاں۔ ڈاکٹر صاحب۔
امتیاز: گھبرانے کی بات نہیں معمولی حملہ ہے جلد ہی طبیعت سنبھل جائے گی۔
(دروازے کے پاس جا کر باہر دیکھتے ہوئے) ابھی تک مسٹر محسن نہیں آئے۔
عباس: (آہستہ آہستہ آنکھیں کھول کر) ۔ نیں۔ نیں۔
امتیاز: (عباس کے پاس آ کر) آپ آرام کیجئے۔ ابھی تھوڑی ہی دیر میں طبیعت سنبھل جائے گی۔
عباس: مگر میں آپ سے علاج کرانا نہیں چاہتا۔ آپ خدا کے لئے چلے جائیے۔ ورنہ میں سچ مچ جان دے دوں گا۔
(اس طرح نڈھال ہو کر کرسی سے ٹک جاتا ہے جیسے اس پر بیہوشی طاری ہو۔ امتیاز زیتون کی طرف دیکھ کر)
امتیاز: آیئے انہیں چارپائی پر لٹا دیں۔
زیتون: گھبرایئے نہیں، آیئے میری مدد کیجئے۔ (محسن کمرے میں آتا ہے، امتیاز اسے دیکھ کر) اے مسٹر، ذرا میری مدد کرنا۔
(محسن اور امتیاز بدقت اُسے چارپائی پر لٹاتے ہیں —
زیتون کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر) گھبرانے کی بات نہیں بہت معمولی حملہ ہے ٹھیک ہو جائے گا۔
(باقی صفحہ ۸۰ پر دیکھئے)

حاشیے

ڈاکٹر محمد حسن

ننھا سا شعلہ

ریاستوں کی طرح ہر فرد کا بھی ایک آئین ہوتا ہے جس کے سامنے اُسے جواب دہ ہونا پڑتا ہے۔ ریاستیں صدیوں میں منتی ہیں، فرد زندگی کے ماتھے کی شکن ہے جو ایک لمحے اُبھرتی ہے اور دوسرے لمحے مٹ جاتی ہے چند شکنیں البتّہ ایسی بھی ہوتی ہیں جو گہرے نقش چھوڑ جاتی ہیں، مگر ہر بار ہر فرد کو اپنی زندگی کا جواز ڈھونڈھنا پڑتا ہے۔ ابسن نے اپنے ڈرامائی لہجے میں اُسے 'بچانے والے جھوٹ' SAVING LIE کہا ہے۔ دراصل مسرّت اسی کا نام ہے کہ انسان جس کام کی تکمیل یا جس مشغلے کو سب سے اہم جانتا ہو اُسی میں زندگی صرف کر سکے۔ غالب نے بڑی عارفانہ بات کہی ہے:

"سُنو صاحب! جس شخص کو جس شغل کا ذوق ہو اور وہ اُس میں بے تکلّف عمر بسر کرے اُس کا نام عیش ہے"

آج جینے کا جواز تلاش کرنا اور بھی اہم ہو گیا ہے، ایٹم بم اور ایٹمی توانائی کی یہ دُنیا بہ یک وقت مکمّل تباہی کی نذر بھی ہو سکتی ہے اور اُن دیکھی مسرّتوں اور خواب و خیال سے ماوراء برکتوں اور نعمتوں سے ہم کنار بھی۔ افراط و فراوانی کا یہ حال کہ ساری انسانی آبادی کی ضروریات چند چند ملکوں کی مصنوعات سے پُوری ہو سکتی ہیں اور غربت اور ناداری کا یہ عالم کہ ملکوں ملکوں لوگ مُفلسی اور بھوک میں زندگی گزار رہے ہیں۔

اس صورتِ حال میں آج کے ادیب اور دانشور کہاں ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ فن کار کو جس طرح آسمان پر پھیلی ہوئی قوسِ قزح کے رنگ یا ایک حسین منظر سے بے اختیار ہونا چاہیئے، اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ زمین پر بہتے ہوئے انسانی خون، بھوک، غلامی، مفلسی اور سماجی نعمتوں میں مبتلا انسانوں کی تذلیل سے بھی تڑپ اٹھنا چاہیئے۔ میرے نزدیک محبّت اور حُسن فن کا مذہب ہے اور محبّت اور حُسن تک انسان کی رسائی احساس کی پاکیزگی کے بغیر ممکن نہیں۔

اس لئے آج کے ادیب کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ حسّیت کی توسیع کا ہے۔ عصری دردمندی سے بے تعلّقی کا نہیں، بلکہ اس میں شمولیت اور اس کے بھرپور احساس کا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آج کا ادیب عام طور پر عصری دردمندی اور اس کے کرب میں اس طرح مبتلا اور شریک نہیں ہے۔ خوشونت سنگھ "اسٹرٹیڈ ویکلی" کے مدیر بھی تھے اور عصرِ حاضر کے ایک اہم ادیب بھی۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"میرے حواس مفلوج ہو چکے ہیں۔ مجھ پر اب دہشت ناک واقعات کا ردِّ عمل نہیں ہوتا۔ میں ایک ویت نامی بچّے کی تصویر دیکھتا ہوں جس کا بازو بارود سے اُڑ گیا ہے اور یہ تعجّب کرنے لگتا ہوں کہ اسے پھر کس طرح جوڑا جا سکتا ہے۔ میں اخبار میں ان بچّوں کے بارے میں پڑھتا ہوں جو اسرائیل کے نیپام بموں سے جل گئے ہیں۔ ہر نئے قتلِ عام کے بعد میں جغرافیئے کے بارے میں اپنی معلومات بڑھاتا ہوں۔ شارپ ویل جنوبی افریقہ کا وہ مقام ہے جہاں کالوں کا قتلِ عام ہوا۔ مائی کائی، ویت نام کا وہ گاؤں ہے جہاں امریکی سپاہیوں نے ویت نامی بچّوں اور عورتوں کا صفایا کر دیا۔ جبل پور وہ شہر ہے جہاں دو پریمیوں کی محبّت کی بنا پر فرقہ وارانہ قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا۔ پھر رانچی، احمد آباد، تھانہ، بھیونڈی۔ جل گاؤں . . . . .!"

کسی فلسفی نے کسی طالبِ علم سے سوال کیا تھا۔ "کیا تم میں تحصیلِ علم کی جُرأت ہے؟" علم اور صداقت واقعی جرأت طلب ہیں۔ یہ مے پیچ پیچ مرد افگن ہے۔ اسی لئے سُقراط کو زہر پینا پڑا تھا۔ اور اہلِ بینش ہر عہد میں خوار و زبوں رہے ہیں۔ آج بھی فنکار کا فریضہ ہے کہ اس کی کُلاہ کج ہو، اور سماجی ناانصافی، انسانیت دُشمنی اور مصلحت پرستی کے خلاف اُس کی آواز میں بغاوت کا ننھا سا شعلہ ضرور لہرائے کہ یہی ننھا سا شعلہ ہے، جو اُس کے فن کو اُس کے اپنے دَور کی آواز ہی نہیں بناتا بلکہ انسانیت کے درد و داغ و جستجو و آرزو کی آواز بھی بنا دیتا ہے جو زمان و مکان کے فاصلوں کے اُس پار بھی سُنی جاتی ہے۔

پسِ نوِشت ،

آئینہ ۔ ؟ !
شمال کی جانب شمال کی آخری حد تک آئینے کی دیوار !
جنوب کی جانب جنوب کی آخری حد تک آئینے کی دیوار !!
آسمان کی جانب آسمان کی انتہائی بلندیوں تک آئینے کی دیوار !!!
آنکھوں کے سامنے آئینہ ۔،
آئینہ ۔ اُجلا ۔ صاف ، شفّاف .....
گھر کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ لٹکا کر آپ جدید نہیں بن سکتے !

(بلراج مین را ، کمپوزیشن پانچ ۔ السطور ص ۴۹)

بقیہ ڈراما صفحہ ۶۵ ۔ موت سے پہلے آدمی ...

زیتون : مگر ڈاکٹر ۔ !

اِمتیاز : آپ مجھ پر بھروسہ کیجئے ۔

زیتون : مجھے تو آپ پر بھروسہ ہے ، مگر وہ آخر کیوں ۔ (اپنے آنسو پونچھ کر آہستہ سے) مجھے افسوس ہے کہ آپ کو ان کے رویے سے تکلیف پہنچی ہوگی ۔

اِمتیاز : آپ فکر نہ کیجئے مسز ۔ زیتون ، عباس (پھیکی مسکراہٹ سے) ڈاکٹری زندگی میں ایسے ہزاروں مواقع آتے ہیں ۔ جہاں لوگوں کو اس پر بھروسہ نہیں رہتا ۔

عباس : (پھر آہستہ سے آنکھیں کھول کر) ڈاکٹر امتیاز ، آپ ابھی تک نہیں گئے ۔ کیا میری موت ہی دیکھنے کا ارادہ ہے اور اب تو آپ نے ۔ (انتہائی طنز سے) مسز زیتون عباس سے ملاقات بھی کر لی ۔

(امتیاز کچھ دیر خاموش کھڑا رہتا ہے ۔ پھر آہستہ آہستہ دروازے کی جانب بڑھتا ہے ۔ زیتون بے حد مایوسی کے عالم میں)

زیتون : ڈاکٹر صاحب ۔ آپ ۔

امتیاز : (پلٹ کر) مسز عباس مجھے افسوس ہے کہ آپ نے ایک چھوٹے سے آدمی سے شادی کر لی ۔

(آگے بڑھتا ہے کہ محسن دوائیوں کا بکس ہاتھ میں لئے کمرے میں آتا ہے اور امتیاز کو جاتا ہوا دیکھ کر)

محسن : ڈاکٹر صاحب ! ۔ یہ دوائیاں ۔

اِمتیاز : شاید عباس صاحب اپنا علاج خود کر لیں گے ، ویسے میں دوسرے ڈاکٹر کو بھیجتا ہوں ۔

(کمرے سے چلا جاتا ہے ۔ محسن حیرت اور زیتون مایوسی سے دیکھتے رہ جاتے ہیں ۔)

(پردہ)

زرِ سالانہ ختم ہونے کی اطلاع

اس سرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا سالانہ خریداری اگست ۱۹۷۷ء میں ختم ہو چکا ہے لہٰذا شاعر دوستی جاری رکھنے کے لئے سال کیلئے دس روپے بذریعہ منی آرڈر بھیج دیجئے ، چونکہ وی۔ پی کا خرچ بہت بڑھ گیا ہے اس لئے وی۔ پی نہیں بھیجا جائیگا ۔ اگر تجدید خریداری منظور نہ ہو تو بذریعہ خط کے فوراً اطلاع دے دیجئے ۔ (منیجر)

ناول

(دوسری قسط)

کشمیری لال ذاکر

دھرتی سدا سہاگن

(دوسرا باب)

سنسان پلیٹ فارم پر اپنے مختصر سامان کے درمیان ٹرنک پر بیٹھے بیٹھے آخر شیتل اکتا گیا۔ یوں کب تک بیٹھا رہے گا وہ؟ بسکٹ کھا چکنے کے بعد وہ آوارہ کتا بھی غائب ہو گیا تھا۔ بسکٹوں کا خالی ڈبہ پلیٹ فارم پر پڑا تھا۔ ایسے ہی جیسے خالی ڈبے پڑے ہوتے ہیں۔ ایک دم بے کار اور حقیر۔ خالی ڈبے کو دیکھ کر اسے بڑی کوفت ہونے لگی۔ جیسے وہ اس کی بے بسی کا مذاق اڑا رہا ہو۔ اس نے ایک ہاتھ سے بیساکھی کو سنبھالا۔ اور ڈبے کو بہت دور دھکیل دیا۔ اتنی دور کہ آخر وہ سرکتے ہوئے پلیٹ فارم کے نیچے ریلوے لائن پر گر پڑا اور شیتل کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اس نے گھڑی دیکھی، چار بجنے کو تھے۔ پچھلے پہر کی دھوپ اور بھی دلکش لگ رہی تھی۔ لیکن ڈھلتی دھوپ کا یہ موہ اب اسے چھوڑ دینا چاہیے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا، بیساکھی سنبھالی اور گیٹ کی طرف چل دیا۔ شاید کوئی تانگہ والا مل جائے گاؤں جانے کے لئے۔ گیٹ سے باہر نکل کر وہ سامنے والی کھلی جگہ پر آ گیا۔ وہی جانا پہچانا میدان تھا۔ ویسا ہی جیسا وہ آج سے کچھ برس پہلے چھوڑ کر گیا تھا۔ کوئی خاص تبدیلی نہیں تھی۔ شیتل وہیں کھڑا دیر تک جانے کیا سوچتا رہا۔

اس نے دیکھا ایک تانگہ اسٹیشن کی طرف آ رہا تھا۔ دھیرے دھیرے اسی طرح، جیسے وہ پسنجر ٹرین، جس سے وہ اترا تھا گذری تھی۔ یہ دھیما پن تو جیسے اس ماحول کا ایک ضروری حصہ تھا۔ گاؤں کے کچھ مسافر چھ بجے والی گاڑی پکڑنے آ رہے تھے۔ ان لوگوں کو سدا بجائے دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں انہیں دیر نہ ہو جائے۔ کہیں ان کی گاڑی چھوٹ نہ جائے اور اسی نامعلوم ڈر کے زیر اثر وہ منہ اندھیرے ہی اسٹیشن پر پہنچ جاتے ہیں اور اس طرح اپنے وقت کا اکثر حصہ فضول ضائع کرتے رہتے ہیں۔ تانگہ قریب آتے آتے آخر رک گیا۔ شیتل نے کوچوان کو پہچاننے کی کوشش کی۔ ارے، یہ تو وہی دولت کاکا تھا۔ گاؤں کا سب سے پرانا تانگہ چلانے والا۔ تانگہ بھی تو وہی تھا۔ گھوڑا بھی شاید وہی ہو، شاید نہ بھی ہو۔ اس کا وہ ٹھیک طرح اندازہ نہ کر سکا۔ تانگہ اب بہت پرانا ہو گیا تھا۔ پہیوں سے کیسی بے ہنگم سی آوازیں نکلتی تھیں۔ سواریاں تانگے سے اتریں، کوچوان کو کرایہ ادا کیا اور ٹکٹ گھر کی طرف چل دیں۔ شیتل بیساکھی بغل میں دبائے انہیں غور سے دیکھتا رہا۔

"کہاں جاؤ گے حوالدار؟" دولت کاکا نے خالص تانگے والوں کے کاروباری انداز میں پوچھا۔ شیتل کو یہ انداز کچھ پسند نہ آیا۔ وہ پل بھر کو خاموش رہا۔

"اکیلے ہو؟" کوچوان کے اس سوال کا بھی شیتل نے کوئی جواب نہ دیا۔

"سامان کہاں ہے؟" اس نے پھر پوچھا۔

شیتل سوچنے لگا کہ یہ آدمی کوچوان تو خیر ہے ہی، لیکن دولت کاکا بھی تو ہے۔ اس کے مرحوم والد کا لنگوٹیا یار، جو اسے کندھے پر اٹھا کر گھمایا کرتا تھا اور جب اس نے پہلی بار تانگہ جوڑا تھا تو شیتل کو اگلی سیٹ پر اپنے ساتھ بٹھا کر بہت دیر تک گھماتا رہا تھا۔ شیتل اب اس کے کاروباری انداز کا جواب گاہکوں کی طرح نہیں دے سکے گا۔ کیا ہوا اگر وہ کئی برسوں کے بعد اس سے مل رہا ہے۔ آخر وہ دولت کاکا ہی تو ہے۔ وقت کے ساتھ رشتے تھوڑی بدل جاتے ہیں۔ اس کے والد کے بچپن کا دوست ایک خالص تانگہ چلانے والا کیسے بن سکتا ہے؟

"آپ دولت کاکا نہیں ہیں کیا؟" شیتل نے پوچھا۔

"ہاں لیکن تم کون ہو؟" دولت نے اپنی عینک کے شیشوں کو آنکھوں پر جماتے ہوئے پوچھا، جس کی ایک کمانی ٹوٹ گئی تھی اور اُس کے ساتھ ڈوری باندھ کر وہ اُس سے کام چلا رہا تھا۔ کبھی کبھی جب ڈوری کھل جاتی تو پیتل کا گھسا ہوا فریم ناک سے نیچے کھسک جاتا۔ ڈوری پسینے کی وجہ سے خاصی گندی اور بے جان ہو گئی تھی۔

"میں شیتل ہوں، رام اوتار کا لڑکا۔"

شیتل کی بات سُن کر دولت تانگے سے نیچے اُتر کر اُس کے پاس آگیا اور اُسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ شیتل نے اگر بیساکھی کو مضبوطی سے نہ دبا رکھا ہوتا تو وہ یقیناً گر جاتا۔

"ارے باؤلے تو اتنی مدّت کہاں رہا؟"

"فوج میں بھرتی ہو گیا تھا کاکا۔!"

"سو تو تو ہو ہی گیا تھا۔ لیکن جو فوج میں بھرتی ہوتے ہیں وہ گھر نہیں آتے کیا؟"

"اب آ ہی تو گیا ہوں۔" شیتل بولا۔

"تیری ماں سُوکھ کر کانٹا ہو رہی ہے۔"

"وہ پہلے کون سا پھول تھی کاکا۔ وہ تو ہمیشہ کانٹوں کی طرح ہی رہی ہے۔ لیکن کسی کو چبھن نہیں پہنچائی اُس نے۔"

"تو تو بہت بدل گیا ہے اب۔" دولت کاکا بولا

"لیکن تم تو ویسے ہی ہو دولت کاکا، جیسے آج سے آٹھ برس پہلے تھے۔" شیتل نے دولت کو غور سے دیکھا۔ ایک خاص عمر پر پہنچ کر انسان میں رُو نما ہونے والی تبدیلیوں کا عمل کتنا سُست ہو جاتا ہے۔ بچپن، لڑکپن اور جوانی میں آدمی پل پل بدلتا رہتا ہے۔ لیکن پکّی عمر میں جیسے وقت کوئی اثر ہی نہیں دکھاتا۔ دولت کی کایا ویسی ہی تھی، جیسی وہ آٹھ برس پہلے چھوڑ کر گیا تھا۔ اُس کے چہرے اور جسم میں کوئی بھی پریورتن نہیں تھا۔

"ارے بھائی بوڑھے درخت کا کیا بدلے گا۔ نہ ساون ہرا نہ اساڑھ سُوکھا۔" یہ کہہ کر دولت ہنس دیا۔

"تمہارا تانگہ بھی تو ویسا ہی ہے۔"

"نہیں اب تو بے چارے کی چولیں ڈھیلی ہو گئی ہیں۔"

"اور کتنے تانگے بن گئے ہیں گاؤں میں؟"

"ارے تم تانگوں وانگوں کو چھوڑو اور اپنا سامان لاؤ۔ کہاں ہے تمہارا سامان؟"

"پلیٹ فارم پر۔"

"تم دوپہر کی گاڑی سے آئے تھے کیا؟"

"ہاں — !"

"تو اِس وقت تک کہاں غائب رہے تم؟ میں تو بہت دیر کے بعد یہاں سے گیا تھا۔"

"پلیٹ فارم پر ہی بیٹھا رہا۔" شیتل نے جواب دیا۔

"تو آؤ سامان لے کر آئیں۔ یہاں قلی وُلی کوئی نہیں ہے"

"تم شام کی گاڑی نہیں دیکھو گے؟"

"نہیں، اب گاؤں ہی چلیں گے۔ دِکھاؤ اپنا سامان۔"

شیتل جواب تک ایک ہی جگہ کھڑا تھا۔ بیساکھی کا سہارا لے کر پلیٹ فارم کی طرف چلنے کو مڑا۔ اُس کی بغل میں دبی ہوئی بیساکھی کو دیکھ کر دولت پر جیسے بجلی گر پڑی تھی۔

"تیری ایک ٹانگ کیا ہوئی شیتل؟" دولت جیسے چیخ اٹھا تھا۔

"کٹ گئی کاکا۔"

"ارے تو ایک ٹانگ کٹوا کر واپس آیا ہے اپنے گاؤں؟" دولت کاکا کی آواز میں بے پناہ درد تھا۔

"یہی غنیمت جانو کہ صرف ایک ٹانگ ہی کٹی ہے۔"

"اور کیا سر کٹتا تیرا؟" دولت نے کڑک کر کہا اور پھر شیتل کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر رُک گیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ غصّے اور دُکھ کے زیرِ اثر اُس نے ایسا کہہ دیا تھا۔

"سر ہی تو نہیں کٹا کاکا۔" شیتل نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا اور اپنے کندھے پر رکھے ہوئے۔ دولت کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ سے دبا لیا۔

"مجھے کھشما کرنا بیٹا، کبھی کبھی میں بہک جاتا ہوں" دولت نے پگڑی کے پلّو سے اپنی آنکھیں پونچھیں اور پھر شیتل کو سہارا دے کر پلیٹ فارم کی طرف چل پڑا۔

تھوڑی ہی دیر میں شیتل کا مختصر سا سامان تانگے میں

لدگیا اور دولت کاکا نے شیتل کو اپنے ساتھ اگلی سیٹ پر بٹھا لیا۔
تانگہ گاؤں کی طرف چل پڑا۔ اُس میں شیتل کے علاوہ کوئی اور سواری نہیں تھی۔

" تمہیں یاد ہے جب میں نے پہلے دن تانگہ جوڑا تھا تو تم اِس سیٹ پر میرے ساتھ بیٹھے تھے ؟ "

" یاد ہے کاکا ؟ "

" اُن دِنوں رام اُوتار زندہ تھا۔ کتنا جاندار دوست تھا میرا وہ ؟ "
دولت کاکا نے ایک آہ بھری۔

تانگہ دھیرے دھیرے چل رہا تھا۔

" آج جب تانگہ بوڑھا ہو گیا ہے اور پھر میں تمہارے ساتھ بیٹھا ہوں کاکا۔ لیکن فرق یہ ہے کہ آج میری ایک ٹانگ نہیں ہے اور میرے سر پر میرے پِتا کی محبت کی ٹھنڈی چھاؤں نہیں ہے۔ "

" تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ " دولت نے ایک آہ بھری۔

" ہم دونوں وہی ہیں لیکن ہمارے درمیان کی زمین لگاتار طوفانوں سے کتنی کٹ چکی ہے اور بہہ گئی ہے۔ " شیتل نے کہا۔

" زمین تو مسلسل کٹتی ہی رہتی ہے۔ ہمارے اپنے گاؤں کی کتنی ہی زمین بے کار ہو گئی ہے، لیکن کٹنے سے نہیں، نہ کٹنے سے، تپنے سے، سوکھنے سے، پانی کے چھینٹوں کو ترسنے سے۔ زمینیں جہاں بہت پانی سے خراب ہوتی ہیں وہاں بغیر پانی کے بھی) تو اُن کا کچھ نہیں رہتا۔ "

دولت کاکا نے کتنی بڑی بات کہی تھی۔ یہ بزرگ لوگ جنہوں نے زندگی کی تو او ر جھکڑ برداشت کئے ہیں کبھی کبھی کتنی تلخ سچائیاں کہہ ڈالتے ہیں۔ شیتل کی سوچ کو ایک نیا موڑ مل گیا تھا تو گاؤں کی زمین ابھی تک خراب ہو رہی تھی ! دولت کاکا کو اِس ڈھلتی عمر میں بھی، اِس کا غم تھا۔ یہ غم تو زندگی کو گھن کی طرح کھا جاتا ہے۔ زندگی سے اگر یہ چھوٹے چھوٹے غم، دُکھ اور رنج نکل جائیں تو زندگی کتنی خوبصورت اور پیاری بن جائے۔

تانگہ اُسی دھیمی رفتار سے چل رہا تھا۔ پہیئے بڑی عجیب آواز میں کراہ رہے تھے جیسے تھک گئے ہوں۔ اِس ایک ہی راستے پر ہر روز صبح شام کئی کئی چکر لگاتے ہوئے۔ جیسے کہہ رہے ہوں کہ اُنہیں اب نئے راستوں اور نئی منزلوں کی آرزو ہے۔ ایک ہی نہج پر گھومتی ہوئی زندگی آخر بے رس اور بے جان ہو جاتی ہے۔

دولت کاکا نے جیب میں سے بیڑی کا بنڈل نکالا۔

" بیڑی پیتے ہو نا ؟ " اُس نے شیتل سے پوچھا۔

شیتل کو بیڑی پینا پسند نہیں تھا۔ بیڑی شاید اُس نے ایک آدھ بار ہی پی تھی۔ لیکن وہ دولت کاکا کے سامنے اِنکار نہ کر سکا۔ اُس نے بیڑی سُلگائی۔ کڑوا کسیلا دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے اُس نے پوچھا۔

" گاؤں کی یہ سڑک تو ویسی ہی ہے، پکی نہیں بنی ابھی تک ؟ "

" گاؤں والے ایک دوسرے کا ساتھ دیں تو سڑک پکی بنے۔ وہ تو آپس ہی میں جھگڑتے رہتے ہیں۔ "

" برسات کے دِنوں میں تو بہت دقت ہوتی ہوگی۔ ؟ "

" سڑک کئی کئی روز تک بند رہتی ہے۔ لوگ اسٹیشن سے گاؤں تک پیدل ہی آتے جاتے ہیں۔ "

" تو اِسے پکا کیوں نہیں بناتے ؟ "

" ایک وجہ تو اُن کے آپسی اِختلافات ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ غریب ہیں۔ دھن اِکٹھا نہیں کر سکتے۔ "

" غریبی کوئی نئی بات نہیں ہے کاکا۔ غریبی کا اِحساس نئی بات ہے۔ یہ تلخی نئی ہے۔ اِنقلاب کی یہ اُمنگ نئی ہے۔ لوگ غریب ہیں تو کیا، زندہ رہنا تو چاہتے ہیں۔ "

" چاہتے تو ہیں لیکن ــ "

" لیکن کیا ؟ "

" لیکن سادھن نہیں ہیں۔ "

" سادھن تو بنائے جاتے ہیں کاکا۔ راستے خود نہیں بنتے، بنائے جاتے ہیں۔ منزلیں آپ سے آپ نہیں مل جاتیں ڈھونڈھی جاتی ہیں۔ "

شیتل نے اَدھ جلی بیڑی کو کچی سڑک کی دھول پر پھینکتے ہوئے سوچا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے دولت کاکا اُسے سمجھتا بھی ہے کہ نہیں۔ وہ بے کار ہی اپنا جھکی پن دکھائے جا رہا ہے۔ اُس کے دِل میں کہنے کو اِتنا کچھ ہے کہ وہ رُک نہیں سکتا۔ اُس کا من کرتا ہے کہ بس بولے ہی جائے۔

گاؤں قریب آرہا تھا۔"

سامنے ہی گاؤں کا کنواں تھا۔ عورتیں پانی بھرنے آرہی تھیں۔
شیتل کو پیاس لگ رہی تھی۔ لیکن تانگے سے اُتر کر کنوئیں تک جانا اور دوبارہ تانگے میں بیٹھنا بڑا مشکل کام تھا۔ وہ اپنی کٹی ہوئی ٹانگ کو لے کر کہیں بھی جانا نہ چاہتا تھا۔

گاؤں کے کنوئیں پر شام کا یہ منظر اُس نے برسوں کے بعد دیکھا تھا۔ اُس کی آنکھیں اِس نظارے کو ترس گئی تھیں۔

"کنوئیں کا پانی کیسا ہے کاکا۔؟"

"کھارا۔"

"ابھی تک کھارا ہی ہے۔؟"

"اور کیا مصری گھل جاتی اِس میں؟"

شیتل کو لگا جیسے دولت نے اُس کے مُنہ پر بھرپور طمانچہ لگایا تھا۔ وہ سٹپٹا گیا۔

"گاؤں والے میٹھے پانی کا کنواں بھی نہیں بنا پائے ابتک؟"
شیتل نے بڑے کھُردرے پن سے کہا۔ جیسے دولت کی بات سے وہ چِڑ گیا ہو۔

"نہیں۔"

"کیوں۔؟"

"گاؤں کے اِس طرف تو سب جگہ کھارا پانی ہے۔ دوسری طرف زمین کی ایک ٹکڑی ہے جس کی تہہ میں میٹھا پانی ہے۔ سرکاری آدمیوں نے اُس کی جانچ بھی کی تھی۔ لیکن اُمراؤ سنگھ ٹھاکر جسکی یہ زمین ہے، زمین کی اُس ٹکڑی کو دینے پر راضی نہ ہوا، اور بات رہ گئی۔"

"گاؤں کی پنچائت نے کچھ نہیں کیا۔؟"

"ٹھاکر شہر میں رہتا ہے۔ اُس پر پنچایت کا کیا دباؤ تھا۔"

"تو تم لوگ جب سے کھارا پانی ہی پی رہے ہو؟"

"تم بھی یہی پانی پیوگے اب؟"

شیتل نے محسوس کیا کہ دولت کاکا اُس کی باتوں سے ناراض ہو رہا تھا۔ اِس لئے کہ اُس نے اُن کمزوریوں کی طرف اِشارہ کیا تھا جنہیں دیکھ کر دولت ایک زمانے سے کُڑھ رہا تھا اور جنہیں دُور کرنے کے لیئے وہ کچھ بھی نہ کرسکا تھا۔ اور اب وہ نراش ہو کر تلخ ہوگیا تھا۔ اُس کی یہ تلخی شکست کی تلخی تھی۔

"تم اگر میرا ساتھ دو تو ہم مل کر کچھ کرسکتے ہیں۔" شیتل نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

"میں تو تیار ہوں شیتل۔ لیکن ہم دونوں سے کیا ہوگا۔؟"

"کچھ تو ہوگا ہی دولت کاکا۔ کچھ تو کریں گے ہی ہم۔" شیتل نے بڑے یقین سے کہا۔

تانگہ اب سمر پور گاؤں کے جوہڑ کے پاس سے گزر کر گلی میں داخل ہونے لگا تھا۔ شیتل کا دِل دھڑک اُٹھا۔ وہ سہم سا گیا۔ اُسے اپنے اپاہج پن کا احساس بڑی شدّت سے ہونے لگا۔ وہ ماں کے سامنے کون سا مُنہ لے کر جائے گا۔

"میرا گاؤں مجھے قبول کرے گا کاکا۔؟"

"کیوں نہیں؟"

"میری دھرتی مجھے سویکار کرلے گی؟"

"کیوں نہیں شیتل۔"

"یہ گلیاں مجھے یہاں پاؤں دھرنے دیں گی؟"

"کیوں نہیں دھرنے دیں گی بیٹا؟"

"میری ایک ٹانگ جو نہیں ہے!"

"لیکن تمہارے سینے میں دِل ہے شیتل، جو دھڑک سکتا ہے، محسوس کرسکتا ہے۔ رو سکتا ہے، جل سکتا ہے۔"

ڈھول سے اٹی سمر پور گاؤں کی ایک تنگ سی گلی میں سے گزرتے ہوئے شیتل کا دِل دھڑک رہا تھا اور اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی سُلگ رہی تھی۔

شیتل کے گھر کے سامنے پہنچکر تانگہ رُک گیا۔

عام طور سے دولت کاکا سواریوں کو گاؤں کے باہر ہی اُتار دیا کرتا تھا۔ گلیوں میں سواریاں بٹھا کر اُس نے تانگہ کبھی نہیں گزارا۔ لیکن آج اور بات تھی۔ آج تانگے میں رام اوتار کا لڑکا بیٹھا تھا۔ اُس کے جگری دوست کا بیٹا، جو آٹھ برس کے بعد گھر لَوٹ رہا تھا اور وہ بھی اپاہج۔ بے چارہ اِن اوبڑ کھابڑ گلیوں میں سے کیسے چل سکتا تھا۔

گھر کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ آج کئی مہینوں کے بعد وہ دروازے پر آیا تھا۔ اکثر اندر سے سانکل چڑھی رہتی تھی۔ ماں بہت کم کہیں جاتی۔ عام طور سے گھر ہی میں رہتی تھی۔ گلی، محلے کی عورتیں خود ہی اُس کے پاس آجاتی تھیں۔ دولت نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک کمزور سی عورت نے کواڑ کھولے۔ عورت بہت بوڑھی نہیں تھی۔ لیکن اُس کے چہرے پر فکر اور پریشانی کے بڑے گہرے نشان تھے۔ دولت کو کھڑا دیکھ کر اُس نے سر کا کپڑا ذرا اور نیچے سرکا لیا۔ یہ شیتل کی ماں تھی۔

"بہت دِنوں میں دکھائی پڑے ہو بھیا۔ ؟"

"یہ تانگے کا چکر کہیں جانے ہی نہیں دیتا بھابی۔" یہ جواب دیتے ہوئے تنگ سے آنگن کے اندر آگیا۔

شیتل اب تانگے میں نہ بیٹھا رہ سکا۔ وہ بیساکھی کی مدد سے بڑی مشکل سے نیچے اُترا اور گلی کو پار کرتا ہوا اپنے گھر کے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ آنگن ویسا ہی تنگ اور گھٹا ہوا تھا۔ جگہ جگہ گڑھے تھے۔ سامنے دیوار کے ساتھ خالی ناند تھی۔ بہت دِن ہوئے جب یہاں گائے بندھا کرتی تھی۔ ایک زمانے سے تو اُپلے اور ایندھن رکھنے کے کام آرہی تھی۔ لگتا تھا جیسے اُس کا گھر ویسا ہی تھا۔ جیسا وہ اُسے چھوڑ کر گیا تھا۔

شیتل کی ماں نے دولت کے لئے کھاٹ ڈالی کہ وہ بیٹھ جائے۔ لیکن وہ بیٹھا نہیں۔

"بھابی، شیتل آیا ہے۔"

"شیتل، میرا بیٹا!" وہ حیرت اور خوشی سے جیسے چیخ ہی تو اُٹھی۔

شیتل ایسے کس طرح آسکتا تھا بنا کسی چٹھی پتری کے۔ وہ سوچنے لگی۔

"کہاں ہے شیتل۔ ؟"

"وہ رہا تانگے میں۔"

"اندر کیوں نہیں لائے اُسے۔ ؟"

یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف لپکی۔

شیتل دہلیز پر کھڑا تھا۔ خاموش اور بے حس و حرکت، جیسے زمین میں گڑا ہو۔ وہ ماں کے پاؤں چھونا چاہتا تھا۔ لیکن اب تو یہ خیال بھی اُس کے دماغ سے نکل گیا تھا۔ وہ تو بس ایک بُت کی طرح کھڑا تھا اور ماں کو ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔

"شیتل!!" وہ چیخ اُٹھی۔ اتنے گمبھیر مزاج والی عورت ایک دم پاگل ہو گئی تھی۔

وہ آگے بڑھ کر شیتل سے لپٹ گئی اور شیتل لمحہ بھر کو لڑکھڑا گیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"مجھے کھشما کرو ماں، میں اپرادھی ہوں۔" شیتل سسکنے لگا

"لوگو! مجھے مبارکباد دو میرا بیٹا گھر واپس آیا ہے اپنی ٹانگ کٹوا کر ایک اپاہج بن کر۔" ماں زور زور سے رونے لگی۔

دولت نے آگے بڑھ کر شیتل کا بازو تھاما اور اُسے اندر لے آیا۔ اُسے کھاٹ پر بٹھایا اور تانگے میں رکھا اُس کا سامان آنگن میں رکھنے لگا۔ پھر وہ شیتل کی ماں سے مخاطب ہوا

"بھابی شیتل نے بڑا کڑا وقت دیکھا ہے۔ اُس نے دیش کی رکھشا کے لئے بہت بڑی قربانی دی ہے۔ اُس نے برف سے ڈھکی پہاڑیوں پر لڑتے ہوئے تمہارے خون کی لاج رکھی ہے۔ یہ اُس سوتنتر دیش کا سپاہی ہے جو امن اور انصاف کے لئے صدیوں سے سنگھرش کر رہا ہے۔ اِس کی دیکھ بھال کرو۔ یہ تمہارے گھر کا چراغ ہے۔ اِس سے تمہارا آنگن جگمگائے گا۔ تمہارے جیون کے گلیارے چمکیں گے۔"

لیکن وہ روئے جا رہی تھی۔

شیتل نے مشکل سے تھوڑا جھک کر ماں کے پاؤں چھوئے۔

اور ماں نے اُس کا ماتھا چوم لیا۔

"یگ یگ جیو بیٹا۔ تم نے اپنی بوڑھی ماں کا جھکا ہوا سر اُونچا کر دیا ہے۔"

دولت کی کمزور آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔

گلی میں گھوڑا ہنہنا رہا تھا۔ اب وہ اپنے تھان پر پہنچنا چاہتا تھا۔

"میں کل آؤں گا شیتل۔ اب چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر دولت سکا کا دروازے سے باہر نکل گیا۔

شیتل اور اُس کی ماں کچھ دیر چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر ماں بولی۔

"بیٹا ہاتھ منہ دھولو۔ میں چائے بناتی ہوں۔"

ماں چائے بنانے میں لگ گئی اور شیتل ہاتھ منہ دھو کر فارغ ہوگیا۔ پچھلے تین روز سے وہ سفر میں تھا۔ اب ذرا اُس کی تھکان اُتری تھی۔ چائے کی پیالی ماں نے بڑے پیار سے بنائی تھی۔ اُس نے آنگن میں ایک پرانا مونڈھا اور اسٹول ڈال دیا اور شیتل چائے پینے لگا۔ شام ہو رہی تھی۔ ماں شیتل کے لیے سبزی لینے دکان پر چلی گئی۔ گاؤں بھر میں ایک ہی دکان تھی۔ جہاں مہینے میں ایک آدھ بار کوئی سستا سا پھل اور آٹھویں دسویں روز کوئی عام سی سبزی مل جاتی تھی۔ اپنے لئے تو وہ شام کو کھانا بناتی ہی نہیں تھی۔ بس چائے پی کر ہی گزارہ کر لیتی تھی۔ لیکن شیتل کے لئے تو کھانا بننا ضروری تھا۔

ماں کے جانے کے بعد شیتل نے گھر کا اچھی طرح سے جائزہ لیا۔ یہی وہ تنگ سا صحن اور تاریک سا گھر تھا۔ جس کی کشش اُسے اِتنی دور سے کھینچ لائی تھی۔ اِن نیم پکی دیواروں میں وہ کیا چیز تھی جسے وہ اتنی مدت گزرنے پر بھی نہیں بھول سکا۔ دیواریں تو اُسے کسی بھی جگہ مل سکتی تھیں۔ لیکن یہ دیواریں اُسے کہاں سے ملتیں جن میں ایک نسل کی روایات دبی تھیں۔ روایات کا یہ خزانہ اُسے اور کہاں ملتا؟ یہی پونجی تو اِنسان کی زندگی کی اساس ہے۔ اِنسانی زندگی سے پرے پُرکھوں کا یہ سمندر کتنا گہرا اور اٹوٹ ہے۔ اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے گھر کا یہ اُوبڑ کھابڑ صحن اگرچہ بہت تنگ تھا۔ تینوں کمرے چھوٹے اور تاریک تھے۔ ڈیوڑھی بڑی پرانی اور خستہ تھی۔ لیکن یہ سب ایک دور کے امانتدار تھے۔ ایک یُگ کے ساکھشی تھے۔ اِن سے اُس کا وہی تعلق تھا جو کپاس کے پودوں کا دھرتی سے ہوتا ہے۔ وہ تو ایک ایسا پودا تھا جو مختلف زمینوں میں لگتا رہا۔ لیکن کسی دھرتی نے اُسے قبول نہ کیا اور آخر وہ اپنی ہی دھرتی پر لوٹ آیا تھا۔ جانے اُس کی دھرتی بھی اُسے سویکار کرے گی کہ نہیں؟ جانے کپاس کا یہ پودا کبھی پھول بھی دے گا کہ نہیں؟ اِس میں کبھی روئی کی کلیاں سی ہرائیں گی کہ نہیں؟ کوئی روئی کے اِن گالوں کو چُنے گا کہ نہیں؟ روئی چُنی گئی تو کوئی کنواری چرخے پر سوت کاتے گی اور پھر اُس کا کپڑا بُنے گا اور یہ کپڑا کسی خوبصورت جسم پر سجے گا اور کپاس کے پودے کی زندگی سپھل ہو جائے گی۔

شیتل ایسی ہی باتیں سوچتے سوچتے سو گیا۔ ماں جب بازار سے واپس آئی تو شیتل گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ اُس کے قریب کھڑی دیر تک اُسے دیکھتی رہی۔ جوانی میں شیتل کا پِتا بھی ایسا ہی لگتا تھا۔ اُسے اپنے سُورگیہ پتی کی یاد آ گئی، وہی ماتھا وہی ناک نقشہ، جسم کی ویسی ہی بناوٹ۔ کاش اُس کی ایک ٹانگ نہ کٹتی! وہ تو کئی گھرانوں سے شیتل کی شادی کی بات بھی چلا رہی تھی۔ اب اِس اپاہج کو کون دے گا اپنی لڑکی؟ تو کیا شیتل کی شادی کبھی نہ ہوگی؟ گاؤں کا اِتنا پرانا خاندان کیا یہیں ختم ہو جائے گا؟ شیتل کے بعد اس خاندان کا نام لینے والا کیا کوئی نہ ہوگا؟ یہ باتیں سوچتے سوچتے اُس کی آنکھیں گیلی ہو گئیں جنہیں اُس نے اپنے دوپٹے کے چھور سے پونچھ ڈالا۔ اُسی لمحہ شیتل نے کروٹ لی اور ماں وہاں سے ہٹ گئی۔

شیتل جب جاگا تو اندھیرا ہو گیا تھا اور آنگن کے آخری کونے میں طاق میں رکھا لیمپ جل رہا تھا۔ اُس کی ماں ایک طرف خاموش بیٹھی تھی، اُس شمع کی طرح جو بجھ گئی ہو۔

"کھانا لاؤں بیٹا؟" ماں نے پوچھا۔

"ہاں لاؤ، بھوک لگ رہی ہے۔" شیتل نے جواب دیا۔

ماں تھالی میں کھانا پروس کر لے آئی اور خود کھاٹ کی پائینتی کی طرف بیٹھ گئی۔

"تم کھانا نہیں کھاؤ گی کیا؟"

"میں تو رات کو کچھ نہیں کھاتی۔"

"لیکن آج تم میرے ساتھ کھاؤ گی۔"

"میں کچھ نہیں کھاتی اِس سمے۔"

"تو میں بھی نہیں کھاؤں گا۔"

اب اِنکار کرنا ماں کے بس کی بات نہیں تھی۔

ماں بیٹا دونوں ایک ہی تھالی میں کھانے لگے۔

"میس (MESS) میں کھا کر تو اب گھر کے کھانے کا ذائقہ ہی ختم ہو گیا ہے۔" شیتل بولا۔ لیکن ماں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ تو اِتنی جذباتی ہو رہی تھی کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ کچھ دیر خاموش رہ کر اور شیتل کو کھانا کھلانے میں مصروف دیکھ کر وہ صرف بات کرنے کی خاطر بولی۔

"کھانا اچھا نہیں بنا کیا ؟"

"بہت اچھا ہے۔ آج کئی برسوں کے بعد تو کہیں نصیب ہوا ہے۔"

کھانا کھا چکنے کے بعد دونوں ماں بیٹے کچھ دیر باتیں کرتے رہے اور پھر اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹ گئے۔ کچھ سمے خاموش رہ کر شیتل نے پوچھا۔

"ماں وہ چندر کہاں ہے آج کل ؟"

"کون چندر بیٹا ؟"

"تو بھول گئی اُسے۔ ارے وہی جو میرے ساتھ پڑھا کرتا تھا، اور ہم دونوں اسکول سے کھسکا کرتے تھے۔"

"وہی جس کی شادی میں تم نے کئی روز تک گھر کا منہ نہ دیکھا تھا، اُسی کے گھر سے بندھ گئے تھے۔"

"تم ناراض بھی تو بہت ہوئی تھیں ماں، یاد ہے نا ؟"

"بالکل یاد ہے۔"

"اُس کی بہو کو تم نے شگن ڈالا تھا۔ بہت خوبصورت تھی نا اُس کی بہو ؟"

"ہاں۔"

"کہاں ہے وہ آج کل ؟"

"نہیں سسرال میں۔"

"چندر کے ساتھ نہیں گئی ؟"

"نہیں، چندر اکیلا ہی گیا ہے۔ لوگوں نے اُسے جانے سے روک دیا۔"

"لوگ تو گدھے ہیں، اُن کا کیا۔ چندر کہاں ہے آج کل ؟"

"وہ بہت دور چلا گیا ہے بیٹا۔"

"خط وط تو لکھتا ہوگا ؟"

"اُس نے یہاں سے جانے کے بعد کوئی خبر ہی نہیں دی۔"

"تو ہے کہاں وہ آج کل ؟"

"بیٹا ! چندر پرلوک سدھار گیا ہے۔"

"ماں، یہ کیا کہہ دیا تم نے ؟" شیتل چیخ کر بستر سے اٹھ بیٹھا۔

"چندر کو مرے تو کئی برس ہو گئے۔"

"کئی برس ہو گئے اور مجھے خبر ہی نہیں۔"

"کون دیتا تمہیں خبر۔" ماں یہ کہہ کر خاموش ہو گئی۔

"ہوا کیا تھا اُسے ؟"

"دو چار دن بیمار رہا اور پھر چل بسا۔"

"ٹھیک علاج نہیں ہوا ہوگا۔"

"سرکاری دواخانہ تو یہاں سے بہت دور ہے، وہاں تو لے جانا بہت مشکل تھا۔ کاسود گاؤں کا حکیم ہی اُس کا علاج کرتا رہا۔ لیکن چندر بچ نہ سکا۔"

"ٹھیک ڈھنگ سے علاج ہوتا تو شاید وہ بچ جاتا۔"

"اُس کی پتنی کیرتی نے تو جلتی چتا میں کودنا چاہا تھا۔ اتنا دکھ ہوا تھا بے چاری کو۔"

"تو چندر میرے واپس آنے سے پہلے ہی گاؤں چھوڑ گیا، میرا انتظار نہ کر سکا ظالم۔"

"تمہیں بہت یاد کیا کرتا تھا۔ مرنے سے پہلے اُس نے کئی بار تمہیں پوچھا۔ لیکن تم جانے کہاں تھے۔"

"کیرتی اپنے مائکے نہیں گئی ؟"

"نہیں۔ وہ سمر تور کو چھوڑ کر کہیں بھی جانا نہ چاہتی تھی۔"

"کیا کرتی رہتی ہے دن بھر ؟"

"عورتوں کو پڑھاتی لکھاتی، سیتی ہے۔ بڑی سگھڑ ہے۔"

"چندر کا پتا کیا کرتا ہے آج کل ؟"

"وہ گاؤں کا سرپنچ ہے۔ کیرتی اُس کا بھی ہاتھ بٹاتی ہے۔"

"تم جاتی ہو کبھی اُن کے گھر ؟"

"میں تو بہت کم جاتی ہوں کسی کے گھر۔ البتہ کیرتی دوسرے تیسرے دن ضرور آ جاتی ہے میرا حال پوچھنے۔"

"لیکن چندر نے بڑی زیادتی کی ہے، اُسے کبھی معاف نہیں کروں گا۔"

"تو تو ویسے کا ویسا ہی رہا۔"

"بدل جاتا تو میری ماں مجھے کیسے پہچانتی۔" شیتل نے جواب دیا اور ماں کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔

(باقی صفحہ ۸۷ پر دیکھئے)

نقد و نظر

(ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

فاصلے

از ——— مدہوش بلگرامی

مدہوش بلگرامی نئی نسل کے باشعور اور پڑھے لکھے شاعر ہیں۔ ان کے اس مختصر مجموعۂ کلام میں نظمیں، غزلیں اور قطعات شامل ہیں۔ مدہوش کا رجحان اور ذہنی پھیلاؤ رومانی ہے، وہ اسی کو انقلاب و اصلاح کی بنیاد بناتے ہیں۔ رومانی انقلاب پسندی کی اردو شاعری میں بہت اچھی اچھی مثالیں موجود ہیں اور اس انداز کے کئی قابلِ ذکر شاعر ہوئے ہیں۔ مدہوش بلگرامی اُن سے کافی پیچھے نظر آتے ہیں۔ کلام کے مطالعہ سے اُن کے یہاں فنکارانہ خلوص اور جذبہ و حرارت کا تو پتہ چلتا ہے۔ لیکن وہ فکری توازن اور گہرائی نہیں ہے جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کرلے۔ البتہ بقول زاہدہ زیدی :

"اگر اُن کی شاعری جذباتیت اور تکرار کے گرداب میں نہ پھنس گئی تو اس میں ترقی کے بہت امکانات ہیں۔"

نظموں میں "انقلاب" اور "تنہائی" اپنے اختصار، سادگی اور تکنک کے اعتبار سے تمام نظموں میں اچھی ہیں۔ مدہوش بلگرامی کو نظمیہ شاعری ہی کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہیئے۔ اُن کی غزلیہ شاعری متاثر نہیں کرتی ہے۔ رومانی غزل ہو یا مسائلی یا عصری، یہ انتہائی بلندیوں تک پہنچ چکی ہے۔ جب تک کوئی غزل گو وہاں تک نہ پہنچے، غزلیہ شاعری کی داد حاصل نہیں کرسکتا۔ نظمیہ شاعری میں ہمیشہ گنجائش رہی ہے اور آج بھی ہے۔ چونکہ مدہوش فلمی دُنیا سے متعلق ہیں، اس لئے اُن کی شاعری پر اُن کے ماحول اور تقاضوں کے واضح اثرات ہیں۔ ان سے بچنے کی ضرورت ہے۔

"فاصلے" کی نظموں اور غزلوں میں علمی و فنی کمزوریاں بھی جابجا نظر آئیں۔ اس کے علاوہ کتابت کی کافی اغلاط رہ گئی ہیں۔ یہ کمزوریاں اور غلطیاں بھرپور توجہ چاہتی ہیں۔

حجم ۱۲۸ صفحات۔ قیمت دو روپے پچاس پیسے۔ ملنے کا پتہ بیگم ہوشیار جنگ نمبر ۲۰ نیپئن روڈ۔ تاڑدیو۔ بمبئی ۳۴

دُنیا کہیں جسے

از ——— ڈاکٹر عشرت انور

ڈاکٹر عشرت انور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبۂ فلسفہ کے ریڈر ہیں۔ "ڈسٹ کور" کے حاشیے پر اُن کی انگریزی، فارسی، اردو اور ہندی زبانوں میں کئی علمی کتابوں کے نام ہیں۔ اُن کے بلند علمی پس منظر کا اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

"دُنیا کہیں جسے" ڈاکٹر عشرت انور کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس میں نعت و منقبت اور چند سیاسی شخصیتوں پر بھی نظمیں ہیں۔ جو صاحبِ مجموعہ کی وسیع المشربی کا ثبوت ہیں۔ "دُنیا کہیں جسے" کی شاعری کس نوع کی ہے، اس کی نشاندہی ایک مشکل کام ہے۔ حالانکہ اپنے ۳۶ صفحات کے طویل دیباچہ میں ڈاکٹر عشرت انور نے اپنے اور اپنی شاعری کے متعلق بہت کچھ کہا ہے۔ وہ بایں الفاظ اپنے قاری کی رہنمائی کرتے ہیں۔

"..... اس کے باوجود بھی شخصیت کے بعض گوشے اور جذبات اور فکر کی بعض سطحیں دل اور دماغ پر دستک دیتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں کہ یہ خارج از بیان رہ گئی ہیں یا لفظ و بیان پورے طور پر متحمل نہیں ہوسکے ہیں..... مجھے عالمِ کیف میں لفظ و بیان کے سارے امکانات عاجز نظر آتے ہیں اور پھر تو کیفیت تو شاید آج تک کسی شعر یا پوری غزل یا نظم میں بھی ادا نہیں ہو پائی ہے۔ کیفیات یا افکار کے چند مخصوص گوشے ہی لفظ و بیان میں شعر کی حیثیت سے ٹوٹے پھوٹے طور پر ادا ہو سکے ہیں۔"

ڈاکٹر عشرت انور کی اپنی اسی سچائی کی روشنی میں تبصرہ نگار کو بھی اس نمایاں خصوصیت کا احساس ہوا کہ وہ ایک ہی لفظ کو بار بار دُہرانے اور اُس سے مختلف مفاہیم پیدا کرنے کے بعد بھی مطمئن نہیں ہوتے۔ مثلاً یہ تین شعر پیش ہیں ؎

عالمی انداز سے ڈالی ہے عالم پر نظر
اپنا اندازِ نظر فرسودۂ عالم نہیں
دردِ عالم سے دروں ہو نہ جائے زندگی
دردِ عالم ہے بقدرِ ہمتِ عالم نہیں

دردِ عالم سے ہے انورؔ دل میں اک عالم بپا
آپ دیتا ہے شعور و فن پہ شورشِ عالم نہیں

ایک بار عالمی اور آٹھ بار عالم لانے کے باوجود بھی شاعر اپنے جذبات و خیالات کے گوشوں کو واضح نہ کر سکا۔ شاعر نے خود بھی عالم کیف کی شاعری کو لفظ و بیان کے سارے امکانات سے عاری بنایا ہے۔ ایک مختصر نظم "زوسیو" (ایک کتا) میں لفظ انسان کی تکرار کے ساتھ فلسفی شاعر کے یہ فلسفیانہ خیالات ملاحظہ کیجئے ؎

محبّت میں ہے تو انساں سے آگے
بظاہر اگرچہ تو انساں نہیں ہے
ابھی تک لائقِ ذوقِ محبّت،
دلِ گم گشتۂ انساں نہیں ہے
وفا نا آشنا دنیا میں انساں
ابھی تک خوگرِ انساں نہیں ہے
ہے کتّا آج بھی ہم رشکِ انساں
ہے انساں آج بھی کتّے سے بدتر

ڈاکٹر انورؔ تعقیدِ لفظی کو بھی بطورِ خاص اپنے اشعار میں جگہ دیتے ہیں۔ "دردِ عالم ہے بقدرِ ہمّت عالم نہیں"۔ آپ اوپر پڑھ چکے ہیں، طوالت کے خوف سے صرف تین شعر اور پیش ہیں ؎

مری آنکھوں پہ روشن ہیں رموزِ ملک و ملّت بھی
نہیں اہلِ ہنر کی دردمندی کی ہے حسرت بھی

نئی تعمیر ہی ممکن نہیں ہے نہیں دنیا کے گر معمار بدلیں

زندگی کے کچھ تقاضے ہیں کہ جو گویا ہوئے
آجکل جو کچھ بھی ہے آتا نظر یکسر نیا

ڈاکٹر عشرت انورؔ کے رنگِ کلام کو سمجھنے کے لئے چند اشعار اور ؎

ستم کشتوں کے غم میں شاعروں کو غزل لکھنی ہے خونِ کشتگاں سے

بظاہر اگرچہ نظامِ زندگی برہم نہیں زندگی میں ایک لمحہ بھی ایک سا عالم نہیں

زمین و آسماں محوِ تحیّر ہیں کہ اب کیا ہونے والا ہے
زمیں پر آدمی ذوقِ درائے آسماں سے ہے،

بہت سے شعروں میں کتابت کی اغلاط کو نظر انداز کر دینے کے باوجود، خاصی تعداد میں ایسے مصرعے بھی موجود ہیں ؎

صفحہ ۱۲۲۔ آج دن شبِ مثال ہوتا ہے
صفحہ ۶۴۔ مرے ہی دم سے گل کو نورِ صبح ہے۔
" ۶۷۔ کشمیر کے وہ کیف میں ڈوبے ہوئے منظر
خیالوں میں چلے آتے ہیں بہتے ہوئے اکثر

"دنیا کہیں جسے" میں بکثرت جو شعری اسقام ملتے ہیں، انہیں غالباً ڈاکٹر عشرت انورؔ جائز سمجھتے ہیں، یا علی گڑھ کے معتبر ادبی و شعری حلقے نے جس میں پروفیسر آل احمد سرورؔ، ڈاکٹر معین احسن جذبیؔ، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی اور شہاب رحمٰن وغیرہ ہیں، جن سے شاعر نے اپنی قربتوں کا اظہار کیا ہے، شاعر کو اپنے دوستانہ مشوروں سے محروم رکھا۔ جو کچھ بھی ہو یہ شعری مجموعہ بہت دلچسپ ہے۔ مجموعہ کے آخر میں ورڈزورتھ کی دو نظموں "کوئل" اور "یادِ طفلی" کے منظوم تراجم ہیں۔ ابتدا میں دیباچہ کے ساتھ پرانے چھپے ہوئے دیباچے کے ۱۶ صفحات دوبارہ لگے ہیں۔ ۲۶۰ صفحات۔ قیمت پانچ روپے۔ ملنے کا پتہ۔ انٹرنیشنل لٹریچر سوسائٹی۔ ۴۔ حالی روڈ، مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ۔

۱۔ فضل الرحمٰن اسلامیہ کالج میگزین۔ بریلی۔
۲۔ سیفیہ کالج، اردو میگزین۔ بھوپال۔

غالب نمبر

"غالب صدی" کے سلسلے میں مندرجہ بالا دو کالجوں نے خاص اہتمام سے "غالب نمبر" شائع کئے ہیں، جو دوسری یونیورسٹیوں اور کالجوں کے میگزینوں میں امتیازی درجہ رکھتے ہیں۔

(۱) فضل الرحمٰن اسلامیہ کالج بریلی کے غالب نمبر کا اردو حصّہ ۲۳۴ صفحات کا ہے اور ۵۰ صفحات ہندی کے ہیں، جبکہ سیفیہ کالج کے غالب نمبر میں ہندی کا حصّہ نہیں ہے۔ اسلامیہ کالج بریلی نے ہندی داں طلبہ کے لئے غالب کو سمجھنے کا موقع دیا۔ ہندی کے صفحات اگر اور زیادہ ہو گئے تو اچھا تھا۔ حصّۂ نثر میں، ۳۳ مضامین ہیں۔ کالج کے اساتذہ اور طلبہ کے علاوہ مولانا عرشی، ضیا احمد بدایونی، خواجہ احمد فاروقی۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدّیقی۔ وجاہت علی سندیلوی۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی جیسے مشاہیر اہلِ قلم بھی اس میں شامل ہیں۔ ۲۷ منظومات ہیں، جن میں غالب کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ ابتدائی ۱۲ صفحے دو رنگ میں آفسٹ پر چھاپے گئے ہیں۔ بقیہ تصویریں ہیں، جو باقی صفحہ ۸۲ پر

مکتوبات

جون ۷۰ء کے "شاعر" کی اشاعت کے بعد بڑی تعداد میں قارئین کے خطوط آئے۔ بہت سے خطوط شائع نہ ہو سکے۔ اِس شمارہ میں اُن میں سے چند اہم خطوط پیش کئے جا رہے ہیں۔ قلمکاروں سے درخواست ہے کہ وہ زیادہ طویل خطوط نہ لکھا کریں۔ ہر سلسلے میں اہم نکات ہی پر اظہارِ خیال کیا جائے اور مقصدیت و افادہ کو پیشِ نظر رکھا جائے

(ادارہ)

شمارۂ جون ۷۰ء سے متعلق

● جون کا شمارہ مِلا۔ مگر اُردو کے دوستوں کی مہربانی سے جو کیچڑ اُچھالی جا رہی ہے اُس کے علم سے بے حد افسوس ہوا۔ پروفیسر نریش جیسے اُردو کے پُجاریوں سے اُمید بڑھانے سے بہتر ہے کہ اُردو کی کوئی حمایت ہی نہ کرے، اور حالات سے ہم سمجھوتہ کرکے بیٹھ جائیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا جو نریش صاحب اپنا اُردو مضمون "بھارتیہ کرن"۔ شاعر کے بجائے ہندی رسالے "ہندوستان" میں شائع کرواتے اور "ردِّ عمل" کو اُردو میں لکھ کر "شاعر" کو بھیج دیتے' جو سبق وہ اہلِ اُردو کو پڑھاتے ہیں وہ ہندی والوں کے لائق ہے اور اگر وہ اُن کی آنکھوں پر پڑے پردے ہٹا سکیں تو ہم مانیں کہ یہ اُردو کے سچے "خادم" کار رہیں۔

"اُردو کو "مسلمان" سے مترادف (EQUATE) کرنے سے تو وہ نفرت اور تنگ نظری کی آگ کو اور بھڑکا رہے ہیں۔ اور بلا وجہ، بلا ثبوت اُردو کے ادیبوں پر الزام لگا رہے ہیں۔ سوال ہندو اور مسلمان کا نہیں ہے، ہندو یا مُسلم تہواروں، طور طریقوں کا نہیں ہے۔ سوال ہے صرف سیاسی فرقہ پرستی (DIRTY POLITICS) کا۔ کسی بھی زبان میں جو بھی لکھا جاتا ہے مُصنّف یا شاعر کی اپنی مرضی اور موڈ (MOOD) کی بنا پر لکھا جاتا ہے اور اُس زبان تک سمجھنے والوں کے لئے لکھا جاتا ہے، نہ کہ دوسری کسی زبان کے پڑھنے والوں کے لئے، جو مُصنّف کی زبان پڑھنا تو درکنار سمجھ بھی نہیں سکتے، جو الفاظ اُردو میں استعمال ہوتے ہیں وہ بے شک فارسی اور عربی سے آئے ہیں، لیکن اُس کا یہ مطلب نہیں کہ چند انگریزی، مراٹھی، گجراتی کے الفاظ اُردو میں استعمال ہی نہیں ہوتے الفاظ کا خزانہ (VOCABULARY) تو ہر زبان اپنی جنس (GENUS OF THE LANGUAGE) کے مطابق اختیار کرتی ہے۔ ہم اُردو کو زبردستی بدلیں تو کس کے لئے؟ کیا اُردو کے کٹر دشمن اُردو سیکھنے اور پڑھنے کی زحمت کریں گے؟ کیا وہ رام اور کرشن کا ذکر اُردو میں پڑھ کر اُردو دوست بن جائیں گے؟ اگر ایسا ہوتا تو آج اُردو اور دوسری زبانوں کی یہ حالت نہ ہوتی، یہی تو اِن زبانوں کی بدقسمتی ہے کہ ہندی کے حمایتی اُردو، تامل، تلگو کنڑا، بنگلہ جیسی زبانوں کے نایاب ذخیروں سے قطعی ناواقف ہیں، ورنہ وہ اِس بیدردی سے اِن زبانوں کو مٹانے پر تُلے نہ ہوتے۔

● ویسے اُردو میں دیوالی، راکھی، ہولی کا ذکر اور ہندو ناموں کے کرداروں کی کوئی کمی نہیں۔ اور وہ بھی مُسلم مصنّفین کی لکھی کہانیوں میں، ہندوستانی وطن پرستی کے گیت بھی اُردو ہی میں پیدا ہوئے ہیں۔ گنگا، جمنا، گومتی، نربدا، پر اُردو میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ علامہ اقبال، سیماب، کرشن چندر، شکیل، ساحر، ٹھاکر پونچھی۔ خواجہ احمد عباس اور اُردو کے ان گنت ادیبوں نے ہندو مُسلم یکجہتی اور بنیادی ہمدردی کے کتنے ہی ثبوت پیش کئے ہیں۔ یہ ہندی پڑھنے والوں کو کیسے معلوم ہوگا۔ اگر نریش صاحب انگریزوں کی لگائی ہوئی اُس آگ کو ہوا دیں گے جس کو بجھانے میں سیکڑوں عوام اپنی جانیں دے چکے ہیں؟

۷۰ - ۱۹۶۹ء میں حکومت نے ہر روز ۴۰،۳۴ روپے ہندی کو "ہر دلعزیز" بنانے میں صرف کئے اور منسٹری آف ایجوکیشن کے ۱۴ لاکھ کے بجٹ میں سے ۳۷،۸۸،۱۳ روپے ہندی کا حوصلہ بڑھانے کے لئے ۱۲۴ اِداروں کو دیئے گئے جن میں سے ایک اُس کے دکشن بھارت ہندی پرچار سبھا کا حق سب میں زیادہ ثابت ہوا۔

اگر ہندی ہندوستان کے عوام کی زبان ہے تو ہم پوچھ سکتے ہیں کہ اِس کو ذکشن بھارت میں زبردستی کیوں عوام کے گلے اُتارا جا رہا ہے؟ آل انڈیا ریڈیو کی ہندی خبریں کتنے فی صدی ہندوستانیوں کے پلے پڑتی ہیں؟ اور اس تلخ دوا کی قیمت اتنی بڑھی ہوئی کیوں ہے؟ کیا منسٹری آف ایجوکیشن اینڈ یوتھ سروسز اِس بجٹ میں سے کچھ حصّہ دوسری زبانوں کی مدد میں نہیں صَرف کر سکتی، جو ہندوستانیوں کیلئے مادری زبان ہونے کے تحت جان سے بھی پیاری ہیں، جو ساتھ ساتھ خوبصورت بھی ہیں اور لاجواب بھی۔

"Language is a temple in which the soul of those who speak it is enshrined." ——— O.W. HOLMES

(ہر انسان کے لئے اُس کی اپنی زبان ایک ایسا مندر ہے جس میں وہ اپنی رُوح کو محرم رکھتا ہے۔)

میرا یہ عقیدہ ہے کہ بغیر اجازتِ عوام، کوئی حکومت اِس مسئلہ کو چکنا چور کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ اگر اہلِ زبان مل کر اُس کی حفاظت پر تُل جائیں یا اپنے بچّوں میں اُس کے لئے پیار پیدا کریں تو یہ وقتی آفت بھی ٹل سکتی ہے اور آنے والی نسلوں کا حق برقرار رکھا جا سکتا ہے۔

۱۱/۲/۱۴/۱۵/۱۱- ریڈ ہلز۔ حیدرآباد۔ مِس پروینِ زویکاجی

● اِدھر کچھ عرصہ سے ہندی اور اُردو کی جو بحث چل پڑی ہے وہ نہایت مایوس کن ہونے کے علاوہ دونوں زبانوں کے ادب کے لئے مضر بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ اختلافِ رائے جرم تو نہیں، بشرطیکہ وہ خلوص پر مبنی ہو۔ لیکن تعجب ہے کہ وہ لوگ جو عمر بھر اُردو ہی کی کمائی کھاتے رہے ہیں، اُردو کو اپنے خیالات کا ذریعۂ اظہار بنا کر دُنیائے ادب میں چمکے، وہی لوگ اب شُدّی کی آڑ میں شکار کھیلنے نکل گئے ہیں اور بظاہر اُردو کے حامی بن کر اُردو اور ہندی کے رسالوں میں اپنی گمراہ کن تحریروں سے اُردو کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کسی ادیب کا بِک جانا کوئی نئی بات نہیں۔ دوسرے مُلکوں میں بھی ایسا دیکھنے میں آیا ہے اور ظاہر ہے کہ اُردو کے اِن ادیبوں کو بھی ہندی والوں نے خرید لیا ہے۔ جیسے تھوڑے سے لالچ پر ایک سیاسی رہنما اپنی پارٹی کو لات مار کر مخالف پارٹی میں شامل ہو جاتا ہے تو اُردو کے غریب شاعروں اور افسانہ نویسوں کا کیا ماتم کیا جائے، منافقت تو ہمارے قومی کردار کا ایک جزوِ لاینفک بن چکی ہے!۔

گورنمنٹ کالج۔ رُوہتک۔ (ہریانہ) (پروفیسر) امیر چند بہار

● "اُردو ادیب، شُعراء اور صحافی کہاں ہیں؟" کے عنوان سے آپ نے جو کچھ بھی اپنے اداریہ میں لکھا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے دِل میں چار جانب پھیلی ہوئی بھیانک فرقہ پرستی کے خلاف ایک زبردست احساس جنم لے چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے اِنسداد کے لئے آپ اُردو ادیبوں، شاعروں، صحافیوں پر مشتمل اُن کے اپنے اپنے علاقے میں ایک کونسل قائم کرنے کی تحریک چلانا چاہتے ہیں۔ اِس سلسلے میں (آپ کے قول کے مطابق) آپ نے ڈیڑھ سو ذمّہ دار ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کی توجّہ مبذول کرانے کی کوشش کی۔ لیکن اُنہوں نے کوئی توجّہ نہیں دی۔ شاید ڈیڑھ سو ادیبوں کی فہرست میں بڑے بڑے نام ہی ہوں گے۔ ظاہر ہے اُن کا مقصد پُورا ہو چکا ہے، اُن کی شخصیت کی تشکیل ہو چکی ہے، وہ اِن چھوٹی چھوٹی باتوں میں کیوں اُلجھیں؟ چاہے مُلک ٹکڑوں میں بٹ جائے، چاہے بے شمار عورتوں کے سُہاگ کو آگ لگ جائے، چاہے بچّوں کی مُسکراہٹوں کا قتل ہو، چاہے گلیوں اور سڑکوں پر "فاشزم" کا ننگا ناچ ہو، یہ تو بجلی کے کھمبوں کی طرح چُپ چاپ تماشائی بنے رہیں گے۔ آپ اگر چاہتے ہیں کہ شر پسند سیاہ طاقتوں کے خلاف آپ کی چلائی تحریک کامیاب ہو تو آپ نئی نسل کے باشعور اور ذمّہ دار ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کو آواز دیں، اُن میں حوصلہ ہے، وہ اپنا قیمتی وقت بھی برباد کر سکتے ہیں۔

فرقہ پرستی کا زہر اب زندگی کے ہر شعبے میں سرایت کر چکا ہے ورنہ چنڈی گڑھ کے پروفیسر قریشی یہ نہ کہتے کہ اُردو زبان و ادب پر ایران اور عرب کی گرفت زیادہ مضبوط ہے اور اُردو میں اُنہیں صرف ایک نام نظیر اکبر آبادی کا ملا۔ میر، غالب، اقبال، چکبست، سیماب، جوش، فراق، محروم، جمیل، سردار، پرویز اور ساحر کے علاوہ سیکڑوں پُرانے اور نئے شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات میں اُنہیں ہندوستان کی مٹّی کی سوندھی مہک نہیں ملی، اب اُنہیں کون سمجھائے کہ یہ اُردو زبان کی وُسعت ہی ہے کہ اُس کے ادب میں جہاں دجلہ اور فرات کا منظر نظر آتا ہے وہاں جمنا، والگا، میسی سپی۔ یانگسی، اراودی،

اور تیل وغیرہ کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ رہی گنگا اور جمنا کی بات تو اُس سے رشتہ گوشت اور ناخن کا ہے۔ چنانچہ اِس سلسلے میں پروفیسر فرتیش جیسے لوگوں کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ اُن کے دل میں جتنی محبت اپنے وطن سے ہے (شاید ہو) اُس سے کہیں زیادہ اُردو کے ادیب اپنے وطن سے محبت کرتے ہیں۔ اور اس محبت میں کسی قسم کی کوئی بناوٹ نہیں ہے اور اس پر اُردو والوں کو فخر ہے۔ فرتیش جی نے ایک بات بڑی مضحکہ خیز کہی ہے کہ بسمبر رام نے جوش تخلص رکھنا پسند کیا ہے۔ لیکن کوئی ابراہیم علی دنیش تخلص رکھنا کیوں پسند نہیں کرتا۔ کاش! کوئی اُن سے کہتا کہ حضور! آپ پروفیسری چھوڑ کر کوئی اور کام کیجئے۔ اِتنی بات بھی آپ کی سمجھ میں نہیں آئی کہ چاہے ہندو ہو یا مسلمان، جو شاعر جس زبان کا ہوگا اُس سے متعلق تخلص کا استعمال کرنا پسند کرے گا۔

میں بنگال میں رہتا ہوں، بنگال جو ہڑتالوں، جلوسوں اور نعروں کا صوبہ ہے، مجھے اِس میں کوئی بھی بنگلہ زبان بولنے والا اُردو کا دشمن نہیں ملا۔ معلوم نہیں اِس میں کیا راز ہے کہ اُردو کے دشمن صرف ہندی کے اندھے پریمی ہی نظر آتے ہیں۔ لیکن میں اُردو زبان کے شیدائیوں سے صرف اِتنا کہوں گا کہ اُنہیں اپنی زبان سے پیار ہے تو اُسے زندہ رکھنے کے اسباب پر غور کریں اور اِس کیلئے اپنا خونِ جگر بھی صرف کرنے سے گریز نہ کریں۔ اُردو زبان صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے، جو ایسا سمجھتا ہے وہ سب سے بڑا فرقہ پرست اور مُلک کی یک جہتی کا دشمن ہے۔ اِس زبان کی نگہداشت اور حفاظت کی ذمّہ داری اُن لوگوں پر بھی عائد ہوتی ہے جو ملک کی سالمیّت کے لئے قومی یک جہتی کا نعرہ لگاتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اُردو بولنے والوں کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ اِس زبان سے متعلق چاہے ادبی سطح پر ہو یا عوامی سطح پر، ہر طرح کی غلط فہمی کو دُور کرنے کی کوشش کریں اور ایسا ماحول پیدا کریں کہ ملک کی دیگر زبانوں کے بولنے والے اِنصاف پسند لوگوں کی اِسے حمایت حاصل ہو، اور بس...!

جواہر لال نہرو روڈ۔ رانی گنج۔ (مغربی بنگال) رونق نعیم

شمارہ جولائی ۷۸ء سے متعلق

● ممنون ہوں کہ آپ نے بڑی محبت سے مجھے یاد کیا ہے۔ کرم نامہ باصرہ نواز ہوا۔ "شاعر" میں مطبوعہ اپنے دونوں مضامین سے متعلق اب صرف اِتنا اور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں نہ تو یہ چاہتا ہوں کہ اُردو ہندی ہو کر رہ جائے یعنی اپنی انفرادیت کھو دے اور نہ یہ کہ اُردو اپنی اُن تمام بنیادی خصوصیات کو خیرباد کہہ دے جو اُس نے ایران یا عرب کی تہذیب سے حاصل کی ہیں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ چونکہ اُردو ہندوستان میں مُلک گیر زبان کا درجہ رکھتی ہے اِس لئے باقی زبانوں کی نسبت اِس زبان میں ہندوستانیت کے عناصر زیادہ نمایاں ہونے چاہئیں۔ اُردو کے بھارتیہ کرن سے میری یہی مُراد ہے۔ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ جن سنگھ والوں نے جو نعرہ بھارتیہ کرن کا بلند کیا ہے وہ سیاسی نعرہ ہے، اِس کا تعلق مسلمانوں کی مذہبی زندگی سے ہے۔ میں مذہب کو ہر انسان کا ذاتی معاملہ مانتا ہوں، میرے دونوں مضامین کا تعلق اُردو زبان و ادب سے ہے مذہب سے نہیں۔

اُردو ہی کی طرح میں ہندی اور مُلک کی دوسری زبانوں کا بھارتیہ کرن بھی چاہتا ہوں تاکہ اِن زبانوں کے شعراء و اُدباء انگریزی ادب کی تقلید میں اپنی پست ذہنیت کا مظاہرہ کرنے سے باز آئیں۔ ہندوستانی سماج کا "بھارتیہ کرن" بھی ہونا چاہئے۔ جو شخص ہندوستان میں رہ کر ہندوستان کا پرستار نہیں ہے وہ غدّار ہے، اُس کا یا تو بھارتیہ کرن کیا جائے یا اُسے مُلک بدر کر دیا جائے۔

رہا سوال میرے کتاب لکھنے کا۔ تو وہ تو میں آپ کے کہنے سے پہلے ہی لکھ رہا ہوں۔ میں یہ ثابت کرسکتا ہوں کہ اُردو میں وطنیت اور ہندوستانیت موجود ہے۔ مگر اِس حد تک نہیں کہ میں اُس پر فخر کرسکوں۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ہم اُردو اور موجودہ نسل کے درمیان پیدا ہوئے فاصلے کو کم کریں تاکہ ہندوستانیوں کے لئے یہ زبان اجنبی نہ رہے۔

میں نے اتفاق سے ہندی اور اُردو دونوں زبانوں میں نہ صرف فرسٹ کلاس میں بلکہ یونیورسٹی میں اوّل رہ کر ایم اے پاس کیا ہے، اُردو اور ہندی میں ہی پی ایچ ڈی کی ہے۔ ڈاکٹر سنگر نے اِن دونوں زبانوں کو اتنے قریب سے غالباً نہیں دیکھا ہے۔ تحقیق کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرے محققین کے اسمائے گرامی آپ نے تحریر نہیں فرمائے۔ مجھے تو خوشی ہوگی اگر کوئی صاحب (اگر وہ واقعی مجھ سے زیادہ پڑھے لکھے اور زیادہ تحقیق کر چکے ہیں۔) میری رہنمائی کریں ———— ہاں آپ سے بہت کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے۔

آپ کو معلوم ہوگا ہے کہ میرے دل میں آپ کیلئے کتنی عزت ہے۔

پنجاب یونیورسٹی کالج۔ چنڈی گڑھ — (پروفیسر) ترلیش۔ ایم اے پی ایچ ڈی

● تازہ شاعر ملا۔ آپ نے پروفیسر ترلیش کو اچھا جواب دیا ہے۔ آپ کے تفصیلی خط سے اُن کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں۔ اگر وہ کور چشم نہیں ہیں تو انہیں آپ کے خط کی روشنی میں وہ سب کچھ نظر آجائیگا جس سے وہ دانستہ یا نادانستہ طور پر محروم تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ اُردو کے خلاف ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال ہو رہے ہیں۔ اِس میں پروفیسر ترلیش بھی حصہ لے رہے ہیں۔

آج جن سنگھ کے جال میں اچھے اچھے اور پڑھے لکھے لوگ بھی بُری طرح پھنس گئے ہیں۔ آپ کے دس جون ۷۰ء کے خط کے جواب میں ترلیش صاحب اپنے ۲۲ جون کے خط میں کیسی سیدھی زبان میں آپ سے مخاطب ہیں۔ مگر ۲۵ جون کے جواب میں وہ کیسا پینترہ بدل کر آپ سے بات کر رہے ہیں؟ یہ بھی لکھ رہے ہیں کہ میرے مضمون پر ہندو دوستوں نے مبارکباد بھیجی اور مسلمان دوستوں نے ناراضگی کا اظہار کیا۔ بے شک جن سنگھی ذہنیت کے لوگوں نے انہیں ضرور مبارکباد دی ہوگی۔ مگر سُریندر ناتھ ورما (جن کا خط تازہ شاعر میں چھپا ہے) ایسے مخلص ادیب لاکھ لوگوں کے لئے اُن کا کیا خیال ہے؟ اُن کی شُدھی کی جائے یا بھارتیہ کرن؟ اور پھر اُردو کے بہی خواہوں میں چند نام تو پہاڑ کی طرح بلند اور وزنی ہیں، جیسے فراق گورکھپوری۔ راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، آنند نرائن مُلّا۔ مہندر ناتھ۔ جگن ناتھ آزاد۔ کنول پرشاد کنول، کشمیری لال ذاکر، کنہیا لال کپور، عرش ملسیانی، نوشتر گرامی۔ گوپال متل۔ کرشن موہن۔ پرکاش پنڈت۔ راج نرائن راز۔ بالی۔ سُریندر پرکاش۔ رشی پٹیالوی بلراج کومل۔ کمار پاشی اور سیکڑوں دوسرے۔ ان سب پہاڑوں کو کاٹنے کے لئے بھی ترلیش صاحب کو کوئی ٹھوس پروگرام بنانا پڑے گا۔ ورنہ اُن کے خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکیں گے۔

حرمت الاکرام کی نظم "جواب نہ دو"، ندا فاضلی کا "نیا سفر" غلام ربانی تاباں اور محسن زیدی کی غزلیں پسند آئیں۔ تاجدار احتشام کو اُن کے افسانے پر میری طرف سے مبارکباد۔

یاقوت پورہ۔ بڑودہ ۶ — خلش بڑودوی

● شاعر کا جولائی کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ آپ کی جرأت اور حوصلہ مندی کی جس قدر داد دی جائے کم ہے۔ قول و عمل کا غازی اعجاز صدیقی زندہ باد!!

یہ اچھا کیا کہ آپ نے پروفیسر ترلیش کی باز پرس کی اور باہمی مراسلت کو "شاعر" میں شائع بھی کر دیا۔ اب یہ حقیقت واضح طور پر منکشف ہوگئی ہے کہ اُردو کے نام لیوا ہی اُردو کے دشمن ثابت ہوئے ہیں۔ "اُردو کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے" کا ڈھونگ رچانے والے آستینوں میں خنجر چھپائے پھرتے ہیں۔ آپ نے جامع الفاظ میں پروفیسر ترلیش کی غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے۔ کاش وہ کھلے دماغ سے آپ کی تحریر کو پڑھیں اور غور کریں!

اِس بار سب ہی مضامین نظم و نثر لائق توجہ ہیں۔ خاص طور سے حرمت الاکرام کی نظم پسند آئی۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر صاحب کا مضمون "نسخۂ بھوپال بخط غالب" اِس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں تحقیق کے نئے باب کھلتے ہیں اور واقعیت اور اصلیت کا پتہ چلتا ہے۔ "غالب صدی کے موقع پر غالب پر جو کچھ کام ہوا ہے اُس کی افادیت سے قطعی انکار کی گنجائش تو نہیں ہے لیکن اِس موقع پر یہ احساس بھی رہا کہ محققین و ماہرین غالب ایک طرف تو جلد بازی سے کام لے رہے ہیں اور دوسری طرف اِن کی تحریروں میں عقیدت کا جذبہ غالب ہے جو در اصل تحقیق و تنقید کی صحت مند روایت کے منافی ہے۔

ڈاکٹر ابو محمد سحر صاحب نے کچھ اِسی قسم کے "غلطیہائے مضامین" پر گرفت کی ہے جو غالب پرستوں کی جلد بازی اور عقیدت مندی کا نتیجہ ہیں ——— "شاعر" کو مبارکباد کہ اُس نے ایسا کار آمد مضمون شائع کر کے "عقیدتمندانِ غالب" کو گمراہی سے بچا لیا۔

ابراہیم پورہ۔ بھوپال — ایم اے نسیم (ایم اے)

● "شاعر" کا مطالعہ برابر کرتا ہوں۔ اِس نازک دور میں جس طرح آپ اُردو زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں وہ قابلِ تحسین ہے۔

اِس طرف "شاعر" اور دوسرے پرچوں میں اُردو کے متعلق جو باتیں شائع ہوئی ہیں انہیں برابر پڑھتا ہوں۔ آپ سے کیا بتاؤں دشمن تو دشمن دوست بھی ساتھ چھوڑنے لگے ہیں۔ یعنی "جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے" والی مثال ہے۔ رضیہ سجاد ظہیر، راہی معصوم رضا اور

رام لعل کے علاوہ حال ہی میں عصمت چغتائی کا مضمون پڑھ کر اور بھی دنگ رہ گیا۔ انہوں نے بھی اردو کے بارے میں لکھا ہے کہ اسے دیوناگری رسم الخط میں قبول کر لینا چاہیے۔

مگر اردو کشی کے اس دور میں کچھ شخصیتیں ایسی آج بھی موجود ہیں جو ڈوبتے کو تنکے کا سہارا دکھائی دیتی ہیں۔ ان میں آپ کی شخصیت سب سے اہم ہے۔ بہار میں شہیل عظیم آبادی کی بھی بڑی قیمتی شخصیت ہے۔ سہیل عظیم آبادی پہلے ہندی ساہتیہ سمیلن کے ایک رکن تھے۔ لیکن جب رانچی میں اردو مسئلہ پر ہندی ساہتیہ سمیلن کے لوگوں نے فرقہ وارانہ فساد کیا تو سہیل عظیم آبادی نے فوراً اس سے ناتہ توڑ لیا اور ہر طرح سے اس کی مخالفت کی۔ حالانکہ ہندی ساہتیہ سمیلن والوں نے انہیں بہت لالچ دیا اور بہت ورغلایا۔ لیکن سہیل عظیم آبادی نے صاف کہہ دیا کہ آج میری جو بھی عزت ہے وہ محض اردو کی بنا پر ہے۔ میں اس کے ساتھ غداری نہیں کر سکتا۔ چنانچہ صرف اس بنا پر سہیل عظیم آبادی کو طرح طرح سے بدنام کیا گیا۔ یہاں تک کہ انہیں پاکستانی جاسوس تک کہا گیا۔ لیکن سہیل عظیم آبادی نے اپنا موقف نہ بدلا۔

اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد کمیونسٹ پارٹی کے ممبر اور شاعر معصوم شرقی انیس نے جو اردو کے سلسلے میں بھوک ہڑتال بھی کر چکے تھے اس پلیٹ فارم سے سہیل عظیم آبادی کے منع کرنے کے باوجود جلیاں والا باغ ڈے کے موقع پر نظم سنائی۔

حالانکہ سہیل عظیم آبادی نے کہا تھا کہ صرف معصوم شرقی ہی کو نہیں بلکہ کمیونسٹ پارٹی کو بھی ہندی ساہتیہ سمیلن کا بائیکاٹ کرنا چاہیے تھا۔ کیونکہ کمیونسٹ پارٹی اردو کی حامی تھی۔ لیکن پارٹی اور پارٹی کے ضمیر فروش ممبروں میں سے کسی کو یہ توفیق نہ ہوئی۔

یہ تو ہے اردو والوں کا حال۔ آج نہ جانے کتنے ہی غدار چھپے ہیں جو ایک ایک کر کے سامنے آتے جا رہے ہیں اور جو اردو کے حامی ہیں خاموش بیٹھے ہیں۔ اردو بے چاری ان کی طرف امید کی آس لگائے بیٹھی ہے۔

احتشام حسین۔ راجندر سنگھ بیدی۔ سہیل عظیم آبادی۔ کرشن چندر۔ ساحر لدھیانوی وغیرہ کو چاہیے کہ جلد سے جلد اپنی تحریر کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کریں ورنہ ان پر بھی شک کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس وقت اپنے ہی دھوکہ دے رہے ہیں۔ اس سے میرا مطلب کسی کو بدنام کرنا نہیں۔ لیکن آج اگر یہ فنکار چپ رہے تو تاریخ انہیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔ میرے خیال میں ہر جگہ اردو کمیٹی بننا ضروری ہے۔

سبزی باغ، پٹنہ ۴ — جمیل الدین

● شاعر جولائی ۷۳ء کے اداریہ میں "پراوت" کا ذکر ہے۔ اس کا تعلق رسوائے زمانہ جماعت "آنند مارگ" سے ہے۔ جب آر ایس ایس کی سیاسی حیثیت واضح نہ ہو پائی تھی تو جن سنگھ کے توسط سے اس کے سیاسی اغراض و مقاصد کی تکمیل ہوتی تھی۔ پھر بھی دونوں کو جس طرح پہلے دو مختلف جماعت کہا جاتا تھا اسی طرح آج بھی۔ لیکن "پراوت" کے ساتھ یہ بات نہیں۔ "آنند مارگ" والوں کا اس نام سے کیا تعلق ہے، اسے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ ۶۹ء کے عام انتخابات میں "آنند مارگ" نے بھی اپنے نمائندے کھڑے کرنے کا منصوبہ بنایا تھا، ایم پی یا ایم ایل اے کے لئے کھڑے ہونے والے "آنند مارگی" امیدوار کے پاس جو انتخابی منشور تھا اس پر سواستک کا ہی انتخابی نشان تھا اور یہ منشور "پراوت" نامی سیاسی جماعت کی طرف سے تیار کیا گیا تھا۔ یہ لوگ عام لوگوں کو کس طرح بے وقوف بناتے ہیں اس کی ایک مثال یہ مل سکتی ہے کہ گزشتہ انتخاب میں انہوں نے خود ہمارے علاقہ سے ایک ایسے سیدھے سادے آدمی کو کھڑا کرنے کا اعلان کیا تھا جسے سیاست سماجیات یا علم و دانش سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہ بیچارہ مفت میں مارا جاتا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ عین موقع پر اسے لوگوں نے اس کی ملازمت سے استعفیٰ دلانے سے روک دیا..... اس کا ذکر میں نے بھی کچھ اس لئے کیا کہ آپ کے اداریئے کے مطابق صرف دلی ہی میں نہیں ہر علاقہ میں اپنے تمام تر برے اثرات کے ساتھ چھاتا جا رہا ہے! ہمارے کو نغیلڈ میں بھی ہر جگہ در و دیوار پر اس کے نعرے لکھے ہوئے نظر آئیں گے۔ اس تنظیم کے خطرات سے ہمیں ہر خاص و عام کو آگاہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ادیبوں اور صحافیوں کی کونسل برائے انسداد فسادات سے گہری دلچسپی رکھنے والوں کو "آنند مارگ" جیسی ملک دشمن جماعت کے بارے میں بھی زیادہ سے زیادہ جانکاری رکھنے کی ضرورت ہے۔

بھرگنڈا۔ (ہزاری باغ) — ظہیر تمنائی

محفل اپنی

اگست ۷۰ء کا تازہ شمارہ

جولائی ۷۰ء کے شمارہ کے صرف ۱۰ دن بعد ہی اگست کا شاعر پیش کیا جا رہا ہے۔ مجلد جلد کئی شمارے شائع کرکے "شاعر" کو وقت پر لے آیا گیا ہے۔ "شاعر" کے زرِ سالانہ اور فی کاپی کی قیمت میں خفیف سے اضافہ کا خیر مقدم کیا گیا ہے۔ صفحات کے مستقل اضافے، مواد کے تنوع، اُس کی ترتیب، معیار اور اندازِ پیش کش نے قارئین کو مسرور اور متاثر کیا ہے۔ کئی مہینے سے بڑے اہم مسائل پر "شاعر" میں بحثیں ہو رہی ہیں۔ یہ تازہ شمارہ بھی اِن تمام خصوصیات کا حامل ہے۔ چونکہ یہ یومِ آزادی کے قریب شائع ہو رہا ہے۔ اِس لئے اِس کے بعض مضامین افسانوں اور اِس کی منظومات میں قومی، وطنی اور سیاسی مسائل کی جھلکیاں ہیں۔

ممتاز قلمکاروں سے

"شاعر" کے پچھلے شمارے میں قلمکاروں سے کچھ گزارشات کی گئی تھیں۔ ہم اُن ممتاز قلمکاروں کے ممنون ہیں جنہوں نے اپنے قلمی تعاون کا یقین دلایا اور "شاعر" میں مستقلاً لکھتے رہنے کا وعدہ فرمایا۔ جو مشاہیرِ اہلِ قلم اب بھی خاموش ہیں، ہم پھر "شاعر" کی طرف اُن کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں۔

اُردو شاعری میں ہندوستانیت

ہم چاہتے ہیں کہ اِس موضوع پر "شاعر" کے ہر شمارے میں ایک مضمون شائع ہو۔ اِس شمارہ میں نازش پرتاب گڑھی کا مضمون شریک ہے۔ اُمید کہ ذمہ دار ادیب اِس اہم مسئلہ کو جاری رکھنے میں تعاون فرمائیں گے۔ "اُردو میں ہندوستانیت" کے موضوع پر بہت مواد موجود ہے، ضرورت اُسے از سرِ نو منظرِ عام پر لانے کی ہے۔ مثالوں کو دُہرایا نہ جائے بلکہ ایک ادیب جو مواد اپنے مضمون میں فراہم کرے، اُس سے مختلف مواد دوسرا ادیب پیش کرے تو ایک بڑا مفید کام ہو سکتا ہے۔

باقیات

بعض ایسے خریداروں کی طرف جو سالہا سال سے "شاعر" کے خریدار ہیں، ایک یا دو سال کا چندہ باقی ہے۔ "شاعر" سے اُن کو دیرینہ تعلق کی بنا پر زرِ سالانہ ختم ہو جانے کے بعد بھی "شاعر" بھیجا جاتا رہا۔ افسوس کہ بار بار توجہ دلانے کے باوجود ایسے خریداروں نے "شاعر" کی باقیات نہیں بھیجی ہیں۔ ایسے تمام خریداروں سے آخری بار فوری توجہ کی درخواست ہے۔

● بقیہ نقد و نظر صفحہ ۷۶ ●

نمبر کی ترتیب بہت اچھی ہے۔ سرورق سہ رنگا اور معنی خیز ہے، اسے ڈاکٹر محمد شکیل احمد صدیقی نے مرتب کیا ہے اور وہ اِتنا اچھا نمبر پیش کرنے کے لئے مبارکباد کے مستحق ہیں۔

قیمت مع محصول ڈاک سات روپے ۵۰ پیسے۔ یہ نمبر پرنسپل فضل الرحمٰن اسلامیہ اِنٹر کالج بریلی (یو پی) سے منگایا جا سکتا ہے۔

(۷) سیفیہ کالج بھوپال نے اپنے مجلّہ سیفیہ کے اب تک جتنے نمبر نکالے ہیں اُن میں یہ غالبؔ نمبر سب سے اچھا اور ضخیم ہے۔ اِس کے ۲۰۴ صفحات ہیں۔ اِس میں غالبؔ سے متعلق چند تصاویر اور تحریریں بھی شامل ہیں۔ کتابت و طباعت بہت اچھی ہے۔ پہلے حصے میں کالج کے اساتذہ و طلبہ کے ساتھ ساتھ پروفیسر محمد مجیب۔ ڈاکٹر گیان چند۔ وجاہت علی سندیلوی۔ ڈاکٹر سید حامد حسین۔ عابد رضا بیدار کے مضامین بھی ہیں۔ غالبؔ کے پانچ غیر مطبوعہ خطوط اِس نمبر میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ جو شاہ غمگین کے نام ہیں۔ خود مجلّہ سیفیہ کے روحِ رواں پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے نسخۂ بھوپال اور نسخۂ بھوپال ثانی پر ایک طویل مضمون لکھا ہے۔

نمبر پر قیمت درج نہیں ہے۔ سیفیہ کالج بھوپال سے یہ غالبؔ نمبر حاصل کیا جا سکتا ہے۔

▲

● بقیہ ناول "دھرتی سدا سہاگن" صفحہ ۶۰ سے آگے ●

رات خاصی بیت گئی تھی۔ ماں کو صبح جلدی اُٹھنا ہوتا تھا اِس لئے وہ جلدی سو جانے کی عادی تھی۔ وہ شیتل کی باتوں کا مختصر سا جواب دیتے ہوئے آخر سو گئی۔ لیکن شیتل بہت دیر تک جاگتا رہا۔ اور جانے کیا کیا سوچتا رہا۔ اُس نے کمرے کے چھوٹے سے روشن دان میں سے نظر آتے ہوئے تاروں کو دیکھا جن کے قریب سے گزر کر چاند بہت آگے نکل گیا تھا۔ ماں گہری نیند سو رہی تھی اور اُس کے ہلکے ہلکے خرّاٹوں کی آواز گونج رہی تھی۔ (باقی آئندہ)

مالک، پرنٹر، پبلشر اعجاز صدیقی نے یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس ۲۳، نوروز جی اسٹریٹ ٹھاکردوار۔ بمبئی ۲ میں چھپوا کر دفتر سے شائع کیا۔

AIR Bombay
THE MOST POPULAR OLDEST LITERARY & CULTURAL URDU JOURNAL
(Telephone No. 359904)
Publishing Dates, 15-16
R. N. No. 14482/57
It takes 100,000 men to make an Escort tractor
Only 5,000 of them are at Escorts
And the rest?
They are part of a thousand odd companies
over India that supply most of the components
tractors (each has about 4,200 individual
that's how many people outside Escorts contribute
operations. And they are mostly small-scale
facturers.
Escorts gives them technical, sometimes even financial,
assistance. They in turn supply high quality components
made to international standards given them by
They become highly skilled specialists—even export
products back to countries that once exported to
This is the kind of interdependence that has
Escorts nearly double its tractor production every
And this year, we celebrate the silver jubilee of this
interdependence.
We believe, this is the substance of real industrial
development
Interdependence
for 25 years,
the Escorts
for growth

جاری شدہ ۱۹۳۰ء
بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم
اردو کا اکتالیس سالہ علمی، ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

شاعر بمبئی

ستمبر ۱۹۷۰ء
جلد (۴۱) شمارہ (۹)

مدیر اعلیٰ
اعجاز صدیقی

ادارۂ تحریر:
مہندرناتھ
ڈاکٹر محمد حسن
شہاب جعفری
ندا فاضلی

اس شمارے میں

زر سالانہ : ۱۰ روپے
معاونین سے : ۲۵ روپے
تاعمر خریداری : ۱۲۵ روپے
ممالک غیر سے : ۲۵ شلنگ

فی پرچہ : ایک روپیہ

[illegible] کا پتہ
ماہنامہ شاعر، قصرالادب، [illegible] بی سی
★
خط و کتابت کا پتہ
ماہنامہ شاعر، مکتبۂ قصرالادب، پوسٹ بکس نمبر ۴۱ ۲۵ ۔ بمبئی ۸ بی سی
★
فون نمبر: ۳۵۹۹۰۴

ترتیب

ستمبر ۷۰ء

شاعر کے چار گراں قدر خاص نمبر

کرشن چندر نمبر

اُردو کے شہرۂ آفاق افسانہ نگار کرشن چندر کی شخصیت اور اُنکے ہمہ گیر فن پر ایک عظیم و حسین خصوصی اشاعت جس میں ہند و پاک کے ممتاز اہلِ قلم کے علاوہ دوسرے ممالک کے بھی کئی مصنفین اور مفکرین نے کرشن چندر کے شاہکار افسانوں، ناولوں اور ڈراموں پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ یہ نمبر کرشن چندر کی ادبی زندگی کی لافانی تاریخ ہے، خود کرشن چندر کے قلم سے اس نمبر میں کئی تازہ کہانیاں اور ایک مکمل نیا ناول شامل ہے۔

اِس عظیم و ضخیم نمبر نے ہند و پاک میں مقبولیت اور پسندیدگی کی نئی روایات قائم کی ہے۔

۲۴۷ صفحات، پانچ رنگ کا نظر فریب سرِورق، اٹھارہ صفحات پر یادگار تصاویر، اعلیٰ کتابت و طباعت قیمت: پندرہ روپے

گاندھی نمبر

ہندوستان کے عظیم رہنما، تحریکِ آزادی کے سب سے بڑے قائد مہاتما گاندھی کی شخصیت، اُن کی زندگی اور سیاسی و سماجی کارناموں کا بھرپور جائزہ۔ اُردو اور دیگر زبانوں کے ممتاز قلمکاروں کے تازہ و خصوصی مضامین۔ مُلک کی آزادی اور تقسیم کے متعلق معتبر یادداشتیں، گاندھی جی کے مضامین کا انتخاب، اُن کے بصیرت افروز مقولے، مُلک کے مشاہیر شعرا کا باپو کو منظوم خراجِ عقیدت۔ کئی ابواب۔ ابواب کے خوبصورت سرِورق۔ گاندھی جی کی چار رنگ کی نایاب تصویر۔

گاندھی صدی پر کسی زبان نے ایسا یادگار نمبر پیش نہیں کیا۔

لاجواب سرِورق: ۲۸۲ صفحات

قیمت: چار روپے

غالب نمبر

غالب صدی کا بیش بہا تحفہ

غالب کی شخصیت، فن اور زندگی پر ہند و پاک کے ممتاز قلمکاروں کے تازہ و فکر انگیز تنقیدی و تحقیقی مضامین، غالب نمبروں کی بھیڑ میں ایک نہایت سنجیدہ، متنوع اور منفرد خصوصی اشاعت جسے ہندوستان اور پاکستان کے تمام غالب نمبروں میں سب سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔ گیارہ ابواب، ابواب کے سرِورق دو رنگ میں، آرٹ کا بہترین نمونہ، چار رنگ کی غالب کی سُنہری تصویر۔ غالب کی مختلف اَدوار کی تمام یادگار تصاویر، غالب کے مشہور شاگردوں کی تصویریں، پُرانی کتابوں، غالب کی تحریریں اور سرِورق کے عکس، ہر صفحہ پر غالب کا اسکیچ، تین رنگ کا نظر فریب سرِورق، رنگین بارڈر کے ساتھ غالب کے اُردو و فارسی کلام کا انتخاب

۶۳۰ صفحات۔ قیمت: آٹھ روپے

افسانہ و ڈرامہ نمبر

اِس نمبر میں شاہکار افسانے اور ڈرامے پیش کیے گئے ہیں اس نمبر کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اِس میں اُردو کے ۱۷ افسانہ نگاروں اور ۵ ڈرامہ نویسوں کے علاوہ ہندوستان کے کئی دوسری بڑی زبانوں کے گیارہ مشہور افسانہ نگاروں کے درجۂ اوّل کے افسانے اُردو میں ترجمہ کرا کے شائع کیے گئے ہیں اور اُن افسانہ نگاروں کا مختصر تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔ غیر مُلکی زبانوں کی دو شاہکار کہانیاں بھی اسمیں شامل ہیں۔ اُردو، ہندی، بنگلہ، مراٹھی، گجراتی، کنڑ، پنجابی وغیرہ زبانوں کے ۲۳، افسانہ اور ڈرامہ نگاروں کی تصاویر بھی شائع کی گئی ہیں۔

یہ نمبر افسانوی ادب میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲۳۴ صفحات ؛ قیمت: تین روپے

مکتبۂ قصرُ الادب

پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ بمبئی ۸ بی سی

شاعر ممبئی

<u>مجمعات</u>

اُردو نئی نسل کو اذنِ بیداری

دنیا کتنی ہی قدیم کیوں نہ ہو۔ آفرینش سے یہی ہوتا آرہا ہے کہ قدامت کی تہوں سے جدتوں کے گل بوٹے پھوٹتے ہیں۔ ایک نظامِ فکر کے بعد دوسرا نظامِ فکر آیا ہے اور ایک نسل کے بعد دوسری نسل نے شعبہ ہائے زندگی کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ تاریخ اس کی شاہد ہے کہ ہر دَور میں نئی نسل نے ایک نئے جوش و ولولے نئی اُمنگ اور نئے حوصلے سے کام لے کر اپنے دَور کی تشکیل و تعمیر میں حصہ لیا ہے۔ اُس نے پُرانی روایتوں سے بغاوت بھی کی ہے اور اُن کا احترام بھی کیا ہے۔ اُس کی سرکشی کے انداز میں بھی ایک خوش آئند انقلاب کی آہٹیں ہوتی ہیں۔ اگر پُرانی نسلیں، نئی نسلوں میں اپنی صالح روایتوں کا رنگ بھر دیں اور اُن کے جذبات و احساسات کو پوری طرح سمجھ لیں تو نہ صرف بہت سی صحت مند قدیم روایتوں کو توانائی اور زندگی مل جاتی ہے بلکہ قوموں اور ملکوں میں تہذیب و ترقی کے نئے اُفق پیدا ہو جاتے ہیں۔ اِس سے کون اِنکار کر سکتا ہے۔ کہ ؎

کہنگیِ منزل کے جب نشاں بدلتے ہیں
راستے بدلتے ہیں، کارواں بدلتے ہیں

ہندوستان جس نئے طرز کے اِنقلاب کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ اُس میں نئی نسلوں کا رول سب سے اہم ہوگا۔ ہم ایک "ہندوستانی قوم" ہوتے ہوئے بھی مختلف فرقوں اور زبانوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ہمارے ملک میں جو صُورتِ حال ہے، اُس میں انقلاب کسی قسم کا بھی کیوں نہ آئے، اِس کے مختلف المذاہب اور مختلف اللسان طبقے اپنی جگہ باقی رہیں گے لیکن ہم آہنگ ہو کر یک جہتی اور یگانگت کے ساتھ ہمیں ہر قسم کی فرقہ پرستی کی دیواروں کو مسمار کرنا ہوگا۔ اِس کے بغیر ملک کی ترقی اور عظمت ممکن نہیں ہے۔

اَلحمدُ لِلّٰہ، اُردو سے وابستہ نئی نسل اپنے علم و فکر و شعور میں کسی بھی ہندوستانی زبان کی نئی نسل سے پیچھے نہیں ہے۔ یہ نئی اُردو نسل لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں ہماری درس گاہوں میں بھی ہے اور اِن سے باہر بھی۔ صنعتی، سائنسی، معاشی، تہذیبی، تمدّنی، علمی ادبی اور لِسانی انقلاب کا یہ پورا پورا اِحساس و ادراک رکھتی ہے۔ جہاں تک شعر و ادب کا تعلق ہے، اِسمیں بھی اُردو نئی نسل کے ایک محدود طبقے نے ممتاز درجہ حاصل کر لیا ہے۔ اُردو شعر و ادب کے ساتھ اِس کی مساعی مخلصانہ اور مدبرانہ ہیں۔ لیکن اُردو زبان کی بقا اور اُس کے ساتھ ہونے والی حق تلفیوں سے اِسے اِتنی دِلچسپی نہیں ہے، جتنی شعر و ادب سے ہے۔

اُردو زبان کے بے شمار مسائل ہیں اور اب جبکہ مخالفینِ اُردو اِس زبان کو ختم کر دینے یا اِسے محدود بنا دینے کے لئے نئے نئے حربے اِستعمال کر رہے ہیں، اُردو کی پُرانی نسل کی تمام کوششیں بے نتیجہ ثابت ہوئی ہیں، یہ پُرانی نسل تھک بھی چکی ہے یا اِس میں سے کچھ نے مصلحتوں سے سمجھوتہ کر لیا ہے تو ایسی سنگین صورتِ حال میں اُردو کی نئی نسل کو اُردو کی پرچم اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہیئے۔ وہ اُردو تحریک کو ایک فیصلہ کُن مرحلے پر لانے میں تنہا نہیں رہے گی۔ پُرانی نسل کے بھی بہت سے مدبر اُردو دانشور ہر قدم پر اُس کا ساتھ دیں گے۔

یہ وقت لفظی اور کاغذی جنگوں کا نہیں ہے، بلکہ ٹھوس عملی اقدامات کا ہے۔ آندھی کی طرح اُٹھنے اور پہاڑوں کی طرح اپنی جگہ جم جانے کا ہے۔

اُردو زبان، اِس کے رسم الخط اور اِس سے وابستہ کئی سو سال کی ترقی یافتہ تہذیب کو اگر ختم کر دیا گیا تو یہ تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہوگا۔ وقت اُردو نئی نسل کو چیخ چیخ کر پکار رہا ہے ؎

اذن ہر تغیر ہے، زندگی پرستوں کی
جن کے قلب مُردہ ہیں وہ کہاں بدلتے ہیں!

اُمید کہ اُردو نئی نسل زندگی اور بیداری کا ثبوت دے گی۔

[signature]

ابوالفیض سحر

سردار جعفری کا اسلوبِ نگارش

"اُردو کے اسالیبِ بیان" میں ڈاکٹر زورنے اُردو نثر کی چار قسمیں گنوائی ہیں (۱) مرجّز۔ (۲) مُقفّٰی۔ (۳) مسجّع۔ (۴) عاری (تسہیل البلاغت۔ از سجّاد مرزا بیگ اور بحرالفصاحت۔ از نجم الغنی رامپوری سے بھی اِس کی سَند لی جا سکتی ہے۔) پھر اِس کے بعد اُن کی ذیلی قسمیں بھی بتائی ہیں۔ جیسے سلیس سادہ، دقیق سادہ، سلیس رنگین اور ساتھ ہی چند اقتباسات دیتے ہوئے اِن کی وضاحت بھی کی ہے۔ اگر زورؔ صاحب زندہ ہوتے اور سردار جعفری کی نثر نگاری کے بعض روشن پہلوؤں پر غور کرتے تو شاید اُنہیں اپنی کتاب پر نظرِ ثانی کرتے ہوئے کچھ اضافوں کے ساتھ دوسرا ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت ہوتی۔ کیوں کہ خلفائے راشدین کی جمہوریت کی طرح جس کو موجودہ، مُروّجہ و مشہور نظام ہائے حکومت میں کسی ایک سے مشابہ بتانے میں دشواری ہے۔ سردار جعفری کی نثر کا تجزیاتی مُطالعہ بھی زورؔ مرحوم کی بتائی ہوئی اقسامِ نثر سے بہ مشکل واضح ہو سکیگا۔ ویسے تو بنیادی طور پر سردار کی نثر ہمارے جدید نثر پاروں کی طرح نثرِ عاری ہی پر مبنی ہے۔ مگر اُن کے اسالیبِ بیان اپنی دیگر خصوصیات کی وضاحت کا مُطالبہ کرتے ہیں۔ یہ اگر کہیں سلیس بھی ہے تو ایسی نہیں کہ اُس کا ادبی معیار مجروح ہوا ہو یا تخیّل اور تخلیق کی شایانِ شان نہ لکھی گئی ہو۔ یہ کہیں دقیق بھی ہے تو غیر واضح اور مبہم ہرگز نہیں، یا ایسی نہیں کہ جس پر مہمل گوئی کا الزام عائد کیا جا سکے۔ سلیس اور دقیق کی طرح اِس میں سادہ اور رنگین طرزِ اظہار کا دلکش امتزاج بھی ہے۔ اِس طرح سردار جعفری کی نثر رنگ رنگ کے جذبات و کیفیّات کی ایک نکھری ستھری مسحور کُن تصویر ہے۔ ایک سردار جعفری ہی پر کیا موقوف ہے۔ موجودہ دَور کے اکثر ذہین اور منجھے ہوئے قلمکار حیرت انگیز طور پر نثر میں اپنا ایک خاص رنگ و آہنگ اور مقام و معیار بنا رہے ہیں اور ان کی تحریروں میں بلّوری رنگ اور چمک کے دلفریب جلوے دکھائی دیتے ہیں۔

"اُردو میں خوبصورت نثر کی ایک مثال محمد حسین آزاد، مہدی الافادی، سجّاد انصاری۔ ابوالکلام آزاد، ناصر علی دہلوی کی تحریریں ہیں۔ لیکن اِن حضرات نے نوک پلک سے درست اِنشاء پردازی اور زبان کے ظاہری رنگ و روپ پر اِس قدر توجہ دی ہے کہ معروضیت اور منطقیت مفقود ہو کر رہ گئی ہے۔ اِس اعتبار سے اِن حضرات کو رُومانی نثر نگار کہنا زیادہ صحیح ہے۔ کسی کی گپ پر وحی کا گمان ہونا، ہو سکتا ہے کہ تحریر کا کوئی خاص وصف ہو۔ لیکن جہاں تک کامیاب نثر کا تعلق ہے اِس میں وحی کو وحی اور گپ کو گپ ہی معلوم ہونا چاہیئے۔"[1]

اِس روشنی میں سردار جعفری کی نثر کو مَعائب سے بالکل پاک کہنا بھی تنقیدی نقطۂ نظر سے ناانصافی کے مترادف ہے۔ مگر

---

[1] فیض ایک نثر نگار۔ سحر انصاری۔ فیض (افکار ۶۵ء)

کسی بھی قیمت پر اُن جیسے ذہین اور با شعور مصنف کی گوناگوں کیفیات رکھنے والی پُر وقار تحریر کی اُن قدروں سے انکار کرنا جن کی وہ حامل ہیں۔ ایک طرح کی تنگ نظری اور کوتاہ بینی ہوگی۔ اِس میں شک نہیں کہ سردار جعفری کی بعض اِبتدائی تحریروں میں پختگی کم اور خام کاری زیادہ ہے۔ جیسا کہ ہر مبتدی کے یہاں فنی اور شعوری ارتقاء کی اِبتدائی منازل میں ہوتا ہے۔ اِس خام کاری کے علاوہ شدید جانبدارانہ رنگ بھی جعفری کی بعض تحریروں میں نمایاں طور پر جھلکتا ہے۔ مثلاً :-

" تم ایک یونیورسٹی میں ادب کے اُستاد ہو اور خود بھی شاعر ہو۔ تمہیں یہ تو معلوم ہوگا کہ شاعر کا لفظ شعور سے بنا ہے اور شعور الہامی چیز نہیں بلکہ علم کی طرح اِکتسابی چیز ہے۔ تمہیں ادب کے اُستاد اور شاعر کی حیثیت سے اپنے موضوع اور فن دونوں پر حاوی ہونا چاہیئے اور اُس تبدیلی کو سمجھنا چاہیئے جو ہماری شاعری میں رُونما ہو رہی ہے۔ یہ زوال نہیں ہے ترقی ہے اِس لئے تم سے ایسے بھونڈے سوال کی اُمید نہ تھی۔" [1]

اور دیکھئے یہاں بھی اُن کی جھلاہٹ کس طرح بے نقاب ہو رہی ہے :-

" تم سے یہ کس مسخرے نے کہدیا ہے کہ ہم نظریات کو نظم کرتے رہتے ہیں۔ یہ گناہ تو ہم سے پہلے وہ اُساتذہ بھی کر گئے ہیں جن کی شاعری ہمارے لئے مشعلِ راہ ہے (راہ نہیں، مشعلِ راہ") ہم نظریات اور عقائد کے پرستار نہیں ہیں۔ ہم تو زندگی اور حقیقت کے جویا ہیں۔" [2]

لیکن جیسے جیسے اُن کی فنکارانہ صلاحیتیں منجھ کر [illegible] گئیں۔ اُن کی فکری تابش اُن کے فن کے دھندلکوں کو بھی روشن کرتی گئی۔ جعفری کی نظر دور رس بھی ہے اور نزدیک بیں بھی۔ وہ ماحول کی دُکھتی رگوں پر ہاتھ رکھتے ہیں اور وہ نہ صرف سماج کے زخموں کی مرہم پٹی ہی کرنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ اُس کے ناسوروں کا عملِ جراحت سے علاج بھی کرنا چاہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک باہمت ڈاکٹر کی طرح نشتر میں مجلے جگری اور بے حسی سی نظر آئے، مگر یہ تصویر کا صرف ایک رُخ ہے اور اُس کا بھی صرف ایک پہلو۔ سردار جعفری کے وسیع مطالعے اور گہرے مشاہدے نے اُنہیں تخلیق کے لئے کافی مواد فراہم کیا ہے، وہ ادب میں حقیقت پرستی کے قائل ہیں۔ جتنے مضامین اور کہانیاں، ڈرامے انشائیے وغیرہ اُنہوں نے تصنیف کئے ہیں [illegible] وقت کی عکاسی کی ہے اور یہ اُن کے اِردگرد کے سماجی ماحول سے ہی ماخوذ ہیں۔ ایسی فنکارانہ صداقت شاید ہی کسی اور فنکار کے ہاں ملے۔ حالات و واقعات کے اشتراکی انداز کے جائزے نے اُنہیں جو اظہار کا اُسلوب بخشا ہے [illegible] اور اسی وجہ سے وہ دوسرے ادیبوں میں ممتاز ہیں۔ اپنے مرتبہ دیوانِ غالبؔ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :-

" غالبؔ کی آخری قیام گاہ اُس کا تصور اور تخیل ہے، کیونکہ مفلس کا مدارِ حیات خیالات پر ہے (ایک خط) اِس دنیا میں پہنچ کر [illegible] سات پر حکمرانی کرنے لگتا ہے اور زندگی کی ہر کمی کو پُورا کر لیتا ہے۔ یہ خوابوں کی دُنیا ہے اور یہاں خوابوں کی تخلیق کرنے والے کے سوا کسی کی حکمرانی نہیں چلتی۔ یہاں بادشاہ اژدہے معلوم ہونے لگتے ہیں اور شاعر پیغمبر ہو جاتا ہے۔ اور جبرئیل اُس کے ناقۂ شوق کا حُدی خواں۔ یہاں سقائی نہیں ہے صرف دردمندی ہے۔ حسرتیں نہیں ہیں، صرف نشاطِ کامراں ہے۔ قدح سازی اور ساقی تراشی ہے۔ پیاس جتنی بڑھتی ہے دریا کا جوش اُتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔ ایسے میں جینے کا حوصلہ بیدار ہوتا ہے اور خونِ جگر پی کر جینے کی تازگی بڑھ جاتی ہے (منشی نامہ) تصور نا آفریدہ گلشنوں کی گل چینی کرتا ہے اور

---

[1] ترقی پسند شاعری کے بعض بنیادی مسائل۔ سردار جعفری (شاہراہ نمبر [illegible] ۔ ایڈیٹر ساحر لدھیانوی ص ۱۴)

[2] ترقی پسند شاعری کے بعض بنیادی مسائل۔ سردار جعفری (شاہراہ نمبر [illegible] ایڈیٹر ساحر لدھیانوی ص ۱۴)

بہاروں کی قیمت لگاتا ہے۔ اِس دنیا میں صرف جنبش اور پرواز ہے اور آگے بڑھتے جانے کا مستانہ عمل۔ "تا باز گشت سے نہ رہے مدعا مجھے"[1]

خیال پر قابو اور قلم پر قدرت جعفری کا ایک قابلِ قدر وصف ہے، شاعری کی طرح نثر میں بھی مترادفات و متضاد الفاظ و علائم کی بازی گری کے ہنر سے سردار بہرہ ور ہیں۔ ملاحظہ ہو :۔

"پھول چہروں میں بدل جاتے ہیں۔ چہرے پھولوں میں۔ خاک سے آدمی بنتا ہے اور آدمی خاک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح موت اور زندگی ایک سلسلے کی کڑیاں بن جاتی ہیں اور ساری کائنات ایک وحدت میں تبدیل ہو جاتی ہے اور میر کی شاعری کے تمام بکھرے ہوئے جلوے ایک صد رنگ گلستاں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اِس میں پھول بھی ہیں، کانٹے بھی، بلبل بھی ہے اور صیاد بھی۔ نشیمن بھی ہے اور بجلی بھی، زندہ رہنے کی اُمنگ بھی ہے اور مر جانے کا حوصلہ بھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ شاعری آج بھی عظیم ہے اور زمانے کے بدل جانے کے بعد بھی دو سو برس پرانی زبان میں ہمارے جذبات و احساسات کا ساتھ دے رہی ہے۔"[2]

یوں تو جعفری نے کہانیاں، ڈرامے، تنقیدی مضامین اور انشائیے وغیرہ بھی کچھ اپنے انداز میں لکھے ہیں۔ لیکن خاص طور پر انشائیوں میں جعفری نے دور از کار تشبیہات اور تراکیب، فرسودہ عبارت آرائی کو ختم کر کے ایک شاعرانہ اسلوبِ نگارش کا اضافہ کیا ہے۔ اور اسے ادبِ لطیف کے شستہ ذوق سے سنوارنے کی سعیِ جمیل کی ہے۔ زبان کی صحت مند اور جاندار فقرات، موزوں الفاظ کی نگینہ سازی سے صوری حسن اور حسنِ عبارت کی بہاریں تو ہیں ہی، ساتھ ہی معنویت اور معقولیت کا ایک پُر وقار آہنگ بھی بخشا ہے، ایک اور خدمت سردار نے یہ بھی انجام دی ہے کہ حالی، عبدالحق اور ڈاکٹر زور کی مقدمہ نگاری کے فن کو نہ صرف آگے بڑھایا ہے، بلکہ بہت اونچا اٹھایا ہے۔ دیوانِ میر، دیوانِ غالب اور کبیر بانی وغیرہ کے دیباچے اُردو ادب میں یقیناً اہمیت رکھتے ہیں۔ سردار کے مزاج کی طرح تقریر، اور اُن کی تقریر کی طرح اُن کی تحریر میں ایک بلند آہنگ ملتا ہے، جس میں زندگی کا حوصلہ اور جینے کا جذبہ پایا جاتا ہے، جو تحریر کی ہر سطح پر رواں دواں رہتا ہے۔ اِس طرح کی شدتِ احساس اور قوتِ اظہار سے ہی عظمتِ تحریر عبارت ہوتی ہے۔ پُر جوش، جذبہ اور حرکت، رومانی رنگینی اور روانی جعفری کی نثر کے مخصوص عناصر ہیں۔

اِسی کے ساتھ غالب کی متحرک اور رقصاں امیجری ہے، جو تصویر گری کی معراج ہے، جب وہ اپنی اچھوتی تشبیہوں اور نادر اِستعاروں کا جادو جگاتا ہے تو ایک ایک حرف رقص کرنے لگتا ہے۔ ٹھہرے ہوئے نقوش سیال ہو جاتے ہیں، مجرد خیال ایک پیکرِ رنگ و بو بن کر سامنے آ جاتا ہے، دشت گرمیٔ رفتار سے جلنے لگتے ہیں۔"[3]

اُن کی رنگا رنگ نگارشات کو پڑھنے کے بعد انیس، غالب اور اقبال کی نئی عظمتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اقبال سے تو وہ اس قدر متاثر ہیں کہ روشنائی میں سجاد ظہیر نے اِن کی "اقبالیات" کے بیزار کن حد تک بڑھ جانے کی میٹھی شکایت بھی کی ہے۔ گفتگو ہو کہ تحریر، سردار غالب اور اقبال کے متعدد اشعار اس برجستگی اور روانی سے استعمال کرتے ہیں کہ ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے کوئی ہوشیار جوہری اپنے لعل و گہر کی نظر نواز آب و تاب دکھانے کے باوجود بڑی تیز بیانی اور چابک دستی سے اُن کی دیگر خصوصیات کو بھی ایسے متاثر کن

---

[1] دیباچہ۔ دیوانِ غالب۔ مرتبہ سردار جعفری ص (۲۳)

[2] دیوانِ میر۔ جلد دوم۔ مرتبہ سردار جعفری ص (۵۲)

[3] دیباچہ۔ دیوانِ غالب۔ سردار جعفری ص (۲۱)

پیرائے میں پیش کر رہا ہو کہ گاہک کو خریدتے ہی بنے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ والے مضمون میں جو شاید بڑی روا روی میں لکھا گیا ہے۔ غالب اور اقبال کو بار بار یاد کیا گیا ہے۔ ذیل کے اقتباس سے اُن کی اِس گراں قدر اثر پذیری کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔
غالب نے بھی اِس کھو جانے والی زندگی کا ماتم کیا ہے۔ لیکن اِس طرح سے

مٹتا ہے فوت فرصتِ ہستی کا غم کہیں
عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

ایلیٹ کو کھوئی ہوئی زندگی کا غم اِس لئے ہے کہ وہ عبادت میں توبہ اور استغفار میں اور رُومانی کلیسا کی تعمیر میں صرف نہیں ہوئی۔ لیکن غالب تو اِس قسم کی عبادت کو بھی جو احساسِ گناہ سے پیدا ہو اور ذاتی نجات کی خواہشمند ہو تضیعِ اوقات سمجھتا ہے۔ یہ خیال کہ علم جہالت ہے اور جہالت موت ہے، بہت پُرانا ہے۔ "ویدانت" میں اِس جہالت اور موت کو "اودیا" کہا گیا ہے۔ صوفی طرزِ فکر میں یہ روایت بہت قدیم ہے۔ یہ وراثت اقبال کے پاس بھی ہے سے

"علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن"

"عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب" لیکن ایلیٹ کے یہاں اِس کا استعمال جس طرح کیا گیا ہے اِس سے اِنسان تاریک اندیشی اور کلبیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور اقبال کے الفاظ میں سے

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے
بُری ہے مستیٔ اندیشہ ہائے افلاکی [1]

جعفری کے اِس اُسلوبِ نگارش میں جملوں کے اندرونی و بیرونی پردے، فکر و نظر کے رنگ و نور سے اِس طرح منوّر ہوتے ہیں کہ دیکھنے والا نہ صرف بے اختیار مائل ہو جاتا ہے۔ بلکہ مطالب کی حریمِ ناز کی تلاش و جستجو بھی کرنے لگتا ہے۔ قلم کا یہ اعجاز، غالب کے فیضان، اقبال کے عرفان اور رشید احمد صدّیقی سے اکتساب کی غمّازی کرتا ہے۔ اُن کی فلسفیانہ بلند خیالی، خوبصورت اور اثر آفریں پیرایۂ اظہار سے مل کر عبارت کو ایک بلیغ استعارہ بنا دیتی ہے۔ اگر یقین نہ آئے تو ذیل کا حوالہ پڑھیے۔

"مجھے انسانی ہاتھ بڑے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی جنبش میں ترنم ہے اور خاموشی میں شاعری۔ اُن کی اُنگلیوں سے تخلیق کی گنگا بہتی ہے۔ یہ وہ فرشتے ہیں جو دل و دماغ کے عرشِ بریں سے وحی و الہام لے کر کاغذ کی حقیر سطح پر نازل ہوتے ہیں اور اُس پر اپنے لافانی نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ ان کاغذوں کو دُنیا نظم، افسانہ، مقالہ اور کتاب کہہ کر آنکھوں سے لگاتی ہے اور اُن سے رُوحانی تسکین حاصل کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ہمیشہ قلم کو ہاتھ کا تقدّس، ذہن کی عظمت اور قلبِ انسان کی وُسعت سمجھا ہے اور قلم کے بنائے ہوئے ہر نقش کو سجدہ کیا ہے۔" [2]

سردار جعفری شعری تخلیقات اور نثری نگارشات میں بھی عوامی الفاظ، تہذیبی و صنعتی ترقی پذیر زندگی کے قومی اور آفاقی عصری مسائل کا ساتھ دینے والی زبان استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ اُردو کو ہندی سے قریب تر کرنے کے وہ متمنّی ہیں، مگر "چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی" کے مصداق اِن کی تخلیقات میں خالص اُردو زبان کی سجی سجائی دُلہن، ریشمی گھونگھٹ اُلٹ کر اپنے رُخِ روشن، اپنی مہتابی چتون، شناسائی پلکیں، یاقوتی لب اور اپنے حجاب آفریں شباب کی ایک مسحور کن جھلک دِکھا ہی جاتی ہے۔ شاید اِس سلسلے میں جعفری

---

[1] ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ۔ توبہ و استغفار کا شاعر۔ سردار جعفری۔ آئینہ، ۱۰ / مارچ ۶۵ء
[2] "لکھنؤ کی پانچ راتیں"۔ سردار جعفری۔ ص (۱۰۹)

منظر نامجبور رہی ہیں۔

" اسلوب اور اسلوبیات کے بارے میں مشہور امریکی مصنفین ریّن اور ویلک کا [illegible] ہے۔ انہوں نے ادیب اور اس کے اسلوب کے درمیان شخصیت اور اس کے اظہار کا رشتہ قائم کیا [illegible] کامیاب فن پارہ وہی ہے، جو فن کار کی شخصیت کا بھی مظہر ہو۔ سردار جعفری علم و فن کی اس [illegible]۔ ان کی [illegible] تحریروں میں اُن کی دل آویز شخصیت کا عکس رقصاں ملتا ہے۔ کبھی تو شیلے [illegible] کی تڑپ کی طرح [illegible] معروف و نہمک معمار کی دُھن کی صورت، کہیں ہمدردِ انسانیت کے خلوص اور پیار کے روپ میں۔ [illegible] استغراق کے عالم میں ———— نت نئی اچھوتی اور دلفریب تراکیب و تشبیہات جعفری کے اسلوب [illegible] اور ادب کے ماحول کا آوردہ اور پروردہ ہے اور جو ہماری زبان کے مزاج میں بھی رچا بسا ہے [illegible] ادب اور [illegible] کی روایات کے پس منظر میں ایسی لالہ کاری معلوم ہوتی ہے کہ ہم اُس سے مانوس ہوتے ہوئے بھی ایک چونکا دینے والی جدّت پاتے ہیں۔

" استالن گراڈ اپنے زخموں کو مندمل کر رہا ہے۔ اپنی تعمیر میں مصروف ہے [illegible] میں سر اُٹھا رہی ہیں۔ جیسے زمین سے درخت اُگ رہے ہیں۔ یہ بوڑھا شہر تباہ و برباد ہو [illegible] ہے زلیخا پھر سے جوان ہو رہی ہے۔ "[1]

" شہر کا جنوبی حصّہ جو دریا کے کنارے کنارے بہت دور تک چلا گیا ہے [illegible] آسمان کے سفید بادل اپنی پرچھائیاں زمین کے ننگے سر پر آنچلوں کی طرح اُتار رہے تھے "[2] ندرتِ خیال اور لطافتِ بیان کے قابلِ قدر نمونے ذیل کے اقتباسات میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ اردو ادب میں یہ حیات افروز طرزِ انشا سردار جعفری ہی سے مخصوص ہے۔

" کسی زمانے میں اِس کے سر پر موت کی تلوار لٹک رہی تھی اور وہ دلیس بدیس مارا مارا پھر رہا تھا۔ اب اُس کے سر پر شہرت اور عظمت کا تاج رکھا ہے اور وہ خواب آلودہ لہجے میں بات کرتا ہے جیسے گنگا کا پانی بہہ رہا ہو یا صنوبر اور چیڑ کے درختوں سے ہوا آہستہ آہستہ گزر رہی ہو۔ "[3]

یا پھر یہ :-

" میں نے موجوں کی طرف دیکھا جو واقعی بہتی ہوئی چاندنی [illegible] دور اُفق پر مہینے کی آخری راتوں کا چاند اُبھر رہا تھا۔ جس کی نرم [illegible] تھیں اور مٹیالے پانی کو سیّال چاندی میں تبدیل کر رہی تھیں۔ بوڑھے کا [illegible] سرخی مائل روشنی میں چمک اُٹھا۔ اور سفید بادبان، بادل کا ایک خوبصورت ٹکڑا معلوم ہوتا تھا۔ یہ [illegible] چاندی کے دریا میں بہائے لے جا رہا تھا۔ "[4]

عام طور پر سردار جعفری کے صرف شاعرانہ چہرے بُشرے ہی [illegible] اردو نثر کے دامن میں (باقی صفحہ ۱۳ پر دیکھیے)

---

[1] ذوقِ تعمیر۔ لکھنؤ کی پانچ راتیں۔ سردار جعفری۔ ص [illegible] ۱۹۹۳ء
[2] " " " (۱۴۱)
[3] حالِ مجبوب اور امن عالم۔ " (۱۴۷)
[4] چھیڑ و مانجھی۔ لکھنؤ کی پانچ راتیں۔ "

اختر سعید

غزل

قیمتِ دل کا مجھے اندازہ کچھ ہو تو سہی
پھر چُرا لینا نگاہیں، پہلے دیکھو تو سہی

سرسری گذرو نہ شہرِ دل سے نا پُرسانِ غم
بات بھی کرنی مجھے آتی ہے پوچھو تو سہی

کچھ نظر آتا تو ہے، وہم و یقیں کے درمیاں
یہ مرا سایہ ہے یا میں ہوں، بتاؤ تو سہی

پَل رہا ہے لائقِ تعبیر شائد کوئی خواب
میری اِن اُجڑی ہوئی آنکھوں میں جھانکو تو سہی

اب بھی رہ رہ کر جو اُکساتی ہے جینے کیلئے
کون سی وہ آرزو ہے، دِل میں ڈھونڈو تو سہی

جُز اَجل کیا کچھ نہیں ہے اب علاجِ زندگی؟
چارہ سازو، غم گسارو، مُنہ سے بولو تو سہی

اب جو ہم اِس موڑ پر بچھڑے تو جائیں گے کدھر؟
کتنے آگے بڑھ چکے ہیں، مُڑ کے دیکھو تو سہی

بند رکھو گے دریچے دِل کے یارو کب تلک؟
کوئی دستک دے رہا ہے اُٹھ کے دیکھو تو سہی

▲

شہاب جعفری

تضمین (برغزل غالب)

آوارگی نصیب ہے، رُسوائی راس ہے
ہُوں اِس جہاں میں یُوں کہ نہ ہونا قیاس ہے
بے چہرگی پہ اپنی دِل اِتنا اُداس ہے
"سرگشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے
تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے"

مَیں سنگِ آستانۂ بُت خانۂ وفا
میرے جُنوں سے رونقِ ویرانۂ وفا
سُنتا ہے وہ بھی شُہرۂ افسانۂ وفا
"ہے وہ غرورِ حُسن سے بیگانۂ وفا
ہر چند اُس کے پاس دلِ حق شناس ہے"

فردوسِ دَرد پھیلی ہے جاں سے جہاں تلک
پیدا فضائے نُور ہے دِل سے زباں تلک
پہنچا زمیں سے شعلہ مرا آسماں تلک
"کیجے بیاں سرورِ تپِ غم کہاں تلک
ہر مُو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے"

دِل تا بہ دَہر چھائی ہے خاموشیٔ لَحد
ہندوستاں کی حَد سے مِلی ہے عدم کی حَد
یہ مُلک ہے فسادوں کا، کیا کہیئے حالِ بد
"ہر اِک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسد
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے"

▲

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو۔ دہلی)

افسانہ

آمنہ ابوالحسن

اِنفرنو

دو سو سال پہلے وہ عدم تھا، اس کی کوئی مسلسل و مستقل شکل نہیں تھی۔ مگر پھر اس نے جنم لیا اور بڑھنے کھیلنے لگا اور پھر سنہ ۱۹۴۷ء میں وہ جوان اور بالغ ہو گیا۔ وہ بنتا گیا' اس نے ایک مضبوط اور باقاعدہ شکل اختیار کر لی۔ اب اس کے پیروں کی جگہ دو لاٹھیاں تھیں۔ ہاتھوں کی جگہ دو نیزے، تھوبڑا مگرمچھ کی طرح بدنما۔ جبڑے سخت اور تند خو۔ دانت شیر کی طرح استوار اور کٹیلے۔ ذہن سازشی اور عیار۔ دھڑ سانپ کی طرح زہریلا اور جست عقابی، گویا وہ مجسم خوف و دہشت تھا۔ بچے اسے دیکھ کر چلّا پڑتے۔ عورتیں واویلا کرنے لگ جاتی، مرد گھبرا گھبرا کر اکٹھے ہوتے۔ مگر اس کے ہر وار کے آگے کٹ پھٹ کر منتشر ہو جاتے۔ پچھڑ جاتے۔ وہ بھیڑیئے کی چال دھتا۔ کسی شکاری طرح کٹا پھٹا بچا ہوا، مگر موت کی طرح ہر جگہ پہنچ جانے والا۔

میں نے اسے پہلی مرتبہ سنہ ۱۹۴۷ء میں دیکھا اور ٹھٹک کر اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ اس کی ہیئت کذائی پر میرے قدم زمین میں گڑ سے گئے۔ جوں توں ہمت کر کے میں نے پوچھا۔ "تم کون ہو"۔ اور وہ مسکرا کر میری طرف بڑھا۔ اس کی تمام شخصیت پھانسی کے تختے کی طرح تھی۔ میں گھبرا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ مجھے جرأت و ہمت کے باوجود اپنی زندگی عزیز تھی۔ میں دو بچوں کا باپ اور ایک عورت کا شوہر تھا۔ مجھے ان سب سے بھی پیار تھا۔ مگر بھاگ کر جب میں اپنے گھر پہنچا تو میں نے اپنے آپ سے پہلے پھر اسے وہاں موجود پایا۔ اس کے ہونٹوں پر خون تھا اور ہاتھوں میں میرے دونوں بچے۔ بچے جنہیں میں کچھ دیر پہلے ہنستا کھیلتا اور حرکت کرتا ہوا چھوڑ کر گیا تھا۔ مگر جو اب بے حس و حرکت مردہ تھے۔ اس کی ٹانگوں میں پھنسی ہوئی میری بیوی جس کی بے نور پتلیوں دہشت و خوف جم چکے تھے۔ جس کے نیم وا ہونٹوں پر ایک چیخ سی منجمد تھی۔ جیسے چیخنے سے پہلے ہی چیخ کا خاتمہ کر دیا گیا ہو۔ اس کا زخمی بدن کپڑوں کی بجائے آلودگی اور خون سے ڈھکا ہوا تھا۔

میں پاگلوں کی طرح اس عفریت کی طرف لپکا کہ اس کا گلا دبوچ لوں۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں۔ اس کی بوٹیاں چیل کوؤں کو کھلا دوں، مگر وہ میرے جنون کے ہاتھ نہ آ سکا۔ وہ کسی مچھلی کی طرح پھسل کر میری ہر ہر گرفت کو خالی کر گیا اور پھر مسکراتا، ٹھٹھے لگاتا ہوا میرے دونوں مردہ بچوں کو فرش پر پٹخ کر گھر سے باہر نکل گیا۔

میں نے تین لاشوں کو پھلانگ کر اس کا تعاقب کیا۔ مگر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ دوسرے گھر میں داخل ہو چکا تھا اور وہاں موجود ہر متنفس کو ایک گٹھری کی طرح باندھ کر انہیں سوکھی گھاس کی طرح آگ دکھا رہا تھا۔ زمین و آسمان ہلا دینے والی لمبی چیخیں میرے کان پھاڑتی ہوئی مجھ پر سے گزر گئیں اور وہ اپنی شیطنت سے خوش خوش پھر اس گھر سے بھی نکل گیا اور مغرور و بےپروا سا تیسرے گھر میں داخل ہو گیا۔ یہاں اس نے ہر مرد کو آناً فاناً کچل دیا اور ہر ہر عورت کو اپنی گرفت میں جکڑ کر انہیں برہنہ کرنے لگا۔ ان کے جسموں کو ٹہنیوں کی طرح توڑنے مروڑنے، ربڑ کی طرح کھینچنے تاننے اور حلوے کی طرح چوسنے چاٹنے لگا۔ پھر اس نے ہر ہر جسم کو پارہ پارہ، ریزہ

ریزہ ریزہ کر دیا۔ اپنے وجود تلے روند اور رگڑ ڈالا تہس نہس کر دیا۔ میری آنکھیں دفعتاً اپنے حلقوں سے باہر اُبل آئیں اور میرا رُواں رُواں دہشت اور وحشت سے سارس کی دُم کی طرح اینٹھ گیا۔ "او خونی لٹیرے، خونخوار،" میں نے چلّا کر کہا۔ "تو ظالم ہے، تو زانی ہے، تو ناقابلِ معافی ہے، تو قہر کی طرح خوفناک، وَبا کی طرح سفّاک، کوڑھ کی طرح قابلِ نفرت ہے۔ ٹھہر، میں تیرا قلع قمع کرتا ہوں، تیرے بھی پرخچے اڑاتا ہوں، تیرے بھی ہاتھ پاؤں تیرے تن سے جدا کرتا ہوں۔ تیرے بھی ایک ایک عضو کو جلتی ہوئی آگ میں بھسم کر ڈالتا ہوں۔"

اور نہ جانے کس قوت کے سحر سے میں آگے بڑھا۔ مگر وہ مجھے پھر جُل دے کر مجھ سے بھی پہلے چوتھے گھر میں داخل ہو چکا تھا۔ میں نے پھر اس کا تعاقب کیا اور دیکھا کہ وہ وہاں موجود ایک ایک بچے کو سوکھی ہڈیوں کی طرح پیس رہا تھا اور ایک ایک جوان مرد کو تیز ابے سے مسخ کر رہا اور جھلسا رہا تھا۔

"کمبخت، کمبخت،" میں چلّایا۔ "رُک جا، ٹھہر جا، اب تو اپنے ظلم و ستم کا سلسلہ بند کر۔ اتنی زندگیوں کی قربانی لے کر کم از کم اپنی بھوک پیاس ختم کر دے" مگر وہ میری طرف متوجہ نہ ہوا اور آہوں اور کراہوں کے طوفانِ شدید سے مسکراتا ہوا گزر کر پانچویں گھر میں داخل ہو گیا۔ یہاں اُس نے ہر شخص کی آنکھیں پھوڑ دیں اور ہر شخص کے پیٹ میں چھُرے گھونپ دیئے اور خون کے فواروں میں نہاتا ہوا نہایت تیزی مگر آرام و اطمینان سے آگے بڑھا۔

میں تیورا کے گر پڑا اور نہ جانے کب تک بے ہوش رہا۔ جب میری آنکھ کھلی تو گھنٹوں گزر چکے تھے اور ہر طرف چیخ پکار، دہشت و وحشت، واویلا اور شیون کے بجائے گہرا سکوت مسلّط تھا۔ موت کا سا سکوت، میں لڑکھڑا کر اُٹھا، مگر پھر چکرا کر گرا۔ میں خود خون میں لت پت تھا اور پھٹے ہوئے جسم اور نچی ہوئی آنکھیں میرے ہر طرف بکھری ہوئی بجلجے سانپوں کی طرح ایک دوسرے پر رینگتی ہوئی۔ میں کانپ کانپ گیا۔ میں نے اپنا سر تھام لیا۔ مجھ میں چلنے کا حوصلہ تک ختم ہو گیا۔ مگر میں نے ہمت کی، بے حد جرأت و ہمت۔ میں نے اپنے خوف کو جھٹک جھٹک دیا۔ اپنے چکراتے گھومتے ہوئے سر کو پٹخ پٹخ دیا۔ شاید میں کوئی منحوس خواب دیکھنے لگا ہوں۔ میں نے سوچا، مگر اس خواب کو ٹوٹنا چاہئے۔ مجھے اس کے مہیب جنگل سے چھوٹنا چاہیئے اور میں جوں توں کر کے پھر اٹھا۔ میں نے اپنی آنکھیں رگڑ رگڑ مسل ڈالیں۔

یہ کیسا واہیات خواب ہے۔ یہ کیسا ذلیل خیال — !!

میں نے اپنی بیوی اور بچّوں کو پکارا۔ جواب ندارد۔ میں پھر چلّایا، مگر خاموشی ہی خاموشی۔ تو کیا یہ خواب نہیں؟ میں ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ سائیں سائیں کرتی تاریکی۔ جھینگروں کے شور اور مینڈکوں کے واویلا میں مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ کچھ سنائی نہ دیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آسکا۔ میں نے اپنی پوری قوت مجتمع کی اور بگٹٹ وہاں سے بھاگا۔ شاید میں کسی اجنبی اور وحشی جگہ پہنچ گیا ہوں۔ میں بھاگتا رہا، بھاگتا رہا۔ جب تک میرے قدموں نے ساتھ دیا اور خوف کی اکتائی ہوئی میری طاقت نے مجھے سہارا دیا۔ میں رُکے بغیر بھاگتا رہا۔ حتیٰ کہ تھک کر میں پھر گر پڑا۔ دہشت، نقاہت اور نفرت سے مل کر میرے سارے جسم نے مجھ سے بغاوت کر دی اور مجھ میں اُمید اور جرأت کی ہر رمق دم توڑنے لگی۔ میں نہ جانے کون سے کون سے نام یاد کر کے چیخنے لگا۔ کون کون سے رشتے یاد کر کے فریاد کرنے لگا۔ نہ جانے کس کس کو آوازیں اور دُہائی دینے لگا۔ "او لوگو مجھے بچاؤ، میں ڈوب رہا ہوں۔ میں مر رہا ہوں۔ میں درد سے اکڑ گیا ہوں" مگر کوئی نہیں آیا۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ اندھیرا اور خاموشی —! میرے نتھنوں میں البتہ جلے ہوئے گوشت کی چراند اور خون کی بساند تیزی سے گردش کرتی رہی۔ اور نہ جانے میں کب تک اسی حالت میں تڑپتا پھڑپھڑاتا رہا۔ نہ جانے کتنے دن مجھ پر سے یونہی گزر گئے اور کوئی میری مدد کو نہیں آیا۔ مجھے اس جہنم سے نکال نہیں لے گیا۔ مگر جب مجھے پھر ہوش آیا تو اندھیرے اور خاموشی کے بجائے اُجالا دکھائی دیا اور آوازوں کی بھنبھناہٹ سنائی دی اور جلے ہوئے گوشت کی چراند اور خون کی بساند کے بجائے دواؤں کا تیز بھبکا میرے نتھنوں سے ہوتا ہوا میرے دماغ میں جا گھسا۔

میں نے نیم وا آنکھیں بالکل کھول دیں اور اُجالے کی ہمت اور انسانی آوازوں کی بھنبھناہٹ سے جرأت پا کر پھر اپنے بیوی

بچوں کو پکارنے لگا۔ دفعتہً سفید کپڑوں میں ملبوس ایک ہستی میری طرف بھاگتی ہوئی آئی اور کچھ انوکھی خوشی اور نرمی سے بولی۔
"مت چلاؤ، آرام کرو، آرام۔" پھر اُس نے آواز دی۔ "ڈاکٹر ڈاکٹر، یہ ہوش میں آگیا ہے، یہ کچھ کہہ رہا ہے۔ یہ کس کو پکار رہا ہے۔" تب عاجلانہ قدموں کی تیز چاپ اُبھری اور ایک دھمک کی طرح میرے قریب آکر تھم گئی، کورامائین، کورامائین اور ٹھنڈا پانی بھی۔ آنیوالے نے آہستگی سے میرے ماتھے پہ ہاتھ رکھا، میرے دل کی دھڑکن محسوس کی۔ میری آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ "لو یہ پی لو۔" پھر اُس نے کوئی چیز میرے مُنہ سے لگادی اور میں غٹاغٹ اُسے پی گیا۔ معاً مجھے اپنے آپ میں نئی طاقت اور توانائی کا احساس ہوا۔ راحت اور ٹھنڈک کا۔ میری آنکھیں پھر بند ہونے لگیں۔ "سونے دو، اسے سو جانے دو۔" دور ہوتی ہوئی ایک آواز آئی اور میں پھر اپنے جملہ حواس سے دور نہ جانے کس اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا۔ خود سے بالکل ہی بیگانہ۔ حتیٰ کہ پھر میری آنکھ کھلی۔ اور کسی دوسری ہستی نے میری نبض ٹٹولی۔ کسی نے پھر مجھے کچھ کھلایا پلایا اور میں پھر ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔ نہ جانے کب تک یہی سب کچھ ہوتا رہا اور کتنے دِنوں کا عرصہ میری بے ہوش زندگی پہ سے بیت گیا۔ مگر اس کے بعد جب میں جاگا تو بالکل اپنی اصلی حالت میں تھا اور انتہائی با ہوش و حواس!

"یہ کیا مذاق ہے؟" میں دفعتہً بیہودگی سے چلّایا۔ یہ میرا بستر نہیں، یہ میرا گھر نہیں۔ یہاں کوئی میرا نہیں، میں کیوں یہاں لایا گیا ہوں، کس لئے رکھا گیا ہوں، کیا میں بیمار ہوں، بیمار۔۔۔؟؟" میں ایک ایک کی طرف گھورنے لگا۔

"اب آپ اچھے ہیں۔ ٹھیک ہیں۔" کسی نے مجھے بتایا۔

"تو کیا اب تک میں نحیف و نزار، بیمار تھا۔ کیا بیماری تھی مجھے۔۔؟"

"بستر سے اُٹھ آیئے۔ مُنہ ہاتھ دھو لیجئے۔ ابھی آپ کو بتا دیا جائے گا کہ آپ کی علالت کس قسم کی تھی۔"

"اور میرے بیوی بچے، میرا گھر۔۔۔؟؟"

"سب آپ کو مل جائیں گے، سب آپ کو مل جائیں گے۔"

مارے خوشی کے میرے جسم میں پھُرتی پڑ گئی۔ جو کچھ گزر چکا تھا وہ مجھے یاد نہیں تھا، مگر کوئی خوف برابر ایسا تھا جو مجھے جکڑے پکڑے ہوئے تھا۔ میں بستر سے نیچے اُترا اور غسل خانے کی طرف بھاگا۔ جب میں مُنہ پر ٹھنڈے پانی کے چھپاکے مار رہا تھا تو رہ رہ کے چند چیخیں کہیں دُور اُبھر رہی تھیں اور میری سماعت کو جھنجھوڑ رہی تھیں۔ یہ کیسی چیخیں ہیں، کیسی چیخیں۔۔!! میں نے سوچا اور حیران ہکا بکا باہر نکل آیا۔ ڈاکٹر اور نرس میرے منتظر تھے۔

"ہاں تو مسٹر۔۔۔ ڈاکٹر نے رُک رُک کر کہا۔ جیسے میرا نام جاننا چاہتا ہو۔

"میرا نام کمال ہے۔" میں نے فوراً اپنا نام بتا دیا۔

ڈاکٹر خوشی سے مسکرایا۔

"خدا کے لئے اب اور مجھے یہاں نہ روکیئے۔ میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔" میں بے تابی سے بڑبڑایا۔

"ہاں ہاں ضرور مگر۔۔۔!"

"مگر کیا۔" میں نے جنونیوں کی طرح ہانک لگائی۔

"ابھی ابھی تو آپ ٹھیک ہوئے ہیں مسٹر کمال۔ اتنا جلد گھر کس طرح جا سکتے ہیں بھلا۔" "کچھ دن اور آپ کو یہاں رہنا پڑیگا۔ پھر ہم آپ کو اپنے گھر بھی بھجوا دیں گے۔ مگر آپ کا گھر۔۔؟"

"تو کیا آپ سمجھتے ہیں میرا کوئی گھر نہیں۔۔؟ کیا آپ مجھے گھر سے نہیں لائے تھے؟ کیا میری ساری بیماری میں میری بیوی، میرے کسی عزیز رشتے دار نے میری کوئی خبر نہیں لی۔۔؟

"کچھ لوگ آئے تو تھے، مگر ہم نے انہیں آپ سے ملنے کی اجازت نہیں دی۔ دراصل آپ سخت بیمار تھے، آپ کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں تھا۔"

"ذہنی توازن، ہو ہو ہو۔!!!" میں بے ساختہ ہنس پڑا۔

"آپ مجھے پاگل ثابت کرنا چاہتے ہیں ڈاکٹر؟" میں نے کچھ سراسیمگی اور دیوانگی سے پوچھا۔

"ہرگز نہیں!" ڈاکٹر نے نرمی سے کہا، کوئی چیز آپ کے سر پر گر پڑی تھی یا شاید کسی چوٹ سے آپ بے ہوش ہو گئے تھے۔ آپ کی یاد داشت ختم ہو چکی تھی۔ آپ ہمارے پاس زیرِ علاج تھے۔ مگر اب ۔۔ !

"اب میں بالکل تندرست ہوں، بالکل ٹھیک اور درست، میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ میں ایک کمرشیل فرم میں ملازم تھا اور اپنے گھر میں اپنی بیوی بچوں کے ساتھ خوش اور مگن۔ مگر.....

دفعتاً میری یاد داشت الجھنے لگی اور میں سٹپٹا سا گیا۔

"میں نے شاید ایک ڈراؤنا خواب دیکھا تھا ڈاکٹر اور اس خواب میں الجھ کر اس سے ڈر کر میں اپنے بستر سے نیچے آ پڑا۔ لیکن کیا چوٹ میرے دماغ پر لگی تھی۔؟"

"ہاں، مگر مسٹر کمال۔ اب آپ کسی پریشان خیال کو اپنے دل میں جگہ نہ دیں اور زیادہ سے زیادہ پُرسکون رہنے اور آرام لینے کی کوشش کریں، کیوں کہ صرف اسی صورت میں آپ جلد سے جلد یہاں سے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹروں کو یہ یقین دلانے کے بعد کہ اب آپ کا ذہن الجھا ہوا نہیں ہے۔"

مجھے اپنے سامنے کھڑا ہوا آدمی ڈاکٹر کی بجائے قصاب یا جیلر نظر آیا۔ میرا جی چاہا میں اسے گرا کے، ادھ مُوا کر کے پھلانگ کے بھاگ جاؤں اور جلد سے جلد اپنے گھر جا پہنچوں، اپنے بچوں کو چوموں۔ اپنی بیوی سے بغلگیر ہو جاؤں اپنے گھر کو از سرِ نو دیکھوں مگر میں نے اپنے غصے کو فت اور تمام خواہشات کو ضبط کر لیا۔ پہلے مجھے اپنی حالت سمجھ لینی چاہیئے۔ میں نے سوچا اور مسکرا کر ڈاکٹر کو "او کے" کہا۔ میں بستر پر لیٹ گیا اور میں نے اپنی آنکھیں بند بھی کر لیں۔ پھر میں واقعی سو گیا۔ جب جاگا تو اب میں کسی دواخانے کے وارڈ میں نہیں تھا بلکہ ایک کشادہ مکان میں ایک بالکل ہی نئے آدمی کے ساتھ تھا۔

"تم کون ہو؟" میں نے اس آدمی سے پوچھا۔

"تمہارا دوست۔!" وہ بولا

"مگر میں تمہیں نہیں پہچانتا۔"

"پہچان لوگے دھیرے دھیرے۔"

"اور وہ دواخانہ۔ وہ ڈاکٹر، وہ نرس ....."

"کیسا دواخانہ۔ کون ڈاکٹر۔ کہاں کی نرس؟" وہ زندہ دلی سے ہنسا۔

"تو کیا میں بیمار نہیں تھا۔ میں کسی دواخانے میں زیرِ علاج نہیں تھا۔ میرے سر پر چوٹ نہیں لگی تھی۔؟؟؟"

"مسٹر،" اجنبی نے ہنس کر خوش دلی سے کہا۔ "ایسی پاگلوں جیسی باتیں مت کرو۔ تم ایک کمرشیل فرم کے ملازم ہو۔ ہو نا۔؟"

"ہاں ہاں بالکل۔ سو فی صد۔"

"تو بس تمہاری ترقی ہو گئی ہے۔ تم اس فرم سے نئی فرم میں بھجوا دیئے گئے ہو۔ یہ تمہارا نیا مکان ہے۔ کل صبح سے تمہیں نئے کام پر جانا ہے۔ ہوش و حواس میں آؤ۔ کیا تم خود یہاں نہیں آئے تھے؟ تم نے خود یہ اطلاع نہیں دی تھی کہ تم اپنی بیوی کو بچوں کے

اُن کے والدین کے پاس چھوڑ آئے ہو۔"

"میں نے ۔ ؟" میں نے سر تھام کر خود سے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔ کسی اور نے نہیں تمہیں نے۔" اجنبی نے پورے وثوق سے کہا۔ "اور یہ رہا تمہارا اپائنٹمنٹ لیٹر۔ تمہارا تبادلہ اِس برانچ میں کر دیا گیا ہے۔ ترقی کے ساتھ۔ اور اب دو تین ماہ بعد تمہیں چھٹی دی جائے گی تاکہ تم جاکر اپنے بچوں کو یہاں لا سکو۔ فی الحال میں تمہارا کلیگ ہوں۔ تمہارے ساتھ تمہارے گھر میں رہتا ہوں اور میرا نام کمار ہے"

اُس نے اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی۔ ذرا سا جھکا اور مجھے اکیلا چھوڑ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

"عجب گورکھ دھندا ہے"، میں نے سوچا۔ آخر میں سب کچھ بھول کس طرح جا رہا ہوں۔ اپنا یہاں آنا۔ بیوی بچوں کو چھوڑ آنا، مگر اجنبیت کے باوجود سب کچھ اتنے خلوص سے کہا گیا تھا کہ میں نے مزید سوچنا ترک کر دیا اور فوراً اپنی بیوی کو خط لکھنے بیٹھ گیا۔

اگلی صبح میں نے سب سے پہلے خط پوسٹ کروایا۔ اور اپنے کلیگ کے ساتھ کام کرنے چلا گیا۔ یہاں سب نئے لوگ تھے۔ کوئی جانتا، پہچانتا نہ تھا۔ میں خاموش خاموش سا اپنا کام نپٹاتا رہا۔ مگر میرا جی بار بار چاہتا تھا کہ میں سب چھوڑ کر چھاڑ کر بھاگ جاؤں اور سیدھا اپنے گھر پہنچ کر دم لوں۔

کچھ دن یونہی گزر گئے۔ پھر ایک شام میرے ساتھی نے مجھ سے کہا۔ "چلو، تم کچھ نئے کپڑے خرید لو۔ کیونکہ تمہارا بکس کسی نے چرا لیا ہے اور اب جو کپڑے پہن رہے ہو، وہ دراصل تمہارے نہیں بلکہ ایک اور ساتھی کے ہیں جو کچھ دن کی رخصت پر گیا ہوا ہے، مگر اب جلد ہی آنے والا ہے۔"

واقعی کپڑے میرے نہ تھے مگر اور سب معموں کی طرح میں اُن کے بارے میں بھی استفسارات کرتے ہوئے ڈرتا تھا کہ پھر کچھ اَن دیکھے جوابات نہ مل جائیں۔ چنانچہ میں اپنے دوست کے ساتھ چلا گیا اور کچھ نئے کپڑے خرید لایا۔ مجھے اپنی بیوی کے جواب کا شدید انتظار تھا۔ مگر جواب اب تک نہ آیا تھا۔ جب میں متفکر اور متوحش ہونے لگا۔ تو میرے دوست نے بھانپ لیا اور بولا۔ "دراصل یہ ایک ضلع ہے اور یہاں ڈاک کا انتظام نہایت ناقص۔ ہے۔ میری بیوی کا جواب بھی ایک مہینے کے بعد آیا تھا جب میں نے اُسے پہلا خط لکھا تھا۔"

میں نے اپنے اجنبی دوست کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہاں ہر طرف خلوص ہی خلوص تھا۔ چنانچہ میں اپنے دل و دماغ پر پتھر رکھ کر خاموش ہو گیا۔ ایک ایک دن بدترین اور بے کیف انداز میں گزرتا رہا۔ جس نے میرا اندرونی خوف اور ظاہری خاموشی بے حد بڑھا دی۔ مگر کچھ پوچھنا بے فائدہ تھا۔ کیونکہ سب کچھ نہایت ڈرامائی انداز میں وقوع پذیر ہو رہا تھا اور ان حالات میں میرا خاموش اور متعجب رہنا ہی بہتر تھا بہ نسبت سوال و جواب یا بحث مباحثے کے۔ لہٰذا چند دن اور یونہی گزر گئے۔ میری بے چینی بڑھنے لگی، نہ جانے کچھ خوف ایسے کیوں ہوتے ہیں جو تحت الشعور سے کچھ اس طرح چمٹ کر رہ جاتے ہیں کہ پھر انسان لاکھ مسکرا کر ان کا خیر مقدم کرے، مگر وہ اُس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ میرا بھی کچھ یہی حال تھا۔ میرا اضطراب خود میری سمجھ سے باہر تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کچھ کہوں، کچھ پوچھوں، کچھ صحیح صحیح دریافت کروں، مگر کچھ بھی نہ کر سکا۔ حتیٰ کہ ایک دن میرے اجنبی دوست نے خود مجھ سے کہا۔

"کیا تم واقعی بہادر انسان ہو۔ ؟"

"کیوں نہیں۔" میں نے بے دلی سے جواب دیا۔

"کتنے بہادر ۔ ؟"

"جتنا ایک انسان ہو سکتا ہے۔"

"یعنی کیا بُری سے بُری خبر بھی صحیح الدماغی سے برداشت کر سکتے ہو تم۔ ؟"

"مگر کون سی بُری خبر۔ ؟" میں جلدی سے کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"بیٹھو بیٹھو۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "معلوم ہو گیا کہ تم قطعی بہادر نہیں ہو۔"

"خدا کے لئے مجھے نہ بہکاؤ، صاف صاف کہو۔ میں معمّوں سے عاجز آگیا ہوں۔" میں نے ملتجیانہ انداز میں درخواست کی۔

"سنو۔ فرض کرو کہ تمہیں یہ اطلاع ملے کہ تمہارے گھر کو آگ لگ گئی ہے تمہارا سب کچھ جل کر بھسم ہو چکا ہے تب۔ تب تم کیا کرو گے؟"

"مگر کس نے لگائی ہے میرے گھر کو آگ، میں تو کسی کا دشمن نہیں۔ کوئی میرا دشمن نہیں۔ پھر۔ ؟ ۔"

"پھر بھی اگر اتفاقاً آگ لگ گئی ہو تو۔ ؟" وہ میری بے قرار آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

"تو مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔" میں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کوئی آواز مجھ سے نہ جانے کیا کیا کہنے لگی کیا کیا کچھ۔ جیسے مجھے یکایک کچھ یاد آنے لگا۔

"اچھا تو اس دیو نے۔ اس عفریت نے۔ ؟؟" میں یکایک مٹھیاں کس کر چیخا۔

"کون سا دیو۔ کون سا عفریت۔ ؟؟" میرا دوست اچھل کر میرے نزدیک آگیا اور پھر دفعتاً مجھے سب کچھ یاد آگیا۔ میں نے اپنی کنپٹیاں تھام لیں اور عورتوں کی طرح سسک سسک کر رونے لگا۔ ہائے میری پیاری بیوی۔ میرے معصوم بچے۔ وہ سب لوگ جو میرے سامنے نوچے کھسوٹے گئے۔ جلائے گئے، قتل کئے گئے۔ آخر ہم سب کا قصور کیا تھا۔ کیا۔ ؟

اور ایک اجنبی مگر دوستانہ لمس نے آہستہ سے مجھے تھپتھپایا۔

"میرے دوست، میرے دوست، میں بھی اس دنیا میں اکیلا ہوں، مگر پھر بھی مرنا نہیں چاہتا۔ آؤ، ہم دونوں مل کر جینے کی کوشش کریں۔ کیونکہ اس عفریت نے میرا بھی سب کچھ نگل لیا ہے۔ میں بھی تمہاری طرح بچا کر یہاں لایا گیا ہوں۔ بڑے تک دھوکے میں رکھا گیا ہوں لیکن کوئی زندگی بھر دھوکہ کس طرح کھا سکتا ہے بھلا۔"

اور میں نے دیکھا کہ وہ بھی شدت سے آبدیدہ تھا۔ اس کی آواز اور اس کا لہجہ بھی لڑکھڑا گیا تھا اور اس کی سونی سونی برباد آنکھیں بھی بے مقصد خلاؤں میں تکنے لگی تھیں۔

میں نے یک لخت اس کا ہاتھ تھام لیا اور میری بھیگی آنکھوں اور کانپتے، کپکپاتے، پھٹتے دل کو بھی کچھ ڈھارس سی محسوس ہونے لگی۔

"مگر وہ کون تھا میرے دوست۔ ناحق اتنی جانیں اس بے دردی سے لینے والا، کیا وہ ملک الموت تھا۔ ؟"

"نہیں۔ اس سے بھی بے رحم اور بدتر ایک خونی۔ ایک قاتل۔ ایک آدم خور، جسے انسانی خون کا چسکا لگ چکا ہے۔ جسے بچوں کے کھلنڈرے پن۔ عورتوں کی عصمت، اور مردوں کی جی داری سے خدا واسطے کا بیر ہے جو انسان کو انسان کا دشمن اور دنیا کو ایک تباہ شدہ ویرانہ بنا دینا چاہتا ہے۔"

"مگر کیوں، کس لئے آخر۔ ؟"

"یہ سوال شاید اس کم بخت نے بھی کبھی اپنے آپ سے نہ پوچھا ہو گا۔ کیونکہ اس کے دماغ ہے ہی نہیں۔ دل ہے ہی نہیں، اس کے پاس عقل، محبت اور جذبۂ انسانیت ہے ہی نہیں۔"

"تو پھر اس کے پاس کیا ہے۔ ؟"

"صرف جسم۔ فولاد سے ترشا ہوا، اور ذہن۔ زنگ خوردہ۔ صرف بھوک پیاس جو انسانوں کی بھینٹ مانگتی ہے۔"

"تو سارے انسان مل کر خود اسے کیوں نہیں مار دیتے۔ اٹھو۔ تم اور میں ہی کافی ہیں۔" میں نے دیوانگی سے اپنے دوست کو تھام لیا۔ "چلو۔ آگے بڑھو۔"

میرا دوست آنسو پونچھ کر مسکرایا۔

"برسوں سے وہ زندہ ہے اور برسوں سے ہر اچھا انسان اسے مارنے، ختم کرنے، بھسم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر میرے دوست"

خون پیتے پیتے اور انسانی گوشت چباتے چباتے اب وہ ایک ایسا بھوت بن گیا ہے جو سب کو اپنی گرفت میں لیتا ہے، مگر خود کسی کی گرفت میں نہیں آتا۔ وہ بدمعاش، غنڈہ اور سازشی ہے۔ قتل و خون کا ماہر۔ اُس نے ہر نئی رات کے ساتھ اپنی نسل بڑھائی ہے، اپنی فوج پھیلائی ہے اور اب تو ایک شیطان نے ہزار ہا ہزار شیطان پیدا کر دیئے ہیں۔ اور دراصل کون انسان ہے اور کون شیطان۔ یہ تم اور میں بھی نہیں جان سکتے۔ نہیں پہچان اور بتا سکتے۔ لہٰذا ہم کس کس کو ڈھونڈتے پھریں گے۔ کس کس کو سمجھا کر یں گے، ماریں گے۔ اگر اس بھول میں ہم غلطی سے کسی انسان کو مار بیٹھے تو ۔ ۔ ؟"

اُس کی آنکھوں میں کوئی نادیدہ آگ سی سلگ گئی اور اُس تمام باطنی درد اس آگ کے لئے ایندھن کا کام کرنے لگا۔

"سنو۔" وہ دُکھ سے بولا۔ "میں نے اوروں کے ہاتھوں میں اپنی ماں کا برہنہ جسم دیکھا۔ مگر میں مر نہ سکا۔ میں نے اپنے بوڑھے باپ کے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھے۔ مگر میں اُنہیں بچا نہ سکا۔ میرے دونوں نوجوان بھائی ہتھیاروں سے گاجر مولی کی طرح چھیل دیئے گئے، چھید دیئے گئے۔ اُدھیڑ دیئے گئے، چیر دیئے گئے۔ میں اُن کی ہولناک دِل ہلا دینے والی دلخراش چیخیں سنتا رہا۔ مگر کچھ کر نہ سکا۔ میرا سب کچھ ختم ہو گیا۔ چھین لیا گیا۔ مٹا دیا گیا۔ مگر میں آج بھی زندہ ہوں۔ اپنی محبت، اپنا خاندان، اپنی پہچان کھو کر بھی اور نہ جانے کب تک اور زندہ رہوں گا۔ لوگ مجھے تندرست سمجھتے ہیں۔ لیکن میں تندرست نہیں ہوں۔ میں خود ہر انسان کے ٹکڑے اُڑا دینا چاہتا ہوں۔ میں خود خون پی پی کر، انسانی گوشت چبا چبا کر سب کو ہلاک کر دینا اور خود زندہ رہنا چاہتا ہوں مگر خود میری آواز مجھ سے یہ پوچھتی ہے کہ تم کون ہو۔ کون۔ کیا تم بخیب الطرفین انسان نہیں یا تم بھی اُسی شیطان کی اولاد ہو جس نے یہ تمام زہر پھیلایا۔ لوٹ مار مچائی، غارت گری پھیلائی۔ انسان پر انسان کے ظلم کو روا سمجھا اور اُن کے نت نئے ہولناک طریقے ایجاد اور باور کروائے۔ اس لئے میرے دوست، میں سب کچھ برداشت کر لیتا ہوں کیونکہ مجھے اپنا وطن عزیز ہے۔ اپنے بھائی بند، اپنے لوگ پسند۔ مجھے دِل سے اپنائیت عزیز۔ میں شیطان نہیں بن سکتا۔ قاتل، خونخوار، غدار نہیں بننا چاہتا۔ میں نے سسکیوں کو دُکھ کاٹے ہیں۔ مگر مجھے اپنے زخموں سے پیار ہے، کیونکہ یہ زخم مجھے یاد دلاتے ہیں کہ میں کہاں ہوں اور کیوں ہوں۔ میں کیا کر رہا ہوں۔ میں اُس درخت کی طرح ہوں جسے سَو بار کاٹا گیا۔ جس کی ہر ہر ڈال کو ایندھن بنا کر ہر بار آگ میں جھونک دیا گیا۔ مگر درخت نے پھر بھی ہمت نہیں ہاری۔ اُمید نہیں چھوڑی۔ مایوس نہیں ہوا۔ بلکہ پھر اُس نے ایک ایک اُمید سے سَو سَو ٹہنیاں پیدا کیں۔ ہزار ہزار پتے اُگائے۔ لاکھ لاکھ پھول کھلائے۔ ہمیشہ انسانیت سے سینچا جاتا اور بار آور کیا جاتا رہا اور جب تک میرے جیسا یا تمہارے جیسا ایک بھی انسان اس دنیا میں زندہ ہے یہ دنیا بھی زندہ رہے گی۔ مر نہ سکے گی۔ وہ بے شک اُس دیو اُس عفریت کو مارے بغیر چین نہ لے گی جس نے ہر طرف آگ اور خون کے بیج بوئے ہیں۔ زہر کے درخت اُگائے ہیں۔ موت کے تختے بچھائے ہیں۔ کیونکہ دیو سے لڑنے کے لئے، دیو اور عفریت کو پچھاڑنے کے لئے صرف عفریت ہی ضروری نہیں بلکہ ایک انسان۔ ہر وہ شخص بھی اُسے پچھاڑ اور دبوچ سکتا ہے جس نے زخم کا مزا چکھا ہے، جو اپنوں کے خون میں نہایا ہے۔ جس نے اپنوں کو جلتے، مٹتے، دفن ہوتے دیکھا ہے۔ تم کماتی ہو اور میں کماتا، لیکن اگر تم اور میں شیطان نہیں تو یقین رکھو کہ وہ دیو اور عفریت ضرور مارا جائے گا۔ ایک نہ ایک دن برباد و ہلاک ہوگا۔ ایک نہ ایک دن خود اپنے خون میں نہائے گا۔ لیکن۔ لیکن۔۔۔۔"

وہ جھجک کر رُک گیا۔

"تمہارا میرا مذہب الگ الگ ہے۔ تمہارے میرے طور طریقے جُدا جُدا، تمہارے میرے خدا مختلف، لیکن کیا تمہارے میرے وجود اور غرض و غایت ایک نہیں ۔ ؟"

"بکو مت۔" میں چلّایا۔ "میں اب اور تقریر سننا نہیں چاہتا۔ مجھے میری بیوی واپس دلا دو۔ میرے بچے لوٹا دو۔ ورنہ میں تمہارا سر توڑ کے رکھ دوں گا۔ کھوپڑی پھوڑ کے چھوڑوں گا۔ تمہارے پرخچے، رتی ریزے اُڑا کے رہوں گا۔" میں اُس کی طرف لپکا۔ خدا کی پناہ۔ ایک ہندو، ہم مسلمان کی ذات اور خدا گئے اور وہ بھی یوں کھلے بندوں، سرکشی سے۔ دفعتہً مجھے اپنے آپ پر اُسی دیو،

شاعرِ بمبئی

اُس عفریت کا گمان ہونے لگا۔ میں ہر کس و ناکس کو جھنجھوڑ دینے کے جذبے سے بے قابو، بے اختیار ہونے لگا۔ میں نے دوڑ کر ایک بڑا پتھر اٹھا لیا۔ اور بولا۔

"اب تم پچھلے گئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔" اُس نے گھبرا کر میری طرف دیکھا۔ پھر پتھر کی طرف۔ اور بولا۔ "میں زندہ نہیں ہوں، میں کب کا مر چکا۔ ٹھہرو، اب میری لاش کو اور مت مارو۔ اور مت بگاڑو۔ بلکہ اُس کی کھوج لگاؤ، جو زندہ بھی ہے اور شیطان بھی، پھر تم اور میں مل کر اُس سے نپٹ جائیں گے اور اُس سے اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں، بیوی بچوں اور ہم وطنوں کا پتہ پوچھیں گے۔ شاید اب ہم اُن تک کبھی نہ پہنچ سکیں گے۔ مگر ایسے شیطانوں کو کھوج کر ہم بیویوں اور بچوں اور بہن بھائیوں اور ماں باپ اور ہم وطنوں عزیزوں کو تو کٹنے، مرنے، جلنے سے بچا ہی لیں گے۔ کیونکہ یہ سب دراصل نہ ہندو ہوتے ہیں، نہ مسلمان، بلکہ صرف انسان اور تارے۔ تم اور میں اِس بات کو اب بھی سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن شاید وہ عفریت وہ دیو نہیں سمجھ سکتا جس کا نام فساد ہے، جو نہ ہندو ذہن رکھتا ہے نہ مسلمان ذہن۔ بلکہ جو صرف شیطانی ذہن رکھتا ہے اور جب تک ایک بھی شیطان زندہ ہے دنیا میں امن و سکون ناممکن ہے۔"

میرا ذہن چکرا گیا۔ میرا بدن لڑکھڑا گیا۔ پتھر میرے ارادے کی گرفت سے چھوٹ کر دور جا گرا۔ پسینہ میرے رُوئیں روئیں سے پھوٹ بہا۔ نہیں کسی انسان کو نہ مار۔ ہندو اور مسلمان کو نہ مار، مگر۔ مگر تجھے اُس شیطان کو کبھی نہیں چھوڑنا چاہئے۔ جس کی غذا انسان ہیں، جو اوروں کے عزیز و اقربا کو چباتا اور کھاتا ہے، اوروں کے دل جلاتا ہے اوروں کے گھر پھونک کر تماشا دیکھتا ہے۔ اپنی کمزوری بھول جا، خود پر قابو پا۔ اپنی طاقت کو سمیٹ اور اُس شیطان کی کھوج میں نکل کھڑا ہو جس نے تیرے بچوں کو ذبح کیا ہے۔ تیری بیوی کی عصمت لوٹی کی ہے۔ تجھے دیمک کی طرح چاٹ گیا ہے۔

"یہ کیسی آواز ہے، کیسی آواز ہے" میں نے چلا کر پوچھا۔

"یہ کون ہے جو بول رہا ہے۔ سچ سچ بول رہا ہے۔"

اور بوکھلائے ہوئے میرے دوست کمار نے مسکراہٹ سے مصافحہ کرکے ذرا تلخ، نرمی اور کسی قدر چبھتی ہوئی آہستگی سے کہا۔

"یہ میں ہوں جو تمہارے کانوں میں تمہارے دل و دماغ میں بول رہا ہوں۔ ایک انسان جسے خود ہر شیطان کی تلاش ہے۔ ہر شیطان کی موت کا انتظار۔"

اور نہ جانے مجھے کیا ہوا کہ میں فوراً اُس اجنبی کی سمت بڑھ گیا۔ لپک پڑا، اور اُس سے بغلگیر ہو گیا۔ میں نے اُسے [illegible]

میں نے جان لیا تھا کہ آنسو، زخم، درد، عزت و ناموس، انسانیت اور موت کا کوئی مذہب نہیں ہوا کرتا۔

"آؤ ہم دونوں اِس تلاش میں نکل پڑیں۔" میں نے کہا اور مجھے محسوس ہوا کہ ایک انسان کا، ایک دوست کا، ایک ہمدرد کا۔ ہاتھ پکڑ لینے سے میں اپنا ہر غم بھول گیا ہوں۔ میں زندگی کے قابل ہو گیا ہوں۔ میرے تمام وجود میں ایک مضبوطی، میری ہر سوچ میں ایک استحکام، میری ہر حرکت میں ایک یقین۔ میری ہر سانس میں ایک نیا خلوص اور پیغام پیدا ہو گیا ہے۔

اور خواہشِ حیات سے سرشار ہم دونوں کے وجود پھیل گئے۔ بڑھ بڑھ کر تمام وسعتوں پر قبضہ جمانے لگے۔

ہمارا نام انسان ہے۔ ہمارا مذہب انسانیت۔!!

اور میں نے دیکھا کہ میرا اجنبی دوست بھی مسکرا رہا تھا۔ بالکل ویسی ہی مسکراہٹ جیسی شاید خود خدا کے ہونٹوں پر بھی موجود ہو گی، جب اُس نے ہمیں دیکھ لیا ہو گا۔

عشرت ظفر

اے تیرہ ذہن انسانو!

دیارِ وقت کے اے تیرہ ذہن انسانو!
مجھے حقیر نہ سمجھو کہ میری فکر کا رنگ
فصیلِ وادیٔ احساس کے چراغوں کو
ازل سے بخش رہا ہے حیاتِ نو کی اُمنگ
مرا قلم ہے وہ تیشہ کہ جس کے سینے پر
لکھی ہے خون سے تاریخِ عہدِ شیشہ و سنگ
سُنا رہا ہے وہ نغمے مرا ربابِ سخن
کہ جن کی لے میں ہے سازِ حیات کا آہنگ
جبینِ لفظ و معانی کے سُرخ قشقوں میں
لپک رہی ہے مرے نشۂ جنوں کی ترنگ
بلیں گے میرے سُرودِ نوا سے ہم آغوش
نشاط خانۂ عہدِ خرد کے بربط و چنگ
طلسمِ مہر و مہ و کہکشاں کی سرحد سے
گزر چکے ہیں مری چشمِ آرزو کے خدنگ
نہیں ہے بازیٔ طفلاں سے کم مرے نزدیک
نگار خانۂ بہزاد و مانیؔ و ارژنگ

ہے سر بسجدہ مری خامشی کے صحرا میں
فسونِ نغمۂ تیغ و سنان و تیر و تفنگ
تراشتا ہے مرا ذہن وہ حسین اجسام
کہ جن کے سامنے تخئیلِ آذری بھی ہے دنگ
بجھا سکا نہ میں زخموں کی مشعلیں اب تک
کہ لگ نہ جائے کہیں نورِ آفتاب میں زنگ
ہوئے کمند فگن لاکھ انقلاب مگر
بدل سکا نہ مرے حوصلوں کا کوئی بھی ڈھنگ
مرے بلورِ عزائم کی شوخ دیواریں
ہمیشہ کرتی رہیں سنگِ حادثات سے جنگ
وہ قافلے مرے پرچم تلے ہیں خیمہ زن
کہ جن کے واسطے صحرائے کائنات ہے تنگ

سیاہ رات میں اِک نور کی لکیر ہوں میں
طلوعِ آئینۂ صبح کا بشیر ہوں میں

مقالہ

محمد ایوب واقف

اُردو کی آزاد نظم

تحریکیں کسی طرح کی بھی ہوں اور تجربے کسی بھی نوعیت کے۔ یہ زندگی کے ہر دور میں وقوع پذیر ہوتے رہے ہیں۔ اِن تحریکات و تجربات کی موافقت اور مخالفت میں آوازیں بھی بلند ہوتی ہیں۔ لیکن جن تحریکوں اور تجربوں میں بڑھنے اور ترقی کرنے کی صلاحیتیں ہوتی ہیں وہ بڑی سُرعت سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ کامیابی اور کامرانی اُن کے قدم چومتی ہے۔ یورپ کی بعض تحریکوں کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ مشہور اطالوی شاعر میرنیٹی (MERINETTE) کی فنونِ لطیفہ (FUTURISM) کی تحریک، بلجیم کے مصوّروں کی مابعد اثریت (POST IMPRISSIONISM) کی تحریک اور فرانسیسی تمثیل نگاروں کی اِشاریت (SYMBOLISM) مہندسانہ نقاشی (CUBUISM) کی تحریکیں وغیرہ۔ اطالوی شاعر میرنیٹی (MERINETTE) نے شاعری میں جدّت پسندی (MODERNISM) کی تحریک چلائی اور اپنی نظموں میں عام نہج سے ہٹ کر خیالات و افکار کے نئے پیکر (IMAGE) تراشے تو ابتدا میں وہاں کے سخن شناسوں اور زبان دانوں نے اُس کا مذاق اُڑایا۔ لیکن شاعری میں اُس کی جدّت طرازیوں نے جو انقلاب برپا کیا، اُس سے نہ صرف وہاں کے ادیب و شاعر ہی متاثر ہوئے بلکہ دنیا کی دیگر زبانوں کے شُعراء و اُدباء نے خاصی دلچسپی لی۔ ہندوستانی شاعری (اُردو) سے وابستہ مختلف قسم کی تحریکات ہمارے سامنے ہیں۔ مولانا الطاف حسین حالؔی کی نظر میں غزل کی تنگنائے کافی نہ تھی۔ اِس لئے کہ اِس میں صرف قلبی واردات و کیفیات اور سوز و گداز کی ترجمانی ہوتی تھی اور حالؔی مرحوم کی نظر میں یہ امر اُس وقت کے تقاضوں کے خلاف تھا۔ اِس لئے اُنہوں نے اِس صنف میں کچھ اصلاح کرنا چاہی۔ اُنہوں نے غزل کو حیاتِ اِنسانی کے داخلی و خارجی تمام پہلوؤں کا آئینہ بنانے کی مہم شروع کی تو اُن کو بڑی دشواریاں پیش آئیں۔ حالؔی مرحوم کی موافقت اور مخالفت میں دو زبردست محاذ قائم ہوگئے۔ مخالفین نے اُن پر غزل کُشی کا اِلزام عائد کیا۔ لیکن چونکہ حالؔی کی آواز رفتارِ زمانہ کے عین مطابق تھی۔ اِس لئے بہت جلد وہ بہتوں کی آواز بن گئی اور مخالفین نے بھی مقتضائے وقت کو پیشِ نظر رکھ کر سرِ تسلیم خم کر لیا۔ غزل کی دُنیا میں بہت بڑا اِنقلاب رُونما ہوا۔ شُعرائے وقت نے محبوب کی نرگسی آنکھوں اور ناگن جیسی چوٹیوں پر جمی ہوئی نظروں کو سماجی اور اِنسانی مسائل کی طرف پھیر دیا اور یہ حالؔی مرحوم ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج غزل سے ہم وہ تمام کام لے رہے ہیں جس کے لئے ہم نے صرف نظم ہی کو مخصوص کر رکھا تھا۔ اقبالؔ۔ چکبستؔ، حسرتؔ، سیمابؔ۔ فانیؔ، اصغرؔ، اقبال سہیلؔ۔ یاسؔ یگانہ۔ جگرؔ۔ مجازؔ۔ فیضؔ۔ فراقؔ، رَوِش۔ جذبیؔ۔ ندیم قاسمی اور مجروحؔ وغیرہ کی غزلیں اِس کا زندہ و پائندہ ثبوت ہیں۔ حالؔی کی اِصلاحی تحریک کے بعد اُردو شاعری نے ایک اور بڑی تحریک کو جنم دیا۔ جسے ہم اُردو کی ترقی پسند تحریک کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اگرچہ اِس تحریک کے لئے فضا بہت پہلے سے ہموار تھی۔ لیکن ۱۹۳۵ء سے اِس نے باقاعدہ ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ اِس تحریک کا پہلا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا، اور جب اِس کا منشور لوگوں کے سامنے آیا تو بہت سے ادیبوں اور شاعروں نے

خفگی کا اظہار کیا۔ لیکن یہ امر حقیقت پر مبنی ہے کہ اُردو ادب میں حقیقت بیانی، سماجی اور تہذیبی مسائل کی ترجمانی ترقی پسند تحریک ہی کے توسط سے شروع ہوئی ورنہ اس سے قبل کی بیشتر شاعری پر عشق کا جنون طاری تھا۔ شعرائے اُردو اپنے گرد و پیش کے حالات سے یکسر بے خبر اور تصورِ جاناں میں مُنہمک و مُستغرق نظر آتے ہیں۔

مذکورہ بالا تحریکوں ہی سے ملتی جلتی اُردو کی آزاد نظم کی تحریک بھی ہے جو گزشتہ دس پندرہ سال سے ہماری تمامتر توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے اُردو کی آزاد نظم ایک تجربہ بھی ہے اور ایک منظم تحریک بھی۔ کچھ لوگ آزاد نظم کے مدّاح و معترف ہیں اور کچھ اسے ناپسند کرتے ہیں۔ آزاد نظم کے معترضین نے یہاں تک کہد یا کہ یہ لغو اور مُہمل (NON SENSICAL) چیز ہے۔ یہ ہماری قدیم اور باوقار روایتی شاعری کی پیشانی پر بدنما داغ ہے جسے اگر نہ دھویا گیا تو اردو شاعری پر اس کے اثرات بڑے ہی مُہلک ہوں گے۔ اس لئے کہ آزاد نظم شعر و ادب میں تحریف کا درجہ رکھتی ہے۔ اس میں الفاظ مہمل و مبہم ہوتے ہیں۔ اس میں اُردو شاعری کے بندھے ٹکے اسالیب سے انحراف کیا جاتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اُردو کی آزاد نظم کو ہدفِ ملامت بنائے جانے کے اسباب پر غور کیا جائے اور بالتفصیل اِن کا جائزہ لیا جائے تو یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اعتراضات کچھ کمزور بنیادوں پر قائم ہیں۔ فرانس میں بادلیر (BAUDELAIRE) سے قبل کی شاعری پر جو اعتراضات کئے گئے تھے وہ بھی کچھ اسی نوعیت کے تھے۔ فرانسیسی شاعر آرتھر رمبو (ARTHER RIMBAU) نے اس وقت کی شاعری پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا۔

"*Before Baudelaire there was no poetry at all, there was only a sord of rhymed prose., the bovine glory of innumerable generatous of idiots.*"

اِس طرح کی سخت تنقید اور مخالفین کے فلک شگاف نعروں اور آوازوں کو ایک لمحے کے لئے بالائے طاق رکھ کر اگر ہم دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ یہ شاعری جسے آرتھر رمبو نے اچھے خاصے احمقوں کا کارنامہ بتایا ہے بعد میں کتنی مقبول ہوئی۔ آنے والی نسلوں نے نہ صرف یہ کہ اُس عہد کی شاعری سے بھرپور استفادہ کیا۔ بلکہ اپنے نظامِ فکر کی بنیاد رکھنے میں اِس سے پوری مدد لی۔ دراصل بات یہ ہے کہ پُرانی چیزوں کے مقابلے میں لوگ نئی چیزوں سے ہمیشہ بدکتے ہیں۔ یہ اِنسانی فطرت ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم پُرانی چیزوں کی وضع قطع سے اِتنا مانوس ہو جاتے ہیں کہ اُس کے عیوب بھی ہمیں اوصاف معلوم ہوتے ہیں۔ اور نئی چیز چاہے اپنے دامن میں کتنا ہی جاذبِ توجہ مواد کیوں نہ رکھتی ہو، اِس کے حُسن و قبح سے ہم جلدی سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ لیکن جہاں تنقیدی شعور کو ایک ایسے آلے کی حیثیت سے استعمال کیا جائے گا جو کھرے میں سے کھوٹے کو اور کھوٹے میں سے کھرے کو الگ کر دے، وہاں قدیم و جدید انواع و اقسام سے زیادہ چیز کی ماہیت و اصلیت سامنے آئے گی اور کسی چیز کی اصلیت کو سامنے لانا ہی تنقید کا اصل جوہر ہے۔ لیکن افسوس کہ ہمارے بعض تنقید نگار دانستہ یا دانستہ طور پر ایسی باتوں کو معرضِ بحث میں لانے سے گریز کرتے ہیں۔ یومِ حالی کے صدارتی خطبہ میں آل احمد سرور نے شاعری میں حالی کا درجہ متعین کرتے ہوئے کہا تھا کہ

"حالی کی شاعری ایک خاموش بغاوت ہے اور ایک مکمل بغاوت ہے، اُنہوں نے انقلاب کا کہیں نام نہیں لیا۔ مگر ایک بہت بڑا ذہنی انقلاب برپا کر دیا۔ اُنہوں نے آج کل کے نادانوں کی طرح قدیم زبان کو نہیں چھوڑا۔ اِس میں بول چال کا اضافہ کر کے اِسے اپنا لیا۔"

آل احمد سرور نے حالی مرحوم کو جو عظمت بخشی وہ غلط نہیں، حالی کی شاعری یقیناً مدح و ستائش کے قابل ہے۔ لیکن نئی نسل کے فنکاروں کو نادان کہنا انصاف پسندی نہیں۔ حالات اِتنی تیزی سے بدل رہے ہیں کہ ہم اِس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ کل کے

شغلِ انسانی کے جو قانون بنے آج کی زندگی کے لئے وہ بے معنی ثابت ہو رہے ہیں۔ یہ بات ہماری روزانہ زندگی کے بدلتے ہوئے طور طریق سے اَظہر مِنَ الشمس ہے۔ ایسی حالت میں ہم ایک ہی پگڈنڈی پر چلتے رہنے کے عادی کیسے ہو سکتے ہیں۔ ہمیشہ ایک ذائقہ کی چیزوں کے شیدا کب تک رہ سکتے ہیں۔ انسان فطرۃً تنوّع اور جدت پسند ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش ہمیشہ اس کا مقصد و مسلک رہا ہے اور پھر انسانی فکر و احساس اپنے گرد و پیش کے ماحول سے بے نیاز بھی تو نہیں رہ سکتا۔ مولانا حالی نے بھی تو کہا تھا۔

" چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی "

ان حقائق کو پیشِ نظر رکھ کر ہمیں وقت کی آواز پر لبیک کہنا چاہیئے۔ زمانے کی ہوا ہمارے رُخ کو جس سمت بھی موڑ رہی ہے ہمیں فکر و شعور کے سہارے اُس طرف جانا چاہیئے، ورنہ زندگی کی بھاگ دوڑ میں ہم بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ اگر ہمارے بزرگوں سے کچھ کوتاہیاں ہوئی ہیں تو کم از کم اس نئے دَور میں ہمیں ان کی تلافی کی کوشش کرنی چاہیئے۔ سر سیّد احمد خاں نے مسلمانوں کے قوت و اقتدار کے اضمحلال سے متاثر ہو کر مغربی علوم و فنون اور تہذیب و معاشرت سے رشتہ اُستوار کرنے کی تلقین کی اور حکومتِ وقت کی ساتھ دستِ مصالحت بڑھانے کی تحریک چلائی تو اُس وقت کے مذہبی ٹھیکیداروں نے اسے مسلمان قوم کے لئے باعثِ ذلت سمجھا۔ اب ہم محسوس کر رہے ہیں کہ یہ بات باعثِ ذلت نہیں بلکہ باعثِ برکت ہوئی۔ اگر سب نے سر سیّد کی تحریک کو تقویت بخشی ہوتی، افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ سر سیّد کی اصلاحی تحریک سے انحراف ہی کا نتیجہ ہے کہ آج مسلمان مادّی و علمی اکتشافات میں دوسروں سے پیچھے رہ گیا ہے۔ کم از کم اس نئے دَور میں ہمیں اپنا ہر قدم بہت سوچ سمجھ کر رکھنا چاہیئے۔ اردو زبان کا مسئلہ ہو، آزاد نظم کی ہیئت کی بات ہو یا تہذیب و ثقافت کا معاملہ ہمیں محتاط ہو کر سوچنے اور کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اختلافات بُری چیز نہیں۔ لیکن کسی بھی موضوع کے تمام گوشوں کو سامنے رکھ کر اس کے بارے میں اچھی یا بُری رائیں صادر کرنا چاہیئے۔

آزاد نظم کی مخالفت کرنے والے لوگوں کو آزاد نظم سے اتنا بیر کن وجوہ کی بنا پر ہے؟ کیا انہوں نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا کی کہ آزاد نظم کیسے اور کن حالات کے تحت وجود میں آئی؟ پابند نظموں کے مقابلے میں ہمارے نوجوان شعراء آزاد نظم کو کیوں ذریعۂ اظہار بناتے ہیں؟ ہمارے موجودہ سماجی نظام کے مد و جزر کو آزاد نظم روایتی شاعری کے مقابلے میں کتنے واضح، عیاں اور دلکش انداز میں الفاظ کی شکل دے سکتی ہے؟ یہ ایسی بنیادی باتیں ہیں جن پر غور کرنا نہایت ضروری ہے۔ انگلستان میں جدید شاعری کا آغاز پہلی جنگِ عظیم کے دوران ہوا فرانس میں ویرلیبر (آزاد نظم) اور انگلستان میں فری ورس (آزاد نظم) جیسی اصنافِ شاعری کا پرچار بڑی شد و مد سے ہو رہا تھا۔ فرانسیسی اور انگریزی شعراء اس میں خاصی دلچسپی لے رہے تھے۔ یہی زمانہ مغرب میں سرمایہ داری کے عروج کا بھی زمانہ ہے سرمایہ دارانہ نظام فسطائیت سے کھلے بندوں ہاتھ ملا رہا تھا اور رُوس میں سرمایہ داروں اور مزدوروں کی بھیانک جنگ میں مزدوروں کی تاریخی فتح بھی ہو چکی تھی۔ رُوس میں مزدوروں کی اس عظیم الشان فتح کا اثر ایشیا کے غلام ملکوں پر بڑا شدید ہوا۔ ہماری غلامانہ ذہنیت میں بھی آزادی کی ایک نئی کرن پھوٹ پڑی۔ ہمارے شاعر اس عظیم انقلاب سے بے بہرہ نہ رہ سکے۔ انہوں نے بھی اپنی پست ہمتی اور ملکی بدحالی سے چھٹنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ پہلی بار قومی و مذہبی، اقتصادی و سیاسی، وطنی و بین الاقوامی، جنسی و نفسیاتی تمام مسائل پر بیک وقت دلیرانہ نگاہ پڑی تھی۔ ہمارے شاعروں کو ان پیچیدہ مسائل کے فوری حل تلاش کرنے تھے۔ برق رفتار زندگی کے زیر و بم کا احاطہ کرنا تھا۔ ایسی صورت میں پابند روایتی شاعری کے بندھے ٹکے اُصولوں سے انحراف کرنے کا ان کا عمل کسی طرح غلط نہیں تھا۔ اس لئے کہ ردیف و قافیہ کا التزام، بحور کی بے کیف روایت، نئے زمانے کے مقتضا اور مقاصد کا ساتھ دینے سے قاصر تھی۔ اس کے مقابلے میں آزاد نظم جس میں ردیف قافیہ اور وزن کی کوئی بندش نہیں ہوتی، اس مقصد میں کامیاب ہو سکتی تھی۔ اس لئے کہ اس میں شاعر وزن اور قافیہ کی پابندیوں سے آزاد ہو کر صرف مواد اور اس کی ہیئت پر غور کرتا ہے۔ جس کا خوشگوار اثر یہ ہوا کہ خیالات میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہو

گئی۔ ن۔م راشد قائد کی حیثیت سے سامنے آئے، اُنہوں نے انگلستان کی جدید شاعری کا عمیق مطالعہ کیا اور اس سے متاثر ہو کر آزاد نظمیں لکھنا شروع کیں۔ ن۔م راشد کی تحریک پر اُن کے دوسرے معاصرین نے لبیک کہا۔ میراجی اس سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اُنہوں نے ن۔م راشد کی اس تحریک کو اپنی گراں قدر آزاد نظموں سے تقویت پہنچائی۔ میراجی کی آزاد نظموں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اشارے اور کنائے میں بڑے پتے کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ اپنی نظموں میں اشاریت کی داغ بیل اُنہوں نے مغرب کی اشاریت سے متاثر ہو کر ڈالی۔ اس لئے کہ فرانس میں بودلیر، ومیرلن اور ملارمے وغیرہ نے اشاریت (Symbolism) کے تجربے میں خاصی کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اُردو کی آزاد نظم کے ان دو عظیم محسنین کی تخلیقات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ایک بات اور واضح ہو گی اور وہ یہ کہ اگرچہ ان کی ذہنی نشوونما میں سگمنڈ فرائڈ، اشپنگالے، والٹ وٹمن، ڈی ایچ لارنس وغیرہ مغربی فنکاروں کے فکری شعور نے خاصہ حصّہ لیا ہے، مگر ن۔م راشد اور میراجی نے اپنی شاعری میں جو ماحول پیدا کیا، وہ مغربی نہیں خالص ہندستانی ہے۔ اُنہوں نے اُردو شاعری کی کلاسیکی صنعت گری اور فارسی شاعری کی پُرجلال ترکیبوں سے انحراف کیا۔ اور نئی نئی ترکیبیں ایجاد کیں۔ لیکن اس کا اثر بے سود اور بے ہنگم نہیں بلکہ اور بھی خوشگوار رہا۔ اس لئے کہ شاعری قدرتی زبان سے اور قریب ہو گئی۔ اس پر آورد کا نہیں آمد کا گمان ہوتا ہے۔ اُردو شاعری میں یہ گراں قدر اضافہ آزاد نظم نے کیا ہے۔ ۱۹۱۸ء اور ۱۹۳۰ء کے آس پاس کے زمانے میں وجود پانے والی یہ نئی نویلی صنف اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتی ہوئی جب ۱۹۳۶ء تک پہنچا تو اس کا رجحان عام ہو گیا۔ اس کی کامیابی کو دیکھ کر نوجوان شاعروں کی ایک بڑی تعداد اس طرف متوجہ ہو گئی۔ ان شعراء کے نمائندہ شاعر علی سردار جعفری تھے۔ ۱۹۳۶ء کے بعد بھی آزاد نظم کے اچھے شاعر افقِ شاعری پر چمکے۔ مختار صدیقی۔ منیب الرحمٰن۔ مخدوم محی الدین، خلیل الرحمٰن اعظمی۔ سلام مچھلی شہری۔ مخمور جالندھری۔ بلراج کومل۔ ظہیر کاشمیری اور دوسرے بہت سے شعراء نے آزاد نظمیں لکھیں۔ فیض احمد فیض اور اختر الایمان نے اگرچہ زیادہ تعداد میں آزاد نظمیں نہیں لکھیں۔ لیکن جو بھی لکھی ہیں وہ نمائندہ نظمیں ہیں اور ان سے آزاد نظم کی تحریک کو پُرزور تائید نصیب ہوئی۔

مذکورہ بالا سطور میں یہ عرض کیا گیا ہے کہ آزاد نظم موضوع اور فنی ضروریات کے اعتبار سے اُردو کی پابند نظموں کے مقابلے میں موجودہ دور میں ہر لحاظ سے قابلِ قبول ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے جدید شعراء نے جو آزاد نظمیں قلم بند کی ہیں اُن میں مُلکی و قومی اور تہذیبی و ثقافتی معاملات و مسائل کی ترجمانی کس حد تک ہوئی ہے۔ آزاد نظم نے موجودہ سماجی اور انسانی مسائل کے نشیب و فراز اور جدوجہد کو اپنے اندر جس خوبصورتی سے سمویا ہے اور جس فراخ دلی سے بکھرے ہوئے سماجی عناصر کو اپنے دامن میں سمیٹا ہے یقیناً قابلِ تحسین ہے۔ بقول عبادت بریلوی "آزاد نظم کے یہ جوہر پابند نظموں میں بہت کم کھلے ہیں۔" شاعروں نے آزاد نظم کے ذریعہ سماجی تجدید و اصلاح (SOCIAL REFORMATION) کا کام بڑی مستقل مزاجی سے انجام دیا۔ ان شاعروں کے سامنے استخلاصِ قوم وطن کے ساتھ ساتھ عالمگیر انسانی اُخوت و محبت کی تشکیل و اشاعت کی نیک خواہشات بھی رہی ہیں۔ اُنہوں نے اُردو دنیا کے سامنے انسان اور انسانیت کا نیا باب کھولا ہے۔ فکر و خیال کی ایک حسین و جمیل دنیا کی تعمیر کی ہے جہاں خدا کی مخلوق میں کوئی نسلی و جغرافیائی امتیاز نہیں۔ یہ باتیں ہمیں اس دور کی پابند نظموں میں بھی ملتی ہیں لیکن آزاد نظموں میں یہ امور بھی موثر انداز میں بیان ہوئی ہیں۔ ایک مختصر مضمون میں تمام آزاد نظم نگار شعراء کے کلام سے اس کی مثالیں فراہم نہیں کی جا سکتیں۔ البتّہ چند نمائندہ شاعروں کی تخلیقات کے کچھ بند ملاحظہ فرمائیے جن سے مذکورہ بالا خیالات کی تائید ہو سکتی ہے۔

اسی مینار کو دیکھ
صبح کے نور سے شاداب سہی
اسی مینار کے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے

اپنے بے کار خدا کے مانند
اُونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں
ایک اِفلاس کا مارا ہوا مُلّائے حزیں
ایک عفریت ــــ اُداس
تین سو سال کی ذلّت کا نشاں
ایسی ذلّت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی

(دریچے کے قریب)

اُوپر کے بند میں ن، م راشد نے اپنی خواب گاہ کے دریچے سے اپنی محبوبہ کی توجّہ ــــــــ سامنے کی ایک مسجد کے بلند وبالا مینار کی طرف منعطف کر کے ارضِ مشرق کی پامالی۔ ذلّت، بھوک اور پیاس میں ڈوبی ہوئی دھرتی کا کتنا دردناک اِظہار کیا ہے اور مشرق کے فرسودہ نظامِ زندگی کا کتنا اچھا تجزیہ کیا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ شاعر کا تخیّل سطحی اور طرزِ بیان موہوم ہے۔

پھر

بس دیکھا اور پھر بھول گئے
جب حُسن نِگاہوں میں آیا
من ساگر میں طوفان اُٹھا
طوفان کو چنچل دیکھ ڈری۔ آکاش کی گنگا دودھ بھری
اور چاند چھپا تارے سوئے۔ طوفان مٹا ہر بات گئی
ہر منظر، ہر انسان کی دیا اور میٹھا جادو عورت کا
اک پل کو ہمارے بس میں ہے۔ پل بیتا سب مٹ جائے گا۔
اِس ایک جھلک کو چنچلتی نظر سے دیکھ کے جی بھر لینے دو
تم اِس کو ہوس کیوں کہتے ہو...... ؟
کیا داد جو اک لمحے کی ہو وہ داد نہیں کہلائے گی۔

(چل چلاؤ)

اور

یہ خاک وہ خاک ہے کہ جس نے
سنہرے گیہوں کے موتیوں کو جنم دیا ہے۔
یہ خاک اِتنی قدیم جتنی قدیم اِنساں کی داستانیں
عظیم اِتنی عظیم جتنی ہمالیہ کی بلندیاں ہیں
حسین اِتنی حسین جتنی حسین اجنتا کی اپسرائیں
یہ اپنی فیاضیوں میں دریائے نیل گنگا سے کم نہیں ہیں
یہ گود بچوں سے اور پھولوں سے اور پھلوں سے بھری ہوئی ہے

(ایشیا جاگ اُٹھا)

اِسی طرح۔

بچے ماؤں کی گودوں میں سہمے ہوئے
عصمتیں سر برہنہ پریشان ہیں۔

شاعر لکھنوی

ہر طرف شورِ آہ و بکا ہے
اور میں اِس تباہی کے طوفان میں
آگ اور خون کے ہیجان میں
سرنگوں اور شکستہ مکانوں کے ملبے سے پُر راستوں پر
اپنے نغموں کی جھولی پسارے، دربدر پھر رہا ہوں
مجھ کو امن اور تہذیب کی بھیک دو
میرے گیتوں کی لَے، میرا سُر، میری نَے
میرے مجروح ہونٹوں کو پھر سونپ دو
(آج)

اُوپر میں نے ن، م راشد، میرا جی، سردار جعفری اور ساحر لدھیانوی کی آزاد نظموں سے کچھ بند پیش کئے۔ مضمون کی طوالت کے خوف سے دوسرے بہت سے اچھے آزاد نظم نگار شاعروں کے یہاں سے مثالیں نہ دے سکا۔ لیکن اِن چند نظموں میں آزاد نظم کے عمدہ اسلوبِ بیان، نفسیاتی تحلیل، جذباتی تسلسل، بلند خیالی، سیاسی و سماجی مسائل اور انسانیت دوست عناصر کی بھرپور ترجمانی ملتی ہے۔ آزاد نظم کی یہی خصوصیات اُس کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کی روشن مثال ہیں اور یہی اُس کی بقا و تحفظ کی ضامن۔ جہاں تک آزاد نظم کے مستقبل کا تعلق ہے یہ تاریک نہیں بلکہ روشن ہے۔ ہم ن، م راشد، میرا جی، تصدق حسین خالد، سردار جعفری اور ایسی قبیل کے دوسرے شعراء کو بلند و بالا مقام دے چکے ہیں۔ بلاشبہ یہ شعراء ہماری ادبی تاریخ کا اٹوٹ حصہ ہیں۔ یہ اپنے زندۂ جاوید کارناموں سے ادب کے ہر دور میں زندہ رہیں گے۔ اِن کے نام آزاد نظم کی بقا اور اس کی لافانی مقبولیت کی ضمانت ہیں۔ لیکن اِس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ صرف یہی شعراء اس صنف کو زندہ رکھ سکیں گے۔ ہمیں جدید نسل اور اس کے بعد آنے والی نسل سے دوسرے راشد، میرا جی، سردار جعفری حاصل کرنے ہیں۔

آج کل ہندوستان اور پاکستان میں آزاد نظم نگار شاعروں کا جمِ غفیر ہے۔ لیکن اِن نوجوان شعراء میں بیشتر ایسے ہیں جو اپنی کوئی راہ متعین نہیں کر سکے ہیں۔ حال ہی میں جدید شعراء کے کلام کا انتخاب "نئے نام" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اِس کے مرتب شمس الرحمٰن فاروقی نے نوجوان شعراء کو ادبی دنیا سے روشناس کرا کے ایک اہم ادبی فریضہ انجام دیا ہے۔ نئے شاعروں اور ادیبوں کی ہمت افزائی اور تحسین کی یقیناً ضرورت ہے۔ لیکن شعراء کے انتخاب میں فاضل مرتب نے دُور اندیشی سے کام نہیں لیا۔ نئے نام میں ایسے کتنے ہی شاعروں کو شامل کر لیا گیا ہے، جن کے کلام میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جسے کسی سنجیدہ غور و فکر کا نتیجہ کہا جا سکے۔ اِن شاعروں کو شاعری کے رموز و نکات اور آداب سے کما حقہٗ آگاہی نہیں ہے۔ اِن کے افکار و خیالات میں توازن کی بھی کمی ہے۔ اِن ہی جدید شعراء میں کئی ایک ایسے بھی ہیں جو اپنی آفاقیت و ارضیت اور تخلیقی حسن کی وجہ سے خوشگوار اثر پیدا کر رہے ہیں۔ کئی اچھے شاعر اُبھرے ہیں۔ اور اُبھرتے جائیں گے۔ لیکن ابھی جدید ترین آہنگ کو مستقل شکل اختیار کرنے میں کچھ وقت لگیگا۔

ع۔ "رَو میں ہے رخشِ "شعر" کہاں دیکھئے تھمے"

جہاں تک اِن جدید شاعروں کو تسلیم کرنے کا سوال ہے اِس سلسلے میں کسی قسم کی جلد بازی ادب کے حق میں اور خود ادیبوں کے حق میں مفید نہیں ہو سکتی۔ ادب ریاض اور لگن چاہتا ہے۔ ادیب یا شاعر جب تک اپنی پوری شخصیت کو اپنے فن میں جذب نہ کر دے اُس وقت تک فن کی تکمیل ممکن نہیں۔

قیصر شمیم

امکانات کا قتل!

خُون
کالے آسمانوں کے نگر میں
روشنی بن کر بکھر جانے سے پہلے
بہہ گیا!

خُون
ہاتھوں کا پسینہ بن کے
سوکھی دھرتیوں کے تن پہ
کچھ بوٹے اُگا لینے سے پہلے
بہہ گیا!

خُون
میری عُمر کے لوگوں سے بہتر
نسل کی تخلیق کرنے ۔
آہ کتنی چھاتیوں میں دُودھ بن جانے سے پہلے
بہہ گیا!

خُون
میری، فن کی داسی، اُنگلیوں میں
اور کچھ تحریر کر لینے سے پہلے
جَل نہ جائے!
جَل نہ جائے!!

▲

قیصر شمیم

ٹیگور

چھوڑ دے اے عصرِ حاضر
نوحہ خوانی چھوڑ دے
ارضِ بنگالہ کے پیغمبر سے کسبِ فیض کر،
بے گُماں ہر طفلِ نوزائیدہ تھا جس کے لیئے
اِس عقیدے کا بڑا روشن ثبوت
کہ خدائے لم یزل
غیب دانِ این و آں
خالقِ کون و مکاں
نسلِ آدم سے نہیں مایوس ابھی!
(کس بلندی پر تھا اُس کا جذبۂ انسانیت،
اُس کی انساں دوستی تھی بے مثال!)

آج بھی اے عصرِ حاضر،
وہ خدائے کارساز
مالکِ مرگ و حیات
بھیجتا ہے یا نہیں
لمحہ لمحہ کوئی طفل
اِس جہانِ تیرہ میں؟
پھر ہے تُو مایوس کیوں؟
چھوڑ دے اے عصرِ حاضر،
نا اُمیدی چھوڑ دے
آفتابِ ارضِ بنگالہ سے کسبِ نُور کر،
ضُوفشاں ہے آج بھی وہ آفتاب،
جَل نہیں سکتا کہیں بھی جس کی کرنوں کا جواب!

▲

افسانہ

رضاء الجبّار

اُجالوں کے پاسباں

اپنے ہینڈ بیگ کو ہاتھوں میں گھماتی ہوئی مسکراہٹوں کے شراروں کو ہونٹوں میں دبائے ایک تتلی کی طرح اڑتی ہوئی سلیمہ اپنے خوبصورت مکان کے احاطے میں داخل ہوئی کلائی پر باندھی ہوئی گھڑی کو دیکھ کر اس نے اطمینان کر لیا کہ اسے دیر نہیں ہوئی۔ ابھی پانچ بجنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ تب تک وہ سارا کام ختم کر لے گی۔ اور تب پانچ بجے اس کے شوہر دفتر سے آئیں گے اور وہ دونوں ساتھ مل کر ایک برتھ ڈے پارٹی میں جائیں گے۔ اس برتھ ڈے پارٹی کا انتظار انھوں نے کئی ہفتوں سے کیا تھا اور تہیہ کیا تھا کہ اس پارٹی میں اس کے شوہر ظفر نیا سوٹ پہنیں گے اور سلیمہ وہ لال پھولوں والی بنارسی ساڑی پہنے گی جو ظفر کو بہت پسند تھی۔ ان کپڑوں کو پہن کر ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے، وہ جب پارٹی میں جائیں گے تو یوں لگے گا جیسے وہ ایک دوسرے کے لئے بنے ہیں، جیسے وہ ایک دوسرے کی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے پیدا ہوئے ہیں۔

دیوان خانہ کا دروازہ کھلا تھا سلیمہ نے سوچا کوئی ظفر سے ملنے کے لئے آیا ہوگا۔ اس لئے وہ باز و کے دروازے سے صحن میں سے ہوتی ہوئی اندر چلی گئی۔ لیکن اندر گئی تو نوکر نے بتایا کہ کوئی صاحب دیوان خانہ میں بیٹھے ہیں اور وہ سلیمہ ہی سے ملنا چاہتے ہیں۔ سلیمہ نے سوچا کہ ضرور وہی صاحب ہوں گے جو ایک یتیم خانہ کے لئے چندہ لینے ہر ماہ کی ابتدائی تاریخوں میں آجاتے ہیں۔ وہ اس خیال سے دیوان خانہ کی طرف آئی تاکہ ان سے التجا کرے کہ وہ کسی اور دن آجائیں۔ آج وہ بہت مصروف ہے۔

سلیمہ دیوان خانے میں آئی تو اس کے اوسان خطا ہوگئے۔ دیوان خانہ میں ایک صوفہ پر پڑے ہوئے بڑے اطمینان سے سگریٹ کے کش لینے والا حکیم تھا۔ سلیمہ کو دیکھا تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ ابھری اور وہ کھڑا ہوتا ہوا بولا۔

"تمھاری تعظیم میں کھڑا ہوجانے کے لئے میں اپنے اندر جو تحریک محسوس کر رہا ہوں اس پر میرا کوئی قابو نہیں ہے۔" پھر ذرا دیر رک کر اس نے کہا: "کہو مجھے پہچان لیا؟"

سلیمہ کا ذہن ماؤف ہوگیا۔ اس کے چہرے پر خوف اور ڈر کے آثار ابھر آئے اور وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"تم کیوں میرا پیچھا کرتے ہو حکیم۔ میرے سکون کی زندگی میں پتھر پھینکنے کے لئے کیوں چلے آتے ہو؟"

"اپنے ایک پرانے ساتھی کا خیر مقدم کرنے کا تمھارا یہ طریقہ بہت بھونڈا ہے سلیمہ تم نے میرے ساتھ بہت سے لمحے گزارے ہیں۔"

"لیکن میں اب شادی شدہ ہوں" سلیمہ کی آواز میں کپکپی آگئی اور اس نے کہا "میرے شوہر مجھ پر اعتماد کرتے ہیں۔ مجھ سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔ تمھاری باتیں وہ سنیں گے تو ان کے اعتماد کو ٹھیس لگ جائے گی۔ محبت کے جذبات بہت ہی نازک آبگینوں جیسے ہوتے ہیں جو ذرا سی ٹھیس میں ٹوٹ جاتے ہیں۔ انھیں توڑ کر تمھیں کچھ نہیں ملے گا۔"

"میرے انتقام کے جذبے کو سکون ملے گا" حکیم نے اطمینان سے کہا "تم نے مجھ سے بے وفائی کی ہے تم مجھ سے محبت کرتی تھیں لیکن مجھ سے شادی کرنے کے بجائے تم نے ظفر سے شادی رچا لی۔"

"میں تم سے محبت نہیں کرتی تھی" سلیمہ نے جواب دیا: "میں تمہاری کلاس فیلو ضرور تھی۔ اس وجہ سے بہت سے خوشگوار لمحے تمہارے ساتھ گزرے اور ان خوشگوار لمحوں سے ایک اُنس ضرور پیدا ہو گیا تھا"

"یہ اُنس ہی محبت بن گیا تھا۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا تھا"

"شادی بچوں کا کھیل نہیں ہے حکیم! زندگی کا ایک انتہائی سنجیدہ قدم ہے۔ اسے یوں گڈمڈ نہ کرو۔"

صوفے پر دوبارہ حکیم بے تکلفی کے ساتھ بیٹھ گیا اور سگریٹ کا کش لے کر بولا۔

"لیکن میرے پاس بہت سے ثبوت ہیں۔ مثال کے طور پر سگریٹ ہی کو لے لو۔ کالج کے دنوں میں میں سگریٹ پیتا تھا۔ میرے منہ سے ایک دفعہ تم نے سگریٹ یہ کہہ کر نکال دیا تھا کہ اس سے کینسر ہو جاتا ہے اور پھیپھڑے خراب ہو جاتے ہیں۔

"ہاں مجھے تم سے ہمدردی تھی کیونکہ تم کلاس کے اچھے طالب علم تھے، لیکن تمہاری خانگی زندگی ویران تھی۔ تم بڑی کسمپرسی کی زندگی گزار رہے تھے۔ مجھے تمہاری حالت پر رحم آ جاتا تھا۔

"تمہیں یاد ہوگا کہ سگریٹ میں نے چھوڑ دیا تھا کیونکہ تم نے میری ایک شرط پوری کر دی تھی۔ میں نے جلتے ہوئے سگریٹ کو اپنے ہاتھ سے اوپر اٹھا کر کہا تھا کہ اگر میری محبت کا جواب مجھے محبت ہی کی زبان میں مل جائے تب میں سگریٹ نہیں پیوں گا۔ اور مجھے کینسر نہیں ہوگا۔ تم نے میری شرط پوری کر دی تھی۔ سگریٹ کو دوبارہ میرے ہاتھ نہیں لگے۔ اب تم مجھ سے بیوفا ہو گئی ہو تو مجھے بھی پروا نہیں ہے کہ مجھے کینسر ہو جائے یا نہ ہو جائے۔

"میں نے تمہاری کوئی شرط کبھی پوری کرنے کیلئے سوچا بھی نہ تھا" سلیمہ سسکیاں لیتی ہوئی بولی: "تم میری نرم طبیعت اور تنہائی کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ چہل قدمی کے بہانے سے تم مجھے کالج کی کینٹین کے پیچھے باغ میں لے جایا کرتے تھے۔ میری تصویریں نکالتے اور دوسروں کے سامنے یہ کہہ کر بات کو پھیلایا کرتے تھے کہ میں تم میں دلچسپی لیتی ہوں۔ میں اب ایسی باتوں کو یاد بھی کرنا نہیں چاہتی۔ خدا کے لئے بھول جاؤ حکیم۔"

"تم نے میری زندگی برباد کر دی ہے"

"خدا کے لئے یوں نہ کہو" سلیمہ روتی ہوئی بولی "ظفر کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔ انہیں ان باتوں کا شک بھی ہو گیا تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔

"اتنا ڈرتی ہو تو تم نے ظفر سے شادی ہی کیوں کی؟"

"ظفر نے اس وقت میری مدد کی تھی جب مجھے مدد کی سخت ضرورت تھی اور میرے اطراف اندھیرا تھا۔ بعد میں جب میں نے محسوس کیا کہ ظفر کو میری ضرورت ہے تو میں نے اپنے آپ کو ان کی خدمت کیلئے وقف کر دیا۔ یہی ہماری محبت کی بنیاد ہے"

"نہیں" حکیم نے چیخ کر کہا "تم نے ظفر سے اس لئے شادی کی کہ اس کے پاس پیسہ ہے اور میں اس کے مقابلے میں غریب ہوں"

"نہیں" سلیمہ نے بدستور سسکتے ہوئے کہا "یہ الزام ہے، میں نے ظفر سے اس وقت شادی کی جب کہ ان کے پاس پیسہ نہیں تھا۔ اُن کی طبیعت مسلسل خراب رہتی تھی اور انہیں تیمارداری کی ضرورت تھی۔ میں ان دنوں ان کے دفتر میں نئی نئی ملازم ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ میں نے محسوس کیا کہ میں ان کی ضرورت ہوں۔ اس لئے ان کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا۔ حکیم! تمہیں مجھ سے اچھی لڑکیاں مل سکتی ہیں۔ مجھ میں کوئی خاص بات نہیں ہے"

"تم نے محبت سے تجارت کی ہے" حکیم نے آہستہ آہستہ الفاظ ادا کئے "اس لئے اب میں بھی تم سے تجارت کروں گا۔ دیکھو یہ البم لایا ہوں۔ اس میں تمہاری اور میری تصویریں ہیں۔ تم میرے ساتھ رقص کر رہی ہو۔ تم میری باہوں میں جھول رہی ہو۔ تم میری گود میں

سودا کر رہی ہو۔ پچاس کے قریب قریب تصویریں ہیں۔ بولو کیا قیمت دو گی۔"

"خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو حکیم۔ تم اگر مجھ سے محبت کرتے ہو تو کیا محبت میں ایسا رویہ پسندیدہ ہوتا ہے؟ ظفر کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔ وہ آ جائیں گے اور انہیں ایسی باتوں کا ہلکا سا گمان بھی ہو گیا تو میری زندگی پر دکھ کے مہیب بادل منڈلا سکتے ہیں۔ میں خودکشی کر لوں گی۔"

"میں جانتا ہوں کہ وہ آئیں گے لیکن پانچ بجے سے پہلے نہیں آئیں گے۔ ابھی بیس منٹ ہیں۔ وہ ٹھیک پانچ بجے آئیں گے۔ جلد بیس منٹ کے اندر مجھ سے سودا کر لو۔ چار ہزار روپے دے دو، میں یہ البم تمہارے حوالے کر دوں گا۔"

"تم بہت ذلیل ہو۔ بہت ہیچ ہو۔"

"بیس منٹ گزر جائیں گے تو میں یہ البم ظفر کو چار ہزار میں فروخت کر دوں گا۔"

"نہیں نہیں" سلیمہ نے روتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں اتنے پیسے نہیں دے سکتی۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ زندگی بھر تمہاری احسان مند رہوں گی۔"

"تمہاری عاجزی سے میرا دل بھی پسیج رہا ہے۔ اچھا تین ہزار دے کر البم لے لو۔"

"تین ہزار بھی بہت ہیں" سلیمہ نے روتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس اتنے زیور بھی نہیں ہیں، جنہیں تمہارے حوالے کر کے میں تمہاری خواہش پوری کر سکوں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم کالج کے دنوں میں میرے اطراف یوں جال بُن دو گے۔ میں اُن دنوں بے حد احساسِ کمتری کا شکار تھی۔ میرے اس احساس کا بھی تمہیں پتہ تھا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر تم نے میری یہ درگت بنا دی۔ مجھے بگاڑ دیا۔ خواہ مخواہ تم نے میرے تعلق سے اپنی وابستگی کی تشہیر کی۔"

"لیکن تم یہ البم خرید لو تو بات ختم ہو جائے گی۔ دس منٹ رہ گئے ہیں۔ مزید رعایت تمہارے ساتھ کر سکتا ہوں۔ تم مجھے کم سے کم ایک ہزار روپے ابھی دے دو۔ باقی بعد میں دے دینا۔ دو نہیں تو چلو ڈیڑھ ہزار ہی بعد میں دے دینا۔"

سلیمہ دوڑتی ہوئی اندر گئی۔ اڑھائی ہزار روپیوں کے عوض اگر اس کی ساری زندگی کا اطمینان اور سکون پامال ہونے سے بچ سکتا ہے تو یہ سودا مہنگا نہیں ہوگا۔ ظفر کے آنے سے قبل وہ ایک ہزار روپے حکیم کو دے کر اسے وہاں سے روانہ کر دینا چاہتی تھی۔ اس کی اپنی تجوری میں صرف پانچ سو روپے تھے۔ باقی پانچ سو روپے وہ کہاں سے لائے پانچ سو روپیوں کی مالیت کے زیور دے دے گی۔ ایرنگ، بالیاں اور انگوٹھی یا وہ اپنی پازیب دے دیگی، لیکن دوسرے لمحے یاد آیا کہ ظفر نے اگر پوچھ لیا کہ اس کے زیورات کیا ہو گئے تو وہ کیا جواب دے گی۔ بہت سوچنے کے بعد اس نے تہیہ کیا کہ وہ ظفر کے کمرے میں جا کر تلاشی لے گی۔ کبھی کبھار اُن کے کمرے میں اُن کے دفتر کے پیسے رہتے ہیں۔ اپنی آبرو اور ازدواجی زندگی کو ڈوبنے سے بچانے کی خاطر وہ اپنے ہی شوہر کے پیسے چوری کرے گی۔

ظفر کا علیحدہ کمرہ دیوان خانے سے ملحق تھا۔ اہم کاغذات پڑھنے لکھنے کی کتابیں اور دفتر کی فائلیں ہمیشہ بکھری پڑی رہتی تھیں۔ سلیمہ کے قدم تیزی سے اٹھے اور وہ اس کمرے کے اندر چلی گئی۔ لیکن اندر گئی تو اسے یوں لگا جیسے وہ ایک طوفان کی زد میں آ گئی ہے۔ کمرے کے اندر ظفر تھا۔ سلیمہ کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا، حالت غیر ہونے لگی۔ اپنی بدلتی ہوئی حالت اور گھبراہٹ پر کوئی قابو رکھے بغیر اس نے پوچھا۔

"آپ آ گئے ہیں۔ کب آئے آپ؟"

"میں ساڑھے تین بجے آیا" پھر آہستہ سے بولا "تمہارے معزز مہمان میرے بعد ہی آئے ہیں۔"

"آپ نے ان کی باتیں سنی ہوں گی" سلیمہ کے لہجے میں مایوسی تھی۔ اُسے اپنی دنیا کے لٹ جانے کا یقین ہو گیا تھا۔ اب ظفر کی باتوں

سے اُس کی محبت کے خواب بکھر جائیں گے، اُس کے بنائے ہوئے محلات میں آگ لگ جائے گی۔

"ہاں میں نے ساری باتیں سُن لی ہیں" ظفر نے جواب دیا۔ "میری آنکھوں سے آج پردہ اٹھ گیا"

"ظفر! میں نے آپ سے کوئی بے وفائی نہیں کی ہے۔ مجھے آپ سے بے انتہا محبت ہے۔ شادی سے قبل مجھ سے کچھ لاپرواہی ضرور ہو گئی تھی، لیکن میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میرے دل میں کوئی کھوٹ نہیں ہے"

ظفر نے اشارہ سے سلیمہ کو قریب کر لیا اور اس کی کمر کے اطراف اپنے ہاتھوں کا دائرہ بنا کر کہا "تم یہ سب کیا کہہ رہی ہو۔ میں نے کہا کہ میری آنکھوں سے پردہ ہٹ گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آج مجھے پتہ چلا ہے کہ کیوں تم کبھی کبھی یکایک اداس ہو جایا کرتی تھیں۔ انجانے میں ڈر جایا کرتی تھیں۔ آپ ہی آپ ایک نامعلوم خوف سے تمہارے ڈر جانے کا راز اب مجھے مل گیا ہے۔ یہ وہ تصویریں ہی ہیں نا جو حکیم نے کرایا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ تم نے کبھی اشارتاً بھی ان تصویروں کا ذکر نہیں کیا"

"آپ کے بدگمان ہو جانے کا مجھے اندیشہ تھا۔ میں آپ کے دل میں کوئی بدگمانی پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی، اس لئے ہمت نہیں کر سکی"

"لیکن یہ بات روشنی میں آ ہی گئی سلیمہ" ظفر نے سلیمہ کو اور قریب کھینچ کر کہا۔ "اب تم اس البم کو خریدنا چاہتی ہو۔ اسے خریدنے سے کوئی فائدہ ہوگا کیا؟ ان تصویروں کے سارے نگیٹو تو حکیم کے ہاں محفوظ ہوں گے۔ وہ ان سے کئی البم بنائے گا اور پھر انہیں خریدنے کے لئے پیشکش کرتا رہے گا۔ کیا تم یوں ہی خریدتی رہو گی۔ چلو ہم حکیم کے پاس جا کر کہیں گے کہ ہمیں وہ البم بطور تحفہ دے دے"

"آپ حکیم سے ملیں گے کیا!"

"کیا حرج ہے۔ تم تعارف کراؤ تو مل لوں گا"

سلیمہ کو کھینچ کر ظفر دیوان خانے کی جانب گیا۔ سلیمہ کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ ظفر نے ہاتھ پکڑا تھا۔ اور سلیمہ اس کے پیچھے دیوان خانے کی طرف یوں چلی آئی جیسے کوئی اونٹ اپنی نکیل سے باندھی ہوئی رسّی کو کھینچنے والے کے پیچھے پیچھے چلا آتا ہے، اس بات کی پروا کئے بغیر کہ وہ راستہ کدھر جاتا ہے

سلیمہ کی زبان گنگ ہو گئی تھی۔ وہ تعارف کیا کراتی۔ ظفر نے خود ہی کہا۔

"حکیم صاحب آپ سے غائبانہ تعارف ہے۔ مجھے ظفر کہتے ہیں" ظفر نے ہاتھ بڑھایا تو حکیم نے ہاتھ ملایا اور بولا۔

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی"

"خوشی تو آپ سے مل کر بھی ہوتی۔ ویسے ایک شکایت بھی ہے آپ سے"

"کیا!" حکیم نے پوچھا

سلیمہ نے گھبرا کر دونوں کو دیکھا۔

"ہماری شادی کے موقع پر آپ نے شرکت ہی نہیں کی" ظفر نے جواب دیا "خیر کوئی مصروفیت رہی ہوگی۔ اب سلیمہ نے بتایا کہ آپ ہم دونوں کو ایک تحفہ سے نوازنے کے لئے آئے ہیں تو مجھے بڑی خوشی ہوئی"

"جی یہ آپ کیا فرما رہے ہیں" حکیم ہکلایا۔

"میں کیا فرما رہا ہوں آپ جانتے ہیں" ظفر زور سے ہنس کر بولا "اور شاید آپ کو اس بات کا بھی اندازہ ہے کہ تحفہ میں ملے البم مجھے بہت پسند ہیں۔ آپ نے بہت اچھا کیا جو یہ البم لے آئے۔"

"اس البم کا آپ سے تعلق نہیں ہے۔ میں کوئی دوسرا۔۔"

"مسٹر حکیم" ظفر نے فوراً بات کاٹی اور تیز آواز میں بولا "میرے پاس وقت کم ہے۔ اس بات کا بھی احساس ہے کہ اس

وقت آپ میرے مہمان ہیں۔"

"اس البم میں جو تصویریں ہیں آپ کا تعلق ان سے نہیں ہے"

"جن تصویروں کی مدد سے آپ میری بیوی کو بلیک میل کرسکتے ہیں ان تصویروں سے میرا تعلق بہت قریب کا ہو جاتا ہے" پھر ظفر کی تیز آواز غصیلی ہونے لگی اور بولا "سنئے۔ میں ماضی کو ہمیشہ دفن کر دیتا ہوں۔ حال پر میرا اعتماد اور مستقبل پر میرا اعتقاد ہے۔ ماضی میں اپنے چند لمحات سلیمہ نے آپ کے ساتھ گنوائے جس کا آپ فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔

ظفر کی آواز پھر اور زیادہ بلند ہوئی اور وہ کہنے لگا۔

"قبل اس کے کہ میں اپنے نوکروں کو آواز دوں اور آپ کی بے عزتی ہو جائے مناسب یہ ہے کہ آپ اس البم کو یہیں ٹیبل پر چھوڑ کر چلے جائیے"۔

کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے حکیم اٹھا۔ ظفر نے پھر کہا

"اور اس ملاقات کے بعد آپ کے پاس ان تصویروں کے جو نگیٹو ہیں ان کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ لہٰذا فرصت سے انھیں بھی روانہ کر دیجئے گا"۔

حکیم تیزی سے باہر چلا گیا۔ کچھ لمحوں تک کمرے میں سناٹا تھا۔ سلیمہ بے سدھ سی صوفے پر پڑی تھی۔

ظفر نے سلیمہ کو اپنے قریب کھینچ کر کہا "ہمارے کردار کی عظمت کبھی نہ گرنے میں بلکہ گرنے کے بعد کھڑے ہونے میں اور دوبارہ نہ گرنے کا عزم کرنے میں ہے۔ ان تصویروں کو دیکھے بغیر میں اس البم کو جلا دوں گا اور اس بات کا یقین کر لو کہ میرے دل میں بسی ہوئی تمہاری تصویر ذرا بھی دھندلی نہیں ہوئی ہے"

سلیمہ ظفر سے چمٹ کر رونے لگی۔ ایک بہت بھاری سل اس کے دماغ سے ہمیشہ کے لئے ہٹ گئی تھی۔ اُسے یوں لگا جیسے آج اُسے نئی زندگی ملی ہے۔ وہ دوبارہ پیدا ہوئی ہے۔ بہت دیر رو لینے کی وجہ سے جب اس کا جی ہلکا ہو گیا اور ظفر کے سینے سے اس نے سر اٹھایا تو احساس ہوا کہ وقت بہت گزر گیا ہے۔ اس لیے برتھ ڈے پارٹی میں جانے کا پروگرام انھوں نے ملتوی کر دیا۔

بقیہ صفحہ ۱۲ سردار جعفری کا اسلوب نگارش

ان کی کہرافسانیوں سے بہت کم اہل ذوق واقف ہیں۔ بعض جو واقف ہیں اُن کی نثر کے پرستار ہیں اور اس شدت سے کہ اُن کو شاعر سے زیادہ نثر نگار تسلیم کرتے ہیں۔ یہ جعفری کی پہلو دار شخصیت اور ہمہ گیر فن کاری کا سحر اور خلاقی کی شان ہے۔ سردار جعفری ایک عظیم شاعر ہی نہیں، ایک قابلِ فخر نثر نگار بھی ہیں۔ آہنگِ شعر کی طرح اُن کی شگفتہ و شاداب نثری تحریر اُن کے جمالیاتی ذوق اور تجسس و تفکر کی آئینہ دار ہے۔ جعفری صرف انسانیت کی ابدی اور مثبت قدروں کی تصدیق ہی نہیں کرتے بلکہ اُن پر اتفاق و ایمان بھی رکھتے ہیں۔ ساتھ ہی حیات و کائنات کے دائرۂ فکر و عمل میں تعمیر و ترقی کے روشن امکانات کی تشہیر و تبلیغ بھی ان کا بنیادی مسلک ہے۔

احمد عظیم آبادی

رباعیات

بازار میں دیکھ کر اندھیروں کا جلوس
گلیوں میں ٹھہر گیا اُجالوں کا جلوس
پربت نے جھکا کے سر، سلامی دی ہے
گذرا ہے قریب سے جو بونوں کا جلوس

ناپید گھڑی کی سوئی معدوم مکان
بے نام سا راستہ، مسافر نادان
سیماب پہ چل رہا ہے دھیرے دھیرے
کندھوں پہ اُٹھائے کالا گورا سا جہان

دیوار سے سر ٹکائے بیٹھے ہیں ہم
جبرئیل کے پر جلائے بیٹھے ہیں ہم
اُس پار کی ظلمتیں بجھانے کیلئے
مٹی کا دیا جلائے بیٹھے ہیں ہم

آکاش میں اُڑ رہا ہوں بادل ہوں میں
پاتال میں لوٹنے کو بیکل ہوں میں
خود ساختہ بیڑیاں ہیں پیروں میں پڑے
کیا جانے اسیر ہوں کہ پاگل ہوں میں

باوا کرشن گوپال مغموم

قطعات

ذوقِ دل کو سنوارتا ہوں میں
حُسن کے نقش اُبھارتا ہوں میں
پے بہ پے آنسوؤں کے چھینٹوں سے
چہرۂ غم نکھارتا ہوں میں

چاندنی مجھ کو مست کرتی ہے
میرے ساغر میں نور بھرتی ہے
اور پھر دفعتہً کوئی تصویر
دل کے آئینے میں اُترتی ہے

جام میں آفتاب لے آؤ
شاعری کی شراب لے آؤ
جام کیا؟ خُم کے خُم پیوں گا میں
یہ سمجھ کے لاجواب لے آؤ

عیش و آسودگی کا دخل نہیں
کام اِس میں نہیں امیری کا
یہ تو دیر آگ ہے، تپتی ہے
شاعری نام ہے فقیری کا

ڈاکٹر نور السعید اختر

اکبرِ اعظم کا مشغلۂ شکار

زندگی نشیب و فراز، عروج و زوال اور اسی قسم کی کئی متضاد باتوں کا ایک خوبصورت اور حسین امتزاج ہے۔ خاندانِ مغلیہ کے بانی ظہیر الدین بابر گورگانی کی ابتدائی زندگی بھی کئی متضاد باتوں سے ہم آہنگ تھی۔ بابر کی جوانی نہایت پریشان کن حالات میں گزری تھی، لیکن اس کی زندگی کے آخری چار سال یعنی ۱۵۲۶ء تا ۱۵۳۰ء تک کا عرصہ جبکہ وہ ہندوستان کا بادشاہ بن چکا تھا، نہایت اطمینان سے گزرا تھا۔ ہمایوں کی ابتدائی زندگی بھی جنگ و جدال سے عبارت رہی۔ ۱۵۳۰ء میں بابر کے انتقال کے بعد اُسے تختِ شاہی کا حقدار قرار دیا گیا۔ ہمایوں نے ابھی سکون کی سانس بھی نہ لی تھی کہ شیر شاہ سوری نے اُسے وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ ہمایوں جان بچا کر ایران کی طرف نکل پڑا۔ پریشان حال ہمایوں ۱۵ اکتوبر ۱۵۴۲ء میں سندھ کے راجہ امرکوٹ کے یہاں شاہی مہمان کی حیثیت سے ٹھہرا ہوا تھا۔ یہیں قسمت کی ماری حمیدہ بانو بیگم کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ ہمایوں نے اس لڑکے کا نام اکبر منتخب کیا۔ اکبر کا بچپن جن حالات سے دوچار تھا۔ اُس سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن سا تھا کہ یہ ننھا مُنّا بچّہ ایک دن تختِ شاہی کا وارث قرار دیا جائے گا۔ اکبر بمشکل ایک برس کا تھا کہ اُس کے ظالم چچا مرزا عسکری نے اُسے پکڑ لیا۔ ہمایوں کسمپرسی کی حالت میں فارس کی طرف بھاگ گیا۔ مرزا عسکری اکبر کو لے کر مرزا کامران کے پاس کابل پہنچا۔ دو سال تک اکبر وہیں رہا۔ ۱۵۴۵ء میں ہمایوں نے کابل پر چڑھائی کی۔ کامران مرزا نے خیال کیا کہ اگر اکبر کو فصیل کی دیوار پر بٹھا دیا جائے تو ہمایوں ہرگز توپوں کے دہانے نہیں کھولے گا۔ ہمایوں نے اس امر کی پروا نہیں کی۔ بندوقیں، گولیاں، توپیں، آگ اور کڑچی و چاچی کمانیں زہریلے تیر برساتی رہیں۔ اللہ کے فضل و کرم سے اکبر محفوظ رہا۔ ۱۵۵۵ء میں ہمایوں نے شیر شاہ سوری کے وارثوں سے اپنی سلطنت دوبارہ حاصل کر لی اور اکبر کی تعلیم و تربیت کی طرف متوجہ ہوا۔

اکبر کو زیورِ علم سے آراستہ کرنے کے لئے کئی اساتذہ مقرر ہوئے۔ لیکن اکبر نے تحصیلِ علم سے بے توجّہی کا مظاہرہ کیا۔ یہ بات ہمایوں کے لئے نہایت تکلیف دہ تھی، کیونکہ وہ علم و فضل کا شیدائی تھا اور یہ چیز خاندانی روایت میں بھی شامل تھی۔ اکبر کا فطری رجحان جانوروں اور درندوں کی طرف تھا۔ رابرٹ بریَن (Robert Bryan) دی گریٹ مین آف انڈیا ۱۹۱۱ء میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "اکبر جانوروں کی معیّت میں شادان و فرحاں رہتا اور نہ صرف چرندوں، پرندوں بلکہ مست ہاتھیوں اور خوفناک درندوں کو بیک نظر رام کر لینے کی مقناطیسی طاقت، اُس کی قوّتِ ارادی میں موجود تھی۔" ۲۴ جنوری ۱۵۵۶ء میں ہمایوں نے اس دارِ فانی سے کوچ کیا اور اس سانحے کے بعد ہی تیرہ سالہ اکبر بادشاہ بنا دیا گیا۔ بیرم خان اور اُس کی ماں ماہم بیگم نے سلطنت کے کاموں میں اکبر کی رہنمائی کی۔ اکبر نے جب حالات کا جائزہ لیا تو اُسے اپنے آپ میں چند خامیاں نظر آئیں۔ جہاں تک ممکن ہو سکا اُس نے علم و فن کی طرف توجّہ مبذول کی اور ۱۵۶۰ء میں پورے طور پر سلطنت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور پینتالیس برس تک یعنی ۱۶ اکتوبر ۱۶۰۵ء تک نہایت

تزک و احتشام سے سلطنت کرتا رہا۔

مغل بادشاہوں کا آبائی مشغلہ صید افگنی اور سیر و تفریح رہا ہے۔ بابر خود ایک اچھا شکاری تھا۔ اس نے ہمایوں کو سیر و شکار کی تربیت دی تھی۔ ہمایوں نے اکبر کے رجحان کو پہلے ہی بھانپ لیا تھا۔ لہٰذا اس نے اکبر کو فنِ شکار کی اعلیٰ تربیت دی۔ اکبر نے نہ صرف سیر و شکار سے اپنا دل بہلایا۔ بلکہ اس کے جدت طراز ذہن نے فنِ شکار میں کئی نئی روشیں پیدا کیں۔ وہ اس فن کو ہمت و جوانمردی کا میدانِ عمل تصور کرتا تھا۔ اکبر کے نورتن اور آئینِ اکبری کے مصنف علامہ ابوالفضل اکبر کی صید افگنی پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"ظاہر میں دنیا پرست طبقہ جانوروں کی صید افگنی کو ایک مسرت خیز مشغلہ سمجھتا ہے اور اپنی لاعلمی کی وجہ سے اس پر نازاں بھی کرتا ہے۔ لیکن حقیقت شناس افراد صید افگنی کو تحصیلِ علم کا ذریعہ اور اضافۂ معلومات کا واسطہ خیال کرکے اپنے خلوت کدۂ عبادت کو ایک خاص نورانی شمع سے روشن و درخشاں کرتے ہیں۔

حقیقت پرست افراد کا مقصد جہاں پناہ کے مشغلۂ صید افگنی سے ظاہر و روشن ہوگیا۔ جہاں پناہ اس مشغلے کو سرمایۂ دانش خیال فرما کر بغیر عمال کو مطلع کئے ہوئے شکار کے بہانے سے رعیت و سپاہ کے حالات سے واقفیت حاصل کرتے ہیں اور ناشناسی کا لباس پہن کر مالی، ملکی، اور خانگی واقعیات سے آگاہ ہوتے ہیں۔ مظلوم طبقے کی دستگیری کرتے اور ظالم افراد کو ان کے افعالِ بد کی سزا دیتے ہیں۔" (آئینِ اکبری۔ نمبر ۲۷، جلد اول ص ۲۲۵)

اقتباسِ بالا سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اکبر شکار کو محض وقت گزاری اور دلجوئی نہیں سمجھتا تھا، بلکہ اس کے ذریعے وہ اپنی وسیع و عریض سلطنت کے کوائف سے آگاہی بھی حاصل کرتا تھا۔ یہ امر اکبر کی وسعتِ فکر اور بالغ النظری کی بہترین مثال پیش کرتا ہے۔

شکار اور صید افگنی کا علیحدہ محکمہ پہلی بار اکبر ہی کے عہد میں قائم ہوا۔ میر شکار کا عہدہ اکبر کے دادا ظہیر الدین بابر کا قائم کردہ تھا۔ ہمایوں نے میر شکار کی طرف بہت کم توجہ کی۔ البتہ ہمایوں نے جب بھی شکار کیا، اس کا گوشت اقربا اور امراء میں اپنے سامنے تقسیم کروایا۔ (ہمایوں نامہ۔ از گلبدن بیگم ص ۱۴۴) اکبر کا محکمۂ شکار، شاہی شکار کا انتظام مہینوں پہلے کرتا تھا۔ میر شکار کو کبھی کبھی وقتی طور پر بھی فیصلے کرنے ہوتے تھے۔ بسا اوقات اکبر تن تنہا شکار کے تعاقب میں نکل جاتا تھا۔ ان حالات میں بادشاہ کی حفاظت کا خیال میر شکار کو رکھنا ہوتا تھا۔

شکار کا انتظام

شاہی شکاری عملے کی روانگی سے پیشتر میر شکار چند تیز رفتار اور چابکدست قراول مخصوص شکارگاہ کی طرف روانہ کرتا۔ یہ قراول ساری شکارگاہ کو چاروں طرف سے گھیر لیتے تھے۔ قورچیگی شکارگاہ سے آٹھ یا دس میل کے فاصلے پر خدمت گزاری کے لئے تیار رہتا۔ امرائے سلطنت اور دیگر متعلقین قورخانے کے قریب قیام کرکے بادشاہ سلامت کی آمد کے منتظر رہتے۔ شکار سے متعلق اشیاء یعنی کمند، لوہے اور لکڑی کے پنجرے وغیرہ کی حفاظت کے لئے چند ملازم متعین کئے جاتے جو اپنے فرائض متوجہ بوجہ کے ساتھ انجام دیتے۔ ان ملازمین کے ایک کوس پیچھے میر تورک کمربستہ رہتا اور میر تورک سے آدھ میل کے فاصلے پر اکثر ملازمین اور درباری حاضر رہتے۔ یہاں پر خدمت گاروں کا ایک خاص گروہ بھی احکام شاہی کا منتظر ہوتا۔ تقریباً ایک میل کے فاصلے پر ایک قابلِ اعتماد، ہوشیار اور وفادار سردار چند آزمودہ کار سپاہیوں کے ساتھ کیل کانٹے سے لیس رہتا۔ تاکہ اگر کوئی امیر وغیرہ زخمی ہو جائے یا بادشاہ پر اچانک حملہ ہو جائے تو فوری طور پر کمک پہنچائی جا سکے۔ اس امیر کے پیچھے ایک تجربہ کار افسر تمام معاملات کی نگہبانی کے لئے موجود رہتا تھا۔ یک شنبہ اور جمعہ کے دن اکبر شکار سے پرہیز کرتا تھا۔

عہدِ اکبری کی بندوقیں

اکبر کا اختراع پسند اور جدت طراز ذہن ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتا۔ وہ ہر جگہ اپنی فطری و اختراعی قوتوں کو بروئے کار لاتا اور خصوصاً شکار میں فرسودہ طریقوں سے ہٹ کر نئے نئے حربوں کا استعمال کرتا۔ بندوق کے معاملے میں بھی اکبر نے کمال کر دکھایا۔ اس نے بندوقیں رکھنے، بنانے اور صاف کرنے کا علیحدہ محکمہ

بنایا قسموں کے لحاظ سے بندوقوں کے الگ الگ نام رکھے اور اپنی نگرانی میں چند آہنگروں کو ایسی تربیت دی کہ یہ لوگ آستادِ زمانہ قرار دیئے گئے۔ چنانچہ عہدِ اکبری کے آہنگروں میں آستاد کبیر اور حسین آہنگر کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

اکبر اپنی خداداد صلاحیتوں کے باعث چند کام ایسے کرتا جو عام انسانوں کے لئے ممکن نہ ہوتے۔ وہ بندوق سازی اور نشانہ بازی کے فن میں یکتائے روزگار تو تھا ہی۔ لیکن عام طور سے بندوقوں میں معمول سے زیادہ بارود بھر کر داغنے میں اس کا ثانی نہیں تھا۔ دلی سے بڑی بندوقیں دو گز کی اور چھوٹی سوا گز کی ہوتی تھی۔ بڑی بندوقوں کی گولیاں پچیس ٹانک وزن سے زائد نہ ہوتیں۔ چھوٹی بندوقوں کی گولیاں پندرہ ٹانک کی ہوتیں۔ اکبر بڑی بندوقوں میں مقدار سے زیادہ بارود بھر کر پچیس ٹانک وزن کی گولیاں چلاتا۔ ابوالفضل نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ "بڑی قسم کی بندوق صرف جہاں پناہ (اکبر) ہی استعمال کرتے۔ اسے داغنے کی جرأت کسی اور کو نہ ہوتی تھی۔"

اکبر کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ مختلف جانوروں کو اُن کے فطری عادات واطوار اور ڈیل ڈول کے مطابق عجیب و غریب ناموں سے نوازتا۔ اس طرح اُس نے بندوقوں کے نام بھی تجویز کئے تھے۔ حیرت تو یہ ہے کہ اُسے یہ نام ازبر ہوتے تھے۔ سوا گز لمبی بندوقوں کو اکبر نے "دمانک" کے نام سے موسوم کیا۔ ایسی بندوقیں جن کا بیرونی حصّہ شہنشاہ اکبر بادشاہ کی فرمائش پر تراشا اور جب یہ بندوقیں امتحان کے بعد شاہی محل میں پہنچتیں تو "سادہ" کہلاتیں۔ اکبر نے کچھ بندوقوں کا نام کو "شکار" بھی رکھا۔ شاہی محل میں بھیجی ہوئی بندوقوں کے ساتھ پانچ گولیوں میں چار گولیاں امتحانی طور پر اکبر خود چلاتا اور ہر قسم کے اطمینان کے بعد ان کے لئے رنگ و روغن مخصوص کرتا۔ اس کے بعد یہ بندوقیں "رنگین" کہلاتیں۔ اکبر نے نہ صرف بغیر فتیلے والی بندوقوں کی نئی نئی قسمیں ایجاد کیں۔ بلکہ اُس کے اسلحہ خانے میں ایسی بھی بندوقیں تھیں کہ جن میں لبالب بارود بھر کر بھی چلایا جاتا تو نہ پھٹتیں۔

بندوقوں کے استعمال کا یہ طریقہ تھا کہ ایک بندوق صرف ایک ماہ تک استعمال میں رہتی۔ تین ہفتوں کے لئے علیحدہ بندوقیں مخصوص تھیں۔ اسی طرح "تینتیس" بندوقیں شمسی ماہ کے لئے رکھی گئی تھیں۔ اکبر نے خاصے کی بندوقوں کو سات حصّوں میں تقسیم کر دیا تھا جو صرف اُس کے استعمال میں رہتیں۔ اکبر کا بندوق بار "بندوقوں کا ایک گٹک" ہمیشہ تیار رکھتا تھا۔

خاصے کے ہتھیاروں سے ہونے والے شکار کی تعداد لکھنے کی ذمہ داری تبکچی پر ہوتی تھی۔ اکبر کی سب سے زیادہ قابلِ اعتماد بندوق کا نام سنگرام تھا۔ اس بندوق سے اکبر نے ایک ہزار انتیس (۱۰۲۹) جانور شکار کئے تھے۔

شکار کے طریقے

عہدِ اکبری میں شیر کے شکار کے عموماً چار طریقے رائج تھے۔ حیلہ اور مکر و فریب کے جتنے طریقے فنِ شکار میں رائج تھے اکبر شیر ۔۔ کو اُن سے طبعاً لگاؤ نہ تھا۔ لہٰذا وہ ان طریقوں پر بہت کم عمل کرتا تھا۔ تاہم خونخوار جانوروں اور درندوں کو زندہ پکڑنے کے لئے چند طریقے اپنانے پڑتے تھے۔ ذیل کی سطور میں اُن طریقوں کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) گھنے جنگل میں جہاں شیر کی رہائش کا یقینی طور پر علم ہوتا تھا وہاں لوہے کی مضبوط سلاخوں والا پنجرہ شیر کی گزرگاہ پر رکھ دیا جاتا تھا جس میں دو خانے ہوا کرتے تھے۔ ایک خانے میں بکرا بند کر دیا جاتا تھا۔ شیر اُس لقمۂ تر کے لالچ میں پنجرے کے پہلے خانے میں داخل ہوتا اور اُس کے ساتھ ہی خالی پنجرے کا دروازہ خفیف سی حرکت پاتے ہی گر جاتا تھا۔

(۲) شیر کی گزرگاہ کا تعیّن کرنے کے بعد کسی درخت کی شاخ سے زہر آلود تیر کمان کے ساتھ باندھ دیا جاتا۔ راستے سے گزرتے ہوئے اگر شیر کا اُس درخت کی شاخ کو دھکا لگتا تو تیر شیر کے بدن میں پیوست ہو جاتا۔ زہر کی وجہ سے شیر مر جاتا۔

(۳) ایک موٹے تازے بکرے کو شیر کی گزرگاہ پر باندھ جاتا اور اس سے ذرا ہٹ کر ایک گہرا گڑھا کھود کر اُس میں خشک گھاس

کے پتّے سرکش لگا کر ڈال دیے جاتے اور سطح ہموار کر دی جاتی۔ جونہی شیر بکرے پر جھپٹتا وہ گڑھے میں دھنس جاتا۔ سرکش لگے ہوئے گھاس کے پتّے اُس کے سارے جسم سے چپک جاتے۔ شیر پریشان ہو جاتا اور اِس طرح پکڑ لیا جاتا۔

(۴) شیر کے شکار میں اکبر کی فطری بہادری کی جلوہ سامانیاں قابلِ دید ہوتیں۔ وہ اپنی دلیری، شجاعت اور فنِ شکار پر مہارت کے ایسے ایسے مظاہرے کرتا کہ دیکھنے والے انگشت بدنداں ہو جاتے۔ وہ خوفناک بھینسے پر سوار ہو کر شیر جیسے خطرناک درندے کے رُو برو پہنچ جاتا اور بھینسے کو شیر سے لڑا دیتا۔ غصّے سے بھرا ہوا بھینسا شیر پر اپنے نکیلے سینگوں کو جھکائے ٹوٹ پڑتا اور اپنے سینگوں سے شیر کو اُچھال اُچھال کر ختم کر دیتا۔ بعض اوقات اکبر بھینسے پر کھڑا ہو جاتا۔ اِس منظر کو دیکھنے والے مبہوت و ششدر رہ جاتے۔

(۵) اکبر ہاتھی پر بیٹھ کر بھی شیر کے شکار سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ لیکن یہاں بھی دلیری کے جوہر دکھاتا تھا۔ ایک مرتبہ اکبر آدم خور شیر کو موت کی نیند سُلا دینے کی غرض سے "ناہر خان" ہاتھی پر سوار ہو کر پاری نامی مقام پر پہنچا۔ آدم خور شیر نے اچانک حملہ کر دیا اور اپنی پوری طاقت سے ہاتھی کے سر پر پنجہ مار کر اُس کی گردن زمین تک جھکا دی۔ ایسی نازک حالت میں بھی اکبر نے ہوش و حواس بحال رکھے اور شیر کے ایسی کاری ضرب لگائی کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

(۶) اکبر کو چیتوں سے بے حد لگاؤ تھا۔ وہ اُنہیں پالتو جانوروں کی طرح اپنے ساتھ رکھتا اور سدھا کر اُن سے شکار کرواتا۔ چیتوں کے شکار کا عام طریقہ یہ تھا کہ سایہ دار درختوں کے نیچے جہاں چیتے آرام کرتے تھے درخت کی جڑوں سے مضبوط زنجیریں لگا دی جاتی تھیں۔ چیتوں کو درختوں سے جسم رگڑنے کی عادت ہوتی ہے اور جب بھی کوئی چیتا یہ شغل کرتا تو وہ پابہ زنجیر ہو جاتا۔

ہاتھی :- اکبر جنگلی ہاتھیوں کے شکار میں کافی دلچسپی لیتا تھا۔ اُس کے زمانے میں ہاتھیوں کے شکار کے چار طریقے مروّج تھے۔ اِس کے علاوہ اکبر نے بھی چند ایسے طریقے ڈھونڈھ نکالے تھے جن کی مدد سے بیک وقت کئی کئی ہاتھی ایک ساتھ شکار کیے جاتے تھے۔ اِن شکار شدہ ہاتھیوں میں چند قوی ہیکل اور مست ہاتھی اکبر اپنے لئے مخصوص کر لیتا اور اِن کی جسامت، رنگ ڈھنگ کے اعتبار سے اِن کے نام بھی رکھ دیتا تھا۔ جنگلی ہاتھیوں کے شکار کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

(۱) کھیدہ :- جنگلی ہاتھیوں کو پالتو ہاتھیوں کی مدد سے پکڑنے کے طریقے کو "کھیدہ" کہا جاتا تھا۔ اِس شکار کا قاعدہ یہ تھا کہ شکاری، سوار اور پیادے موسمِ گرما میں ہاتھی کی رہائش گاہ میں شور و غل کرتے ہوئے گھس پڑتے، گرمی کی شدّت اور گرد و غبار سے ہراساں ہو کر ہاتھی میدان کی طرف نکل پڑتے اور اپنے ڈیل ڈول کے باعث فوراً تھک ہار کر کسی سایہ دار درخت کے نیچے دم لینے بیٹھ جاتے۔ بڑی چالاکی اور پھرتی کے ساتھ شکاری اِس درخت کے قریب پہنچ جاتے اور نہایت چابکدستی کے ساتھ منتخبہ ہاتھی کی گردن اور پاؤں میں مضبوط رسّی کے پھندے ڈال دیتے اور رسّیوں کے سِرے درخت سے باندھ دیتے۔ کچھ دِنوں تک گرفتار شدہ ہاتھیوں کو بے آب و دانہ رکھا جاتا۔ پھر اُن کے قریب پالتو ہاتھی لائے جاتے اور اِس طرح اِنہیں مانوس کر لیا جاتا۔

(۲) چور کھیدہ :- اِس طریقۂ شکار میں فیلبان کے کمالِ فن اور ہوشیاری کی داد دینی پڑتی ہے۔ اسی لئے اِس طریقہ کا نام "چور کھیدہ" رکھا گیا ہے۔ فیلبان پالتو ہاتھی کی پیٹھ سے چمٹ کر اُسے جنگلی ہاتھیوں کی چراگاہ میں ہانکتا۔ جنگلی ہاتھی اجنبی ہاتھی کو دیکھتے ہی چنگھاڑتا اور پالتو ہاتھی سے زور آزمائی شروع کر دیتا۔ فیلبان موقع پاتے ہی جنگلی ہاتھی کی گردن میں مضبوط رسّی کا پھندہ ڈال دیتا اور اُسے زیرِ دام کر لیتا۔

(۳) گاڑ :- اِس طریقۂ شکار میں مکر و فریب سے کام لیا جاتا۔ جنگلی ہاتھیوں کی گزرگاہوں پر خندق نما گڑھے کھود کر اُن کے منہ گھاس پھوس سے ڈھانک دیے جاتے۔ جونہی جنگلی ہاتھی اِن گڑھوں کے قریب آتے۔ اِدھر اُدھر چھپے ہوئے شکاری شور مچاتے۔ گھبراہٹ کے عالم میں ہاتھی جائے پناہ ڈھونڈھتے اور اسی اَدھیڑ بُن میں اِن خندقوں میں گر جاتے۔ بھوک پیاس سے نڈھال کر کے اِن ہاتھیوں ا

ہی مانوس کرلیا جاتا۔

(۴) ابتداءً جنگلی ہاتھیوں کی آرام گاہوں پر نظر رکھی جاتی۔ اس میں سے ایک جگہ کا انتخاب کرکے اُس کے تینوں طرف گڑھے کھود دیے جاتے اور چوتھی طرف کسی مضبوط لکڑی کا بڑا سا دروازہ لگادیا جاتا۔ اِس دروازے کو رسیوں کی مدد سے معلق رکھا جاتا۔ ہاتھیوں کی مرغوب غذائیں اُس دروازے کے سامنے رکھی جاتیں۔ ہاتھی اُس غذا کی طرف جونہی لپکتا، شاطر شکاری فوراً معلق دروازے کی طنابیں کاٹ دیتا۔ غصے کے عالم میں یہ ہاتھی دروازہ توڑنے کی لاکھ کوشش کرتا، لیکن آگ وغیرہ جلاکر اُسے ڈرا دیا جاتا۔ کچھ دنوں بعد یہ ہاتھی قابو میں آجاتے۔

ہرن اور دیگر جانور۔ چیتوں کی مدد سے ہرنوں کے شکار میں اکبر کو خاص لطف آتا تھا۔ اِسی غرض سے اکبر نے چیتوں کے زندہ پکڑنے اور اُن کے سدھانے کے لئے ایک علیحدہ محکمہ قائم کر رکھا تھا۔ اس محکمہ کا نگراں سیّد محمد بلربد تھا۔ اکبر کے پاس سدھائے ہوئے چیتوں کی تعداد ایک ہزار تھی۔ یہ چیتے خاصے کے چیتے کہلاتے تھے۔ اِس پر دو سو نوکر مقرر تھے۔ اِن چیتوں کو درجوں اور فرماں برداری کی جنس کے حساب سے غذا دی جاتی۔ اوّل درجے کے فرماں بردار چیتوں کو پانچ سیر، دوم درجے والوں کو ۴½ سیر اور سوم درجے والے چیتوں کو چار سیر گوشت دیا جاتا تھا۔ چیتوں کے لئے زربفت کی جھولیں اور مرصّع زنجیریں ہوا کرتی تھیں۔ ہر چیتے کا اُس کی صفات کے لحاظ سے نام رکھا جاتا تھا۔ چیتے اپنی چالاکی، پھرتی، قوتِ شامّہ و سامعہ کے ذریعے نہ صرف شکاریوں کے لئے شکار کی نشان دہی میں ممد و معاون ثابت ہوتے بلکہ آزاد چھوڑنے پر شکار بھی پکڑ کر لاتے۔ خصوصاً ہرن کا شکار چیتے ہی کے ذریعے کھیلا جاتا۔ اِس طریقۂ شکار کے چار نام ہیں۔ جن کی تفصیل ذیل میں دی جارہی ہے۔

(۱) **آپر کمشی**۔ شکاری چیتے کو پوشیدہ طور پر پنجرے میں بند رکھا جاتا ہے جونہی ہرن نظر آتا وہ چیتے کو دکھا دیا جاتا۔ چیتا بجلی کی سرعت کے ساتھ جھپٹ کر ہرن کو پکڑ لیتا۔

(۲) **رکھمی**۔ اپر کمشی اور رکھمی میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ اِس طریقہ میں چیتے کو ہرن دور ہی سے دکھا دیا جاتا۔ مشّاق حیلہ ساز چیتا اپنے بدن کو سکیڑ کر جھاڑیوں کے سہارے ہرن کے قریب پہنچ جاتا اور ایک ہی جست میں ہرن کو جالیتا۔

(۳) **مہاری**۔ شکاری چیتے کو اُس کے پنجرے سے اُتار کر کسی جھاڑی میں چھپا دیتے اور خالی گاڑی ہرن کی طرف ہانکی جاتی۔ چیتے کی بو سے ہرن ہر دو طرف سے پریشان ہو جاتا، وہ راہِ فرار سے مایوس ہو کر گھبرا جاتا۔ اِسی اثنا میں چیتا ہرن پر ٹوٹ پڑتا اور اُسے اپنے پنجوں میں جکڑ لیتا۔

(۴) **گھنٹا ہیرہ**۔ ہرن کے شکار کا یہ طریقہ نہایت عجیب و غریب تھا۔ بیسویں صدی میں اِس طریقے پر عمل کرنا تو درکنار اعتبار کرنا تک مشکل ہے۔ مشہور ہے کہ اکبر کے زمانے میں راگ راگنیوں کے ذریعے جنگلی جانوروں کو پکڑا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب اکبر کا نورتن تان سین ایک خاص راگ الاپتا تو اُس کے اردگرد کئی جنگلی جانور اکٹھا ہو جاتے۔ لیکن اِس طریقۂ شکار کی چھب نرالی تھی۔ شکاری ایک ہاتھ میں سپر یا ٹوکرے کو اُلٹا پکڑتا۔ اُس کی آڑ میں روشن چراغ رکھ لیتا۔ دوسرے ہاتھ سے گھنٹی بجاتا ہوا دوڑتا۔ بھولے بھالے ہرن چراغ کی روشنی اور گھنٹی کی آواز سن کر شکاری کے اطراف اکٹھا ہو جاتے اور اس طرح جال میں پھنس جاتے۔ اکبر اِس طریقۂ شکار کو معیوب سمجھتا تھا اور اس نے اُسے ممنوع قرار دے دیا تھا۔

(۵) **تھاگی**۔ اِس طریقۂ شکار میں شکاری مجنونانہ حرکتیں کرتا اور برہنہ سر جنگلی جانوروں کے قریب پہنچ جاتا۔ شکاری اپنے سر کو دیوانہ وار جنبش دیتا۔ جنگلی جانور متحیر ہو کر اس کے قریب آتے اور اس کے چنگل میں پھنس جاتے۔

(۶) **بوکارہ**۔ کئی شکاری دو حصوں میں تقسیم ہو کر تیر و کمان کے ساتھ ایک دوسرے کے مقابل جھاڑیوں میں چھپ جاتے۔

شکاریوں کے درمیان کھلے میدان میں ہرن ہانکے جاتے۔ ہر شکاری نشانہ بازی کا کرتب دکھا کر زیادہ سے زیادہ ہرن شکار کرتا۔ یہ طریقہ دیگر پرندوں کے شکار میں بھی رائج تھا اور اکبر کو بھی پسند تھا۔

(۷) ڈھاون :- اس طریقۂ شکار میں صحیح معنوں میں تیر انداز اپنے کمالِ فن کے جوہر دکھاتے تھے۔ دو سبز پوش کمانداز بے حس و حرکت کھڑے ہو جاتے۔ ہانکے والے جنگلی جانوروں کو اُن کی طرف ہانکتے۔ یہ تیر انداز زد میں آئے ہوئے جانوروں کو بڑی خوبی کے ساتھ چھلنی بنا لیتے۔ اکبر اِس طریقے سے بہت خوش ہوتا تھا۔

(۸) اَجارہ :- شکاری سر تا پا سبز پوشاکیں پہن کر آہو زار میں جاتے۔ اِن کے تیر و کمان پر بھی سبز کپڑے لگے ہوتے۔ یہ لوگ آہستہ آہستہ حرکت کرتے اور جب دیکھتے کہ کوئی جانور اِن کی طرف آ رہا ہے تو ساکت و جامد کھڑے ہو جاتے۔ اِس طرح زد میں آئے ہوئے جانور کو فوراً مار لیتے۔

(۹) دَہ اٹھکی :- دہ اٹھکی اور تھائی طریقۂ شکار میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ اِس میں بھی شکاری دیوانوں کی طرح برہنہ سر دوڑتے ہیں۔ اور اُن کے کپڑے پان کی پیک سے تر رہتے ہیں۔ جنگلی جانور انہیں زخمی تصور کر کے قریب چلے آتے ہیں اور خود ساختہ دیوانے کے مکر و فریب کا شکار بن جاتے ہیں۔

(۱۰) اکبر کو جنگلی بھینسے کے شکار سے بھی شغف تھا۔ اُس نے اِن کے زندہ پکڑنے کی نئی نئی ترکیبیں کھوج نکالی تھیں۔ ایک رسی کا پھندا گیلی زمین میں چھپا دیا جاتا۔ پالتو مست بھینس کو اُس پھندے کے قریب باندھ دیا جاتا۔ جنگلی بھینسا جب بھینس کی پکار سن کر اُس کے قریب پہنچتا تو چھپا ہوا شکاری دوسری رسی اِس طرح کھینچتا کہ زمین میں دھنسا ہوا پھندا بھینسے کی گردن میں پھنس جاتا۔ اِس شکار کے لئے پھندا پھینکنے میں ماہر شکاری منتخب کئے جاتے۔ جنگلی بھینسے نہانے کے بھی شوقین ہوتے ہیں۔ اُنہیں گہرے پانی میں پھانسے کے ذریعہ پکڑا جاتا ہے۔ بعض اوقات جوانمرد شکاری جنگلی بھینسے کا شکار نیزوں سے کرتے اور نیزہ بازی کے کمالات دکھاتے۔ جنگلی بھینسوں کے علاوہ اکبر سیاہ گوش، لومڑی اور خرگوش کے شکار کا بھی شوقین تھا۔ اُس نے شکار کی خاطر کابلی کتے (ہزارہ) بھی بلوائے تھے، جو شیر پر بھی بے جگری کے ساتھ ٹوٹ پڑتے تھے۔

پرندوں کا شکار :- اکبر کو مختلف پرندوں کا، شکاری پرندوں کے ذریعے شکار کرنے کا بہت شوق تھا۔ اُس نے اِس غرض کے لئے کئی باز، شاہین، شکرے اور اِسی قسم کے کئی شکاری پرندے پال رکھے تھے۔ وہ اِن کی نگرانی میں خود بھی مصروف رہتا اور اُن کے سدھانے کام میں بھی حصّہ لیتا تھا۔ اِن پرندوں کے طور طریقے دیکھ کر اکبر اُن کے نام رکھتا۔ شکاری پرندوں کی مدد سے اکبر آبی پرندوں کا بھی شکار کرتا تھا۔ ابوالفضل آئینِ اکبری میں اکبر کے اِس شوق کی تعریف میں یوں رقم طراز ہیں :-

"His Majesty from motives of generosity and from a wish to add splendour to his Court, is fond of hunting with falcons, though superficial observers think that merely hunting is his object."

(A-IN-I AKBARI, H. Blochmann)
P. 325

فنِ شکار میں اکبر کی جدّتیں :- اکبر صرف میدانِ جنگ کا ایک آزمودہ کار سپاہی تھا بلکہ زندگی کے دیگر شعبوں میں بھی اُس کی جدّت طرازِ طبیعت نے نئی نئی باتیں پیدا کی تھیں۔ اکبر نے بندوقوں وغیرہ کی ایجاد میں جس طرح اپنی تخلیقی قوتوں کا آشکار کیا اُسی طرح اُس نے فنِ شکار میں بھی جدّتیں پیدا کیں۔ روایتی

طریقۂ شکار سے ہٹ کر اُس نے نئے طریقے اپنائے۔ اِن باتوں سے اکبر کی اُپچی صلاحیتوں پر روشنی پڑتی ہے۔

(۱) چیتوں کو زندہ پکڑنے کا جو فرسودہ طریقہ رائج تھا۔ اِس میں اکثر بیشتر چیتے زخمی ہو جاتے تھے اور کبھی کبھی گرفت سے نکل جاتے تھے۔ اکبر نے چیتوں کو پکڑنے کے لئے نیا طریقہ ایجاد کیا۔ اُس نے دو تین گز گہرا گڑھا کھدوایا۔ اِس گڑھے پر ایک دروازہ نصب کروایا۔ یہ دروازہ درندے کے گڑھے میں گرتے ہی بند ہو جاتا تھا۔ اِس میں درندہ زخمی نہیں ہوتا تھا۔ اور بعض اوقات ایک سے زائد درندے گرفتار ہو جاتے تھے۔ اِس نئے طریقے سے ایک وقت میں چھ نر ایک مادہ چیتے پکڑے گئے تھے۔

(۲) جنگلی ہاتھیوں کو زندہ پکڑنے میں اکبر نے یہ جدت پیدا کی تھی کہ جنگلی ہاتھیوں کو تین طرف سے گھیر کر اُن کا ہانکا کیا جاتا تھا۔ ہاتھیوں کے لئے صرف ایک راہِ فرار باقی رہتی، جہاں مست پالتو ہتھنیاں کھڑی کی جاتی تھیں کہ نر ہاتھی مادہ ہتھنیوں کی طرف بڑھنے لگتے اور ہتھنیاں شکاریوں کے حلقے کی طرف کھسکتی جاتیں۔ اِس طریقۂ شکار میں کئی کئی نر ہاتھی ایک ساتھ پکڑ لئے جاتے تھے۔

(۳) ہرنوں کے شکار کے لئے اکبر نے دو نئے طریقے ایجاد کئے تھے۔ اُن میں سے ایک "چتر منڈل" کہلاتا تھا۔ اِس طریقے میں ہرنوں کی چراگاہ کو شکاری حلقہ بنا کر گھیر لیتے تھے اور چاروں طرف جھاڑیوں میں سدھائے ہوئے چیتے چھوڑ دیئے جاتے تھے۔ خوف کے مارے ہرن جھاڑیوں سے باہر جانے سے ڈرتے تھے اور شکاری حلقہ تنگ کرتے جاتے اور بالآخر ایک ہی کوشش میں کئی ہرن پکڑے جاتے۔

(۴) ہرن کے شکار کا دوسرا ایجاد کردہ طریقہ یہ تھا کہ اُس میں شکاری سدھائے ہوئے چالیس بیلوں کی آڑ میں آہو زار میں پہنچنا اور چالاکی سے زد میں آئے ہوئے ہرنوں کا تیر و کمان سے شکار کرتا۔ عہد بابری کی طرح عہدِ اکبری میں بھی پالتو ہرنوں کے سینگوں پر جال کا پھندا لگا کر جنگلی ہرن پکڑے جاتے تھے۔ پالتو ہرن سے لڑائی کے دوران جنگلی ہرن کے سینگوں میں یہ پھندا اٹک جاتا اور وہ پکڑ لیا جاتا۔

عجیب و غریب واقعات

دورانِ شکار میں کئی عجیب و غریب اور ناقابلِ یقین واقعات پیش آتے ہیں۔ اکبر کی شکاری زندگی میں بھی چند ایسے واقعات پیش آئے۔ بعض واقعات یہ ہیں:

(۱) اکبر کی مستقل مزاجی اور قوتِ ارادی نے اُس کی آنکھوں میں ایک غیبی قوت پیدا کر دی تھی۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اکبر کی آنکھوں میں مسمریزم کی کچھ نہ کچھ رمق ضرور ہوگی، جس کی توثیق اِس واقعہ سے ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ اکبر شیر کے شکار میں مصروف تھا۔ اِس کے ہمرکاب ایک امیر شجاعت خان اُس سے کچھ آگے تھا۔ شجاعت خان شیر کو دیکھ کر سہم گیا۔ شیر اکبر کے قریب پہنچ گیا۔ اکبر اپنی خداداد ہمت کی بناء پر اپنی جگہ قائم رہا۔ ابوالفضل نے اِس واقعہ سے متعلق لکھا ہے کہ "اکبر نے شیر کو تیز نظروں سے دیکھا۔ اِس نگاہِ ایزدی کی ہیبت نے جانور پر ایسا اثر کیا کہ وہ لنگڑاتا ہوا واپس ہوا۔" (آئینِ اکبری)

(۲) چیتے جیسے خوفناک درندے کو تربیت دینے میں اکبر کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ عموماً چیتے دو ماہ کی سخت محنت کے بعد حکم کی تعمیل کرنے لگتے تھے، لیکن اکبر نے ایک ایسا طریقہ اِختیار کیا تھا کہ یہ درندے اٹھارہ دِن میں سدھ جاتے تھے۔ چیتوں کی فرماں برداری سے متعلق ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ ایک نوگرفتار چیتا شہنشاہِ اکبر کے سامنے لایا گیا۔ اکبر نے اُس چیتے کو اکبری جاہ و جلال کے ساتھ گھور کر دیکھا اور شکار کے لئے اشارہ کیا۔ اِس چیتے نے بہترین تربیت یافتہ چیتے کی طرح حکم کی تعمیل کی۔ تماشائی اِس منظر کو دیکھ کر مبہوت رہ گئے۔

(۳) ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ اکبر کے ساتھ ایک چیتا بغیر پٹے اور زنجیر کے تھا۔ اکبر کے ہر اشارے پر چیتا ایک فرماں بردار انسان کی طرح عمل کرتا اور شکار میں بھی کمال دکھاتا۔ دیگر شکاری اِس چیتے کی کارگزاریوں کو دیکھ کر حیرت کرنے لگتے تھے۔

(۴) مثل مشہور ہے کہ شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی نہیں پیتے۔ لیکن عہدِ اکبری میں ایک مثال ایسی بھی ملتی ہے جس میں ایک

چیتے کی ہرن کے ساتھ دوستی تھی۔ دراصل یہ کرشمہ اکبر کی جانوروں کے ساتھ والہانہ محبت کی ایک مثال اچھی مثال تھی۔ یہ دونوں جانور ہمیشہ ساتھ رہتے اور ایک لمحے کی جدائی بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ یہی چیتا دوسرے ہرنوں کو ہڑپ کر جاتا۔ لیکن اپنے محسن کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ عہدِ جہانگیری میں بھی ایک بکری بندر کے بچے پر مہربان ہو گئی تھی اور اسے اپنا دودھ پلاتی تھی۔

نشانہ بازی کے معرکے:- اکبر بندوق سے صحیح نشانہ لگانے اور معیاری تیراندازی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ اس کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ وہ نازک لمحات میں کامن سینس (Common Sense) سے کام لے کر اپنی شعوری لیاقت کا ثبوت دیتا تھا۔ ٹوڈہ کے مقام پر شیر نے ایک شخص کو پنجوں سے دبوچ رکھا تھا۔ اکبر نے تاک کر ایک ایسا تیر مارا، کہ شیر اچھل کر دوسری جانب گر پڑا اور مر گیا۔ اسی طرح قمرغہ کے مقام پر بلا نکے میں شیر سامنے آیا اور اس نے اکبر پر حملہ کر دیا۔ اکبر نے کمال جرأت سے کام لے کر ایک ہی تیر میں شیر کو زمین دوز کر دیا۔

ایک مرتبہ شکاریوں نے اکبر کے لئے شیر گھیر رکھا تھا۔ شیر کو جب کوئی راہِ فرار نہ سوجھی تو اس نے ایک پیادے پر حملہ کر دیا۔ سب لوگ اس پیادے کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ اکبر نے فوراً اپنی قابلِ اعتماد بندوق اٹھائی اور ایسا نشانہ لگایا کہ شیر اچھل کر دوسری جانب گر پڑا۔ اکبر نے اس موقع پر جس توجہ کو جمع سے کام لیا وہ قابلِ ستائش ہے۔ علامہ فیضی نے بھی 'نل دمن' میں اکبر کے شکاری کارناموں کو ان الفاظ میں سراہا ہے ؎

شیرانِ جہاں شکار کردہ　　　وز مورچۂ کنار کردہ

در معرکہ کربستہ شمشیر

از بیم فتادہ ناخنِ شیر

آئینِ اکبری جلد اوّل صفحہ ۲۱۸

نصر قریشی

جلتے ہوئے ماحول میں جینا بھی سزا ہے
ہر چہرہ ترے شہر کا آئینہ بنا ہے

کل جس کو کوئی پوچھنے والا بھی نہیں تھا
سنتے ہیں وہی شخص خدا بن کے اٹھا ہے

دیوانگی کی اس سے بڑی حد بھی ہے کوئی
دیوانے نے، دیوانے کو، دیوانہ کہا ہے

جسموں پہ سجائے ہوئے زخموں کی دکانیں
لٹتے ہوئے بازار میں ہر شخص کھڑا ہے

دامانِ سحر تار، تو پیراہنِ شب چاک
خوابوں کے جزیروں میں دھواں پھیل رہا ہے

ڈھلتے ہیں نئے دور کے سانچے میں نئے ذہن
پارینہ روایات کا بت کانپ رہا ہے

میں ہوں کہ ترے درد کی توقیر کا ضامن
اور تو مری رسوائی کا سامان بنا ہے

ڈستی ہوئی تنہائیوں کی اندھی گپھا میں
دل شمع کی مانند ضیا بانٹ رہا ہے

چندر پرکاش شاد

شب بھر آوارہ گھومے ہیں، اب تو سو لیں
اتنی مدت غیر رہے، اب اپنے ہو لیں

دھرتی کی ہر چیز پہ جانے کیا بیتی ہے
ہم ڈولیں تو کیوں یہ پیڑ اور پتھر ڈولیں

صدیوں کے سناٹوں سے دل ڈوب رہا ہے
ان لمحوں سے کہہ دو جاگیں اور کچھ بولیں

اک دن یہ بھی کام کریں وحشت کی رو میں
شہر کی دیواریں جانچیں، دروازے تولیں

ہریالی کو ڈھونڈنے والوں سے یہ کہہ دو
لفظوں کے صحرا میں دل کی دھڑکن گھولیں

جب جب وہ مکھڑا دیکھا ہے، صبح ہوئی ہے
ایسی صبحیں ہم اپنی مالا میں پرو لیں

لگتا ہے جیسے یہ جھونکے پوچھ رہے ہیں
کب تک بے معنی خوابوں کے بدن ٹٹولیں

سجی سجائی نگری ہے یہ ارمانوں کی
اس نگری میں آنے والے منہ کو دھولیں!

افسانہ

نسیم محمد جان

چھوٹی بات

اُسے زندگی شروع کئے ہوئے پندرہ سال ہو گئے تھے۔ ان پندرہ برسوں میں بہت کچھ ہو چکا تھا۔ رضو کے ساتھ وہ اپنے دیہات کا آبائی گھر چھوڑ کر شہر کے کرائے کے تین کمروں والے مکان میں آ گیا تھا۔ اب پرویز اسکول سے کالج جانے کی تیاری کر رہا ہے مہ جبیں سوئٹر بننے لگی ہے اور راشدہ رومال میں رنگ بھرنے کے ڈھنگ سے واقف ہو چکی ہے۔ منا گھٹنوں کے بل چلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے سوچا۔ وہ تین چار دن سے نہ جانے کیوں وہ سب کچھ سوچ رہا ہے جو پچھلے پندرہ برسوں میں کبھی نہ سوچ پایا تھا۔ شائد اُسے ان باتوں پر غور کرنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ حالانکہ نہ وہ کسی فیکٹری میں مزدور تھا اور نہ کسی ریاست کا منسٹر۔ اُسے آپریشن کرائے ہوئے چار یا پانچ روز ہو گئے تھے۔ بستر پر لیٹا وہ محسوس کر رہا تھا کہ ایسی ساری باتیں جو اُس کے ذہن کے کسی گوشے میں پڑی تھیں۔ اور جنہیں اُس نے کبھی قابل توجہ نہیں سمجھا تھا، اب اُسے کمزور پا کر بغاوت پر تلی ہوئی ہیں ۔۔ وہ آدھ گھنٹے سے دروازہ پیٹ رہا ہے۔ برابر والے مکان کے بڑے میاں کھانسنے لگے ہیں۔ ارشد صاحب کا کتا بھوں بھوں کرنے لگا ہے، مگر رضو ہے کہ اب تک نہ جاگ پائی۔ اس نے پھر دروازہ پر دستک دینی شروع کر دی۔ ایسا ہفتہ ہی ہوتا ہے۔ وہ رات کے گیارہ ساڑھے گیارہ بجے تاش کھیل کر لوٹتا ہے۔ تب رضو سوئی ہوئی ہوتی ہے۔ دروازہ کھلنے میں کبھی آدھ گھنٹے سے کم وقت نہیں لگتا۔ زندگی اسی طرح گذر رہی ہے۔ نہ اُس نے تاش کھیلنا بند کیا اور نہ دروازہ کھولنے کے لئے رضو جاگتے رہنے کی عادت ڈال سکی۔ اگر وہ مجبور نہ ہوتا تو شاید محلے والے اس بے وقت کی "کھٹ کھٹ" "تھپ تھپ" کی شکایت کرتے، مگر پاس پڑوس میں متوسط طبقے کے لوگ رہتے ہیں اور لوگ مجبور ہیں۔ ہر خاندان کا مستقبل کالج میں پروان چڑھ رہا ہے۔ مجبوری تو شاید وہ دونوں بھی ہیں۔ چھوٹے سے شہر میں گھومنے پھرنے کی کوئی جگہ نہیں، لوگ الگ الگ محکموں کے کام کرنے والے ہیں۔ اگر ان میں کوئی چیز آسانی سے مشترک ہو سکتی ہے تو وہ تاش ہے ۔۔۔ ادھر رضو کے ساتھ پندرہ سال نکل گئے ہیں۔ وہ اب خالی وقت میں اگر گھر پر رہتا تو تعجب کی بات تھی ۔۔۔ اور اگر ایک رات کی بات ہوتی تو ممکن تھا دروازہ کھولنے کیلئے رضو بستر پر لیٹی دروازے پر کان رکھتی اور گلی میں جوتوں کی آواز سنتے ہی اُٹھ بیٹھتی

"لیجئے انڈے کا حلوہ" رضو مخاطب ہے۔

"۔۔۔۔۔۔۔"

"تھوڑا سا کھا لیجئے۔ آپریشن میں بہت سارا خون نکل گیا ہوگا۔"

"بالکل خواہش نہیں ہے"

"بہت کمزور ہو گئے ہیں آپ!"

اس نے عجیب سی نظروں سے رضو کی طرف دیکھا۔

شاعر بیٹی۔

• میں نماز میں دعا کر رہی ہوں بہت جلد اچھے ہو جائیے گا۔ بیٹے! دعا کرو بیٹا ابا جلد اچھے ہو جائیں۔

وہ لیٹے لیٹے رضا کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ ماں کی چوڑیاں بجا رہا تھا۔

• کھانا ٹھنڈا ہو چکا ہے۔

• ————— •

• گرم ہو سکتا ہے۔

• کھانا کبھی بھی، سردی بہت زیادہ ہے، چولہے کے پاس جانا پڑے گا۔

اب رضو نے اُس کے سینے پر تولیہ رکھ دیا ہے۔ انڈے کے حلوے کو منہ میں رکھتے ہی وہ اُس ٹھنڈے کھانے کے متعلق سوچنے لگا جسے ہر بات خاموشی سے حلق کے نیچے اتارنا پڑتا تھا۔ وہ اب رضو سے کبھی کھانا گرم کرنے کیلئے نہیں کہتا تھا ————— وہ سمجھ رہا تھا اس حلوے اور اُس ٹھنڈے کھانے کے متعلق پھر سے آپریشن یاد آ گیا۔ کتنی تکلیف ہوئی تھی۔ ڈاکٹر اگر دوست نہ ہوتا تو شاید آپریشن کم ہو نہ ہو سکتا۔ مگر تکلیف تو بہر کیف ہوتی ہی ہے، چاہے ڈاکٹر دوست ہو یا نہ ہو ———— اس نے رضو کی طرف دیکھا اور اُس کی آنکھوں میں جھانکا ———— "انڈے کا حلوہ بہت لذیذ ہے۔" ———— اُس کا جی چاہا کہ وہ رضو سے کہہ دے، میں اچھا ہو کے پھر آپریشن کرا لوں گا، مگر وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا کہ آپریشن نے اُسے اُس رضو سے ملا دیا ہے، جسے وہ بارہ تیرہ سال ہوئے کھو چکا تھا اور یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ اب کوئی طاقت اُس کی رضو کو واپس نہیں لا سکتی۔ رضو کی آنکھوں میں تین چار روز سے وہی چمک تھی جسے اس نے ان دنوں دیکھا تھا جب وہ نئی نئی بیاہ کر آئی تھی۔ وہ اٹھ کر باہر گئی پھر دوسرے ہی لمحے میں واپس آ گئی اور پچھلے تین چار روز کی طرح آج بھی اُس نے کنستر آلیو آئل کی شیشی سے کچھ تیل اپنی ہتھیلی پر انڈیلا اور اس کے روکنے کے باوجود رضو کی مخروطی انگلیاں کسی ایکسپرٹ مالش کرنے والے کی طرح اُس کے سر کے بھاری پن کو جذب کرنے لگیں ———— پھر اسے وہ رضو یاد آ گئی، جو اس کی بیوی تو تھی مگر ابھی ماں نہیں بنی تھی۔ گھنٹوں اُس کے بالوں سے کھیلا کرتی تھی۔ آج بھی رضو کی انگلیاں اس کے بالوں سے الجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اگر اُس وقت کی رضو اور ان دنوں کی رضو میں کوئی فرق ہے تو بس ایک ایک برش کا۔ کاش وہ اس وقت بستر سے اٹھ سکتا۔

اب وہ کچھ اچھا ہو چکا تھا، حالانکہ وہ صحت یاب ہونا نہیں چاہتا تھا۔ مگر پھر اس نے سوچا، اگر چھٹیاں ختم ہو گئیں تو ————؟ اگر رضو اکتا گئی تو ———— "اچھا ہے جو میں جلد صحت یاب ہو جاؤں" —۔ اب وہ دو تین روز سے شام کے وقت باہر جانے کے لئے بے چین ہو جاتا تھا۔ تاہم اُس کی کمزوری تھی۔ وہ گرم بنیان اور گرم شرٹ پہنتا۔ بالوں میں کنگھی کرتا۔ مگر جب باہر جانے کے لئے دروازے کی طرف بڑھتا تو رضو دروازہ روکے کھڑی ملتی جس کی آنکھیں کہتیں "چاہتے ہو مجھے مار ڈالو، میں تمہیں باہر نہیں جانے دوں گی۔ چار پانچ روز کے بعد جانا۔ بالکل اچھے ہو جاؤ پھر میں روکوں تو کہنا" وہ اندر لوٹ آتا۔ پھر اسے رضو کی آنکھوں میں وہی جانی پہچانی چمک دکھائی دیتی، جسے دوسرا کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اُس کا جی چاہتا کہ وہ لپک کر رضو کو اپنی باہوں میں کس لے اور پھر زندگی بھر اُن آنکھوں کو چومتا رہے مگر دوسرے ہی لمحے اسے کچھ کمزوری محسوس ہونے لگتی ————: وہ مجھے جلد سے جلد صحت یاب کرنا چاہتی ہے ———— اور میں اچھا ہونا نہیں چاہتا؛ وہ مسکرانے لگا ———— اچانک پڑوس کا صاحب والا یاد آ گیا: "وہ اپنی مشین کے خراب ہو جانے پر کتنا پریشان ہو جاتا ہے" پھر وہ اپنے خیالوں میں بری طرح الجھ گیا، رضو مجھ سے محبت کرتی ہے ———— صاحب والا اپنی مشین سے محبت کرتا ہے۔ وہ اپنی مشین سے محبت نہیں کرتا ہے بلکہ ———— رضو مجھ سے محبت نہیں کرتی ہے بلکہ ————، اور پھر وہ آگے کچھ نہ سوچ سکا۔ وہ ان خیالوں کو اپنے ذہن سے یہ کہتے ہوئے جھٹکنے کی کوشش کرنے لگا۔ "کتنی چھوٹی بات ہے، کتنی چھوٹی بات۔"

اب وہ بالکل اچھا ہو چکا تھا۔ دن بھر شام کے ہونے کا منتظر رہا۔ اُس نے گرم پتلون اور شرٹ پہنی۔ آج پھر وہ دروازے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ وہ دروازے پر ایک لمحے کیلئے رکا اور گلی میں آ گیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میں رضو کو دھوکے دیکر یہاں آ گیا ہوں۔ اُس نے سوچا اور پھر پیچھے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا، مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ گلی میں داہنی طرف مڑ گیا۔

▲

مقال

انور صدیقی

نازش کی غزل

ملک کے عام سخن آشنا حلقوں میں نازش پرتاب گڑھی نظم نگار کی حیثیت سے زیادہ متعارف اور مقبول ہیں۔ یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے کہ انہوں نے غزلیں بھی لکھی ہیں اور انتہائی کامیاب غزلیں لکھی ہیں۔ معلوم نہیں کیوں وہ عرصہ سے مشاعروں میں نظمیں ہی سناتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ جس طرح کی نظمیں وہ لکھتے ہیں اُن میں براہِ راست ایک بڑے حلقے کو متاثر کرنے کی صلاحیت زیادہ ہے اور لطیف ابلاغ کے مسائل بھی کم ہیں۔ بلند آہنگ نظمیں آسپ پر جلد چھا جاتی ہیں یہ اور بات ہے کہ وہ سننے والے کو دیر تک اپنی گرفت میں نہ رکھ سکیں اور اسے اندر سے اس طرح نہ بدل سکیں جیسے کہ غزل کے اشعار بدلتے ہیں۔ نازش صاحب نے نظموں کے ساتھ ساتھ شروع ہی سے غزلیں لکھی ہیں۔ مگر وہ اپنی غزلوں کو کسی گہرے راز کی طرح سے چھپاتے رہے ہیں۔ اس کی ایک نفسیاتی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ انہوں نے اپنی داخلی شخصیت کے تمام نقوش، اپنے احساس کے سارے سوز و ساز اور نوش و نیش کا اپنی غزلوں میں اظہار کیا ہے۔ میر کی زبان میں انہوں نے بھی سخن کو پردہ بنایا ہے اپنی محرومی و دکھن کا۔

نازش صاحب نے یہ پردہ ابھی حال میں اٹھایا ہے۔ اپنی غزلوں کا مجموعہ "لکیریں" شائع کرکے اس مجموعے کا انتساب غزل ہی کے نام کیا ہے جس سے وہ نفسیاتی نکتہ سامنے آجاتا ہے، جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔ صنفِ غزل کے نام کہ اس بھری دنیا میں تنہا غزل ہے جس سے کھل کر اپنے دل کی بات کہہ لیتا ہوں اور جو میرے سارے دکھ درد کو خود اپنے دامن میں سمیٹ کر میرے سینے کا بوجھ ہلکا کر دیتی ہے۔ انہیں اس بات کا احساس ہے کہ "ترجمانیٔ ذات" اور خود اظہاری کے لئے صنفِ غزل کے علاوہ اور کوئی اتنی مؤثر صنفِ سخن نہیں ہے۔ مگر اس میں ایک مشکل بھی ہے اور وہ یہ کہ غزل کی اشاریت، اُس کی ایمائیت اور خود [illegible] کے سانچے صدیوں کے بنے ہوئے ہیں۔ خود غزلیہ اظہار کی اپنی ایک روایت ہے جو اپنی جگہ پر اتنی محکم ہے کہ اگر شاعری شخصیت کمزور ہوئی تو محکوم بنا لیتی ہے اور پھر اُس سے وہی کچھ کہلواتی ہے اور ویسے ہی کہلواتی ہے جیسے دوسروں سے کہلواتی رہی ہے۔ غزل بڑی سخت گیر محبوبہ ہے۔ وہ پوری شخصیت مانگتی ہے۔ ہمارے احساس و اظہار کے تمام وسائل کو اجارہ میں لینا چاہتی ہے۔ اگر شاعری شخصیت میں کس بل ہوتا ہے تو وہ اس میں کچھ تبدیلیاں کر لیتا ہے ورنہ وہ طرف باز گشت بن کر رہ جاتا ہے ناسخ اور ما قبل کی غالباً یہی وجہ ہے کہ اُس کے شہیدوں کی تعداد زیادہ ہے اور غازیوں کی کم۔ اس کے علاوہ غزل میں اس بات کا تعین بڑا مشکل ہے کہ کیا کچھ شاعر کا اپنا ہے اور کیا کچھ روایت کی دین۔

نازش صاحب اِن مشکلوں سے اپنے طور پر عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ اِن کی غزل گوئی کی ابتدا ہی روایتی انداز سے نہیں ہوئی۔ اُن کو شعور و احساسات نے جب اظہار کا مطالبہ کیا تو اُس وقت غزل کا انداز بہت کچھ بدل چکا تھا۔ وہ حدیث

دلبری سے زیادہ صحیفۂ کائنات بن چکی تھی۔ اِس کے بعد ترقی پسندوں نے سماجی اور سیاسی شعور کے اظہار کے لئے اُسے برتنا یا استعمال کیا۔ مگر اِس عرصہ میں غزل انکشافِ ذات سے زیادہ اظہارِ کائنات کا وسیلہ بن چکی تھی۔ لاشخصی انداز سے اُسے ذاتی اظہار کی شدّت اور فوریت سے محروم کر دیا تھا۔ وہ مشترک احساس کا مشترک اظہار بن چکی تھی۔ نازش صاحب بھی کچھ عرصہ کے لئے اِس انداز سے متاثر ہوئے۔ مگر اُن کی غزلوں میں طنطنے سے زیادہ گداز کا عنصر غالب رہا۔ اِس لئے کہ وہ اِس نکتہ سے باخبر تھے کہ غزل جگ بیتی کو بھی آپ بیتی بنا کر پیش کرنے کا نام ہے۔ اگر خیال شاعر کے ذہن و احساس کی خلوتوں میں رہ کر شعلہ ریز نہیں ہوا ہے تو خواہ وہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو غزل کے کام کا نہیں ہے۔ چنانچہ اُس دَور میں بھی جب سیاسی اور سماجی شعور کا بڑا زور تھا۔ نازش صاحب جو کچھ کہہ رہے تھے اُس میں اُن کی گرمیٔ نفس شامل تھی۔ چند اشعار دیکھئے ؎

نہ دیکھی جائیگی دستِ طلب کی محرومی	خدا کرے نہ کبھی مجھ کو مانگنا آئے	۱۹۴۸ء
اِک آرزو تھی مٹ گئی، اِک دل تھا بجھ گیا	اَب ہم کو کیا غرض ہے کہ ترکِ وفا کریں	۱۹۴۸ء
بزم تو سجی ہوتی۔ دَور تو چلا ہوتا	جام ہم تک آجاتا پھر چھلک گیا ہوتا	
زیست کی مروّت نے روک لی زباں ورنہ	عشق نے مسرّت کو کفر کہہ دیا ہوتا	
ہم بھی دیکھتے کوئی کیسے مسکراتا ہے	ہاتھ سے کسی کے اور جام چھن گیا ہوتا	
وہ تو خیریت گزری غم نے گود پھیلا دی	ورنہ حضرتِ نازش کون آپ کا ہوتا	
یوں ہی کب ہاتھوں میں چھلکا تھا کوئی پیمانہ	آج محسوس ہوا ہے غمِ دنیا کیا ہے	۱۹۴۹ء
آؤ دیارِ دار سے ہو کر گزر چلیں	سُنتے ہیں اِس طرف سے مسافت رہے گی کم	۱۹۴۹ء
تھی تو حیات اپنی جگہ انجمن مگر	جب یاد آگئے ہو تو تنہا ہوئے ہیں ہم	۱۹۵۲ء
موت مانگوں کہ زندگی مانگوں	اے غمِ دل عجیب اُلجھن ہے	۱۹۶۵ء

یہ اشعار اِس بات کا ثبوت ہیں کہ نازش نے غزل کو نہ کسی نظریئے کا "گوریلا دستہ" بنایا اور نہ ہی اُسے "توبہ و استغفار" کا ذریعہ۔ بلکہ اُس کے ذریعہ اپنی مجروح شخصیت کے زخموں کے لالہ و گل پیش کئے ہیں۔ اُس شخصیت کے ٹوٹنے اور بکھرنے میں چونکہ بہت سارے عوامل کا ہاتھ رہا ہے۔ اِس وجہ سے بالواسطہ طور پر انتہائی لطیف انداز سے وہ کام بھی ہو گیا ہے جسے تنقیدِ حیات کہتے ہیں اور جس کا مطالبہ ایک زمانے میں فیشن بن گیا تھا۔ نازش صاحب اِس دشنام طرازیوں کے دَور میں بھی ہمیشہ "شائستگیٔ دیدۂ تر" کے قائل رہے ہیں اور یہ بات یاد رکھی ہے ؎

جب بھی اور جس دور میں بھی — اپنی ہی ذات سے ہو جو کچھ ہو

جو شاعر یہ بات بھولے گا، وہ غزل اور خود اپنے منصب سے گر جائے گا۔

نازش صاحب کی غزلوں میں ایک سوچا ہوا غم غالب عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ غم اتنا ذاتی نہیں جتنا کہ محسوس ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ذاتی سے ذاتی ہو کر بھی غم کلّیتاً ذاتی نہیں ہوتا۔ اُس میں غیر محسوس طور پر ہی سہی بہت سارے عوامل کی کارفرمائی ہوتی ہے جن کی خارجی اور مادّی بنیاد ہوتی ہے۔ نازش صاحب کی شاعری میں ایک بیکراں اور انتھاہ غم گینی کا احساس ہوتا ہے۔ اُن کا شعری کردار ایک ایسے شخص کا کردار ہے جس کی قسمت میں چند گریزپا مسرّتیں تو آئی ہیں مگر وہ مسرّتیں اُس کے دامن کو محرومیوں کے کانٹوں سے بھر گئی ہیں۔ جن کی خلش وہ ہر لمحہ محسوس کرتا ہے، وہ نشاطِ درد سے زیادہ "عذابِ درد" کے شاعر ہیں۔ مگر وہ اِس عذابِ درد کی تہذیب بھی کرنا جانتے ہیں۔ وہ اپنے زخموں

کی نمائش نہیں کرتے۔ انہیں یہ بات اپنی "عظمتِ غم" کے منافی محسوس ہوتی ہے وہ بھری بزم میں آنسو بھی نہیں بہاتے کہ اس سے آبروئے چشمِ تر جاتی ہے۔ وہ چارہ گروں کی چارہ گری کا بھی احسان نہیں اٹھانا چاہتے۔ انہیں "عرفانِ غم" حاصل ہے۔ وہ غموں سے توانائی بھی حاصل کرتے ہیں اور تابندگی بھی۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ اس غم میں ماورائی عناصر نہیں ہیں۔ ہم ان کی غمگینی کو کسی فلسفیانہ ادراک کا نتیجہ بھی نہیں کہہ سکتے۔ "بے رحمیٔ حالات" نے یا ماحول کی "جبریت" نے اس غم کی تخلیق کی ہے۔ ایسے غم میں بالعموم وسعت اور فراخی کا احساس کم ہوتا ہے۔ مگر جس غم کا اظہار نازش کا شعری کردار کرتا ہے اس میں نہ تو تعلّی ہے، اور نہ تلخی ہی، اور نہ کلبیت۔ اس غم میں جو سلیقہ اور جو باطنی رکھ رکھاؤ ہے وہ ہمیں شاعر سے دور نہیں کرتا بلکہ قریب لے آتا ہے اور ایک مخصوص رشتۂ درد سے منسلک کر دیتا ہے۔ نازش کے غم میں رومانی افسردگی نہیں، بلکہ جدید زمانہ و زندگی کی تنگ و تاریک حقیقتوں کا احساس و ادراک ہے۔ اس ادراک کی شاعری میں بالعموم "خود رحمی" (self pity) پیدا ہو جاتی ہے اور وقار قائم نہیں رہ پاتا۔ کبھی کبھی تو ایک طرح کی ہسپتالی کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے، مگر جیسا کہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں نازش صاحب تہذیبِ غم پر قادر ہیں۔ ان کا احساس اس غم میں ایک کیمیاوی تبدیلی پیدا کر دیتا ہے جس سے اس کی درشتی اور تلخی میں ایک خوشگوار کمی یا اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ ایک غیر معمولی چیز ہے جو مجھے نازش صاحب کے ادراکِ غم میں محسوس ہوئی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

آجاتے ہیں پلکوں پہ کسی وقت بھی آنسو ۔۔۔ تہذیبِ غمِ زیست ابھی سیکھ رہا ہوں

روز ہنس بول کے دن کاٹ لیا کرتے ہیں ۔۔۔ روز ہو جاتے ہیں رنجیدہ سے ہم رات گئے

یارو مری شبیہہ وہی ہے جو پہلے تھی ۔۔۔ صرف اک ذرا اضافۂ رنگِ ملال ہے

پاس آئی تھی دم بھر کے لئے خواہشِ گریہ ۔۔۔ تا عمر مری عظمتِ غم مجھ سے لڑی ہے

دردِ بے حد کو نشاطِ دل بنا دیتا ہوں میں ۔۔۔ یعنی جیتا ہوں تو جینے کا صلہ دیتا ہوں میں

خوب ہنس لیتا ہوں بزمِ دوستاں میں بیٹھ کر ۔۔۔ اکثر اپنے آپ کو یوں بھی سزا دیتا ہوں میں

نازش اک عمر گزاری ہے اسی حسرت میں ۔۔۔ کاش ٹھہرے نگہہِ دردِ مجھی پر تنہا

جانے کب ہم سے ہوا جرمِ تبسم سرزد ۔۔۔ آج تک پھرتے ہیں با دیدۂ نم آوارہ

زندگی! تیری مروّت میں نکلے ہیں کچھ دیر ۔۔۔ ورنہ ہم لوگ نہیں وقت سے کم آوارہ

گزشتہ آٹھ دس سال میں نازش صاحب کی غزل میں کچھ خوشگوار تبدیلیاں اور بھی آئی ہیں، ان کی غزلوں میں تازگی تو پہلے ہی سے تھی۔ مگر وہ تازگی ترقی پسند غزل کی روایت کا حصّہ معلوم ہوتی تھی۔ ادھر چند برسوں میں ہمارا ملک اس تہذیبی بحران سے قریب آ گیا ہے جس سے یورپ کوئی نصف صدی سے دوچار ہے، یہاں بھی بڑے پیمانے پر آدرش ٹوٹے ہیں اور خواب پامال ہوئے ہیں۔ بہت سے عقائد جو کبھی جذباتی سہارے کا کام دیتے رہے ہیں آج دم توڑ چکے ہیں، ایسی بے بسی تہذیبِ انسانی کے کسی دور میں بھی محسوس نہیں کی گئی تھی، گزشتہ بحرانوں میں روشنی کی کوئی نہ کوئی کرن ضرور در آتی تھی اور کسی نہ کسی خوش آیند دور کی بشارت دیتی تھی۔ اب تو بے ستارہ شبوں کا دور ہے۔ اب کوئی نظریہ ایسا نہیں رہا ہے جو فرد کی بکھرتی ہوئی شخصیت کی شیرازہ بندی کر سکے۔ تمام نظریئے بے کار ہو کر رہ گئے ہیں۔ انسانی زندگی کی بے معنویت یا مہملیت کا احساس شدید تر ہو گیا ہے۔ فرد اپنی شناخت سے محروم اور اس کے جذباتی رشتے مبہم ہو چکے ہیں۔ اس صورتِ حال نے جو سنگین بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ ہمارے نظامِ احساس یا حسیّت کو عجیب انداز سے بدلا اور متاثر کیا ہے۔ اس تبدیلی کا اثر ہماری غزل گوئی پر بھی پڑ رہا ہے۔ غزل کی لفظیات، یہاں تک کہ اس کی جمالیات بھی متاثر ہو رہی ہے۔ غزل کی داخلی فضا اب کچھ سے کچھ ہو گئی ہے۔ ہمارے وہ بزرگ شعراء جو اس تبدیلی کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں یا جو اس

تبدیلی سے تخلیقی طور پر متاثر ہو رہے ہیں اُن میں نازش صاحب بھی ہیں، نازش صاحب کے لئے آسانی یہ ہے کہ وہ کلاسیکی غزل کے بنیادی رموز سے بھی واقف ہیں اور ترقی پسند غزل کے آداب سے بھی۔ اس کے علاوہ اُن کے یہاں جو تخریب ہے پہلے ہی سے موجود تھی یا جو شعری کردار تھا وہ بھی بڑی حد تک جدید شعری کردار سے قریب ہے ہے مجھے تو کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے جدید شاعری نے اُن کے شعری احساس کی تصدیق و توثیق کر دی ہو۔ نازش صاحب کو جدید لب و لہجہ اختیار کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے یہاں کسی قسم کا بھی لسانی یا معنوی تشدد نہیں بلکہ ایک طرح کی بے ساختگی اور سہولتِ اظہار ہے۔ جو اُن کی فنی پختگی کا ثبوت ہے۔ میرا خیال ہے کہ شاعری میں کارگر اور مؤثر "شعری آواز" اُسی شاعر کی ہو سکتی ہے جس کا کوئی اپنا ماضی بھی رہا ہو، جدید اُردو شاعروں میں وہی لوگ کچھ اچھی غزلیں لکھ رہے ہیں جنہوں نے پہلے بھی غزل کی مشاطگی کی تھی۔ غزل میں سرے سے نئی آواز ناممکن ہے۔ اب میں آپ کو نازش صاحب کے وہ اشعار سناتا ہوں جو نئی حسیت یا نئی ہوشمندی کے مظہر ہوتے ہوئے بھی اُن کے عام شعری لب و لہجہ اور مزاج سے ہم آہنگ ہیں ؎

اربابِ خرد نے مجھے دیوانہ بتایا
جس لمحہ میں آپ اپنے کو محسوس ہوا ہوں

چھیڑو نہ مرے شہر کے سناٹے کو یارو
پی پی کے یہی زہر تو میں زندہ رہا ہوں

اے نئی نسل نہ لے ہم سے اِک اِک پل کا حساب
ہم نے کچھ عمر بسر کی ہے کراہوں کی طرح ،

یوں جیئے جاتے ہیں بے قدر مرے عہد کے لوگ
جیسے دھرتی پہ ہوں روندی ہوئی راہوں کی طرح

زندگی کچھ اس طرح بھچکر ملی مجھ سے کہ اب
اِنتقاماً سب کو جینے کی دُعا دیتا ہوں میں

جذبات کے چہرے بہے جاتے ہیں پگھل کر
بے رحمیٔ حالات کی دھوپ اِتنی کڑی ہے

ہنستا ہوں اپنی ہی ویرانیٔ دل دیکھ کر
ورنہ میرے شہر میں اِتنا بھی سناٹا نہیں

کس جگہ قافلۂ زیست رُکا ہے یارو
آدمی میر کا "دیوان" بنا ہے یارو

کوئی اتنا بھی نہیں ہے کہ جو محسوس کرے
قافلہ اُلٹے قدم لوٹ رہا ہے یارو

حد درجہ بھیانک ہے تصویرِ جہاں نازش
دیکھے نہ اگر انساں کچھ خواب تو مر جائے

مندرجہ بالا اشعار میں آپ کو ایک قدرے بدلے ہوئے زاویۂ نگاہ کا اندازہ ضرور ہوگا۔ لہجے میں جو غنائیت پہلے تھی وہ اور گہری ہو گئی ہے۔ عصری زندگی پر جو اُن کی گرفت میں بھی ہے اور گرفت سے باہر بھی، وہ ایک "غیر مشروط ذہن" کے ساتھ روشنی ڈال رہے ہیں۔ شعری پیکروں اور تمثالوں کی فضا بھی کچھ بدلی ہوئی سی ہے۔ جدید غزل فارسیت اور بے جا ترقیع اور مینا کاری سے بھی آزاد ہوئی ہے اور سادگی، زبان اور سہولتِ اظہار کے نئے معیار بنا رہی ہے۔ نازش صاحب کی غزلوں میں شروع ہی سے ایک طرح کی سادگی اور لچک تھی۔ لسانی سطح پر بھی اُنہیں نئی غزل سے ہم آہنگ ہونے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی ہوگی۔ ذیل کے چند اشعار کسی نہ کسی حد تک نازش صاحب کے نظریۂ شعر کی ترجمانی کرتے ہیں ؎

لہجے میں نکیلا پن، لبوں پر زہر خند
اب یقین آیا کہ نازش راز دارِ نغمہ ہے

صرف اپنی خود کلامی لکھ لیا کرتا ہوں میں
آج تک فنِ غزل گوئی مجھے آیا نہیں

ہر غزل میں ہلکے ہلکے غم کی موج تہہ نشیں
زندگی کی دین کا نازش کو اندازہ نہیں

اپنی غزلوں کے مجموعے کی اشاعت کے بعد مجھے اُمید ہے کہ نازش صاحب غزلوں پر زیادہ توجہ کریں گے اُنہیں اب یہ بات مان لینی چاہئے کہ بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں اور غزل ہی اُن کی "ادبی شناخت" کا ذریعہ بنے گی ہمیں اُن سے غزل کے اور بھی مجموعوں کی اُمید ہے۔

تنہا تما پوری

رام رحیم کی جُڑواں لاشیں

مندروں کی گھنٹیاں خاموش ہیں
مسجدوں کے سب مینارے سو گئے
خانقاہوں کے کواڑوں نے بھی آنکھیں مُوند لیں
مدرسوں کے صحن میں کانٹے بچھے ہیں
اب بہاروں کو چمن کا راستہ ملتا نہیں ہے
پیار کا سورج بھی نفرت کی گھٹاؤں میں چھپا ہے
مَیں پڑوسی کے مکاں کو راکھ بنتے دیکھتا ہوں
راکھ بن جاتی ہے ماتھے کا تِلک !
تم پڑوسی کے مکاں میں خُون بہتا دیکھتے ہو
خون بن جاتا ہے راہِ حق میں قربانی کا نُور !!
اب مجھے اِتنا بتا دو !
کل جو مَیں نے خواب میں دیکھا تھا، کیا تھا ؟؟
مَیں نے دیکھا تھا کہ
زمزم
گربھ میں دھرتی کے
گنگا جی سے مِل کر پُوچھتا تھا :
"رام، رحیم کی جُڑواں لاشوں کی مٹی کو
کِس نے،
کیسے ـــــ ؟؟
الگ کیا ہے !؟"

پروفیسر عابد عالمی

وہ رہگزار

خلا سے بھی کبھی اُبھرا ہے زندگی کا وجود
تری نگاہ کہاں ٹِک رہی ہے دیوانے !
ترے دماغ، ترے ذہن پر مُسلّط ہیں
حسین عُمر گذشتہ کے چند افسانے
ہَوا کا جھونکا تھا، ٹکرایا دَر سے، لَوٹ گیا
ہَوا کا جھونکا تھا، اِک چھیڑ کر کے لَوٹ گیا

وہ رہگذار جہاں گرد اُڑتی پھرتی ہے
پڑا ہُوا ہے بگولوں میں رَن جہاں، کب سے
وہیں تجھے یہ گُماں ہے کہ کوئی سایہ ہے
یہ صرف تیرا تصوّر ہے آس کے مارے

بگولے پھرتے ہیں ہر روز یُونہی آوارہ
جسے گُذرنا تھا، وہ تو گُذر گیا ہوگا
وہ جس کے نقشِ قدم چھُو رہی ہے تیری نظر
وہ جانے والا بہت دُور جا چُکا ہوگا !

(ملیالم)

ٹی ۔ ایس ۔ پلّے

مترجمہ: عالم برہانی

اپنا خون

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ جو بھی ہو، میں اُس سے شادی کروں گا۔"
باپ کے سامنے ذہنی گوپال نے ایسا کہہ تو دیا۔ وہ گھر کے اُتر طرف والے آنگن میں کھڑا تھا۔ اُس کے پتا شنکرن نائر پورب طرف کی چوپال پر کھڑے تھے۔ "بیٹا بڑی ہمت سے کہتا ہے۔ وہ ضرور اُس لڑکی سے شادی کرے گا! تیری ایسی ہمت" کہتے ہوئے شنکرن نائر اُچھل کر اس کی طرف دوڑ پڑے۔ اُن کے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ باپ کو اپنی طرف دوڑ کر آتے دیکھ کر گوپال ایسے چلنے لگا جیسے بھاگنا چاہتا ہو۔ شنکرن نائر نے لاٹھی گوپال کے گھٹنے پر ماری۔ خوش قسمتی سے نشانہ خطا ہو گیا۔
شور غل سن کر پاروتی باورچی خانے سے باہر آئی۔ "کیوں شور مچاتے ہو؟" شوہر پر رُعب جماتے ہوئے اُس نے پوچھا۔
شنکرن نائر نے جواب دیا۔ "دیکھو نا اس کی ہمت! میرے سامنے کہتا ہے کہ اُس لڑکی سے شادی کرے گا۔ بدتمیز!" پھر بھی پاروتی نے شوہر کو قصوروار ٹھہرایا۔ "خیر! اس نے تو اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن میں پوچھتی ہوں تم نے کیوں ایسا کہنے کا موقع دیا؟" شنکرن نائر اب بیوی پر غصّہ ہو اٹھے "تم کیوں نہیں کہو گی! تمہارا خاندان ہی کچھ ایسا ہے! باپ کو مارنے والا۔"
پاروتی بھڑکی۔ "میرے خاندان کے بارے میں کچھ نہ کہنا۔ ہمارے خاندان میں باپ کو مارنے والا کوئی پیدا نہیں ہوا۔"
"تو تم کہتی ہو کہ ہمارے خاندان میں پیدا ہوا ہے!"
"میں نے تو ٹھیک ہی ایسا کہا!"
جھگڑے کو طول دینے کے خیال سے پاروتی اندر چلی گئی۔ غصّے میں شنکرن نائر کچھ بڑبڑا رہے تھے۔ باورچی خانہ میں پاروتی بھی کچھ بھنبھنا رہی تھی۔

گھر سے نکل جانے پر گوپال سیدھا گوری کے گھر گیا جیسے یہ اس کے لئے ایک چیلنج تھا۔ جھگڑا ابھی ختم نہیں ہوا تھا، لیکن وہ سیدھا گوری کے گھر ہی گیا۔ جیسے اُس کا مقصد ہو کہ اُس کا باپ اُسے دیکھ لے۔ اپنے باپ کی ذرّہ برابر بھی اُسے پرواہ نہ تھی۔ کسی پاگل کی طرح شنکرن نائر گرج کر بولے۔ "اری پارو! دیکھ تو وہ کہاں جاتا ہے!" پاروتی اُتر طرف والے آنگن میں آئی۔ اُس نے دیکھا کہ اُس کا بیٹا گوری کے گھر کے چوپال پر بیٹھ کر بیڑی پی رہا ہے اور گوری آنگن میں کھڑی ہے۔ دونوں میں کچھ بات چیت ہو رہی ہے۔ چھوکری پیر کے انگوٹھے سے زمین کرید رہی ہے۔ پاروتی اور شنکرن نائر دونوں نے یہ سارا منظر دیکھا۔ اس بار پاروتی غصّے سے اُبل پڑی "دیکھو نا اُسے! کیسا تماشا دکھا رہی ہے۔ بے حیا کہیں کی۔ نہ جانے کون سا جادو کر کے اس نے میرے بیٹے کو بس میں کر لیا ہے؟" یہ کہتے کہتے پاروتی کا کلیجہ منہ کو آ گیا۔

اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اُس کا بیٹا سدا کیلئے اُس کے ہاتھ سے نکل گیا ہو۔ وہ اپنے آپ کو سنبھال کر زور سے چلا اٹھی "ارے گوپال!" لیکن مُڑ کر دیکھا گوری نے۔ گوپال اندر چلا گیا۔

اس گاؤں کے لئے، اس مہینے کا خاص موضوع تھا۔ گوپال گوری سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ لیکن گوپال کے ماں باپ کو یہ بالکل پسند نہیں۔ دونوں شادی کے خلاف ہیں۔ ایک دو بیچ بچاؤ کو آئے۔ سمجھانے لگے کہ لڑکی نیک ہے۔ پڑوس میں رشتہ ہونے سے فائدہ ہوگا۔

پڑوس کی ایک بوڑھی عورت آئی۔ اُس کی بات گاؤں بھر کے لوگ مانتے تھے۔ اس نے پاروتی کو سمجھایا "پاروتی! سنو میری بات، لڑکی نیک ہے۔ پڑوس کا رشتہ ہے۔ مان لو کبھی تم بیمار پڑیں تو کون ہے تمہیں بارلی یا کافی بنا کر دینے والا؟ یہ لڑکی تن سے تمہاری خدمت کریگی۔ میری بات مانو اس رشتے میں تمہارا بھلا ہے۔"

"دھت!" پاروتی نے ایسا دھتکارا کہ کان پھٹ گئے۔ پاروتی کو ایسی گالی نہیں دینی چاہیئے تھی۔ بوڑھی ماں کو غصہ آیا اور اُس نے اپنی بے عزتی محسوس کی۔ دونوں میں من مٹاؤ ہو گیا۔

پھر دوسرے مصلح کار رامن نائر آئے۔ اُنہوں نے ذرا سمجھ بوجھ سے کام لیا۔ رامن نائر نے شنکرن نائر سے کہا "جو بھی ہو گوپال اُس لڑکی کے ساتھ شادی کرے گا ہی، چونکہ اس نے فیصلہ کر لیا ہے۔ اس لئے اچھائی اسی میں ہے کہ ہم سب مل کر اُن کی شادی کردیں۔ کم سے کم دنیا والوں کو دکھانے کیلئے ہی ...."

"چولہے میں جائیں تمہارے دُنیا والے۔ ہماری اجازت سے یہ شادی نہیں ہوگی۔ آخر وہ لڑکی ہے کون! جانتے نہیں ہو کہ کوتیچ کُنجو میرا دُشمن ہے۔ دشمن کے بھائی کی بیٹی میرے گھر کی بہو بنے! واہ رے!"

پھر ایک دوسرے مصلح کار کیشو پلے آئے اور بولے "ماں باپ کا یہ دعوی کرنا فطری ہے بھائی کہ اولاد کیلئے اُنہوں نے بہت کچھ جھیلا ہے"۔ شنکرن نائر نے کہا "اس لڑکے کیلئے ہم نے کیا نہیں سہا"۔ "لیکن وہی لڑکا آج میرے سامنے بغیر جھجک ہٹ کے کہتا ہے کہ اس لڑکی سے شادی ضرور کریگا۔ ایسی ہمت!"۔ بیچارے شنکرن نائر رو پڑے۔ کیشو پلے نے کہا "اُسے ایسا کہنا نہیں چاہیئے تھا۔ پھر بھی مجبور ہو کر اس نے ایسا کہا ہوگا"۔ بات شنکرن نائر کی سمجھ میں نہیں آئی "بھائی ذرا بتاؤ تو وہ مجبور کیوں ہے؟"

"ہاں بھائی، وہ مجبور تو ہے۔ تمہارے لئے اس کے دل میں الوٹ شردھا ہے۔ سمجھ لو کہ اسی شردھا کی وجہ سے اس نے یہ شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہو"

شنکرن نائر اب بھی کچھ سمجھ نہیں سکے۔ "یہ کیا پہیلی بجھاتے ہو جی؟"

کیشو پلے مسکراتے ہوئے بولنے لگے۔ "وہ چاہتا ہے کہ اس کے نام پر کوئی بٹہ نہ لگے۔ اسی لئے اس نے اس لڑکی سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ لیکن بات کچھ ایسی ہے کہ وہ تم سے کہہ نہیں پا رہا ہے"۔ شنکرن نائر ہکا بکا رہ گئے۔ آخر کیشو پلے نے وہ راز اُن کے کان میں کہا۔ "وہ لڑکی ماں بننے والی ہے۔ کوئی اور نہیں..... تمہارا ہی بیٹا ہے۔ ایسی حالت میں اُس لڑکی کو چھوڑنا کیا دھرم ہوگا؟"

شنکرن نائر کے لئے یہ بالکل نئی خبر تھی۔ ایک لمحہ کے لئے وہ بالکل سُن سے رہ گئے۔ پھر بولے "میں تبھی سے اُس کو بتا رہا تھا کہ اُدھر مت جایا کرو۔ اُس کمینے کوتیچ کُنجو کا گھر تو ہے وہ جادو کا خطرہ۔ اب آیا ہے عقل مندی کا کام کرکے۔ سمجھتا ہے کہ ماں باپ مان جائیں گے۔ یہی بات ہے نا؟"

کیشو پِلّے نے شنکرن نائر کو مناتے ہوئے کہا۔ "ویسی بات نہیں ہے بھائی۔ تم یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ وہ دھرم اور انصاف کا دامن تھامے ہوئے ہے"
شنکرن نائر نے اپنا فیصلہ سنایا۔ "جو بھی ہو ہم اس شادی میں شامل نہیں ہونگے۔ ہماری اجازت سے یہ شادی نہیں ہوگی۔"
یہ داؤ بھی کامیاب ثابت ہوا۔ اب یہ واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ ماں باپ کی اجازت سے یہ شادی پایۂ تکمیل تک نہیں پہونچ سکتی۔

گوری کی ماں اللہ کو پیاری ہو چکی تھی۔ اُس کے پتا کا ایک چھوٹا بھائی تھا، بڑا ہوشیار، نام تھا کوچو کنج پلّے۔ اُس میں اور شنکرن نائر میں بڑی دشمنی تھی۔ شنکرن نائر کو بے عزت کرنے کا ایک اچھا موقع کوچو کنج پلّے کو ملا۔ ایسا موقع وہ کیوں ہاتھ سے جانے دیتا؟ گوپال کا خیال تھا کہ کسی طرح کے طول کلام کے بنا گاؤں کے چار بڑے آدمیوں کے سامنے شادی ہو جائے۔ ماں باپ، چچا، ماما، اور دوسرے عزیز و اقربا ناراض ہو چکے۔ اس کی غیر حاضری میں بھوج وغیرہ کا انتظام کرنا ٹھیک نہیں۔ پیسے کا خرچ الگ۔ گوری کے باپ نے اس صلاح کو مان لیا، لیکن کوچو کنج پلّے اس سے خوش نہیں ہوئے۔ اُن کے بھائی کے گھر میں ہونے والا آخری شبھ کارج ہے یہ۔ اس لئے دھوم دھام ہی سے کرنا ہے۔ گوری کے باپ کے پاس کچھ روپے تھے۔ چھوٹے بھائی کے دباؤ کے سامنے بڑے بھائی کو جھکنا پڑا۔
گوری کی بھی یہ خواہش تھی کہ اُس کی شادی دھوم دھام سے ہو۔ اس لئے گوپال نے مان لیا۔ سارے گاؤں کو شادی میں مدعو کیا گیا۔ اچھا خاصا اُودھم رہا۔
۔ آلپتو شہر سے کوچو کنج پلّے ایک گراموفون لے آیا، جو اس گاؤں کیلئے ایک نئی چیز تھی۔ کوچو کنج پلّے نے اس گراموفون کا رخ شنکرن نائر کے گھر کی طرف رکھا۔ شادی کے پہلے دن، رات بھر گانا ہی گانا ہوتا رہا۔ ایک قسم کی ذاتی تسکین کے ساتھ کوچو کنج پلّے بولا۔ "وہ بے ایمان شنکرن نائر آج سونے نہ پائے"
گراموفون کے علاوہ لڑکوں کے ناچ کے ساتھ بھی گانے بجانے کا انتظام تھا۔ اُسی دن ایک اچھے خاصے بھوج کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ اُس دن تڑکے ہی شنکرن نائر اُٹھ کر کہیں چلے گئے تھے۔ لیکن پاروتی تھوڑے ہی کہیں جا سکتی تھی۔ سارا دن اُس کی آنکھیں برستی رہیں۔ جس بیٹے کو اپنی کوکھ میں دس مہینے ڈھو کر جنم دیا تھا اُس بیٹے نے نہ صرف اس کی ہتک عزتی کی تھی۔ بلکہ اپنی ماں کو کہیں منہ دکھانے کے لائق نہ رکھا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ ساری دھوم دھام اُسے اور اُس کے پتی کو چڑانے اور بے عزت کرنے کیلئے ہے۔ اس کام میں اُس کا بیٹا ان لوگوں کا ساتھ دیتا ہے۔ وہ سب کچھ بھولا ہوا ہے۔
پاروتی نے اپنے سر پر دونوں ہاتھ رکھ کر بددعا دی۔ "جس نے میرے بیٹے کو جادو ٹونے سے اس طرح کا کر دیا ہے اس کا سر پھوٹ جائے"
گوپال کی گذشتہ فرمانبرداری کا خیال کرتی تو یہ یقین پکا ہو جاتا کہ بیٹے پر جادو ٹونا کر دیا گیا ہے۔ گوپال پہلے ایسا نہ تھا۔ ماں باپ کی بات ماننے والا تھا۔
شادی ہو گئی۔ پاروتی اور شنکرن نائر گوپال کو دُور سے دیکھ لیتے تھے۔
پھر شادی سارے گاؤں کا موضوعِ بحث بن گئی۔ دولوں کے بارے میں کہنے سننے کو بہت کچھ تھا۔ گوری کے باپ کو اس بات کا بھروسہ تھا کہ اُسے ایک داماد مل گیا، بھلے ہی بہت سارے روپے خرچ ہوئے ہوں۔ کوچو کنج پلّے کو ایسی تسکین ہوئی جیسے کھیر کھانے سے ہوتی ہے۔
دو مہینے بیت گئے۔ ایک دن گوپال اپنے گھر آیا۔ شنکرن نائر اور پاروتی آنگن میں ناریل کے پتے سنوار رہے تھے۔ گوپال شادی کے پہلے اپنا گھر چھوڑ گیا تھا، تب سے پہلی بار گھر میں قدم رکھا تھا۔ اُس کی صورت سے یہ پتہ چل رہا تھا، جیسے وہ کسی فیصلہ پر آ پہنچا ہو۔

شاعر۔ بمبئی

آہٹ سُن کر شنکرن نائر نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ گوپال تھر تھر کانپ اٹھا۔ شنکرن نائر مارے غصے کے اُچھل پڑے۔ "کیوں رے تو اِدھر کیوں آیا؟"

گوپال نے جو جملے یاد کر رکھے تھے، جیسے تیسے وہ کہہ دیئے: "مجھے اپنا حصّہ چاہیئے۔"

"تجھے حصہ چاہیئے؟" ہاتھ اُٹھاتے ہوئے شنکرن نائر آگے کود پڑے۔ گوپال بھاگ نکلا۔ اس دوران گوری کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ گوری کے حمل کے دن پورے ہو رہے تھے۔ گھر کا خرچ مشکل سے چلتا تھا۔ اب اس کی دیکھ بھال کرنے والا صرف کوچ کنج پیلے ہی رہ گیا تھا۔ اُس نے گوپال کو صلاح دی "تم اپنے باغ سے ناریل توڑ لاؤ۔ تمہارا بھی تو حق ہے۔"

دن میں باغ میں گھس کر ناریل توڑنے کی ہمت گوپال میں نہ تھی۔ اس لئے کارروائی رات میں ہونے لگی۔ منتری شنکرن نے تھانے میں شکایت کی۔ پولس گوپال کو پکڑ کر لے گئی۔ شام کو کوچ کنج پیلے اُسے چھڑا لایا۔

دو ایک گاؤں والے صلح سمجھوتہ کرنے آئے۔ آخر میں دکھن طرف پاؤ ایکڑ زمین گوپال کے حصے میں دینے کے لئے شنکرن نائر راضی ہو گئے۔ گوری نے ایک بچہ کو جنم دیا۔ لیکن یہ سب کچھ بڑا تکلیف دہ تھا۔ گوپال کو اُسے ہسپتال لے جانا پڑا۔ اتنا ہی نہیں ہسپتال میں اُسے دو چار دن ٹھہرانا بھی پڑا۔ اِدھر اُدھر سے قرض لینے پر ہی گوپال یہ سارا خرچ سنبھال سکا۔ بٹوارے میں جو پاؤ ایکڑ باغیچہ ملا تھا اس میں دس بیس ناریل کے پیڑ تھے اس سے کیا دن کٹتے۔ کوچ کنج پیلے کی مدد سے گوپال نے باغیچہ ایک عیسائی کے ہاتھ چھ سو روپے میں فروخت کر دیا۔

گوپال کو جو چھ سو روپے ملے۔ اُس میں سے دو سو روپے قرض چکانے میں لگ گئے۔ پچاس روپے میں اُس نے گوری کیلئے ایک ساڑی اور ایک چولی خریدی۔ پہلی بار اس نے اپنی بیوی کو ساڑی خرید کر دی تھی۔ گوپال نے ایک نئی خوشی محسوس کی۔

اُس دن رات کو میاں بیوی نے بڑی دیر تک مستقبل کے بارے میں غور و خوض کیا۔ تین سو روپے بچے ہوئے ہیں۔ گوری کے ذہن میں ایک بات آئی "کیوں نہ ہم ایک کاروبار شروع کریں؟" گوپال کو یہ مشورہ پسند آیا۔

ایک دن کی بات ہے، پاروتی اپنے ایک دوسرے باغیچہ میں گھاس چھیل رہی تھی۔ سر اُٹھا کر دیکھا تو ایک لڑکی گود میں بچے کو لئے کھڑی تھی۔ پاروتی کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ بچہ کس کا ہے۔ پاروتی نے اُس لڑکی کو اپنے پاس بلایا۔ "منے کو اِدھر لانا۔" لڑکی پاروتی کے پاس آئی۔ ہاتھ بڑھانے سے پہلے ہی منا پاروتی کی طرف اُچھل پڑا۔ اگر پاروتی نہ پکڑتی تو منا نیچے گر جاتا۔ وہ اُدھم مچاتا، چیختا، چلاتا اپنی دادی سے ہل مل گیا۔ اُس دن رات کو کھانے کے بعد جب شنکرن نائر پان کھا رہے تھے، اُسے ایک موزوں موقع جان کر ذرا ہچکچاتے ہوئے پاروتی بولی،

"سنو تو، آج ایک خاص بات ہوئی" شنکرن نائر نے پوچھا۔

"ہوں، کون سی بات؟"

پاروتی نے کہا "خون کا رشتہ بڑی چیز ہوتا ہے۔"

"ہوا کیا؟"

"آج شام کو میں گھاس چھیل رہی تھی۔ منا دادی کہتا ہوا میری طرف کود پڑا۔ اگر میں ہاتھ بڑھا نہ لیتی تو بچہ نیچے گر گیا ہوتا۔ مجھے چھوڑ کر جاتا ہی نہیں تھا۔"

شنکرن نائر نے کہا "پرسوں میں نے بھی اُسے دیکھا۔ وہ میری طرف بھی کود پڑا تھا۔ منا تو بالکل تمہاری طرح ہے۔"

پاروتی نے اختلاف کیا "نا، میں کہتی ہوں کہ وہ بالکل اپنے دادا کی طرح ہے۔"

گوپال کے ہاں بیٹا ہوا۔ اس سے ترقی نہیں ہوئی۔ بات یہ تھی کہ اسے کاروبار کے متعلق کوئی علم نہ تھا۔ گھر کے خرچ کیلئے کاروبار ہی سے پیسہ لینا پڑتا تھا
شام کا وقت تھا۔ پاروتی اور شنکرن نائر اپنی ایک پھلواری میں ترکاری کے پودے لگا رہے تھے۔ اس دن بھی وہ لڑکی منّے کو
لے کر آئی۔ اُس دن وہ اپنے دادا کے ہاتھوں میں کود پڑا۔
شنکرن نائر نے منّے کا چہرہ دادی کے چہرے سے ملاتے ہوئے کہا۔ "کوئی فرق نہیں" منّے کو لے جاتے وقت گوری سے کہنے کیلئے
پاروتی نے اُس لڑکی سے کہا،
"اُس سے کہہ دینا کہ روز منّے کی نظر اتارا کرے۔"
ایک شام گوری کے گھر سے منّے کے لگاتار بلک بلک کر رونے کی آواز سنائی پڑی۔ شنکرن نائر اور پاروتی گھر کے پچھواڑے میں کھڑے
تھے۔ پاروتی نے بےچینی سے پتی سے پوچھا۔ "منّا کیوں اس طرح بلک رہا ہے؟ کہیں اُس کا دم نہ گھٹ جائے! وہ لڑکی ہی تو اُسے اُٹھائے
ہوئے ہے۔ گوری کہاں گئی؟"
"شاید وہ گھر میں نہیں ہے۔ بچہ کیوں ایسے روتا ہے! اس کی صحت ٹھیک نہیں ہے کیا؟"
"گوپال بھی ادھر نہیں ہے؟"
دوسرے دن معلوم ہوا کہ گوری بے ہوش پڑی ہے۔ اسے زوروں کا بخار ہے۔ تین چار بار ڈاکٹر بلایا گیا، لیکن بخار ذرا بھی کم نہیں ہوا۔
شنکرن نائر اور پاروتی نے منّے کو گھر بلا لیا۔ اُسی لڑکی نے منّے کو لا کر دیا۔ پانچویں دن گوری نے آنکھیں کھولیں۔ گوپال کی جان ٹھنڈی
ہوئی۔
گوری نے پوچھا۔ "میرا منّا کہاں ہے؟"
"وہ اپنے دادا اور دادی کے پاس ہے"
گوری کا چہرہ چمک اُٹھا۔ اس کی آنکھیں بند ہوئیں اور پھر وہ کبھی نہیں کھلیں۔
شنکرن نائر اور پاروتی آنگن میں بیٹھے تھے۔ منّا اپنے دادا کو چاروں پاؤں پر کھڑے ہونے کو مجبور کر رہا تھا۔ اس کے بعد
وہ ہاتھی پر چڑھے گا۔ شنکرن نائر چاروں پیر پر کھڑے ہوگئے۔ منّا دادا کی پیٹھ پر چڑھ بیٹھا
اُسی وقت گوپال آ پہنچا۔ اُس نے بیٹے کو ڈانٹا۔ "ارے یہ تو کیا کر رہا ہے!"
پاروتی بولی۔ "کرنے دو بیٹا۔ تمہارے پتا تیس سال کے بعد ہاتھی بن رہے ہیں۔ تمہارے لئے ہاتھی بننے کے بعد اب آج بنے ہیں

آدم نصرت

ہر شکل گلستاں کی مجھے ایک سی لگے
کچھ دُور چل کے جاؤں تو اُسکی گلی لگے
رنگت بدن کی اُسکے کسی پھول سی لگے
ہر بار جب قریب وہ آئے نئی لگے
تبدیلیِ فضا کی شکایت بجا کہ خود
مجھ کو ہی میری اپنی زباں کھردری لگے
مایوس کر دیا ہے زمانے نے اسقدر
ہر بات اب خلافِ توقع کھری لگے
نصرت بدل گیا ہے کچھ ایسا کہ آجکل
اس شہر میں وہ کوئی نیا آدمی لگے

عزیز اکبر آبادی

اُٹھ گئیں کیا پیار کی باتیں سبھی سنسار سے
دُھوپ بچکر چل رہی ہے سایۂ دیوار سے
اب خلوصِ دل کہاں ہے اور کہاں پاسِ وفا
کل کہ دیوانے بھلے تھے آج کہ ہُشیار سے
پتھروں کے شہر میں شیشے سی نازک دل کیساتھ
مجھ کو ٹکرانا پڑا ہے ہر در و دیوار سے
زندگی کے جام میں پگھلی ہوئی ہیں تلخیاں
آگ یہ کیسی لگی ہے آج کے افکار سے
گھٹ گئے ہیں زندگی کے گیت محفل میں عزیز
پائلیں سہمی ہوئی ہیں اپنی ہی جھنکار سے

مظہر محی الدین ہبلوی

مَیں نے ہر دَرد کو سینے سے لگایا دیکھو
رشتۂ زیست کو اس طرح نبھایا دیکھو
تم نے راتوں کے اندھیرے تو بہت دیکھ لیئے
آؤ اِس دَور میں اب دل کا اندھیرا دیکھو
دل میں ہے جور و جفا، لب پہ وفا کا سرگم
کتنا گہرا ہے زمانے کا یہ رشتہ دیکھو
خضر کی عمر کہیں لگ نہ گئی ہو مظہر
وعدۂ شب کا گذرتا ہوا لمحہ دیکھو

محبوب راہی

اہلِ نظر کو قطرہ میں دریا دکھائی دے
جو لوگ کور بیں ہیں اُنھیں کیا دکھائی دے
مدت سے تک رہا ہوں میں چہروں کی بھیڑ کو
ممکن ہے ان میں کوئی شناسا دکھائی دے
آئینۂ ضمیر ہے آلودۂ گناہ
جو چہرہ اس میں دیکھئے دھندلا دکھائی دے
دل پر تو اتنے داغِ سیہ کاریوں کا ہے
صورت سے لاکھ کوئی فرشتہ دکھائی دے

مجتبیٰ حسین

سندباد جہازی کا سفرنامہ

حضرات ! میں سندباد ہوں۔ وہی سندباد جہازی جو سفر کم کرتا تھا اور سفرنامے زیادہ لکھا کرتا تھا۔ بلکہ اکثر سفرنامے تو سفر کئے بغیر ہی لکھ دیتا تھا ـــــــ میرے سفرنامے اتنے مقبول ہوئے کہ پبلشروں نے مجھے کوئی رائلٹی دیئے بغیر ہی ان کے کئی کئی ایڈیشن شائع کر لئے اور میرے کان پر جوں تک نہ رینگنے دی۔ ادھر عرصہ سے پبلشروں کا تقاضا تھا کہ میں کوئی ایسا سفرنامہ لکھوں جسے زیور طبع سے آراستہ کر کے وہ اپنی بیویوں کو زیور طلائی سے پیراستہ کر سکیں۔ اور میں بدستور اپنی لنگوٹی میں مگن رہوں پبلشروں کو لاکھ سمجھایا کہ اب پیرانہ سالی اتنی بڑھ چکی ہے کہ ہاتھ میں لکڑی پکڑتا ہوں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے لکڑی کو پکڑ رکھا ہے یا لکڑی نے مجھے۔ پھر یہ عذر بھی پیش کیا کہ عرصہ سے بلا ٹکٹ سفر کرنے کی پریکٹس چھوٹ چکی ہے، ٹکٹ خرید کر سفر کروں گا تو اپنی کج کلاہی پر آنچ آئے گی اور فقیرانہ شان الگ متاثر ہوگی۔ لہٰذا اجازت ہو تو حسب عمل درآمد قدیم سفر کئے بغیر ہی سفرنامہ لکھ ڈالوں۔ لیکن پبلشروں کا استدلال یہ تھا کہ جب میں نے اتنے سارے فرضی سفرنامے لکھ ڈالے ہیں تو اب تجربے کے طور پر عملاً ایک آدھ سفر کر لینے میں کیا قباحت ہے۔ سو چار ناچار یہ ٹھہرا کہ جب سفر کرنا ہی ٹھہرا تو کیوں نہ اس مقصد کے لئے کسی اچھے ملک کا انتخاب کیا جائے۔ اسی اثناء میں ملک ہندوستان سے یہ اطلاعیں دھڑا دھڑ ملنے لگیں کہ وہاں آئے دن فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ جاری ہے اور ہر سال فسادات کے بیج بو کر انسانی سروں کی فصل کاٹی جا رہی ہیں۔ ہندوستان کے فرقہ وارانہ فسادات کے بارے میں اخبارات میں بہت کچھ پڑھ رکھا تھا۔ اور دل بے چین تھا کہ اپنی چشم گنہگار سے ان فسادات کو دیکھوں اور اپنی نظر کو سرفراز عطا کروں۔

اپنے بے روزگار دوستوں سے اس سلسلے میں مشورہ کیا تو ایک نے یہ رائے دی۔ " اگر فسادات کو دیکھنا ہی آپ کی منزل مقصود ہے تو امریکہ چلے جائیے۔ وہاں بھی نسلی فسادات کا دور دورہ ہے (بلکہ دور کم اور دورہ زیادہ ہے) "

مگر دوسرے دوست نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ لیکن اگر آپ خالص فسادات دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر ہندوستان ہی چلے جائیے یہاں کے فسادات اتنے خالص ہوتے ہیں کہ ان میں کبھی بھی انسانیت کی ملاوٹ نہیں ہوتی۔ اس صفائی سے انسانوں کے سر کاٹے جاتے ہیں اور ان کے جسموں میں چھرے بھونک دیئے جاتے ہیں کہ عقل حیران اور نظر دنگ رہ جاتی ہے۔" مجھے بتایا گیا ہے کہ فرقہ وارانہ فساد ہندوستان کا بڑا قدیم کھیل ہے۔ اگر اس کھیل کو نہ دیکھا تو اس دنیا میں پیدا ہونے کا مقصد ہی کیا ہوا۔ ایک اور دوست نے کہا "ویسے ہندوستان میں تاج محل، ایلورا، اور اجنتا بھی دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن فرقہ وارانہ فسادات کی تو بات ہی جدا گانہ ہے۔"

غرض اس خیال کے آتے ہی میں نے دوستوں سے سامان سفر مانگنا شروع کر دیا اور اسے باندھ کر ہندوستان کی سیاحت پر روانہ ہو گیا۔ خشکی کے سفر کی بے شمار صعوبتیں جھیل کر اور راستہ بھر ٹی ٹی آئی کی نظروں سے بچ کر میں بخیر و عافیت ہندوستان پہنچ گیا۔ مگر دوستوں نے

کہہ رکھا تھا کہ ہندوستان کو بخیر و عافیت پہنچنا تو بہت آسان ہے لیکن وہاں سے بخیر و عافیت واپس آنا بہت مشکل ہے۔ لہٰذا ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی مجھے واپسی کی فکر لاحق ہو گئی۔

چنانچہ میں نے اپنا سامانِ سفر بدستور باندھے رکھا کہ خطرے کی گھنٹی بجتے ہی میں اسے اٹھا کر واپس بھاگ کھڑا ہو جاؤں گا۔ میرے قیام و طعام کا یہاں کوئی مستقل بندوبست نہیں تھا۔ لیکن بعد میں لوگوں نے بتایا کہ ہندوستان میں خود اہلِ ہند کے قیام و طعام کا کوئی مستقل بندوبست نہیں ہے۔ وہ تو بس سارے ملک کو ایک سرائے کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور آخر میں سرائے کا کرایہ بقایا میں رکھ کر اس عالمِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا میں نے ایک ریلوے پُل کے نیچے ایک وسیع اور پُر فضا جگہ اپنے قیام کے لئے منتخب کر لی۔ وہاں میری طرح اور بھی چار مقامی سیّاح رہتے تھے۔ جو دن بھر بھیک مانگا کرتے اور رات کو اپنے سفر نامے ایک دوسرے کو سُنایا کرتے۔ ہندوستان میں سیّاحوں کو درویش کہا جاتا ہے میں بھی ان درویشوں میں یوں شامل ہو گیا جیسے دودھ میں شکر شامل ہوتی ہے۔ ہم سب ایک ہی تھیلی کے چٹّے بٹّے تھے۔ لیکن مقامی درویشوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں بیرونی سیّاح ہوں اور میرا نام سندباد جہازی ہے تو اُن سب نے مل کر قہقہہ لگایا۔ اور مجھ سے کہا۔ ابتداء میں یہاں آنے والا ہر سیّاح اپنے آپ کو سندباد جہازی ہی کہتا ہے۔ تم آٹھویں سندباد ہو۔ چند دن اس ملک میں ٹھہر جاؤ گے تو خود بخود تمہارا نشہ ہرن ہو جائے گا۔" میں اُن درویشوں کی غلط فہمی کو دُور نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے کہ میرے پھٹے پُرانے کپڑوں میں بھاری رقم موجود تھی۔ وہ مجھے اپنی ہی طرح درویش سمجھتے رہے۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں بھی اُن کے ساتھ ہر روز بھیک مانگنے چلوں گا۔ تفریح بھی ہو جائے گی اور پیٹ بھی بھر جائے گا۔ مگر درویشوں نے کہا۔ میں بیرونی درویش ہوں اور اس اعتبار سے اُن کا مہمان ہوں۔ اہلِ ہند مہمان نوازی کیلئے بدنامی کی حد تک شہرت رکھتے ہیں۔ وہ کبھی مہمان کو بھیک نہیں مانگنے دیتے' بلکہ خود بھیک مانگ کر مہمان کا پیٹ بھرتے ہیں۔ سچ پُوچھیے تو یہ بڑی آسان قسم کی مہمان نوازی ہے۔ کیونکہ اس میں میزبان کو ہینگ لگتی ہے نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آجاتا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ طریقۂ عمل یہاں اُوپر سے نیچے تک رائج ہے۔ اگر عوام کبھی حکومت سے کسی مسئلے پر مدد طلب کرتے ہیں تو حکومت جواباً بیرونی ملکوں سے مدد طلب کرتی ہے اور سارا حساب بے باق ہو جاتا ہے۔ گویا اس طرح اہلِ ہند کے کاروبار بالا بالا ہی طے پا جاتے ہیں۔ میں عرصہ تک ان درویشوں کی صحبت سے لُطف اندوز' اور بھنگ، چرس، گانجہ جیسی مفرّح اور مقوّی اشیاء کے استعمال میں ید طُولیٰ حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

میں نے ان درویشوں کو اپنے ہندوستان آنے کا کوئی مقصد نہیں بتلایا تھا۔ کیونکہ اہلِ ہند کسی مقصد کے بغیر زندگی گزارنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ لہٰذا وہ نہ تو اپنی زندگی میں کوئی مقصد تلاش کرتے ہیں اور نہ کبھی کے مقصد کے بارے میں استفسارات کرنے کو ضروری سمجھتے ہیں۔

ایک دن میں نے موقع کو غنیمت جان کر ان درویشوں سے کہا۔ "بھائیو! میں اصل میں آپ کے عظیم الشان ملک کے فسادات کو دیکھنے کے لئے آیا ہوں۔ اس لئے کوئی ایسی ترکیب کیجئے کہ میں فسادات کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی سعادت حاصل کرسکوں۔" ——— فسادات کا نام سُنتے ہی درویشوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ ایک درویش نے کہا۔ "اے سندباد! تم کوئی بیرونی ایجنٹ نظر آتے ہو۔ ہمیں تمہاری نیّت پر شُبہ ہونے لگا ہے۔ خبردار جو تم نے ہم درویشوں کے سامنے پھر کبھی فسادات کا ذکر کیا۔ انہی فسادات کی وجہ سے تو ہم درویش بن گئے ہیں اور اس ریلوے پُل کے نیچے اپنی بقیہ زندگی کا بقیہ حصّہ گزار رہے ہیں۔ یہاں آنے سے پہلے ہم بھی ہندو اور مسلمان تھے۔ ہم اتفاق سے پڑوسی تھے اور خود ہم نے فسادات میں ایک دوسرے کے گھر جلائے تھے اور ایک دوسرے پر لاٹھیوں سے حملہ کیا تھا۔ لیکن جب ہمارا سب کچھ لُٹ گیا اور ہمارے افرادِ خاندان فسادات میں

مارے گئے تو ہمیں محسوس ہوا کہ ہندو اور مسلمان باقی نہیں رہے ہیں۔ کیونکہ نہ تو ہمارے پاس زر و جواہر تھے اور نہ ہی کوئی مال متاع۔ ہمارے پاس کچھ تھا ہی نہیں کہ جس کسی بنیاد پر ایک دوسرے سے نفرت کی جا سکے۔ گویا وہ شاخ ہی نہ رہی جس پر نفرت کا آشیانہ تھا۔ لہٰذا ہم چاروں درویشوں نے ایک دوسرے کو عزت کے رشتے میں باندھ لیا۔ اب ہم اس پل کے نیچے رہتے ہیں، یہاں آکر ہم اس لئے اچھے پڑوسی بن سکے کہ ہمارا کوئی مکان نہیں ہے۔ ہم اچھے دوست اس لئے بن سکے کہ نفرت کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی اونچ نیچ نہیں ہے۔ لہٰذا سندباد تم فسادات کا ذکر نہ کرو۔ کہ ہم اپنی عزت میں مالا مال ہیں اور ایک دوسرے کو سمجھنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ دوسرے درویش نے کہا۔ "سندباد تمہارا اب ہمارے درمیان رہنا مناسب نہیں ہے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ کہیں ہم خود تمہارے خلاف فساد نہ کر بیٹھیں۔ تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ تم یہاں سے اسی وقت چلے جاؤ۔ اور اس پل کا تخلیہ کر دو، ورنہ ہم سے برا کوئی نہ ہوگا۔ دوسرے درویش کی سختی کو محسوس کر کے میں خوف زدہ ہو گیا اور اپنا سامان اٹھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ کئی دنوں تک پیدل چلنے کے بعد میں ایک شہر میں پہنچا جو ویرانی اور تباہی کا جیتا جاگتا نمونہ تھا۔ لوگ سہمے ہوئے اور خوف زدہ سے تھے۔ میں نے ایک شخص سے پوچھا۔ بھائی! آپ کے شہر پر یہ نحوست کیوں برس رہی ہے، اس شخص نے کہا ابھی دو دن پہلے اس شہر پر فساد نازل ہوا تھا۔"

فساد کا نام سنتے ہی میری باچھیں کھل اٹھیں۔ میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ "کہاں ہو رہا ہے فساد! مجھے وہاں لے چلئے۔ میں ہزاروں میل کی مسافت کر کے کر کے یہاں اسی لئے تو آیا ہوں۔ مجھے فوراً فساد کے پاس لے چلئے۔"

اس شخص نے حیران نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ بھلا فساد بھی کوئی ٹکنے والی چیز ہے۔ وہ تو بس آندھی کی طرح آتا ہے اور بگولے کی طرح نکل جاتا ہے۔" میں نے پوچھا پھر کب آئے گا فساد اس شہر میں۔"

وہ بولا، ابھی ابھی تو فساد نے سارے شہر میں جھاڑو سی پھرا دی ہے۔ جب تک یہ شہر از سر نو ترقی نہیں کرے گا اور یہاں کے لوگ خوشحال نہ ہو جائیں گے اس وقت تک یہاں فساد کے آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ لہٰذا آپ فساد کی تلاش کرنے کے لئے کسی خوش حال اور آباد شہر کی طرف چلے جائیں۔ اس وقت تو فساد نے اس شہر کو لیموں کی طرح نچوڑ لیا ہے اور انسانی سروں کی فصل کٹ چکی ہے۔ پھر فسادات کے ماہرین بھی اس شہر کو چھوڑ کر دوسرے آباد شہروں کی طرف چلے گئے ہیں۔

میں بہت مایوس ہوا اور دوسرے شہر کی طرف نکل کھڑا ہوا۔ فسادات کے اور میرے درمیان اچھی خاصی آنکھ مچولی جاری تھی۔ میں ہر روز اخبارات کا مطالعہ کرتا۔ اطلاعیں ملتیں کہ فلاں شہر میں فساد ہو گیا۔ فلاں گاؤں میں کئی مکانات جل گئے۔ کئی سو افراد نے بیک وقت داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور داعیٔ اجل کا کام بڑھا دیا۔ مگر افسوس کہ میرے پہنچنے تک فسادات کی تباہی ختم ہو چکی ہوتی۔ اور امن کمیٹیوں کی تباہیوں کا آغاز ہو چکا ہوتا۔ میں ایک ایک شخص سے فسادات کا پتہ پوچھتا رہا۔ یہاں تک کہ میں تقریباً مایوس ہو گیا۔ مجھے اپنا وطن بے ساختہ یاد آنے لگا اور میں اپنے وطن واپس چلا جانا چاہتا تھا کہ ایک دن اچانک میری ملاقات ایک شخص سے ہو گئی جسے لوگ اپنا لیڈر سمجھتے تھے اور سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ اس لیڈر سے جب میں نے اپنا تعارف کرایا تو وہ بہت خوش ہوا۔ مگر بعد میں لوگوں نے بتایا کہ اس کی خوشی صرف ایک سیاسی چال تھی۔ اس لیڈر کی غذا یہ تھی کہ وہ صبح میں اپنے نام کے ساتھ "زندہ باد۔ زندہ باد" کے نعرے سنتا۔ دوپہر میں اپنے حواریوں کی چاپلوسی سے لطف اندوز ہوتا اور رات میں وہ سارے کام کرتا جن کے کرنے کے لئے قدرت نے رات بنائی ہے۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میں سندباد جہازی ہوں تو اس نے دوسرے کمرے میں جا کر اپنے سکریٹری سے سندباد جہازی کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور کمرے سے نکل کر میرے سفرناموں کی تعریف کرنے لگا۔ جب میں نے پوچھا کہ آپ کو میرا کون سا سفرنامہ زیادہ پسند آیا تو وہ پھر اپنے سکریٹری کے کمرے کی طرف چلا گیا اور واپس آ کر کہنے لگا۔ "میرے سکریٹری کو اب

یہ یاد نہیں رہا کہ مجھے آپ کا کون سا سفرنامہ پسند آیا تھا۔ تاہم میں نے سلیم بھائی سے کہہ رکھا ہے کہ وہ شام تک کوئی سفرنامہ پسند کرکے آپ کو اس کی اطلاع دیدے۔"

اس لیڈر سے میری گفتگو نہ صرف دلچسپ بلکہ مضحکہ خیز بھی رہی۔ باتوں باتوں میں میں نے اس لیڈر سے اپنے ہندوستان آنے کا مقصد بیان کیا اور شکایت کی کہ آپ لوگ اپنے شہرۂ آفاق فسادات کسی طے شدہ پروگرام کے مطابق کیوں نہیں کرتے، تاکہ سیاحوں کو فسادات کے انعقاد کی پہلے سے اطلاع مل جائے تو وہ وقتِ مقررہ پر پہنچکر لطف اندوز ہو سکیں۔ پھر میں نے کہا کہ میں فسادات کا نظارہ کرنے کی غرض سے ہندوستان آیا تھا۔ لیکن فسادات ہمیشہ ایسے شہروں میں ہوتے رہے جو مجھ سے دور واقع تھے۔ اب حسرت اپنے دل میں لے کر ہی اس ملک سے جا رہا ہوں۔

میرے اس بیان کو سن کر لیڈر نے زوردار قہقہہ لگایا۔ اور بولا۔ مسٹر سندباد! آپ تو بڑے معصوم آدمی نظر آتے ہیں۔ اجی، فسادات کو دیکھنا کون سا مشکل کام ہے۔ اگر آپ کی خواہش ہے تو میں کل ہی اس شہر میں ایک فساد کروا دیتا ہوں۔ ہم ہندوستانی اپنے مہمانوں کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ میں اتنا بڑا لیڈر ہوں۔ کیا میں آپ کی اتنی چھوٹی سی آرزو بھی پوری نہیں کر سکتا۔"

لیڈر کی یہ تقریر دل پذیر سن کر میں گیند کی طرح اچھل پڑا۔ اور لیڈر پر حملہ آور ہونے کے انداز میں اس سے لپٹتے ہوئے بولا "لیڈر صاحب! میں آپ کا یہ احسان عمر بھر نہ بھول سکوں گا۔ آپ نے میری مشکل آسان کردی۔ اب میں اطمینان سے آپ کے ملک کے فسادات کو دیکھ کر اپنے وطن واپس جاؤں گا۔ اور بقیہ زندگی سفرنامہ لکھنے میں گنوا دوں گا۔"

اس پر لیڈر نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "مسٹر سندباد۔ مگر پہلے یہ بتایئے کہ آپ کس قسم کا فساد دیکھنا پسند کریں گے؟" میں نے پوچھا۔ "آپ کے پاس فساد کی کتنی قسمیں ہیں۔؟"

وہ بولا۔ "اے کلاس سے لے کر تھرڈ کلاس تک فسادات کی کئی قسمیں ہیں۔ افواہی فساد، تباہی فساد، خواہی نخواہی فساد وابہی تباہی فساد۔ ایک قسم کا فساد ہو تو گناؤں بھی۔ یہ بتایئے کہ آپ سیدھا سادا فساد دیکھنا پسند کریں گے یا ایک دم ہنگامہ خیز" میں نے پوچھا ان دونوں فسادات میں کیا فرق ہے؟

وہ بولا۔ سیدھا سادا فساد اصل میں ہنگامہ خیز فساد کا ٹریلر ہوتا ہے، اس میں صرف دکانات اور مکانات جلائے جاتے ہیں۔ باشندوں کی تھوڑی سی ہڈیاں اور پسلیاں توڑی جاتی ہیں۔ اور اگلے فساد کی تمہید باندھی جاتی ہے۔ ہنگامہ خیز فساد ایک دم ٹاپ کلاس ہوتا ہے۔ اس میں دکانات و مکانات جلانے کے علاوہ انسانوں کا خون بھی بہایا جاتا ہے۔ ان کے پیٹوں میں چھرے بھونکے جاتے ہیں۔ بچوں کو ذبح کیا جاتا ہے۔ عورتوں کی عصمتیں بڑے اہتمام سے لوٹی جاتی ہیں۔ یہ فساد (ONLY FOR ADULTS) ہوتا ہے۔ الغرض بڑا ہی لطف آتا ہے۔"

میں نے کہا جب اتنی دور سے آیا ہوں تو اے کلاس فساد کو دیکھنا ہی پسند کروں گا۔ بار بار ایسا موقع پھر کہاں ملے گا۔

لیڈر نے کہا۔ تو گویا بات پکی ہو گئی سمجھئے۔ آپ کو اس فساد کے انعقاد کے لئے ۲۰ ہزار روپے دینے ہوں گے تاکہ میں فسادیوں کو تیار کر سکوں۔ آپ اطمینان رکھیں کہ اگر آج آپ فساد کا آرڈر ہمارے پاس بک کرائیں تو کل شام تک فساد تیار ہو جائے گا۔ میں نے خوشی خوشی ۲۰ ہزار روپے نکال کر لیڈر کو دیدیئے۔ اس نے فوراً اپنے آدمیوں کو بلوایا اور ان کے ہاتھوں میں کرنسی نوٹ دیکھتے ہوئے بولا۔ میرے دوست سندباد ایک دم اے کلاس فساد دیکھنا چاہتے ہیں۔ تم لوگ کل شام تک فساد کے انتظامات مکمل کر لینا۔ کل شام میں ٹھیک چھ بجے مسٹر سندباد شہر کے چوک میں فساد کو دیکھنے آئیں گے، وہ ہمارے مہمان ہیں ان کا خیال رکھنا۔" جب اس کے آدمی چلے گئے تو میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اور فسادات کے بارے میں اس سے مختلف استفسارات کرنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ آپ ہندوستانی اس قدر آسانی سے کس طرح فساد برپا کر لیتے ہیں" بھئی کمال ہے"! وہ بولا۔ فساد برپا کرنا ہم ہندوستانیوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ برسوں کے ریاض کے بعد اب ہم نے اِس فن میں وہ مہارت حاصل کر لی ہے کہ کسی وجہ کے بغیر بھی فساد برپا کر دیتے ہیں۔ فساد کے لئے ایک ہندو اور ایک مسلمان کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اِن دونوں کے اتحاد کے بغیر فساد کا ہونا ناممکن ہے۔ اگر ایک ہندو نے کسی مسلمان کی طرف گھور کر دیکھا تو یہ بات خود ایک ہنگامہ خیز فساد کے لئے بہت کافی ہے۔ ہندو اور مسلمان کی بات تو چھوڑیئے، اگر کسی مسلمان کے کتّے نے کسی ہندو کے کتّے پر بھونکنا شروع کیا تو سمجھ لیجئے کہ فساد کی بنیاد پر تعمیر ہو رہی ہیں۔ جب کتّے ایک دوسرے پر بھونکنا ختم کر دیں گے تو اُن کے مالکین ایک دوسرے پر بھونکنے لگ جائیں گے۔ اور بھونکنے کی یہ وبا اتنی عام ہو جائے گی کہ فضا میں شور و غل مچ جائے گا اور اگر ایسے میں کسی منچلے نے مذاق مذاق میں اپنا چاقو کسی کے پیٹ میں اُتار دیا تو سمجھ لیجئے کہ فسادات کا باضابطہ افتتاح ہو گیا ہے۔

میں بڑی دیر تک اس لیڈر فسادات کے بارے میں تفصیلات حاصل کرتا رہا اور اپنے سفرنامے کے اہم نوٹس لیتا رہا۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں دوسرے دن ٹھیک چھ بجے شہر کے چوک میں موجود رہوں اور حسبِ استطاعت فسادات کا نظارہ کروں۔ میں نے لیڈر سے رخصت ہو کر رات ایک کباڑ خانے میں گزاری اور دوسرے دِن صبح ہی سے ہندوستان کے شہرۂ آفاق فسادات کا دیدار کرنے کی تیاریاں کرنے لگا۔

شام کو چھ بجے مقررہ وقت سے کچھ منٹ پہلے جب میں چوک میں پہنچا تو خوب چہل پہل تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے فساد کا دُور دُور تک کہیں پتہ نہیں ہے، مجھے شبہ ہونے لگا کہ کہیں مجھے لیڈر نے دھوکہ نہ دیا ہو۔ دُور دُور تک اُس کے آدمی نظر نہیں آتے تھے۔ زندگی بڑی حسین نظر آ رہی تھی۔ میں چوک کے کلاک ٹاور پر چڑھ گیا تاکہ محفوظ مقام سے فسادات کا نظارہ کر سکوں۔ چھ بجنے میں ابھی ایک منٹ باقی تھا کہ اچانک سڑک پر ایک اسکوٹر کی ٹکر دوسری اسکوٹر سے ہو گئی۔ کسی نے چیخ کر کہا۔ جس اسکوٹر نے ٹکر دی ہے وہ مسلمان اسکوٹر ہے۔ کسی نے کہا۔ جی نہیں یہ ساری کارستانی ہندو اسکوٹر کی ہے۔ ہم اپنے مذہب پر اتنے بڑے حملے کو برداشت نہیں کر سکتے۔ حالانکہ میں نے کلاک ٹاور پر سے دیکھا کہ دونوں اسکوٹروں پر لیڈر کے آدمی سوار تھے اور جو اصحاب شور و غل مچا رہے تھے وہ بھی لیڈر کے آدمی ہی تھے۔ میں کلاک ٹاور پر سے چیخ کر کہنا چاہتا تھا کہ میں دھوکہ دہی کے ذریعہ ہونے والے فساد کو نہیں دیکھنا چاہتا کہ اسی اثنا میں ایک چاقو فضا میں چمک اُٹھا۔ پھر آن کی آن میں کئی چاقو فضا میں لہرانے لگے۔ برچھے اور بھالے بھی فضا میں بلند ہو گئے۔ ہندو چاقو مسلمان کی گردن تلاش کرنے لگا۔ اور مسلمان چاقو ہندو کی گردن ...... زندگی میں پہلی بار مجھے ہندوستان کے مشہور و معروف فسادات کو دیکھنے کا شرف حاصل ہو رہا تھا۔ آج دِل کی مراد پوری ہو رہی تھی۔ میں بہت خوش تھا۔ انسانوں کے سر اِس قدر صفائی سے کٹ رہے تھے کہ میں عش عش کرنے لگا۔ ایک فسادی نے ایک کمسن بچّے کو اِس کمال سے اپنے نیزے پر اُٹھا لیا کہ میرے مُنہ سے بے ساختہ تعریف نکل گئی۔ میں نے اُس کے فن پر یوں داد دی جیسے اُس نے کوئی شعر کہہ دیا ہو۔ اُس نے میری تعریف کے جواب میں مؤدبانہ سلام کیا تو میں نے چیخ کر کہا۔ مکرّر ارشاد ہو۔ اِس پر اُس نے جھپٹ کر ایک اور بچّے کو نیزے پر اُٹھایا۔ مجھے اُس کا وار کچھ زیادہ پسند نہ آیا تو میں نے ہوٹنگ کے انداز میں اُس سے کہا۔ اَب مقطع کی طرف آجایئے۔" وہ آگ بگولہ ہو گیا اور کلاک ٹاور کی طرف بڑھنے لگا۔ اُس وقت تک شہر کے چوک میں کُشتوں کے پُشتے لگ گئے تھے اور بازار میں صرف انسانوں کا خون بک رہا تھا۔ میں ابھی اچھی طرح فسادات کا نظارہ کر بھی نہ پایا تھا کہ وہ فسادی کلاک ٹاور پر چڑھ گیا۔ وہ میرے سر پر آن کھڑا ہوا اور اپنا نیزہ بلند کر کے مقطع ارشاد کرنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے گڑگڑا کر اُس سے کہا۔ "میں بیرونی باشندہ ہوں۔ میں تو صرف فساد کو دیکھنے کے لئے یہاں آیا ہوں۔ مجھے نہ مارو۔" اِس پر اُس نے پوچھا۔ "بتاؤ تم ہندو ہو یا مسلمان؟"

میں نے کہا۔ میں نہ ہندو ہوں نہ مسلمان۔ میں تو صرف ایک انسان ہوں۔" اس پر وہ بولا۔ جب تک آدمی ہندو یا مسلمان نہ بنے۔ اُس وقت تک وہ اِنسان کیسے بن سکتا ہے۔ تب میں نے کہا۔ لیکن ہندو اور مسلمان بننے کے بعد تو انسان اِنسان کہاں باقی رہ جاتا ہے۔ گاجر اور مولی میں تبدیل ہو کر رہ جاتا ہے۔؟"

وہ میری گستاخی کا جواب نیزے سے دینا چاہتا تھا کہ میں نے اچانک اُس لیڈر کا حوالہ دیا جسے میں نے فساد کے لئے بھاری رقم دی تھی۔ لیڈر کا نام سُن کر اُس نے نیزہ اپنے ہاتھ سے پھینک دیا۔ مگر اسی اثناء میں دوسرے فسادیوں نے مجھے نرغے میں لے لیا۔ میں نے گڑگڑا کر کہا کہ مجھے ایک بار لیڈر سے مل لینے دو۔ اس کے بعد میرے ساتھ جو چاہو سلوک کر لینا۔ وہ سب مجھے دھکے دے کر اپنے لیڈر کے پاس لے گئے۔ لیکن لیڈر اُس وقت بہت مصروف تھا۔ کسی نے بتایا کہ وہ امن کمیٹی کا صدر نشین بن گیا ہے اور کمیٹی کے اجلاس کی صدارت کر رہا ہے۔ میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ وہ فساد میں ہلاک ہونے والوں کی یاد میں اپنی آنکھوں سے خشک آنسو بہا رہا تھا۔ اُس نے کہا فسادات ہمارے مُلک کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہیں۔ ہمارا سر شرم سے جُھک گیا ہے۔ میں حیران نظروں سے اُس لیڈر کو یوں دیکھتا رہا جیسے اُسے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد لیڈر نے اعلان کیا۔ "میں اِس تباہی سے متاثر ہوئے والوں کی امداد کے لئے اپنی طرف سے ریلیف فنڈ میں دس ہزار روپے کا عطیہ دیتا ہوں۔" اِس پر سارے ہال میں تالیاں گونج اٹھیں لیڈر کی جے جے کار ہونے لگی۔ اور میں تالیوں کی گونج میں پکارتا رہا۔ حضور! میں نے آپ کو ۲۰ ہزار روپے دیئے تھے۔ آخر بقیہ ۱۰ ہزار آپ نے صرف اپنے ریلیف کے لئے کیوں رکھ لئے۔؟"

لیکن میری آواز کا وہی حشر ہوا جو نقار خانہ میں طوطی کی آواز کا ہوتا ہے۔ میں نے لیڈر سے اپنی دی ہوئی رقم کا حساب پُوچھنے کا خیال ترک کر دیا۔ کیونکہ اِس وقت میرے کانوں میں خطرہ کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ میں فسادیوں کی نظر بچا کر بھاگ کھڑا ہوا اور کئی دِن تک بھاگتا رہا۔ ایک دِن بالآخر میں اپنے وطن پہنچ گیا۔ لیکن مجھے اب بھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں مسلسل بھاگ رہا ہوں اور فسادی میرا تعاقب کر رہے ہیں۔ اب ہندوستان کے تاج محل، ایلورہ اور اجنتا تو مجھے یاد نہیں رہے۔ ہاں صرف وہاں کے فسادات کی یاد تازہ ہے اور اس قدر تازہ ہے کہ میں اکثر نیند سے چونک کر اُٹھ بیٹھتا ہوں اور چیخنے لگتا ہوں۔

"مجھے لیڈر سے ایک بار مل لینے دو۔!!"

اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرا سارا وجود ایک ایسا نیزہ بن گیا ہے جس پر ایک معصوم بچے کا سر لٹکا ہوا ہے۔ ▲

ڈراما
(مرہٹی)

رتناکر مہتکری
ترجمہ: نور پرکار

ہم آواز

شری کانت
نندنی

کھلی کھڑکی میں سورج نے شام کی ہلکی کرنوں کا جال پھیلایا ہے۔ تیس سالہ اندھا جوان بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے قریب ہی چھوٹی ٹیبل پر لیمن جوس کی ایک بوتل رکھی ہوئی ہے اور اس کے پاس ہی ایک گلاس! دور سے موسیقی کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ داخل ہوتی ہے۔ عمر پچیس کے اوپر، پاؤں میں اونچی ایڑی کے سینڈل! سینڈل کی آواز کی جانب وہ مڑ جاتا ہے۔

...... تم آگئیں، میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔

...... اپنی جگہ سے ہلنے کا نہیں! (اُسے اچھی طرح سے بٹھاتی ہے)

...... تم بھی تو بیٹھو۔ اور یہ تکلفات کس لئے؟

...... کیسے ہو شری؟

...... کیسا لگ رہا ہوں؟

...... گال اوپر آ گئے ہیں۔

...... ہاں! یہ اندھاپن اب راس آگیا ہے۔ نہ آنا کہیں نہ جانا کہیں! بس سبھی کچھ جیسے شانت ہے! صرف میں اور میری تحریر! تم کیسی ہو؟ کیا صحت پہلے جیسی ہی ہے؟

...... نہیں تو! اب تو پہلے سے ڈبل ہوگئی ہوں۔ سبھی تو کہتے ہیں کہ نندنی کو شادی راس آگئی ہے۔

...... واقعی؟ میں بھی تو اکثر کہا کرتا تھا کہ بیاہ کے بعد تمہاری صحت اچھی ہو جائے گی۔ (لحہ بھر رکنے کے بعد) میں تمہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اگر تم ناراض نہ ہو جاؤ تو میں اپنے ہاتھوں سے تمہاری صحت کا اندازہ لگا لوں۔

...... (وہ قدرے گھبرا جاتی ہے۔ پھر بھی قابو پاتے ہوئے) اس میں ناراض ہونے جیسی کیا بات ہے؟ (اس کا ہاتھ پکڑتی ہے وہ اُس کے ہاتھ اور اُس کی کمر دیکھتا ہے پھر اُس کے کندھے پکڑتے ہوئے)

...... نندنی باہر دھوپ ہے ابھی؟

...... ہاں پرکاش، اب تو کرنیں سنہری ہو چلی ہیں اور گلاب کی ڈالی پر ایک چھوٹی سی چڑیا (بولتے بولتے چپ ہو جاتی ہے (دونوں لحہ بھر کے لئے خاموش، ساکت!)

...... یعنی شام اب بھی ویسی ہی ہے (یکایک آہستہ دور کرتے ہوئے) کہاں اچھی ہوئی ہے صحت تمہاری؟ تم تو ابتک ویسی ہی ہو۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تم بیمار ہو۔

...... تم کچھ نہیں سمجھ سکتے شری۔

...... آج یہیں رہوگی نا تم؟

...... نہیں! میں اپنی بھاوج کے گھر رہوں گی۔

...... تو پھر کل!

...... کل شام کی گاڑی سے واپس جا رہی ہوں۔

...... کیا رُک نہیں سکوگی؟

...... نہیں! وہ خود ہی آنے والے ہیں مجھے لینے کے لئے۔ بچے کچے تو ہیں ہی۔ مینو لی تو اسکول بھی ماں کے سوائے نہیں جاتی! خفا نہ ہونا شری کانت! آج اپنی اتنی ہی ملاقات۔ اس کے بعد بھی شاید ہی پھر کبھی اپنی ملاقات ہو سکے، سنا ہے اُن کا بہت دور کہیں تبادلہ ہونے والا ہے۔

...... کیسا ہے تمہارا پتی؟

...... تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ وہ بہت ہی اچھے ہیں۔ شانت

بھی ہیں اور کم کو بھی!

...... تمہیں ایسے ہی پتی کی ضرورت تھی۔

...... تو وہ بھی اچھا ہے اور سوسائٹی میں عزت بھی۔

...... خوش قسمت ہو تم!

...... اس کے بعد کا تو کچھ نہیں کہہ سکتی۔ البتہ اب تو بہت سکھی ہوں۔

...... اس کے بعد کی زندگی بھی اچھی ہی گزرے گی۔ اچھے لوگوں کی نیک بھاگوان کو ہوتی ہے۔ کیا پیو گی؟ میرا لیمن جوس تو یہیں رکھا ہے، البتہ گلاس ایک ہی ہے۔

...... (گلاس میں انڈیلتے ہوئے) پہلے تم پی لو۔ پھر میں پی لوں گی۔

...... (تعجب سے) کیا اسی گلاس میں پیو گی۔؟

...... اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟

...... تو پھر دے دو۔ بچے کتنے ہیں؟۔ دو؟

...... ہاں! دو ہیں۔ ایک لڑکا ایک لڑکی! بس اتنا ہی چھوٹا سا سنسار ہونا چاہئے۔ دونوں ہی شریر ہیں۔

...... کیسے لگتے ہیں۔؟

...... اب کیا کہوں۔ لڑکی مجھ جیسی اور لڑکا شنشی آن کا روپ لایا ہے۔ لوگ کہتے ہیں لڑکا ماں جیسا ہو تو بھاگیوان کہلاتا ہے۔

...... یہ باتیں میں کیا جانوں؟ ہاں یہ تو ٹھیک ہی ہوا، کہ تمہاری زندگی سپھل ہو لی۔

...... ہاں! کبھی کبھار پچھلی یادیں اپنا سر جوڑیں میرے سامنے آ کھڑی ہوتی ہیں۔ لیکن تم نے کہا تھا نا کہ ہمیشہ اپنے آپ کو مصروف رکھو۔ تاکہ ...... تو دن رات مصروف ہی رہتی ہوں۔ سر اٹھا کر دیکھنے کی بھی مہلت نہیں ملتی۔

...... مجھ جیسے اندھے کے ساتھ بیاہ رچا کر زندگی بھر دکھ جھیلنا پڑتے۔ جذبات کے ریلے میں بہنا کہاں کا انصاف ہے۔؟

...... آنکھیں حادثے کا شکار ہو گئیں۔ یہ قدرت کی مہربانی ہے۔ تم اچھے خاصے کلاکار تھے۔ ایک بہت بڑے مصنف!

...... اب تو اور بھی بہت بڑا ادیب ہو گیا ہوں۔ ہر چیز پہلے سے زیادہ صاف اور واضح ہو گئی ہے۔ لیکن میں تمہیں مزید تکلیفیں نہیں دینا چاہتا تھا۔ (مسکرا کر) کیا کیا خیالات تھے تمہارے اُس وقت! بیاہ رچا کر ٹھاٹ سے زندگی گزارنے کے ___ میں صرف لکھتا رہوں گا اور باقی کے سارے کام تمہارے ذمے ہوں گے۔ لیکن زندگی کے رُخ ہی کچھ نرالے ہیں۔ خیالوں کی دنیا سے اس کا دور دور تک کوئی واسطہ نہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ میں بیاہ کے بعد کچھ نہ لکھ سکتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ کچھ دنوں تک تم میرے لئے بہت ساری قربانیاں دیدیتیں اور پھر مجھ سے اکتا جاتیں۔ میں خود ناراض ہو جاتا۔ تم بھی مجھ سے ناراض ہو جاتیں۔ بہت اچھا کیا نندا میں نے۔ میں نے تمہاری ضد کو ٹھکرا دیا۔ میں نے جو کچھ کیا اس کے لئے پشیمان نہیں ہوں، خوش ہوں۔ کسی بات کا پچھتاوا نہیں ہے مجھے۔!

...... (ہلکی آواز میں) ہاں! کچھ کچھ مجھے بھی ان باتوں کا احساس ہو چلا ہے۔ ممکن ہے کہ اب میں پہلے سے زیادہ کٹھور...... سخت دل بن گئی ہوں میں!

...... نندا جو کچھ ہوا بہت ہی اچھا ہوا۔ اگر تم نے اپنا جیون میرے لئے تباہ کیا ہوتا تو میں کب کا ختم ہو چکا ہوتا۔ اسی لئے میں نے اپنے آپ سے تمہیں دور کرنے کے لئے ایک ضد کا سہارا لیا۔ یہاں تک کہ تمہاری کسی بھی بات کی پروا نہیں کی۔ تمہاری کمی میری سکریٹری نے پوری کر دی۔ اس کی مدد سے میں نے کافی لکھا کافی پڑھا۔ وہ بہت ذہین ہے۔ خط و کتابت، لین دین بھی کچھ اُس کے ذمے ہے۔

...... نام اُس کا شمّی ہے نا؟

...... (مسکراتے ہوئے) اُس سے حسد نہ کرو نندی۔ بہت شریف اور غریب لڑکی ہے۔

...... تم تو اُس سے بہت خوش نظر آ رہے ہو۔

...... ہونا بھی چاہئے۔ فی الحال اُس کے سوا میرا کون ہے؟ قدم قدم پر اس کا ساتھ ضروری ہے۔ کبھی کبھار تو لگتا ہے

کہ بھی مرد اسی طرح عورتوں کی مدد کی وجہ سے زندہ رہیں۔

...... تم اُس سے بیاہ کیوں نہیں کر لیتے ؟

...... ہاؤ سِلی ! اب تو بیاہ کا خیال تک نہیں آتا۔ میرا بیاہ تو میری تحریروں اور رو چاروں سے ہو گیا ہے۔ مجھے بہت بڑا ادیب بننا ہے ندا۔

...... شری کانت، تم یقیناً بہت بڑے ادیب بن جاؤ گے۔ تم تو آج بھی مہان ہو۔

...... تم تو وہی پُرانا برتاؤ کر رہی ہو۔ لگتا ہے جیسے پُرانے دن آج پھر لوٹ آئے ہیں۔ میرے اتنے قریب تو تمہارے سوا اور کوئی نہیں آیا۔ وہ مجھ سے بھی ڈرتی ہے۔ "صاحب" کے سوا کے بات نہیں کرتی۔ صرف ایک ہی چیز تم دونوں میں مشترک ہے۔

...... وہ کون سی .... ؟

...... آواز ! - تم دونوں کے آواز میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہسپتال سے نکلنے کے بعد میں یہاں چلا آیا اور اخباروں میں "سکریٹری کی ضرورت" کا اِشتہار دے دیا۔ جب وہ انٹرویو کے لئے یہاں آئی تو میں نے صرف اُس کی آواز کی بنا پر اُسے رکھ لیا۔ میں نے اُس سے پوچھا بھی کہ ندا سے تمہارا کیا رِشتہ ہے .؟ یہ سوال سُن کر وہ بوکھلا گئی تھی۔ چونکہ اُس کے لئے تمہارا نام بالکل نیا تھا۔ بس اُسے رکھ لیا۔ صرف اِس لئے کہ تمہاری اور اُس کی آواز میں کوئی فرق نہیں۔

...... یعنی اُس وقت بھی تم مجھ سے متعلق ہی سوچ رہے تھے۔ اِسی لئے تمہیں لگتا ہو گا کہ ہم دونوں کی آواز میں کوئی فرق نہیں۔ کہاں ہے وہ۔ ؟

..... میں نے ہی اُسے کہدیا ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے وہ یہاں نہ آئے، تم جو آنے والی تھیں۔ تمہارا جب سے خط آیا۔ میں تمہاری آمد کا منتظر ہوں۔ میں اکثر ذکر کرتا ہوں تمہارا۔ میں نے اُس سے کہدیا کہ مجھے ندا سے ملنا ہے۔ وہ خود ہی کہیں سے تمہارا پتہ لے آئی۔ جانتی ہو میں کیوں تم سے ملنا چاہتا تھا۔ ؟

...... کیوں ؟

...... صرف تمہارے مُنہ سے سُننے کے لئے کہ تم خوش ہو۔ میرا ترج صحیح ثابت ہوا۔ سچ کہا جائے تو ندا بی اسی ایک تمہاری خوشی کے لئے زندہ ہوں۔ کبھی کبھار پانے سے زیادہ کھونے میں حاصل ہوتا ہے۔ میرے لئے تم نے اپنی زندگی تباہ نہ کی۔ تباہ نہ کرنا پڑی یا اس ایک حقیقت سے بہت خوش ہوں۔ مجھ میں ایک نئی قوت آ گئی ہے ندا۔ میں پہلے کی بہ نسبت اور بھی بڑا...

...... میری کلا بڑھ گئی ہے۔ اگر تمہارے متعلق کوئی بُری خبر سُنتا تو میں ختم ہو چکا ہوتا۔ میری ہمّت پست ہو چکی ہوتی۔ اِسی لئے ...... اِسی لئے ایکبار میں تمہارے مُنہ یہ سُننا چاہتا تھا کہ تم خوش ہو۔ سُکھی ہو۔ یہاں آ کر آج تم نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ مجھے موت کے بھیانک راستے سے بچا لیا ہے۔ تمہیں لگتا ہو گا۔ کہ میں آج بھی اُسی ایک پُرانی راہ پر قائم ہوں اور متواتر تم سے باتیں کئے جا رہا ہوں۔ یہ تمام باتیں میں تنہائیوں میں تم سے کہہ چکا ہوں۔ آج تم میرے سامنے ہو تو پھر اُن باتوں کو کیسے چھپاؤں۔ کیوں نہ میں تمہارے سامنے انہیں بیان کر دوں۔؟

...... میں خود بھی تمہیں دیکھنے کے لئے بے چین تھی۔ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوں کہ تم اب بھی پہلے ہی جیسے ہو (مسکراتے ہوئے) ہاں ندا میں بھی سُکھی ہوں۔ خوش بھی ہوں۔ اندھا ہونے کے بعد بھی مجھے کسی چیز کا کوئی غم نہیں۔ میری سکریٹری ہر کام بحسن و خوبی انجام دیتی ہے۔ مجھے کسی بات کی کمی کا احساس ہی نہیں ہونے دیتی۔ کبھی کبھار تو میں اُس سے پوچھ لیتا ہوں کہ آخر تم اِتنا سارا کام کیوں کرتی ہو؟ اِتنی فکر کیوں ...... ؟

...... اب باہر اندھیرا ہو رہا ہے، شری مجھے جانا چاہئے۔

...... کیا بات ہے ندا، آج تم پہلی سی اپنائیت سے باتیں نہیں کر رہی ہو۔ پرائی کیوں لگ رہی ہو آج۔ ؟

..... نہیں شری! تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے۔ میں آج بھی پرانی روش پر قائم ہوں۔ مجھ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

..... بچوں کے لئے کچھ نہ کچھ دینا چاہئے تھا۔ لیکن اب تم ہی بازار سے اُن کی پسند کی کوئی چیز خرید لو اور انہیں میرے نام سے دے دو۔

..... ہاں خریدوں گی۔

..... لگتا ہے آج پھر بہت دِنوں کے بعد خوب لکھ سکوں گا' وہ آجائے تو شروع کردوں۔

..... اچھا شری کانت، اب اجازت چاہوں گی۔ اپنی صحت کا خیال رکھنا۔

..... کوشش کروں گا۔

..... ہاں .... ہاں اٹھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم بیٹھے رہو۔ اب میں چلتی ہوں۔ گڈ نائٹ۔

(وہ چلی جاتی ہے۔ جاتے وقت اُونچی ایڑی کے سینڈل زور سے بجتے ہیں۔ وہ لیمن بوس پی لیتا ہے۔ وہ پھر واپس آجاتی ہے۔ اب کی بار اُس کے پاؤں میں اُونچی ایڑی کے سینڈل نہیں ہیں۔ عام قسم کے بنے چپّل ہیں۔ اور ہاتھ میں ایک شال۔!)

..... صاحب .... !

..... آوں — کون ؟

..... میں سُمتی ہوں۔

..... تعجّب سے، اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے) کون .... کون؟

..... اُٹھنے کی ضرورت نہیں صاحب! میں ہوں سکریٹری سُمتی! آپ یہ شال پہن لیجئے۔ باہر ٹھنڈ پڑ رہی ہے۔

..... تم ہو سُمتی ...... میں تو سمجھ رہا تھا نندنی پھر واپس آگئی ہے ..... تم دونوں کی آواز میں کوئی فرق نہیں۔ آدمی کسی بھی وقت دھوکہ کھا سکتا ہے۔ یہ بھی قدرت کا عجیب کھیل ہے سُمتی ......!!!

ناول
(تیسری قسط)

کشمیری لال ذاکر

دھرتی سدا سہاگن

تیسرا باب

شیتل کے جاگنے تک ماں کوئیں سے نہا کر اور پانی کا گھڑا لے کر واپس آ گئی تھی۔ وہ تو منہ اندھیرے جاگ کر چکی پیسا کرتی تھی اور پھر نہانے جایا کرتی تھی۔ لیکن آج اُس نے چکی نہیں پیسی۔ چکی کی آواز سے شیتل کی نیند خراب ہو گی۔ آج کے لئے پسا ہوا آٹا پڑا تھا۔ دن میں کسی وقت اور آٹا پیس لے گی۔ وہ کونے میں رکھی چکی کو بنا ہاتھ لگائے ہی باہر چلی گئی۔ اُس کے واپس آنے تک بھی شیتل سویا پڑا تھا۔ ماں نے اُسے جگایا نہیں۔ تھوڑی دیر میں وہ خود ہی جاگ پڑا۔ اتنے میں ہاتھ منہ دھونے کا پانی گرم ہو گیا تھا اور چائے کا پانی بھی تیار تھا۔ کچھ دیر بعد ماں نے چائے کی پیالی بنا کر شیتل کو دی۔

گرم گرم چائے کی پیالی سے بڑی پیاری سی بھاپ اٹھ رہی تھی۔ شیتل نے سگرٹ سلگایا اور چائے کے گھونٹ لینے لگا۔ کسی زمانے میں وہ چھپ کر سگرٹ پیا کرتا تھا۔ آج وہ ماں کے سامنے پی رہا تھا۔ چھپ کر کوئی کام کرنے میں گناہ کی کیفیت ہے۔ یہ احساس اُسے جانے کب اور کیسے ہوا۔ یہ تو اب اُسے یاد نہیں تھا۔ لیکن اُس کے کاموں میں آپ سے آپ ایک کھلا پن سا آ گیا تھا۔ ماں نے اُسے سگرٹ پیتا ہوا دیکھا تو اُس نے بُرا نہیں مانا۔ شیتل کا پتا بھی تو حقّہ پیا کرتا تھا۔ دن میں کئی کئی بار وہ حقّے کا پانی بدلتا اور اُسے تازہ کرتا۔ کس لگن اور پیار سے وہ چلم بھرا کرتا تھا۔ حقّے کا ایک گہرا کش لیتے ہی جیسے اُسکی تمام پریشانیاں کافور ہو جاتی تھیں۔

"چائے اچھی ہے بیٹا؟" ماں نے پوچھا۔

"بہت اچھی ہے ماں۔"

کتنے برسوں کے بعد وہ اپنی ماں کو اس عقیدت سے مخاطب کر رہا تھا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے الفاظ اُس کی آتما کی گہرائیوں سے نکل رہے تھے۔

"تم تو بہت کمزور ہو گئی ہو۔" اُس نے ماں کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اُس کے بال بھی ایک دم سفید ہو رہے تھے۔

"تم آ گئے ہو تو اب میری صحت ٹھیک ہو جائے گی۔"

"تمہیں میری فکر رہا کرتی تھی کیا۔؟"

"میں تو سوچتی تھی، مرنے سے پہلے شاید تمہاری شکل بھی نہ دیکھ سکوں گی۔" ماں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا اور اُس کے اور قریب کھسک آئی۔

"تم مجھے اتنا بچہ سمجھتی تھیں؟"

"بچہ نہیں کشور۔"

ماں کی بات سن کر شیتل ہنس پڑا۔ چائے کی خالی پیالی چار پائی کے پائے کے ساتھ زمین پر رکھتے ہوئے وہ بولا۔

"میں اتنا کشور بھی نہیں، جتنا تم سمجھتی ہو۔"

"تو گھر سے کیوں بھاگ گئے تھے اس طرح۔!"

"یہ تو بہت پرانی بات ہے۔"

"تمہارے لئے پرانی ہے۔ لیکن میرے لئے تو یہ کل کی بات ہے۔ میں دن بھر رویا کرتی تھی اور کوئی ڈھارس بندھانے والا بھی نہ تھا۔" ماں کی آواز کانپ رہی تھی۔

"میں بھی رویا کرتا تھا ماں۔ رات کے اندھیرے میں جب سب سو جاتے تھے۔"

"تم بھی رویا کرتے تھے؟"

"ہاں۔!"

"کیوں۔؟"

"اس لئے کہ مجھے گھر کا یہ چھوٹا سا آنگن، اُس میں لگا تلسی کا پودا، اُس کے قریب جلتا ہوا دیا، سب یاد آیا کرتے تھے۔"

"ماں تو یاد نہیں آیا کرتی تھی نا؟" کتنا درد تھا ماں کی آواز میں۔

"اور جب یہ چیزیں یاد آتی تھیں تو تمہارا اُداس چہرا جلتے ہوئے

چراغ کی طرح اندھیری راتوں میں چمک اُٹھتا تھا۔"
یہ سُن کر ماں مسکرا دی اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے،
چراغ جیسے اب بھی جل رہا تھا۔ ماں کی محبت کا دیپک جو سدا جلتا رہتا
ہے کبھی نہیں بجھتا۔ جھکڑ اور طوفان کے اُن تھپیڑوں میں بھی نہیں،
جب چاند کی قندیل اور تاروں کے چراغ اُن کی تاب نہ لاکر بجھ جاتے ہیں
ماں کی محبت کی روشنی ابدی اور لافانی ہے۔ یہ سدا بہار کے پھول ہیں
جو ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ جو ریگستانوں میں بھی اپنی خوشبو پھیلاتے ہیں
اور پہاڑوں کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کو بھی مہکاتے ہیں جو ندیوں
کے کناروں پر بہاریں بن کر کھیلتے ہیں اور ساگر کی لہروں میں چاند کی
کرنیں بن کر رقص کرتے ہیں۔ ماں کی محبت وہ دھارا ہے جو کبھی نہیں
سوکھتا۔ سدا امرت چھلکاتا ہوا رہگزاروں کو سجاتا رہتا ہے۔
"ارے تم تو رو رہی ہو۔؟"
"یہ تو خوشی کے آنسو ہیں میرے لال' یہ میری دیوالی ہے"
کیا بات کہہ ڈالی تھی ماں نے۔ جذبات کی شدّت میں ایک معمولی
اِنسان بھی کتنی خوبصورت باتیں کہہ ڈالتا ہے
اُس کی ماں کا دیوالی کا تصوّر کتنا انوکھا تھا۔ بے چاری نے
جیون بھر اماوس کی سیاہی ہی تو دیکھی تھی، جسے اپنے آنسوؤں سے چمکایا
تھا اور سوچا تھا کہ ایک نہ ایک دِن اُس کی زندگی میں روشنی ضرور ہو گی
اِتنی جان توڑ جدوجہد کے باوجود اُس کے چہرے پر عزم اور وشواس
کے کتنے اُجلے نقوش تھے۔ اِسی وِشواس نے اب تک اُسے زندہ رکھا
تھا۔ وِشواش کی اِس آنچ سے شیتل کو اب اپنے ٹھٹھرے ہوئے ذہن
کو گرمانا تھا۔ ورنہ اُس کی زندگی منجمد ہو کر رہ جائے گی۔
اُس نے جلتے ہوئے سگرٹ کا آخری حصّہ زمین پر رگڑ کر بجھایا۔
اُسی لمحہ ڈیوڑھی کی سانکل کھٹکی۔
"میں گھر آگیا ہوں۔ اب دروازہ بند نہ رکھا کرو۔ جانے کوئی
کِس وقت آجائے اور دروازہ بند دیکھ کر چلا جائے۔"
"اب کواڑ کھلے ہی رکھا کروں گی بیٹا۔" ماں نے کہا اور دروازہ
کھولنے کے لئے باہر آگئی۔
"تائی! کیا غضب ڈھایا کر رکھا ہے تم نے، جو صبح سویرے بھی دروازہ
بند رکھتی ہو۔" یہ کیرتی کی آواز تھی جو کئی برس کے بعد آئی تھی اُس سے ملنے۔

"میرے پاس ہے ہی کیا بیٹی؟ ایک آبرو ہی تو ہے جسے
اب تک بچائے رکھا ہے۔"
"جب بھی آؤ تم تو فلاسفی چھانٹنے لگتی ہو۔" کیرتی نے کہا۔
"آج صبح سویرے کیسے چلی آئی ہو؟"
"یہ کہنے کہ آج کیرتن ہے۔ کام کاج سے نمٹ کر جلدی آجانا"
"پچھلی بار بھی تو تم نہیں آئی تھیں۔"
"آج میرا فارغ ہونا مشکل ہے۔"
"کیوں۔؟"
"شیتل آیا ہے رات۔"
ماں کی بات سُن کر پل بھر کے لئے جانے کیوں کیرتی کا چہرہ
سُرخ ہو گیا۔ اُسے کئی برس پہلے کا زمانہ یاد آگیا جب وہ دُلہن
بن کر سمر پور گاؤں میں آئی تھی۔ پردے کا سخت رواج تھا۔ لیکن
اُس کے خاوند نے اپنے دوست شیتل کو اپنی دُلہن کا چہرہ دکھا
ہی دیا تھا۔ کیرتی نے گھونگھٹ تو اُٹھا دیا تھا لیکن آنکھیں اوپر نہ
اُٹھائی تھیں۔ اُس نے شیتل کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ صرف آواز
سُنی تھی۔
"چندر، یار بڑی سُندر بہو لائے ہو۔"
آنگن میں کھڑی کیرتی کو لگا جیسے شیتل کے یہ الفاظ آج بھی
اُس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔
"کہاں ہیں وہ؟"
"اندر ہے۔ آؤ، بلاؤں۔ رات وہ چندر کی باتیں کرتے
رو پڑا تھا۔"
جانے کیوں کیرتی اِنکار نہ کر سکی اور شیتل کی ماں کے پیچھے پیچھے
کمرے میں آگئی۔ شیتل ابھی تک کھاٹ پر پڑا تھا۔
"شیتل، کیرتی آئی ہے۔" ماں نے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے
کہا۔ شیتل ایک دم چونک پڑا۔ کیرتی دہلیز پر کھڑی تھی۔
"نمستے۔" کیرتی نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی اپنی
سفید ساڑھی کے پلّو کو سر سے ذرا اور آگے کھینچ لیا۔
شیتل اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔
آج سے بارہ برس پہلے جب کیرتی چندر کی بہو بن کر آئی تھی

تو وہ پندرہ برس کی ایک لڑکی تھی۔ اب وہ ایک مکمل عورت تھی، زمانہ کتنی منزلیں طے کر گیا تھا۔ تنگ سے نیم اندھیرے کمرے میں سردیوں کی ایک صبح کو سفید ساڑھی پہنے کیرتی بڑی عجیب لگ رہی تھی۔

"بیٹھئے نا۔" شیتل نے کھاٹ پر سنبھلتے ہوئے سامنے پڑے اسٹول کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں اب اجازت دیجئے۔ پھر کسی وقت آؤں گی۔"

"تھوڑی دیر تو بیٹھو بیٹی۔"

"سب کو کیرتن کی اطلاع دینی ہے اور پھر آج پنچایت کی بیٹھک بھی تو ہے۔"

"تجھے تو جہان بھر کے کام رہتے ہیں۔" ماں نے کہا۔ کیرتی خاموش رہی اور صرف مسکرا دی۔

"آپ اگر شام کو فارغ ہوں تو پنچائت کی بیٹھک میں آیئے۔" کیرتی نے شیتل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"کوشش کروں گا۔" اُس نے جواب دیا۔

"تو شام کو ملیں گے!" کیرتی یہ کہہ کر کمرے سے باہر آنگن میں آگئی۔ شیتل خواہش ہونے پر بھی باہر نہ آسکا۔

کیرتی کے کمرے سے باہر چلے جانے کے بعد شیتل کو لگا جیسے کچھ لمحے پہلے کمرے میں دھوپ پھیل رہی تھی، جو اب ڈھل گئی تھی۔ سورج کسی گھٹا کے پیچھے چھپ گیا تھا اور کیرتی جب آنگن سے بھی باہر نکل کر چلی گئی تو شیتل کو محسوس ہوا کہ اُس کا آنگن اب چھوٹا اور تنگ نہیں رہا تھا۔ اُس میں پھیلے ہوئے گڑھے بھر گئے تھے۔ دیوار کے ساتھ بنی ناند اب اُپلوں سے نہیں بھری تھی۔ بلکہ اُس میں ہری ہری دوب پڑی تھی۔ جس کی ہلکی ہلکی باس فضا میں رچ رہی تھی۔ ناند کے پاس کھونٹے سے بندھی دودھ سے بھرے تھنوں والی ایک گائے کھڑی تھی اور اپنی زبان سے اپنے ننھے سے بچھڑے کی گردن کو چاٹ رہی تھی۔

اور وہ صبح کی اُن گھڑیوں میں ہی شام کا انتظار کرنے لگا۔

شیتل کے آنے کی خبر گاؤں میں بجلی کی لہر کی طرح دوڑ گئی۔ دن بھر لوگ اُس سے ملنے آتے رہے۔ اُس سے نیفا کے محاذ کی باتیں کرتے رہے۔ وہ انہیں اپنے اور اپنے ساتھیوں کے تجربے سناتا رہا۔ وہ سب خوش تھے کہ وہ گاؤں واپس آگیا ہے۔ لیکن اُس کی ٹانگ کٹ جانے کا بھی کو افسوس تھا۔ مگر جس محبت اور اپنے پن سے گاؤں کے لوگ اُس کا سواگت کر رہے تھے وہ بڑا حوصلہ افزا تھا۔ آج ماں بھی بہت خوش تھی۔ اُس کی ٹھہری اور بندھی ہوئی زندگی میں بھی روانی آگئی تھی۔ اُسے جیسے ایک نئی اُمنگ، ایک نئی آرزو اور ایک نیا حوصلہ مل گیا تھا۔

تیسرے پہر دولت کاکا بھی اُس سے ملنے آگیا۔ آج وہ شام کی گاڑی دیکھنے نہیں گیا۔ وہ شیتل سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔

"آج تو بہت سے لوگ تم سے ملنے آئے ہوں گے شیتل!" اُس نے کھاٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں کاکا۔"

"یہ اچھی بات ہے مل کر بیٹھنے ہی سے مسئلوں کو حل کرنے کا آغاز ہوتا ہے۔"

"آج پنچائت کی بیٹھک ہے نا؟"

"تمہیں کس نے بتایا ہے۔؟"

"کیرتی آئی تھی۔ بیٹھک میں شامل ہونے کو کہہ گئی ہے!"

"مجھے بھی جانا ہے۔ میں تمہیں ساتھ لے چلوں گا۔" دولت نے کہا۔

"لیکن میں کروں گا کیا وہاں جا کر؟"

"تم یہ جان سکو گے کہ ہم کیا کر رہے ہیں، کدھر جا رہے ہیں اور ہماری سمسائیں کیا ہیں۔؟"

"سمسائیں تو ہم سب کو معلوم ہیں کاکا۔ سوال تو حل ڈھونڈنے کا ہے۔" شیتل بولا۔

"حل بھی مل جائیں گے تم چنتا مت کرو۔" دولت کاکا نے کہا۔

کچھ دیر کے بعد دولت چلا گیا۔

شام کو پنچائت گھر کی طرف جاتے ہوئے شیتل کو بڑا عجیب لگ رہا۔ بغل میں بیساکھی دبائے ہوئے دھول بھری اونچی نیچی گلیوں میں سے گزرتے ہوئے اُسے بڑی مشکل پیش آرہی تھی۔ لیکن وہ چلا جا رہا تھا۔ دولت کاکا اُس کے ساتھ تھا۔ اس سے اُس کی ہمت بندھ رہی تھی۔ اکیلا شاید وہ اِس حوصلے سے نہ بھی جا سکتا۔ بیچ بیچ میں جب راستہ زیادہ خراب ہوتا تو دولت اُسے

سمہارا دے کر آگے لے جاتا۔ شیتل کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اُن دونوں کو بھی ایک دوسرے کی ضرورت تھی۔

پنچایت گھر اونچی جگہ پر تھا۔ سیڑھیاں چڑھنا پڑتی تھیں۔ سیڑھیاں دیکھ کر شیتل کی ہمت ٹوٹ گئی۔ جب سے اُس نے مصنوعی ٹانگ لگوائی تھی وہ سیڑھیاں بھی نہیں چڑھا تھا۔ آج یہ مرحلہ پہلی بار درپیش تھا۔ اُس نے سوچا وہ واپس چلا جائے۔ سیڑھیاں چڑھنا اُس کے بس کی بات نہیں تھی۔ پنچایت گھر کی بلندی اُس کی پہنچ سے باہر تھی۔ وہ روہانسا سا ہو گیا۔

"دولت کاکا میں واپس جاتا ہوں۔"

دولت نے اُس کے من کی بات جان لی۔ اُس نے شیتل کا درد پہچان لیا۔

"ایک بار آ کر واپس نہیں جایا کرتے بیٹا۔"

"میں یہ سیڑھیاں نہیں چڑھ سکوں گا۔"

"کیوں نہیں چڑھ سکو گے۔ میں کس لئے ہوں تمہارے ساتھ؟"

وہ دونوں پہلی سیڑھی کے سامنے کھڑے تھے اور آخری سیڑھی پر کیرتی کھڑی تھی۔

شیتل نے اُس کی طرف دیکھا۔ اُسے لگا جیسے کیرتی اُس کے اپاہج پن کو قبول نہ کر سکی تھی۔ اُس کا دل ڈوب گیا۔

"میں واپس جا رہا ہوں۔" اُس نے جیسے تڑپ کر دولت سے کہا اور پیچھے کی طرف پلٹا۔ اُس نے دو ہی قدم اُٹھائے تھے کہ کیرتی سیڑھیاں اُتر کر اُس کے قریب آ گئی۔

"آپ جا کیوں رہے ہیں؟"

"یوں ہی۔" شیتل نے دھیرے سے جواب دیا۔

"آیئے میں لے چلتی ہوں اوپر۔"

شیتل خاموش رہا۔ اُس نے ایک بار کیرتی کی طرف دیکھا اور پھر اُس کی نظریں ذرا دوری پر کھڑے دولت پر جم گئیں۔

کیرتی اور دولت کاکا شیتل کو تھامے ہوئے سیڑھیاں چڑھا رہے تھے۔ اور پنچایت گھر کی اونچی سطح اُسے اپنے پاس بُلا رہی تھی۔ گاؤں کی آتما ایک بچھڑے ہوئے بیٹے کو اپنے سینے سے لگانے کو بے تاب ہو رہی تھی۔ گاؤں کی پنچایت گاؤں کی آتما ہی تو ہے۔

شیتل کے پنچایت گھر میں داخل ہوتے ہی تمام پنچ کھڑے ہو گئے۔ کیرتی نے سب سے اُس کا تعارف کرایا۔ گاؤں کے سرپنچ نیکی رام نے اُس کے گلے میں ہار ڈالا۔ اُسے یہ سب بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ کیرتی نے جانے کس طرح اِتنا کچھ کر لیا تھا۔ کیرتی اُس کے مرحوم دوست چندر کی بیوی تھی اور اِس ناتے سے نیکی رام کیرتی کا سسر تھا۔ بہو اور سسر کا یہ اِتنا خوبصورت سمبندھ سرگوپر جیسے گاؤں کے ماحول میں شیتل کے لئے بالکل نئی بات تھی۔ شاید گاؤں کے لئے بھی وہ نئی ہی ہو۔ شروع شروع میں یقیناً گاؤں والوں نے اِسے قبول نہیں کیا ہوگا۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ اِس کے عادی ہو گئے ہونگے۔ شاید یہی کارن تھا کہ کیرتی اِس لگن سے گاؤں کی تعمیر اور ترقی کے لئے کام کر رہی تھی۔ نیکی رام نے شیتل کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ کیرتی کچھ اور کام کرنے لگی۔ دولت پنچوں سے باتوں میں لگ گیا۔ دھیرے دھیرے گاؤں کے کچھ اور لوگ بھی آ گئے۔ پنچایت کی بیٹھک کا پروگرام شروع ہونے سے پہلے نیکی رام سرپنچ نے شیتل کا سواگت کیا۔ اور اُس کے گاؤں واپس آنے پر خوشی کا اظہار کیا۔ کاش، آج اُس کا لڑکا چندر زندہ ہوتا تو دونوں دوست ایک دوسرے کو دیکھ کر کتنے خوش ہوتے۔ دونوں مِل کر گاؤں کے لئے بہت کچھ کر سکتے تھے۔ کیرتی سر جھکائے ایک طرف بیٹھی تھی۔ سرپنچ نے شیتل سے اِصرار کیا کہ وہ پنچایت کے کاموں میں دِلچسپی لے۔ اور گاؤں کی سمسیاؤں کو سلجھانے میں اُن کا ہاتھ بٹائے۔

سرپنچ کے بول چکنے کے بعد شیتل نے محسوس کیا کہ اُسے بھی کچھ کہنا چاہیئے۔ وہ کھڑا ہونے لگا تو پنچوں نے اُسے بیٹھ کر ہی بولنے کو کہا۔ اِس خیال سے کہ اُٹھنے میں اُسے تکلیف ہوگی۔ شیتل کو اُن کی یہ ہمدردی اچھی تو لگی لیکن اپنی بے بسی اور بے چارگی کا اِحساس بھی اُسے بڑی تلخی سے ہوا۔ مگر اِس طرح کڑھنے سے کیا ہوگا؟ یہ تو جیون بھر کا روگ تھا۔ اپنی اِس کمزوری سے تو اب اُسے نباہ کرنا ہی ہوگا۔ یوں تلخ ہوتے رہنے کا فائدہ؟

شیتل نے بولنا شروع کیا۔

"جس محبت اور عزت سے میرے بزرگوں نے مجھے اپنے درمیان بٹھایا ہے میں اپنے آپ کو اِس کے قابل نہیں سمجھتا۔ میں تو ایک بھٹکا اور بھولا ہوا بیٹا ہوں جو بہت ٹھوکریں کھانے کے بعد اپنے گھر واپس

یا ہے۔ اور اُس کی پیاری دھرتی نے اپنے نالائق بیٹے کو سینے سے لگا کر اُس کی تمام غلطیاں معاف کر دی ہیں۔ آج کا یہ دِن میری زندگی میں چراغ بن کر مجھے آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتا رہے گا۔"

بولتے بولتے اُس نے ایک طرف بیٹھی کیرتی کی طرف دیکھا۔ اُس کا چہرہ فخر سے چمک رہا تھا۔ اُسے ہمّت ملی۔ وہ بولتا گیا۔

"سُرگپور ایک آدرش گاؤں بن سکتا ہے اگر ہم سب مل کر کندھے سے کندھا مِلا کر چلیں اور اپنی سمسیاؤں کو سمجھ کر سوچ کر حل کرنے کے ڈھنگ سوچیں۔ آزاد ہندوستان کا ہر گاؤں وِشواس اور مضبوطی سے ترقّی کے راستے پہ گامزن ہوگا تو دیش کی جنتا اُن خوابوں کی جیتی جاگتی تصویریں دیکھے گی جن کے خاکے دیش پِتا مہاتما گاندھی کی آنکھوں نے دیکھے تھے۔

"میں عظیم اور پیاری دھرتی کو پرنام کرتا ہوں۔"

"جے ہند۔"

اُس نے اپنی تقریر ختم کی تو پنچایت گھر تالیوں سے گونج اُٹھا۔ گاؤں کی جنتا کو محسوس ہوا کہ اُنہیں ایک اچھا سیوک اور سمجھدار نیتا مِل گیا تھا۔

کیرتی کو لگا جیسے اُس کے راستے آسان ہو رہے تھے۔

پنچایت کی بیٹھک میں آج جو معاملہ پیش ہو رہا تھا وہ کچھ اِس طرح سے تھا۔

جگّو نے اپنے بیل رام دھن کے کھیت میں چھوڑ دیئے تھے اور اُس کے بار بار منع کرنے پر بھی باز نہ آیا تھا۔ جب اُس نے کئی بار ٹوکا تو وہ اُس سے اُلجھ پڑا۔ جگّو کی اپنی مجبوری تھی۔ اُس کے پاس بہت تھوڑی زمین تھی اور اُس کی فصل خراب ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ گھر میں کھانے کو اناج بھی نہیں تھا۔ وہ بیلوں کو کہاں سے کھلائے۔ بیل بھوکے رہ کر تو محنت نہیں کر سکتے۔ آخر اُسے اگلی فصل کا بھی تو کچھ کرنا تھا۔ رام دھن نے جب معاملہ پنچایت کے سامنے رکھنے کی دھمکی دی تو جگّو نے کہا۔

"یہ پنچایت بھی ہماری جان کو مصیبت بن گئی ہے۔ غریبوں کا تو ناک میں دم کر رکھا ہے اِس نے۔ جاؤ۔ لٹکوا لو مجھے پھانسی پر۔"

رام دھن یا تو خاموش رہتا اور جگّو کے بیل اُس کے کھیت اُجاڑ دیتے۔ یا پھر وہ اپنی شکایت پنچایت کے سامنے پیش کرتا۔ وہ یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ اُس کا گھر لُٹتا رہے اور وہ سب کچھ چپ چاپ سہتا رہے۔ معاملہ جب پنچایت کے سامنے لایا گیا تو کچھ ممبروں نے جگّو کے برتاؤ کو پنچایت کی بے عزّتی سمجھا اور اُس کے خلاف کارروائی کرنے کی مانگ کی۔

معاملہ پنچایت کے سامنے پیش ہوا۔

جگّو اور رام دھن دونوں موجود تھے۔

پنچ سوچ وِچار کر رہے تھے۔

شیتل کا اِس جھگڑے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اِس لئے وہ الگ بیٹھا ساری باتیں سُن رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ جگّو اور رام دھن کا جھگڑا دو افراد کا جھگڑا نہیں بلکہ پُورے سماج کا جھگڑا تھا۔ ایک کمزور اور غریب اِنسان نے جینے کا حق مانگا تھا اور اُسے نہیں دیا جا رہا تھا کا رن تھا کہ اُس کا طریقۂ کار غلط تھا۔ اُس نے تشدّد سے کام لیا تھا۔ لیکن جہاں اہنسا سے کام لیا جاتا ہے وہاں بھی تو نتائج یہی نکلتے ہیں۔ یہ مسئلہ صرف ایک جگّو اور ایک رام دھن کا نہیں تھا۔ بلکہ سینکڑوں جگّو اور سینکڑوں ہی رام دھن اِس سے اُلجھے ہوئے تھے۔ یہ مسئلہ اُن سب کا تھا جن کے پاس کھانے کو کافی اناج تھا اور اُن کا جن کے پاس گزارے کو بھی گیہوں یا چاول نہیں تھے۔ یہ مسئلہ سماج کے ایک طبقے اور دوسرے طبقے کی ضرورتوں کے آپسی ٹکراؤ کی اُپج تھی۔ جب لوگوں کی بنیادی ضرورتیں پُوری نہیں ہوتیں۔ گاؤں کی پنچایتیں اِن چھوٹے چھوٹے جھگڑوں ہی میں اپنی طاقت اور اپنا وقت ضائع کرتی رہیں گی۔ اُن کی زندگی اور مستقبل سے وابستہ سنجیدہ اور مُشکل مسئلے ویسے کے ویسے پڑے رہیں گے۔ اُن کی طرف کوئی توجہ نہ دے سکے گا۔ بجائے اِس کے کہ کھیت الگ الگ ٹکڑیوں میں بٹے رہیں۔ سب کھیت ایک جگہ اِکٹھے کیوں نہیں کئے جا سکتے۔ سب کھیتوں میں ایک ساتھ ہل چلیں۔ ایک ساتھ بیج بوئے جائیں۔ ایک ساتھ فصل پکیں۔ کھلیان بنیں اور پھر اناج بٹ جائے۔ کسی کو ایک دوسرے کے خلاف شکایت نہ ہوگی۔ جگّو اور رام دھن آپس میں نہیں لڑیں گے اور اپنے چھوٹے چھوٹے نجی جھگڑوں سے پنچایت کی طاقت ضائع نہیں کریں گے۔

شیتل سوچتے سوچتے اچانک چونک پڑا۔

فیصلہ سُنایا جا رہا تھا

جگّو کو پچیس روپے جُرمانہ کیا گیا تھا اور اُسے پنچایت سے

معافی مانگنے کو کہا گیا تھا۔ جگو نے یہ فیصلہ سُنا تو کہا۔

"اگر پنچایت کا یہی فیصلہ ہے کہ مجھے معافی مانگنی چاہیے تو میں معافی مانگ لیتا ہوں۔ لیکن یہ پچیس روپے میں کہاں سے لاؤں گا۔ میرے پاس تو کل کے کھانے کو اناج بھی نہیں۔ اگر میرے پاس روپے ہوتے تو میں بیلوں کیلئے چارہ نہ خریدتا۔ انہیں رام دھن کے کھیتوں میں کیوں چھوڑتا میرے پاس بھی اگر اچھا کھیت ہوتے اور کنواں ہوتا اور اچھا گھر ہوتا۔ تو میں مجبور و بے بس نہ ہوتا میری بھی عزت ہوتی۔ یوں بھری پنچایت میں مجھے ذلیل نہ کیا جاتا۔"

کیرتی بھی جگو کی بات سُن رہی تھی۔ جگو ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔ غریب پچیس روپے کہاں سے لائے گا۔

شیتل بڑا بے چین ہو رہا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اُسے پنچایت کے فیصلے کے متعلق بولنے کا حق نہیں تھا، اور پھر وہ پہلی بار تو آیا تھا وہاں۔ خود کہاں آیا تھا۔ بُلایا گیا تھا۔ اُس پر مہربانی کی گئی تھی۔ کاہے بول نہیں سکتا تھا۔ اُس کی زبان بند تھی۔

جگو کی بات سُن کر پنچایت نے پھر اپنا فیصلہ دُہرایا۔

"پچیس روپے جرمانہ دینا ہی ہوگا۔"

جگو نے بڑی بے بسی سے سب کی طرف دیکھا اور پھر اُس کی نظریں شیتل سے مل گئیں۔ جگو کی بے بس اور لاچار نظریں شیتل کے سینے میں اُتر گئیں۔

وہ بڑی ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔

"جگو کا جرمانہ میں ادا کروں گا۔ پنچایت کا فیصلہ بنا رہے۔"

کچھ لمحوں کے لئے سناٹا چھا گیا۔

حالات کی یہ کروٹ خلافِ اُمید تھی۔

سب خاموشی سے ایک دوسرے کا مُنہ تک رہے تھے۔ جگو حیران تھا۔ شیتل تو اُسے جانتا بھی نہ تھا۔

اِتنا بڑا احسان اُس نے کیسے کر ڈالا تھا؟

کیرتی شیتل کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ شاید اندازہ کر رہی تھی کہ شیتل نے یہ بات غلط کی تھی یا ٹھیک۔

کچھ دیر اور خاموشی رہی اور پھر پنچایت اُٹھ گئی۔ پنچوں نے شیتل کی بات کی مخالفت نہیں کی۔ ظاہر تھا کہ انہیں اِس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ لوگ دھیرے دھیرے سیڑھیاں اُتر کر اپنے گھر چلے گئے۔ رام دھن پل بھر کو رُکا۔ شاید شیتل سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن پھر جانے کیوں بنا کوئی بات کئے چلا گیا۔ جگو ایک طرف کھڑا تھا اور کیرتی سے بات کر رہا تھا۔ اور پھر وہ شیتل کے پاس آیا۔ دولت کاکا بھی پاس کھڑا تھا۔

"شیتل بابو میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

"اِس کی ضرورت نہیں۔"

"لیکن آپ اپنے بیل دوسروں کے کھیتوں میں مت چھوڑنا۔" دولت کاکا بولا۔ جگو خاموش رہا۔ اس کا جواب شیتل نے دیا۔

"یہ فیصلہ اِس جھگڑے کا صحیح حل نہیں ہے۔ اِس کا حل کچھ اور ہے دولت کاکا۔ وہ تمہیں میں بتاؤں گا۔"

پنچ بھی ایک ایک کر کے جانے لگے۔

"بیٹی شیتل کو گھر چھوڑ آؤ۔" بینی رام سرپنچ نے کیرتی سے کہا۔

"اچھا پتاجی۔"

شیتل خاموش رہا۔

"میں تو چلتا ہوں۔ شیتل کل تم سے بات کروں گا۔" بینی رام بولا۔

"بہت اچھا جی۔" شیتل نے جواب دیا۔

(باقی آئندہ)

مکتوبات

قلم کاروں سے درخواست ہے کہ وہ آئندہ پروفیسر نریش کے سلسلے میں کچھ نہ لکھیں۔ اُن کے اور اُردو دوستوں کے خیالات واضح ہو چکے ہیں۔ نریش صاحب کے اُٹھائے ہوئے بے محل سوال کے جواب میں پہلے ہی یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ اُردو شاعری میں "ہندو دیو مالا" چاہتے ہیں اور اُردو شاعری میں یہ جس حد تک بھی ہے" اُن کے لئے "قابلِ فخر" نہیں۔

اُن کے "قابلِ فخر" کا مطلب تو خیر وہ سمجھنے کا ہے اور نہ سمجھانے کا۔ گزارش یہ کرنی ہے کہ "دیو مالائی" تشبیہات و استعارات و تلمیحات ہر زبان کی شاعری میں موقع و محل ہی سے آتی ہیں۔ یہ روٹی دال تو ہیں نہیں اور نہ کسی بھی زبان کی عظیم شاعری کی پابندی۔ یہ شاعری کا ایک جزو ہو سکتی ہیں، کل نہیں۔ جزوی طور پر ہمارے نزدیک اُردو شعر و ادب میں "ہندو دیو مالا" قابلِ فخر حد تک شامل رہی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ چاہے پروفیسر نریش کتنا ہی غلط پروپگنڈہ کیوں نہ کریں۔ ہمیں یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن اُنہیں اپنے خیالات پر منفعل ہونا پڑے گا۔ وہ جس زبان کی شاعری سے بھی اِس طرح کا مطالعہ کریں گے، اُنہیں علمی و ادبی سطح پر سخت پشیمانی ہوگی، جذباتی، مذہبی اور فرقہ وارانہ سطح کی بات اور ہے۔

ابتک شائع ہونے والے خطوط میں جن قلم کاروں کا لہجہ سخت ہو گیا ہے، اُس کا نفسیاتی سبب وہ دلی تکلیف ہے، جو اُنہیں پروفیسر نریش کے رویّے سے پہنچی ہے۔ لیکن اِس کیلئے بھی ہم اپنی اخلاقی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے معذرت خواہ ہیں۔

جولائی اور اگست کے اشاعتوں کے متعلق ڈیڑھ سو سے زیادہ خطوط آئے ہیں۔ افسوس ہے کہ شمارۂ جولائی سے متعلق چند اہم خطوط صرف مکتوبات میں جگہ نہ پا سکے۔ (ادارہ)

شمارۂ اگست ۷۶ء کے متعلق

● شاعر کا تازہ شمارہ ملا اور آپ کا تفصیلی خط بھی۔ آپ نے جس دل سوزی سے اُردو والے معاملے کے بارے میں لکھا ہے، اُس نے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ واقعی اب عالم یہ ہے کہ اُردو والوں کی زبان سے بقول مُلّا صاحب، ہندی پبلشر بول رہا ہے۔ جس طرح مسلمانوں کا کیس دن بدن اِس لئے خراب ہوتا جا رہا ہے کہ اُسے ڈھنگ سے پیش نہیں کیا جاتا اور جو لوگ پیش کرتے ہیں وہ اُلٹا (مصلحت پرستی کی خیر ہو) اِسی طرح اُردو کا معاملہ ہے۔ کسی نے آج تک اُردو کا معاملہ غیر اُردو والوں کے سامنے پیش کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ سب حلفِ وفاداری اُٹھانے میں لگے ہوئے ہیں، جو اُٹھائے نہیں اُٹھتا! میں نے تین سال پہلے انگریزی میں ایک مقالہ لکھا تھا۔ مقالہ کیا تھا پورا کتابچہ تھا۔ اُس کے اقتباسات "اِسٹیٹسمین" میں چھپے تھے۔ سرور صاحب سے عرض کیا کہ انجمن ترقیِ اُردو کی طرف سے ہندی اور انگریزی میں چھپوا دیا جائے تو بہتر ہے۔ اُنہوں نے چھ ماہ اپنے دفتر میں رکھا پھر واپس کر دیا۔ کہ ابھی حالات سازگار نہیں۔ بارے شکوے شکایات کو دفع کیجئے، واقعی کچھ کیجئے۔ "اُردو کے رسم الخط اور اُس کے ادب کی قومی حیثیت کے بارے میں۔" ہم لوگ اِن موضوعات پر دہلی میں ایک "سیمنار" کریں گے، غالباً نومبر کے آخر میں۔

ڈی ۔ ۲ ماڈل ٹاؤن ۔ دہلی ۹ (ڈاکٹر) محمد حسن

● اگست کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ پروفیسر نریش کا خط خاص طور پر پڑھا۔ اِن صاحب کو اپنی "مَیں" سے ہی فرصت نہیں اور آپ اُن سے آسمان سے تارے توڑ کر لانے کی آس لگائے بیٹھے ہیں، جیسا کہ اِسی شمارے میں اختر راہی نے کہا ہے ؎

حق شناسی کے ہیں لاکھوں زاویئے
خود شناسی کا کوئی نقطہ نہیں

کاش، پروفیسر صاحب کی پہنچ بھی اِس "نقطے" تک ہو پاتی۔ میری رائے میں یہ ضروری نہیں کہ جس شخص نے اپنے سینے پر دو کی بجائے دس سندیں فریم میں مڑھا کر لٹکائی ہوں اُس کو ادب اور زبان شناسی کی سند بھی عطا کر دی جائے۔ محض ڈگری حاصل کر لینے سے کوئی عالم نہیں بن جاتا۔ مگر پروفیسر صاحب جس خوش فہمی یا غلط فہمی میں مبتلا ہیں، اُس کا علاج تو آپ کے پاس ہوگا نہیں

اُن کو دلائل اور حقائق کی روشنی دکھانا بے سُود ہے۔ اگر آپ ایسی غلطی بھی کریں گے تو وہ اپنی آنکھیں بند کر لیں گے۔

پروفیسر نریش کے اعتراضات پر میں نے کافی غور کیا ہے۔ جنوب مشرقی ایشیا کے تمام ممالک پر ہندو اور بدھ تہذیب و تمدّن کی گہری چھاپ ہے انڈونیشیا کے مُسلم راماین اور مہابھارت کے ناچ بڑے شوق سے دیکھتے ہیں۔ کل کو وہاں بھی پروفیسر نریش کا کوئی بھائی اِس بات پر اعتراض کر دے گا کہ جزیرۂ بالی کے باشندے ہندو کیوں ہیں اور یہ کہ وہ دریائے گنگا کو متبرک کیوں مانتے ہیں۔ اِسی طرح جاپان یا برما کا کوئی سرپھرا اِس بات پر مُعترض ہوگا کہ بدھ دھرم کے پیرو کار بلیتنی۔ گیا، اور سارناتھ وغیرہ کو اپنی زیارت گاہیں کیوں تسلیم کرتے ہیں۔ اگرچہ اعتراضات واہیات اور لغو قسم کے ہیں تو ہمیں یہ بھی ماننا ہوگا کہ مسلمان بھائیوں سے عرب کی زیارت گاہوں کو فراموش کر دینے کی اُمّید رکھنا بھی اتنا ہی مضحکہ خیز ہے۔ جب تک ہندوستان میں ایک بھی مُسلمان موجود ہے تب تک اُس کی نظروں میں مکّہ، مدینہ اور کربلا وغیرہ کا وہی مقام رہے گا۔ جو کہ ایک سناتنی ہندو کے لئے کاشی پریاگ اور ہردوار کا ہے اور اِس لئے یہ بھی لازم ہے کہ وہ شاعری میں بھی اِن کی مدح سرائی کرے، قوم پرستی اور مذہب دو مختلف چیزیں ہیں۔

پروفیسر نریش نے اور بھی کچھ باتیں کہی ہیں۔ اِس بارے میں مَیں اِشارتاً صرف ایک ہی حوالے پر اکتفا کروں گا۔ طُور اور ہمالہ دو الگ الگ پہاڑ ہیں۔ دونوں کے ساتھ مختلف روایات وابستہ ہیں طُور کے جلوے کا ذکر طُور کے حوالے سے ہی ہو سکتا ہے، ہمالہ سے نہیں۔ اِسی طرح سنسکرت اور ہندی میں جو باتیں ہمالہ کے حوالوں سے کہی گئی ہیں وہ طُور کے بس کی بات نہیں۔ دونوں اپنی اپنی جگہ اہم ہیں۔ قوم پرستی کی آڑ میں طُور کی اہمیت سے اِنکار اور ہمالہ کی اہمیت کا اقرار نہیں ہو سکتا۔ یہی بات اِس قسم کے دوسرے اعتراضات پر صادق آتی ہے۔ دجلہ و فرات کی طرف سے چشم پوشی کر کے اُن کے وجود سے مُنکر نہیں ہو سکتے۔ پروفیسر نریش کی مشکل یہ ہے کہ وہ دو وفاداریوں کو نبھانا چاہتے ہیں۔ وہ اُردو میں بطور اُردو ایم اے" لکھتے ہیں اور ہندی میں بطور ہندی ایم اے"۔ بخوشی نبھائیں۔ مگر ایک دوسرے کی قیمت پر نہیں۔ ہندی اور اردو زبانوں کو جیئو اور جینے دو کے اُصول پر کاربند ہونا ہوگا۔ اِسی میں دونوں زبانوں کی خیر ہے، ورنہ یہی اعتراضات ہندی کے متعلق تامل، تیلگو اور ملیالم زبانوں والے کر رہے ہیں۔ اپنی اِسی تنگ دلی اور تنگ نظری کے زیرِ اثر ہم ہندی کو جنوبی ہند میں قومی زبان کا درجہ نہیں دِلا سکے۔ ہندی والے ہی ہندی کے زبردست دشمن ثابت ہو رہے ہیں۔ اپنا کھیل تو وہ بگاڑ ہی رہے ہیں مگر ساتھ میں وہ دوسری زبانوں پر بھی کلہاڑا چلا رہے ہیں۔ اگر وہ اپنی سرگرمیوں کو ہندی کے تحفظ و ترویج تک ہی محدود رکھیں تو اِس سے ہندی کا کیس مضبوط ہوگا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ شیشے کے گھر میں بیٹھ کر دوسروں پر خشت باری کریں اور پھر اپنے گھر کی امان کی دُعائیں مانگیں اُن کا یہ فعل خطرے سے ہرگز خالی نہیں۔ بلکہ یہ تو خودکُشی کے مترادف ہے۔

جُرعات کے عنوان سے آپ کا اِداریہ بہت فکر انگیز ہے۔ کاش! ہندوستان کا اُردو داں طبقہ اِس بارے میں کوئی ٹھوس قدم اُٹھا سکتا۔ آپ کی نظم "آزادی" بہت خُوب ہے۔ منظومات میں حُرمت الاکرام کی غزل اِس شمارے کی جان ہے۔ یہ دو اشعار بہت خوبصورت ہیں ؎

دِل کی مٹّی کو نہ کوسو، یہ ہے مقسوم حیات
خواب بُویا جائے ہے اور درد کاٹا جائے ہے
بنتی مِٹتی سی لکیریں، جلتے بجھتے سے دیئے
زندگی بھر زندگی کا خواب دیکھا جائے ہے

نازش پرتاب گڑھی کا مقالہ اُردو شاعری میں ہندوستانیت اُردو کا بھارتیہ کرن کا نعرہ لگانے والوں کے گال پر ایک چپت ہے۔

مجسٹریٹ درجۂ اوّل۔ دھرم سالہ (کانگڑہ) تسر ٹیلہ ناتھ ورما

● یہ اُردو والے واقعی بڑے قابلِ رحم ہیں۔ اِن غریبوں میں ایک بھی تو نفسیات داں نہیں جو یہ سمجھ سکے کہ فلاں شخص جو یہ بات کہہ رہا ہے تو اُس کے دِل میں کیا ہے اور وہ کیا چاہتا ہے۔ بیچارہ نریش جوان آدمی ہے شہرت کا طالب ہے۔ واہ واہ کا بھوکا ہے۔ چاہتا ہے لوگوں کی نظریں اِس پر بھی پڑیں۔ بھلا جس شخص نے اُردو اور ہندی ایم اے نہ صرف فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا ہو،

بلکہ تمام یونیورسٹی میں اوّل رہا ہو، اگر وہ چاہتا ہے کہ لوگ اُس کی رائے کو اہمیت دیں اور وہ سب کی نگاہوں کا مرکز بنے، تو اس میں ناراضگی کی کیا بات ہے۔ وہ غریب تو جب اُردو رسائل میں لکھے گا تو اردو سے اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کرے گا۔ اور جب ہندی رسالوں میں لکھے گا تو اُردو شاعری اور ادب میں کیڑے نکالے گا۔ حالانکہ نہ اُسے اُردو سے دشمنی ہے اور نہ ہندی سے پریم ہے۔ اُس کا منشا تو صرف اپنی شخصیت کو نمایاں کرنا ہے۔ البتہ یہ اس کی بدقسمتی ہے کہ اس کے ہندی کے مضمون پر بھی اُردو والوں کی نظر پڑ گئی، اگرچہ اِس بدقسمتی میں بھی اُس کی خوش قسمتی پنہاں ہے کہ اُس کا دلی مقصد (کہ وہ بھی لوگوں کی نظر میں آجائے اور بہت سے ادیبوں کی قلم اور زبان پر اُس کا چرچا ہو) پورا ہو گیا۔

اُردو والوں کو چاہیئے کہ اِس نوجوان ایم اے پی ایچ ڈی کی ہمت افزائی کریں اور اُردو رسائل کے مدیران کو چاہیئے کہ وہ اپنے رسائل اِس بے اندازہ پڑھے لکھے اور غیر معمولی محقق" کی خدمت میں مفت ارسال کرتے رہیں۔ اور تین سال بعد اُس سے دریافت کریں کہ اُردو کی کتنی نظموں اور غزلوں میں لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد اور دجلہ اور فرات کا کتنی بار ذکر آیا ہے اور کتنی دفعہ اِس نام نہاد ہندوستانیت کی جامہ دری کی گئی ہے جو زر پرستی اور WESTED INTEREST کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

نادر بک اینڈ کو۔ فیروزآباد (ضلع آگرہ)   محمد عظیم فیروزآبادی

● اِدھر کسی پروفیسر نریش صاحب نے خاصا دلچسپ موضوع چھیڑ دیا ہے۔ جس پر آپ سے بھی اُن کی خط و کتابت ہوئی۔ آپ نے اچھا کیا کہ اُسے شائع کر دیا۔ کچھ اور صاحبان نے بھی اِس پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ پروفیسر موصوف کے بیان میں کہاں تک حقیقت ہے یہ ایک علیحدہ بحث ہے اور اُن کی نیت کی پاکیزگی کے بارے میں خدا بہتر جانتا ہے۔ مگر پروفیسر موصوف نے سستی شہرت کے لئے خاصا گُل کھلایا ہے۔ صاحبِ موصوف کو اِس پر فخر ہے کہ انہوں نے اُردو ہندی دونوں زبانوں میں ایم اے فرسٹ کلاس ہی میں پاس نہیں کیا، بلکہ یونیورسٹی میں ٹاپ کیا ہے اور ان زبانوں میں تحقیقی کام بھی۔ قابلِ مبارکباد ہیں۔ پروفیسر موصوف دوسری سانس میں فرماتے ہیں کہ مجھے خوشی ہوگی کہ اگر کوئی صاحب (اگر واقعی مجھ سے زیادہ پڑھے لکھے اور زیادہ تحقیق کر چکے ہوں) میری رہنمائی کریں۔ گویا اگر کوئی اُن کی رہبری کرنا چاہے تو اُسے پہلے پروفیسر موصوف کے ساتھ کسی مقابلے کے امتحان میں بیٹھنا ہوگا۔ تب کہیں جاکر یہ فیصلہ ہوگا کہ واقعی وہ اُن کی رہبری کرنے کے قابل ہے۔

اِس بحث میں سب سے دلچسپ چیز جو دیکھنے میں آرہی ہے، وہ یہ کہ شاید پروفیسر موصوف اور دیگر صاحبان نے صرف شاعری ہی کو کسی زبان کا تمام ادب سمجھ لیا ہے۔ پروفیسر موصوف کا اُردو ادب کی دوسری اصناف کے بارے میں کیا خیال ہے۔ کیا وہ اِس پر بھی اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں گے؟ پروفیسر نریش ایم اے پی ایچ ڈی کو شکایت ہے کہ مسلمان تخلص رکھتے وقت ہندی تخلص کیوں اختیار نہیں کرتے۔ شکایت کس قدر باوزن ہے! فلمی دنیا کے اکثر بڑے بڑے مسلمان فنکاروں نے اپنے ہندو نام رکھ چھوڑے ہیں۔ کیا فرماتے ہیں اِس بارے میں پروفیسر موصوف؟ کیا فلمی دنیا کے کسی ہندو فنکار نے بھی مسلمان نام رکھ چھوڑا ہے؟ اگر ایسا ہے تو پروفیسر موصوف رہبری فرما دیں۔ فلم میں ہندو ناموں کی ضرورت ہوتی ہے، اِس لئے ہر فنکار بلا تکلف اِسے اختیار کر لیتا ہے۔ جس زبان میں شاعری کی جا رہی ہے اُسی زبان کا تخلص مناسب ہوتا ہے۔ اِس لئے اُردو کے ہندو شعراء بھی اِسے بلاتکلف اختیار کر لیتے ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے ہندی میں تخلص کی کوئی روایت نہیں ہے۔ اگر کچھ ہے تو وہ اُردو ہی کے ذریعے ہندی میں آئی ہے اور ہندی کا شاعر ہندی زبان ہی سے اپنے لئے تخلص پسند کرتا ہے۔ کسی ہندو اُردو نثر نگار نے آج تک مسلمان نام اختیار نہیں کیا۔ اگر کیا ہو تو پروفیسر موصوف نشان دہی فرما کر میری معلومات میں اضافہ فرمائیں۔ پروفیسر صاحب کے خط سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کوئی کتاب بھی تصنیف فرما رہے ہیں۔ کاش! اِس کتاب میں وہ ایک ایسے باب کا بھی اضافہ فرما لیں جس سے یہ پتہ چل سکے کہ قومی یکجہتی، اِنسانیت دوستی اور وطن پرستی میں اُردو و ہندی میں کیا کیا کام ہوا ہے اور کس کس معیار کا۔ اِس باب کو پورے

ادب کا احاطہ کرنا چاہیئے۔

دوسرا اہم مسئلہ رسم الخط کا ہے کہ اسے دیوناگری میں تبدیل کردیا جائے۔ تکنیکی الجھنوں سے قطع نظر یہ مشورہ سر آنکھوں پر۔ بشرطیکہ اُس کے علمبردار پہلے تامل، ملیالم، تیلگو، سندھی وغیرہ کے رسم الخطوں کو بھی دیوناگری میں تبدیل کرالیں۔ پھر اُردو والے بخوشی اِس مشورے کو قبول کرلیں گے مگر شاید دیوناگری رسم الخط کے مجاہدوں کو اس زبان درازی پر اپنے پر جلنے کا خطرہ ہے اِس لئے خاموشی ہی میں عافیت مضمر نظر آتی ہے۔ کچھ اُردو کی عظیم الشان ہستیوں نے بھی اِسی قسم کا مشورہ دیا ہے۔ کہ رسم الخط تبدیل کرلیا جائے۔ اُن کی مصلحتیں تو وہ جانیں یا خدا، مگر اُن کی خدمت میں صرف اِس قدر عرض ہے کہ اُردو والے چاہتے ہیں کہ اُن کی اولاد رضیہ سجاد ظہیر کو رضیہ سجاد ظہیر، عصمت چغتائی کو عصمت چغتائی اور خواجہ احمد عباس کو خواجہ احمد عباس ہی کہے۔ رجیہ سجاد جہیر۔ اسمت چگتائی اور کھاجا احمد اباس کہکر اُن کی مٹی پلید نہ کرے۔

اُردو کے حامی اور پرستار بلا وجہ پروفیسر نریش ایم اے پی ایچ ڈی قماش کے لوگوں سے بحث و مباحثہ میں وقت ضائع کرتے رہتے ہیں جس سے اِس مشکل وقت میں کوئی ٹھوس نتیجہ برآمد نہیں ہوسکتا۔ عملی دنیا میں آکر کام کریں تو ایسے معترض سطح آب پر بلبلوں کی طرح خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ غیر اہم لوگوں کو پبلسٹی دینے سے کیا فائدہ؟

اُردو کے پرستاروں میں بہت سے ایسے لوگ بھی ہوں گے جو ہندی ادب پر عبور رکھتے ہوں۔ کاش! وہ اِس طرف دھیان دیں کہ ہندی ادب میں مسلمانوں اور اُردو ادب کے بارے میں کیا کچھ ہے اور کس معیار کا۔ اُردو کی یہ بھی ایک بڑی خدمت ہوگی۔

ویسے میں خطوط چھپوانے کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ لیکن اگر آپ چاہیں تو اِس خط کو چھاپ دیں۔

ملت پریرنا ہائر سکنڈری اسکول بیگم گنج۔ (پرنسپل) ابراہیم یوسف

● اگست [illegible] کا شاعر پڑھا۔ پروفیسر نریش کا خط پڑھ کر بے ساختہ ہنسی آگئی۔ اپنی پچھلی تحریروں میں اُردو کی تلمیحات کی سخت مخالفت اور مسلم دوستوں کی ناراضگی کی مذمت کرنے کے بعد اب وہ یہ کہتے نظر آرہے ہیں کہ میں نہ تو یہ چاہتا ہوں کہ اُردو ہندی ہوکر رہ جائے یعنی اپنی انفرادیت کھو دے اور نہ یہ کہ اُردو اپنی تمام بنیادی خصوصیات کو خیرباد کہہ دے جو اُس نے ایران یا عرب کی تہذیب سے حاصل کی ہیں۔) تو پھر اُن کی پچھلی تحریریں کیا مطلب رکھتی ہیں؟ اور پھر اب وہ اُردو زبان کے ساتھ ساتھ دیگر زبانوں کا بھی "بھارتیہ کرن" چاہ رہے ہیں۔ خاص طور سے ہندی کا۔ کیا اب انہیں یہ خدشہ نظر آرہا ہے کہ ہندی والے انگریزی کی تقلید شروع نہ کردیں۔ یہ کتنی بڑی تنگ نظری ہے؟ کیا کسی زبان کو ایک احاطے میں قید کردینا اچھی بات ہے؟ کیا یہ ہندی زبان کے ساتھ دشمنی نہیں ہے؟

نریش صاحب بھی ایک عجیب ڈگڈگی ہیں؟! ایک قدم اور آگے بڑھ کر اب وہ ہندوستانی سماج کا بھی بھارتیہ کرن چاہنے لگے ہیں۔ وہ ہندوستان کی پرستش نہ کرنے والے کو غدار قرار دیتے ہیں اور اُسے ملک بدر کرنے کا قیمتی مشورہ بھی۔ مگر وہ یہ نہیں بتاتے کہ وہ کون لوگ ہیں، کون سا فرقہ یا کون سی پارٹی ہے۔ کیا وہ نکسلوادی ہیں؟ کیا وہ کمیونسٹ ہیں؟ یا پھر جن سنگھی ہیں۔ جنہوں نے دیش کے امن و امان میں خلل ڈالا ہے۔ دیش کے اتحاد اور شانتی کو کچل دیا ہے، تمام ملک میں نفرتوں کا زہر پھیلایا ہے۔ کرفیو کی لعنت بخشی ہے۔ گھر، دکانیں، محلّے، روزگار اور سکون کو برباد کردیا ہے۔ جنہوں نے دیش کے قانون کا مذاق اڑایا ہے۔ اور جنہوں نے میرے عزیز شہروں احمد آباد اور بڑودہ میں ہندوستان کی قومی یک جہتی کو کچل دیا۔ مجھے نریش صاحب بھی قومی یک جہتی کے دشمن معلوم ہوتے ہیں۔

بھارت ایک امن پسند ملک ہے۔ شانتی چاہک ہے اور جو لوگ اِس کے امن و امان اور شانتی کو نقصان پہنچائیں صحیح معنوں میں انہیں لوگوں کا بھارتیہ کرن ہونا چاہئے۔

اپنے تازہ خط میں پروفیسر نریش صاحب نے اپنی قابلیت کا بھی ڈھنڈورہ پیٹا ہے کہ میں پی ایچ ڈی ہوں۔ چلتے چلتے وہ ڈاکٹر ست پرکاش سنگر کی شخصیت پر بھی تھوڑی کا ڈھول

اُڑائے جا رہے ہیں۔ چند سال پہلے نریش صاحب بمبئی سے احمد آباد بھی آئے تھے۔ اُن کی اُردو ہندی کی قابلیت کو ہم جانتے ہیں۔ ڈاکٹر ست پرکاش سنگر سے ابھی انہیں دس سال، تاریخی، تہذیبی، علمی اور لسانی علم حاصل کرنا ہوگا۔

میں سمجھتا ہوں کہ دیش کے امن و امان، بھائی چارے، وسیع النظری، انسانی برادری اور دوسروں کی دل شکنی کے تحت خود پروفیسر نریش صاحب ہی کا بھارتیہ کرن ہونا چاہیے۔

یاقوت پورہ۔ بڑودہ۔ **خلش بڑودوی**

● تازہ شاعر میں آپ کے "جرعات" اور آپ کی نظم "آزادی" نے دل و دماغ پر گہرے تاثرات چھوڑے ہیں۔ دُکھ، درد، بیماری اور ناہموار حالات کی ستم سامانیوں کے باوصف آپ کی تحریر اور تخلیق کا حسن برابر نکھرتا رہا ہے۔ یہ ایک غیر معمولی اور حیرت زا بات ہے۔ اُن حالات میں جبکہ سکون کی سانس تک لینا مشکل ہے۔ آپ زبان و ادب کی بقا اور ترقی کے لیے مسلسل اور مستقل جدّو جہد کر رہے ہیں۔ کاش اُردو والوں کی بے حسی، بے پروائی اور سنگدلی کا طلسم کم از کم اب تو ٹوٹے۔ ابھی وقت ہے، آپ جیسے بے غرض، بے لوث اور باہمت دردمند باقی ہیں۔ کاش اُردو والے آپ کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لیے عملی طور پر آگے بڑھیں اور آپ سے واقعی تعاون کریں۔ آپ کے مجموعۂ کلام کو بھی اب شائع ہو جانا ہی چاہیے۔

حصّۂ منظومات میں "آزادی"، "اُس کے نام"۔ اور "ایک سوال" ذاتی طور پر وجہ تسکین ثابت ہوئیں۔ ابراہیم یوسف کا ڈراما اور ذاکر صاحب کے ناول کا سلسلہ خوب ہے!

ڈیوڑھی نواب دولھا خان، چنچل گوڑہ۔ حیدرآباد ۲۴ **اکرام جاوید**

● پروفیسر نریش صاحب سے میں ذاتی طور پر واقف ہوں۔ ایک آدھ بار ملاقات بھی ہوئی ہے۔ اُن کی اُردو نوازی سے میں متاثر تھا۔ لیکن وقت بڑا ظالم ہے۔ بڑے بڑے طلسم آنِ واحد میں باطل ہو جاتے ہیں۔ اچھا ہوا کہ پہلے ہی سے وہ کھل گئے۔

اور لیجیے، پروفیسر نریش کو تو رو ہی رہے تھے۔ یہ "بی آدی اللّٰہ" بھی اپنی کھال سے باہر نکل آئیں۔ "بلٹز" کے شماروں میں اُن کی بحث پڑھی۔ انتہائی نامعقولیت کا ثبوت دیا ہے اُنہوں نے۔ لیکن ہائے پیسہ، وائے پیسہ!!

ندا فاضلی امریکہ کے ایجنٹ سہی، لیکن اُردو دشمن تو نہیں ہیں۔ یہ تو اُن سے بن نہ پڑا کہ معقول جواز پیش کرتیں۔ لگیں عورتوں والے کوسنے دینے۔

ابھی تک تو دشمنوں کا رونا تھا، مگر اب بہت سے "مار آستین" بھی پھن پھیلا کر سامنے آ رہے ہیں۔ اُن کے زہر کا اُتار ہونا ہی چاہیے، ورنہ مستقبل کی تیرگی پنجے پھیلائے نظر آ رہی ہے۔ کیا اُردو اس تیرگی کے پنجۂ جبر کا شکار ہو جائے گی؟ میں سمجھتا ہوں کہ اُردو والے (اُردو دوست) اگر زندگی کی بازی لگا سکتے ہیں تو یہی وقت ہے ورنہ:-

تلک الایام نداولہا بین النّاس ؎

کی صورت سے تو دوچار ہونا ہی پڑے گا۔

۴۹ وی۔ مدن گیر۔ نئی دہلی ۶۲ **فصیح اکمل قادری**

● الحمدللہ کل ہی تازہ شمارہ ملا ہے۔ اب "شاعر" وقت پر آنے لگا ہے۔ کشمیری لال ذاکر کا ناول "دھرتی سدا سہاگن" دلچسپ اور خاصے کی چیز ہے اور یہ سرت چٹرجی کے رنگ میں ہے۔ اس ناول کے اضافے سے یقیناً "شاعر" میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ مضامین نظم و نثر بھی پہلے سے زیادہ متنوّع اور ٹھوس ہیں۔ خدا اس جریدے کو نظرِ بد سے بچائے اور اسے آپ کی نگرانی و سرپرستی میں سلامت رکھے۔ (آمین)

ایگریکو۔ کراس روڈ نمبر ۲۔ اگریکو، جمشید پور ۹ **رونق دکنی سیمابی**

● اس بار اگست ۸۶ء کا "شاعر" رانچی میں دیکھا۔ "اُردو میں ہندوستانیت" کے موضوع پر بہت معقول مواد موجود ہے۔ جی ہاں، آپ کے خیال سے مجھے اتفاق ہے اور اُردو شاعری میں ہندوستانیت کی سُرخی (جیسا کہ "محفل اپنی" کے تحت درج ہے) سے زیادہ مناسب سُرخی "اُردو میں ہندوستانیت" ہی ہے۔ اُردو کو غیر ہندوستانی، غیر پاکستانی اور ایک اجنبی زبان ثابت کرنے کے لئے ہندی والے بہت کچھ کر رہے ہیں اور ہم خاموش بیٹھے ہیں۔!

"دھرم یگ" ۹ اگست ۱۹۸۷ء میں "پاکستان میں اُردو کے خلاف جن بھاشاؤں (عوامی زبانوں) کی کھلی بغاوت" کے عنوان سے ایک اعدادیہ پیش کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ بنگالی بولنے والے ۵۵ فی صد، پنجابی ۲۸ فیصد، پشتو ۸ فی صد، سندھی ۶ فیصد اور اُردو ۵ فی صد جبکہ حقیقت (کم از کم اُردو کے معاملے میں) اس سے قطعی برعکس ہے۔ اسی عنوان کے تحت کہا گیا ہے کہ اُردو کے خلاف بغاوت کا یہ عالم ہے کہ اُردو والے کسی سندھی کو سلام علیکم کہتے ہیں تو سندھی اُردو سے بے پناہ نفرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب میں کہتا ہے۔ "جے سندھ!"

ظہیر نیازی

بسر کنڈا (ہزاری باغ) بہار۔

● شاعر کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ اس قدر جلد دوسرا شمارہ موصول ہونے پر حیرت آمیز مسرت بھی ہوئی۔ خاص طور سے اس کی گوناگوں خوبیوں کے باعث "جرعات" میں آپ نے نہایت اہم سوالات اٹھائے ہیں اور اس وقت کی اہم ترین ضرورت کی طرف اشارے کئے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ آج اُردو کے خلاف جنگ اُردو سے زیادہ ہندی پریس میں لڑی جارہی ہے اور اُردو پرستوں کو اس محاذ پر ہر ممکن طریقہ سے مدافعت کرنی پڑے گی۔ یہ چیلنج ہمارے ماہرینِ لسانیات اور مفکرینِ اُردو کے لئے زبردست تازیانہ ہے۔ اور انہیں اپنے زبان و ادب کے دفاع کے لئے اس جانب بھرپور توجہ صرف کرنی ہی پڑے گی۔ ہاں ایک دشواری اس امر میں یہ ہے کہ ہندی کے بہت سے اخبار و رسائل اُردو کے خلاف کسی ممتاز اہلِ قلم کا کوئی مضمون ہو تو فوراً شائع کر دیتے ہیں۔ لیکن اگر اس کے جواب میں کوئی دیگر مضمون یا خط کسی دوسری جانب سے روانہ کیا جائے تو معمولی فرد سمجھ کر قابلِ اعتنا نہیں گردانتے یہ سب سوچی سمجھی پالیسی کے تحت ہے اور ہمارے مشاہیر اہلِ قلم اس طرف متوجہ نہیں ہوتے اس لئے بھی ان کی غلط دھاندلی رنگ لے آتی ہے بہرحال اب نہایت سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کرنا اور عملی قدم اٹھانا نہایت ضروری ہوگیا ہے۔ کاش یہ حضرات آپ کی آواز پر لبیک کہہ سکیں۔!

تازہ شمارے میں آپ کا شعر سچ مچ حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے۔ خدا آپ کو سلامت رکھے اور آپ کی مثال دیگر اُردو پرستوں کے لئے مشعلِ راہ بنی رہے۔

یہاں نشاط قمر صاحب بہت عرصے کی خاموشی کے بعد سنائی پڑے۔ غزل بہت پسند آئی۔ کیفر نواز، حرمت الاکرام اور راہی صاحبان کی تخلیقات بہت عمدہ لگیں۔ افسانوں کے تراجم بہت خوب ہیں۔ شاعر مسلسل دیگر زبانوں کے نہایت اچھے اور کامیاب تراجم پیش کر رہا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن کا ننھا سا شعلہ، ہر اہلِ قلم کے دل و دماغ کا نور ہونا چاہئے۔

ڈاکٹر نرنیش کے بھارتیہ کرن والی بات چیت پر خطوط بہت معقول اور مدلل ہیں۔ لیکن جناب نے اب بھی اپنی ہٹ اور ضد نہیں چھوڑی ہے۔ اپنے علمی تفاخر کی بنا پر شاید دل و دماغ سے بھرپور کام لینے کی کوشش نہیں کرتے۔ اب وہ دیگر زبانوں کے بھارتیہ کرن کی بات کرنے لگے ہیں اور آپ نیا تجزیہ اس نیک کام کی اُردو سے شروع کی ہے۔ کتاب بھی لکھ رہے ہیں اور بڑی شان سے "ثابت کرسکتے ہیں" کہ اُردو میں وطنیت اور ہندوستانیت موجود ہے۔ یعنی کتنا بڑا انکشاف اس کتاب کے ذریعہ ہونے والا ہے! ڈاکٹر صاحب علمی اور ادبی کارناموں کو ابھی اپنی ڈگریوں سے ناپ رہے ہیں۔ اور خود سے زیادہ پڑھے لکھے حضرات کی ہی رہنمائی قبول کریں گے۔ بجز آپ کے! خیر آپ کی ہی کوششوں سے وہ راہِ راست پر آجائیں تو بہت غنیمت ہے۔

ظفر غوری

اعظم بلڈنگ۔ سرائے کا ستھان۔ کوٹہ۔

● "شاعر" کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ یہ شمارہ بھی شاعر کی روایات کے عین مطابق ہے۔ اس بار شاعر میں "پس نوشت" کے زیرِ عنوان بلراج مینرہ کی چند سطریں شائع ہوئی ہیں۔ میں نے موصوف کا متعلقہ افسانہ "سہ ماہی سطور" کے اوّل شمارے میں پڑھا ہے۔ میرے نزدیک یہ افسانہ کم اور ایک عامیانہ قسم کا انشائیہ ہے ہے۔ شاعر جیسے ادبی پرچے میں اس بے مقصد قسم کے انشائیے کی چند سطور شائع ہونا میرے لئے ایک عجیب بات ہے۔ شاعر کو اس قسم کی CHEEP تخلیقات سے دور رکھیں۔ کیونکہ موجودہ دور میں "شاعر" سے ہماری کئی امیدیں وابستہ ہیں۔

کاشف رومانی سرحدی

پے۔ این۔ آئی۔ فرید آباد۔

نقد و نظر

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو کاپیاں آنا ضروری ہیں)

محمد علی جناح

از:۔۔۔۔۔۔ کانجی دوارکاداس

مترجم:۔۔۔۔۔۔ سیّد شہاب الدین دسنوی

کانجی دوارکاداس، ہندوستان کی ایسی ہمہ گیر و ممتاز شخصیت ہیں جن کا سیاسی اور سماجی خدمات میں شعور و کردار کی پختگی کے ساتھ نمایاں حصّہ رہا ہے۔ اُن کی خدمات کا زمانہ بھی بہت طویل ہے۔ وہ ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ قومی معاملات میں ہمیشہ گہری دلچسپی لی۔ بمبئی اسمبلی میں اُن کی کوششوں سے مزدوروں کی فلاح، پیشہ ور عورتوں، بے گھر اور آوارہ گرد بچوں کی بہبودی کے لئے کئی قانون منظور ہوئے۔ وہ بمبئی مجلس لیجسلیٹو کونسل کے رُکن، آل انڈیا ہوم رول لیگ کے جنرل سکریٹری اور خازن اور امپیریل ہوم رول لیگ کے بانی اور جنرل سکریٹری رہے۔ اُن کا شمار آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ بمبئی میونسپل کارپوریشن کے ممبر اور ہاؤسنگ بورڈ کے رُکن بھی رہے۔ یورپ، امریکہ اور مشرقی افریقہ کے سفر کئے، اِن ممالک میں تقریریں کیں۔ اُن کے مضامین مؤقر اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ کانجی دوارکاداس ہندوستان کی جنگِ آزادی کا ایک ایسا کردار ہیں جو اُس کے تمام کرداروں سے براہِ راست متعلق ہی نہیں بلکہ قریب رہے اور ۱۹۱۲ء سے ۱۹۴۷ء تک آزادی کے ڈرامے کے اسٹیج پر پسِ پردہ کام کرتے رہے۔ اُس دَور سے اِس تک کے تمام سیاسی لیڈروں سے اُن کا تعلق رہا اور اُنہوں نے اپنا رول بڑی خوبی، خلوص اور سچائی سے ادا کیا۔ اُن کی کتاب "ہندوستان کی جنگِ آزادی" جس کا مقدمہ برطانیہ کے سابق وزیرِ اعظم لارڈ ایٹلی نے لکھا تھا، ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ اِسی موضوع پر دوسری کتاب ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی۔

کانجی دوارکاداس اور پاکستان کے بانی قائدِ اعظم محمد علی جناح کے از ابتداء تا انتہا نہایت گہرے ذاتی تعلقات رہے۔ اور اُنہوں نے ایک عزیز دوست کی حیثیت سے محمد علی جناح کو قریب سے دیکھا۔

اِس کتاب کے مترجم سیّد شہاب الدین دسنوی (جو اُردو کی معروف شخصیت ہیں) نے کانجی دوارکاداس کی اجازت سے اُن کی دونوں کتابوں INDIAS FIGHT FOR FREEDOM اور TEN YEARS OF FREEDON میں سے قائدِ اعظم محمد علی جناح کی شخصیت اور سیاسی سرگرمیوں کے متعلق پھیلے ہوئے سارے مواد کا نہ صرف بہترین اُردو ترجمہ کیا ہے بلکہ تاریخی ترتیب کے ساتھ اِس خوبی سے پیش کیا ہے کہ یہ بجائے خود ایک ایسی کتاب بن گئی ہے جو قاری کو تحریکِ آزادی اور تقسیمِ ہند کے اہم ترین موڑوں اور حقائق سے آگاہ کراتی ہے۔

کانجی دوارکاداس نے اپنی کتابوں میں اُن یادداشتوں سے کام لیا ہے جو وہ ۱۹۱۶ء سے ۱۹۴۸ء تک ہر ہفتے لکھتے رہے تھے۔ اُنہوں نے اپنی یادداشتوں کی تقریباً تین سو فائلیں امریکہ کی پن سلوینیا یونیورسٹی کے کتب خانے کو دے دی ہیں۔

مصنّف نے لکھا ہے کہ "میں ہر بات صاف صاف لکھتا ہوں۔ نہ کسی کو خوش کرنے کی خاطر اور نہ کسی کو ناراض کرنے کے لیے"۔ اِس کتاب میں بعض اہم واقعات کے بعد کئی جگہ مصنّف کے قلم سے نکلا ہوا ایک بے اختیارانہ جملہ ملتا ہے۔ "اگر ایسا نہ ہوتا تو ہندوستان کی تاریخ آج کچھ اور ہوتی۔" مصنّف کی کھرائی، سیاسی شعور اور سچائی کا اِس سے بڑا اور کوئی ثبوت نہیں ہو سکتا۔ کتاب اپنی جگہ دلچسپ تو ہے ہی لیکن اِس میں دلوں کو جوڑنے اور ہمارے تمام سیاسی قائدین کی خوبیوں، خامیوں اور فروگزاشتوں کو محسوس کرا دینے کا بھرپور سامان ہے۔ اگر یہ کتاب دوسری زبانوں میں بھی شائع ہو جائے تو اِس سے نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں بلکہ ہندوستان اور پاکستان کی ناخوشگواریاں ایک حد تک دُور ہو سکتی ہیں۔ نئی نسلوں کیلئے تو خصوصیت کے ساتھ اِس کا مطالعہ ضروری ہے۔ کاش مصنّف اور مترجم دونوں کی پُرخلوص کاوشیں بار آور ہوں۔

کتاب کے آخر میں اُن تمام ناموں کا اِشاریہ مع نمبر صفحات درج ہے جو اس کتاب میں آئے ہیں۔

ضخامت ۱۲۸ صفحات، اعلیٰ کتابت و طباعت۔ قیمت چار روپے پچاس پیسے۔
ناشر:۔ علمی مجلس۔ چھتہ نواب صاحب۔ فراش خانہ۔ دہلی ۶

ہندوستانی زبان

ایڈیٹر ۔۔۔۔۔۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی

بمبئی میں ۱۹۶۷ء میں "مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر" قائم ہوا تھا۔ اور تین سال کی قلیل مدّت میں اس نے کافی ترقی کر لی ہے۔ اس میں ہندی، اردو، لنگوسٹکس کی نایاب اور معیاری کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر کا مقصد ہندوستانی اور دیگر بولیوں مثلاً اردو، ہندی، ریختہ، گجری، دکنی، اور اودھی وغیرہ پر کام کرنے کے علاوہ قلمی کتابوں کی ترتیب و تدوین، مختلف ہندوستانی بولیوں کے 'DESCRIPTIVE' دیگر ادبی و لسانی مطالعے اور ہندوستانی کی ذولسانی ڈکشنریاں تیار کرنا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ریسرچ کرنے والوں کو آسانیاں بہم پہنچانا بھی ہے عنقریب ریسرچ سینٹر کی طرف سے چند کتابیں شائع ہونے والی ہیں۔

خوشی کی بات ہے کہ اس سینٹر کے سینئر ریسرچ آفیسر ڈاکٹر عبدالستار دلوی کی توجہات اور کاوشیں بارآور ہو رہی ہیں۔ "ہندوستانی زبان" اسی ریسرچ سینٹر کا جریدہ ہے جس کا پہلا شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ سر ورق سے لے کر اپنے مندرجات تک اس میں ایک علمی سنجیدگی ہے۔ اسے اردو ہندی دونوں زبانوں میں ٹائپ کے ذریعہ شائع کیا گیا ہے۔ ۸۲ صفحات اردو کے ہیں اور ۵۰ صفحات ہندی کے۔ حصّہ اردو میں چار علمی اور تحقیقی مضامین شامل ہیں اور اسی طرح ہندی کے حصّے میں بھی۔ رسالے کی اٹھان کافی اچھی ہے۔ اگر مزید توجّہ دی گئی تو یہ ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد کے مرحوم رسالہ "ہندوستانی" (مرتبہ ڈاکٹر تاراچند) کی جگہ لے لے گا۔

قیمت فی کاپی تین روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر، نیتاجی سبھاش روڈ۔ بمبئی ۲

جگر بریلوی، شخصیّت اور فن

مرتبہ ۔۔۔۔۔۔ مالک رام و ڈاکٹر وصیفی پرمی

جناب شیام موہن لال جگر بریلوی ہمارے ایسے پرانے اساتذہ میں سے ہیں جنہوں نے اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصّہ کسی نہ کسی رنگ و معیار کے ادب کی خدمت میں صرف کیا ہے۔ اُن کی سرگرمیاں صرف غزل گوئی تک محدود نہیں رہیں۔ اُنہوں نے نظموں اور رباعیوں کے علاوہ ایک مثنوی "پیام ساوتری" بھی لکھی ہے۔ رباعیوں کا مجموعہ "نورس" کے نام سے چھپا۔ "حدیث خودی"، "یادِ رفتگاں"، "سحت شبان"، "یادگار نظر" اور "حدیث خودی" شائع ہوئیں۔ اُن کے ادبی و مزاحیہ مضامین اور نثر کی چار پانچ دوسری کتابیں شائع ہونا باقی ہیں۔ جگر بریلوی حضرت نوح لکھنوی سے رشتۂ تلمذ رکھتے ہیں۔

اس کتاب میں جگر بریلوی کی شخصیّت اور فن پر دس مضامین ہیں۔ خود جگر بریلوی کے قلم سے "میری تعلیم و تربیت اور میری ملازمت" کے عنوان سے دو خاصے طویل مضمون ہیں۔ ان میں اتنی ذاتی قسم کی باتیں ہیں جن سے ادب و شعر کے قاری کو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ دوسرے اہلِ قلم کے مضامین کو ہلکے پھلکے تاثراتی مضامین کہا جا سکتا ہے۔

ہونا یہ چاہیے تھا کہ جگر بریلوی کی غزلیہ شاعری، نظمیہ شاعری، رباعیوں اور اُن کی مثنوی پر تنقیدی نظر ڈالی جاتی، اُن کی نثری کاوشوں اور فن سے بحث ہوتی۔ بہتر انتخاب بھی آخر میں شامل کتاب کر دیا جاتا تو جگر صاحب کی شاعرانہ شخصیّت ابھر کر سامنے آجاتی۔

صفحات۔ قیمت چھ روپے۔ علمی مجلس چھتہ نواب صاحب فراشخانہ۔ دہلی۔

محفلِ اپنی

پہلے اثر کیوں ؟

"محفلِ اپنی" کے کالم میں ایسی ہی باتیں عرض کی جاتی ہیں جن کا تعلق صرف "شاعر" کے قارئین، قلم کاروں اور اُردو حلقوں سے ہو۔ لیکن بجز چند لوگوں کے عام طور پر اُن معروضات کا کوئی بھی اثر نہیں لیا۔ بات کتنی ہی دردمندی سے کیوں نہ کہی جائے' نتیجہ خیز نہیں ہوتی۔ آج کے انقلاب ساماں متحرک اور عمل دَور میں اُردو سے وابستہ حلقوں کی یہ خاموشی اور بے احساسی بڑی افسوسناک ہے۔ کیا اُردو حلقے نظریاتی بحثوں، شعر و شاعری، مشاعروں اور آپس کے اختلافات ہی میں اُلجھے رہیں گے ؟ عملی طور پر وہ اپنے علمی و ادبی جرائد کے لئے کچھ نہیں کریں گے ؟ کیا وہ چاہتے ہیں کہ یہ جو دس پانچ اُردو کے خالص علمی و ادبی رسائل رہ گئے ہیں، بند ہو جائیں ؟ زندگی کی دوسری ضرورتوں میں ادبی رسائل کو کیوں شامل نہیں کیا جاتا ہے ؟ کیوں اپنے طور پر ہر اُردو داں ایک دوسرے کو یہ احساس نہیں دلاتا کہ اُن رسائل کو زیادہ سے زیادہ خریدا جائے جو ایک طرف اُردو زبان کی زندگی کا ثبوت ہیں تو دوسری طرف اُن سے بہترین ادب و شعر کی ترویج و اشاعت ہوتی ہے۔

یہ ایک بڑا اور نہایت اہم سوال ہے کہ ادبی پرچے نہ رہیں گے تو اعلیٰ پایہ کے شعر و ادب کی ترسیل و تشہیر کس طرح ہوگی ؟۔ "شاعر" زبردست اقتصادی پیچیدگیوں میں گھرا ہوا ہے کیا اُردو حلقے اُس گھڑی کے منتظر ہیں جب یہ اعلان کر دیا جائے کہ چالیس سال کے بعد "شاعر" کو اب جاری رکھنا ممکن نہیں ہے۔ کسی ادبی جریدے کو زندہ رکھنے کیلئے بڑی تعداد میں مستقل خریدار، ایجنسیاں اور اشتہارات ضروری ہیں اور اس کیلئے سب کا تعاون چاہیئے۔ امدادِ باہمی کے بغیر تو اس دَور میں اُردو کے تعمیری کام ہو نہیں سکتے !۔

۱۹۷۱ء کا خاص نمبر :- چونکہ "گاندھی نمبر" ۶۹ء کے آخر میں نکلا تھا۔ اسلئے ۷۰ء میں "شاعر" کا کوئی خاص نمبر پیش نہ کیا جا سکا۔ "خاص نمبر" کے مطالبے بڑھتے جا رہے ہیں۔ ہم یہ اعلان کرتے ہوئے مسرت محسوس کرتے ہیں کہ اوائل ۱۹۷۱ء میں پھر "شاعر" کا ایک چونکا دینے والا خاص نمبر پیش کیا جائے گا۔
اعلان آئندہ شمارے میں ملاحظہ کیجئے !

رفتار

(علمی، ادبی اور تہذیبی خبریں)

● ۱۳ اگست کی شام کو "بزمِ سیماب"، باجوری گارڈن نئی دہلی کا ایک خصوصی جلسہ بزم کے صدر جناب ضیا فتح آبادی کی صدارت میں ہوا۔ ضیا صاحب نے جناب فراق گورکھپوری کی شخصیت اور اُن کے فن پر تقریر کی۔ اور تمام اُردو برادری کی طرف سے اطمینان و مسرت کا اظہار کیا کہ بھارتیہ گیان پیٹھ نے سنہ ۱۹۶۹ء کا ایک لاکھ روپیہ کا انعام فراق صاحب کی کتاب "گل نغمہ" پر دے کر وسیع النظری کا ثبوت دیا ہے۔ اس کے بعد ایک قرارداد متفقہ طور پر منظور ہوئی اور آخر میں شعراء نے اپنا چیدہ چیدہ کلام سنایا۔

● ۱۰ اگست ۷۰ء کو ماؤلنکر آڈیٹوریم نئی دہلی میں جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی قیادت میں بڑے اہتمام سے جشنِ ساحر ہوشیارپوری منایا گیا۔ افتتاح نائب صدر جمہوریۂ ہند شری پاٹھک نے فرمایا۔ اور صدارت جناب وی شنکر۔ آئی۔ سی۔ ایس نے کی۔ اسٹیج سکریٹری کے فرائض جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے انجام دیئے۔ نائب صدر جمہوریۂ ہند کی افتتاحی تقریر اور صدر کی تقریر کے بعد جناب ساحر ہوشیارپوری کے اُستاد حضرت جوش ملسیانی کی خدمت میں خلعت پیش کی گئی۔ پھر ساحر ہوشیارپوری کو ۲۳ ہزار روپے کا کیسہ زر کئی دیگر تحائف کے ساتھ پیش کیا گیا۔ جناب مالک رام نے ساحر ہوشیارپوری کے نئے مجموعۂ کلام "سحر نغمہ" کا اجراء کیا۔ ساحر ہوشیارپوری کا کلام ساز و نغمہ کے ساتھ پیش کیا گیا۔ اور آخر میں ایک شاندار مشاعرہ ہوا۔

آہ ــــــ سلیمان اریب

(چھپتے چھپتے) یہ اطلاع بڑے رنج و افسوس کے ساتھ سُنی گئی کہ اُردو کے ممتاز شاعر اور ماہنامہ "صبا" کے ایڈیٹر سلیمان اریب کا ۷ ستمبر سنہ ۱۹۷۰ء کو حیدرآباد میں انتقال ہو گیا۔ وہ کچھ عرصے سے کینسر کے موذی مرض میں مبتلا تھے۔ چند دن پہلے اُن کا آپریشن کیا گیا تھا۔ اُن کے پسماندگان میں اُن کی اہلیہ صفیہ کے علاوہ صرف ایک لڑکا ہے۔

سلیمان اریب مرحوم دس بارہ سال سے "ماہنامہ صبا" نکال رہے تھے۔ سلیمان اریب کی وفات اُردو دنیا کیلئے عموماً اور حیدرآباد کے ادبی و شعری حلقوں کیلئے خصوصاً باعثِ رنج و افسوس ہے۔ (ادارہ)

Regd. No. MH 244 The 'SHAIR' Bombay 8. September
THE MOST POPULAR OLDEST LITERARY & CULTURAL URDU JOURNAL
(41 Years of Publication) (Telephone No.
Publishing Dates, 15-16
Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 14482/57

اِس شمارے میں

جاری شدہ ۱۹۳۰ء
بانی سیماب اکبرآبادی مرحوم
اُردو کا اکتالیس سالہ علمی، ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

بمبئی شاعر

اکتوبر ۱۹۷۰ء
جلد (۴۱) شمارہ (۱۰)

مُدیرِ اعلیٰ
اعجاز صدیقی

ادارۂ تحریر:
مہندر ناتھ
ڈاکٹر محمد حسن
شہاب جعفری
ندا فاضلی

زرِ سالانہ: ۱۰ روپے
معاونین سے: ۲۵ روپے
تاعمر خریداری: ۱۲۵ روپے
ممالکِ غیر سے: ۲۵ شلنگ

فی پرچہ: ایک روپیہ

ترسیلِ زر کا پتہ
ماہنامہ شاعر، قصر الادب، بمبئی ۸ بی سی

★

خط و کتابت کا پتہ
ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصر الادب، پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ بمبئی ۸ بی سی

★

فون نمبر: ۳۵۹۹۰۴

کرشن چندر نمبر ——— غالب نمبر ——— گاندھی نمبر

جیسی یادگار اور مثالی خصوصی اشاعتوں کے بعد

شاعر

کی ایک اور منفرد، معیاری، خوبصورت، ضخیم اور انتہائی دلچسپ خصوصی اشاعت پیش کی جارہی ہے۔

ناولٹ نمبر

طویل ناول اور مختصر افسانہ کی درمیانی کڑی ناولٹ دنیا کی ہر زبان کے ادب میں سب سے زیادہ پسندیدہ چیز ہے

۱۹۷۱

اُردو کے شہرۂ آفاق اور ممتاز ناولٹ نگاروں کے تازہ ترین، غیرمطبوعہ اور بیش قیمت

۱۸ ناولٹ

ناولٹ نگاروں کی تصاویر اور اُنکے سوانحِ حیات

اُردو رسائل کے خاص نمبروں میں ایک گرانقدر اضافہ

ناولٹ نِگار

کرشن چندر	راجندر سنگھ بیدی
خواجہ احمد عباس	کوثر چاند پوری
رام لعل	مہندر ناتھ
قاضی عبدالستار	جوگندر پال
ستیش بترا	ہربنس دوست
ست پرکاش سنگر	آمنہ ابوالحسن
عفت موہانی	واجدہ تبسم
حامدی کاشمیری	اکرام جاوید
نور شاہ	موہن یاور

ناولٹ
ایک تنقیدی جائزہ

ترتیب

شاعر نمبر

مقالات

اُردو کا رسم الخط ہرگز نہ بدلیے

کئی ہفتے سے "بلٹز" میں "اُردو رسم الخط" پر نرم وگرم بحثیں ہو رہی ہیں، اس سے پہلے بھی اُردو اخبارات و رسائل میں بہت بحثیں ہو چکی ہیں۔ اور اب تک کی یہ تمام خامہ فرسائی اس اعتبار سے بے معنی ثابت ہوئی ہے کہ ذمہ داران اُردو نتائج و عواقب کو سامنے رکھ کر کوئی آخری فیصلہ نہیں کر سکے ہیں۔ اُردو کو اُس کے مخالفین سے اتنا نقصان نہیں پہنچ رہا ہے، جتنا خود اُردو والوں کی باہمی آویزش سے پہنچا اور آئندہ بھی پہنچنے کا خدشہ ہے۔ کافی پڑھے لکھے اور با شعور اُردو ادیب و شاعر "رسم الخط" کی بحث میں بارہا اپنا توازن کھو چکے ہیں اور آپس ہی میں زبردست تلخیاں پیدا کر لی ہیں۔ حیرت ہے کہ ان کے ذہن انگریزی اقتدار کی "لڑاؤ، کمزور بناؤ اور حکومت کرو" کی حکمت عملی (POLICY) تک کیوں نہیں پہنچ رہے ہیں۔ ہندی اقتدار نے بھی اُردو والوں میں یہ بیج بو دیا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اُردو کے کسی مسئلے پر بھی گزشتہ بیس بائیس سال میں خود اُردو والے متفق نہیں ہو سکتے ہیں، حکومت یا دوسروں سے کسی بات کا منوا لینا تو الگ بات ہے۔ انگریزوں نے بھی اپنے اقتدار کے لئے بے شمار ہندوستانیوں کو اپنا آلۂ کار بنایا تھا۔ ہندی والے بھی اُردو والوں کو استعمال کر رہے ہیں۔ یہ میں کسی پر طنز نہیں کر رہا ہوں، نہ مجھے ہندی زبان کی سرکاری و قومی حیثیت سے اِنکار ہے۔ میں اُس کے فروغ سے خوش ہوں۔ زبانوں، قوموں اور فرقوں کے درمیان رواداری اور یک جہتی کو پسند کرتا ہوں۔ میں اِس بحث میں بھی پڑنا نہیں چاہتا تھا، لیکن ۱۲ ستمبر کے "اُردو بلٹز" میں عصمت چغتائی کا مضمون "میں اُردو کا فائدہ چاہتی ہوں" پڑھ کر اُردو دوستوں کے ذہن کو ایک ایسی سمت میں لے جانا چاہتا ہوں، جس کی طرف اب تک توجہ نہیں دی گئی ہے۔ میری یہ بھی درخواست ہے کہ اُردو رسائل و اخبارات میں "رسم الخط" کی بحث کو قطعی بند کر دیا جائے۔ اب تک کی ہونے والی بحثیں اتنی گھسی پٹی، بے محل، لایعنی، بے سوچی سمجھی، بے نتیجہ اور سطحی انداز کی ہیں۔ (بہ استثناء) کہ رسم الخط کے انتہائی نازک، اہم اور خالص علمی و لسانی، سماجی اور سیاسی پہلوؤں کو ذرا بھی نہیں چھوتیں۔ اس کے بجائے ہندی اور بعض دوسری ملکی زبانوں کی "خفیہ سرگرمیوں" سے وابستہ لوگ اور ادارے ہم اُردو والوں کی کمزوریوں اور بے وقوفیوں (معافی چاہتا ہوں) سے آگاہ ہوتے رہتے ہیں، ہمارے اختلافات سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اُن کو اس کا موقع ملتا ہے کہ ہماری باتوں کی روشنی میں وہ آئندہ کے لئے اپنی کیا پالیسیاں بنائیں۔ کتنے اسکولوں اور کالجوں سے اُردو کو ختم کرائیں۔ کتنی اُردو کانفرنسوں اور کتنے کنونشنوں کو ناکام بنائیں۔ کیسے انعام دلائیں اور کیسے مشہور کروائیں، ریاستی اسمبلیوں اور مرکزی پارلیمنٹ میں اُردو کے سوال کو کس طرح ذرا مبہم کریں۔ کن اُردو ادیبوں، اخباروں اور رسالوں کو سیاہ فہرست (BLACK LIST) میں پہنچائیں اور کن کے سینوں پر تمغے لگوائیں۔ ہندی زبان کا محکمۂ (INTELLIGENCE) اُردو کی ایک ایک نمایاں شخصیت کے مزاج و کردار اور رفتارِ خیالات سے پوری طرح واقف ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ اُردو والوں کی نااتفاقیاں کہاں تک پہنچ چکی ہیں۔ اُسے علم ہے کہ آنند نرائن مُلّا، حیات اللہ انصاری اور آل احمد سرور کے الگ الگ سیاسی و لسانی نظریات و خیالات کیا ہیں؟ وہ مرکزی انجمن ترقی اُردو اور اُس کی شاخوں کی کارکردگی سے بھی اچھی طرح آگاہ ہے۔ اُس کے پاس اُردو پڑھنے اور بولنے والوں کے صحیح اعداد و شمار ہیں (جو خود اُردو والوں کے پاس نہیں ہیں اور یہ اُردو والے محض ہوا اور خلا میں باتیں کرتے ہیں) اُردو والے کتنے مصلحت پسند بن چکے ہیں اُس کو اس کا بھی اندازہ ہے۔ اُس کی نظر اُس تدریجی اثر کرنے والے زہر (SLOW POISON) پر بھی ہے جو ۲۲ سال پہلے اُردو کے جسم میں اِسی گروہ نے پہنچایا تھا اور جس کے اثرات کا بغائر مطالعہ ہندی زبان کے سربراہ کرتے رہتے ہیں۔ وہ خفیہ کارکردگی کا محکمہ خوب سمجھ چکا ہے، اور اپنے پورے ہندوستان گیر حلقے کو سمجھا بھی چکا ہے کہ اُردو بہت سخت جان زبان ہے، "وقت گزارو۔ الجھائے رکھو" کا نسخہ

اُردو زبان والوں کو ابھی پچاس سال اور استعمال کرنا پڑے گا۔ آسے معلوم ہے کہ اُردو کی بلند و بالا عمارت میں شگاف تو پڑ گئے ہیں، مگر بنیادیں بہت گہری اور مضبوط ہیں۔ آسے یہ بھی اندیشہ ہے کہ سب اُردو والے مل کر ان شگافوں کو بھر نہ دیں۔ اِس لئے جہاں تک ہو سکے اُردو والوں کو "اتحادِ خیال" سے روکا جائے۔ چنانچہ بڑے غور و فکر کے بعد انتہائی ہوشیاری سے اُردو کے سادہ لوح ادیبوں کے کانوں میں یہ بات

"اگر تم نے اُردو کا رسم الخط نہ بدلا تو تمہارا اَدب مر جائے گا۔"

ظاہر ہے اِن ادیبوں کو فکر ہونی ہی چاہیئے۔ چاہے زبان مر جائے مگر اُس زبان کا ادب زندہ رہے۔ یہ ہے شوشے کے حروف میں لکھا جانے والا "نظریۂ تبدیلیٔ اُردو رسم الخط"۔ میں تفصیل میں بالکل نہیں جا رہا ہوں۔ گزشتہ بیس سال میں اِس مسئلے پر میں نے جتنا غور و خوض کیا ہے، جتنا سمجھا اور لکھا ہے اُسے تفصیل سے پیش کرنے کے لئے کئی سو صفحات چاہئیں۔ یہاں اُردو ادب کے زندہ رہنے کے مفروضے کے سلسلے میں صرف ایک بات کہتا چلوں اور وہ یہ کہ ہندی اور اُردو والے (دونوں) بار بار پریم چند کا نام لے رہے ہیں، مگر درمیان میں حائل کی کتنی بڑی ٹٹی حائل ہے۔ کاش اِس پر بھی غور کیا جا سکے۔؟!

جہاں تک مسئلۂ معلومہ کے علمی، لسانی، تہذیبی، سیاسی اور سماجی پہلوؤں کا تعلق ہے، اُردو زبان کے اپنے مزاج، کردار اور انفرادیت کا سوال ہے، تو اُس کے پیشِ نظر رسم الخط کا حل اُردو اخبارات اور رسالوں کی بحثوں سے ممکن نہیں ہے۔ نہ یہ دو چار دن اور دو چار لوگوں کے غور و فکر کی بات ہے۔ یہ تو وہ اہم ترین مسئلہ ہے جس پر تمام دانشوروں کو بند کمرے میں سر جوڑ کر بیٹھنے اور غور و فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ ندا فاضلی نے علمی اور لسانی بنیادوں پر بات کو کچھ آگے بڑھانا چاہا تھا مگر افسوس کہ وہ بات بھی ترقی پسندی، سی آئی اے اور جدیدیت وغیرہ کے خارزار میں اُلجھ کر رہ گئی!۔ خدا کے لئے ایک بہت عظیم، بہت مالدار اور جاندار زبان کے ساتھ مذاق نہ کیجئے۔ مسئلے کو جذبات کی رَو میں نہ بہایئے اور لچھے دار افسانوی رنگ کی تحریروں یا طنزیہ جملوں اور فقروں میں نہ اڑایئے (دونوں گروہوں، مؤیدین، اور مخالفین سے میری یہی درخواست ہے) تھوڑی دیر کی واہ واہ کے لئے زبانوں اور قوموں کی زندگیوں سے اِس طرح نہیں کھیلا کرتے!

ہر تحریک اٹوٹ جذبہ، قربانی اور عمل چاہتی ہے، فیصلہ کن جنگیں زنگ آلود قلموں، فرسودہ دماغوں اور مصلحت آمیز تحریروں سے نہیں لڑی جاتی ہیں۔ پورے ملک کے ہنگامی حالات، چھوٹی بڑی تحریکوں اور زبانوں کے ارتقاء (DEVELOPMENTS) کی طرف سے جن کی آنکھیں بند ہیں وہی اِس طرح کی باتیں کر سکتے ہیں۔

عصمت چغتائی اُردو کی اچھی افسانہ نگار ہیں۔ اِس آخری مضمون میں بھی اُن کی افسانوی رنگ کی تحریر نے لطف دیا۔ وہ باور کریں کہ شروع ہی سے اُن کے دلائل بے جان، غیر نفسیاتی اور غیر منطقی رہے ہیں۔ اپنی تحریروں میں کوئی ایک بات بھی اُنہوں نے نئی نہیں کہی ہے۔ ہاں کچھ اُردو ہندی والوں کی کہی ہوئی پچھلی باتوں کو اپنی افسانوی زبان میں دوہرا دیا ہے۔ مگر اِن باتوں کا [illegible] اُردو کا بھی تعلق نہیں۔ اِس بار اُن کا لہجہ بڑا نرم اور پیار بھرا ہے جس سے احساسِ شکستگی و پسپائی کے علاوہ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ بالکل خالی الذہن ہیں اور سخت احساسِ کمتری کا شکار۔ اُنہیں علم ہی کہ اُردو کا لسانی مسئلہ کیا ہے؟ اُنہیں تو صرف ایک ہی دُھن ہے کہ اُردو کا رسم خط بدل دینے سے ایک وسیع میدان ہاتھ آجائے گا۔ ادیبوں اور شاعروں کو خوب فائدہ ہوگا۔ اُردو کے رسالے اور اخبارات ناگری رسم الخط میں خوب فروخت ہوں گے! سے

"اِس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا۔"؟!

اگر عصمت چغتائی کی یہ آرزو پوری ہو گئی تو جس اخبار میں وہ آج کل "مسئلۂ اُردو رسم الخط" پر لکھ رہی ہیں یعنی "اُردو بلٹز" (جو بیس ہزار سے زیادہ چھپتا ہے) وہ تو بند ہو ہی جائے گا۔ کرنجیا صاحب "دو دو اخبار ایک ہی رسم الخط" میں کیسے نکالیں گے؟

"شمع" والے جو عصمت کو کافی معاوضہ دیتے ہیں، ایک ہی رسم الخط میں "شمع" اور "شمسا" کیونکر شائع کر پائیں گے۔ "ہند پاکٹ بکس" سے اردو ادب کی دس ہزار کی تعداد تک چھپنے والی کتابیں اردو میں بھلا کیوں شائع ہونے لگیں؟ وہ صرف دیوناگری ہی میں چھپیں گی اور ہندی کی کتابیں کہلائیں گی۔ اب اردو اور ہندی میں الگ الگ چھپتی ہیں۔ یہ تو چند سامنے کی مثالیں ہیں اور بہت موٹی عقل رکھنے والوں کے دماغ میں بھی یہ باتیں آ سکتی ہیں۔ صرف اسی ایک نکتہ پر زوردار بحث ہو سکتی ہے۔

جہاں تک ہندوستان کے دیہی علاقوں میں ناگری رسم الخط کے ساتھ اردو کے بہت زیادہ پھیلاؤ کے روشن امکانات کی طرف عصمت چغتائی یا دوسرے مؤیدینِ ناگری رسم الخط کے ذہنوں کے جانے کی بات ہے تو ہم اس خوش فہمی کو بھی مانے لیتے ہیں، مگر پہلے اُن کروڑوں دیہاتیوں کو اردو پڑھانی ہوگی، عربی، فارسی اور ترکی الفاظ کا صحیح تلفظ مع معنی بتانا ہوگا۔ اردو کے وہ محاورے سمجھانے ہوں گے جو عصمت چغتائی اپنے افسانوں میں استعمال کرتی ہیں۔ اُس تہذیب اور معاشرے سے بھی آگاہ کرنا ہوگا جس سے اردو ادب وابستہ ہے۔ اس لئے کہ گزشتہ تیس چالیس سال میں ہندی داں اکثریتی فرقہ "سنسکرت آمیز ہندی" اور اُس زبان سے وابستہ تہذیب سے پوری طرح واقف ہو چکا ہے۔ ہندی کی نئی نسل کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان کے لئے دیوناگری رسم الخط میں بھی اردو کتابوں اور اخبارات و رسائل کو پڑھنا اور سمجھنا ممکن نہیں۔ ہاں اگر عصمت چغتائی اور چند دوسرے "مؤیدینِ ناگری رسم الخط" کی نظر میں اردو کی وہ "آخری کریا کرم" کی منزل ہے جب اُس میں اور ہندی زبان میں کوئی فرق نہ رہے۔ تو اُن کے اس "نیک خیال" پر کفِ افسوس ملنے کے علاوہ اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ ؟!

اگر تقسیم کے بعد مہاتما گاندھی کے نظریۂ "ہندوستانی" کو مان لیا جاتا۔ اُسی کو (دیوناگری اور فارسی دونوں رسم الخطوں میں) قومی اور سرکاری زبان قرار دے دیا جاتا تو اردو والوں کو کوئی اعتراض نہ ہوتا اور اردو ہندی اس طرح الگ الگ زبانیں نہ رہتیں۔ ان کے ناموں کا جھگڑا ہی مٹ جاتا۔ اب جبکہ دونوں زبانیں ہر اعتبار سے بڑی اور مکمل زبانیں بن چکی ہیں تو ایک زبان سے اُس کا مخصوص رسم الخط چھین کر اُسے ختم کر دینا کتنی بڑی زیادتی ہے۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ اردو زبان کے "پروانۂ موت" پر اردو والوں ہی سے دستخط کرانے کی شعوری سازش کی جا رہی ہے۔!!

کیا چھوٹے چھوٹے ملکوں اور علاقوں نے اپنی زبانوں اور رسم الخطوں کو محض اس خیال سے کبھی تبدیل کیا ہے کہ اُن کا ادب دوسری بڑی زبانوں اور کسی بڑی تعداد کے اختیار کردہ رسم الخط میں بدل کر زیادہ پڑھا جائے گا۔؟؟؟؟؟۔ نیپال، بھوٹان، برما، سیلون، ایران، افغانستان، ترکی، ملایا، انڈونیشیا، ملیشیا اور بہت سے دوسرے چھوٹے بڑے ممالک کی اُن کی اپنی زبانوں اور اُن کے ادب کے متعلق کیا ارشاد ہے "اردو کے لئے دیوناگری رسم الخط اختیار کر لینے والوں اور حامیوں کا ؟ ۔

میں جاننا چاہتا ہوں کہ ہندوستانی بک ٹرسٹ کے شائع کردہ دیوانِ غالب اور دیوانِ میر (ہندی) کے اب تک کتنے ایڈیشن شائع ہوئے ہیں اور ان کے کتنے کروڑ نسخے ہندی پڑھنے والوں نے خریدے ہیں۔ خود عصمت چغتائی کے ناول ہندی میں ترجمہ ہونے کے بعد کتنے لاکھ چھپے ہیں؟؟ (آئندہ کی خوش فہمیوں کا انجام معلوم ہوا۔)

عصمت چغتائی کو شاید علم نہیں کہ ہندی والے نہ صرف اردو کے فارسی رسم الخط ہی کو تبدیل کرا دینے کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں بلکہ "اردو شعر و ادب کے بھارتیہ کرن" کی آوازیں بھی زور شور سے اٹھائی جا رہی ہیں۔ صاف طور پر یہ کہا جا رہا ہے کہ "اردو شعر و ادب میں ہندوستانیت نہیں ہے۔" خدا کرے عصمت چغتائی وہ دَور بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں جب چند سال بعد اُن کی تحریریں دیوناگری رسم الخط میں بھی بے وقعت بن جائیں گی !۔ خدا کے لئے وہ اکثریتی فرقے کے ذہنی دھارے کو سمجھیں اور اردو والوں کے جذبات سے نہ کھیلیں۔

اُردو کا فارسی رسم الخط بدل دینے کے سلسلے میں جتنے بھی دلائل (ARGUMENTS) ہندی اور اُردو والوں نے ابتک پیش کئے ہیں وہ سب انتہائی ناقص اور سازشانہ ہیں۔ نظالوں کی تعلیم اور بچوں کے ذہنوں پر بوجھ کے سلسلے میں جو باتیں عصمت چغتائی نے لکھی ہیں وہ بھی اُن کی تعلیمی اُمور سے ناواقفیت پر مبنی ہیں۔ انہوں نے بڑی بھولی باتیں کہی ہیں۔ مگر انہیں یہ معلوم نہیں کہ ہر صوبے میں تین سے پانچ زبانوں تک کا بوجھ بچوں پر ہے اور یہ ہمیشہ رہیگا۔ اس سلسلے میں بھی انہوں نے محض افسانوی کڑیاں جوڑی ہیں۔

حرفِ آخر

اگر ہندوستان میں اُردو زبان اپنے مزاج و کردار و انفرادیت اور رسم الخط کے ساتھ صرف چند لاکھ لوگوں کی زبان بھی رہجائے تو اس سے بہتر ہے۔ جبکہ رسم الخط بدل دینے کے بعد اس کا کوئی وجود ہی باقی نہ رہے۔ سنسکرت جیسی عظیم زبان بھی محدود ہو گئی تھی مگر اس کی عظمت میں کوئی فرق نہ آیا۔ اس کا ادب آج بھی عظیم سمجھا جاتا ہے۔ اس کا احیاء (REVIVAL) ہماری نظروں کے سامنے ہے۔ اُردو زبان محدود ہو کر اور زیادہ عظیم و وسیع ہو جائے گی۔ ہمیں اس کی بین الاقوامی حیثیت پر بھی نظر رکھنا چاہئے اور اس کی ترقی و بقا کے لئے انتھک مخلصانہ کوشش کرنی چاہئیں۔

عزیز صدیقی

پس نوشت:

یہ مراسلہ ۱۹ ستمبر ۱۹۷۰ء کے اُردو بلٹز بمبئی میں شائع ہوا تھا۔ افسوس کہ کتابت کے بعد کالم سازی کے وقت کئی جملے اِدھر سے اُدھر ہو گئے تھے اور اس میں عرض کی گئی باتوں کا ربط و تسلسل قائم نہ رہ سکا تھا۔ بلٹز (اُردو) میں شائع شدہ اس مراسلے کو بطور اداریہ "شاعر" میں دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔ مراسلے میں عصمت چغتائی کے مضمون کا مندرجہ ذیل جملہ بھی درج ہونے سے رہ گیا تھا۔

"میں نے مشق کرنے کے لئے ہندی رسالے پڑھنے شروع کئے۔ اُن میں مجھے بہت سی ایسی کہانیاں ملیں جنہیں میں پہلے اُردو رسم الخط میں پڑھ چکی تھی۔ یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا کہ انواد کے مرحلے سے گزرنے کے بعد اُن کہانیوں کی زبان میں بہت کچھ جھٹکے پیدا ہو گئے۔ وہ خوبصورتی اور روانی ختم ہو گئی۔ نشی پریم چند کی وہ کہانیاں جو نہایت آسان اُردو میں تھیں انواد کے بعد ٹھیٹ ہندی میں تبدیل ہو گئیں۔ عموماً شاعری کی رتی ہے لیکن مجھے سخت حیرت ہوئی جب میں نے دیکھا کہ جذا شعار کا حلیہ بھی خراب ہو گیا ہے۔ وزن بھی لڑکھڑا گیا ہے اور معنی بھی بے تکے ہو گئے۔"

فصیلِ شب کٹنے سے پہلے

میں مانتا ہوں حصارِ شب میں تمہاری جانوں پہ بن گئی ہے
میں مانتا ہوں فصیلِ شب سے نبرد آرا ہیں گرم سانسیں
میں مانتا ہوں کہ صبحِ نو کی کرن ہے خوابوں میں کارفرما
میں مانتا ہوں کہ ڈس رہی ہیں نفس نفس تم کو سرد آہیں

مگر مرے اس یقیں کی دولت تمہاری راہوں میں لٹ چکی ہے
تجلیوں کی متاعِ روشن جفا کے رستے میں کھو گئی ہے

فصیلِ شب کاٹنے سے پہلے، نگاہ و دل کا بھی جائزہ لو!
وفا کی شمعیں بجھانے والو، حصارِ شب پائیدار کب ہے
حیات اک دائرہ ہے جس میں، ہے تیرگی بھی، تجلیاں بھی!
تمہیں تو ہے تیرگی ہی پیاری، تمہیں تجلی سے پیار کب ہے

فصیلِ شب کاٹنے سے پہلے دھوئیں کی چادر ہٹاتے جاؤ

دھواں جو گھیرے ہوئے ہے صبحیں، دھواں جو شاموں پہ چھا گیا ہے
دھواں جو چہروں پہ جم گیا ہے، دھواں جو سانسوں میں گھل گیا ہے
دھواں جو آنکھوں میں چبھ رہا ہے، دھواں جو سینوں میں گھٹ رہا ہے
دھواں جو یادوں کا تلخ ہالہ بنا کے نس نس میں اٹھ رہا ہے
دھواں جو تلخی کی لہر بھی ہے، دھواں جو نسلوں کو زہر بھی ہے
دھواں کہ اب جس کی زد میں لوگو، ہر ایک جنگل بھی شہر بھی ہے

دھواں دھواں ہیں تمام چہرے، دھواں دھواں ہے فضائے عالم
سیاہ کرتوت ہو چکے ہیں چراغِ ہستی کی لو ہے مدھم

فصیلِ شب کاٹنے سے پہلے دھوئیں کا سحرِ تمام توڑو
برائے صبحِ حیات توڑو، برائے تزئینِ شام توڑو
جو تلخ یادوں نے بُن دیئے ہیں، وہ بند توڑو، وہ دام توڑو

حصارِ شب ہے نظر کا دھوکا "فصیلِ شب" ہے دھوئیں کی چادر
دھوئیں کی چادر ہٹا کے دیکھو، چمک رہے ہیں تمام منظر!

فصیح اکمل قادری

مقالہ

ڈاکٹر احمر لاری

تاریخِ ادب کی تدریس

تاریخِ ادب کی تدریس کے مسئلے پر غور کرتے ہوئے سب سے پہلے یہی سوال ہمارے سامنے آتا ہے کہ تاریخِ ادب کیا ہے؟ اس سوال کا ایک آسان سا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ "کتابوں اور ان کے مصنّفین کے تاریخی ترتیب سے ذکر کا نام تاریخِ ادب ہے۔" ظاہر ہے یہ جواب نہ صرف یہ کہ مبہم ہے، بلکہ تاریخِ ادب کو سمجھنے میں بہت دُور تک ہماری رہنمائی بھی نہیں کرتا۔ اُردو میں تاریخِ ادب کا تصوّر مغرب کی دین ہے، کیونکہ عربی اور فارسی میں تاریخِ ادب کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ لہٰذا ہمیں تاریخِ ادب کا ایک واضح خاکہ متعیّن کرنے کے لیے مغربی زبانوں اور خصوصاً انگریزی کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ انگریزی میں نظریاتِ ادب کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ تاریخِ ادب کا تصوّر بدلتا رہا ہے۔ آج انگریزی میں تاریخِ ادب کا جو ارتقا یافتہ تصوّر ملتا ہے وہ انیسویں صدی کے چند اہم نقّادوں کے نظریاتِ ادب کا پروردہ ہے۔ مادام دی استیل (Mme De steal) کا خیال ہے کہ "ادب کا اظہار معاشرے کا اظہار ہے۔" سینٹ بوو (Sainte Beuve) کے نزدیک "ادب شخصیت کا اظہار ہے۔" مشہور تاریخی نقّاد تائین (Taine) ادب کو نسل (Race)، ماحول (Milieu) اور تشویق (Moment) کے اظہار سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کے خیال میں ادب معاشرتی عوامل کی پیداوار ہوتا ہے اور ادیب اپنے عہد، معاشرہ اور عصری تشریقات کی مخلوق۔" اِس کے علی الرغم میتھو آرنلڈ (MATHEW ARNOLD) ادب میں شخصی اور غیر شخصی دونوں عناصر کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ اِس کے نزدیک "ادب افکار و تصوّرات کا اظہار ہے۔" اور ادبی شہ پاروں کی تخلیق میں دو عوامل لازمی ہیں۔ اوّلاً تشریقاتِ تخلیقی، ثانیاً تشریقاتِ عصری۔" یہ نظریات بظاہر متناقض نظر آتے ہیں۔ لیکن دراصل یہ ایک دوسرے کا تکملہ ہیں۔ ان سب میں جزوی صداقت موجود ہے۔ درحقیقت ادب شخصیت کا اظہار بھی ہے اور معاشرے کا بھی۔ اِس کے آئینے میں نسل، ماحول اور عصری تشریقات کی پرچھائیاں بھی اُبھرتی ہیں اور شخصی اور اجتماعی افکار و تصوّرات کا عکس بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ انہیں نظریاتِ ادب نے مجموعی طور پر انگریزی میں تاریخ ادب کا تصوّر متعیّن کیا ہے، جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

ادب میں شخصی عنصر کی اہمیت کم نہیں، کیونکہ کسی کتاب کا ذکر آتے ہی سب سے پہلے ہمارا ذہن اُس کے لکھنے والے کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اس لیے تاریخِ ادب کا سب سے پہلا کام ان شخصیتوں کی طرف توجّہ مرکوز کرنا ہے جنہوں نے ادب کی تخلیق کی ہے۔ تاریخِ ادب میں کسی مصنّف کے سوانحِ حیات، تجربات اور کردار کا تفصیلی جائزہ تو ممکن نہیں۔ لیکن اتنا بہرحال ضروری ہے کہ ہر مصنّف کی شخصیت کے خدوخال ضرور واضح ہو جائیں۔ ایک نقّاد کا قول ہے کہ ہر بڑا مصنّف اپنے ساتھ دنیا میں ایک بالکل نئی چیز لے کر آتا ہے۔ یعنی اپنے آپ کو۔ یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے، کیونکہ ہر تصنیف پر اِس کے مصنّف کی شخصیت کی گہری چھاپ ہوتی

ہے جو اُسے دوسری کتابوں سے ممتاز کرتی ہے۔ کسی مصنّف کا مطالعہ کرتے وقت اُس کی انفرادیت کے خدوخال کا متعین کرنا بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر ہم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ اسے اپنے ادب میں کیوں اہمیت حاصل ہوئی۔ اس لئے تاریخ ادب کا یہ اوّلین فریضہ ہے کہ ہر مصنّف نے اپنے ادب میں جو اضافہ کیا ہے اُس کی ماہیّت اور اہمیت پر روشنی ڈالے۔

لیکن یہ چیز تاریخ ادب کا ایک معمولی جزو ہے۔ صرف اہم مصنّفین اور ان کی تصانیف کی فہرست سازی کا نام تاریخ ادب نہیں، کیونکہ ادب مجموعی طور پر آگے بڑھتا اور متغیّر ہوتا رہتا ہے۔ اس نامیاتی ارتقاء کی داستان بیان کرتے ہوئے تاریخ ادب کو ہر مصنّف کا ادبی مقام متعین کرنا ہوگا اور ماقبل اور مابعد کے مصنّفین سے اُس کے تعلق کی وضاحت کرنی ہوگی۔ غیر معمولی توانا شخصیت کا حامل مصنّف لازمی طور پر اپنے عہد کو متاثر کرتا ہے اور اس کے بعد آنے والے مصنّفین کے یہاں شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کے اثرات ضرور پائے جاتے ہیں۔ اُردو ادب میں میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ اس کی بیّن مثال ہیں۔ ان تینوں شعراء نے اپنے عہد کو اور اپنے بعد آنے والے شعراء اور اُدباء کو جس طرح متاثر کیا ہے۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ علاوہ ازیں اگر کسی مصنّف کی کسی خاص قسم کی کوئی تصنیف مقبولیت حاصل کرتی ہے تو فطرتاً اُس کی تقلید کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ اس طرح دبستانوں کی تشکیل ہوتی ہے اور تحریکوں کا آغاز ہوتا ہے۔ اس قسم کی تحریکوں اور دبستانوں کا ادب کی ترقی میں بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے اور ان کی اہمیت انفرادی مصنّفین سے کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ صلاحیتوں کا حامل شخص بھی ماقبل کی ذہنی صلاحیتوں کا مرہونِ منّت ہوتا ہے اور اُن سے کسبِ فیض کرتا ہے۔ ادب میں چراغ سے چراغ جلانے کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ پروفیسر آل احمد سرورؔ کا قول ہے کہ "اگر غالبؔ نہ ہوتے تو اقبالؔ بھی نہ ہوتے" یہ بات ایک حد تک صحیح ہے۔ لیکن اس سے اقبالؔ کی عظمت پر حرف نہیں آتا۔ تاریخ ادب کو ان تمام باتوں کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ اسے ایک مصنّف سے دوسرے مصنّف اور ایک گروہ سے دوسرے گروہ کے تعلق کی وضاحت کرنی ہوگی اور دبستانوں اور تحریکوں کے آغاز و ارتقاء پر روشنی ڈالنی ہوگی۔ اگر کسی مصنّف نے ان دبستانوں اور تحریکوں کے ارتقاء میں نمایاں حصّہ لیا ہے۔ تو اس بات کا جائزہ لینا ہوگا کہ اُس نے کس حد تک ادب کی رفتار کو متاثر کیا ہے۔ اور آیا وہ قدیم روِش پر چلتا رہا ہے یا اُس نے ادب کو کوئی نئی راہ دکھائی ہے۔

جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں ادب ارتقاء پذیر ہوتا ہے اور نسلاً بعد نسلٍ اس میں تغیّرات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ چونکہ ہر عہد ایک مخصوص رجحان کا حامل ہوتا ہے اور اُس کے ادراک و احساس کا انداز بھی مخصوص ہوتا ہے۔ لہٰذا اُس عہد میں ادب کی تخلیق بھی اُسی مخصوص ذوق کے تابع ہوتی ہے۔ یہ ذوق کچھ عرصے تک قائم رہتا ہے اس کے بعد لازماً اس میں تبدیلی آتی ہے۔ اس تبدیلی کا سبب خواہ پرانے ذوق کی فرسودگی ہو، خواہ نئے معاشرتی، ذہنی اور ثقافتی رجحانات۔ بہر حال ہر عہد کا ذوق نہ صرف یہ کہ مختلف ہوتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی تو ان میں بعد المشرقین ہوتا ہے۔ اسی لئے ایک عہد کا ادب بھی دوسرے عہد کے ادب سے مختلف ہوتا ہے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے کا شعر و ادب جاگیردارانہ عہد اور ماحول کا پروردہ تھا۔ اسی لئے وہ ۱۸۵۷ء کے بعد کے شعر و ادب سے اتنا مختلف نظر آتا ہے۔ ابھی حال میں اُردو ادب میں جو تغیّرات رُونما ہوئے ہیں، اُن سے ہم آپ سبھی اچھی طرح سے واقف ہیں۔ ۱۹۶۰ء سے پہلے اُردو میں ترقی پسند ادب کا طوطی بول رہا تھا، اور خارجیت اور مقصدیت حاوی رجحان کی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے دنیا بدل گئی اور داخلی و انفرادی رجحانات ادب میں حاوی ہوتے گئے۔ اب تو داخلیت اور انفرادیت کی لَے اتنی تیز ہو گئی ہے کہ ترقی پسند عہد کے پروردہ لوگوں کے لئے آج کے ادب کو سمجھنا بھی دشوار ہو گیا ہے۔ ان حالات میں تاریخ ادب کی بنیادی غایت یہ ٹھہرتی ہے کہ وہ ادب کے عہد بہ عہد ارتقاء کو پیش کرے، اور حتی الامکان اُن اسباب کا جائزہ لے جنہوں نے ادب کی تخلیق کو متاثر کیا ہے۔ ان اسباب میں شخصی اثرات کی طرف سب سے پہلے نگاہ پڑتی ہے۔ کیونکہ ایک بڑا مصنّف اکثر نیا ذوق

پیدا کرتا ہے اور اپنے عہد کے ادب کو ایک نئی راہ دکھاتا ہے۔ لیکن شخصی اثر کی اہمیت کے باوجود دوسرے ملحوظات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ بڑے سے بڑا نابغہ بھی اپنے عہد کے معاشرتی، ذہنی اور ثقافتی رجحانات اور تصورات کے سانچے میں ڈھلا ہوتا ہے، اگر ایک توانا شخصیت کا حامل مصنف اپنے عہد کو متاثر کرتا ہے تو اپنے عہد سے متاثر بھی ہوتا ہے۔ اس لئے ہر مصنف کو اپنے عہد اور معاشرے کا پروردہ سمجھتے ہوئے اُن اثرات کی نشاندہی کرنی ہوگی جنہوں نے اُس کے خیالات کو متاثر کیا ہے، اُس کے ذوق کی رہنمائی کی ہے اور اُس کی تخلیقات کو امتیازی حیثیت عطا کی ہے۔

کبھی کبھی خالص ادبی اور علمی اثرات بھی ادب کو ایک نئی راہ پر ڈالنے کا باعث ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے شروع میں انگریزی نظموں کے تراجم نے اُردو شاعری کے مزاج کو بدلنے میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ حالی کے "مقدمۂ شعر و شاعری" اور حالی اور آزاد کی نظموں نے جو فضا پیدا کی تھی اُس کو ان تراجم نے بڑی تقویت بخشی اور اُردو شاعری کو غزل کے محدود دائرے سے نکالا اور جدید طرز کی نظموں کو مقبولِ عام بنایا۔ لیکن وہ اثرات جو ادب کی سمت و رفتار متعین کرتے ہیں، بیشتر ادبی سے زیادہ غیر ادبی ہوتے ہیں۔ یعنی اُن کا تعلق سیاسی، معاشرتی اور معاشی حالات سے زیادہ ہوتا ہے۔ جو چیزیں کسی عہد کی زندگی میں نئے افکار و تصورات لاتی ہیں اور آدمیوں اور اشیاء کے متعلق اُس کے خیالات اور محسوسات کو بدل دیتی ہیں، وہ ادب کو بھی ایک نئے انقلاب سے دوچار کرتی ہیں۔ کوئی بھی کتاب زمان اور مکان سے ماورا ہو کر نہیں لکھی جاتی۔ وہ بہر حال ایک ایسے شخص کی تصنیف ہوتی ہے جو کسی خاص عہد اور معاشرے کا باشندہ ہوتا ہے۔ اور اپنی شخصیت کی ماہیت کے مطابق اُس عہد کے معاشرتی، ذہنی اور ثقافتی رجحانات اور تصورات سے متاثر ہوتا ہے۔

الغرض ہر مصنف اپنے عہد اور معاشرے کا پروردہ ہوتا ہے، اور چاہے اُس کی شخصیت کتنی ہی ممتاز کیوں نہ ہو، اُس کی تصانیف میں اُس کے عہد اور معاشرے کی روح ضرور جھلکتی ہے۔ اس لئے تاریخ ادب میں شخصی اور اجتماعی دونوں جہتوں کی نمائندگی ضروری ہے، ادب کی تاریخ صرف چند مصنفین کے کارناموں کی داستان کا نام نہیں۔ بلکہ یہ ادب کے عظیم ورثے کو مجموعی طور پر کسی قوم کی ذہانت کی پیداوار کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔ ہر وہ شئے چاہے وہ اچھی ہو یا بری، جو کسی قوم کی زندگی کو متاثر کرتی ہے، وہ اس کے ادب کے تار و پود پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر علی گڑھ تحریک نے، جو اصلاً ایک قومی تحریک تھی، نہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کی حالت میں تبدیلی پیدا کی، بلکہ اُس نے اُردو شعر و ادب کی بھی دنیا بدل دی۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ عام تاریخ اور تاریخ ادب میں ایک گہرا رشتہ ہے۔ تاریخ اگر کسی قوم کی سوانح عمری ہوتی ہے تو ادب اُس کی خود نوشت۔ ایک اُس کے عملی کارناموں کی مظہر ہوتی ہے تو دوسری اُس کے ذہنی ارتقاء کی آئینہ دار۔ اس لئے تاریخ ادب صرف ادب کے عہد بہ عہد تغیرات کی داستان ہی نہیں بیان کرتی۔ بلکہ اُس قوم کے جس کے ادب کی تاریخ وہ قلم بند کرتی ہے، ذہنی ارتقاء اور اجتماعی شعور کی بھی عکاسی کرتی ہے۔ اس کے آئینہ میں ہم اُس قوم کے افکار و تصورات اور جذبات و احساسات کو بھی دیکھ سکتے ہیں۔

تاریخ ادب میں ادوار کا تعین سہولت کے پیشِ نظر ضرور کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ بالکل نام نہاد سی چیز بھی نہیں جیسا کہ بعض نقادوں کا خیال ہے۔ ایک ادبی روایت کے خاتمے اور دوسری ادبی روایت کے آغاز کی بنیاد پر ہی ادوار متعین کئے جاتے ہیں۔ ہر ادبی دور میں ایک مخصوص ذوق کارفرما ہوتا ہے جس کے زیرِ اثر اُس دور کے ادب میں موضوع، افکار، لہجہ اور اسلوب کی بعض مشترک خصوصیات کسی نہ کسی شکل میں ضرور پائی جاتی ہیں جو اُس دور کا طرۂ امتیاز ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر میر اور سودا کی شخصیتوں کے فرق نے اُن کے کلام میں کافی فرق پیدا کر دیا ہے۔ لیکن غم و آلام کا عکس جو اُن کے دور کا عام موضوع ہے دونوں کے کلام کے آئینے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک کے یہاں غم و آلام نے گہری یاسیت کی شکل اختیار کر لی ہے تو دوسرے کے

یہاں زہر خند کی شکل میں نمایاں ہوا ہے۔ بہرحال ذوق کی تبدیلی ہی نئی ادبی روایت کے آغاز اور پرانی ادبی روایت کے خاتمے کا باعث ہوتی ہے اور جیسا کہ اس سے پہلے وضاحت کی جا چکی ہے، ذوق کی اس تبدیلی کا سبب پرانے ذوق کی فرسودگی بھی ہو سکتی ہے اور نئے معاشرتی، ذہنی اور ثقافتی رجحانات کی کارفرمائی بھی۔

لیکن یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ یہ ادوار منجمد اور قائم بالذات ہوتے ہیں۔ اور ایک دور اور دوسرے دور کے درمیان کوئی دیوار حائل ہوتی ہے۔ تاریخ، چاہے وہ عام تاریخ ہو یا تاریخِ ادب، ایک مسلسل بہتے ہوئے دھارے کی طرح ہوتی ہے۔ جسے خانوں میں تقسیم کرنا آسان نہیں۔ دراصل ایک دور دوسرے دور میں اس طرح پیوست ہوتا ہے کہ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ ایک دور کب ختم ہوا اور دوسرا دور کب شروع ہوا۔ نئی ادبی روایت کے آغاز کے باوجود بعض مصنفین پرانی ادبی روایت پر ثابت قدمی سے جمے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۸۵۷ء کے بعد اردو میں آزاد، حالی، اور اسمٰعیل میرٹھی وغیرہ نے جدید شاعری کی داغ بیل ڈالی۔ لیکن اسی زمانے میں داغ، امیر اور ان کے تلامذہ پرانے رنگِ سخن کو سینے سے لگائے رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ادوار کے تعین میں پرانی ادبی روایت کے خاتمے کے بجائے نئی ادبی روایت کے آغاز کو ہی بنیاد بنانا ہوگا۔ کیونکہ پرانی ادبی روایت کسی نہ کسی شکل میں دیر تک اور دور تک اپنا سلسلہ قائم رکھتی ہے۔

انگریزی کی پرانی تاریخوں میں ادوار کا تعین یا تو صدیوں کے پیمانے سے کیا گیا ہے یا بادشاہوں کے زمانِ حکومت کے مطابق بعض ادبی مورخین نے سیاسی و سماجی مورخین کے قائم کردہ ادوار کو ہی بجنسہٖ لے لیا ہے۔ اس کے باوجود کہ ادبی کارناموں کی تخلیق میں سیاسی و سماجی عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ مگر ان عوامل میں جو ادبی کارناموں پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان عوامل میں جو ان کی صورت گری کرتے ہیں فرق کرنا ہوگا۔ دراصل تاریخِ ادب کسی قوم کے افکار و تصورات کے نامیاتی ارتقا کی داستان پیش کرتی ہے۔ اور افکار و تصورات کے ارتقا میں سیاسی و سماجی عوامل کے علاوہ معاشی، ثقافتی اور ادبی عوامل کا خود بھی ہاتھ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی کی حالیہ ادبی تاریخوں میں صدیوں کے پیمانے سے یا بادشاہوں کے زمانِ حکومت کے مطابق ادوار کے تعین کا طریقہ ختم ہو گیا ہے۔ گو اب بھی ایلزبیتھن (ELIZABETHAN) وکٹورین (VICTORIAN) یا اٹھارہویں صدی (Eighteenth Century) کی اصطلاحیں، جو عہدِ گزشتہ کی باقیات ہیں، مستعمل ہیں۔ مگر اب ان کا مفہوم بدل گیا ہے۔ اب وہ بطور علامت استعمال ہوتی ہیں اور ایک مخصوص ذہنی رویے کی آئینہ دار ہیں۔ آج کل انگریزی کی ادبی تاریخوں میں ادوار سے متعلق جو اصطلاحیں مروج ہیں وہ زندگی کے مختلف شعبوں سے ماخوذ ہیں۔ اور انگریز قوم کے ذہنی سفر کے مختلف منازل کی نشاندہی کرتی ہیں۔ بالفاظِ دیگر ان میں ادوار کا تعین افکار و تصورات میں بنیادی تغیرات کی بنا پر کیا گیا ہے کیونکہ ادبی ذوق کی تبدیلی بیشتر افکار و تصورات کی تبدیلی کی ہی رہینِ منت ہوتی ہے۔

مندرجۂ بالا مباحث کی روشنی میں جب ہم اردو کی ادبی تاریخوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ اردو کی سب سے پہلی ادبی تاریخ "آبِ حیات" (۱۸۸۰ء) دراصل تذکروں ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس میں انگریزی کی ادبی تاریخوں کی طرح ادب کو ایک وسیع پس منظر میں اور ایک ہمہ گیر چوکھٹے کے اندر رکھ کر دیکھنے کی کوشش نہیں ملتی۔ میری مراد ان سیاسی اور معاشی عوامل اور معاشرتی اور ثقافتی رجحانات سے ہے جو کسی قوم کے ذہنی ارتقا کی سمت و رفتار کو متعین کرتے ہیں۔ ان عوامل اور رجحانات کو نظر انداز کر کے ادب کا کوئی بھی جائزہ نہ صرف یہ کہ نامکمل ہوگا بلکہ اکثر و بیشتر گمراہ کن ہوگا۔ "آبِ حیات" میں سارا زور سوانحی معلومات، قلمی مرقعوں اور معاصرانہ چشمکوں پر ہے۔ اس میں شعرا کے کلام پر تنقید میں بھی موضوع اور مواد سے زیادہ ہیئت اور اسلوب پر توجہ کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "آبِ حیات" کے مطالعے سے ہندوستانی مسلمانوں کے ذہنی

ارتقاء کی کوئی تصویر نہیں اُبھرتی۔ علاوہ ازیں "آبِ حیات" میں اَدوار کے تعین میں پود ([illegible]) کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ ہر نئی پود کے ساتھ ایک نئے دَور کا آغاز ہوتا ہے۔ قطعِ نظر اس کے کہ افکار و تصورات میں کوئی بنیادی تبدیلی ہوئی ہے یا نہیں۔ اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو "آبِ حیات" دراصل ایک ہی دَور کے شعراء کے ذکر پر مشتمل ہے۔ کیونکہ ۱۷۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک افکار و تصورات میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ اس ایک دَور کو پانچ اَدوار میں تقسیم کرنے کی کوشش ایک میکانکی عمل سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ "گُلِ رعنا" اور "شعر الہند" بھی "آبِ حیات" سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں۔ اس لئے ان میں بھی وہی خامیاں پائی جاتی ہیں جو "آبِ حیات" میں ہیں۔ ہاں "شعر الہند" کی دوسری جلد میں ایک نئی چیز ضرور ملتی ہے جو "آبِ حیات" میں نہیں۔ مصنف "شعر الہند" نے اپنے اُستاد مولانا شبلی کی مشہور تالیف "شعر العجم" کی چوتھی اور پانچویں جلد کی تقلید میں اُردو شاعری کے تمام اصناف یعنی غزل، قصیدہ، مثنوی وغیرہ کے فن سے بحث کی ہے اور ان کے تاریخی ارتقاء کا جائزہ لیا ہے۔ لیکن اصناف کے جائزے میں بھی مصنف "شعر الہند" نے سیاسی اور معاشی عوامل اور معاشرتی اور ثقافتی رجحانات کو پیشِ نظر نہیں رکھا ہے۔

اب تک جن ادبی تاریخوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب کی سب صرف ادبی شاعری تک محدود ہیں۔ اُردو کی سب سے پہلی مکمل ادبی تاریخ رام بابو سکسینہ نے ۱۹۲۷ء میں انگریزی میں لکھی، جس کا ترجمہ اضافے کے ساتھ مرزا محمد عسکری نے اُردو میں کیا۔ اس میں نثر اور شاعری دونوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ رام بابو سکسینہ نے اس کے دیباچے میں دعویٰ کیا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کی اصلی غرض یہ ہے کہ ادبِ اُردو کی تدریجی ترقی کا خاکہ زمانۂ قدیم سے لے کر زمانۂ حال تک کا مع مشہور شعراء اور نثاروں کے مختصر حالاتِ زندگی اور ان کے کلام اور تصانیف پر ایک مختصر تنقید کے کھینچا جائے۔ یہ بھی کوشش کی گئی ہے کہ ایک طبقہ کے تعلقات دوسرے طبقے کے ساتھ اور ایک فرد کے تعلقات دوسرے فرد کے ساتھ اس میں وضاحت کے ساتھ بیان کئے جائیں۔ نیز مختلف تحریکوں اور طرزوں کے ابتداء اور زوال کے اسباب بتائے جائیں اور اُس دَور کے تاریخی حالات و واقعات بھی نظر انداز نہ کئے جائیں جس میں کہ وہ شعراء اور نثار گزرے۔ یہ کتاب محض کسی زمانے کے واقعات کا ایک ذخیرہ نہیں بلکہ اُن خیالات اور خصوصیات کے دکھانے کی اس میں پوری کوشش کی گئی ہے جن کا اثر اس زمانے پر تھا۔" لیکن کتاب کے مطالعے سے اس دعویٰ کی تائید نہیں ہوتی۔ یہ تاریخ "آبِ حیات" سے قدرے بہتر ضرور ہے۔ مگر اس میں زیادہ زور سوانحی اور تنقیدی عنصر پر ہے۔ رام بابو سکسینہ نے پروفیسر جارج سینٹسبری (GEORGE SAINTSBURY) اور ایڈمنڈ گاس (EDMUND GOSSE) کی ادبی تاریخوں کو اپنے لئے نمونہ بنایا ہے۔ سینٹسبری تاریخِ ادب کو ادیبوں کے کارناموں کا جائزہ سمجھتا ہے۔ جس میں اُن کے کارناموں کی بازآفرینی ہو۔ گاس اور سینٹسبری کی ادبی تاریخوں میں مصنّفین کی سوانح حیات اور ان کی تصانیف کے تنقیدی جائزے کو ترتیب کے ساتھ پیش کر دیا گیا ہے۔ رام بابو سکسینہ کی تاریخ میں بھی یہی نقص ملتا ہے۔ کہیں کہیں تاریخی حالات و واقعات کا ذکر اُن کی تاریخ میں ضرور ملتا ہے مگر ان حالات اور واقعات کا جو اثر ادب پر ہوا ہے اس کا کوئی واضح اور تشفی بخش بیان نہیں ملتا۔ پھر ہر جگہ ان تاریخی حالات اور واقعات کا ذکر بھی نہیں۔ علاوہ ازیں اس میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ہر دَور کی شاعری اور نثر کا ذکر یکجا نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ کتاب دو حصّوں میں منقسم ہے۔ ایک حصّہ شاعری کی تاریخ پر مشتمل ہے اور دوسرے حصّے میں نثر کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس طرح پورے اُردو ادب کا تاریخی ارتقاء سامنے نہیں آپاتا۔ جہاں تک اَدوار کے تعین کا سوال ہے، حصّۂ نظم میں "آبِ حیات" ہی کی تقلید کی گئی ہے۔

چند مختصر ادبی تاریخیں طلبہ کے لئے بھی لکھی گئی ہیں۔ لیکن ان کی حالت اور بھی بدتر ہے۔ "علی گڑھ تاریخِ ادبِ اُردو" کی صرف ایک جلد شائع ہوئی ہے اور بقیہ جلدیں ابھی منظرِ عام پر نہیں آئی ہیں۔ اس لئے اُس کے بارے میں اظہارِ خیال ابھی قبل از وقت

ہوگا۔ الغرض اُردو ادب کی کوئی بھی تشفی بخش تاریخ ابھی تک نہیں لکھی گئی ہے۔ اِن حالات میں تاریخ ادب کی تدریس اُردو کے اساتذہ سے کوہکن کے عزم و استقلال اور حوصلے کا مطالبہ کرتی ہے۔ انہیں خام مواد کے کوہ بے ستون سے جوئے شیر نکالنا ہے۔ اُردو میں ایسی کتابوں کی کمی نہیں جن میں خام مواد بکھرا پڑا ہے۔ محولۂ بالا کتابوں کے علاوہ مختلف علاقوں میں اُردو زبان و ادب کے ارتقاء سے متعلق بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ جیسے "دکن میں اُردو" "پنجاب میں اُردو" "بہار میں اُردو زبان و ادب کا ارتقاء" وغیرہ۔ اِس کے علاوہ اصناف، رجحانات اور تحریکات پر بھی خاصی تعداد میں کتابیں تالیف کی گئی ہیں۔ یہ تمام کتابیں تاریخ ادب کا بدل تو نہیں ہو سکتیں۔ لیکن اِن سے ہم تاریخِ ادب کی تعلیم و تدریس میں مدد ضرور لے سکتے ہیں۔

اُردو ادب کی تاریخ کی تدریس کے سلسلے میں سب سے اہم مسئلہ اَدوار کے تعین کا ہے۔ اُردو کی ادبی تاریخوں میں اَدوار کے تعین میں کوئی علمی اُصول پیشِ نظر نہیں رہا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، افکار و تصورات میں تبدیلیوں کو ہی اَدوار کے تعین کی بنیاد بنانا چاہیئے۔ اِس لئے میرے خیال میں اُردو ادب کی تاریخ کو مندرجۂ ذیل پانچ اَدوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلا دَور	از آغاز	تا	سنہ ۱۷۰۰ء
دوسرا دَور	سنہ ۱۷۰۰ء	تا	سنہ ۱۸۵۷ء
تیسرا دَور	سنہ ۱۸۵۷ء	تا	سنہ ۱۹۱۴ء
چوتھا دَور	سنہ ۱۹۱۴ء	تا	سنہ ۱۹۴۷ء
پانچواں دَور	سنہ ۱۹۴۷ء	تا	حال

اَدوار کے تعین کے سلسلے میں اختلافِ رائے کی گنجائش ہے۔ اِس لئے میں اِس پر اصرار نہیں کرتا کہ آپ اَدوار کی اِس تقسیم کو تسلیم کرلیں، لیکن میں اِس بات پر ضرور اصرار کروں گا کہ افکار و تصورات میں تبدیلیوں ہی کو اَدوار کی تقسیم کی بنیاد بنائیں۔

اَدوار کے تعین کے بعد ہر دَور کے تاریخی، سیاسی اور معاشی حالات اور معاشرتی ذہنی اور ثقافتی رجحانات کو اجمالاً پیش کرنا چاہیئے۔ مگر اِس پس منظر کی تشکیل میں صرف اُنہیں حالات اور رجحانات کو جگہ دینی چاہیئے جن کا اُس دَور کی ادبی تخلیقات سے واقعی ربط ہو۔ بعدازاں اُس دَور کے اہم شعراء اور اُدباء، اور ان کی اہم تصانیف کا جائزہ لینا چاہیئے۔ یہ قطعی ضروری نہیں کہ ہم اُس دَور کے تمام لکھنے والوں اور اُن کی ساری تصانیف کا جائزہ لیں۔ دراصل ہمیں اُس دَور کے اہم رجحانات اور تحریکات کو نمایاں کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور اِس سلسلے میں صرف اُنہیں شعراء و اُدباء کو مطالعے کا موضوع بنانا چاہیئے، جو اِن تحریکات اور رجحانات کے اہم نمائندے ہوں۔ پھر ہر دَور کے اپنے ماقبل اور مابعد کے اَدوار سے ربط کو بھی ظاہر کرنا چاہیئے۔ کیونکہ تاریخ ادب ایک نامیاتی کل ہے۔

ہر صنفِ ادب کی فنی خصوصیات اور اُس کے تدریجی ارتقاء سے بھی طلبہ کو روشناس کرانا چاہیئے۔ جے۔ اے۔ سمنڈس (J. A. SYMANDS) کا قول ہے کہ "ادبی اَصناف کا ارتقاء ادبی تاریخ کا سب سے اہم جزو ہے"۔ ظاہر ہے کہ یہ قول مبالغے سے خالی نہیں۔ لیکن اِس میں جزوی صداقت ضرور ہے۔ جس طرح کسی شاعر یا ادیب کی تخلیق یا کسی تصنیف کو پڑھانے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم اُس شاعر یا ادیب کے عہد اور ماحول کا جائزہ لیں۔ اُس کی مختصر سوانح حیات پیش کریں اور اس کی ادبی خصوصیات پر روشنی ڈالیں اسی طرح کسی صنفِ ادب کے نمونے کی تدریس سے قبل اِس صنفِ ادب کی فنی خصوصیات پر روشنی ڈالنا اور اُس کے عہد بہ عہد ارتقاء کا جائزہ لینا بھی اشد ضروری ہے۔

اُردو پر عربی، فارسی، ہندی اور انگریزی کے اثرات کی وضاحت کرنی بھی ضروری ہے۔ کیونکہ اِن زبانوں نے نہ صرف اُردو زبان کی تشکیل میں نمایاں حصّہ لیا ہے بلکہ اُس کے ادب کی سمت و رفتار کو بھی متاثر کیا ہے۔ علاوہ ازیں اُردو کے تمام اصناف بھی اِنہیں زبانوں سے مستعار ہیں۔ مثال کے طور پر غزل یا قصیدے کی فنی خصوصیات کا جائزہ لیتے ہوئے عربی اور فارسی میں

(باقی صفحہ ۳۳ پر دیکھئے)

غزل

اعجاز صدیقی

★

میری طویل اور شدید علالت نے انتہائی کرب کی صورت اختیار کرلی ہے۔ یہ کرب کبھی کبھی شعر میں بھی اُبھر آتا ہے۔ گزشتہ دنوں بیٹھے بیٹھے ایک بہت عام زمین میں اسی کرب نے [illegible] اختیار کرلی تھی اور میں صرف [illegible] تھا۔ لیکن اس زمین میں اظہارِ ذات [illegible] دو تین دنوں سے طویل غزل ہو گئی۔ (اعجاز)

چراغِ آخرِ بزمِ وفا ہوں
اندھیری شب میں تنہا جل رہا ہوں

فضاؤں سے خلاؤں تک رسا ہوں — زمیں تا آسماں پھیلا ہوا ہوں

اگر چھیڑو تو ہوں میں سیلِ نغمہ — بظاہر ایک سازِ بے صدا ہوں

مری بینائی مجھ سے چھن نہ جائے — حقائق کے سرابوں میں گھرا ہوں

مجھے پڑھنا بہت مشکل ہے لوگو! — میں اک خاموش حرفِ مدعا ہوں

مرے ہاتھوں کی جرأت کو دعا دو — نظامِ جبر پر سنگ آزما ہوں

ہمیشہ جگمگاتی ہی رہیں گی — وہ راہیں جن کو روشن کر رہا ہوں

مری تکمیل ہے جہدِ مسلسل — ہزاروں بار مٹ مٹ کر بنا ہوں!

گزر آیا ہر اک راہِ خطر سے — مگر منزل پہ آکر لٹ گیا ہوں؟!

ملا ہے جب کبھی اذنِ تماشا — نظر کی وسعتوں میں کھو گیا ہوں!

مرے نقشِ قدم کے ساتھ آؤ — میں رسم و راہِ منزل آشنا ہوں

مرا چہرہ نہیں، کیا میرا چہرہ؟ — یہ آئینوں میں کیوں میں جھانکتا ہوں!؟

نظر کا ساتھ کوئی تو کرن دے! — فصیلِ شب پہ میں کب سے کھڑا ہوں!

خود اپنی آگ کا تو ذکر ہی کیا! — پرائی آگ میں جلتا رہا ہوں!!

اسی پر صورتیں بگڑی ہوئی ہیں! — میں کیوں ماضی کا اپنے آئینا ہوں؟

جنھیں ڈسنے کی عادت پڑ گئی ہے — انھیں سانپوں کو اکثر پالتا ہوں!

ملا ہے جب بھی مجھ سے کوئی جھک کر — میں اُس سے بھی زیادہ جھک گیا ہوں

مرے احساس کو چھو کر تو دیکھو! — پرانا ہو کے بھی کتنا نیا ہوں!!

مجھے کیا پاؤ گے یارانِ منزل؟ — میں اب تم سے بہت دور آ گیا ہوں!!

وہ خود کو ڈھونڈنے لگتا ہے اعجاز!
پتہ جس سے بھی اپنا پوچھتا ہوں!؟

جوگندر پال

سیّارے

عجیب بات ہے:

میں خلا سے لوٹ کے آیا ہوں مگر مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ میں بدستور وہیں ہوں اور میرے آس پاس اَن گنت سیّارے حرکت میں ہیں جو بھی اور ایک دوسرے کے اتنے قریب نظر آتے ہیں کہ انہیں دیکھ دیکھ کر میری جان بار بار گلے میں پھنس کر رہ جاتی ہے کہ کہیں آپس میں ٹکرا نہ جائیں، لیکن یہ صاف بچ کر خلا میں اپنی اپنی راہ پر بہہ نکلتے ہیں، کوئی کسی کو ذرا سا چھو کر بھی نہیں گزرتا۔ اتنی تنگ قربت میں بھی سب ایک دوسرے سے بے خبر ہیں، چاروں طرف اجنبیوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے ——

اور یہ سیّارہ ۔۔۔ یہ سیّارہ ۔۔۔ یہ کتنا خوبصورت ہے! اسے لگاتار دیکھ دیکھ کر مجھے لگ رہا ہے کہ میں اسے چھو رہا ہوں اور چھو چھو کر اس کے انگ انگ سے واقف ہو گیا ہوں۔ یہ وہی ہے جسے میں ہر رات گھنٹوں دیکھتا رہتا ہوں۔ وہ ۔۔۔ یہ میری بیوی ہے ۔۔۔ میں اپنی بیوی کو گلے لگائے ہوتے ہوں مگر سچائی یہ ہے کہ ہم نے کبھی ایک دوسرے کو نہیں چھوا۔ اس پر ہجوم خلا میں ہم ہمیشہ ایک دوسرے سے صاف بچ کر اپنی اپنی راہ پر بہہ نکلتے ہیں۔ میری بے انتہا خواہش ہے کہ اپنی بیوی کو چھو لوں، اپنے تمام تر سائنسی کمال کو عمل میں لا کر اب اس سے ناواقف نہ رہوں، لیکن کیا کروں؟ پہلے مجھے بہر صورت سارے چاند کو دریافت کرنا ہے، پھر یہ کشش سیّارہ بھی دیکھ لوں گا۔

افسانہ

حبیب کیفی

ٹوٹا ہُوا

بُورَی اپنے نام ہی کی طرح خود کو بہت چھوٹا محسوس کرنے لگا تھا۔ ہوا کا جھونکا آیا اور اُسے پُوری طرح جھنجھوڑ کر چلا گیا۔ ہوا تیز بدبو لئے تھی جسے نہ چاہتے ہوئے بھی اُس نے مجبوراً اپنی سانسوں میں بھر لیا تھا۔ یہ بدبُو سڑے ہوئے گوشت کی تھی۔ فوراً ہی سانس چھوڑ کر اُس نے تصوّر کی آنکھوں سے ہڈیوں کے ڈھیر کو دیکھا۔ وہ بے چین سا ہو گیا اُس کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ کولتار کی سڑک سے کوئی دو کلومیٹر اُدھر گاؤں تھا اور گاؤں کے مغربی کنارے پر اُس کی جھگی تھی۔ جھگی کے پچھواڑے ہی دُور تک اُس کا کھیت تھا۔ جس کی زمین عرصۂ دراز سے پیاسی تھی۔ پیاس نے اُس زمین کو بانجھ بنا رکھا تھا۔ اور وہ جگہ جگہ سے تڑخ گئی تھی۔ بُورَی کو پچھلی کئی راتوں سے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ تفکّرات کے حلقے میں گھرا ہوا دِنوں دِن چھوٹا اور غیر اہم ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اُس کی حیثیت برابر گھٹتی چلی جا رہی تھی۔ اب اُس کے کانوں میں ٹھیکیدار کی آواز کچھ اس طرح گونجنے لگی تھی کہ خود کو وہ ہڈیوں کے ڈھیر میں پھنسا ہوا دیکھنے لگا تھا۔

"دیا اُس لیلی (نیلی) چھتری والے کی ہے۔ ورنہ ہم کیا ہیں بابا"

ٹھیکیدار کو اُس نے کئی بار یہ کہتے ہوئے سُنا تھا اور "دیا" کا مطلب بھی وہ اب سمجھنے لگا تھا۔ تین موٹے تازے بیل، ایک گائے اور چار بکریوں کی ہڈیوں کو بھی ٹھیکیدار نے بڑی سادگی کے ساتھ ہڈیوں کے ڈھیر میں شامل کر لیا تھا۔ اس کے عوض بُورَی کو کچھ بھی نہیں مِلا تھا۔ وہ بس ٹھیکیدار کا مُنہ دیکھتا رہ گیا تھا۔ اُس دِن اُس نے محسوس کیا تھا۔ کہ ٹھیکیدار چور ہے اور یہ کہ اُس کے مرنے کے بعد وہ اُس کی ہڈیوں کو بھی ٹرک میں بھر کر لے جائے گا۔ غصّہ تو اُسے بہت آیا تھا لیکن وہ کچھ بھی نہیں کر پایا تھا۔ بس اُس کے جبڑے زور سے بھنچ کر رہ گئے تھے۔

ہڈیوں کے ڈھیر اب اُس کے لئے کوئی خاص اہمیت کے نہیں رہ گئے تھے۔ لیکن پھر بھی کچھ ایسا تھا جو اندر ہی اندر اُسے کھائے جا رہا تھا۔ آنکھیں اُس کی اب نہیں بھیگتی تھیں، لیکن خود کو وہ اکثر آنسوؤں میں ڈوبا ہوا محسوس کرنے لگا تھا۔ ایسے میں وہ تیرنے کی کوشش کرنے لگتا۔ پاگلوں کی طرح ہَوا میں ہاتھ پیر ہلانے لگتا تھا وہ۔ یہ عمل دیر تک چلتا رہتا۔ دیکھنے والے اُس میں دیوتا کا آنا بتاتے یا اُسے پاگل کہہ کر چھٹی پا لیتے۔ اِس وقت بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد وہ سرکس کے کسی جانور کی طرح شانت ہو گیا تھا۔ بیٹھا وہ دھیرے دھیرے ہانپ رہا تھا۔ ہانپتا ہوا وہ چلم کی طلب محسوس کرنے لگا۔ لیکن اِس وقت اُس کے پاس چلم تھی نہ اُس میں بھری جانے والی تمباکو ہی۔ چلم کی طلب اُس نے آدھی بجھی ہوئی بیڑی سُلگا کر پُوری کر لینی چاہی۔ بیڑی اُس کے کان میں اٹکی ہوئی تھی جسے اُس نے جیب میں بچی ہوئی آخری تیلی سے سُلگانے کی کوشش کی۔ لیکن اِدھر ایک مدّت سے سارے ہی کام اُس کی مرضی کے خلاف ہو رہے تھے۔ اب بھی یہی ہوا۔ بدبُو دار ہوا کا جھونکا آیا اور تیلی کو بُجھا گیا۔ اُس نے ماچس کو توڑ کر ایک طرف پھینک دیا۔ بیڑی اُس کے ہونٹوں میں دبی ہوئی تھی جسے اُس نے دانتوں سے کاٹنا شروع کر دیا۔ سر سے پیر تک دھوئیں کی ہلکی سی پرت جمی ہوئی تھی جو تھوک سے مِل کر اُس کے مُنہ میں گھُل گئی۔ اُس کے مُنہ کا ذائقہ

کڑوا ہو گیا اور اُس نے بیڑی کو تھوک دیا۔

ننگی چارپائی کی موتج اُس کی ننگی پیٹھ میں برابر چبھ رہی تھی۔ لیکن اُسے اس کا احساس نہ تھا۔ اُدوان البتہ جب اُس کی پنڈلیوں میں گڑنے لگی تو اُس نے اپنی ٹانگیں سمیٹ لیں۔ اس طرح اُسے کچھ راحت سی ملی۔ پیٹ کے خالی پن کا احساس بھی تھوڑا کم ہو گیا تھا۔ ایسا کرنے کی وجہ سے اُس کے پیٹ کی کوئی آنت گڑگڑا کر رہ گئی تھی۔ آسمان۔ جوری کو ایسا لگنے لگا تھا کہ آسمان صدیوں سے خالی اور سوکھا پڑا ہے۔ کھیتوں کی طرح! وہاں تارے نہیں، بلکہ جانوروں، مردوں، عورتوں اور معصوم بچوں کی ہڈیاں بکھری پڑی ہیں جو دُور اور بہت اُوپر ہونے کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی دکھائی دے رہی ہیں! اُس نے اپنی آنکھیں موند لیں۔

بڑے لڑکے چیت سنگھ کی چھوٹی لڑکی رونے لگی تو جوری نے بند آنکھوں سے اُسے دیکھا۔ پچکے ہوئے گال، بجھی ہوئی آنکھیں، پھرا سا پیٹ، پھولی ہوئی ناف اور ہاتھ پیر جیسے بے گوشت! فنک کا کیڑا اُس کے دماغ میں رینگنے لگا۔ پارسال بھی چیت شہر گیا تھا۔ اُس نے حساب لگانا شروع کیا۔ ساون میں وہ آیا تھا۔ برسات نہیں ہوئی۔ نااُمیدی کی تہ موٹی ہو گئی۔ سب کے چہرے لٹک گئے۔ تالاب پہلے ہی سوکھا پڑا تھا اور اِس سال تو گاؤں کے کنوئیں کا پانی بھی جیسے پاتال میں جذب ہونے لگا تھا۔ چیت واپس شہر چلا گیا تھا۔ بہو کے بچی ہوئی۔ شک کے کیڑے نے جوری کے ذہن کو بڑی بے رحمی کے ساتھ کُریدنا شروع کر دیا۔ پھر ۔۔۔؟ بہو بھی گئی تھی۔ سرکاری کیمپ لگے تھے۔ تھوڑی سی راحت سب میں بٹ گئی تھی اور جوری کی اہمیت کم ہونی شروع ہو گئی تھی۔ اُس نے دیوی کی پوجا کرنا بند کر دی۔ وہ انتظار کرنے لگا۔ لیکن برسات کی دیوی جب موسم پر خوش نہ ہوئی تو بے موسم کیا ہوتی! تاہم وہ منتظر تھا، وہ اپنے اندھے وشواس کو سینے سے لگائے ہوئے اپنی حیثیت و اہمیت کو برابر گھسٹا تا چلا گیا اور آج نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ پریوار میں کسی ایک کو بھی اُس کی پروا نہیں رہ گئی تھی۔ چیت کی بچی رو رہی ہے اُس نے سوچا، بہو کی بچی رو رہی ہے۔ شک کا کیڑا اپنا کام کر رہا تھا۔ شاید سرکاری کیمپ کی بچی ۔۔۔۔۔! وہ کسمسانے لگا اور گھبرا کر اُس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ بدبُو اُسے پہلے ہی کی طرح پریشان کر رہی تھی۔ "یہ کمینہ ٹھیکیدار! اُٹھا کر کیوں نہیں لے جاتا؟ ۔۔۔" وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی کروٹ بدل کر اُس نے اپنا چہرہ جھونپڑے کی طرف کر لیا۔ وہاں اندر بچی رو رہی تھی۔

سوکھا پڑنے سے پہلے پریوار میں جوری سمیت کل تیرہ جنے تھے۔ وہ ایک ایک کو گننے لگا۔ چیت کی روتی ہوئی بچی پر آ کر وہ رُک گیا۔ اُس سے چھوٹا پریوار میں کوئی نہ تھا۔ اور سب اپنی اپنی جگہ ٹھیک تھے۔ شک کا کیڑا سو گیا تھا۔ اب اُس کے دل میں رحم کی ندیاں بہنے لگی تھیں۔ اُسے اپنی ادھیڑ پتنی پر غصّہ آنے لگا۔ وہ آخر اِس طرح بے خبر ہو کر کیوں پڑی رہتی ہے؟ کیوں نہیں وہ اُٹھ کر بہو کو جگا دیتی؟ کیوں آخر بہو ۔۔۔۔؟ بہو بھی کیمپ جایا کرتی ہے۔ تھک کر چُور ہو جاتی ہوگی۔ اسی لئے تو گہری نیند میں سو جاتی ہے۔ ورنہ کون ماں، اِس طرح اپنی اولاد کو رونے کے لئے چھوڑتی ہے! بچی رو رہی ہے۔ رحم نے اُسے بے چین کر دیا۔ چارپائی سے اُٹھ کر وہ جھونپڑے کی طرف گیا۔ بغیر دروازے کی جھونپڑی سے ذرا دُور رُک کر اُس نے سوچا، کون کس حال میں سویا ہوا ہوگا؟ آواز دے لی جائے۔ لیکن پھر اُسے خیال آیا کہ اِس طرح تو سب کی نیندیں حرام ہو جائیں گی اور صبح کیمپ پر کون کون جا سکے گا۔؟ بچی کا رونا اُسے جھونپڑے کے اندر لے گیا۔ وہاں ایک دم اندھیرا تھا۔ وہ سنبھل سنبھل کر رونے کی آواز کی سمت بڑھنے لگا۔ بچی کے نزدیک پہنچ کر وہ رُک گیا۔ اُسے ایک بار تو ایسا لگا کہ وہ اندھا ہو گیا ہے۔ چند ثانیوں کے بعد وہ وہاں بچی کو دیکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ بے نام بچی اُس کے پاؤں کے پاس پڑی ہوئی رو رہی تھی۔ اُس نے جھک کر دو تین بار روتی ہوئی بچی کو بڑی آہستگی کے ساتھ تھپکے دیئے۔ لیکن چپ نہ ہوئی۔ جوری نے تھوڑا آگے بڑھ کر دیکھا۔ تھوڑے فاصلے پر اُسے ایک گٹھری سی دکھائی دی۔ بچی کو دونوں ہاتھوں میں اُٹھا کر وہ اُسی کی طرف بڑھا۔ اُس کا گلا سوکھ رہا تھا۔ اُس نے بچی کو گٹھری کے بیچ کے پاس لٹا دیا۔ ایک پل کے لئے وہاں اندھیرے میں اُسے دوسری گٹھریوں کا خیال آیا۔ لیکن وہ اُن کے متعلق زیادہ کچھ سوچ نہ سکا۔ بچی رو رہی تھی۔ وہ ہمّت کر کے گٹھری پر جھک گیا۔

دائیں ہاتھ سے بچی کا سر اوپر اٹھا کر بائیں ہاتھ کی مدد سے اُس نے ٹٹول کر گٹھری کا پستان بچی کے منہ میں دیدینے کی کوشش کی۔

"باپو!" جوری کے کانوں میں اُس کی منجھلی لڑکی دیپا کی سہمی ہوئی سی آواز پڑی تو روتی ہوئی بچی کا سر اُس کی ہتھیلی سے پھسل کر نیچے پر آ رہا۔ بچی کی آنکھوں میں جیسے کئی کئی سورج چمک گئے تھے وہ تڑپ کر رونے لگی۔ جوری کو یوں لگا جیسے جھونپڑی کی اندھی گپھا میں بجلی چمک گئی ہے۔ اُس کا گلا خشک ہو گیا۔ وہ پیچھے ہٹ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اُس نے وہاں دوسری چھوٹی بڑی گٹھریوں کو دیکھنے کی کوشش کی۔

"تو دیپی!؟...... تیری بہو اور بھاوج کہاں ہیں۔؟"

"وہ...... کوئی کام سے...... اب بس آتی ہی ہوں گی!" دیپا نے کہا۔ اُس کی آواز میں ڈر تھا۔

جوری کو ایسا لگا جیسے اُس کی بوڑھی رگوں میں بہتا ہوا خون یک بیک سفید پڑ گیا ہے۔ اُس نے محسوس کیا جیسے کسی نے اُسے زمین پر گرا کر اُس پر تھوکنا شروع کر دیا ہے۔ اُس نے اندھیرے میں دیکھا کہ پنچایت میں اُس کی پگڑی اُچھال دی گئی ہے۔ اُس نے وہاں کھڑے کھڑے راحت کیمپ کو دیکھا۔ جو یہاں سے کوئی آدھا کوس کی دوری پر لگا ہوا تھا۔ بچی پہلے ہی کی طرح روئے جا رہی تھی۔

"اُسے پانی پلا کر چپ کرا دے۔" اُس نے بہ مشکل تمام کہا۔

جھونپڑے سے نکل کر جوری واپس اپنی چارپائی پر آ کر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی اُس کی سانسوں میں بدبو بھر گئی۔ بچی اندر جھونپڑے میں حالانکہ اب بھی رو رہی تھی۔ لیکن وہ اُس رونے سے اب بے نیاز ہو چکا تھا۔ کروٹ بدل کر اُس نے اپنی نظریں راحت کیمپ کی سمت جانے والی پگڈنڈی پر جما دیں۔ لیکن اُسے کسی کا انتظار نہ تھا۔ چارپائی پر پڑا ہوا وہ چاہنے لگا تھا کہ کسی بھی طرح اُس کی ویران و سنسان آنکھیں بھیگ جائیں۔ بوجھ کچھ کم ہو جائے، لیکن اُس کی بجھی ہوئی آنکھیں خشک ہی رہیں۔ وہ چاہ کر بھی نہ رو سکا۔

جوری کی کھلی آنکھوں میں ایک منظر تیر گیا۔ گئے برس اِن ہی دِنوں اُس نے اپنے کھیت کی باڑھ کے پاس اپنے تیسرے اور آخری بیل کو مرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ حالانکہ اُس کے لئے چارے اور پانی کا انتظام کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ لیکن اب بہت دیر ہو گئی تھی بیل کی بھوک پیاس بجھ کر مر چلی تھی۔ اُس نے پانی اور چارے کی طرف دیکھا تک نہیں۔ وہ تو بس مرنے پر تلا ہوا تھا۔ اُس کے منہ جھاگ نکل رہے تھے اور وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ آخر وہ مر گیا۔ جوری اپنا سر پکڑ کر کچھ دیر تک مرے ہوئے بیل کے پاس بیٹھا رہا۔ اُس کے نتھنوں میں چارے کی بو بھر گئی۔ پھر وہ وہاں سے اُٹھ کر جھونپڑے کے پاس بچھی چارپائی پر آ کر لیٹ گیا تھا۔ کوئی آدھی پولی چارا اور پانی کا برتن مرے ہوئے بیل کے پاس ہی رکھے ہوئے تھے۔ اُنہیں اُٹھا کر لے آنے کا خیال آیا تو وہ دور کھیت کی بنجر باڑھ کی سمت دیکھنے لگا۔ وہاں بیل کی لاش کو کوّے اور گدھ نوچنے لگے تھے۔ چارا وہیں پڑا ہوا تھا اور جوری کو ایسا لگنے لگا تھا کہ بھوکے شکاری کتے اِس پر ٹوٹ پڑے ہیں اور کوّے اور گدھ منڈیر بیٹھے ہوئے اُس کی موت کا اِنتظار کر رہے ہیں۔!

کوّے اور گدھ ــــ جوری اپنے پورے جسم میں سوئیوں کی چبھن محسوس کرنے لگا۔ منجھلی اور چھوٹی لڑکی کے بیاہ کے لئے جو زیور اُس نے پیٹ کاٹ کر بنوایا تھا وہ گئے برس ہی کال کی نذر ہو گیا تھا۔ اُسی سال پہلے کپڑے اور پھر برتن بھی اُٹھ گئے تھے۔ اِس سال بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ ہل اور بیل بچے تھے سو گائے اور بکریوں کے ساتھ بیل بھی مر کھپ کر پورے ہو گئے۔ ہل اور کھیتی کا دوسرا سامان کوڑیوں کے مول بیچ دینا پڑا۔ بنجر کھیت کسی کام کا نہیں رہ گیا تھا ورنہ وہ اُسے بھی بیچ دیتا راحت کیمپ پر...... وہ اُس کے متعلق سوچنے سے کترانے لگا۔ اُس کے متعلق سوچنا اُسے کریہناک لگ رہا تھا۔ تھا جہاں

کی شکل اُس کی آنکھوں میں گھوم گئی۔ اُسے ایک موٹا سا گِدھ یاد آگیا جو اُس دِن اُس کے مرے ہوئے بیل کو بار بار نوچ رہا تھا۔ گِدھ وہاں بہت سے تھے۔ لیکن اُس موٹے سے گِدھ پر اُس کی نظریں جم کر رہ گئی تھیں۔ موٹا سا گِدھ مہاجن کی طرح! سوچ کر وہ مسکرا دیا۔ اُس کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی یہ مسکراہٹ زہر میں بجھی ہوئی تھی۔ پھر اُسے کوّے دِکھائی دینے لگے۔ کائیں کائیں کرتے ہوئے کالے کوّے، مکروہ چونچوں سے مُردہ جسم نوچتے ہوئے! کوّوں نے پھر اُسے راحت کیمپ کی یاد دلا دی۔ اُس نے راحت کیمپ کی سمت جانے والی پگڈنڈی کی طرف دیکھا۔ جھونپڑی سے ذرا دُور پگڈنڈی پر اُسے تین سائے دکھائی دے گئے۔ وہ اُنہیں دیکھنے لگا۔ سائے رفتہ رفتہ بڑے ہوتے جا رہے تھے۔ اُس کی بوڑھی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ اُس کے ذہن میں ایک خیال کوند گیا۔ لکڑیاں کاٹنے کی کلہاڑی اُس نے ابھی تک بیچی نہیں ہے۔ اِسی کا استعمال کیا جائے۔ پھر لاشوں کو کھیت میں گاڑ کر راحت کیمپ کو آگ لگا دی جائے۔ اُس کے بعد جو ہونا ہے ہوتا رہے۔ لیکن وہ چارپائی پر پڑا ہوا سوچتا ہی رہ گیا اور تینوں سائے جھونپڑے کی اندھی گپھا میں داخل ہو گئے۔ "میرا خون سفید ہو گیا ہے!"..... میں نہ مرد ہوں نہ عورت!!..... زیرِ لب بڑبڑا کر اُس نے اپنا سر پیٹ لیا۔

جھونپڑے کے اندر تھوڑی دیر بعد خاموشی ہو گئی۔ بچّی اب نہیں رو رہی تھی۔

گہری اندھیری رات دھیرے دھیرے گزر رہی تھی۔

"بڑھیا کا دماغ چل گیا ہے!..... پتی ورتا بنتی!!" چارپائی پر پڑا ہوا وہ پھر بڑبڑایا۔ "زہر کھاؤں؟..... لیکن میری ہمّت؟"

بڑبڑانے کے بعد وہ چُپ ہو گیا تو اُس کے کانوں میں گِدھ ایسے مہاجن کی آواز گونجنے لگی۔ "سب کچھ بیچ دیا، کھا گئے۔ بھوک پھر بھی باقی ہے۔ راحت کیمپ کی بات چھوڑو جوری! راحت اپنے ہی دے سکتے ہیں۔ سمجھو ذرا بات کو..... میں نہ سُود کی بات کروں گا نہ اصل رقم کی۔ تم بس ایک کام کرو۔ دِیپا کو میرے ہاں بھیج دیا کرو..... جوری بس اِتنا ہی سُن سکا تھا۔ وہ خاموش تھا۔ اور اُسے اپنے آپ پر غصّہ آنے لگا تھا کہ کیوں اِس قدر خاموش اور مجبور ہے؟ وہ زہر کا گھونٹ پی کر رہ گیا تھا۔ مجبوری اُسے روکے ہوئے تھی ورنہ تو وہ..... اور پھر جب وہ وہاں سے اُٹھ کر چُپ چاپ آنے لگا تھا تو مہاجن کی بے سُری آواز نے اُس کا تعاقب کیا تھا۔ سوچنا جوری! میں اِنتظار کروں گا۔ بھگوان نے چاہا تو....."

بھگوان چاہ چکا۔ اُسی کی مرضی سے ہوتا ہے۔ ابھی جو یہ ہوا اُس کی مرضی سے ہی تو ہوا تھا! پھر اُس میں بُرا کیا ہے؟ لیکن دِیپا سے یہ بات کون کہے گا؟ خود وہ، اُس کا باپ؟ بیٹی! بات یہ ہے..... کہ وہ اپنے مہاجن جی ہیں نا..... تو اُن کے یہاں..... وہ پہلی ہی میں ہی ہار گیا۔ اور مان لو دِیپا سے یہ بات کسی طرح کہہ بھی دی گئی تو کیا وہ پریوار کو راحت پہنچانے، بچانے کے لئے راضی ہو جائے گی؟ مان جائے گی وہ؟ دو طرفہ سوال جوری کو کچوٹنے لگا۔ اور اُس نے تھک کر اپنے ذہن کو دوسری طرف منتقل کر لیا۔

یہ چیت سنگھ کیا کرتا ہے وہاں شہر میں؟ اپنا پیٹ تو کتّے بھی بھر لیتے ہیں! ساون میں آیا تو کُل پچاس روپے ہاتھ پر رکھ کر چلتا ہو گیا۔ اِتنے لمبے سمے تک شہر میں رہ کر اُس نے پچاس ہی روپے بچائے تھے؟ جوری اُس سے بہت کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ وہ اُسے پھٹکارنے کا اِرادہ بھی رکھتا تھا، ایک باپ کی طرح۔ لیکن وقت نے اُسے گُونگا بنا دیا تھا۔ وہ اُس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا تھا۔ رُخصت ہوتے وقت جوری نے سوالیہ نگاہوں سے ایک بار اُس کی طرف دیکھا تھا اور چیت سنگھ نے اپنی نظریں جھکا لی تھیں۔ اور اُس دِن حل نہ ہونے والے سوالوں میں ایک اور سوال کا اِضافہ ہو گیا تھا۔

تخیل کے بازوؤں کے سہارے جوری اپنے گاؤں کی سیر کرنے لگا۔ یہ جھونپڑی اور کھیت۔ کھیت کے سہارے اُمید کا بنجر کھیت اور اُس سے جڑا ہوا ایک اور کھیت رڑمل کا۔ رڑمل کو ہیضہ ہو گیا تھا۔ مر گیا۔ اچھا ہوا۔ مکتی ملی! ورنہ ..... معصوم بچے اور اُس کی بیوی؟۔ معصوم بچے اکثر بھوک سے بلکتے رہتے ہیں۔ اور ان کی ماں کو راحت کیمپ پر کام کرنے کے عوض وقت پر پیسے نہیں ملتے۔ لیکن پھر بھی وہ سڑک پر کام کرنا بند نہیں کرتی۔ کام کرنا بند کر دے تو زندگی، بلکہ زندگیوں کے پہیے رُک جائیں! گاڑی جیسے بھی سہی گھسٹ تو رہی ہے اور زیادہ کھا لینے کے کارن ہیضہ ہو جاتا ہے۔ لیکن رڑمل تو بھوکا تھا۔ پھر؟ خیر آگے چلو یہ جھونپڑی رہی سری دیو کی۔ بیوی بچوں کو لے کر شہر چلا گیا۔ وہاں کیا کرتا ہے؟۔ کرتا ہوگا کچھ بھی۔ سری دیو کے مکان کے سامنے نیم کا بوڑھا پیڑ اور پیڑ کے پاس ہی پتھر کا بنا ہوا بابا رام دیو کا مندر۔ اِس مندر میں بابا جی کی چاندی کی مورتی۔ مورتی کا پوجا پھکا بھگت، بنا کتا تندرست دھیان چند، ایسے کال میں بھی تندرست!۔ یہ سب بابا کی نہیں۔ بلکہ اندھے بھگتوں کی کرپا ہے! مندر سے جڑا ہوا کنواں جس پر پیاسوں کی بھیڑ اور چیخ چیخ، تو تو میں میں!! مندر سے ذرا ہٹ کر گاؤں کی پنچایت اور اسکول۔ جوری ابھی آدھے گاؤں کا سفر بھی طے نہیں کر پایا تھا۔ لیکن اُس کے تخیل کے بازو جواب دے گئے۔ اُس کے سامنے مہاجن کا مکان تھا۔ مہاجن کا مکروہ ادھیڑ چہرہ اُس کی آنکھوں میں تیر گیا۔ اور اُس کے کانوں میں پھر ایک بار اُس کی ناپاک سازش کی صدا گونجنے لگی۔ اُس کے ساتھ ہی اُس کی سانسوں میں سڑے ہوئے گوشت کی بدبو بھر گئی۔ سانس چھوڑ کر چارپائی پر پڑا ہوا وہ اپنے ہاتھ پیر تیز تیز چلانے لگا۔ لیکن بھوک اور ذہنی تکان کے باعث اس کا یہ عمل زیادہ دیر تک نہ چل سکا۔ وہ بھوکے اور بے بس کتے کی طرح ہانپنے لگا۔

گاؤں کے بانکے جوان کیا ہوئے؟ ـــ تھوڑی دیر کے وقفہ کے بعد جوری نے پھر سوچنا شروع کیا ـــ ان سب کی ایک ٹولی بنائی جائے۔ اِس ٹولی کا سردار میں بن جاؤں۔ میں نہیں تو کوئی اور ہی سہی؛ اِس سے کیا فرق پڑتا ہے! ٹولی میں ہر ایک کے پاس ہتھیار ہونے چاہئیں۔ مقصد بتانے کی ضرورت نہیں۔ بس کسی بھی شئے دھاوا بول دیا جائے۔ اُس کے پاس بیسیوں بوری اناج ہے، دالیں، گڑ اور شکر بھی۔ چلم کی تماکو بھی اور کئی لوگوں کے برتن کپڑے بھی اور ...... سونا چاندی بھی۔ بس ایک ہی بار میں سب کچھ ہو جائے۔ پھر اس کے بعد جو ہونا ہے۔ ہوتا رہے!۔ راحت کیمپ کو اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ جیت کی ماں کا گلا دبا کر بھو کو زندہ جلا دیا جائے اور ..... اور اِسی جوش میں اُس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ اُس کے جبڑے کس گئے۔ اُس کی آنکھوں خون اتر آیا۔ اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور خود کو وہ زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھنے لگا۔ اُس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا!

"سب فضول ہے!" وہ اپنے آپ سے کہنے لگا۔ "سوچنے کی بنیاد ہی غلط ہے۔ گاؤں میں بانکے جوان رہے ہی کب؟"

دور مشرق میں صبح کے آثار دکھائی دینے لگے تو جوری خوفزدہ ہو گیا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ سورج اب اُس گاؤں میں کبھی نہ آئے۔ بس اِسی طرح رات چھائی رہے یا پھر صبح ہونے سے پہلے موت ہی آ جائے! سورج کی روشنی کے تصور سے وہ ڈرنے لگا۔ اُس گھڑی کا سامنا کرنے کی ہمت اُس میں نہیں رہ گئی تھی۔ جو اُس اندھی گپھا میں روتی ہوئی بچی کے پاس پڑی ہوئی تھی اور تین سائے ..... ، کون کس کا منہ دیکھ سکے گا؟ بھوک سب کی تیز ہو جائے گی اور قرض بڑھ جائے گا! ٹھیکیدار ... فرمائش دہرائے گا۔ سوال سود در سود کی طرح بڑھتے چلے جائیں گے۔ پہاڑ سا دن کیونکر کٹے گا؟ اِنہیں سب باتوں کو سوچ ... رہا تھا کہ صبح ہو گئی۔ کروٹ بدل کر اُس نے اپنا چہرہ مغرب کی سمت کر لیا۔ لیکن اُسے ایسا لگنے لگا کہ پیچھے گدی پر بھی آنکھیں ہیں جو برابر صبح کے آثار دیکھ رہی ہیں۔ اُس نے اپنی آنکھیں موند لیں۔ تاہم مشرقی اُفق سے پھوٹتا ہوا اُجالا اُس کی آنکھوں میں بھرنے لگا۔ خود کو وہ ٹوٹتا ہوا محسوس کرنے لگا۔ اِسی عالم میں اُس نے اپنے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ جو ہونا ہے، ہوتا رہے!

شہاب جعفری

غزل

دیوارِ دل پہ دشتِ مصوّر کہاں سے آئے
ایسی عمارتوں کو یہ پتھر کہاں سے آئے

درویشو دِل کا چین میسّر کہاں سے آئے
جب زندگی سفر ہے تو پھر گھر کہاں سے آئے

گھر سے ملا تھا درس کہ دُنیا ہے دِلنواز
یارو پھر آستینوں میں خنجر کہاں سے آئے

مجھ تک بھی لوگ آئے ہیں سچ کی تلاش میں
سچ کی زباں کھلی تو یہ پتھر کہاں سے آئے

زندہ بچا ہے دَرد ہی صحرائے مَرگ میں
اِس جانِ جاں کو خاک کا پیکر کہاں سے آئے

کیا زندگی صدائے جرس کی تھی بازگشت
دِل میں جمودِ سنگ کے منظر کہاں سے آئے

کس دَشت کو پکارتے رہتے ہیں اہلِ شہر
سب کیوں جلا وطن ہیں، یہ پتھر کہاں سے آئے

رو رو کے مانگتے ہیں بھلا کس کا خوں بہا
اِن بستیوں میں خوں سے بھرے گھر کہاں سے آئے

اِس تیرہ خاکداں کو ہے سُورج سے رَبط کیا
اور چاند کے لیئے یہ سمندر کہاں سے آئے

چھوٹی زمیں تو خاک کا بستر بھی چھن گیا
بیزار ہے فلک بھی یہ بے گھر کہاں سے آئے

تیری عطا یہ تھی کہ بس اِک بار زندگی
میرا جنوں یہ ہے کہ مکرّر کہاں سے آئے

ٹھوکر ہی میری پیاس کی اب معجزہ کرے
تجھ میں تو اے سراب سمندر کہاں سے آئے

درویش ہو چکے ہو یہ مت بھولنا شہاب
جو تم کو بھر کے جام دے نوکر کہاں سے آئے

رحمٰن حمیدی

جدید اُردو ناول

جدید اُردو ناول کا اوّلین بنیاد اٹھارھویں صدی میں اُس وقت پڑی جب اُردو ادب کا جدید دَور شروع ہو چکا تھا۔ ناول بحیثیت معنی خود جدّت اور جدید پر مشتمل ہے۔ اِس لئے اُس کے ساتھ جدید کا اضافہ غیر ضروری ہے۔ لیکن یہ بات محتاجِ تحریر نہیں کہ اُردو ناول کے ماضی اور حال میں اتنا ہی نمایاں تفاوت ہے جتنا خود مراۃ العروس کی 'اصغری'، میرزا [illegible] کی 'شمن' اور رُسوا کی 'اُمراؤ جان ادا' کی دنیا میں نمایاں ہے۔ جس طرح اُمراؤ جان ادا، شمن سے مختلف ہے، اور شمن 'اصغری' سے مختلف [illegible] طرح جدید ناول بھی اپنے پیشرو ناولوں کی اسلوب نگاری، ٹیکنیک، منظر نگاری، کردار نگاری اور مواد کے لحاظ سے بے حد مختلف ہے۔ اگر ادبِ لطیف میں فنِ ناول کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ ادب میں ناول کی روایت ایک صالحہ اور ترقی پسند رجحان کا نتیجہ ہے۔ میرے اِس خیال کی تصدیق کے لئے پروفیسر آرنلڈ نے انگریزی ناول پر جو تاثرات پیش کئے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے۔ اُردو ناول پر یہ کہاوت صادق آتی ہے کیونکہ

"انگریزی ناول کی اِبتداء اور ترقی تاریخ کا ایک جزو ہے۔ تاریخ صرف کتاب میں بند نہیں کی جا سکتی۔ تاریخ اِنسان کے محسوسات، کیفیات، رہن سہن کے طریقے، سوچنے سمجھنے کے ڈھنگوں میں تبدیلی کو دیکھتی ہے۔ وہ یہ دیکھتی ہے کہ انسان نے نیچر کو کس طرح مسخر کیا ہے۔ زندگی نے کون کون سے نئے مسائل پیش کئے۔ اور حل کئے۔ ناول اِن ہی چیزوں کو ریکارڈ کرتی ہے اور حقیقت نگاری کی سب سے مقبول صنف ہے۔"

جس طرح دَورِ جمہوریت نے جاگیرداری تمدن کی مطلق العنانی اور استبداد کو معدوم کر کے عوام کی حکومت قائم کی، اِسی طرح ناول نے بھی ادب میں جمہوریت کی بنیاد رکھی اور ادب کو رومانس اور تخیل کی مطلق العنانی سے نجات دِلائی جس نے فنِ شاعری اور طویل داستانوں میں اپنے آپ کو محصور کر لیا تھا۔ جمہوریت جس طرح "عوام کی حکومت" "عوام کے لئے" اور "عوام کے ہاتھوں" کا دوسرا نام ہے، اِسی طرح ناول بھی عام اِنسانوں کے رہنے سہنے کے ڈھنگ، اُن کے دکھ درد، تمناؤں، ناکامیوں، حسرتوں اور آرزوؤں کا مرقع بن گیا اور دنیائے ادب میں اُمراء کی مسلط شدہ میراث سے نکل کر متوسط، درمیانی اور نچلے طبقے کا عکاس بن گیا۔ دراصل اُسی وقت سے فنِ ناول زندگی کے قریب آیا۔

اٹھارھویں صدی میں ہندوستان کی زندگی میں جو انقلاب رونما ہوا، اُس کی سب سے بہترین تصویر اُردو ناول پیش کرتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد اور پنڈت رتن ناتھ سرشار دو نام ایسے ہیں جنہوں نے اُردو ادب کو ناول کے نام سے روشناس کرایا۔ سرشار نے لکھنؤ اور دِلّی کی جاں بلب تہذیب کو محفوظ کیا اور نذیر احمد نے نمودار ہوتی ہوئی زندگی کے نقوش کو اُبھارا۔ معاشرے کے تغیر پذیر رجحانات، عورتوں کی جہالت، اکثریت کی مذہب سے بیگانگی، امیرزادوں کی عیاشی، رئیسوں کی ہوس پرستی، بیواؤں کی کس مپرسی، زندگی کا درد و الم،

اور حیات کی کربناکی کو ناولوں کا موضوع بنایا۔ دوسری جانب سرشار نے اعلیٰ طبقے کی رئیسانہ زندگی، رسم و رواج کی پابندی، حسن و عشق کے حادثات اور زندگی کے کیف و سرور کو رومان آفریں چاشنی کے ساتھ بیان کیا۔

اُردو ناول کا دوسرا اہم دَور تاریخی ناولوں اور ترجموں کا دَور تھا۔ شرر اور محمد علی نے اسلاف کے کارنامے اس لئے پیش کئے کہ عروقِ مُردہ میں خونِ حیات رقص کرنے لگے۔ اُس دَور میں مرزا ہادی حسن رُسوا کا نام ایسا ہے جن کے ناول "اُمراؤ جان اَدا" نے ادبیاتِ عالیہ میں بلند مرتبہ حاصل کرلیا۔ اور اُردو ادب کے ناولوں میں ایک سنگِ میل کی حیثیت اختیار کرلی۔

اِس کے بعد خواتین ناول نگاروں نے ناول کو اصلاحِ معاشرت کا ذریعہ بنایا۔ اِس مقصد کی روشنی میں چند اچھے ناول قلم بند کئے گئے۔ کردار نگاری، جذبات نگاری، منظر کشی اور مواد کے اعتبار سے یہ ناول ناقابلِ فراموش ہیں۔ لیکن یہ صرف ابتدائی کوششیں تھیں۔ اِن کوششوں کو اُردو ناول میں پریم چند نے بامِ عروج پر پہنچایا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ پریم چند جدید اُردو ناول کے بانی ہیں۔ اُردو ناول میں جو کچھ بھی فکری اور تخلیقی انقلابات رُونما ہوئے ہیں، اُن کی بنیاد پریم چند نے رکھی ہے۔ اُنہوں نے ادب کو نئی سماجی حقیقت نگاری اور نئی ٹیکنیک سے آشنا کیا۔ جدید شعور اور جدید مسائل کو سمجھ کر جدید اخلاقی قدروں پر اپنے افسانوں اور ناولوں کی عمارت تعمیر کی ہے۔ اُن کے ناولوں کا اساسی مرکز انسان اور انسان دوستی ہے۔ انسانیت دوستی کا اس جذبے نے ۱۹۳۶ء میں اور شدّت اختیار کرلی۔ ترقی پسند ادیبوں نے ادب کو ایک نئی شاہراہ پر لاکر کھڑا کردیا۔ اور ادبی ٹیکنیک اور فارم میں ایک انقلاب آگیا۔ اِس انقلاب کی زد میں شاعری، افسانہ، ناول، تنقید، غرض ادب کی ہر صنف آرائی۔ فنِ شاعری میں تو یہ انقلاب بحیثیت ناول کے کہیں زیادہ ہے اس میں نہ صرف باطنی اعتبار سے تغیّر نمودار ہوا بلکہ ہیئت کے اعتبار سے بھی تبدیلی ہوئی۔ بہرکیف اِس انقلاب کے باعث فنِ ناول کی ٹیکنک میں بھی ترقی ہوئی۔ یہ بات مسلّم الثبوت ہے کہ اُردو میں ناول انگریزی ادب کے توسّط سے داخل ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے اُردو ناول پر انگریزی ناول کا گہرا اثر آج بھی ہے۔ بیسویں صدی انگریزی ناول میں بھی جدّت اور تجربے کا دَور تسلیم کیا جاتا ہے، جس میں وکٹوریائی عہد کی روایتیں تغیّر پذیر دکھائی دیتی ہیں۔ مذہب کے عوض سائنس اور مادّیت کا غلبہ ہوا۔ اب جارج، ایلیٹ، میریڈتھ، ہیمنس اخلاقی مجوزہ اُصولوں کے بدلے نوجوان اہلِ قلم کا ایک گروہ نمودار ہوا۔ جس نے قدیم ادبی قدریں تبدیل کردیں۔ ڈکنس کے بعد سینٹ، گالزوردی نے بھی قدیم روایات کو سینے سے لگائے رکھا۔ لیکن بیسویں صدی کے شوخ اور چنچل نوجوان قلم کار اِن سے دو قدم آگے بڑھ گئے۔ کامپٹن میکاول نے ۱۹۱۳ء میں "والہانہ فرار" شائع کرکے قارئین کے ذوق میں نفسیات نگاری کی نئی دلچسپی پیدا کردی۔ اس ناول میں نوجوانوں کے کردار کی نفسیات کا حسین ترین تجزیہ پیش کیا گیا تھا۔ اِس کے بعد اِس نے "کارنیوال" اور "گندی گلی" دو اور ناول شائع کئے جس میں مرکزی کردار کے بچپن، بلوغ، اور تعلیمانہ زندگی کا نفسیاتی مطالعہ کیا گیا تھا۔ اِس لئے یہ ناول بیحد مقبول ہوا۔ اِن ناولوں کی مقبولیت کا ایک راز یہ بھی تھا کہ اس میں تحریر کی جدّت تھی۔ اور سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ جو نوجوانوں کو اپنی ہی داستان معلوم ہوتی تھی اور اِس طرح ناول کا مرکزی کردار، عوام کا کردار بن کر عوام پر چھا گیا۔ اِس قسم کے ناولوں کی مقبولیت دیکھ کر فرینک سوئنرٹن نے "رات" قلم بند کیا۔ اور اِس طرح آکسفورڈ ناولوں نے نوجوانوں کے جذبات و احساسات کا بڑی کامیابی سے نقشہ پیش کیا اور اس کے ساتھ ہی ایک نئی اور بہترین دنیا نوجوانوں کے سامنے پیش کی جو نہ صرف خیالی تھی بلکہ عملی بھی تھی۔ اُردو ناول کا بھی مذکورہ اثرات سے متاثر ہونا فطری بات ہے۔

ادب کے جتنے شعبے ہیں۔ اُن میں ناول اور افسانے کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہے۔ یہ فن زندگی کے اسرار و رموز کو سب سے زیادہ تنقیدی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ تہذیب و تمدّن کے تغیّر اور انسانی حرکات و سکنات کی تصویر کشی کامیابی سے کرتا ہے کیونکہ اِس کے دامن ہر قسم کے نقش و نگار کی سب سے زیادہ گنجائش ہے۔ داخلیت اور خارجیت کی آمیزش، زمان و مکان کی

تغیر پذیری، انسانی فطرت کے مختلف عناصر کی تشریح۔ مقصد کی وضاحت ناول سے زیادہ کہیں نہیں پائی جاتی۔ جدید ناولوں کی عظیم خصوصیت یہ ہے کہ افسونِ حیات اور نقشِ حیات کو پورے طور پر بیدار کرتا ہے۔ زندگی کی تصویر کے ساتھ ساتھ خوش اور تلخ آیندہ مستقبل کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔ اگر ہم تفصیلات میں جائیں تو اُردو کے جدید ناولوں میں وہ سب کچھ ملے گا جس سے آج کا انسان دَور گزر رہا ہے۔ سماج اور انسان کی رُوح میں جو کشمکش اور بے اطمینانی پائی جارہی ہے۔ اُس کا مکمل عکس جدید ناولوں میں اکثر و بیشتر نظر آتا ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں کرشن چندر کا "شکست"۔ راجندر سنگھ بیدی کا "ایک چادر میلی سی"۔ خواجہ احمد عباس کا "چار دل چار راہیں"۔ رضیہ سجاد ظہیر کا "کانٹے"۔ صالحہ عابد حسین کا "یادوں کے چراغ"۔ سجاد ظہیر کا "لندن کی ایک رات"۔ رئیس احمد جعفری کا "چنگاری"۔ کوثر چاند پوری کا "پتھر کا گلاب"۔ عصمت چغتائی کا "ٹیڑھی لکیر"۔ ڈاکٹر اختر اورینوی کا "حسرتِ تعمیر"۔ اور سعادت حسن منٹو، علی عباس حسینی، عزیز احمد، قرۃ العین حیدر، قاضی عبدالغفار وغیرہ کے ناولوں کا تفصیلی جائزہ لینا ممکن نہیں۔ اسی لئے اختصار کے پیشِ نظر چند ناولوں کا تذکرہ کر رہا ہوں۔

لندن کی ایک رات "سجاد ظہیر نے صرف "لندن کی ایک رات" کی بدولت اُردو ناول نگاری میں اپنا خاص مقام پیدا کر لیا۔ اُن کا یہ ناول آکسفورڈ ناولوں کے مقابلے میں رکھا جاسکتا ہے۔ فرینک سوئنرٹن نے "رات" میں لندن میں رہنے والے ایک گروپ کی چند گھنٹوں کی زندگی پیش کی ہے۔ ٹھیک اسی انداز میں سجاد ظہیر نے "لندن کی ایک رات" میں ایک طالب علم کے چند گھنٹے پیش کئے ہیں۔ ناول کے نام سے تو ایسا گمان ہوتا ہے کہ اس میں نائٹ کلب کے رقص و سرود کے علاوہ کچھ نہیں ہوسکتا۔ لیکن سجاد ظہیر نے اس گمان کی تردید کردی ہے۔ سجاد ظہیر کے اُن چند لمحوں میں بڑا حسن اور عظمت ہے۔ یہ مجبوری دَور کے ایک نوجوان کے دل و دماغ کی کشمکش کی کامیاب تصویر ہے۔ منشی پریم چند کے نوجوان ہیرو گاندھی وادی تھے۔ اُن کے سامنے ہندوستان کی غلامی کا سب سے بڑا مسئلہ درپیش تھا۔ سجاد ظہیر کے ہیرو کا دل مجموعی طور پر تمام انسانیت کے دُکھ درد، رنج و الم، ناکامیوں اور حسرتوں کی آماجگاہ ہے۔ پریم چند نے صرف مشرقی عورتوں میں وفاداری اور جذبۂ ایثار پسندی پیش کیا ہے۔ انہیں صرف مشرقی عورتوں ہی میں شوہر پروری کا جذبہ نظر آیا تھا۔ سجاد ظہیر نے آشکار کیا کہ جغرافیائی حدود انسانیت کو تقسیم نہیں کرسکتیں۔ وفا ایثار، خلوص، ہمدردی اور شوہر پرستی جس طرح مشرقی عورتوں کی خاصیت ہے اسی طرح مغربی عورتوں کا بھی وطیرہ ہے۔ آزادیت اور انسان دوستی کے جذبے سے پورے ناول کی فضا معمور ہے۔ اس ناول کی ٹیکنیک بھی غیر معمولی ہے۔ عام طور سے اُردو ناولوں میں پلاٹ اور واقعات نگاری کو اہمیت دی جاتی تھی۔ لیکن یہاں نہ کردار ہے نہ پلاٹ ہے۔ پورا ناول ایک نقطے کے گرد رقص کناں ہے۔ اس کے افعال سے زیادہ اُس کے شعور کی رَو کا پتہ چلتا ہے۔ یہ ایک خاص علامت ہے جو نئی نسل کے تذبذب، تشکیک، بے چینی، اور بے کیفی کا آئینہ ہے۔ جو ایک سماج کو نیست و نابود کرنا چاہتا ہے، جس میں ظلم و ستم جبر و استبداد، بے انصافی و بے اطمینانی، بےکسی اور مجبوری کا دور دَورہ ہے اور ایک نیا سماج تشکیل کرنا چاہتا ہے جس میں ہر فرد کو پوری آزادی ملے۔ اور اس نوعیت کے سماج کی تعمیر وہ اور اس کے مغربی ساتھی کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کا یہ ناول ذات پات، مذہب و ملت، ملک و قوم کے اختلافات سے بے نیاز ہے۔ وہ اپنی انسان دوستی کے وسیع مسلک کے سامنے ان سب کو پسِ پشت ڈال دیتا ہے۔

شکست "لندن کی ایک رات" کے کچھ ہی دنوں بعد کرشن چندر نے "شکست" لکھا۔ شکست بھی آکسفورڈ ناولوں کی طرح ایک نوجوان کے داخلی جذبے کے گرد گھومتا ہے۔ لیکن اس ناول میں بے پایاں جاذبیت ہے۔ اس کی رومانیت انقلاب آفریں ہے۔ اس ناول کا ہیرو اُن بے شمار نوجوانوں میں سے ایک ہے جو سماج سے شکست کھا جاتا ہے۔ لیکن اُس کے

...کی ہمت نہیں ہوتی کہ ذات پات اور سماجی بندشوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر سکے۔
جس ناول میں سماجی اجاریت کی فتح اور طبقاتی کشمکش کی شکست کو پیش کیا گیا ہے۔ ہیرو کی خارجی اور باطنی کشمکش کو کرشن چندر نے جس طرح بیان کیا ہے وہ صرف کرشن چندر ہی کا کمال ہے۔ ورنہ بظاہر معمولی سی داستانِ عشق میں اتنی دلچسپی باقی نہیں رہ سکتی تھی۔ اس ناول میں جذبے کی دھیمی دھیمی آنچ ہے۔ کہانی صرف اتنی ہے کہ شیام (ایک تحصیلدار کا لڑکا) کو ایک برادری سے خارج شدہ عورت چھایا دیوی کی لڑکی ونتی سے محبت ہو جاتی ہے۔ اس کے اپنے خاندان کی قدیم روایات ہیں۔ جس کی وجہ سے ونتی سے اس کی شادی نہیں ہونے پاتی۔ ونتی کسی اور کی زوجیت میں دے دی جاتی ہے اور شیام کی شادی دوسری جگہ طے ہو جاتی ہے۔ ونتی غمِ محبوب کی تاب نہ لا کر موت کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس طرح یہ ناول ایک عورت کی روح اور جسم کی بربادی اور ویرانی کی داستان ہے۔ اس کہانی کو کشمیر کی وادی میں پیش کیا گیا ہے جس سے شاید ایک طرف فطرت کا حسن اور دوسری جانب انسان کی بربادی پیش کرنا فنکار کا مقصود ہے۔ منظر کشی اس ناول میں انتہائی بلندیوں پر ہے۔ کرشن چندر کے قلم نے سحر آفریں جادو ہر موڑ پر جگایا ہے۔ اس ناول کی عظمت و بلندی کو دیکھ کر عزیز احمد نے اعتراف کیا ہے کہ "یہ اُردو کا بہترین ناول ہے۔"

ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی کا یہ ناول جدید ناولوں میں ایک خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ ناول عبوری دور کی ایک لڑکی کی داستان ہے۔ جب قدیم تہذیب دم توڑ رہی تھی۔ نئی تہذیب جنم لے رہی تھی۔ پردہ اور مردوں سے علیحدگی کے تصوّر کے عوض مخلوط ماحول جنم لے رہا تھا۔ شادی بیاہ کی رسومات اور بندشوں میں تبدیلی آرہی تھی اور عورت معاشرتی زندگی میں مرد کے شانہ بہ شانہ آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ عصمت نے "ٹیڑھی لکیر" کا نام دے کر شمن کے روپ میں بڑا جیالا اور سبق آموز کردار پیش کیا ہے۔ جو "شکست" کے بزدل شیام "لندن کی ایک رات" کے "آدرش اعظم" سے مختلف ہے۔ شمن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ سماج سے شکست نہیں کھاتی اور جس کی بدولت اس کی شکست ہونے والی تھی اس سے وہ آگاہ ہو جاتی ہے۔ وہ سماج کی باغی ضرور ہے لیکن انسانی فطرت سے بغاوت نہیں کرتی۔ اس ناول میں عصمت نے بدلتے ہوئے معاشرتی نظام کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ آزاد محبت مخلوط معاشرہ، پردہ نشین گھرانوں کی نفسیاتی اُلجھن، نوجوانوں کے جذبات و احساسات، عورت اور اس سے متعلق پیچیدہ مسائل۔ اسی لئے اس ناول کو اُردو ادب میں ایک خصوصی اہمیت اور مقام حاصل ہے۔

گریز عزیز احمد یوں تو شاعر بھی ہیں۔ مترجم بھی ہیں۔ نقاد بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی۔ لیکن اُن کی شہرت کا خاص میدان ناول ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عزیز احمد اس زمانے کے سب سے عظیم ناول نگار ہیں۔ انہوں نے "مرمر اور خون"۔ "ہوس"۔ "گریز"۔ "آگ"۔ "ایسی بلندی اور ایسی پستی"۔ اور "شبنم" ایسے کامیاب ناول تحریر کئے ہیں۔ لیکن اُن کی شہرت خاص طور سے "گریز" کے باعث ہوئی۔ گریز کے مطالعے کے بعد ہی کنہیا لال کپور اور کرشن چندر کو اعتراف کرنا پڑا کہ عزیز احمد کو ناول کی ٹیکنیک پر قابلِ رشک عبور حاصل ہے۔ کرشن چندر نے صاف لفظوں میں لکھا۔

"عزیز احمد کے ناول ٹیکنیک میں پریم چند سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ لیکن اُن کی ساری مشاطگی ایک لاش کو سنوارنے اور سجانے میں صرف ہو رہی ہے۔"

لیکن میرے خیال میں یہ درست نہیں۔ اسلوب، ٹیکنیک اور مواد کے اعتبار سے عزیز احمد کے ناولوں میں جدّت اور انفرادیت نمایاں ہے۔ عزیز احمد کے سبھی ناولوں کا مقصد انسانیت کی آزادی اور انسانیت کی بیداری ہے۔ عزیز احمد کے طرزِ خیال میں یاس و الم کی کیفیتیں اور طعن و طنز کا درد ہے۔ لیکن ان کی قنوطیت کا مفہوم عام مفہوم سے جداگانہ ہے۔ معمولی خوشیوں یا راحتوں کے زوال، جیسے بھوک بے روزگاری، فاقہ کشی سے ان کے ناولوں میں یاس و الم کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ وہ حادثات جو ذہنی بے چینی اور تڑپ کی وجہ سے

چونکہ یہ جذبات ذہنی تخیلات اور اعصابی شکست کے باعث پیدا
عمل پذیر ہوتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں یاس و الم کی فضا پیدا کرتے ہیں۔
ہوتے ہیں۔ اس لئے ان میں شوکت و حسن اور ایک قسم کا وقار ہوتا ہے۔
کردار نگاری میں بھی عزیز احمد کو خصوصی ملکہ ہے۔ ان کی کردار نگاری آئینے سے بہت حد تک ملتی جلتی ہے۔ وہ بھی جب کاغذ پر
کا باطن حاضرین کو دکھانا چاہتا ہے تو خورد بین سے ان کو دیکھ کر ناظرین کی طرف بڑھا دیتا ہے اس کی اسے مطلق پروا نہیں ہوتی کہ
اس طرح چیر دینے سے اس کے ڈرامے کے کردار موت کا شکار ہو جائیں گے۔ اس قسم کی مثالیں عزیز احمد کے نعیم، شبنم، ارشد، سلطان
حسین اور سکندر کے کرداروں میں اکثر و بیشتر ملتی ہیں۔ بحیثیتِ مجموعی عزیز احمد نے اردو ناول کو بہت کچھ دیا ہے۔ جاندار اسلوب، بے مثال
ٹیکنیک، جذبات نگاری، مختصر یہ کہ ان کے ناول جدید اردو ناول کے شاہکار سمجھے جاتے ہیں۔

میرے بھی صنم خانے: قرۃ العین حیدر کا یہ ناول بیسویں صدی کی زندگی کا کامیاب عکاس ہے۔ اس میں داخلیت اور خارجیت کا نہایت خوش نما امتزاج ہے۔ یہ صرف ایک فرد کے کرب و اندوہ کی داستان
نہیں۔ جماعت کے حسرت و غم کا مرقع ہے۔ ساتھ ہی ایک مخصوص معاشرے کا جو بہت تیزی سے مٹ رہا ہے، ماتم بھی ہے۔ اس ناول
کے کردار بڑے وسیع مشرب ہیں جو مشرق و مغرب، کالے گورے اور ہندو مسلمان کا فرق نہیں برتتے۔ اور زمان و مکان کی پابندیوں
سے آزاد رہتے ہیں۔ رخشندہ کے کردار میں نسوانی حسن بھی ہے اور عظمت و بلندی بھی۔ اسی کے ساتھ ہی روح کی لطافت جو اسے
اردو ادب کی تمام ہیروئنوں سے ممتاز کرتی ہے۔
قرۃ العین حیدر کے ناول میں محض حقیقت نگاری ہی نہیں، حقیقت نگاری سے بڑھ کر آئیڈیلزم (تصوریت) ہے۔ اسی لئے
ان کا یہ ناول ہنگامی نہیں دوامی ہے۔ چند سال قبل انہوں نے ایک کامیاب ناول "آگ کا دریا" پیش کیا ہے۔ اس ناول میں قرۃ العین
حیدر نے فن کی بلندیوں کو چھو لیا ہے۔

جدید ناول نگار جنہوں نے جدید اثرات کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا۔ ان کے متعلق مجھے زیادہ کچھ کہنا نہیں ہے۔ لیکن حقیقت
یہ ہے کہ انگریزی ادب کا اثر اس قدر طاری ہو چکا ہے کہ جدید ناول اس کی زد سے نہیں بچ سکا۔ جدید ناولوں میں انفرادی زندگی،
خاندانی زندگی، معاشرتی اور سماجی زندگی کی الجھنوں کو اس قدر دلچسپی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ قاری ناول کی گہرائی میں ڈوبتا چلا جاتا
ہے۔ ٹامس ہارڈی، ڈی ایچ لارنس، ای ایم فاسٹر، ایلیٹ، میکسم گورکی وغیرہ کے تاثرات براہِ راست اردو کے جدید ناولوں پر اثر انداز
ہوئے ہیں۔ میرے خیال کی تصدیق کے لئے مہندر ناتھ کا "ارمانوں کی سیج"۔ بلونت سنگھ کا "ایک معمولی لڑکی"۔ ٹھاکر پونچھی کا "یہ من بڑا چنچل ہے"۔
آمنہ ابوالحسن کا "سیاہ، سرخ، سفید"۔ کوثر چاند پوری کا "پتھر کا گلاب"۔ قاضی عبدالستار کا "شب گزیدہ"۔ جمیلہ ہاشمی کا "تلاش
بہاراں"۔ زلیخا حسین کا "ایک خواب ایک حقیقت"۔ مخمور جالندھری کا "خواب گاہ میں"۔ رضیہ بٹ کا "وحشی"۔ عفت موہانی کا "محبت
نام ہے غم کا"۔ مظہر الحق کا "خونریز"۔ ذکی انور کا "زنجیر"۔ ڈاکٹر حامدی کاشمیری کا "پگھلتے خواب"۔ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کا "نئے فرہاد"۔ ش
مظفر نوری کا "ہزار راتیں"۔ اور ستیش بترا۔ رام لعل، احمد سہیل عظیم آبادی کے ادبی کارنامے کافی ہیں۔ ان مذکورہ ناولوں میں حقیقت نگاری
کے ساتھ ساتھ زندگی کے سیاسی، معاشرتی، سماجی اور تمدنی مسائل کی صحت مند نظریئے کے ساتھ تصویر کشی کی گئی ہے۔ بین الاقوامی اخوت،
اور صحت مند رجحانات کو فروغ دینے میں ان ناولوں نے نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے۔ جدید مسائل کے حل کے لئے ذہن و فکر کو مائل کیا ہے۔
ہر ناول اپنی حیثیت اس کیمرے کے مانند رکھتا ہے جو جزئیات کے ساتھ ساتھ زندگی کی مکمل تصویر پیش کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں
کہ ہر ناول ٹیکنیک اور فنی خصوصیات کی رو سے یک رنگ ہے بلکہ ہر ناول کی ایک جداگانہ انفرادیت اور خصوصیت اپنی جگہ نمایاں
ہے۔ یوں تو چند نقادوں نے جدید اردو ناولوں پر بھی رجعت پسندی اور جمودیت کا الزام عائد کیا ہے۔ لیکن یہ الزام معدودے چند
ناولوں کو چھوڑ کر سب پر عائد نہیں ہوتا۔ جدید اردو ناولوں کی مجموعی تعداد ایسی ہے جسے دنیا کی دیگر زبانوں کے مقابلے میں فخر کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے۔ اس حقیقت
کا اعتراف ناقدینِ اردو کے علاوہ دنیا کی دیگر زبانوں کے نقادوں نے بھی کیا ہے۔

رونق دکنی سیمابی

دیپ سے دیپ جلانا تو بہت آساں ہے
دل کے ٹکڑوں کو بھی جوڑو، تو کوئی بات بنے
آستینوں کے بھگو لینے سے کیا ہوتا ہے
دامنِ تر بھی نچوڑو، تو کوئی بات بنے
اُن کو جو آج ہیں بیگانۂ احساسِ عمل
خوابِ غفلت سے جھنجھوڑو، تو کوئی بات بنے
جس سے گرمیٔ تشدد کو توانائی ملے
اُس کلائی کو مروڑو، تو کوئی بات بنے
دل کسی کا بھی ہو، اللہ کا گھر ہے لوگو!
دل کسی کا بھی نہ توڑو، تو کوئی بات بنے
ہست سے بود، حقیقت میں نہیں بیگانہ
ہست کو بود سے جوڑو، تو کوئی بات بنے
پھل بھی اُٹھیں گے چٹکنے کے بقدر، لیکن
بتِ پندار کو توڑو، تو کوئی بات بنے
جذبِ دل بستۂ زنجیرِ علائق کب تک؟
اسے آزاد بھی چھوڑو، تو کوئی بات بنے
جس سے ہو کبر کا اظہار بہ اندازِ خلوص
ایسی آنکھوں کو بھی پھوڑو، تو کوئی بات بنے
قوم کی یک جہتی پہ ہے مدارِ ہستی!
رُخِ جذبات کو موڑو، تو کوئی بات بنے

کوئی مشکل نہیں، مشکل ہر اک آساں ہو جائے
صرف اتنا ہو کہ ہر آدمی انساں ہو جائے

پیشکش

اور بھی جینے کی راہیں ہیں، بعنوانِ حیات
غمِ ہستی کا فقط موت ہی درماں کیوں ہو؟
دل سلگتا ہے تو آہوں سے دھواں اٹھتا ہے
اس کثافت میں کوئی شمع فروزاں کیوں ہو؟
خون ہے مایۂ تخلیقِ عناصر، لوگو!
خونِ انساں کا مٹی سے بھی ارزاں کیوں ہو؟
پیٹھ میں صلح پسندوں کے چھرا کیوں گھونپو؟
دلِ اربابِ وفا خون میں غلطاں کیوں ہو؟
جھونک دو کیوں کسی معصوم کو انگاروں میں
نیک جذبۂ دل شعلہ بداماں کیوں ہو؟
اس کا سیندور مٹے، اس کا اُجڑ جائے سہاگ
زندگی موت سے یوں دست و گریباں کیوں ہو؟
کیوں جنازہ اٹھے، ارتھی کی ہو کیوں تیاری
صبحِ مرگھٹ کی، شبِ شہرِ خموشاں کیوں ہو؟
بھائی چارہ رہے کیونکر، جو بھروسا اٹھ جائے
سہما سہما ہوا، انساں سے انساں کیوں ہو؟
کیسی اربابِ خرد کی ہے نظر میں تفریق
سب ہیں انساں، یہ ہندو، وہ مسلماں کیوں ہو؟
"خود جیو اوروں کو جینے دو" کہ تمکینِ حیات
دشنۂ بغض کی شرمندۂ احساں کیوں ہو؟

بے یقینی کا رُخِ دہر سے دھل جائے غبار!
ٹوٹ کر برسے مساوات کا یوں ابرِ بہار!

خانزادہ عبدالواسع خاں

"میرا گاؤں، میری مسکراہٹ"

بیمار رابرٹ بستر پر لیٹا ہوا ہے ——— وقت کی دھوپ چھاؤں نے اُسکے بال کھچڑی کر دیئے
ہیں۔ میری پلنگ کے سامنے کرسی پر بیٹھی مکمل بانہماک اپنے شوہر کو دیکھ رہی ہے جس کی نگاہیں سامنے دیوار پر آویزاں کیلنڈر پر جمی ہوئی ہیں۔ اس پر ایک
گول مٹول بچے، تندرست اور جوان ماں اور ایک لاغر ضعیف عورت کی تصویریں کمال فنکارانہ مصوری کے ساتھ دکھائی گئی ہیں۔ کھلتی ہوئی کلی کی طرح
مسکراتا ہوا بچے کا بے داغ اور معصوم چہرہ... رابرٹ کا دل خواہ مخواہ اُس کی طرف کھنچنے لگا... بچے ..... ننھے فرشتے۔ خالق اکبر کے بنی آدم کو عطا کردہ
بہترین تحفے۔ ان کو کٹھور سے کٹھور دل بھی پیار سے گود میں اٹھائے اور سینے سے لگائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تصویر میں انتہائی والہانہ انداز میں ماں اپنے بچے پر
جھک رہی ہے۔ بچے کے ابھرے ہوئے سرخ گالوں جیسے آرٹسٹ کے رنگوں سے نہیں ماں کی آنکھوں سے پھوٹتی ہوئی ممتا کی کرنوں نے تابناک اور
لال لال ہو گئے ہیں۔ معصومیت کی یہ تصویر دھندلی پڑ گئی اور اس کی جگہ ایک خرانٹ نوجوان کی تصویر نے لی۔ رابرٹ کو لگا جیسے ننھے فرشتے
نے شیطان کا روپ دھار لیا ہو۔ اس کی آنکھوں سے بھڑکتے ہوئے شعلے نکلتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے ان ہی شعلوں نے
بٹوارے کے وقت اُس کے گاؤں کو انسانوں کے ہاتھوں انسانوں کی لوٹ کھسوٹ کی جولانگاہ بنا دیا تھا۔ اور پھر ہر دن محشر کا دن تھا اور ہر رات
قیامت کی رات تھی۔

رابرٹ حیران تھا۔ ماں کے سینے سے نکلے ہوئے ممتا کے دودھ کے دھارے بھی انسان کے اندر چھپے ہوئے دوسرے انسان کو شیطان بننے
سے نہیں روک سکے اور وہ ماں کے لاڈ پیار میں سے ذرہ برابر بھی عالم انسانیت کو نہیں دے سکا۔
تصویر کو تکتا اور دیکھتے دیکھتے رابرٹ کی آنکھیں پتھرا سی گئیں اور ان میں درد محسوس کرنے لگا۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں مگر اُس کا دماغ برابر
خیالات کے تانے بانے میں اُلجھا رہا۔ بچہ، ماں اور بوڑھی عورت... حیاتِ انسانی کی مکمل تصویر..... پیدائش، بچپن، لڑکپن، جوانی، بڑھاپا
اور موت۔ وہ سوچنے لگا یہی تو اسٹیشن ہیں زندگی کی گاڑی کے۔ چلتے چلتے دم لینے کیلئے گاڑی چند لمحے ان پر رکتی ہے اور پھر آگے بڑھنے لگتی
ہے۔ یہاں تک کہ ٹرمینس (TERMINUS) آ پہونچ جاتی ہے۔ زندگی کا ٹرمینس .... موت۔ ایک مستقل پڑاؤ اور ٹھہراؤ۔ رابرٹ کو
اپنا انجام نظر آنے لگا۔ اُس کو اپنے اندر آندھیاں چلتی محسوس ہوئیں۔ دنیا غبار ہوتی نظر آئی۔ اُجالے دھندلکوں میں تبدیل ہوتے دکھائی دیئے۔
مے حیات کا خمار اترنے لگا اور اس کی حسیات کی نسیں تن کر چٹخنے لگیں۔ بڑی عجیب سی بات ہے۔ انسانی ہاتھوں سے بنی ہوئی گاڑیاں ٹرمینس پر مقررہ
وقفہ تک کھڑے رہنے کے بعد پھر اپنے پرانے مانوس راستوں کی واپس دوڑنے لگتی ہیں۔ رابرٹ کا مرغ تخیل "آواگون" کی جھاڑیوں میں پھنس کر رہ گیا۔ اگر
واقعی دوسرے جنم والی بات صحیح ہے تو وہ اپنے خدا سے صاف صاف کہہ دے گا کہ دوسرے جنم میں وہ اس کو خواہ کچھ بھی بنا دے مگر نہ بنائے تو صرف
" ایک انسان..... آج کا انسان..... ایک منافق"
دور بہت دور رابرٹ کو ریل کی سیٹی سنائی دی۔ دوسرے ہی لمحہ ان گنت ریلوں اور پانی کے جہازوں کی سیٹیاں، ہوائی جہازوں کے غراٹے،
موٹروں کے ہارن اور کارخانوں کی آوازیں اسکے کانوں کے پردوں پر گونج کر بج اُٹھیں۔ سفر سفر... اور سفر ہی سفر۔ وہ ایک کرب انگیز تڑپ

سے معاملہ کو ٹال گیا۔ "میرے ڈارلنگ" میری گھبرا گئی اور اُس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ "کچھ نہیں ... کچھ نہیں" رابرٹ پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے بولا۔ "میں تو یوں ہی تھی تمہاری آنکھ لگ چکی ہے" میری نے کہا۔ "ہاں ... مگر ایک ڈراؤنے خواب نے جگا دیا۔" رابرٹ نے جواب دیا۔ میری نے رابرٹ کو لٹا دیا کر بستر لٹا دیا اور اٹھ کر اپنی کرسی کی طرف جانے لگی۔ رابرٹ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ "یہیں بیٹھ جاؤ میرے پاس۔" اور پھر اُس نے تکیہ کے نیچے سے ایک بہت پرانے پھٹے ہوئے رومال میں سے ایک بوسیدہ کاغذ کی پڑیا نکالی اور اس کو اپنی بیوی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "زندگی کا کیا بھروسہ۔ میری اس نشانی اور امانت کو اپنے پاس رکھو۔ اس میں میرے گاؤں کی وہ مٹی ہے جس میں میرے خاندان اور میری محبوبہ کی زندگی سو رہی ہے" رابرٹ رونے لگا۔ اُسے ایسا لگا جیسے اُس نے محبوبہ کا ذکر کر کے اپنی بیوی کو مغموم کر دیا ہے۔ میری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُس کے دل کی گہرائیوں کو ٹٹولا۔ اُس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔

"تم ہرجائی ہو۔ بے وفا ہو" روتے روتے ایک ہلکی سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر کھیل گئی۔ جیسے کہ وہ اُس کو سمجھانا چاہتا ہو۔ "میری غلط ابھی غلامت سمجھو۔ میری محبوبہ .... یہ وہ عورت تھی جو تمہارے شریکِ حیات بننے سے پہلے میری زندگی میں بہار بن کر آئی تھی۔ میرے تڑپتے ہوئے محبوب دل کا شباب دھڑکنیں آج بھی اُس کے لئے ناقابلِ برداشت ہیں۔ محبوبہ کے نام میں ابھی تک میرے لئے زندگی کی حرارت باقی ہے۔ میرا سوزِ محبت جاودانی ہے۔ اس کے ہجر کے سیلاب میں میری تیرتی ہوئی نظروں میں آج بھی اُس کی تصویر رقص کر رہی ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ میں بے وفا ہوں۔ دیکھو۔ میری وہ دیکھو۔ وہ سامنے کھڑی کھلی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی ہے۔ انتہائی کرب اور اضطراب کی حالت میں اپنے ہونٹوں کو دانتوں میں دبائے اپنی چیخوں کو ضبط کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ خاموش ہے۔ اُس کی عصمت لٹ چکی ہے۔ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی ہیں۔ اُس کے آنسو خشک ہو چکے ہیں۔ وہ اس کائنات سے دُور جا چکی ہے جہاں بھلائی اور بُرائی کا احساس ہوتا ہے اپنے دونوں ہاتھ میری طرف پھیلا کر چلا چلا کر کہہ رہی ہے "تم آگئے ... میں جانتی تھی تم ضرور آؤ گے۔ تم اگر نہ بھی آتے تو مرتے دم تک تمہاری صرف تمہاری راہ تکتی۔ میرے بعد میرے بیٹے بیٹیاں۔ میرے پوتے پوتیاں تمہاری راہ دیکھتے۔ یہ سرزمین تمہارے لئے ترستی اور چشم براہ رہتی۔ میں نے دعائیں مانگی تھیں، خواب دیکھے تھے، اپنی آنکھوں کے آخری آنسو تک بہا دیئے تھے، تمہارے .... صرف تمہارے آنے کے لئے۔ میری طرف دیکھو۔ کیا تم مجھے نہیں پہچانتے؟ میں وہی ہوں تمہاری اپنی پاکدامن۔ نہیں .... نہیں .... میں پاک دامن نہیں ہوں۔ کاش تم مجھے نہ پہچان سکو۔ مجھے جھوٹی تسلیاں نہ دو۔ جو تمہارے آنسوؤں میں برابر کی شریک تھی، وہ کوئی اور ہوگی۔ جس کیلئے تمہارے گلستان کے پھول اور تمہارے خرمنِ سوختہ کے انگارے یکساں تھے، وہ کوئی اور ہوگی۔ تم کیوں آگئے۔ چلے جاؤ۔ میں کہتی ہوں خدارا جلدی کرو۔ مجھے تمہاری زندگی خطرہ میں نظر آرہی ہے۔ تم کو تمہاری قوم عزیز ہے مگر قوم کو تم اور تمہاری زندگی پیاری نہیں۔ اس سرزمین پر تمہاری جس قوم نے انگارے بوئے ہیں وہ تمہارے لئے پھول ہرگز پیدا نہیں کرے گی۔ یہاں انسانیت ختم ہو چکی ہے۔ میرے محبوب ایسی کس مپرسی کے عالم اور ایسے نازک وقت پہلے ہو جب اور روح کے درمیان ایک خلا محسوس کر رہی ہوں میرا دل زور زور سے دھڑک کر ڈوبنے لگا ہے۔ یہاں تو ہر ہر قدم پر لاشوں کے پشتے لگے ہیں۔ میں بھی ان ہی میں سے ایک ہوں۔ یہ مقدس امانتیں ہیں۔ ان کو مجھے سونپ دو اور تم چلے جاؤ۔ یہ بات اب میرے لئے باعثِ شرم ہے کہ میں تمہاری ہونے والی بیوی، تمہارے گھر کی بہو، کسی کی بہن اور کسی کی بیٹی ہوں۔ جاؤ۔ جانے کیوں نہیں۔ میں کہتی ہوں چلے جاؤ" رابرٹ چونک پڑا اور گھبرا کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اُس نے دیکھا کہ اُس کی محبوبہ کے رُکے ہوئے آنسو جنہیں کسی کے سامنے بہانا اُسے ہرگز گوارا نہ تھا۔ اچانک اُس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔ وہ دیوانہ وار کبھی ہنستی کبھی روتی تھی۔ اُس کے اور محبوبہ کی نگاہوں کے درمیان آنسوؤں کا ایک دبیز پردہ حائل ہوگیا۔ اُس کو محبوبہ کے آنسو محبت کے وہ آنسو دکھائی دینے لگے جو عورت کی آنکھوں کو شبنم آلود کلیوں سے کہیں زیادہ لطافت اور پاکیزگی عطا کر دیتے ہیں۔ رابرٹ کے ڈوبتے ہوئے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ اس کے کمرہ کی پُرسکون فضا میں کئی ہنگامے بیدار ہوگئے، اُس کے بھینچے ہوئے ہونٹ لرز کر چلا اٹھے "محبوبہ .... محبوبہ" جو قوم کے وجود پر بلکتی ہوئی، تڑپتی، چلاتی اور چیختی ہوئی انسانیت کے درمیان

اُن کے شعلوں سے بچنے کیلئے ہاتھ پیر مار رہی تھی، چلا رہی تھی۔ مجھے بچاؤ..... مجھے بچاؤ۔
محویت کے عالم میں رابرٹ کے دل و دماغ کی تمام حسیات سمٹ کر اُس کی آنکھوں میں آ گئیں۔ اُس کو وقت کے دھارے رُکتے ہوئے محسوس
ہونے لگے۔ اور تھوڑی دیر کیلئے اُس کی رگوں میں خون کا آخری قطرہ تک منجمد ہو کر رہ گیا۔ اچانک آنسوؤں کا ایک سیلاب اُس کی آنکھوں سے
پھوٹ نکلا۔ وہ سوچنے لگا۔ اُس نے اپنے آنسو پونچھے اور زیرِ لب مسکرا دیا، جیسے کہ وہ اپنی محبوبہ کو سمجھانا چاہتا ہو۔ "پگلی کہیں کی۔ تجھے کیا معلوم
کہ میدانِ جنگ میں گھر سے دور لڑنے والا شہسوار عورت کی نظر میں زیادہ محبوب ہوتا ہے۔ جانبازی سپاہی کا زیور ہے اور جانبازوں کے چوڑے
چکلے سینوں پر قوم کی تقدیر لکھی ہوتی ہے۔" لمحہ بھر کیلئے اُس کو ایسا لگا جیسے وہ خود کو دھوکہ دے رہا ہے۔ "مگر یہ خود فریبی نہیں ہے۔ یہ حقیقت
ہے۔ میں کسی بہادر سپاہی اور جانباز شہسوار سے کسی طرح بھی کم نہیں ہوں، مگر میں مجبور تھا۔ وہ درندے رات کے اندھیرے میں ٹوٹ پڑے
میں تنہا تھا، اور اجتماعِ آلام و مصائب کا سامنا کرنے کیلئے اجتماعی جدوجہد درکار ہوتی ہے۔"
رابرٹ نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک خط نکال کر اپنی پُرنم آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا۔ "جانتی ہو میری، یہ کیا ہے۔ میری محبوبہ
کا پہلے پہلے پیار کا پہلا پہلا خط۔" وقت کی ٹوٹی ہوئی کڑیوں میں پھر ایک بار ربط پیدا ہو گیا اور موتی کی طرح چمکدار آنسوؤں کی ایک لڑی اُس
کی آنکھوں سے نکل کر خط پر آ گری۔ اُس خط پر جس کو جان سے بھی زیادہ عزیز سمجھ کر وہ ۲۲ سال سے اپنے کلیجے سے لگائے ہوئے ہے۔ یہ
تشکر کے آنسو تھے، جیسے کہ وہ اپنی محبوبہ کو اُس کے خط کا جواب دے رہا ہو: "میں سمجھتا تھا کہ میں صرف دلکش نغمے اور رومانی افسانے سنانے کے لئے
پیدا ہوا تھا اور تم صرف پھولوں سے کھیلنے کیلئے۔ لیکن اب میرے دامن میں تمہارے لئے بجھی ہوئی راکھ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ کاش میں بھی
ڈرامہ کے اُس ہیرو کی طرح ہوتا جس کو خونخوار اور بھوکے درندوں کے سامنے ڈالنے کے بعد بھی بے بسی کے عالم میں اپنی محبوبہ کی اشک
آلود آنکھیں گوارا نہ ہوں اور جس کو ڈرامہ نگار نے درندوں پر بجلی گرا کر بچا لیا ہو اور المناک انجام کو خوشی میں بدل دیا ہو۔ میں بھی اپنے قیام
ازل سے مایوس نہ تھا۔ مگر افسوس ایسا نہ ہوا۔ میری کہانی بھی بھیڑیوں اور انسانوں کی کہانی ہے۔ انسان سو رہے تھے اور بھیڑیئے ان
پر ٹوٹ پڑے، کاش میرے کاتب تقدیر نے اُن پر بجلیاں گرا کر میری کہانی کا انجام بھی بدل دیا ہوتا۔"
وقت اور حالات کے سنگین ہاتھ رابرٹ کا گلا دبا رہے تھے۔ انتہائی مایوسی کے عالم میں وہ زندگی کا سسکتا ہوا امن بچانے کی ناکام کوشش
کر رہا تھا۔ جیسے ڈوبنے والا پانی کی سطح پر آ کر ہاتھ پیر مارنا چاہتا ہو۔ اُس کا دل بیٹھنے لگا۔ وہ میری کے سہارے اٹھا اور کھڑکی کے پاس
جا کر کھڑا ہو گیا۔ کمرے سے باہر سیاہ بادلوں سے ڈھکی کالی رات نے اُس تاریک آندھی اور طوفان کی یاد تازہ کر دی جس نے ایک ایسی آگ
کو ہوا دی تھی کہ اُس سے اُس کی شمعِ زندگی ہمیشہ کیلئے بجھ کر رہ گئی اور جس کے شعلے آج بھی اس کی نظروں کے سامنے ہیں۔ اچانک اُس
کی نظر دور بہت دور سکریٹریٹ کی عمارت پر بجلی کی روشنی میں لہراتے ہوئے ترنگے جھنڈے پر پڑی۔ جیسے جیسے ترنگا لہراتا تھا، اُس کا دل بھی پتّے کی
طرح لرزتا تھا۔ آہستہ آہستہ ترنگے کے سب رنگ دھندلے پڑتے گئے اور اُن کی جگہ خون کے چھینٹوں نے لے لی۔ شہیدوں کے خون کے
چھینٹے۔ اور پھر اُسے ایسا لگا، جیسے ترنگے پر صرف ایک رنگ چڑھ گیا..... خون کا رنگ اور ترنگے کے چاروں طرف جلتے ہوئے بجلی کے بلب،
اُس کو وحشیوں اور بلوائیوں کی وہ خونی آنکھیں محسوس ہونے لگے جو معصوموں کو خون میں نہلانے کے بعد فاتحانہ انداز میں مسکرا رہی ہوں۔
رابرٹ نے دیکھا کہ سامنے ایک کارخانہ کی چمنی سے سیاہ دھوئیں کی ایک گھنی لکیر نکل کر خوشگوار فضا کو مکدر کر رہی ہے۔ اُس کو بٹوارہ کی اُس
لکیر کا خیال آ گیا جو اگست ۱۹۴۷ء میں پنجاب اور بنگال کی سر زمین پر اُبھری اور ملک کے امن و امان کی فضا کو مکدر کر دیا۔ اُس کی نظر میں یہ
لکیر ایک ایسا کالا ناگ تھی جس نے بیشمار دلہنوں کو اُن کے گھونگھٹ اٹھنے سے پہلے ہی ڈس لیا جس کی پھنکار نقار خانہ میں طوطی کی آواز
ثابت ہوئی اور لٹیروں نے وقت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنی جھولیوں کو خوبصورت مال سے بھر لیا۔
رابرٹ رونے لگا اور بھرائی ہوئی آواز میں میری سے کہنے لگا۔ "مجھے وہ وقت یاد ہے جب معصوموں کے ٹوٹے ہوئے بازوؤں اور

بے گناہوں کے خون سے بھیگتے ہوئے وطن کا آخری منظر دیکھنے کے بعد آفتاب سیاہ رات کا نقاب اپنے چہرہ پر ڈال چکا تھا۔ خون اور آگ کی ہولی کھیلنے والے تمہیدہ اندھیروں کو چیرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ اس آگ سے اگر کسی نے زندگی کی پونجی کو بچانا چاہا تو بھی وہ بچا سکا تھا۔ بستیاں اور شہر آتش آگ اور خون کے سیلاب میں ڈوب کر تباہ و برباد ہو چکے تھے۔ خون کی یہ ہولی دیر تک کھیلی جاتی رہی چیخیں دیر تک سنائی دیتی رہیں۔ غنڈے ان چیخوں کا جواب قہقہوں اور نعروں سے دیتے رہے۔ جب میرے گاؤں کی معصوم لاشوں پر مٹی ڈالی جا رہی تھی تو اس وقت گاؤں کے مکھیا نے رو کر کہا تھا "آج ہمارا گاؤں مر چکا ہے۔ اب ہمارا نہ کوئی خاندان رہا اور نہ کوئی گھر۔ آج کے بعد یہاں کے لوگ کبھی نہیں ہنسیں گے۔ اب ہم میں سے کوئی کسی کا فرزند اور رشتہ دار نہیں رہا۔ اب ہم سب انتقام ہیں ...... صرف انتقام۔ گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔ پہلی موت بزدلی اور نامرادی کی موت ہے اور اگلی موت بہادری اور کامرانی کی موت۔ ماضی کی تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کے نقشہ پر ٹیڑھے لفنگے کش ہمیشہ تلوار کی نوک سے درست کئے گئے ہیں۔ ایمان انسانیت کا جوہر ہے۔ ہماری لڑائی انسانیت اور انصاف کی لڑائی ہے۔ آج ہم ان کی طرف سے لڑیں گے جو لڑ نہیں سکتے۔ اگر ایک انسان کی قربانی اس کی قوم کے گناہوں کو دھو سکتی ہے تو آج میں اپنی جان پر کھیل کر بے گناہ خلقِ خدا کا خونِ ناحق ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔" یہ کہہ کر مکھیا لٹیروں سے صف آرا ہو گیا اور مظلوموں کو بچاتا ہوا مارا گیا۔ اس کی پیروی میں انصاف اور انسانیت کے علمبردار جو تعداد میں بہت کم تھے، اس خطرناک آگ اور شعلوں کی آتشیں آغوش میں جل کر خاک ہو گئے۔ قتل و غارتگری کا بازار سرد پڑنے کے بعد میرے گھر میں ایک ایسا سکوت طاری ہو گیا تھا جو جنگ و جدل کے ہنگاموں سے بھی زیادہ بھیانک تھا۔ سارا گاؤں خانماں برباد ہو کر پتھرائی ہوئی نگاہوں سے کشتوں کے پشتے دیکھ رہا تھا۔ گو لوگوں کے سینوں میں قیامت کے ہنگامے اور زبان پر ایک نئی داستان تھی مگر اس کے کہنے کیلئے اُن کے خشک ہونٹوں پر نہ الفاظ تھے اور نہ بے نور آنکھوں میں آنسو۔ اُن کی زبان بے زبانی پر ایک ایسی خاموشی طاری تھی جو صرف محسوس کی جا سکتی تھی کہی نہ جا سکتی تھی۔ وہ گھبرا گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھتے تھے اور دبی دبی سسکیاں بھر کر خاموش ہو جاتے تھے زخمیوں کی کرب انگیز آہیں کہہ رہی تھیں کہ اس تباہ کن سیلاب کی اور لہریں اٹھیں گی جو پہلے سے بھی زیادہ تند و تیز ہوں گی ہوں گی اور دور دراز ملک کے گوشہ میں خوشحالی زندگی کی پونجی کے بچے کچھے آثار کا آخری نشان تک مٹا دیں گی۔ زمین کی خاکی چادر پر خون سے لت پت ذرّے اور آسمان کی نیلی ردا پر خونی ستارے آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے "اسٹیفورڈ کرپس کی بجائے ماؤنٹ بیٹن کی جگہ انگریز بہادر کی ہے"۔

رابرٹ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر میری نے کہا "ڈارلنگ، چلو اب سو جاؤ۔ آدھی رات سے زیادہ ہو چکی ہے۔ بیماری کی حالت میں زیادہ جاگنے سے صحت پر اور برا اثر پڑے گا۔"

رابرٹ سو رہا ہے میری سامنے جیسی ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہی ہے۔ چھریرے بدن کا یہ دیوانہ انسان جب پہلی بار اس سے ملا تھا تو اس کی کشادہ پیشانی، بڑی آنکھیں، پتلے پتلے ہونٹ اس کو بہت اچھے معلوم ہوئے تھے۔ وہ اُن نوجوانوں میں سے تھا جنہیں ہر ماحول میں دوست اور قدردان مل جاتے ہیں۔ قلت کے علاوہ وہ فضائل دیر تک پوشیدہ نہیں رہتے۔ اس کو بھی رابرٹ کی شخصیت میں ایک دوست، مفکر اور رہنما مل گیا تھا جو ماضی اور حال کا موازنہ کر کے قوم کے مستقبل کیلئے بے چین رہا کرتا تھا اور احساس کا ان حدوں تک پہنچ جاتا تھا جہاں اضطراب کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔ وہ دھوپ چھاؤں کے اس حسین ماحول میں پلا تھا جس میں نکھری ہوئی بہاریں اور قوس قزح کے رنگ تھے۔ اس کی دھڑکنیں سنجیدگی اور شوخی کا ایک ایسا سنگم تھیں جو دل کی بے پناہ گہرائیوں سے اٹھتی تھیں۔ شاہراہ حیات پر رابرٹ کے ساتھ گذارے ہوئے سادہ و رنگین لمحات جو ماضی کے دھندلکوں میں روپوش ہو چکے تھے، جیسے پھر اس کے سامنے ابھر آئے اور وہ حسرت و اضطراب کی ملی جلی گدگدی محسوس کرنے لگی۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ رابرٹ کی صحت یابی کی ایک امید افزا کرن اس کی آنکھوں میں چمکنے لگی۔ اب اس کو جمائیاں آنے لگی تھیں اور وہ بیٹھے بیٹھے اپنی کرسی پر سو گئی۔

رابرٹ کے سوتے ہی حقیقت کا بھیانک چہرہ حسین تصورات کے خوشگوار دھندلکوں میں چھپ گیا۔ اُس کے تحت الشعور نے کروٹ لی اور
کڑیوں کے جالے اور بکھرنے کے جال کی طرح گھرے ہوئے اُس کے طلسمِ خیال کے لامتناہی سلسلہ کو توڑ کر اس کو وادیٔ خواب کے اُن گنت اُن
تک پہنچا دیا، جہاں اُس کا اپنا گاؤں تھا۔ گاؤں کے ہندو مسلمان اور عیسائی سبھی سب اُس سے لپٹ گئے۔ اسکول چھوڑنے کے بعد وہ الف،
ب، ت، سے شروع ہونے والی تمام چیزوں کے نام بھول چکا تھا مگر نہیں بھولا تھا تو اس کا اپنا گاؤں۔ اُس کی گلیاں، اُس کے سیدھے سادے
لوگ اور اُن کے قہقہے اور مسکراہٹیں۔ اُس کی بھولی بھالی مائیں جن کے نوزائیدہ بچے ابھی ان کی گود اور جھولوں میں ہوتے تھے اور وہ ان
کی شادی کی تیاری شروع کر دیتی تھیں۔ اُس کی زمین کے سبزہ پر جگنوؤں کی طرح مسکراتے ہوئے پیارے پیارے خودرو پھول جن
کی زندگی صرف آفتاب کے طلوع اور غروب تک محدود تھی۔ معصومِ فطرت کی ان معصوم اور دلفریب تصاویر کو رابرٹ دیکھتا تو اُسے ایسا لگتا
جیسے وہ زبانِ حال سے کہہ رہی ہوں "ہماری مختصر زندگی انسان کیلئے ایک ابدی حقیقت کا پیغام ہے۔ ہم ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ اپنے
اُسی خالق کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں جس نے ہم کو زمین کی تاریک کوکھ سے نکال کر رنگینی، رعنائی اور مہک بخشی۔ ہم ایک دوسرے سے گلے مل کر
خوشگوار فضا اور ماحول میں پلتے بڑھتے اور پھولتے پھلتے رہیں۔ صد حیف کہ انسان نفرت، نفاق اور فساد کے بیج بو کر ہمیشہ انسانیت کے درپئے آزار
رہتا ہے۔ دنیا کے امن و امان کو درہم برہم کرکے اپنے اس خالقِ بالا و برتر کے عتاب کا نشانہ بنتا ہے جس نے اس کو اشرف المخلوقات بنا کر
دنیا کی ساری نعمتیں اس کیلئے مسخر کر دی ہیں۔ اے انسان ہمیں دیکھ اور خود کو اور اپنے فرض کو پہچان"

رابرٹ نے اپنے گھر کی کھڑکی سے باہر طائرانہ نظر ڈالی۔ اُس کی نظر اُس بوڑھے درخت پر پڑی جو ایک صدی سے گاؤں کی زندگی کا مرکز بنا
ہوا ہے۔ اُس نے دور ہی سے اُس کو جھک کر مؤدبانہ سلام کیا جو گاؤں کی بلند ترین شے تھا۔ اُس نے بچوں کو جوان اور جوانوں کو بوڑھا ہوتے دیکھا
تھا۔ بچپن کی مسکراہٹیں جوانی کی دھڑکنوں میں تبدیل ہوتے دیکھی تھیں۔ عورتیں اس کے نیچے جمع ہو کر نئی دلہنوں کا استقبال کرتی تھیں۔ چھوٹے
بڑے سب اُس کی گھنی اور ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر اگلے وقتوں کی باتیں کرتے تھے۔ بچے اس کی شاخوں پر جھولے ڈالتے تھے۔ اُس کو اُس
کے پتوں کی سرسراہٹ میں ایک دھیمی اور میٹھی راگنی محسوس ہوئی۔ لیکن جیسے ہی وہ عالمِ شعور کی طرف لوٹا تو اُس کو ایک آگ کا دھواں دکھائی دیا
جس نے اُس راگنی کو درخت کے نیچے کھیلنے والے بچوں کی چیخوں میں دبا کر رکھ دیا، جنہوں نے اُس کی چھاؤں میں ہنسنا اور مسکرانا سیکھا تھا۔
اُس کی جڑوں پر ان معصوموں کا خون بہتا ہوا نظر آیا جنھوں نے اس کو سینچا تھا۔ اس کے سایہ میں ان کی لاشیں تڑپتی نظر آئیں جو اس کی ڈالوں
پر جھولتے تھے۔ یہ سب ہی تو اس کے دوست، ساتھی، عزیز اور بزرگ تھے۔ اگر وہ متنفس ہوتا تو اس کے پتوں اور شاخوں سے ایک ایسا نغمہ
چھیڑتا جو فضائے بیکراں کو ان بے بس روحوں کی فریاد سے لبریز کر دیتا جو آج بھی اُس کے نیچے بیٹھی نہایت کرب کی حالت میں کسی قافلہ سالار کا
انتظار کر رہی ہیں۔ اب صرف اُن کے ان قہقہوں کی گونج اُس کے نیچے ہے جو ہمیشہ کیلئے خاموش ہو چکے ہیں۔ وہ بوڑھا درخت، آج بھی اپنی جگہ
جوں کا توں کھڑا ہے لیکن زندگی اس طرح ویران ہو چکی ہے، جیسے اُس کے معصوم چہرہ سے مسکراہٹیں ہمیشہ کیلئے چھین لی گئی ہوں۔ اس کی ابتدائی
زندگی کے نقوش جو گزرے ہوئے وقت کی ریت میں دب چکے تھے پھر اُبھر آئے اور اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے سوتے جاری ہو گئے۔ عین
اُسی وقت اُس کی بوڑھی ماں نے پیچھے سے آ کر اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور گلے لگا کر بولی "میرے بچے میں تیرے اضطراب اور تڑپ
کو خوب سمجھتی ہوں، لیکن کیا تو نے اُس بھیڑیے کی کہانی نہیں سنی جس کو ایک شخص نے پال پوس کر بڑا کیا۔ لوگ اُس سے ڈرنے لگے۔ وہ سب کو
اُس کے خونخوار درندہ نہ ہونے کا یقین دلاتا رہا۔ لوگ مطمئن ہو کر راتوں کو سونے لگے اور ایک رات اُس نے بے خبر سوئے ہوئے لوگوں کو
کھانا شروع کر دیا۔ انسانوں کا گوشت اس کے منہ لگا اور وہ اپنے مالک کو بھی نگل گیا، کیونکہ اُس کے مالک کا گوشت دوسرے انسانوں سے
مختلف نہ تھا۔ یہ دیکھ کر لوگ ڈر کے مارے سہم گئے۔" رابرٹ بھی سہم کر اپنی ماں سے لپٹ گیا۔ ماں نے رابرٹ کی پیشانی کو بوسہ دیا اور بولی۔
"بیٹے تو اس المناک کہانی کے بھیانک منظر کو دیکھ چکا ہے اور اس میں مضمرات نصیحت آمیز کہانی سے ڈرتا ہے۔ کیا تو نے نہیں دیکھا تھا کہ

ہر سُو دُور دُور تک بستیوں میں آگ کے شعلوں، دھوئیں کے بادلوں اور خون کی ندیوں میں بکھری ہوئی لاشیں اور ان کا سکوت جنگ و جدل کے ہنگاموں سے بھی زیادہ بھیانک تھا۔ آسمان اور اُس کے چاند ستاروں کی گردش میں ٹھہراؤ آگیا تھا۔ اپنی زندگی کی تمام پونجی لٹانے کے بعد جب بدحواس انسانوں کی ٹولیاں جگہ جگہ جمع ہو کر چھوٹے چھوٹے قافلوں کی صورت میں کسی نامعلوم منزل کی طرف رخ کرتی تھیں تو وحشت و بربریت کے جتھے اُن کو بے شمار چھوٹی چھوٹی کربلاؤں میں گھیر لیتے اور اُن کو بھیڑوں کا گلہ سمجھ کر دن دھاڑے اُن پر یلغار کرتے تھے۔ انتہائی مایوسی اور مجبوری کے عالم میں جب لرزتے اور لڑکھڑاتے انسان خود کو حفاظت کیلئے فوجیوں اور راہنماؤں کے حوالے کر دیتے تو انگریز سامراج کے یہ پِٹھو ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا کر ان کو تہ تیغ کر دیتے تھے۔"

لاش، عریانی، بے بسی اور مظلومیت کی یہ تصویر زبانِ حال سے کہہ رہی تھی: "میری طرف مت دیکھو۔ میرے قریب مت آؤ۔ دنیا کے تمام چراغ بجھا دو۔ چاند، سورج اور ستاروں سے کہہ دو کہ وہ ہمیشہ کیلئے چھپ جائیں تاکہ مجھے کوئی اس حال میں نہ دیکھ سکے کیونکہ میں انور کی ماں، رام کی بہن، اسلم کی بیٹی اور راجیش کی بیوی ہوں۔ میں وہ معصوم مسکراہٹ ہوں۔ جسے زندگی کے لبوں سے نوچ لیا گیا ہے۔ میں تمھاری عزت ہوں۔ کیا تم میری عصمت کی قسم کھا کر کہہ سکتے ہو کہ میں بہن ہوں جس نے دمشق کے ایوانوں پر لرزہ طاری کر دیا تھا۔ وہ بیٹی ہوں جس کی رگوں میں تیمور کا خون ہے اور جس کے لئے لال قلعہ تعمیر ہوا تھا، وہ جھانسی کی رانی ہوں جس نے سُورماؤں کے چھکے چھڑا دیئے تھے۔ وہ ممتاز محل جس کے لئے شاہجہاں نے تاج محل بنوا کر دنیا کو محبت کا حسین تحفہ دیا تھا۔ وہ سنجوگتا ہوں جس کو حاصل کرنے کیلئے پرتھوی راج جیسے جانباز کو میرے سوئمبر میں سر سے کفن باندھ کر آنا پڑا تھا۔ میں وہ ہوں جس نے صدیوں تک اشوک اور گوتم بدھ کے امن و آشتی کے گیت گائے تھے۔ اے قوم دیکھ میں کون ہوں۔"

لاشوں کی پتھرائی ہوئی آنکھیں قوم کے بیٹوں سے کہہ رہی تھیں: "ظالم و مظلوم کی داستان بہت پُرانی ہے۔ ابلیس نے کئی بھیس بدل کر باغِ آدم کو کئی بار نذرِ آتش کیا ہے۔ سمرقند و بخارا کو اگر چنگیز بن کر لوٹا تو بغداد کو ہلاکو بن کر مٹایا۔ لیکن وحشت و بربریت کے ہاتھوں نے انسانیت کا اس مرتبہ منہ نوچ کر انسانی تاریخ کا سب سے تاریک انقلاب برپا کیا۔ بلاشبہ یہ کارنامہ ایسا کا شاہکار رہے۔ اور جس کو دیکھ کر چنگیز اور ہلاکو کے سر بھی شرم سے جھک گئے ہیں" رابرٹ کی ماں رونے لگی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی: "میرے لال۔ تیرے بھائی کے خون کی قسم، تیری ماں کی ممتا کی قسم، تیری بہن کی عصمت کی قسم، تیری محبوبہ کی بکھری ہوئی زلفوں کی قسم۔ تیری بیٹی کی معصومیت کی قسم۔ تو بھی آج میرے سامنے قسم کھائے تو اب کبھی نہیں ڈرے گا۔ تیرے ہاتھ اب کبھی نہیں کانپیں گے۔ اب کسی کا خون رائیگاں نہیں جائیگا۔ اے شہیدوں کی روح! دعا کرو کہ میرے بچّے کے سینہ میں آگ کے انگارے بھر جائیں تاکہ وہ اُس خاک کی تقدیس کو بھول نہ جائے جس پر تمھارا خون گرا ہے۔ اے زمین و آسمان کے مالک میرے لختِ جگر کو ہمّت و طاقت دے کہ یہ وحشی درندوں سے یوم حساب کا انتظار کر سکے۔ یاد رکھ آگ انتقام کی ہوا کو جنم دیتی ہے اور اس وقت تک جلتی رہتی ہے جب تک ظلم مٹ نہیں جاتا لیکن میرے بچّے میں بھی قانونِ قدرت سے ناامید نہیں ہوں، کیوں کہ اس قانون میں عروج و زوال کی راہیں متعین ہیں۔"

نیند میں رابرٹ تڑپ کر چلاّ اٹھا "بس کرو ماں۔ بس کرو۔ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا" میری بھی چونک کر بیدار ہو گئی اور اُس کی طرف بے تحاشہ دوڑی۔ مگر میری کو وہاں بجز ایک جسم خاکی اور کچھ نہ ملا۔ اس کا رابرٹ مر چکا تھا۔

احباب و اقارب میں رابرٹ یکساں طور پر ہر دلعزیز تھا۔ کفن چہرہ سے ہٹا کر میّت آخری دیدار کے لئے رکھی ہوئی ہے۔ اس کی کشادہ پیشانی پر شکنیں پڑی ہوئی ہیں جیسے انتہائی کرب کے عالم میں گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہو۔ اُس کے سیدھے ہاتھ کی ایک انگلی اُس کے ہونٹوں پہ آکر ٹھہر گئی ہے، جیسے اشارہ سے سب کو خاموش ہونے کیلئے کہہ رہا ہے کہ ذرا اُس کی نیند خراب ہو جائے کیونکہ وہ۔ ؎

"ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے"

رابرٹ کے بچپن کا دوست اور شاعر شیدا اُس کی نعش کے پاس کھڑا زار و قطار رو رہا ہے۔ اُس کی نظریں اپنے مرحوم دوست کے بے داغ چہرہ اور لبوں پر ٹھہری ہوئی انگلی پر جمی ہوئی ہیں۔ اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اپنے خواب سے بیدار ہو کر کہہ رہا ہے "میرے اچھے شاعر! جب غیر ملکی سامراج نے تہذیب و تمدن کے احیاء کی بنیاد نفرت اور نفاق پر رکھ کر صوبوں کی تقسیم کو وحدتِ ملی کے اندر جذب کرنے کی بجائے صوبائی حد بندیوں سے ایک صوبہ کو دوسرے صوبہ سے اجنبی بنا دیا اور جب ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کی قرارداد پیش کی گئی، کیا اُس وقت تم نے تمہیں خبردار نہیں کیا تھا کہ ہم سب ایک آتش فشاں پہاڑ کے دہانہ پر کھڑے ہیں۔ اسی لئے شہیدان قوم کے خون سے لکھ کر ایک نئی روح پھونک دو تاکہ قوم ان زہریلے عناصر سے ہمیشہ چوکنا رہے، جو زہر آلود خنجر کو پھولوں میں چھپا کر لانے کی قائل ہیں۔ کاش تم نے قوم کو یہ بتا دیا ہوتا کہ اجتماعی آلام و مصائب کا سامنا کرنے کیلئے اجتماعی عمل، اجتماعی جد و جہد، اجتماعی شعور، اجتماعی فکر اور اجتماعی کردار درکار ہوتے ہیں، جو کبھی رائیگاں نہیں جاتے اور ان کو حاصل کرنے کیلئے مزدوروں اور کسانوں کے دلوں میں اجتماعی حیات کا جوش اور ولولہ زندہ رکھنا ضروری ہے۔ عوام کو مجاہدانہ کردار اور سیرت کے سانچے میں ڈھالنے کی ضرورت ہے۔ تم نے "ادب برائے قوم" اور "ادب برائے زندگی" کو نظر انداز کیا۔ آلام و مصائب کی آندھیوں میں گھری ہوئی قوم کو ذہنی انتشار پھیلانے، زلفوں کے پیچ و خم، گل و بلبل کی داستانوں اور اخلاقی بے راہ روی میں گھرے ہوئے شاعر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ دن یاد کرو جب انگریز لال قلعہ میں داخل ہو رہے تھے اور دہلی کے شعراء کی محفلوں میں کوچۂ جاناں کی شوخ جلیوں کا رونا رویا جا رہا تھا۔ شیدا! کاش تم نے بھی قوم کو میٹھے اور سہانے نغمے سنانے کی بجائے زندگی کے ساز پر تلخیوں کے سُر چھیڑ کے جھنجھوڑ دیا ہوتا کہ وہ افق پر تاریک گھٹائیں چھانے سے پہلے اپنے مکانوں اور کھیتوں کی مرمت کر لیتی۔ جو دریا کھیتیاں سیراب نہیں کرتا، ریگستان اس کو سکھا دیتا ہے اور جس طاقت کو بروقت قوم کی تعمیر کے لئے بروئے کار نہیں لایا جاتا وہ وقت گذرنے پر تخریب کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ یہ نظامِ قدرت ہے پس یہ تباہی اور بربادی بلاوجہ تھی۔

"میری یہ باتیں شاید تم کو ایک آنکھ نہ بھائیں کیونکہ یہ بڑی تلخ ہیں، لیکن میرے اچھے شاعر میں تو صرف آنا جانتا ہوں کہ تمہارے قلم میں جادو ہے۔ اور تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ میری زندگی کے تلخ ترین لمحات وہ ہوتے تھے جب میں ہوش میں ہوا کرتا تھا۔ اب اس بیہوشی کے عالم میں بھی جسم اور روح کے درمیان اُس عارضی خلا میں پہنچ گیا ہوں جس میں وہ رعنائیاں اور رنگینیاں رقص کر رہی ہیں جن کا احاطہ تمہارا شاعرانہ تصور نہیں کر سکتا۔ میری روح زندگی کی ان بلندیوں اور گہرائیوں سے آشنا ہو رہی ہے جو تمہارے شاعرانہ دل و دماغ میں نہیں سما سکتیں۔ اس خلا کی تمام وسعتیں سمٹ کر میرے مرجھائے ہوئے لفظوں میں سمو گئی ہیں۔

"میرا گاؤں ..... میری مسکراہٹ"

"بہت دیر ہو چکی ہے جلدی کرو۔ میت کو دیر تک رکھنا مناسب نہیں" کسی نے مجمع میں سے چلا کر کہا۔ شیدا چونک پڑا۔ اُس کو نہایت شدت کے ساتھ اپنی تنہائی اور بے بسی کا احساس ہونے لگا۔ "کیا واقعی رابرٹ مر چکا ہے" لیکن دوسرے ہی لمحہ رابرٹ کے دلائے ہوئے اجتماعی ذمہ داری کے شدید احساس نے اُس کی مایوسی کو اُمنگوں میں بدل دیا۔ اُس نے آنسو پونچھ ڈالے اور بے ساختہ اُس کے ہونٹ تھرا اُٹھے۔ "رابرٹ مرا نہیں ہے۔ وہ زندہ ہے۔ اُس کا کردار ہمیشہ ہمارے لئے مشعلِ راہ بن کر راستہ دکھاتا رہے گا"

رابرٹ کو منوں مٹی کے نیچے دبا کر لوگوں نے اُس کے ساتھ اپنی زندگی بھر کی محبت کا صلہ دیا اور پھر ایک ایک کر کے سب رخصت ہو گئے لیکن شیدا ابھی تک تنہا اُس کی تربت پر کھڑا آنسو بہا رہا ہے۔ اچانک اُس کو ایسا محسوس ہوا، جیسے رابرٹ کی تربت سے ایک آواز آئی ہو اس سے کہہ رہی ہے "میری غم گسار! میری چارہ ساز! مت رو۔ میں آج نہیں مرا ہوں۔ میں اُسی روز مر چکا تھا جس روز میرا گاؤں مرا تھا اور جس روز میرے لبوں سے میری آخری مسکراہٹ تک نوچ لی گئی تھی۔ میں ایک چلتی پھرتی لاش تھا ..... صرف ایک چلتی پھرتی لاش۔ تمہارا شریکِ حیات ہوتے ہوئے بھی میں نے تمہارے ساتھ بڑی ناانصافی کی ہے۔ میں جانتا تھا کہ تم کس شدت کے

(بقیہ صفحہ ۶۳ پر دیکھئے)

شاعر بمبئی

ضیا فتح آبادی

کیا لیے پھرتا ہے صحرا میں جنوں
کیوں نہ میں دیوار سے سر پھوڑ لوں

نا شناسائی کا کیا اُن سے گلہ
مَیں تو خود نا آشنا اپنے سے ہوں

برف زاروں میں رہو یخ بستہ تم
مَیں بھی تپتی دھوپ میں جلتا رہوں

رازِ تکمیلِ محبت ہے یہی
تُو مجھے اور مَیں تجھے دیکھا کروں

اے مری منزل! ذرا آگے تو بڑھ
اور کتنی دُور مَیں تنہا چلوں

دیکھ تو کھڑکی سے باہر جھانک کر
کب سے تیرے در پہ ہول میں منتظر ہوں

صُبح کے آثار پیدا ہیں ضیا
ٹوٹنے کو اب ہے راتوں کا فسوں

حسن کمال

ہر اک فضا سے ہر اک شے سے جو خفا سا لگے
نہ جانے کیوں مجھے وہ آدمی بھلا سا لگے

مزاج پارہ، دلِ آوارہ، شوق بنجارہ
کوئی بھی ایسا ملے مجھ کو آشنا سا لگے

اُسے جو دُور سے دیکھوں تو میرا اپنا ہے
اُسے قریب سے دیکھوں تو دوسرا سا لگے

ہر ایک بات کو سُن لے مگر خموش رہے
مجھے تو یار وہی اپنا ہمنوا سا لگے

وہ میرا کون ہے یہ تو خبر نہیں لیکن
اُسے بُرا کہے کوئی، مجھے بُرا سا لگے

مَیں آئینے میں اُسے کب سے ڈھونڈتا ہوں حسن!
جو مجھ میں ہے تو ہے مجھ سے پہ چھپا سا لگے

ڈاکٹر عبدالستار دلوی

اُردو شاعری کا جذبۂ وطن دوستی

عورت، شراب، وطن اور مذہب شاعری کے اہم ترین موضوع ہیں۔ دُنیا کی مختلف ادبیات کے مُطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اِن ہی چار موضوعات نے شاعری کو محیط رکھا۔ چنانچہ عربی میں ابونواس اور فارسی میں حافظ و خیام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ جہاں تک نسوانی حسن سے متاثر ہونے کا سوال ہے، یہ عین فطرت ہے۔ نسوانی حسن گویا ادبیات کے لئے سنگار (COSMETIC) کا حکم رکھتا ہے۔ اس نے ادبیات کو سحر بنا دیا ہے۔ اور زندگی کو جلال و جمال کی ساری کیفیتوں سے آراستہ کر دیا ہے۔ اس کے معنی یہ بھی نہیں ہیں کہ شراب اور عورت کے بغیر شاعری نہیں ہو سکتی۔ آج کا ادب اِس بات کا گواہ ہے کہ شراب اور عورت سے دور ہو کر بھی احساسات نے خیالوں کے فانوس جلائے ہیں۔

اُردو شاعری بھی اپنے موضوع کے اعتبار سے ادبیاتِ عالم سے ہم آہنگ ہے۔ چنانچہ خمریات کے سلسلے میں قلی قطب شاہ سے لے کر فراق و جگر تک لازماً یہ موضوع چلا آیا ہے۔ اِس سلسلے میں غالب کی خمریات کافی اہم ہیں۔ اس لئے بھی کہ وہ مشاہدۂ حق کی گفتگو کے لئے بادہ و ساغر کے بغیر آگے نہیں بڑھتا۔ اِس کی شراب شرابِ معرفت نہیں ہے بلکہ خالص پرتگالی ہے جس سے چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ وہ شراب یک گونہ بے خودی کے لئے پیتا ہے، اسے بہشت بھی اس لئے عزیز ہے کہ وہاں بادۂ گلفام مشکبو ملے گی۔ اس کے لئے ہوا میں بھی شراب کی تاثیر موجود ہے۔ اس کی بادیہ پیمائی بھی بادہ نوشی کی غرض سے ہے اور اسی عذرِ مستی کے سہارے محبوب کو چھیڑنے کی جرأت کرتا ہے۔ جہاں تک عورت کا سوال ہے شاعر پر شراب کی مستی سے کہیں زیادہ عورت کی ہستی کا نشہ و خمار چھایا ہوا ہے۔ انیسویں صدی کے نصف اول تک عورت ہماری شاعری میں پسِ پردہ آنکھ مچولی کھیلتی نظر آتی ہے۔ جس نے بعد میں موتی، فاطمہ، حجاب کا روپ دھارا اور بیسویں صدی کے وسط تک سلمیٰ، عذرا، لیلیٰ، نورا اور مریم کی صورت میں جلوہ گر ہوئی۔

سلمیٰ، عذرا، اور نورا جیسی مہ طلعتوں کے بعد لیلیٰ وطن کے جاں نثار بھی اُردو نے شروع ہی سے پیدا کئے۔ قبل اس کے کہ اِن عاشقوں کی فہرست گنائی جائے اور ان کی شدتِ محبت بیان کی جائے، یہ ضروری ہے کہ وطن کے تصور کو واضح کیا جائے اور دیکھا جائے کہ اِس تصورِ وطن میں کہاں تک ابدیت اور گہرائی ہے اور کون سا مقام ہے جہاں پہنچنے کے بعد تصورات متزلزل ہونے لگتی ہیں، اور پھر یہ دیکھا جائے کہ اُردو شاعری میں وطن اور حُبِ وطن کا تصور کس حد تک کارفرما ہے۔

عام طور سے وطن جغرافیائی حدود سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور اس کی تشکیل اور بناوٹ میں پہاڑ، دریا اور سمندر کام کرتے ہیں لیکن پروفیسر احتشام حسین "وطن ریاست کا دوسرا نام ہے، لیکن ریاست کیا ہے؟ کوئی اسے مشیتِ ایزدی بتاتا ہے جو خود بخود کن فیکون کا روپ دھار کر آجاتی ہے۔ کوئی اسے سماجی معاہدہ تصور کرتا ہے اور کوئی ایک مقدس ترین ادارے کی صورت میں اس کی تعبیر و تشریح

کرتا ہے۔" وطن اور حبِ وطن کی اصطلاح بڑی حد تک غیر مبہم اصطلاح ہے۔ میں بذاتِ خود اسے ایک اعتقاد سمجھتا ہوں، ایک
ایسا جاندار اعتقاد کہ جس کی بنیادوں پر ہر ذرۂ خاک ایک دیوتا کی صورت میں ہم سے خراجِ تحسین حاصل کرتا ہے۔

وطن کا دوسرا تصور سیاسی تصور ہے۔ یہ جغرافیائی تصور کے مقابلے میں زیادہ واضح ہے۔ تاہم اسی کے ساتھ مہلک بھی۔ واضح اس
لحاظ سے کہ سیاست نے اسے وحدت اور اکائی عطا کی۔ اور مہلک اس طرح کہ اقبال کے لفظوں میں اقوام عالم میں رقابت اسی سے در آتی
ہے اور کمزور کا گھر بھی اسی سے غارت ہوتا ہے۔" شاید یہی وجہ ہے کہ اقبال نے بعد میں جس تصورِ وطن کی وکالت کی ہے اس کی بنیاد مذہب
ایک مشترکہ تہذیب اور لسانی وحدت پر قائم ہے۔ گو اقبال کا یہ تصورِ وطن کافی بحث طلب ہے، تاہم یہاں اس کا موقع نہیں۔ وطن اور حب الوطنی
کی صراحت سے پہلے لفظ "قوم" کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ "قوم" ان افراد سے عبارت ہے جو ایک جغرافیائی وحدت میں سکونت پذیر ہوتے
ہیں۔ اس لحاظ سے وطن اور قوم کے ڈانڈے بڑی حد تک ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وطن اور قوم کے تصور کو ایک دوسرے
سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ جب تک ہم کسی ملک میں بسنے والوں تصور نہ کریں۔ صرف جغرافیائی حد بندی سے وطن کا تصور قائم نہیں
رہ سکتا۔ وطن اور قوم لازم و ملزوم ہیں۔ جب ہم وطن کا ذکر کرتے ہیں تو اس کے ساتھ اس کی جغرافیائی وحدت کی جزئیات، مثلاً وہاں کے
بسنے والے، دریا، پہاڑ، جنگل، موسم، پھل پھول، تہذیبی عوامل، رسم و رواج یہاں تک کہ مختلف مذاہب اور نظریات اور دوسری چیزیں آ
جاتی ہیں۔ جن کا کلی تصور کرنا بھی بہت مشکل ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ سیاسی تصورِ وطن جارحانہ عناصر سے مرکب ہے اور ایک خاص انداز
میں بربریت کی نمائندگی کرتا ہے۔ جغرافیائی تصورِ وطن کی بنیادیں بھی انسانی ذہن و شعور نے مذہب اور سیاست کے سہارے ڈھیلی کر دی ہیں۔
اس میں پائیداری کے عناصر کم دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں جب ہم موجودہ سیاست پر نظر ڈالتے ہیں تو کئی مثالیں جواز کی
صورت میں ہمارے سامنے آ جاتی ہیں۔ ابھی ماضی قریب کی بات ہے کہ مصری و شامی، مصری و شامی نہیں بلکہ عرب قوم بن گئے تھے اور مصر و
شام دو [illegible] متحدہ جمہوریہ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اسرائیل جس کا وجود ہی نہ تھا، بزورِ سیاست مشرقِ وسطیٰ کے سیاسی افق پر سیاسی
حقیقت کے طور پر ایسا طلوع ہوا کہ بظاہر اس کے غروب کے آثار دور دور تک دکھائی نہیں دیتے۔ اسی طرح ہندوستان کی تقسیم بھی دو سیاسی
وحدتوں، دو ملکوں اور دو قوموں کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس ساری بحث کا ماحصل یہ ہے کہ تصورِ وطن سیاسی و جغرافیائی
دونوں حیثیتوں سے اپنا وجود کھو چکا ہے اور صرف ایک مجرد نظریئے کی حیثیت رکھتا ہے۔ لہٰذا مختصراً وطن ہماری جائے پیدائش سے عبارت
ہے جس کی زمین نے دھان اگا کر ہمیں پالا پوسا، اور بادلوں نے برس کر ہماری پیاس بجھائی۔ جس سرزمین پر ہم نے سانس لینا سیکھا اور جس ماحول
نے ہمارے شعور کو بیدار کیا۔ اور اگر اس لحاظ سے ہم غور کریں تو وطن اور حب الوطنی ایک ناگزیر حقیقت ہے اور حب الوطنی انسانی زندگی کا ایک جزوِ لاینفک
ہے۔ اس لحاظ سے اردو شاعر ابتدا ہی سے اس جذبے سے سرشار دکھائی دیتے ہیں اور ہندوستان کی تاریخ کے ارتقا کے ہر موڑ پر انہوں نے ہندوستانی
وطنیت اور معاشرے کی نمائندگی کی ہے۔ دکنی ادب اس کا بیّن ثبوت ہے جہاں ہمیں شدید قسم کی ہندوستانیت کے عناصر ملتے ہیں اور جو اپنی
ارتقائی صورت میں اردو شعر و ادب میں وطنیت کی پہلی مثالیں ہیں۔ اس دور کی مثنویوں میں یہاں کی تہذیب، آب و ہوا، رہن سہن اور مقامی
اشیاء کا جو ذکر ملتا ہے وہ ان شاعروں کے جذبۂ حب الوطنی کے ساتھ شعر و ادب میں ہندوستانیت کی بھرپور نمائندگی بھی کرتا ہے۔ حب الوطنی کے لئے
لفظ "وطن" کا ذکر ضروری نہیں بلکہ وطن کی تہذیبی ترقی کا ذکر اور ماحول و معاشرت کا ادب میں استعمال بھی حبِ وطن پر دلالت کرتا ہے۔ اردو
ادب از ابتدا تا انتہا ملکی عناصر سے بھرا ہوا ہے۔ ہولی، دیوالی، بسنت، پدمنی، رام اور لکشمن، بدھ اور نانک، بھرتری ہری اور سوامی رام
تیرتھ پر نظمیں اردو شاعروں کی ہندوستانی تہذیب اور روایات سے دلچسپی اور اپنائیت کا نتیجہ ہیں۔ اور اس سے ان کی حب الوطنی، اپنے ملک
کی تاریخی و تہذیبی روایات سے گہری وابستگی اور ان کا اعترافِ عظمت ان کی حب الوطنی کا ایک پہلو ہے، اور اس لحاظ سے ہندوستان
کے ادبیات میں اردو شعر و ادب ملکی اور سیکولر ادب کا سب سے بڑا نمائندہ ادب ہے۔

شاعر بھی

اردو شعر وادب کی شمالی ہند میں تدوین و ترقی کے دور میں بھی اردو کے فنکار جذباتی طور پر اپنے ملک کے پیار اور پریم میں یکسر ڈوبے رہے۔ چنانچہ اس جذبۂ وطن پرستی کو سمجھنے کے لئے ہندوستان کی تاریخ کے اس دور سے مدد لینا ضروری ہے جو عالمگیر کی وفات کے بعد شروع ہوتا ہے۔ عالمگیر کی وفات کے بعد شاہی خاندان کے مختلف افراد قلیل مدت میں کبھی تخت پر اور کبھی تختہ پر نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کی حیثیت کٹھ پتلیوں کی سی تھی۔ جو دربار کے بارسوخ امیروں اور بادشاہوں کے منہ چڑھے غلاموں کے اشاروں پر رقص کرتے تھے۔ یہاں تک اس بازی گری پر مرہٹوں کی بغاوتیں اور جاٹ سرداروں کی سرکشیاں ہی کیا نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کی قتل و غارتگری بھی اثرانداز نہ ہو سکی۔ آہستہ آہستہ دہلی کی مرکزیت کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ اور مغل حکومت متعدد خود مختار ریاستوں میں بٹ گئی۔ چنانچہ دلی جو ہندوستان کا دل اور "فلک نشیں و ملائک جناب" رہی تھی۔ بہت بری طرح اس معاشی وسیاسی انقلاب کا شکار ہوئی۔ ہندوستانِ بے نظیر کے اس سرمایہ اور ہندوستان کے تاج کی حیثیت رکھنے والے شہر دلی سے جو خلوص اور لگاؤ دہلی کے شاعروں کو تھا اُسے شعر کے پیکر میں ڈھال کر شہر آشوب کے روپ میں محفوظ کر لیا۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے سودا کا قصیدہ شہر آشوب، مخمس شہر آشوب، قصیدہ "تضحیک روزگار" میر کا درد حال لشکر اور حاتم کا شہر آشوب یہ تمام اس زمانے کی اجڑی ہوئی دلی کی درد بھری داستانیں ہیں۔ یہ لازمی نتیجہ ہے۔ جذبۂ حب الوطنی کا جو ہمارے شاعروں کے دلوں میں فطرتاً ودیعت کیا گیا تھا۔ نادر شاہ اور احمد شاہ کے حملوں کے بعد آفتوں اور خون و غارت گری سے نجات ملی تو انگریزوں اور بہادر شاہ کی باہمی کوششوں سے ایک مشترکہ حکومت بنانے کی سعی کی گئی۔ لیکن اس کو ابھی عملی جامہ بھی نہیں پہنایا گیا تھا کہ ۱۸۵۷ء کا دلخراش سانحہ پیش آیا جو ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی یا انقلاب ۱۸۵۷ء کے نام سے مشہور ہے۔ اب کے دہلی پھر برباد ہوئی، اس کی گلیاں خون سے رنگی گئیں۔ جس سے متاثر ہو کر ظفر، ذوق، آزردہ، شیفتہ، ظہیر، حالی، یہاں تک کہ داغ جیسا مستِ عیش شاعر بھی دلی کا مرثیہ لکھنے پر مجبور ہو گیا ؎

فلک جناب و ملائک جناب تھی دلی — بہشت خلد بریں انتخاب تھی دلی
جواب کاہے کو تھا لاجواب تھی دلی — مگر خیال سے دیکھو تو خواب تھی دلی
پڑی ہیں آنکھیں وہاں جو جگہ تھی نرگس کی
خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی

دلی کی بربادی کا یہ نوحہ شاعر کی وطن دوستی اور اس کی حب الوطنی کا ایک عکس ہے جو صرف ایک مخصوص شہر ہی کا مرثیہ نہیں بلکہ سارے ہندوستان کی تباہی و بربادی کا مرثیہ ہے۔

۱۸۵۷ء کا یہ انقلاب دراصل دو تہذیبوں کی ایک جنگ تھی۔ اور جدید قومیت و وطنیت کے سیاسی تصور کا نقش اولین۔ اس انقلاب کے بعد انگریزوں کے قدم ہندوستان کی سرزمین میں پہلے سے زیادہ مضبوطی سے جم گئے۔ سارا ملک انگریزوں کا دست نگر تھا۔ ہندوستانیوں کے وہ حوصلے جو جنگ پلاسی کے بعد پست ہو گئے تھے۔ انہیں اس انقلاب نے بیدار کر دیا تھا اور آزادی کی کوششیں شروع ہونے لگیں جو ایک منظم صورت میں ۱۸۸۵ء میں (INDIAN NATIONAL CONGRESS) کی صورت میں ملک کے سامنے آجاتی ہے۔ آزادی کا یہ جذبہ بلاتفریق مذہب و ملت اس قدر زور پکڑتا گیا کہ اس کا اثر ہندوستانی ادبیات پر پڑنا ناگزیر ہو گیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں اردو شاعروں نے بھی اپنے طور پر وطن دوستی کے گیت گائے اور اپنے اشعار کے ذریعہ عوام میں نئی زندگی اور جوش وخروش عطا کرنے کی کوشش کی۔ اب اردو شاعری اپنی پرانی اور روایتی روش سے ہٹ کر جدیدیت کی طرف راغب تھی۔ چنانچہ اس سلسلے میں آزاد اور حالی کا نام سرفہرست دکھائی دیتا ہے۔ آزاد اور حالی ہمارے ادب میں جدید شاعری کے امام ہی نہیں بلکہ وطنی شاعری اور وطن کے گیت گانے والوں میں پیش پیش

نظر آتے ہیں چنانچہ اِس سلسلے میں حالی اور آزاد نے حُبِّ وطن کے عنوان سے نظمیں لکھیں اور ان میں مادرِ وطن کی اہمیت کے طرف اشارے کئے ہیں اور بہشت پر وطن کی مُشتِ خاک کو ترجیح دی ہے ؎

اے وطن، اے مرے بہشتِ بریں — کیا ہوئے تیرے آسمان و زمین
رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا — وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا
سچ بتا تو سبھی کو بھاتا ہے! — یا کہ مجھ سے ہی تیرا ناتا ہے
جنّ و انسان کی حیات ہے تو — مُرغ و ماہی کی کائنات ہے تو
ہے نباتات کی نمو تجھ سے — روکھ تجھ بن ہرے نہیں ہوتے
سب کو ہوتا ہے تجھ سے نشو و نما — سب کو بھاتی ہے تیری آب و ہوا
تیری اِک مُشتِ خاک کے بدلے — لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے
جان جب تک نہ ہو وطن سے جُدا — کوئی دشمن نہ ہو وطن سے جُدا

اِس مثنوی میں حالی نے صرف حبّ الوطنی کے ہی گیت نہیں گائے ہیں۔ بلکہ اِس کے شاندار ماضی کی پُرشکوہ مستقبل میں تلاش کی ہے۔ نادر شاہ کی قتل و غارت گری پر آنسو بہائے ہیں۔ اور شائستہ قوم مغرب کی فتح پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے اِتفاق و اتحاد اور علم و ہنر کی ترویج پر زور دے کر ہندوستان کیلئے ایک خوبصورت لائحۂ عمل پیش کیا ہے۔

حالی کی طرح آزاد، پنڈت کیفی اور سرور جہاں آبادی نے بھی حُبِّ وطن پر مختلف عنوانوں کے تحت نظمیں لکھی ہیں۔ چنانچہ آزاد نے بھی حبِّ وطن کے عنوان سے جذبۂ حبّ الوطنی کی کمیابی کا ماتم کیا ہے۔ اور ہند کے حبّ الوطنی کے جذبہ سے معمور ہونے کی دُعائیں مانگی ہیں۔ آزاد کی یہ نظم حبّ الوطنی کے ساتھ نادر تشبیہات و استعارات و تراکیب اور اثر آفرینی کی نہایت ہی کامیاب مثال ہے ؎

اے آفتابِ حُبِّ وطن تو کدھر ہے آج — تو ہے کدھر کہ کچھ نہیں آتا نظر ہے آج
تجھ بن جہاں ہے آنکھوں میں اندھیر ہو رہا — اور انتظامِ دل زبر و زیر ہو رہا
ٹھنڈے ہیں کیوں دلوں میں ترے جوش ہو گئے — کیوں سب بجھے چراغ ہیں خاموش ہو گئے
حُبِّ وطن کی جنس کا ہے قحط سال کیوں — حیراں ہوں آجکل ہے پڑا اِس کا کال کیوں
کچھ ہو گیا زمانے کا اُلٹا چلن یہاں — حُبِّ وطن کے بدلے ہے بُغض الوطن یہاں
بن تیرے ملکِ ہند کے گھر بے چراغ ہیں — جلتے عوض چراغوں کے سینہ میں داغ ہیں

آزاد اور حالی ہی کے زمانے میں اسمٰعیل میرٹھی اور اکبر الٰہ آبادی نے اپنے اپنے انداز میں کبھی صبح کی آمد کا گیت گا کر اور کبھی قلعہ اکبرآباد کی شان میں قصیدہ خواں ہو کر حبّ الوطنی کے جذبے کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی۔ اِس سلسلے میں وطن دوستی کے بھرپور عناصر اکبر کی شاعری میں زیادہ اُبھرے ہوئے ملتے ہیں۔ اکبر کی مشرقیت اور مغرب سے خدا واسطے کا بَیر سستی جذباتیت ہی سہی، لیکن ہماری وطنی شاعری میں اِس کی بڑی اہمیت ہے۔ وطن سے محبت، اُس کے ماضی سے لگاؤ، اُس کا آسمان و زمین، ہوائیں اور لہلہاتے کھیت اور گنگناتے ہوئے دریا ہمارے شاعروں کے دِلوں میں راہ پا چکے تھے

۱۹۱۴ء یعنی پہلی جنگِ عظیم کے شروع ہونے کے بعد جب ہندوستان میں سیاسی تحریکوں کا زور شروع ہوا تو اس کے ساتھ ہی ساتھ حبّ الوطنی اور آزادی کے نعرے اور زیادہ شدید پیمانے پر شروع ہوئے۔ ۱۹۱۴ء سے لے کر ترقی پسند تحریک کے شروع ہونے تک ہر شاعر کے یہاں یہ جذبہ سیلاب کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ جس کی وجہ وہ اُمیدیں تھیں جو دورانِ جنگ میں ہم نے اپنے حاکموں

سے وابستہ کر رکھی تھیں۔ اور جن اُمیدوں کے صلہ میں رولٹ ایکٹ، مارشل لا اور جلیان والا باغ جیسی دل خراش اور بہیمانہ ساعتوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ لیکن انہیں دلخراش اور بہیمانہ حادثات نے ہندوستانی قوم میں جدوجہد اور جوش و خروش کی ایک نئی لہر دوڑادی۔ ترکِ موالات، رولٹ ایکٹ، مارشل لا، جنرل ڈائر اور اصلاحات نے انہیں ایک نئی واقعیت و صداقت دیدی۔ چکبست حسرت، اور مولانا محمد علی نے انہیں جس طرح برتا ہے۔ کسی اور نے نہیں برتا۔ یہاں حُسن کے تصور میں آزادی کی دیوی کا رُوپ اور عشق کی آن بان میں جہادِ آزادی کے سپاہی کی آن بان بڑی دلکشی سے مل جُل گئی ہے۔ وطن اور قوم کی خاطر عوام میں ایک نئی رُوح پھونکنے کے لئے اس قسم کی کوشش بڑی مؤثر اور پُرکشش ثابت ہوئی۔ اسی کی وجہ سے بچوّں، جوانوں اور بوڑھوں کے دلوں میں وطن کی محبت اور آزادی کا جذبہ اور راسخ ہوگیا۔ چنانچہ اس دَور میں چکبست، سرور جہاں آبادی اور کیفی کی شاعری اپنی اثر آفرینی، شاعرانہ خصوصیات حب الوطنی کے عناصر سے مملو نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں چکبست کی صبحِ وطن ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ چکبست کے یہاں وطن کی محبت ہی اُن کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ چنانچہ صبحِ وطن کے پہلے حصّے میں وطن اور حبِّ وطن سے متعلق متعدد نظمیں مل جاتی ہیں جو اپنی سلاست روانی کے اعتبار سے بھی کامیاب ترین مُرقع ہیں۔ اُردو شاعری حبِّ وطن سے متعلق جس سادگی و پُرکاری کے ساتھ چکبست نے نغمے الاپے ہیں اُن میں "ہمارا وطن دل سے پیارا وطن"، اور "وطن کو ہم، وطن ہم کو مبارک"، جیسے دِلآویز نغمے ہیں جو فلسفیانہ رنگِ سخن سے علیحدہ ہونے کی وجہ سے قدسی الاصل اور دل سے نکلی ہوئی بات معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح اپنی مشہور و معروف نظم "وطن کی عظمت" میں اس الفت کے چمن کو جس خلوص و محبّت سے یاد کیا ہے وہ چکبست کا اپنا کارنامہ ہے۔ نظم پڑھتے وقت یہ معلوم ہوتا ہے۔ گویا چکبست کے دل و دماغ میں حب الوطنی کا ایک سیلاب ہے۔ جو بلا روک ٹوک آگے بڑھتا جا رہا ہے اور ساری زمین کو اس جذبۂ حبّ الوطنی سے سیراب کرنے والا ہے۔ زورِ بیان، مبالغہ، تلمیحوں کا استعمال، دلفریب اور جاذبِ نظر تراکیب اس نظم کی نمایاں خصوصیات ہیں ؎

اس خاکِ دل نشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری | چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آب یاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری | چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری

شمعِ ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہرِ دانش اس وادیِ کہن میں

شیدائے بوستاں کو سرو و چمن مبارک | رنگیں طبیعتوں کو رنگِ سخن مبارک
بلبل کو گُل مبارک، گُل کو چمن مبارک | ہم بےکسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک

غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اُٹھے ہیں اس خاک میں مِلیں گے

چکبست ہی کی طرح سرور اور پنڈت کیفی نے بھی وطن کی محبت سے سرشار ہو کر اس کی زُلفیں سنوار دی ہیں۔ چنانچہ سرور جہاں آبادی کی نظم موضوع کے لحاظ سے چکبست کی عظمتِ وطن سے بہت ہی قریب ہے جس میں وہ وطن کی خاک کو سُرمۂ نورِ نظر اور سرمایۂ آسائشِ جان و جگر کہکر اس کے پھولوں، پھلوں، علم و ہنر اور تہذیب و تمدن کا دنیا کی دوسری تہذیب یافتہ اقوام سے مقابلہ کرتے ہیں۔ سرور کی "خاکِ وطن" اور چکبست کی "وطن کی عظمت" کا اگر ایک دوسرے سے مقابلہ کیا جائے تو معنی، الفاظ اور تلمیحات کے استعمال میں بہت ہی کم فرق دِکھائی دیتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک نظم دوسری نظم سے متاثر ہوکر لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ سرور کی دوسری نظم "پھولوں کا کُنج" بھی وطن دوستی کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ چند اشعار مثالاً پیش کرتا ہوں ؎

حُبِّ وطن کا مل کر سب ایک راگ گائیں — لہجہ جُدا ہو گرچہ مُرغانِ نغمہ خواں کا
ایک ایک لفظ میں ہو تاثیر بُوئے اُلفت — انداز دل نشیں ہو ایک ایک داستاں کا
موسم ہو جوشِ گل کا اور دن بہار کے ہوں — عالم عجیب دلکش ہو اپنے گلستاں کا
مل جل کے ہم ترانے حُبّ وطن کے گائیں
بُلبل ہیں جس چمن کے گیت اُس چمن کے گائیں

اُس دور کے نظم نگاروں میں پنڈت کیفی نے بھی حبّ وطن سے متعلق نظمیں لکھیں۔ جن میں "صبحِ وطن" اور "بھارت ورش" جو حالی کی مسدّس سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

اُردو میں اقبال کے یہاں حُبّ الوطنی کے عناصر زیادہ چھچے تُلے انداز میں اور منظّم صورت میں ظہور پذیر ہوئے۔ اُنھوں نے اپنی شاعری کے پہلے دور میں حبّ الوطنی سے سرشار متعدد نظمیں لکھیں جو اردو ادب میں مُرقّعوں کی صورت میں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ اقبال نے ان نظموں میں مادرِ وطن کی محبّت کے جو گیت الاپے ہیں وہ اُردو شاعری کے حبّ الوطنی سرمایہ پر بھاری ہیں۔ لیکن یہاں یہ بات واضح کر دینی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ وہ زمانے کی رفتار کے ساتھ اپنے تصوّرِ وطن میں وسعت کی جستجو کرتے ہوئے عالمگیر اسلام کا خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ اقبال کے اس تصوّر پر بعض حلقوں سے فرقہ وارانہ ذہنیت کے نعرے بلند کئے گئے، لیکن پھر بھی اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اقبال کے خیالات میں اس لوچ کی وجہ وہ جارحانہ وطنیت تھی جو کمزور کا گھر غارت کر دیتی ہے، بہر حال اس سے قطع نظر کہ انھوں نے ملّی شاعری کیوں شروع کی اور اس سے اُن کی وطنی شاعری کی عظمت اور بلندی میں کیا فرق آ جاتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ وہ وطن دوست شاعر کی حیثیت سے ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ چنانچہ اقبال کی وطن دوستی ہی کے سلسلے میں ؎

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا
مُسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

کے بعد جس کے سہارے اقبال پر فرقہ پسندی اور وطن کے ساتھ غیر ہمدردانہ رویّہ کے الزام کے بعد جب ہم اُن کی مشہور فارسی مثنوی جاوید نامہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں اقبال کی حبّ الوطنی اور ہندوستان کی محبّت کا احساس جلوہ گر پاتے ہیں۔ یہاں پر وہ صادق و جعفر جیسے غدّاروں کو ننگِ ملّت، ننگِ دین، ننگِ وطن کہتے ہیں۔ رُودِ کاویری پر ٹیپو سلطان کی رُوح سے مادرِ وطن کی درد بھری داستان سُنتے ہیں اور آخر میں خدا سے شکوہ کرتے ہیں کہ اُس نے اُنھیں اُس دیس میں پیدا کیا جس کے باسی غلامی پر رضامند ہیں۔

جاوید نامہ فارسی میں ہونے کی وجہ سے میرے موضوع بحث سے خارج ہے تاہم اس صدی کے شروع سے قومیت و وطن دوستی کی تحریک نئی نسل کے لئے نئے احساس کی آواز ہونے کی حیثیت سے اقبال نے اُردو میں تصویرِ درد، ترانۂ ہندی، ہمالیہ اور ہندوستانی بچّوں کا گیت، نیا شوالہ جیسی نظمیں لکھ کر اُردو شاعری کو مالا مال کر دیا۔ ضربِ کلیم میں بھی اُنھوں نے اپنی مشہور و معروف نظم "شعاعِ اُمید" میں وطن دوستی کا ثبوت دیا ہے ؎

اک شوخ کرن، شوخ مثالِ نگہِ حُور — آرام سے فارغ صفتِ جوہرِ سیماب
بولی کہ مجھے رُخصتِ تنویر عطا ہو — جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرّہ جہاں تاب
چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو — جب تک نہ اُٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب
خاور کی اُمیدوں کا یہی خاک ہے مرکز — اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن — یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِ ناب

شاعرِ مشرق

اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواصِ معانی جن کے لئے ہر بحرِ پر آشوب ہو پایاب

اقبال کے بعد قومی و وطنی شاعری میں سیماب اکبرآبادی اور ظفر علی خاں کا مرتبہ سب سے بلند نظر آتا ہے۔ سیماب کی نظموں کے مجموعوں میں متعدد نظمیں ایسی ہیں۔ جن میں ہندوستان کی جغرافیائی خصوصیات کے ساتھ ساتھ اس کی عظمتوں کے گہرے نقوش ملتے ہیں۔ اپنی نظم "ہندوستان" میں سیماب نے کیسی دل آویز تصویر پیش کی ہے ؎

وہ پرستش گاہِ فطرت، سجدہ گاہِ آفتاب
گردگارِ صبحِ مشرق، شامِ گیتی کا شباب

سرخ صندل سی جبینیں، ان پہ قشقوں کے چراغ
برگ سے نازک طبیعت پھول سے نازک دماغ

جس کے دریا آئینے پگھلے ہوئے بہتے ہوئے
جس کے پربت کائنات ابر کو گھیرے ہوئے

جس کی ندیاں موجِ مے کی طرح لہراتی ہوئی
گھومتی گرتی، گرجتی، گونجتی، گاتی ہوئی

لہلہاتے سبزہ زاروں میں بہار آئی ہوئی
اک گھٹا برسی ہوئی اور اک گھٹا چھائی ہوئی

جیسے رقصاں ہو فضا میں حسن کا رنگیں خدنگ
مختلف رنگوں کا جیسے اڑ رہا ہو اک پتنگ

وطن کی محبت کی یہ چنگاری سیماب کے یہاں دیکھئے ؎

وطن، پیارے وطن، تیری محبت جزوِ ایماں ہے
تو جیسا ہے، تو جو کچھ ہے، سکونِ دل کا ساماں ہے

وطن میں مجھ کو جینا ہے، وطن میں مجھ کو مرنا ہے
وطن پر زندگی کو ایک دن قربان کرنا ہے

وطن کی خاک سے اٹھا ہوں رنگیں پیرہن ہو کر
وطن کی خاک میں مل جاؤں گا خاکِ وطن ہو کر

جوش نے وطنی شاعری کو اور زیادہ توانائی بخشی اور وہ روایت جو وطن دوستی کی شکل میں ۱۸۵۷ء سے منظم طور سے شروع ہوئی تھی اس کی رہنمائی کی۔ جوش نے بھی جو بین الاقوامیت اور ساری دنیا کو ایک ملک کی صورت میں دیکھنے کے قائل ہیں، ہندوستان سے متعلق گیت گائے اور اسے فرنگی معاشرتی غلامی سے آزاد کرنے کی کوشش میں عوام میں ان کے خلاف نفرت پیدا کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ ان کی نظموں میں انگریزوں کے خلاف نفرت و حقارت ٹپکتی ہے اور اس کی پشت پناہی میں وطن اور قوم سے محبت کا جذبہ کارفرما ہے۔

جوش جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے نوعِ انسانی کو ایک خاندان سمجھتے ہیں اور دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ وطنیت کے اس ناپاک تخیل کو جو خود غرضی، تنگ نظری، منافرت اور ابنِ آدم کی تقسیم چاہتا ہے۔ انتہائی حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کا عقیدہ ہے کہ اپنے گھر کو غاصبوں کے تسلط سے محفوظ رکھا جائے۔ چنانچہ مندرجہ بالا تصور وطن کی وضاحت کے ساتھ ساتھ "شعلہ و شبنم" میں وطن کے عنوان سے ایک کامیاب نظم ہے جس کے چند بند پیشِ خدمت ہیں ؎

تیری ہی گردشِ رنگیں میں ہیں بانہیں اپنی
تیرے ہی عشق میں ہیں صبح کی آہیں اپنی

تیرے ہی حسن سے روشن ہیں نگاہیں اپنی
کج ہوئیں تیری ہی محفل میں کلاہیں اپنی

بانکپن سیکھ لیا عشق کی استادوں سے
دل لگایا بھی تو تیرے ہی پری زادوں سے

پہلے جس چیز کو دیکھا وہ فضا تیری تھی
پہلے جو کان میں آئی وہ صدا تیری تھی

پالنا جس نے ہلایا وہ ہوا تیری تھی
جس نے گہوارے میں چوما وہ صبا تیری تھی

اولیں رقص ہوا مست گھٹا میں تیری
بھیگی ہیں اپنی مسیں آب و ہوا میں تیری

شاعر عجیبی

حسن تیرے ہی مناظر نے دکھایا ہم کو　　تیرے ہی صبح کے نغموں نے جگایا ہم کو
تیرے ہی ابر نے جھولوں میں جھلایا ہم کو　　تیرے ہی پھولوں نے نوشاہ بنایا ہم کو
خندۂ گل کی خبر تیری زبانی آئی
تیرے باغوں میں ہوا کھانے جوانی آئی

جوش کی بہت سی دوسری نظمیں ہیں۔ جو سیاسی اور ایجیٹیشنل ہونے کے ساتھ حب وطن کے جذبات سے مملو ہیں۔ ان میں شکست زنداں کا خواب، نظام نو، انسانیت کا کورس اور ایسٹ انڈیا کے فرزندوں کے نام وغیرہ نظمیں ہیں۔ ایسٹ انڈیا کے فرزندوں کے نام جو نظم ہے، وہ ۱۹۲۹ء کی یادگار ہے۔ اس میں جوش نے سارے ہندوستان کے جذبات کو پیش کیا ہے جو ان کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف پرورش پا رہے تھے۔ اس میں شاعر نے انگریزی سامراج کی تاریخ پیش کی ہے اور نہایت ہی موثر انداز میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ انگریز تاجروں کے بھیس میں کیونکر آئے اور اپنے فریب و ریاکاری سے ہماری زمین پر قبضہ کیا۔ اس میں ہماری قومی تحریک کی طرف اشارے بھی ہیں۔ اور جلیان والا باغ اور بھگت سنگھ کی المناک داستانیں بھی۔ اور آخر میں نظم کا خاتمہ ذیل کے اشعار پر ہوتا ہے ؎

غیر ملکی سوداگر! اب ہے تو بس اس بات میں　　وقت کے فرمان کے آگے جھکا دو گردنیں
اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی　　جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی
وقت کے ماتھے سے یہ فرمان ٹل سکتا نہیں　　موت ٹل سکتی ہے اب فرمان ٹل سکتا نہیں

بقول سردار جعفری جوش کی رومانیت، وطن کی محبت اور آزادی کی خواہش سے پیدا ہوئی ہے۔

وطنی شاعری میں ایک اہم ترین نام تلوک چند محروم کا بھی ہے۔ "کاروانِ وطن" اُن کی قومی و وطنی نظموں کا قابل قدر مجموعہ ہے۔ محروم اپنی ایک سادہ سی نظم "ہمارا دیس" میں کہتے ہیں ؎

سب سے اچھا دیس ہمارا　　دنیا بھر سے نیارا ہے
پیارا دیس ہمارا بھارت　　ہم کو دل سے پیارا ہے
اونچے اونچے پربت اسکے　　لہراتے ہیں جن پر جنگل
مور پپیہے اور کوئل سے　　جنگل میں ہوتا ہے منگل

"اختر ہند کو ہم اوج ثریا کر دے" سے محروم کے جذبے کی تیز آنچ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ترقی پسند تحریک کے شروع ہونے کے بعد یہ جذبہ اور بھی تیز تر ہونے لگا۔ اور اس دور کے نوجوان شاعروں نے بھی اس موضوع پر متعدد نظمیں لکھی ہیں۔ چنانچہ عظمت اللہ خاں، افسر، حفیظ اور ساغر نے اپنے ہلکے پھلکے گیتوں کی مدھم اور شریلی لے سے لوگوں کے دل و دماغ میں وہ تاثر پیدا کیا جو روز بروز بڑھتا ہی گیا۔ چنانچہ عظمت اللہ خاں کی نظم "وطن" کا ابتدائی بند ملاحظہ ہو ؎

مری جان ہو کہ مرا بدن　　تری جلوہ گاہ ہے اے وطن
تری خاک اس کا خمیر ہے
مرے خون میں یہ جھلک تری　　مری نبض میں یہ چمک تری
مری سانس تیری سفیر ہے

ساغر نظامی نے بھی اپنی نظموں اور اپنے گیتوں کے ذریعہ وطن اور اس کی ہر چیز کو تقدس عطا کر کے ہندوستان کی محبت کو اپنی شاعری کا پیام بنایا۔ چنانچہ ایک قومی گیت میں کہتے ہیں ؎

شاعرِ مشرق

ہم سے بھارت کی رونق ہے — آزادی دن رات سبق ہے
اپنی دھنک ہے اپنی شفق ہے — ہر ذرّے پر اپنا حق ہے
کھیت اپنے، دہقان ہمارا
سارا ہندستان ہمارا
مسجد، مندر اور مے خانہ — بادہ، ساغر، اور پیمانہ
جنگل، بستی اور ویرانہ — ہر محفل اور ہر کاشانہ
ہر در اور ہر ایوان ہمارا
سارا ہندستان ہمارا

اسی دور کے نظم گو شعراء میں آنند نرائن مُلّا، بِسمل سیوہاروی، شمیم کرہانی، سلام مچھلی شہری، اعجاز صدیقی، علی جواد زیدی، نازش پرتاب گڑھی، شفیق جونپوری، رفعت سروش، سردار جعفری، جاں نثار اختر، مسعود اختر جمال، وامق جونپوری وغیرہ کے یہاں بھی یہ جذبہ دکھائی دیتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اختر شیرانی جیسا شہیدِ عشق حضرت سلمیٰ "شاعر جس کی شاعری شراب و سلمیٰ کے گرد گھومتی ہے۔ وطن اور وطن کی آزادی پر عشق کو قربان کرنے پر تیار ہو جاتا ہے اور دیس سے آنے والے سے اپنے وطن کے حالات، وہاں کی راتیں، پیار کی باتیں اور عشق کی گھاتیں غرضیکہ ساری جزئیات معلوم کرنے کے لیے بے چین نظر آتا ہے۔ اختر کی یہ نظم جو حبّ الوطنی کے جذبہ سے بھری ہوئی ہے اُس کی تمام نظم ہے، اپنے وطن سے متعلق مختلف النوع جزئیات جاننے کے لئے یہ بے تابی اور یہ تڑپ ہندوستانی ادبیات میں آسانی سے دستیاب ہونے والی چیز نہیں ہے ؎

او دیس سے آنے والے بتا، !
او دیس سے آنے والے بتا — کس حال میں ہیں یارانِ وطن
آوارۂ غربت کو بھی سُنا — کس رنگ میں ہیں کنعانِ وطن
وہ باغِ وطن، فردوسِ وطن — وہ سروِ وطن، ریحانِ وطن
او دیس سے آنے والے بتا !

او دیس سے آنے والے بتا!
کیا ہم کو وطن کے باغوں کی — مستانہ فضائیں بھول گئیں ؟
برکھا کی بہاریں بھول گئیں — ساون کی گھٹائیں بھول گئیں ؟
دریا کے کنارے بھول گئے — جنگل کی ہوائیں بھول گئیں ؟
او دیس سے آنے والے بتا !

اختر شیرانی کے علاوہ اس دور میں وطن دوستی کے عناصر مختار صدیقی کے یہاں بھی ملتے ہیں۔ چنانچہ اس کے گہرے نقوش ان کی نظم موہن جو دارو میں نمایاں ہیں۔ آنند نرائن مُلّا اور سردار جعفری اور اعجاز صدیقی کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ نمونے کے طور پر ان کے بھی چند بند دیکھتے چلئے۔ مُلّا اپنی نظم "زمینِ وطن" میں اس طرح مخاطب ہیں۔

ترے کوہ و دریا جمال آفریں
تری وادیاں رشکِ خلدِ بریں

شاعرِ بمبئی

یہ کس نے بنایا تجھے یوں حسیں

کہ جیسے سنواری گئی ہو دُلہن

زمینِ وطن، اے زمینِ وطن

سردار اپنی نظم "یہ ہندوستان" میں کوئلے اور لوہے کی کانیں، سُرخ پتھر کی چٹانیں اور سنگِ مرمر کے شفاف سِل دیکھتے ہیں۔ جس کی صفائی پر دل پھسلتا ہے۔ اِس کے علاوہ آزادی سے متعلق جو نظمیں ملتی ہیں وہ بنیادی طور پر وطن کی محبت سے لبریز ہیں۔ یہی نہیں بلکہ سردار کے یہاں حب الوطنی کا جذبہ سب سے زیادہ اُن کی طویل تمثیلی نظم "نئی دنیا کو سلام" میں رچا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اِس نظم کی فضا، کردار، سوچنے دیکھنے کا طریقہ یہ ساری چیزیں ہی ہندوستانی ہیں۔

اقبال نے خاکِ وطن کے ہر ذرّے کو دیوتا کہا ہے اور اعجاز صدیقی وطن کی چاہت اور اُلفت کو عبادت کے درجے سے بھی زیادہ درجہ دیتے ہیں۔ اُن کی نظم "نغمۂ وطن" کے آخری بند کے چند شعر پیش ہیں ؎

تیری مٹی سے ہوا رُوحانیت کا ارتقا، — تو کہ اِک تہذیب کا صدیوں سے گہوارہ رہا

دل کشا ہیں تیری ہوا، تیرے مناظر جاں فزا — مختلف رنگوں میں بھی یک رنگ ہے تیری ادا

آگ تیری دولتِ دل، خاک تیری کیمیا — تجھ سے افضل تر نہیں ہے کوئی شے، تیرے سوا

وہ رگ و پے کیا، کہ جس میں درد ہو تیرا بسا — زیست کا حاصل ہے تو، تو زندگی کا مدّعا

تیرا پرچم عظمتِ افلاک کو چھوتا ہوا — تیرے جادے امنِ عالم کے لئے ہیں رہنما

ایک ایک ذرّے پہ تیرے ثبت ہے سجدہ مرا — تیری چاہت تیری اُلفت ہے عبادت سے سوا

اے وطن، میرے وطن، اچھے وطن، پیارے وطن

مخدوم کی "سحرِ نو"، وجد کی "سحرِ نو" اور "اجنتا اور ایلورا"، کیفی کی "آخری مرحلہ" اور جمیل مظہری کی "موسم کے اشارے" اِسی ضمن میں آتی ہیں — ساحر کی طویل نظم "پرچھائیاں" بھی اُن کی اپنی وطن کے شدید جذبۂ محبت سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔

اِن کے علاوہ خواتین نے بھی اپنے اِس فطری جذبے کو شعر کے پیکر میں ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ چنانچہ ادا بدایونی اور سیّدہ اختر کے یہاں یہ احساس موجود ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد آزادی کے بعد کی شاعری میں بھی یہ جذبہ کارفرما ہے۔ جس میں ہمارے شاعرِ ہندوستان کی قومی و معاشی تعمیر کے خواب دیکھتے ہیں۔ مخدوم کی نظم "پھول برسا دو"، اقبال سہیل کی "مبارکبادِ آزادی"، مجاز کی "جشنِ آزادی" اِسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

آزادی اور حب الوطنی کے جذبے سے غزل بھی کچھ زیادہ دُور نہیں رہی۔ چنانچہ حسرت اور محمد علی کی غزلیں اور بعد میں اقبال سہیل، فیض، ساحر اور مجروح کے یہاں بھی اِس کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔ حسرت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

رسمِ جفا کامیاب، دیکھئے کب تک رہے — حُبِّ وطن مستِ خواب دیکھئے کب تک رہے

نام سے قانون کے ہوتے ہیں کیا کیا ستم — جبر بہ زیرِ نقاب دیکھئے کب تک رہے

دولتِ ہندوستاں قبضۂ اغیار میں — بے عدد و بے حساب دیکھئے کب تک رہے

مولانا محمد علی کے بھی چند اشعار سُنتے چلیے۔ جو حسرت کی مندرجہ بالا بحر ہی میں لکھے گئے ہیں ؎

سینہ ہمارا فگار، دیکھئے کب تک رہے — چشم یہ خوں نابہ بار دیکھئے کب تک رہے

یوں تو ہے ہر سو عیاں، آمدِ فصلِ خزاں — جور و جفا کی بہار دیکھئے کب تک رہے

رونقِ دہلی پہ رشک تھا کبھی جنّت کو بھی — یوں ہی یہ اُجڑا دیار دیکھئے کب تک رہے

فیض نے قدیم اُردو شاعری کی علامتوں اور استعاروں کو نئی علامتوں میں اِستعمال کیا۔ اُن کے یہاں قفس، اہلِ قفس چارہ گر اور چارہ گری، اہلِ ستم اور اصحابِ غم، صیاد و گلچیں جیسے استعارے سیاسی اشارات کے طور پر استعمال کئے گئے ہیں۔ ان کے وصل سے مراد سیاسی نصب العین کا حصول ہے۔ اور ہجر سے اُن کا مقصود اُس نصب العین سے دُوری اور اس کے حصول کی دشواریاں ہیں اور ان تمام اشارات کے پس پردہ اُن کا جذبۂ حبّ الوطن کام کرتا ہے۔ اُن کے یہاں پیلائے وطن کی محبت جو نظموں میں پائی جاتی ہے اُن کی غزلوں میں بھی نمایاں ہے ؎

صبا سے کرتے ہیں غربت نصیب ذکرِ وطن — تو چشمِ صبح میں آنسو اُبھرنے لگتے ہیں
چمن پہ غارتِ گلچیں سے جانے کیا گزری — قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے

فیض کی طرح مجروحؔ نے بھی اپنی غزلوں میں اِس جذبے کو سمویا ہے ؎

غیروں کی خلش، اپنوں کی لگن، سوزِ غمِ جاناں، دردِ وطن — کیا کیجئے کہ ہم ہیں کس کس کو سینے سے لگائے زنداں میں

غرض اُردو شعر و ادب میں جہاں ہر موضوع پر رنگا رنگ دفتر ملتے ہیں، وہیں اپنے وطن اور وطن کی مختلف النوع چیزوں سے لگاؤ، اُن سے محبّت، اور اپنائیت کا اظہار اِس کا وصفِ خاص ہے۔ ہندوستان کی مٹّی کی سوندھی خوشبو اس میں بسی ہوئی ہے۔ کوئل کی کوک اور پپیہے کی پیہو سے یہ نغمہ بار ہے۔ یہاں کے فطری مناظر اور آبشاروں کا حُسن اِس کا غازہ ہے اور اِس کے رِشی، مُنی، شُورویر، پیغمبر اور اُوتار، بدھ اور سوامی اور فکر و فلسفہ سے اِس کا سیکولر کردار اُبھر آیا ہے۔ ہندوستانی علم الاصنام کی مختلف روایتوں کے پاس اور احترام سے اس کا مجموعی حُسن دو چند ہو گیا ہے۔ اُردو شاعری کی وطن دوستی، ہندوستانی مزاج، جمہوری عنصر اور پیغام اِس مُلک کے زبان و ادب کے لئے باعثِ رشک اور قابلِ تقلید ہے۔

غزلیں

علیم اختر مظفر نگری

جاں نذرِ شوق کر کہ نئی زندگی ملے
پوشیدہ تیرگی میں کوئی روشنی ملے

ان حادثوں کی دھوپ میں بڑھتے چلے چلو
شاید سکون سایۂ دیوار بھی ملے

ہم اپنے آپ سے بھی مخاطب ہیں اسطرح
جسطرح اجنبی سے کوئی اجنبی ملے

سنتے ہیں تیرا شہر اُجالوں کا شہر ہے
لیکن اگر وہاں بھی یہی تیرگی ملے!

محرومیوں کو ایک بھی انساں نہیں ملا
ملنے کو یوں تو ہم سے بہت آدمی ملے

ارزاں کچھ ایسی جنسِ گرانِ خلوص ہے
جس طرح راستے میں کوئی شے پڑی ملے

ویرانیوں میں شہر کی آبادیوں سے دور
اہلِ جنوں کے ساتھ خردمند بھی ملے

اپنے نصیب' اپنے مقدر کی بات ہے
تم پھول چن رہے ہو ہمیں خار ہی ملے

خوں وف دیا ہے رہِ ظلم و جور کو
شاید اسی چراغ سے کچھ روشنی ملے

پوچھیں گے ترکِ رسمِ تعلق کی لذتیں
اب اتفاقیہ اگر اُن سے کبھی ملے

ہر آنے جانے والے سے اب پوچھتے ہیں وہ
دلی گئے تھے! حضرتِ اختر سے بھی ملے!

زیب غوری

تار بندھا ہے اشکوں کا، کیا برکھا ہوتی ہے
تیرے پاس اے من کے ساگر! کتنا موتی ہے

رات گئے تک سپنے بُنتی رہتی ہے آشا
کیسی میٹھی میٹھی نیندیں جاگ کے کھوتی ہے

ذرے ذرے سے آتی ہے اپنی ہی آہٹ
ہم تنہا لوگوں کی بھی کیسی دنیا ہوتی ہے

سناٹے کی اوٹ میں بیٹھی ننگی رات انجان
چاند لگن میں لمبی لمبی زلفیں دھوتی ہے

آکے مجھے تڑپا جاتی ہے میری یاد اکثر
میرے ہی درپن کی کرچیں من میں چبھوتی ہے

چپ سادھے دیواریں کھڑی ہیں دکھوں کا بوجھ اٹھائے
رو دھو کر کس چین سے دنیا گھروں میں سوتی ہے

بھور بھئے سے سانجھ سمے تک جیون کی بیگار
اس پربت سے اس پربت تک پتھر ڈھوتی ہے

مَیں تو اس پتھریلے بھیگے پتھر پر لیٹا ہوں
ان سنسان جگہوں میں کس کی پوجا ہوتی ہے؟

ہونٹوں کے دیپک کے نیچے زیب اندھیرے میں
اک دکھیاری بھیتر بھیتر من میں روتی ہے

افسانہ

پریم گلین

اَندھی دیوار کا ایک سُورج!

موسم بہار کی آمد آمد ہے۔ کیاریوں میں قرینے سے لگائے گئے پودے اپنے سروں پر رنگ برنگی کلیاں اٹھائے ہیں، جو بس پھوٹنے ہی والی ہیں۔ میں خود دوسری منزل کی بالکنی پر کھڑا ڈوبتے سورج کی رنگ افشانیوں میں کھویا ہوا ہوں۔ بڑی خوبصورت شام ہے۔ پورے جوبلی پارک پر اُفق سے اُبھرنے والی نارنجی رنگ کی پھوٹ پڑ رہی ہے۔

آنشو پیچھے سے آ کر میرے قریب کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور میرا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ وہ جوبلی پارک کے فوارے دیکھنے کیلئے مچل رہا ہے۔ اُسے پانی کی اُڑتی ہوئی بوندوں پر پڑنے والی رنگا رنگ روشنیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔ فوارے کا پانی آسمان کو چھو لینے کی تمنا میں اوپر اُچھلتا ہے اور ایک ممکن بلندی تک پہنچ کر دھواں سا بن جاتا ہے۔ یہ دھواں جب لہراتا ہوا دھرتی کی جانب لوٹتا ہے تو اس پر جلتی بجھتی، رنگ برنگی روشنیاں پڑتی ہیں۔ پانی کے اس طرح بلندی کی جانب اُبھرنے اور پھر زمین پر گرنے کے پیچھے اگر کوئی تہ داری ہے، تو معصوم آنشو کو نہ اس کی سمجھ ہے اور نہ ہی اُس سے کوئی سروکار۔ اُس کے لئے تو یہ سب ایک دلچسپ تماشہ ہے، اُسے اچھا لگتا ہے۔ اور بس۔

یوں بھی میں آنشو کی باتیں نہیں ٹالا کرتا ہوں۔ اور آج کے دن تو اُس کا خاص خیال رکھتا ہوں۔ سال میں آج ہی کا تو دن ہے، جب میں بہت خوش ہوتا ہوں اور بہت غمگین ہوتا ہوں! — آج سے چار سال قبل جب رات رخصت ہو رہی تھی اور دن چلا آ رہا تھا تو ایک ساتھ فضا میں دو ہچکیاں ابھری ہوئی تھیں۔ ایک کا استقبال انگڑائی لیتے ہوئے سورج نے کیا اور دوسری کو کالی رات اپنے ساتھ سمیٹ کر لے گئی۔ تب نرسنگ ہوم کے سپیشل وارڈ میں بستر کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر، ساڑھے تین پونڈ کے ایک لوتھڑے کو اپنے ہاتھوں میں تھامے، دیر تک میں گم سم بیٹھا رہا۔ خون کا وہ لوتھڑا گرم تھا، لیکن پاس ہی پڑے ہوئے گوشت کے ٹھنڈے ڈھیر سے بہر حال اُس کی اہمیت زیادہ تھی!

اور پھر جب اُس لوتھڑے نے بڑھنا شروع کیا تو مجھے اُس کے چہرے پر گالوں کی وہ تازگی نظر آ گئی جسے میں دمینتی کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔ میرے شعور اور لاشعور سے وہ نفرت، جو مجھے ماس کے گرم لوتھڑے سے تھی، اُسی طرح مٹ گئی جیسے ایک بچہ اپنی سلیٹ پر نئے سوالوں کو حل کرنے کیلئے پچھلے سوالات کے اعداد و شمار مٹا ڈالتا ہے۔

آج کے دن میں بے تحاشہ روپیہ خرچ کر ڈالتا ہوں۔ پورے گھر کو دلہن کی مانند سجایا جا رہا ہے۔ پاس پڑوس کے بچوں کو مدعو کیا جا چکا ہے۔ پارٹی شروع ہونے میں ابھی تھوڑی دیر ہے۔ سوچتا ہوں اس دوران آنشو کو جوبلی پارک کی سیر کرا دی جائے۔ اپنی کار نکالتا ہوں اور آنشو کو لے کر جوبلی پارک پہنچ جاتا ہوں۔

پارک میں بڑی بھیڑ ہے۔ جو لوگ پہلے سے وہاں فواروں کے گرد موجود ہیں، وہاں سے سرکنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ بھیڑ بڑھتی جا رہی ہے۔ کار کو میں نے ایک طرف پارک کر دیا ہے۔ اور آنشو کو فوارے دکھانے چل پڑا ہوں۔ سورج غروب ہو چکا ہے۔ اندھیرا پھیلنے والا ہے۔ فوارے ابھی سے بند ہیں۔ اور روشنیوں کا رقص شروع ہونے والا ہے۔ آنشو نے میرے داہنے ہاتھ کی انگلی پکڑ رکھی ہے اور ہم دونوں آگے

آہستہ آہستہ فواروں کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ روز گارڈن سے گزر کر ہم جوبلی لیک پہونچ گئے ہیں جو بلی لیک سے ٹھیک درمیان میں ننھا سا ایک ٹاپو بنا ہوا ہے۔ جو بہت خوبصورت اور قرینے سے ترشی ہوئی جھاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ ان جھاڑیوں کے درمیان سے بڑا فوارہ چھوٹتا ہے۔ اس فوارے کو دیکھ کر اکثر یہ احساس ہوتا ہے کہ گویا کبھی یہاں کوئی جادوگر آیا ہوگا اور اُس نے جادو کی بنسری بجائی ہوگی، جس سے جھیل کے بیچوں بیچ ایک ٹاپو اُبھر آیا اور ایک فوارہ پھوٹ نکلا اور اب فطرت کی دلکش تخلیق بن کر دل و نگاہ کو طراوت اور خنکی بخش رہا ہے۔

یہاں تک پہنچتے پہنچتے مجھے سگریٹ کی شدید طلب محسوس ہونے لگتی ہے۔ اور میں "لیک کیفے" کی جانب بڑھ جاتا ہوں۔ کاؤنٹر سے سگریٹ خرید کر مڑتا ہوں تو سامنے کی میز پر رمیش اپنے چند دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنی میز کی طرف بلانے لگتا ہے۔ میں اُس کے قریب پہنچ کر خالی کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں۔ رمیش اپنے دوستوں سے میرا تعارف کراتا ہے کہ میں عمل پر یقین رکھتا ہوں اور تقدیر کو عمل کا ہی نتیجہ مانتا ہوں۔ اور وہ لوگ جو جدوجہد سے فرار چاہتے ہیں اور اُس کیلئے تقدیر کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں، میرے نزدیک مجہول اور اپاہج ہیں۔

میں دوستوں کے ساتھ باتوں میں مشغول ہو جاتا ہوں اور آنشو کو موقع مل جاتا ہے۔ وہ کیفے سے نکل کر نیچے جھیل کے کنارے پہنچ جاتا ہے۔ دن میں اُس کی اسکول ٹیچر نے اُسے کاغذ کی ایک ناؤ بنا کر دی تھی جو اُس کی جیب میں موجود ہے۔ ناؤ کو پانی میں بہانے کے لئے وہ جھیل کے بالکل کنارے پہنچ جاتا ہے اور بیٹھ کر ناؤ کو پانی میں بہانے کی کوشش کرتا ہے۔ اُس کا پیر پھسل جاتا ہے اور جسم غیر متوازن ہو جاتا ہے۔ اور وہ پانی میں گر پڑتا ہے۔ وہ تیرنا نہیں جانتا، پانی میں غوطے کھانے لگتا ہے۔ اور جب تک لوگوں کی نظر اُس پر پڑتی ہے، پیارہ سولہ سے کر سولہ عدد گن چکا ہوتا ہے۔

جھیل کے کنارے بھیڑ جمع ہو جاتی ہے اور لوگوں کے شور سے جب ہماری باتوں کا سلسلہ ٹوٹتا ہے تو میں آنشو کو اپنے قریب موجود نہ پاکر گھبرا کر اٹھتا ہوں اور اُس کا نام پکارتا ہوا بھیڑ کی جانب دوڑتا ہوں۔ کچھ لوگ پوچھتا چھ کر رہے ہیں کہ بچے کے ساتھ کے لوگ کہاں ہیں۔ بھیڑ کو کائی کی مانند چیرتا ہوا میں کنارے پہنچ جاتا ہوں اور آنشو کو گھاس پر لیٹا ہوا دیکھ کر ششدر ہو جاتا ہوں!

گھر پہنچ کر کار کی پچھلی سیٹ سے آنشو کو اٹھا کر گود میں لے لیتا ہوں، اور آہستہ آہستہ لان کو طے کرتا ہوا برآمدہ کی جانب آ رہا ہوں۔ رمیش گم سُم سا میرے ہمراہ چل رہا ہے۔ اتنے میں رامو ایک تار لے کر دوڑتا ہوا میرے قریب آتا ہے لیکن میرے چہرے کی سنجیدگی دیکھ کر سہم جاتا ہے۔ رمیش، رامو کے ہاتھ سے تار لے کر آواز بلند پڑھتا ہے اور پھر ساتھ ہی پھوٹ پڑتا ہے۔ تار دہلی سے آیا ہے اور آنشو کے ماموں نے بھیجا ہے۔ تار میں لکھا ہے: "آنشو کو جنم دن مبارک ہو"

آنشو کو گود میں اُٹھائے ہوئے برآمدہ میں کھڑے ہو کر میں گیٹ کی طرف دیکھتا ہوں۔ رستوگی، ٹنڈن اور سوڈانی اپنے بچوں کے ہمراہ میرے مکان میں داخل ہو رہے ہیں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ لوگ میرے مکان میں نہیں بلکہ میرے جسم میں ان تحفوں کو لئے داخل ہو رہے ہیں، جن پر تقدیر کا لیبل چسپاں ہے۔!

اچانک محسوس ہوتا ہے، کسی نے میرے گال پر زبردست تھپڑ مارا ہو۔ میری زندگی بھر کی کمائی یوں منتشر ہو جائے، بکھر جائے، لٹ جائے۔ میں کیسے برداشت کر سکتا ہوں۔ میں آنشو کے گال پر ہلکی سی تھپکی دیتا ہوں،

"اُٹھ جاؤ، بیٹا! اُٹھ جاؤ۔ دیکھو لوگ مجھے کس قدر رسوا کر رہے ہیں!"

رستوگی، ٹنڈن، سوڈانی اور دوسرے تمام لوگ میری طرف حیرت سے دیکھنے لگتے ہیں۔ چند لمحوں بعد وہ سب چیخنا شروع کر دیتے ہیں۔

مقالہ

جاوید نہال

غنچۂ ارم

ایک نایاب تذکرہ

مسلّمہ حقیقت ہے کہ اُردو ادب فارسی کے سانچے میں ڈھلا ہے اور فارسی کے اثر میں ہی نئے ارتقائی منزلیں طے کی ہیں۔ اُس نے فارسی روایات سے بہت کچھ حاصل کیا ہے' اُردو کے قدیم ادب پر فارسی ادب کے اثرات گہرے مرتب ہوئے ہیں۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ فارسی میں جن اصناف سخن کی کمی تھی اُردو ادب کا دامن بھی اُن سے خالی رہا۔ شروع میں ڈراموں کا چلن بالکل نہیں تھا۔ اُردو میں بھی ڈرامہ کے فن سے شروع میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی گئی اور آج بھی آغا حشر کاشمیری کے بعد اُردو ڈراموں کا کوئی خاص ارتقا نہیں ہوا۔ فارسی میں تنقید کا بھی کم و بیش یہی حال رہا۔ تنقیدی ادب بے توجہی کا شکار رہا۔ اور چند خاص خیالات' اصطلاحات اور بعض خوبصورت اور منتخب جملوں کا استعمال ہی تنقید سمجھی جاتی رہی۔ فارسی زبان اور اُس کا ادب جب تک مغربی ادبی قدروں سے آشنا نہیں ہوا تھا' تنقید اُسی میکانکی انداز میں ہوتی رہی۔

اُردو بہت دنوں تک فارس کے بنائے ہوئے خطوط پر چلتی رہی۔ لہٰذا اس میں بھی برسوں تنقیدی ادب کی روایت قائم نہ ہو سکی بلکہ اُردو شاعری جب بہت سے ارتقائی مراحل سے گزر چکی تھی' تب بھی تنقید خالی خالی ہی نظر آتی ہے۔ البتّہ جب اُردو کے شاعروں نے اپنے عہد کے شاعروں کے کلام اور ان کی حیات کو اکٹھا کیا اور فارسی میں اُردو کے شعراء کے تذکرے تالیف ہوئے تو ہمیں پہلے پہلے انہی تذکروں میں ہلکے تنقیدی اشارے ملتے ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر اُردو میں تنقید کی ابتداء تذکروں ہی سے ہوتی ہے۔

آج بھی نکاتُ الشعراء اُردو شاعروں کا پہلا تذکرہ مانا جاتا ہے' غزل کے تاجدار میر تقی میرؔ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے تذکرہ لکھنے کی بنا ڈالی۔ نکاتُ الشعراء فارسی میں ہے اور تشنہ بھی۔ شاعروں کے مختصر سوانح حیات اور ان کے اشعار' ہلکے تبصرے کے ساتھ نمونتاً منقول ہوئے ہیں۔

میر تقی میرؔ کے نقش پا پر کئی اور شاعر چلے۔ نکات الشعراء سے زیادہ بسیط اور مفید تذکرے مصحفیؔ' میر حسنؔ وغیرہ نے لکھے اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُردو کے یہ تذکرے اُس عہد کی یادگار رہیں۔ جب شاعری کو "فن شریف" سمجھا جاتا تھا' اُس کا خاص معیار تھا۔ جس پر پورا اُترنا ضروری تھا۔ میرؔ سے شیفتہؔ تک یہ معیار ایک ہی انداز میں قائم رہا۔ "اور آب حیات" کے مؤلف محمد حسین آزادؔ بھی "فن شریف" کے اس پُر فریب طلسمی دائرے سے اپنے آپ کو باہر نہ نکال سکے اور یہ کہکر "دو اشعار بسیار دارد کہ بر زبان شوقین جاری است ..." نظیرؔ اکبر آبادی جیسے عوامی شاعر کو اپنے مشہور تذکرے سے نکال دیا۔

گو اُردو نثر کی داغ بیل حیدر آباد دکن میں پڑی' مگر اس کا باضابطہ ارتقا فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے ہوا۔ اس سے پہلے شمالی ہندوستان میں اُردو نثر بھی "فن شریف" سمجھی جاتی تھی۔ اس بنا پر میرؔ سے شیفتہؔ تک تذکروں کا ایک ایسا معیار قائم رہا' بہم حادثات سے اس کو

شروع کر دی گئیں، لیکن اس کے ڈھانچے میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہوا۔ اُردو شاعروں کے تذکرے فارسی ہی میں تحریر [illegible]

مولانا محمد حسین آزاد نے فورٹ ولیم کالج کے مشہور ادبی کام کا حال ضرور سنا ہو گا۔ امکان اس کا بھی ہے کہ گلشنِ ہند اور دیوانِ جہاں جیسے تذکرے اُن کی نظر سے گزرے بھی ہوں اور اُنیسویں صدی کے ان دو مفید تذکروں سے متاثر ہو کر اُنہوں نے آبِ حیات تالیف کی ہو۔ آبِ حیات بھی فارسی اور اُردو تذکروں کی روش پر تالیف ہوئی ہے۔ لیکن مولانا آزاد نے اپنے بے پناہ اسلوب اور سحر انگیز انشا پردازی کے بل بوتے پر اپنے تذکرے میں نہ صرف وسعت و گہرائی پیدا کی ہے بلکہ بعض زبردست واقعاتی غلطیوں کے باوجود اُردو ادب کو ایک ایسا تذکرہ عطا کیا ہے۔ جو بہت اہم اور مفید ہے۔ اور جس میں پہلی بار تنقیدی اشارے واضح طور پر ملتے ہیں۔

آزاد کی تنقید بھی فارسی تنقید سے الگ نہیں۔ مغربی تنقید سے یہ متاثر نہیں ہوئی۔ مولانا آزاد کے ہم عصر اور اُردو کے سب سے بڑے سوانح نگار مولانا الطاف حسین حالی نے آزاد کی ان خامیوں کو محسوس کیا اور مقدمۂ شعر و شاعری میں اُردو تنقید کو مغربی تنقیدی قدروں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی اور اُردو میں تنقید کی ایک نئی راہ نکالی، جس پر آج بھی ہمارے نقاد چل رہے ہیں اور ہماری تنقید کچھ آگے بڑھ سکی ہے۔

میرے مقالے کا نفسِ مضمون تنقید نہیں ہے اُردو تذکروں سے تنقیدی ارتقاء کے ضمن میں یہ باتیں آ گئیں۔ آج اُردو میں تنقیدی ادب کے ارتقاء کے ساتھ تذکرہ نویسی کے فن نے بھی ترقی کی منازل طے کی ہیں۔ اُردو ادب میں تذکروں کی بڑی اہمیت ہے، ان کی افادیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان تذکروں میں ہمیں نہ صرف شاعروں کی حیات و شاعری کی جھلکیاں ملتی ہیں بلکہ اُس عہد کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی خاکے بھی ملتے ہیں۔

انہیں تذکروں میں غنچۂ ارم بھی ہے، جو کلکتے میں اُنیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں تالیف ہوا تھا۔ تذکرۂ غنچۂ ارم کے مؤلف مولوی محمد علی نجف رامپوری ہیں۔ جن کی زندگی کا بیشتر حصہ کاروبار کے ناتے کلکتے میں گزرا۔

مولوی نجف رامپوری، رامپور کے محلّے مہین پوری میں پیدا ہوئے [1]۔ ان کے والد کا نام بقول اُن کے حکیم مولوی حافظ محمد علی احسن تھا۔ جو دلّی میں بہت دنوں تک رؤسا کی مصاحبت میں رہے، اور دلّی کی تاخت و تاراج کے زمانے میں، دوسرے رؤسا، اُمراء، اُدبا و شعراء کے قافلوں کے ساتھ رامپور منتقل ہو گئے تھے۔ جہاں وہ نواب محمد کلب علی خان کے دربار سے وابستہ ہوئے۔ مولوی نجف رامپوری کو اپنے والدِ بزرگوار کے سائے میں پرورش پانے کا موقع نہ مل سکا۔ کیونکہ محمد علی احسن صاحب کو دربار کے کام سے عرب و ایران کے سفر پر رہنا پڑا۔ نجف رامپوری کی تربیت و تعلیم اُن کے چچا کی سرپرستی میں ہوئی۔ تعلیم سے فارغ ہو کر نجف رامپوری ذریعۂ معاش کی تلاش میں کلکتے چلے آئے اور وہیں کے ہو رہے۔

مولوی نجف رامپوری کو کلکتے کی ادبی دنیا میں خاص اہمیت حاصل تھی۔ اُن کے عہد میں بھی کلکتے کے اُدبا و شعراء کے درمیان رقابتیں شباب پر تھی۔ اور ادبی تلواریں ایک دوسرے کی ادبی زندگی کو فنا کے گھاٹ اُتارنے کی غرض سے چلتی رہیں۔ عبد الغفور خان نسّاخ اور مولوی نجف رامپوری کے تعلّقات اچھے نہیں تھے۔ اِس کا اندازہ اِس سے ہوتا ہے کہ نسّاخ نے اپنے تذکرۂ سخنِ شعراء میں اکثر فرو تر اور گمنام شاعروں کا ذکر کیا ہے مگر نجف رامپوری کا حال درج نہیں کیا۔ تذکرۂ غنچۂ ارم میں بھی نسّاخ کا ذکر نہیں ملتا۔

تذکرۂ غنچۂ ارم۔ سخنِ شعراء کے جواب میں لکھا گیا ہے، بنگال اور کلکتہ کے جن شاعروں کو نسّاخ نے نظر انداز کیا ہے۔ اصل میں انہیں کا یہ تذکرہ ہے۔ بعض ایسے شاعروں کا بھی حال ملتا ہے جو نسّاخ کے حلقہ بگوش رہے۔ عصمت اللہ اسیر کو کلکتہ کا ملک الشعراء قرار دیا گیا ہے۔ غالباً نجف رامپوری نے شاگرد کو اُستاد (نسّاخ) کی زندگی میں ملک الشعراء کا خطاب عطا کر کے نسّاخ کو ذلیل کرنے کی کوشش کی ہے۔

'غنچۂ ارم' میں ایسے شاعروں کا بھی ذکر ملتا ہے جنہوں نے چند مہینوں یا چند برسوں کے لئے کلکتہ میں قیام کیا تھا۔ انہیں شاعروں

---

[1] تذکرۂ غنچۂ ارم میں نجف رامپوری نے اپنا مختصر حال لکھا ہے۔ لیکن سنہ پیدائش نہیں۔ (دیباچہ)

شاعرِ مبتلی

میں حضرت داغ دہلوی بھی آئے۔ حضرت داغ کا قیام کلکتہ میں تین ماہ رہا۔ اس مختصر قیام کے دوران میں کئی اہم طرحی مشاعرے بھی منعقد ہوئے تھے۔ مولوی نجفت رامپوری کے مشاعرے کے لئے داغ نے ایک طرحی غزل کہی تھی جو اس تذکرے میں پوری نقل کی گئی ہے۔ تذکرۂ غنچۂ ارم میں کئی اہم شاعروں کا ذکر ہے۔ بنگال کے بعض اچھے شاعروں کی شمولیت کے سبب سے اس کی خاص اہمیت ہو گئی ہے مگر اب تک مولوی نجفت رامپوری کا یہ ادبی کارنامہ گمنامی کی دبیز چادر میں لپٹا ہوا کسی گوشے میں پڑا ہوا تھا۔

غنچۂ ارم تاریخی نام ہے۔ [illegible] ہجری میں یہ ترتیب پایا۔ مولوی نجفت رامپوری نے سنہ تالیف خود ہی لکھا ہے۔

گفتم بہ باغبانِ خرد نامِ او بگو　　گفتا کہ نام و سال بود غنچۂ ارم

غنچۂ ارم کوئی جسوط و ضخیم تذکرہ نہیں ہے۔ یہ کلکتہ ہی میں چھپا اور شائع ہوا۔ اب اس کا صرف ایک بوسیدہ مطبوعہ نسخہ[1] ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانہ میں بچ رہا ہے۔ تاریخِ اشاعت [illegible] ہجری ہے، اور ۵۰ صفحات میں یہ پھیلا ہوا ہے۔

بنگال کے اردو شاعروں کا یہ تذکرہ بھی نکات الشعراء، گلشنِ ابراہیم، اور تذکرۂ شعراء میر حسن کی طرح فارسی میں قلم بند ہوا ہے۔ دوسرے تذکروں کی طرح یہ بھی الفبائی ترتیب سے تالیف ہوا ہے۔

تذکرۂ غنچۂ ارم، مٹیا برج کے ایک شاعر آبدؔ منشی عبدالرحیم کے حال سے شروع ہوتا ہے۔ مولوی نجفتؔ رقمطراز ہیں۔

"آبدؔ، منشی عبدالرحیم یکے از احبابِ بے ریا و مخلصانِ باصدق و صفائے مؤلف اگرچہ لکھنوی الاصل است مگر از زمانۂ قدیم مقیم کلکتہ بودہ پیش ازیں مشقِ سخن زیادہ نمودہ۔ اکنوں معتصم بہ حبل المتین[2]۔"

نجفت رامپوری نے یہ بھی لکھا ہے کہ کلکتہ کے شاعروں میں آبدؔ کو نمایاں مقام حاصل تھا۔ وہ فارسی میں دستگاہِ کامل رکھتے تھے اور کلکتہ سے شائع ہونے والے مشہور فارسی اخبار "حبل المتین" کے ادارے میں شامل تھے۔ نعت گو برترے پایہ کے تھے۔ اور نعتیہ کلام کا اُن کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ آبدؔ کی نعتیہ غزل بھی نقل کی ہے ؎

دیکھا کافر نے بھی جب محبوبِ سبحاں کی طرف　　اُس کا دل مائل ہوا توحیدِ یزداں کی طرف

بھول جائے وہ بہارِ باغِ جنت اے آبدؔ　　دیکھے رضواں گر مدینہ کے گلستاں کی طرف

طرحی مشاعرے کی ایک غزل بھی درج ہے۔ جس کا ایک شعر نمونے کے طور پر نقل ہے ؎

راہ جو بھولے ہوئے تھے منزلِ مقصود کے　　آپ کا ارشاد اُن کو خضرِ رہ کر کے چلا

اس تذکرے میں جس دوسرے شاعر کا ذکر ملتا ہے وہ بھی ادب میں گمنام ہے۔ وہ حضرت داغ دہلوی کا شاگرد تھا۔ اُس کا تخلص اشکؔ، نام سید محمد قطب الدین ہے۔ حضرت اشکؔ جلیسر ضلع علی گڑھ کے رہنے والے تھے۔ اُن کی کئی غزلیں بھی نقل کی گئی ہیں۔

نجفت رامپوری کا یہ تذکرہ بنگال میں مقیم ساٹھ شاعروں کے حال پر مشتمل ہے۔ اِن میں اکثریت اُن شاعروں کی ہے جن کو نساخ نے اپنے مشہور تذکرے میں کوئی جگہ نہیں دی۔ اس بنا پر غنچۂ ارم کی افادیت سے انکار کی گنجائش نہیں۔ کیونکہ سخن شعرا اور غنچۂ ارم کی تالیف ایک ہی عہد میں ہوئی تھی۔

مولوی نجفت رامپوری نے بھی ادبی دیانت داری سے کام نہیں لیا ہے۔ انصاف و تنقید کی ترازو پر [illegible] ہو گا۔ اس میں شاعروں کا حال اختصار سے ملتا ہے۔ مؤلف نے اپنے احباب کی خوب مدح سرائی کی ہے اور دوسرے شاعروں کی دو تین غزلیں نقل کر دی ہیں اور دو چار سطروں میں اُن کا حال لکھ دیا ہے جس سے تشنگی کا احساس جا بجا ہوتا ہے۔

[1] تذکرۂ غنچۂ ارم ص ۱۰ - ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری۔ کلکتہ نمبر 321 A

شاعرِ بنگال

بنگال کے اُردو ادب میں 'غنچۂ ارم' کی افادیت اور اہمیت ہمیشہ رہے گی کیونکہ اِس تذکرے میں اُن تمام بڑے شاعروں کی حیات اور کلام کے نمونے مل جاتے ہیں جو تاجدارِ لکھنؤ واجد علی شاہ اختر کے ہمرکاب' لکھنؤ سے ہجرت کر کے مٹیا برج (موچی کھولی) میں مقیم ہوئے۔ جن کی موجودگی نے مٹیا برج کو رشکِ لکھنؤ بنا دیا تھا۔ اِن شاعروں میں اختر، بہارؔ، برقؔ، مقیمؔ، مائلؔ اور کئی دوسروں نے بنگال کے نئے ذہن کو متاثر کیا تھا۔ اِن اساتذہ سے اِس عہد کے نئی پود کے شاعروں نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ اُردو شاعری نہ صرف مقبولِ انام ہوئی تھی۔ بلکہ زبان بھی منجھ گئی تھی۔

نجفؔ رامپوری نے مائلؔ لکھنوی سے متعلق تحریر کیا ہے۔

"مائلؔ، مولوی میر صادق علی لکھنوی مقیم مٹیا برج کلکتہ ملازم سرکار حضرت شاہِ اودھ و ہم متعین بہ تعلیم صاحب زادگانِ جناب حامد الدولہ بہادر برترہ ہر چند سن و سالش بدرجۂ پیری رسیدہ، مگر طبع والا یش مائل بہ فکر جوانانہ گرویدہ' اوستاد مشہور است..... اگرچہ صاحب استعدادِ عربی و فارسی است، مگر بیشتر فکرِ اُردو می نماید[۱]۔"

نجفؔ رامپوری کے بیان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ۸۰-۱۸۷۹ء میں مائلؔ بوڑھے ہو چکے تھے، قرینِ قیاس ہے کہ مائلؔ کی وفات کلکتے میں ہوئی۔ اور مٹیا برج کے شاہی قبرستان میں پیوندِ خاک ہوئے ہوں گے۔ "غنچۂ ارم" میں مائلؔ کی تین غزلیں درج ہیں۔ جن کے اکثر اشعار بھرتی کے ہیں۔ چند اشعار نمونہ مشتے از خروارے کے طور پر دیئے جا رہے ہیں۔

مجھے باور نہیں انکار تیرا ۔۔۔ مگر غماز ہے اقرار تیرا

تیر آہوں کے چلے اُس کو ہدف ہم سمجھے ۔۔۔ فرقتِ یار میں آیا جو نظر جامِ شراب

مائلؔ کے بعد عطارد الدولہ محسنؔ کا ذکر ملتا ہے جن کو واجد علی شاہ اختر کا قرب حاصل تھا۔ محسنؔ کا عربی' فارسی اور اُردو ادب کا گہرا مطالعہ تھا۔ انہوں نے اپنا دیوان بھی ترتیب دیا تھا۔ مگر ترتیب و تدوین کے باوجود یہ شرمندۂ اشاعت نہ ہو سکا۔ مٹیا برج کے اِس صاحب دیوان شاعر کی تین غزلیں 'غنچۂ ارم' میں ملتی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

وہ نہ پاس آئے تو جاں آنکھوں میں آ کر رہ گئی ۔۔۔ حسرتِ دیدار بھی وقتِ سفر جاتا رہا

پھر جنوں چمکیگا اے محسنؔ بہار آنے تو دو ۔۔۔ فکر کیا ہے ولولۂ دل کا اگر جاتا رہا[۳]

"غنچۂ ارم" میں داغؔ دہلوی سے متعلق جو ذکر ہے وہ بے حد مفید ہے۔ داغؔ کے حال میں مولوی نجفؔ رامپوری نے قیام کلکتہ کے بارے میں بھی کوئی چونکا دینے والی بات نہیں کہی ہے۔ مگر قیام کلکتہ کے دوران میں ہونے والے طرحی مشاعروں کی چار غزلیں نقل ہیں۔ داغؔ کی یہ غزلیں کلکتہ کے روایتی مشاعروں کی 'دین' ہیں۔ نجفؔ رامپوری کو داغؔ کے تلمیذ ہونے پر فخر ہے جس کا اظہار انہوں نے اپنے حال میں مکمل کر کیا ہے۔

"داغؔ" "سخنورِ یکتا" تھے۔ اُن کے عہد میں داغؔ کی شاعری کی دھوم مچی ہوئی تھی۔" حالِ مثنوی 'فریادِ داغ' است کہ اکثری از اشعارِ آبدارش بر زبانِ لفتہ دردمنداں و ہجر نصیبانِ جاناں و واصلینِ معشوقانِ نو دیا ست۔ زمانِ قیام چند روزہ کلکتہ بہ مشاعرہ مرتبہ ایم۔ حسب عزت افزائی خاکسار ارشاد شدہ بود[۴]۔"

---

[۱] تفصیل کے لئے دیکھئے۔ [۲] تذکرہ غنچۂ ارم ص ۱۷۶

[۲] (انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب، مولف)

[۳] غنچۂ ارم ص ۱۷۹۔ [۲] ایضاً ص ۹۱۔

[۴] کرم خوردہ ہے۔ پڑھا نہیں جاتا۔

مولوی نجف رامپوری کے مولۂ بالا بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داغ نے کچھ دنوں کے لئے کلکتے میں قیام کیا۔ لیکن مشاعروں کی محفلوں میں داغ شرکت کرتے رہے۔ ان طرحی مشاعروں کے لئے بھی تازہ غزلیں کہیں، اُن کی طرحی غزل کے اشعار منقول ہیں ؎

تڑپ کتا دِل کو کہ شوقِ زلفِ دلبر لے چلا — تھامتا مجھ کو کہ یہ سودا سر لے چلا (کذا)

دِل کی باتیں دِل ہی جانے بے خودیٔ شوق میں — کس طرح لایا خدا جانے یہ کیونکر لے چلا

آنکھ چھوٹی پھرتے ہی محفل میں چل چل مچ گئی — مضطرب کو مضطرب، مضطر کو مضطر لے چلا

منزلِ مقصود تک پہنچے بڑی مشکل سے ہم — ضعف نے اکثر بٹھایا، شوق اکثر لے چلا

یہ حسین مہ جبیں، یہ شہر ایسی لہر بہر — داغ کلکتہ سے لاکھوں داغ دِل پر لے چلا

دوسری غزل ردیف "ی" میں ہے جس میں داغ کا اصل رنگ نمایاں ہے۔ غزل شروع ہوتی ہے ؎

شبنم سے شبِ ہجر کی ظلمت نہیں جاتی — سو شب پہ پڑیں تو بھی یہ رنگت نہیں جاتی

آئی ہوئی عاشق کی طبیعت نہیں جاتی — آتی ہے تو آ کر یہ قیامت نہیں جاتی

رونے سے بھی مٹتا ہے کہیں شوقِ نظارہ — آنکھیں بھی گئیں تو بھی تو حسرت نہیں جاتی

ہم چھانک کے چھپ لئے بھی اس پردہ نشیں کو — آنکھوں سے کسی وقت وہ صورت نہیں جاتی

اے داغ سلامت رہیں مہمان ہمارے — .... کہ قیامت نہیں جاتی [1]

مولوی نجف رامپوری نے اپنے تذکرے میں عصمت اللہ انسخ، عبدالحمید اور عبدالغفور خان شہباز کے بھی حالات لکھے ہیں۔ شہباز بھی کچھ دنوں تک کلکتہ میں مقیم رہے۔ شہباز اچھے شاعر اور نثار تھے۔ اُن کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ شہباز کے حال میں نجف رقم طراز ہیں۔

شہباز، سید محمد عبدالغفور، نقد، منشی سید طالب علی صاحب ساکن باڑہ من مضافات عظیم آباد، پٹنہ حال مقیم کلکتہ فارغ از تحصیل علوم عربی و فنونِ انگریزی گردیدہ...... چندے ایڈیٹری اخبار دارالسلطنت کلکتہ نمودہ[2]۔

شہباز، شاعر، ادیب اور صحافی تھے۔ مشہور اخبار دارالسلطنت کی ادارت کی ذمہ داریاں بھی کچھ دنوں کے لئے نباہیں۔ جلد ہی وہ اڑیسہ (کٹک) چلے گئے جہاں برسوں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز رہے۔ شہباز اچھے شاعر تھے۔ اُن کی چار غزلیں غنچۂ ارم میں ملتی ہیں۔ چند اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں ؎

ہائے ناکامی رقیب روسیہ گھر لے چلا — اور میں یہ خوش کہ رہبر سوئے دلبر لے چلا

میں نے جانا آگئی شامت دِلِ دیوانہ کی — بے ستوں سے قیس جب دامن میں پتھر لے چلا

(کذا) کام اس عقل پر شہباز جب ہوں بند، — یار سے فقروں میں کوئی کام کیونکر لے چلا

مدت ہوئی آیا تھا ترا نام زباں پر — اُس وقت کی دل سے مرے لذت نہیں جاتی

شہباز کسی شوخ کا ہے فیضِ تکلم — پر ہاتھ سے شوخیٔ عبارت نہیں جاتی

(باقی صفحہ ۔۔ پر دیکھئے)

---

[1] کرم خوردہ ہے پڑھا نہیں جاتا

[2] غنچۂ ارم مطبوعہ ۱۳۰۱ھ ص ۱۱۰

غزلیں

ڈاکٹر حامدی کاشمیری

ستارے نیند جو برسائیں ایسا خواب بنوں
اِن اونچی اونچی فصیلوں کو پھاند کر نکلوں

یہاں تک آ گئے ہیں پرچھائیوں کے پاگل ہاتھ
جو بات مجھ پہ بنی ہے، وہ چوک میں کہہ دوں

کٹا پھٹا ہے بدن پر لبادۂ تہذیب
اب ایسے چیتھڑے کو میں اُتار کے پھینکوں

یہ کالی کالی سی پرچھائیاں مکانوں کی
یہ سامنے سے ہٹیں، تم سے کوئی بات کروں

خلا میں حشر جگاؤں گا پُرفشاں ہو کر،
میں پہلے طوقِ ہوا کو گلے سے کاٹ تو لوں

ہے فتنہ فتنہ یہاں کا طلسمِ دشت و سراب
میں اپنے سائے کے ہمراہ کتنی دور چلوں؟

پھر اس کے بعد مجھے لمحہ لمحہ زہر پلاؤ
بھیگتے جسم کی خوشبو میں گھونٹ گھونٹ پیوں

قدم قدم پہ بگولوں کے دشت اُگتے ہیں
کوئی گلاب کھلے، روح مشکبار کروں

ہے دل کو کاٹتی تلوار روشنی کی لکیر!
مذاہبِ جہاں ہیں یا نگینِ اُنھیں میں بھوٹتی دوں

مُظفّر حنفی

تارے بغیر ٹوٹے ہی پلکوں سے مُڑ گئے
ہنسنے چلا جو میں تو مرے ہونٹ جُڑ گئے
جب پار کی نگاہ نے، فولاد کی سُرنگ
شرما کے میری آنکھ سے منظر سکڑ گئے
بیساکھیاں ہٹاتے ہی تحریر گر پڑی
پھر جھاڑ کر کتاب سے الفاظ اُڑ گئے
زخمی پرند جیسا پھڑکتا رہا خیال،
قطرے مرے لہو کے قلم سے بچھڑ گئے
ہم نے پلٹ دیا ہے مظفر ہوا کا رُخ
کچھ مرغ ہائے قبلہ نما تھے کہ مُڑ گئے

☆

وہ ضبط و احتجاج کا منظر تھا سامنے
دلدل عقب میں اور سمندر تھا سامنے
دریائے خوں سے اُٹھتے تھے سر بلبلے نہیں
پل کی جگہ تنا ہوا خنجر تھا سامنے
بستی کو پھونکنے کے لیے آرہے تھے لوگ
پٹری بدل گئے کہ ترا گھر تھا سامنے
مجبور کن رکاوٹوں سے نمٹنا پڑا مجھے
پردے میں سنگِ میل کے پتھر تھا سامنے
جھنجھلا کے اپنے عکس کو دو لخت جب کیا
راون کا ایک اور نیا سر تھا سامنے
ظلمت کی وادیوں میں جہاں تک نظر گئی
دھندلا سا ایک چاند برابر تھا سامنے
اُکتا گیا، بصارتِ محدود کی قسم!
دیکھا ہے جس طرف بھی، مظفر تھا سامنے

طنز و مزاح

سید شہاب الدین دسنوی

غالب کا خط ڈاکٹر زکریا کے نام

۱۹۶۹ء میں غالب صدی منانے کے سلسلے میں 'غالب یادگار کمیٹی بمبئی' کے تحت کئی مہینے تک شاندار تقاریب کا سلسلہ جاری رہا۔ تقریری جلسے، عظیم الشان مشاعرہ، غالب قوّالی اور مباحثے وغیرہ کے علاوہ کمیٹی نے چند نہایت اہم تحریری کام کرائے۔ دیوانِ غالب (صدی ایڈیشن) مراٹھی اور انگریزی زبانوں میں غالب پر ایک ایک کتاب ماہنامہ 'شاعر' کا غالب نمبر اور خوب صورت غالب طغرا۔ غالب یادگار کمیٹی بمبئی ہی کی کوششوں اور تعاون کا نتیجہ ہیں۔

۲۵ ستمبر ۱۹۷۰ء کی شام کو جے ہند کالج بمبئی کے خوبصورت ہال میں کمیٹی کی طرف سے غالب صدی کا اختتامی جلسہ منعقد ہوا۔ اس جلسے میں ادبی ایوارڈس پیش کیے گئے۔ ہال ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور ہر مذہب و ملت سے تعلق رکھنے والے علم دوستوں سے بھرا ہوا تھا۔ جلسہ کی صدارت عالی جناب نواب علی یاور جنگ، گورنر مہاراشٹر نے فرمائی۔

غالب یادگار کمیٹی کے صدر جناب رفیق زکریا (وزیر صحت و اوقاف حکومت مہاراشٹر) نے اپنی خیر مقدمی تقریر سے جلسہ کا آغاز کیا اور فرمایا کہ گزشتہ سال جشنِ غالب صدی کا جو آغاز ہوا تھا آج اس کا اختتامی جلسہ ہے۔ کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ آج کے جلسہ میں اس کی طرف سے ایسے چند ادیبوں اور شاعروں کو تحائف سے نوازا جائے، جنہوں نے کمیٹی کے ساتھ تعاون کر کے اردو اور غیر اردو داں طبقہ سے غالب کو روشناس کرایا۔ ہمیں دوسرے ادیبوں اور شاعروں کی خدمات کا بھی اعتراف ہے لیکن کمیٹی اپنے محدود ذرائع اور سرمائے کی وجہ سے ان کو نوازنے سے معذور رہی ہے۔ ڈاکٹر زکریا نے ایک نہایت اہم بات یہ فرمائی ہے کہ ہم نے بمبئی میں 'غالب ٹرسٹ' قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس کے ذریعہ غالب پر مزید ٹھوس کام ہو سکیں گے۔

مراٹھی زبان کے مشہور عالم شری لکشمی شاستری جوشی نے انگریزی میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ غالب ہماری مشترکہ تہذیب کے نمائندے تھے۔ غالب نے انسانیت کا درس دیا اور انسانی قدروں میں اضافہ کیا۔ اردو ہندوستان ہی کی زبان ہے اور ایک بڑی زبان ہے۔ ہندی، مراٹھی اور گجراتی زبانوں میں فارسی، عربی اور اردو کے پچاس فی صد الفاظ شامل ہیں۔ اگر یہ الفاظ ان زبانوں سے نکال دیے جائیں تو یہ زبانیں بے روح ہو جائیں۔ جوشی صاحب کی تقریر کے بعد کمیٹی کے جنرل سکریٹری پرنسپل سید شہاب الدین دسنوی نے ان شخصیتوں کی خدمات کی صراحت کی جنہیں ایوارڈس دیئے گئے۔ تالیوں کی گونج میں صدر جلسہ جناب نواب علی یاور جنگ گورنر مہاراشٹر نے ذیل کی شخصیتوں کو تحائف پیش کیے۔

۱۔ قرۃ العین حیدر صاحبہ (غالب پر سردار جعفری کے اشتراک سے انگریزی میں کتاب لکھنے پر)	قیمتی ساڑی
۲۔ سردار جعفری (دیوانِ غالب ہندی' اردو مرتب کرنے اور انگریزی کتاب میں حصہ لینے پر)	شال
۳۔ اعجاز صدیقی ('شاعر' کا ضخیم اور شاندار غالب نمبر شائع کرنے پر)	ڈیڑھ ہزار روپے
۴۔ وِدیادھر گوکھلے۔ ایڈیٹر لوک ستا (غالب پر مراٹھی زبان میں کتاب لکھنے پر)	ایک ہزار روپے

ا؎ صابو صدیق پالی ٹیکنک۔ ۲؎ شیفرڈ روڈ

۵۔ محسنِ ادب شام گوپی ناتھ نگم دہلوی (دیوانِ غالب کا خوبصورت اور ارزاں "صدی ایڈیشن" شائع کرنے پر) شالی، ان تحائف اور انعام حاصل کرنے والوں نے خود یہ مطبوعات گورنر صاحب کی خدمت میں پیش کیں۔ گورنر صاحب کا شکریہ بھی محترمہ فاطمہ زکریا نے کیا۔

گورنر صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں غالب یادگار کمیٹی بمبئی کے کاموں کی تعریف کی۔ انہوں نے فرمایا کہ غالب پر مزید توجہ کی ضرورت ہے۔ گزشتہ سال امریکہ میں مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ انگریزی ادیب اور طلبہ بھی غالب سے بے حد متاثر ہیں۔ اردو صرف ہندوستان یا مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک بین الاقوامی زبان ہے۔ اسے مزید ترقی دینے کی جتنی بھی کوشش کی جائے وہ کم ہے۔

آخر میں ڈاکٹر اسحاق صدیقی (سابق صدر انجمن ترقی اردو) نے کمیٹی کے ایک ممتاز رکن کی حیثیت سے صدرِ جلسہ نواب علی یاور جنگ، غالب یادگار کمیٹی کے صدر محترم جناب ڈاکٹر رفیق زکریا (جو بمبئی کی تعلیمی، علمی، ادبی، شعری اور سماجی زندگی کا محور ہیں) کمیٹی کے جنرل سکریٹری سید شہاب الدین دسنوی، دوسرے عہدہ داروں خیام کشن نگم دہلوی، عمار صدیقی، سید محمود زیدی اور ڈاکٹر مجی رضا کی بہترین کارکردگی کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے سردار جعفری، قرۃ العین حیدر صاحبہ، سکندر علی وجد، وِدیا دھر گوکھلے، ن۔ انصاری، شری گلشن شاستری جوشی اور بمبئی ریڈیو کے ڈائرکٹر شری ڈی این ڈِکشٹ (جنہوں نے ریڈیو کا نفرنس پر آج کے جلسے کے آخر میں قوالی کا اہتمام کیا) اور ان تمام غالب دوستوں کا بھی شکریہ ادا کیا جو غالب صدی کی تقاریب میں شریک ہوتے رہے۔ قوالی کے پروگرام کے ساتھ یہ جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

ذیل کا طنزیہ و مزاحیہ مضمون سید شہاب الدین دسنوی (پرنسپل صابو صدیق پالی ٹکنک بمبئی) نے شروع میں کمیٹی کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے سنایا اور جو مسکراہٹوں اور قہقہوں کے درمیان بے حد پسند کیا گیا۔ (ادارہ)

صاحبو! ـــــ میں آپ کے سامنے تقریر کرنے نہیں، بلکہ ایک اخلاقی جرم کا اعتراف کرنے اور اس کی معافی مانگنے آیا ہوں۔ پہلے وہ گناہ بیان کر دوں۔ معافی اس کے بعد چاہوں گا۔

چند روز گزرے کہ ڈاک کا ہرکارہ آیا اور بیرنگ ایک لفافہ لایا۔ اس پر پتہ لکھا تھا۔ "عالی مرتبت، ولی نعمت، ڈاکٹر رفیق زکریا بالقابہ، صدر غالب یادگار کمیٹی، معرفت صابو صدیق۔ شفاخانہ روڈ، بمبئی" تحریر آشنا تھی۔ اس لئے قابلِ اعتنا تھی۔ خط لے لیا اور سوچنے لگا۔ کھولوں یا نہ کھولوں۔ مکتوب میرے نام تھا نہیں، مگر تحریر کی پہچان اُکسانے لگی کہ کاتب کا راز معلوم کروں، شوق نے جرأت دلائی، ارتکابِ جرم کی ہمت بڑھائی۔ لفافہ کھولا۔ خط پڑھا۔ مضمون اس قابل ہے کہ آج کی مجلس میں سنایا جائے۔ تو لیجئے سنئے۔

خط بنام عالی مقام، ڈاکٹر رفیق زکریا، بالقابہ۔

رفیقِ شفیق۔ گزشتہ سال کی بات ہے، فروری کی کوئی تاریخ تھی۔ ایک روز چلم میں آگ کے بغیر حقے کی نے منہ میں دبائے شغل کر رہا تھا۔ جنت میں آگ کہاں! اتنے میں قدسیوں نے آ گھیرا۔ لگے مبارکبادیاں دینے، تہنیت پیش کرنے۔ میرے سبب معلوم کرنے پر بولے۔ "اجی حضرت ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ سرزمینِ ہند میں آپ کی صد سالہ برسی کا جشن بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منایا جا رہا ہے۔ ہر چند کہ قاعدہ عام یہ ہے کہ عالمِ ارواح کے مکینوں کو عالمِ آب و گِل سے قطعِ تعلق کرنا ضروری ہے، مگر آپ کے ساتھ غیر معمولی رعایت ہے، خصوصی عنایت ہے، جشن میں شرکت منظور ہو تو فرمایئے۔ اجازت کا پروانہ منگوا لیجئے۔ یہ سنا تو دل میں ہوک سی اٹھی، سوچنے لگا، جشن میں کیا کچھ ہوگا! ہم کیا کریں گے وہاں جا کر! غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں۔" مگر دل پھر رہا ہے۔

ے صابو صدیق پالی ٹکنک ۔ ے شفاخانہ روڈ

مچل گیا۔ آتشِ شوق بھڑک اٹھی، فیصلہ کر لیا کہ شرکت کروں گا۔ اِس پر ایک حور نے "چغہ" نامی پہنا دیا۔ اب میں دوسروں کو دیکھ سکتا تھا لیکن مجھے کوئی نہ دیکھ پاتا تھا۔ ایک فرشتے نے تتاب شکرم جیسی سواری لاکر کھڑی کر دی۔ آن کی آن میں عالمِ اَرواح سے نکل کر دِلّی پہنچ گئے۔ اب تو قبلہ ما دنیا کے منچلے بھی چاند پر کمند پھینکنے لگے ہیں۔ آپ نے سنا ہوگا میرا شعر ؎

ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یارب　　　ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

اِس کے معنی لوگوں کی سمجھ میں اب تو آگئے ہوں گے۔

ہاں صاحب، تو ہم، آپ لوگوں کے حساب سے پورے سو برس بعد دِلّی پہنچے۔ بستی نظام الدین میں اپنی آخری آرام گاہ تک گئے۔ اپنا مزار دیکھ کر کچھ رونا آیا، کچھ ہنسی، میر مہدی مجروح کا خدا بھلا کرے کہ اُس نے میرے لوحِ مزار کے لئے ایک قطعہ لکھ دیا تھا۔ یہ پتھر نہ ہوتا تو قاضی عبدالودود، مولانا عرشی اور مالک رام جیسے محقّق سر مارتے پھرتے۔ میری خاک کا پتہ نہ چلتا۔ یہ لال کنویں کے حکیم عبدالحمید ہمدرد دواخانے والے بھی خوب آدمی ہیں۔ میری قبر کے پاس کیسی شاندار عمارت کھڑی کر دی اور نہ جانے کیا سوجھی اُس کا نام "غالب اکاڈمی" رکھ دیا۔ ارے بھائی، میرے نام کے ساتھ صفتِ نسبتی "اکبرآبادی" یا "دہلوی" ہو سکتی ہے، لوگ گرامی یا پگرامی بھی ہوتے ہیں۔ یہ میں "اکاڈمی" کیسے ہو گیا؟ اور سنیئے۔ حکیم صاحب نے یہ بھی کمال کر دکھایا کہ اس عمارت میں اُن اشیاء کے نمونے جمع کر دیئے جن کا ذِکر میری تحریروں میں آیا ہے۔ یعنی چکنی سپاری، آم، کباب، بیسنی روٹی، خمیری روٹی، مربّے۔ وہ کم بخت تو یہ چاہتے تھے کہ انہیں میری اولڈ ٹام، بلکہ اور شمپئین کی بوتلیں نہیں مل سکیں، ورنہ اُن کی بھی نمائش کر ڈالتے اور مجھے حوروں کے سامنے شرمندہ کر دیتے۔

یہ بھی کیا حسنِ اتفاق ہے جب اِس دُنیا سے رخصت ہوا تھا تو اُس وقت اِس مُلک پہ ایک نیک دِل ملکہ حکومت کرتی تھی اور اب سو برس بعد بھی حکومت کا کاروبار ایک دُور اندیش عورت ہی کے ہاتھوں میں ہے۔

۱۷ فروری کو دِلّی میں بہت بڑا اجتماع ہوا۔ اِسی موقع پر اندرا جی اور میاں ذاکر حسین کو دیکھا۔ نورِ چشم فخرالدین علی احمد نے اِس تقریب میں خوب بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ کیوں نہ لیتے۔ لوہارو خاندان کے تعلق سے وہ میرے عزیز ہوئے۔ جلسے میں بڑے بڑے عالموں اور فاضلوں نے اِس حقیر کے کلام کو سراہا۔ جس لائق نہ تھا وہ بتایا۔ اُن میں ولایت سے آئے ہوئے فرنگی عالم بھی تھے۔ کیا خدا کی شان ہے، جس شخص کے اشعار بے معنی اور مہمل بتائے جاتے تھے، اب اُسی کے کلام کی ایسی تاویلیں ہو رہی ہیں جو خود شاعر کے گمان سے باہر۔ ایک مہربان نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ہندوستان میں دو الہامی کتابیں ہوئی ہیں، "وید مقدّس اور دیوانِ غالب"۔ معاذ اللہ، بھائی قرآن کی قسم، انجیل کی قسم، توریت کی قسم، زبور کی قسم، ہنود کے چار بید کی قسم، دساتیر کی قسم، ژند کی قسم، پاژند کی قسم، اُستاد کی قسم، گرو کے گرنتھ کی قسم کھا کر کہتا ہوں، ایسی کوئی بات نہیں۔ میرے کلام کی جو خوبی ہے تو بس اتنی کہ اِسے سمجھنے کے لئے دِل گداختہ چاہیئے ؎

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دُور ہے اسدؔ　　　پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

اور سنیئے! جیسے غالب اکاڈمی کی عمارت پر میرا نام کافی نہ تھا کہ برخوردار فخرالدین علی احمد نے ایک اور بڑی شاندار عمارت بنوانے کا اعلان کر دیا۔ اُس کا نام ہوگا "غالب ہال"۔ ہائے یہ کیا ستم ہے، کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ غالب کس حال میں ہے؟ نہ کسی نے فاتحہ کے لئے ہاتھ اُٹھایا، نہ مغفرت کی دُعا کی اور عمارت "غالب ہال" بنوا دی۔ آج میرے نام پر محل اور ایوان کھڑے ہو رہے ہیں۔ کل تک میرا یہ حال تھا ؎

گھستے گھستے پاؤں میں زنجیر آدھی رہ گئی　　　مر گئے پر قبر کی تعمیر آدھی رہ گئی

عرصے سے میرا معمول ہے کہ دِل بہلانے قریب کے باغ میں چلا جاتا ہوں، یہ باغ ہے، سبزہ و شاداب جس میں گل ہیں ہزار در ہزار، میوہ دار درخت بے شمار، زمین سراسر سبزہ زار، بہت سے حوض، بہت سی نہریں، مٹّی نظر نہیں آتی، سبزہ یا نہریں۔ یہیں دوسرے احباب کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولوی شبلی نعمانی بھی مل جاتے ہیں، اُن کی زبانی شہر بمبئی کا ذِکر سنا تھا۔ آزاد بمبئی کے نام پہ شیفتہ، شبلی اِس شہر پہ

فریفتہ۔ بابلبل شبلی اپنا شعر پڑھتے ۔

شادِ بمبئی کن ہر قبائے کہنۂ و نو را
طرازِ مسندِ جمشید و فرِ تاجِ خسرو را

اور ابوالکلام فرشتوں کے سامنے شبلی کو چھیڑنے کے لئے کہتے ۔ "مولانا! اپنا وہ شعر بھی تو پڑھیئے ۔"

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنارِ آبِ رکناباد و گلگشتِ مصلیٰ را

اور کبھی آزاد مجھ سے کہتے، قبلہ، آپ کلکتے کے بعد ایک بار بمبئی دیکھ لیتے تو اپنے شعر کو یوں بدل دیتے ۔

بمبئی کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

اِنہیں باتوں کے سبب دِل میں آئی کہ کیوں نہ دِلّی کے بعد بمبئی بھی دیکھ لیجئے۔ کون جانے پھر یہاں آنا ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ اپنے راہبر کے ساتھ بمبئی آیا۔ اور سیدھا اِحاطۂ صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ پہنچ گیا۔ اب جو دیکھتا ہوں تو بجلی کے قمقمے جگمگا رہے ہیں۔ میدان کو بقعۂ نور بنا رکھا ہے۔ ہزاروں آدمی ہیں کرسیوں پر بیٹھے۔ ہزاروں کھڑے ہیں۔ سامنے شہ نشیں پر وزیرِ اعلیٰ تشریف رکھتے تھے، نوجوان شعراء تھے، اور ایک شعلہ بیان خاتون بھی تھیں جن کا نام اِس وقت بھولتا ہوں۔ غرض بڑا شاندار مجمع تھا۔ بھائی، کیا بتاؤں، کیسا دِل خوش ہوا اپنے قدردانوں کو اتنی بڑی تعداد میں دیکھ کر۔ جن میں ہندو بھی تھے، پارسی بھی، سکھ بھی اور اہلِ اِسلام بھی۔ ہائے، اب جو سنتا ہوں کہ کچھ لوگ اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان بتلاتے ہیں تو مجھے ایک ایک کرکے اپنے شاگرد یاد آتے ہیں۔ ہر گوپال تفتہ، جواہر سنگھ جوہر، شیو نرائن آرام، منشی ہیرا لال، مکند بے جگر۔ اِن میں سے کون تھا جو اردوئے معلیٰ سے پیار نہ کرتا تھا۔ اِس زبان پر دِل و جان نثار نہ کرتا تھا۔ جلسے میں خوب خوب دادِ سخن ملی۔ میری غزلیں گائی گئیں۔ اِس موقع پر بمبئی والوں نے میرا اردو دیوان بھی صدی ایڈیشن کے نام سے شائع کیا۔ ایک نظر میں نے بھی دیکھا۔ سبحان اللہ۔ چشمِ ما روشن، دِلِ ما شاد! خدا بھلا کرے دِلّی والے منشی شام کرشن نگم کا، اُس نے ہم وطن ہونے کا حق ادا کر دیا۔ کس اہتمام سے دیوان چھاپا۔ ایک روز عالمِ بالا میں میرے اردو دیوان کے سات مختلف نسخوں کا پارسل پہنچا۔ اُس وقت مجھے اپنا وہ شعر یاد آگیا ۔

سات جلدوں کا پارسل پہنچا
واہ کیا خوب، برمحل پہنچا

اِس پارسل میں جرمنی کے کاویانی پریس میں میاں ذاکر حسین کے ہاتھ کا چھپا ہوا حبیبی دیوان، دوسرا عبدالرحمٰن چغتائی کا مصوّر نسخہ، تیسرا عرشی رام پوری کا نسخہ۔ چوتھا مالک رام کا تصحیح کیا ہوا نسخہ، پانچواں لالہ یودھراج کے اہتمام سے چھپا ہوا سردار جعفری کا نسخہ، چھٹا مرقعِ غالب جو ابھی حال میں دِلّی سے چھپا ہے۔ اور ساتواں اُس دیوان کا نسخہ جو پہلی بار اکتوبر ۱۸۴۱ء میں سید المطابع میں چھپا تھا۔ کیا نیرنگیٔ زمانہ ہے۔ ایک وہ دیوان جس کی طباعت دیکھ کر جھلا کر میں نے میر مہدی مجروح کو لکھا تھا۔ "دِلّی پر آہن کے پانی پر اور آہن کے چھاپے خانے پر لعنت، صاحبِ دیوان کو اِس طرح یاد کرنا جیسے کوئی کتے کو آواز دے۔" جانتے ہیں؟ اُس وقت حقِ تصنیف میں دیوان کا صرف ایک نسخہ مجھے دیا گیا تھا۔ باقی جلدیں میں نے مول لے کر عزیزوں اور دوستوں میں تقسیم کی تھیں اور اب دیکھتا ہوں تو اُسی دیوان کے کیسے کیسے نفیس نسخے بازار میں بک رہے ہیں۔ نہ جانے کتنے لوگوں نے اِس سے کتنا منافع حاصل کیا! آپ کا چھاپا ہوا دیوان بھی نہایت دیدہ زیب ہے۔ اِس میں میری تصویر بھی اعلیٰ ہے۔

پس سچ ہے کہ بمبئی والوں کا سلیقہ اور کام دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ وہ بڑے میاں مولوی عبدالحق نام کے ٹھیک ہی کہتے تھے ۔

خوشا بمبئی تجھ پہ اردو کا سایا
تجھے جیسا سنتے تھے ویسا ہی پایا

غرض شب و روز کا یہ سب تماشا دیکھنے کے بعد یہ فقیر پھر کرۂ ارضی سے اپنے دائمی مستقر کو پہنچ گیا۔ آج آپ نے جشن کے خاتمے کی محفل جمائی ہے۔ نواب صاحب صدر ہیں۔ اُن کو میرا آداب کہیئے۔ اُن سے کہتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ لیکن ڈرتے ڈرتے کہتا ہوں، قبلہ و کعبہ،

میرے دیوان کے پہلے چھاپے کی ایک جلد آپ کے شہر حیدرآباد کے کتب خانۂ آصفیہ میں رکھی ہے۔ اُس کی غلطیاں مَیں نے خود اپنے قلم سے درست کی ہیں۔ اُسے حفاظت سے رکھیے۔ خدا نہ کرے اُس کا حشر بھی بھوپال والے نسخۂ حمیدیہ جیسا ہو جائے۔

یہ مکتوب خاصا طویل ہو گیا، اے اہالیانِ بمبئی، قدر افزائے غالب، تم سب کو میرا سلام، اب بہ صد حسرت و یاس تم سے یہ کہتا ہوا رخصت ہوتا ہوں ؎

نہ دے نامے کو اِتنا طُول غالبؔ، مختصر لکھ دے
کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستم ہائے جُدائی کا

آپ سب کی دعاؤں کا طالب
اُسد اللہ خاں غالبؔ

حضرات ! خط تمام ہوا۔ میرا اِخلاقی جرم طشت از بام ہوا۔ اگر اُس کی معافی درکار ہے تو بندہ معافی کا خواستگار ہے۔

● بقیہ صفحہ ۱۶۔ تاریخ ادب کی تدریس ●

ان اصناف کی ماہیت اور اہمیت اُن کے تدریجی اِرتقاء اور اُن کے متعلق ان زبانوں کے نقادوں کی آراء کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اِسی طرح ناول اور مختصر افسانہ یا علیگڑھ تحریک کا جائزہ لیتے ہوئے انگریزی کے اَثرات پر روشنی ڈالنا ناگزیر ہے۔ المختصر تاریخِ ادب کی تدریس میں تاریخ، تحقیق اور تنقید کا ایسا متناسب امتزاج ہونا چاہیئے کہ طلبہ اُردو ادب کو اُس کے صحیح تناظر میں دیکھ سکیں اور اُنکے ذوقِ ادب کی بھی آبیاری ہو۔

● بقیہ صفحہ ۳۰ "میرا گاؤں، میری مسکراہٹ" ●

ساتھ ماں بننے کی آرزو مند تھیں میں تمہارے اِس فطری اور مقدس جذبہ کا ہمیشہ احترام کیا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ ہر عورت اِس جذبہ کے ساتھ جنم لیتی ہے۔ لیکن تباہی کی آگ اور خون کی ندیاں جو میں نے دیکھیں، اُن کے بھیانک تصور نے مجھے مرتے دم تک اِس طرح لرزہ براندام رکھا کہ میں نے یہ کبھی نہیں چاہا کہ ہمارے یہاں اولاد ہو، مبادا میرے بچے بھی اُس بھیانک آگ میں جلیں، جس میں میرا خاندان اور میرا گاؤں جلا تھا اور موت کے بعد شروع ہونے والی زندگی میں بھی میری روح اُسی طرح بلکتی اور تڑپتی رہے جس طرح میں زندگی بھر بلکتا اور تڑپتا رہا۔ میں تم کو دنیا میں بالکل تنہا چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ میری ، میری اچھی میری ، میرے دل میں تمہارے لئے کوئی بُرائی نہیں ہے، مجھے معاف کر دو۔ مجھے اُمید ہے تم ضرور معاف کر دوگی کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم مجھ کو بے پناہ چاہتی ہو۔"

میری نے آنسو پونچھ ڈالے، ایک پھیکی سی مسکراہٹ نے اُس کے

ہونٹوں پر پھیلنے کی ناکام کوشش کی اور وہ بھرّائی ہوئی آواز میں چیخ پڑی "میں نے معاف کیا میرے عیسیٰ مسیح نے معاف کیا میرے خدا نے معاف کیا۔" قبرستان کے گیٹ پر ایک اندھا بوڑھا فقیر کمر اٹھا کر درد بھری آواز میں گا رہا ہے ؎

درندو! جنگلوں سے آؤ اور اِس کی گواہی دو،
کہ اِنساں سے نہیں پائی ہے انساں نے اماں ابتک

● بقیہ صفحہ ۵۰۔ غنچۂ ارم ۔ ایک نایاب تذکرہ ●

بنگال کے اُردو شاعروں کا یہ فارسی تذکرہ ایک گمنام شاعر یقینؔ پر ختم ہوتا ہے۔

" یقین محمد یحییٰ خلف حاجی مہر اللہ تاجر کتب، کلکتہ مولد و مسکن ہے۔"

یقینؔ کو بنگال کے شاعروں نے کوئی جگہ نہیں دی۔ نساخؔ نے بھی اُنہیں درخورِ التفات نہیں سمجھا۔ یقینؔ نے پہلے نواب علی خاں نفیسؔ کا پندری کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ پھر یقینؔ تذکرہ سے شور سخن کرنے لگے۔ یہ دوسرے درجہ کے شاعر تھے۔ مولوی نجف رامپوری نے شاگرد ہونے کے ناتے سے اُن کو اپنے تذکرے میں جگہ دیدی ہے۔ ان کی جو غزلیں ہمیں ملی ہیں وہ پھیکی پھیکی سی اور بے رنگ ہیں ؎

اچھا ہوا کہ غیر کا ارمان نکل گیا	سوزِ فراق سے دلِ مشتاق جل گیا
آئی صدائے مرغِ سحر دل نکل گیا	کیونکر خوشی ہو وصلِ صنم کی مجھے بھلا
آنسو چلو تعز فلک پر سے باہر	کچھ غرت خدا بھی یقیں یا نہیں تجھ کو

تذکرۂ غنچۂ ارم کے نسخہ پر سنہ اِشاعت ۱۳۰۲ھ درج ہے تالیف سبب بھی اختصار سے بیان ہوا ہے۔ اُس عہد کے دوسرے تذکروں جیسا ہے۔ بس فرق اِتنا ہے کہ بنگال کے کئی اچھے گمنام شاعروں سے ہم واقف ہوئے ہیں۔

۱۔ غنچۂ ارم مطبوعہ ۱۳۰۲ھ ص ۱۱۷
۲۔ " " " " ۲۲۸

حاشیہ

محمد حسن

اُردو کا معاملہ اور رسمِ خط کا قضیہ

ہر دور کی اپنی حکمتِ عملی ہوتی ہے۔ ہمارے دَور نے اپنی منفرد حکمتِ عملی وضع کی ہے۔ بات خواہ کیسی ہی رکیک اور بے جا کیوں نہ ہو، ظلم خواہ کتنا ہی واضح اور صریح کیوں نہ ہو۔ ہمارا دَور اُسے خالص علمی مسئلہ بنا کر اسے ڈبیٹنگ سوسائٹی کے سپرد کر دیتا ہے۔ مدّت ہوئی کرپشن اور بدعنوانی پر توجہ مبذول ہوئی، سیمینار ہوئے، رپورٹیں لکھی گئیں۔ اور ایک ماہرِ اقتصادیات نے اپنی مستند کتاب "کرپشن اِن انڈیا" میں یہ ثابت کر دیا کہ دراصل اِس قسم کی بدعنوانیاں تو بہ ترقی صنعتی سماج کے ابتدائی دَور کا ہر ملک میں خاصہ رہی ہیں۔ اور ان کا سبب اگر کچھ ہے تو قوم کی بدلتی ہوئی نفسیات ہے۔ لیجئے۔ سارا مسئلہ حل ہو گیا۔ پہلے قوم کی نفسیات بدلیئے۔ پھر کرپشن دُور کرنے کا نام لیجئے۔ فرقہ واریت کے خلاف ہوا چلی تو فرقہ واریت کی تعریف میں وہ موشگافیاں پیدا کی گئیں کہ ملک میں کوئی سیاسی پارٹی تو کیا کوئی فرد بھی بالیقین فرقہ پرست نہیں کہا جا سکتا۔ فسادات کا سبب یہ ٹھہرا کہ دراصل اقلیتیں پسماندہ ہیں اور جب تک اِن کی ذہنیت تبدیل نہ ہو اور انہیں "ہندیا" نہ لیا جائے اُس وقت تک فسادات کا سدِّباب ممکن نہیں۔

اب آیا اُردو کا معاملہ۔ اوّل یہ مسئلہ اُٹھا کہ صاحب، اُردو کی تعریف کیا ہے؟ پتہ چلا کہ تعریف کی تلاش میں اُردو زبان کا وجود ہی غائب ہو گیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ اُردو ہندی سے الگ کوئی زبان ہے ہی نہیں؟ ہاں ایک رسمِ خط ضرور ہے، جس پر اُردو کے نام کا اتہام لگایا جا سکتا ہے، مگر دراصل وہ بھی عربی یا زیادہ سے زیادہ فارسی رسمِ خط ہے۔ اگر اُسے تبدیل کر دیا جائے تو اُردو کا سارا معاملہ حل بلکہ تحلیل!

جہاں تک مسئلوں کو علمی بنا کر تحلیل کرنے کی نئی ٹیکنک کا سوال ہے یہ نسخہ بڑا ہی تیر بہدف ہے، مگر سینہ زوری سے اگر سب کچھ حل ہو جاتا تو پھر انصاف کا نام کوئی نہ لیتا۔ اِس ٹیکنک سے قطعِ نظر ذرا اِس علمی مسئلے کے علمی پہلو پر بھی غور کر لیجئے۔

(۱)

اُردو الگ زبان ہے یا نہیں؟ اِس کا فیصلہ کرنے کے لئے دراصل ماہرینِ لسانیات اور علماء کے گرد چکر کاٹنا اتنا ضروری نہیں جتنا کہ ہندوستان کا آئین بنانے والوں سے رجوع کرنا لازم ہے۔ ہندوستان کے آئین نے اچھا کیا یا بُرا، صحیح کیا یا غلط، حقیقت یہ ہے، کہ شیڈول ۸ میں جہاں قومی زبانوں کی فہرست دی گئی ہے وہاں دو الگ الگ زبانوں کی حیثیت سے اُردو اور ہندی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اُردو والے بیچاروں کی کیا مجال کہ وہ یہ زبان پر لائیں کہ دستور میں تبدیلی کر دی جائے وہ تو صرف اتنی بات کہتے ہیں کہ دستور میں جو کچھ لکھا گیا ہے اُس پر خلوصِ دِل سے عمل درآمد کیا جائے۔ جب اُردو کو قومی زبانوں میں جگہ دی گئی ہے تو دوسری قومی زبانوں کی طرح اسے بھی علاقائی اور سرکاری دونوں حیثیتیں ملیں، وہ قومی زبان تو مانی جائے مگر قوم کے کسی گروہ اور ملک کے کسی علاقے سے اُس کا تعلق نہ ہو۔ یہ بات اُردو دنیا کی سمجھ میں نہیں آتی۔ بات فقط اتنی سی ہے اِس میں یہ فقہی عذر نکالنا کہ اُردو الگ زبان ہے بھی یا نہیں یا محض ہندی ہی کی ایک شکل ہے، یا اِس کا رسمِ خط تبدیل کرنا چاہیئے یا یہ مسلمانوں کی زبان ہے۔ یہ ساری باتیں غیر متعلق ہیں، حالانکہ ان پر الگ الگ گفتگو ہو سکتی ہے۔ مگر ان باتوں سے اُردو کے آئینی حق پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ دستور نے اُردو کو جو حقوق دیئے ہیں اِن پر عمل درآمد ہونا چاہیئے اور ان کی نوعیت یہ ہے:۔

(الف) اُن علاقوں میں جہاں اُردو بولنے والوں اور لکھنے پڑھنے والوں کی کافی تعداد ہے اُردو کو بھی علاقائی اور ثانوی سرکاری

زبان کی حیثیت حاصل ہو اور وہاں کے اسکولوں میں اُردو کی تعلیم کا انتظام اور وہاں کے دفاتر میں اُردو میں بھی کام کرنے کی سہولت دی جائے۔

(ب) اُردو والوں کو وہ تمام سہولتیں دی جائیں جو دوسری قومی زبانوں کو حاصل ہیں۔

(۲)

اب چند غیر متعلق مباحث پر گفتگو کر لیجئے جن کی آڑ لے کر اُردو کے سیدھے صاف معاملے کو اُلجھانے کی کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ اُردو کوئی زبان ہے بھی یا محض ہندی کا ایک ادبی اسلوب ہے؟ جو لوگ اِس قسم کی بات کرتے ہیں دراصل ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک بددیانت ہیں دوسرے دیانتدار۔ بددیانت لوگ صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہندی کا اسلوب کہہ کر اُردو کا سر قلم کر دیا جائے۔ اِن کے رشتے ہندی۔ ہندو۔ ہندوستان کے نظریئے سے جا کر ملتے ہیں۔ خواہ ان میں سے بعض اپنے کو اشتراکی ہی کیوں نہ کہتے ہوں۔ مثلاً (راہل سنکرتائن) اِن حضرات کے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ شاید ہی دنیا کی زبانوں کی تاریخ میں ایسی دو زبانوں کا کبھی کہیں وجود رہا ہو جو اُردو اور ہندی کی طرح ایک دوسرے سے اتنی قریب بھی ہوں اور اتنی دُور بھی۔ وجہ اِس کی محض اِتفاق نہیں بلکہ ہندوستان کا مخصوص ارتقا ہے۔ ہندوستان مختلف قومیتوں، مختلف تہذیبی منطقوں اور مختلف زبانوں کا ملک ہے۔ یہاں کے رہنے والے ابھی قوم بنے نہیں ہیں۔ قوم بننے کے عمل سے گزر رہے ہیں اور یہ عمل جبری نہیں ہو سکتا۔ محض رضاکارانہ اور خوش دلی سے ہو سکتا ہے۔ اِن پر ایک قوم، ایک تہذیب اور ایک زبان عائد نہیں کی جا سکتی، بلکہ ان کے باہمی اور مسلسل میل جول اور اختلاط سے ایسی ایک صورت پیدا ہو گی جس میں عجلت اور جبر رخنہ ڈال سکتے ہیں مدد نہیں کر سکتے۔

اب دیانتدار حضرات کو لیجئے۔ یہ بیچارے کہنا کچھ اَور چاہتے ہیں، کہتے کچھ اور ہیں۔ کہنا تو یہ چاہتے کہ بولی جانے والی اُردو اور بولی جانے والی ہندی ایک ہے اور اِن دونوں میں اگر فرق ہے تو بہت معمولی سا۔ اِن کی اِتنی بات صحیح ہے، مگر غلطی اُس وقت ہوتی ہے جب وہ اِس مشترک لِسانی بُنیاد کو ہندی کا نام دے دیتے ہیں، اِسے ہندی کہنا بھی اِسی قدر غلط ہے جتنا اسے اُردو کہنا۔ اِسی لئے اِس کے لئے ایک نام ایجاد ہوا تھا اور وہ تھا ہندوستانی۔ اِس بیچاری کو آپ کا آئین سرے سے زبان ہی تسلیم نہیں کرتا۔ اِسی لئے یہ لوگ جب کہتے ہیں کہ اُردو ہندی سے الگ کوئی زبان نہیں ہے۔ اور ہندی کا ایک اسلوب ہے تو کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ہندی اور اُردو دونوں الگ الگ وجود نہیں رکھتیں بلکہ اُن کا بُنیادی رُوپ ایک ہے اور اِس کا نام ہندوستانی ہے جو دو رسم خط میں لکھا جاتا ہے۔ گاندھی جی ہندوستانی کے بھگت رہے۔ پنڈت نہرو نے اِن دونوں رسم خط میں لکھی جانے والی ہندوستانی کی حمایت کی اور جب عملاً ملک کا دستور بنانے بیٹھے تو اِس زبان کو ملک بدر کر دیا۔ اب ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ آئین تبدیل ہو، اور قومی زبانوں کے شیڈول سے اُردو اور ہندی دونوں کو خارج کر کے ہندوستانی کا نام لکھا جائے اور یہ صراحت کی جائے کہ یہ دونوں رسم خط میں لکھی جا سکتی ہیں۔ تب کام پورا ہو گا۔ اُردو والے اس کو دُور کی کوڑی جانتے ہیں اور ہندوستانی کے لئے غیر اُردو داں طبقے میں کوئی جوش اور جذبہ نہیں پاتے۔ اِس لئے اتنی بڑی مہم اٹھانے کے بجائے اِس قناعت کر لیتے ہیں کہ صاحب اگر آپ اُردو اور ہندی کو (یعنی ہندوستانی کے دو روپ) الگ الگ جانتے اور مانتے ہیں تو یوں ہی سہی، جو سہولتیں آپ نے ایک رُوپ ہندی کو دے رکھی ہیں وہی یا اِن میں کچھ دوسرے رُوپ یعنی اُردو کو بھی دیدیجئے۔

(۳)

اب رہا مسئلہ رسم الخط کا، اِسے یاروں نے خلطِ مبحث کے طور پر بڑی خوبصورتی سے اُلجھایا ہے، بات وہی ہے۔ فسادات کا حل یہ ہے کہ مسلم پرسنل لا میں ترمیم کر دی جائے، اُردو کے مسئلے کا حل یہ ہے کہ رسم خط بدل دیا جائے، باتیں دونوں غیر متعلق ہیں۔ اِسے کہتے ہیں "ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ"۔ اب اگر رسم خط کے مسئلے پر گفتگو کیجئے، اس کے خلاف یا اس کی حمایت میں دلیلیں دیجئے تو حریفوں کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

شاعر بمبئی

یعنی معاملہ اُردو کے جائز حقوق سے ہٹ کر رسم خط کی بحث پر آکر ٹھہر جاتا ہے۔ دیکھئے تو سمجھا جائے گا کہ یہیں پانی مرتا ہے:

جس زبان کا نام اُردو ہے اور جسے آئین نے تسلیم کیا ہے اس کا تصوّر اس کے مروجہ رسم خط کے بغیر نہیں کیا جاسکتا اس لئے موجودہ شکل میں اُردو کو آئینی حقوق ملنے کے سلسلے میں رسم خط نہ کوئی رکاوٹ ہے نہ مسئلہ۔ پھر اس کے اور بھی کئی پہلو ہیں۔

اُردو ایسی زبان ہے جو صرف ہندوستان میں ہی نہیں بولی اور لکھی جاتی، اس کے لکھنے والوں کا ایک بہت بڑا گروہ پاکستان میں ہے جہاں سے روزنامے اور ہفتہ وار اخبار تک نکل رہے ہیں۔ ماریشس اور کینیا سے لیکر برما تک اُردو والوں کا حلقہ پھیلا ہوا ہے۔ اب اگر ہندوستان کے اُردو والے یکقلم ناگری رسم خط اختیار کر بھی لیں تو اُردو رسم خط کا نام و نشان تو دنیا سے مٹنے سے رہا۔ البتہ یہ ہوگا کہ ہندوستان کا اُردو داں طبقہ اپنے کو اُردو ادب کے اچھے خاصے بڑے حصے سے ناآشنا کرلے گا۔ (اس ضمن میں دہلی یونیورسٹی کے جدید ہندوستانی زبانوں کے پنجابی شعبے کی نظیر قابل لحاظ ہے، جنہوں نے اپنے ایم اے کے طلبہ کے لئے گورمکھی کے ساتھ اُردو رسم خط سیکھنا بھی لازمی قرار دیا ہے۔ اور پنجاب فہمی کے سلسلے میں اپنے کورس میں اقبال اور فیض کے مجموعے نصاب میں شامل کئے ہیں) ہم زبان کو دو رسم خط میں بانٹ کر نہیں بچا سکتے۔

پھر لوگ بدقسمتی سے ایسے بھی ہیں جن کے کان میں پاکستان کا لفظ پڑے تو چونک پڑتے ہیں۔ اور اس کا نام دینے والے کو قوم دشمن، غدّار پاکستانی ایجنٹ وغیرہ خطابات سے نوازتے ہیں، وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ سیاسیات میں دوستی اور دشمنی ناپائیدار ہوتی ہے۔ آج کے دوست کل کے دشمن بھی ہوتے ہیں۔ اور اس کے برعکس بھی اکثر ہوتا رہتا ہے۔ ہم جغرافیے کو نظرانداز نہیں کرسکتے، تاریخ اور تہذیب کے سارے رشتے دامن جھٹک کر توڑ نہیں سکتے آج نہیں تو کل اور کل نہیں تو پرسوں یہ دونوں ملک قریب آئیں گے۔ اتنے قریب کہ شاید پھر ایک ہوسکیں، مگر جبر کی بنیاد پر نہیں رضامندی اور خیرسگالی سے، اور اس رضامندی اور خیرسگالی کا سب سے بڑا رشتہ اُردو ہوسکتی ہے یا پھر کسی حد تک پنجابی اور بنگالی ——— پھر لطیفہ یہ ہے کہ اُردو رسم خط تبدیل کرنے کی ساری بحث کشمیر کو نظرانداز کرکے ہوتی ہے۔ وہاں ایک متنفس ناگری رسم خط نہیں جانتا۔ کیا ہم کشمیر سے قطع نظر کرلیں اور وہاں اُردو کی تعلیم کا کام بند کردیا جائے یا کشمیر میں اُردو اپنا موجودہ رسم الخط باقی رکھے گی اور باقی ہندوستان میں ناگری رسم خط اختیار کرلے گی؟ گویا اپنے گھر میں خود ہی عجوبہ بن جائے گی۔

اس کے علاوہ اس صدیوں کے فنی، روایتی، قانونی، ادبی اور علمی سرمائے کا کیا ہوگا۔ جو اُردو رسم خط میں محفوظ ہے اور سب اہم کاغذات کو جانے دیجئے، اگر آج کوئی صرف قانونی دستاویزوں ہی کا جائزہ لے تو اس کا سرمایہ بڑی حد تک اُردو رسم خط میں ملے گا۔ ہندوستان کی تاریخ مرتب کرنی ہو یا گزرے ہوئے زمانے کی کوئی تحقیق طلب بات تک رسائی حاصل کرنی ہو تو ہر صورت میں اُردو رسم خط کا سہارا لینا ہوگا۔ کیا ہم آج کی سہولت کے لئے ماضی کی وراثت کو حرفِ غلط کی طرح مٹانے پر آمادہ ہیں۔ اس میں اُردو کا جو نقصان ہوگا وہ تو ہوگا خود ہندی کے لاتعداد مخطوطے ضائع ہو جائیں گے جو سیّد محمد جائسی کی پدماوت کی طرح اُردو رسم خط میں دستیاب ہوئے ہیں۔ تاریخ کا کتنا مواد، کیسے کیسے اہم مکاتیب اور دستاویزیں، کتنے علمی ذخیرے ہماری دسترس سے دور ہو جائیں گے۔ اس پورے ذخیرے کو ناگری رسم خط میں منتقل کرنا ممکن نہیں۔ اور اگر ہو بھی تو اس کا صرفہ اُردو کو حقوق دینے کے صرفے سے کم سے کم دس گنا ہوگا۔

دراصل اس غلط فہمی کا بنیادی سبب یہ مفروضہ ہے کہ رسم خط کا اختلاف لوگوں کو اور تہذیبوں کو ایک دوسرے سے دور کرتا ہے۔ یہ تاریخ کو غلط طریقے سے پڑھنے کا نتیجہ ہے۔ تاریخ میں اکثر ایسا ہوا ہے کہ دو ایسے ممالک جن کا رسم خط (اور زبان) دونوں ایک ہیں۔ دوست کم پہلے دشمن رہے ہیں۔ اور یوں بھی ہوا ہے کہ مختلف رسم خط اور مختلف زبانوں کی قومیں شیر و شکر رہی ہیں۔ ایک ہی ملک میں اس قسم کے اختلافات موجود رہے ہیں۔ اور انہوں نے دوری پیدا نہیں کی ہے۔ خود پنجابی زبان آج بھی دو رسم خط میں لکھی جاتی ہے۔ اور دونوں طرز میں لکھنے والے اسے پنجابی ہی کہتے ہیں۔ یہی حال سندھی کا ہے، اس لئے یہ دلیل کہ رسم خط تفرقہ پیدا کرتا ہے صحیح نہیں ہے۔ اس لئے رسم خط کی تبدیلی پر زور دینا ایسا ہی ہے جیسے یہ خیال کرنا کہ مسلم پرسنل لا میں تبدیلی سے فسادات رک جائیں گے۔

پھر ایک سوال اور بھی غور طلب ہے۔ اُردو کے اُن چند ادیبوں نے جن کی تخلیقات ناگری رسم خط میں چھپنے لگی ہیں یہ کیسے فرض کرلیا کہ

سوادِ اعظم سے صرف ناگری رسم خط مراد ہے، اُردو قومی زبانوں میں سے ہے اور اس کا حلقہ ہندوستان گیر ہے۔ میسور کے رہنے والے ناگری رسم خط کی جگہ کنڑی رسم خط کیوں اختیار نہ کریں۔ بنگال میں اُردو بولنے والے بنگلہ رسم خط اختیار کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔ بمبئی کے رہنے والے اُردو داں مرہٹی رسم خط اور پنجاب کے اُردو داں گورمکھی رسم خط اختیار کریں تو پھر اُردو کہاں رہے گی۔

اس کے علاوہ فرض کر لیجیے کہ اُردو والوں نے ناگری رسم خط اختیار کر لیا تو پھر ہندی اور اُردو کے درمیان صرف ایک شے امتیاز کی نشان رہ جائے گی اور وہ ہیں فارسی عربی کے چند الفاظ، اصطلاحیں اور آوازیں۔ ان میں سے کون سی شے ایسی ہے جو بطور خاص اس غرض سے گزیر ہو کہ رسم خط تو تبدیل کر دیا جائے اور اُسے نہ بدلا جا سکے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ "پرتاپ" اور "ملاپ" اُردو کے اخبارات ہیں۔ لیکن کے باوجود ان میں ٹھیٹھ ہندی بلکہ سنسکرت تک کے الفاظ کی بہتات ہوتی ہے۔ اگر قومی یک جہتی کے قیام کے لیے رسم خط تبدیل کرنا لازمی ہے تو پھر ان چند الفاظ کو تبدیل کرنے میں کیا دقت ہے؟ گویا رسم خط تبدیل کرنے کے بجائے اگر کھلم کھلا یہی اعلان کیا جائے کہ اُردو دنیا اُردو سے تائب ہوتی ہے اور سرکاری ہندی کے ہاتھ پر بیعت کرتی ہے تو رسم خط کے ترک کرنے سے جو عمل ادھورا رہتا ہے وہ پورا ہو تا ہے اور اُردو والے بھی سوادِ اعظم میں شریک ہو کر ہندی، ہندو۔ ہندوستان کے نعرے کے ہم نوا ہوتے ہیں اور اسی کا نام ہے بھارتیہ کرن!

(۴)

اب اس فریاد پر بھی ذرا غور کرتے چلئے کہ اُردو نے اپنا ذہنی اور جذباتی رشتہ ہندوستان کی سرزمین اور یہاں کی تہذیبی فضا سے قائم نہیں کیا۔ یوں تو آج کی دنیا میں جو روز بروز سکڑتی جاتی ہے اور قومی حلقوں اور علاقوں سے آگے بڑھ کر عالمی تہذیب اور آفاقی اقدار کے طرز پر سوچ رہی ہے۔ اس قسم کی ملکی اور قومی حد بندیاں بے جا اور ناروا ہیں۔ دوسری بات یہ کہ زبان و ادب کا مستقبل ڈھالا جا سکتا ہے مگر اس کی ادبی روایات پر یہ اعتراض کہ وہ ایسی کیوں تھیں اور ویسی کیوں نہیں تھیں غیر منصفانہ ہے؟

اوّل تو یہ جاننا چاہیے کہ جو لوگ اس قسم کا اعتراض کرتے ہیں وہ شاید اُردو ادب کے تہذیبی سیاق و سباق پر غور کرنے کی زحمت ہی گوارہ نہیں کرتے۔ اُردو کا کمال تو یہ ہے کہ یہاں مرثیہ اور سلام جیسی خالص مذہبی نظمیں بھی ہندوستانی تہذیب، تاریخ اور جغرافیے کے پیرائے میں لکھی گئیں۔ مرثیوں میں ذکر کربلا کا ہے۔ مگر ریگستان، جنگل اور دشت و دریا سب ہندوستان کے سے ہیں۔ کردار عرب ہیں مگر ان کا لباس معاشرت، طرزِ احساس اور طرزِ گفتگو سب ہندوستانیوں کا سا ہے۔ شادی کے موقع پر سہرا باندھنا، مہندی لگانا تو صرف چند مثالیں ہیں، پوری تہذیبی تصویر ہی ہندوستانی ہے۔ یہ حال صرف مرثیئے کا نہیں، مثنوی کا بھی ہے اور داستانوں کا بھی اور دوسری اصناف کا بھی ہے۔ داستانوں کے بارے میں ہمایوں کبیر نے لکھا ہے کہ عمرو عیار کا کردار بڑی حد تک ہنومان جی کے طرز پر ڈھالا گیا ہے اور جس طرح ہندو دیو مالا میں مختلف دیوی دیوتاؤں کی چشمک ہوتی ہے اسی طرح یہاں بھی خیر و شر کی مافوق فطری طاقتیں ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہاں ان کو مذہبی نام دے دیئے گئے ہیں۔ غزل اور نظم سے لے کر افسانے اور ناول تک سب کا یہی حال ہے یعنی عکاسی ہندوستان کی تہذیب اور تاریخ کی ہے۔ مگر اسلوب اور نگارش اور علامات میں فارسی اور دوسری ادبیات سے بھی مدد لی گئی ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اُردو زبان اور ادب قومی مزاج کے آئینہ دار اور عکاس تو ہیں لیکن پیغمبر اور خداوند نہیں کہ ان تاریخ کے دھارے کو اپنی مرضی کے مطابق موڑ دیں۔ مثلاً یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان مختلف قومیتوں اور مختلف تہذیبی وحدتوں کا ملک ہے اور ان سے مل کر جو قومی یک جہتی اور تہذیبی یگانگت پیدا ہونی چاہیے تھی وہ ابھی تک تکمیل تک نہیں پہنچی ہے البتہ یہ عمل جاری ہے۔ اُردو ادب جو کچھ کر سکتا تھا وہ صرف اس صورتِ حال کی عکاسی کا کام تھا۔ وہ ان قومیتوں اور تہذیبی اکائیوں کو ایک قومی تہذیب کی شکل میں ڈھال لیتا، یہ اس کے کرنے کا کام نہیں تھا۔ جہاں تک بن پڑا اس نے اس اکائیوں کے نقاطِ اتحاد و اشتراک پر زور دیا۔ مگر اس سے آگے کے کام کا مطالبہ اس سے نہیں تاریخی قوتوں سے کرنا چاہیے۔ تاریخی قوتیں ہمیں بانٹتی رہیں، اُردو ادب ہمیں ملاتا رہا۔ لیکن بس اس

حد تک جہاں تک ادب اور زبان کا تعلق ہے یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ آریہ سماج کا پورا ادب اُردو میں ہے اور دوسرے مذاہب کی اُردو کے ذریعہ ترویج پانے کا کام اتنا ہوا ہے کہ اس پر پی ایچ ڈی کا ایک اچھا اور ضخیم مقالہ ڈاکٹر محمد عزیز نے "اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب کی ترویج میں اُردو کا حصّہ" کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ ناشر: انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ)

لیکن ہمارا قومی اور تہذیبی ورثہ ایک سیسہ پلائی ہوئی واحد دیوار نہیں ہے بلکہ رنگا رنگ پھلواری ہے۔ اب اُردو والے اس حقیقت کو کیسے جھٹلائیں کہ ہم ابھی ایک نہیں ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے تہذیبی طور پر مختلف ہیں۔ لیکن مختلف ہونا اور مخالف ہونا دو الگ الگ باتیں ہیں۔ مختلف ہونے کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ ہم ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ ہم ایسے کیوں ہیں۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ لیکن یہ بات سمجھ لینے کی ہے کہ ہندوستان میں چونکہ ایک تہذیبی روایت اور ایک مذہب کے لوگ نہیں بستے۔ اس لئے اگر کوئی ہیرو، کوئی تلمیح، یا کوئی اصطلاح کسی خاص مذہب یا فرقے سے متعلق ہو جاتی ہے تو وہ دوسرے فرقوں کے لئے ہمیشہ قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ تامل ناڈ آج تک رام کو ہیرو اور راون کو ولین تسلیم نہیں کر سکا۔ کرشن جی کے بارے میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کے ہندو فرقوں کے تاثرات جدا جدا ہیں۔ پھر اُردو والوں سے یہ مطالبہ کہ وہ لچھمن اور ارجن ہی کے تذکرے تک اپنے کو محدود کیوں نہیں رکھتے بے جا ہے۔ دراصل ایک بڑی دقت یہ ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک ہندو دیومالا اور ہندو مذہب کی روایات ہی صحیح معنوں میں قومی اور ہندوستانی روایات ہیں۔ (یہ مسئلہ بھی بحث طلب ہے) مگر اتنی بات تو واضح ہے کہ ایک مذہب کی روایات دوسرے تمام فرقوں کے لئے قابلِ قبول نہیں ہو سکتیں۔ اُردو میں جہاں چکبست نے رامائن کا ایک سین نظم کیا۔ اور دوارکا پرشاد اُفق اور منور لکھنوی تک ہندو دیو مالا اور مذہبی قصّوں کو نظم و نثر میں لکھنے کا سلسلہ جاری رہا وہاں قبولِ عام صرف غیر مذہبی کرداروں اور تلمیحوں ہی کو ملا ہے۔ اُردو ادب کی اصناف پر کسی مذہب کی مُہر نہیں ہے۔ اور یہ شرف شاید ہی کسی جدید ہندوستانی زبان کو حاصل ہو کہ اس کی ابتدا پر کسی مذہب کی مُہر نہیں لگی ہے۔ اس کے برخلاف ہندی ادب کے بہترین نمونے سورداس، تلسی داس اور میرا کے ہیں۔ جنہیں سمجھنا اور ان سے لطف لینا ہندو معتقدات کو مانے بغیر ممکن نہیں۔ (اُردو میں اگر کچھ مذہبی ادب ہے تو وہ مرثیئے تک محدود ہے اور اس کا حال اوپر بیان ہوا ہے) پھر دوسرے مذہبی معتقدات رکھنے والوں کے لئے ان کرداروں اور تلمیحات کو قبول کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔

(۵)

مختصر یہ کہ اُردو کے مطالبے کی نوعیت سیدھے سادے لفظوں میں صرف یہ ہے کہ:-

(۱) ہندوستان کے دستور نے چونکہ ہندی اور اُردو کو دو الگ الگ قومی زبانوں کی شکل میں تسلیم کیا ہے لہٰذا اُردو کو آئینی حقوق ملنے چاہئیں۔ یہ آئینی حقوق صرف اس قدر ہیں کہ اُردو والوں کے بچّے اُردو میں تعلیم حاصل کر سکیں اور یہ سہولت ابتدائی درجوں سے یونیورسٹی کی سطح تک ہو۔ دوسرے یہ کہ اُردو کو دفاتر اور سرکاری اداروں میں مناسب مقام دیا جائے۔

(۲) اگر ہندوستان کے دستور میں تبدیلی لازمی ٹھہرے تو ہندی اور اُردو دونوں کے نام خارج کر کے دیوناگری اور اُردو رسم خط میں لکھی جانے والی ہندوستانی زبان کو تسلیم کیا جائے اور دونوں رسم خط کے استعمال کرنے کی سہولت ہر سطح پر بہم پہنچائی جائے۔

ان جائز مطالبات کو ٹالنے کے لئے اُردو رسم خط میں کیڑے نکالنا یا اُردو ادب کے تہذیبی مزاج کے بارے میں اُلٹی سیدھی باتیں کرنا محض خلطِ مبحث ہے۔ بھیڑیئے نے بھیڑ کے بچّے کو کھانے کے لئے پہلے یہ الزام لگایا کہ وہ چشمے کا پانی کیوں گندا کر رہا ہے۔ بھیڑ کے بچّے نے کہا حضور! میں تو ڈھلان کی طرف کھڑا ہوں، پانی آپ کی طرف سے میری طرف بہہ رہا ہے۔ بھیڑیئے نے کہا۔ اچھا یہ نہ سہی۔ پچھلے جاڑوں میں تو نے مجھے گالی کیوں دی تھی۔ بھیڑ کا بچّہ عذر خواہ ہوا کہ پچھلے جاڑوں میں تو میری پیدائش بھی

(باقی صفحہ پر ۔۔ دیکھئے)

رؤف خیر

ہمارے بعد.....؟

(محترم اعجاز صدیقی کے اس شعر سے متاثر ہو کر)

"ہماری طرح کون اپنا لہو دیگا چراغوں کو
ہمارے بعد محفل میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے"

آپ اور آپ کے معاصر فنکاروں نے اپنے فن کی داد نئی نسلوں تک سے پالی لیکن نئی نسل کا فنکار کس سے داد پائے گا؟ خیر

کہیں چراغ جلے ہم بنے رہے فانوس
اندھیری راتوں کا ہم لوگ کرب جانتے تھے
کہ مہر و ماہ کو ذرّوں کا خواب مانتے تھے
ہم ابتدا ہی سے کچھ روشنی سے تھے مانوس

ہمارے آگے کئی قافلے روانہ ہوئے
ہمارے پیچھے تو گرد و غبار ہے ایسا
نگاہ و دل پہ اُبھرتا نہیں کوئی چہرہ
بگولے راہوں کے جیسے کوئی بہانہ ہوئے

ہمارے دور کے اے جاں گداز فن کارو
تمہارے فن کو تو ہم جیسے قدرداں بھی ملے
تمہارے درد کو کچھ غمگسارِ جاں بھی ملے
"تم" اپنے طور پہ خوش بخت ہی رہے یارو

دل و جگر کے بخشیں، نظر کسے سونپیں!
"ہم" اپنے بعد متاعِ ہنر کسے سونپیں؟

(سانیٹ)

عالم برہ پوری

کشمکش

اُفق پہ ذہن کے چھائی ہے کشمکش کی گھٹا
رواں حیات ہے تکمیلِ آرزو کے لیئے
سُبک خرام کبھی غم کبھی خوشی کی ہوا
اُفق پہ ذہن کے چھائی ہے کشمکش کی گھٹا
فنا قریب سے دیتی ہے جسقدر بھی صدا
اُسی قدر ہے قدم تیز رنگ و بو کے لیئے
اُفق پہ ذہن کے چھائی ہے کشمکش کی گھٹا
رواں حیات ہے تکمیلِ آرزو کے لیئے

(ترائیلے)

چراغ [illegible]

چراغِ آرزو جلتا ہے دل کے رہگزاروں میں
بظاہر زندگی ہے شادمانی کا حسیں پیکر
ہوائیں غمزدہ نغمے سناتی ہیں بہاروں میں
چراغِ آرزو جلتا ہے دل کے رہگزاروں میں
ہے مُضمر دردِ دل اپنا فلک کے ماہ پاروں میں
اگرچہ ظاہری صورت میں ہیں وہ دل نشیں پیکر
چراغِ آرزو جلتا ہے دل کے رہگزاروں میں
بظاہر زندگی ہے شادمانی کا حسیں پیکر

(ترائیلے)

کشمیری لال ذاکر

دھرتی سدا سہاگن

پنچائت گھر کے آنگن میں شیتل کیرتی اور دولت کاکا ہی رہ گئے تھے۔ دولت کاکا تھا تو کو چوان۔ لیکن گاؤں والے اُس کی کتنی عزت کرتے تھے۔ یہ شیتل نے آج کی بیٹھک میں جانا تھا اور اِس بات سے وہ خاموش تھا

"آپ نے جگو کی جگہ جرمانہ دینے کی بات کہکر اُس کا اپمان نہیں کیا کیا؟" کیرتی نے پوچھا۔

"میں ایسا نہیں سمجھتا۔ اگر جگو اِسے اپنی بے عزتی سمجھتا تو میرا شکریہ ادا نہ کرتا۔" شیتل نے جواب دیا۔

"مگر پنچائت کیوں خاموش رہی؟"

"اُس کے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔"

"دولت اِس بحث کو طول دینا نہ چاہتا تھا۔" اُس نے کہا۔

"دیر ہو رہی ہے۔ اب ہمیں چلنا چاہیئے۔"

دولت کی بات سُن کر شیتل نے بیساکھی بغل میں دبائی۔ اور سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ کیرتی اور دولت اُسے سنبھال کر سیڑھیوں سے نیچے اُتار رہے تھے۔

گلیوں کی اونچی نیچی سطح پر چلتے ہوئے سب خاموش تھے۔ دولت اور کیرتی دونوں سوچ رہے تھے کہ شیتل کو اندھیرے میں کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے۔

شیتل کے گھر کے سامنے وہ دونوں رُک گئے۔

"پنچایت کی بیٹھک میں شریک ہونے کیلئے بے حد شکریہ—!" کیرتی نے کہا۔

"شکریہ تو مجھے ادا کرنا چاہیئے کہ آپ نے میری اتنی عزت کروائی۔" شیتل نے جواب دیا۔

"میں آپ کو اکثر تکلیف دیتی رہوں گی۔"

"مجھے اِس سے خوشی ہوگی۔"

لمحہ بھر کے بعد سب ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ دولت کاکا اور کیرتی آہستہ آہستہ قدم اٹھائے گلی کے موڑ کے اُس طرف ہو گئے۔

اُس رات بستر پر لیٹے ہوئے شیتل نے محسوس کیا کہ اُس کی زندگی ایک دم فضول اور بے کار نہیں رہی تھی۔ اُس کے سامنے کچھ مقاصد اُبھرنے لگے تھے۔ اُس کے سامنے اب ایک وسیع چٹیل میدان نہیں تھا بلکہ کچھ راستے تھے جو صاف ہوتے جا رہے تھے۔ کچھ منزلیں تھیں جو نکھر رہی تھیں، اب اُس کے چاروں طرف اندھیرا نہیں تھا۔ کہیں کہیں تارے بھی چمک رہے تھے۔ آسمان میں چاند بھی نظر آ رہا تھا۔ اور چاندنی کا ہلکا سا غبار فضا میں گھل رہا تھا۔

اُس نے اپنے کمرے کے چھوٹے سے روشن دان سے آکاش میں تیرتے ہوئے چاند کو دیکھا اور پھر کروٹ بدل لی۔

چوتھا باب

اپنے خاوند عندر کی موت کے بعد کچھ عرصہ تو کیرتی پاگل سی ہو گئی تھی۔ اُسے لگتا تھا جیسے زندگی نے اپنے تمام سمبندھ اُس سے توڑ ڈالے تھے۔ اُس کے سامنے اب کوئی مقصد نہ رہ گیا تھا، جس کی خاطر وہ زندہ رہتی۔ اُس کا کوئی بچہ بھی نہ تھا جس کی خاطر اُسے جینے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ وہ تو جیسے ایک کھنڈر بن کر رہ گئی تھی جس میں صرف جنگلی پرندے ہی بسیرا کر سکتے ہیں اور اپنے بے ہنگم سے گھونسلے بنا سکتے ہیں۔ بہت دِنوں تک اُس کے دل و دماغ کی یہی حالت رہی۔ اُسے محسوس ہوتا تھا جیسے اُس کے انگ انگ پر فالج گر گیا تھا اور اب وہ ایک دم ناکارہ ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ بول نہیں سکتی تھی۔ سُن نہیں سکتی تھی۔ سوچ نہیں سکتی تھی۔ کچھ بھی تو نہیں کر سکتی تھی۔ اُس کے سسر نیکی رام نے سوچا، کہ وہ اُسے اُس کے مائیکے بھیج دے۔ اُس نے کیرتی سے بات بھی

کی لیکن اُس نے وہاں جانے سے انکار کر دیا۔ ایک بار کیرتی کے پتا اُسے لینے بھی آئے۔ مگر کیرتی ساتھ نہیں گئی۔ خود تو وہ دکھی تھی ہی اپنے ماں باپ کو کیوں دکھی کرے۔ رات کو سوتے میں وہ اکثر چیخ اٹھتی اُسے محسوس ہوتا کہ چتا کے وہ شعلے جنہوں نے اُس کے پتی کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ اور جن میں وہ کود جانا چاہتی تھی لیکن کود نہ سکی تھی اُس سے قریب آکر اُسے جھلس رہے ہیں۔ اُس کا جسم جل رہا تھا۔ اُس کے بال سُلگ رہے تھے۔ اور اُس کی ہڈیاں پگھلنے لگی تھیں۔ اُس کی چیخ سُن کر اُس کی ساس جاگ جاتی۔ اُس کا سسر اٹھ کر بیٹھ جاتا۔

"کیا ہوا بیٹی؟" وہ پوچھتا۔

"پانی ڈالئے میرے جسم پر۔"

"کیوں، کیا ہوا؟" نیکی رام پوچھتا۔

"میرا انگ انگ جل رہا ہے۔"

کیرتی کا یہ جواب سُن کر نیکی رام رو اٹھتا۔

اُس کی ساس اُسے ٹھنڈا پانی پلاتی اور اُس کے سرہانے بیٹھ کر اُس کا سر دبانے لگتی اور پھر کیرتی پر نیم بیہوشی کی سی حالت طاری ہو جاتی اور اسی حالت میں وہ کچھ دیر کے بعد سو جاتی۔

یہ کیفیت بہت دنوں تک رہی۔

جب تک کیرتی کی زندگی میں کوئی دلکشی اور مقصد نہ لایا جائے، وہ کبھی زندگی کی اہمیت کو قبول نہ کر سکے گی۔

رفتہ رفتہ یہ خیال نیکی رام کے دماغ میں گھر کر گیا۔ اُنہی دنوں پنچایتوں کے چناؤ ہوئے اور نیکی رام کو گاؤں والوں نے اپنا سرپنچ چن لیا۔ نئی ذمہ داریوں کا بوجھ اُس کے کندھوں پر رکھ دیا گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ سارے گاؤں نے جو اُوٹ وشواش اُس میں رکھا ہے وہ اپنے آپ کو اس قابل ثابت کرے۔ پنچ اُس کے ساتھ تھے لیکن تقریباً سبھی اَن پڑھ تھے۔ وہ اُس کی بہت زیادہ مدد نہیں کر سکتے تھے۔ گاؤں میں کچھ پارٹی بازی بھی تھی، پارٹی بازی تو گاؤں کی زندگی کا ایک ضروری حصّہ ہے کسی نہ کسی شکل میں تو یہ رہتی ہی ہے اور جب کبھی گمبھیر روپ اختیار کر لیتی ہے تو گاؤں کا امن تہس نہس ہو جاتا ہے۔ ساری فضا ہی بگڑ جاتی ہے معمولی باتوں پر جھگڑے ہوتے ہیں، خون، خرابے تک نوبت آ جاتی ہے۔ پولیس آتی ہے، پکڑ دھکڑ ہوتی ہے اور بہت دنوں تک سماجی زندگی کا شیرازہ بکھرا رہتا ہے۔ کئی بار یہ معمولی اور چھوٹی چھوٹی رنجشیں دو خاندانوں کو کئی پشتوں تک ایک دوسرے کے نزدیک نہیں آنے دیتیں۔ بڑے بوڑھوں سے لے کر نوجوانوں تک ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں۔ اور پھر دشمنیاں پلتی ہیں اور دوسروں کو نقصان پہنچانے کے بہانے ڈھونڈے جاتے ہیں۔

نیکی رام گاؤں کی اس بُرائی کو پہچانتا تھا اور اُسے ختم کرنا چاہتا تھا لیکن اُس کا ساتھ دینے والے بہت کم لوگ تھے اُن میں سے اکثر تو اس بُرائی کے غلط پہلوؤں کو جاننے کی کوشش بھی نہیں کرتے تھے۔ اور کچھ پہلے ہی سے اس قابل نہ تھے۔ کارن تھا لوگوں کی اَن پڑھتا اور جہالت۔ زمینیں کم فصل اُگاتی تھیں اور دماغ اچھی اور مفید باتیں کم سوچتے تھے۔ دونوں ہی طرح سے گھاٹا تھا۔ جب تک لوگ پڑھیں گے نہیں وہ معاملوں پر غیر جانبداری سے نہیں سوچ سکیں گے۔ وہ اپنے فائدے اور نقصان میں تمیز نہیں کر سکیں گے، وہ ضروری کم ضروری اور غیر ضروری باتوں میں فرق محسوس نہیں کر سکیں گے۔ نیکی رام کو یہ یقین ہو گیا کہ جب تک لوگ پڑھ لکھ نہیں جائیں گے، گاؤں آگے نہ بڑھ سکے گا۔ گاؤں والے اپنے لئے کچھ نہ کر پائیں گے۔

نیکی رام ایک روز بڑا ہی دکھی ہو گیا۔ دو پڑوسنیں بچوں کے معمولی سے جھگڑے پر آپس میں لڑ پڑیں۔ بات ہاتھا پائی تک پہنچے پہنچے مردوں کے خون خرابے تک پہنچ گئی۔ لاٹھیوں کا استعمال ہوا، سر پھوٹ گئے۔ پولیس آئی اور کئی روز تک سارے گاؤں کو پریشان کرتی رہی۔ نیکی رام اُس روز بڑا اُداس تھا۔ لیکن وہ کر بھی کیا سکتا تھا؟ اپنے دل کا غبار نکالنا چاہتا تھا لیکن کہاں نکالے؟ کون اُس کی بات سمجھے گا؟ وہ آنگن میں بیٹھا حقّہ پی رہا تھا اسی لمحہ کیرتی پاس سے گزری۔ وہ کہیں باہر سے آئی تھی۔

"کہاں سے آ رہی ہو بیٹی؟"

"مندر گئی تھی پتا جی۔"

"کیا کرتی ہو مندر جا کر؟"

"تھوڑی دیر ایکانت میں بیٹھ کر رامائن پڑھتی ہوں۔"

"اکیلی ہی پڑھتی ہو؟"

"جی۔!"

"راماٰئن تو بہت اچھی پستک ہے نا؟"

"ہے تو سہی پتا جی۔" کیرتی نے جواب دیا۔

"اگر تم اسے دوسروں کے ساتھ بیٹھ کر پڑھو تو کچھ نقصان ... کیا؟"

"اُلٹے فائدہ ہی ہوتا ہے۔"

"اکٹھے بیٹھنے سے، پڑھنے سے، سوچ بچار کرنے سے فائدہ ہوتا ہے نا؟"

"جی، مگر آپ اس طرح گریدکیوں رہے ہیں؟"

"بیٹی، گاؤں کی اکثر عورتیں اَن پڑھ ہیں۔ جبھی وہ آپس میں لڑتی ہیں اور خون خرابہ ہوتا ہے۔"

"اگر وہ پڑھ لکھ جائیں تو ضرور سمجھ دار ہو جائیں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے پتا جی۔"

"تو ایک کام کرو۔"

"کیا۔؟"

"مندر میں کافی جگہ ہے۔ تم عورتوں کو راماٰئن پڑھ کر سنایا کرو اور کیرتن کرایا کرو۔ عورتیں مردوں سے زیادہ دھرم کرم کا خیال کرتی ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ آنے لگ جائیں گی جب وہ آنے لگیں تو تھوڑی بہت پڑھائی کرانا شروع کر دو۔ شاید بات بن جائے ...نیکی رام نے حقے کا ایک لمبا کش لے کر دھواں آنگن میں چھوڑ دیا۔

"میں کل سے ایسا ہی کروں گی۔" کیرتی نے جواب دیا۔

اُس سے اگلے روز مندر میں راماٰئن کی کتھا ہونے لگی۔ کچھ عورتیں آ گئیں، کچھ نہیں آئیں۔ گاؤں میں چرچا ہونے لگی کہ سرپنچ کی بہو مندر میں کتھا کرنے لگی ہے۔ شاید گھر والوں نے تنگ کرنا شروع کر دیا ہے۔ آخر ایک نوجوان بیوہ کو کوئی کب تک برداشت کر سکتا ہے۔ کچھ لوگوں نے اُس کی مخالفت بھی کی، لیکن زیادہ لوگوں نے اُن کی رائے کو اہمیت نہ دی۔ عورتیں صبح سویرے مندر آنے لگیں۔ مندر کی فضا ایکدم تبدیل ہو گئی۔ بھگوان رام چندر جی کی تصویر کے سامنے عورتیں کچھ پیسے ویسے بھی چڑھاتی تھیں۔ کیرتی ان سب پیسوں کو اکٹھا کرتی رہی اور جب رقم کچھ بڑھ گئی تو اُس نے چھوٹی چھوٹی کتابیں، سلیٹیں تختیاں، روشنائی وغیرہ خرید لی اور دوپہر کے بعد مندر میں عورتوں کو پڑھانے کا کام شروع کر دیا۔ شروع شروع میں بڑی عمر کی عورتیں ہچکچاتی رہیں۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد وہ بھی شوق سے پڑھنے لگیں۔ اب اُن کی توجہ گھر کے کام کاج اور پڑھنے لکھنے کی طرف ہو گئی۔ چھوٹے چھوٹے جھگڑوں کی طرف سے اُن کا دھیان ہٹ گیا۔

کچھ ہی دیر میں سمر تو پر گاؤں کا مندر تعلیم بالغاں کا ایک اچھا خاصا مرکز بن گیا۔

پنچایت نے ایک سلائی کی مشین بھی خرید دی۔ کیرتی نے عورتوں کو سینا پرونا بھی سکھانا شروع کر دیا۔

نیکی رام اب مطمئن تھا۔

کیرتی اب رات کو کبھی کبھار ہی چیختی تھی۔ اب اُس کی الگ کونے میں چپ چاپ بیٹھ کر سوچتے رہنے کی عادت بھی چھوٹ گئی تھی۔

ایک دن نیکی رام نے اُس سے پوچھا۔

"ایک مرد اگر پڑھ لکھ جائے تو اُس کا کیا فائدہ ہوتا ہے بیٹی؟"

"وہ سوجھ بوجھ سے کام لینے لگتا ہے۔" کیرتی بولی۔

"اور اگر ایک عورت پڑھ لکھ جائے تو؟"

"تو ایک کنبہ پڑھ لکھ جاتا ہے۔ ایک خاندان سنور جاتا ہے۔ ایک نسل نکھر جاتی ہے اور اس طرح تمام ملک کا مستقبل مضبوط ہو جاتا ہے۔" کیرتی نے جواب دیا۔

نیکی رام اپنی بہو کا یہ جواب سن کر خوشی سے جھوم اٹھا۔

دھیرے دھیرے گاؤں کا مندر ایک بڑی ہی دل کش اور پرکشش جگہ بن گئی۔ عورتیں اپنے چرخے بھی وہیں لے آتیں۔ لوک گیتوں کی گونجیں اُبھرتیں اور اُن کے ساتھ سوت کے لمبے لمبے تار لہراتے۔ کلائیوں میں پڑی چوڑیاں کھنکتیں، جوان قہقہوں کا سنگیت فضا میں گھلتا اور گاؤں کی عورتیں اپنے گھر کے تنگ آنگنوں کی گھٹن کو بھول جاتیں۔ اپنے چھوٹے چھوٹے غموں دکھوں اور مسئلوں سے دور اجتماعی زندگی کی وسعت کا احساس کرتیں۔ ایسے بھی لمحے آتے جب وہ محسوس کرتیں کہ اُن

زندگیاں اُن کے گھروں کو سنوار نے اُن کے بچوں کو پروان چڑھانے اور اُن کے مستقبل کو تراشنے میں کام آسکتی تھیں —

کیرتی اب خوش تھی کیونکہ وہ گاؤں کی عورتوں کی رہنما بن گئی تھی۔ عورتوں کا کوئی بھی مسئلہ ہو کیرتی سے ضرور مشورہ ہوتا تھا۔ اُس کی آواز کو لوگ پہچانتے لگے تھے۔ اب سمر کوٹ میں کسی لڑکی کی چھوٹی عمر میں شادی کرنا آسان نہیں تھا۔ ایک بار تو کیرتی نے ایک برات واپس لوٹا دی تھی۔ اِس واقعہ کے بعد کئی روز تک گاؤں میں ہلچل رہی بلکہ آس پاس کے گاؤں میں چرچا ہوتی رہی۔ پنچایت نے کیرتی کا ساتھ دیا تھا۔ لڑکی کے باپ نے چاہے دبے دبے سے انداز میں ہی پنچایت کی بات مان لی تھی۔ برات جب مایوس واپس جا رہی تھی تو گاؤں کے منچلے نوجوانوں نے براتیوں پر آوازے کسنے شروع کئے تھے۔ اُس وقت کیرتی کی آواز گونجی تھی۔

"خبردار! جو کسی نے ایک لفظ بھی کسی براتی کے خلاف کہا۔ برات کو عزّت سے واپس بھیجو۔ ہم باعزّت لوگ ہیں، ذلیل اور بدتمیز نہیں۔" ہر طرف سنّاٹا چھا گیا تھا۔ گاؤں کے چھوکرے ایک دم خاموش ہو گئے تھے۔ اور برات کو باقاعدہ چائے وائے پلا کر واپس بھیجا تھا۔

یہ ابتدا تھی کیرتی کی نئی زندگی کی۔

اِس کے بعد اُس نے پنچایت کے تعمیری کاموں میں جی جان سے حصّہ لینا شروع کر دیا اور عورتوں کی ترقی کے ہر پروگرام میں پیش پیش رہنے لگی۔

وقت گزرتا گیا اور پھر اُسے احساس ہونے لگا کہ وہ اکیلی تھی۔ کام بہت تھا۔ لیکن وہ سب اکیلے آدمی کے بس کا نہیں تھا۔ اِس لئے کبھی کبھی وہ دِل چھوڑ جاتی۔ اکیلی کیرتی اتنے بڑے گاؤں کی بیسیوں سمسیاؤں کے بارے میں کیسے سوچ سکتی تھی۔ کاش، ایسی ہی لگن سے کام کرنے والا ایک اور شخص اُسے مل جائے۔ ایک اور —!

اور آج جب وہ سُشیل کو پنچایت کی میٹنگ کے بعد اُس کے گھر چھوڑ آئی تو اُسے محسوس ہُوا کہ اب اُس کے راستے آسان ہو گئے تھے۔ اُسے اپنے اندر ایک نئی طاقت اور نئے عزم کا احساس ہوا۔ اب وہ اکیلی نہیں تھی۔ اُس کے ساتھ ایک اور آدمی تھا جو دشوار راستوں میں اُس کا ساتھ دے سکتا تھا۔ دوسری صبح جب، وہ سو کر اٹھی تو اُس کی آنکھوں میں بڑی خوبصورت چمک تھی۔ جیسے اُس کے سامنے ایک نئے پربھات کا اُجالا کسمسا رہا ہو۔

(باقی آئندہ) ▲

بقیہ صفحہ ۶۸ - "حاشئے"۔

نہیں ہوئی تھی مگر بھیڑیئے نے ایک دلیل نہ سنی اور اُسے پھاڑ ڈالا۔ جذبی کا شعر ہے ؎

اُن کی پُر اسرار عدالت اُن کا پُر اسرار انصاف
تاریکی ہے مجرم نہ ٹھہریں چاند ستارو لہٰذا کے اوصاف

سردار جعفری کا ایک شعر ہے ؎

تیغ منصف ہو جہاں، دار و رسن ہوں شاہد
بے گنہ کون ہے اِس شہر میں قاتل کے سوا

البتّہ اپنی بات کو سمجھانا اور الزامات کا جواب دلیل سے دینا پھر بھی لازم ہے تاکہ جمہوریت پسند عوام کے سامنے معاملے کا ہر پہلو آجائے کہ سب سے بڑی عدالت وہی ہیں۔ ▲

مکتوبات

● ستمبر کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ اِس بار مقالات کا حصّہ بہت جاندار ہے۔ افسانوں میں آمنہ ابوالحسن کے افسانے میں خلوص ہے، درد ہے، اِنسانیت کیلئے تڑپ ہے، حوصلہ ہے، عزم ہے اور انسان کے روشن مستقبل کی پیش گوئی ہے۔ مگر ایسی کہانیوں میں عموماً افسانہ کا حُسن قائم نہیں رہتا۔ انفرنو کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ رضاء الجبار کے افسانے میں ظفر کا کردار ایک IDEAL ہے اور خوب ہے۔ ملکی زبانوں کے افسانوں کے تراجم پیش کرکے آپ ایک بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

حصّۂ نظم میں "اِمکانات کا قتل"۔ فلیگور۔ رام رحیم کی جڑواں لاش، اچھی نظمیں ہیں۔ نصر قریشی۔ آدم نصرت اور محبوب راہی کی غزلوں کے بعض شعر پسند آئے۔ شاعر کے معیار کی تعریف نہ کرنا، بے انصافی ہوگی۔

یہ حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں نئی نسل ہی کو اُردو زبان کی بقا اور تحفّظ کے لئے سامنے آکر عملی طور پر کچھ کرنا ہوگا۔ یہ برابر دیکھا جا رہا ہے کہ "پرانے لوگ" یا تو خاموشی اِختیار کئے ہوئے ہیں یا پھر چہرے کے نقاب بدل کر سامنے آرہے ہیں اور ان سے اُردو دشمنی کی بو آرہی ہے۔ اِس زمانے میں ایک المیہ یہ بھی ہوا ہے کہ ہم لوگ اُردو کی ترویج و اشاعت کی جانب توجہ دینے کے بجائے رسم الخط کے معاملے پر ہی اُلجھ گئے ہیں بلکہ اُلجھا دیئے گئے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ مخالفین اُردو کی جانب سے ایک قسم کی "توجہ ہٹاؤ تحریک" ہے تو بیجا نہیں ہوگا۔ حامیانِ اُردو رسم الخط کی بحث میں اُلجھ کر اُردو کے جائز حقوق کی مانگ بھول گئے ہیں۔ اُردو اب اُس مقام پر پہنچ گئی ہے کہ رسم الخط کی تبدیلی قرینِ قیاس معلوم نہیں ہوتی۔ چند بڑے لوگ اِس پر متفق ہو بھی جائیں تو کیا ہوتا ہے۔

جرعات میں نوجوانوں کے لئے آپ کا پیغام بڑی دوراندیشی کی دلیل ہے۔ نوجوان نہ صرف حال کو بناتے ہیں — بلکہ مستقبل کا سنگِ بنیاد بھی رکھتے ہیں۔ یہ پیڑھی جب کسی کام کے لئے بیڑہ اُٹھا لیتی ہے تو اُسے پایۂ تکمیل تک پہنچا کر ہی چھوڑتی ہے۔ رسم الخط بدل کرنے کی تائید ابھی تک کسی نوجوان کی جانب سے نہیں کی گئی ہے جبکہ مخالفت میں متعدد جوان آوازیں بلند ہوئی ہیں۔ بلاشبہ اگر یہ نئی نسل ایسی سنگین صورت حال میں اُردو کا پرچم اپنے ہاتھ میں اُٹھا لیتی ہے تو ہر قلعہ فتح ہو جائے گا۔ آپ کا یہ فرمانا قطعی درست ہے کہ یہ وقت نظریاتی بحثوں کا نہیں ہے۔ بلکہ ٹھوس عملی اِقدامات کا ہے۔ آندھی کی طرح اُٹھنے اور پہاڑوں کی طرح جم جانے کا ہے"۔

خدا کرے ہمارے نوجوان آپ کی اِس آواز سے چونک اُٹھیں اور عملی اِقدامات کے لئے کمربستہ ہو جائیں۔ (آمین)

شفیق رحمانی

گوالیار (ایم پی)

● تازہ شاعر مل گیا تھا۔ اچھا ہوا پروفیسر نریش والا معاملہ ختم کر دیا۔ ڈگریوں سے عقل نہیں آتی۔ شاید وہ شہرت کے بھی بھوکے ہوں۔ لیکن وہ لسانی و ملکی اور قومی یگانگت کے تقاضوں سے قطعاً بے بہرہ ہیں۔ مجھے تو جان پڑتا ہے کہ یہ معاملہ اُن کے فہم و اِدراک سے بالاتر ہے۔

اُردو کے فارسی رسم الخط کے بارے میں آپ کے بصیرت افروز خیالات پڑھے۔ دیکھئے نہ یہ ناقص ہے اور نہ ہی زیادہ دشوار بدیسی تھا اور مسلمانوں کا تھا۔ اِس سے اِنکار نہیں ہو سکتا۔ یہ تاریخی حقیقت ہے۔ صدیوں پہلے مسلمان باہر سے یہاں آیا۔ وہ جو بھی لایا وہ بدیسی ٹھہرا۔ جیسے انگریزی کا رومن سکرپٹ۔ باہر سے آیا۔ اتنی ترقی کے باوجود بھی یہ بھارتی نہیں انگریزوں ہی کا ہے۔ فارسی رسم الخط مسلمان باہر سے لائے اور یہ (IM-PORTED) ہے۔ مگر اِس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ آج یہ زبان صرف مسلمانوں کی ہے اور فارسی رسم الخط یکسر ختم ہی کر دینا چاہئے یا دونوں زبانوں کا ایک ہی رسم الخط دیوناگری ہو۔ انگریزی کی نشوو نما میں ہندوستانیوں نے وہ حصّہ نہیں لیا جو اُردو کے سلسلے میں لیا۔ یہاں تو یہ لاکھوں کی مادری زبان بھی ہے۔ کروڑوں اِسے پڑھتے لکھتے ہیں۔ پورے ادب پر ہر فرقے کی چھاپ ہے۔ میں نے اِس

سلسلے میں عصمت چغتائی محترمہ سے استفسار کیا ہے۔ جواب آنے پر عرض کروں گا۔

موجودہ شمارے میں راہم اور رحیم کی جڑواں لاش" نظم بہت اچھی ہے۔ اُردو کی آزاد نظم پر محمد ایوب واقف صاحب کا مقالہ دیکھا۔ ایک STANDARD کی آزاد نظم پنڈت آنند نرائن مُلّا نے لکھی ہے۔۔۔۔ "مریم ثانی" اسے شامل کئے بغیر ہر آزاد نظم پر مقالہ تشنہ رہے گا۔ بلکہ اسی پر مقالہ لکھا جا سکتا ہے۔

ورلیسی روڈ۔ لدھیانہ — اندر پرتاپ نیر۔ ایم اے

● "شاعر" کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ اس کی ظاہری و باطنی خوبیوں نے اس کے معیار کو بلند سے بلند تر کر دیا ہے۔ اس کے لئے آپ کی ذاتی محنت و کاوش کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ سرورق پر ایک خاص احساس رنگ (COLOUR SENSE) کے ساتھ سردار جعفری کی تصویر چھاپ کر آپ نے شاعر کے نکھار میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ اس مرتبہ نظم و نثر کا انتخاب بڑا ہی صحت مند اور معیاری ہے۔ مقالوں میں ابوالفیض سحر کا مقالہ "سردار جعفری کا اسلوبِ نگارش"۔ اور محمد ایوب واقف کا مقالہ "اُردو کی آزاد نظم" بہت خوب ہیں۔ اور بڑی محنت سے لکھے گئے ہیں۔ افسانوں میں محترمہ آمنہ ابوالحسن کی تخلیق ہمارے سماج میں پھیلتے ہوئے خطرناک زہر کے لئے تریاق کا کام کر سکتی ہے۔ مجتبیٰ حسین نے طنز و مزاح کے پیرائے ایک سبق آموز بات کہی ہے اور بعض تلخ حقائق کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ پچھلے چند دنوں میں میں نے مجتبیٰ حسین کے جس قدر مضامین دیکھے ہیں۔ ان میں "سندباد جہازی کا سفرنامہ" اپنی نوعیت اور ہیئت کے اعتبار سے نہایت معیاری اور پُراثر ہے۔

شہاب جعفری کی تضمین بر غزلِ غالب کے آخری بند کا کوئی جواب نہیں ہے۔ تمنا مظفر پوری، پروفیسر عابد عالمی کی شعری کاوشیں اچھی ہیں۔ نورِ پرکار کا ترجمہ بھی تعریف کے قابل ہے۔

آپ نے خاص نمبر کا اعلان کر کے پھر ایک بار قارئین "شاعر" کو چونکا دیا ہے۔ حسب روایت یہ خاص نمبر بھی آپ کی انتھک کوششوں سے گلزارِ اُردو کا گُلِ سرسبد ثابت ہوگا۔ خدا کرے آپ اُردو کی سرپرستی کے لئے اور بہت دنوں تک زندہ رہیں۔

ہندوستانی پرچار سبھا۔ بمبئی ۷ — (ڈاکٹر) نورالسعید اختر

● تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ سب سے پہلے مجتبیٰ حسین کا طنزیہ "سندباد جہازی کا سفرنامہ" پڑھنا شروع کیا۔ پڑھتے وقت مجھے کرشن چندر بحیثیت طنز نگار یاد آ گئے۔ مجتبیٰ صاحب نے بہترین طنزیہ لکھا ہے۔ پچھلے شمارہ میں ایک افسانہ کا ذکر کیا تھا جو فسادات سے متعلق ہوگا۔ میں نے سمجھا یہ وہی چیز ہے۔ لیکن میرا خیال آیا کہ طنزیہ کا اعلان الگ تھا۔ ڈھونڈھنے پر پہلا افسانہ آمنہ ابوالحسن صاحبہ کا "انفرنو" مل گیا۔ میرا خیال ہے اور امید کرتا ہوں کہ "انفرنو" اور "سندباد" دونوں تخلیقات ہندی رسالے والے بھی شائع کریں گے۔ ملیالم افسانہ "اپنا خون" ــ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کچھ عرصہ پہلے میں نے اسی عنوان سے کسی رسالے میں پڑھا تھا۔ کس میں پڑھا تھا یاد نہیں آ رہا ہے۔

مراٹھی ڈراما "ہم آواز" ایک بار پڑھنے کے بعد میں اب تک چھ سات مرتبہ پارٹ پارٹ کر کے پڑھ چکا ہوں۔ پتہ نہیں کیا شئے ہے جو مجھے بار بار اس ڈرامے کو پڑھنے کے لئے اکساتی ہے۔ نورپرکار صاحب قابلِ مبارکباد ہیں کہ انہوں نے اس ڈرامے کو ترجمہ کے لئے منتخب کیا۔

ستمبر کا شمارہ اس اعتبار سے بہت ہی بہتر ہے۔ پتہ نہیں آپ کیونکر اتنا خوبصورت اور معیاری پرچہ نکال لیتے ہیں۔ پھر اس قدر کم قیمت پر! جبکہ اُردو کے دوسرے ادبی اور نیم ادبی رسالے والے اچھے سرکولیشن کے باوجود عوام سے زیادہ پیسے لیتے ہیں۔ دراصل یہ آپ کی لگن اور اُردو پرستی ہے۔

گوبارہ (گیا) — تمنا مظفر پوری

● تازہ شمارہ ملا، شکریہ! مضمون کی خصوصی توجہ سے اشاعت کے علاوہ آپ نے سوشلزم کے سُرخ فریم میں امن کے نیلے شیشے میں سردار جعفری کو جس انداز سے پیش کیا ہے۔ یقیناً وہ اس کے مستحق تھے۔

رسم الخط کے تعلق سے جناب کا بھرپور اور وزن دار مضمون (مجلوعہ بلٹز) پڑھا۔ بحث کو اس پُراثر طریقے سے ختم کرنا آپ ہی کا حصہ تھا۔ میں نے بھی اس تعلق سے علمی، تاریخی اور لسانی اساس پہ بحث کرتے ہوئے ایک مقالہ سپردِ قلم کیا تھا۔ جو ۲۸ اگست کے "قومی آواز" لکھنؤ میں شائع ہوا ہے۔ اس تعلق سے مشاہیر کے ستائشی خطوط آئے۔ جنھیں میں نے انہیں اُردو کے لئے کام کرنے کو لکھا۔ لیکن کسی نے بھی گرمجوشی کا

اظہار [illegible] شاید محمد شاہ رنگیلا اور واجد علی شاہ کے دور کے اثرات
اب تک باقی ہیں ! و لیکن اگر کچھ نہ کیا جائے تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں ایسا
نہ ہو جائے کہ یہی ہمارا مقدّر بن جائے اور تاریخ اپنا فیصلہ سنا دے۔

یونین پبلک سروس کمیشن۔ نئی دہلی۔ — **ابو الفیض سحر**

● اُردو کے لئے اِس جلتے ماحول میں آپ ہی جیسی شخصیتیں سایہ دار درخت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جس کے نیچے تھکے ہوئے راہی سکون پاتے ہیں۔ "رسم الخط" اور "بھارتیہ کرن" جیسے مسائل کے خلاف آپ کی آواز صدا بہ صحرا ثابت نہیں ہوگی۔ شیدائیانِ اُردو کا سارا طبقہ آپ کے ساتھ ہے۔ اُردو والوں کو باتوں سے زیادہ عملی اقدامات کی جانب توجہ دینی چاہیئے۔ اُردو کو اُس کا جائز مقام دِلانے کے لئے ہر ممکن کوشش اور ایثار کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

"شاعر" کے سب ہی شمارے ادبِ عالیہ کا نمونہ ہیں۔ تازہ شمارہ نثری و شعری اِعتبار سے جامع بھی ہے اور معیاری بھی۔

الٰہ آباد ۳ — **نصر قریشی**

● شاعر کا تازہ شمارہ بے حد پسند آیا۔ "شاعر" ہی واحد جریدہ ہے، جو ادبی صلاحیتوں اور اُردو زبان کی حفاظت کے لئے مسلسل جد و جہد کر رہا ہے ورنہ اُردو کے تمام دوسرے رسالے صرف مضامین، افسانے، نظمیں، غزلیں چھاپ کر ہی اپنا فرض پورا کر دیتے ہیں۔ آپ نے تجربات میں نئی نسل کو جو مشورہ دیا ہے وہ ہر نوجوان کے لئے قابلِ قبول ہوگا۔ آپ کا تازہ مضمون "اُردو بلٹز" میں دیکھا۔ آپ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بھرپور جواب دیا ہے۔ اِس عمر میں آپ کی یہ جواں ہمتی نوجوانوں کے لئے مشعلِ راہ ہے۔

بھوجلہ پہاڑی۔ دہلی۔ — **شاہد ماہلی**

● کل "شاعر" کا تازہ شمارہ ملا۔ اِس بار سرورق بہت ہی خوبصورت ہے۔ غزلوں اور نظموں کی تعداد ضرور کم ہے۔ مگر بحیثیت مجموعی یہ شمارہ کسی رسالے کے خاص نمبر سے کسی طرح کم نہیں۔ عصمت چغتائی کے جواب میں پچھلے "بلٹز" میں آپ کا مضمون اُردو والوں کو فکر و عمل کی دعوت دیتا ہے۔ ہم "اُردو، اُردو" چلّاتے ضرور ہیں، لیکن عملی طور پر اُس کی بقا اور اُس کے تحفّظ کی طرف سے آنکھیں بند کر چکے ہیں۔ اِس وقت اہم ترین مسئلہ اُردو کی اِبتدائی تعلیم کا ہے

ریاستی حکومتوں نے اُردو کے لئے جو مراعات دی ہیں، ہم اُن سے کہاں تک مستفیض ہو رہے ہیں۔ ہم نے اِس بات پر غور کرنے کی کوشش نہیں کی کہ آئندہ نسلیں اُردو سے نابلد ہوتی جا رہی ہیں، اِس طرح اُردو کا مستقبل کیا ہے؟ کیوں نہ ہر ذمہ دار اُردو چاہے وہ ادیب ہو یا شاعر۔ تاجر ہو یا ملازم۔ کسان ہو یا مزدور، فلمساز ہو یا اداکار، اس طرف بھی توجّہ دے اور اُردو کو ابتدائی جماعتوں میں عام کرانے کی کوشش کرے۔

پرتاپ گڑھ۔ — **مہدی پرتاپگڑھی**

● گزشتہ چند ماہ میں "شاعر" کے مواد میں خاصا توسّع پیدا ہو گیا ہے۔ عصری رجحانات سے چشم پوشی نہ کرتے ہوئے، آپ نے "شاعر" کے صفحات نئے شعور کی نمائندگی کے لئے جس طرح وا کر دیئے ہیں، اُس سے آپ کی فراخدلی اور بیّاضی کا ثبوت ملتا ہے۔ ہر شمارہ میں اگر آپ نئے ادب کے کسی پہلو کے متعلق ایک مقالہ شائع کیا کریں تو مجھے یقین ہے کہ "شاعر" کے قارئین اُس کا گرم جوشی سے استقبال کریں گے۔

جمیدیہ روڈ۔ بھوپال۔ — **متین سیّد**

● تازہ شمارہ مل چکا ہے۔ مقالوں میں سردار جعفری کا "اسلوبِ نگارش" اور "اکبر اعظم کا مشغلۂ شکار" خوب ہیں۔ حصّۂ نظم بھی از حد پسند آیا۔ آمنہ ابوالحسن کا افسانہ اور مجتبیٰ حسین کا طنز یہ فرقہ پرستوں کے مُنہ پر طمانچہ رسید کرنے کے مترادف ہے۔ عالم برہ پوری کا "اپنا خون" بھی خوب ہے۔

بھیمڑی (مہاراشٹر) — **ہارون الرّشید**

● تازہ شمارہ کھولتے وقت مجھے خیال آیا تھا کہ اب "چنڈی گڑھ کے بھارتیہ کرن" والے صاحب کی بیجا پبلسٹی ختم کر دینا چاہیئے۔ اور پھر آپ کا نوٹ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ نے بھی اِس بحث کو ختم کر دینے کا مشورہ دیا ہے۔ اِس مباحثہ سے نہ اُردو کا کوئی فائدہ ہوگا۔ نہ اردو والوں کا۔ ہمیں چاہیئے کہ چند خاص تجویزوں پر عمل کریں اور یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ عمل میں لانے والے بہت ہی کم لوگ ہیں۔ حیدر آباد میں دیواروں پر جگہ جگہ لکھے ہوئے SLOGANS بہتر ہیں، جو جونیئر کالجوں میں اُردو جاری

کروانے کے طلبگار ہیں۔

آپ نے میرا خط "شاعر" میں شائع کردیا۔ کسی صاحب U P S C سے خط بھیجا ہے کہ میں نے جس دلیری اور صاف گوئی سے شاعر میں لکھا ہے، ویسے ہی انگریزی کے اخباروں میں لکھوں۔ یہ تو میرے ہی دل کی بات ہے۔ میں ٹائمز اور WEEKY میں لکھنا چاہتی ہوں مگر وقت کا سوال بہت بڑا ہے۔

ریڈ ہلز۔ حیدرآباد۔ (مس) پی، کے، ویکاجی

● اِس موضوع پر انگریزی اور ہندی میں کتابچہ ضرور شائع کیجئے۔ جو کام مجھ سے ہو سکے گا ضرور کروں گا۔ میری تجویز یہ بھی ہے کہ شاعر کی طرف سے اُردو تحریک کے مسئلے پر ایک سیمینار کہیں منعقد ہونا چاہئے۔ جس میں شاعر کے پڑھنے والوں کی بھی اچھی نمائندگی ہو۔ اِس کے بعد کچھ تجویزیں سامنے آسکتی ہیں۔

آپ نے جو جرأت مندانہ قدم اُٹھایا ہے اُس کی ہر طرف تعریف و توصیف ہے۔

ماڈل ٹاؤن۔ دہلی۔ (ڈاکٹر) محمد حسن

● آج جبکہ اُردو کا گلا گھونٹا جا رہا ہے۔ آپ کی خدمات کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔ پابندی سے پرچہ نکالنا بلند حوصلگی ہے ورنہ آج کا بڑے سے بڑا ادیب اور شاعر مایوس اور بے دم ہو کر رہ گیا ہے۔ آپ کی آواز اُردو والوں کے لئے نقارے کی چوٹ کی حیثیت رکھتی ہے۔

.....صاحب سے متعلق بہت کچھ لکھنا چاہتا تھا مگر آپ نے ستمبر کے شاعر میں لکھنے والوں کو روک دیا۔ اتنا ہی کہوں گا کہ وہ صاحب ابن الوقت بن گئے ہیں اور سستی شہرت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اُن سے کچھ کہنا اپنا قیمتی وقت خراب کرنا ہے۔

سندباد جہازی کا سفرنامہ اور سردار جعفری کا اسلوبِ نگارش وغیرہ پسند آئے۔ "جرعات" میں اُردو نئی نسل والی بات بیحد پسند آئی۔

خاص کر وہ شعر ؎

گمرہی منزل کے جب نشاں بدلتے ہیں
راستے بدلتے ہیں، کارواں بدلتے ہیں

اور یہ شعر تو اُن کے لئے اور بھی زیادہ موزوں معلوم ہو رہا ہے۔ جو زندہ رہ کر بھی اُردو کے حق میں مُردہ ہو چکے ہیں ؎

اذنِ ہر تغیر ہے زندگی پرستوں کو
جن کے قلب مُردہ ہیں، وہ کہاں بدلتے ہیں

ارکی کلاپا اسٹریٹ۔ کڑپہ (اے پی) تسلیم کڑپوی

● "شاعر" بدستور مل رہا ہے۔ پچھلے کچھ شمارے ہر لحاظ سے "شاعر" کے مخصوص معیار کے نمائندہ ہیں۔ آپ نے بہترین ادبی توازن کا ایک ایسا جدید معیار قائم کر لیا ہے جو شاعر کی مستند روایتوں کی مضبوط بنیادوں پر جدید و قدیم ادب کے تقاضوں کے لئے شاندار مستقبل کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ اُردو زبان اور رسم الخط سے متعلق آپ کی مسلسل جدوجہد سے کما حقہٗ واقفیت رکھتا ہوں۔ اِس سلسلے میں "نوینگ تحریک" اور "بلٹز" وغیرہ میرے مطالعہ میں رہے ہیں۔ "نیشنل فرنٹ" لدھیانہ کے سالنامہ میں متعلقہ مسائل سے میں نے بھی بحث کی ہے۔ ہریانہ، دہلی۔ پنجاب کے اُردو نوازوں نے میرے مضمون کو پسند کیا ہے۔ اُردو زبان و ادب کے خلاف ہم اُن لوگوں کی مخالفت سے خائف نہیں جو مدت سے اِس زبان کو ختم کر دینے کے منصوبے بنا رہے ہیں اور اعلانیہ مخالفت کر کے اِس زبان کو اچھوت بنانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں اِن مخالفین کی مساعیِ مذمومہ سے اُردو زبان و ادب کو اتنا نقصان نہیں ہوا جتنا خود مصلحت اندیش بہی خواہانِ اُردو کے نیم بروں، نیم دروں قسم کی منافقانہ پالیسی سے ہوا ہے۔ "بمبئی اُردو کنونشن" احیائے اُردو کے لئے مستحسن کوشش تھی۔ لیکن ضروری نہیں کہ ہر کوشش کامیاب بھی ہو۔ پھر ایسے ماحول میں جو اِس وقت ہمارے یہاں پایا جاتا ہے۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ فراق گورکھپوری جیسے لوگ بھی اُردو رسم الخط کو قتل کر دینے پر تُلے بیٹھے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ اردو رسم الخط ہی کو مٹا دیا گیا تو اُردو کا مستقبل کیا ہوگا۔؟ یقیناً کوئی بھی زبان اپنے مخصوص رسم الخط کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔

میں عصمت چغتائی، راہی معصوم رضا، رضیہ سجاد ظہیر، عارفی یا آزیش جیسے لوگوں کی بات نہیں کہتا۔ جن کے لسانی استقلال و ادبی معتقدات میں "وقت کی راگنی" الاپنے کو ارتقائے فن کا درجہ حاصل ہے۔ بلکہ مجھے حیرت ہوتی ہے تو اُن اربابِ زبان و ادب پر جو خدمتِ اُردو کے مستند دعویدار ہیں اور واقعتاً جن کی پشت پر برسوں کی تواریخِ جہد و عمل ہے۔ آج جب کہ اُردو زبان کے خلاف سازشیں کی جا رہی ہیں،

یہ لوگ کیوں چپ سادھے بیٹھے ہیں؟ آخر وہ کون سی مصلحتیں ہیں جن کے پیش نظر ان کی زبانوں پر تالے لگ گئے ہیں۔ انجمن ترقی اردو کے ارباب بست و کشاد ہوں یا انفرادی حیثیت میں ملّا و فراق، غالباً احتیاط نے ان سب کو "دوبارہ مزاج" بنا دیا ہے ___

مینائی ٹی۔ فرید آباد۔ (پنڈت) گوبند داس محوش سرحدی

برادرِ محترم اعجاز صاحب۔ تسلیم!

کرم نامہ موصول ہوا۔ شکریہ! "شاعر" کا تازہ شمارہ آپ نے نہیں بھجوایا۔ تاہم میں نے دیکھ لیا ہے۔ ممکن ہے کچھ ایسے خطوط بھی آپ کو ملے ہوں جن میں بعض لوگوں نے بھارتیہ کرن سے متعلق میری رائے سے اتفاق کیا ہو۔ شاید آپ نے ایسے خطوط کو شائع کرنا پسند نہیں فرمایا عالانکہ شاعر میں سے پچاس سے زائد حضرات نے مجھے براہِ راست خط لکھ کر میرے مضامین پر پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ ممکن ہے وہ سب لوگ اردو دشمن ہوں۔

میرا مضمون اور میری نظم اگرچہ آپ نے شائع نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے لیکن میں آپ کی اطلاع کیلئے عرض کر دوں کہ یہی نظم دیوناگری رسم الخط میں ہندی کا مقبول جریدہ "جن ساہتیہ" شائع کر چکا ہے۔ اسی شمارہ میں ایک مضمون جناب سوشیل رتن چوپڑہ کا بھی شائع ہوا ہے۔ جس میں مضمون نگار موصوف نے شاعر میں شائع ہوئے ان تمام خطوط کا جواب دے دیا ہے جن سے آپ کی اور آپ کے احباب کی تنگ نظری واضح ہوتی ہے ___ ظاہر ہے کہ میں اس سلسلے میں مزید لکھوں گا اور ہندی کے رسالوں کو اشاعت کیلئے دوں گا۔ میرا خیال ہے اب آپ کو یہ اعتراض نہیں ہوگا کہ "اگر مجھے اردو والوں سے کچھ سوالات کرنے ہی تھے تو وہ اردو کے کسی رسالے کے ذریعہ کئے ہوتے"! ___

پنجاب یونیورسٹی ایوننگ کالج۔ چنڈی گڑھ۔ نیازمند نریش

لے آپ کی تائید میں کوئی ایک خط بھی موصول نہیں ہوا۔ اب آپ کو ذاتی طور پر خط کا جواب دینا یا بھجوانا میں اپنی اور اس مقدس فریضہ کی توہین سمجھتا ہوں جس کی طرف خلوص اور فکرمندی کے ساتھ بار بار توجہ دلا تا رہا ہوں ___ مجھے میرے احباب اور ہزاروں لاکھوں اردو دوستوں کو تنگ نظر کہہ دینا بہت آسان ہے۔ اپنی جنتا بہت اقدام ہی پر منتقل ہو کے بجائے آپ اردو ہندی مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان منافرت پھیلانے اور غلط فہمیاں پیدا کرنے کا مزید الزام کھتے ہیں۔ ایک ہی صورت ہے کہ حکومت پنجاب پیپسو کے تمام ذمہ دار اردو اور ہندی کے رسالے، ادیب، شاعر اور صحافی آپ کی نہایت خطرناک فرقہ وارانہ سرگرمیوں پر سختی کیساتھ آپ سے بازپرس کریں اور آپ پر کڑی نظر رکھیں۔

اعجاز صدیقی

نقد و نظر

تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں

تنقید و انداز نظر

از ——— ڈاکٹر سیدہ جعفر

ڈاکٹر سیدہ جعفر ہماری جانی پہچانی ادیبہ ہیں۔ اُن کی تقریباً نصف درجن تحقیقی اور تخلیقی تصانیف شائع ہو چکی ہیں، اپنی شگفتہ شاداب اور منظم نثر اور متین اسلوبِ نگارش کی وجہ سے ان کا اپنا ایک مقام ہے۔

"تنقید و انداز نظر" موصوفہ کے چیدہ چیدہ گیارہ مضامین کا مجموعہ ہے اور اسی عنوان کے تحت اِس مجموعے میں پہلا مضمون ہے۔ اِس مضمون میں مختصراً مگر جامع طور سے تنقید کی تاریخ اور اس کی اہمیت و ماہیت پر اجمالی نظر ڈالی گئی ہے۔ اِس مضمون کی تیاری میں محترمہ نے کئی یورپی، روسی اور دیگر زبانوں کے نقادوں کے زاویۂ نگاہ سے خوشہ چینی کی ہے اور اپنا نقطۂ نظر واضح کیا ہے۔ اُنہوں نے ناقدینِ اُردو کے لئے "تنقید و انداز نظر" کا معیاری راستہ متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اِس مضمون کا کتاب کے دیگر مضامین سے مقابلہ کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ مصنفہ نے اسے بڑی کاوش سے قلم بند کیا ہے۔

دوسرے مضمون کا عنوان "داغ کی غزل گوئی" ہے۔ اِس میں اُنہوں نے داغ کی شخصیت اور اُن کی غزل گوئی سے متعلق اُن پوشیدہ عناصر کو سامنے لانے کی سعی کی ہے جو اب تک دنیائے ادب کی آنکھوں سے اوجھل تھے۔ مثلاً وہ لکھتی ہیں۔ "اپنی غزلوں میں وہ (داغ) حُسن کے پرستار کم اور طلبگار زیادہ نظر آتے ہیں۔"

انگریزی ادب کے شعراء، ادباء اور کہانی کاروں وغیرہ پر جس قدر مواد ہمارے ادب میں ملتا ہے۔ وہ نہیں کے برابر ہے۔ تیسرا مضمون انگریزی ادب کے مشہور کہانی کار سمرسٹ مائم کی ادبی خدمات پر محیط ہے۔ اِس میں مائم کی زندگی اور اس کی شہرۂ آفاق تصانیف کا فنی چابکدستی اور اختصار کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔

چوتھا مضمون اُردو نثر میں مُرقّع نگاری کی بابت ہے جس میں مصنفہ نے مختصراً اُردو ادب میں مُرقّع نگاری کی تاریخ پیش کی ہے اور اُردو کے ۱۳ مُرقّع نگاروں کو متعارف کرایا ہے۔ سعادت حسن منٹو کی تصنیف "گنجے فرشتے" پر ڈاکٹر صاحبہ تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ "انسان کی عظمت اِنسانیت میں ہے ملکوتیت میں نہیں۔" یہ جملہ محترمہ کی پہلودار تنقید کی اچھی مثال ہے۔

پانچواں مضمون اُردو ادب کے بلند پایہ ادیب نذیر احمد کے سماجی تصوّرات پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ نے نذیر احمد کی تمام تصانیف کے مطالعہ کے بعد اُن کے سماجی تصوّرات کو سلسلے وار پیش کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔ "کہانی یا قصّہ نذیر احمد کے یہاں محض وقت گزاری، دل چسپی اور تفریح یا تفننِ طبع کا وسیلہ نہیں، قومی ترقی، اصلاحِ معاشرت اور سماج سُدھار کا ایک مؤثر حربہ اور اہم ذریعہ بھی ہے۔"

چھٹے مضمون میں ڈاکٹر صاحبہ نے حسرت موہانی کے تغزل پر نہایت متوازن اور دل پذیر انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اُنہوں نے حسرت موہانی کی شخصیت، کردار اور شاعری کا جس پہلو سے جائزہ لیا ہے وہ اَوروں سے کچھ مختلف ہے، ڈاکٹر صاحبہ دو ٹوک بات کہنے کی عادی ہیں۔ لہٰذا حسرت سے متعلق رقمطراز ہیں کہ "حسرت کی نظر میں حق وہی ہے جو عین فطرت اور نیچر کے مطابق ہو" دوسری جگہ لکھتی ہیں۔ "ایک اور چیز جو حسرت کو دوسرے غزل گو شعراء سے ممیّز کرنے والی ہے وہ یہ ہے کہ حسرت کا محبوب شمعِ محفل نہیں چراغِ خانہ نظر آتا ہے۔"

بقول ڈاکٹر صاحبہ "غزل اپنی ریزہ کاری اور اختصار کے باوجود بڑی جامع صنف ہے۔" "دکنی غزل گوئی" کے عنوان سے اِس مجموعے میں اُن کا ساتواں مضمون ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ کی دکنی ادب پر خاصی نظر ہے۔ اُن کی مُرتّبہ شاہ تراب چشتی کی من سمجھاون اِس امر کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہے۔ اِس مضمون میں ڈاکٹر صاحبہ نے دکن میں اُردو غزل کے ارتقا اور دکنی کے مشہور غزل گو شعراء کا تعارف کروایا ہے۔ اُنہوں نے قدیم اُردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کو ایک حد تک صوفی شاعر تسلیم کیا ہے۔ یہ اُن کا

جرأت مندانہ اقدام ہے۔ کیونکہ قدیم اُردو کے بیشتر ناقدین اِس امر کے قائل نہیں ہیں۔

آٹھواں مضمون تلوک چند محروم پر ہے۔ اِس میں ڈاکٹر صاحبہ نے محروم کی نظموں کے جمالی پہلو کے خدوخال اُبھارے ہیں اور محروم کے کلام کی دردمندی، خستگی اور اسلوب کی سوزناکی کو واضح کیا ہے۔

نواں مضمون صفی اورنگ آبادی کی حیات و شاعری پر محیط ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ نے صفی کی حیات کے المیہ پہلو کو مدّنظر رکھ کر اُن کی شاعری کی فنّی خوبیوں کو اُجاگر کیا ہے۔ دراصل اُردو ادب کو صفی اورنگ آبادی کا شرمندۂ احسان ہونا چاہیئے۔ کیونکہ بقول ڈاکٹر صاحبہ اُنہوں نے تھوڑے سے عرصہ میں "سماج کو تابندہ شعر دیئے۔ اور کھنکتی ہوئی غزلیں دیں۔ دمکتے ہوئے محاورے اور بولتی ہوئی تصویریں اور جگمگاتی ہوئی ترکیبیں دی ہیں۔"

اُردو ادب میں انشائیہ نگاری پر بہت کم مواد فراہم ہوا ہے۔ چند چھوٹی چھوٹی کتابیں مل جاتی ہیں۔ لیکن اُن میں ادبی تشنگی باقی رہتی ہے۔ اِس مضمون میں حسن نظامی جیسے البیلے اور صاحب طرز انشائیہ نگار کی ادبی کاوشوں اور طرزِ نگارش کے تمام پہلوؤں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ حسن نظامی کے انشائیوں کی زبان ازحد سادہ آسان اور عام فہم خیالات سے مزیّن ہے۔ اسی بناء پر ڈاکٹر صاحبہ نے لکھا ہے کہ "اُنہیں عوامی ادیب کہنا بجا نہیں معلوم ہوتا۔"

کتاب کا آخری مضمون مولانا ابوالکلام آزاد کے مضامین سے متعلق ہے۔ ابتداءً اِس مضمون میں آزاد کے بنیادی تصوّرات اور تشکیلی عناصر کو سمجھنے کے لئے اُس عہد کے سیاسی و سماجی پس منظر کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اُس کے بعد آزاد کے اُن پیغامات کو فرداً فرداً واضح کیا ہے جو اُنہوں نے اپنے مضامین کے ذریعہ ہم تک پہنچانے کی کوشش کی ہے آخر میں آزاد کے اسلوبِ نگارش اور پُررعب اندازِ بیان پر روشنی ڈالی ہے۔ اِس ضمن میں وہ لکھتی ہیں۔ کہ "یہ ہو سکتا ہے کہ پڑھنے والا ابوالکلام آزاد کے خیالات اور تصوّرات سے پُوری طرح ذہنی ہم آہنگی نہ پیدا کر سکے۔ لیکن اُن کے مضامین کے مطالعے کے دوران میں، اُن کی علمیت، بالغ نظری اور اسلوب کے پُرزور آہنگ سے مرعوب اور متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

ڈاکٹر سیدہ جعفر صاحبہ کے تنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ اُردو ادب میں قدر کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ موصوفہ کا اندازِ نظر یک طرفہ نہیں ہے۔ وہ بات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش بھی کرتی ہیں۔ اُن کے یہاں چند مخصوص ہندی الفاظ کا استعمال ہوا ہے۔ کہیں کہیں ان الفاظ سے بھدّا پن پیدا ہو گیا ہے۔ وہ مکمّل اشعار اور مصاریع کو بھی نثر کے پیکر میں ڈھالنے میں مشّاق ہیں۔ اسی لئے اُن کے مضامین میں شگفتگی اور تر و تازگی ہوتی ہے۔

حجم ۲۲۲ صفحات، اچھی کتابت و طباعت، قیمت چار روپے۔
ناشر:- نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ۔

سُکھ انجن

مرتبہ ــــــــــ ڈاکٹر سیّدہ جعفر

شاہ ابوالحسن قادری بیدری متوفّی ۱۱۲۵ھ مطابق ۱۷۱۳ء کی مثنوی "سُکھ انجن" کو ڈاکٹر صاحبہ نے اپنے محققانہ مقدّمہ کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ قدیم اُردو کی ترویج و ترقی میں بیجاپور کا معتدبہ حصّہ ہے۔ یہ متصوّفانہ مثنوی بھی اُسی سلسلے کی ایک اہم کڑی تصوّر کی جا سکتی ہے۔ اس کتاب میں شاہ ابوالحسن کے مکمّل حالاتِ زندگی بڑی چھان بین کے بعد قلم بند کئے گئے ہیں۔

"سُکھ انجن" قدیم اُردو کی اچھی مثنویوں میں شمار کی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ نے اِس کے متعدد قلمی نسخوں کا پتہ لگا کر متن تیار کیا ہے۔ اور حاشیے میں مشکل الفاظ اور ادق تراکیب کے مطالب دے دیئے ہیں۔

مرتّبہ نے "سُکھ انجن" پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "آنکھ مچانی دکنی بچوّں کا ایک پسندیدہ کھیل ہے۔ اِس میں چور بننے والا بچّہ اپنے دوسرے ساتھیوں کو جو چھپ جاتے ہیں ڈھونڈ نکالتا ہے شاہ ابوالحسن نے اِس مثنوی میں طفلانہ بازی کے ذریعے تصوّف کے بعض نکات کی تشریح کی ہے اور تصوّف کے بعض مسائل کو تمثیلی انداز میں پیش کیا ہے۔"

ڈاکٹر صاحبہ نے اِس مثنوی کو منظرِ عام پر لاکر قدیم اُردو کی

نوشتوں میں ایک گل تر کا اضافہ کیا ہے۔

حجم ۱۹۱ صفحات، صحت نامہ الگ سے ہے۔ کتابت طباعت اور کاغذ معیاری نہیں ہے۔ ورنہ کتابت کا حسن اور قدر و قیمت دوبالا ہو جاتی۔ کتاب کی قیمت کہیں درج نہیں ہے۔

شائع کردہ :۔ لطف اللہ ولبا در نیشنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ حیدرآباد ۲۷

از ڈاکٹر نور السعید اختر

میوۂ تلخ

از ـــــــــ عبدالحلیم شرر لکھنوی

مرتبہ ـــــــــ مناظر عاشق ہرگانوی

مناظر عاشق ہرگانوی نے چند سال ہی میں اپنی تحریروں سے علمی و ادبی حلقوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ وہ تنقید، تحقیق اور اخذ و ترجمہ کی اچھی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مغربی ادب کے مطالعہ کے علاوہ مختلف ملکی زبانوں کے ادب پر بھی اُن کی نظر ہے۔ ہر رسالہ میں اُن کی تحریریں شائع ہوتی ہیں۔ وہ اُن فعال ادیبوں سے ہیں جن کا قلم تو یہ تو تخلیقی اور ترتیبی کاموں میں مسلسل مصروف ہے۔

اب سے ۶۵ سال پہلے عبدالحلیم شرر نے "میوۂ تلخ" کے نام سے ایک ڈراما لکھا تھا۔ اور مصنف کی اجازت سے یہ ابوالعلائی پریس آگرہ میں طبع ہوا تھا۔ اُس زمانہ میں اچھے اچھے مصنفین کی کتابیں معمولی کاغذ اور سرورق کے ساتھ شائع ہوا کرتی تھیں اور نہایت سستی فروخت ہوتی تھیں۔ لیکن بڑی تعداد میں چھپتی تھیں اور ایک کتاب کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوتے تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد، راشد الخیری اور عبدالحلیم شرر وغیرہ کی کتابیں خوب نکلتی تھیں۔ شرر کے تاریخی، اصلاحی اور اخلاقی ناول بھی بہت مقبول تھے۔ شرر نے ڈرامے کی طرف بھی توجہ دی لیکن انہیں مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ مناظر عاشق لکھتے ہیں۔

"میرے پیش نظر اُس کا پہلا ایڈیشن ہے اور جہاں تک تحقیق سے معلوم ہو سکا اس ڈرامے کا دوسرا ایڈیشن پہلے کبھی شائع نہیں ہوا تھا۔"

مناظر عاشق نے "میوۂ تلخ" کی پرانی کاپی حاصل کر کے ازسرِ نو اُس کی ترتیب و تدوین کی ہے اور اُسے نہ صرف دستبردِ زمانہ سے بچا لیا ہے، بلکہ اردو دنیا کو پرانے ادب سے اچھی شکل میں روشناس کرانے کی مستحسن کوشش کی ہے۔

مرتب نے ابتداءً اپنے مقدمہ میں شرر کے مختصر حالاتِ زندگی اُن کے تخلیقی کاموں اور اردو ڈراموں پر روشنی ڈالی ہے۔ "میوۂ تلخ" کے مرکزی خیال، اور اس کی ادبی حیثیت پر مختصراً لکھا ہے۔ "میوۂ تلخ" شرر کے بعض ناولوں ہی کی طرح اصلاحی اور اخلاقی ہے جس میں عورتوں کی تعلیم کی اہمیت، پردہ کی مخالفت اور نکاحِ ثانی پر زور دیا گیا ہے۔ اِس کی زبان آسان اور گھریلو ہے۔ کردار بھی اِسی نوعیت کے ہیں۔ مکالموں میں کہیں زور ہے اور کہیں یہ بالکل سپاٹ قسم کے ہیں۔ شرر چونکہ ناول نگاری کے عادی تھے اِس لئے ناول اور ڈرامے کے مکالموں میں زیادہ فرق نہیں کر سکے ہیں۔ اردو ڈرامہ نگاری کا عروج بعد میں ہوا ہے۔ اُن کے سامنے ڈرامہ کی اچھی مثالیں نہ تھیں۔ پھر بھی ڈرامہ کافی دلچسپ اور سبق آموز ہے۔

۱۱۸ صفحات۔ لکھائی چھپائی اچھی۔ قیمت دو روپے۔

ملنے کا پتہ :۔ نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ۔

محفل اپنی

شاعر کے مندرجات

شاعر کا حصّۂ نظم و نثر ایک خاص انداز و معیار کا ہوتا ہے۔ سرسری ہنگامی اور عمومی رنگ کی تحریریں اِس میں جگہ نہیں پاتیں۔ اُردو قاری کے بلند متنوّع ذوق کی آسودگی کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھا جاتا ہے۔ تخلیقات کے متنوّع اور معیار کے پیشِ نظر بیشتر تحریریں واپس کرنا پڑتی ہیں۔ یہ اہتمام کیا جاتا ہے کہ ہر شمارہ میں مختلف اصناف ادب پر مشتمل معیاری تخلیقات ہوں۔ منظومات کے علاوہ مقالوں، افسانوں، طنزیوں اور ڈراموں [illegible] اہم موضوعات پر لکھی گئی تحریروں ہی کو ترجیح دی جاتی ہے۔ محض شعر و شاعری کے ذکر و اذکار سے اُردو حلقے بیزار آچکے ہیں۔ "شاعر" کے ہر شمارہ میں نثری تخلیقات زیادہ ہوتی ہیں، اور چونکہ معتبر لکھنے والوں نے "شاعر" کے مزاج کو پہچان لیا ہے۔ اِس لئے بڑی تعداد میں مقالے، افسانے، ڈرامے اور طنزیئے وصول ہوتے ہیں۔ حال ہی میں اُردو میں "ہندوستانیت" کا موضوع دیا گیا تھا۔ اب تک اِس موضوع پر چھ مضامین آچکے ہیں۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ منتخبہ تخلیقات کی اشاعت میں تاخیر ہو جانے یا طے شدہ موضوعات پر آئی ہوئی کمزور تخلیقات کی واپسی سے قلم کاروں کو شکایت نہیں ہونی چاہیئے۔ شخصیات پر اگر چار اچھے مضامین جمع ہوں تو ظاہر ہے ایک اشاعت میں صرف ایک ہی مضمون شائع ہو سکتا ہے۔ اسی طرح دوسرے موضوعات کی بات ہے۔ "شاعر" کے صفحات بڑھا دینے کے باوجود تنگیٔ داماں والا معاملہ ہے۔ ——— اکتوبر ۱۹۷۴ء کے اِس شمارہ میں اعلان کردہ طنزیہ "سالانہ جلسے" شامل نہیں ہے۔ طنزیہ نگار نے اسے نومبر میں شائع کرنے کی ہدایت کی ہے۔ اُس کی جگہ ایک دوسرا تازہ طنزیہ شائع کیا جارہا ہے۔ اِس اشاعت میں وطنیت کے موضوع پر ایک مضمون خاصا طویل ہے۔ اِس لئے اعلان کردہ ڈرامہ "راستہ" بھی روکنا پڑا ہے۔ یہ دونوں تخلیقات نومبر ۱۹۷۴ء کے "شاعر" میں شامل ہوں گی۔

ناولٹ نمبر: پچھلے شمارہ میں خاص نمبر ۱۹۷۴ء کے سلسلے میں صرف ایک اِشارہ کیا گیا تھا۔ "شاعر" کے خوش ذوق قارئین نے بڑی گرمجوشی سے اُس کا خیر مقدم کیا ہے۔ اِس خاص نمبر ۱۹۷۴ء کے موضوع کے علم کے بعد تو اُردو حلقوں کو اور بھی زیادہ مسرت ہوگی۔ "ناولٹ نمبر" کی کامیابی کا انحصار "شاعر" دوستوں کے پُرخلوص تعاون پر ہے۔

مالک، ایڈیٹر، پبلشر افتخار امام صدیقی نے یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس ۳۳ نوروز جی اسٹریٹ، قصاکر واڑہ بمبئی ۸ میں چھپوا کر و ہیں سے شائع کیا۔

Publishing Date 15-16
Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 14482

علامہ سیماب اکبر آبادی

کی چند حیات افروز تصانیف

کلیم عجم	(غزلیات)	چار روپیہ آٹھ آنے
سدرۃ المنتہیٰ	(غزلیات)	چار روپیہ
کار امروز	(نظمیں)	چار روپیہ آٹھ آنے
شعر انقلاب	(نظمیں)	تین روپیہ
عالم آشوب	(رباعیات)	چھ روپیہ
شہر غم (مراثی نظمیں اور سلام)		ایک روپیہ

جلدوں پر خوبصورت اور رنگین گردپوش

(مکمل سیٹ کی خریداری پر نصف محصول ڈاک معاف)

منیجر اشاعت ۔ مکتبۂ قصر الادب پوسٹ بکس ۳۵۲٦ بمبئی ۸

...ET PRINTERS, Bombay-8.

۷ سالہ نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹ
(چوتھا اجراء)
بچت کی ایک عمدہ تجویز ہے
تفصیل کے لئے اپنے ڈاک گھر سے معلومات حاصل کریں۔
قومی بچت آرگنائزیشن

کرشن چندر نمبر ـــ غالب نمبر ـــ گاندھی نمبر
جیسی یادگار اور مثالی خصوصی اشاعتوں کے بعد
ماہنامہ شاعر بمبئی
کی ایک اور منفرد، معیاری، خوبصورت، ضخیم
اور انتہائی دلچسپ خصوصی اشاعت پیش کیجارہی ہے
فروری ۷۱ء میں
ناولٹ نمبر
اردو کے مشہور و ممتاز
ناولٹ نگاروں کے
تازہ ترین
غیر مطبوعہ اور
بیش قیمت ناولٹ
ناولٹ نگار: کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، کوثر چاندپوری
سہیل عظیم آبادی، رام لعل، مہندر ناتھ، قاضی عبدالستار، جوگندر پال، ستیش بترا
ہربنس دوست، ستیہ پرکاش سنگھ، آمنہ ابوالحسن، عفت موہانی، واجدہ تبسم
حامدی کاشمیری، اکرام جاوید، نور شاہ، موہن یاور، آغا رشید مرزا۔
۲۰ کتابوں کے برابر ۲۰ ناولٹ
اردو رسائل کے خاص نمبروں میں ایک گرانقدر اضافہ
(ناولٹ نگاروں کی تصاویر اور انکے سوانح حیات)
ضخامت تقریباً پانچ سو صفحات
قیمت چھ روپے پچاس پیسے
مستقل سالانہ خریداروں کیلئے رعایتی قیمت صرف دو روپے پچاس پیسے
(علاوہ رجسٹری خرچ)
ایجنٹوں کو اپنے آرڈر فوراً بھیجنے چاہئیں
منیجر ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصر الادب پوسٹ بکس ۲۵۲۶ بمبئی ۸
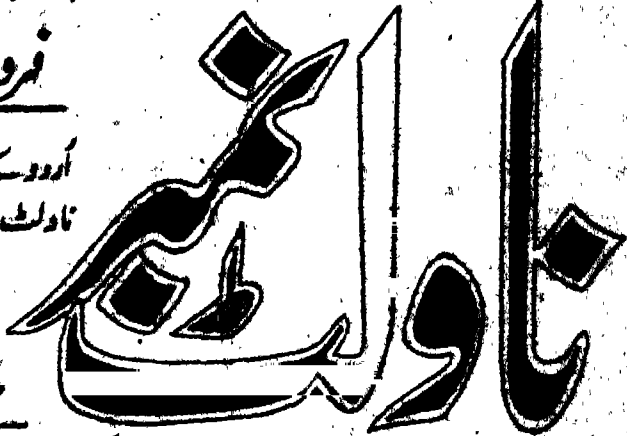
نہایت ضروری اور توجہ طلب

شاعر کے ساتھ تعاون کیجیے اور اسے نقصان سے بچائیے

"شاعر" کے مستقل خریداروں سے :-

۱۔ تمام مستقل خریداروں کو شاعر کے ضخیم و عظیم ناولٹ نمبر کی رعایتی قیمت دو روپے پچاس پیسے اور ایک روپیہ رجسٹری خرچ۔ کُل تین روپے پچاس پیسے (3.50) منی آرڈر سے بجلت بھیجنے ضروری ہیں۔ منی آرڈر کوپن پر پتہ اور نمبر خریداری واضح اور صاف لکھنا چاہئے۔ رعایتی قیمت اور رجسٹری خرچ آئے بغیر کسی خریدار کو ناولٹ نمبر نہیں بھیجا جائے گا۔

۲۔ جن خریداروں کا زرِ سالانہ دسمبر ۱۹۷۰ء یا جنوری ۱۹۷۱ء میں ختم ہو رہا ہے، وہ دس روپے سالانہ چندہ اور رعایتی قیمت ناولٹ نمبر (مع رجسٹری خرچ) کُل تیرہ روپے پچاس پیسے (13.50) بذریعہ منی آرڈر جلد از جلد بھیج کر ممنون فرمائیں۔

۳۔ جن خریدار حضرات کا زرِ سالانہ دسمبر ۱۹۷۰ء سے پہلے گزشتہ مہینوں میں ختم ہو چکا ہے اور مسلسل یاد دہانیوں کے باوجود انھوں نے اب تک نہیں بھیجا ہے، اُن سے بھی درخواست ہے کہ وہ اپنا زرِ سالانہ مع رعایتی قیمت "ناولٹ نمبر" اور رجسٹری خرچ تیرہ روپے پچاس پیسے فوراً بھیج دیں۔ اگر اُن کا چندہ وصول نہ ہوا تو اس شمارہ کے بعد "شاعر" اُن کے نام بند کر دیا جائے گا۔ نہ جنوری ۱۹۷۱ء کا شاعر بھیجا جائے گا اور نہ ناولٹ نمبر اُنھیں مل سکے گا۔

۴۔ کسی بھی خریدار کو زرِ سالانہ یا "ناولٹ نمبر" کی رعایتی قیمت (یا دونوں) کا وی۔پی نہیں بھیجا جائے گا۔

کوئی خریدار زرِ سالانہ یا "ناولٹ نمبر" کی رعایتی قیمت بعد میں بھیجنے کے لیے نہ لکھے۔

کالجوں، اسکولوں اور گورنمنٹ لائبریریوں سے :

۱۔ جن کالجوں اور اسکولوں کو زرِ سالانہ کے بِل جا چکے ہیں، اُنھیں بھی ناولٹ نمبر کی رعایتی قیمت دو روپے پچاس پیسے اور ایک روپیہ رجسٹری خرچ۔ کُل تین روپے پچاس پیسے منی آرڈر سے بھیجنے چاہئیں۔ بِل نہیں بھیجا جائے گا۔

۲۔ جن لائبریریوں کے نام ریاستی حکومتوں کی طرف سے "شاعر" جاتا ہے، وہ ذاتی طور پر لائبریری کی طرف سے ناولٹ نمبر کی رعایتی قیمت دو روپے پچاس پیسے اور ایک روپیہ رجسٹری خرچ۔ کُل تین روپے پچاس پیسے منی آرڈر سے جلد بھیج دیں۔ بصورت دیگر انھیں ناولٹ نمبر نہیں بھیجا جائے گا۔

شاعر کے ایجنٹوں سے :

۱۔ شاعر کے تمام ایجنٹ جلد از جلد اطلاع دیں کہ اُنھیں ناولٹ نمبر کی کتنی کاپیوں کی ضرورت ہوگی۔

۲۔ ہر ایجنٹ کو ناولٹ نمبر کی کاپیاں وی۔پی سے بھیجی جائیں گی۔ مطلوبہ تعداد کی کُل رقم کا چوتھائی حصہ بطور پیشگی آنا ضروری ہے۔

۳۔ کسی ایجنٹ کو ناولٹ نمبر کی پانچ کاپیوں سے کم نہیں بھیجی جائیں گی۔ دس سے ستّر کاپیوں تک منگانے والے ایجنٹ اپنے قریبی ریلوے اسٹیشن کا نام لکھیں۔ ریلوے رسید وی پی کے ذریعہ بھیجی جائے گی۔ ہر حالت میں وی پی کا وصول کرنا لازمی اور ضروری ہوگا۔

ایجنٹ حضرات کے چوتھائی پیشگی آنے تک ... ناولٹ نمبر کی کاپیوں کے وی پی نہیں بھیجے جائیں گے۔

(مینیجر)

غائب ہیں۔ طنز و مزاح پسندیدہ روِش، جو نوکِ خامہ سے بڑھتے بڑھتے گفتگو تک آ پہنچی ہے۔ باتیں کافی چٹپٹی اور نوکیلی ہوتی ہیں۔ لیکن گفتگو میں تلخ کوئی نہیں ہے۔ طنز نگار ہوتے ہوئے بھی "ہم کسی چیز کی تعریف کرتے ہی نہیں" کا نعرہ نہیں لگاتیں۔ شاید اسی لئے کوثر چاندپوری صاحب شفیقہ فرحت کے طنز کو "بیضرر طنز" کہا کرتے ہیں۔ لاابالی پن فطرتِ ثانیہ۔ جذباتی بھی سنگدل بھی۔ لیکن دونوں انداز میں صرف اپنے لئے بے رحم۔ خود کو بڑی نفسیاتی قسم کی سزائیں دینے کی عادی۔ اپنے بارے میں سوچتے وقت خود پر بڑھاپا طاری کر لینے کی عادت ایک مستقل کمزوری۔ شاید اسی وجہ سے رومان کو جذباتی ہیجان اور جسم کی پیاس کا نام دے رکھا ہے۔ پہلے کبھی کوئی خواب دیکھا ہو تو دیکھا ہو۔ اب جیسے ہر خواب پلکوں سے جھٹک کر پھینک دیا ہے۔ اور اپنی قوتِ خود ارادی کے ساتھ ہر خواب کا راستہ روکے کھڑی ہیں اس کئے سے بے نیاز کہ کچھ خوابوں کو خوش آمدید کہنا اور کچھ خوابوں کی مدافعت کرنا ضروری ہے۔ شاید یہ بے نیازی اس لئے بھی ہے کہ وہ خود طنز نگار ہیں اور طنز نگاری حقیقت پسندی کا ایک جزو۔ برخلاف اس کے خواب دیکھنا رومانیت پرستوں کی ایک مستقل عادت۔ لیکن پھر بھی یہ منتقمانہ بے نیازی اُن کی شخصیت کا ایک المیہ تو ہے ہی۔ شاید راجہ مہدی علی خاں مرحوم اُن کی شخصیت کے اِس کرب کا سراغ پا گئے تھے اسی لئے لکھ گئے کہ ؎

"غائب دماغی کا یہ عالم کہ بار بار اپنے وطن ناگپور جا کر اپنی امّی جان سے پوچھنا۔ امّی آپ کی بیٹی شفیقہ کہاں ہے۔ گھر میں نظر نہیں آ رہی۔ کیا شادی کر کے سسرال تو نہیں بھاگ گئی ہے؟" اس کے بعد اپنی امّی سے یہ کہہ کر ناگپور سے بھوپال آ جانا۔ "ہم مرد ہیں کمانے پردیس جا رہے ہیں"

"مشہور اہلِ قلم خواتین کے محبوب مشغلے"
مطبوعہ بیسویں صدی، دہلی ماہ فروری

تضاد کی شکل میں اُبھرنے والے اِس المیہ نے شفیقہ فرحت کو دو طاقتوں کے ٹکراؤ کی پیداوار بنا کر رکھ دیا ہے۔ اُن کی حیثیت دو دُنیاؤں کے درمیان بھٹکتے ہوئے ایک مسافر کی سی ہے۔۔۔۔ پہلی دنیا مُردہ ہو چکی ہے اور دوسری دُنیا کو ابھی تک پیدا ہونے کی طاقت نصیب نہیں ہو سکی ہے۔

شفیقہ فرحت کی پسندیدہ صنف انشائیہ ہے، انشائیہ اُردو میں کافی نئی صنف ہے۔ اُردو میں ابتداء سے ایسی کسی صنف کا فقدان رہا جس کو لاطینی صنف ایکسیجیم (EXAGIUM) فرانسیسی صنف ایسائے (ESSAIE) یا انگریزی صنف ایسے (ESSAY) کا مترادف کہا جا سکے۔ شروع ہی سے اُردو نثر نگاروں کا رُجحان افسانہ نگاری، شخصیت نگاری یا تنقید کی طرف زیادہ رہا۔ اور اُردو نثر میں ایسی کسی صنف کا وجود عمل میں نہ آ سکا جو مندرجہ بالا اصناف کے مقابل رکھی جا سکے۔ نام کے فرق کو اگر بالائے طاق رکھ کر اگر دیکھا جائے تو انشائیہ نثر کی وہ صنف ہے جس میں کسی موضوع پر غنائیت کی سی کیفیت پائی جائے۔ بدلتے ہوئے سماج میں کیونکہ فرد کی شاعری اور فرد کے تاثرات جیسے نعرے بہت عام ہو رہے تھے۔ اس لئے نثر کو جدید شاعری کے ہم رکاب بنانے کے لئے کسی ایسی صنف کی تلاش ضروری تھی جو فرد کے تاثرات کی بلا قید و بند عکاسی کر سکے۔ تلاش و اختراع کا یہ سلسلہ کافی پرانا ہے جو آج تک جاری ہے اور آزاد کی نیرنگی سے انشائیہ تک آیا ہے لیکن خوبصورت کہ اس دور میں جو ادیب اس صنف کی تلاش میں سرگرداں ہوئے اُن میں سے ایک شفیقہ فرحت بھی ہیں۔

شفیقہ فرحت کی تحریروں میں طنز و مزاح کا ایک خوبصورت امتزاج ہے۔ لیکن عام طور پر طنز کم اور مزاح زیادہ ہے۔ شفیقہ فرحت [illegible] قلم [illegible] کھل کھلی تو [illegible] پر خود بھی دل کھول کر ہنستی ہیں [illegible] کو بھی ہنسا [illegible] کی [illegible] ان کے [illegible] سے کم [illegible] انسانیت پسند ہوتا ہے اس کو دوسروں سے کیا

نائیلون کی ساڑی۔ گزشتہ رات کے ذہن میں رہتا کا گایا ہوا گانا اور سوئٹزر کی شکیل وغیرہ میں کیونکہ دور دور تک کوئی مطابقت نہیں پھر اس لئے سب سے پہلے ان کی نظر انہیں چار پانچ گوری گوری لڑکیوں پر پڑتی ہے جن کی آنکھیں تو کھیل پر لگی ہیں اور دماغ نائیلون کی ساڑیوں میں اُلجھا ہوا ہے۔ کرکٹ میچ دیکھنے کے لئے انہیں اشتیاق نہیں بلکہ کھوکھلی خودنمائی اور فیشن پرستی کھینچ لائی ہے۔ عورت کی خودنمائی پر اگر بہت زیادہ موثر طنز کہیں ملتا ہے تو وہ برنارڈ شاہ یا خلیل جبران کی تحریروں میں ہے۔ خلیل جبران ایک جگہ لکھتا ہے کہ "جب ایک عورت بات کرتی ہے تو وہ اپنی پوری شخصیت کھول کر رکھ دیتی ہے۔ اور جب بہت سی عورتیں بولنا شروع کرتی ہیں تو وہ صرف اور صرف بکواس کرتی ہیں"۔ اسی طرح ایک جگہ اور دنیا کے سب سے بڑے جھوٹ کے عنوان کے تحت لکھتا ہے کہ "میں نے تین عورتوں کو ایک کمرے میں بالکل خاموش بیٹھے دیکھا ہے"۔ قطع نظر اس کے شفیقہ فرحت کا طنز اس لئے زیادہ اہم ہے کہ وہ خود بھی اسی صنف سے تعلق رکھتی ہیں جس پر یہ طنز کیا گیا ہے۔ یہ طنز اُن کی حقیقت پسندی اور جرأت مندی کا واضح ثبوت ہے۔ اور جرأت اور بے باکی طنز نگار کی اہم ترین خصوصیات ـــــ

شفیقہ فرحت کو امیجری (IMAGIERY) پر پورا پورا کنٹرول ہے۔ اپنے فن میں مزید سحر اور پیدا کرنے کے لئے وہ اس قسم کا امیج استعمال کرتی ہیں۔ جو اُن کے مقصد پر پوری اترتی ہیں۔ مثلاً مذکورہ بالا انشائیے میں پان فرائڈ انڈے کی کچی زردی کے لئے انہوں نے "بلبلاتی ہوئی زردی" کا فقرہ لکھ کر لفظی تصویر کشی کا حق ادا کر دیا ہے۔ انہیں خصوصیات کی وجہ سے شاہراہ دہلی کے ایڈیٹر یوسف جامعی نے اپنے اداریئے میں اس انشائیہ کے بارے میں لکھا ہے: "شفیقہ فرحت کا "بچپن کہاں گیا"... طنز و مزاح کی بہترین مثال ہے۔ امیجری کے اس رکھ رکھاؤ کی وجہ سے ان کے طرزِ تحریر میں اک نئی شگفتگی اور برجستگی آگئی ہے"۔ زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی "ایک طرح سے مبالغۂ اضافی (EXTNDED HYPERBOLE) سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن یہ مبالغۂ اضافی سچائی سے بہت دور نہیں ہے۔ اس انشائیے میں ایک طنز کے قلم سے نکلی ہوئی ایک انتہائی سرد دنوں کی منظر نگاری قابلِ ستائش ہے۔

"جب تند و تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ درختوں کے نیچے بکھرے ہوئے سوکھے پتے یوں کھڑکھڑاتے جیسے بیک وقت پون درجن عورتیں پورے جوش و خروش سے لڑ رہی ہوں اور سورج اپنی عاقبت کی فکر میں جانے کہاں جا چھپا تھا، چائے پیالی اور ہونٹوں تک کا فاصلہ طے کرنے میں برف بن بن جاتی تھی۔ اس لئے ایک کمیٹی اس معجزے کے امکانات پر غور کر رہی تھی جو کینٹین کے آس پاس کے گلزار کو تھوڑی دیر کے لئے آتش نمرود میں بدل دے۔ دوسری کمیٹی وہ درخواست لکھ رہی تھی جس میں وزیر تعلیمات سے یہ مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ ایسے پُرآشوب موسم میں ہر چار طلبہ کے لئے ایک انگیٹھی مہیا کی جائے۔ وہ گرمیوں میں جب پہاڑوں کی برف پگھلے گی تو کلاس روم کی فضا میں وہ لیکچر گونجیں گے۔ جو مہینوں پہلے دیئے گئے تھے۔ لیکن سنے نہ جا سکے"۔

مطبوعہ بیسوی صدی۔ دہلی امئی ۱۹۶۰ء

اس پورے ٹکڑے کو چند برمحل امیجیز (IMAGES) کے سہارے اس انداز سے تحریر کیا گیا ہے کہ نثری شگفتگی مجروح نہ ہو قابلِ ذکر امیجیز ہیں۔ "بیک وقت پون درجن عورتوں کی پورے جوش و خروش کے ساتھ لڑائی"، "بھاپ اڑاتی ہوئی چائے کی پیالی"، "برف"، "آتشِ نمرود"، "انگیٹھی"۔ جمہوری دور میں معمولی سے معمولی بات پر منسٹر سے رجوع کر کے مطالبہ کرنے والے اصحاب کی درخواستیں اور گرمیوں میں پہاڑوں کی برف پگھل جانے کے بعد ان اشیاء کی جیبوں کی تیری برآمدگی جو سردیوں کی برف باری میں کھو گئی تھیں اس انشائیہ میں سوئیٹر کا تذکرہ جس انداز میں کیا گیا ہے وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔

"ایک مرتبہ بعض باغیوں کے ورغلانے سے کچھ اس قسم کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن جب کئی سال کی محنت کے بعد وہ پایۂ تکمیل کو پہنچائی گئی تو اس عجیب و غریب شے کا نام رکھنے کے لئے ماہر لسانیات سے رجوع کرنا پڑا۔ اور ایک نیا لفظ عالم وجود میں آگیا اور جب ہم نے اسے پہننے کی ہمت کی تو آس پاس اتنی بھیڑ اکٹھی ہوگئی کہ سارا ٹریفک رک گیا اور ہم شہر میں ہنگامہ برپا کرنے کے جرم میں دھر لئے گئے۔"

اس انشائیہ کے تانے بانے شفیقہ فرحت نے اپنی ایک کرم فرما کے گرد بُنے ہیں جو اس "پُرآشوب موسم" میں اپنی ایک "لطافیہ خیال" میں دیکھ کر از راہِ احسان ایک سوئیٹر بنا دینے کا وعدہ کرتی ہیں اور اس طرح اُن کی "اکلوتی ٹوٹی پھوٹی جان" پر اپنے احسانِ عظیم کا بار رکھ کر نہ صرف اُن کی شخصیت بلکہ اُن کے جسمانی نظام تک کو تہس نہس کر ڈالتی ہے۔ سوئیٹر تو ڈیڑھ سال تک تھوڑے تھوڑے وقفہ بعد نیوز بلیٹن اِشو ہوتے رہنے کے بعد تیار ہوتا ہے۔ لیکن احسان جتانے کا یہ سلسلہ سوئیٹر کی تشکیل کا پروگرام بنتے ہی شروع ہو جاتا ہے اور بدلے کے طور پر چائے کی پیالی کے مصارف سے لے کر سنیما کے ٹکٹ کے مصارف تک برداشت کرنے کے باوجود احسان احسان ہی رہتا ہے۔"

"فری پیریڈ میں جہاں ہم نظروں سے ذرا اوجھل ہوئے اور ہانک لگائی گئی۔ "ارے بھئی وہ کس قدر نالائق ہیں۔ ہم تو مر مر کر اُن کے لئے اتنا بڑا سوئیٹر بنا رہے ہیں اور وہ ہمیں چھوڑ چھاڑ کر غائب ہو جاتی ہیں۔"

واقعی "اچھے بچے" اور اس قدر طویل عرصہ تک بنائے جانے والی سوئیٹر کے پایۂ تکمیل تک پہنچنے کی خبر اتنی ہی استعجابیہ ہو سکتی ہے کہ اگر وہ "اپنے پرس میں خمیرۂ مروارید جواہر والا" لخلخہ اور ایک دن کی چھٹی کی درخواست" نہ رکھنے لگیں تو شادی مرگ واقع ہو جانے کا ہر امکان باقی رہتا۔

اس انداز کی حقیقت نگاری کا انجام وہی ہونا چاہئے تھا جو سامنے آیا۔ چنانچہ "خاندان کی ناک" اس حقیقت نگاری پر ملی ہوئی "دادِ تحسین" کا ایک فوری ردِ عمل ہے۔ اس انشائیہ میں بہ نظرِ غائر اُن اصحاب کا مذاق اُڑایا گیا ہے جو بات بات پر خاندان کی ناک کٹ جانے کی دُہائی دیتے ہیں۔ اس سے بے خبر کہ وہ جس دنیا میں کھڑے ہیں وہ دنیا ٹوٹی ہوئی اقدار، ٹوٹی ہوئی روایات اور ٹوٹے ہوئے عقیدوں اور رشتوں کے ملبے سے پُر ہے۔ ایسی دنیا میں خاندان کی ناک کا تصور بھی کیا تصور ہوا؟ یہ انشائیہ بھی شفیقہ فرحت کی جرأت مندی کا ایک اور واضح ثبوت ہے۔ اس لئے کہ اس کا ماحول بالکل گھریلو ہے اور کردار بھی والد صاحب اور بھائی صاحب قسم کے ہیں۔ طنز کا تیکھا پن لیکن حسبِ دستور ہے۔ حالانکہ اسی انشائیے میں حقیقت نگاری پر ملی ہوئی "دادِ تحسین" کے ردِ عمل کے طور پر صدقِ دل سے قسم کھائی گئی ہے کہ:—

"اب کبھی بھول کر بھی حقیقت نگاری کا خیال دل میں نہ لاؤں گی بلکہ کہانیاں لکھوں گی۔ جن اور پریوں کی محبت — بھوتوں کی نفرت کی — بہاروں کی — خوشبوؤں سے لدی ہوئی جھومتی ہواؤں کی — رنگین فضاؤں کی — اُس جنت کا نقشہ کھینچوں گی جسے کسی نے نہیں دیکھا۔ اُس دوزخ کا ذکر نہیں کروں گی جو ہمارے چاروں طرف پھیلی ہے۔"

(مطبوعہ خاص نمبر شاعر بمبئی ۱۹۵۹ء)

لیکن یہ قسم کبھی پوری نہ ہوئی۔ کیونکہ اس کی حیثیت منتقمانہ اور وقتی تھی اور فن کار اور فن دونوں کی پسپائیت کا اعلان۔ اس لئے اس کے بعد بھی شفیقہ فرحت نے جو کچھ لکھا اس میں اسی دوزخ کے خد و خال اُبھارے گئے جو ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ چنانچہ اس کے باوجود "کہ نہ لکھیں گے ہم" (مطبوعہ بیسویں صدی۔ دہلی۔ مارچ ۱۹۶۱ء) اور "اور لکھنا ناول"

(مطبوعہ شاعر بمبئی ماہ اکتوبر ۱۹۶۲ء) اپنے موضوع کے اعتبار سے مختلف ہو لیکن طرزِ تحریر اور طریقۂ اظہار کے اعتبار سے عموماً ایک شخصیت سے مختلف نہیں ہیں۔ اور راجہ مہدی علی خاں کے محبوب مشغلے" (مطبوعہ بیسویں صدی دہلی ستمبر ۱۹۶۲ء) جواب مضامین تحریر کی چیزوں میں بھی شگفتہ انشائیوں کو بھی حقیقت نگاری سے گریز کرتے ہوئے تحریر نہیں کیا گیا ہے۔ اسی حقیقت نگاری کی وجہ سے شفیقہ فرحت کی تحریروں میں ایک دنیا سی آباد ہو گئی ہے اور یہ دنیا اپنے خدوخال کے اعتبار سے جانی پہچانی دنیا ہے کیونکہ شفیقہ فرحت اتنی باتوں میں مختلف نہیں ہے کہ اسے ہم صرف اپنی دنیا کا ترجمہ بھی کہہ سکیں۔ بیسویں صدی کے ناقدین نے شیکسپیئر اور برنارڈ شا کے ڈراموں کی اسی خصوصیت کو DRAMATIC ENCYCLOPAEDIA کہا ہے

شفیقہ فرحت کی دنیا شہروں کی دنیا ہے۔ یہ شہروالی دنیا پڑھے لکھے فیشن پرست لوگوں سے آباد ہے۔ سماج کے نچلے طبقے کے لوگ مزدور اور کسان اس دنیا کے افراد نہیں ہیں۔

اپنے انشائیوں میں آباد کی ہوئی شفیقہ فرحت کی مبادہ دنیا جس میں چہرے کا اڑا ہوا رنگ اب خالص گھی کی طرح غائب ہو گیا ہے۔" اور نہ صرف گھی اور چہرے کا رنگ غائب ہو گیا ہے۔ بلکہ لوں سے تو تیز رفتار والی چیزیں غائب ہوتی ہیں اس لئے یہ اللہ کا کرم نہیں ہے بلکہ دفتروں کا کرم ہے۔" غائب ہونے اور غائب کئے جانے کا یہ طویل سلسلہ گیہوں اور شکر تک پہنچتا ہے۔ شکر کا وجود تو صرف "پیشیوں میں باقی رہ گیا ہے" (اور بنانا پروگرام کا۔ مطبوعہ صبا حیدرآباد) لیکن گیہوں سایۂ ہما کی طرح نایاب ہے۔ (عہد نامہ جدید۔ مطبوعہ بیسویں صدی دہلی۔ جنوری ۱۹۶۳ء) لیکن پھر بھی اس حق گوئی سے خاندانوں کی ناک پر بن آتی ہے۔ اس لئے کہ لوگ اپنی تصویر دیکھنا نہیں چاہتے۔ صرف دوسروں کی شکلیں دیکھ کر ہنستے ہیں۔ لیکن اپنا کارٹون دیکھ کر مسکرانے کی سکت کسی میں نہیں۔ (خاندان کی ناک) لوگ جب بھی مسکراتے ہیں تو اس تبسم کی تہہ میں کوئی مقصد چھپا ہوتا ہے اور یہ مسکراہٹ بھی وہ سیدھی سادی ہنسی نہیں ہوتی جس میں ہر زبان کی اے بی سی سے لیکر ایکس وائی زیڈ تک کے خاص شامل ہیں۔ کیونکہ اس مسکراہٹ کو پتلون کے تنگ پائنچوں کی طرح آؤٹ ڈیٹیڈ سمجھا جانے لگا ہے۔ مقصد کی اہمیت کے تحت مسکراہٹ بھی چیک پر یک مسکراہٹ، تبلیغاتی مسکراہٹ، سیاسی مسکراہٹ، مشکل کشا مسکراہٹ، بقول بجلیاں مسکراہٹ، وغیرہ وغیرہ کی قسموں میں بٹ چکی ہے۔ (ایک تبسم مطبوعہ بیسویں صدی دہلی۔ ماہ فروری ۱۹۶۳ء) اس دنیا میں لوگ پروگرام بناتے ہیں کہ پروگرام بنا کر کام کرنا منظم ہونے کی دلیل نشانی ہے۔ لیکن پھر بھی کوئی کام پروگرام کے مطابق نہیں ہو پاتا۔ (اور بنانا پروگرام کا مطبوعہ ماہنامہ صبا حیدرآباد ۱۹۶۳ء) ایک حکومت بھی قائم ہے۔ ایسی دنیا میں جس کا ہر کام فائل اور نوٹ شیٹ کے بغیر نہیں چل سکتا۔ ویسے کام تو شاید چل جائے لیکن یہ فائل کبھی نہیں چلتی۔ کیونکہ اس دنیا کی سرکار ڈکنس (DICKENS) کے CIRCUMLOCUTION OFFICE سے مختلف کوئی شے نہیں ہے (تیری سرکار دیکھ کر مطبوعہ ماہنامہ نو تم حیدرآباد۔ ماہ ستمبر ۱۹۶۲ء) اہلِ عزت اور صاحبِ جائیداد کہلانا اس دنیا کے باشندوں کی معراج ہے۔ صاحبِ جائیداد ہو جانے کی صورت میں لوگ از خود اہلِ عزت بھی کہلائے جانے لگتے ہیں۔ اس لئے صاحبِ جائیداد ہونے کے لئے خود پر ہر ستم کا جبر کرتے ہیں۔ اپنی شخصیت سے نیچے گرتے ہیں۔ اپنی خواہشات کو کچلتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں کہ وہ اہلِ عزت کہلائے جانے کے مدارج طے کر رہے ہیں۔ (تو آج ہم بھی صاحبِ جائیداد ہو گئے) چند بنیادی مسائل کی غیر موجودگی کے باوجود بھی شفیقہ فرحت کے ان خاکوں کو ایڈیسن (JOSEPH ADDISON) کے کورلی پیپرس (COVERLEY PAPERS) ڈکنس (CHARLES DICKENS) کے پک وک پیپرس (PICKWICK PAPERS) کے مقابلے میں بلا کسی جھجک کے رکھا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ انہیں تخلیق پاروں کی طرح یہاں بھی من و عن ایک دنیا آباد ہے۔ اور اسی دنیا کے ایک کونے میں خود شفیقہ فرحت اپنے احساسِ تنہائی، شکست خوردگی، اور محرومی کو قہقہوں کے پردوں میں چھپاتے ہوئے ایک سوالیہ نشان کی طرح کھڑی ہوئی ہیں۔

شہر

ایک ہندی نظم

(ہندی کی کویتا)

ولور نکم
مترجمہ: شفق تنویر

لگتا ہے
اب سب کچھ ختم ہو گیا ہے
سبھی سلسلے
مٹی کے ڈھیلے سے بکھر گئے ہیں
سڑکوں پر
لوگ بدحواس، بے حساب بھاگتے ہیں صرف روٹی کی تمام
بھوک
ہر گھر کی مانگیں بھاری ہیں دن رات
کسی کی ہمت گراؤ کھا لینے کی نہیں ہوتی
بہت کم بچے ہیں وہ خوش نصیب
رات جن کے یہاں بھوک نہیں ہوتی
راشن کی دوکانوں پہ
قطاریں لمبی ہوتی جا رہی ہیں
اناج کی کمی سے
گوشت اور چمڑے کو چبانے لگی ہیں ہڈیاں
بس چلے تو سورج کو گولی مار دو
بس ایک لمبی بہت ہی لمبی رات ہو
کبھی نہ نکلے دن
جس سے روٹی کپڑے کی نہ کوئی بات ہو
سوتے ہی بس سوتے ہی رہیں سب لوگ
بھوک کی ڈراؤنی شکل دیکھنے کو نہ ملے
سارا شہر
ایک بڑی مشین ہو گیا ہے
ہزاروں لاکھوں پرزوں والی مشین
گندی بے ترتیب، تیل کی بو چھوڑتی مشین

کبھی پورے دن رات چل رہے ہیں
ایک ایک کر کے گل رہے ہیں
بغیر دھوئیں کے جل رہے ہیں
اور اس سب سے ہوتا ہے بس یہ
کہ کارخانوں کے مالکوں کے
بیچارے بینک بیلنس پل رہے ہیں
خبریں، جو روز روز آتی ہیں
خود کو دہراتی ہیں
ان میں خاص ہیں:
پورے خاندان کی خودکشی، لڑکی کا لڑکے کے ساتھ بھاگ جانا،
شوہر کے ذریعہ بیوی کا قتل،
لوٹ مار چوری ڈکیتی وغیرہ
یا کسی آدمی سے ٹکرا کر بیچارے ٹرک کی موت
شراب کی دوکانیں
لوگوں کو پی رہی ہیں بے جھجک
کیا لکھوں بڑا بے ترتیب، بے جوڑ ماحول ہے
ہتھیلیوں، کہنیوں، پیروں پر جم جاتا ہے
باڑھ کی طرح پھیلتی ہوئی ہمیشہ
جو سارے اپنوں کو
جاننے پہچاننے کو
ایک تیز نہ ٹوٹنے والی لہر میں سمیٹ لیتی ہے
اور اب سب اکیلے ہیں
کیا میں؟
کیا تم؟؟
کیا وہ؟؟؟

انیس رفیع

دو آنکھوں کا سفر

اُس کی دو آنکھیں اکیلی تھیں۔ !
اُس کے دونوں ہاتھوں کی اُنگلیوں میں کھوکھلا نرکٹ پھنسا ہوا تھا۔ نرکٹ کی پہلی گرہ سے اوپر کا وہ حصّہ جس میں سُروں کے بے شمار رنگوں کا جھولا تھا۔ اور جو ترچھا کٹا ہوا تھا۔ اُس کے دونوں ہونٹوں کے درمیان اٹکا تھا۔
سُر جھونکے کی طرح ہواؤں میں تیر رہے تھے۔ آنکھ کے آنسو ٹال بن بن کر بوند بوند گیت کے آنچل کو بھگو رہے تھے۔ اِس آنچل کے نیچے ایک پاپ تھا۔
پاپ ـــــ وہ بھی رو رہا تھا۔
اچانک وہ دو آنکھیں،
دو ہونٹ،
دو ہاتھ،
اور وہ نرکٹ، آنچل، اور آنسو سب کے سب ایک متناسب بدن میں فٹ ہو گئے۔
اس بدن نے، اِس جسم نے ایک پاپ کیا تھا۔
ہاں ایک پاپ ـــــ گھور پاپ !
جہاں سانسوں کا طوفان اُٹھتا تھا۔ آہوں کے بگولے اُٹھتے تھے، جہاں پتھر کے ہونٹ تک سی دیے جاتے تھے۔ جہاں چاند کے جسم سے مٹی کرید لی جاتی تھی۔ وہاں سے وہ صرف دو روتی ہوئی آنکھیں اور ایک کھوکھلا نرکٹ اور اس سے اُلجھے ہوئے بلکتے گیت لے کر بھاگ آیا تھا۔۔۔۔۔ وہ جسم وقت کا ٹوٹا ہوا ایک ذرّہ تھا۔ وقت جب کنواں کھودتا ہے تو کسے پیاسا نہیں چھوڑتا۔ اگر وہ کنوئیں کو پیاسا رکھ کر صرف کھوکھلا نرکٹ اور بلکتے گیت لے کر بھاگ جائے تو اُسے پاپ لگے گا پاپ! وقت کے جسم کو یہ محسوس ہوا جیسے اُس کے جلدوں پر تیزاب چڑھا دیا گیا ہو۔ اور سارا وجود جل رہا ہو۔
اچانک کسی نے وقت کے کندھے پر جیسے نرم اور ٹھنڈا ہاتھ رکھ دیا ہو۔ آنکھ کے آنسو تھم گئے، نرکٹ کا سانس رک گیا، آنچل خشک ہونے لگا۔ نرم ہاتھ کا دباؤ بڑھنے لگا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ ـــــ اور بہت پیچھے آگیا۔!
ہونٹوں نے نرکٹ کو دھرتی کی چھاتی پر اُگل دیا۔ اُس کی گردش کرتی ہوئی دو آنکھوں کی پتلیوں پر ایک محل ناچنے لگا۔

پھر وہ محل پتلیوں پر ساکت ہو گیا۔ بہت سارے دروازے تھے محل میں داخل ہونے کے لئے۔ چھوٹے چھوٹے اور ایک بہت بڑا
ہر دروازے سے تین فٹ اونچا اور چھ فٹ چوڑا چبوترہ لگا ہوا تھا۔ چبوترے کی دراڑوں سے باگو اور مٹی جھانک رہی تھی اور چبوترے
کے اوپر شب کے بسے ہوئے کچھ الگ الگ ڈھنگ سے سوئے تھے۔ ایک دراڑ سے نکل کر ایک پیپل کا درخت' چبوترے پر سوئی ہوئی ادھیڑ
عورت کی ٹانگوں کو سہلا رہا تھا۔ سورج آہستہ آہستہ اپنی بھٹی کو سلگانے کے لئے گرم کر رہا تھا۔ بھٹی کی دھیمی آنچ سوئے ہوئے
بدنوں کو پگھلانا چاہتی تھی اور صبح کی میٹھی اور نرم ہوائیں ان بدنوں پر مرہم کی طرح بچھی جا رہی تھیں۔ اچانک بہت سے کپڑے
لپیٹے، ننگے پاؤں کھلے سر، ہاتھوں میں پھول کی تھالی اور تھالی میں تلسی کے پھول' ایک کٹوری اور کٹوری میں گنگا جل
لئے ہوئے ایک آدمی آیا۔ وہ پیپل کے درخت کے پاس ہی کھڑا ہو گیا۔ پیپل کا پیڑ اپنے پجاری کو دیکھ کر کسی سرکاری باس کی
طرح تن کر کھڑا ہو گیا۔ عورت کی ٹانگیں اس سے دور ہو گئی تھیں۔ پجاری نے تلسی کا پتا اٹھایا، ادھر ادھر دیکھا اور
اپنا ہاتھ پھرتی سے بے سُدھ سوئی ہوئی عورت کی ننگی چھاتی کے اوپر لے گیا — عورت سوئی رہی — سوئی رہی۔!
پجاری نے پھر ادھر ادھر دیکھا اور ہاتھ کھینچ کر پیپل کے سر پہ گنگا جل اور تلسی کے پتے انڈیل دیا۔ اچانک سناٹوں
کے قدم جیسے جاگ پڑے ہوں۔ قدموں کی آہٹ پا کر وہ پنڈت سوکھے پیاز کی طرح تہ بہ تہ سکڑ گیا۔ اور خوف کے قافلے
اُس کے چاروں اور پیتل کی گھنٹیاں پیٹنے لگے۔

وقت کی دو آنکھیں یہ سب دیکھتی رہیں۔ اس کی گردن پر کن کھجورے رینگتے رہے۔ اس نے ان کن کھجوروں
کو کچھ کہا بھی نہیں۔ اور کہتا بھی کیا — ؟ ان کن کھجوروں کا جنم داتا بھی تو وہی تھا۔

اب وقت کی دو آنکھوں کی پتلیوں سے اُتر کر وہ محل اپنی گرد و پیش سمیت آنکھوں کے سامنے کے سوئے ہوئے
منظر کی خالی پیٹھ پہ روز نی مہر کی طرح ثبت ہو گیا۔ منظر کی پیٹھ پھیل کر کشادہ ہو گئی۔ ان دو آنکھوں نے اب محل کو غور سے
دیکھا۔ محل کتنا بدل گیا ہے۔ بالکل بدل گیا ہے۔ کسی نے محل سے روپہلی کرن چھین کر اس پر لال پھٹے سا رنگ چڑھا دیا تھا
یقیناً یہ رنگ چمکدار نہیں ہے' مگر گاڑھا ضرور ہے۔ اِس رنگ کو کوئی اُتار نہیں سکتا۔ محل کو چمکدار آہنی دروازوں سے لیس کر دیا
گیا ہے۔ یہاں کوئی رہتا بھی نہیں۔ شاید ان دروازوں کے علاوہ — چبوترے پر لیٹے ہوئے لوگوں کے بے ربط خراٹوں اور صبح
کی تنہائی کے سوا کچھ بھی تو نہیں تھا یہاں — کبھی کبھی کبوتروں کی غٹر غوں کان کے پردوں پر ہلکی سی جنبش پیدا کر دیتی ہے۔

بھور کا سورج ذرا اور اُوپر چڑھ گیا اور محل کے چمکدار آہنی دروازے دس کے گھنٹے کے ساتھ ہی جھر جھر کرتے دیواروں میں
کھدے ہوئے گھاؤں کے بیچ پیوست ہو گئے۔ چبوتروں کے باشی بھاپ کی طرح اڑ گئے۔ پھر ان چبوتروں پر وہ لوگ آ جمے
جو تصوراتی قلعے قائم کرتے ہیں۔ ان کی چھتوں کو توپوں سے لیس کرتے ہیں۔ اور پھر ان کے دہانے دشمن کی طرف موڑ دیتے ہیں
اس کے بعد ایک آواز ہمیشہ اُبھرتی ہے۔ پھس۔ پھس۔ پھس۔ پھر ان قلعوں کی سُرخی' بالو' مٹی ایک ساتھ ان
کے جسم پہ ڈھم ڈھم کر گرتی جاتی ہے۔ اور یہ لوگ اِس بوجھ تلے دبتے جاتے ہیں اور دشمن اُبھرتے آتے ہیں۔

اِس بھیڑ میں ایک جوڑا ہے۔ چبوترے پر بیٹھا ہے۔ جوڑا ایک لڑکی اور ایک لڑکے کا ہے۔ دونوں گفتگو کر رہے ہیں
یہ وہ جوڑا ہے جو شاید قلعے کے کھوکھلے پن سے واقف ہے۔ توپ کی سرد بارود سے واقف ہے۔

"مونا! دیکھو یہ ہمارا جگ کتنا ہانپ رہا ہے۔ بالکل سامنے کھڑے ہوئے کتے کی طرح" جوڑے کا لڑکا بولا۔
"نہیں تریبے' ہم سب ہانپ رہے ہیں۔ مگر یوں ہی تو نہیں ہانپ رہے ہیں ہم لوگ۔ اس کے کئی کارن ہیں۔ اب
اس محل کو لے لو یہ خود بھی نہیں ہانپا۔ اس میں بسنے والے طرح طرح کے امراض میں مبتلا ہوئے' ہانپے' اور چل بسے

اور اب تو یہ طوفان کی آماجگاہ ہے۔ یہ محل یونیورسٹی کہلاتا ہے۔ اس کے کونے کونے میں پوسٹ مارٹم ہو رہا ہے۔ اندھیرے کی ... اس کا ہر کونا ڈارک روم تھا۔ اور اس ڈارک روم میں لوگ تصور ات کی گاڑی دوڑا رہے تھے اور کرچھیاں ... پھرتے ہیں۔ اور ان گاڑیوں کی پشت پر جو لوگ بیٹھے ہیں اور جنھوں نے صرف اسی گاڑی پر چڑھنا سیکھا ہے، انہیں آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر گاڑی کے پہیوں کے نیچے جانا سکھایا جاتا ہے۔ جوڑے کی لڑکی ان حقائق کی روشنی میں سوچ میں ڈوبے ہوئے نکتہ رس کی طرح گمبھیر اور رومانی دنیا کے شہزادوں سے ہزار ہا میل دور لگ رہی تھی۔ جوڑے کا لڑکا بھی آہستہ آہستہ بہکنے لگا۔

"...... میں سب کچھ سمجھ رہا ہوں مونا۔ لیکن اندھکار ہمارے انگ انگ میں اس طرح رس بس چکا ہے، کہ اب ہم اپنی آس، سانس اور خون تک بجھ بیٹھے ہیں۔ نہ ہمیں کوئی ALTERNATIVE ملتا ہے اور نہ کوئی ہمیں سمجھاتا ہے۔ ہم اس اندھکار کے قیدی بن کر گھٹ رہے ہیں۔ جوڑے کی لڑکی کے ہونٹوں پر تہہ دار مسکراہٹ لپک آتی ہے۔

"..... ہاں تریدیب! ALTERNATIVE انہیں نہیں دکھائی پڑتا ہے جو سلئے کے اس پہلو کو لے کر بیٹھتے اور سوتے ہیں جو عناصر میں متضاد حقیقتوں کے منافی ہے۔ NEGATIVITY کا بھوت ان کے ذہنوں پر مسلط ہے۔ جو سورج کی گرمی کو کوستے رہتے ہیں۔ ان کے ذہنوں کو سورج کی روشنی کبھی نہیں چھوتی۔ تریدیب! اگر ہم غور سے دیکھیں تو ہم میں سے کچھ لوگ اندھیروں کو روشنی کی چادر اڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن اندھکار کی گاڑی کی اسٹرنگ وہیل ان ہاتھوں میں ہے جو شب کے پجاری ہیں اور دن ان پر موت کی سی کیفیت لے کر آتا ہے۔ یہ شب گزیدہ ہیں۔ اب ان انگلیوں کو توڑنے کی تیاری کی جا رہی ہے جو روشنی کا بٹن دبانا نہیں چاہتیں۔ آؤ میرے ساتھ۔ وہ دیکھو سامنے ہمارے دوست، تمہارے ساتھی، جن میں مونو توش، سانیال، اور سلیم بھی شامل ہیں۔ کیا تمہیں ان میں تبدیلی نظر نہیں آتی۔ یہ جب یونیورسٹی آئے تھے تو ان کی زلفوں کے خم کتنے مغرور تھے، پورے ـــــــ ـــــــ COMMON ROOM میں میکرو پولو کے بدبودار دھوئیں شیطان کی ہیٹھ کی طرح چوڑے ہوتے رہتے ہیں کپڑوں کے کیریسز BLUE ANGEL بلیڈ کی دھار سے بھی زیادہ SMOOTH اور تیز تھے۔ جب وہ کامن روم میں چلتے تھے تو ایسے لگتے جیسے سرکس کے جوکر نما بازیگر کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی گئی ہوں۔ لڑکیوں میں ان کا تذکرہ جنگ کی طرح چھڑا رہتا تھا۔ لیکن آج یہ لوگ سب کے بیچ آگئے ہیں۔ ان بدبودار دھوؤں کو درو دیوار کھا گئی۔ اب وہ کرچے جو ان کے چمڑوں سے قریب تھے۔ ان کے دلوں کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ ان سے متاثر لڑکیوں میں ان کا تذکرہ گمنام تاریکی پہلو بن چکا ہے۔ دیکھو، وہ لوگ کیا لکھ رہے ہیں۔ آؤ، اب ہم تم دونوں بھی ان کے قریب بہت قریب چلیں۔"

مونا اور تریدیب دونوں ان کے قریب اور بہت قریب چلے آئے ہیں۔

بیپلب[1] اس محل کے بلند دروازوں کے عرشے پر کھڑا یہ بتا رہا تھا۔ کہ یہ کالا انظام کس طرح نصاب کے ذریعہ ہماری شریانوں میں پیوست کیا جاتا ہے۔ وہ بتا رہا تھا کہ جب ہمیں افلاطون کے انتخاب سے درس دیا جاتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے وہ اپنے قریبی دوست کی بیوی کے ساتھ فلرٹ کر رہا ہو۔ ان کے چاروں آدرسیاہ پردے پڑے ہیں جن کا ہر سوت اس قانون کا حامل تھا۔ جس سے صرف دل کاٹے جا سکتے ہیں، پتھر نہیں۔ اور جب ارسطو پڑھتا ہے تو یوں محسوس کرتا ہے جیسے اس کے دماغ کے

---

[1] بیپلب کا لفظی معنی انقلاب ہے۔ آج کل یہ لفظ بنگال میں بطور نام عام ہے۔

ٹکڑوں کو آرے سے کاٹ کر ہزاروں خانوں میں بانٹ دیا گیا ہو۔ اور جب ہابس کا فلسفۂ سیاسیات اُس کے سامنے آتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنے ہاسٹل کے کمرے میں سوئے ہوئے تینوں قریب ترساتھیوں کا گلا گھونٹ دے۔ اور کلاس میں جو پروفیسر آتا ہے اُسے کرسی سے اُچھال کر تین منزلے سے نیچے پھینک دے اور خود اس کرسی پر قابض ہو جائے۔ تاکہ دوسرا اُسے بھی اُٹھا کر وہاں سے پھینک دے۔ اور جب لاک (LOCKE) کو پڑھایا جاتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ اُس کے گرد کئی جلّاد ننگی تلواریں لیۓ رقص کر رہے ہیں۔ اور بھاگنے کا راستہ صرف ایک ہے جو آسمان اور ستاروں سے ہو کر گزرتا ہے۔ زمین سے بھی راستے ہیں یہ اُس مصنّف کو بھی معلوم نہیں کیونکہ خود اُس مصنّف کے ہاتھ میں بھی ایک ننگی تلوار ہے۔ جب روشو ROUSSEAU ہمارے سامنے آتا ہے تو ہم سب کو اس دنیا کو لے جانا چاہتا ہے۔ جہاں ہوائیں خلائی بکسوں میں ووٹ دیتی ہیں۔ جہاں روشنی اندھیروں کے خول میں دبک کر پل بھر کو باہر جھانکنا نہیں چاہتی۔ جہاں جمہوریت کی ندی بہتی ہے جس میں آنسوؤں کا سیلاب اُمڈا کرتا ہے۔" پیپل بولتا جا رہا ہے۔ آہستہ آہستہ ایک اچھا خاصہ مجمع اکٹھا ہو گیا ہے۔ مجمع کیا تھا ایک لاوا تھا جو پھٹ کر تخریب کی جھیل کو تعمیر کے کنول سے بھر سکتا تھا۔

وقت کی دو آنکھیں چمک اُٹھیں۔ بدن پر چڑھے ہوئے کن کھجورے بے دم ہو گئے اور اس نے اُس لاوے کو اور بھی پکانے کا طریقہ سوچ لیا۔

اب وقت کے جسم کا حلیہ بالکل بدل گیا تھا۔ آنکھوں کے پپوٹے پھول گئے تھے۔ داڑھی سینے تک جھول آئی تھی۔ رنگ بھورا ہو گیا تھا۔ کُرتے کی لمبائی پیر کی اُنگلیوں کو چھو رہی تھی۔ اب مجمع کے قریب اُس پیپل کے درخت کی بغل میں آ کر بیٹھ گیا اُس نے دیکھا کرکٹ نالی میں آنکھیں بند کیۓ پڑا ہے۔ اُس نے بڑھ کر کرکٹ کو اُٹھا لیا۔ مجمع کے لوگ پیپل کے درخت کی بغل میں بیٹھے ہوئے ہپی کو بڑی تحقیر آمیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ مجمع آپے سے باہر ہے۔ لوگوں کی کچھ مانگیں ہیں اور وہ مانگیں سب کے سامنے رکھی جا رہی ہیں۔ اِس بیچ اچانک ایک گورا ایک ہندوستانی انٹیلکچول کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔ ہندوستانی انٹیلکچول کہتا ہے۔" سر آپ نے CONTINENTAL INTELLECTUALS ASSEMBLY کی حفاظت کا انتظام کر لیا ہے؟ یہ لوگ شاید آج اُس طرف بھی جائیں۔" گھبراؤ نہیں، انتظام مکمل ہے۔ تمہاری طرح بہت سے وفادار ہیں ہمارے۔" پھر وہ ہندوستانی انٹیلکچول گورے کو لے کر چبوترے پر چڑھ جاتا ہے اور گورے کا تعارف مجمع سے کرانا چاہتا ہے۔ مجمع گورے اور ہندوستانی انٹیلکچول کو دیکھ کر بپھر جاتا ہے۔ مجمع گورے سے کہتا ہے۔" وہ اپنے کتوں سمیت واپس چلا جائے۔ لیکن گورا واپس نہ جا کر یہ کہتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کی تحریک التوا میں پڑ جائے۔ میں آپ کی تحریک کی مخالفت نہیں کرتا۔ میں تو محض آپ لوگوں کی خدمت کو حاضر ہوا ہوں۔ میں آپ لوگوں کی خدمت خود پر اس لیۓ فرض سمجھتا ہوں کہ میں اُس قوم کا فرد ہوں جو گلوب (GLOBE) کے عرض و طول پر پُرامن ہم وجودیت اور شانتی چاہتی ہے۔ اور ضعیف قوموں کو خود کفالت جیسے مبارک لفظ سے آشنا کرانا چاہتی ہے۔ اُخوت و آشتی کے بغیر ممکن نہیں۔ ہم نے اپنی اغراض و مقاصد کے تحت CONTINENTAL INTELLECTULS ASSEMBLY کی سرپرستی میں ایک لائبریری کی بُنیاد ڈالی ہے۔ اِس لائبریری میں بہت ساری کتابیں ہیں۔ پڑھنے کی جگہ ہے۔ خاموش اور ٹھنڈا ٹھنڈا ماحول ہے پڑھنے کے لئے۔ جہاں تک میری عقل کا تعلق ہے وہ کہتی ہے کہ فی الوقت آپ سب پڑھیں اور صرف پڑھیں۔ کیونکہ پہلے آپ طالب علم ہیں پھر اور کچھ۔ زندگی بڑی لمبی ہے، وقت بہت ہے بہت کچھ کرنے کے لئے۔ پڑھنے لکھنے کے لئے شانتی کی ضرورت ہے۔ بالکل اس پیپل کے درخت کے پاس بیٹھے ہوئے شخص کی شانتی کی طرح۔ دیکھئے کس قدر شانت ہے۔ اُس شخص کے اندر کتنی گہرائی ہے۔ وہ بھی پڑھا لکھا ہے۔ لیکن شانتی اور کھوج ہی اُس کی زندگی ہے،

دھرکا [illegible] ہوں گا۔ کہ کچھ دیر ہم سب یہاں بیٹھ کر کیوں نہ اس مہان آتما سے گیان دھیان کی باتیں کریں۔" مجھے کچھ سننا نہیں چاہتا ہے۔" بند کرو اس بکواس کو۔ اپنے پوسے ہوئے دلال کو لے کر چھوٹ جاؤ۔ ورنہ مار مار کر گاڑ دیئے جاؤ گے سامنے والے تالاب میں۔"

وقت کے جسم میں خوشی سنسناہٹ بن کر پھیل گئی۔ وہ نرکٹ سے مُنہ لگائے آنکھیں بند کئے سب کچھ سُنتا رہا۔ گورے نے وقت کے ہپی نما جسم سے کہا۔ "چلو بھئی، اِس گرمی میں کیوں بیٹھے ہو۔ سامنے ہماری ایر کنڈیشنڈ لائبریری کا بیٹھک خانہ ہے۔ فری ریڈنگ روم ہے چلو چل کر وہیں کہیں بیٹھو۔"

وقت کی آنکھیں مُسکرائیں۔ اِس کے ہونٹ مُسکرائے۔ اِس کا جسم مُسکرایا۔ پھر اُس نے ایک ہاتھ میں نرکٹ پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے پیپل کے درخت کو اُکھاڑ کر شانتی شانتی کہتا گورے کے ساتھ چل دیتا ہے۔ وقت کی دو آنکھوں نے اِن کالی پرچھائیوں کو بھی دیکھا۔ جن کے سر حکم کے بوجھ سے دَبے ہوئے تھے۔ گورا کہتا ہے۔ "بے دھڑک چلے آؤ۔ یہاں تم بالکل محفوظ ہو۔ اِن کالی پرچھائیوں سے بھی ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ تو ہماری محافظ ہیں۔ آج تو ہمیں اِن پرچھائیوں کی دیوار کے پیچھے ہی رہنا ہے۔ شاید آج وہ لوگ پاگل بھی ہو جائیں۔" وقت کے کندھے پر ایک بار پھر کن کھجورے رینگنے لگے کیونکہ گورا پیپل کے درخت کو کڑی نظروں سے دیکھنے لگا تھا۔ گورے نے سگریٹ جلاتے ہوئے کہا۔ اِس جنگل کی یہاں کیا ضرورت ہے۔ پھر اسی اِس درخت کو باہر لے جا کر پھینک آؤ۔" یہ جملہ برقی لہروں میں تحلیل بھی نہ ہوا تھا۔ کہ ایک زوردار فسٹ (FIST) دھماکے کی طرح گورے کے چوکٹے پر دھمک گیا۔ گورے کی آنکھیں دیکھنے سے چند لمحوں کے لئے قاصر ہو گئیں۔ مگر کانوں نے سُنا۔

"کھول اپنی آنکھیں اور دیکھ۔ دیکھ اِن پتّوں کو غور سے دیکھ۔ اِن میں زہریلے کیڑے پڑ چکے ہیں۔ میں یہ پیڑ تمہارے واسطے ہی لایا ہوں۔ تمہاری کچھ کتابوں کی ہے اور اندھے کنوئیں جیسے درس گاہوں کی۔ تمہارا یہ جسم پٹ سن کی بوری کی طرح ہے۔ جس میں جلالی سکے کھنکھنا رہے ہیں۔ میری بات تو تم نہیں سمجھتے۔ لیکن اِس پیڑ کی سیدھی سادی زبان ضرور سمجھو گے۔ کیونکہ صدیوں سے اِس کی سیدھی سادی زبان کو استعمال کرتے رہے ہو۔ ہاں، تو دیکھو اُس کے پتّوں میں کیڑے پڑ چکے ہیں۔ اِس کا جسم کسی جنم جلی کی طرح سوکھ گیا ہے۔ اگر اس جنم جلی کو بچانا ہے تو اِن پتّوں کو جلا کر راکھ کرنا ہوگا۔ شاید تم نے میری بات سمجھ لی ہوگی۔"

پھر اُس نے پتّوں کو پیڑ سے جُدا کیا۔ اِنہیں ڈھیر بنا کر آگ لگا دی۔ فری ریڈنگ روم کے شیلف سے کتابوں کو نکال کر ایک جگہ جمع کیا۔ اور ان پتّوں کی آنچ اُس طرف موڑ دی۔

آگ ـــ! آگ ـــ! آگ ـــ!

آگ کے شعلے اُبل پڑے۔ کالی پرچھائیوں نے آ کر وقت کے ہپی نما جسم کو لپک لیا۔ آگ بُجھانے والی گاڑی گھنٹیاں جھلانے لگیں وقت کے ہونٹوں اور اُس کی دو آنکھوں کو سیل کر دیا گیا۔ ہاتھوں کو زنجیر پہنا دی گئی۔ پاؤں پر بیڑیاں کھنکھنانے لگیں۔ پھر اُسے کالے صندوق میں بھر دیا گیا۔ کالے صندوق کی سوراخوں سے وقت کی دو آنکھیں، دو ہونٹ باہر جھانک رہے تھے۔ گورا پریشان اندر سے باہر آیا۔ وقت کے ہپی نما جسم کو صندوق سے باہر کیا گیا۔

"تم ہو کون؟ تم نے آگ کیوں لگائی۔ اِس طرح آگ کیوں لگائی۔ ہمارا کام ہے شانتی کی تیلی اور گُلاب کے پٹرول سے آگ لگانا لیکن تم نے یہ براہِ راست حرکت وہ بھی ہمارے سامنے کیوں کی ـــ؟؟؟" گورے نے سوالوں کی جھڑی لگا دی۔

وقت کے ہونٹوں پر سیل ہے۔

"تم ہو کون؟ تم ہو کون؟" گورے نے اُسے جھنجھوڑ لیا۔

اچانک ایک [illegible] قہقہہ کالی پرچھائیوں کو لرزا گیا۔ وقت کے ہونٹوں کے سیل ٹوٹ گئے وقت کے بھاری پاؤں سے قریب ہی

(باقی صفحہ [illegible] پر دیکھئے)

شاہد غنی

سلام مچھلی شہری

اب بھی جو اک ضیائے سکونِ حیات ہے
شاید وہ تیری چاند ستاروں کی بات ہے

مطرب! بس ایک گیت کہ پھر صبح ہو سکے
ساقی! بس ایک جام، ابھی تھوڑی رات ہے

شاید کہ انقلاب زمانہ کے ساتھ ساتھ
میری تباہیوں میں تمہارا بھی ہات ہے

یہ کیا، وہ تم، یہ آئینہ، اب تم ہی یہ بتاؤ
منسوب کس سے نامِ بہارِ حیات ہے

دل کا روبارِ وقت کی مرضی پہ ڈھل گیا
اب کچھ شراب دو کہ بڑی سخت رات ہے

مہ پیکران آئینہ خواب کھو چکے
خود میرا عکس ہائے ابھی ساتھ ساتھ ہے

آؤ سلام! زندہ رہیں اور بطرز نو
پوچھے کوئی چمن، یہ بزمِ حیات ہے

نشار اٹاوی

ہر قدم ناپ کر تول کر دوستو
سانپ کی پشت ہے رہ گزر دوستو
تن برہنہ تمہیں دیکھ کر دوستو
اٹھ گیا اعتبارِ نظر دوستو
کون پوچھے گا تم سے کرلیتے ہو تم
قتل کر دو مجھے بے خطر دوستو
صیدِ آزاد فطرت ہوں اڑ جاؤں گا
نوچ ڈالو مرے بال و پر دوستو
عرش سے فرش تک فرش سے عرش تک
زندگی ہے مسلسل سفر دوستو
اس تذبذب کے طوفان میں تا بکے
کشتیاں یا ادھر یا ادھر دوستو
محفلِ سرد مہری ہے آراستہ
بانٹ دو میرا سوزِ جگر دوستو
جنس نادار ہو بس اک نگاہِ کرم
میری قیمت نہیں سیم و زر دوستو
مسجدیں ڈھا گئیں، بتکدے لٹ گئے
کھول دو بادہ خانے کے در دوستو
اے نشار اپنے حاسد سلامت رہیں
ہے کسے تابِ عرضِ ہنر دوستو

سید فضل امام رضوی

اُردو زبان پر ہندو تہذیب اور مذہب کے اثرات

اگر بولیاں اور زبانیں کسی تہذیب کا مظہر سمجھی جا سکتی ہیں اور اگر بولیوں اور زبانوں کی تعمیر و تشکیل میں تہذیبی قدروں کا بھی ہاتھ ہوتا ہے تو پہلا قیاس اردو زبان کی ساخت و پرداخت میں ہندو تہذیب کا بھی حصّہ رہا ہے۔ یہاں اِسی موضوع پر علمی انداز میں بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ اُردو برج بھاشا سے نکلی یا پنجابی سے۔ اِس کا مصدر و ماخذ ہریانی ہے یا کھڑی بولی۔ یہاں تو صرف یہ کہنا ہے کہ وہ برج بھاشا ہو یا پنجابی۔ ہریانی ہو یا کھڑی بولی، یہ سب کی سب ہندو تہذیب میں ڈوبی ہوئی بولیاں یا زبانیں رہی ہیں۔ اور اُردو نے بہرحال اِنہیں بولیوں سے کسبِ نور کیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا بھی مبالغہ نہیں کہ اُردو نے اِنہیں بولیوں اور زبانوں کے آغوش میں آنکھیں کھولی تھیں۔ اِس طرح شعوری یا غیر شعوری طور پر اُردو کے خمیر میں ہندو تہذیب کے عناصر شامل ہو گئے۔ اُردو صرف و نحو، اس کے جملوں کی بناوٹ، اس کی کہاوتیں اور اُس کے محاورات بڑی حد تک مذکورہ بالا بولیوں اور زبانوں کے رہینِ منّت ہیں۔ آج زمانے کی ستم ظریفیوں نے اِس پر ایک غیر مُلکی زبان ہونے کے دبیز پردے ڈال دیئے ہیں۔ لیکن اگر یہ پردے ہٹا دیئے جائیں اور اُردو کی عمارت کہیں سے بھی تھوڑی سی کھُرچ دی جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ ہندو تہذیب کو غالب کی وضع کردہ ترکیب رگِ سنگ[1] کی حیثیت حاصل ہے۔

یہیں اِس امر کا ذکر کر دینا برمحل ہوگا۔ کہ اُردو کے ہندو تہذیب سے متاثر ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بھی اِسی رنگ میں ڈوب گئی ہے۔ دراصل اُردو ہندو ایرانی تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس نے ہر اس تہذیب اور مذہب سے استفادہ کیا جس سے یہ دوچار ہوئی۔ لیکن یہ کسی ایک کی ہو کر نہیں رہ گئی۔ بلکہ موجودہ اصطلاح میں یہ سیکولر زبان ہے۔ جس میں ہر مذہب اور ہر تہذیب کو در آنے کی اجازت ہے لیکن کسی کو اپنی بالادستی جتانے کی اجازت نہیں ہے۔ ہاں یہ بات ضرور صحیح ہے کہ اُردو اپنے دورِ ارتقاء میں برابر "ترک و قبول" کے اُصول کو اپناتی رہی۔ کبھی اُس نے ایک عنصر ترک کیا اور دوسرے کو قبول کر لیا اور پھر کبھی اِسی متروک عنصر کو دوبارہ قبول کر لیا اور کبھی ایسا بھی کہ مختلف عناصر کو اپنے مزاج میں ڈھال لینے کے بعد اپنایا۔ اِس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اُردو اپنے روزِ ازل ہی سے دیگر زبانوں اور نتیجے کے طور پر ہندو تہذیب اور ہندو مذہب کے زیرِ سایہ پلی بڑھی۔ ضرورت اِس کی ہے کہ اِس اجمال کی تفصیل بیان کی جائے۔ تاکہ اُن افراد کے سامنے اُردو کی اصل تصویر آ جائے جن کے سامنے اس کی مسخ شدہ تصویر ہے۔

تہذیب و مذاہب کی عمریں پیمانۂ ماہ و سال کی رہینِ منّت نہیں۔ اَدوار مٹتے رہتے ہیں۔ تہذیبیں اور مذاہب باقی رہتے ہیں۔

---

[1] ع۔ "رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا"

[2] INDO—ARYAN

دورِ ماضی کو سمجھنے کے لئے تہذیب کو بھی آئینہ بنانا پڑتا ہے۔ ہر عہد کے جواہر پاروں کی تلاش کے لئے یہی مشعل راہ بنتی ہے۔ اسی کی مدد سے تحلیل و تجزیے کی گتھیاں سلجھتی ہیں، کیونکہ ہر عہد اپنے خزانۂ دانش میں بہت سے تہذیبی اور مذہبی گہر ہائے آبدار چھپائے رہتا ہے۔ ادب انہیں بکھرے ہوئے تہذیبی موتیوں میں عکس ہوتا ہے۔ زمانے اور ادوار کے ہزاروں تہ دار پہلوؤں کا، اور انہیں پہلوؤں میں صدیوں کی تمام ویرانیاں اپنی رنگینیوں سے سج دھج کر ابھرنے لگتی ہیں جس سے ایک جیتا جاگتا کلچر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔

ماضی، حال، مستقبل، اقدارِ حیات (VALUES OF LIFE) پیش کرتے ہیں۔ اور یہ اقدار مشترک ہیں تہذیب و مذہب سے۔ تہذیب کی تشکیل کوئی حادثہ نہیں اور نہ ہی منصوبہ ہے۔ اسی طرح مذہب بھی حادثہ تو نہیں، لیکن اسے ایک حد تک منصوبہ ضرور کہا جا سکتا ہے اور یہ دونوں سیکڑوں سال کی ریاضت کا ثمرہ ہیں۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ خود تہذیب کیا ہے۔؟ اور اس لفظ سے کیا مراد ہے؟ اس باب میں مفکرین اور دانش وروں میں اختلاف ہے۔ اس کی اب تک کوئی ایک مستقل تعریف نہیں پیش کی گئی۔ اور ایسا ہونا بھی نہیں چاہئے کیونکہ تہذیب کا لفظ جس عظیم مفہوم کو پیش کرتا ہے۔ اسے چند جملوں میں سمجھا بھی نہیں جا سکتا۔ لیکن جب ہم لفظ تہذیب زبان پر لاتے ہیں تو اس سے کسی قوم یا ملک کی داخلی یا خارجی زندگی کے وہ سارے اہم پہلو اور وہ تمام لازمی صفات عبارت ہوتی ہیں جنہیں اس ملک کے باشندے عزیز رکھتے ہیں۔ اور جن کے سہارے ان کی انفرادیت پہچانی جا سکتی ہے۔ انسان قدروں کے بنانے اور محفوظ رکھنے کی جد و جہد میں اپنی قومی تہذیب پیدا کرتا ہے۔ اور وہ تہذیب اس کے ماضی سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ تہذیب قومی زندگی کی ساری جذباتی، روحانی اور مادی امنگوں اور خواہشوں کا احاطہ کر لیتی ہے۔ اس کو بناتی اور سنوارتی ہے۔ تہذیب نام ہے مقصدیت کا جو زمانے کے تقاضے کو پورا کر سکے اور ان تمام قوتوں کو محفوظ کر لے۔ جو دورِ ماضی نے اسے بخشی ہیں۔

زبان و ادب میں تہذیبی اور مذہبی تصورات اور اثرات جس طرح نمایاں ہوتے ہیں۔ ان کا مطالعہ بڑی دل چسپ چیز ہونے کے ساتھ ساتھ بصیرت افروز بھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مختلف ملکوں اور قوموں کی تہذیبی اور مذہبی روایات مختلف النوع ہوتی ہیں۔ ہر ملک کی تاریخ میں ایسے مواقع آتے ہیں جب تہذیبیں ٹکراتی ہیں، ایک دوسرے سے متاثر ہوتی ہیں اور عصبیت، کٹر پن، تنگ نظری سے بلند و بالا ہو کر اپنے علاوہ دوسروں کے یہاں بھی حسن، خوش سلیقگی اور خوبی کے جوہر دکھائی دینے لگتے ہیں۔

تہذیب و مذاہب کی دنیا بھی عجیب دنیا ہے۔ یہاں باہمی اشتراک و تعاون کے ذریعہ برگ و بار آتے ہیں۔ مسلمانوں کا قافلہ جب ہندوستان میں آیا تو یہ صرف ایک تہذیب لے کر نہیں آیا تھا۔ بلکہ یہ خود مختلف تہذیبوں کی نمائندگی کر رہا تھا۔ لیکن سب کے سب اپنی دل فریب اداؤں کے باعث منظورِ نظر بنے ہوئے تھے۔ ہندو تہذیب و مذہب کا اردو زبان و ادب پر اثر پوشیدہ نہیں اور بقول بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب "اردو کی تنظیم و ترتیب میں اگر ہندوؤں کی شرکت نہ ہوتی تو یہ وجود میں ہی نہیں آ سکتی تھی۔"

اردو زبان و ادب کا یہ سرسبز و شاداب گلستاں ہر تہذیب کا ورثہ دار ہے۔ جہاں گلاب اور انار کی رعنائیوں کا بیان ہے، وہیں سرسوں کے پھول اور کنول کی رنگینی اور دل کشی بھی جاذبِ نظر ہے۔ مسلمان جب یہاں وارد ہوئے تو انہیں یہاں ایسے لوگوں سے وابستگی اختیار کرنی پڑی جو زبان، خیالات، عقائد، رسم و رواج، خورد و نوش، طرزِ رہائش، غرض ہر اعتبار سے مختلف تھے۔ لیکن یہاں کچھ ہی عرصہ بعد زبان و ادب، مذہب، فنونِ لطیفہ، رسم و رواج سب پر حیرت انگیز اثرات نمایاں ہونے لگے اور نتیجے کے طور پر صوفیائے کرام اور بھگتوں نے بھگتی تحریک کے ذریعہ منفرد تہذیب اور مذہب کے فرق کو بے معنی تصور فرمایا۔ رام اور رحیم ایک ہی تصور قرار پائے۔ سترھویں صدی تک یہ اختلاط اس قدر استوار ہو گیا۔ کہ تجزیہ کرنا بھی ایک امرِ محال ہے۔

زبان و ادب، تہذیب اور مذہب کے اثرات سے بے گانہ نہیں رہ سکتے۔ ایرانی تہذیب نے بھی اسی اشتراک کا خیر مقدم کیا

اور زبان اُردو [illegible] ہی ہے۔ اسی تہذیبی اور مذہبی اشتراک کی اُردو شعرا اور اُدبا بھی اپنے خیالات و اعتقادات میں ہندو تہذیب اور مذہب کے گوناگوں پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہوئے نظر آنے لگے۔ ساخت کے اعتبار سے اُردو زبان و ادب قریب قریب ہندو تہذیبی اور مذہبی عقائد کے تاثرات کا سرچشمہ ہے۔ لیکن ہندو تہذیب اور مذہب کے کچھ ایسے لازوال مرقعے اس کے وسیع دامن میں آویزاں ہیں جن کے وجود کے بغیر اُردو کا تصوّر ہی گمراہ کن ہوگا۔

اُردو زبان جن حالات میں پروان چڑھی وہ تاریخ کا ایک اہم باشان کارنامہ ہے۔ یہ دو عظیم تہذیبوں کے اتحاد سے عالم وجود میں آئی۔ اس لئے اس کے مزاج میں ہندو رسوم و عقائد کا رچ بس جانا عین فطری ہے۔ چنانچہ اُردو ادب عہدِ طفلی ہی سے سبحہ و زنّار دونوں کا شیدائی ہوگیا۔ اور خواہش وصل میں فارسی کے اس شعر پر ایمان لایا ؎

حافظا گر وصل خواہی صُلح کن با خاص و عام
با مُسلماں اللہ اللہ، با برہمن رام، رام

صنم و حرم، کعبہ و دیر، مندر و مسجد کے گن گانا اُردو کی سرشت میں داخل ہے۔ واقعات کے پیشِ نظر اس امر کی وضاحت بھی با آسانی کی جا سکتی ہے کہ اللہ اللہ کرنے میں چاہے تامّل رہا ہو، مگر کرشن کرشن کی رٹ لگی رہی۔ امانت کی اِندر سبھائیں نوابینِ لکھنؤ کے حالات محفوظ ہیں۔ ہندوؤں نے اُردو زبان میں اپنے عقائد کا دل کھول کر پرچار کیا، اپنے تہذیب و تمدّن کے محاسن بیان کئے۔ بھگتی برہمو سماج۔ آریہ سماج۔ سناتن دھرمی نامی تحریکیں اُردو ہی کے ذریعہ سرگرمِ عمل رہیں۔ آریہ سماج کی مشہور اور مقبول مایۂ ناز کتاب ستیارتھ پرکاش اُردو میں لکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ سُورج نرائن مہر نے کیا ہے جس میں ہندو مذہب کے پروردہ الفاظ آئے ہیں۔ درحقیقت ہندو تہذیب اور مذہب دو جداگانہ حیثیت نہیں رکھتے بلکہ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ ان کے سلسلہ (SACRAMENTS) بھی تہذیبی ہیں۔ جن کو اب دھرم کے احاطے میں داخل کرلیا گیا ہے۔

ہندوستان مختلف تہذیبوں اور مذہبوں کی آماجگاہ رہا ہے۔ کول و بھیل کے عہد بھی اپنے تمدّن کو پیش کرتے ہیں۔ اُس وقت یہاں مذہب کی کوئی شکل متعین نہیں ہوئی تھی۔ جس تہذیب اور جس مذہب پر ہم ہندو سابقہ لگا سکتے ہیں وہ اس عہد سے کچھ ہی پہلے وجود میں آیا تھا جب عرب و ایران سے ہندوستان کے تعلقات قائم ہوئے تھے۔ تحقیق کی روشنی میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ "ہندو" کا لفظ ساخت کے اعتبار سے عربی و فارسی تہذیب کا آئینہ دار ہے۔ ہندو تہذیب عہدِ دراوِڑ اور ویدک میں بھی نمایاں نہیں ہوئی تھی۔ ہندوستان میں مسلمانوں نے بہت پہلے سے پہلے ہی سنسکرت کا گہرا مطالعہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ محمود غزنوی جس کو مستقل غلط فہمیوں کا شکار بنایا گیا ہے اپنے سکّوں پر سنسکرت حروف میں اسلامی کلمہ نقش کراتا تھا۔ اسی کے عہد میں ابوریحان البیرونی نے سنسکرت کے کم و بیش چالیس علماء و فضلاء سے سنسکرت زبان سیکھی اور ہندو تہذیب کا اثر اسلامی یا زیادہ صحیح ایرانی تہذیب پر آہستہ آہستہ پڑنے لگا۔ فارسی زبان پر تو سنسکرت کا جبرت انگیز اثر پڑا۔ ملا عبدالقادر بدایونی۔ فیضی۔ ملا شیرازی نے مہابھارت کا ترجمہ کیا۔ اور اس کا نام رزم نامہ رکھا۔ رامائن کا ترجمہ بھی نقیب خان اور عبدالقادر بدایونی نے مکمل کیا۔ بھگوت گیتا اور رگ وید کا ترجمہ بھی اسی عہد کی یادگار ہے۔

اورنگ زیب جو تاریخی غلط فہمیوں کے باعث آج تک نشانہ طعن و تشنیع ہے۔ اس کے عہد میں تحفۃ الہند نامی کتاب کا وجود گی کا قطعی ثبوت ملتا ہے۔ جو میرزا محمد خان کی تصنیف ہے اور جس میں سنسکرت کتابوں کی مدد سے جوتش، سامدرک، پنگل [illegible] کے علاوہ اور بہت سے دوسرے علوم کا تذکرہ ہے۔ برج بھاشا کی قواعد بھی پہلی دفعہ عہدِ عالمگیر میں مرتب ہوئی۔ دارا شکوہ نے جب ہندو فلسفہ اور اسلامی تصوّف کو ایک مرکز پر لانے کی کوشش کی تو یوگ وششٹ اور دوسری تصانیف کا ترجمہ بھی کیا گیا کیونکہ تصوّف ایرانی اور ہندو عقائد کا سنگم ہے۔ نتیجے کے طور پر اُردو میں کافی حد تک ہندو فلسفہ رچ بس گیا ہے۔ خود تصوّف کی بنیاد وحدت الوجود [illegible]

نہیں یوگ درشن۔ سانکھیہ درشن۔ ویدانتی تصوّر پہ مبنی ہے بھگتی تحریک نے تصوّف کو ایک نیا اسلوب بخشا۔ چنانچہ بابا فرید گنج شکرؒ اور خواجہ مخدوم اشرف کے بہت سے اقوال ہندو مذہب کی روایاتی روایت سے بھرپور ہیں۔ اِن صوفیائے کرام نے اپنی تبلیغ کے لئے ویدانتی تصوّر کو ایرانی رنگ دے کر مقبولِ خاص و عام بنا دیا۔

ہندو تہذیب کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے پہلے ہندو تصوّر اور طریقۂ فکر کا سمجھنا ضروری ہے، ورنہ اِن کی اِعتقادی کہانیاں بالکل سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ اِن کہانیوں کا طریقہ تمثیلی ہے۔ چنانچہ ہندو فلسفہ واقعات کو بہ حیثیت واقعہ کے غیر حقیقی قرار دیتا ہے۔ اُس کے نزدیک تاریخ کی تعریف مندرجہ ذیل ہے۔

धर्मार्थ काम मोक्षाणामुपदेश समन्वितं ।
पूर्ववृत्तं कथायुक्तं इतिहासं प्रचक्षते ॥

(دھرم ارتھ، کام اور موکش سے بھری ہوئی قدیم کہانیوں کو تاریخ کہتے ہیں)

پنج تنتر، رامائن۔ مہابھارت۔ بھگوت گیتا۔ وغیرہ کی کہانیاں غیر مربوط اور غیر مسلسل ہوتے ہوئے بھی گہرے فلسفیانہ پہلوؤں کو پیش کرتی ہیں یہی ہندوؤں کی تاریخ ہے۔ اِنہیں آج کے سائنسی دَور میں محض اعتقادی رُوپ کہا جا سکتا ہے۔ اُردو ادب میں بھی یہی سِلسلہ جاری و ساری ہے۔ فورٹ ولیم کالج میں اور اس کے باہر داستانیں لکھی گئیں۔ اُن پر ہندوؤں کے مذہبی اِعتقادات کی گہری چھاپ ہے۔

(۲)

اب تک جو بحث کی گئی ہے وہ اِس موضوع کے نظری حصّے کا احاطہ کرتی ہے۔ اب یہاں اُردو شعر و ادب سے بعض مثالیں پیش کی جاری ہیں۔ اُردو زبان بلا شبہ اپنی نسل کے لحاظ سے شمالی ہند کی زبان ہے لیکن اسے پہلی بار ادبی حیثیت دکن میں حاصل ہوئی۔ ہمارے دکنی ادب کا ایک بڑا حصّہ دست برد زمانہ کی نذر ہو گیا۔ لیکن جو کچھ بھی ہمارے سامنے ہے وہ اِس بات کا کُھلا ہوا ثبوت پیش کرتا ہے کہ اُردو پر ہندو مذہب اور ہندو تہذیب کے واضح اثرات ہیں۔ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ صرف محمد قلی قطب شاہ کے کلیات کا نام لینا ہی اس کا ثبوت ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے ؎

تری پیشانی پہ ٹیکا جھمکتا　　تماشا ہے اُجالے میں اُجالا

پیا بن میرے تین بیراگ بھایا ہے جو ہونی ہو سو ہونے دو
بھبھوت اب جوگیوں کا رنگ لایا ہے جو ہونی ہو سو ہونے دو

(ٹیکا۔ بیراگ، بھبھوت وغیرہ کا تصوّر ہندو تہذیب کی دین ہے)

وَلی دکنی ہوں یا گجراتی، ہمارے اُن شاعروں میں ہیں جو دکن اور شمال کے درمیان نقطۂ اِتصال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ صرف ایک شاعر نہیں بلکہ دو دبستانوں کا سنگم ہے۔ ایک طرف اُنہوں نے دکنی خزانے سے اِستفادہ کیا اور دوسری طرف شمالی ہند سے متاثر ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شعر و ادب کی ایک حسین مگر دل چسپ مثال بن گئے۔ وَلی کی شعری تلمیحات یا دوسرے الفاظ میں وَلی کی شعریات "ہندو مذہب اور تہذیب کی ایک حد تک آئینہ داری کرتی ہے۔ اُنہوں نے جگہ جگہ جو سجن۔ موہن۔ کرشن۔ عاشق۔ مہترہ کے الفاظ استعمال کئے ہیں وہ ہندو تہذیب اور مذہب سے ان کی اثر پذیری کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

اُردو نظم و نثر کے علاوہ اُردو ڈرامے بھی ہندو تہذیب اور ہندو مذہب کے زیر سایہ پروان چڑھے ہیں ورنہ اِس صنف کا وجود ایران میں کہاں تھا؟ ہندوؤں کی مذہبی کتاب رِگ وید ہے۔ اور وہیں سے یہ مکالماتی انداز شروع ہو جاتا ہے۔ مکالموں کی ابتدا

ہندو مذہب ہی کی دین ہے کیوں کہ رشیوں منیوں نے علم و حکمت اور پند و نصیحت کے لئے اس عنوان کو بہتر سمجھا اور ہندوؤں کے قدیم اخلاقی تعلیمات کے ذریعے پیش کئے جاتے رہے۔

ہند و ایران اور ہند و عرب تعلقات اُردو کی تشکیل میں مرکزیت رکھتے ہیں۔ اگر قدیم ایرانی تہذیب کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ بات کسی ثبوت کی محتاج نہیں کہ ہندوستان کی تہذیب اور مذہبی زندگی، رسوم و رواج، ایرانی تمدن کی علمبردار ہے۔

اُردو ڈرامہ نگاری اور داستانوں کی تاریخ میں ہندو تہذیب کا اثر ہر جگہ ہے۔ بھرت منی کے ناٹیہ شاستر میں برہما، وشنو، مہیش کے علاوہ چھوٹے چھوٹے بہت سے دیوی دیوتاؤں کا ذکر ہے۔ مافوق الفطرت داستانیں، بھوت، پریت کے قصے، پنچ تنتر کی حکایات، دیو مالا کی غیر مربوط کہانیوں پر مبنی ہیں۔ اُردو مثنویاں بھی انہیں خیالات سے حد درجہ متاثر ہیں۔ فقط ہندو شعراء اور اُدباء نے ہی اُردو زبان میں ہندو تہذیب اور مذہب کو نہیں پیش کیا ہے بلکہ مسلمان شعراء اور اُدباء نے بھی بُت ہندی سے عشق نہ کرنا کفر کے مترادف سمجھا۔ مذہبی پیشواؤں، تہواروں، رسم و رواج کو وسیع النظری اور وسیع المشربی سے اپنایا اور انہیں واقعی ہولی، دیوالی، بسنت، کرشن، رام چندر جی، گرو نانک وغیرہ سے گہری عقیدت تھی۔ ان بزرگوں کے حسن کردار، جرأت اور حق گوئی کا سکہ دل پر جم چکا تھا۔ اور ہولی و بسنت کے پُر فریب مناظر نے قلم کو متحرک کر دیا۔

اُردو نے اثرات کو قبول کرنے میں یہ امتیاز بھی باقی رکھا کہ اُس نے وہیں تک ضم ہونا چاہا جہاں تک اس کی "سیکولرازم" نے اجازت دی۔ اُردو نہ تو کسی تہذیب میں ضم ہو گئی اور نہ اُس نے اُس کی بھرپور نمائندگی کی ہے وہ ایک مشترکہ تہذیب کی نمائندہ ہے۔ جس میں ایرانی اثرات بھی ہیں۔ اور ہندوستانی بھی۔ وہ نہ تو صرف ایرانی ہے اور نہ صرف قدیم ہندوستانی۔ نئے ہندوستان نے مختلف تہذیبوں کے حسین امتزاج سے جس تہذیب کو جنم دیا تھا۔ یہ اُس کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے اور مسلمان جو تہذیب لے کر آئے تھے وہ وقتاً فوقتاً ہندوستانی اثرات قبول کرتی رہی۔ اس "ترک و قبول" کا لسانی اور ادبی نام "اُردو" ہے۔

مختصر یہ کہ اُردو زبان وحدت میں کثرت کے جلوے سموئے ہوئے ہے۔ اسے ہندو تہذیب و مذہب سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ وہ حضرات جو اُسے غیر ملکی تصورات پر مبنی ٹھہراتے ہیں۔ اُن کا غیر مستحسن فعل محض کوتاہیٔ مطالعہ اور ہمالیہ سے بھی بلند ترین شے یعنی حقیقت سے چشم پوشی کے مترادف ہے۔

درحقیقت اُردو کی "سیکولرازم" پر رگ وید کا یہ اشلوک صادق آتا ہے ؎

आनो भद्रा: क्रतवोयन्तु विश्वत:

(کائنات میں جہاں بھی سچے اور اعلیٰ خیالات ہوں۔ بغیر جھجک حاصل کرو)

ضیاء الانجم

دوہے

(۱)

خودی کی آرتی جب اُٹھتی ہے، تب آتا ہے گیان
کتنی مشکل سے ہوتا ہے آپ اپنا نروان

ٹوٹ گئی ہردیئے کی بینا، ٹوٹ گئی مضراب
شاید اب میں زیست کا دریا کر لوں گا پایاب

بیٹھا ہوں سگرٹ سلگائے دھواں کرے ہے کلول
اِس فانی سنسار میں یارو کیا ہستی کا مول

شور مچائے جل کی دھارا، اِٹھلائے ہر موج
جب دریا میں ڈوبا مانجھی، کیا پستی کیا اوج

کالی شب کا پربت کالا الجھنے لگتا ہے سانس
میرے دل میں درد اُٹھا ہے کون نکالے پھانس

شبدوں کی تیزابی گت پر ضیا کے دوہے گاؤ
سمجھو تو کچھ بات بنے گی نا سمجھو تو جاؤ

▲

(۲)

ساگر ساگر سیپ بہے اور موتی سیپ کے بیچ
ہاتھوں سے جب ساحل چھوٹا، موتی ملا نہ کیچ

ہر اک بوند میں انگارے ہیں کہنے کو ہے آب
کون جلائے اپنا دامن ہے کس میں یہ تاب

بنجاروں نے جنگل جنگل گایا پریم کا گیت
اِس لوبھی سنسار میں یارو ملا نہ من کا میت

دن بیتا سنیاسی جیسا، بیوہ جیسی رات
آشاؤں کی ہر ڈالی کے پیلے ہو گئے پات

مُنہ پر ہیں تعریفی جملے، پیچھے ہے تکذیب
یہ کیسا اخلاق ہے یارو، یہ کیسی تہذیب

بوند بوند میں اِک ساگر ہے سنو ضیا کی بات
ساحل والو تیرنا سیکھو، تب دو موج کو مات

▲

انور خاں

پانی کی تحریریں

مس برگنزا شام کا لباس پہن چکیں تو آیا کو آواز دی۔ پانچ بج رہے تھے۔

"آئی میم صاب!" آیا نے جواب دیا لیکن بدستور آئینہ دیکھنے میں مصروف رہی۔

"دھوپ کم ہے؟" انہوں نے آیا سے کہا۔

"ہاں میم صاب" آیا نے لاپروائی سے تائید کی وہ روزانہ یہی بات سنتی تھی اور ایسے ہی جواب دیتی تھی۔

مس برگنزا کی عمر پچاس سے اوپر ہو رہی تھی۔ اس عمر میں بھی ان کے چہرے پر ایسی معصومیت تھی جس سے آدمی فوراً متاثر ہو جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی مسکراہٹ اسکول بھر میں جہاں وہ ہیڈ مسٹریس تھیں مشہور تھی۔ اس معصومیت اور مسکراہٹ کے اتنی عمر تک تازہ رہنے کی وجہ وہ خطوط تھے جو انہوں نے اپنی جوانی میں اپنے محبوب فریڈ ڈالس کو لکھے تھے۔ فریڈ ڈالس شادی شدہ تھا۔ اس کی بیوی ریٹا ہمیشہ بیمار رہتی تھی۔ فریڈ جو ملٹری میں تھا سرحد پر ایک جھڑپ میں مارا گیا۔ مس برگنزا کو کئی پیام آئے لیکن انہوں نے رد کر دیئے اسکول کے اوقات کے علاوہ آنجہانی فریڈ ڈالس کے خطوط پڑھتی رہتیں، جو ماضی کے دریچے کھول دیتے اور انہیں جینے کی قوت فراہم کرتے۔

مس برگنزا نے معمول کے مطابق جلد کئے ہوئے خطوط نکالے اور پڑھنے لگیں۔

"فریڈی، میرے پیارے فرشتے!

کیا واقعی میں نے سات سہانے دن تمہارے ساتھ گزارے یا یہ سب ایک خواب تھا جو کبھی نہیں دہرایا جائے گا۔ کل رات تم ساڑھے بارہ بجے تک میرے ساتھ تھے اور آج رات اگرچہ چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزرے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ہمیں بچھڑے ہوئے ایک زمانہ ہو گیا۔ آج اسکول میں آئے ہوئے کئی خطوط کا جواب دینا تھا ایک کو بھی ہاتھ لگانے کی میری طبیعت نہیں ہوئی۔ رات کے گیارہ بج رہے ہیں اور تمام وقت صرف تمہارے بارے میں سوچتے ہوئے گزر رہا ہے۔ میرا جی تو چاہ رہا تھا کہ دوسری ہی ٹرین سے تم سے آکر ملوں، لیکن جب تک ریٹا ہے مجھے تمہاری خاطر دور رہنا ہے۔ وہ تمہارے لئے جینا مشکل کر دے گی اگر اسے معلوم ہوا کہ میں کہیں آس پاس ہوں۔"

عادت کے مطابق مس برگنزا نے خط ادھورا چھوڑ دیا۔ جذبات نے ان کے پورے بدن کو جکڑ لیا تھا۔ حیرت انگیز دن! حیرت انگیز دن! انہوں نے اپنے آپ سے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔ آیا دوڑ کر آئی اور کندھوں پر شال درست کرنے لگی۔ وہ آہستہ آہستہ سیر کے لئے سیڑھیاں اتریں۔

دھوپ کی تیزی ختم ہو چکی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ گرمیوں کی مخصوص سوندھی خوشبو فضا کو مہکا دیا تھا۔ مس برگنزا نے

سو چاہے موسم اور ملک کبھی نہیں بدلتے بس ان کا چہرہ وقت بدلتا جاتا ہے اس وقت لوگ کہہ رہے ہیں بدل جاتے ہیں۔ مس برگنزا اسی قسم کی باتیں سوچتی، آہستہ آہستہ سمندر کے کنارے چلتی رہیں۔

"گڈ ایوننگ مس۔" ان کی کسی طالبہ نے جو اپنے ماں باپ کے ساتھ تفریح کے لئے آئی تھی قریب آکر کہا۔

"گڈ ایوننگ، گڈ ایوننگ، سویٹ بےبی۔" مس برگنزا نے جھک کر شفقت سے کہا اور اس کے کندھے اور گال تھپتھپا کر آگے بڑھ گئیں۔

راستے میں ان کے جان پہچان کے کئی لوگ ملے، وہ سب سے ایک ایک دو دو باتیں کرتی آگے چلتی گئیں۔ جب کچھ تھکان سی محسوس ہوئی تو وہ ایک خالی بنچ پر بیٹھ گئیں۔ سورج غروب ہو رہا تھا وہ دلچسپی سے یہ منظر دیکھنے لگیں۔ سورج جاتے جاتے آسمان پر سرخی بکھیر گیا۔ پھر آہستہ آہستہ تاریکی ہر چیز کو ڈھانپنے لگی۔ مس برگنزا آہستہ آہستہ چلتی ہوئی واپس ہوئیں۔ اپنے مکان کے نزدیک پہنچیں تو کوئی تیزی سے ان کی طرف بڑھا۔

"ہلو مس برگنزا!"

"اوہ! ہلو مسٹر جان!" انہوں نے پہچانتے ہوئے جواب دیا۔ "آئیے آئیے، آپ کب آئے!"

"کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی۔" کیپٹن جان نے جواب دیا۔ "یہی کوئی پندرہ منٹ ہوئے ہوں گے۔"

"اوہ! مجھے افسوس ہے آپ کو انتظار کرنا پڑا۔" مس برگنزا نے معذرت کے لہجے میں کہا۔

"کوئی بات نہیں۔" کیپٹن جان نے مسکراتے ہوئے کہا اور ان کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنے لگا چلتے چلتے وہ ڈرائنگ روم میں آگئے۔ کیپٹن جان نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پیر پر پیر رکھ لیا اور اپنی ٹوپی کو ڈھیلی کر لی۔

"آیا! چائے لاؤ۔" مس برگنزا نے آیا کو آواز دی۔

"ابھی لائی میم صاحب۔" آیا نے کچن سے جواب دیا۔

"اور سنائیے کیسے زندگی گذر رہی ہے، کہاں رہے اتنے دن۔" مس برگنزا نے کیپٹن سے پوچھا۔

"میں نیفا میں تھا پچھلے دنوں۔" کیپٹن جان نے جواب دیا۔

"بڑے سخت دن گذر رہے ہوں گے؟" مس برگنزا نے پوچھا۔

"گذر ہی جاتے ہیں۔" کیپٹن جان نے کہا۔ "آپ کی زندگی کیسے بیت رہی ہے؟"

"ہمیشہ کی طرح۔" مس برگنزا نے جواب دیا۔ "خوش قسمتی سے میں اسکول میں ملازم ہوں۔ اسکول میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی ہنگامہ برپا رہتا ہے، دل بہل جاتا ہے۔"

کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔ پھر خاموشی اسوقت ٹوٹی جب آیا چائے لے آئی۔ وہ بسکٹ بھی لیتی آئی تھی۔ سالہا سال سے وہ مس برگنزا کے ساتھ رہی تھی اسے معلوم تھا کہ اسے کب کیا کرنا ہے۔ مس برگنزا نے چائے بنا کر کیپٹن جان کو پیش کی۔

"چائے ٹھیک ہے!" مس برگنزا نے پوچھا۔

"جی ہاں، بہت اچھی بنی ہے۔" کیپٹن جان نے جواب دیا۔

"یہ بسکٹ چکھیے۔" مس برگنزا نے بسکٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"شکریہ۔" کیپٹن جان نے بسکٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر بعد وہ جانے کے لئے اٹھا۔

"اُمید ہے کل رات آپ کھانا میرے گھر کھائیں گی" کیپٹن جون نے کہا
"شکریہ! آپ کی دعوت کا بہت بہت شکریہ۔ لیکن میں کم ہی رات کا کھانا باہر کھاتی ہوں"
مس برگنزا نے جواب دیا۔
"مس برگنزا کبھی تو آپ میری بات بھی رکھ لیا کیجئے" کیپٹن جون نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"اچھی بات ہے" مس برگنزا مسکراتے ہوئے بولیں "لیکن اب کار چلاتے ہوئے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ ڈرائیور سے کہنا پڑے گا وہ آج کل چھٹی پر ہے"
"اس کی ضرورت نہیں، میں کار بھجوا دوں گا" کیپٹن جون نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "اچھا برگنزا گڈ نائٹ!"
"گڈ نائٹ!" مس برگنزا نے جواب دیا۔
اس رات کھانا کھانے کے بعد مس برگنزا نے پھر خطوط کی جلد نکالی۔ اور وہ خطوط دیکھنے لگیں جہاں جون کا ذکر تھا۔

"میرے پیارے!
جب سے آئی ہوں تمہیں خط لکھنے کے لئے سوچ رہی ہوں لیکن دل اس قدر بھاری ہے کہ خیالات کو الفاظ میں منتقل کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ جون کی ماں کل آ کر گئی ہے۔ اور ممی طے کر چکی ہیں کہ مجھے جون سے جلد سے جلد شادی کر لینی چاہیئے اتنا اچھا لڑکا وہ گنوانا نہیں چاہتیں۔ جون کو فوج میں مستقل کمیشن ملا ہوا ہے۔ اس کی تنخواہ بارہ سو روپے ماہوار ہے۔ جب سے آئی ہوں ہر وقت جون جون سنتی رہتی ہوں۔ جی چاہتا ہے گھر سے بھاگ نکلوں۔ میں ممی سے کیسے کہوں کہ روحانی طور سے تمہاری ہو چکی ہوں اور دوسرا کوئی تمہاری جگہ نہیں لے سکتا۔ ممی بار بار مجھ سے انکار کی وجہ پوچھتی رہیں اور میں بتا نہیں سکی۔ وہ کہتی ہیں کہ وہ بوڑھی ہو چکی ہیں اور مرنے سے پہلے چاہتی ہیں کہ میری شادی کسی اچھی جگہ ہو جائے۔ جون میں تمام خصوصیات ہیں۔ وہ قد آور ہے خوبصورت ہے، اچھی تنخواہ پاتا ہے اور بہت اچھا کردار رکھتا ہے۔ لیکن وہ یہ بھول جاتی ہیں کہ ان خصوصیات کے علاوہ ایک کامیاب شادی کے لئے ایک اور چیز کی ضرورت ہے اور وہ ہے محبت، لیکن مجھ میں ان سے یہ کہنے کی جرات نہیں۔ فریڈی! آؤ مجھے کسی ایسی جگہ لے چلو جہاں کوئی ممی، کوئی آنٹی میرے سکون کو درہم برہم نہ کر سکے۔"
مس برگنزا نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کتاب رکھ دی اور بتی بجھا کر بیڈروم میں آ گئیں۔ شب خوابی کا لباس پہن کر لیٹ گئیں اور ٹیبل لیمپ جلا کر اپنی کروٹ پر کہنیوں کے بل لیٹ کر پھر خطوط دیکھنے لگیں۔
"میرے قیمتی فرشتے!
مجھے خوف ہے جون سے آسانی سے چھٹکارا نہیں مل سکے گا۔ ممی کے برتاؤ نے میرے لئے بڑی مشکل پیدا کر دی ہے۔ تم نے لکھا ہے کہ دنیا کہتی ہے کہ وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہے گی پیارے! میں چھ مہینے کیا زندگی بھر تمہارا انتظار کر سکتی ہوں اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ آخر میں تم مجھ مل جاؤ گے۔ مجھے دنیا سے کوئی حسد نہیں، میں تو تمہارے قریب رہنا، تمہارے لئے جینا چاہتی ہوں۔"
مس برگنزا نے کتاب بند کی اور لیمپ بجھا دیا۔ اندھیرے میں وہ دیر تک چھت کو گھورتی، ماضی کی یادوں میں کھوئی رہیں یہاں تک کہ نیند نے انہیں اپنی آغوش میں لے لیا۔
دوسرے روز شام کو تفریح سے لوٹ کر خطوط کی جلد دیکھ رہی تھیں کہ موٹر کے ہارن کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔ آیا کھڑکی سے نیچے دیکھنے لگی، پھر مس برگنزا سے مخاطب ہوئی۔
"میم صاحب! موٹر آ گیا۔"
"ڈرائیور کو بٹھاؤ" انہوں نے کہا اور لباس تبدیل کرنے چلی گئیں۔

لباس تبدیل کر کے وہ ڈرائنگ روم میں آگئیں۔ نوجوان جون ان کے سامنے کھڑا تھا۔

"میں کیپٹن جون کا لڑکا ہوں۔" اس نے کہا۔

"اچھا، اچھا!" انھوں نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "خدا کرے تم بھی بڑے پُرجوش بنو۔

بہت خوشی ہوئی تم سے مل کر۔"

"جی ہاں۔" کیپٹن جون کے لڑکے نے ادب سے کہا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" انہوں نے پوچھا۔ ان کی آواز میں لرزش تھی۔

"مجھے سیموئیل کہتے ہیں۔" اس نوجوان نے ذرا جھک کر جواب دیا۔

"بہت پیارا نام ہے۔" مس برگنزا نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

سیموئیل جان ان کی طرف بڑھا۔ مس برگنزا اس کا بازو پکڑے آہستہ آہستہ اتریں۔ کار میں وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔ مس برگنزا نے سیموئیل جون سے اس کے متعلق باتیں کیں۔ وہ باپ کی طرح آرمی میں کیپٹن بنے جا رہا تھا۔ اسی کی طرح باادب، ملائم ہوتا تھا اور باوقار۔

جون نے اپنے بنگلے سے باہر آکر ان کا استقبال کیا۔ اور بازو میں بازو ڈال کر ڈرائنگ روم تک لے گیا۔ ڈرائنگ روم میں جون کی بیوی کے علاوہ ایک خوبصورت لڑکی بھی بیٹھی ہوئی تھی۔

"یہ سیموئیل کی منسوبہ ہے۔" جان نے اس لڑکی سے ملاتے ہوئے آہستہ آہستہ کہا۔ "سیموئیل مجھ سے زیادہ خوش قسمت نکلا۔"

مس برگنزا نے نوجوان لڑکی سے مسکرا کر ہاتھ ملایا۔

پھر پتہ نہیں مس برگنزا نے کیا کیا باتیں کیں۔ وہ جیسے خود فراموشی کے عالم میں تھیں۔ دو گھنٹے بعد سیموئیل گاڑی میں انہیں گھر تک چھوڑنے آیا۔ آیا منتظر تھی۔ سیموئیل اوپر تک چھوڑنے آیا۔ انھوں نے اصرار کر کے اُسے کافی پلوائی۔ اس کے جانے کے بعد آیا نے کپڑے تبدیل کرنے میں مدد دی۔ شب خوابی کا لباس پہن کر وہ لیٹیں۔ پلنگ کے سرہانے دھری ٹیبل لیمپ جلا کر انہوں نے خطوط کی جلد نکالی۔

"جان سے عزیز فریڈی!"

وہ آگے نہ پڑھ سکیں۔ اچانک انہیں بے حد کمزوری محسوس ہوئی۔ خطوط کی جلد ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ ▲

بقیہ "دو آنکھوں کا سفر" صفحہ ۲۲

پڑے ہوئے نرکٹ کو بُری طرح مسل دیا۔ پھر اُس نے کہا۔ "میں پاپ ہوں۔ کیونکہ میں نے بھگوان کے اوتار کو بھگوان میں ملا دیا ہے۔ میں پچھلی شتابدی کا پاپ ہوں اور نئے لمحوں کا پن۔ اور تم اس پن کو کالے صندوق کا قیدی نہیں بنا سکتے۔" پھر گورے نے دیکھا وہ زنجیر خود اُس کی کلائیوں سے لپٹی ہوئی ہے۔ وقت کا جسم مجمع سے ابھرتے ہوئے شور کی طرف بھاگ رہا تھا۔ اچانک ہوا کے دوش پر اڑتا ہوا اخبار کا ایک ٹکڑا گورے کے پاؤں تلے دب کر پھڑپھڑانے لگا۔ یہ اخبار کا وہ ٹکڑا ہے جس میں چاند اپنے CRATOR کی گہرائی کا داغ لئے سویا پڑا ہے اور اپولو گیارہ کی خون آلود ٹانگیں تین سمتوں میں پھیلی اس کے بدن میں سختی سے چبھی ہیں۔ ٹکڑے کی پشت پر سائی لائی کے کئی سپوت اپنے سروں سے دور دور سوئے پڑے ہیں۔ اچانک بستر کے شعلے باہر لپک آئے۔ اخبار کے ٹکڑے کو جس میں چاند ہیولی کی بوجھ سے دبا پڑا ہے۔ شعلوں نے جلا کر کئی حصوں میں تقسیم کر دیا۔ کچھ حصے شعلوں کے پیٹ میں سما گئے۔ اور کچھ کالے صندوق کے پہیوں تلے جا کر دفن ہو گئے۔ ادھر وقت کی آنکھوں کا سیل بھی ٹوٹ گیا۔ پھر ان دو آنکھوں نے دیکھا کہ اُن کا سفر اُن سے آگے آگے تھا۔ اور کالی پرچھائیاں اپنا حفاظتی جال لئے پیچھے کی طرف کھسکتی چلی جا رہی تھیں۔ ! ▲

شوکت پردیسی

جب بھی کوئی فنکار بِکا ہے دُنیا کے بازاروں میں
شاخِ نشیمن ٹوٹ گئی ہے، پھول چھپے ہیں خاروں میں
آؤ! کوئی فیصلہ کر ہی ڈالیں اب مستقبل کا
کب تک یوں گمبھیر سی سُرخی نکلے گی اخباروں میں
آپ کو شاید یاد نہ ہو اب، وقت بدلنے سے پہلے
آپ بھی تھے میری ہی طرح اِن سڑکوں پر ناداروں میں
غم کی کلی پھر چٹکی کوئی، زخم کا شاید پھول کھلا
دیکھئے کیا کیا گُل کِھلتے ہیں، اب کے برس گلزاروں میں
کل تک درد تھا جن کے دِل میں، مزدوروں ناداروں کا
آج انھیں کا نام ہے اونچا بستی کے زرداروں میں
چاک گریباں سینے والوں کا ہے لہو سے دامن تر،
پھر کوئی سنجیدہ صورت پیش ہوئی ہے یاروں میں
ہم پہ ہر بہتان لگا کر افسانوں میں رنگ بھرا
پھر بھی کوئی جان نہ آئی، ان فرضی کرداروں میں
بستی بستی لوٹنے والو! اس کا بھی احساس رہے
زیست بھی طوفاں بن سکتی ہے موت کے شعلہ زاروں میں
چاند بھی ڈوبا، تارے بھی ڈوبے، وعدہ پر وہ آ نہ سکے
شوکت! آخر رہ گئے تنہا ہم اپنے غمخواروں میں

چندر پرکاش جوہر بجنوری

ہر سمت سے طوفانِ حوادث میں گھِرا ہوں
پھر آج تباہی کے دہانے پہ کھڑا ہوں
کچھ دیر خیالوں کی گھنی چھاؤں میں رُک کر
جاتا ہے کدھر یہ میں ابھی سوچ رہا ہوں
دِل میں ہے مِرے جذبۂ تعمیرِ محبت
انسان ہوں انسان کا غم لیکے اُٹھا ہوں
جس دَور میں جینا کوئی آسان نہیں ہے
اُس دَور سے جینے کا صِلہ مانگ رہا ہوں
یاد آئی ہیں مجھ کو مِری گم گشتہ منازل
جب بھی کسی بھٹکے ہوئے راہی سے مِلا ہوں
پستی و بلندی کے مناظر کو مِلا کر
میں کچھ نئی راہوں کی بِنا ڈال رہا ہوں
تاریخ کے پھیلے ہوئے اوراق کو دیکھو
یہ مجھ سے نہ پوچھو کہ میں کس طرح جیا ہوں
فردا کی حقیقت کا تو احساس نہیں ہے
ماضی کے فسانوں پہ فقط جھوم رہا ہوں
ہر سُو مِرے نغموں سے ہیں معمور فضائیں
کہنے کو میں اِک سازِ شکستہ کی صدا ہوں
پروردۂ آغوشِ محبت ہوں میں جوہر
دُنیا کے مِٹانے سے مِٹوں گا نہ مِٹا ہوں

مقالہ

ارشد صدیقی

مولانا سیماب اکبرآبادی کا طریقۂ اصلاح

علامہ سیماب اکبرآبادی کی اصلاح اور طرزِ اصلاح میں بعض خوبیاں ایسی تھیں جن سے موصوف کی اُستادانہ صلاحیتوں اور شاعرانہ عظمتوں پر روشنی پڑتی ہے اور آپ کی شرافتِ نفس اور نفاستِ ذہن و خیال کا اندازہ ہوتا ہے۔ اُنہوں نے ادب اور وقت دونوں کی نبضوں کو پہچان لیا تھا اور اُسی کی روشنی میں اپنے تلامذہ کی ذہنی تربیت فرمائی۔ یہاں تفصیل سے تمام چیزوں کے بیان کرنے کا کوئی موقع نہیں۔ صرف اختصار کے ساتھ چند اشارے پیش کیے جا سکتے ہیں۔

علامہ سیماب کے شاگردوں کی کثیر تعداد دیکھ کر بعض لوگوں کا یہ خیال رہا ہے کہ وہ "ہر کسے باشد" کو اپنی شاگردی میں قبول فرما لیتے تھے۔ حالانکہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ وہ بہت سوچ سمجھ کر شعراء کو شرفِ تلمذ عطا کرتے تھے۔ اُنہیں جب یہ یقین ہو جاتا تھا کہ کسی شاعر میں شعر گوئی کی واقعی صلاحیتیں موجود ہیں اور اُس کی صلاحیتوں سے خدمتِ علم و ادب کا کام لیا جا سکتا ہے، اُسی وقت اُس کو اپنے حلقۂ تلمذ میں شامل فرماتے تھے۔ یہ بات الگ ہے کہ آپ نے ترویجِ شعر و ادب اور ضرورتِ سخن پروری کی خاطر بعض علاقوں میں وہاں کے مقامی حالات کے پیش نظر کبھی کسی معمولی صلاحیت رکھنے والے شاعر کو بھی شرفِ تلمذ سے نواز لیا ہو۔ لیکن اس میں بھی ادبی خدمت کے جذبے کا مصلحت آمیز پہلو مضمر ہوتا تھا۔ ورنہ آپ کے شاگردوں میں بہت بڑی تعداد اُن شعراء کی ہے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور اپنے اپنے علاقوں میں شعر و ادب کی گراں مایہ خدمات انجام دیتے رہے ہیں اور دے رہے ہیں۔ ان میں سے بعض تو ایسے ہیں جو آپ سے رہبری حاصل کر کے خود بڑے بڑے کاروانوں کے رہبر بنے اور ہند و پاک میں نمائندہ حیثیت کے مالک ہیں۔

علامہ سیماب کے طریقۂ اصلاح میں اگر بعض معمولی باتیں بھی نظر آئیں تو ان میں بھی ادبی حکمت پوشیدہ ہوتی تھی، اور اسی حکیمانہ صلاحیت نے "آگرہ اسکول" کی بنیاد رکھی۔ مثلاً جس کاغذ پر غزل یا نظم لکھ کر اصلاح کے لئے بھیجی جاتی تھی اس کے متعلق یہ ہدایت ہوتی تھی کہ کاغذ کا ایک چوتھائی حصّہ خالی رکھا جائے اور اشعار کی سطریں دُور دُور قائم کی جائیں۔ چنانچہ شاگرد کے کلام پر جہاں اصلاح دی جاتی تھی وہاں کاغذ کے خالی حصّے (MARGIN) پر آپ اصلاح کی توجیہہ بھی فرما دیا کرتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ شاگرد رفتہ رفتہ فنِ عروض کی نزاکتوں اور قواعدِ زبان کی باریکیوں سے آشنا ہوتا رہتا تھا۔

شاگردوں کے لئے علامہ کی تصانیف خرید کر پڑھنا اور رسالہ "تاج" یا "ایشیا" اور ان کے بعد ماہنامہ "شاعر" کا خریدار ہونا تو اخلاقی طور پر ضروری تھا ہی۔ لیکن علامہ موصوف اپنے تمام شاگردوں کو قدیم و جدید دونوں قسم کے شعری اور نثری ادب کے مطالعے کی بھی ہدایت

فرماتے رہتے تھے۔ آپ کا حکم تھا کہ قدیم وجدید شاعری کے کم ازکم پانچ پانچ سو اشعار از بر یاد کئے جائیں۔ اِس سلسلے میں وقتاً فوقتاً محاسبہ بھی کیا جاتا تھا۔ مشقِ سخن پر آپ زیادہ زور دیتے تھے۔ آپ کا قول تھا کہ چاہے اصلاح کے لئے ایک ہی غزل بھیجی جائے۔ لیکن دس پانچ غزلیں کہہ کر ضائع کردینی چاہئیں۔ اِس سے شاگردوں میں شعر گوئی کا ملکہ پیدا ہوتا تھا۔

علامہ نے متروکات کی ایک فہرست مُرتب کی تھی۔ اور تلامذہ کو یہ مشورہ دیتے تھے کہ اِن متروکات سے حتی الوسع پرہیز کیا جائے۔ اخلاق سوز اور توہین آمیز اشعار لکھنے پر سخت پابندی تھی۔ لیکن تنقیدِ حیات سے مُتعلق مضامین کی آپ قدر فرماتے تھے۔ معائبِ سخن کی اصلاح کے ساتھ ساتھ آپ زبان کی صحت پر بھی زور دیتے تھے۔ بعض اغلاطِ زبان جو آپ سے پہلے رائج چلی آرہی تھیں۔ آپ نے اُن کی طرف اپنے شاگردوں کی توجّہ مبذول کرائی۔ اور اُن کے کلام کو اُن اغلاط سے پاک کیا۔ آپ نے غزل میں ایسے الفاظ پر بھی زور دیا جو پہلے شاعری کی زبان میں مُستعمل نہیں تھے۔ اِس طرح آپ نے اُردو زبان کو صرف نکھارا اور سنوارا ہی نہیں بلکہ اِس کے شعری اَدب کو وسعت اور ترقی بھی عطا کی۔

غیر اِصلاح شدہ غزل پڑھنے یا شائع کرانے پر سخت پابندی تھی۔ کسی دوسرے اُستاد کی اِصلاح شدہ غزل پر آپ سے اور آپ کی اِصلاح شدہ غزل پر کسی دوسرے اُستاد سے مشورہ حاصل کرنا بہت بڑا ادبی اور اخلاقی جُرم تھا۔ اِس سے علامہ کی خُود اعتمادی اور ذمہ داری پر روشنی پڑتی ہے۔ اگر دیگر اُستاد سے مُتعلق کوئی شاعر آپ کے پاس اپنی غزل بھیج کر اِصلاح کا خواہشمند ہوتا تھا تو آپ پہلے اِس سے یہ دریافت کرلیتے تھے کہ تم نے فلاں صاحب سے اِصلاح لینا کیوں چھوڑ دیا۔

فنِ عروض اور قواعدِ زبان سے مُتعلق کتب کا مُطالعہ کرنے کی آپ نے ہمیشہ تلقین فرمائی۔ تنقیدی مقالات اور تبصرے، تنقیدی کتابیں اور مضامین پڑھنے اور لکھنے پر ہر وقت زور دیا اور جن تلامذہ نے آپ کے اِن قیمتی مشوروں پر عمل کیا اُن کے اندر صحیح معنیٰ میں تنقیدی شعور اور خود تنقیدی کا رُجحان پیدا ہوگیا! وہ شاعروں میں صاحبِ فن اور صاحبِ نقد و نظر کہلائے اور آج اُن کا فرمایا ہوا "مُستند" مانا جاتا ہے اور اُن کی آرا شعر و فن کی کسوٹی سمجھی جاتی ہیں۔ آپ عربی اور فارسی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ مغربی ادب کے مطالعہ کے خاص طور پر تلقین فرماتے تھے۔ مقصد یہ ہوتا تھا کہ تلامذہ تنقیدِ حیات اور تنقیدِ ادب کی جدید قدروں سے آشنا ہوسکیں اور اپنی شاعری میں اُن صلاحیتوں کو بروئے کار لاسکیں۔

علامہ سیماب شعر پہ بہت مختصر اصلاح فرمایا کرتے تھے۔ لیکن جو لفظ جہاں رکھ دیتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا جیسے نگینہ جڑ دیا ہو اور جیسے وہ لفظ اُسی مقام کے لئے پیدا ہوا ہو۔ ایسا تو شاذ و نادر ہی ہوتا تھا کہ آپ نے کوئی مصرع قلمزد کرکے دوسرا مصرع لکھ دیا ہو۔ عام طور پر لفظ کے بدلے لفظ یا چند الفاظ یا ترکیب کی تبدیلی سے شعر کو ایسا سجا دیتے تھے کہ اصل شعر کا صرف عیب ہی دُور نہیں ہو جاتا اُس کا حُسن اُبھر آتا تھا اور اُس کے مفہوم و معنی میں بلندی اور خیال میں وسعت پیدا ہو جاتی تھی۔ معمولی قسم کے شعر کو نظر انداز کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔ لیکن جو شعر آپ کی نظر میں بلند یا معیاری ہوتا تھا۔ اُس پر ایک صاد (ص) یا دو صاد (ص ص) اور کبھی کبھی تو تین صاد (ص ص ص) کے نشانات دے کر شاگردوں کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ اِس طرح تلامذہ کے شعری ذوق میں بھی ترقی ہوتی تھی۔ اور اُن میں اعلیٰ ادب کی قدروں کو پہچاننے کا شعور بھی پیدا ہوتا تھا۔ مولانا صرف لفظی اصلاح ہی نہیں فرماتے تھے۔ بلکہ آپ نے اپنے شاگردوں کے ذہن و خیال کی بھی اصلاح فرمائی۔ اِس کی متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں کہ مولانا سیماب نے اصلاحِ سخن کے ذریعہ کس طرح اپنے تلامذہ کو زندگی کی جدید قدروں اور حیات کے نئے تقاضوں سے رُوشناس کیا۔ پھر یہی نہیں بلکہ اُن کے اندر جدید تخلیقی قوتیں بھی پیدا کیں اور اِن قوتوں کو جلا بھی بخشی۔

غرض یہ کہ آگرہ اِسکول کے بعض متعین قواعد و ضوابط کی پابندی کے ذریعہ علامہ سیماب نے اپنے تلامذہ کی شعری و

نئی صلاحیتوں میں بہت اضافہ کیا اور اپنے بعد اپنے روشن خیال شاگردوں کا ایک ایسا کارواں چھوڑ گئے جو ہند و پاک کے گوشے گوشے میں فنِ شعر و ادب کی روشنی پھیلائے ہوئے ہے۔

مولانا سیماب چونکہ خود بھی قدیم و جدید کا ایک حسین امتزاج تھے۔ لہٰذا اپنے تلامذہ کو بھی روایات پرستی کے تاریک گوشوں سے نکال کر ادب کی جدید قدروں سے آشنا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ علّامہ نے عظیم کلاسیکی ادب کی صالح روایات اور جدّت پسندی کے خمیر سے شاعری کا ایک نیا پیکر بنایا تھا۔ آپ نے قدیم روایات کو اس کے صحت مند خیالات، ہئیت اور فن کی حد تک قبول کیا۔ (بلکہ اُن میں بھی ترقی کے اِمکانات پیدا کئے۔) لیکن مواد اور رُجحان کے اعتبار سے آپ کا ادب خالص جدید ہے ہے جس کے پیش رو خود آپ ہی کے ہموطن شاعر نظیر اکبر آبادی گزرے ہیں۔ نظیر نے اپنے دَور میں عوامی نقطۂ نظر سے اپنی زندگی کے گرد و پیش پر نظر ڈالی تھی اور زندگی کے آس پاس کی چیزوں کو موضوعِ سخن بنا کر عوام سے اُنہیں کی زبان میں گفتگو کی تھی۔ مگر سیماب کے موضو... ورڈس ورتھ کے SKYLARK کی طرح عالمِ بالا کی خبر بھی لے آتے ہیں اور مادّی دنیا سے بھی اپنا رشتہ ہموار کئے ... آپ کے موضوعاتِ سخن اِنسانی زندگی ہی سے متعلق ہوتے تھے۔ لیکن محدود نہیں بلکہ زندگی ہی کی طرح ہمہ گیر۔ وقت اور ماحول کے اِعتبار سے اِن کے خیالات کی شکل بھی ترقی یافتہ ہوتی تھی۔ اور زبان بھی ترقی یافتہ۔ آپ نے زندگی کے منفی پہلوؤں کے بجائے اُس کے مُثبت پہلوؤں کو پیش کرنے کی زیادہ بلیغ کوشش کی، اور یہی تمام رُجحانات اپنے شاگردوں میں عام کئے۔

علّامہ کے جن تلامذہ نے علّامہ کے اِس مافی الضمیر کو اپنی ذہنی گرفت میں لے لیا وہ جدید ادب کی قدروں کا راز پا گئے اور ... ملک کے شعری ادب میں نمائندہ حیثیت کے مالک ہیں۔ مثلاً ساغر نظامی۔ منظر صدّیقی۔ اعجاز صدّیقی۔ نازش پرتاب گڑھی۔ ضیا فتح آبادی۔ نثار اٹاوی۔ طرفہ قریشی۔ ضیا جالندھری۔ شہ زور کاشمیری۔ اِقبال ماہر۔ شفیق کوٹی۔ سراج الدین ظفر۔ رونق دکنی۔ الطاف مشہدی۔ مختار صدّیقی۔ سید فیضی۔ نور بجنوری۔ مخمور جالندھری۔ شفا گوالیاری (مرحوم)، احمد عظیم آبادی۔ حکیم عبدالکریم ثمر۔ علیم اختر مظفر نگری۔ آلم مظفر نگری (مرحوم)، راز چاندپوری (مرحوم)، لطیف انور گورداسپوری (مرحوم)۔ آرزو سہارنپوری۔ حبیب آردی۔ ساحل ٹونکی۔ مفتوں کوٹوی۔ زیب بریلوی۔ پنڈت نند لال کول طالب کشمیری۔ پنڈت گووند داس خموش سرحدی۔ رمزی اٹاوی۔ حکیم حسامی مانکپوری۔ حنیف سہارنپوری۔ ڈاکٹر سحر اعظمی۔ (اور اگر آپ مناسب سمجھیں تو) خود راقم الحروف ارشد صدّیقی۔ اور نہ جانے ایسے کتنے ہی تلامذۂ سیماب ہیں جو اپنے شعری ادب میں زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کی جد و جہد میں پیش پیش ہیں۔ وہ فنِ شعر کی صحت مند روایات کو بھی برقرار رکھے ہوئے ہیں اور بے راہ روی سے دامن بچا کر ادب کی نئی قدروں کا بھی حق ادا کر رہے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اِنہیں ہندوستان گیر پیمانے پر شہرت حاصل ہے۔ ادبی دنیا میں اُن کا ایک نام اور مقام ہے۔ اور وہ صفِ اوّل کے شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ یہ تمام فیوض و برکات علّامہ سیماب اکبر آبادی کی طرزِ اصلاح اور طرزِ تعلیم کی ہیں۔ جن کے ذریعہ آپ نے اپنے تلامذہ کے ذہن و شعور میں ادب اور زندگی کی نئی قدروں کے چراغ روشن کئے تھے۔

تنہا تمنا پوری

ایک منظر

دُور :
گگن کی اُس نگری میں
کالے بادل،
شور مچاتے، آنکھ مچولی کھیل رہے تھے
اور چمن کے ویرانے میں
خود رو پودے، پیلے بدن میں
سَر کو چھپائے کانپ رہے تھے۔

ایسے میں یہ مَیں نے دیکھا :
سُرخ گلاب کا ننھا پودا
ویرانے سے جھانک رہا تھا
آس کی آنکھوں سے بادل کو تاک رہا تھا
بادل اپنی آنکھ مچولی بھول گئے تھے
اور چمن کے ویرانے میں ورشا گھنگھرو باندھ رہی تھی
خود رو پودوں کی آنکھوں سے
آشا باہر جھانک رہی تھی۔

▲

اُڑیا - اما کانت رتھ
ترجمہ - کرامت علی کرامت

خوف

رات کے پچھلے پہر، جب راستے سُنسان تھے
تب نکل کر گھر سے تنہا
اجنبی گلیوں میں مَیں نے شہر بھر کی خاک چھانی
پھر مجھے محسوس یوں ہونے لگا
جیسے کوئی اجنبی میرے تعاقب میں لگا ہے

جب پلٹ کر مَیں نے دیکھا، ہو گیا یخ بستہ جیسے دل مِرا
میرے اندر کی چھُپی "حیوانیت" اور "شیطنت"
دیکھ کر اس اجنبی شے کو ہوئی لرزاں، ہراساں
مَیں نے دیکھا، میرے پیچھے چل رہی تھی ایک بھیڑ
مَیں نے سوچا بھیڑ کی صُورت میں میرے سامنے آ ہی گئی "معصومیت"
پھر مِری حیوانیت معصومیت سے ڈر گئی
شانتی کا نیشتر پیوست کر بیٹھی مِرے سینے میں وہ معصوم بھیڑ
بس اُسی دن سے ہے مجھ پر خوف طاری ہر گھڑی
اور اسکے بعد تنہا چل پڑا ہوں جب بھی مَیں ان راستوں پر
میرے دل میں وسوسہ پیدا ہوا ہے
جیسے اب تک میری ہستی کے تعاقب میں ہے روز و شب
وہی کم بخت بھیڑ !

افسانہ

جمیل احسن شاہجہاں پوری

تخلیق

گیارہ سال پہلے جب میں، سعید، جمال، اعجاز، خورشید اور سعادت علی گڑھ یونیورسٹی میں ایک ہوسٹل کے ملحقہ کمروں میں رہتے تھے اور اپنے ناپختہ ذہن کے باوجود خود کو بہت عقلمند سمجھتے تھے اور زیادہ تر عورت کی نفسیات کے بارے میں بات کرتے تھے تب کا ذکر ہے۔ ایک شام کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے ہم سب اس بات پر بحث کر رہے تھے کہ عورت مرد سے کس بات کی خواہش کرتی ہے۔ وہ مرد سے کیا حاصل کرنا چاہتی ہے اور کس بات کے حصول سے مطمئن ہو جاتی ہے۔

خوش شکل جمال کا خیال تھا کہ ہر لڑکی ایک خوبصورت ہم سفر کی متلاشی ہوتی ہے۔ متمول گھر کے سعید کا کہنا تھا کہ عورت کے لئے معاشی تحفظ سب سے بڑی چیز ہے۔ جو مرد اس کو خوبصورت، آرام دہ، پر آسائش زندگی مہیا کر سکتا ہے وہی اس کا دل جیت لیتا ہے خواہ وہ حسین ہو یا نہ ہو۔ خورشید نے اپنے پٹھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا کہ عورت کی نظر میں مردانگی سب سے بڑی شئے ہے۔ اگر کوئی مرد حسین بھی ہے اور امیر بھی مگر عورت کی جنسی خواہشوں کی تسکین اور خطرات سے حفاظت کرنے کے قابل نہیں تو وہ ہمیشہ اس کی نظروں میں گرا رہے گا۔ سعادت کا خیال تھا کہ تینوں چیزیں اہم ہیں اور تینوں میں سے کسی بھی شئے کی کمی عورت کیلئے بے اطمینانی کا سبب ہو سکتی ہے۔ اس کو کلی آسودگی تب ہی مل سکتی ہے جب تینوں خصوصیات والا مرد مل جائے۔ اعجاز کا خیال تھا کہ عورت بڑی قناعت پسند ہوتی ہے۔ وہ ان میں سے کچھ نہ پاکر بھی خوش رہتی ہے۔ اُسے مرد کے بغیر ہمیشہ ادھورے پن کا سا احساس رہتا ہے۔ مرد جیسا بھی ہو خواہ کتنا کم زور، کتنا غریب اور کتنا بدصورت، جب وہ اس کا رفیق زندگی بن جاتا ہے تو اس کی رفاقت ہی عورت کے لئے سب سے بڑی خوشی اور آسودگی مہیا کر دیتی ہے۔ میں خاموش تھا۔ اپنی محرومیوں اور بدنصیبیوں کے باعث مجھے نہ کسی لڑکی کی قربت نصیب ہوئی تھی نہ سرگوشیاں، نہ ریشمی لمس نہ محبت کی نظر ـــــ لیکن اس دن سے میرے ذہن میں یہ سوال مستقل چکر لگاتا رہا کہ عورت کی تمنا کیا ہے! مرد سے کس بات کی طلب ہوتی ہے اس کو۔ اور کس خصوصیت والا مرد عورت کو ہر تشنگی سے آزاد کر سکتا ہے اس کی نگاہ میں بلند مقام اور دل کی گہرائیوں میں جگہ حاصل کر سکتا ہے۔

دو سال بعد ہم لوگ یونیورسٹی سے رخصت ہو گئے اور یوں منتشر ہو گئے جیسے ہوا کے جھونکے سے ایک ہی شاخ کے چند پتے۔ میں نے ان سوالوں کا جواب ہر جگہ ڈھونڈا۔ کتابوں میں، زندگی کے چھوٹے بڑے تجربوں میں، لوگوں کے خود سنائے ہوئے حقیقی واقعات میں اور رخسانہ کی محبت میں ـــ جو اچانک اور غیر متوقع طور پر میری زندگی میں یوں آ گئی جیسے پیڑ کے نیچے بیٹھے ہوئے خستہ حال مسافر کی گود میں وہ پھول آ گرے جو اس کی پہنچ سے بہت دور رہا ہو یا جیسے چاند کی سنہری اور پہلی کرن جو تاریک گوشے میں بیٹھے ہوئے بدنصیب کے گلے میں اچانک خود بخود ہار بن کر لپٹ جائے۔

میں نے یہ سوال رخسانہ سے بھی کئی بار پوچھا۔ عورت کیا چاہتی ہے۔ کس چیز کی آرزو ہوتی ہے اُسے مرد سے۔ کس جذبے

یا دولت یا تحفظ کی طلب ہوتی ہے۔ کیا جستجو ہوتی ہے۔ اُسے مرد کی محبت میں۔ قربت میں اور رفاقت میں۔" میرے ان سوالوں کے جواب میں اُس نے ہمیشہ مجھے ایسی عجیب اور سمجھ میں نہ آنے والی نظروں سے دیکھا جو میرے سوال کا واضح جواب تو نہیں دیتیں مگر میرے شعور کے دُور دراز گوشوں میں کہیں پریوں کی کلکلانے لگتیں جیسے کچھ سمجھ میں آتا رہا ہو مگر مبہم مبہم، کوئی جواب گونج رہا ہو مدھم مدھم۔

رخسانہ کی مجھ سے محبت اور شادی کی بھی عجیب اور دلچسپ کہانی ہے۔ میں، جو اپنی مایوسیوں سے پُر، بیزار کُن زندگی کو بوجھ سمجھ کر گذار رہا تھا اور متعدد ناکامیوں اور بے وفائیوں سے تھک کر محبت اور خوشی کی اُمید کو تج بیٹھا تھا اور جو اپنی بے رنگ، بے رس اُداس زندگی کو ایک ناگوار فرض کی طرح پورا کر رہا تھا، اُس کی زندگی میں اچانک ایسا انقلاب آگیا جیسے سیاہ بادلوں سے بھری اندھیری رات کے سارے بادل چھٹ جائیں اور جھلملاتے ہوئے بے شمار تارے نکل آئیں اور شبِ تاریک شبِ مہتاب بن جائے۔

ایک رنگین محفل میں جب میں دوستوں کے اصرار پر مجبور ہو کر ساحرؔ کی نظم تیری آواز سُنا رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ میرے لہجے کے سوز و گداز پر دو خوبصورت آنکھیں دھیرے دھیرے نم ہوتی جا رہی ہیں۔ اس نظم سے میری کچھ تلخ یادیں، کسک اور ماضی کی بے قرار راتیں وابستہ تھیں اس لئے میں اس نظم کو جب بھی پڑھتا تھا تو میری روح کا کرب اور جذبات کا درد میرے لہجے اور آواز میں سمٹ آتا تھا۔ سُننے والے اس درد و کرب سے متاثر اور محظوظ ہوتے تھے اور اکثر اسی نظم کی فرمائش کرتے تھے جسکو سُنانے سے ہمیشہ گریز کرتا تھا۔ اتفاق ہی تھا کہ اُس دن میں اس نظم کو سنانے پر راضی ہو گیا اور وہ کلیوں جیسی شاداب شگفتہ آنکھیں بھیگ بھیگ کر شبنمی ہوتی گئیں، ہوتی گئیں۔ جب نظم ختم ہوئی تو اُن آنکھوں سے دو بوندیں ٹپکیں جیسے آکاش سے دو تارے ٹوٹیں اور ان تاروں نے میری زندگی کے اندھیروں کو روشنی سے جگمگا دیا۔ یہ دو بوندیں خالی سیپ جیسی میری زندگی میں موتی بن کر گریں۔ یہ دو بوندیں جب گریں تو میرے دل کا ویرانہ سیراب ہو کر گلشن گلشن ہو گیا اور میں نے جہاں جہاں دیکھا وہاں پھول ہی پھول کھلے تھے۔

رخسانہ نے میرے لئے اپنے دولت مند گھر کو چھوڑ دیا۔ اپنے خاندان کی سکھ بھری زندگی کو تج دیا اور میرے غم خانے میں شمع بن کر آگئی۔ جلتی رہی پگھلتی رہی مگر میرے گھر میں نور ہی نور بھر دیا۔ ایک سیٹھ کے گھر سے ایک کلرک کے گھر تک کا راستہ بڑا پُر خار سنگلاخ اور دشوار گذار ہوتا ہے جس پر چلنا بڑا کٹھن کام ہے مگر رخسانہ یوں چلی آئی جیسے وہ گلستاں کی روش پر چل رہی ہو اور اُس نے کبھی اُن گرم جھونکوں کی شکایت نہیں کی جو زندگی میں اکثر آتے رہے۔ میں جب دفتر کی فائلوں سے سر کھپا کر دیر سے گھر واپس آتا تو وہ سب سے پہلے اپنی نرم و نازک انگلیوں سے میرا سر دباتی اور میرا دردِ سر جو مستقل سا ہو گیا تھا اُس کی نرم انگلیوں کا لمس پاتے ہی دُور ہو جاتا۔ پھر وہ میرے لئے کھانا گرم کرتی اور ہم دونوں ساتھ ساتھ کھانا کھاتے۔ ٹھنڈا کھانا کھانے اور اکیلے کھانے سے مجھے ہمیشہ کوفت رہی ہے۔ ہوسٹل میں بھی خواہ کتنی رات ہو جائے میں بغیر گرم کئے اور کسی کو شریک بنائے ہوئے کھانا نہیں کھاتا تھا۔

میں اکثر یہ بات سوچتا کہ اگر عورت دولت یا سماجی تحفظ کی خواہش مند ہوتی ہے تو وہ میرے پاس نہیں تھا۔ اگر مرد کی خوبصورتی پر جان دیتی ہے تو میں اُس سے بھی محروم تھا۔ اگر مرد کی دلبری، جواں مردی اور بہادری سے مطمئن ہوتی ہے تو اس کی نمائش کا بھی کوئی موقع نہیں آیا تھا۔ پھر رخسانہ مجھے کیوں پیار کرتی ہے؟ کیا مل گیا ہے اُسے، یا کیا حاصل کرنا چاہتی ہے مستقبل میں وہ مجھ سے؟ وہی پرانے سوالات میرے ذہن میں اُن پرندوں کی طرح اُڑتے اور پھڑ پھڑاتے رہتے جن کو باہر نکلنے کے لئے کوئی راہ نہ ملے یا بیٹھنے کے لئے کوئی شاخ یا مضبوط سہارا نہ ملے۔ مجھے بھی کسی مضبوط دلیل کی ضرورت تھی۔

(باقی صفحہ ۴۵ پر دیکھئے)

غزلیں

مصوّر سبزواری

سیاہ درد کا یہ سائبان گِر جائے
ہمیں پہ ٹوٹ کے کاش آسمان گِر جائے

خرابۂ دلِ تنہا نہ دیکھا جائے گا
ہمیں مکیں ہیں تو ہم پر مکان گِر جائے

مَیں اُس لرزتی سی دیوارِ دل کا نوحہ ہُوں
جو کہتے کہتے کوئی داستان گِر جائے

سنبھل سنبھل کے اُٹھا بارِ بیکسی کا پہاڑ
ترے جگر پہ نہ سر کی چٹان گِر جائے

دُعائے نیم شبی اور یقین بے اثری
کہ جیسے تیر سے پہلے کمان گِر جائے

مُصوّر ایسی ہوئی تنگ یہ زمیں ہم پر
بڑھیں جدھر بھی وہیں آسمان گِر جائے

☆

یہ آخری سراب بھی محکم نہیں رہا
سایوں کے ساتھ چلنے کا اب دم نہیں رہا

مارے گئے ہیں ہم تو ہواؤں کے ہاتھ سے
اب بُزدلوں کی جیت کا کچھ غم نہیں رہا

شیشہ بہ شیشہ بیٹھا ہُوا عکسِ سنگ ہے
شیشوں کے گھر میں چھُپنے کا موسم نہیں رہا

اب کے سفر میں ہوگیا سمتوں کا بھی زوال
پُورب میں آگ لگ گئی پچھم نہیں رہا

اب اس شکستہ کشتیٔ جاں میں ہی بیٹھ لو
طوفاں تو پچھلی رات بھی مدھم نہیں رہا

اسکے بچھڑنے پر یہ مصوّر کھُلا بھرم
شامل رہا وہ مجھ میں مگر ضم نہیں رہا

کیف احمد صدیقی

ہم آج کچھ حسین سرابوں میں کھو گئے
آنکھیں کھُلیں تو جاگتے خوابوں میں کھو گئے

ہم صفحۂ حیات سے جب بے نشاں ہوئے
لفظوں کی رُوح بن کے کتابوں میں کھو گئے

آئینۂ بہار کے کچھ عکسِ مضمحل
خوشبُو کا رنگ پا کے گُلابوں میں کھو گئے

دراصل برشگال کے تم آفتاب تھے
برسات جب ہوئی تو سحابوں میں کھو گئے

نکلے تھے جو بھی آج تلاشِ ثواب میں
وہ زندگی کے سخت عذابوں میں کھو گئے

دِل کو تھی ایک شہرِ تمنّا کی جُستجو!
لیکن ہم آرزُو کے خرابوں میں کھو گئے

طُوفاں کا سامنا وہ سفینے کریں گے کیا
جو سطحِ آب پر ہی حبابوں میں کھو گئے

جب مسئلہ حیات کا کچھ حل نہ ہو سکا
کچھ لوگ فلسفے کی کتابوں میں کھو گئے

اے کیف ہم کو دید کی خواہش نہیں رہی
ہم تو نگارِ فن کے حجابوں میں کھو گئے

ہارون ایوب

اردو افسانہ — پریم چند سے آزادی تک

اردو میں باقاعدہ افسانہ نگاری کا آغاز پریم چند سے ہوتا ہے۔ پریم چند اردو کے پہلے افسانہ نگار ہیں جن کے یہاں باقاعدہ ایسے نمونے ملتے ہیں جن پر جدید افسانہ نگاری کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ ۱۹۰۸ء میں پریم چند کا پہلا افسانہ شائع ہوا اس کے بعد پریم چند برابر لکھتے رہے اور ان کا فن برابر ترقی کرتا رہا۔ پریم چند کے ابتدائی مجموعوں میں "سوز وطن" کی بڑی اہمیت ہے۔ اسلوب، انداز بیان۔ فکر و نظر کی ساری خصوصیات اس میں موجود ہیں۔ دیہاتی زندگی اور متوسط طبقے کے مسائل پریم چند کے افسانوں کے موضوع رہے ان کی عمر کا زیادہ حصہ گاؤں میں گزرا تھا۔ اس لئے وہ وہاں کے ماحول اور وہاں کے لوگوں کے دکھ سکھ ان کی مجبوریاں اور محرومیاں۔ ان کے مسائل۔ ان کی زندگی کے مختلف کیفیات۔ اُن کے افسانوں میں اپنی پوری کرینا کی کے ساتھ ملتے ہیں۔

یہ اردو افسانہ کی خوش قسمتی ہے کہ اس کو اپنی پہلی منزل میں پریم چند جیسے دردمند انسان دوست افسانہ نگار کی قیادت حاصل ہوئی۔ پریم چند نے سماجی حقیقتوں کو سمجھتے ہوئے اپنی کہانیوں کو ایک نئی شکل دی ہے۔ پریم چند دراصل اردو افسانہ کا بانی ہے۔ اور اس نے بہت سلیقے سے اس کی تعمیر و تکمیل بھی کی۔

پریم چند کے ساتھ دو اور بڑے افسانہ نگار ہیں۔ ایک سلطان حیدر جوش اور دوسرے سجاد حیدر یلدرم۔ سجاد حیدر یلدرم نے افسانہ کو رومانیت کی روایت سے روشناس کرایا۔ بہت سے بعد میں آنے والے افسانہ نگار اس سے متاثر ہوئے ان کی رومان پرستی کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ وہ خالص فنی افسانہ نگار تھے۔ لیکن انھوں نے ایک سچے ادیب کی حیثیت سے یہ نعرہ بلند کیا کہ ادب اور ادیب کو زندگی کے جھگڑوں سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے۔ جس میں پھنس کر ادیب کو معلم و واعظ بنا پڑے سجاد حیدر یلدرم نے سب سے پہلے ترکی افسانوں کا ترجمہ اردو میں کیا جس نے اردو میں اہم اضافہ کر دیا۔ ان کی رومانیت دراصل ترکی افسانہ کا ہی اثر قبول کئے ہوئی تھی۔ خود ان کے ترجمے ایسے ہیں کہ انہیں پڑھ کر پڑھنے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ ترجمے ہیں یا تمثیل کا نتیجہ۔ ان کے افسانوں میں شاعری کا مزہ آتا ہے۔

سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں کا مجموعہ "خیالستان" بہت مقبول ہوا تھا اس میں کچھ ترکی اور انگریزی سے ترجمہ کئے ہوئے افسانے ہیں اور کچھ طبع زاد ہیں۔

سلطان حیدر جوش کے افسانوں میں مقصد اور حقیقت نگاری پر زور دیا جاتا ہے انہوں نے ایک خاص ماحول اور پس منظر میں اصلاحی افسانے لکھتے ہیں۔ جوش کے افسانے خالص معاشرتی ہوتے ہیں۔ جس کے ساتھ ہی ساتھ طنز و مزاح کی چاشنی اُن کے افسانوں میں ملتی ہے۔ ان کے سارے افسانے مشرقی ماحول کی پیداوار ہیں اور لوگوں کو مغربی رنگ سے الگ رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس میں ناصحانہ رنگ آگیا ہے۔ ان کی زبان بہت شگفتہ اور بیان میں پختگی ہے۔

یہ تین مختلف رجحانات اردو افسانے میں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ لیکن ان تینوں رجحانات نے مل کر الگ الگ اردو افسانے کو بہت اچھے اچھے سبق دیئے ہیں۔ ایک سبق پریم چند سا دیا ہوا تھا کہ ہماری کسوٹی پر وہی ادب اترے گا جس میں فکر آزادی کا جذبہ ہو تعمیر کی روح ہو۔ حسن جس کا جوہر ہو اور زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو۔ اور دوسرا سبق جوش سا معاشرتی اصلاح کا مقصد قریب نے اور بلند نصب العین کے ساتھ کیا جائے۔ اور تیسرا یلدرم سا کہ فن کی ریاضت کردار کے تقاضوں کی پیروی کرتی ہے۔

ان لوگوں کے بعد اردو افسانے کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے جس میں ان تینوں افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والے آکر مل جاتے ہیں۔ ان میں سدرشن۔ راشد الخیری۔ ل احمد۔ نیاز فتحپوری۔ مجنوں گورکھپوری۔ امتیاز علی تاج۔ عظیم بیگ چغتائی۔ علی عباس حسینی۔ اعظم کریوی۔ حامد اللہ افسر وغیرہ قابل ذکر ہیں ان کے بعد کے افسانہ نگاروں نے ارادی یا غیر ارادی طور پر ابتدا میں پریم چند۔ یلدرم اور جوش کے اثرات قبول کئے۔ لیکن ان میں سے ہر ایک نے اپنے مزاج کے مطابق اپنی الگ راہ تلاش کرلی۔ پریم چند کی راہ پر چلنے والے سدرشن۔ اعظم کریوی اور علی عباس حسینی ملتے ہیں۔ جن کے افسانوں میں دیہاتی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں نظر آتی ہیں۔ اس دور میں ہمیں سماجی حقیقتوں کے ساتھ ہی ساتھ رومانی تحریک بھی ملتی ہے۔ ان افسانہ نگاروں میں نیاز فتحپوری اور مجنوں گورکھپوری سب سے زیادہ رومان پرست ہیں۔ ان پر عورت چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان کے افسانوں کا بنیادی موضوع محبت اور عورت ہے یہی وہ چیز ہے جو مردہ دلوں میں جان ڈال دیتی ہے۔ بقول وقار عظیم "رومان سے انہیں محبت نہیں بلکہ جنون سا ہے وہ رومان کی آغوش میں سکون تلاش کرتے ہیں۔ وہ انسان کو عام سطح سے اوپر لے جانے کی کوشش کرتے ہیں جہاں کا ہر ذرہ رومان کے جذبے میں ڈوبا ہوا ہے۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ عورت محبت کے لئے پیدا ہوئی ہے اس کی پرستش کے لئے محبت کا جذبہ فطری ہے جتنا دبایا جائے گا اتنا ہی ابھرے گا" جب نیاز فتحپوری پر یہ اعتراض کیا گیا تھا کہ ان پر ہمیشہ عورت سوار رہتی ہے تو انھوں نے اس کے جواب میں ایک مضمون لکھا تھا اور خود کو اس طرح حق بجانب قرار دینے کی کوشش کی، "مجھے حیرت ہوتی ہے کہ عورت اور اس کے ذکر کو نکال دینے کے بعد آپ کے پاس کیا رہ جائے گا۔ کائنات میں کون سی دوسری چیز ایسی ہے جس سے آپ کی محفل کی رونق قائم رہ سکے"

سدرشن نے دیہاتی اور شہری زندگی دونوں پر افسانہ لکھے ہیں۔ اُن کے کردار اکثر ذہنی الجھنوں میں مبتلا نظر آتے ہیں لیکن اس کشمکش کو بہت خوبصورتی سے سدرشن اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہیں۔ سدرشن واقعات کو کچھ اس انداز سے ترتیب دیتے ہیں کہ پڑھنے والے کے لئے وہ واقعہ بالکل نیا ہو جاتا ہے اور ایک دم اس کے سامنے آجاتا ہے تو اس سے اس کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔

علی عباس حسینی کے ہر افسانہ میں درد و غم ملے گا جس کی خاص وجہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سماج کی دکھتی رگوں کو پکڑ لیتے ہیں۔ وہ بے بس انسان سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اس کی بے بسی کا ذکر اپنے افسانہ میں اس طرح سے کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اس میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ ان کے افسانے رومان اور شاعری سے قریب ہوتے ہیں۔ پریم چند اور سدرشن کی طرح حسینی بھی۔ یہ اپنے افسانوں کا مواد آس پاس کی زندگی سے حاصل کرتے ہیں۔ آپ دیہاتی زندگی کے اندرونی جذبات کو ابھار کر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں جس سے احساس درد اور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ علی عباس حسینی کی محبت عام محبت سے الگ ہوتی ہے۔ وہ فطرت سے زیادہ قریب ہوتی ہے۔

اس طرح سے ۱۹۳۵ء کے آتے آتے اردو افسانہ نے کئی مراحل طے کئے۔ جو مشرق اور مغرب کی مختلف ادبی سماجی اور سیاسی تجربات کا نتیجہ تھے۔ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک شروع ہوئی۔ زندگی کی ہر ناکامی۔ عوامی تباہی اور بربادی کا ذکر افسانوں

میں ہونے لگا۔ اس تحریک کے ساتھ ہی ساتھ بہت سے نئے افسانہ نگاروں کا اضافہ ہوا۔ یہ سال بہت اہم تھا۔ ہندوستان آزادی کی لڑائی کے لئے تیار تھا۔ اس وقت ملک کی حالت ایک آتش فشاں کی سی ہو رہی تھی۔ پورے ملک میں سماجی اور اقتصادی پریشانیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس وقت "انگارے" شائع ہوئی۔ جس نے سیاسی زندگی میں روح پھونک دی۔ انگریزوں نے اس کی مخالفت کی اور اس کتاب کو ممنوع قرار دیا گیا۔ انگارے میں کل دس کہانیاں ہیں جن میں پانچ سجاد ظہیر۔ دو رشید جہاں۔ دو احمد علی اور ایک محمود الظفر کی۔ انگارے مشرق اور مغرب کے فنی امتزاج کا کارنامہ تھا جو ہندوستان کی مذہبی سیاسی زندگی کی پیداوار ہے۔ ہر جگہ اس بے باکی سے آزادی کا خیال پیش کیا ہے جو اس وقت تصور سے باہر تھا۔ موضوع کے اعتبار سے اتنی صاف گوئی اور بے باکی اس سے پہلے کسی افسانے میں نہیں ملتی۔ احمد علی۔ سجاد ظہیر۔ سہیل عظیم آبادی۔ اختر اورینوی۔ اختر انصاری۔ حیات اللہ انصاری کے بعد کرشن چندر۔ منٹو۔ حجاب۔ راجندر سنگھ بیدی۔ عصمت چغتائی۔ اپیندر ناتھ اشک۔ غلام عباس۔ دیوندر ستیارتھی۔ احمد ندیم قاسمی، حسن عسکری۔ بلونت سنگھ، خواجہ احمد عباس۔ ابراہیم جلیس۔ ممتاز شریں۔ ہاجرہ مسرور۔ شفیق الرحمن۔ قرۃ العین حیدر۔ خدیجہ مستور۔ تسنیم سلیم چھتاری وغیرہ کی ادبی فتوحات کا دور شروع ہوا اور ان سب افسانہ نگاروں کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے شدت کے ساتھ ادب اور زندگی کے تعلق کو محسوس کیا ہے کسی نے دیہاتی زندگی اور کسی نے شہری زندگی کو اپنا موضوع بنایا۔ کرشن چندر نے کشمیر سے اپنا مواد حاصل کیا تو منٹو نے بمبئی اور لاہور کی گلیوں سے۔ ان سب افسانہ نگاروں میں جذبات اور احساس کی بڑی گہرائی ہے اور فکر و فن کے اعتبار سے ان لوگوں کی رفتار میں اردو افسانہ نے ترقی کی منازل بڑی آسانی اور تیزی کے ساتھ طے کیں ۱۹۳۶ء سے آگے کے گیارہ سال کا زمانہ اردو افسانہ کی سربلندی کا زمانہ ہے۔

پریم چند کا لگایا ہوا پودا ایک تناور درخت کی تشکیل اختیار کر گیا۔ ہندوستان کے لئے یہ سارا دور کشمکش اور سیاسی تبدیلیوں اور تحریکات کا دور تھا۔ اردو افسانے نے کسی موڑ پر حالات سے منہ نہیں موڑا۔ ایک طرف وہ موضوعات کی ہمہ گیر کشمکش میں پیش پیش رہا تو دوسری طرف اس نے فنی عظمت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اور اس طرح سے یہ کارواں ۱۹۴۷ء تک پہنچ گیا۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی زندگی میں وہ زبردست سیاسی، معاشی انقلاب رونما ہوا۔ لیکن اس انقلاب کے رونما ہونے سے پہلے ہمارا افسانہ فن کی اس منزل پر پہنچ چکا تھا۔ جہاں زندگی کے حقائق فنکار کی شخصیت اور فن کا حسن ایک دوسرے میں جذب اور مدغم ہو جاتے ہیں۔

رؤف خیر

منافقین ادب سے کہو

منافقینِ ادب سے کہو ذرا دم لیں
نگاہ و دل ابھی توحیدِ جاں کے قائل ہیں
یہ راست گو ابھی پاسِ زباں کے قائل ہیں
مُبانِ خوش بدناں کا بھی نام کم کم لیں

یہ لوگ سایۂ زیرِ چراغ ہیں یوں بھی
جو اپنی جانوں پہ خود آپ ظلم ڈھاتے ہیں
زبانِ حافظ و سعدی جو بھول جاتے ہیں
انھیں کے سر ہے مقدس کتاب کا خوں بھی

ابھی عزیز ہے ان کو زباں کا "پیراہن"
مگر یقین ہے یارو وہ دن بھی آئیں گے
یہ لوگ اپنی زباں آپ بھول جائیں گے
بنے گی مرثیہ خواں ان پہ خود متاعِ سخن

تمام دعوے خلوصِ زباں کے بے جا ہیں
زبان کیلئے یہ لوگ کرتے ہی کیا ہیں

——— سانیٹ

ناز قادری

کربِ احساس

یہ سُبک گام ہوائیں، یہ فضائے خاموش
دُور تک پھیلے ہوئے غم کے گھنیرے سائے
اور ماحول کے چہرے پہ اُداسی کی لکیر
چاندنی رات، در و بام کے ہونٹوں پہ سکوت
تیرے گُریزِ تبسّم کی ضیا ہو جیسے
کوئی آہٹ، کوئی آواز، نہ کوئی نغمہ
دفعتہً ———
میری تخئیل میں جل اُٹھے ہیں یادوں کے چراغ
لوحِ خلوت پہ اُبھر آئے ہیں مدّھم سے نقوش
(اپنے سینے میں چٹکتی ہوئی کلیوں کی قسم)
فرشِ احساس پہ رقصندہ ترا پیکرِ ناز
سطحِ دریا پہ ہو عکسِ مہ و انجم جیسے
تیرے ہونٹوں پہ مچلتے ہوئے نغماتِ نشاط
موجِ دریا کا فسوں جاگ رہا ہو جیسے
(عنبریں زلف، ضیا بار تبسّم کی قسم)
دلِ مجروح میں کیسی یہ چبھن ہوتی ہے
چشمِ نمناک میں کیسی یہ جلن ہوتی ہے
شبِ ہجراں کی سُلگتی ہوئی تنہائی میں
جب ترے قُرب کا احساس ہُوا کرتا ہے ▲

شہاب دائروی

لکشمی

لالہ سونا رام اپنے کمرے میں بستر پر چت لیٹے ہوئے تھے۔ ٹیبل لیمپ کی ہلکی روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی اور لکشمی ان کے سینے سے چمٹی کہہ رہی تھی ــــــ

"کتنی بے پناہ چاہت کا تم مجھ سے اظہار کرتے ہو، منہ سے چومتے ہو، دل سے لگاتے ہو لیکن تم ہو بڑے مطلبی لالہ، نہایت بے شرم مجھ سے کتنے بڑے بڑے کام لیتے ہو، اب میں تم سے منہ پھیر لوں گی ــــــ"

"نہیں، نہیں لکشمی ــــــ" لالہ جی تڑپ اٹھے۔ "تمہارے بغیر میں جی نہیں سکتا ــــــ"

"بڑے شاطر ہو لالہ، تم نہ لیڈر ہو نہ کسی ریاست کے وزیر، پھر بھی کتنی صفائی سے اتنا شاندار جھوٹ بولتے ہو کہ میں دنگ ہوں۔ کھاؤ میری قسم، کیا تم نے پہلے یہی باتیں اپنی بیوی پارو سے نہیں کہی تھیں ــــــ؛ پھر تمہارا جب چلن بدلا، رم اور وسکی کے تم عادی ہوئے اور تمہاری ہر نئی رات نئی زلفوں کی خوشبو میں گذرنے لگی تو پارو تمہارے چلن سے تنگ آکر اپنے میکے چلی گئی اور اس کے جانے کے بعد بھی تم کس شان سے کار کو اڑاتے اور پائل کی جھنکاروں میں گم جیتے ہو ــــــ" لکشمی نے کہا ــــــ "میں تم سے منہ پھیر لوں گی جب بھی تم زندہ ہی رہو گے ــــــ"

"تمہیں پاکر میں پارو کی جدائی کا غم کیا کرتا ــــــ" لالہ جی جذباتی ہوگئے۔ "پہلے صرف پارو سے میری ویران زندگی میں روشنی ہوئی تھی لیکن جب تم میرے قریب آئیں تو میں نے جانا کہ تمہاری خوبصورتی اور عظمت کے آگے پارو کی کوئی حیثیت نہیں تھی ــــــ میں نے تمہارے قرب سے وہ نشہ پایا کہ میری زندگی جھوم جھوم اٹھی، ہزاروں آرزوئیں جو داغ بن کر میرے دل پر جمی ہوئی تھیں۔ پوری ہو کر سب مٹ گئیں، اپنے سارے غموں کو بھول گیا، اب اگر تم منہ پھیر لو گی تو میں مان بھی لوں کہ جیتا ہی رہا پر تم نہ ساتھ ہو گی تو زندگی کیا ہوگی ــــــ؟"

"یہی جو پہلے تھی ــــــ" لکشمی نے کہا ــــــ "زندگی کی رفعتوں پر پہونچ کر شاید اپنی زندگی جو تمہاری پہلے تھی بھول گئے ہو، پر سوچو لالہ کہ تمہاری زندگی پہلے کیا تھی ــــــ ساٹھ روپے پر تم ایک دوکان میں ملازم تھے، نہ اچھا لباس تھا تمہارا، نہ اچھی غذا تھی تمہاری، بس زندگی جیسے گھسٹ رہی تھی کشمکش سے بڑے پریشانیوں سے دبی ہوئی، مجھے جب بھی جہاں بھی تم دیکھتے تھے بس دیکھتے ہی رہتے تھے، مجھے پانے کے لئے کتنے پریشان تھے تم، پھر ایک دن ریس کے میدان میں تمہاری اداسی دیکھ کر میں تمہارے قریب ہوگئی تھی یاد ہے تمہیں لالہ ــــــ"

"تم بھی کبھی کبھی کتنا نرالا سوال کر بیٹھتی ہو لکشمی ــــــ" لالہ جی ہنس پڑے۔ "میں لاکھ برا سہی، پر اتنا بھی برا نہیں ہوں کہ اپنے محسن سے اہم ملاقات کی بات بھول جاؤں، کتنی بار میں تم سے اعتراف کر چکا ہوں کہ میں اپنی گھسی پٹی گذری ہوئی زندگی پر ایک نظر

ڈالتا رہوں۔"

"صرف اس خیال سے کہ تم خود کو پہچانتے رہو ۔۔۔۔!"

"تو کیا میں خود کو بھولتا جا رہا ہوں ۔۔۔۔؟"

"بڑی تیزی سے لالہ ۔۔۔۔" لکشمی نے کہا۔ "پہلے تم کتنی لگن سے سوتے جاگتے رام کا نام لیتے تھے، روز صبح سویرے اشنان کر کے رامائن کے اشلوک سے اپنے من کو شانتی اور اُجالے سے بھرتے تھے، لیکن اب میری سوگند کھا کر بولو ایک بار بھی رام کا نام تم لیتے ہو، کبھی بھول کر بھی تمہیں رامائن کے اشلوکوں میں جھانکنے کا خیال آیا ۔۔۔۔؟"

"میں تمہاری سوگند جھوٹ کیوں کھاؤں ۔۔۔۔" لالہ جی نے کہا۔ "مانا کہ اب میں رام کا نام نہیں لیتا، یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ رامائن نہیں پڑھتا، لیکن یہ تو تم بھی جانتی ہو کہ دیا دھرم کے کاموں میں دل کھول کر مدد کر کے رام کے حکم کا پالن کرتا ہوں ۔۔۔۔"

"بڑے سیانے ہو لالہ۔" لکشمی نے کہا۔ "مجھے بھی تم سیدھے سادے لوگوں کی طرح فریب دینا چاہتے ہو، کیا میں نہیں جانتی کہ دیا دھرم کے نام پر تم نے وہیں وہیں کچھ دیا، جہاں جہاں تمہیں کچھ پانے کی اُمید تھی، قحط میں تم نے بھوکوں کو روٹی دے کر ساہوں کی پرمٹ لی سیلاب زدہ کا سہارا بن کر ایک صوبے میں گیہوں کے گودام پر اپنا قبضہ جما لیا ۔۔۔۔"

"ہاں، میں جانتا ہوں، تمہاری نگاہ میں دنیا کا سب سے بڑا پاپی ہوں ۔۔۔۔" لالہ جی جھلا گئے۔

"جھلاتے کیوں ہو لالہ ۔۔۔۔" لکشمی تن گئی۔ "میں پارو نہیں جو تمہارا رعب برداشت کر لوں ۔۔۔۔"

"بھلا میری مجال ہے کہ میں تم پر رعب جماؤں ۔۔۔۔" لالہ جی موم کی طرح نرم ہو کر بڑے پیار سے بولے۔ "میں تو تمہارا داس ہوں لکشمی، کہاں روپا کہاں تم، تمہارا اُس سے کیا مقابلہ ۔۔۔۔"

"بس سرد پڑ گئے۔ لالہ، جھلاتے بھی ہو اور داس بھی بن جاتے ہو ۔۔۔۔" لکشمی نے کہا۔ "تمہیں میں نے بہت اچھا آدمی سمجھا تھا، تم پر بھروسہ کیا تھا لیکن تم بہت بُرے نکلے ۔۔۔۔ سو فیصدی بُرے ۔۔۔۔"

"جو بھی ہوں تمہارا ہوں ۔۔" لالہ جی نے کہا۔ "تمہیں تو سینے سے ہر دم لگائے رہتا ہوں ۔۔۔۔، رتی برابر بھی تم نے میری چاہت میں کبھی کمی نہیں پائی ہوگی ۔۔۔۔"

"کافی چالاک ہو تم لالہ ۔۔۔، میں خوب جانتی ہوں کہ تم ایسی غلطی کبھی نہیں کرو گے ۔۔۔" لکشمی نے کہا۔ "لیکن جس جس ڈھنگ سے تم مجھے پہچانتے ہو ۔۔، کبھی گناہ کی دیوی کا روپ دے کر ۔۔۔، کبھی لالچ کی پری بنا کر، میں تنگ آ گئی ہوں ۔۔۔ ذلت میں اٹھاؤں: عزت تمہیں ملے ۔۔۔۔، رسوا میں ہوں ۔۔۔۔ شہرت تم پاؤ ۔۔۔۔ ایسی محبت مجھے نہیں کرنی ۔۔۔۔"

"آج تم دل توڑ دینے والی ایسی اُکھڑی اُکھڑی باتیں کیوں کر رہی ہو لکشمی ۔۔۔۔" لالہ جی نے کہا۔ "کس کمینے نے تمہیں مجھ سے بدظن کر دیا ۔۔۔۔"

"خود تم نے لالہ ۔۔۔۔" لکشمی نے کہا۔ "سوچو تم کہاں کہاں مجھے بھیجتے ہو ۔۔۔، کبھی کسی کلرک کے پاس اُس کی خوشنودی کی خاطر کبھی کسی حاکم کے پاس اُس کا ایمان خریدنے، تم نے مجھے لکشمی سے ہرجائی بنا دیا لالہ ۔۔" لالہ جی خاموش تھے ۔۔، لکشمی پر ان کے ہاتھ کی گرفت سخت ہو گئی ۔۔، اور دل تیزی سے دھڑک رہا تھا ۔۔۔۔

"تمہاری گرفت خواہ کتنی ہی سخت ہو لالہ پر جب میں نے جانے کا فیصلہ کر لیا تو تم مجھے کیا روک سکو گے ۔۔" لکشمی نے کہا ۔۔ "میں جانتی ہوں کوئی اپنے عیش و نشاط کو چھوڑنا پسند نہیں کرتا، تم بھی نہیں کرو گے لیکن میری ٹھوس حقیقت کے آگے تم مٹی کے کھلونوں سے زیادہ نہیں جو بنتے اور ٹوٹتے ہیں ۔۔۔۔، ہم نے بھی تمہیں بنا کر توڑ دیا لالہ۔"

"کیا بکتی ہو لکشمی ۔۔" لالہ جی بے چین ہو گئے۔

(باقی صفحہ ۔۔ پر دیکھئے)

حبیب الرحمٰن راہی

اب کوئی راہنما اور نہ رہبر مانگے
قدمِ شوق تو احساس کی ٹھوکر مانگے

جن کی دیواریں تھیں کمزور، شکستہ چھپّر
سرپھری تیز ہواؤں نے وہی گھر مانگے

سازشِ قتل میں بھرنے کیلئے رنگِ خلوص
ان اندھیروں نے اُجالوں سے ہی خنجر مانگے

ہائے اس بھولے سے مہمان کی تقدیر کہ جو
شب بسر کرنے کو صیّاد سے بستر مانگے

مجھ کو بہلانے کی کوشش نہ کرو، چارہ گرو
زخم ایسا ہے جو مرہم نہیں نشتر مانگے

ہم نے تاریک خلاؤں میں اُنھیں پھینکدیا
روزنِ وقت کے شیشوں نے جو پتھر مانگے

اب تو وہ زہرہ جبیں جانِ غزل اے راہی
آتشِ فکر سے چمکا ہوا جھومر مانگے

▲

محمد منشاء الرحمٰن خاں منشا

نفس نفس ہر اب مشکبار جیسا ہے
مہکتے زخموں کا عالم بہار جیسا ہے

متاعِ غم سے نوازا ہے آپ نے جب سے
مزاج دل کا کسی شہریار جیسا ہے

جگر میں ہوتی ہے رہ رہ کے اک عجیب خلش
پرانی یادوں کا سایہ بھی خار جیسا ہے

ہم ایسی چشم کو قاتل کہیں تو کیسے کہیں
سلوک جس کا بظاہر تو پیار جیسا ہے

ترس رہی ہیں نگاہیں حسیں اُجالوں کو
رخِ سحر پہ ابھی کچھ غبار جیسا ہے

تڑپتے جسموں کے انبار ہیں ہر جانب
تمہارے شہر کا منظر بھی دار جیسا ہے

وہ ہونگے اور قیامت سے جو ڈریں منشا
ہر ایک دن ہمیں روزِ شمار جیسا ہے

▲

مقالہ

ڈاکٹر نورالسعید اختر

شاہ تراب چشتی کی ایک غزل

شاہ تراب کی نصف درجن سے زیادہ شعری تخلیقات ہیں۔ اُن کی ایک تصنیف "من سمجھاون" کو حیدر آباد سے ڈاکٹر سیّدہ جعفر نے ۱۹۶۴ء میں اور بمبئی سے ڈاکٹر عبدالستّار دلوی نے ۱۹۶۵ء میں بسیط مقدّموں کے ساتھ مرتّب کرکے شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر سیّدہ جعفر نے اپنی مرتّبہ "من سمجھاون" کے مقدمہ میں شاہِ تراب کے حالاتِ زندگی اور اُن کی تصانیف پر تفصیلی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ جہاں تک حقائق کی تلاش و جستجو اور شاہ تراب کی سیرت و سوانح سے متعلق ڈاکٹر صاحبہ کی تحقیق کا تعلّق ہے۔ وہ بقول پروفیسر مسعود حسین خان اہل نظر کی خدمت میں ایک ادبی تحفہ اور علمی چیلنج ہے۔[1] جسے قبول کرنے میں کوئی امر مانع نہیں۔

البتّہ ڈاکٹر سیدہ جعفر صاحبہ نے شاہ تراب کی غزل گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے اُس ضمن میں مضمون نگار کو کچھ اختلاف ہے۔ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کے کتب خانے میں ایک ایسا مخطوطہ موجود ہے جس میں شاہ تراب کی بیشتر منظوم تصانیف درج ہیں۔ اس مجموعہ میں شاہ تراب کی "من سمجھاون"، گنج الاسرار (دراصل یہ گیان سروپ ہے جو شاہ تراب چشتی کی تصنیف ہے) گلزارِ وحدت از شاہ تراب، شاہ تراب کی غزلیں، قصائد، نظم خاندانِ چشتیہ از شاہ تراب، اپدیش حسینی از شاہ تراب چشتی کے علاوہ شاہ تراب چشتی کے پیر و مرشد کا کلام بھی درج ہے۔ اس مخطوطہ میں چند دوسرے رسائل بھی موجود ہیں۔ شاہ تراب کی تصانیف کے سلسلے وار نمبر ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶ ہیں۔

ڈاکٹر سیّدہ جعفر نے اپنے مقدمہ میں شاہ تراب کی غزل گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "شاہ تراب کی غزلوں میں بڑی سلاست، بے ساختگی اور آمد نظر آتی ہے۔ ہندی شاعری کی طرح عورت کی زبان میں جذباتِ عشق ادا کرنے کا یہ انداز ملاحظہ ہو۔"[2] اس اقتباس کے بعد ڈاکٹر سیّدہ جعفر صاحبہ نے اپنے دعوے کو مدلّل بنانے کے لئے جو غزل پیش کی ہے اُس کے پہلے تین اشعار مضمون نگار کی تحقیق کے مطابق شاہ تراب کے نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں ان اشعار کی قرأت بھی دُرست نہیں ہے۔ مضمون نگار کو اپنے علی گڑھ کے سفر کے دوران انجمن کے کتب خانے سے نہ صرف شاہ تراب کی اسی بحر اور زمین میں پوری غزل دستیاب ہوئی ہے۔ بلکہ اس سلسلے میں ایک نئی بات بھی معلوم ہوئی اور وہ یہ کہ شاہ تراب نے یہ غزل شاہ صادق اورنگ آبادی کی غزل کے جواب میں کہی تھی۔ متذکرہ بالا مخطوطے میں جہاں شاہ تراب کے قصائد نقل ہوئے ہیں۔ اس کے فوراً بعد شاہ تراب نے اس راز کو "الف" ردیف کے قصیدے کے آخری اشعار میں فاش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

غزل سُن شاہ صادق کا سمندِ طبع نے میری　　کیا جولان در صحن جوابِ غزل خوشتر کا

(قصیدہ از شاہ تراب۔ ردیف الف)

---

[1] "من سمجھاون"، شاہ تراب، مرتبۂ ڈاکٹر سیّدہ جعفر، پیش لفظ از ڈاکٹر مسعود حسین خان۔ ص: د

[2] "من سمجھاون" از شاہ تراب۔ مرتبہ، ڈاکٹر سیّدہ جعفر۔ ص: ۸۳

اِس قصیدے کے مقطع کے بعد شاہ تراب نے شاہ صادق[1] اورنگ آبادی کی پُوری غزل پیش کی ہے۔ مضمون نگار نے غزل کو صحیح قرأت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ گو کہ اِس غزل میں شاہ صادق کا تخلص موجود نہیں ہے۔ لیکن مندرجۂ بالا اشعار سے اِس کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

غزل شاہ صادق

رین کوں لے بات دل کا دیا سجن کوں ڈھونڈنے[1] چلی چلی جی
سجن سجیلا نظر پڑا کہیں[2] ہر یک کوں پوچھی گلی گلی جی

کسی نے ہرگز نہ مجکوں بولا اری دیوانی یدھر[3] کیا ہے
ایسے کُرڈا[4] پی کوں دیکھ ناسکا انپس میں اپی گلی گلی جی

پرت کا پہڑ کا لگا کے دھڑ کا تپ بخاری پُولا سُٹا ہے
اگن کی سوسّاں کوں سوس ناسکا پکارتی ہوں جلی جلی جی

ہوا ہے جل کر کباب تمنے میرے کلیجے کا حال دیکھو
سجن کے پیچھے ہو کر دیوانی رتی رتی کر تلی تلی جی

اتا تو میرا علاج ہرگز رہا نہیں ہر سکیاں پرت میں
ادل لگن سون لگا کے دل کوں پڑا اپنے ہاتاں ملی ملی جی

ادسی کُرڈا پی کوں دیکھ ناسکا ہتی[11] ساتن بتی[12] ہوا یوں
فراق یوسف منی زلیخا کی جیو جوانی ڈھلی ڈھلی جی

یہاں تلک میں ہوئی ہوں ڈبلی سرو کے نمنے ..... کر
سکھیاں کے باتاں کی باؤ لگتی ڈلڈل ہلی ہلی جی[13]

چمن چمن سب کُہلے سنے سون خبر نئیں چولی کا بند ٹٹیا تو
پیا پیا کر پہری دیوانے بھنور نمن میں کلی کلی جی

ڈاکٹر سیدہ جعفر نے "من سمجھاون" کے صفحہ ۸۳ کے آخر میں دو اور صفحہ ۸۴ کی اِبتداء میں جو پہلا شعر نقل کیا ہے وہ اشعار شاہ صادق اورنگ آبادی کے ہیں۔ اِن اشعار میں حسب ذیل اختلاف ہے ــــــ

اشعار شاہ صادق از مجموعہ کلام شاہ تراب	اشعار شاہ صادق از "من سمجھاون" ص ۸۳
(۱) رین کوں لے بات دِل کا دیا سجن کوں ڈھونڈنے چلی چلی جی	۱۔ رین کوں لے بات دِل کا شمع پوکارتی ہوں جلی جلی جی
سجن سجیلا نظر پڑا کہیں ہر اک کوں پوچھی گلی گلی جی	سجن سجیلا نظر میں کر کر ہر اک کوں پوچھی گلی گلی جی
۲۔ پرت کا پہڑ کا لگا کے دہڑ کا تپ بخاری پولا سٹیلا ہے	۲۔ پرت کا بھڑ کا لگا کے دھڑ کا تپا تو زاری پولا سٹیا ہے
اگن کی سوساں کو سوس ناسکا پکارتی ہوں جلی جلی جی	اگن کی سوساں کوں سوس نہ سکا پوکارتی ہوں جلی جلی جی
۳۔ چمن چمن سب کُہلے سنی سون خبر نئیں چولی کا بند ٹٹیا تو	۳۔ چمن چمن سب کھلے سنی ہوں خبر نہیں ہے پیا گیا ہے
پیا پیا کر پہری دیوانے بھنور نمن میں کلی کلی جی	پیا پیا کہہ پہری دیوانی بھنور کے نمنے کلی کلی جی

۱؎ سہ ماہی اُردو، جنوری ۱۹۹۶ء، مضمون از محمد اکبرالدین صدیقی۔ صفحہ ۸۶-۸۷۔ اور "تحریر": مرتّبہ مالک رام۔ شمارہ ۱۰۔

۱۔ ڈھونڈنے، ۲۔ کہیں، ۳۔ اِدھر، ۴۔ سنگرل، ۵۔ فضول، ۶۔ لاشا ہے۔ کرڈالا ہے۔ ۷۔ تکالیف، ۸۔ سوس نا برداشت کرنا۔ ۹۔ سیکھ، ۱۰۔ اندر، ۱۱۔ ہاتھی، ۱۲۔ بتی، ۱۳۔ پورا شعر غیر واضح۔

شاہ صادق کی غزل کے بعد شاہ تراب نے اپنی غزل یوں پیش کی ہے۔ اِس غزل کے ساتویں شعر میں اِس امر کی طرف اِشارہ بھی موجود ہے کہ اُنھوں نے غزل جواب میں کہی ہے۔ پوری غزل ملاحظہ ہو ؎

۱۔ کرے جو باتاں میری پرت کے چمن کے بلبل کلی کلی جی
کئے گریباں کو چاک اپنے مرا گود کہ سن کلی کلی جی

۲۔ تدانتی ہرگز ہے نیں ہر انکھیاں میں میری..... اوچرے
جدانتی صورت پیا کی اگر میری نین میں سَلی سَلی جی[1]

۳۔ دوتیاں نے مجکو بُری بُری کر تمام عالم میں شور[2] پاریاں
بہت اہو لا میرا بجن ہے بُری کون کھتا بَھلی بَھلی جی

۴۔ ہوا ایکار ایہی جہاں میں تجھ سے تن کون لجا[5] دیوانے
بِرہ (برہ) میں پیو تو برھنی ہو جگر میں غم کے دَلی دَلی جی

۵۔ ستی ستی کر کتے سو لوگاں ستی میں مجھ میں بُرا ہے انتر
مرا گود کہ سن ستی نے سر دھن نا تاب لا کر تلی تلی جی

۶۔ جو کوئی ثابت قدم رکھا ئیں برے پیا کے پرت کے درمیاں
اوسی تو مجلس میں عاشقاں کی پکار تے سب للی للی جی

۷۔ کرو یو فریاد کس تے جا کر جو مجھ جلی دِل کا داد دیوے
غزل یو میرا پکار تا ہے جواب خاطر دلی دلی جی

۸۔ تیا اشارت سوں بولتے ہیں سگل محباں تراب کے تئیں
قبر سوں اپنے اُوٹھیگا کھتا بروز محشر علی علی جی[6]

اب شاہ تراب کے وہ اشعار ملاحظہ ہوں جو ڈاکٹر سیدہ جعفر نے اپنے دعوے کو درست قرار دینے کے لئے "من سمجھاون"[7] میں نقل کئے ہیں ؎

۱۔ ہوا ایکار ایہی کہ جان میں تجھ سے تن کون پسیا دیوانی
برہا میں پیو کی برہانی ہو کر جگر میں غم کی دلی دلی جی۔

مضمون نگار کی حاصل شدہ غزل میں اِس شعر کا نمبر چوتھا ہے۔ مصرعۂ اولیٰ میں ڈاکٹر سیدہ جعفر صاحبہ نے "پسیا دیوانے" صحیح نقل کیا ہے۔ اِس سے شعر کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ البتہ مصرعۂ ثانی میں ڈاکٹر صاحبہ نے "برہانی" نقل کیا ہے، دراصل وہ لفظ "برھنی" (مبتلائے فراق) ہے۔

۲۔ کروں میں فریاد کس تے جا جو کوئی جلے دِل کا داد دیوے
غزل تو میرا پکار تا ہے جواب خاطر ولی ولی جی

مضمون نگار کی حاصل شدہ غزل میں اِس شعر کا نمبر ساتواں ہے۔ مصرعۂ اولیٰ میں "کروں میں فریاد" کی بجائے "کرو یو فریاد" درج ہے۔ اور "جلے دِل" کی بجائے "جلی دل" رقم ہے، جو زیادہ صحیح ہے۔ کیونکہ ہندی شاعری کے اُصول کے مطابق یہ جذبات عورت کی زبان سے ادا ہوئے ہیں۔ لہٰذا "جلی دل" کی ترکیب مناسب معلوم ہوتی ہے۔

۳۔ اِتا اشارت سوں بولتے ہیں سگل محباں تراب کے تئیں
قبر سوں اپنے اُوٹھا او کہتا بروزِ محشر علی علی جی

مندرجۂ بالا شعر میں ڈاکٹر سیدہ جعفر صاحبہ نے مصرعۂ اُولیٰ صحیح نقل کیا ہے۔ البتہ مصرعۂ ثانی میں کوئی نہ کوئی خامی باقی رہ گئی ہے۔ مضمون نگار کی دستیاب شدہ غزل کا مقطع دیکھئے ؎

تیا اشارت سوں بولتے ہیں سگل محباں تراب کے تئیں
قبر سوں اپنے اُوٹھیگا کھتا بروز محشر علی علی جی ▲

۱۔ تب سے ، ۲۔ جب سے ، ۳۔ سلنا ، کھلنا ، ۴۔ شور پاڑنا۔ ڈھنڈورا پیٹنا۔ ۵۔ ؟ ۶۔ دلنا۔ پیسنا۔
۷ "من سمجھاون"، شاہ تراب۔ مرتبہ، ڈاکٹر سیدہ جعفر۔ مقدمہ ص ۸۴

قطب سرشار

اُن کا جیون

اُن کا جیون
اور اُن کے جیون کا ملبوس
لمحوں کا پُر ہول کھنڈر ہے
لمحوں کے پُر ہول کھنڈر میں
دُھندلے دُھندلے، سہمے سہمے
پژمُردہ افسردہ چہرے
خائف بے حِس
بے بس پیکر
تاریکی کھا کر جیتے ہیں
پھر ظلمت کی چادر تان کے سوجاتے ہیں
اور ــــــــ
خوابوں کی تاریکی میں
سُورج کی آشائیں لے کر
رنگینی میں کھو جاتے ہیں ــــ !!!

▲

خالد شفائی

اے فطرتِ آزاد!

کبھی کبھی
میرے دِل میں لیتی ہے چُٹکیاں سی
یہ آرزُو
کاش!
مَیں بھی خانہ بدوش ہوتا
تمام رسموں، سبھی رواجوں کو
چھوڑ دیتا
مَیں توڑ دیتا
خود اپنے پیروں کی بیڑیوں اور بندشوں کو
نکل کے اِس شہرِ علم و تہذیب کی فضا سے
مَیں گھُومتا پھرتا
کوہ دَر کوہ، دَشت دَر دَشت، وادی وادی
مَیں گھُومتا پھرتا
قریہ دَر قریہ، کُوچہ دَر کُوچہ، گلیوں گلیوں
ہر ایک قدغن سے
اور پابندیوں سے
پاکر نجات
فطرت کی گود میں
مُسکراتا رہتا
اور ایک آزاد زندگی کے
حسین نغمات
گاتا رہتا!

▲

شاعر بمبئی

ظہیر نیازی

گناہ اور سزا

نوٹ:- عام طور پر لوک کہانیوں کے ساتھ اصل مصنفین کا نام نہیں ہوتا۔ اس کہانی کے ساتھ بھی یہی بات ہے۔ (ظہیر نیازی)

رانی تین سال سے بیمار پڑی تھی۔ اس کے بچنے کی امید نہ تھی۔ زندگی کی آخری گھڑیوں میں اُس نے اپنے شوہر کو تن اور شوہر کی داشتاؤں کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ خاص طور پر ۱۹ سالہ حسینہ یوکیکو کے بارے میں! - رانی کی خواہش کے مطابق راجہ کے حکم سے یوکیکو رانی کے روبرو پیش کی گئی۔

"تم آ گئیں یوکیکو! بہت خوب! میرے اور قریب آؤ پیاری لڑکی!"۔ رانی نے بڑے پیار سے اسے مخاطب کیا۔ دیکھو میری آخری گھڑی آ پہنچی ہے۔ میں سمجھتی ہوں راجہ کے لئے تم سے زیادہ وفادار کوئی دوسری ہستی نہیں ہو سکتی۔ میری آخری خواہش ہے کہ مرنے کے بعد میری جگہ تم ہی سنبھالو! راجہ بھی تمہیں چاہتے ہیں، ہزار گنا زیادہ! وہ بھی تمہیں ہی رانی بنانا چاہیں گے ..... اور میرا تم سے یہی کہنا ہے کہ تم راجہ کو آج جس طرح ٹوٹ کر چاہتی ہو، میرے مرنے کے بعد اس سے زیادہ ہی پیار کرنا .... !"

"رانی صاحبہ! کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" یوکیکو نے کہا۔ "مجھے یوں خوابوں کے جزیرے میں نہ بھٹکایئے۔! کہاں راجہ! کہاں میں مفلس و نادار!"

"یوکیکو ڈیر!" رانی نے بڑی سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔ "اس وقت ہمیں ایک دوسرے سے سچ بولنا چاہئے۔! میرے بعد راجہ بھی تمہیں ہی اپنی ملکہ بنائیں گے اور میری بھی یہی دلی خواہش ہے .... آہ! میں ایک بات تو بھول ہی گیا۔ ایک زحمت گوارا کرو گی یوکیکو میرے لئے؟ ..... تمہیں معلوم ہے نا۔ دو سال قبل ہم نے پہاڑی علاقے سے ایک مخصوص چنار کا درخت منگوایا تھا۔ جس میں دو قسم کے پھول کھلتے ہیں۔ سنا ہے اس بار اس چیری میں خوب پھول آئے ہیں ..... وہ پھولوں سے لدا ہوا ہے میں مرنے سے پہلے اسے پھولوں سے لدا ہوا دیکھنا چاہتی ہوں۔ یوکیکو! تم کسی طرح مجھے باغیچے تک لے چلو اور مجھے وہ چیری دکھلاؤ۔ ابھی، فوراً چلو یوکیکو! فوراً،! اب میرے پاس وقت نہیں رہا۔ کچھ سوچو نہیں۔ مجھے اپنی پیٹھ پر ہی بٹھالو ڈیر! ....."

اور رانی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔!

یوکیکو ہکا بکا! وہ کیا کرے؟ سمجھ نہ پا رہی تھی۔ تبھی راجہ نے سر ہلا کر اسے اشارہ کیا کہ وہ رانی کو باغ میں لے جائے۔ یوکیکو نے پلنگ کی طرف پیٹھ کر دی اور کندھے کانی جھکا دیئے! یکایک رانی میں نہ جانے کون سی غیبی طاقت عود کر آئی کہ وہ اچھلی۔ اُس کے کندھوں پر چڑھی اور سوار ہو گئی۔ آگے آتے ہوئے اُس کے ہاتھ یوکیکو کے سینے پر سے سرک کر اُس کے پستانوں تک پہنچ گئے اور اُس کے پستانوں کو اُس نے کس کر پکڑ لیا۔ اچانک وہ خوفناک ہنسی ہنستی ہوئی چیخی۔ "بس میری خواہش پوری ہو گئی۔ میں

ہاں پیچھے میں کھلے چیری کے پھول نہیں، ان ہی بدمست شباب چیری کے پھولوں کو پانا چاہتی تھی۔ بھلا میں اپنی زندگی کی آخری واحد اور حسین ترین خواہش کو پورا کئے بغیر مر سکتی تھی؟ آہ جوانی کی مستی سے بھرپور ان جوان پھولوں کو چھونے میں کس قدر لطف آرہا ہے۔ کتنی اچھوتی لذت ... " اتنا کہہ کر رانی یوکیکو کے کندھوں پر آگے جھکی اور مر گئی۔

نوکروں نے یوکیکو کے کندھوں سے رانی کو نیچے اتار کر لٹانا چاہا تھا۔ مگر اُن کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ رانی کے سرد مردہ ہاتھ یوکیکو کے پستانوں سے چپک کر رہ گئے تھے۔ اور انہیں کسی طرح بھی الگ نہ کیا جا سکا۔ ڈاکٹروں کو بلایا گیا۔ کوئی کچھ کر نہیں پایا۔ یوکیکو خوف و دہشت کے مارے بیہوش ہو گئی۔ اگر ہاتھ پستانوں سے الگ کھینچے جاتے تو جلد سے خون رسنے لگتا۔ اخیر میں ایک ڈچ سرجن کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اس کی بھی سمجھ میں جب کچھ نہ آیا تو اُس نے رانی کے ہاتھ کلائی پر سے کاٹ دیئے۔ رانی کا بھاری بھرکم جسم یوکیکو سے الگ ہو گیا۔ لیکن اُس کی ہتھیلیاں اُس کے پستانوں سے چپکی ہی رہیں۔ ہاتھ کالے پڑ گئے، سوکھ گئے، لیکن پھر بھی وہ زندہ تھے اور یوکیکو کے پستانوں سے چپکے ہوئے رہے۔ !

پھر آگے چل کر ایسا ہوا کہ یہ کالے ہاتھ ڈراؤنے مکڑے کی ٹانگوں میں بدل جاتے ہیں۔ اور پستانوں پر اُدھم مچاتے! درد اور تکلیف سے یوکیکو کراہتی، چیختی رہتی!

آخر یوکیکو نے بال کٹوا دیئے اور بدھ بھکشوؤں میں شامل ہو گئی۔ ایک تختی پر لکھا ہوتا۔ "دعا کرو کہ میری رانی کی روح کو سکون ملے" لیکن اس تختی کو مستقل ساتھ رکھنے اور دعاؤں کی بھیک مانگنے اور خود بھی عاجزی سے گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں کرنے سے بھی کچھ حاصل نہ ہوا...... رانی مرحومہ کے خوفناک مکڑے کی ٹانگ جیسے ہاتھ اُسے نہ جانے کس گناہ کی پاداش میں کڑی سے کڑی سزا دیتے رہے...! اور سزا کی یہ طویل میعاد سترہ سال تک برقرار رہی۔ آخر وہ سترہ سال بعد کہیں چلی گئی۔ شاید درد ناک سزا سے نجات کی تلاش میں..... پچھلے تین برس سے اُسے وہاں کسی نے نہیں دیکھا! (غیر مطبوعہ)

بقیہ افسانہ "تخلیق" صفحہ ۴۰

پھر اجمل ہم دونوں کی محبت کے اُفق پر پہلی شب کے چاند کی طرح طلوع ہوا۔ ہم دونوں کی زندگی میں خوشیاں دُونی ہو گئیں، رخسانہ تو جیسے اجمل کی ہو کر رہ گئی۔ ہر وقت اُسی کی دیکھ بھال، ناز برداری۔ میں خود کو نظر انداز سا محسوس کرنے لگا۔ دھیرے دھیرے یہ احساس بڑھتا ہی گیا۔ اب رخسانہ کی توجہ مجھ سے زیادہ اجمل کی طرف ہوتی میرے کام کے وقت اگر وہ رونے لگتا تو میرا کام چھوڑ کر اسکو بہلانے میں مصروف ہو جاتی۔ ایسے مواقع پر مجھے جھنجھلاہٹ سی ہونے لگتی۔ اجمل کو بھی ضد تھی۔ ایسے ہی وقت پر رونے کا شوق تھا جب رخسانہ میرا کام کر رہی ہو

ایک دن میں تھکا ماندہ دفتر سے آیا تو میرا سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ اور میں بھوک سے بے چین تھا دروازہ میں داخل ہوتے ہی مجھے اجمل کے رونے کی آواز سنائی دی۔ میں گھر میں آکر خاموش لیٹ گیا اور انتظار کرنے لگا کہ رخسانہ بچے کو خاموش کرا کے میرے پاس آئے گی اور اپنی سحر انگیز اُنگلیوں سے میرا سر دبائے گی۔ اُس کے بعد ہم کھانا کھائیں گے۔ لیکن اجمل نے بھی چپ نہ ہونے کی قسم کھائی تھی۔ میں سر کے درد سے کراہنے لگا۔ بڑی دیر بعد جب وہ خاموش ہو کر سو گیا تو رخسانہ اُٹھی مگر بچہ فوراً جاگ گیا رخسانہ اٹھتی اٹھتی پھر بچے کے پاس لیٹ گئی اور مجھ سے کہہ دیا آپ کھانا کھا لیجئے۔ میں دیکھ رہا تھا وہ میرا سر دبانے اور مجھے کھانا کھلانے کے لئے بیچین بھی تھی مگر اُسے بچے اور شوہر کے درمیان فیصلہ کرنا تھا اور یہ فیصلہ بچے کے حق میں ہوا۔

تب یکایک میرے ذہن کے دریچے روشن ہو گئے اور مجھے میرے سب سوالوں کا جواب مل گیا میرے ذہن نے کہا "حُسن معاشی تحفظ، مردانگی اور شجاعت سب سطحی چیزیں ہیں۔ عورت تو خالق ہوتی ہے۔ اُس کی سب سے بڑی آرزو، تمنا اور خواہش تخلیق ہوتی ہے اور صرف اسی کے لئے وہ مرد کی مرہون منت ہوتی ہے۔ مرد کی اہمیت اور ضرورت اُس کے لاشعور میں اتنی ہی ہوتی ہے جتنی ایک مصنف کے لئے قلم، ایک مصوّر کے لئے برش اور سنگتراش کے لئے چھینی کی ضرورت"

طنز و مزاح

پرنسپل محمد عاقل علی خاں

سالانہ جلسے

اگر کسی پیشہ ور اسیاست کار نے اپنی پیشہ ورانہ "پیداآور مصروفیات" کی بنا پر کسی جلسہ کی صدارت سے انکار کر دیا ہو اور کوئی ایسا با اقتدار فرد جو طویل اور بے ربط تقریریں جھاڑنے میں قابلِ رشک مہارت رکھتا ہو، منتظمین جلسہ کے لئے آسانی سے قابلِ حصول نہ ہو تو مجبور اور بے بس ہو کر وہ واقعی علمی آدمیوں کی طرف سے ملتجی نظریں اٹھاتے ہیں۔ اُن میں سے کسی ایک کو اشاعتِ علم کا واسطہ اور روز افزوں "عالمانہ جہالت" کی دہائی دے کر جلسہ کی صدارت یا مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت پر راضی کر لیا جاتا ہے۔

تعلیمی اداروں میں تعلیمی سال کے آخری مہینے میں ایسے جلسوں کی وبا پھوٹ پڑتی ہے تاکہ کل کے شہریوں کے دماغ میں جمہوری تربیت کی آخری کیل پوری قوت سے ٹھونک دی جائے اور وہ اپنی عملی زندگی میں اپنے علم سے کم سے کم اور ادارہ سازی اور انجمن بانی کی تربیت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں اور اس طرح انجمن بنانے اور انجمن بن جانے کے بعد عہدوں کی تقسیم سے ناراض ہو کر لڑیں اور لڑ کر اس کو توڑنے یا کم از کم دو شاخوں میں تقسیم کرنے کے فن کے مظاہرہ کے ذریعہ قوم کی خدمت انجام دے سکیں۔ کیونکہ یہ جمہوریت کا زمانہ ہے جس میں آثارِ کہن کو توڑنے اور بنیادِ نو کو خام سے خام تر طریقے پر رکھنے کی شدید ضرورت پڑتی ہے۔ خام سے خام تر بنیاد کا فائدہ یہ ہے کہ آثارِ کہن ابھرنے نہیں پاتے اور زندگی میں جذباتی سیلاب و تلاطم کی ہنگامہ آرائی جاری رہتی ہے۔

جلسہ کی صدارت کے لئے اگر "مقامی" آدمی کو چنا جائے تو چاہے اُس کی واقعی قدر و منزلت کچھ ہی ہو، شرکائے جلسہ کی نظروں میں صدرِ جلسہ یا مہمانِ خصوصی کی اہمیت اور اُس کی تقریر کی افادیت نہیں ابھرتی، کیونکہ جو لعل بدخشاں میں نہ رہیں وہی "لعلِ بدخشاں" کہلاتے ہیں۔ اگر یہ مہمانِ خصوصی واقعی اور خاص طور پر مہمان بنا کر لایا جائے تو اُس کی شخصیت جراحتی تجزیئے کی خواہش اور اُس کی تقریر میں نقائص کی جستجو کا شوق مقامی مہمانوں کی تعداد میں اضافہ کر دیتا ہے۔

قومی بچت کی مہم کو قوت بخشنے کے غیر ارادی ارادہ کے ساتھ جلسہ گاہ کو مختلف قسم کے رنگین کاغذوں اور کپڑے کی جھنڈیوں سے سجایا جاتا ہے تاکہ گرمائی شام کی ہلکی ہلکی ہوا کو رنگین رکاوٹوں میں تیز روی کا جذبہ ملے اور سست فکر نوجوانوں کی نرم رفتاری اور تیز گفتاری کو تسکین حاصل ہو سکے۔ جلسہ کے آغاز سے کم سے کم گھنٹہ سوا گھنٹہ پہلے ہی سے گراموفون ریکارڈوں کی گونج ڈیڑھ دو میل کے رقبہ کو آگاہ کرنے لگتی ہے کہ سارے لوگ اپنے ضروری اور غیر ضروری کام کاج چھوڑ کر اپنے قوائے بصارت و سماعت کی آزمائش کے لئے بہ یک بینی و دو گوش اور بسر و چشم حاضر ہو جائیں۔ اس موسیقی بردوش دعوت پر مستقبلِ بعید کے شہری لبیک کہتے ہوئے جلسہ گاہ پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں ڈوبتے سورج سے آنکھیں لڑانے والے رنگ برنگی بجلی کے قمقمے شام کے دھندلکے سے کافی پہلے ہی روشن رہتے ہیں۔ کیونکہ اکثر تاریکی سے لڑتے ہوئے گل ہو جانے کی پرانی عادت ہے۔ جس کی وضع داری کو برقرار رکھنا اُن کے لئے اتنا ہی ضروری ہوتا ہے جتنا کہ وقت سے کافی پہلے اُن کو

روشن کر دینا غیر ضروری نہیں سمجھا جاتا۔

جلسہ گاہ کے بیچ میں ایک شہ نشین بنائی جاتی ہے جسے بقدرِ استطاعت روپیہ صرف کرکے اس غریب ملک کی زینت پسندی کے مظاہر اور ملک کے نوعمروں میں فہم عامہ کے استعمال اور خرچ میں کفایت شعاری کی تبلیغ کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ دو یا تین مائیکروفون ایستادہ یا نیم ایستادہ نظر آتے ہیں۔ جو اپنی ہر حالت میں ہمارے دماغی استغنا کی غمازی کرتے ہیں کہ چاہے کتنی ہی پر مغز اور معقول تقریریں اُن کے ذریعہ فضا میں گونجیں، وہ تقریر یا اور مقرر دونوں سے اپنی دیانتدارانہ غیر جانبداری کو قائم رکھتے ہوئے بُتوں کے تُون بیٹھے رہتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے اکثر نوعمر دوست بھی اس غیر جانبداری کو اپنا اہم فرض سمجھتے اور اُس کو ادا بھی کرتے ہیں۔ وقفہ وقفہ سے الگ الگ اشخاص مائیکروفون کی کارکردگی سے زیادہ اپنی آواز کی موسیقیت کی جانچ فرماتے اور اکثر ایسی باتوں کا اعلان فرماتے رہتے ہیں جو گرد و نواح کے لوگوں کو بیجا معلوم ہوتی ہیں۔ یہ ساری کیفیت ایک سماں باندھتی ہے جو اکثر میلوں، عرسوں اور جاتراؤں میں کسی چھوٹے موٹے سرکس یا جادو تماشا کے خیمہ کے آس پاس دیکھا جاتا یا جا سکتا ہے۔

جلسہ کی کارروائی کے آغاز کا وقت اپنی غیر انسانی مستعد رفتار سے قریب آنے لگتا ہے۔ منتظمینِ جلسہ میں ہل چل کا شوق زور شدت حاصل کرلیتا ہے۔ اُن کی تیز رفتاری اور بلند آہنگی اعلان کرتی ہے کہ مہمانِ خصوصی تشریف لا رہے ہیں۔ یہ بیچارہ ایک خوش پوشاک نامحرم قیدی کی طرح چند منتظمین کی فوجدارانہ نگرانی میں کسی سے بھی مانگی ہوئی موٹر میں جلسہ گاہ تک لایا جاتا ہے۔ اُس بے کار کو کارِ سرکار انجمن کے بہت سے کارندے اپنی تحویل میں لے لیتے ہیں۔ اس بیچارے کا یہ فرض ہے کہ اُس لمحہ سے لے کر جلسہ ختم ہونے تک اپنے چہرے سے تبسم کو ہٹنے نہ دے یعنی اداکاری کرتا رہے۔ اُس کی آزمائش کی پہلی منزل عکس کشی ہوتی ہے جہاں اس پر خوب پھول چڑھائے جاتے ہیں۔ سرکس کے اُس رنگ ماسٹر کی طرح جو مختلف وضع کے چھوٹے بڑے جانوروں کی سرکشی کو اپنی زبردستی سے زیر کرکے فرماں بردارانہ انداز میں بٹھا ہوا پیش کرتا اور اپنے اس کارنامہ کی داد حاصل کرنے کے لئے آپ کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بتیسی کی نمائش کرتا ہے۔ جو فوٹوگرافر اپنے جادو کی ڈبے کی اکلوتی آنکھ کھول کر اپنی گردن کے خم اور آنکھوں کی جنبش سے فخریہ انداز میں اس عارضی گروہِ اسیرانِ غلامی کا اعلان کرتا ہے۔ یہاں سے یہ مخصوص جلوس اس ہال میں داخل ہوتا ہے جہاں پیٹ بھروں کو عصرانہ تناول فرمانے کی زحمت اس لئے دی جاتی ہے کہ وہ کھانے پینے کی چیزوں میں نقص نکالیں اور اپنے خوش ذائقہ اور معزز ہونے کا ثبوت دیں۔ یہ سب کچھ ہونے تک مشینی گھڑیوں کا وقت جلسے کے مقررہ وقت سے ایک آدھ گھنٹہ ضرور نکل جاتا ہے۔ ایسے منتظر حاضرینِ جلسہ کو جنہیں عصرانے کے بجائے صرف ہوا کھانے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ گراموفون ریکارڈ بہلاتے رہتے ہیں۔ اللہ اللہ کرکے شہ نشین کی کرسیاں پُر ہوتی ہیں۔ جلسہ کی کارروائی کا آغاز کبھی کبھی ایک آدھ نظم خوانی اور اکثر نثر خوانی یعنی استقبالی تقریر سے ہوتا ہے جو اکثر لکھا کوئی اور ہے اور پڑھتا کوئی اور۔ اسی کو شاید سائنسی تیکنیک اور معاشیات کی علمی زبان میں "تقسیمِ عمل" کہا جاتا ہے۔ اگر یہ خطبہ اردو میں ہو تو نقطوں کے حضور و غیاب اور اضافتوں سے اُچھل کود، اس کی قرأت کو سمجھدار حاضرین کی تفریح کا سامان بنا دیتی ہے۔ اگر آپ قیافہ شناسی سے ذرا سا شغف رکھتے ہوں اور آپ کو اسی ہجوم میں ایک آدھ چہرہ کرب و اضطراب سے بھرا ہوا نظر آجائے تو آپ جان لیں گے کہ وہی بے چارہ اس استقبالی تقریر کا مصنف ہے جس کی گردن پر اداکار بلکہ صدا کار کا قصیدہ پڑھا جاتا ہے۔ گویا بالواسطہ یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے انداز اوصاف کو پیدا کرکے اس قصیدہ کا مستحق بنائیں یا اس جلسے کے صدرِ استقبالیہ کو مستقبل قریب میں کسی ایسے ہی جلسے کا صدر اور مہمانِ خصوصی بنا کر یہ قرض چکانے کا فرض ادا کریں تاکہ "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" کا مطلب عملی طور پر واضح ہو سکے اور شاعر کی روح کو تو ایک گونہ کر اطمینان نصیب ہو کر دنیا اُس کے مشورہ پر حسبِ مقدور عمل کر رہی ہے۔ اس بیان پر یہ پایانِ بیان ملک کے باشندوں کے افلاس سے زیادہ توانا قسم کے بار مہمانِ خصوصی

کی نازک گردن میں ڈالے جاتے ہیں اور اسی کے ساتھ جب خواتین کی چھتری کی سائز کا ایک گلدستہ انہیں پیش کیا جاتا ہے تو جلسہ گاہ میں تقریباً ہر شخص ہاتھ پیٹنے لگتا ہے جسے اخبار نویس "تالیوں کی گونج" کا نام دیتے ہیں۔ صدر جلسہ جو مجسم انکسار بنے ہوئے ایستادہ ہوتے ہیں۔ وزنی گلدستہ کی گرفت دونوں ہاتھوں سے اور مضبوط کر کے اُسے چقندر کی طرح دائیں بائیں ہلاتے ہوئے اپنی کرسی میں محجوب ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد پروگرام کا ایک نہایت صبر آزما جز شروع ہوتا ہے یعنی رپورٹ خوانی جس میں کافی اعداد و شمار پیش کئے جاتے ہیں۔ جن کی تحقیق و صداقت کا نہ تو کسی کو اختیار ہوتا ہے اور نہ تردید کی اجازت۔ اس دوران میں حاضرین جلسہ کو جماہیاں لینے کی کافی فرصت میسر آ جاتی ہے اور اکثر حضرات بازار کے بڑھتے بھاؤ یا اپنے شہر میں پانی کی قلت کی وجہ سے پیدا شدہ کربلائیت پر تبادلۂ خیال کرتے ہوئے پیمانۂ صبر پر ماتم کی رسم بھی انجام دے لیتے ہیں۔

ادھر رپورٹ ختم ہوئی اور تقسیم انعامات کا سلسلہ شروع ہوا۔ نام کے بعد اور ہر انعام یافتہ کی صدر جلسہ کی پنجہ کشی یعنی مصافحہ اور انعام نہ پانے والوں کا ہتھیلیاں کوٹنا یعنی تالیاں بجانا۔ اگر یہ ادارہ مخلوط تعلیم کا ہو جیسا کہ آج کل اکثر ادارے ہوتے ہیں تو کسی لڑکی کا نام پکارے جانے سے اُس کی اپنی جگہ واپس آنے تک مسلسل تالیوں کا شور، تاکہ خود ساختہ ماہرانِ تعلیم کے ہوش جاگیں اور کان کھڑے ہو جائیں کہ وہ تعلیم کو اس طرح خلط ملط کرنے والے نظام پر نظرِ ثانی فرمائیں اور عوام اپنی بہنوں اور بیٹیوں کی چھب کی داد دیں۔ جب انعامات کے سلسلے کی یہ زلف سر ہوتی ہے تو مہمانِ خصوصی اپنے پنجے جھاڑ جھٹک کر مائیکروفون کے آگے کھڑے نظر آتے ہیں۔ حاضرینِ جلسہ اپنا پہلو بدلتے ہیں اور صدرِ جلسہ کی الاپ دیسے سُروں میں شروع ہوتی ہے۔ اس میں صدرِ ادارہ کی نکتہ رسی کو سراہتے ہوئے اپنی ہیچمدانی کے اظہار سے اپنی ہمہ دانی کا سکہ بٹھاتے ہیں۔ اس الاپ کے بعد خیال بلمپت کئے میں آگے بڑھتا ہے۔ یہاں موضوع کی پابندی نہیں ہوتی ہے۔ اس لئے لفظی نغمہ ریزی کا مقصود حاضرین کو گدگدانا اور زودرنج کو ہر ممکن ترکیب سے ہنسانا ہوتا ہے۔ ان کی خندہ آفرینی حاضرین کے قہقہوں کو دُرت اور ترانے کی لے عطا کرتی ہے۔ ایسے موقعوں پر کی جانے والی تقریروں کی کامیابی کا معیار ہنسی کی مقدار ہی سے ہوتا ہے۔ اگر صدرِ جلسہ اپنی بدقسمتی سے کوئی با موضوع تقریر فرمانے لگیں تو بے موقع تالیوں کے ذریعہ ان کو الٹی میٹم دے دیا جاتا ہے کہ اگر وہ محاذ سے ہٹ نہ جائیں تو تالیوں کی مشین گن مسلسل حرکت میں رہے گی۔ صدرِ جلسہ نے اگر غلطی سے اس تنبیہہ کو تحسین سمجھ لیا تو سمجھئے کہ بھڑ کے چھتے پر اُس کا سر پڑ گیا۔ اور وہ ساری ریاضت جو اُنہوں نے ایک بلیغ تقریر کیلئے فرمائی تھی نہایت خوبصورتی سے ضائع ہو گئی اور انہیں کھسیانا ہوتے ہوئے اپنی کرسی سنبھالنا پڑی۔

صدرِ جلسہ کے اس طرح منظر سے ہٹ جانے کے بعد ایک اور صاحب اس پٹی ہوئی پچ پر نظر آتے ہیں۔ اُن کا خوشگوار فریضہ "شکریہ ادا کرنا" ہوتا ہے۔ اُن کے بیان کے مطابق، انہیں ادائے تشکر کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔ مگر وہ مسلسل بولے جاتے ہیں۔ لوگ اُٹھنے لگتے ہیں۔ لیکن شکریئے کے اداکار صاحب نہیں بیٹھتے۔ صدرِ جلسہ سے صفائی کے داروغہ تک ہر ایک کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے اور لوگوں کی با آواز گفتگو کے پیش منظر میں اُن کی تقریر جاری رہتی ہے۔ جلسہ کے اس حرفِ آخر کے بعد قومی ترانہ ہوتا ہے۔ بیشتر حاضرین انتشار پسندی کا مظاہرہ فرماتے رہتے ہیں۔ کچھ لوگ جو ترانہ کی وقعت کو سمجھتے ہیں، مؤدب و ایستادہ رہتے ہیں۔ لیکن انہیں ادھر اُدھر گھومنے پھرنے والوں کے دھکے بطور نمونہ حاصل ہوتے ہیں جن سے یہ سبق ملتا ہے کہ جو بھی واقعی خلوص سے قوم کی خدمت میں جُت جائے یا جُت جانا چاہے اُسے اپنے ساتھیوں کے دھکے کھانے کا حوصلہ پہلے پیدا کرنا چاہئے۔

میں نے ایسے متعدد سالانہ جلسے دیکھے ہیں اور اب ضرورت محسوس کرنے لگا ہوں کہ جس طرح زندگی کے مختلف کاروبار

(باقی صفحہ ۵۸ پر دیکھئے)

غزلیں

یعقوب راہی

کسی گلی میں دریچہ کوئی کھلا ہی نہیں
وہ کس طرح ہے مجھے اس کا کچھ پتہ ہی نہیں

کوئی پکارتا پھرتا ہے مجھ کو آخرِ شب
میں بند گھر میں ہوں چپ جیسے کچھ سنا ہی نہیں

کسی کے نام سے کل تک یہ دل دھڑکتا تھا
اور آج دل کے نگر میں کوئی صدا ہی نہیں

وہ جب بھی ملتا تھا ہنستا تھا پاگلوں کی طرح
عجیب شخص ہے کل شام وہ ہنسا ہی نہیں

ابھی ابھی وہ یہاں سے چلا گیا ہے مگر
کچھ ایسا لگتا ہے جیسے کبھی ملا ہی نہیں

چھٹیں تو کیسے چھٹیں گہری دھند کے بادل
جو کاٹتی پھرے وہ تیز رَو ہوا ہی نہیں

سلیمان خمار

تنہائیوں کے دشت میں یادوں کے قافلے
گھبرائی ہرنیوں کی طرح دوڑتے رہے

آئے قریب جب تو وہی پیڑ خشک تھے
کل تک جو لگ رہے تھے نظر کو ہرے بھرے

اک وقت تھا کہ تھی نئی راہوں کی جستجو
اب راہرو کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں راستے

دھندلا گئی ہے کہنہ چراغوں کی روشنی
آفاقِ ذہن سے نئے سورج اگائیے

اپنے نصیب میں نہیں تنہائیوں کا لطف
ہر لمحہ ساتھ رہتے ہیں تہہ دار مسئلے

سہمی ہوئی ہیں صبح کی شہزادیاں خمارؔ
شب نے اک ایک راہ پہ پہرے بٹھا دیئے

احمد سوز

خلوص و درد ہے ناپید آج سینوں میں — سکون ڈھونڈتا ہے آدمی مشینوں میں
شعورِ اہلِ نظر ہے نہ نکتہ چینوں میں — ملے ہیں کانچ کے ٹکڑے یہاں نگینوں میں
بھٹکتے ہیں یہ پتھر سے چلتے پھرتے ہوئے — نہ جوت آنکھوں میں انکی، نہ دل ہیں سینوں میں
ہمارے سر پہ فلک بھی نہیں ہے سایہ فگن — قیامت آئی ہے برسات کے مہینوں میں
سہارے پاؤں میں زنجیر ڈال دیتے ہیں — نکل کے آگ لگا دیجئے، سفینوں میں

دل و نگاہ کے زخموں کو کون سمجھے گا
پہنچ گئے ہو کہاں سوزؔ نکتہ چینوں میں

ناول

کشمیری لال ذاکر

دھرتی سدا سہاگن

چھٹا باب

اگلی صبح پنچائت کے ممبر اپنے نیتا کے ساتھ سرپنچ گاؤں سے شہر کے لئے روانہ ہو پڑے۔ گاؤں کے بہت سے مرد اور کچھ عورتیں گاؤں سے باہر اس ڈیلی گیشن کو چھوڑنے کے لئے آئے۔ عورتوں کے دیئے ہوئے زیور اور مردوں کی دی ہوئی رقم ایک تھیلے میں بند تھی جسے نیکی رام سرپنچ نے اُٹھا رکھا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے گاؤں کی ساری پونجی گاؤں سے باہر جا رہی تھی۔ چہروں پر خوشی کے بجائے سنجیدگی چھائی تھی۔ ایک بہت بڑی آزمائش تھی۔ اس میں پورے اُترے گئے تو گاؤں کا سر اُونچا ہو گیا اور اگر ہار گئے تو بڑی ہیٹی ہو گی۔

کیرتی، شیتل اور دولت ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ شیتل تو بہت سنجیدہ تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اُس کی دونوں ٹانگیں سلامت ہوتیں تو اُس میں کام کرنے دوڑ دھوپ کرنے اور حالات کا مقابلہ کرنے کی زیادہ ہمت ہوتی۔

"آپ تو بہت زیادہ سنجیدہ ہو رہے ہیں۔" کیرتی نے چلتے چلتے کہا۔

"کاش، اس بیساکھی کی جگہ میرے ہاتھ میں کدال ہوتی پھاوڑے ہوتے، ہتھوڑے ہوتے، تدبیلیں ہوتیں۔ مجھے احساس ہوتا کہ میں کچھ کر سکتا ہوں، میں بھی کسی قابل ہوں۔ ایک دم اپاہج نہیں" یہ کہتے ہوئے شیتل کی آواز میں بھر پور درد اُبھر آیا۔

"تو یہی کچھ سوچ رہے ہیں آپ ؟"

"ہاں۔ کاش تم مجھے اُس روز پنچائت کی بیٹھک میں لے جاتیں۔"

"آپ کو افسوس ہے اس کا ؟" کیرتی نے اپنی نگاہیں شیتل کے چہرے پر جما دیں۔ شیتل کو لگا جیسے وہ پگھل جائیگا۔

"ہے بھی اور نہیں بھی۔"

"یہ کوئی جواب نہیں ہے۔" کیرتی نے کہا۔

"میں خود بھی تو جواب ہی ڈھونڈ رہا ہوں۔" شیتل بولا۔

گاؤں کی آخری سیما آ گئی تھی۔ نیکی رام سرپنچ رُک گیا۔ باقی لوگ بھی رُک گئے۔ دولت کاکا کا تانگہ اور ایک بیل گاڑی کھڑی تھی۔

"شیتل، آؤ تانگے میں بیٹھو۔" نیکی رام اور دولت نے سہارا دیکر شیتل کو تانگے میں بٹھایا۔

"آپ بھی آیئے نا سرپنچ جی ؟" اُس نے نیکی رام سے کہا۔

"نہیں یہ ہمارے نیتا کا تانگہ ہے۔ اس میں صرف تم بیٹھوگے۔ ہم سب بیل گاڑی میں چلیں گے۔" یہ کہکر نیکی رام اور دوسرے پنچ گاڑی میں بیٹھ گئے۔

گاؤں کے مرد اور عورتیں سب بڑے اشتیاق سے اُنہیں دیکھ رہے تھے۔ پھر سب نے پرنام کے لئے ہاتھ اُٹھائے اور تانگہ اور بیل گاڑی دونوں چل پڑے۔

"دولت کاکا میں بھی چلوں گی اسٹیشن تک۔" کیرتی نے اچانک کہا۔

تانگہ پل بھر کو رُک گیا اور پچھلی سیٹ پر شیتل کے ساتھ کیرتی بھی بیٹھ گئی اور پھر تانگہ چل دیا اور لوگ اپنے اپنے

گھروں کو واپس ہو گئے۔

شیتل اور کیرتی دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ البتہ کبھی کبھی نظر بھر کر ایک دوسرے کو دیکھ لیتے تھے۔ دونوں کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن کہہ نہ پا رہے تھے۔

شیتل سوچ رہا تھا۔ کہ کیرتی کیوں جا رہی تھی اسٹیشن تک اُسے چھوڑنے؟ وہ دوسرے لوگوں کی طرح گھر کیوں نہیں واپس چلی گئی؟ وہ اِن نظروں سے اُسے کیوں دیکھتی تھی کبھی کبھی۔ یہ نظریں جیسے اُس کی آتما میں اُتر کر اُجالا پھیلا رہی ہیں۔

اُس کی زندگی میں اتنا زیادہ اندھیرا ہے کہ چھوٹے موٹے چراغ کی روشنی تو اُس میں ڈوب کر رہ جائے گی۔ جانے کس خیال سے اُس نے اپنی مصنوعی ٹانگ کے اوپر والے حصّے کو چھوا۔ اس میں ابھی تک زندگی تھی۔ وہ بالکل بے جان نہیں تھی۔ ابھی اُس میں زندگی کے آثار تھے۔ پھر جانے کیسے اُس کی بیساکھی ہاتھ سے چھوٹ کر راستے میں گر پڑی۔ اچھا ہی ہوا جو گر گئی۔ اب وہ پوری طرح اپاہج تو کہلا سکے گا۔ وہ سوچنے لگا۔

"دولت کاکا روکو تانگہ!" کیرتی چلّائی۔

"کیا ہوا بیٹی۔؟" دولت نے تانگہ روکتے ہوئے پوچھا۔

کیرتی نے جواب نہیں دیا۔ وہ تانگے سے نیچے اُتر کر کچھ قدم پیچھے بھاگی۔ اور بیساکھی لے کر واپس آ گئی۔

"لیجیے!"

"میرا اپاہج پن مجھے واپس لوٹا رہی ہو۔ شکریہ!"

شیتل نے بیساکھی لیتے ہوئے کہا۔ دولت بیڑی سلگا رہا تھا۔ بیڑی جلانے کے بعد اُس نے گھوڑے کی چابک ہلا دی۔ تانگہ چل پڑا۔

شیتل کے الفاظ سُن کر کیرتی کے جسم میں کپکپی دوڑ گئی۔

"میں تو آپ کا ہاتھ پکڑ رہی ہوں شیتل بابو" کیرتی نے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔

"مجھے اپاہج سمجھ کر ہی نا!" مجھ پر ترس کھا کر!"

"نہیں، رہنما سمجھ کر کہ مجھے راستہ مل جائے۔"

"کیرتی!" شیتل نے جانے کس جذبے سے اُس کا نام لیا تھا۔ کہ اُس کی آنکھیں ایک دم جھک گئیں۔

پھر کچھ دیر تک کوئی نہیں بولا۔ دونوں چُپ رہے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھا تک نہیں۔

تانگہ چلتا رہا۔

اسٹیشن قریب تھا۔ گاڑی آنے والی تھی۔

"شام کو لوٹ آیئے گا نا؟" کیرتی نے خاموشی کو توڑتے ہوئے پوچھا۔

"اگر وہیں نہ رہ گیا تو!"

یہ شخص کیسی باتیں کرتا تھا۔ جیسے اُس کے دماغ اور دل پر برف کی کوئی بڑی سی سِل رکھی تھی جو اُسے اپنے بوجھ سے کچل بھی رہی تھی اور ٹھنڈ سے بے حس بھی کرتی جا رہی تھی۔

اسٹیشن پر پہنچ کر کیرتی نے شیتل سے کوئی بات نہیں کی۔ اُس نے اپنے سسر نیکی رام سرپنچ کے پاؤں چھوئے اور انہیں گاڑی کے ڈبے میں بٹھا دیا۔ شیتل ایک کونے میں دُبک گیا۔

گارڈ نے وِسل دی۔ گاڑی اسٹیشن سے سرکی۔

سب آدمی پلیٹ فارم کو دیکھ رہے تھے۔ ایک صرف شیتل تھا جس کی نظریں ڈبے کے اندر قید تھیں۔ جیسے اُسے ڈبے کی باہر کی دنیا سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

دولت کاکا اور کیرتی پلیٹ فارم پر کھڑے تھے۔ شیتل کی اِس بے نیازی سے کیرتی کی آنکھوں میں آنسو اُبھر رہے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد دولت کاکا اور کیرتی گاؤں لوٹ گئے۔

شہر پہنچتے ہی سارے پنچ سیدھے ٹھاکر امراؤ سنگھ کی کوٹھی پر گئے۔ نوکر نے اطلاع کی۔ ٹھاکر خود باہر آ گیا۔

"ہم گاؤں کی طرف سے آئے ہیں، کنوئیں کے لئے زمین خریدنے۔" نیکی رام بولا

"خریدنے کے لئے۔ دان میں لینے کے لئے نہیں؟" ٹھاکر نے طنزاً مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں!" نیکی رام نے جواب دیا۔

"میرے پاس وقت بہت تھوڑا ہے۔ اپنا ایک آدمی

چُن لیجئے۔ جو مجھے بہت کہنے ؟ ٹھاکر نے کہا۔

سب کی نظریں شیتل پر جم گئیں جو بغل میں بیساکھی دبائے خاموش کھڑا تھا۔

" شیتل بابو ہماری طرف سے بات کریں گے ! " نیکی رام نے کہا۔ اور ٹھاکر اُمراؤ سنگھ ننگرے شیتل کو دیکھ کر مُسکرا دیا۔ سوچ رہا تھا یہ گاؤں والے کتنے جاہل تھے۔

" آپ کو آپس میں بات چیت کرنی ہو تو کرلیں اور پھر اندر آجائیں ! " یہ کہہ کر ٹھاکر اندر چلا گیا۔

نیکی رام نے زیوروں اور روپوں کا تھیلہ شیتل کے حوالے کیا۔ اور خود برآمدے سے باہر آکر ایک طرف کھڑا ہوگیا۔

اُسی لمحہ ٹھاکر کی کار پورچ میں آکر رُکی۔ ٹھاکر کو شاید جلدی ہی کہیں جانا تھا۔

نوکر سہارا دے کر شیتل کو ٹھاکر کے ڈرائینگ رُوم میں لے آیا۔ سامنے صوفے پر ٹھاکر اُمراؤ سنگھ بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا اُس نے بڑی بے نیازی سے شیتل کی طرف دیکھا اور مُسکرا کر بیٹھنے کے لئے اِشارہ کیا۔ شیتل بیٹھ گیا۔

" آپ شاید ابھی آئے ہیں گاؤں میں ؟ " ٹھاکر نے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے پُوچھا۔

" جی ہاں ــ ! "

" پہلے کہاں تھے ؟ "

" فوج میں بھرتی ہوگیا تھا۔ "

" ویر چکر لے کر آئے ہیں کیا ؟ "

شیتل ٹھاکر کی طعنہ بازی سے جل اُٹھا۔ لیکن جواب اُس نے بڑی نرمی سے دیا۔

" جی نہیں۔ صرف ایک ٹانگ گنوا کر "

" آتے ہی نیتا گری شروع کردی۔ اچھا پیشہ ہے۔ "

ــ " نیتا لوگ تو سب باہر کھڑے ہیں۔ میں تو ایک سیوک ہوں ! " شیتل نے جواب دیا۔

" تو میں آپ سے بات کرسکوں گا۔ "

" شکریہ ! "

" سمر نور گاؤں ہی کے رہنے والے ہیں آپ ؟ "

" جی ہاں ــ ! "

" آپ کے پتا کا نام ؟ "

" شری رام اَوتار۔ "

" وہی جن کا اِنتقال ہو چکا ہے۔ "

" جی ــ ! "

" اُس شخص کے لئے میرے لئے دِل میں بڑی عزت ہے۔ ہیرا آدمی تھا۔ "

شیتل کو ٹھاکر کی بات سُن کر خوشی ہوئی۔ وہ بولا کچھ نہیں۔

" آج رام اَوتار زندہ ہوتا تو گاؤں کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔ کتنی لگن سے کام کرنے والا آدمی تھا۔ ! "

" جی " شیتل نے ویسے ہی نرمی سے جواب دیا۔

" اب کیا اِرادہ ہے تمہارا ؟ " ٹھاکر نے پُوچھا۔

" آپ " سے " تمہارا " کہہ کر پکارا جانا شیتل کو اچھا لگا۔ اِس تخاطب سے اپنے پن اور قربت کا اِحساس ہوتا ہے۔

" گاؤں میں رہوں گا اور اپنی توفیق کے مُطابق اِس کی خدمت کروں گا۔ "

" نیک خیال ہے۔ "

" آپ ایسا سوچتے ہیں تو میں اِسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں ــ ! "

ٹھاکر نے صوفے کی پُشت سے پیٹھ ٹیکتے ہوئے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا اور نوکر کو آواز دی۔ لمحہ بھر میں وہ آگیا۔

" چائے لاؤ۔ "

نوکر چلا گیا۔

" سگریٹ پیتے ہو ؟ "

" جی پیتا ہوں " شیتل نے جواب دیا۔

" تم ایماندار باپ کے ایماندار بیٹے نظر آتے ہو ؟ " ٹھاکر نے سگریٹ کیس اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

" شکریہ ــ ! "

"اپنی ایمانداری قائم رکھنا۔"

"اسی نصیحت کے لئے شکر گزار ہوں۔" شیتل نے کہا اور سگریٹ سلگا لیا۔

گاؤں کے لوگ ویسے ہی ٹھاکر کو بُرا کہتے ہیں۔ وہ سوچنے لگا۔ یہ تو بڑا مہذب اور بھلا آدمی ہے۔ ہو سکتا ہے گاؤں کے لوگ جس ڈھنگ سے اس سے بات کرتے ہیں وہ اسے پسند نہ ہو۔ شیتل نے محسوس کیا۔ ٹھاکر کی نظر پھر اُس پر گڑی تھی۔

نوکر نے چائے لاکر میز پر رکھ دی۔

"میرے لئے بھی تم ہی چائے بناؤ۔" اُس نے شیتل کو اپنے قریب بیٹھنے کے لئے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ شیتل جھجکتے ہوئے ٹھاکر کے قریب بیٹھ گیا۔ اور چائے بنانے لگا۔

ٹھاکر اُسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

چائے کی پیالی اُٹھاتے ہوئے اُس کی نظر اُس تھیلے پر پڑ گئی۔ جو شیتل کی پہلے والی کرسی کے ساتھ رکھا تھا۔

"اس تھیلے میں کیا ہے؟"

یہ سُن کر شیتل کا دل دھڑک اٹھا۔

"گاؤں والوں کی تمام پونجی ٹھاکر صاحب۔"

ٹھاکر بات سمجھ گیا۔

"تو پنچایت نے میری زمین خریدنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے؟"

"جی۔" اِس کی بہت ساری ذمہ داری مجھ پر ہے۔"

"کتنی رقم دے سکتے ہو؟" ٹھاکر نے پوچھا۔

شیتل نے جواب دینے کے بجائے تھیلا اُٹھایا اور اُسے ٹھاکر کے قدموں میں خالی کر دیا۔

چاندی کے بہت سے زیور۔ کچھ سونے کے چھوٹے موٹے گہنے، روپے اور نوٹ اور گلابی کا وہ چمکتا ہوا کنگن۔

ٹھاکر نے ایک ہی نظر میں تمام پونجی کا جائزہ لے لیا۔

"تو تمہارا خیال ہے زمین بیچ دینی چاہیئے؟"

"سمرپور گاؤں آپ ہی کا گاؤں ہے۔ اس کے ہر کھیت نے آپ کے خاندان کی خدمت کی ہے۔ گاؤں کے ہر شخص نے آپ کا نمک کھایا ہے۔ گاؤں کی ساری دھرتی، اس کے سارے پیڑ اُس کی پگڈنڈیاں اور راستے سب آپ کے ہیں۔" شیتل نے جواب دیا۔

"کبھی تھے۔ اب تو زمین داری ختم ہو گئی۔"

"لیکن سمرپور گاؤں آپ ہی کا رہے گا۔ لوگ اسے اب بھی آپ ہی کا گاؤں سمجھتے ہیں۔"

"یہ اُن کی مہربانی ہے۔"

شیتل یہ بات سُن کر جھوم اُٹھا۔ وہی ٹھاکر یہ الفاظ کہہ رہا ہے جس کے بارے میں لوگوں سے وہ طرح طرح کی باتیں سُن چکا تھا۔

آپ کی زمین کا وہ ٹکڑا گاؤں کو مل جائے تو لوگ میٹھا پانی پی سکیں گے۔ جانے کب سے بیچارے کھاری پانی ہی پی رہے ہیں۔"

"یہ بات تو ٹھیک ہے۔ لیکن یہ رقم بہت کم ہے۔"

"اس سے زیادہ تو گاؤں والے نہیں دے سکیں گے۔ ٹھاکر صاحب، گاؤں بڑا غریب ہے۔"

ٹھاکر نے تازہ سگریٹ سلگایا۔ لیکن اِس بار اُس نے شیتل کو پیش نہیں کیا۔

شیتل بڑے ادب سے خاموش بیٹھا رہا۔

تھوڑی دیر کے بعد ٹھاکر اُٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

شیتل کمرے کی دیواروں، پردوں اور فرنیچر کو دیکھ رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ اگر زیوروں اور روپوں کا یہ ڈھیر کم تھا تو گاؤں والے کیا کریں گے۔؟ اِس سے زیادہ اُن کے بس کی بات نہیں۔

یہ سوچ کر وہ کچھ اُداس ہو گیا۔ اور اس کی نظریں گلابی کے چمکتے ہوئے کنگن پر جم گئیں۔

کچھ دیر کے بعد ٹھاکر کپڑے بدل کر کمرے میں داخل ہوا جیسے کہیں جانے کی تیاری ہو۔

شیتل اپنی جگہ سے اُٹھا لیکن بیساکھی سنبھالنے میں اُسے دقت ہوئی۔ وہ دوبارہ وہیں بیٹھ گیا۔

"آپ کو شاید کہیں جانا ہے؟"

"سوچ رہا ہوں کہ اب نہ جاؤں۔ تم نے مجھے لیٹ کرادیا ہے۔"
"اس کے لئے مجھے افسوس ہے۔ معاف کیجئے گا۔"
"میرا جو ہرج ہونا تھا وہ تو ہوگیا۔"
"میں اس کے لئے شرمندہ ہوں۔" شیتل نے کہا۔
"تو پھر تمہارا بھی خیال ہے کہ زمین بیچ دی جائے۔"
ٹھاکر نے بات پلٹ دی تھی۔
"جی۔"
اتنے میں نوکر آگیا۔
"مراری اور دوسرے کچھ لوگ آپ سے ملنے آئے ہیں۔" اس نے ٹھاکر صاحب کو اطلاع دی۔
"اندر بھیج دو۔"
ٹھاکر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اور اس نے تازہ سگرٹ سلگایا۔
"یہ سب کباڑ خانہ تھیلے میں ڈال لو۔"
شیتل کو ٹھاکر کی اس بات سے چوٹ پہنچی۔ تمام گاؤں کے زندگی بھر کے سرمائے کو ٹھاکر کباڑ خانہ کہکر ٹھکرا رہا ہے۔ جب سے وہ ٹھاکر سے ملنے آیا تھا اب پہلی بار اسے ٹھاکر سے نفرت ہوئی تھی۔ واقعی یہ آدمی دل کا پتھر ہے۔ اسے غریبوں اور حاجت مندوں سے قطعی کوئی ہمدردی نہیں۔ اس کا جی چاہا کہ وہ جیسے تیسے کر کے اپنی بیساکھی سنبھالے اور تھیلا اٹھا کر کمرے سے باہر چلا جائے اور منتظر پنچوں سے کہدے کہ وہ ہار گیا ہے۔ پنچایت والوں کو زمین نہیں ملے گی گاؤں والے رہتی دنیا تک کھاری پانی پیتے رہیں گے۔ اور کوستے رہیں گے، جس نے ان کی ہیٹی کرائی تھی۔ اب وہ کیرتی کو بھی منہ نہ دکھا سکے گا۔ اب وہ شام کو تو کیا کبھی بھی گاؤں نہیں لوٹ سکتا۔

وہ اس قسم کی بات سوچ رہا تھا اور جھک کر زیور وغیرہ تھیلے میں ڈالتا جا رہا تھا۔
اسی لمحہ مراری اپنے ساتھیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ گلابی کا پتا بھی تھا۔

"نمسکار ٹھاکر صاحب۔" سب نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔
اور پھر انہوں نے شیتل کی طرف دیکھا۔ جو تھیلا تھامے اٹھنے کو تیار نظر آتا تھا۔
"کیسے آئے ہو مراری۔؟"
"ہجور، اکیلے میں کچھ کہنا ہے۔"
"جو کچھ کہنا ہے کہدو۔ شیتل اپنا ہی آدمی ہے۔"
ٹھاکر کی بات سن کر مراری چکرا گیا۔ وہ ٹھاکر کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔
"ہم سب کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔"
"تو ٹھیک ہے۔ ہاں ایک بات بتا دوں، میں نے زمین کا وہ ٹکڑا جس کے لئے بہت دنوں سے جھگڑا چل رہا تھا گاؤں کی پنچایت کو بیچ دیا ہے۔"
"زمین آپ نے بیچ دی ہے کیا۔؟"
"ہاں۔!"
"لیکن آپ مجھ سے تو مشورہ کر لیتے۔" مراری نے کہا۔
"تم سمجھتے ہو کہ ہر بات میں تمہاری صلاح ضروری ہے۔"
مراری شرمندہ ہوگیا۔
"لیکن سرکار، گاؤں والوں نے جو رقم پائی پائی کر کے اکٹھی کی ہے۔ اس رقم سے تو گز بھر زمین بھی نہیں خریدی جا سکتی۔" بات گلابی کے پتا نے کہی تھی۔
"تم کون ہو؟"
"یہ گاؤں کا ایک چمار، رام سیوک ہے سرکار۔" مراری نے جواب دیا۔
"تمہارا نیا چیلا لگتا ہے۔؟"
"جی ہجور۔" مراری یہ کہتے ہوئے ذرا سا مسکرا دیا۔
"اچھا تمہیں جو بات کہنی تھی کہو۔ میں جلدی میں ہوں۔"
"اب کچھ نہیں کہنا سرکار۔"
"تو ٹھیک ہے۔"
ٹھاکر نے نوکر کو آواز دی۔ نوکر اندر آیا تو اس نے کہا "گاڑی تیار کراؤ۔ مجھے گاؤں جانا ہے۔ ڈرائیور سے

کہو جیپ بھی نکال لے۔ گاؤں کے کچھ لوگ باہر ہیں وہ بھی جائیں گے۔
شیتل حیرت بھری نظروں سے ٹھاکر کو دیکھ رہا تھا۔
مُراری اور اُس کے ساتھی سہمے ہوئے سے ایک طرف کھڑے تھے
آؤ شیتل۔ اُس نے شیتل کا بازو تھام کر اُسے اُٹھایا۔
شیتل نے اپنی بیساکھی سنبھالی اور پھر فرش پر پڑے تھیلے کی طرف دیکھا۔
"مُراری، اِسے اُٹھا کر گاڑی میں رکھ دو۔"
مُراری نے تھیلا اُٹھا لیا۔
شیتل کو ٹھاکر نے پچھلی سیٹ پر بٹھا لیا۔
نکّی رام سرپنچ اور دوسرے آدمی ٹھاکر کے قریب آ گئے۔
اور ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔
"میں نے زمین بیچ دی ہے۔ تم گاؤں چلو اور لکھا پڑھی کر لو۔"
ٹھاکر کی بات سُن کر سب نے اِحسان مندی کے جذبے سے سر جھکا دیئے۔
ٹھاکر نے گاڑی اِسٹارٹ کر دی۔
جیپ میں سرپنچ اور دوسرے لوگ بیٹھ گئے۔
مُراری اور اُس کے ساتھی کھڑے دیکھ رہے تھے۔ اُدھر ڈرائیور جیپ اسٹارٹ کر رہا تھا۔
ٹھاکر کے گاؤں پہنچتے ہی گھر گھر میں ہلچل مچ گئی۔ سارا گاؤں اُس جگہ اُمڈ پڑا جہاں ٹھاکر کی زمین تھی۔ اور جس میں کنواں کھودنے کی تجویز تھی۔
ٹھاکر بڑی سنجیدگی سے کھڑا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں زیوروں سے بھرا تھیلا تھا۔ اور اُس کے قریب کھڑا تھا شیتل۔ ایک دم بھونچکا سا۔ ایسے جیسے اُس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آ رہا تھا۔ عجیب گورکھ دھندا تھا۔ وہ ٹھاکر کے ساتھ اُس کی گاڑی میں گاؤں تک آیا تھا۔ لیکن راستے میں ٹھاکر نے اُس سے بات تک نہ کی تھی۔
لوگ آتے گئے اور بیٹھتے گئے۔ کوئی کچھ نہ جانتا تھا۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ کیا ہونے والا تھا۔

جب سب لوگ بیٹھ گئے تو ٹھاکر کی آواز گونجی۔ آج پہلی بار وہ بھرے گاؤں کے سامنے بول رہا تھا۔
"آج میں تمہیں زمیندار کی حیثیت سے مخاطب نہیں کر رہا۔ وہ چولا اُتار کر آیا ہوں تمہارے پاس۔ تم نے جو آج ایک ڈیلی گیشن میرے پاس بھیجا ہے اُس کا نیتا بڑا مضبوط ہے۔ اُس نے مجھے ہرا دیا ہے۔ میں نے گاؤں کے لئے زمین بیچ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"
اُس کے بولنے کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ کیونکہ لوگوں نے زور، زور سے تالیاں بجانا شروع کر دیں۔ پل بھر کے بعد ٹھاکر پھر کہنے لگا۔
یہ تھیلا میرے پاس ہے جس میں گاؤں کی بیٹیوں اور بہوؤں کے گہنے پڑے ہیں۔ مَردوں کی جیبوں سے نکلے ہوئے پیسے جمع ہیں۔ اور سونے کا ایک کنگن بھی ہے۔ لیکن تمہارے خون پسینے سے پیدا کیا ہوا یہ دھن میری زمین کی قیمت نہیں ہے۔ کیا آپ میری زمین کو جس سے ٹھاکر خاندان کی عزت وابستہ ہے، اِس کو مانگ مانگ کر اکٹھی کی ہوئی رقم سے خریدنا چاہتے ہیں؟ یہ میرے بزرگوں کی دھرتی کی توہین ہے۔ یہ قیمت بہت تھوڑی ہے۔ مجھے قبول نہیں۔ میں زمین بیچنے کو تیار ہوں لیکن اتنی کم قیمت پر نہیں۔"
عورتوں میں بیٹھی کیرتی کا دِل دھڑک اُٹھا۔ بات بگڑنے والی تھی۔
شیتل بیساکھی کے سہارے کھڑا لڑکھڑا گیا۔ یہ زمیندار پل پل بعد پینترے کیوں بدل رہا تھا۔ سرمایہ دار سرمایہ داری کا چولا اُتارے تو بھی بہت بڑا دکاندار بن جاتا ہے۔
پنچوں کا ٹولا ناراض ہو رہا تھا۔
ٹھاکر کی پاٹ دار آواز گونج رہی تھی۔
"مجھے جس قیمت کی ضرورت ہے وہ دیجئے۔ مجھے وہ دھن دیجئے جس سے دھرتی کے بیٹے جوان ہو کر اُس کی آبرو کو سنبھالتے ہیں۔ اُس کا روپ نکھارنے کے لئے اپنے خون کا غازہ استعمال کرتے ہیں۔ اُسے جوان رکھنے کے لئے اپنے بازوؤں کی قوت استعمال

منتقل کرتے ہیں۔ سونے کے کنگنوں، چاندی کے جھانجھروں اور کاغذ کے نوٹوں کی مجھے ضرورت نہیں۔"

ساری فضا تالیوں سے گونج اٹھی۔

کیرتی کا ڈوبتا ہوا دل سنبھل گیا۔

شیتل کے قدم زمین پر جم گئے۔

اور بچوں کے چہروں پر خوشی کی ریکھائیں ابھر آئیں۔

"میں یہ تھیلا تمہاری پنچایت کو واپس کرتا ہوں۔ زمین میں یہ کنواں کھودنے کیلئے یہ دھن خرچ کیجئے۔ اگر روپیہ کم پڑے تو پنچایت کے کھاتے میں میری طرف سے دو ہزار چندہ جمع کر لیجئے۔"

تالیاں پھر گونجنے لگیں۔

نیکی رام سر نیچے زیوروں اور روپوں سے بھرا تھیلا ٹھاکر سے واپس لے رہا تھا۔

"میں تمہارے نیتا اور تم سب کو اس ہمت کیلئے مبارکباد دیتا ہوں۔"

ٹھاکر نے پاس کھڑے شیتل کے کندھوں کو تھپتھپایا اور پھر نمسکار کیلئے ہاتھ جوڑ دیئے۔

جلسہ ختم ہو گیا۔

ٹھاکر کی گاڑی جب گاؤں سے واپس جانے لگی تو سارا گاؤں اسے گھیرے ہوئے تھا۔ ٹھاکر نے یہ نظارہ زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ گاؤں کے لوگ اپنے جذبات کے پھول اس پر نچھاور کر رہے تھے۔

جس سمے کار گاؤں کی سیما سے باہر نکلی۔ مُرارِی اور اس کے ساتھی گاؤں میں داخل ہو رہے تھے۔

بقیہ "سالانہ جلسے" صفحہ ۵۸

تو مبائے جانے لگے ہیں۔ اسی طرح سالانہ جلسوں کیلئے بھی کوئی قانون بنایا جائے اور مہمانِ خصوصی یا صدرِ جلسہ بننے والے حضرات و خواتین پر لائسنس حاصل کرنے کی شرط لگا دی جائے۔ اگر مجھے آئندہ انتخابات میں لوگ منتخب کر کے مقننہ کا رکن بنا دیں تو ایسا ایک قانون بنوانے کی کوشش کروں گا۔

علی عباس اُمید

پروانے کی خاک

کردار

بادشاہ :۔ مرزا سراج الدین بہادر شاہ ظفر، دہلی کے آخری تاجدار۔
مرزا شاہ عباس :۔ بادشاہ کے رشتہ دار اور رنگون میں مصاحبِ خاص۔
احمد بیگ :۔ ملازم خاص
کپتان ڈیوس :۔ رنگون میں بادشاہ کا داروغۂ زنداں۔
مسز کوپ لینڈ :۔ انگریز بیوہ، جن کا شوہر گوالیار میں قتل کر دیا گیا۔
چارلی گریفتھ :۔ مس کوپ لینڈ کا منگیتر۔
انگریز پادری، حولدار اور دوسرے

مقام

رنگون

زمانہ

۱۸۵۷ء کے بعد رنگون میں بہادر شاہ ظفر کے قید کے ایام

پہلا منظر

(لکڑی کے بنے ہوئے ایک مکان کا تقریباً سولہ مربع فٹ کا کمرہ۔ دیواروں پر سفیدی کی ہوئی ہے۔ آرائش کا کوئی سامان نہیں ہے۔ کمرے کے ایک گوشے میں ایک معمولی چارپائی پر میلا سا بستر لگا ہوا ہے۔ بستر پر گاؤ تکیے کے سہارے بادشاہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ سامنے حقہ رکھا ہوا ہے۔ خمیرے کی خوشبو چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ بادشاہ کے چہرے پر کوئی خاص وقار نہیں ہے۔ ان کی عمر کا اندازہ ستر برس سے زیادہ ہوتا ہے۔ قد میانہ ہے، رنگت گہری سانولی، جسم نحیف و لاغر، لمبی گردن، دہانہ کشادہ، ناک ستواں، پیشانی کشادہ، داڑھی لمبی سینہ تک، لبیں کتری ہوئی، چہرے پر جھریاں ہیں، آواز میں کڑک ہے۔ ایک بڑا سبز کمخواب کا پائجامہ اور سفید ڈھاکے کی ململ کا کرتہ زیب تن ہے۔ سر پر کارچوبی گوشہ ٹوپی ہے۔ گرد و پیش سے بے خبر سامنے کھلے ہوئے دروازے سے باہر دیکھ رہے ہیں۔ کمرے کے دوسرے گوشہ میں ایک اور چارپائی پڑی ہے جس پر بستر نہیں ہے۔ اس چارپائی کے سامنے والی دیوار میں ایک دروازہ ہے، جس پر میلا سا پردہ ٹنگا ہے۔ یکایک بادشاہ چارپائی سے اٹھ کر ٹہلنے لگتے ہیں۔)

بادشاہ :۔ خوابوں کی تعبیر تو دیکھنا [illegible] درخت سے ٹوٹ کر گرا ہوا خشک پتہ ہواؤں کی زد پہ اڑا اڑا پھر رہا [illegible] ایک حقیر تنکے نے اپنے سر پہ طوفان اٹھانے کی کوشش کی۔ چراغِ سحر کی ٹمٹماتی ہوئی لو سے چراغاں کا اہتمام کرنا چاہا۔ عمر نے لبِ آرزو کو [illegible]

(مرزا شاہ عباس داخل ہوتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر بادشاہ رک جاتے ہیں۔)

مرزا شاہ عباس :۔ جہاں پناہ! آج مجھے کپتان صاحب نے بلایا تھا۔ اُنھوں نے کہا کہ ہندوستان سے کچھ فرنگی آئے ہیں جو اعلیٰ حضرت سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔

بادشاہ :- میں نے کہا نہیں میں کسی سے ملاقات کے قابل نہیں ہوں، وہ لوگ مرزا جواں بخت سے مل لیں۔
مرزا شاہ عباس :- جہاں پناہ! میں نے عرض کیا تھا کہ اعلیٰ حضرت علیل ہیں، کسی سے شاان کے لئے نقصان دہ ہو سکتا ہے، اس لئے بہتر یہی ہوگا کہ
مہمان حضرات مرزا جواں بخت سے مل لیں۔ مگر حضور کپتان صاحب نے فرمایا کہ آنے والوں میں کوئی پادری ہے جو ہندوستانی
شاعری کا دلدادہ ہے۔ وہ بادشاہ کی شعر گوئی کا شہرہ سن کر ملاقات کا مشتاق ہوا ہے۔
بادشاہ :- مجبوراً انہوں نے وہ کپتان نے ملاقات کا کوئی وقت مقرر کیا ہے؟
مرزا شاہ عباس :- نہیں، ملاقات کا کوئی وقت تو نہیں مقرر کیا ہے مگر کیا ہے دن کا کھانا وہ لوگ کپتان صاحب کے ساتھ کھائیں گے۔ اس کے بعد
ہی شاید ملنے کے لئے آئیں۔
بادشاہ :- اچھا۔ وہ لوگ ظہر کے بعد ہی آسکیں گے، احمد بیگ سے کہو کہ شربت کا اہتمام کرے۔
مرزا شاہ عباس :- جو حکم ہو جہاں پناہ۔

(مرزا شاہ عباس کورنش بجا لاتے ہیں اور کمرے سے باہر نکل جاتے ہیں)

دوسرا منظر

(وہی کمرہ بادشاہ چارپائی پر گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھے ہوئے ہیں۔ سامنے کے دروازے سے احمد بیگ داخل ہوتا ہے اس
کی وضع قطع دہلی کے قدیم شرفا کی سی ہے۔ بادشاہ کے قریب پہونچ کر آداب بجا لاتا ہے۔)
احمد بیگ :- جہاں پناہ! مرزا شاہ عباس صاحب کے ساتھ کچھ انگریز مہمان تشریف لا رہے ہیں۔ ان میں ایک پادری ہے، ایک نوجوان
اور دو عورتیں۔
بادشاہ :- شربت تیار رکھو۔ ان لوگوں کے آنے پر فوراً پیش کرنا۔
احمد بیگ :- بہت بہتر، عالی جاہ!
(کورنش بجا لا کر بغلی دروازے سے دوسری طرف چلا جاتا ہے۔ چند لمحوں بعد مرزا شاہ عباس کے ساتھ انگریز سامنے
کے دروازے سے داخل ہوتے ہیں۔ آنے والوں کی ترتیب یہ ہے، سب سے آگے مرزا شاہ عباس ہیں، ان کے
پیچھے پادری، اس کے بعد دو عورتیں، ایک جوان العمر دوشیزہ ہے اور دوسری ادھیڑ عمر اس کی ماں۔ عورتوں کے
عقب میں ایک نوجوان اور ایک مسلح انگریز سپاہی ہے۔ مرزا، پادری اور سپاہی سلام کرتے ہیں۔ بادشاہ سلام کا
جواب دے کر سامنے پڑے ہوئے پلنگ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ وہ لوگ بیٹھ جاتے ہیں۔ اسی طرح دونوں عورتیں
اور نوجوان بغل کی چارپائی پر بیٹھ جاتے ہیں۔)
بادشاہ :- (انگریزوں کی طرف مخاطب ہو کر) آپ سے مل کر مجھے بڑی مسرت ہوئی۔
مرزا شاہ عباس :- (تعارف کراتے ہوئے) آپ کلکتہ کے نواح میں ایک کلیسا کے پادری ہیں۔ (عورتوں کی طرف متوجہ ہو کر) آپ جناب کوپ
لینڈ صاحب کی بیوہ ہیں۔ آپ کے شوہر کو گوالیار میں ہندوستانی سپاہیوں نے قتل کر دیا تھا۔ یہ آپ کی صاحبزادی
اور یہ ان کے منگیتر جناب چارلی گرلفتھ ہیں۔
پادری :- افسوس ہے کہ ہندوستانیوں کی یہ ناعاقبت اندیشی انہیں تہذیب کے میدان میں سو برس اور پیچھے لے گئی۔ ہم ہندوستانیوں
کو تعلیم یافتہ اور مہذب بنانا چاہتے ہیں، نئی روشنی میں لانا چاہتے ہیں مگر انہوں نے بعض لوگوں کے بہکانے میں آکر ...

تمک کے احسانات کو درہم برہم کر دیا اور ہزاروں بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

چارلی ۔ چھوڑیئے ان باتوں کو۔ آپ تو بادشاہ کی شاعری کی تعریف سن کر آئے تھے۔

مرزا شاہ عباس ۔ شاعری کیا، وہ تو اعلیٰ حضرت کی تنہائیوں کی رفیق ہے۔ کبھی کبھی اعلیٰ حضرت جذبات کو الفاظ کا قالب عطا کر دیتے تھے۔ خاص کمال تو اعلیٰ حضرت نے فن سپہ گری، تیر اندازی اور شمشیر زنی میں حاصل کیا تھا۔ شہسواری میں تو حضور کا جواب ہندوستان میں نہیں تھا۔

پادری ۔ اور شاید اسی کمال کے مظاہرے کے لئے باغیوں کی سربراہی قبول کر لی تھی۔

چارلی ۔ پادری صاحب! آپ بادشاہ کی ادبی شخصیت سے متاثر ہو کر ملنے آئے ہیں، خود بھی اردو میں شاعری کرتے ہیں، آپ کچھ انہیں اپنے اردو اشعار سنائیے پھر بادشاہ زحمت فرمائیں گے۔

پادری ۔ اچھی بات ہے۔ ایک شعر راستے میں ہو گیا تھا۔ وہی سناتا ہوں (شعر پڑھتا ہے)

دمدمے میں دم نہیں اب خیر مانگو جان کی ؎ اے ظفر بس ہو چکی شمشیر ہندوستان کی (بادشاہ کی پیشانی پر بل پڑ جاتے ہیں۔)

بادشاہ ۔ بہت خوب۔ اپنے دلی جذبات کا اظہار آپ نے اچھا کیا ہے۔ میرا شعر بھی سن لیجئے ؎

ہندیوں میں بو رہے گی جب تلک ایمان کی ؎ تخت لندن تک چلے گی تیغ ہندوستان کی

چارلی ۔ شعر میں بھی وہی نوک جھونک۔ ملاقات سے دلوں کی کثافت دھل جاتی ہے۔ مگر اس قسم کی ملاقاتوں سے تو بغض و کینہ گھٹنے کے بجائے بڑھ جاتا ہے۔ کیا گفتگو کا کوئی دوسرا موضوع نہیں ہے!

مرزا شاہ عباس ۔ بجا ارشاد ہوا۔ اعلیٰ حضرت علیل ہیں اور اس طرح کی گفتگو کا ان کے اعصاب پر خراب اثر ہوتا ہے۔ (آگے آگے احمد بیگ آتا ہے اس کے پیچھے ایک خواص سرپوش سے ڈھکی ہوئی سینی لئے داخل ہوتی ہے۔)

مرزا شاہ عباس ۔ لیجئے شربت نوش فرمائیے!

(احمد بیگ گلاسوں میں انڈیل کر زعفرانی رنگ کا شربت سب لوگوں کو پیش کرتا ہے)

چارلی ۔ بہت عمدہ مشروب ہے۔ میں نے ایسا نفیس شربت یورپ میں کہیں نہیں پایا۔

مرزا شاہ عباس ۔ اس شربت کا نسخہ حکیم احسن اللہ صاحب کا وہ مخصوص نسخہ ہے جسے انھوں نے تلاش بسیار کے بعد ترتیب دیا ہے۔

مسز کوپ لینڈ ۔ واقعی بہت اچھا شربت ہے۔ دہلی کے حکیموں کا تذکرہ تو لندن میں بھی ہوتا ہے۔ پچھلے برس گوالیار میں رابرٹ کو حکیم صاحب نے جو علاج کیا تھا، وہ معجزے کا تھا۔ ڈاکٹروں نے تو جواب ہی دے دیا تھا۔ جب درد اٹھتا تھا بے چین ہو جاتا تھا، بیچارہ، مگر حکیم صاحب نے پندرہ روز میں ٹھیک کر دیا۔

(سب لوگ شربت پی لیتے ہیں۔ احمد بیگ گلاس اکٹھا کرتا ہے اور باہر چلا جاتا ہے)

چارلی ۔ ہم لوگ جس مقصد سے یہاں حاضر ہوئے تھے وہ تو ابھی حاصل ہی نہیں ہوا۔ میں بادشاہ سلامت سے درخواست کروں گا کہ اگر وہ اپنی ایک غزل پڑھنے کی زحمت فرمائیں تو ہم لوگوں کی بڑی عزت افزائی ہوگی۔

بادشاہ ۔ اگر آپ لوگوں کی یہی خواہش ہے تو میں چند اشعار سنائے دیتا ہوں

لگتا نہیں ہے جی مرا اجڑے دیار میں ؎ کس کی بنی ہے عالم ناپائیدار میں

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن ؎ دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

کہہ دو ان حسرتوں سے کہیں اور جا بسیں ؎ اتنی جگہ کہاں ہے دل داغدار میں

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے ؛ دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

چارلی :- اچھا اب اجازت دیجئے۔ تکلیف دہی کے لئے معذرت خواہ ہوں

(سب لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں اور بادشاہ سے مصافحہ کرکے رخصت چاہتے ہیں۔ پادری اور دوسرے لوگ تسلیم بجا لاتے ہیں اور شاہ عباس کی معیت میں چلے جاتے ہیں۔ کمرے میں صرف بادشاہ رہ جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر تک گم صم بیٹھے رہتے ہیں پھر اٹھ کر ٹہلنے لگتے ہیں۔ پردے کے عقب میں کوئی پرسوز آواز میں گا رہا ہے)

آواز :- کسے فریب کہ کیا ہے قبا کے دست کا رنگ ؛ ہواؤں میں کہیں خوشبوئے زلف یار نہیں

(بادشاہ ٹہلتے ٹہلتے رک جاتے ہیں پھر چارپائی پر بیٹھ جاتے ہیں۔)

خیال وصل کجا، درد ہجر یار کجا ؛ خود اپنے دل کے دھڑکنے پہ اعتبار نہیں

(بادشاہ کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔)

غروب ہو رہا ہے حوادث کا تیرہ دل سورج ؛ وہ دن پڑا ہے کہ جس دن کی کوئی شام نہ ہو

ہے ناامیدی کا صحرا حد نگاہ تلک ؛ خیال چاہے تو یہ فاصلہ تمام نہ ہو

(دھیرے دھیرے آواز معدوم ہوتی ہے بالآخر ختم ہو جاتی ہے۔)

تیسرا منظر

(بادشاہ اسی کمرے میں لیٹے ہوئے ہیں۔ احمد بیگ حقہ لے کر آتا ہے۔)

بادشاہ :- شاہ عباس کو بھیج دو۔

(احمد بیگ جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد مرزا شاہ عباس اندر آتے ہیں اور تسلیم بجا لاکر ایک طرف کھڑے ہو جاتے ہیں۔)

بادشاہ :- کہو مرزا کپتان سے ملاقات کر آئے؟

مرزا شاہ عباس :- جی ہاں اعلیٰ حضرت۔ میں نے کپتان صاحب سے گزارش کی کہ وہ تھوڑے سے کاغذ اور محدود مقدار میں ہی روشنائی کا بندوبست کر دیں۔ مگر انھوں نے مجبوری کا اظہار کیا۔ کہہ رہے تھے کہ اس سلسلے میں اوپر سے بہت سخت احکامات ہیں میں نے کہا کہ آپ گن کر کاغذ دے دیجئے اور جب چاہیے ان کا معائنہ کر لیجئے مگر وہ کسی طور پر راضی نہیں ہوئے۔

بادشاہ :- اچھا! نہیں راضی ہوئے؟ آل تیمور پر یہ وقت بھی پڑنا تھا۔ خلد آشیانی شجاعت کے بعد اس پہاڑی دیس کی سرزمین میرا تماشہ دیکھ رہی ہے۔ معبود، تو جس حال میں رکھے تیری مصلحت ہے۔

(بادشاہ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں جو داڑھی کے بالوں میں جذب ہو رہے ہیں۔ مرزا شاہ عباس آگے بڑھتے ہیں پھر رک جاتے ہیں۔)

مرزا شاہ عباس :- جہاں پناہ صبر کیجئے۔ آپ نے اس سے زیادہ نازک موقعوں پہ دل کو سنبھالا ہے۔

بادشاہ :- مرزا میں نے زندگی کی ہر چوٹ کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا، ہر تبدیلی کو قبول کر لیا۔ سخت سے سخت موقع پر بھی میرے پائے ثبات میں لغزش نہ ہوئی۔ میں نے کسی زخم کا مداوا نہ چاہا، کبھی شکوے سے زبان آلودہ نہ کی مگر اپنی شاعرانہ فطرت کو کیسے بدل دوں!

مرزا شاہ عباس :- صبر کیجئے۔ خدا چارہ ساز ہے۔ وافوض امری علی اللہ

بادشاہ :- بے شک۔ خدا منصفِ حقیقی ہے۔ جلد یا بدیر وہ ضرور ظالموں کو کیفرِ کردار تک پہنچائے گا۔ وہ بڑا انصاف کرنے والا ہے
(مرزا شاہ عباس تھوڑی دیر تک خاموش رہتے ہیں پھر دفعتاً تسلیم بجا لاکر کمرے سے باہر نکل جاتے ہیں۔ بادشاہ گم سم ہیں)

چوتھا منظر

(بادشاہ اپنے کمرے میں دوسا ہی لگائے ہیں۔ بستر کے سامنے حقہ رکھا ہوا ہے۔)

بادشاہ :- (اپنے آپ سے) دہلی میں کیسے کیسے باکمال لوگ اکٹھا ہوگئے تھے۔ ہر ایک اپنے فن میں استادِ کامل تھا۔ خلد آشیاں اکبر اعظم کے بعد دہلی میں ایک وقت میں اتنے علماء و فضلاء کبھی اکٹھا نہ ہوئے تھے۔ فضل حق خیرآبادی، صہبائی، آزردہ، شیفتہ، ذوق، شاہ نصیر، غالب، مومن اس فہرست میں کس کس کا نام لوں۔ ہائے کیا لوگ تھے! خدا جانے اب کس حال میں ہوں گے جیتے بچے ہیں یا خونی تقدیر کا شکار ہوگئے۔ کہتے ہیں چراغ جب بجھنے کو ہوتا ہے تو تو بھڑک اٹھتا ہے۔ یہ لو کے بھڑکنے کا تماشا تھا۔

(خاموش ہوجاتے ہیں پھر ٹہلنے لگتے ہیں۔)

آواز :-
لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

بادشاہ :- استاد ذوق واقعی استاد تھے، عوام کا یہ خیال کہ ان کی غزلیں قصائد سے فروتر ہیں حقیقت سے بعید ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انہیں ہر دو اصناف پر قدرت تھی۔ اٹھارہ برس کے سن میں ملک الشعرا ہو جانا سہل نہیں ہے۔ ذوق اور غالب کی چشمک جواں بخت کی شادی میں لطف دے گیا۔ غالب ایک عظیم شاعر ہی نہیں، ایک بلند اخلاق انسان بھی ہے۔ کس مزے میں گزارشِ احوال واقعی کردی۔ کدورت اور ملال کے بادل مطلع دل سے یکسر چھٹ گئے۔

آواز :-
مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے ؛ جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے
دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے ؛ پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے
جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن ؛ بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

بادشاہ :- غالب اور نواب شیفتہ کے کیا اچھے تعلقات تھے، خلوص اور اپنائیت اسی کو کہتے ہیں

آواز :-
وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی
مت پوچھئے کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

بادشاہ :- واقعہ ہے کہ شیفتہ ایک نکتہ سنج نقاد ہی نہیں نازک خیال شاعر بھی ہے۔ اچھا آپ حضرات نے اپنا کلام تو سنایا، اب میرے بھی چند اشعار سماعت فرمائیے۔ جب سے آپ لوگوں سے جدا ہوا ہوں سیکڑوں غزلیں لکھیں۔ آج میں غالب سے مضمون آفرینی کی، مومن سے نزاکتِ خیال کی اور شیفتہ سے حسنِ زبان کی داد چاہوں گا۔ (تحت اللفظ پڑھتے ہیں۔)

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں، نہ کسی کے دل کا قرار ہوں ؛ جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں
میں نہیں ہوں نغمۂ جاں فزا، کوئی سن کے مجھکو کرے گا کیا ؛ میں بڑے بروگ کی ہوں صدا کسی دل جلے کی پکار ہوں
مرا رنگ روپ بگڑ گیا، مرا یار مجھ سے بچھڑ گیا ؛ جو چمن خزاں سے اجڑ گیا میں اسی کی فصلِ بہار ہوں
کوئی آکے شمع جلائے کیوں کوئی چار پھول چڑھائے کیوں ؛ کوئی آکے اشک بہائے کیوں کہ میں بیکسی کا مزار ہوں
نہ میں کسی کا حبیب ہوں نہ تو میں کسی کا رقیب ہوں ؛ جو بگڑ گیا وہ نصیب ہوں، جو اجڑ گیا وہ دیار ہوں

اشعار پسند نہیں آئے! آخر آپ لوگ خاموش کیوں ہیں؟

(احمد بیگ کمرے میں داخل ہوتا ہے۔)

احمد بیگ:۔ جہاں پناہ! آپ کس سے باتیں کر رہے ہیں؟

بادشاہ:۔ دیکھتے نہیں یہ دہلی کے علماء و شعراء کا مجمع ہے!

احمد بیگ:۔ مجھے تو کوئی نظر نہیں آتا اعلیٰ حضرت!

بادشاہ:۔ کیا کہا، کوئی نظر نہیں آتا! رہنے دو، میرے دائیں بائیں فرش پر دیکھو۔

(احمد بیگ کمرے سے نکل جاتا ہے تھوڑی دیر بعد مرزا شاہ عباس کمرے کر آتا ہے۔ اس اثنا میں بادشاہ نے چلم الٹ کر کوئلہ نکال لیا ہے اور کمرے کی دیواروں پر اشعار لکھ رہے ہیں۔)

مرزا شاہ عباس:۔ اعلیٰ حضرت! یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔

بادشاہ:۔ اپنی تسکینِ خاطر کا سامان کر رہا ہوں۔ (گلوگیر آواز میں) مرزا تم میرا کرب نہیں سمجھو گے۔ (قہقہہ لگا کر) میں اپنے اشعار دیواروں پر اس لئے لکھ رہا ہوں کہ یہ میری قوم کی امانت ہیں۔ مرزا یاد رکھنا میری قوم بزدل نہیں ہے۔ (پھر قہقہہ لگاتے ہیں دفعتہً رونے لگتے ہیں۔)

مرزا شاہ عباس:۔ احمد بیگ، مرزا جواں بخت کو مطلع کرو۔ (احمد بیگ آنسو پونچھتا ہوا باہر نکل جاتا ہے)

پانچواں منظر

(کپتان ڈیوس اپنے آفس میں بیٹھا ہوا ہے۔ آفس معمولی سا ہے۔ سامنے میز پر چند فائلیں پڑی ہوئی ہیں۔ پشت کی دیوار پر ملکہ وکٹوریہ کا ایک بڑا فوٹو فریم آویزاں ہے، دو کلنڈر بھی ہیں۔ ایک بالکل سادہ دوسرے پر کوئی لینڈ اسکیپ ہے۔ ایک اردلی پیچھے سے پنکھے کی ڈوری کھینچ رہا ہے۔ ایک باوردی سپاہی اجازت لے کر اندر داخل ہوتا ہے اور ایک خط دے کر مودب کھڑا ہو جاتا ہے۔ ڈیوس جیسے جیسے خط پڑھتا جاتا ہے، چہرے پر مسرت کے آثار نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔ خط ختم کرکے رکھ دیتا ہے۔)

ڈیوس:۔ چلو یہ آخری کانٹا بھی صاف ہوا چاہتا ہے۔ بڈھے بادشاہ کا دماغ تو پہلے ہی ماؤف ہو چکا تھا، آج کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ حالت بے حد نازک ہے۔ اب سیال چیزیں بھی حلق سے نہیں اترتیں۔ (سپاہی سے مخاطب ہو کر) جاؤ اپنے حولدار کو بھیج دو۔

(تھوڑی دیر بعد حولدار داخل ہوتا ہے اور فوجی انداز میں سیلوٹ کرکے مودب کھڑا ہو جاتا ہے۔)

ڈیوس:۔ تجہیز و تکفین کے ضروری انتظامات کر لئے؟

حولدار:۔ جی سرکار۔ مجوزہ قبر کے پاس اینٹ اور چونا بھی جمع کرا دیا ہے۔ جیسا حکم تھا ویسا ہی بانس کے کھمچیوں سے حصار بنا دیا ہے۔ کیا بادشاہ کا انتقال ہو گیا؟

ڈیوس:۔ ابھی تو نہیں مگر اب وہ صرف چند گھنٹوں کا مہمان ہے۔

حولدار:۔ حضور، جنازے کے ہمراہ اور لوگ بھی چلیں گے؟

ڈیوس:۔ نہیں جنازے کے ساتھ کوئی نہیں جائیگا۔ مرزا جواں بخت، مرزا شاہ عباس اور احمد بیگ شامل ہوں گے۔ اگر زینت

(باقی صفحہ ۔۔ پر دیکھیے)

مکتوبات

● گلبرگہ میں تو اس مرتبہ "شاعر" کی بارش معلوم ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ گلبرگہ ہمیشہ ہی سے شعر و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ ان دنوں تو اردو کے کئی معیاری رسائل آرہے ہیں۔ پڑھنے والوں کے ساتھ ساتھ لکھنے والوں کی بھی کثیر تعداد ہے اور یہ خوشی کی بات ہے۔

مجتبیٰ پر اپنے مضمون کی اشاعت کے لئے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ نئے شمارہ کے لکھنے والوں میں ل، احمد اکبر آبادی، ہیاشی ذو میکو، اننت کا نیکر، یوسف ناظم، اکرام جاوید، ایف اے بادشاہ پسند آئے۔ اکرام جاوید نے تو خون کے آنسو رلائے ہیں۔ اتنے پاکیزہ افسانے بہت کم پڑھنے کو ملتے ہیں۔ اس کامیاب افسانے پر انہیں میری مبارکباد پہنچا دیجئے۔ شعراء میں متین سروش کی غزل کا ہر شعر قابلِ ذکر ہے۔ ندا کی نظم "جنگل کے لوگ"۔ رفعت سروش کی ترسیل، اختر بستوی کی "سوچتا ہوں کہ" اور ظفر غوری کی غزل خوب ہے۔ غلام مرتضیٰ صاحب راہی کا یہ شعر بھی خوب ہے ؎

بھاگ نکلے ہیں سبھی چھوڑ کے میدان، مگر
میں ہی کچھ دیر ٹھہرنے کی جسارت کرلوں

بھئی! یہ عاقل صاحب کا مزاحیہ مضمون "سالانہ جلسے" کب شائع ہوگا؟ حیدرآباد میں مجتبیٰ سے ملاقات میں آپ کا ذکر بھی رہا۔ وہ تو آپ کے بڑے معتقد معلوم ہوتے ہیں!!

طیبہ انصاری
گورنمنٹ کالج۔ گلبرگہ

● "شاعر" کا نومبر ۱۹۷۵ کا جاذبِ نظر شمارہ ذہن و دل کو طمانیت بخش رہا ہے۔ جرمنی میں اردو کی ہمہ گیر مقبولیت اور ہر دل عزیزی کے بارے میں آپ کا حرف حرف ایک ٹھوس حقیقت ہے جو زبان عوام و خواص کو اتنی پیاری ہو اس کا مٹنا نا ممکنات میں سے ہے اور جس کی آبیاری کرشن چندر، سردار جعفری، اعجاز صدیقی جیسی آفاقی شخصیتوں نے کی ہو اس کو بڑھنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ ہاں ہم اردو والے عمل پیرا ہو جائیں۔

تازہ شمارہ ہر لحاظ سے معیاری ہے۔ آپ کی عرق ریزیاں "شاعر" کا حسن بڑھانے میں بہت اہم رول ادا کر رہی ہیں۔ حصۂ نظم و غزل بہت بھاری ہے۔ متین سروش، مغیث الدین فریدی، راہی قریشی اور ممتاز راشد کی غزلیں بہت پسند آئیں۔ ندا فاضلی اور رفعت سروش کی نظمیں اپنے موضوع کے اعتبار سے خوب ہیں اور بڑی تاثر انگیز ہیں۔ مقالوں میں طیبہ انصاری کا مجتبیٰ حسین پر لکھا ہوا مقالہ دلچسپ انداز میں لکھا گیا ہے اور ان کی شخصیت کا بھرپور عکس پیش کرتا ہے۔ عظمت حسین خاں میکش کا مقالہ بہت محنت سے لکھا گیا ہے اور بڑے کام کی چیز ہے۔ اکرام جاوید کا افسانہ دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ یوسف ناظم صاحب کی "ادبی لغت" کون نہیں پسند کرے گا۔ ل، احمد اکبر آبادی کا مقالہ بے حد ٹھوس ہے۔

"شاعر" کا "مکتوبات" کا حصہ ادبی برادری کے درمیان تعلقات بڑھانے کی ایک اہم کڑی ہے۔ فن کار اپنے فن کے بارے میں قارئین کے تاثرات و احساسات سے بخوبی واقف ہو کر اپنے فن کو اپنے عہد سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتا ہے جو خود فنکار اور فن کے لئے مفید ہے لیکن یہ سب کچھ آپ کے دم سے ہے۔ آپ "شاعر" کا چراغ آندھیوں کی زد میں جلائے ہوئے ہیں۔ خدا کرے اردو کو آپ جیسے جیالے ہمیشہ ملیں۔

نصر قریشی۔ ایم اے
ہٹیا بہادر گنج۔ الٰہ آباد۔

● گلہائے عقیدت۔ گرامی نامہ صادر ہوا۔ آپ یہاں تشریف لائے اور چل بھی دیئے۔ میں تو منتظر تھا کہ آپ کم از کم ایک ہفتہ یہاں قیام کریں گے۔ اور ہمیں آپ کی کچھ خدمت کرنے کا شرف حاصل ہوگا۔ مگر وہ آرزو محض آرزو ہی رہی۔ آپ سے نیاز حاصل کرکے دل کو سکون ہوا۔ آپ کی تحریروں نے تو پہلے متاثر کیا ہی تھا۔ مگر آپ کی پرخلوص شخصیت نے تو مجھے آپ کا معتقد بنا دیا ہے۔ چہرہ انسان کے خیالات و احساسات کا آئینہ ہوتا ہے۔ یہ مثل شاید آپ ہی کو دیکھ کر عالم وجود میں آئی ہوگی۔ میری اہلیہ بھی آپ کی گرویدہ ہو چکی ہیں۔ ہماری زبردست خواہش ہے کہ آپ ہمارے یہاں چند روز قیام کریں۔ اگلے سال جشن کے موقع پر آپ کی

آمد کا انتظار کروں گا۔

مشاعرے کی تعریف کے لئے شکریہ! جہاں انتظامات تحسین تھے۔ وہاں مشاعرے کی کامیابی شریک ہونے والے شعراء پر منحصر تھی۔ آپ اور سردار بھائی اور دوسرے شعرائے کرام کی ذات شاعرہ کی کامیابی کی ضمانت تھی۔ آپ سب یہاں تشریف لائے اور ہماری قدر افزائی ہوئی۔ اس کے لئے میں آپ کا اور محترمی سردار بھائی کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔

لوگوں کو یقین نہیں ہوتا تھا کہ اردو ادب کے یہ درخشاں ستارے دھرم سالہ جیسے دور دراز مقام پر منعقد ہونے والے مشاعرہ میں شرکت کرینگے آپ کی ذات اور خاص توجہ سے میں سرخرو ہوا۔ لہذا اس تقریب کی کامیابی کے لئے آپ بھی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ہماچل پردیش میں اردو کے فروغ و بقا کے لئے آپ ضرور کوئی ٹھوس قدم اٹھائیے۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ آپ جیسے اردو دوست اس معاملے پر اپنی توجہ دیں تاکہ ہمارا یہ قیمتی سرمایہ ہمارے پاس ہمیشہ محفوظ رہے۔ آپ کے اس فیصلے پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ اور آپ کی کامیابی کے لئے دعا گو ہوں۔

فرسٹ کلاس مجسٹریٹ۔ دھرم سالہ (کانگڑہ)۔ **سر بیدر ناتھ ورما**

● آپ جس اولوالعزمی اور دور اندیشی سے اردو کی بقا کے لئے کوشاں ہیں اُسے دیکھ کر دل عقیدت سے جھک جاتا ہے۔ ہر محبِ اردو آپ کا عقیدت مند ہے اور ہم سب آپ کی درازیٔ عمر کے لئے دعا گو ہیں۔ آپ..... جیسے افراد کو نگاہ میں نہ لائے ایسے افراد ہر دور میں پیدا ہوتے ہیں۔ جو اپنے کردار سے اسلاف کا سر نگوں کرتے ہیں..... "ناولٹ نمبر" کا اعلان پڑھ کر بے پایاں مسرت ہوئی۔

مشن اسکول۔ گومہ۔ **رحمٰن حمیدی (بی اے)**

● آپ کی شخصیت ایک عہد آفریں، عہد ساز، ادب نواز اور ادیب ساز کی ہے۔ حیرت اُن لوگوں پر ہے جو آپ کی بے لوث خدمات کا اعتراف کرنے کے بجائے آپ پر انگلیاں اُٹھاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو پہلے اپنے گریبان کے تار اور داغ کو دیکھنے چاہئیں۔

آپ کا اداریہ "شاعر" ہمیشہ کی طرح فکر انگیز ہے۔ کاش چند ہی لوگ آپ جیسے اور ہوتے تو آج اردو اس کس مپرسی کے عالم میں نہ ہوتی۔ حالیہ شمارہ میں "فرہنگ سراپا"، "مسلمان موسیقاروں کی رہنماؤں میں ہندو دیومالا" اور "ضناعت ادب" بڑے ہی فکر انگیز مضامین ہیں۔ "مجتبیٰ حسین ـ دیدہ و شنیدہ" میں طیب انصاری نے بڑی بے باکی اور صفائی سے مجتبیٰ حسین کی خوبیوں اور خامیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ افسانوں میں "اطویلا" بہت پسند آیا۔ نظمیں اور غزلیں بھی بہت خوب ہیں۔

ایس، این، ایس کالج۔ ٹیکاری (گیا)، **محمد محفوظ الحسن ایم اے**

● آج ہی نومبر کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ اردو رسم الخط کو بدلنے کی جو سازشیں ہو رہی ہیں، وہ اُس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتیں جب تک آپ جیسے جری اردو کو نصیب ہیں۔ جنہیں اردو رسم الخط سے پیار ہے، اردو سے محبت ہے۔ وہ میدان میں آگئے ہیں۔ اردو رسم الخط سے متعلق "شاعر" کا موقف قابلِ تحسین ہے۔

مجنوں نے غلافِ کعبہ تھام کر کہا تھا۔ اے خدا مجھ میں لیلیٰ کی محبت اور زیادہ کر۔ اسی طرح اردو کے فدائیوں کو دعا مانگنے کی ضرورت ہے۔

ریسرچ فیلو۔ پٹنہ یونیورسٹی۔ پٹنہ۔ **محمد کمال الدین**

● ایک مختصر ڈراما بھیج رہا ہوں۔ بالکل نفسیاتی ڈراما ہے۔ جس میں نقطۂ عروج پہلے آجاتا ہے۔ اور انکشاف بعد میں۔ ایک نیا تجربہ کیا ہے۔ اُمید ہے کہ ڈراما پسند کیا جائیگا۔ بالکل توقع کے عین مطابق آپ نے "ناولٹ نمبر" کا اعلان کر دیا۔ میں خود ہی سوچ رہا تھا کہ اس بار آپ "ناولٹ نمبر" کا اعلان ضرور کریں گے۔ امید کہ یہ نمبر غیر معمولی طور پر کامیاب ہوگا۔

بیگم گنج (رائے سین) ایم، پی (پرنسپل) **ابراہیم یوسف**

● یہ ایک نیا شگون تھا کہ خرابیٔ صحت کے باوجود آپ نے جشنِ خواں دھرم سالہ کے مشاعرہ میں شرکت فرمائی۔ آپ کی ذاتِ گرامی سے نیاز حاصل کر کے جو مسرت مجھے اور دیگر احباب کو ہوئی، اُس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ "شاعر" میں آپ کی غزل پڑھ کر دل میں کئی گھڑ ایک ساتھ پیوست ہو گئے تھے۔ مجھے اس بات کا افسوس رہا کہ میں آپ کی کوئی خدمت نہ کر سکا۔ کیونکہ مجھے اگلی صبح ہی شملہ کا قصد کرنا پڑا۔

ایک جرمن کہانی کا ترجمہ "شاعر" کے لئے ارسال ہے۔
مارشدا۔ کانگڑہ۔ (ایچ۔ پی) منوہر شرما ساغر پالمپوری

● نومبر کا شاعر ملا۔ افسانوں کی نسبت شاعری کا معیار اونچا ہے۔ جاگتی آنکھوں کے خواب میں سوائے زبان کے اور کچھ نہیں۔ بچے کی جدائی اندوہناک ضرور ہے۔ مگر یہ کوئی نیشنل نہیں اس کا اختتام بھی جاذب نہیں اور نہ ہی کوئی سبق لئے ہوئے ہے۔ نیکش صاحب کا مقالہ "مسلمان موسیقاروں کی رچناؤں میں ہندو دیومالا" بڑی محنت اور ریسرچ کے بعد لکھا گیا جان پڑتا ہے۔ آخر میں اُن کی تجویز بھی درست ہے کہ اردو ادب کے بھارتیہ کرن کا عمل بھی شدت سے ختم کر دینا چاہئے۔ طیب انصاری صاحب کا مقالہ مجتبیٰ حسین میرے لئے تو انکشاف ہے۔ شمالی ہندوستان کنہیا لال کپور۔ فکر تونسوی، اور شوکت تھانوی کے علاوہ فرقت کو بطور مزاح نگار اچھی طرح جانتا ہے۔ مگر مجتبیٰ حسین ادھر روشناس نہیں ہیں۔ ہوتے تو کم از کم میری نظر سے ضرور گزرتے ان کی کتابیں کس نے شائع کی ہیں۔ لکھئے، منگواؤں گا۔
حصۂ نظم میں متین سروش کا یہ شعر خوب ہے ؎

گلشن عیش میں اپنی بھی رسائی ہوتی
توڑ سکتے جو ترے درد کا رشتہ ہم لوگ

آزاد نظم میں رفعت سروش کی ترسیل خوب ہے۔ ظفر غوری، علیم جہانگیر کی غزلیں بڑی اچھی ہیں۔ لیکن ندا فاضلی سب سے اوپر ہیں۔ جنگل کے لوگ سرکار کے پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے لاکھوں کی تعداد میں چھپوا کر بانٹنی چاہئے تاکہ درندوں کی اپنی شکل نظر آئے۔ اور وہ شرم سے ڈوب مریں۔
چوک مصراں۔ لدھیانہ ۸ اندر پرتاپ نیر۔ ایم اے

● شاعر کا تازہ شمارہ بابت نومبر ۱۹۷۵ء موصول ہوا۔ اس سے پہلے اکتوبر کا شمارہ بھی مل چکا ہے۔ شکر گزار ہوں۔ اردو بلٹز میں رسم الخط کے سلسلے میں آپ کا مضمون پڑھ چکا تھا۔ اور اپنی جگہ مطمئن تھا کہ اب یہ جھگڑے ختم ہوں گے۔ مگر حال میں اخبارات سے معلوم ہوا کہ افرو ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس میں اردو کو بائیں جانب سے لکھنے کی تجویز پیش کی گئی۔ جس کے محرک رضیہ سجاد ظہیر اور عصمت چغتائی کے علاوہ جناب کرشن چندر بھی تھے۔ اگرچہ تجویز کا اصل متن میری نظر سے نہیں گزرا۔ مگر جگہ جگہ جو احتجاجی جلسے ہو رہے ہیں۔ ان سے کچھ نہ کچھ ہوا کا رخ تو معلوم ہوتا ہی ہے۔ رضیہ سجاد ظہیر اور عصمت چغتائی کے خیالات تو ڈھکے چھپے نہ تھے۔ مگر اس تحریک میں کرشن چندر کی شمولیت نہایت حیرت انگیز ہے۔ یہاں کی گزشتہ تحریریں جن میں انہوں نے اردو زبان اور رسم الخط کے تحفظ کے لئے آواز بلند کی تھی۔ حرفِ غلط کی طرح مٹائی تو نہیں جا سکتی۔ کرشن چندر سیاسی لیڈر بھی نہیں ہیں جن کے لئے دل بدلی کپڑا بدلنے کے مترادف ہے۔ ممبئی کے ادیبوں اور شاعروں نے اردو کی بقا اور ترقی کے لئے جتنی اور جیسی عظیم الشان کوششیں کی ہیں ان کو کسی بھی زبان کے فخریہ کارناموں میں گنا جا سکتا ہے۔ تاہم اب یہ جو اکا دکا آوازیں مخالف سمتوں سے آ رہی ہیں وہ محبانِ اردو کے لئے یقیناً باعثِ تشویش ہے۔ ؎

اکا دکا صدائے زنجیر زنداں میں رات ہو گئی ہے

زنداں میں رات ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ مگر بعض ادیبوں کی رسم الخط بدلنے کی یہ کوشش نہ صرف یہ کہ غیر منطقی اور خطرناک ہے بلکہ اس سے ادنیٰ درجے کی ذاتی مفاد پرستی کی بو بھی آتی ہے۔ اس سلسلے میں "شاعر" اور مدیر شاعر کی آواز بھی مدبرانہ، باوقار، مدلل اور درد آمیز ہے۔ مگر اس مورچے کو سر کرنے کے لئے ممبئی کے دیگر ایماندار ادیبوں اور شاعروں کو بھی اپنا دستِ تعاون بڑھانا چاہئے۔ جس کے بغیر اس فتنے پر قابو پانا غیر ممکن نہیں مگر دشوار ضرور ہو جائیگا۔
"ناولٹ نمبر" کا اعلان خوش آیند ہے۔ شاعر کے وزن و وقار میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ جو باعثِ طمانیت ہے۔

پس نوشت: قومی آواز مورخہ ۲۸ نومبر سے معلوم ہوا ہے کہ کرشن چندر نے افرو ایشیائی کانفرنس میں پیش ہونے والی مبینہ تجویز سے نہ صرف اپنی بے تعلقی کا اظہار کیا ہے بلکہ اس سارے افسانے کو بے بنیاد اور شرارت آمیز بتایا ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے اس بات کا پھر اعادہ کیا ہے کہ وہ اردو زبان اور اس کے رسم الخط کی بقا اور تحفظ کے اپنے پرانے موقف پر بدستور قائم ہیں۔ مزید یہ کہ افرو ایشیائی کانفرنس اس بات کی مجاز

بھی دی تھی۔ کہ وہ اِس قسم کی تجویزوں پر غور کر سکتی۔ اور عصمت چغتائی تو دِلّی میں موجود تھیں۔ ؎

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

۱۷/۹۷۔ پریڈ کانپور۔ نامی انصاری

● اِس ماہ کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ "جرعات" میں روا داری والی بات نہایت پسند آئی۔ کاش کہ لوگ آپ کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کر سکیں۔

عظمت حسین خاں میکش کا مقالہ "مسلمان موسیقاروں کی رچناؤں میں ہندو دیو مالا" واقعی اُن حضرات کے منہ پر بھرپور طمانچہ ہے جن کو یہ اعتراض ہے کہ مسلمان شعراء ہندی میں تخلص نہیں رکھتے۔ اور اُن کی رچناؤں میں سوائے طور، دجلہ، و فرات کے اور کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ درحقیقت میکش صاحب قابلِ مبارکباد ہیں۔

متین سروش اور غلام مرتضیٰ راہی کی غزلیں۔ ندا فاضلی اور رفعت سروش کی نظمیں، اکرام جاوید اور سلیم اقبال کے افسانے بے حد پسند آئے۔ یوسف ناظم صاحب کا 'ادبی لغت' گو کہ مختصر ہے لیکن خوب ہے۔

کرشن چندر' غالب اگا ندھی؛ ورافسانہ وڈرامہ نمبر جیسی شاندار اشاعتوں کے بعد آپ نے ناولٹ نمبر کا اعلان کیا ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ اتنی طویل و شدید علالت کے باوجود ڈھیر ساری مصروفیات کا بار کیسے سہہ سکتے ہیں۔ اُردو کی بقا کے لئے اس نازک دور میں آپ جیسے سرپرستوں کی اشد ضرورت ہے۔ خدا کرے کہ آپ جلد از جلد صحت یاب ہو جائیں۔

سدھو نام نگر۔ ہبلی۔ کامل کلادگی۔ ایم' اے

● شاعر کا تازہ شمارہ مواد اور معیار کے اعتبار سے کافی موثر اور معتبر ہے۔ "جرعات" حسب معمول فکر انگیز اور توجہ طلب ہے۔ منظومات میں متین سروش۔ ندا فاضلی۔ رفعت سروش اور راہی قریشی کا کلام پسند آیا۔ مترجمہ افسانے کافی دلچسپ اور معیاری ہیں۔ حصۂ مضامین میں مجتبیٰ حسین پر طیب انصاری نے بڑی محنت، محبت اور خلوص سے لکھا ہے اور ایک حد تک وہ مجتبیٰ کی روحِ جوان تک پہنچنے میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ لیکن میں اِن کے اِس خیال سے ہرگز متفق نہیں ہوں کہ مجتبیٰ کے اپنے مضمون (جسے میں مزاح و طنز میں ڈوبا ہوا افسانہ سمجھتا ہوں۔ "سندباد" میں ترقی پسندی کا ڈھنڈورچی بننے کی کوشش کی ہے۔ کسی بھی تحریک یا فرد سے اظہارِ بیزاری یا نفرت کا یہ پامال عام انداز طیب انصاری جیسے نوجوان اور باصلاحیت فنکار کے لئے زیب نہیں دیتا۔ بہ حیثیتِ مجموعی طیب انصاری کا مضمون پُر اثر اور کامیاب ہے۔ اِس سے مجتبیٰ حسین کی شخصیت اور اُن کے فن پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ "ناولٹ نمبر" میں ۱۹ ناولٹ ہوں گے۔ مجھے شک ہے کہ اتنے مواد کے لئے پانچ، چھ سو صفحات بھی کافی نہیں ہوں گے۔ اپنی بیماری، غم اور پریشانی کے باوجود بھی آپ شاعر کے ذریعہ اُردو زبان اور اس کے ادب کی برابر خدمت کرتے جا رہے ہیں اور یہ بات کوئی معمولی یا غیر اہم بات نہیں۔ اِس منزل پر بھی آپ کو اُردو والوں کا خلوص اور عملی تعاون مل جائے تو بات بن سکتی ہے۔ بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ لیکن بے حسی اور یخ بستہ ماحول میں حرارت اور حرکت پیدا ہوگی اِس کا فوری یقین نہیں آتا۔ پھر بھی آپ مایوس نہیں ہیں۔ اور مسلسل جد و جہد کرتے جا رہے ہیں۔ آپ قابلِ صد مبارکباد ہیں۔ اور زبانِ اُردو ادب کے لئے بڑی اہم اور ناقابلِ فراموش خدمات انجام دے رہے ہیں۔

متصل چھپلگوڑہ۔ پوسٹ آفس۔ حیدرآباد ۳۶ اکرام جاوید

● شاعر کے مضامین اِس قدر دلچسپ و مفید ہوتے ہیں کہ شروع سے آخر تک پڑھتا ہوں۔ شعری حصّہ بھی جاندار ہوتا ہے۔ اگر کسی ماہ نہ ملے تو ایک طرح کی بے چینی سی ہوتی ہے۔ میری نظر میں شاعر معیاری پرچہ ہے اُردو زبان کی قابلِ قدر خدمت ادا کر رہا ہے۔ اُردو داں طبقے کی یہ ذمہ داری ہے کہ اُردو کے رسالے اور اخبار خرید کر پڑھیں۔ ہر رسالے کے مالیہ کے استحکام کے لئے مشترکہ سعی کی جائے اور ہر بڑے شہر میں فلم چیرٹی شو کے ذریعہ سے رقم اکٹھا کی جائے۔ اور دُوسرے کی وسکیم سارے ایڈیٹر مل کر بنائیں تو کوئی صورت گری ہو۔

بنگلور ۵۱ محمد عبدالقادر ادیب

● خدا آپ کو اردو کی سرپرستی کیلئے ہزاروں سال زندہ رکھے۔ شاعر کا تازہ شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ اردو دشمنوں کی کج ادائیاں اور ان پر آپ کی کڑی تنقید قابلِ تعریف ہی نہیں لائقِ تحسین بھی ہے حسبِ سابق تجزیات اِس بار بھی تیر و نشتر کی حقیقت رکھتے ہیں۔ تبدیلیِ اردو رسم الخط اردو کی بقا کے لئے مُضر ہی نہیں خطرناک حد تک سم قاتل ہے۔ خود اردو داں طبقوں کا اِس روش پر طوفانِ بدتمیزی اِس امر کی حامل ہے کہ بیشتر اردو مصنف اِس ناگوار تبدیلی پر راضی ہیں۔ ان میں عصمت صاحبہ دو قدم آگے ہی ہیں۔ پتہ نہیں ان کے منہ کا مزا کیونکر بدل گیا۔ شاید اسی وقت کے لئے مرحوم نریش کمار شاد نے کہا تھا۔

اردو کے محافظ جو بنے بیٹھے ہیں
دراصل وہی ہیں قاتلانِ اردو

محترمی عزت مآب ل احمد اکبرآبادی کا مقالہ شا . کی جان ہے۔ نظم و غزل میں متین سروش۔ ندا فاضلی۔ رفعت سروش۔ ارشد صدیقی۔ اختر بستوی بے حد کامیاب رہے۔ اور افسانہ نویسی میں اکرام جاوید۔ ایف اے بادشاہ۔ سلیم اقبال خوب رہے۔ انشر دیو پسند آیا۔ ناول "دھرتی سدا سہاگن" کے چھٹے باب کا انتظار ہے۔

الہلال نیوز ایجنسی۔ ساوڑے روڈ۔ بھیونڈی   س م پاشاہ

● نومبر کا شمارہ بھی اپنی گزشتہ روایت کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ شاعر جدید و قدیم ادب کا سنگم ہے اور یہی ایک واحد رسالہ ہے جو دونوں طرح کی پیاس بجھاتا ہے۔ اِس شمارے میں دو کہانیاں جاگتی آنکھوں کے خواب؟ اور دستک بہت اچھی ہیں۔ خاص طور سے دستک تو بے حد پسند آئی۔ اُس کا یہ جملہ "دھرتی پر انسانوں نے لکیریں کھینچی ہیں۔ اب دھرتی انسانوں کے بیچ لکیریں کھینچ رہی ہے۔" اب تک میرے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہا ہے۔ آج کے متنازعہ ماحول میں ایسی ہی کہانیوں کی ضرورت ہے۔ اتنی اچھی کہانی لکھنے پر میں شری ایف اے بادشاہ کو مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ اس کے ترجمے بھی بہت اچھے ہیں۔ غزلیں اور نظمیں بھی پسند آئیں۔

اردو کا رسم الخط ہرگز نہیں بدلنا چاہئے۔ میں رضیہ اور عصمت وغیرہ سے گزارش کرتی ہوں کہ وہ اپنے ضمیر کو نہ بیچیں۔

اُن کے نام اردو رسم الخط سے ہی زندہ ہیں۔ ورنہ رضیہ اور عصمت ہو جانے کے بعد انہیں کون پوچھے گا؟!

آپ کی حیات لمبی ہونے کے لئے بھگوان سے پرارتھنا کرتی ہوں۔

پٹنہ   مریدولا ورما

● بقیہ افسانہ "لکشمی" ۔ صفحہ ۴۷ ●

سچ کہتی ہوں لالہ، میں تم سے اپنی ذلت کا اتنا سخت انتقام لینا چاہتی ہوں کہ تم اپنی زندگی کی آخری گھڑی تک بھول سکو۔" لکشمی نے کہا۔" اسی لئے میں نے تمہیں سٹے کی طرف مائل کیا۔ تم بازی لگا کر جیتے اور نہال ہوتے گئے۔ پھر میں نے تم سے تمہارا سب کچھ لگوا کر تمہیں قلاش بنا دیا۔ اب تم قلاش ہو لالہ۔ مجھ سے تمہارا رشتہ ٹوٹ گیا۔ میں جا رہی ہوں لالہ۔"

نہیں ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ یہ سب جھوٹ ہے ۔۔۔ لکشمی مت جاؤ ۔۔۔"

لالہ سونارائے چیخ پڑے۔ بیتابی سے پلنگ پر کئی کروٹیں لے کر پلٹ گئے۔ اور اس الٹ پلٹ میں ان کے جسم کا اگلا حصہ جب پلنگ کے نیچے جھکا تو وہ جاگ گئے۔ ہاتھ کی گرفت ڈھیلی ہوتے ہی اُن کی جیب سے اشرفی نکل کر فرش پر گری اور لڑھکتی ہوئی دور چلی گئی اور لالہ سونارائے اُسی طرح جھکے لیٹے اُس اشرفی کو دیکھتے اور سوچتے رہے۔ ▲

● بقیہ ڈرامہ "پروانے کی خاک" ۔ صفحہ ۲۷ ●

سمجھا گیا تو ملازمین میں سے ایک آدھ لے لیا جائیگا۔

حوالدار ۔ حضور، ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ قبر کا اوپری حصہ کچا اور زمین کے برابر کیوں رکھا جا رہا ہے۔ قبریں تو کافی اونچی اونچی ہوتی ہیں۔ میں نے دہلی کے قبرستانوں میں دیکھا ہے کہ کئی قبریں بھی خاصی اونچی ہوتی ہیں۔

ڈپٹی ۔ حوالدار تم نہیں سمجھ سکتے! جب تک بانس کا گھیرا گل سڑ کر ختم ہوگا اُس وقت تک قبر پر خوب گھاس جم چکی ہو گی اور مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار کی قبر کا نشان بھی معدوم ہو جائیگا۔ اگر کوئی ہندستانی کھوج بھی کرے تو قبر کی نشاندہی نہ ہو سکے گی۔ (بیگ گراؤنڈ میں کوئی پرسوز آواز میں گا رہا ہے)

ہے کتنا بدنصیب ظفر دفن کے لئے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

نقد و نظر

(ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

آثارِ محروم

مرتبہ ـــــــ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

یہ رسالہ "پگڈنڈی" امرتسر کا محروم نمبر ہے جو کئی سال کے اعلان کے بعد اب کتابی شکل میں اخباری کاغذ پر شائع ہوا ہے۔ اس میں ملک کی ۷ مقتدر شخصیتوں کے پیغامات، ۲۷ چھوٹے بڑے مقالے خراجِ عقیدت کے طور پر ۲ نظمیں ۳۴ خطوط محروم کے کلام پر ۵ تضمینیں جشنِ محروم کی پانچ تقاریب کی تفصیلی روداد، ۵۲ اخباروں اور رسالوں کے اقتباسات اور ۴ سپاسنامے شامل ہیں۔

چونکہ چند محروم کی شاعرانہ شخصیت بلند اور تسلیم شدہ ہے، انہوں نے اپنی نظمیہ شاعری سے خصوصیت کے ساتھ اردو شاعری میں قابلِ قدر اضافے کئے۔

۴۶۸ صفحات کا یہ نمبر محروم کے فن اور اُن کی شخصیت کو اجاگر کرنے میں معاونت کرتا ہے۔ جن قلم کاروں نے آثارِ محروم میں اظہارِ خیال کیا ہے اُن میں سے بیشتر ذمہ دارانہ حیثیت رکھتے ہیں جس کے باوجود اکثر نے اپنی ذمہ داری نبھائی نہیں ہے۔ بعض نے رسمی طور پر لکھا ہے۔ اور بعض نے نقد و تبصرہ کا صحیح حق ادا نہیں کیا ہے۔ اسی کے ساتھ متوازن اور اچھی تحریریں بھی شامل کتاب ہیں۔

قیمت سات روپے (جو کسی قدر زیادہ ہے)۔ ملنے کا پتہ :—

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵۔

تاثراتِ سفرِ ایران

از ـــــــ ڈاکٹر رفیعہ اکبر

سفرنامہ دیگر اصنافِ ادب کی طرح ایک مستقل صنفِ ادب ہے۔ یہ چار عنصر میں تہذیب و ثقافت، شعر و ادب، نغمہ و موسیقی اور منظرِ فطرت کی حسین امتزاج اگر داستان ہے اردو میں گو یہ صنفِ ادب معدوم تو نہیں تاہم کمیاب ضرور ہے۔ سفرناموں میں ملک در ملک اور چمن در چمن کے حالات ذاتی مشاہدہ پر مبنی ہوتے ہیں اور سارے تجربات و واقعات عمل اور ردِ عمل کی حیثیت سے پیش ہوتے ہیں۔ اگر سیر و سیاحت کے یہ سارے تجربات قاری پر ایک کیفیت طاری کر دیں اور واقعات کی رنگا رنگ تصویریں نقش بن بن کر ابھرتی رہیں تو یہ دلچسپ داستان خیالی داستانوں کی طرح اپنے آپ کو داستانوں کے اس ماحول سے قریب کر دیتی ہیں۔ جہاں سے داستانیں ناول اور افسانہ کی سرحدوں کو چھونے لگتی ہیں۔

یوسف خان کمل پوش کا سفرنامہ "عجائبِ فرنگ"، یا "تاریخِ یوسفی" غالباً اُردو کا پہلا سفرنامہ ہے۔ جسے موصوف نے ۱۸۳۶ء میں اپنے سفرِ انگلستان کی بنیاد پر لکھنا شروع کیا تھا۔ اور جو ۱۸۴۷ء میں پہلی بار شائع ہوا، اور جو نصیر الدین حیدر شاہ (شاہ سلیمان جاہ) نوابِ اُودھ کے زمانہ کی یادگار ہے۔ شبلی کا سفرنامۂ مصر و روم۔ قاضی عبدالغفار کا نقشِ فرنگ، سید احتشام حسین کا ساحل اور سمندر"۔ خواجہ احمد عباس کا "مسافر کی ڈائری" وغیرہ متعدد سفرنامے ہیں۔ جو بعد میں اُردو میں لکھے گئے۔ ایران کی سرزمین سے ہندوستان کے بہت قدیم تہذیبی و لسانی تعلقات ہیں۔ اِن تعلقات میں بھی سنسکرت اور فارسی کے لسانی بہناپے سے بڑی تقویت ملی۔ اِنہیں تعلقات کے پیشِ نظر اور علمی تحقیق کی تشنگی بجھانے کی خاطر جب ۱۸۸۵ء میں اُردو کے مشہور انشاء پرداز اور ادیب مولانا محمد حسین آزاد نے جب ایران کی سیاحت کا قصد کیا تو اپنے اِس سفر کی یادگار کے طور پر "سیرِ ایران" کے نام سے ایران کا پہلا سفرنامہ بھی دیا۔ آزاد کی "سیرِ ایران" کے بعد ایران کا تازہ ترین سفرنامہ، ڈاکٹر رفیعہ اکبر کا زیرِ نظر "تاثراتِ سفرِ ایران" ہے۔ جسے حیدرآباد کے اشاعتی ادارے ادبی ٹرسٹ نے پیش کیا ہے۔ ادبی ٹرسٹ جو پچھلے چند سالوں سے اردو زبان و ادب کے اشاعتی پروگرام کے تحت قائم ہوا ہے بحیثیت سے اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں فال نیک ہے۔ ادبی ٹرسٹ کی یہ بات قابلِ تعریف ہے کہ اپنے ابتدائی اشاعتی پروگرام میں اس نے "تاثراتِ سفرِ ایران" کو شامل کیا اور اردو میں اس کمیاب نثری صنف کو نہ صرف پروان چڑھانے میں مدد دی ہے بلکہ زیرِ نظر سفرنامہ کی ادبی قدر و قیمت کا اندازہ کرتے

کہا جاسکتا ہے کہ صحیح اور ادبی اعتبار سے بلند پایہ کتاب کو بُک کریک نے اپنے اس پروگرام میں ایک اچھی طرح ڈالی ہے — "فرات سفر ایات" نہ صرف سفرنامہ ہونے کی حیثیت سے قاری کو ایران اور اس کی زندگی سے روشناس کراتی ہے بلکہ اس کی حسین وجمیل زبان، جو افسانوی ادب کا پیرایہ لیے ہوئے قاری کو اپنے ساتھ ساتھ لے چلتی ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے۔ گویا پردۂ سیمیں پر ایک کے بعد دوسری تصویر خود قاری دیکھ رہا ہو۔ اسلوب کی بے پناہ جاذبیت سے اس سفرنامہ کا حُسن نکھر آیا ہے۔

قیمت پانچ روپے۔ طابع ادبی ٹرسٹ۔ حیدرآباد۔

تبصرہ نگار: ڈاکٹر عبدالستار دلوی

نغمۂ شب

از: ——— اختر بستوی

"نغمۂ شب" ایک طویل تاثراتی نظم ہے۔ شب کو اس میں متکلم کردار بنایا گیا ہے اور ایک تمثیلی انداز پیدا کیا گیا ہے۔ نظم یوں شروع ہوتی ہے کہ رات غمگین و اُداس ہے، اُس کے لبوں پر درد وکرب کا نغمہ ہے۔ لیکن اس نغمۂ درد کو کوئی سننے والا نہیں ہے۔ دنیا والے محوِ خواب ہیں۔ وہ دن کی سرگرمیوں سے تھک کر نیند کے ساگر میں ڈوب جاتے ہیں۔ اُنہیں ہوش نہیں رہتا کہ وہ شب کے نغمات سنیں۔ روزِ ازل سے رات اسی طرح نغمے سناتی آئی ہے۔ لیکن اُس کے یہ نغمے فطرت کے سکوتِ بے پایاں میں کھو جاتے ہیں۔ حیات وکائنات پر اس کے تاثرات سُننے اور محسوس کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ یہ جب اپنے پر پھیلاتی ہے تو دُنیا اُن کے سائے میں آرام سے سو جاتی ہے، اپنی نارسائیوں، تکلیفوں اور غموں کو بھلا کے۔ مگر رات جو ہمیشہ جاگتی رہتی ہے۔ انسان کی تلخیوں اور زندگی کی کشاکش سے آگاہ ہے ؎

تھک کر سوئے ہوئے لوگوں کے احساسات تھے سحر زدہ

نغمۂ شب کا سارا تاثر، اُن کے لئے تھا لا حاصل

لیکن وہ شاعر اپنے ادھورے سپنوں کا سنسار لئے جاگ رہا

تھا اُس کے ذہن میں نامعلوم مسائل و افکار تھے۔ وہ ایک پل کے پیچھے گم صُم گزرا تھا۔ اُسے پل کی تعمیر کا خیال آتا ہے اور انسان کے جہد وعمل کی ایک تاریخ اُس کے ذہن میں اُبھرتی ہے۔ پل کی ویرانی اور اُس کے بے رُوح جسم ہی کی طرح اُسے آج کے دور کا انسان نظر آتا ہے۔ اس عالم میں اُس نے رات کی دیوی کا درد بھرا نغمہ سنا۔ رات خود کو چشمِ بصیرت اور دیدۂ بینا کی مالک بتاتی ہے اور کہتی ہے کہ دہر کے آنگن میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ میں سدا سے دیکھتی چلی آرہی ہوں۔ پھر وہ انسانی زندگی کی ناکامیوں، محرومیوں، اُس کے زخموں اور تیرہ بختی کو بے نقاب کرتی ہے۔ انسان کو اُجالوں کی طرف بڑھنے اور ایک بہتر زندگی کا پیام دیتی ہے۔

نظم شروع سے آخر تک یقیناً مربوط ہے، اس میں تاثر بھی ہے، بہت سے اچھے مصرعے ہیں، لہجہ بھی نرم ہے۔ موضوع خاصا اچھا ہے۔ نظم کی زبان سلیس اور کسی حد تک مترنم ہے، لیکن کہیں کہیں خود شاعر کا اپنا تجرباتی اور مشاہداتی شعور کمزور محسوس ہوتا ہے۔ ورنہ زبانِ شب سے انسانی زندگی پر ایسا بھرپور اور حقیقت پسندانہ تبصرہ کرایا جاسکتا تھا جو قاری اور سامع کو چونکا دیتا، جس سے دلوں اور ذہنوں پر ایک ضرب پڑتی۔ نظم کا اختتام قطعاً بے رُوح بن کر رہ گیا ہے۔ شاعر نے اپنے ذہن کو کسی حاصل کی طرف نہیں موڑا ہے۔ ہاں نظم کا مجموعی تاثر شاعر کی کاوشِ فکر کو سراہنے کی ترغیب ضرور دیتا ہے۔

فنی اعتبار سے اگر نظم کا تجزیہ کیا جائے تو نظم کے کچھ مصرعے نظم کی متعینہ بحر "متقارب شانزدہ رکنی" سے ہٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بعض الفاظ اور تراکیب میں بھی بہتر انتخاب اور ترمیم و ترقی کی گنجائش ہے۔

"نغمۂ شب" کے مطالعہ کے بعد اختر بستوی سے اور بھی بہتر طویل نظموں کی تخلیق کی توقعات پیدا ہوتی ہیں۔

۶۴ صفحات۔ طباعت وکتابت خوبصورت۔ قیمت ۲ روپے

ملنے کا پتہ: "شب خون کتاب گھر" ۳۱۳۔ رانی منڈی، الٰہ آباد

(ادارہ)

معذرت

اخبار کی [illegible] دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے دسمبر کا یہ شمارہ تاخیر سے شائع ہو رہا ہے — ادارہ

محفلِ اپنی

۴۹ سال کا سفر:

"شاعر" نے اپنے سفر کے ۴۹ سال پورے کر لئے ہیں۔ یہ علمی و ادبی ماہنامہ تیزی کے ساتھ نصف صدی کی حدود تک پہنچ رہا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو "شاعر" ایک نقش کارگر کی حیثیت رکھتا ہے۔ کتنی ہی آندھیاں چلیں کتنے ہی طوفان آئے لیکن اس کا سفر جاری رہا۔ اب بھی جاری ہے۔ اور آئندہ کیلئے بھی اسے ایک نقش جاوداں کی حیثیت حاصل ہو سکتی ہے بشرطیکہ اُردو کے پرستار یہ تہیہ کر لیں کہ ہندوستان کے اس سب سے پرانے ادبی ماہنامے کو دوامی حیثیت دینی ہے۔ اس کے نقش و نگار کو اور زیادہ اُبھارنا ہے۔

اگر کسی دوسری زبان کے ماہنامے نے اتنی طویل عمر پائی ہوتی، اتنی نمایاں اور ٹھوس خدمات انجام دی ہوتیں تو شہروں شہروں اس کے جشن منائے جاتے، ہزاروں اور لاکھوں کا سرمایہ اس کیلئے فراہم کیا جاتا۔ اسے ادبی و لسانی تاریخ کا ایک عظیم کارنامہ قرار دیا جاتا۔ بدقسمتی سے یہاں یہ عالم ہے کہ عام طور پر "شاعر" کے چند خریدار بھی بنانا اُردو پرستوں کو بھاری معلوم ہوتا ہے۔ دس روپے سالانہ چندہ تک لوگوں کی جیبوں سے نہیں نکلتا! "شاعر" کے پاس برائے نام بھی کوئی "بینک بیلنس" نہیں ہے۔ روز کنواں کھودا جاتا ہے اور روز پانی نکالا جاتا ہے۔ "شاعر" کے عظیم و ضخیم نمبر نکالنے کیلئے ہمیشہ بڑے بڑے قرض لینے پڑے ہیں اور ان قرضوں کو ادا کرنے کیلئے سخت پریشانیوں سے گزرنا پڑا ہے۔ آج کے دور میں جبکہ ہر سمت قومی و لسانی سطح پر بڑے بڑے کام ہو رہے ہیں۔ بڑے سے بڑا سرمایہ جمع کر لیا جاتا ہے کیا اُردو کے اس فعال ادارہ کو جس نے "شاعر" نکالا ہے، سرمایہ کی کشاکش سے نجات نہیں دلائی جا سکتی ہے؟ کیا محض زبانی اعترافِ خدمت عمل کی اس دنیا میں وجہِ تسلی ہو سکتا ہے؟!

ناولٹ نمبر:

"ناولٹ نمبر" فروری ۱۹۸۱ء میں شائع ہو رہا ہے۔ سوچا یہ تھا کہ اس اہم نمبر کو زیادہ سے زیادہ چار سو صفحات میں سمیٹ لیا جائیگا۔ لیکن اب یہ اندازہ ہے کہ اس کا حجم پانچ سو صفحات یا اس سے بھی کچھ زیادہ ہو جائے گا۔ یہ حُسنِ اتفاق اور "شاعر" سے عقیدت رکھنے والوں کا گہرا لگاؤ ہے کہ سب نے ہماری درخواست پر تازہ ترین ناولٹ لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ بعض تخلیقات نے ناولٹ سے بڑھ کر ایک مکمل اور طویل ناول کی صورت اختیار کر لی۔ بہرحال "شاعر" کا ناولٹ نمبر معیار کے علاوہ اپنے انداز پیشکش کے اعتبار سے بھی یادگار ہوگا۔ اس میں شامل شدہ ہر ناول اور ناولٹ اگر کتابی شکل میں خریدا جائے گا تو مجموعی قیمت کسی طرح ساٹھ روپے سے کم نہ ہوگی۔ لیکن ہم نے "ناولٹ نمبر" کی قیمت صرف ساڑھے چھ روپے رکھی ہے اور "شاعر" کے مستقل خریداروں کی خدمت میں یہ نمبر انتہائی رعایت کے ساتھ محض دو روپے پچاس پیسے میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ اُردو حلقے پُرجوش اور پُرشوق انداز میں "ناولٹ نمبر" کی طرف ہاتھ بڑھائیں گے۔ اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں اسے خریدیں گے، اپنے احباب و اعزا تک اس "یادگار نمبر" کو پہنچائیں گے۔

ناولٹ نمبر کیلئے اشتہارات:

کسی بھی عظیم اور ضخیم نمبر کے اخراجات اُس کی فروخت سے پورے نہیں ہوتے ہیں۔ ایک بہت ضخیم نمبر معمولی قیمت پر صرف اس لئے دیا جاتا ہے کہ اخراجات کا بڑا خرچ اشتہارات سے پورا کر لیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اشتہارات بنیادی حیثیت رکھتے ہیں جب تک بڑی تعداد میں اشتہارات جمع نہ ہوں، کام نہیں چل سکتا۔

"شاعر" سے قربت رکھنے والے ایسے بہت سے مخلص احباب ہیں جن کی توجہ اس خصوص میں بے انتہا مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ وہ اپنے اثر و رسوخ سے "ناولٹ نمبر" کے لئے اشتہارات دلا سکتے ہیں۔ اُمید کہ جلد اس طرف توجہ دی جائے گی۔ اشتہارات کا لٹریچر چھپ چکا ہے اور مخلص و دردمند احباب طلب کر سکتے ہیں۔

شاعر کا زرِ سالانہ بھیجئے

جن خریداروں کی طرف "شاعر" کا زرِ سالانہ باقی ہے یا جن کی مدتِ خریداری دسمبر ۱۹۷۰ء میں ختم ہو رہی ہے وہ نادوث نمبر کی رعایتی قیمت کا رجسٹری خرچ بہت جلد منی آرڈر سے روانہ فرما دیں۔ اگر اپنے زرِ سالانہ کے ساتھ ساتھ دو دو چار چار نئے خریداروں کا زر خریداری بھیجنے کی سعی فرمائیں تو کرم مزید ہو۔

تصحیح کر لیجئے

"شاعر" کے پچھلے شمارہ نومبر کے ایک مضمون "مسلمان موسیقاروں کا رجحان میں ہندو دیومالا" کے صفحہ ۳۲ کے بعد والا صفحہ غلط لگ گیا تھا۔ صفحہ ۳۲ کے بعد صفحہ ۳۴ پڑھا جائے۔ اور پھر صفحہ ۳۳۔

متین سروش کی غزل مطبوعہ شاعر نومبر ۷۰ء صفحہ ۵ پر مقطع میں قافیہ "جاناں" غلط چھپ گیا تھا۔ صحیح "رخِ زیبا" ہے۔ رفتار کے صفحہ ۷۵ پر بزمِ سیماب دہلی کی شعری نشست کی روداد میں مولانا علیم مظفر نگری کا نام شامل ہونے سے رہ گیا تھا جس کا ہمیں افسوس ہے۔

مدیرِ شاعر کے سفر

مدیرِ شاعر محترم اعجاز صدیقی ۱۹ اکتوبر سے ۲۴ نومبر تک دھرم شالہ اور دہلی کے سفر میں رہے۔ ۲ دسمبر ۷۰ء کو آپ محترم پھر آگرہ، اٹاوہ، فیروزآباد اور دہلی کے سفر پر روانہ ہو چکے ہیں۔ ۲۴ دسمبر تک بمبئی واپس تشریف لائیں گے۔

اس اطلاع سے بنگلور اور حیدر آباد کے مخلص احباب اور علمی و ادبی حلقوں کو بڑی مسرت ہوگی کہ سالہا سال کے بعد محترم اعجاز صدیقی جلد ہی بنگلور اور حیدر آباد دکن کے ہنگامی سفر کا بھی ارادہ رکھتے ہیں۔

مدیرِ شاعر کے پے در پے سفر سے اُن کی ذاتی ڈاک اور اُن کے ذاتی کاموں میں جو رکاوٹ پیدا ہوئی اُس کا اُنہیں احساس ہے۔ "شاعر" میں اگر کچھ جھول رہ گئے ہوں تو اُنہیں بھی نظر انداز کیا جائے۔